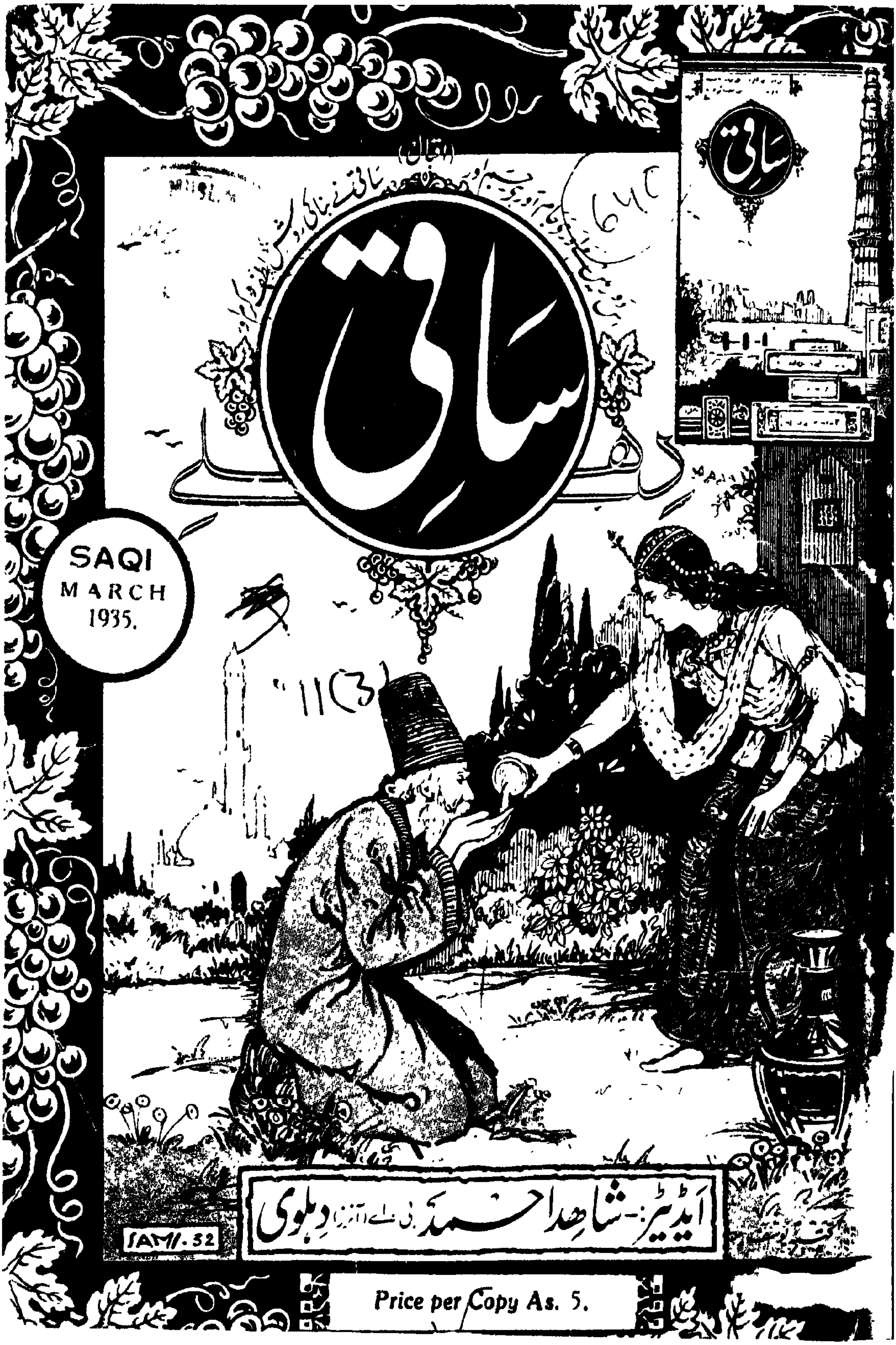

ساقی
SAQI
MARCH
1935.
ایڈیٹر:- شاہد احمد بی اے (آنرز) دہلوی
Price per Copy As. 5.

تصانیف مصورِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی

کولتار مضحکہ خیز اور پُر اسرار ناول شوخ و شنگ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور ایک عورت کی دردناک زندگی۔ قیمت دو روپے	**شریر بیوی** ایک خاتون کی معصوم شرارتیں اسقدر دلچسپ ہیں کہ کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ چار تصویریں اور رنگین سرورق۔ قیمت عہ	**روحِ ظرافت** "انگوٹھی کی مصیبت" اور دیگر مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ یہ افسانہ ظرافت کی روح ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت عہ	**روحِ لطافت** "مہارانی کا خواب" اور دیگر افسانے جنکو پڑھکر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائینگے۔ پہلا افسانہ لاجواب قرار دیا گیا ہے۔ قیمت عہ
ومپائر ایک شریف خاتون کی آبروریزی کا دردناک واقعہ اور ایک عجیب اتفاق ہے اُس کا دلچسپ انجام۔ قیمت دو روپے	**کمزوری** عورت کی کمزور فطرت کس طرح مرد کے بہکانے میں آجاتی ہے۔ ابتدائی حصہ ہنسانے والا اور آخری حصہ رلانے والا۔ قیمت دو روپے	**فُل بُوٹ** حسن و عشق کی عجیب و غریب داستان پلاٹ کے اعتبار سے مصنف کا بہترین ناول ہے۔ ایک جوتے کی وجہ سے کیا ہوا؟ قیمت عہ	**دیکھا جائیگا** عشق و ہوس میں تمیز کس طرح ہوا؟ ایک حسین مالدار لڑکی کے تین عاشقوں کی داستان۔ کامیابی کسے اور کیسے ہوئی؟ قیمت عہ
کھرپا بہادر ایک بدمعاش کی شادی فرمانروائے سلطنت کی لاڈلی بیٹی سے زبردستی کردی گئی اور اُسکے خندہ خیز و عبرت انگیز واقعات۔ قیمت ایک روپیہ	**جنت کا بھوت** ایک بدشکل نوجوان اور اُس کی حسین عزیزہ کی پُر لطف داستان مارے ہنسی کے آپکے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ قیمت ۱۲ر	**ملفوظاتِ ثانی** ایک کُتے کی خود نوشت سوانحعمری۔ اگر کُتے کی زبان ہوتی تو وہ اپنے جذبات کس طرح ادا کرتا؟ قیمت ۱۲ر	**چینی کی انگوٹھی** پہلا حصہ مزاحیہ دوسرا حصہ [illegible] انجام دیکھکر مصنف کی [illegible] کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ قیمت ۸ر
تفویض ایک بی۔ اے پاس خاتون کی شادی مسجد کے ملا سے ہوجاتی ہے۔ کیسی گذرتی ہے؟ انجام کار کیا ہوتا ہے؟ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت ۵ر	**مرزا جنگی** لکھنؤ کے بانکے مرزا جنگی اور انکے احباب کا ایک نہایت دلکش ڈرامہ۔ واجد علی شاہ کے زمانے کے لکھنؤ کی ایک جھلک۔ قیمت ۸ر	**قرآن اور پردہ** قرآن شریف کی آیات سے دکھایا گیا ہے کہ پردہ کسے کہتے ہیں اور اُسکے متعلق کیا کیا احکام ہیں۔ قیمت عہ	**حدیث اور پردہ** حدیث شریف کے مستند حوالوں سے پردہ کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ عورتوں اور مردوں دونوں کیلئے ضروری کتاب۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی

عورتوں کیلئے اُمورِ خانہ داری کی بہترین کتابیں

سنگھار خانہ

مختلف قسم کے منجن، پوڈر، سُرمہ، کریم، سنو، تیل وغیرہ کے نسخے اور آرائش جمال کے بے شمار طریقے بتائے گئے ہیں۔ قیمت عمہ

خانہ داری کے تجربات

پھوہڑ بے ڈھنگی لڑکیاں اگر اس کتاب کا مُطالعہ کریں تو سلیقہ شعار اور سگھڑ بن جائیں۔ کتاب کی اہمیت اُسکے نام سے ظاہر ہے۔ قیمت ۱۲/

مُفیدِ نسواں

عورتوں کو امورِ خانہ داری میں کن کن باتوں پر عمل کرنا چاہیئے اور خوشگوار زندگی گذارنے کیلئے انہیں کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ قیمت ۸/

بچوں کی تربیت

سائنس اور حفظانِ صحت کے اُصولوں پر بچوں کی پرورش کس طرح کیجاتی ہے، درستیٔ اخلاق کے طریقے بھی اسمیں درج ہیں۔ قیمت ۱۰/

عصمتی دسترخوان

باورچی خانے کے انتظام اور کھانوں کے متعلق نہایت قیمتی ہدایات اور مضامین اس میں درج ہیں۔ ہر ترکیب آزمودہ ہے۔ قیمت عما

مشرقی مغربی کھانے

یورپ اور ایشیا کے کھانوں کی ترکیبیں اس میں درج ہیں اور ہر ترکیب تجربے کے بعد درج کی گئی ہے۔ عمدہ مضامین بھی شامل ہیں۔ قیمت عما

ہنڈکلیا

بچیوں کیلئے تاکہ شادی سے پہلے کھانا پکانے کے فن میں ماہر ہو جائیں ترکیبیں اور کھانے کنواری بچیوں ہی کے مطلب کے درج کئے گئے ہیں۔ قیمت ۸/

بچوں کے کھانے

اُصولِ صحت کے مطابق ننھے بچوں کو کس قسم کی غذا دینی چاہیئے۔ ڈاکٹروں اور تجربہ کاروں کے کارآمد مضامین بھی شامل ہیں۔ قیمت ۸/

بیماروں کے کھانے

جو کھانے بیماروں کیلئے بیحد مفید ہوتے ہیں اس میں صرف انہی کی ترکیبیں درج ہیں۔ کتاب باتصویر ہے۔ ہر گھر میں اسکا ہونا ضروری ہے۔ قیمت ۱۰/

مذاقیہ کھانے

دولھا، نندوئی اور سہیلیوں وغیرہ سے مہذب مذاق کرنے کیلئے اسمیں ایسے ہی کھانے تیار کرنے کی ترکیبیں درج کی گئی ہیں۔ قیمت عہ

ناشتہ

دوپہر اور رات کے کھانے سے قبل صبح اور تیسرے پہر کیا کیا ناشتہ کیا جاتا ہے؟ ہر ملک کے مہمان کیلئے اس میں ترکیبیں درج ہیں۔ قیمت ۱۰/

عصمتی کروشیا

فنِ کروشیا کی ترکیبیں سلیس پیرایہ میں بتائی گئی ہیں، اور نمونوں سے انکی وضاحت کی گئی ہے۔ ہدایات اسقدر آسان ہیں کہ بچیاں بھی سمجھ لیں۔ قیمت عہ

عصمتی کشیدہ

کشیدہ کاری کے نہایت اچھے اچھے نمونے۔ ضروری اور کارآمد ہدایتیں اسقدر آسان ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی سمجھ لیں۔ قیمت عمہ

گلدستۂ کشیدہ

کشیدہ کاری کی اسقدر خوبصورت اور اتنی کارآمد کتاب آج تک نہیں چھپی۔ بے شمار نمونے اور آسان ہدایتیں لکھی گئی ہیں۔ قیمت عہ

موتیوں کا کام

یہ کام بہت مشکل سمجھا جاتا ہے مگر اس کتاب کے پڑھنے سے آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ نقشوں اور تصاویر کے علاوہ عام فہم ہدایتیں۔ قیمت عما

سوئی کا کام

کٹائی اور سلائی پر پہلی اور بہترین کتاب۔ قیمت عہ

سلمہ ستارے کا کام، ۲۵۰ قابلِ قدر نمونے مع ہدایات و ترکیب قیمت عما

ملنے کا پتہ:- ساقی بُک ڈپو، دہلی



عالیجناب کرنل بھولاناتھ صاحب بہادر سی آئی ای آنریری سرجن شہنشاہ جارج پنجم

مذکورہ تمام علوم کی روشنی میں مردانہ و زنانہ امراض پر بحث کی گئی ہے

معالجات قدیمہ و جدیدہ کا نادر مجموعہ ۵۰ سالہ پریکٹس کے تجربات کا نچوڑ

اردو لٹریچر تو درکنار انگریزی زبان میں بھی اب تک ایسی بلند رتبہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ حجم ۴۰۰ صفحات قیمت تین روپے محصول ۸؍

ملنے کا پتہ۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی

اکابرین کی آراء کا خلاصہ

رائے بہادر ڈاکٹر جیون لعل ایم ڈی (امریکہ) میو ہسپتال لاہور

کتاب نہایت زیب اور بہت دلچسپ ہے۔

خانصاحب فضل حق ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

یونانی اور ڈاکٹری کے دو مضامین کو یکجا ایک ہی کتاب میں کرنا قابل تعریف ہے

خانصاحب ڈاکٹر یار محمد خان ایم ڈی پرنسپل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور

اس بلند پایہ اور قابل مطالعہ کتاب کیلئے مصنف مبارکباد اور تحسین کا مستحق ہے

شاعری سیکھیے

مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کی معرکۃ الآرا تصنیف شاعری کا ست جس سے بیشمار شاعر اس وقت تک مستفیض ہو چکے ہیں۔ اور برابر ہو رہے ہیں جس میں تقطیع کرنے کا آسان قاعدہ، علم عروض، علم قافیہ، محاسن و معائب، شاعری تاریخ گوئی کے قواعد صنائع و بدائع کا بیان، اصلاح دینے کے اصول اور ابتدائی مشق کے آسان قاعدے بالتفصیل مذکور ہیں۔ اب تک اس سے زائد آسان کتاب جسکو مبتدی پڑھکر بآسانی سمجھ سکتے ہیں شائع نہیں ہوئی۔ اگر آپ کو اُردو زباندانی و شاعری کا شوق ہے تو پہلے اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ اور مشق کی ترکیب پر عمل کیجیے۔ ایک سال میں آپ شاعر کامل بنجائیں گے۔ حال میں کچھ مفید اضافہ کر کے کتاب کا حجم اور زیادہ کیا گیا ہے۔ مکمل سٹ کی قیمت دو روپے ہے

نیز تمام کُتب مؤلفہ خواجہ عشرت و دیگر مشہور مصنفین کی نادر و نایاب کتابیں عشرت بک ڈپو لکھنؤ سے طلب فرمائیے

ملنے کا پتہ

منیجر عشرت بک ڈپو کیننگ اسٹریٹ احاطہ خانسامہ لکھنؤ

شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم کی آخری تصنیف

اُمّہات الاُمّہ

مرحوم نے جس وقت یہ کتاب تحریر فرمائی تو بعض تنگ خیال مسلمانوں نے جس میں زیادہ تر طلباء مساجد شامل تھے اُسکی سخت مخالفت کی۔ یہ کتاب جیسا کہ اسکے موضوع سے ظاہر ہے اُن غیر مسلموں کے اعتراض کا جواب تھا جو رسالت مآب صلعم کے تعدد ازدواج پر رکیک حملے کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو جو غیر مسلموں کے سامنے پیغمبر اسلام صلعم کی صداقت کا مدعی ہو حُسنِ عقائد کو الگ کرکے دعویٰ اس طرح ثابت کرنا چاہیئے تھا جو منطق، فلسفہ، معقول اور تاریخ کی کسوٹی پر پارس ثابت ہو۔ یہی تھا مصنف کا سب سے بڑا قصور جسکو بعض مسلمان برداشت نہ کرسکے اور کتاب پردۂ دُنیا سے ناپید کردی گئی۔ ذیل میں اُمّہات الاُمّہ پر چند آراء کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جن سے اس کتاب کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہوسکے گا۔

"بڑے اور نامور لوگوں پر اکثر اپنے ہمعصروں کے ہاتھوں بڑے بڑے ظلم ہوئے ہیں۔ مولانا بھی آخر عمر میں اس سے نہ بچے۔ اُمّہات الاُمّہ کا شائع ہونا تھا کہ دلّی میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ مولوی تو پہلے ہی سے اُن سے جلے بیٹھے تھے۔ اُن کی بن آئی خوب جلے پھپھولے پھوڑے۔ مخالفت میں رسالے چھپوائے۔ طرح طرح کے بہتان باندھے۔ کفر کے فتوے لکھے اور بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ طرح طرح سے عوام کو بھڑکایا۔ یہاں تک کہ بعض نوجوان کے آگو ہوگئے اور مرنے مارنے پر مستعد ہو بیٹھے۔ یہ غدر دلّی سے اُٹھا اور دوسرے مقامات تک پہونچا۔

لیکن سب سے حیرت انگیز اور عبرتناک واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کے چھپنے کے بعد ندوۃ العلماء کا جو اجلاس دلّی میں ہوا اُس میں علمائے کرام تو موجود ہی تھے۔ انہوں نے باہم مسکوٹ کرکے اُمّہات الاُمّہ کی تمام جلدیں جو ابتدائی طوفان کے بعد شہر کے بعض معززین نے مولانا کی منت سماجت کرکے ایک صاحب کے پاس رکھوا دی تھیں اور بکری موقوف کرادی تھی منگوائیں اور اپنے سامنے ان کتابوں کا ڈھیر لگوایا۔ اور اُن میں سے ایک مولوی نے زیادہ تر ثواب کمانے کیلئے آگے بڑھکر مٹی کا تیل چھڑکا اور بسم اللّٰہ کرکے آگ لگادی۔ اُسکے شعلوں کی روشنی مولویوں کے مقدس چہروں پر پڑ رہی تھی اور اُن کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی بشاشت سے اس خوفناک دلی مسرت اور باطنی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا جو ایک خونخوار درندے یا ایک سنگدل انسان کی صورت سے انتقام لیتے وقت ظاہر ہوتا ہے۔ اگر حکومت کا ڈر نہ ہوتا تو مولانائے مرحوم بھی اسی آگ میں جھونک دئے جاتے۔ یہ منظر قابل دید تھا۔ مولویوں کا یہ حلقہ زمانہ وسطیٰ کے اُن پادریوں کی یاد دلاتا تھا جنہوں نے کتابیں تو کتابیں ہزاروں بے گناہ زندہ ہستیاں آگ میں جھونک دیں، کو کڑکڑاتے تیل کے کڑھاؤں میں ڈال دئے، گلوں میں پتھر باندھ کر بہتے دریاؤں میں ڈبو دئے، کتوں سے پھڑوا دئے اور طرح طرح کے عذاب دے دیکر اور عجیب و غریب شکنجوں میں کس کس کر سِسکا سِسکا کر مار ڈالے اور اُنکے سامنے راکھ کا ڈھیر ایک تودۂ عبرت تھا جو بیسویں صدی عیسوی کے روشن زمانے کی ایک عجیب یادگار تھا۔ یہ راکھ اس قابل تھی کہ اسکی ایک ایک چٹکی بطور یادگار کے شیشیوں میں بند کرکے رکھ لی جاتی تاکہ آئندہ نسلیں اُسے سامنے رکھکر اُن علمائے کرام اور مصلحانِ ملک و ملت کی ارواحِ پاک پر فاتحہ دلائیں اور اُن کے حق میں دُعائے خیر کریں۔ اس رات گویا مولویوں نے شب برات منائی اور اس آگ سے اپنے نفوسِ مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اعمالناموں میں ایک ایسی بڑی نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً اُن کی نجاتِ اُخروی کا باعث ہوگی۔ یہ اُن بزرگوں کا کام ہے جنہوں نے چشمِ بد دور مسلمانوں کی دینی و دُنیوی اصلاح و فلاح کا بیڑا اُٹھایا ہے۔"

(مولوی عبدالحق بی۔ اے۔ اورنگ آباد۔ دکن)

"حق الامر یہ ہے کہ اُمّہات الاُمّہ وہ کتاب تھی کہ نہ آج مسلمانوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہے نہ آئندہ برسوں نظر آنے کی اُمید ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے اس قابلیت سے پیغمبر اسلام صلعم کی رسالت کو ثابت کر جائے۔ اور مسلمانوں کیلئے اتنا لٹریچر مہیا کردے جو اُمّہات الاُمّہ میں ہے۔ اُمّہات الاُمّہ عم مغفور و اُستادِ مرحوم کی آخری تصنیف اور اُردو لٹریچر کا ایک بیش بہا ذخیرہ تھا جو چند خوش اعتقاد طلبا کی عنایت سے پردۂ دُنیا سے ناپید ہوئی اور کتاب کا اصلی مقصد جو یورپ کے سامنے حضور اکرم صلعم کی ذاتِ پاک کو تعددِ ازدواج کے متعلق اغراضِ نفسانی سے پاک ثابت کرنا تھا پورا نہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اُمّہات الاُمّہ پردۂ دُنیا سے ناپید ہوچکی اور مولانائے مغفور بھی رحلت فرماگئے مگر مخالف دُنیا اب دیکھ لے کہ رسالت مآب کی پاک زندگی کے حالات ایسی حالت میں کہ روئے سخن اُن لوگوں سے ہو جو منطق اور فلسفہ سے باہر قدم تک نہیں رکھتے اس قابلیت سے لکھ دینے والے اب قوم میں کتنے بزرگ ہیں اور علامہ ملگرامی مرحوم کی یہ آرزو کہ "کاش اُمّہات الاُمّہ کا ترجمہ میں کرتا" کہانتک حق بجانب تھی۔"

(علامہ راشد الخیری دہلوی)

کون کہتا ہے کہ دہلی کے علماء نے مرحوم کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا؟ سب جھوٹ ہے چند حریص اور خود غرض لوگوں نے شورش برپا کی تھی مگر معقول اہل علم اس

[illegible]

مولانا نذیر احمد سے مرتے دم تک جب ملنا ہوا ہمیشہ خدا اور خدا والوں کا چرچا رہتا اور آخر وقت میں تو اُنکی خدا ترسی اور رقیق القلبی کا یہ عالم تھا کہ ایک آیت سناتے اور بے اختیار روتے۔ ایسے سچے خدا پرست کو کافر کہنے والے میرے عقیدے میں دوزخ کے کُندے ہیں"
(حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی)

"بیان کیا جاتا ہے کہ اُمہات الامہ کی تصنیف سے مصنف کا مقصود مسلمانوں کا دل دکھانا اور ان کو آزار پہونچانا تھا۔ میں نے تو سوائے چند دہلی کے مسلمانوں کے جو بانی مبانی اس تمام شورش کے تھے اور کسی کو شاکی تک نہ پایا۔ نفس کتاب میں سوائے اسکے کہ بعض جگہ شوخیٔ طبع سے کوئی فقرہ رو میں نکل گیا اور کوئی ایسی بات پائی جس سے اسلام کی توہین یا مسلمانوں کی دل آزاری مقصود ہو۔ نہ مرحوم جیسے شخص سے اس کی توقع ہو سکتی تھی کیونکہ وہ بڑے کٹے مسلمان تھے۔ نماز کے سختی سے پابند تھے۔ نہایت خشوع و خضوع سے نماز پنجگانہ ادا کرتے تھے۔ خود حافظ کلام الٰہی تھے۔ اکثر اوقات کلام مجید پڑھا کرتے تھے۔ مدتوں سے اُن کو حالت وجد تھی۔ ہر وقت کلام مجید کی آیتیں، عربی کے اشعار پڑھا کرتے تھے اور زار و قطار روتے تھے۔ خدا کا ڈر تو ان کے دل میں ایسا تھا کہ شاید کسی کے دل میں ہو۔ ہمدردی انسانی ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کنبا پروری، غربا سے سلوک، پوشیدہ امداد و خیرات، یہ سب باتیں اُن میں لاجواب تھیں۔ تکبر اور غرور اور نخوت اُن کو چھو نہیں گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی غریبی اور طالب العلمی کی حالت کو فخریہ بیان کیا کرتے تھے۔ ایسا شخص جس نے ساری عمر مذہبی زندگی بسر کی ہو، جس نے کلام مجید کا بے نظیر ترجمہ لکھا ہو، جس نے عمدہ سے عمدہ کتابیں اخلاق کی لکھی ہوں، جو طلبا کو علم ادب اور کتب احادیث حسبۃً للہ پڑھاتا ہو، جس کے لکچر سر سے پاؤں تک نصائح اور اخلاق کا مجموعہ ہوں، جو بات بات پر قرآن مجید کی آیات اور احادیث سے استناد کرتا ہو، جو کفر والحاد سے کوسوں دور ہو، کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص اپنی آخری عمر میں ایک ایسی کتاب لکھ دے جس سے مسلمانوں کے دل کیا دکھیں گویا خود اس کی عاقبت خراب ہو۔ اُمہات الامہ کی بھی وہی مثل ہوئی کہ یاروں نے ایک کو نقطہ لگا کر دس کیا۔ ایناولی غبار اس پہلو سے نکالا۔ ما و شما کو کیا معلوم کہ کتاب میں کیا لکھا ہے؟ عوام نے ثقہ پوشوں سے سُنا، سمجھ گئے۔ دلی کی سرزمین میں مذہبی مباحث کے نشو و نما کی خوب تاثیر ہے۔ شمس العلماء مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی پر کب کفر کا فتویٰ نہیں ہوا جو ان پر نہ ہوتا۔ اگر ان پر کفر کا فتویٰ نہ ہوتا تو میری رائے میں اُن کی نیک نامی، اُن کی عظمت، انکی شہرت میں ایک بڑا نقص رہ جاتا۔ کفر کا فتویٰ بھی ما و شما پر نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایسوں ہی پر ہوتا ہے جن سے لوگ جلتے ہیں اور جلے پھپولے پھوڑتے ہیں۔ جس زمانہ میں اُمہات الامہ کی شورش بپا تھی میں نے بچشم خود سیر خطے اور ہر ناحیۂ ہندوستان سے معززین اور علماء کے صدہا خطوط والد کے نام دیکھے ہیں کہ آپ ہرگز اس کتاب کی اشاعت کو بند نہ کیجیے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بیسیوں بیرسٹروں اور صدہا وکلا نے لکھا کہ اگر در عدالت تک یہ مقدمہ پہونچے گا تو ہم آپ کی طرف سے بلا مزد پیروی کرنے کو موجود ہیں۔ حکام نے بھی اس شورش کو جاہلانہ ولولہ خیال کیا اور مرحوم کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن مرحوم کو شر و فساد بڑھانا منظور نہ تھا۔ انہوں نے چھپی چھپائی کتابیں حکیم اجمل خاں صاحب کے سپرد کر دیں اور انہوں نے جلوا دیں۔

اُمہات الامہ دُنیا کے پردے سے ناپید ہو گئی لیکن پھر بھی ہزارہا اسکے خواہشمند موجود ہیں۔ مخالفین کی شورش نے اسکی قدر بڑھائی۔ ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

مولوی سید علی بلگرامی اگر زندہ رہتے تو لوگ دیکھتے کہ اُمہات الامہ کا انگلش ایڈیشن کھلے خزانے نکلتا۔ مگر ع آن قدح بشکست و آن ساقی نماند.....

اب چونکہ مرحوم ہی دُنیا کے پردے پر نہ رہے مخالفوں کی مخالفتیں بھی سرد ہو گئیں۔ اور اُن کا اصلی مقصود تو اُن کا دل دُکھانا اور اپنا کام اس کی آڑ میں نکالنا تھا"
(مولوی بشیر الدین احمد صاحب مرحوم خلف مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم)

"یہ پادری احمد شاہ صاحب شائق کی کتاب اُمہات المومنین کا جواب تھا۔ اور ایسا دنداں شکن جواب تھا کہ معترضین کے دانت کھٹے کر دیتا مگر افسوس کہ لوگوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ اس کتاب کی آڑ میں کفر والحاد کے فتوے مولانا نذیر احمد کے برخلاف لکھوائے گئے مگر اُن فتووں سے نہ مولوی صاحب کافر بنے اور نہ کفر کی کوئی شرط بدلائل ثابت ہوئی۔ اصل بات کو نہ سمجھے۔ مولوی صاحب کی طرز تحریر کو نہ پرکھا کہ وہ ہمیشہ ناولانہ رنگ میں لکھتے تھے اور اس رو میں حسب موقع جو ٹھیٹ الفاظ مناسب معلوم ہوتے اُن کو نہیں چھوڑتے تھے"
(سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ)

اُمہات الامہ ساقی بک ڈپو کے اہتمام سے زیر طبع ہے۔ اُمہات الامہ پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں اور اُن اعتراضات کے دنداں شکن جوابات جو صاحب "احسن التفاسیر" نے دیئے ہیں (یہ جوابات اب تک کہیں نہیں چھپے) وہ بھی بطور ضمیمہ اس جلد میں شامل ہونگے۔ کتاب کی قیمت نسبتاً بہت کم تجویز کی گئی ہے۔ یعنی صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک۔ آج ہی اپنا نام اس کے خریداروں کی فہرست میں شامل کرا لیجیے تاکہ کتاب شائع ہوتے ہی آپکو بھیجدی جائے۔

المشتہر مہتمم ساقی بک ڈپو دہلی

جُرعات

جلد ۱۱ | ساقی دہلی بابت مارچ ۱۹۳۵ء | نمبر ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

سالنامہ ساقی کے متعلق گذشتہ اشاعت میں اعلان کیا جا چکا ہے کہ دفتر ساقی میں اس کی کوئی کاپی برائے فروخت باقی نہیں ہے مگر کئی حضرات اب بھی مصر ہیں کہ کسی اور کو پرچہ بھیجا جائے یا نہ بھیجا جائے مگر انہیں ایک کاپی سالنامہ کی ضرور بھیجدی جائے۔ ان حضرات کی اطلاع کیلئے لکھا جاتا ہے کہ ساقی نہ تو تجارتی اغراض و مقاصد کے تحت جاری کیا گیا تھا اور نہ اس میں اس قسم کے اعلان شائع کئے جاتے ہیں جنہیں تجارت کو فروغ دینے کا ایک موزوں پیرایہ سمجھا جائے۔ ساقی کے قدردان حضرات کا بڑا کرم ہوگا اگر وہ ادارہ ساقی کے اعلانوں کو اور پرچوں کے اعلانوں کی طرح بے بنیاد قرار نہ دیں۔ یہ واقعہ ہے کہ سالنامہ کا تو ذکر ہی کیا اسوقت فروری کا پرچہ بھی دفتر ساقی سے کسی کو نہیں بھیجا جا سکتا۔ ساقی کی اسقدر مانگ پر ہم جسقدر بھی مسرور ہوں کم ہے مگر یہ امر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس مقبولیت کا سہرا ساقی کے مضمون نگار حضرات کے سر ہے کیونکہ انہی حضرات کی جنبش قلم سے ساقی [illegible] ہے۔ ہماری طرف سے وعدہ ہے کہ ساقی میں نت نئی خوبیوں کا اضافہ ہوتا رہیگا۔ زیر نظر اشاعت میں آپ دیکھیں گے کیسے کیسے پایہ کے مضامین شامل ہیں۔ مولوی عنایت اللہ صاحب کی قیمتی تالیف "نجم السحر" کا ایک باب "فقیر اور بادشاہ" بہترین ترجمہ کا نمونہ ہے۔ پوری کتاب بھی ساقی بکڈپو کے اہتمام سے عنقریب شائع ہوگی۔ سید وقار عظیم نے فنِ افسانہ نگاری پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے جسکے کچھ ابواب مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ "افسانہ اور محبت" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جناب ثاقب کانپوری نے اپنی والدہ کے غم میں جو آنسو بہائے ہیں انہیں شاعری نے خونیں نگینے بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل مرحمت فرمائے۔ چغتائی صاحب کی کتاب فسانہ لولی کا باب "نصب العین" نوجوانوں کیلئے مفید ثابت ہوگا۔ "تین بہنیں" انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اردو میں اس قسم کے افسانے اگر لکھے جائیں تو ایک عمدہ طرز کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہماری زبان میں افسانہ کا موضوع عموماً حسن و عشق ہی ہوتا ہے۔ اس سے بچنے اور نئی نئی باتیں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ "تیمم ہندی اسٹیج" انصار ناصری صاحب نے بہت کاوش سے لکھا ہے۔ ڈرامہ پر اردو میں بہت کم توجہ کی گئی ہے ضرورت ہے کہ اس صنفِ ادب کو بھی دوسرے اصناف کے دوش بدوش لایا جائے۔ انصار صاحب نے ڈرامہ ہی کو اپنا موضوعِ خاص بنالیا ہے اور انکی مساعی مسعود و مشکور ہیں۔ گاٹیر کا افسانہ "ملکہ مصر" اس اشاعت میں ختم ہوتا ہے۔ قریشی صاحب نے اصل کی خوبیوں کو برقرار رکھکر ترجمہ کا حق پوری طرح ادا کیا ہے۔ جناب صادق الخیری نے ایک اچھے افسانے کا اچھا ترجمہ کیا ہے۔ "اردو کا غیر زبانوں سے تعلق" بہت قابلِ قدر مضمون ہے۔ جناب ماہر القادری کو تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھنے میں ید طولیٰ حاصل ہے اور آپکے مضامین وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ مورخ صاحب ایک لائق ایڈیٹر اور قابل مضمون نگار ہیں۔ سقراط پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر مورخ صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے دادِ تحقیق دی ہے۔ افسر الشعراء حضرت آغا شاعر قزلباش نے بھی اکثر بزم ساقی کو رونق بخشی ہے۔ آپکا کلام تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ مسز روپ رانی صاحبہ فلمی دنیا میں شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ اب ادبی دنیا میں بھی اپنے اچھے مضامین کی وجہ سے مشہور ہو چلی ہیں۔ جمنا، جمیل اور نظیر کے رباعیے قارئین ساقی کی ضیافتِ طبع کا باعث ہونگے۔ "نقد و تبصرہ" کے زیر عنوان کتابوں اور رسائل پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ اس باب کا مقصد تنقید ہے اسلئے جو حضرات محض توصیف و تعریف کے متمنی ہوں وہ اپنی مطبوعات ادارہ ساقی کو نہ بھیجیں تو مناسب ہے کیونکہ انہیں مایوسی ہوگی۔

ظریف نمبر:- اپریل میں ساقی کا ظریف نمبر شائع ہوگا۔ یہ خاص نمبر اپنی ہنسانیوالی خصوصیات کی وجہ سے صحافتِ اردو میں اپنا جواب آپ ہوتا ہے جس طرح ساقی کا سالنامہ پچھلے تمام سالناموں سے بازی لیگیا اسی طرح کوشش کی جا رہی ہے کہ اسدفعہ "ظریف نمبر" بھی سابق پرچوں سے بڑھ چڑھکر شائع ہو۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

"نجم السحر" کا ایک باب

فقیر اور بادشاہ

بادشاہ جانیس نے جو مہلت تین دن کی دی تھی آج اُس کا آخری دن ہے۔ اور تیسرا پہر ہے۔ طَیبہ اور آشتی کھڑکی کے پاس بیٹھی جھلملیوں میں سے نیچے صحن کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ صحن میں ایک شامیانے کے نیچے بادشاہ حسبِ معمول اجلاس کر رہا ہے۔ سائلوں کی عرضیاں پڑھ کر ان پر حکم سناتا ہو۔ طَیبہ اور آشتی کی حالت اس وقت نہایت تشویش اور پریشانی کی ہے، کیونکہ مہلت جس قدر دی گئی تھی اسکی مدت ختم ہونے کو ہے۔

طَیبہ بولی "شام ہونے کو ہے اور رات ہوتے ہی جانیس یہاں آئے گا۔ ذرا دیکھو تو اس کھڑکی کی طرف کس طرح بار بار دیکھتا ہے۔ بھوکا شیر بھی گوشت کو ایسی بدنیتی سے نہ دیکھتا ہوگا۔ کیفر کا ابھی تک پتہ نہیں۔ فقیر ہے، خدا جانے کس خیال میں کہاں پڑا پھرتا ہوگا۔ ممکن ہے زندہ نہ ہو۔ بالکل بڈھا کھوسٹ تو تھا ہی کہیں وقت نہ آگیا ہو، یا جو کچھ بھی ہو ابھی تک تو اُس کے آنے کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی اور نہ رب نعمون کو ہمارے حال زار پر اب کوئی توجہ ہے۔ دعائیں بہت مانگ چکی ہوں مگر اب تک کبھی قبول نہیں ہوئی۔ افسوس سب ہی نے ہم کو چھوڑ دیا۔ آشتی تم ہی بتاؤ دنیا بھر کی عقل دی ہے، بتاؤ اب کیا کیا جائے؟"

آشتی "خداوند پر بھروسہ رکھو۔ ابھی سورج ڈوبنے میں تین گھنٹے باقی ہیں۔ خدا وقت کی قید سے آزاد ہیں۔ ان تین گھنٹوں میں چاہیں تو ساری دنیا کو مٹا کر دوسری پیدا کر دیں۔ یاد کرو کہ جب منوف کے شہر میں اس بلند دروازے کے برج میں ہم دونوں فاقوں کی مصیبت میں مبتلا تھے تو اس بری حالت سے تم کو کس نے نجات دی تھی۔ وہ اونچے دریچے سے دریا میں کودنا، پھر رب نعم کے جہاز میں سفر کرنا جس کی ناخدائی خود آقائے رب رع نے اختیار کی تھی، کیوں بھولی جاتی ہو۔ سب باتیں یاد کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو۔"

طَیبہ "مجھکو خدا پر بھروسہ ہے لیکن کیا کروں، کچھ دل بیٹھا سا جاتا ہے۔ اچھا اس گفتگو کو جانے دو کچھ اور باتیں کرو۔ معلوم نہیں جب ہم منوف سے نکلے اور نکلے بھی عجیب کیفیت سے تو پھر وہاں کیا گذری۔ آشتی تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا وہ میری آتشیں مزاج ہمزاد اب تک وہاں ملکہ بنی حکومت کر رہی ہے اور بظاہر توران اس کا شوہر ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو توران کے حال پر افسوس کرنا چاہیے۔ اس ہمزاد کی آنکھوں میں خدا جانے کیا چیز تھی کہ جب وہ میری طرف دیکھتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ رگوں میں خون بہتے بہتے تھم گیا ہے۔ مگر آشتی تم ہی تو کہا کرتی ہو کہ یہ ہمزاد میری ہستی کا ایک جزو ہے اور وہ کوئی ایسی روح ہے جو فنا نہیں ہو سکتی اور رہنے کیلئے اس کو میرا ہی قالب ملا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ میری پیدائش کے وقت سے اُسے میرے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ آشتی جی تو چاہتا ہے کہ ایک ہمزاد اور بھی ہوتی جس کو تم اس وقت طلب کر کے اس بدبخت جانیس کے پنجۂ غضب سے مجھے رہا کرا دیتیں۔ ذرا صحن کی طرف تو دیکھو۔ مقدمے کی پیشی ختم ہو چکی ہے۔ وزیر دربار بادشاہ کے کان میں کچھ کہتا ہے اور بادشاہ اب مقدمے ... کو ہے۔ وزیر آہستہ بات کرتا ہے مگر اس کی آواز کچھ یہاں تک آتی ہے۔ جانیس کا دل یہاں ہے ... کھڑکی کی طرف

ڈرانا چاہتی ہے کہ نظر سے بچ رہی جس کی جھلملیوں کے پار ہو کر تن بدن پھونکے ڈالتی ہے۔ اشتی دیکھو اب وہ اُٹھنے کو ہے۔ ہیں! یہ کون ہے۔ اشتی ذرا غور سے دیکھ تو صحن میں یہ عجیب صورت کس کی ہے؟"

اشتی نے اُٹھ کر جھانکا تو دیکھا کہ صحن کے دروازے سے اندر داخل ہو کر ایک بڑے لمبے قد کا آدمی سفید ڈاڑھی، زرد چہرہ آنکھیں کچھ اندر کو دھنسی سی، عمر بہت زیادہ، پھٹے پرانے کپڑے پہنے، ایک موٹی سی لکڑی ہاتھ میں لئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے، دھوپ سے آنکھیں کچھ چندھیا سی گئی ہیں۔ پہرے کے سپاہی دوڑے کہ اسے مار کر باہر نکالیں۔ بڈھے نے انہیں دیکھتے ہی اپنا عصا ان کی طرف اُٹھایا اور وہ سب کے سب دفعتاً رک کر اس طرح پیچھے ہٹے کہ گویا اس عصا میں کوئی برقی قوت بھری تھی۔ اب بڈھے نے [illegible] کی طرح [illegible] نکال ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا یہاں تک کہ بادشاہ کے چمکتے تخت اور خود بادشاہ پر اس کی نظر پڑی جھٹ دو بار لمبی ڈگیں بھر بادشاہ کے قریب پہونچا اور اپنے عصا کے سہارے کھڑا ہو گیا۔

جانمیں نے برہم ہو کر کہا "یہ کون آدمی ہے بڑا بدتمیز ہے ہماری حضوری کے آداب تک نہیں بجا لایا"

تماشا کیف نے کہا "آہا اب پوری ... کیا تو بادشاہ ہے [illegible] تجھے [illegible] کم ... تب خیر بتا کہ تو بھی میری ہی طرح انسان ہے فرق اتنا ہے کہ تو بہت چمکتے ہوئے کپڑے پہنتا ہے اور میں پھٹے پرانے پہنے ہوں۔ ذرا بتا تو بادشاہ ہونے میں اور بادشاہ ہو کر خدا کی مخلوق کو پامال کرنے میں کیا بات نکلی۔ کیا بادشاہ ہو کر تو ایک معمولی انسان کی طرح دنیا کے رنج و الم، امید و بیم، خوشیوں اور موت کے ڈر سے آزاد ہو گیا۔ کیا [illegible] جیسا میرا ان [illegible] سے۔ کیا دنیا کے سانحات جو گذر چکے ہیں، [illegible] کیا یاد ہو ... تجھے [illegible] ... یا مایوسی اور ناامیدی کی سوزش تیرے دل کو محسوس نہیں ہوتی؟"

جانمیں نے [illegible] سے منہ پھیر کر کہا "یہاں [illegible] بیٹھا ہوں سپاہیو! اس پاگل کو باہر نکال دو ہمیں اور کام بھی ہیں"

سپاہی بادشاہ کا حکم سنتے ہی بڈھے پر جھپٹے مگر بڈھے نے پھر اپنا عصا ان کی طرف اُٹھایا اور وہ سب جہاں کے تہاں رہ گئے۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ فقیر کا عصا نہیں ہے بلکہ ایک بہت قوی ہاتھ ہے جو ان کو فوراً روک دیتا ہے۔

[illegible] بادشاہ اور یہ بات کہ تجھے اور کسی کو [illegible] سلطنت کے کام تو وہ ہوں گے نہیں شاید ان لوگوں سے کام ہو جو [illegible] رہتے ہیں" یہ کہہ کر کیف نے بالا خانے کی کھڑکی اور اس کی جھلملیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "سورج ڈوبنے میں ابھی تین گھنٹے باقی ہیں اور یہ اتنا وقت ہے کہ تجھ سے دنیا [illegible] کام [illegible] تجھ سے وہ تجھے اس نوجوان [illegible] سے جدا کر رہی ہے"

جانمیں نے چلا کر کہا "ارے بڈھے بدمعاش! تجھے اس سے کیا کہ ادھر کون رہتا ہے اور تجھے اس سے کیا کام ہے"

کیف "مجھے دونوں باتوں سے بہت تعلق ہے کیونکہ میں اس لڑکی کا باپ ہوں۔ [illegible] احوال سناؤں"

جانمیں "تو لڑکی کا باپ ہے۔ واہ رے بڈھے! تو تو کوئی بڑا پکا شیطان معلوم ہوتا ہے"

کیف "ہاں میں اس کا باپ ہوں [illegible] یہ کہتا ہوں کہ ہمارا خاندان شرافت [illegible] میں تیرے گھرانے سے زیادہ بزرگ

اور افضل ہو میں تجھے دامادی میں قبول کرنا نہیں چاہتا۔ اور نہ میری بیٹی تجھے اپنا شوہر بنانا پسند کرتی ہے۔"

بادشاہ کے قریب جس قدر درباری سامنے تھے وہ یہ گفتگو سُن کر بے اختیار ہنس پڑے۔ لیکن جانئیس نہ ہنسا۔ اُس کا سیاہ چہرہ غصہ سے نیلا پڑ گیا۔ اور دم چڑھ گیا۔ بہت زور سے چیخ کر بولا۔

"اس گستاخ اور دیوانے کو یہاں سے گھسیٹ کر باہر کیوں نہیں نکالا جاتا۔ اسے نکالو اور فوراً تالو سے اسکی زبان کھینچ لو کہ پھر کوئی حرف گستاخی کا اسکی زبان سے نہ نکلے"

سپاہی پھر لپکے۔ بڑھتے تک بھی نہ تھے کہ اُس نے ڈانٹا۔ آواز میں ڈپٹ اس بلا کی تھی کہ کوئی سپاہی ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا۔ ہاتھ لگانا تو درکنار۔

کیفر نے حاضرین کی طرف رُخ کر کے کہا "تانات کے لوگو ٹھہرو۔ جو تم نے مجھ پر انگلی تک اُٹھائی۔ تم نہیں جانتے کہ ان پھٹے پرانے کپڑوں میں کون تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ جانئیس تو اپنے تئیں بادشاہ سمجھتا ہے اب ایک اور بادشاہ کا حکم سُن جو تجھ سے بھی بڑا ہے اور جس کا تخت اس چمکتے سورج سے بھی اوپر فلک الافلاک پر قائم ہے۔ سُن لے۔ وہ حکم یہ ہے کہ رات ہونے سے پہلے اس نوجوان لڑکی کو جس سے تو زبردستی شادی کرنی چاہتا ہے اور اس ضعیفہ کو جو اس لڑکی کے ساتھ ہے مع اُن کے تمام مال و اسباب کے اس شہر کے جنوبی دروازے سے باہر پہونچا دے۔ اور وہاں بغیر کسی قسم کا گزند یا نقصان پہونچائے اُن کو چھوڑ دے۔ یہ حکم ہے اس بادشاہ کا جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور جس کا تخت آسمانوں میں سب سے اونچے آسمان پر ہے"

جانئیس نے کہا "اور جو میں نے اس بادشاہ کے حکم کو کچھ نہ سمجھا تو پھر کیا؟"

کیفر "نہیں اس کے حکم کو ہیچ نہ سمجھ اور اس تصویر کا مضمون یاد کر جو آتش نے حوض کے پانی میں تجھے دکھائی تھی"

جانئیس "وہ تصویر تو مصر کی ایک کُٹنی کا محض شعبدہ تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ بڈھے تو بھی اس فریب میں شریک تھا۔ بس دور ہو یہاں سے۔ میں تجھ کو اور تیرے جادو اور طلسم کو اور جس بادشاہ کا تو نے ابھی ذکر کیا بالکل ذلیل اور ہیچ سمجھتا ہوں۔ اور تیری جوان لڑکی آج رات کو میری جورو بنے گی"

کیفر "اگر یہی ہے تو پھر جانئیس تانات کے بادشاہ وہ حال بھی سُن لے جو تجھ پر گزرنے والا ہے۔ اور جس کی خبر دینے کیلئے میں تیرے پاس بھیجا گیا ہوں۔ آج رات کو تیرے یہاں ایک دوسری دلہن ہوگی۔ اس دلہن کا نام موت ہے۔ تیری رعایا میں سے بھی بہت لوگ موت کی ظلمت میں تیرے ہمرکاب ہونگے۔ کیونکہ اُن کے گناہ حد سے گزر گئے ہیں۔ اور خداوند کی پرستش اُنھوں نے ترک کر دی ہے۔ اور کل صبح ہوتے ہوتے کوئی دوسرا آدمی جو تیرے زمانہ میں نکما تھا اس شہر پر حکومت کرتا ہوگا"

اتنا کہہ کر کیفر خاموش ہوا۔ اور بادشاہ کی طرف سے پیٹھ پھیر کر صحن سے گزرتا ہوا دروازے سے باہر آیا۔ کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ اس کی طرف بڑھتا یا اُس پر ہاتھ ڈالتا۔ اس وقت کیفر کے چہرے پر ایسی جلالی شان برس رہی تھی کہ اُس کے رعب سے سب لوگوں کے تن بدن کی طاقت سلب ہو گئی۔

جب کیفر دروازے سے باہر آیا تو یہ سحری کیفیت لوگوں پر سے دور ہوئی۔ اور بادشاہ جانئیس نے للکار کر کہا۔

"اس جادوگر کو دوڑ کر پکڑو۔ اور میرے سامنے لاکر قتل کرو" بادشاہ کا حکم سُنتے ہی کیفر کو گرفتار کرنے کیلئے سپاہی اس طرح

دوڑے جیسے گردن سے زنجیر کے نکلتے ہی شکاری کتے شکار پر جھپٹتے ہوں۔

لیکن جب محل سے باہر نکلے تو کنیز کا پتہ نہ تھا۔ کہیں کسی عورت نے کہا کہ میں نے یہاں دیکھا تھا۔ کہیں کسی بچے نے کہا میں نے وہاں دیکھا تھا۔ چند غلام رستے میں ملے انہوں نے بتایا کہ فلاں مقام سے گذرتا ہوا ہمیں نظر آیا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مگر اس کی پرچھائیں نہ پڑتی تھی۔ پوچھتے پوچھتے آخر کار اتنا معلوم ہوا کہ شہر کے جنوبی دروازے کی طرف ایک بڈھا جاتا دکھائی دیا تھا۔ سپاہی سب اُدھر دوڑے۔ دروازے پر پہرے والوں سے دریافت کیا۔ انہوں نے کہا ہاں جب ہم دروازہ بند کرتے تھے تو ایک لمبا سا فقیر نکل کر باہر گیا تھا مگر اس وقت ایک بگولا اٹھا اور اس کے غبار میں وہ غائب ہو گیا۔ سپاہی اتنا پتہ سنکر شہر کے دروازے سے باہر تلاش کرنے لگے۔ لیکن آندھی سے ریت اُڑ اُڑ کر فقیر کا پتہ چلنا تو درکنار ڈھونڈھنے والوں کو خود اپنا حال معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں۔ غرض اس طرح بڑی دیر تک سرگرداں رہنے کے بعد سورج ڈوبنے سے کچھ پہلے یہ سپاہی مایوس ہو کر ایک ایک کر کے محل کو واپس آئے۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو حکم ہوا کہ ان نابکاروں کو ڈنڈوں سے خوب پیٹا جائے۔

اب اندھیرا ہو چلا۔ وقت معین پر جانیس ظلم پر آمادہ طیبہ اور آشتی کے کمرے میں داخل ہوا۔ خواجہ سرا جو ساتھ تھے دروازے کے باہر کھڑے رہے۔ کمرے میں خوب روشنی تھی۔ کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں۔ باہر آندھی بڑی بڑی مہیب آوازوں کے ساتھ تیزی سے چلنے لگی۔ ریت کے ذروں نے ہوا کو بالکل تاریک کر دیا۔ کمرے کے بیچ میں حوض کے ایک کنارے پہلے کی طرح طیبہ اور آشتی خاموش کھڑی تھیں دیکھئے کیا پیش آتا ہے۔

جانیس نے طیبہ سے مخاطب ہو کر کہا "اب فرمائیے۔ مہلت ختم ہوئی جو کچھ جواب دینا ہو دیجئے"۔

طیبہ نے کہا "بادشاہ جو کچھ میں کہتی ہوں وہ سُن لیجئے جتنا آپ مجھے دیکھتے ہیں اس سے میں کہیں زیادہ ہوں۔ میرے مربی اور سرپرست اس روئے زمین پر ہی نہیں بلکہ طبقہ ہوا میں بھی موجود ہیں چنانچہ ان میں سے ایک کل ہی آپ سے ملاقات کر چکا ہے۔ آپ اپنے اس جنون کو دور کیجئے اور مجھکو میرے حال پر چھوڑئیے۔ میں آپ کی بھلائی چاہتی ہوں بُرائی نہیں چاہتی۔ لیکن اگر میرے قریب آئے اور مجھے انگلی بھی لگائی تو سمجھ لیجئے کہ مصائب و آفات کا ایک طوفان آپ کے سر پر ٹوٹ پڑیگا۔ اور ممکن ہے کہ میں اپنے ہی ہاتھ سے آپ کو ہلاک کر دوں"۔

جانیس نے نہایت بے دردی سے کہا "بس دھمکیاں ہو چکیں۔ ہاں یا نہ، جو کچھ جواب دینا ہو صاف کہو"۔

طیبہ نے کہا "بادشاہ، یہ آخری بار آپ کو سمجھاتی ہوں کہ آپ میرے قصد سے باز رہیں۔ آپ کا خیال ہوگا کہ میں اپنی بلا ٹالنے کو جھوٹ بول رہی ہوں لیکن ایسا نہیں ہے میرا مقصود آپ کی سلامتی ہے۔ دیکھئے" اور یہ کہکر طیبہ نے چہرے سے نقاب ہٹا دی اور گلوبند کھول کر گلے کے نیچے جو پیدائشی نشان تھا دکھا کر کہا "دیکھئے میری جلد پر یہ نقش خدا کی طرف سے ہے کیا آپ کی غیرت قبول کرتی ہے کہ جس عورت کے سینے پر یہ متبرک نقش ہو اس کی عصمت میں خلل ڈالیں"۔

جانیس طیبہ کے گلے اور سینے کو کھلا دیکھکر اور بھی دیوانہ ہو گیا۔ اور کہنے لگا "ہاں میں نے بھی سنا تھا کہ طیبی میں ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کے سینے پر اب تک ایک ایسا ہی نشان موجود ہے اور اس لڑکی کا باپ بھی کوئی غریب انسان ہے۔ مگر طیبی کی اس عورت کا یہاں آنا کیونکر ممکن ہے کیونکہ ایک تو اب بھی وہ کہیں عورت اس وقت مصر میں بادشاہی کر رہی ہے"۔

طیبہ نے کہا "اے بادشاہ! آپ کے ملک میں جو لوگ غیب کے حالات معلوم کر سکتے ہیں اُن سے اس معمہ کو حل کرائیے، اور یہ بھی جان لیجئے کہ افواہ ہمیشہ غلط نہیں ہوتی اور اس عجیب انسان کی بیٹی دور کو نہ کیجئے۔"

جانمیں نے کہا "لیکن ایک اور آدمی بھی تو ہے جس کو تمہارے باپ ہونے کا دعویٰ ہے۔ یہ ایک بہت ہی زردہ حال بڈھا فقیر ہے۔ اگر میرے سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا ہے تو اب تک اسے مار مار کر ختم بھی کر دیا ہوگا۔"

اس پر اشتی نے بڑے جوش سے کہا "وہ فقیر نہ آپ کے سپاہیوں کو مل سکتا ہے اور نہ کوئی اسے ہاتھ لگا سکتا ہے۔"

جانمیں نے اشتی کی بات کی طرف توجہ نہیں کی اور طیبہ سے کہنے لگا "خیر یہ جو کچھ ہو۔ چاہے تمہارا باپ فقیر ہو یا کسی عجیب انسان کے بھیس میں کوئی خدا ہو اور خواہ عشق کی دیوی خاص بہ نفس نفیس آسمان سے اتر کر دنیا میں قتل و غارت شروع کر دے مگر میں اپنے ارادے میں اٹل ہوں۔ آپ کو اپنا بنا کر رکھونگا۔ چاہے آپ خوشی اور رضامندی سے میری ملکہ بنیں اور چاہے یہ گوارا کریں کہ میری خواصیں یہاں آئیں اور اس بڑھیا چڑیل کو تو اس حوض میں ڈبو دیں اور آپ کو گھسیٹتی ہوئی میرے محل میں پہنچا دیں۔"

طیبہ نے جانمیں کی گفتگو کا کچھ جواب نہیں دیا۔ نقاب منہ پر ڈال لی۔ اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھکر خاموش کھڑی رہی لیکن اشتی نے نہایت حقارت سے اس قدر بلند آواز میں کہ آندھی اور طوفان کے شور میں بھی وہ صاف سنائی دیتی تھی، کہا "بیشک! اپنی خواصوں کو فوراً بلوا لیجئے۔ مگر اس قدر اجازت دیجئے کہ میرا حلق خشک ہے اور جس حوض میں ڈبونے کا آپ نے وعدہ فرمایا ہے بیحد تمنا ہے کہ اس کے پانی سے اپنا حلق تر کروں۔"

جانمیں یہ جملہ سنکر آگ ہوگیا اور زور سے آواز دی:

"غلامو، ادھر آؤ، اور جو حکم دے چکا ہوں اسے بجالاؤ"

جونہیں زبان سے یہ الفاظ نکلے دروازہ بڑے زور سے کھلا اور کیفر صحرا کا آوارہ گرد فقیر پھٹے پرانے کپڑے نہیں بلکہ ایک سپید چغا پہنے سر پر عمامہ رکھے آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے نہایت وحشی صورت کے سیاہ فام حبشی سردار لمبی ڈاڑھیاں، گول گول آنکھیں، گلے میں سونے کی موٹی موٹی زنجیریں پہنے جو فولادی زرہ سے ٹکرا کر جھنکتی تھیں خون میں ننگی ہوئی تلواریں علم کئے، کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ صحرا کے زبردست جنگجو تھے جن کے دل میں نہ خوف تھا نہ رحم۔

جانمیں نے ان لوگوں کو دیکھا اور سمجھ گیا۔ تلوار سونت لی اور کچھ دیر تک اسی تذبذب میں رہا کہ وار کرے یا نہ کرے۔ اتنے عرصے میں ان حبشی سرداروں نے اسکے گرد حلقہ باندھ لیا اور کیفر کی صورت دیکھنے لگے کہ کیا حکم ہے۔

طیبہ نے کیفر سے کہا "بابا اگر ممکن ہو تو جانمیں کی جان بچا دیجئے۔ عشق نے اسکے دماغ میں خلل پیدا کر دیا ہے۔"

کیفر نے جواب دیا "وقت نکل چکا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ خداؤں کے حکموں اور اشاروں کو ہیچ سمجھتے ہیں اُن پر خداؤں کا قہر نازل ہوتا ہے۔ جانمیں تو ایک کمزور اور ناتوان عورت کی آبروریزی کرنی چاہتا تھا۔ دیکھ تیرا شاہی محل کیسا دھڑا دھڑ جل رہا ہے۔ تیرا شہر میرے قبضہ میں ہے اور جو چند آدمی تیرے مددگار تھے وہ سب قتل ہو چکے ہیں۔ جانمیں کل صبح دوسرا بادشاہ تیرے تخت پر بیٹھا ہوگا۔ خداؤں کے سرتاج عمون نے تیری قسمت کا یونہیں فیصلہ کیا ہے۔"

کیفر نے طیبہ اور اشتی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دونوں اسکے پیچھے چلیں اور جانمیں کو اس حال میں چھوڑ کر سیاہ فام صورت کے

جنگی تلواریں علم کئے اس کے گرد کھڑے ہیں۔

میز نیس نے طیبہ کو جاتے ہوئے دیکھ کر کہا "اے حسینہ، جاتی تو ہو مگر اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ بادشاہ تاتت اگر چاہتا تو اپنی جان بچا لیتا مگر تمہارے عشق میں اس نے مرنا ہی گوارا کیا۔"

طیبہ اور آشتی سنتی ہوئی آگے بڑھیں اور پھر انہوں نے جانیس کی طرف نہ دیکھا۔

کیف خواجہ سرا ان کو لے کر عالیشان کمرے کے دروازے سے نکل کر جہاں جانیس کے سپاہی اور خواجہ سرا قتل ہوئے پڑے تھے وہ زینہ سے نیچے اتریں۔ اور محل کے بلند دروازوں میں سے نکل کر باہر آئیں۔ یہاں بھی بادشاہ کے بہت سے فوجی سرداروں کی لاشیں نظر آئیں۔ محل کی طرف مڑ کر دیکھا تو اس میں آگ لگی ہوئی تھی۔ محل کے دروازے کے سامنے ایک بڑا سنگین چوک تھا۔ یہاں کیفر نے دونوں عورتوں کو پالکیوں میں سوار کرایا اور اب کہاروں نے پالکیاں اٹھا کر چلنا شروع کیا۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔

پالکیاں تمام رات چلا کیں۔ طیبہ اور آشتی کبھی سوتی رہیں کبھی جاگتی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ کہار ٹھہرے، دونوں عورتیں پالکیوں سے اتریں، اس وقت معلوم ہوا کہ صحرا کے ایک نخلستان میں آ پہنچے ہیں۔ اور یہاں پالکیاں رکھی گئی ہیں۔ ان کے گرد صحرائیوں کی ایک بڑی فوج کھڑی ہے۔ تاتت کی اب کوئی چیز ان عورتوں کو نظر نہ آتی تھی۔ یہ شہر ایک خواب پریشاں کی طرح ان کے حافظہ سے محو ہو گیا۔ اور نہ کسی کی زبان سے پھر کبھی انہوں نے اس شہر کا یا اس کے بادشاہ کا ذکر سنا۔

نخلستان میں ایک طرف کو ایک خیمہ لگا ہوا تھا۔ اس میں طیبہ اور آشتی اتریں۔ اور چونکہ بے حد خستہ تھیں، دونوں ایسی پڑ کر سوئیں کہ دوسرے دن صبح کو اٹھیں۔ اٹھتے ہی منہ ہاتھ دھویا اور کچھ ناشتہ کر کے خیمے کے باہر آئیں۔ یہاں دیکھا کہ کھجوروں کی چھاؤں میں کیفر ان کا منتظر کھڑا ہے اور اس کے قریب صحرا کے چند بدصورت مگر راوستہ کے مضبوط قوی ہیکل سردار موجود ہیں۔ طیبہ اور آشتی کو ان سرداروں نے جھک کر سلام کیا۔

کیفر نے اب دونوں عورتوں سے خطاب کیا "خاتون نفرطی اور خاتون آشتی اب مجھے تم سے رخصت ہونا ضروری ہے۔ میرا کام جو کچھ تھا وہ ختم ہوا۔ مجھے یہاں سے کہیں بہت دور جا کر مانگ کر پیٹ بھرنا ہے۔ لیکن تم دل میں کچھ خوف نہ رکھو۔ یہ سردار صحرا کے بڑے بڑے نامی رئیس ہیں مگر تمہارے خادم ہیں اور دنیا میں پیدا ہی اس لئے ہوئے تھے کہ اس سفر دور دراز میں تمہاری مدد کریں۔" اتنا کہہ کر کیفر نے ان سرداروں سے کہا "جو کچھ حکم تمہیں ملا ہے اسے بیان کرو۔"

سرداروں کے افسر نے کہا:

"اے دشت و صحرا کے پریشان آوارہ گرد۔ تو وہ ذات اقدس ہے جس کو ہم اور ہمارے باپ دادا دیکھتے چلے آئے ہیں بلکہ ہمارے باپ دادا کے بھی باپ دادا تجھے بچشم خود ان بیابانوں میں سرگشتہ دیکھ چکے ہیں۔ تو ہماری قوموں اور نسلوں کا محافظ اور نگہبان ہے۔ تیرے ہی بھروسے پر ہم جیتے ہیں اور تیری ہی بدولت ہم لڑائیوں میں فتح پاتے ہیں۔ اب تیرا حکم یہ ہے کہ ہم سب لوگ اس خاتون عالی نسب اور اس کی رفیقہ کے اس سفر میں جو چھ ماہ میں تمام ہوگا اور جس میں بڑے بڑے پہاڑ اور جنگل طے کرنے ہوں گے خدمت گذار رہیں۔ یہاں تک کہ ان کو شہر زریں کے دروازے تک پہنچا دیں۔ وہاں پہنچتے ہی ہماری خدمات ختم ہو جائیں گی پس

جب تک ایک متنفس بھی ہم میں زندہ رہے گا ان مستورات عفت مآب کی اطاعت اور فرمانبرداری ہمارا سب سے بڑا فرض ہوگا۔"

کیفر نے قلیہ سے کہا "تم نے سن لیا [illegible] ان پر پورا اعتماد رکھو۔ دن میں امن و عافیت سے چلتی رہو اور رات کو خیر و سلامتی سے آرام کرو اور اس کا یقین رکھو کہ یہ لوگ کبھی تمہارے حکم سے باہر نہ ہوں گے لیکن اتفاق سے اگر ایسا ہو یا کسی اور وجہ سے تمہیں تکلیف پہونچی تو پھر جس طرح جانور کے [illegible] میرا نام لیا تھا [illegible] پھر میرا نام لینا اور مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی تمہاری مدد کو فوراً حاضر ہو جائے گا۔ [illegible] کے باپ دادا مجھے جانتے پہچانتے [illegible] رخصت ہوتے ہیں اور ان کی قوموں اور نسلوں سے [illegible] یہ بڑی عزت اور حشمت والی خاتون ہے جو تمہارے سپرد کی گئی ہے۔ اس کی حفاظت اور خدمت [illegible] حفاظت اور خدمت کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے۔ اور جب یہ مدت ختم ہو جائے تو واپسی پر مجھے اطلاع دینا۔ [illegible]

یہ کہہ کر [illegible] سواروں کی صفوں میں پہونچا۔ سواروں نے اپنے اونٹوں کو للکارا جس قدر اونٹ تھے اگلے دونوں [illegible] ٹیک کیفر کو سلامی دینے لگے۔ اس کے بعد یہ پیر جہاں گرد ایک پہاڑی کی چوٹی پر اس طرح نظر آیا کہ [illegible] پھر ایسا غائب ہوا کہ کسی نے نہ دیکھا۔

صحرائیوں کے سردار سے آشتی نے پوچھا "یہ [illegible] کون ہیں جن کا حکم سنتے ہی تمام دشت و جبل سے قوموں کی قومیں حاضر ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی جنبش [illegible] ہزاروں میں غارت ہو جاتے ہیں؟"

سردار نے جواب دیا "یہ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ کون ہیں لیکن جب سے دنیا شروع ہوئی ہے یہ ان صحراؤں کے اور جس قدر قومیں ان میں آباد ہیں ان کے مالک ہیں۔ انہی کے حکم [illegible] طوفان [illegible] اٹھتے ہیں۔ اور ان ہی کے ایک اشارے پر ریگ خشک سے آب شیریں کے چشمے جاری ہو جاتے۔ ان ہی کے حکم سے قومیں پھولتی پھلتی ہیں اور انہی کے حکم سے ایسی غارت ہو جاتی ہیں کہ نام و نشان تک نہیں رہتا۔ تم لوگ سمجھتے ہو [illegible] انسان نہیں بلکہ روح ہیں جن کی قدرت میں ہے کہ جہاں چاہتے پہونچ جائے اور جس کو یہ خدمت ملی ہے کہ آسمان سے [illegible] اس دنیا میں بجا لائے۔ گو ہم اس مرد سال خوردہ کو شاذ و نادر دیکھتے ہیں لیکن [illegible] وہ اطاعت و فرمانبرداری اسی طرح کرتے ہیں جیسے کہ ہم کرتے ہیں لیکن غضب آجاتا [illegible] لوگوں [illegible] کی قوت اور اختیارات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی پیش آچکا ہے۔ اور نہیں جانتے کہ ان [illegible] زار پوشیدہ ہے اس میں کس بلا کی طاقت ہے۔"

آشتی نے جواب دیا "سردار میں آپ کی شکر گذار ہوں۔ واقعی میرا خیال بھی یہی ہے کہ یہ پیر مرد صحرا گرد کوئی انسان نہیں ہیں بلکہ کسی کی روح ہیں اور روح بھی ایک ایسے صاحب [illegible] جن کا نام نہیں لے سکتی۔" اس کے بعد آشتی نے تمام سرداروں کو متوجہ کر کے کہا کہ "میری [illegible] خاتون [illegible] کی طرف کوچ کرنے کو تیار ہیں جس سمت اور راستے سے آپ مناسب سمجھیں سفر کریں۔"

اب دن پر دن ہفتوں پر ہفتے مہینوں پر مہینے گذرتے چلے جاتے ہیں اور یہ قافلہ کبھی جنوب کی سمت میں اور کبھی مغرب کی سمت میں صحرا کو طے کرتا ہوا [illegible] اونٹوں پر سوار ہیں۔ ایک موقع پر پہاڑوں کی

ایک گھاٹی سے گذرے یہاں راستہ نہایت دشوار تھا۔ پہاڑی لوگوں نے قافلے پر حملہ کیا مگر وہ سب مار کر بھگا دیے گئے۔ اسی طرح ایک مقام پر صحرا کے بعض قبیلوں سے بڑی معرکہ آرائی ہوئی۔ ان لوگوں نے کہیں سن لیا تھا کہ اس قافلے میں ایک دیوی جا رہی ہے پس اس شوق میں کہ اس کو گرفتار کر کے کسی طرح اپنی قوم میں اس کی پرستش جاری کریں انہوں نے قافلے پر شدید حملہ کیا جس وقت لڑائی میں گھمسان ہوا تو طیبہ خود گھوڑے پر سوار ہوئی اور سواروں کے آگے ہو کر دشمن سے لڑنے لگی۔ دشمن نے یہ دیکھکر کہ ایک عورت سپید لباس پہنے اُن کے مقابلے پر آئی ہے راہ فرار اختیار کی اور میدان میں اپنے بہت سے مقتول چھوڑ کر پسپا ہوا۔ ایک مرتبہ پورے دو مہینے تک ایک نخلستان میں قیام کرنا پڑا۔ انتظار یہ تھا کہ بارش ہو جائے تو آگے بڑھیں کیونکہ آگے جس ملک میں سے گذرنا تھا وہاں پانی مطلق نہ تھا۔ آخر کار بارش ہوئی اور قافلہ کئی مہینوں کو طے کر گئے جن کا سلسلہ کہیں ختم ہوتا معلوم نہ ہوتا تھا بدشواری تمام ایک رات ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہونچا اور یہاں سب نے ڈیرے ڈالدیے۔

رات گذرنے پر جب سپیدۂ سحر ظاہر ہوا تو طیبہ اور آشتی اپنے خیمے سے باہر نکلیں اور دیکھا کہ ایک بڑے دریا کے کنارے جسے انہوں نے فوراً پہچان لیا کہ رود نیل ہے، شہر نباطیہ یعنی نیل شہر کے اہرام و عالیشان محل سامنے نظر آ رہے ہیں۔ فوراً دونوں نے خدا کا شکر کیا کہ اس نے آخر کار بخیر و سلامتی انہیں منزل مقصود تک پہونچا دیا۔

آفتاب طلوع ہوتے ہوتے صبح کی روشنی میں شہر کی شان و شوکت دیکھ رہی تھیں کہ قافلہ سالار حاضر ہوا اور آداب بجا لا کر یہ عرض کرنے لگا:

"اے خاتون والا! سب خواہ آپ انسان ہیں یا آسمان کی دیوی یا معبود، گوش گذار ہو کہ صحرا کے بادشاہ کیخسرو جہاں گرد نے جو حکم ہم کو دیا تھا اس کی تعمیل ختم ہوئی۔ آپ یہاں سے نیچے نباطیہ کا شہر آباد ہے۔ مہینوں کے تھکے سفر کے بعد یہ منزل طے ہوئی ہے لیکن ہم لوگ اس شہر کی دیواروں کے قریب نہیں جا سکتے کیونکہ ہماری قوم میں یہ سخت بدشگونی ہے۔ یہ قصہ چلی آتی ہے کہ ہونے والی لڑائی کے موقع کے ہم شہر کی چار دیواری میں داخل نہ ہونگے۔ پس اے خاتون ہمارا کام ختم ہوا۔ ہماری فوج کے جوان اب اپنے اپنے گھروں کو واپس جانا چاہتے ہیں جہاں ان کے بال بچے ان کی راہ دیکھتے ہیں۔ اب واپسی کی اجازت ہو کیونکہ اس وقت یہ خوف ہے کہ نباطیہ کے لوگ ہم کو دشمن سمجھکر شہر سے نکلیں اور ہم پر حملہ کر دیں۔"

طیبہ نے جواب دیا کہ "تمہارا کہنا بالکل درست ہے۔ تم نے ہم پر بڑا احسان کیا۔ خدا تم کو اس خدمت کا صلہ دے۔ اب ہمیں چھوڑ کر تم سب اپنے اپنے وطن کو واپس جاؤ لیکن جانے سے پہلے میں تم کو کچھ انعام دینا چاہتی ہوں اسے قبول کرو۔"

یہ کہکر طیبہ نے جسقدر سیم و زر اور جواہرات کے شہر میں موتی اس کی تجارت سے جمع کیا تھا اور یہ ایک کثیر رقم تھی، قافلہ سالار کو دیا کہ اس کو اپنے لوگوں میں حصہ رسد تقسیم کر دے۔ تھوڑا سا ... بطور یادگار لئے اور باقی تمام دولت ان صحرائیوں کو انعام میں دیدی۔ صحرا کے کل رئیس جو قافلے کے ساتھ تھے طیبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر انعام کے شکریہ میں آداب بجا لائے۔ اس کے بعد صبح کے سہانے وقت میں کہ شبنم کا غبار ابھی زمین پر چھایا ہوا تھا سیاہ فام لوگوں کا یہ گروہ جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی روانہ ہوا اور روانہ ہوتے ہی تھوڑی دیر میں پیچھے دور گرد کا ایک ستون سا اٹھا کہ اس میں چھپکر یہ لوگ پھر کسی کو نظر نہ آئے۔

طیبہ اور آشتی نے اپنے محلوں پر سے ان لوگوں کو جاتے اس طرح دیکھا جیسے نیند میں کوئی خواب دیکھے۔ دونوں بالکل

خاموش تھیں۔ اُمید وحیرت نے لبوں پر مُہریں لگا رکھی تھیں۔ آخر کار سر سے پاؤں تک ... وہ پہاڑی سے اتر کر اس سڑک پر آئیں جو دریائے نیل کے کنارے کنارے شہرپناہ تک گئی تھی۔ راہگیروں کے ساتھ یہ بھی شہر کی طرف اس میدان میں سے گذرتی ہوئی چلیں جہاں اہرام کے نہایت قدیم آثار قائم تھے۔ چلتے چلتے جب شہر کے شمالی دروازے کے قریب پہنچیں جس پر نیچے سے لیکر اوپر تک سونے کی چادریں جڑی تھیں تو ٹھہر گئیں۔ دروازہ ابھی تک کُھلا نہ تھا۔ راہگیروں میں ایک عورت تھی جو تین گدھوں پر سبز ترکاریاں اور جو کی ہری ہری بالیں رکھے شہر میں بیچنے لائی تھی۔ یہ بھی دروازہ کھلنے کے انتظار میں کھڑی ہوگئی۔ کھڑے کھڑے دفع الوقتی کے خیال سے ... اور آشتی سے باتیں کرنے لگی اور پوچھا کہ "بیوی، تم کہاں سے آتی ہو؟"

آشتی نے جواب دیا کہ "ہم نینوا کے شہر سے آتے ہیں۔ گانا بجانا موتی بیچنا ہمارا پیشہ ہے۔"

ترکاری والی نے کہا "اچھا کیا جو یہاں آگئیں۔ یہ شہر تمہارے واسطے ... موتی یہاں کم ملتے ہیں۔ اور یہاں کا بادشاہ آجکل ایک بڑا رسیلا جوان ہے۔ گانا سننے پر دم دیتا ہے۔"

آشتی نے کہا "بادشاہ جوان ہے۔ یہ کیا کہتی ہو۔ بھلا اس کا نام تو بتاؤ؟ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ یہاں کا بادشاہ بڑا بڈھا ہے۔ آخر وہ بڈھا بادشاہ کیا ہوا؟"

ترکاری والی نے کسی قدر شبہ کی نظر سے دیکھکر کہا "بیوی۔ تم تو کہتی تھیں کہ ہم نینوا سے آتے ہیں۔ شاید وہاں تمہارا رہنا زیادہ نہیں ہوا ورنہ سُن لیتیں کہ وہ بڈھا بادشاہ تو مدت ہوئی مارا گیا۔ سامنے والے مقبرے ہی میں تو اُسے رکھا ہے۔ اب سے دو برس پہلے غدر جب یہاں پڑا ہے تو فرعون کے سپہ سالار نے، جو اب یہاں کا بادشاہ ہے، اس بڈھے کو اس مقبرے میں دفن کیا تھا۔ بیوی اس غدر کا حال کیا پوچھتی ہو۔ جھوٹ سچ کون جانے۔ میں تو گاؤں سے ترکاری لاتی، بازار میں بیچی گھر چلی گئی۔ سچا حال میں کیا جانوں۔ جو سنتی ہوں وہ یہ ہے کہ دریا کے دو دفعہ چڑھاؤ یا یوں سمجھو کہ دو برس ہوتے ہیں یہ جوان سپہ سالار مصر کے تین ہزار سپاہی اور اس بڈھے بادشاہ کے بیٹے کا جنازہ لیکر یہاں آیا۔ اس بادشاہ کے بیٹے کو اسی سپہ سالار نے کہیں مار ڈالا تھا۔ کہتے ہیں کہ مصر کی ملکہ کو دونوں چاہنے لگے تھے۔ اسی پر آپس میں جھگڑا ہوا جب بادشاہ کا بیٹا سپہ سالار کے ہاتھ سے مارا گیا تو مصر کی ملکہ نے اسے حکم دیا کہ جس بادشاہ کے بیٹے کو تو نے مارا ہے اسی کے پاس جا، وہی تیرے اس قصور کی سزا جو کچھ دینی ہوگی دیگا۔ ملکہ کا حکم سنتے ہی وہ جوان حاکم یہاں آیا۔ بڈھے بادشاہ کو جب خبر لگی کہ اُسکے جوان بیٹے کو اسی حاکم نے مارا ہے تو وہ آگ بگولا ہوگیا۔ اور حکم دیا کہ اس قاتل کے گلے میں رسی کا پھندا ڈالکر جہاں کے جہاز کے سب سے اونچے مستول میں لٹکا دو۔ اس جوان حاکم نے جب یہ سُنا تو کہلا بھجوایا کہ مجھے پھانسی دینا اگر آپ کے بس کی بات ہے تو پھانسی دیجئے میں تیار ہوں۔ اس پر مصر کے تین ہزار سپاہیوں میں اور یہاں کی فوج میں لڑائی شروع ہوگئی۔ شہر کے بہت سے فوج والے بادشاہ سے بگڑ کر مصر والوں سے جا ملے۔ یہ بڈھا بادشاہ رعیت پر بڑے ظلم کیا کرتا تھا۔ رعیت نے بھی آخیر وقت میں دغا دی۔ غرض لڑائی میں بڈھا بادشاہ مارا گیا اور شہر والوں نے اسکی جگہ مصر سے جو فوج آئی تھی اُسکے سپہ سالار کو تاج پہنا کر اپنا بادشاہ بنا لیا۔

اُس کا نام کچھ ایسی سا ہے۔ یاد نہیں آتا۔ بہت سے نام ہیں۔ پر صورت شکل کا دیکھنے میں بہت اچھا ہے۔ سب اس کو بہت چاہتے ہیں۔ بڑا سیدھا ہے، پر کچھ باؤلا سا بھی ہے۔ لو، دروازہ کھل گیا!" اتنا کہہ یہ عورت اپنے گدھوں کی گردنیں گھسیٹتی ہوئی اس بھیڑ میں مل گئی جو دروازے کھلنے کے انتظار میں کھڑی تھی۔

طیبہ اور آشتی بھی آگے بڑھکر اسی [illegible] میں پہونچیں [illegible] ایک چوڑی سی سڑک پر کچھ دور چل کر ایک بڑے چوک میں آئیں جس کے چاروں طرف درخت تھے [illegible] عالیشان محل تھا۔ یہاں انہوں نے اپنے اونٹوں کو ٹھیرایا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں جائیں۔ دونوں اسی فکر میں تھیں کہ [illegible] دروازہ کھلا اور اس میں سے سواروں کا ایک دستہ زرہ پہنے، ہتھیار لگائے باہر نکلا۔

طیبہ نے ان سواروں کو غور سے دیکھا اور اس کو حیرت ہوئی [illegible] ڈھالوں پر جو طغرہ ہے اُس میں طیبہ کا نام موجود ہے۔ اور نام کے بعد یہ عبارت تھی:۔

"ملکۂ مصر شمال و جنوب فاتح کوش، خاتون ربانی، تاجدار [illegible] [illegible]"

طیبہ نے دبی زبان سے کہا "اور کہیں کے [illegible] یہاں کے لوگ تو [illegible] معلوم ہوتے ہیں" اس کے بعد طیبہ دفعتًا خاموش ہو گئی۔

وجہ یہ تھی کہ اُس محل کے دروازے سے ایک شخص نکلا [illegible] وہ بہت دور تھا مگر کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے کہ پہلے اُسے بہت دیکھا ہو۔

طیبہ نے آشتی سے پوچھا "یہ کون ہے؟"

آشتی کی زبان سے بے اختیار نکلا "دل تو کہتا ہے کہ یہ میرا [illegible] ہے"

بادۂ سرجوش

ہے اودی اودی گھٹاؤں میں چھینٹیں اے ساقیا!
ہے سر کوئی جو برسیں اے ساقیا!
باقی نہیں ہے اب سے الف توبہ توڑنا!
چھلکا گیا آسماں سال ابر اے ساقیا!
وہ کھل گیا ہے باب عرش بریں اے ساقیا!

باقی نہیں ہے وقت قال و قیل اے ساقیا!
شیشے کی نکال کاگ پھینک اے ساقیا!
اب دیر نہ کر کہ آ رہی ہے پیہم
کانوں میں صدائے الرحیل اے ساقیا!

رندوں کو روا ہے کامرانی ساقیا!
ہے روز جزا فقط کہانی ساقیا!
محشر میں اگر ہوئی بھی پرسش بالفرض
دے دیں گے جواب نوجوانی ساقیا!

بجلی کی چمک ہے زندگانی ساقیا!
ہے پانی کا حباب عمر فانی ساقیا!
بیٹھے ہوں بجل جلد جلد شیشے میں انڈیل
جاتی ہے بہار نوجوانی ساقیا!

جوش ملیح آبادی

افسانہ اور محبت

افسانہ اور محبت کا رشتہ آج کا نہیں بلکہ یہ دونوں اُسی دن سے ایک دوسرے کے قریب ہیں جب فطرت نے محبت کا سحر انگیز جذبہ انسان کے دل میں بسایا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے جب افسانہ گوئی شروع کی تو پہلا جذبہ جس کے اثر میں ڈوب کر اُس کے قصے نکلے یہی محبت کا جذبہ تھا۔ تہذیب نے ترقی کی، زبان کی جگہ قلم نے لی اور محبت کی نغمہ پرور داستانیں کاغذ پر انتہائی فراوانی سے لکھی جانے لگیں۔ اُن کی رنگینیوں نے ہر ہر قدم پر ہمیں اپنا دیوانہ بنا دیا۔ اور اب تک ہم اور ہمارے افسانے اس سحر سے آزاد نہیں ہو سکے۔ یہ مان لینے کے بعد کہ افسانہ اور محبت ایک دوسرے کیلئے قریب قریب دو لازمی چیزیں بن گئی ہیں افسانے کے فن کے متعلق لکھتے وقت محبت اور اُس کی افسانوی اہمیت پر غور کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن اُس پر غور کرنے یا اُس کے متعلق کچھ لکھنے کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ہم انسانوں کی محبت اور اس کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کریں گے وہ کسی نفسیاتی تحلیل یا منطقی اور فلسفیانہ تقسیم کا نتیجہ ہوں گے۔ اور نہ یہ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ محبت کے مختلف قسم کے جذبات میں سے کون سا افسانہ کیلئے کم اور کون زیادہ موزوں ہے۔ فن ہر اُس چیز کو اپنی حد میں داخل کر لیتا ہے جو کسی نہ کسی حد تک دلکش بن سکے۔ اور کسی چیز کا دلکش بننا خود اُسکے پیش کرنے والے کی قابلیت پر منحصر ہے۔ اس لئے یہاں بتانا ضروری ہے کہ محبت کے کسی خاص جذبے یا پہلو کو افسانے کا موضوع بنانا حسن یا عیب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر جذبہ صرف اپنے مخصوص ماحول یا لوازمات کے ساتھ ہی افسانے میں دلکشی پیدا کر سکتا ہے۔ اور ان لوازمات کو اصطلاح میں ارضیہ (Settings) کہہ سکتے ہیں۔

افسانوں میں عموماً جو محبت پیش کی جاتی ہے اور جو عام طور پر سب میں زیادہ دلکش اور دلفریب بھی سمجھی جاتی ہے وہ ایک نوجوان مرد اور شباب میں ڈوبی ہوئی عورت کی ہے۔ عشق کا یہی افسانہ ہے جسے ہر قوم نے اپنے ابتدائی احساس سے لیکر تہذیب کی انتہائی ترقی تک پہونچنے کے بعد تک دہرایا ہے۔ ہر قوم اسی فریب میں گرفتار ہوئی اور اسے اپنی سب سے بڑی خوبی جانا۔ ہر قوم نے صرف اسی محبت کو اپنی اور دُنیا کی تخلیق کا راز سمجھا لیکن باوجود اس خیال میں متفق ہونے کے بھی مختلف قوموں نے جس طرح اس عشق کا اظہار کیا وہ ایک دوسرے سے جداگانہ ہے اور ادب میں عموماً اور افسانے میں خصوصاً اس اختلاف نے ایک سے زیادہ ایک دلکش شکل اختیار کر لی۔

عشق یا زیادہ واضح لفظوں میں عورت اور مرد کی محبت کا پہلا مظاہرہ ادب میں اُس صورت میں ہوا جسے ہم کلاسی (Classic) کہہ کر پکارتے ہیں۔

افسانوں میں کلاسی محبت کے جذبات کو ایک سے زیادہ ایک سحر انگیز طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن فن کار مصوروں نے ایسے افسانوں کیلئے چند باتیں لازمی سی کر لی ہیں اور اُن کے وجود کے بغیر کسی افسانے میں کلاسی محبت کا مخصوص اثر پیدا کرنا قطعی غیر ممکن ہے۔ کلاسی افسانوں کا سب سے پہلا جزو اُن کی معصومیت ہے۔ یہ معصومیت عاشق و معشوق کی ذات کے علاوہ خود اُنکے گرد و پیش پر بھی چھائی رہتی ہے۔ محبت کے فریب میں پھنسنے والے یہ عاشق و معشوق اپنے شباب تک محبت کے نام تک سے ناواقف رہتے ہیں لیکن محبت کا جذبہ اُن کی فطرت میں اُن کی پیدائش ہی کے وقت شامل ہوتا ہے۔ اس لئے اُن کا احساس رفتہ رفتہ اس پوشیدہ حقیقت سے واقف ہوتا جاتا ہے۔ دونوں کو اپنے لئے کسی معبودِ محبت کی تلاش ہوتی ہے۔ فطرت اُن کا ساتھ دیتی ہے اور بھولے بھالے عاشق و معشوق ہمیشہ کیلئے ایک دوسرے کو مل جاتے ہیں۔

اور ان کے بعد دُنیا کی ساری لذتیں انہیں صرف اپنی محبت میں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ فطرت جواب تک خاموشی کے ساتھ ان کے دلوں کو گدگدا رہی تھی جس کے مختلف گوشوں سے اب تک محبت کے خاموش نغمے ان متوالوں کے کانوں میں گونج رہے تھے ان کی ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ گلوں کے گل بوٹوں سے بوٹے، شمشاد سے قمریاں اور خود نسیم کے نرم نرم جھونکوں سے جھومنے والی ڈالیاں بھی خود کو ایک دوسرے کے آغوش میں ڈال دیتی ہیں۔ اور ان محبت کی نیند کے ماتوں کی گہری مدہوشی کے ساتھ تمام فطرت میں سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ اور ایک کلاسی محبت جیسی پہلی کرن ازل کے دن چمکنی شروع ہو گئی تھی ابد تک [illegible] روشن [illegible] محبت [illegible] روشنی کے ساتھ [illegible] آگے کو بڑھ جاتی ہے۔

کلاسی محبت میں معصومیت اور [illegible] کی [illegible] ہیں جہاں [illegible] کی محبت کا انجام طرب و نشاط ہو۔ طرب و نشاط کی فضا یاں آتی نظر [illegible] ہیں لیکن [illegible] اس لئے کہ دلوں کی تڑپ میں اور تیزی پیدا ہو جائے۔ وہ محبت کرنے والے محبت کا [illegible] دلوں کیلئے یہ افسانہ ایک حیات ابدی کا پیغام بنکر رہتے۔

کلاسی محبت کے افسانے اسی لئے لکھنے دشوار ہیں۔ افسانہ نگار کو ایسے [illegible] عام دنیاوی سطح سے بلند ہو کر عشق کی اس داستان کو ایک [illegible] پڑتا ہے جہاں [illegible] کے باوجود پیا ماد کر دو سروں کے دلوں کو اس سے مسخر کرے۔ دوسری دشواری [illegible] کے نام لیتے وقت پیش آتی ہے۔ جیسے ہر ممکن طریقے سے اسی جذبۂ محبت کا تابع بنانا پڑتا ہے [illegible] ایک [illegible] ہی کیلئے ممکن ہے۔ کلاسی محبت کے افسانوں [illegible] اس قسم کے افسانے اسی وقت پورا اثر پیدا کر سکتے ہیں جب پڑھنے والے کے جذبات [illegible] اور غیر محسوس طریقے پر وہ ایسے درجے پر پہونچ جائے جہاں جذباتی ہیجان اپنا پورا اثر دکھا رہا ہو۔ ایسے افسانوں کی مثال ایک ایسے دریا کی [illegible] کی سطح بالکل ہموار رہے لیکن اس میں پانی حد سے زیادہ [illegible] ہموار سطح پر یہ پانی آہستہ آہستہ بہتا ہوا سمندر کے کنارے پہونچ جاتا ہے اور اپنے دبے ہوئے جوش کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیتا ہے۔ جوش پیدا ہوتا ہے لیکن اس سے بڑی ایک طاقت لئے دبا دیتی ہے۔ ایسے افسانوں کی بھی بالکل یہی حالت ہے۔ افسانے کے ختم ہوتے ہوتے پڑھنے والے کے جذبات پر زیادہ سے زیادہ اثرات پڑتے ہیں لیکن افسانے کا مجموعی اثر ان جذبات کو دبا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سب بلند فنی نطافتوں کا پیدا کرنا کسی مبتدی کا کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسی محبت کے افسانے ہر ادب میں شاذ و نادر ہیں۔ اردو میں اس کی بہترین فنی مثالیں صرف نیاز کے افسانوں میں مل سکتی ہیں۔

محبت کا جو پہلو افسانوں میں عام طور پر [illegible] رومانیت ہے۔ رومانی افسانے [illegible] رومانی جذبات [illegible] اردو میں بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔

یہ افسانے بھی عام عشقیہ افسانوں سے کسی قدر الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی setting [illegible] افسانوں سے کسیقدر مختلف ہوتی ہے۔ ان کے ہیرو اور ہیروئن بعض حیثیتوں سے دوسروں سے ممتاز ہیں۔

رومانی افسانوں کی setting میں بھی کلاسی افسانوں کی طرح مناظر فطرت کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اور اس قسم کے عشقیہ افسانے لکھنے

والے افسانہ نگار عموماً خاص خاص موقعوں پر اِن سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً سجاد حیدر کے رومانی افسانوں میں چاند اور اُس کی مخصوص کیفیتوں سے اکثر عاشق و معشوق کے سوئے ہوئے جذبات کو جگایا ہے۔ اس سکون پرور چاندنی نے اکثر اِن کے دلوں کو محسوس کرایا ہے اس میں تڑپ پیدا کی ہے۔ انھوں نے اس کی کرنوں میں اپنے محبوب کے جلوے دیکھے ہیں۔ اسکے علاوہ دریائی پُرسکوت روانی۔ رات کا سناٹا اور اس میں سوئے ایک پپیہے کی کسی آواز کا نہ سنائی دینا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا محبوب کی زلفوں کو آکر ہلانا۔ اور اسی قسم کی چیزیں ہیں جو رومانی افسانہ نگار فطرت سے حاصل کر کے انکی بدولت اپنے افسانے میں فنی رنگ بو کے جلوے پیدا کرتے ہیں۔

ایسے افسانوں کے ہیرو کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب پر بُری طرح دیوانہ ہوتا ہے۔ اپنی دیوانگی کو چھپانے کے بجائے اُسے زیادہ سے زیادہ آشکارا کرتا ہے۔ اس کی باتوں میں جوش و خروش اور ہر کام میں بے چینی اور تڑپ سے کام لیتے ہیں۔ وہ محبوب کو پاکر ہر چیز سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ ہر چیز کا جلوہ صرف اسی میں دیکھنے لگتا ہے حتیٰ کہ اُسے کبھی خدا بھی ماننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ صرف اس وقت جس وقت کہ اس کا رومانی جذبہ اُس پر حکومت کر رہا ہو۔ ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے وقت وہ محبوب کو بالکل بھلا بیٹھے۔ وہ ایک ہی وقت میں شاعر بھی ہوتا ہے اور احمق فلسفی بھی۔ دُنیا کا سب سے بہادر سپاہی بھی اور انتہائی بیوقوف انسان بھی۔

اس کا محبوب گوشت اور پوست کا نہیں ہوتا اور نہ دُنیا کے سامنے اُسے اس طرح نمایاں بناتا ہے۔ وہ کبھی اُسے "نطق موسیقی" کہکر پکارتا ہے۔ اس کی ہر جنبش اُسکے نزدیک نقش ترنم ہے۔ اس کی رفتار میں موسیقی کے پردے چھپے ہوئے ہیں۔ وہ عشق اور محبت کی موجد ہے۔ اُسکا حُسن "کائنات کی ساری چیزوں کا نچوڑ" ہے۔ اور اس لئے اس کے بغیر زندگی بے کیف اور بے روح ——— وہ صرف دیکھنے کے لئے ہے۔ "آزادہ رمیدہ" "آغوش سے دور" یا بعض کے نزدیک عورت جو صرف محبت کرنے کیلئے پیدا ہوئی ہے صرف ... ایک لذت نے مجسم، ایک تسکین بے مشکل، ایک سحر بے مرئی، ایک نور بے مادی۔ اور اس لئے وہ ہم پر حکمران ہے۔ یہ ہے رومانی محبوب کا سراپا۔ ہمیں یہ تک پتہ نہیں کہ اسکی شکل کیسی ہے۔ اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اس کا مجسمہ کیسا دلکش ہے لیکن اسکے باوجود ہم رومانی افسانوں کے محبوب پر فریفتہ ہونے پر مجبور ہیں۔ اور یہی ہے اُس کے آرٹ کی تکمیل۔ اُردو کے سب سے بڑے رومانی افسانہ نگار نیاز ہیں۔ ان کے بعد مجنوں۔ سجاد حیدر۔ عابد اور احمد شجاع کے افسانوں میں بھی جگہ جگہ اس جذبے کی جھلک ہے۔

افسانہ نگاروں کا رجحان دن بدن رومانیت کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر کی کوششیں انہیں غلط راستے کی طرف لے جا رہی ہیں۔ اور وہ رومانی جذبات پیدا کرنے کی کوشش میں افسانوں میں عریانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کا واحد علاج صرف یہی ہے کہ اپنے افسانے لکھنے سے پہلے اپنے اچھے لکھنے والوں کے بہترین نمونوں کا مطالعہ بغور کیا جائے۔

عشقیہ افسانوں میں جو روش اب تک عام تھی اور اب رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہے مثالی محبت کی تھی۔ لوگوں نے مثالی محبت کے مفہوم کو بالکل غلط سمجھکر افسانوں کی بنیاد اس پر رکھنی شروع کر دی اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افسانے کی فنی اور ادبی لطافتوں کا خون ہونے لگا۔ جہاں مثالی عشق گھسا وہاں یہ بھی لازم ہو گیا کہ عاشق و معشوق اپنے ظاہری و باطنی محاسن میں دُنیا کی بہترین مثال بن جائیں۔ ایسا ہونا بالکل غیر ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک غیر ممکن چیز کو اصلیت کا جامہ پہنا کر ہمارے سامنے پیش کیا جائیگا تو وہ کتنی بھونڈی معلوم ہوگی۔ اس قسم کے مثالی عاشق و معشوق کلاسیکی اور رومانی عشق کے افسانوں میں تو کسی حد تک موزوں بھی ہو سکتے ہیں لیکن عام عشقیہ افسانوں میں ان کا وجود کبھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسلئے [illegible] وہ ذہن کو فطرت کی

مطابق پیش کریں۔ اور ان کے سراپا کو بجائے ان کے ایک ایک خدوخال کے نمایاں کرنے کے اس کے مجموعی تصور کو پیش کریں تاکہ مثالی محبت کے پیش کرنے کا مقصد کسی حد تک پورا ہو سکے۔

ایسے افسانوں میں عموماً یہی ہوتا ہے کہ محبت پہلی نظر ہی میں اپنا گہرا اثر کر لیتی ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جو محبت آخر میں مثالی حد تک پہونچی ممکن ہے اس کی ابتدا بھی پہلی نظر میں ضرور ہو جانے گی۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ابتدا اور انتہا میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ اسلئے موجودہ افسانہ نگاروں کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ عشق رفتہ رفتہ اپنی انتہائی منزل تک پہونچے اور اس منزل تک پہونچنے کیلئے اسے ضروری موقعے ملیں اسکی کوئی نفسیاتی وجہ ہو۔ علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کے عشقیہ افسانوں میں ایسی مثالیں آسانی سے مل جائیں گی جنہیں اچھا نمونہ بنایا جا سکے۔

اچھے افسانہ نگاروں اور فن کی نزاکتوں کو سمجھنے والوں نے اس روش میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی ہے۔ اور اپنے افسانوں میں ایسے عشق اور محبت کو جگہ دی ہے جو کسی حد تک مثالی تو ضرور کہا جا سکتا ہے لیکن اس کی اکثر پابندیوں سے آزاد ہے۔ ایسے افسانے دن بدن کثرت سے بڑھ رہے ہیں اور انہیں لوگ دوسرے عشقیہ افسانوں کے مقابلے میں زیادہ پسند کرنے لگے ہیں۔ ایسے افسانوں کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عورت اور مرد کے عشق و محبت کو کسی سماجی پابندی کا تابع نہیں کرنا چاہتے۔ نہ رشتہ ان کے درمیان حائل ہوتا ہے اور نہ مذہب ملت کی بند ہی ہے۔ صرف عشق انکا قانون ہے اور اس قانون پر عامل ہونے کے بعد وہ کسی دوسرے قانون کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ اپنے قانون پر اس لئے ایمان رکھتے ہیں کہ انکے نزدیک یہی قانون فطرت ہے اور فطرت دنیاوی جکڑبندیوں سے بے نیاز ہے وہ انکو ٹھکراتی ہوئی ان زنجیروں کو پاش پاش کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے چونکہ اس قسم کی محبت سوسائٹی اور اخلاق کے نزدیک معیوب سمجھی جاتی ہے اس لئے ضروری تھا کہ افسانہ نگار اپنے ہیرو اور ہیروئن کو سوسائٹی کے عام معیار سے بلند کر دیتے اس لئے ایسے افسانوں کیلئے لازمی ہے کہ انکے ہیرو اور ہیروئن تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہوں۔ چنانچہ اس قسم کے جتنے اچھے افسانے اردو میں ہیں ان میں اس بات کا التزام رکھا گیا ہے۔ جنوں کے کئی افسانے اس موقعے پر بہترین مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں نے جب اس روش کو اختیار کیا تو صرف ان نظریہ محبت کو پیش نظر رکھا اور انکے ہیرو اور ہیروئن کے معیار سے بے خبر ہو گئے اور یہ ایک بڑا عیب ہو گیا۔

ایسے افسانوں میں محبت کا جو معیار پیش کیا گیا ہے اُس کے متعلق اخلاقی نقطۂ نظر سے کوئی بلند رائے نہیں قائم ہو سکتی لیکن فن کے اعتبار سے یہ افسانے کیلئے بہت موزوں ہے۔ اس لئے کہ اس میں رومانی۔ نفسیاتی اور مثالی عشق کی ساری خوبیاں ایک جگہ آسانی سے جمع کی جا سکتی ہیں مثلاً خواب و خیال، اور محبت کی قربانیاں۔

ایسے افسانوں میں فنی لطافتیں پیدا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ افسانہ نگار خاص خاص موقعوں پر اخلاقی۔ سماجی اور سیاسی پابندیوں اور جذباتِ محبت میں کشمکش دکھائے اور ان چیزوں سے نفسیاتی نتائج کے ماتحت ایک خاص نتیجہ مرتب کرے۔ عموماً ایسے افسانوں کا انجام حزنیہ ہی ہو سکتا ہے اسلئے خواہ مخواہ اس بات کی کوشش نہ کرنی چاہیے کہ وہ طربیہ ہو جائیں۔

ابتک محبت کے جو مختلف نظریے پیش کئے گئے ان میں سے ہر ایک اردو میں کہیں نہ کہیں پایا جاتا ہے۔ کلاسی محبت پر یونانی تخیل اور انگریزی آب و رنگ کا اثر ہے۔ رومانیت فرانس اور ترکی سے آئی۔ مثالی محبت ایران سے حاصل کی گئی۔ نفسیاتی محبت ان میں سے کسی ایک کے ملنے سے بنی لیکن اکثر افسانوں میں عشق و محبت کی وہ مثالیں موجود ہیں جو ہندوستان کے مخصوص اثرات کے ماتحت پیدا ہوئی ہیں ایسی محبت میں ہر قدم پر رکاوٹیں محسوس ہوتی ہیں جو ہماری سوسائٹی اور ہمارے مذہب کی وجہ سے ہم پر عائد ہوتی ہیں۔ کم استعداد افسانہ نگار ان بندشوں کی پرواہ کئے بغیر جو

جی میں آتا ہے لکھ مارتے ہیں۔ اور اسلئے ان کے افسانے اکثر غیر فطری ہو جاتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں ضروری ہے کہ ہم اپنی سوسائٹی کی مخصوص پابندیوں کو بالکل نظرانداز نہ کر دیں۔ اور اگر ہم ہیرو یا ہیروئن کو اس قید سے آزاد کرنا چاہتے ہیں تو اُس کی کوئی معقول وجہ پیش کریں۔ اس لئے کہ کوئی شخص سوسائٹی کے قوانین کو اُس وقت تک نہیں توڑ سکتا جب تک اُس کے پاس اسکی کوئی نفسیاتی وجہ نہ ہو۔ اس لئے افسانہ نگاروں کو اس موقع پر بے حد احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ وہ اگر کوئی غیر فطری بات دکھائیں تو اُسکی غیر معمولی وجہ بھی موجود ہونی ضروری ہے۔

عشقیہ افسانوں کی جتنی مختلف قسمیں بتائی گئیں اُن میں ہر ایک کی مخصوص ضروریات مختصر طور پر بیان کی گئیں لیکن اسکے بعد بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انکی پابندی کرنیکے بعد ہر شخص بلند عشقیہ افسانے لکھنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسی باتیں بھی پیش کر دی جائیں جنکا لحاظ ہر موقع پر افسانہ نگار کیلئے ضروری ہے۔

عشقیہ افسانوں میں سب سے پہلی احتیاط یہ ہونی چاہئے کہ ہم حتی الامکان محبت کے مادی عنصر کو زیادہ نہ اُبھاریں۔ اُسکے ہیجان انگیز اجزا کو جہاں تک پوشیدہ رکھ سکیں رکھیں اور اس بات کی کوشش کریں کہ افسانہ پڑھنے کے بعد خود پڑھنے والا اس مادی جذبے کا شکار ہو کر نہ رہ جائے۔ اس موقع پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ان مادی جذبات کو بیان کرنا حقیقت اور فطرت کے مرادف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن ہم انہیں مادی باتوں کو انہیں عشق کی داستانوں کو ایسے لفظوں میں پیش کر سکتے ہیں کہ بجائے مادی جذبات کو ہیجان میں لانے کے ہماری فطرت روحانی جذبات یا فطرت انسانی کے بلند احساسات کی طرف مائل ہو۔ اور وہ محبت کرنے والوں کے مادی عشق سے ایک بلند سبق حاصل کرے۔

اس سلسلے میں یہ کہہ دینا بھی لازمی ہے کہ عشقیہ افسانوں میں محبت کے مناظر یا ایسے مواقع جہاں عاشق اور معشوق میں اظہار محبت کا جذبہ غالب ہے زیادہ نمایاں نہیں ہونے چاہئیں ورنہ محبت کی بلندی اُن میں سے غائب ہو جائے گی۔ ایسے موقع پر لکھنے والے کو صرف تصور آفرینی [illegible] سے کام لینا چاہئے۔

عشقیہ افسانوں کے انجام عموماً متبدی کوشش کرتے ہیں کہ طربیہ ہوں طربیہ افسانے برے نہیں ہوتے اور نہ حزنیہ افسانوں کو اس خاص موقع پر ان کے مقابلے میں اچھا کہا جا سکتا ہے لیکن ضروری صرف یہ ہے کہ افسانے کا انجام فطرت کے مطابق ہو نہ کہ خواہ مخواہ طربیہ بنایا جائے اور نہ حزنیہ۔ واقعات اور اُن کی رفتار اُسے جدھر چاہے لے جائے۔ جو انجام افسانے کے واقعات کی صورت میں ہونا لازمی ہے، وہی ہو خواہ طرب خواہ حزن۔

یہ چیزیں تو ایسی ہیں جن میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے لیکن جو باتیں کہی گئیں اُنکے علاوہ اگر افسانہ نگار دو باتوں کا اور خیال رکھیں تو اُنکے افسانے زیادہ لطیف اور نازک بن سکتے ہیں۔

پہلے یہ کہ عشقیہ افسانوں کی ابتدا ہمیں اصل واقعات کے درمیان سے کرنی چاہیئے۔ ہم اپنے ہیرو یا ہیروئن کو ایسی حالت میں لوگوں کے سامنے پیش کریں کہ جب اُن پر عشق کا جذبہ کام کر چکا ہے، اس صورت میں ایک بات یہ بھی ہوگی افسانہ پڑھنے والا شروع ہی سے افسانے میں منہمک ہو جائے گا اور جو کیفیت اُس پر افسانہ کا کافی حصہ سننے کے بعد طاری ہوتی وہ بالکل ابتدا سے شروع ہو جائیگی۔

ابتدا کے متعلق تو یہ ہے اور انجام کے متعلق یہ کہ عشقیہ افسانوں کو اس طرح ختم کرنا چاہیئے کہ پڑھنے والے کی تخیل کے لئے بھی تھوڑی بہت گنجائش رہے اور وہ یقینی طور پر خود بخود ایسے نتیجہ پر پہونچ سکے جو افسانے میں پیش کئے ہوئے واقعات کے لئے

[illegible]

لازمی ہے۔

یہاں تک جو کچھ کہا گیا وہ صرف اُن افسانوں کے متعلق ہے جنہیں عُرفِ عام میں عشقیہ افسانہ کہہ کر پکارا جاتا ہے یا جن میں محض ایک جوان مرد اور جوان عورت کی محبت کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا محبت باوجود اپنی انتہائی وسعتوں کے صرف اتنی ہی محدود چیز ہے کہ اُسے عورت کی ذات سے وابستہ کر دیا جائے؟

اس کا جواب وہ افسانے ہیں جو اب اُردو میں بھی عام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بہت سے افسانہ نگار اپنے افسانے کا موضوع محبت کے اکثر دوسرے شعبوں کو بناتے ہیں، اور ان میں بھی ایسی ایسی افسانے کی نازک فنی لطافتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی افسانے میں محض بہن بھائی کی محبت دکھائی گئی ہے۔ لیکن اُسے زیادہ دلکش بنانے کے لئے اس میں افسانہ نگار نے رومانی Setting پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے لئے "خون کی چاہت" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ کہیں ماں اور بیٹے کی محبت اس حد تک دکھائی گئی ہے جو فطرتِ انسانی کی اس حد سے گذر کر جسے مامتا کہتے ہیں، رومانیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اور ایک ہی افسانے میں ماں اور بیٹے کی محبت کے علاوہ رومانی Setting اُسے زیادہ شاعرانہ بنا دیتی ہے۔ اس قسم کے افسانے کی مثال میں "حُسن کی قیمت" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یا اگر کوئی رومانیت اور عشق کا بے حد دلدادہ ہے اور وہ معشوق اور عاشق کی حدود سے باہر نکل کر بھی رومانیت اور شاعرانہ محبت کی جستجو کرتا ہے تو آسانی سے میاں بیوی کے رشتہ میں اس کے پیدا کرنے کی گنجائش ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ رومانیت جیسا کہ اکثر افسانہ نگاروں کا خیال ہے، شادی کے بعد باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے باوجود بھی سجاد حیدر نے اپنے دو ایک افسانوں میں اس قسم کی Setting مہیا کر دی ہے کہ میاں اور بیوی کی محبت میں رومانیت کا لطف آنے لگتا ہے۔ یہ تو خیر ہے ہی لیکن فن کے ماہرین میاں بیوی کی محبت کے علاوہ خود آقا اور نوکر کی محبت میں، شاعر اور اُس کے شعر کی محبت میں، سنگ تراش اور اُس کے اپنے بنائے ہوئے مجسمے کی محبت میں، رومانیت اور شاعرانہ لطافت کی انتہائی گہرائیاں دکھا سکتے ہیں۔ حامد علی خاں کا افسانہ "پوسٹ ماسٹر"، حمید احمد خاں کا افسانہ "سنگ تراش"، یا "مصور کی موت اور صناع کا راز" ایسے افسانے ہیں جنہیں جذبۂ محبت کی بہترین مثال کہا جا سکتا ہے۔ پریم چند اور راشد الخیری کے افسانوں میں میاں بیوی کی محبت کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ ایک دوست دوسرے دوست کے لئے کس طرح قربانی کر سکتا ہے، افسانے کا بہترین موضوع ہے۔ دوستوں کی محبت کے علاوہ اگر رومانی محبت کا شامل کرنا ضروری ہے تو آسانی سے یہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک دوست نے اپنی محبوبہ کو محض اس لئے چھوڑ دیا کہ اُس کا دوست اُس سے محبت کرتا تھا۔

محبت کی تڑپ اگر رومانی محبت میں ہونی ممکن ہے تو دنیا کی دوسری چیزوں کی محبت میں آسانی سے یہ جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح علی عباس حسینی نے "رفیقِ تنہائی" میں ایک بوڑھے کی تڑپ اور محبت کا اظہار اُس کے کتے کی محبت سے کیا ہے۔ اس قسم کی مثالوں میں طاہرہ دیوی کا افسانہ "گھوڑا" خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اُردو میں ایسے افسانے زیادہ لکھے جائیں، تاکہ محبت اور اُس کے مفہوم کا ایک فرسودہ طریقہ ایک ادبی لطافت سے بدل جائے۔

سید وقار عظیم۔ ایم۔ اے

والدۂ مرحومہ کے غم میں

اے کہ تیری ذات سے محکم تھی بنیادِ حیات
کون اب سمجھائے گا دنیا میں رہ و راہِ حیات

میں نے یہ مانا کہ تو اب رنج سے آزاد ہے
روح تیری جنت الفردوس میں آباد ہے

دل کہاں پائیگا لیکن تیری الفت کے مزے
مجھکو یاد آتے رہینگے تیری شفقت کے مزے

چاند کی ہو ضو فشانی چاندنی کے ساتھ ساتھ
اور تاروں کی تبسم دلکشی کے ساتھ ساتھ

روئے روشن شب کی تاریکی سے ہم آغوش ہو
قطرہ قطرہ بحر سے مل کر سراپا جوش ہو

نکہتِ گل ہو چمن کی وسعتوں میں عطر بیز
ہوں شعاعیں سطح پر دریا کی آکر عکس ریز

شمع کو نسبت ہو جل جانے میں پروانوں کے ساتھ
بادہ پُر جوش وابستہ ہو پیمانوں کے ساتھ

ہاں فقط دنیا میں محرومِ محبت میں رہوں
اس فلک کے سائے میں برگشتہ قسمت میں ہوں

ہوں تسلی سے بھی ناواقف مری بیتابیاں
اف ری یہ مجبوریاں اللہ ری مجبوریاں

موت کیا ہے؟ یہ سمجھنے سے بشر مجبور ہے
پردہ ہائے راز میں یہ راز بھی مستور ہے

موت کیا ہے؟ زندگی کی صبح کا ہے اختتام
موت کیا ہے؟ زندگی نو کا ہے گویا پیام

موت کیا ہے؟ تلخیِ ایام کا شیریں ثمر
موت کیا ہے؟ خواب کا اک کیف پرور اک اثر

موت کیا ہے؟ زندگی کا نغمہ خاموش ہے
موت کیا ہے؟ زندگی کی بادہ بے جوش ہے

موت کیا ہے؟ ارتفاعِ روح کا یہ نام ہے
موت کیا ہے؟ زندگی کی صبح کی یہ شام ہے

موت کیا ہے؟ اس سے قائم ہے نظامِ کائنات
موت کیا ہے؟ روحِ افسردہ کی اک تازہ حیات

موت کیا ہے؟ عقل اس ادراک سے مجبور ہے
موت کیا ہے؟ علم بھی اس علم سے معذور ہے

دیکھتا ہوں خاکِ مرقد کو کہ وہ خاموش ہے
صاحبِ مرقد بھی اپنے حال میں مدہوش ہے

موت کی گتھی نہ سلجھی عقل ہرزہ کار ہے
چل رہی ہے دو دن ہی یہ بیش و کم رفتار ہے

مرنے والی گرچہ اپنے حال میں خاموش ہے
ہاں مگر سینے میں میرے جوشِ غم کا جوش ہے

سوچتا ہوں اس فضا میں واقعاتِ زندگی
کس قدر تھی شعلہ پا کائناتِ زندگی

میں وہی ہوں گھر وہی ہے اُس کے بام و در وہی — وہی نقشِ جہاں کا اور وہ منظر وہی
ہاں مگر دنیا کو اب بدلا ہوا پاتا ہوں میں — اُس کی ہر اک دلکشی سے آج گھبراتا ہوں میں
جی نہیں لگتا ہے اس دنیائے غم آباد میں — ہو مسرت پھر کہاں سے عالمِ برباد میں

بن گئی ہے موجبِ غم اُس کی ہر اک دلکشی
ہاں نہیں ہے اب تو ہے بے کیف ساری زندگی

آہ اے ماں خاطرِ بے تاب کی تسکیں تھی تو — گو بظاہر خوش تھی لیکن درد سے غمگیں تھی تو
آ رہا ہے یاد مجھ کو عہدِ طفلی بار بار — جبکہ تھی محبوب میری زندگیِ مستعار
تھا سکونِ مستقل حاصل تری آغوش میں — رو کے سو جاتا تھا میں اس وسعتِ خاموش میں
عطر سے بڑھکر تھی تیرے جسم کی خوشبو مجھے — مایۂ کونین سے افضل تھی یعنی تو مجھے
تیری ہر کروٹ میں تھا آرام کا میرے خیال — تھی مری افسردگی تیرے لئے وجہِ ملال
آہ جب آتا ہوں گھر میں اور تجھے پاتا نہیں — کس قدر بیتاب ہوتا ہے دلِ اندوہگیں
گھر کے آنے اور جانے میں مسرت اب کہاں — تھا جو مخزن راحتوں کا اُس میں راحت اب کہاں
دیکھتا ہوں تیری ہر اک چیز کو عبرت سے میں — اپنی آنکھوں سے لگاتا ہوں اُسے اُلفت سے میں
ایک حسرت دیکھتا ہوں ہر در و دیوار پر — پہلی سی رونق نہیں ہر گوشہ ہے تاریک تر
یہ تصور بھی ہے میرا کس قدر غم آفریں — چیز تو باقی ہے لیکن آہ تو باقی نہیں
جب کبھی دنیا کے ہنگاموں سے گھبراتا ہوں میں — تیرے مرقد پر پئے سجدہ چلا آتا ہوں میں
اور رکھ دیتا ہوں پیشانی لحد کی خاک پر — ہوتا ہوں اس وقت گویا رفعتِ افلاک پر
دل میں برپا ہوتا ہے ہنگامۂ سوز و گداز — آسماں کے مجھکو دروازے نظر آتے ہیں باز
دیکھتا ہوں نور پاشی میں حجاب اندر حجاب — یعنی جلوے رقص لرزش میں نقاب اندر نقاب
دیکھکر تیری عبادت کا یہ شیریں ثمر — غم سے اک لمحے کو ہو جاتا ہوں اپنے بے خبر

سایہ گستر رحمتیں ہوں قبر پر تیری مدام
برکتیں نازل ہوں تیری روح پر ہر صبح و شام

[illegible]

افسانہ نویسی اور

نصب العین

ایک مبتدی افسانہ نویس کے پیش نظر کوئی صحیح نصب العین ہونا چاہیئے۔ آج کل کے نوخیز افسانہ نویس کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ اُسکے پیش نظر صحیح نصب العین نہیں۔ اس کی دانست میں کامیابی یہی ہے کہ قلیل ترین وقت میں جائز و ناجائز طریقوں سے اُس کا نام پبلک میں آ جائے۔ اور اُس کی شہرت ہو جائے۔ دو چار کتابوں کا مصنف ہو جائے اور عرف عام میں نہ صرف لوگ اُسے افسانہ نویس کہنے لگیں بلکہ خود بھی اُس کا سچے دل سے قائل ہو جائے کہ میں افسانہ نویس ہوں۔ یہ ہے وہ غلط نصب العین جس کے پیچھے نوخیز افسانہ نگار دوڑ رہے ہیں۔ میں خود ان کی صف میں کھڑا ہونیکا فخر حاصل کر چکا ہوں اور انکے کامیابی کے طریقوں پر عمل کرنے سے انکار کر کے نفرت سے ہٹ چکا ہوں۔ آج اس نام نہاد کامیابی اور ان طریقوں کے بارہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ خواہ چند ہی خواہوں اور احباب کو ناگوار ہی کیوں نہ گذرے۔

پہلی ترکیب یہ ہے کہ آپ کو مشورہ دیں گے کہ آپ کوئی تخلص اختیار کریں۔ محض اس لئے کہ پبلک آپ کا نام نہ بھولے۔ ایک دفعہ بھی اگر نظر پڑ گئی تو پڑھنے والا یاد رکھے گا۔ دو چار ہی افسانوں کے بعد آپ کا دلکش تخلص مع آپ کے مکمل پتہ کے لوگوں کو ازبر ہو جائے گا۔ اگر کوئی نسیان کا مریض بھول ہی جائے گا تو یائے معروف مثلاً مچھلی شہری، موہیوی، بھوروی یہ الفاظ ایسے ہیں کہ امداد دیں گے۔ تھوڑی محنت سے کافی شہرت اور تعارف حاصل ہو جائے گا۔ یہ ان لوگوں کا مشورہ تھا جو خود اسی دوڑ میں شریک تھے۔ بلکہ وہ چار منزلیں کامیابی کی طے کر چکے تھے۔ نتیجہ ان کی کاوشوں کا یہ ہے اور ان کے سامنے ہے۔ بہت تھوڑی کوشش سے پبلک ان کا نام جان گئی ہے کہ یہ حضرت وہ ہیں جنہوں نے افسانہ نگاری کی ناکام کوشش کی تھی۔ میری دانست میں اس طریقے سے ایک مبتدی کو بچنا چاہیئے۔ محض نام سے پبلک کو روشناس کرانا آپ کا مقصد نہیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ ایک نہیں کئی حضرات نے مشورہ دیا کہ پبلک میں نام آ جائے گا۔ رسالے کے ایڈیٹر بھی افسانے شائع کرنے لگیں گے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ صحیح نصب العین جن کے پیش نظر نہیں وہ یہی کرتے ہیں۔ ادب لطیف کے شہ پارے، تاریخی مضامین، فکاہیہ مقالے، آزاد ترجمے۔ اور اسی قسم کی قابل اشاعت چیزیں لکھ لکھ کر رسالوں میں شائع کراتے ہیں۔ پچھلے چھ ماہ کسی انگریزی جاسوسی ناول کا خاکہ پیش کر دیا۔ کبھی کسی افسانے کا ترجمہ پیش کر دیا اور سال پیچھے ایک آدھ اوریجنل افسانہ بھی تھوپ دیا۔ ایڈیٹر بیچارے نے سوچا مضمون نگار اچھا ہے۔ مضمون دلچسپ تیار رہتا ہے اور پھر رسالوں میں تو اچھی اور بری چیز دونوں کی مانگ رہتی ہے لہذا افسانہ بھی چھاپ دیا۔ اسی طرح دو چار افسانے پبلک کی آنکھ بچا کر شائع کرا دیے۔ بن گئے افسانہ نویس۔

دوسری ترکیب یہ ہے کہ ایڈیٹر سے دوستی کر کے "مدیر اعزازی" ہو گئے۔ مدیر اعزازی کا ترجمہ میں نے کیا ہے "آنریری مجسٹریٹ"۔ واللہ وہی ذہنیت ہے، وہی خیالات ہیں۔ ایڈیٹر صاحبان معاف فرمائیں، ایک عملی رقم ہوتے ہیں۔ جب تک یہ آنریری مجسٹریٹ ڈاک خرچ کرتے رہتے ہیں، خریدار پیدا کرتے رہتے ہیں۔ مضامین کیلئے دوڑتے پھرتے ہیں اُن کا نام، تصویر اور اُن کے افسانے اور مضامین بھی رسالے میں چھپتے رہتے ہیں۔ جن میں سے اکثر مضامین اور افسانے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسرے معیاری رسالوں میں بغیر اُجرت کے شائع نہ ہو سکیں۔ اور جب یہ آنریری مجسٹریٹ سستی دکھاتے ہیں تو اُن کے اختیارات ضبط کر لئے جاتے ہیں۔ اور یہ حضرت اپنے تقرر کے لئے دوسرے پرگنہ کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ اور تو کچھ نہیں مگر اس گڑبڑ میں ان مجسٹریٹ صاحب کو خان بہادری کا خطاب مل جاتا ہے یعنی پبلک نے "افسانہ نگار" مشہور

ہو جاتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے کسی شایستہ اور معیاری رسالے میں بھی دیکھا ہے کہ اس قسم کا مدیر اعزازی ہو؟ کیا آپ نے کسی کامیاب "افسانہ نگار" کو کسی اچھے یا بڑے رسالے کا اس قسم کا ڈمی ایڈیٹر بنے ہوئے دیکھا ہے؟ بدقسمتی سے اس قسم کے ایڈیٹروں کے وہ خطوط میں نے دیکھے ہیں جو وہ ایڈیٹروں کو لکھتے ہیں۔ ان خطوط کو دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ ادبی خدمت کا نام نہاد جذبہ نہیں بلکہ ادبی حلقوں میں نمود حاصل کرنے کی ذہنیت درپردہ کارفرما ہے۔ اپنے افسانوں کے بل بوتے پر نام پیدا نہیں کر سکتے۔ اور نام پیدا کر کے افسانوں میں جان ڈالنا چاہتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ اس قسم کی حرکتوں سے پرہیز کرو۔ اس ذہنیت سے بچو۔ ورنہ تمہیں بھی وہی کامیابی نصیب ہوگی جو ان لوگوں کو حاصل ہوئی۔ وہ کامیابی یہ ہے:۔

تمہارا نام پبلک میں آجائے گا۔ پانچ چھ سال میں اگر چار افسانے بھی لکھ لئے اور چاروں خراب ہیں، تب بھی تم افسانہ نگار مشہور ہو جاؤ گے۔ تمہارے مضامین کا مجموعہ چھپ بھی جائے گا اور بک بھی جائے گا۔ چونکہ اچھا یا برا لکھنے والے ایک مدت سے ملک میں ناپید نہیں اور بالخصوص وہ جن کا نام اس قسم کی کوشش سے پبلک میں آچکا ہے، لہٰذا تمہارے مضامین رسالوں میں برابر شائع ہوتے رہیں گے۔ اس دوران میں تم بھی کاپی بینی میں ماہر ہو جاؤ گے۔ اِدھر اُدھر کے رسالوں، میگزینوں سے کتر بیونت کر کے مضامین اور مقالے مرتب کرنا سیکھ جاؤ گے۔ رسالوں کے صفحات تمہارے لئے افسانوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ خالی رہتے ہیں اور رہیں گے۔ تمہاری مانگ ہوتے تو بحیثیت ادیب کے تھوڑی بہت قدر بھی ہوگی۔ کچھ ٹھوس کام بھی انجام دو گے اور مجموعی حیثیت سے تمہاری کاوشیں بھی سزاوار ہونگی لیکن واضح رہے کہ "افسانہ نگاری" کی عظمت کبھی حاصل نہ کر سکو گے۔ وہ چیز جو تمہارا صحیح نصب العین ہونا چاہئیے کبھی حاصل نہ ہوگی۔ لہٰذا بہتر ہے کہ ابھی سے کر لو۔

اگر محض ایک ادیب، ایک مضمون نگار یا نامہ نگار رہنا چاہتے ہو تب تو یہ راستہ اختیار کرو۔ لیکن اگر افسانہ نویس بنکر ٹکنا چاہتے ہو تو ان باتوں میں سے کچھ بھی نہ کرو۔ یہاں اُن مدیران اعزازی کا سوال ہی نہیں جو صحیح معنی میں مدیران اعزازی ہیں اور جن کا نام رسالے کے لئے واقعی زینت اور باعثِ فخر ہے۔ اور جن کے نام کا شمول رسالے کی بقا کیلئے باعثِ رحمت ہے یا اور کسی طرح طرفین کی نیت بخیر ہے۔ نہ میرا یہ کہنا ہے کہ سب ہی مدیران اعزازی ایسے ہیں۔ میرے ذاتی تجربے سے ثابت ہے کہ ناکام افسانہ نگار منجملہ اور ترکیبوں کے یہ ترکیب بھی کرتے ہیں۔ اور ایک مبتدی کو اس حرکت سے باز رکھنا میرا اصل مقصد ہے۔ ایک غلط نصب العین اور اس کو حاصل کرنے کی بیکار تدابیر اور اسکے نتائج سے ایک مبتدی کو آگاہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ ان طریقوں سے حاصل کردہ معراج کی حقیقت کیا ہے۔

دراصل ایک افسانہ نگار کا نصب العین کچھ اور ہی ہے۔ اگر کوئی فوجی جنرل بحیثیت ایک طبیب کے شہرت حاصل کرے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بھی کوئی فوجی کارنامہ ہے۔ اگر وہ یہ خیال کرے کہ میرے طبی کارناموں سے پبلک واقف ہو جائیگی تو لامحالہ جنگی کارنامے بھی پبلک کو معلوم ہو جائینگے کہ یہ وہ جنرل ہے جس نے فلاں موقع پر ایک چوہیا ماری تھی۔ یہ نصب العین ٹھیک نہیں۔ اگر بحیثیت شاعر، یا مورخ، یا ناقد کے نام پیدا کر کے اپنی افسانہ نگاری کی بنیادیں اس چٹان پر کھڑی کی ہیں تو عرض ہے کہ اس بالائی منزل کی خیریت نہیں۔ آپ شاعر بھی ہیں۔ مورخ بھی ہیں۔ تنقید بھی خوب کرتے ہیں، فکاہیہ مقالے بھی خوب لکھتے ہیں۔ اور ماشاءاللہ افسانے بھی خوب لکھتے ہیں۔ اگر یہ تمام باتیں صحیح ہیں تو عرض ہے کہ آپ کچھ بھی نہیں اور اگر یہ تعریف جھوٹ ہے تو غالباً آپ ان تمام چیزوں میں سے صرف ایک کام کیلئے موزوں ہیں اور وہی کیجئے۔ اور اگر نہیں تو بہتر ہے کہ طب بھی ساتھ ہی ساتھ شروع کر دیجئے۔

افسانہ نگار کا صحیح نصب العین یہ ہے کہ وہ افسانہ افسانے کیلئے لکھے۔ اور اپنی تمناؤں کو اسی ایک واحد نصب العین سے وابستہ کرے۔ اگر آپ نام پیدا کرنا چاہتے ہیں تو افسانہ نگار کی حیثیت سے کسی کے تعارف یا پروپیگنڈے کے بل بوتے پر نہیں بلکہ اپنے افسانہ کے بل بوتے پر نام آوری حاصل کیجئے۔ دنیائے ادب میں جو پوزیشن

ثمراتِ تخیل

ہم کو الفت کے پاس نے مارا
یا وفا ناشناس نے مارا

یاس وجہِ سکوں تھی دل کیلئے
تجھ سے ملنے کی آس نے مارا

ایک جانِ بہار نے لوٹا
ایک رنگیں لباس نے مارا!!

کیا ہو شکرِ نوازشِ قاتل
مجھ کو فکرِ سپاس نے مارا

آئے بھی وہ تو ہم نہ دیکھ سکے
انتشارِ حواس نے مارا

مئے حق الیقیں پلا ساقی
تشنگیٔ قیاس نے مارا

اُن سے اظہارِ مدعا نہ کیا
خوفِ التماس نے مارا

پی قیامت ہے دور ابھی زاہد
تیرے وہم و ہراس نے مارا

ہے یہ محزوں بہار میں بھی نہال
خاطرِ غم اساس نے مارا

کیفِ غم

جانِ محزوں شرفِ جلنے اور جل جانے میں ہے
شمع میں جو سوزِ غم ہے کب وہ پروانے میں ہے

ہر بہر شکلِ یاس ہے دل کی مکمل داستاں
حاصلِ افسانہ ہے … اس افسانے میں ہے

تھا وہ دیدہ و دل نے مجھے رسوا کیا
یعنی شیشہ میں جو تھی اب وہ پیمانے میں ہے

زخم پہ زخم سہلے دل مجروح آخر تا کجا
یہ بھی جینے کی جو طاقت زخم سہلانے میں ہے

بادہ نوشانِ محبت اور احساسِ خمار
کچھ نہیں تو خونِ حسرت اپنے پیمانے میں ہے

رفتہ رفتہ آشنا ہو گا سکوں سے تجربۂ عشق
راحتِ دل جوش کی حد سے گزر جانے میں ہے

ہر الم کیف آفریں ہے ہر بلا راحت اثر
وہ … روح پرور … غمخانے میں ہے

پھر کہاں یہ اضطرابِ شوق یہ جوشِ طلب
… قوتِ احساس … دیوانے میں ہے

دل تو مٹ جائے گا لیکن درد مٹ سکتا نہیں
زندگانی غم سے جینے میں نہ مر جانے میں ہے

دشمنی پہ بھی نہیں ہے تا گمانِ دشمنی
فرق اگر کچھ ہے تو یہ خویش و بیگانے میں ہے

زندگی ہے زندگیٔ دل بقائے شوق تک
لطف اے کوکب تڑپنے اور تڑپانے میں ہے

ہیبتناک افسانہ

تین بہنیں

تیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ غضنفر منزل میں گرمیوں کی ایک شام کو عذرا مسہری پر پڑی دم توڑ رہی تھی اور باقی سب گھر والے مرنے والی کو گھیرے ہوئے تھے۔ غضنفر منزل میں تین بہنیں رہتی تھیں اور ان میں سب سے بڑی عذرا ہی تھی۔ پرانی مسہری کے بدنما پردے لٹکے ہوئے تھے۔ چراغ کی مدھم روشنی عذرا کے بالوں، چہرے پر پڑ رہی تھی اور اس کی بے نور آنکھیں اپنی بہنوں پر جمی ہوئی تھیں۔ کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف کبھی کبھی سب سے چھوٹی بہن سلمیٰ کے رونے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ باہر موسلا دھار مینہ پڑ رہا تھا اور تند ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔

"کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے نجمی" عذرا نے بمشکل تمام کہا۔ نجمی اور عذرا کی صورت میں غیر معمولی مشابہت تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ نجمی کے چہرے پر زیادہ سختی اور جمود تھا۔ "اس کمرے کو مقفل کر دیا جائے اور اسے پھر کبھی نہ کھولا جائے۔" عذرا نے چھوٹتے ہوئے سانس سے کہا۔

نجمی نے فوراً ہی کہا "اچھا ایسا ہی کیا جائے گا گو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بعد میں تم پر اس کا کیا اثر پڑے گا!"

"اثر ضرور پڑے گا" عذرا نے تعجب خیز قوت سے کہا۔ "تمہیں کیا معلوم۔ مجھے کیا معلوم کہ شاید کبھی مجھے یہاں آنا پڑے۔ میں اتنے عرصے تک اس گھر میں رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں پھر کبھی یہاں آؤں گی۔ میں ضرور واپس آؤں گی۔ اسلئے واپس آؤں گی کہ تم دونوں کی نگرانی کروں اور تمہیں کسی قسم کا گزند نہ پہنچنے دوں۔"

"تم بہک رہی ہو" نجمی نے اپنی بہن کی خوابانہ گفتگو سنکر نرمی سے کہا۔ "تم بہک رہی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں ان باتوں کی معتقد نہیں ہوں۔"

عذرا نے ایک آہ سرد کھینچی اور سلمیٰ کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مسہری کی پٹی سے لگی چپکے چپکے رو رہی تھی۔ جب وہ اسکے پاس آئی تو اسے گلے سے لگا کر پیار کیا۔

"میری پیاری رومت" عذرا نے نحیف آواز میں کہا "شاید اسی میں کچھ بہتری ہو۔ اکیلی عورت کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ اس میں بھلا کیا لطف ہے؟ ہماری نہ تو کچھ آرزوئیں ہیں اور نہ امیدیں۔ اور عورتوں کو دیکھو کہ اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم ہیں۔ لیکن ہم اس گھر میں جیسے دنیا بھلا بیٹھی ہیں تنہا ہیں اور ہماری جوانی ڈھل چکی۔ میں پہلے جا رہی ہوں مگر تمہیں بھی میرے پیچھے جلد ہی آنا ہوگا۔"

نجمی بھی اپنے چالیس سال کی زندگی کا خیال کرکے مسکرائی۔ اس طرح کہ اسکے چہرے سے حزن و ملال ٹپکنے لگا۔

"میں پہلے جاتی ہوں" عذرا نے یہ کہا اور اس وقت اس کی آواز کچھ نئی اور عجیب سی تھی۔ پھر اسکے بھاری بھاری پپوٹے جھک گئے اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ "لیکن میں باری باری سے تم دونوں کو لینے آؤں گی جب تمہاری زندگی کے دن شمار ہو چکیں گے۔ اس وقت میں تمہارے ساتھ ہونگی تاکہ تمہیں بھی وہاں لیجاؤں جہاں میں اب جا رہی ہوں۔"

اُس نے بات ختم ہی کی تھی کہ جھلملاتا چراغ ایک دم سے بجھ گیا گویا کسی نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اُسے بجھا دیا ہو۔ کمرے میں گہری

تازیانہ مارتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ایسی آوازیں جیسے کسی کا گلا گھٹ رہا ہو اور پھر نجمی اور سلمیٰ نے ہانپتے کانپتے دوبارہ چراغ روشن کیا وہاں عذرا کا کوئی پتا نہ تھا اب لازم تھا کہ اسے قبر کو سونپ دیا جائے۔

وہ رات نجمی اور سلمیٰ نے یکجا گذاری مرنے والی کی روح کو نیا پیام تھا وہ رات تھا جو نہ جانے کیسے کٹ گئی۔ میاں ملسلہ کی ایک نامعلوم سی خوفناکی تھی جو اس قدر زنت دل تھی اور ان باتوں پر یقین نہ کرتی تھی آج کی رات کے واقعات سے کچھ نا معلوم ہو گئی تھی اور اسے خوف تھا کہ عذرا نے موت کے وقت جو کچھ کہا کہیں وہ درحقیقت سچ ہی نہ ہو۔

طلوع صبح کے ساتھ ان کا خوف و ہراس جاتا رہا۔ سورج کی پاک کرن کھڑکی میں سے گزر کر عذرا کی نعش پر پڑ رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ساری جھریاں چہرے پر پھیل گئی ہیں جب دیکھنے والوں نے اسے دیکھا تو انہیں تعجب ہوا کہ اس قدر خوشنما اور متبسم چہرے دیکھ کر بات کیا کہ کیوں لگتی تھی شدائی نعش کی دن اس کی ماں سے پہلو میں دفن کی گئی۔ اس دن سلمیٰ کو گھر پر اندھیرا رہا اور ہر چیز پر وحشت سی چھائی ہوئی معلوم ہوتی۔ نجمی کے ذہن میں اس قسم کے خیالات مطلق نہیں تھے عذرا نے اپنا کل مال و زر سلمیٰ کے نام چھوڑا تھا اسلئے نجمی کی جیبیں خالی تھیں اور وہ اپنی بہن کی موت پر سب کچھ بھول کر کسب آمادہ ہو گئی۔

"سلمیٰ! اس تمام دولت کا کیا کرو گی؟" نجمی نے اس سے پوچھا۔

"میں سمجھتی ہوں دولت میری اپنی صورت میں ہے" سلمیٰ نے کہا "ہم دونوں کے پاس اپنا ذاتی سامان نہ ہو تو یہ فراغت گذر ہو سکتی ہے اس سے جو آمدنی ہوگی وہ میں خیراتی کاموں میں دے دوں گی۔"

"اگر خیراتی کاموں میں دے دینا ہوتا تو عذرا خود ہی دے جاتی" نجمی نے کہا "تعجب ہے کہ تم کوئی اور معقول مصرف تلاش نہیں کرتیں۔"

"تو پھر اور کیا کر سکتی ہوں؟" سلمیٰ نے پوچھا۔

"اسے جمع کرو" نجمی نے آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کہا "جمع کرو اسے۔"

سلمیٰ نے سر ہلا کر کہا "نہیں۔ آمدنی خیراتی کاموں میں جائیگی اور اصل کو میں چھونے کی بھی روادار نہیں۔ اور اگر میں تم سے پہلے مر گئی تو وہ سب تمہاری ہو جائیگی اور پھر اس کا تم جو چاہو کرنا۔"

"اچھا" نجمی نے اپنے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے کہ عذرا کا مقصد ہرگز یہ نہ ہوگا کہ تم اسکے بعد اس کی دولت کا یہ حشر کرو اور مجھے اسکا بھی یقین ہے کہ ایسی صورت میں کہ تم اسکے محنت سے جمع کئے ہوئے مال و زر کو یوں ضائع کرو وہ قبر میں بھی چین سے نہ سو سکے گی۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو؟" سلمیٰ نے کہا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا "تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہی ہو میں تو یہ سمجھتی تھی کہ تم ان باتوں پر یقین نہیں کرتیں۔"

نجمی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی بہن کی متفکر نظروں سے بچنے کیلئے وہاں سے ہٹ گئی۔

کچھ عرصے تک اس پرانے گھر کی زندگی میں کوئی انقلاب نہیں ہوا۔ عذرا کا کمرہ اسکی وصیت کے مطابق مقفل کر دیا گیا تھا۔ سارے گھر کی صفائی کے مقابلہ میں اس کمرے کے در و دیوار عجیب تصویر پیش کرتے تھے۔ نجمی باتونی تو یوں بھی نہ تھی مگر اب وہ اور بھی زیادہ چڑچڑی ہو گئی تھی اور گھر اور صحن باغ میں کسی بے چین روح کی طرح پھرتی رہتی تھی۔ اسکے ماتھے پر ہمیشہ شکنیں پڑی رہتی تھیں گویا کسی گہرے فکر میں مبتلا رہتی ہو۔ جب جاڑا شروع ہوا

تو طویل راتوں میں گھر کی تنہائی اور بھی بے پایاں معلوم ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ سارے گھر پر لٹکے خالی کمروں میں اور تاریک برآمدوں میں ایک وحشت اور خوف سا چھایا ہوا ہو۔ رات کی خاموشی میں عجیب عجیب آوازیں سنائی دیتی تھیں اور یہ آوازیں ایسی ہوتیں کہ نہ تو ہوا کے سنسنانے سے انہیں کوئی مشابہت تھی اور نہ چوہوں سے انہیں منسوب کیا جا سکتا تھا۔ [illegible] یہ عجیب عجیب آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے مگر نظر کوئی نہ آتا۔ [illegible] جلدی سے زینے کے قریب [illegible] ہوا تھا۔ [illegible] وہاں کھڑا [illegible] روشنی لے کر [illegible] باتوں سے سلمیٰ کی [illegible] اور [illegible] خلاف [illegible] کا اقرار کیا تھا کہ وہ ان باتوں کی قائل نہیں تھی۔ [illegible] متاثر نہیں ہوتی [illegible]

جب سے [illegible] منتقل ہوا تھا اس کی تمام [illegible] [illegible] وہاں [illegible] سے [illegible] کھڑی [illegible] تھی۔ رات کو جب سب [illegible] سلمیٰ [illegible] اور انجمی کے کمرے [illegible] سے [illegible] اور [illegible] کی آواز [illegible] تھی۔

ایک دن سلمیٰ نے ہمت کر کے [illegible] یہ بات [illegible] کیوں نہیں کرتیں؟ [illegible] اتنا روپیہ [illegible]

"اتنا روپیہ؟" انجمی نے تعجب ظاہر کر کے کہا "اتنا روپیہ [illegible] ہو گیا ہے [illegible] بالکل تمام کر بیٹھی ہوں۔"

سلمیٰ نے اس کی بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے کہا "[illegible] ثابت ہو گئی [illegible] معلوم ہوا کوئی [illegible] کمرے سے باہر [illegible]"

[illegible] انجمی نے سلمیٰ کا ہاتھ [illegible] سے [illegible] مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی [illegible] کی طرف [illegible] [illegible]

پھر وہ سلمیٰ نے [illegible] پوچھا۔

"وہاں کوئی بھی نہ ہو۔" انجمی نے آہستہ سے کہا [illegible] سلمیٰ [illegible] کمرے کے قریب [illegible] آواز [illegible] جیسے کوئی [illegible] پہلے [illegible] روشندان [illegible] نکلنے کی کوشش کر رہی [illegible] صبح کو میں نے جا کر دیکھا تو قفل حسب دستور بند تھا اور [illegible] تھی۔"

"ہمیں اس خوفناک گھر کو چھوڑ دینا چاہئے" سلمیٰ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

[illegible] غالب [illegible] ہے۔

"[illegible]" سلمیٰ نے [illegible] پر ہاتھ رکھ کر کہا [illegible] اپنے [illegible] تم نے [illegible] تو تمہیں [illegible] ہوں۔"

یہ کہتے کہتے اُسے ایک چکر سا آیا اور اس سے پہلے کہ نجمی اُسے سنبھالے وہ گر کر بیہوش ہوگئی

نجمی نے گل نسرین کو آواز دی۔ پانی منگایا اور اُسکے منہ پر چھینٹے دیئے۔ سلمیٰ بیہوش ہوگئی ہے!

گلنسرین نے نجمی کی طرف نفرت انگیز نظروں سے دیکھا اور سلمیٰ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگی۔ جب اُسے ذرا ہوش آیا تو نجمی اُسے گل نسرین کیساتھ چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی اور وہ دونوں چپکے چپکے باتیں کرتی رہیں۔

بوڑھی ملازمہ خوب جانتی تھی کہ یہ کیفیت زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کی جا سکتی اور وہ بار بار سلمیٰ سے کہتی تھی کہ اِس پُراسرار اور ویران گھر کو جلد از جلد چھوڑ دینا چاہیئے۔ جب سلمیٰ نے اس پر آمادگی ظاہر کی تو گل نسرین بہت خوش ہوئی مگر نجمی اس کی مخالفت کرتی رہی۔ اس خیال سے کہ گھر بدل دینے سے شاید سلمیٰ کی صحت پر اچھا اثر پڑے ایک اچھا خوشنما گھر کچھ فاصلے پر تلاش کر لیا گیا اور وہاں جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

بڑے گھر میں آخری رات تھی۔ گرمی کی شدت تھی اور دن بھر لُو چلتی رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں ہوا رقص کر رہی ہو اور سب کی سب ناچ رہی ہیں۔ جب ہوا رکی ہوتی تھی تو ایک سناٹا چھا جاتا تھا۔ آدمی کی سسکیوں کی آوازیں عجیب طرح پر فضا میں شامل کرتی تھیں۔ پھر ہوا کا جھکڑ چلنے لگتا تھا اور روحوں کی آواز دب جاتی تھی اور دروازوں میں سے سنسناتی ہوئی ہوا آ کر گھر سے ٹکراتی تھی۔ ہوائی بہت ناک چیخیں کھڑکیوں اور دروازوں میں سے سنائی دیتی تھیں کہ گویا زندہ ہو گئے تھے اور یہ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندہ ہو گئے ہیں اور چل رہے ہیں۔

نجمی اپنے پلنگ پر پڑی جاگ رہی تھی۔ کمرے میں ایک دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں کبھی کبھی ہوا کی کوئی لہر آ جاتی تھی تو سائے عجیب عجیب شکلیں اختیار کرتے تھے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا کمرے میں داخل ہوا اور وہ روشنی جس سے سلمیٰ کی تصویر روشن تھی بجھتے بجھتے رہ گئی۔ پلنگ پر پڑے پڑے وہ دروازوں اور کھڑکیوں کے پیچھے سے ہوا کے سنسنانے کی آوازیں سن رہی تھی اور افسوس کر رہی تھی کہ آج کی رات اس نے گل نسرین کو اپنے کمرے میں کیوں نہ سلا لیا۔ مگر اب کچھ زیادہ رات نہ آئی تھی اس نے اس نے جلدی سے پلنگ پر سے اٹھ کر اپنا لبادہ اتارنے کے لئے کھونٹیوں کا رُخ کیا۔ جیسے ہی اس نے کھونٹی پر سے اُسے اتارنا چاہا اس نے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کے چلنے کی آواز بالکل صاف سنی۔ لبادہ اس کی کپکپاتی انگلیوں میں سے چھوٹ گیا اور دھڑکتے ہوئے دل کیساتھ وہ بدقت پھر پلنگ پر جا لیٹی۔

پاؤں کی آہٹ پھر سنائی نہیں دی اور گہری خاموشی پھر چھا گئی۔ اس نے بہت چاہا کہ چیخ کر اس سکوتِ مطلق کو توڑ دے مگر اس کی آواز نہ نکلی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جس سے ساری کھڑکیاں لرز گئیں اور موم بتی کا شعلہ پھڑپھڑانے لگا۔ جب اس کی لو پھر قائم ہوگئی تو اُسے دکھائی دیا کہ دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا ہے اور کسی کے ہاتھ کا بڑا سا سایہ دیوار پر پڑ رہا ہے۔ اُس کی چیخ اب بھی نہ نکل سکی۔ دروازہ ایک زور کے دھماکے کے ساتھ کھلا جیسے کسی نے لات مار کر کھولا ہو کوئی داخل ہوا اور اس نے اپنے سر سے کپڑے اتار کر پھینک دیئے۔ سلمیٰ نے ایک ناقابلِ بیان خوف کے ساتھ مردہ قدرا کا چہرہ دیکھا جس کا ڈھانچہ بندھا ہوا تھا اور اسکے لبوں پر خوفناک مسکراہٹ تھی۔ سلمیٰ نے ہاتھ اٹھائے کہ اس نے امداد کے لئے پھٹی ہوئی آنکھوں سے اوپر دیکھا اور پھر اس ہستی نے آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر سلمیٰ کی پیشانی پر اپنا سرد ہاتھ رکھا۔ سلمیٰ کی ایک چیخ نکلی اور اسکے ساتھ ہی اس کی رُوح بھی پرواز کر گئی۔

گل چمن نے یہ چیخ سنی تو اس کی آنکھ کھل گئی اور خوف سے کانپتی ہوئی دروازے کی جانب دوڑی۔ کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اُسے سلمیٰ کے پلنگ پر وہ ہستی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ وہ کھڑی دیکھتی رہی کہ اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور کچھ بات کر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ گل چمن کو نجمی کا بدلا ہوا چہرہ نظر آیا جسکو خوف اور رنج کی علامات نے اسقدر بھیانک بنا دیا تھا کہ وہ پہچانی بھی مشکل سے جاتی تھی۔

"کون ہو تم؟" نجمی نے دیوار پر گل چمن کا سایہ دیکھکر خوف آمیز آواز میں پوچھا۔

گل چمن نے کہا "مجھے اس کے چیخنے کی آواز سنائی دی تھی۔ کیا کسی نے بھی آواز دی تھی؟"

"ہاں سلمیٰ نے" نجمی نے غور سے گل چمن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس نے ایک چیخ کی آواز دی تھی اور جلدی ہی بیہوش ہو گئی۔ یہ اسقدر عجیب کیوں نظر آتی ہے؟ کیا یہ بیہوش ہو گئی ہے؟"

"ہاں" بوڑھی خادمہ نے پلنگ کی پٹی پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا "اس پر موت کی بیہوشی چھا گئی ہے۔ آہ! میری پیاری! میری غریب بچی! یہ کیا انجام ہوا ہے اس کا!" وہ ماتم کرتی ہوئی کہہ گئی۔ بوڑھی عورت نے سلمیٰ کی آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے کہا جن میں ہیبت وحشت و خوف نظر آ رہا تھا "اسے کوئی نہایت ہیبت ناک چیز نظر آئی ہے۔"

نجمی نے نظریں جھکا کر کہا "اسے اختلاج کی شکایت تو پہلے ہی سے تھی۔ اس خوفناک رات نے تو وہ زندگی ہی ختم کر دی۔"

نجمی بہن کے قریب کھڑی رہی اور گل چمن نے سلمیٰ کی نعش پر ایک سفید چادر ڈال دی۔

"پہلے مدرانی اور پھر یہ بھی" نجمی نے ایک گہری سانس لیکر کہا "اب یہاں میں اکیلی رہ گئی ہوں تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں موت کے انتظار میں جاگتی رہوں گی۔"

یہ کہکر اس نے اپنا سر جھکا لیا اور کمرے میں سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف [illegible] اس نے سلمیٰ کی ڈری ہوئی آنکھوں کو آہستہ سے بند کیا [illegible] کی چیخ کی آواز سنائی دی اور وہ اُچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سلمیٰ کے کمرے کے دروازے میں آکر اس نے آواز دیکر پوچھا "کیا ہے؟"

"تم کہاں ہو؟" نجمی نے اسی آواز سے [illegible] سکون کے [illegible] میں پوچھا۔

"سلمیٰ بیگم کے کمرے میں۔ کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"جلدی سے یہاں آؤ۔ فوراً! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز ایسی ہو گئی جیسے کوئی خوف سے چیخنے لگے۔ "جلدی آؤ، جلدی، فوراً ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ گھر میں کوئی عجیب عورت ہے۔"

بوڑھی ملازمہ اندھیرے میں سیڑھیوں پر سے گرتی پڑتی نیچے پہونچی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے پوچھا "کیا بات ہے؟ کون ہے؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"میں نے خود دیکھا ہے" نجمی نے گل چمن کے کندھے کو زور سے دبا کر کہا "میں تمہارے پاس آنے کے ارادے سے سیڑھیوں پر قدم رکھ ہی رہی تھی کہ میں نے دیکھا ایک عورت میرے آگے آگے سیڑھیوں پر چڑھ رہی ہے۔ کیا یہ بات ہو سکتی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہو کہ عذرا سلمیٰ کی روح لینے

آتی ہو، اس نے کہا [illegible]

[illegible] طریقے سے [illegible] حالانکہ وہ بہت [illegible] سادگی [illegible]

[illegible] کے چہرے پر [illegible] وحشت [illegible] چلا کر کہا "چراغ جلاؤ، چراغ جلاؤ، [illegible] روشن کرو،

[illegible] کوئی [illegible] ہوگی۔

"[illegible] ہو جائے گی [illegible] اور [illegible] جب [illegible]

خوف [illegible] گی۔"

"[illegible] نہیں [illegible]؟

[illegible] کام [illegible] اور وہ [illegible]

[illegible]

"[illegible] سے [illegible]"

[illegible] کے [illegible] اور [illegible] کے [illegible]

[illegible] پہلے [illegible] ہی [illegible] کسی [illegible] بیٹے،

[illegible] اور [illegible] وہ [illegible] فرش پر گر گئی۔

[illegible] بات [illegible] سے [illegible]

اور موت [illegible] کے [illegible] اور [illegible]

[illegible] اور [illegible] کا [illegible]

ایسا [illegible] اور [illegible] کی [illegible]

[illegible] تک [illegible] کی [illegible]

[illegible] اور [illegible] کی [illegible] سے [illegible]

[illegible] یہاں تک [illegible] کے [illegible]

جاتی [illegible] مل [illegible] نظر آیا [illegible] ہو کر

گر پڑی۔ [illegible]

شاہد

پروین و ثریا [illegible] دونوں [illegible] کو [illegible] دونوں [illegible] کو [illegible] کس کو [illegible] دی جاتی ہے [illegible] کہ وہ [illegible] جاتے [illegible] دونوں [illegible] کر دی جاتی ہیں [illegible] صورتوں [illegible] ایک [illegible] نفسیاتی مسئلہ کو حل کیا [illegible] سے ان [illegible] تعریف [illegible]

[illegible] **ساقی بک ڈپو دہلی**

قدیم ہندی اسٹیج

اس مضمون کے پہلے حصے میں ہم قدیم ہندی ڈراما کی ابتدا، ڈراما کے اقسام، پلاٹ کی ترتیب، قدیم ہندی ڈراموں کی بعض خصوصیات وغیرہ کے متعلق تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں، زیر نظر مضمون میں قدیم ہندی اسٹیج کے متعلق معلومات بہم پہونچانی منظور ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس مسئلہ پر اردو زبان میں آج تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ محمد عمر نور الٰہی صاحبان نے اپنی گرانمایہ تالیف ناٹک ساگر (جو بلا شبہ اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے) میں بھی اس ضمن میں کچھ نہیں لکھا۔ صرف اتنا لکھ کر اس بیان کو ختم کر دیا کہ ... "حقیقت یہ ہے کہ کسی تھیٹر کی تعمیر کا خیال اس وقت کے تمدن سے بالاتر تھا ... لوگوں کا طرز معاشرت اور ملک کی آب و ہوا کسی ایسی تعمیر کی مقتضی نہ تھی جس سے تھیٹر کا کام لیا جاتا۔" تعجب ہے کہ ایسے ذمہ دار حضرات نے ایک اہم مسئلے کے متعلق بغیر سوچے سمجھے یہ سرسری سی رائے پاس کر دی۔ اگر وہ اس سلسلہ میں معمولی سی بھی توجہ سے کام لیتے تو خود ہی اپنی غلطی تسلیم کر لیتے۔ اس میں کلام نہیں کہ اس ضمن میں بسیار کاوش تحقیق اور دقت نظری سے کام لینا پڑتا لیکن انگریزی زبان میں اس قسم کی بہت سی کتابیں ہیں جن سے کافی سے زیادہ مواد فراہم ہو سکتا تھا اور اس طرح یہ کام تحقیق و تدقیق سے بوجہ احسن طے پا سکتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے لائق مصنفین ناٹک ساگر نے اس زحمت کو گوارا کرنا مناسب نہ خیال کیا۔ بہرطور اب ہم چند انگریزی و دیگر کتب کی مدد سے قدیم ہندی اسٹیج کے متعلق زیر نظر مقالہ پیش کرتے ہیں۔ قدیم ہندی اسٹیج کی ساخت، پرداخت اور نظم و اہتمام کے متعلق تمام امور بھرت کی نٹ شاستر (جس کے ۱۲ ابواب کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہو چکا ہے)، اور ابھی ناٹ گیتا کی تفاسیر میں شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں۔ سنگت رتن کار او ہنترو گیت آچاریہ وغیرہ سے بھی کافی مدد ملتی ہے۔

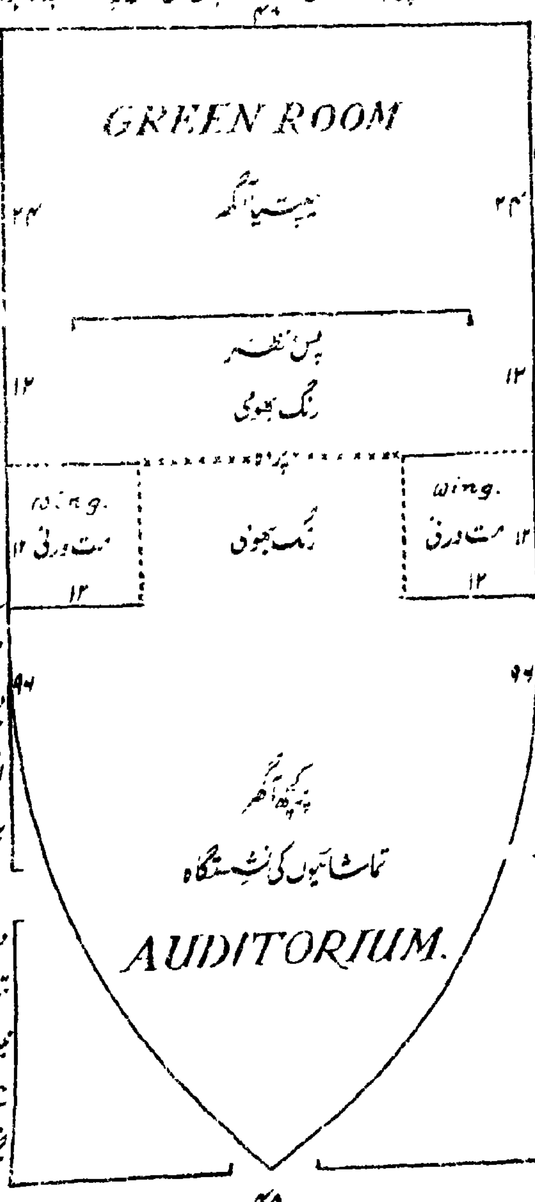
قدیم ہندی ڈراما اور اسٹیج کے اصول و ترتیب وغیرہ پر غور کرنے سے پہلے یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ قدیم ہندی تمدن ہر اعتبار سے قدیم یونانی تہذیب کے بالکل برعکس تھا۔ یونان میں جمہوریت برسر اقتدار تھی اور یہاں شخصی حکومت، اور یہی ایک چیز سارے اختلافات کی جڑ تھی چنانچہ ایتھنز کے قدیم کھیلوں کا ماحول، تماشائیوں کا ہجوم، ججوں کا مقرر ہونا، تقسیم انعامات وغیرہ ان چیزوں کا قدیم ہندی کھیلوں میں نام و نشان بھی نہ تھا۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں ایتھنز کے تھیٹر کی شکل یہ تھی کہ اکروپلس (پہاڑی) کے دامن میں آرکیسٹرا اور اسٹیج مقرر ہوتا تھا اور پہاڑی کی ڈھلان پر تماشائیوں کے بیٹھنے کی جگہ تجویز ہوتی تھی۔ اس کے برخلاف قدیم ہندی تھیٹر خود مہاراجہ کے محل کے ایک حصہ میں بنا ہوتا تھا۔[1] یونانی تماشوں کو ہزاروں تماشائی دیکھ سکتے تھے اور ہندوستانی کھیلوں کو صرف گنے چنے امراء و مصاحب وغیرہ۔ انہیں چند امور سے دونوں کے اختلافات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بھرت جی کی معرکۃ الآرا تالیف "نٹ شاستر" کا دوسرا باب تھیٹر کی عمارت (سنگت سال) کے متعلق بیشمار تفصیلات سے بھرا پڑا ہے جن میں سے ہم چند اہم باتوں کا ذکر کریں گے۔ زمین جو تھیٹر کی عمارت کیلئے منتخب کی جائے سخت اور ہر قسم کے جھاڑ جھنکاڑ سے اچھی طرح صاف ہونی چاہیے۔ حد بندی وغیرہ کی اچھی طرح پیمائش کر لینی چاہیے تاکہ مقررہ طول و عرض میں فرق نہ آئے۔ سنگ بنیاد رکھنا ایک مختتم مذہبی رسم سمجھی جاتی تھی جس میں ناچ

---

[1] یہ امر بھی ذکر کے لائق ہے کہ راج محل کے علاوہ یاترا کے میلوں اور تہواروں کے موقع پر ہر شہر اور قصبے میں بھی تماشے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً بھوبھوتی کے بہت سے ڈرامے پہلی بار ایسے ہی تہواروں کے موقع پر مختلف شہروں میں ہوئے۔

رنگ اور رہتی برہمچاریوں وغیرہ کی دعوت طعام بھی شامل تھی کیونکہ ڈرامہ کی تیاری کا جزو فرض تھا۔ بھرت جی نے سائز کے اعتبار سے
تھیٹر کی تین قسمیں مقرر کی ہیں لیکن صرف اسٹینڈرڈ سائز کے تھیٹر کا ذکر کریں گے۔ عام طور سے یہی قسم رائج تھی اور اس کو ناٹ وشمان کہتے تھے۔
یہ ۹۶ فٹ لمبی ۴۸ فٹ چوڑی اور ۲۰۰۰ فٹ اونچی مستطیل نما عمارت ہوتی تھی جس کی چھت گنبد نما ہوتی تھی اور دیواریں پختہ چونہ گچی کی۔



چہار دیواری پر شیروں، ہاتھیوں، پہاڑیوں، سبزہ زار وغیرہ کی رنگا رنگ
تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ منڈپ کے چاروں کونوں پر چار ستونوں
کا ہونا لازمی تھا۔ یہ چار ستون چاروں جاتیوں۔ برہمن، کشتری، ویشیا
اور شودر کے نام پر منسوب ہوتے تھے۔ پردہ بھی چار رنگ کا ایک
جھنڈا سا بنا رہتا تھا۔ یہ چار رنگ نیلا، سرخ، زرد اور سفید ہوتے
تھے۔ ہر ایک رنگ ایک ایک جاتی سے منسوب ہوتا تھا۔ اس قسم کے خاص
جمہوری جذبات کا اس زمانے کے تمدن میں نظر آنا عجیب سی بات ہے
لیکن شاید مدعا یہ ہو کہ مہاراجہ کے نزدیک ہر ایک جاتی کا مرتبہ ایک سا
تھا اور راج محل کے ان مشاغل میں جن کا تعلق اس خاص فن سے ہو
ہر ورن کے لوگ برابر کی حیثیت سے شریک سمجھے جاتے تھے۔
ناٹ وشمان یعنی تھیٹر کے دو برابر کے حصے ہوتے تھے۔ پہلے حصے کو
"پریکچھا گھر" (Auditorium) یعنی تماشائیوں کی نشستگاہ کہتے
تھے اور دوسرے کو "رنگ بھومی" یعنی اسٹیج۔ قدیم ہندی تھیٹر کی
عمارت کا نقشہ ایک خاکے کی مدد سے[1] اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے۔
خاکے پر ایک نظر ڈالنے سے یہ صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ
پریکچھا گھر (تماشائیوں کی نشستگاہ) ۴۸ فٹ سے ۴۸ فٹ کا ایک
مربع ہے۔ رنگ بھومی یعنی اسٹیج دو برابر کے حصوں میں منقسم ہے۔
پچھلا حصہ اداکاروں کے لباس تبدیل کرنے اور سانگ وغیرہ
بھرنے کے لئے وقف تھا۔ اس کو نیپتھیا گھر یعنی گرین روم کہتے تھے۔
نیپتھیا گھر اور رنگ بھومی کے بیچ حصے کے درمیان ایک دیوار جس پر
طرح طرح کے رنگین نقش و نگار بنے ہوتے تھے، ایک مستقل

[1] یہ خاکہ انڈین تھیٹر مصنفہ ڈاکٹر آر کے یاجنک سے دیا گیا ہے۔ یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ کئی برس ہوئے ڈاکٹر بلوچ کی مساعی سے رام گڑھ میں ایک کھنڈر برآمد ہوا تھا جسے علماء نے ۲۲۰۰ برس پرانی عمارت بتایا۔ ساخت اور نقشہ سے صاف پتہ چلتا تھا کہ کسی اسٹیج کی منہدم شکل ہے جو بھی بھرت جی کی ہدایات کے موافق تعمیر ہوا تھا۔
کلکتہ ریویو بابت جنوری ۲۴ء صفحہ ۱۰۹ مقالہ نگار ایس مکرجی

پسِ منظر Back-ground کے طور پر حائل ہوتی تھی اور اِس دیوار کے آگے والا حصہ ہی اصل رنگ بھومی کہلاتا تھا۔ نیپتیا گھر یعنی گرین روم اصل رنگ بھومی (فرنٹ اسٹیج) سے ذرا نشیب میں ہوتا تھا۔ اور اس میں داخل ہونے کیلئے دو ایک سیڑھیاں اُترنی پڑتی تھیں۔ اصل رنگ بھومی پھر دو برابر کے حصوں میں منقسم ہوتا تھا۔ گو کوئی درمیانی حدفاصل نہ تھی لیکن پردہ (یُونیکا) انہیں دونوں حصّوں کے درمیان حائل ہوتا تھا۔ یہ پردہ اوپر سے نہیں گرتا تھا بلکہ عام طور پر درمیان میں سے پھٹ کر اِدھر اُدھر ہو جاتا تھا۔ پردے کے سبب سے جو دو قیاسی حصّے ہو جاتے تھے اُنہیں ہم آسانی کیلئے اگلا اور پچھلا اسٹیج کہیں گے (front and back stage) اگلے اسٹیج کے دونوں بازوؤں پر ۱۲ مربع فٹ کے دو سائیڈ ونگز بنے ہوتے تھے جس کو مت ورنی یعنی Parascenia کہتے تھے۔ ان کی ضرورت ظاہر ہے۔ قدیم زمانے میں مت ورنی (ونگز) آرکیسٹرا یعنی سازندوں وغیرہ کیلئے وقف تھے۔ کبھی کبھی پرامپٹر بھی یہیں سے اپنے فرائض ادا کرتا تھا۔ سوتر دھار (منیجر و مہتمم) بھی بعض اوقات اداکاروں کے حسنِ عمل کا معائنہ یہیں سے کیا کرتا تھا۔ اسٹیج کا ساز و سامان (پراپرٹی) انہیں ونگز میں رکھا جاتا تھا۔ یہ چیز نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ اگلے اسٹیج کے سامنے کوئی ڈراپ یا پردہ نہیں ہوتا تھا اور وہ مستقل طور پر سامنے سے کھلا رہتا تھا۔

پریکچھا گھر یعنی نشستگاہ ایک کشادہ زینے کی شکل میں بنائی جاتی تھی۔ تاکہ آخری قطار میں بیٹھنے والے لوگ بھی آسانی سے دیکھ سکیں۔ سائے پریکچھا گھر میں چوبی سیڑھیاں سیڑھیاں سی بنی ہوتی تھیں اور اولین سیڑھی فرش سے ۲½ فٹ اونچی ہوتی تھی۔ ان سیڑھیوں پر لوگ آلتی پالتی مارکر بیٹھتے تھے۔ راجہ ایس[۱]۔ ایم۔ ٹیگور نشستگاہ کی ترتیب کے متعلق لکھتے ہیں کہ "سنگت سال کا مشرقی حصہ مہاراجہ یا امیرِ مجلس کے لئے وقف ہوتا تھا جو ایک سنگھاسن پر براجمان ہوتا تھا۔ برہمن، شاعر، جوتشی اور دیگر علماء مہاراجہ کے دائیں بازو اور سنگت سال کے جنوبی حصہ میں متمکن ہوتے تھے۔ اُمرا، وزرا، اور ارکینِ سلطنت وغیرہ شمالی حصّے میں اور راج محل کے کنور کماری۔ لڑکے بالے اسٹیج کے بالکل قریب بیٹھتے تھے۔ رانیاں اور حرم سرا کی دیگر خواتین مہاراجہ کے بائیں طرف۔ نقیب عصا ہاتھ میں لئے امن و خاموشی قائم رکھنے کیلئے جا بجا کھڑے رہتے تھے۔ دہریئے، مسلح، اجنبی اور مشکوک لوگوں کو سنگت سال میں آنے کی اجازت نہ تھی۔

پروفیسر[۲] ہورو دِتز آج سے چودہ سو سال قبل اجین میں شکنتلا کی تمثیل کا نقشہ دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ ناٹک ساگر میں بھی ان کا یہ بیان درج ہے۔ ہم وہیں سے ذیل کا دلکش مقام نقل کرتے ہیں۔

"کالیداس نے ایک نیا ڈرامہ تیار کیا ہے جس کی پہلی نمائش موسمِ بہار میں قرار پائی ہے۔ اہلِ اجین اپنے شیریں مقال شاعر پر ناز کرتے ہیں اور فرطِ عقیدت میں کہتے پھرتے ہیں کہ سلاستِ زبان اور رقتِ جذبات میں ہندوستان کا کوئی ڈرامہ شکنتلا سے لگا نہیں کھا سکتا۔ مہاراجہ بکرماجیت کا فرمان ہے کہ یہ ڈرامہ راج محل میں اسٹیج کیا جائے۔ منتخب روزگار اداکار، اُستاد العصر شاعر اور پھر نسبت کی دلفریبیوں سے جو کیفیت پیدا ہو گی سب اُس کے لئے ہمہ تن انتظار ہیں۔ محل کا سنگت سال جو بالعموم رقص و سرود کی محفلوں کیلئے وقف تھا شکنتلا کی نمائش کیلئے آراستہ کیا گیا۔ ایک کشادہ صحن میں سامعین کی نشست کا انتظام ہے صحن کے گرداگرد سنگِ مرمر کے خوبصورت ستون حلقہ باندھے کھڑے ہیں جن پر تازہ پھولوں کے ہار چڑھائے جا رہے ہیں۔ صحن کے عین وسط میں شاہی شامیانہ نصب ہے جس کی سُنہری جھالریں چکا چوند کا عالم پیدا کر رہی ہیں۔ شامیانہ چھ نقرئی چوبوں پر قائم ہے۔ تھیٹر کے پہلو میں شاہی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اسٹیج کا پردہ لعل و الماس کی ایک

---

[۱] ہندو ڈرامہ مصنفہ راجہ ایس۔ ایم ٹیگور۔ [۲] انڈین تھیٹر مصنفہ ای۔ پی ہورو دِتز۔

ہیں۔ تمام زنجیریں بند ہوا ہوتا ہے۔ یہ زنجیر شاہی کی نذر کی جائے گی کیونکہ مہاراجہ بہرات کا بڑا قدرداں ہے۔ سپیدۂ صبح کے نمود کے ساتھ ہی اسٹیج کے نقب میں سازندے چھیڑتے ہیں اور مہاراجہ بکرماجیت تاج سر پر رکھے شاہی لباس پہنے اپنے خدم وحشم کے جھرمٹ میں جلوہ افروز ہے۔ ماتحت راجاؤں کو دائیں طرف اور مہارانی اور کنیزوں کو بائیں ہاتھ پر جگہ ملتی ہے۔ مہارانی کی خواص کے ہاتھ میں ایک سونے کی بانسری اور سدابہار پھولوں کا گلدستہ ہے جو ملک الشعراء کو مہارانی کی طرف سے پیش کیا جائے گا۔ سیاہ فام غلام سرخ وردیاں پہنے اور ارغوانی کمربند لٹکائے لوازمات تقسیم کرتے پھرتے ہیں۔ ان کالی گھٹاؤں میں سفید گردنوں والی ماہ جبیں خواتین موتیوں کی مالا پہنے نیم تاج سر پر رکھے بجلی سی چمکا رہی ہیں۔ دور دراز مقاموں سے آئے ہوئے مہمان اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے باتوں میں مشغول ہیں۔ اراکینِ سلطنت، پیشوایانِ دین، علماء و فضلا غرضیکہ اعیان کی سوسائٹی کی روح اس مجلس میں موجود ہے۔ کہیں چند مدبر نیپال کی کسی بغاوت کے استیصال کی تدابیر پر بحث کر رہے ہیں۔ ایک پُرسکون گوشہ میں شاہی جوتشی وراہمہیرا ایک سفید ریش ایرانی سے سرگرم کلام ہے۔ شاہی مدبر سنسکرت لغات کے آخری جزو اپنے ان چینی دوست کے حوالے کر رہا ہے جو جنوبی چین سے محض اسی غرض سے آیا تھا ــــ یکایک سارنگی، ستار اور بانسری کے مدہوش کن سُر بلند ہوتے ہیں۔ سارا سنگت ہال دلنشین نغموں سے وجد میں آنے لگتا ہے۔ چند خوش گلو نوجوان سامنے آکر بھجن گاتے ہیں اور مہاراج اور دیگر معززین کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس کے بعد سوتردھار آشیرباد دیتا ہے اور ظرافت آمیز نظم میں حاضرین سے خاص توجہ کا التماس کرتا ہے۔ شاہی حاجب جواہرات کی زنجیر کھول کر کالیداس کے سر پر رکھ دیتا ہے۔ پردہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ حاضرین کے شور وغل سے سنگت ہال گونج اٹھتا ہے۔ ڈراما شروع ہوتا اور ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے .... وغیرہ وغیرہ

جہاں تک سین بلڈنگ اور اسٹیج مشینری کا تعلق ہے قدیم ہندی اسٹیج اس سے بہت کم آشنا تھا۔ گو بھرت جی نے معمولی مشینوں اور چھوٹے چھوٹے اسٹیج ٹرک کا ذکر کیا ہے، جسے "یتہ" کہتے تھے مگر یہ چیزیں عموماً نایاب تھیں۔ مختلف سین سینری البتہ گاہے گاہے استعمال ہوتی تھی۔

بھرت جی نے اسٹیج پراپرٹی (ساز و سامان) جسے "پُست" کہتے تھے، کی تین اقسام مقرر کی ہیں۔ "سندھیما" یعنی وہ اشیا جو بانس کی کھپچیوں سے بنائی جائیں اور جن پر ہرن چیتے وغیرہ کی کھال یا کوئی کپڑا منڈھا ہوا ہو۔ "ویاجما" جو کسی مشین کی مدد سے تیار ہوں اور "وشٹما" یعنی صرف کپڑے کی اشیاء۔ ہتھیار وغیرہ کسی ٹھوس دھات کے نہیں ہوتے تھے بلکہ لکڑی اور لاکھ کے بنتے تھے۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قدیم ہندی ڈراما کا مقصد صرف مایا یعنی نظر فریبی پیدا کرنا تھا اور اسی سبب سے وہ لوگ سین سینری اور اصلی ساز و سامان کے کچھ ایسے زیادہ قائل نہ تھے۔

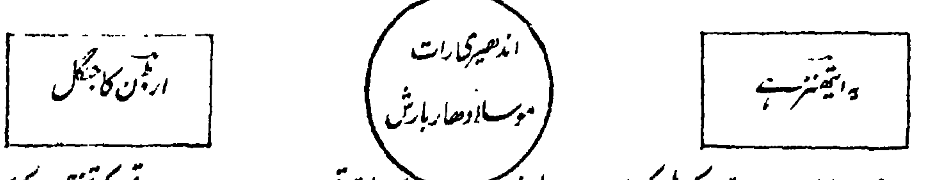
اداکاروں کے لباس کے متعلق اگرچہ یہ احتیاط لازمی تھی کہ رواج کے مطابق ہوں پھر بھی چند خاص قسم کے لباس رسمی طور پر اداکاروں کیلئے مخصوص ہو گئے تھے۔ یہ لباس شوخ رنگ، چمکیلے، فوق البھڑک اور چھوٹے گوٹے کناری سے لپے ہوئے ہوتے تھے۔ راجہ مہاراجہ اور عورتوں کے لباس میں بےشمار زیورات بھی شامل ہوتے تھے۔ مگر سارے زیورات موم یا لاکھ کے ہوتے تھے جن پر سنہری روپہلی پترا چڑھا ہوا ہوتا تھا تاکہ روشنی میں خوب چمک سکیں۔ میک اپ یعنی سانگ بھرنے کیلئے عموماً رال (resin) گلال اور ابرک وغیرہ استعمال کی جاتی تھی۔

تماشے زیادہ تر تہواروں یا شادی بیاہ کے موقعوں پر کئے جاتے تھے۔ رتناولی اور مدراراکھشس دونوں ڈرامے پہلی مرتبہ تہواروں ہی پر کئے گئے۔ بسنت کے موقع پر کام دیو (کیوپڈ) کا تہوار ڈراموں کی نمائش کیلئے وقف تھا۔ یوں مہاراجہ یا کسی اور رئیس کے ہاں لڑکا پیدا ہونے پر، دشمن پر فتح پانے یا صلح ہونے پر، کسی نئی عمارت کی تعمیر کے موقع پر خوشی اور جشن کا اظہار عام طور سے ڈراما ہی سے ہوتا تھا۔ سہرے کا

وقت ڈراموں کی نمائش کیلئے معین تھا۔ عموماً ایک ڈراما چار پانچ گھنٹے میں ختم ہو جاتا تھا۔ یہ امر بھی ذکر کے لائق ہے کہ یونان میں ایک ہی وقت میں دو تین ٹریجیڈیز اور ایک آدھ کامیڈی کی جاتی تھی اور یہاں اُتنے ہی وقت میں صرف ایک مکمل اور مبسوط ڈراما ہوتا تھا۔

ایکٹرز اور ایکٹریسیز سوسائٹی میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے چونکہ یہ لوگ راجہ مہاراجوں کے ہم مشرب ہوتے تھے اسلئے اُنکے پیشے کی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ اداکاری کا پیشہ عرصہ دراز تک برہمنوں کیلئے مخصوص رہا۔

اس جگہ قدیم ہندی تھیٹر اور ملکۂ الیزبیتھ کے زمانے کے انگریزی تھیٹر کا تقابل بے محل نہ معلوم ہوگا اس لئے کہ ہر دو میں بعض امور کے اعتبار سے عجب یکسانیت پائی جاتی ہے پہلی بات جو نوٹ کرنے کے لائق ہے یہ ہے کہ دونوں میں یہ مفاہمت عام تھی کہ حاضرین اپنے تخیل سے قصہ کا محل وقوع اور گرد و پیش کے ماحول کا اندازہ خود بخود کر لیتے ہیں۔ انگریزی تھیٹر میں یہ اس طرح ہوتا تھا کہ ہر ایک سین کے شروع میں اس طرح کی چھوٹی چھوٹی تختیاں دکھادی جاتی تھیں :-



حاضرین جلسہ ان ہدایتوں کو پڑھکر سین اور ماحول فرض کر لیتے تھے۔ ہندوستان میں اس قسم کی تختیوں کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ سوتردھار ڈائریکٹر خود سامنے آکر فصیح و بلیغ زبان میں سین کا محل وقوع بیان کر دیتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ہر دو تھیٹروں میں صرف ایک ہی پردہ کا استعمال رائج تھا۔ دونوں جگہ کے لباس بھڑکیلے ہوتے تھے۔ دونوں تھیٹرز کے ڈراموں کی زبان جوشیلی، محاورات اور ژولیدہ استعارات سے پُر ہوتی تھی۔ ولایت میں زنانہ پارٹ لڑکے کرتے تھے اور یہاں عورتیں۔ دونوں اس چیز کے بھی برابر کے قائل تھے کہ ہیرو یا ہیروئن کی مصیبت کے وقت آسمانی قوتیں اُن کی مدد کرتی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

قدیم ہندی اسٹیج اور الیزبیتھین اسٹیج کے تقابل سے ہم یہ نتیجہ مستنبط کر سکتے ہیں کہ جو جو باتیں ہندوستان میں چوتھی پانچویں صدی قبل مسیح میں رائج تھیں اُن میں کی بعض باتیں ولایت میں سولھویں صدی بعد مسیح رائج ہوئیں۔ تفاوت ملاحظہ ہو!

ہندوستان کی ڈرامائی تاریخ پر نظر رکھتے ہوئے ہم قدیم ہندوستانیوں کے بے مثل تمدن اور اُن کی لائقِ رشک ذکاوت و حسن کاری کی ستائش و توصیف پر مجبور ہیں۔ لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہم نے تمام قدیم علوم و فنون کو اپنی ناقدر شناسی، جمود اور بےحسی کے سبب دفسانۂ کہن بنا دیا ہے۔ اسی ڈراما کو لیجئے۔ یہ فن خالص ہندوستانی ایجاد ہے اور آج سے ہزاروں سال پہلے جبکہ اقوام عالم ڈراما کے نام سے بھی نا آشنائے محض تھیں یہاں یہ فن اس درجہ مکمل، منظم اور منضبط تھا کہ دنیا کی ڈرامائی تاریخ اسکی نظیر پیش نہیں کر سکتی لیکن آج ہم اسی فن کے اکتساب کیلئے انگریزی اور دیگر غیر زبانوں کے محتاج ہیں۔ یہ اسلئے کہ ہم نے اپنے اسلاف کے کارہائے نمایاں اور انکی فتوحات کو پس پُشت ڈال رکھا ہے غیر قوموں اور غیر زبانوں سے بھیک مانگنے پر تیار ہیں لیکن خود اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں سے استصواب کرنا اپنے لئے عار سمجھتے ہیں۔ پھر یہ نہیں کہ قدیم علوم و فنون سب کے سب فنا ہو گئے بفضلِ ایزدی ابھی یہ نوبت نہیں آئی۔ بیشتر چیزیں موجود ہیں گو ہماری ناقدری اور فقدانِ ذوق کے سبب دگرگوں حالت میں منتشر ادھر اُدھر پڑے پھرتے ہیں۔ ہماری ذرا سی توجہ انہیں ازسرِ نو زندہ کر سکتی ہے۔ لیکن کسے غرض پڑی ہے کہ مُفت کا دردِ سر مول لے!!

انصار ناصری۔ بی۔ اے دہلوی

ملکۂ مصر

قدیم مصر کی ایک حکایتِ رنگیں

آخر کار ظُمر کے الفاظ اور اشارات نے راحیل کے خیالات پر بہت گہرا اثر پیدا کر دیا۔ اور وہ اپنے پُر اسرار مہمان کو بہت غائر نظر سے دیکھنے لگی۔ اس نے دھیمے چراغ کی جھلملاتی روشنی میں اُسکے رنگ رُخ کا عمیق مُعائنہ کیا۔ اُس نے طہوثر کے دست و بازو اور چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اور اس نے دیکھا کہ وہ مصری خاتون بہت ہی حسین ہے۔ حالانکہ اس انکشافِ حقیقت پر بھی نرم دل راحیل کے دل میں کوئی تلخ جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ اُسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس قدر رعنائیوں اور کمالِ حسن کی حامل ہستی اپنے اندر ایسی کمینہ و ذلیل روح بھی پوشیدہ رکھ سکتی ہے جس میں دغابازی کی صلاحیت موجود ہو۔ اس طرح اس نوجوان اور روشن ضمیر اسرائیلی روح نے اس ضعیف لیکن تجربہ کار دماغ کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے پر اپنی رائے قائم کی۔

صبح کی روشنی نمودار ہوئی اور رات کے اندھیرے کے ساتھ مریضہ کے بخار میں اضافہ ہو گیا۔ کبھی اس پر شدید ہذیان کی کیفیت طاری ہوئی اور کبھی بے خبری کی نیند آ گئی۔

"اگر اس جگہ اسکی زندگی کا پیمانہ چھلک گیا تو اسکی موت کے ذمہ دار ہم ٹھیرائے جائیں گے" ظُمر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"اسے موت نہیں آئے گی" اسکی مالکہ نے مطمئن لہجہ میں کہا۔

"میں اس کی نعش کو دریائے نیل میں پھینک سکتی ہوں" ضدی ظُمر نے کہا "خونخوار گھڑیال اسکے جسم کا خاتمہ کر ڈالیں گے"

رات کے وقت پوعیفری پھر آیا اور اس نے حورا کو پہچان لیا۔ اسکو حد درجے تعجب ہوا اسکی سمجھ میں نہ آسکا کہ کس طرح بیکس طہوثر اس جیسے مقام پر آ سکتی ہے۔ اسکے استعجاب سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ وہ پوعیفری کے سامنے بیٹھ گئی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اصل حقیقت کا مطالعہ کرنے لگی۔ اس نے کہا۔

"اس کا یہ مطلب ہے کہ تم اس سے واقف ہو؟"

"ہاں" یہ تھا اس سوال کا معمولی جواب۔

ظُمر کنیز کی آنکھیں اطمینان کی شعاعوں سے چمک اُٹھیں۔ اس کا قیاس درست ثابت ہو رہا تھا لیکن راحیل متین و سنجیدہ معلوم ہو رہی تھی۔ اُسے اپنے عاشقِ صادق پر کامل اعتماد تھا۔ پھر پوعیفری نے تمام قصہ بیان کیا اور اس تلاش کا ذکر کیا جو شاہی فرمان کے مطابق عمل میں آ رہی تھی۔

"دیکھا میری مالکہ! میرا اندیشہ صحیح نکلا" ظُمر نے کہا "حورا اور طہوثر ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں"

"یہ ممکن ہے" پوعیفری نے کہا "لیکن اب بھی بعض رموز انکشاف طلب ہیں جنکی عقدہ کشائی کرنے سے میری عقل قاصر ہے — طہوثر نے بھیس کیوں بدلا۔ اور وہ یہاں کیوں آئی؟"

"وہ تمہارا تعاقب کرتی ہوئی یہاں آگئی۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی" راحیل نے جواب دیا۔

آخر کار بہت کچھ بحث و تمحیص کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ طہوٹر اس اسرائیلی مکان میں کس طرح داخل ہوئی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے افسانے کے ہر حصے کو پیش نظر رکھا۔

"بلاشبہ واقعات اسی طرح گذرے جیسا کہ قرین قیاس ہے" پوعیری نے کہا "اس کا ہر فعل میری نگاہ کے سامنے ہے مگر میں اسکے مقصد کو نہیں سمجھ سکتا"

"اسے میں واضح کردوں گی" راحیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "خدا یا بالفاظ دیگر طہوٹر نے تمہیں بدلا اور تمہارے گھر میں داخل ہوگئی صرف اسلئے کہ وہ تمہارے قریب رہ سکے۔ پھر حسد کا مادہ پیدا ہوجانے کے بعد اس نے تمہارا تعاقب کیا جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہے۔ اس کو تم سے محبت ہے۔ تم خوبصورت ہو، قوی و بہادر ہو اور رحمدل۔ تاہم میں اس سے متاثر نہیں ہوئی ہوں حسد نہیں کرتی کیونکہ جانتی ہوں کہ تم کو اس سے محبت نہیں ہے۔ کیا اب تم زیادہ اچھی طرح سمجھ گئے ہو؟"

پوعیری کے چہرے پر تیز گردش خون کی جھلک نمودار ہوئی۔ اسے اندیشہ ہوا کہ ضرور راحیل کو صدمہ پہونچا ہے۔ اور وہ اسکی محبت کا امتحان لے رہی ہے۔ لیکن جن نظروں سے راحیل نے اسکی طرف دیکھا وہ اس قدر صاف، منور اور منزہ تھیں کہ اس پر ظاہر ہوگیا کہ اسکے دماغ پر دیر تک قائم رہنے والا کوئی خیال مرتسم نہیں ہوا ہے۔ ہرچند وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ طہوٹر اسکی عزیز ترین ہستی پوعیری سے محبت کرے۔ پوعیری کیلئے بھی راحیل کا جذبہ محبت کافی ہونا چاہئیے تھا اور کافی تھا۔

اور اب عالم رویا میں نظر آنے والے مدھم نقوش میں طہوٹر کو دکھائی دیا گویا پوعیری اسکے قریب کھڑا ہے۔ انتہائی مسرت کی لہر اسکے چہرے پر دوڑ گئی۔ اپنے جسم کو کسی قدر اٹھاتے ہوئے اس نے پوعیری کا ہاتھ گرفت میں لے لیا اور اسکو اپنے ہونٹوں تک لے گئی۔

"اسکے لب تمتا رہے ہیں" پوعیری نے سادگی سے کہا۔

"شدید بخار کی مانند وہ آتش محبت سے جل اٹھے ہیں" راحیل نے کہا "لیکن وہ درحقیقت علیل ہے۔ کیا نعم کو جاکر موسیٰ کو بلا لانا چاہیئے؟ وہ فرعون کے دربار میں رہنے والے مقدس مہاتماؤں سے زیادہ ذی فہم ہے۔ یقیناً وہ خود سب کچھ کرسکتا ہے جو وہ سب ملکر کرسکتے ہیں۔ وہ طہوٹر کا علاج کرسکیگا۔ میں اتنی بے رحم نہیں ہوں کہ اسکی صحت بھی نہ چاہوں"

پس نعم روانہ ہوگئی۔ اور جلدی ہی ایک طویل القامت شخص کو اپنے ساتھ لے آئی جس کی ڈاڑھی سیاہ تھی اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اسکے اندر ایک پیغمبرانہ شان جھلک رہی تھی۔ پوعیری نے چند مخصوص باتیں اسکے سامنے بیان کردیں اور طہوٹر کے قریب مسہری پر بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ اسکی طرف پھیلاتے ہوئے مندرجہ ذیل آیت پڑھکر دم کردیا۔

"اس ہستی کا نام لیکر جو قادر مطلق ہے اور جسکے مقابلے میں باقی تمام دیوتا محض مٹی کے بت یا شیاطین ہیں اور اگرچہ تو اس پسندیدہ قوم میں سے نہیں جو معبود حقیقی کے نزدیک مقرب ہے تاہم میں کہتا ہوں کہ تجھے صحت نصیب ہوجائے"

وہ بزرگ انسان ان تمام لوگوں پر ایک سکوت منتظرہ طاری کرکے نہایت متانت سے قدم اٹھاتا ہوا واپس چلا گیا۔ طہوٹر یہ محسوس کرکے متعجب ہوئی کہ اچانک اسکو ان آلام سے نجات مل گئی ہے جن میں اسکی روح مبتلا ہوگئی تھی۔ اس نے کمرے میں اپنے چاروں طرف نظر ڈالی اور اپنے جسم پر پڑے ہوئے کمبل کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے اٹھی اور بستر پر بیٹھ گئی۔ اب ماندگی و بخار کا اثر تک باقی نہیں تھا۔ اسے فرحت محسوس ہو رہی تھی

گویا اُس نے کافی دیر تک آرام و سکون حاصل کیا ہے۔ اس وقت اُس کا حُسن و جمال اپنی تمام منزّہ اور پاک خصوصیات کے ساتھ درخشاں ہو رہا تھا۔ اپنے نازک ہاتھوں سے بالوں کی لٹوں کو جو کنپٹیوں کے چاروں طرف منتشر ہو رہی تھیں پس پشت ڈالتے ہوئے وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ گویا وہ چاہتی تھی کہ پوغیری کی وہ خاص ادا دیکھ لے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ راحیل کے پہلو میں بے حس و حرکت بیٹھا ہے اور اپنی نظرِ التفات سے اس اوائے دلبری کی مطلق پذیرائی نہیں کرتا وہ نوجوان اسرائیلی خاتون کی طرف بڑھی اور اپنے بازوؤں کو اس کی گردن میں حمائل کر دیا۔ یہ کیفیت کچھ دیر طاری رہی۔ اس کا سر راحیل کے پہلو میں چھپا ہوا تھا اور خاموشی کے ساتھ آنسو جاری تھے۔ پھر ہلکی ہلکی سسکیاں شروع ہوئیں۔ اور وہ بیتابی کے ساتھ اپنی رقیب کے سینے سے لپٹ گئی۔ اس بیقراری اور حرماں نصیبی کی کیفیات نے راحیل کے دل پر بہت گہرا اثر کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طموثر اعترافِ شکست کرتے ہوئے اپنی قابلِ رحم اور خاموش التجاؤں کے ذریعے عفو اور درگذر کی طالب ہے۔ اس نے اپنی رقیب کی فیاضانہ شخصیت سے مدافعت کی۔

راحیل کا دل نرم ہو گیا چنانچہ اُس نے شفقت سے کام لیتے ہوئے کہا "اپنے آنسوؤں کو خشک کر لو اور پریشان خاطر مت ہو۔ تم کو پوغیری سے محبت ہے بہت خوب۔ تم شوق سے اس سے محبت کرو۔ میرے دل میں حسد کا مادہ پیدا نہیں ہو گا۔ ہماری قوم کے جدِّ امجد حضرت یعقوب کی دو بیویاں تھیں اور ان دونوں کی زندگی مسرت و شادمانی کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔"

طموثر راحیل کے قدموں میں جھک گئی اور اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا لیکن راحیل نے اُسے فوراً اٹھا لیا اور بالکل خواہرانہ طریقے پر اس سے بغلگیر ہو گئی۔

کتنا حسین اجتماع تھا مختلف نسلوں اور خد و خال کی دو خواتین لیکن دونوں حُسن و جمال کے بہترین پیکر نسائیت۔ طموثر — دلکش خطوط میں خوشنما جاذبیت اور انوکھا متنوع صفات کا اجتماع۔ ایک شاداب نوشگفتہ غنچہ کی مانند۔ اور راحیل — اپنی نوخیزی شباب کے زیرِ اثر نوشگفتہ غنچہ خیز اور تمکین و جلال کا مثالی نمونہ۔

"طموثر ..... کیا دراصل تم طموثر ہی ہو؟" پوغیری نے دریافت کیا۔

"ہاں!" اس نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ تحتمس کے عالیشان محلوں میں رہنے والی ایک ہستی جس کی خدمت کیلئے بیشمار کنیزیں مامور ہوں کیونکر گوارا کر سکتی ہے کہ وہ ایک ایسی نسل کے رکنِ واحد سے رشتۂ محبت قائم کرے جو بوجہ تنزل خدمتگذاری اور غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہو۔ ایک ایسے شخص کیساتھ محبت جو تمہارے لئے اجنبی ہے اور غیر مقلد بھی۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ کہ اسکے اور تمہارے درمیان زبردست مغائرت ہو؟"

راحیل اور طموثر دونوں مسکرانے لگیں۔ دل اسیرِ محبت ہوتا ہے، اپنی آرزو کے مطابق۔ اُسے مجبور نہیں کیا جا سکتا کسی بیرونی دباؤ یا اثر کے ذریعے۔

"اگرچہ فرعون کی نظرِ التفات مجھ پر مبذول ہے پھر بھی میں تمہارا ہمسر نہیں ہوں۔ اہلِ مصر کی نگاہوں میں میری وقعت ایک غلام کی سی ہے۔ اور تم رکن ہو ایک کاہن خاندان کی — اعلیٰ ترین اور سب سے زیادہ قابلِ احترام — اگر تم کو مجھ سے محبت ہے۔ جس کی حقیقت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں تو اسکے معنی یہ ہوں گے کہ تم اپنے بلند مرتبے پر داغ بدنامی لگا رہی ہو — کیا ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو سکتے ہیں —؟"

اب پہلی مرتبہ طہوتر نے پوعیری کے سوال کا جواب دیا "کیا میں اس سے قبل تمہارے مکان میں ایک ملازمہ کی حیثیت سے زندگی بسر نہیں کرچکی ہوں؟"

"تمہیں نبیّت کی خاطر ترکِ وطن کرنا پڑے گا۔ اور صحرائے اعظم کو عبور کرکے اس غیر سرزمین پر میرے ہمراہ چلنا ہوگا جہاں آفتاب کی تمازت ہر شے کو جھلس دیتی ہے۔ گرم ہواؤں کے طوفان اٹھتے ہیں۔ اور گرد و غبار کی آندھیاں سڑکوں کے نشانات تک کو نظر سے اوجھل کر دیتی ہیں۔ وہاں نہ کوئی سرسبز درخت میسر آئے گا۔ اور نہ فرحت بخش چشموں کی روانی تمہارے دلوں میں سرور پیدا کرسکے گی۔ راستے ان ہستیوں کی استخوان بوسیدہ سے اٹے پڑے ہیں جو تم سے قبل اس راہ سے گئے اور ناکامیاب رہ گئے"

"میں ضرور چلوں گی" طہوتر نے آہستگی سے کہا۔

"لیکن ابھی کچھ اور بھی کہنا باقی ہے۔ تمہارے دیوتا وہ نہیں ہیں جو میرے دیوتا ہیں۔ میرے خدا کا حکم ہے کہ تم کو سنگین، چوبی یا دھات کے بنے ہوئے بتوں کی پرستش نہیں کرنی چاہیئے۔ ایک اور صرف ایک خدا، وحدہٗ لاشریک، ازلی و ابدی، جسم اور روح کی قید و بند سے آزاد، خد و خال اور رنگ و روغن کی تخصیص سے بے نیاز اس عرصۂ سماوات میں رہنے کیلئے کافی ہے جسکو تمہاری مصری قوم ہزاروں خاکی پتلوں سے آباد رکھتی ہے۔ ہمارے معبودِ حقیقی نے ہم کو تخلیق کیا اور تمہاری مصری قوم اپنے دیوتاؤں کو خود اپنے ہی ہاتھ سے تخلیق کرتی ہے"

طہوتر پر ایک تذبذب کی حالت طاری ہوگئی۔ اور اسکے دل میں تشکک ارتیاب کا مادہ پیدا ہوگیا۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے عقائد کو ٹھکرا دے؟ اور چنانچہ اس نے پوعیری سے خدا کے متعلق زیادہ واضح طور پر بیان کرنے کی استدعا کی۔ تاکہ وہ بھی اس کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرسکے۔

"یہ بات کس قدر سہل معلوم ہوتی ہے" پوعیری نے کہا "تم ضرور میری شریکِ حیات بن جاؤ گی۔ تم کو یہیں مقیم رہنا پڑے گا کیونکہ فرعون کے دل میں تم کو حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی ہے اور اسکے حکم سے ہر جگہ تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔ جب تک تم اس فلاکت زدہ چار دیواری میں ہو وہ لوگ تمہارا کھوج نہیں لگا سکیں گے۔ اور چند یوم کے بعد ہم ان کی دسترس سے باہر نکل جائیں گے۔ اچھا اب کافی رات گذر چکی ہے، مجھے رخصت ہونا چاہیئے"

یہ کہکر پوعیری چلا گیا۔ اور دونوں حسین عورتیں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسی تنگ مختصر بستر پر آسودۂ خواب ہوگئیں۔

طمر جو اس تمام منظر کے دوران میں جو ابھی ابھی اس جھونپڑے میں وقوع پذیر ہوا ایک قریب کے کونے میں پوشیدہ طور پر بیٹھی رہی تھی اپنی جگہ سے اٹھی اور ان دونوں منہ بولی بہنوں کی صدائے تنفس کو خوب توجہ سے سننے لگی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ ان کی نیند گہری ہو چکی ہے تو وہ صد درجہ خاموشی کیساتھ دروازے کے باہر کھسک گئی۔ اور پھر تیز تیز قدم اٹھا کر اسنے ساحلِ نیل کی جانب راہ لی۔

وہ جلدی ہی تاریکی سے نکل گئی۔ اور ان مخدوش مقامات اور خطرناک جگہوں سے بھی گذر گئی جہاں عموماً راہزنوں اور ڈاکوؤں کے گروہ پھرا کرتے ہیں۔ وہ بستی کے اس حصہ میں پہونچ چکی تھی جہاں امرائے شہر کی آبادی ہے۔ تین چار راستوں کے مقامِ اتصال پر بلند عمارات کے سلسلے دور تک پھیلے ہوئے تھے حتیٰ کہ قصرِ شاہی کا بیرونی حصہ آگیا۔ اور یہی اس کی منزلِ مقصود تھی۔ لیکن محل میں کس طرح داخل ہو؟ ـــ بھلا کس کی مجال تھی کہ نصف شب کے ان آخری لمحات میں اسرائیل قوم کی ایک ایسی ضعیف عورت کو اندر جانے کی اجازت دیتا جس کا چہرہ راستے کے گرد و غبار سے خاک آلود ہورہا تھا۔ اور جس کا لباس بھی نہایت بوسیدہ اور غریبانہ تھا ـــ چند سپاہیوں نے ترشروئی سے اسکو جھڑک دیا۔ اور برچھیوں سے گستاخانہ طور پر

ضرب پہونچائی لیکن جب وہ مُصر رہی تو آخر کار انہوں نے اس سے اندر جانے کا مقصد دریافت کیا۔

"میں فرعون سے ملاقات کرنی چاہتی ہوں"

سنتے سنتے اُن کا بُرا حال ہو گیا۔ مگر طعمہ اپنے اصرار سے باز نہ آئی۔

"میں فرعون سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھے اُسکے پاس لے چلو"

"بیشک! بہت مناسب وقت ہے۔ فرعون نے تین پیغامبروں کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس وقت وہ محل کے ایک بالا خانے میں کھڑا ہے۔ اور غیظ و غضب کے باعث بدی کے دیوتا سے بھی زیادہ خوفناک معلوم ہو رہا ہے" ایک سپاہی نے عذر پیش کرتے ہوئے یہ بیان دیا۔ اور شاید اس بڑھی عورت سے چھٹکارا پانے کیلئے یہ چال چلی ہو۔ وہ زبردستی اندر گھس جانا چاہتی تھی۔ لیکن انہوں نے ہر بار اُسے مار کر ہٹا دیا۔ اسکی آہ و زاری کو سنکر ایک افسر اعلیٰ اس جگہ آن پہونچا۔ وہ چلا کر اسکی طرف دوڑی۔

"میں فرعون سے ملنا چاہتی ہوں ـــ مجھے فرعون کے پاس لے چلو"

"یہ قطعی ناممکن ہے" محافظ افسر نے جواب دیا "اگر تو اعلیٰ ترین ارکین سلطنت میں سے ہوتی تب بھی اس وقت فرعون کے حضور میں جا پہونچنا تیرے لئے ناممکن ہوتا۔ چہ جائیکہ تو ایک مفلس و نادار ہستی ہے"

"میں اس جگہ سے واقف ہوں جہاں طہوتمر موجود ہے" بوڑھی عورت نے بلند لہجے میں یہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

یہ الفاظ سنکر وہ افسر اس طرح کانپ اٹھا گویا اس پر ایک ضرب شدید لگی ہے یا کسی نے برچھی سے وار کیا ہے۔ پھر وہ فوراً اسکا ہاتھ پکڑ کر طمانیت کے پاس لے گیا جس نے اسی وقت اس کو فرعون کی بارگاہ میں پہونچا دیا۔ وہ اسکے قدموں میں گر گئی اور چلا چلا کر کہنے لگی۔

"اے فرعون اعظم! میرے پاس تیرے لئے خوشخبری ہے۔ مجھ پر تیری نظر عنایت ہو"

"بلا خوف بیان کر" یہ جواب ملا۔ فرعون کی اضطراری کیفیت میں سکون پیدا ہو گیا اور وہ اپنی تمام قوت سامعہ کو مجتمع کر کے اس خبر کو سننے کیلئے متوجہ ہو گیا۔

"مجھے اس طہوتمر کی موجودہ کمینگاہ کا بخوبی علم ہے جس کی تلاش میں تیرے مخبروں نے بستی کا ایک ایک کونہ چھان مارا ہے"

طہوتمر کا پیارا نام سنتے ہی فرعون کی رگ و پے میں حیات تازہ کا پورا جوش پیدا ہو گیا۔ اور اس جھکی ہوئی ضعیف ہستی کی طرف تیز قدموں سے بڑھا۔

"اگر دراصل تو میرے سامنے ایک حقیقت کا اظہار کر رہی ہے تو میرے خزانے سے زروجواہر یا پر وہ بیش بہا شے جو لے جا سکتی ہے لے جا"

"اے فرعون! میں اُس کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں پکڑا دوں گی۔ اپنی روح کو پیغام مسرت و شادمانی دے۔ میں اس کام کو سر انجام دے سکتی ہوں تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

آخر وہ کون سا جذبہ تھا جس نے طعمہ کو ایسی غداری کرنے پر مجبور کر دیا؟ ـــ وہ اس اتحاد میں نفاق چاہتی تھی جس سے اسکو سخت نفرت تھی۔ وہ مصریوں کو انتہا سے زیادہ ناقابل بیان بلکہ جنون کی حد تک نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اگر اسکے امکان میں ہوتا تو وہ طہوتمر کے شیشۂ دل کو خوب چھٹی چھٹی کر شکستہ و برباد کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ حسین دوشیزہ اگر ایک مرتبہ بھی فرعون کے چنگل میں پھنس گئی تو اسکی جیتے جی

رہائی مشکل ہو۔ اور ایسی صورت میں وہ دوبارہ راحیل کی رقیب نہیں بن سکے گی۔ قصرِ شاہی کی مستحکم دیواریں جانتی تھیں کہ اپنے اندر چھپے ہوئے شکار کی کس طرح حفاظت کی جائے۔

"وہ ہے کہاں؟" فرعون نے بیتابی سے کہا: "میری آرزو ہے کہ کسی طرح بہت جلد اس کا دیدار کروں۔"

"عالی جاہ! میں تنہا اس مقام تک تیری راہبری کر سکتی ہوں۔ میں راستے سے واقف ہوں۔ اور اس نحس حصّے کی چھوٹی چھوٹی گلیوں کو بھی جانتی ہوں جہاں تیرے سب سے زیادہ مفلس غلام اپنی زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ ہاں طہوتر بھی اسی جگہ ایک ذلیل جھونپڑے میں پناہ گزیں ہے۔"

"بہت خوب۔" اس ذی جاہ ہستی کی زبان سے جواب ملا۔ "طمافت! ایک گاڑی تیار کر۔ اے عورت! میں تیرے الفاظ پر کامل اعتماد کرتا ہوں۔"

گاڑی تیار ہوئی۔ اور فرعون کی اس مقام تک رہنمائی کی گئی۔ وہ اسرائیلی عورت اسکے ہمراہ تھی۔ اس نے شاہانہ تمکنت کے ساتھ گاڑی میں قدم رکھا اور یہ دیکھکر کہ بوڑھی راہبر جھجک کر پیچھے ہٹ گئی، حکم دیا کہ وہ بھی ساتھ آ جائے۔ اور وہ ہوا کے دوش پر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس شاندار گاڑی کے اندر عالی مرتبہ فرعون کے پہلو میں وہ ضعیف کمر خمیدہ، پریشان حال عورت ایک عجیب و غریب منظر پیش کر رہی تھی لیکن تمام کائنات میں صرف سطحِ آسمان پر جھلملانے والے ستاروں کی خاموش نگاہیں اسکو دیکھ سکتی تھیں۔

"کیا اب اس راستہ پر چلنا ہے؟" شاہی گاڑیبان نے دریافت کیا۔

"ہاں۔" جواب ملا۔

غریب گھوڑوں کے پیہم کوڑے لگائے جاتے تھے اور وہ اسقدر تیزی سے دوڑ رہے تھے، گویا ان کا بوجھ کوئی معقول وزن نہیں رکھتا۔ گاڑی کے پہیے راستہ کے پتھروں پر رگڑ کھاتے تھے۔ اور ایسا شور پیدا کرتے تھے گویا پیتل کے بنے ہوئے ہیں۔

طہوتر اس دوران میں راحیل کے ساتھ سوتی رہی اور نہایت عجیب و غریب خواب اس کو نظر آتے رہے۔ ایک کی تفصیل یہ ہے۔

"ارضِ مصر کے قدیم دیوتا اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اور کاہنِ اعظم پطامنوف بھی موجود تھا جس نے اپنی دختر سے کہا: "ان سے دریافت کرو کہ کیا یہ دیوتا ہیں؟" طہوتر نے ایسا ہی کیا اور ان دیوتاؤں نے جواب دیا کہ وہ معبودِ حقیقی نہیں ہیں۔ پھر جو عجیبی نظر کے سامنے آیا وہ اسکو ایک درخشاں نور کی طرف لے گیا۔ اس قدر خیرہ کُن نور کہ اسکے مقابلے میں قرصِ خورشید کی حقیقت ایک تاریک سایہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی اور اس نور کے وسط میں ناقابلِ فہم الفاظ کے خطوط سے ایک مثلث بنی ہوئی تھی۔"

یہ تھا وہ خواب جو طہوتر کو نظر آیا۔ اور اسی اثنا میں فرعون کی تیز رفتار گاڑی بھی آگے بڑھتی رہی۔

"میں استدعا کرتی ہوں کہ اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ گاڑی مت دوڑاؤ۔" ضعیفہ نے کہا: "پہیوں کی سخت گڑگڑاہٹ اس پُرسکون مقام پر خطرے کی علامت ثابت ہو جائے گی۔"

اس مشورے کو غور سے سُنا گیا۔ یہ دانشمندانہ تھا۔ چنانچہ اضطراب و بے چینی کی تمام کیفیات کو بالائے طاق رکھکر گاڑی کی رفتار میں اعتدال قائم کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ ضعیفہ چلا اٹھی۔

"بس یہی مقام ہے۔ دروازہ مقفل نہیں ہے۔ داخل ہو جاؤ۔ میں تمہاری گاڑی کی حفاظت کروں گی۔"

بادشاہ آگے بڑھا۔ اور آخر کار طھوثر کو اس جگہ موجود پایا۔ اس نے اس کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا اور باہر نکل آیا۔ وہ بیدار ہوگئی اور اوپر نظر ڈالتے ہوئے اس نے فرعون کا چہرہ اپنے مقابل مسرت سے درخشاں دیکھا۔ ابتدا میں اس نے خیال کیا کہ یہ بھی اسکے حیرت انگیز خواب کا ہی ایک حصہ ہے لیکن جب رات کو چلنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا لمس اس نے اپنے چہرے پر محسوس کیا تو بہت جلد یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ کس قدر اصلی واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس نے چیخنا چاہا مگر آواز نہ نکل سکی۔ علاوہ ازیں فرعون کے مقابلے میں کون اسکی امداد کر سکتا تھا!۔

بادشاہ ایک رتھ گاڑی میں سوار ہوگیا۔ اور لگام کو گرفت میں لیتے ہوئے بہت تیزی سے بل دے کر اپنی کمر کے چاروں طرف اسے لپیٹ لیا۔ اور طھوثر کو جو خوف اور اس اچانک حملے کے باعث نیم مردہ حالت میں تھی۔ اپنے سینے کے بالکل قریب لگا کر خوب دبوچ لیا۔

شاندار گھوڑے ایک بار پھر تاریک رات کے سایوں کو چیرتے ہوئے اپنی برق رفتاری کا ثبوت دینے لگے۔ اسدفعہ فرعون ٹھیک راستے سے واقف تھا اسلئے بہت کم وقفہ میں اس نے محل کے قریب رفتار کو سست کر دیا۔

طھوثر جیسے نیچے کے اندر بیٹھی رہی۔ اور مشفقانہ طریق پر راحیل کی بیداری کا انتظار کرتی رہی جو ہنوز خوابیدہ راحت تھی۔

وہ کونسے خیالات تھے جو اس دیوانگی کی رات کے سفر میں طھوثر کے دماغ کے اندر چکر لگا رہے تھے۔ درحقیقت اسکے خیالات کی پرواز اس فاختہ کی نیم مردہ حالت سے زیادہ نہیں تھی جو اپنے سامنے عقاب دیکھ کر کپکپا اٹھی ہو۔ قوت گویائی سلب کر دینے والے خوف نے اس کو وارفتہ بنا دیا۔ رگوں میں دوڑنے والے خون کی ایک ایک بوند منجمد ہوگئی۔ اور تمام ذہنی قوتیں ساکن ہو کر جواب دے گئیں۔ دو مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ دو مشتعل لب اس کے لبوں سے وصل ہوتے ہیں۔ وہ ان کو اس جرأت بیجا سے باز نہ رکھ سکی کیونکہ غلبہ خوف کی شدت نے تحفظ عصمت کے احساس کو پامال کر دیا تھا۔

جب اس نے دوسرے قصر کی ایک محراب کو پہچانا تو مایوسی اس پر چھا گئی۔ اس نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے اور ان آہنی بازوؤں میں سے جنکی گرفت میں وہ بے قابو تھی رہائی پانے کیلئے حد درجہ کوشش کی۔ تمام جدوجہد مایوس کن بلکہ ایک بڑی حد تک بے معنی تھی۔ وہ شاہی اغوا کرنے والا غرور و نخوت کے ساتھ مسکرا دیا۔ اور اس کو زیادہ دبوچ کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ وہ چلائی مگر ایک طویل بوسے نے اسکے لبوں کو بند کر دیا۔ سفر ختم ہوگیا۔ گھوڑے قصر شاہی کے ایک وسیع صحن میں رک گئے۔ اور بہت سے سائیسوں نے آکر ان کو گاڑی سے جدا کر دیا۔ خود بادشاہ طھوثر کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی سے لے گیا۔ بالکل اس طرح جیسے ایک معمولی آدمی کسی چھوٹی بچی کو لے جا رہا ہو۔ محل میں جا کر اس نے اس بار لطیف کو خود اسکے قدموں پر کھڑا کر دیا۔ اور یہ محسوس کر کے کہ وہ کپکپا رہی ہے، کہا "یقین مان۔ تو فرعون کے دل پر حکومت کرتی ہے۔ اور فرعون صرف تمام دنیا کا حکمران ہے"

یہ تھے وہ مخصوص الفاظ جو اس نے پہلی مرتبہ طھوثر کے سامنے ادا کئے۔ اگر مسلک عشق میں عقل کو دخل ہوتا۔ تو بلاشبہ طھوثر پوٹیری کے مقابلے میں فرعون کو زیادہ پسند کرتی۔ بادشاہ درحقیقت مافوق الانسان حسن کا مالک تھا۔ خدوخال ایسے دلفریب اور متناسب گویا کندہ نقوش سنگیں۔ جبر و تشدد سے کام لینے کی عادت نے اسکی آنکھوں میں نفوذ کر جانے والی ایک چمک پیدا کر دی تھی۔ بلحاظ تناسب جثہ وہ بہت طویل القامت تھا۔ لیکن از سر تا پا شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ۔ جب وہ تن کر ملوکانہ شان کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا تو کسی دوسری نوع کی مخلوق کا رکن معلوم ہوتا۔ ایسی بلند مرتبہ ہستی کے مقابلے میں پوٹیری بہت پست درجے کا انسان معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی طھوثر کو پوٹیری

ہی سے اُلفت تھی۔

طہوثر کا ہاتھ اپنی گرفت میں لئے بہت سے شاندار دالانوں کو طے کرلینے کے بعد فرعون ایک ایسے دیوانخانے میں تختِ شاہی پر متمکن ہوگیا جس کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ قدیم مصریوں کی مصور تحریروں اور بیش بہا سامانِ آرائش سے مزین کیا گیا تھا۔ وسط میں ایک وسیع میز بچھی تھی جسکے پائے قیدی غلاموں کے منقش مجسموں سے بنائے گئے تھے۔ اس پر مختلف الالوان پھول چُنے ہوئے تھے جنکی نیم و لطیف عطربیزیوں سے وسیع دیوانخانے کی تمام فضا مہک رہی تھی۔

اس رفیع الشان مقام کی ہر شے جلالت مآب فرعون کی لازوال عظمت کا ترانہ گا رہی تھی۔ اُسکے باوجود دُختر بطا مطلق مرعوب نہیں ہوئی۔ اُس نے پوچیری کی شاندار و زبارہ دری کا تصور کیا اور پھر اُس جھونپڑے کا جہاں سے اسکو اسیرِ دام کیا گیا تھا۔ فرعون نے اس کی نازک کلائی پکڑی جبکہ وہ اُسکے مقابل خاموش کھڑی تھی۔ اور اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت عمیق نظر سے گھورا۔ نوجوان لڑکی کے تن پر سوائے اس معمولی پوشاک کے اور کچھ نہیں تھا جو راحیل نے مستعار دیدی تھی لیکن اس کا حُسن و جمال اس غربت و افلاس کے لباس میں کم نہیں ہوا بلکہ دوبالا ہوگیا۔ وہ نیم برہنہ حالت میں تھی۔ اور اپنے ایک ہاتھ سے پوشاک کے ان پھٹے دامنوں کو سنبھالے ہوئے تھی جنکی پیہم انتہا کی اس کوشش میں تھی کہ اسکے حسین ترین اعضائے جسم کی مخصوص عبیرآلود رعنائیوں اور دیگر رنگین جاذبیتوں کو بالکل نمایاں کردے۔ فرعون کی حرم سرائے میں ہمیشہ بیشمار حسین و جمیل پیکرِ نسائیت ہوا کرتے تھے اور اس وقت بھی موجود تھے۔ لیکن طہوثر سے زیادہ شان دلفریبی کسی پر نہیں تھی۔ اسکی ضیائے حُسن سے بادشاہ کی آنکھوں میں خواہشات کے شُعلے چمک اُٹھے تھے۔ ان آنکھوں کی بیباک و آتشناکیوں کے سامنے طہوثر کی آنکھیں جھک کر رہ گئیں۔

اپنے اعماقِ قلب میں اس نے محسوس کیا کہ اتنی بلند مرتبہ ہستی کے اندر جذبۂ محبت کو بیدار کرنیکا فخر حاصل ہے۔ کیا روئے زمین پر کوئی ایسی عورت ہے جس میں خودنمائی نہ ہو؟ پھر بھی وہ نوجوان چرانی کے ہمراہ دشت و بیاباں میں خاک چھاننے کو ترجیح دیتی رہی۔ بادشاہ نے اسکو دھمکیاں دیں۔ مگر وہ اُسکے چہرے کے پُررعب جاہ و جلال اور اُس کی مشتعل خواہشات کی بھلا کیا پرواہ کرتی۔ اسکی لرزتی ٹانگوں نے جواب دیدیا۔ فرعون نے اسکی آنکھوں میں اسکی تکلیف کا مُطالعہ کرلیا اور نہایت خلوص و ہمدردی کے ساتھ ایک آرام دہ مسہری پر لٹا دیا۔ پھر اُس نے کہا۔

"آہ طہوثر! مجھے تجھ سے محبت ہے۔ (وہ آگے جھکا اور اُسکے گیسوؤں کو چوم لیا) جب فاتحانہ مراجعت کے وقت اپنے بلند ہوادار میں سے جس کو میرے محافظ دستے کے اعلیٰ افسر اُٹھائے ہوئے تھے زندگی میں پہلی مرتبہ تجھے دیکھا تو میری روح کی گہرائیوں میں ایک عجیب جذبہ طاری و ساری ہوتا چلا گیا۔ میں کہ میری ہر خواہش اسکے پیدا ہونے سے قبل ہی پوری کردی جاتی ہے عرصہ دراز سے ایک نامعلوم شے کیلئے بیتابی کے ساتھ آرزومند تھا۔ پھر میں سمجھنے لگتا کہ میں کُل کائنات پر حاوی نہیں ہوں۔ افضل و اعلیٰ نہیں ہوں اور نہ قادرِ مطلق ہوں۔ اسوقت تک میں نے تنہائی کی زندگی بسر کی باوجود اسقدر تزک و احتشام اور سطوت و اقتدار کے میں اپنی رُوح کی گہرائیوں میں تنہا بھٹکتا رہا۔ اور اپنے رفیع الشان فلک بوس محلات کے قلب میں بھی۔ درانحالیکہ اُس کی تمام فضا میں امتزاج ہوتا تھا ان حسین متبسم سایوں کا جنکو عرفِ عام میں صنفِ نازک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن میرے تصورات کی دنیا میں اُنکے وجود کا اثر اس سے زیادہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک رنگین جلوس ہے نرم موہنی مورتوں کا جن میں قوتِ عمل پیدا ہوگئی ہے۔ میں بہت دُور۔ ان اقوام کی آہ و بکا اور نالہ و فریاد کو سُن لیتا ہوں جن کے سروں پر اپنے جوتوں سے روندی ہوئی خاک منتشر کی ہے۔ اور میں سُن سکتا ہوں اُن لوگوں کی صدائے دلخراش جنکے بالوں کو گھسیٹتے ہوئے کھینچ کھینچ کر اپنا قیدی غلام بنایا ہے۔ مگر افسوس کہ

میرا دل سیاہ سنگ خارا سے تراشے ہوئے دیوتاؤں کی مانند سرد مہر اور سخت ہو گیا۔ کبھی اپنے سینے کے نیچے ضرباتِ قلب کی آواز کو نہ سن سکا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تمام روئے زمین پر میری مانند کوئی دوسری ہستی موجود نہیں ہے۔ اور میں سمجھتا تھا کہ آئندہ بھی ایسی کوئی ہستی نہیں ہوگی جو میرے لئے محرکِ جذبات بن سکے۔ سب بیکار۔ غیر اقوام پر چڑھائی کرنے کے بعد میں ان دوشیزہ لڑکیوں اور عورتوں کو جو بلحاظِ حسن شہرۂ آفاق ہوتی تھیں اپنے لئے منتخب کر لیتا تھا لیکن کچھ عرصے بعد میری نظرِ حسن نواز ان کو حقیر ٹھہرا دیتی تھی۔ گویا میں ان پھولوں کو مسل کر پھینک دیتا تھا جن کی مہک میرے تنفس کو معطر کر چکی تھی۔ مجھے ایک بھی ہستی ایسی نہیں ملی جس کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی ہو۔ میں ان کی موجودگی میں شاذ و نادر ہی ان کی طرف نظر اٹھاتا تھا ایک بار نظر سے اوجھل ہوتے ہی ان کی یاد لوحِ قلب سے محو ہو جاتی تھی۔ طاعیہ، ایکلنی اور حتوتت شیلے جنکو میں نے صرف اسلئے مخصوص کر رکھا ہے کہ بیکار دوسری ہستیوں کو کیوں حاصل کیا جائے اور جو نمود سحر سے قبل میری نگاہ میں بالکل مختلف ہو جائیں گی۔ میری نگاہ میں محض خاکی پتلیاں تھیں معطر و رنگین اور ہمیشہ اس غیر قوم کی مخلوق کی مانند رہیں جنکے ساتھ میں اتصال باہمی گوارا نہیں کر سکتا تھا اور جنکے ساتھ اپنی ہستی کو وابستہ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ چیتا ہرن سے مانوس ہو سکتا ہے نہ ہوا کی چڑیاں پانی کی چڑیوں کے ساتھ مل سکتی ہیں۔ میں خیال کرتا تھا میں دیوتاؤں کا مقرب اور فانی انسانوں سے برتر و بالا ہونے کے باعث ان کے رنج و غم یا مسرت و انبساط میں شریک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میرے احساسات کی دنیا مختلف ہے۔ ایک شدید جذبہ مجھ پر طاری ہو رہا ہے جبکہ اس تخت پر متمکن ہوں حالانکہ اس جگہ ایک سنگین بت کی طرح بیٹھ کر ہزاروں مرتبہ خواب دیکھے ہیں امکان ناممکنات کے حدود و لانہایت کے اور تعینِ ازل و ابد کے۔ اکثر میں نے آئسس کے چہرے سے نقاب اٹھا دینے کا خواب دیکھا اور اس طرح کہ اس بے بیان دیوی کے قدموں پر گر پڑا ہوں۔ غالباً میں کہہ چکا ہوں کہ وہ پُراسرار پیکر ہی میرے خوابوں میں بسنے والی وہ ہستی ہے جو میرے اندر جذبہ محبت کو پیدا کر دیگی۔ اگر یہ کنیز اب بھی میرے لئے سرمایہ مسرت فراہم کرنے سے انکار کر دیگی تو میں فضائے سماوات کی طرف بلند پرواز ہو جاؤنگا۔ لیکن جب تیرا جلوہ نظر افروز ہوا تو مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ میری اپنی ذات سے الگ ایک ایسی ہستی بھی اس دنیا میں ہے جس کا اس وجود میں رہنا ضروری تھا جسکے شاہانہ حقوق مجھ پر واجب ہیں جس کی بابت نہیں جانتا کہ اسکو کس طرح نظر انداز کر دوں یا بھول جاؤں۔ اور جس کے ہاتھ میں زندگی وابستہ تھی اور گرفتار کر دینے کی قدرت ہے ... میں تھا فرعون ..... بادشاہ ..... حاکمِ اعلیٰ اور ان سب سے زیادہ بالکل ایک خدا ..... مگر آہ! طہوشر! تو نے مجھے ایک انسان بنا دیا!"

شاید اس سے قبل فرعون نے کبھی اتنی طویل تقریر نہیں کی تھی۔ عموماً صرف ایک لفظ یا محض ایک اشارہ کافی ہوتا تھا اس کے ہزار ارادے کی تعمیل کیلئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ طہوشر کے حق میں اپنی پتھر کی مانند بے حس شاہانہ سطوت سے دستبردار ہو گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اب اس نے لب کشائی کی اور فصاحت سے کام لیا۔ اور ظاہر تھا کہ دل کو ولی صدمہ پہونچا ہے جیسا کہ عموماً ایک فانی انسان کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔

طہوشر اسوقت روح کی اور تکلیف کا شکار بنی ہوئی تھی۔ اگرچہ اتنی شان پُرشکوہ کی مالک تھی اس حیثیت سے کہ اس نے ایمن رع کی بہت مقرب و دلپسند ہستی کے اندر جذبہ محبت کو بیدار کیا تھا۔ جسکے سامنے نظر اٹھانے کی جرأت بھی مشکل کر سکتی تھی۔ اور یہ کہ وہ کسقدر خوفناک سنجیدہ و متین اور ذی شان تھا مگر پھر بھی طہوشر نے اسکے لئے وہ جذبہ ہمدردی محسوس نہیں کیا جس کے بغیر محبت کا ہونا غیر ممکن ہے۔ البتہ اس احساس نے کہ میں اس کی ملکیت میں ہوں اسکے اندر خوف پیدا کر دیا تھا۔ فرعون کو جس نے اپنے جذبات کی تسکین کیلئے اسکے جسم پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا کسی طرح بھی اپنا محبوب نہیں بنا سکتی تھی۔ اسے وہ پوعیرتی اور راحیل کے سپرد کر آئی تھی۔

اس نے بادشاہ کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا "اے شہنشاہ، عالم پناہ! میں حیران ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تمام دخترانِ مصر کو نظر سے گرا کر تیری چشمِ عنایت میری طرف مبذول ہوئی ہے۔ حالانکہ حسن و جمال، علم و ہنر اور ہر نوع کی خوبی کے لحاظ سے وہ میرے مقابلے میں

برتر و افضل ہیں۔ ہزار ہا شگوفہ ہائے کنول کے درمیان سے تو نے وہ جنگلی پھول منتخب کیا ہے جسکے اندر کوئی خصوصیت نہو۔"

"اسکا تذکرہ ہی فضول ہے۔ لیکن یاد رکھ کہ تمام دنیا میں میرے لئے صرف تیری ہی ذات عزیز وجود میں ہے۔ میں بادشاہوں کی لڑکیوں کو کنیزیں بناکر تیری خدمت کیلئے مامور کردونگا۔"

"اور اگر میں تجھ سے محبت نہ کروں؟" طھوتر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر مجھ کو تجھ سے محبت ہے تو فکر تیری دامنگیر کیوں ہو؟ مجھ سے اجتناب کر یا نفرت۔ تیری شخصیت میری نگاہ میں اور زیادہ حسین ہوتی جائیگی۔ کیونکہ جب کوئی رکاوٹ میرے ارادے کی تکمیل میں حائل ہوتی ہے تو میں اسکو دفع کرنیکی تدبیریں سوچنے لگتا ہوں۔"

"اور اگر میں کسی دوسری ہستی سے محبت کروں؟" طھوتر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اس قوت نے اسکی ہمت بلند کردی تھی جو بظاہر اسکی قدرت میں تھی۔

فرعون کی تیوری پر بل پڑگئے اور وہ اپنے لبوں کو چبانے لگا۔ اس نے لڑکی کے نازک ہاتھوں کو اسقدر شدید گرفت میں لے لیا کہ اُسے تکلیف محسوس ہونے لگی۔ پھر بہت ضبط سے کام لینے کے بعد اس نے زیادہ ملائمت اختیار کرلی۔ اور دوبارہ طھوتر کی مستفسرانہ آنکھوں میں بہت گہری نظر ڈالکر گھورتے ہوئے سلسلۂ کلام شروع کردیا۔ اس کا لہجہ تاکیدی اور دلکش تھا۔

"جب تجھے اس محل میں رہتے ہوئے کچھ عرصہ گذر جائیگا۔ اس تزک و احتشام کے ماحول میں میری محبت میں سرشار تب تو سب کچھ فراموش کردیگی، ان لوگوں کی طرح بھول جائیگی جو بعض ادویات کے استعمال سے اپنے حافظے کو برباد کردیتے ہیں۔ تیری زندگی ایک خواب کی مانند بن جائیگی اور تیرے تمام سابقہ جذبات اس طرح نکل جائینگے جیسے فتیلہ سوزی میں سے دھواں نکل کر غائب ہوجاتا ہے۔ اس عورت کو جسے بادشاہ کی محبت کا فخر حاصل ہو کسی دوسرے مرد کا تصور بھی نہیں کرنا چاہئے۔ تیری ہستی کو فرعونی جاہ و جلال کا عادی بنالے۔ میرے خزانے خالی کرنے پانی کی طرح دریائے زر وجواہر بہانے، حکمرانی کر، خواہ کریانہ کر، جس کو چاہے ذلت دے اور جسے چاہے عزت دے لیکن میری شریک حیات، میری زوجہ، میری ملکہ بن جا۔ میں تجھے عطا کردونگا تمام ملک مصر، اور اسکے کاہن، افواج اور غلام، اسکی بیشمار رعیت، محلات، معبد، اور تمام جاگیریں۔ اگر تو چاہے تو ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈال جس طرح ایک ریشمیں کپڑے کی دھجیاں اڑادی جاتی ہیں۔ اسکے علاوہ اور چیزیں بخشدونگا بیشمار نوادر و عجائبات، خوشنما اور بیش بہا۔ تو ہی وہ واحد ہستی ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ وہ طھوتر جو کاہن اعظم کی حفاظت میں تھی اپنی شخصیت کو کھوچکی۔ لیکن اب وہ ایک ایسی ہستی ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ وہ ۔۔۔۔ ملکۂ فرعون ہے"

صبح کو جب راحیل بیدار ہوئی تو وہ طھوتر کو اپنے پہلو میں نہ پاکر بہت متعجب ہوئی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اس خیال سے کہ نوجوان مصری خاتون کچھ دیر پہلے ہی جاگ اٹھی ہے۔ طھمر ایک کونے میں بیٹھی ہوئی سو رہی تھی یا ایسا ظاہر کر رہی تھی۔ اگر کوئی قریب سے لغور دیکھتا تو اسکی آنکھیں ظالمانہ مسرت سے چمکتی ہوئی دکھائی دے جاتیں اس مسرت سے جو ہم مکاریوں اور دغابازیوں کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

"طھمر" راحیل نے چلاکر دریافت کیا "طھوتر کہاں چلی گئی؟"

بوڑھی عورت بظاہر چونک پڑی۔ گویا اس کی مالکہ کی آواز نے نہایت گستاخی کے ساتھ اسے بیدار کردیا ہے۔ وہ کھڑی ہوگئی اور اپنی آنکھیں ملنے لگی۔ پھر کامیاب فریبانہ استعجاب ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگی:

"تو کیا اس وقت سے وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے؟"

"نہیں" راحیل نے جواب دیا "اور اگر میں اپنے بستر میں اُسکے لیٹنے کے نشانات نہ دیکھتی اور وہ لباس نہ ہوتا جسکو وہ یہاں چھوڑ گئی ہے تو میں تسلیم کر لیتی کہ گذشتہ رات کے تمام تعجب خیز واقعات سوائے ایک خواب کے کچھ حقیقت نہیں رکھتے"

طغمر نے تمام جھونپڑے میں اور اسکے ارد گرد تلاش کیا۔ پھر واپس آکر کہدیا کہ کوئی سراغ نہیں ملتا۔

"یہ بہت تعجب کی بات ہے" راحیل نے مغموم لہجے میں کہا۔

"میری مالکہ!" بوڑھی عورت نے خوبصورت اسرائیلی خاتون کے پاس آتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہا "تم واقف ہو کہ اس نووارد نے مجھے خوش نہیں کیا"

"ہر شخص تمہیں ناخوش کر دیتا ہے طغمر!" راحیل نے مسکرا کر کہا۔

"سوائے تمہارے میری مالکہ!"

"ہاں میں جانتی ہوں کہ تم میری بہت باوفا اور جاں نثار ہو"

"لیکن کیا میں غلطی پر تھی" طغمر نے کہا "یہ لمعو تو ایک خبیث روح تھی جو ایک اسرائیلی کو ورغلانے آئی تھی"

"تاہم اسکے آنسو حقیقی آنسو تھے۔ اور کیا تم خیال کرتی ہو وہ دوزخ سے بھیجا ہوا ایک نفسانی پیکر تھا؟"

"یقیناً" طغمر نے جواب دیا "کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ کاہن اعظم کی دختر ایک عبرانی سے محبت کرے گی! اور فرعون کے مقابلے میں اُسے ترجیح دے گی جبکہ عام طور پر مشہور ہے کہ فرعون اُس کا آرزو مند ہے؟ اگر اس کو ایک عبرانی سے اس قدر محبت ہے تو اس کی دوسری بیوی بن جانی کیوں گوارا نہیں کر لیتی؟ نہیں ایسی صورت میں اُسے اپنے غیر حقیقی دیوتاؤں پر لعنت بھیجنی پڑتی اور خدائے قدوس کی پرستش کرنی پڑتی۔ اسی وجہ سے بھیس بدلے ہوئے شیطان کو فرار ہو جانا پڑا"

"تم اُسے شیطان کہتی ہو۔ حالانکہ اُس کی آواز حد درجہ شیریں اور اُس کی آنکھیں نہایت مسحور کن تھیں" یہ راحیل کا انقطاعی جواب تھا۔

پیشتر اس کے کہ وہ ضروری اشیاء حاصل کرنی چاہتی تھی۔ طغمر نے قصر شاہی کا راستہ لیا۔ وہ اپنے ہمراہ ریشم کا ایک بڑا تھیلا لے گئی کیونکہ اُسے زر و جواہر سے لبریز کر لینے کی اُس کو اُمید تھی۔ دوبارہ طمانت اُس کو بادشاہ کی بارگاہ میں لے گیا جس نے اپنے وعدے کا ایفا کیا یعنی یہ کہ طغمر خزانۂ شاہی سے جسقدر زر و جواہر لے جاسکتی ہے لے جائے۔ جلد ہی زر و جواہر کا انبار کثیر اُس کی نظر کے سامنے تھا حرص اور طمع کے جوش میں وہ اُس پر جھپٹ پڑی۔ اور اُسکی وہ حرکت اتنی ہی مجنونانہ تھی جتنی وحشیانہ۔ اس نے اپنے بازو شانوں تک اس بحر زریں میں غوطہ زن کر دیئے۔ وہ اس قیمتی انبار سے لپٹ گئی۔ اُسے الٹ پلٹ کر دیکھنا چاہا۔ بڑی حد تک اُس کی پرستش کرنے لگی۔ اُسکے لب تھر تھرانے اور وہ اپنی کمینی مسرت سے کپکپا اٹھی۔ پاگل پنے کی حالت میں اس نے مٹھیاں بھر بھر کر تھیلے میں ڈالیں اور چلا چلا کر کہا "ابھی اور۔ ابھی اور زیادہ" حتیٰ کہ وہ بالکل لبریز ہو گیا۔ طمانت نے اُسے اچھی طرح اپنی طمع پوری کرنے کی اجازت دیدی۔ اُسکے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ اُس تھیلے کو اٹھا سکتی ہے لیکن وہ متعجب ہوا جب اُس نے اٹھا کر اُسے اپنی کمر پر لاد لیا۔ لالچ نے اُسکے ضعیف جسم میں وہ طاقت بھر دی تھی جو کبھی نسی ہی نہ ہو۔ آخر کار کسی نہ کسی طرح وہ گرتی پڑتی محل سے باہر نکل گئی اور سونے کا وہ انبار جائز طور پر اُسکی ملکیت بن گیا۔ کچھ دیر کے بعد دو اسرائیلیوں نے جو قریب سے گذر رہے تھے اس خزانے کو لے جانے میں اُس کی مدد کی۔ اُس وقت جبکہ اُس نے ایک مناسب انعام دینے کا

وعدہ کرلیا۔ وہ جلدی ہی شہر کے مضافات میں پہونچ گئے۔ اور انہوں نے مٹی سے بنے ہوئے جھونپڑے میں رکھدیا۔ طمر نے بہت کچھ جھمک جھمک کے بعد موعودہ رقم ادا کردی۔ اور وہ لوگ اسکو ایک بیہوشی کی حالت میں چھوڑ کر چلدئے۔

اس اثنا میں طوتہر کو ایک شاندار شاہی حرم میں داخل کردیا گیا تھا جو خود فرعون کی قیامگاہ کی طرح نفیس اور اعلیٰ تھا۔ ان بہت ہی نایاب اشیاء سے جو وہاں موجود تھیں ایک بادشاہ کو خراج ادا کیا جاسکتا تھا۔ ہاتھی دانت کی کرسی پر متمکن ہوکر طوتہر نے ان قیمتی اشیاء اور جواہرات پر گہری نظر ڈالی جو اس کی خدمت کیلئے مامور کردہ کنیزوں نے اسے دکھائے تھے۔ جب وہ حمام سے غسل کرکے آئی تو ان معطر ابٹنوں اور خوشبودار روغنوں سے جو کنیزوں نے اس کے اوپر ملا اور مسلا تھا اسکے نرم و نازک جسم کی جلد اور بھی زیادہ ملائم اور درخشاں ہوگئی۔ وہ سنگِ یشب کی مانند چمکنے لگی۔ حقیقتاً اس کا حسن مافوق الانسان تھا۔ اور جب اس نے آئینہ کے اندر اپنا رشک زیبا دیکھا تو وہ مسکرائی اور اپنے عکس کو دیکھکر خوش ہونے لگی۔ ایک طویل ریشمی پوشاک اس کے زیب تن تھی لیکن اس میں وہ از سرتاپا پوشیدہ نہیں ہوئی تھی۔ مزید تزئین جمال کیلئے اس نے زیورات میں سے صرف ایک ہفت رنگ نگینے کا مالا پسند کیا۔

فرعون دروازے کی دہلیز پر جلوہ افروز ہوا۔ اسے دیکھکر طوتہر کو اسکے قدموں میں سربسجود ہوجانا چاہیئے تھا لیکن بادشاہ جلدی سے اسکے قریب آگیا اور اسکو اٹھاتے ہوئے آرام سے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔

"نہیں طوتہر! اس قدر عجز و انکساری سے کام مت لے" اس نے نرم لہجہ میں کہا "میں تجھے اپنا ہمسر و برابر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس دنیا میں تنہائی کی زندگی بسر کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ اگرچہ میں قادرِ کل ہوں اور تو بھی میرے قبضۂ قدرت میں ہے۔ تاہم میں منتظر ہوں اس دن کیلئے جب تو مجھ سے اس طرح محبت کرنے لگے گویا میں صرف انسان اور صرف انسان ہی تھا۔ ہر قسم کا اندیشہ دل سے نکال دے۔ تو ایک پیکر نسائیت بن جا یکسر نسوانی جذبات کے ساتھ۔ ہمدردی ہو اور تلون مزاجی بھی۔ اگر انجام کار تیرے دل میں میری محبت جاگزیں ہوجائے تو حرم سرائے میں میری آمد کے وقت تو صرف ہاتھ بڑھا کر وہ کنول کا پھول پیش کردیا کر جو تیری زلفوں میں گندھا رہتا ہے"

اس وقت طمافت بادشاہ سے ملنے کیلئے بیتاب ہو رہا تھا۔ اسے بارگاہِ عالی میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ چنانچہ آداب بجا لاکر اس نے نہایت مضطربانہ لہجہ میں کہا۔

"عالی جاہ! ایک پراسرار انسان حضور سے ملاقات کرنے کا طلبگار ہے۔ کوئی عجیب و غریب نامعلوم قوت اس کی ممد و معاون ہے۔ محافظ اسے روک نہیں سکتے۔ اور اسکے محض چھو دینے سے تمام دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں۔ ہر شخص اسکے احکام کی تعمیل کیلئے آمادہ ہوجاتا ہے۔ میں بھی حضور کی بارگاہ میں حاضر ہونے کیلئے مجبور ہوگیا"

"اس کا نام کیا ہے؟" بادشاہ نے دریافت کیا۔

طمافت نے جواب دیا "موسیٰ"

فرعون دیوان عام میں چلا گیا۔ اور تختِ شاہی پر متمکن ہوگیا۔

موسیٰ نمودار ہوا اور ایک دوسرا عبرانی جس کا نام ہارون تھا اسکے ساتھ آیا۔ آداب بجالائے بغیر موسیٰ قدم بڑھاتا ہوا تخت کے قریب پہنچ گیا اور کہا "تیرے نام بنی اسرائیل کے خدا کا پیغام ہے، تو میرے بندوں کو چھوڑ دے تاکہ جنگل میں جاکر وہ عبادت کرسکیں"

"بنی اسرائیل کا خدا کون ہے؟" فرعون نے دریافت کیا "میں اُس سے واقف نہیں اور میں بنی اسرائیل کو یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

جواب ملا "عبرانیوں کے خدا کی حقیقت ہم سب پر عیاں ہے۔ یہاں سے تین یوم کی مسافت پر ہم سب ہجرت کر جانا چاہتے ہیں۔ وہاں اپنے معبود ازلی کی بارگاہ میں قربانیاں پیش کریں گے۔ تاکہ وہ ہم کو طاعون میں مبتلا نہ کرے اور کسی طرح ہلاک نہ کرے!!"

پھر فرعون بولا اور دریافت کیا کہ وہ کیوں بنی اسرائیل کو ان کے کام کاج سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُس نے نہایت حقارت اور ترش روئی سے اُنکی خوب ملامت کی اور رخصت کر دیا۔ لیکن وہ واپس آئے اور بادشاہ کے سامنے حیرت انگیز شعبدے اور معجزات پیش کئے جلوتُور نے بیکس عبرانی غلاموں کے حق میں بہت کچھ سفارش کی مگر مطلق شنوائی نہ ہوئی۔

"ان کو فراموش کر دے" فرعون نے کہا "ان بیکار شعبدوں کو بھول جا اور آرام و سکون سے رہ۔ یہاں تم کو امن و عافیت کی زندگی بسر کرنی چاہیئے اور تجھے صرف اس نعمت کا تصور کرنا چاہیئے جو تیرے نزدیک ہے۔ تو اس خواب حقیقت میں مسرور رہ کہ فرعون کی قدرت تیرے نزدیک غیر ممکن اور بے اصل اوہیت سے بھی زیادہ ہے۔"

"ہاں! میں واقف ہوں کہ تو حاکم ہے۔ حاکم اعلیٰ ان قیدی غلاموں کا۔ اور تیرے سامنے لوگوں کی حالت وہی ہو جاتی ہے جو ہوا کے تیز جھکڑ کے سامنے ریت کی لیکن ......"

"لیکن پھر بھی میں تجھے اپنی محبت کیلئے مجبور نہیں کر سکتا" فرعون نے مسکرا کر کہا۔

"ہرن شیر سے خوف کھاتا ہے، قمری شاہین کو دیکھکر لرز جاتی ہے۔ اور آنکھیں شعاع خورشید کے سامنے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح انسانی کمزوری کیلئے کافی مدت درکار ہے قبل اسکے کہ وہ تجھ جیسے شہنشاہ کے سامنے نظر اُٹھانے کی جرأت کر سکے۔ غیر فانی دیوتا ہمیشہ ایک فانی انسان کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے طوتر کہ تو مجھ سے خوفزدہ ہے۔ اگر میں بادشاہ ہوتے ہوئے عارضی طور پر ایک معمولی انسان بن کر تجھ سے التجائے محبت نہیں کر سکتا تو تجھے معمولی عورت سے دائمی طور پر ملکہ بنا کر اپنی آرزو پوری کر سکتا ہوں۔ اس طرح ملکۂ مصر اس سرزمین کے بادشاہ سے خوفزدہ نہیں ہوگی۔"

"اگر تو سرفرازی عطا کرتے ہوئے مجھے تخت شاہی پر اپنے پہلو میں جگہ دیدے تب بھی میرے تخیلات کی پستیاں تیرے قدموں میں سرنگوں رہینگی۔ لیکن تو اسقدر رنگین ہے اور تیرا حسن حیات موجودہ کے جسمانی عنصر جمالیات سے اتنا افضل و اعلیٰ ہے کہ شاید انجام کار میرا دل تیری ہمنشینی کے باعث باہمت ہو جائیگا۔ اور تیرے قریب دھڑکنے کی جرأت کر سکے گا۔"

چنانچہ فرعون نے اظہار عشق کو جاری رکھا لیکن ونتریطامنوں کسی طرح بھی یوعیری کی محبت کو فراموش نہ کر سکی۔ تاہم اقتضائے وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ تملق سے کام لیتی رہی۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ بادشاہ کے دل میں شعلۂ محبت کو بھڑکاتی رہی۔ وہاں سے چھپکر فرار ہونا اور یوعیری کو تلاش کرنا ــــ یہ قطعی ناممکن تھا۔

بلاشبہ راحیل اپنی حد درجہ نیک سیرتی اور فراخدلی کے باوجود ایک خطرناک رقیب تھی۔ پھر حقیقتاً فرعون کے جذبہ محبت سے بھی وہ بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ وہ خود اس سے محبت کرنے کی آرزو مند تھی۔ اور یہاں تک کر گذرنے کے قریب ہو گئی جو کبھی اُسکے خواب خیال میں بھی نہ گذرا ہوگا۔

اسکے بعد سرزمینِ مصر پر وہ ہولناک اور دل ہلا دینے والا طاعون پھیلا جو موسیٰ اور ہارون کی سحرکاری اور جادوگری سے نازل ہوا تھا تاکہ فرعون پر خوف و دہشت طاری ہو جائے۔ آخرکار اس نے کہا "جاؤ جہاں چاہو اور جس طرح چاہو اپنے خدا کے سامنے قربانیاں پیش کرو۔"

یہ فرمان سنکر طہوتر نے نہایت محبت کے ساتھ بادشاہ کے گلے میں باہیں حمائل کر دیں اور کہا "اب میں تجھ سے محبت کرتی ہوں کیونکہ تو ایک انسان بن گیا ہے۔ اب تو سنگدل دیوتا نہیں رہا۔"

فرعون نے فوراً طہوتر کی بات کا جواب نہیں دیا۔ طاعون کے حملے نے اسکے اکلوتے بچے کو موت کے منہ میں پہونچا دیا تھا پھر بھی اسکا غرور انتہائی بیکسی کے باوجود سرکشی پر آمادہ تھا۔ وہ عبرانیوں کے خدائے لم یزل کا صدقِ دل سے معتقد نہ ہوا۔ اور اسنے طاعون کی توجیح محض سحر کی۔ اور بتایا کہ اسکا اثر مصری جادوگروں کے سحر سے زیادہ تھا.....

اور طہوتر کی بابت..... کیا اسنے اپنی عبرانی محبت کو فراموش کر دیا تھا؟ نہیں، بلکہ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں فرعون بنی اسرائیل کے قتلِ عام کا حکم نافذ کر دے اس صورت میں پوٹیفری اور نازک اندام راحیل کی حیاتِ تازہ کو بھی نقصان پہونچتا۔ پس اس نے بادشاہ کے غیظ و غضب کو اپنے ناز و انداز اور دلکش طرزِ تکلم سے سرد رکھنے کی کوشش کی۔

"اب میری کوئی اولاد نہیں ہے" ایک دن فرعون نے اس سے کہا "اہ طہوتر! اگر میں مر جاؤں تو تم ملکۂ مصر بنجانا۔"

"تم اپنی موت کا ذکر کیوں کرتے ہو؟" طہوتر نے کہا "عمرِ رفتہ نے اپنی کوئی علامت تمہارے دیر ثبت نہیں کی ہے۔ تمہارے چاروں طرف اقوامِ عالم اس طرح فنا ہو جاتی ہیں جیسے تناور درختوں کے گرد خشک پتے جھڑ جاتے ہیں۔"

"میں کہ میرے اوپر آج تک کوئی ہستی غالب نہیں آئی کیا فاتحِ اعظم کہلانے کے لائق ہوں" فرعون نے مغموم لہجہ میں کہا "یہ تمام آرائش بیکار ہے۔ یہ سنگین منقوشات یہ میرے محل اور معبد کی دیواروں پر بنی ہوئی تصویریں جو میرے جاہ و جلال کو اس طرح ظاہر کر رہی ہیں کہ ایک ہاتھ میں تازیانہ اور دوسرے میں عصائے ملکوتی شان کے ساتھ کھڑا ہوں اور میری تیز رفتار جنگی گاڑی نعشوں کے انبار پر دوڑتی چلی جارہی ہے۔ میں مجبور ہوں کہ ان دو اجنبی ساحروں کو اپنی فسوں سازی کے کرشمے پیش کرنے کا موقع دیدوں۔ اور ایسا ہی ہوگا اگر بنی اسرائیل کے نامعلوم خدا کے مقابلے میں دیوتاؤں نے میری امداد نہ کی۔ میرے اقتدار کی سطوت اور اقبال مندی ہمیشہ کیلئے ختم ہوگئی۔ رعیت میری طرف سے مشکوک ہوگئی ہے۔ اور میرا وجود ایک مدھم سایہ سے زیادہ نہیں رہا۔ لیکن اب چونکہ تجھ کو مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔ اسلئے میں ان تمام باتوں کو فراموش کر دینے کی کوشش کرونگا۔ اور بہت جلد ہم دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔"

اس خوف سے کہ کہیں فرعون اپنے الفاظ واپس نہ لے لے بنی اسرائیل نے وہاں سے ہجرت کر دی۔ جب فرعون کو اسکا علم ہوا تو اس پر ایک عجیب جنونی کیفیت طاری ہوگئی اور اس نے بنی اسرائیل کے تعاقب کا تہیہ کر لیا لیکن خود وہ اور اسکی تمام فوجیں دریائے نیل میں غرقاب ہوگئیں۔

طہوتر ملکۂ مصر بن گئی۔

وہ بے سود فرعون کی واپسی کی منتظر رہی۔ اور ارضِ مصر پر حکومت کرتی رہی لیکن بہت ہی قلیل عرصہ میں اسکی زندگی کا پیمانہ بھی لبریز ہوگیا۔ لوگوں نے اسکی نعش کو اس شاندار مقبرے میں دفن کر دیا جو بادشاہ کیلئے تعمیر ہوا تھا۔ اور جسکی نعش باوصف تلاش و تجسس کے دستیاب نہ ہو سکی تھی۔

(تھیوفائل گاٹیر) — فضل حق قریشی دہلوی

جانِ تغزّل

لاکھ لاکھ احسان جس نے درد پیدا کر دیا
جسنے اس دل کو ہتیلی کا پھپولا کر دیا

دیکھنا مغرب کی جانب یہ شفق کا پھولنا
ڈوبتے سورج نے سونے میں سُہاگا کر دیا

زندگی اور موت میں اک عُمر سے تھی کشمکش
وقت پر دو ہچکیوں نے پاک جھگڑا کر دیا

اک شرارہ سا قریبِ شمع جا کر ملگیا
آتشِ پروانہ نے شُعلے کو دُونا کر دیا

دیکھ لو سرکش کا زور اکچھ نہیں چلتا یہاں
زلف نے جب بَل بھرا شانے نے سیدھا کر دیا

بُلبلِ تصویر ہوں اَب بولنا ہی ناگوار
تیری اس ہنگامہ آرائی نے چُپکا کر دیا

اسکو کہتے ہیں لگی پروانے جل بُجھ ڈوب مر
روتے روتے شمع نے آخر سویرا کر دیا

دیدیا آنکھیں لڑا کر اُس پری پیکر نے جام
مَیں نشّے میں چُور تھا ہی۔ اور اندھا کر دیا

کیا گرامی ہستیاں ہیں حضرتِ عثمانؔ و شادؔ
شاعران دونوں نے دُنیا میں اُجالا کر دیا

تمنا عمر مستی تمنؔ

ایک فرانسیسی مصنف کا شاہکار

جزیرۃ البلور

اُن تمام اقلیموں اور سمندروں سے کہیں دُور جہاں تک عقلِ انسانی پہونچ سکی، ممالک چین اور ماچین کے مغربی سرے پر دو نیلے افقوں کے درمیان ایک پُرافسوں جزیرہ واقع ہے۔ اصل نام تو خُدا جانے مگر چند ملاح جو اتفاقیہ طور پر اس کی ایک خیرہ کُن جھلک دیکھ سکے، اُسے جزیرۂ بلوریں کہتے ہیں۔

اِس جزیرے میں جو تمام سمندری جواہرات کا بہترین اور نادر نمونہ ہے، ایک دفعہ آسمانِ مسرت کی پاک دیوی صرف ایک لمحہ کیلئے اُتری جس کی کہانی عذراءِ شام کی طرح تمام روئے زمین پر پھیل گئی ——— اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سلطان کے انجذابِ محبت نے دو دلوں پر حیرت خیز تسلط حاصل کیا تھا — !

اِس جزیرے کی فضا استعجاب سے لبریز ہے۔ یہاں شیر اور چیتے انسان اور دوسرے مسکین جانوروں کے ساتھ ہم آہنگی رہتے ہیں۔ اُنکے معصوم اور بڑے بڑے جبڑے، جو آلودگیِ خون سے قطعی پاک ہیں صرف اسلئے کھلتے ہیں کہ وہ خلاقِ حسن کے آگے سرِ نیاز خم کریں اور اُسکی توصیف میں یہ مقدس الفاظ فضائے بسیط میں بکھیر دیں، "اللہ اکبر!"

وہاں بھی شہزور سپہ سالار اپنے دیر ہاتھیوں کی سواری کرتے ہیں، مگر اس لئے نہیں کہ نبرد آزمائی کرکے جنونِ جنگ میں بیگناہ انسانوں کے خون سے اپنے ناپاک ہاتھ رنگ لیں، بلکہ زربفت کی چھتریوں کے سائے میں نیچے نیچے عظیم الہیبت پہاڑوں کی خالص ہوا سے لطف اندوز ہونے کیلئے۔ وہاں دوشیزگانِ نازک اندام معطر نسیمِ سحر میں خوش خرام ہوتی ہیں۔ اُن کی لطیف معصوم شوخیاں وادیِ چین اور جنگل کے سبز پتوں میں گدگدی پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ اکثر عشق پیچاں کی لچکدار بیلوں پر بلبل کی طرح جھولتی رہتی ہیں۔ وہاں پلوں کی محرابیں چمکنے والے کُندن کی بنی ہوئی ہیں اور پل ہاتھی دانت اور قیمتی اشیاء سے تیار ہوتے ہیں لیکن کوئی ان پر چلنا نہیں چاہتا اس ڈر سے کہ کہیں اُنکے قدموں سے اُن میں عیب نہ پیدا ہو جائیں اور اُس کی بجائے وہ اپنے سفید گھوڑوں اور عظیم الجسم ہاتھیوں کو دریاؤں میں تیرا کر پار لے جاتے ہیں۔ وہاں دودھ اور شہد کے دریا بہتے ہیں، جنکی خوبصورت موجیں اُنکے سینوں تک ٹھاٹھیں مارتی ہیں۔

فردوسِ تخیل کی حسین پریوں کی آرام کی خاطر کہیں کہیں زینے بھی بنائے گئے ہیں جن کو چاندی اور سنگِ سماق سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ چیزیں وہاں صرف اسلئے ہیں کہ فردوسی مناظر کی قدرتی صحیح حسن کا بھی اضافہ ہو جائے۔

اَن گنت سنہری اور روپہلی گھڑیاں گذریں اِس جزیرۂ سحر میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ اپنی خیرہ کُن شان و شوکت کے ساتھ جلوہ فگن تھی، جس کا جمالِ ماہِ چہاردہم کے چمکدار چہرے پر شرمندگی کی نقاب ڈال دیتا تھا اور یاسمن اُسکے حُسن سے ہمسری کرتے ہوئے نادم ہوتی تھی۔ اُس کا نام تھا ——— "شعلۂ دل"!

وہ حور تھی — آسمانی — جس کو اگر انسانی آنکھیں دیکھ لیں تو مسحور ہو جائیں۔ اُس کا رنگ کُندنی تھا اور آنکھیں شرابِ ارغوانی سے چھلکتے ہوئے دو بلوریں جام۔ اسکے چہرے پر معصومیت کی جھلک تھی اور لب اُسکے لعلیں انار کے دانوں کو مات کرتے تھے۔ اس کا چاہِ زنخدان مُشک کے

پانی پانی کرتا تھا۔ اُسکے نازک لطیف جسم سے آس پاس کی فضا معطر ہو جاتی تھی کیونکہ وہ —— عنبر پاش "قلبِ گلاب" تھی! اُس کا حسین دہانہ کالمعدوم اور رسیلے آلوچہ کی طرح رنگین تھا۔

آپ نے کبھی قمری تو دیکھی ہوگی جس کی گردن میں قرمزی طوق ہوتا ہے! درحقیقت یہ طوقِ غلامی ہے جو اُس نے شعلۂ دل کی یاد میں اپنی نازک گردن میں ڈالا ہے۔ آپ نے قمری کو سرو پر عالمِ بے قراری میں کوکو کرتے سُنا ہوگا.... یہ اُسی فردوسی نازنین کی مضطرب یاد ہے۔ شاید اُس نے کبھی اُسکی ایک جھلک دیکھی ہوگی۔

رات کی تاریکیوں میں آپ نے سرو و شمشاد کی گھنی شاخوں پر غمِ فراق میں تڑپنے والے بلبل کو گاتے سُنا ہوگا —— یہ سب کچھ اُسی دل گرفتہ "شعلۂ دل" سے شکوے ہیں جو اُسکے معصوم دل کی گہرائی سے بلند ہوتے ہیں۔

لازم تھا کہ اس عجوبۂ روزگار حسینہ سے —— جس کا مسکن شاید کوئی فردوس کا کنج گوشہ ہوگا —— شادی کی درخواست کوئی ایسا شخص کرے جو کم از کم شہنشاہ ہو، شہزادہ ہو، بلکہ جسکی تمام پشتیں حکمرانی کرتی آئی ہوں۔

جزیرۃ البلور کے اراکینِ سلطنت کی کوششوں نے سازباز کرکے شعلۂ دل کی شادی شہنشاہ سے ٹھیرا دی! شہنشاہ نے بھی بے شمار زرق برق اور بیش قیمت تحائف عروس کی خدمت میں بھیجنے کے بعد اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ شاہانہ دستور کے مطابق تمام رسوم ادا کی گئیں اور تمام دعاؤں اور خلاقِ اعظم سے التجاؤں کے بعد شعلۂ دل دلہن بن کر طلائی پالکی میں سوار ہو شاہی جلوس کے ساتھ قصرِ شاہی میں متمکن ہوئی۔

تمام باتیں رسم و رواج کے موافق طے ہوئی تھیں مگر دلہن کے والدین نے ایک بات نظر انداز کردی —— اور یہی لازمی تھی —— گو انہوں نے اسکو ضروری نہ سمجھا..... انہوں نے اس شادی میں دلہن کا عندیہ نہیں لیا تھا۔

چنانچہ جب شہنشاہ حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اُس کا چہرہ اُتر گیا اور اُس کا رنگ زرد پڑ گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس کا دل خوف سے بھر گیا ہے۔ اُس نے محسوس کیا گویا کسی نے اُسکے سینے پر پہاڑ رکھ دیا ہے۔ اُس نے دیکھا کہ بجائے چودھویں کے چاند کی طرح جلوہ فگن ہونے کے وہ عروسِ جمیل غمگین گردن اور بکھرے منہ چھپائے سسکیاں لے رہی ہے۔ بیچاری وہ شفقت اور نرمی سے اُسکی طرف یہ سوچتا ہوا بڑھا کہ "خوف کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ اگر وہ رو رہی ہے تو محض اسلئے کہ سب لڑکیاں اپنے گھر سے علیحدہ ہونے پر رنجیدہ ہوتی ہیں اور شیریں الفاظ تو سینے کے بھاری سے بھاری بوجھ کو بھی ہلکا کردیتے ہیں" یہ خیال کرکے وہ دلہن کی معزز پیشانی پر جھکا اور کہنے لگا۔

"اے ملکۂ قلب! اپنے حُسن کا واسطہ! مجھے بتا کیوں تو ان مسحور کن آنکھوں کی چمکدار روشنی کو مدھم اور دھندلا کر رہی ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جو تجھے اسقدر تکلیف پہونچا رہی ہے کہ تو اُس شخص کی موجودگی کو بھی بھول گئی جو اپنی قسمت تیرے قدموں پر نثار کرتا ہے!"

مگر غم خوردہ حسینہ ان الفاظ سے اور بھی متاثر ہوئی اور آنسو اُس کے گلابی رخساروں پر اور بھی شدت سے بہنے لگے۔

بادشاہ نے اُس سے کہا "میرے دل کی رانی! اگر یہ آنسو تیری ماں کی یاد میں ہیں تو مجھ سے کہہ اور میں ابھی جاکر اُسے یہاں لے آؤنگا اور پھر وہ کبھی اس محل سے نہ جائے گی"

مگر اس پر اُس نے اپنے نازک سر کو انکاری جنبش دی اور اُسکی سسکیاں پہلے سے بھی زیادہ ہوگئیں۔ بادشاہ پھر بولا "شاید تجھے اپنی سہیلی کا رنج ہے اور سبزہ زار کا، آبشار، داستان گو، یا مصور کا! اگر یہی بات ہے تو مجھے بتا اور میں بذاتِ خود فوراً جاکر تیرے دل کی خواہش پوری کردوں"
مگر پھر بھی سسکیاں لیتی ہوئی دلہن نے صرف سر کو ایک لطیف جنبش دی۔ بادشاہ چند لمحات تک سوچتا رہا اور پھر بولا "شاید تم اسلئے

اُداس ہے کہ تو اپنے بچپن اور کنوار پنے کے گھر سے وداع ہو گئی ہے۔ اگر تو مجھ کو بتانے تو تیری بلوریں پیشانی کی قسم، جو ستاروں کو شرماتی ہے، کہ میں ابھی تیرے ہمراہ اُسی مکان میں چلا جاؤنگا اور وہیں ہمیشہ تیری خدمت کرونگا"

شعلۂ دل جب اپنے شاہی دولہا کے مُنہ سے یہ پرستش کے الفاظ سُن چکی تو اُسے کسی قدر تسکین ہوئی۔ آخرکار وہ یوں گویا ہوئی۔

"میرے آقا! نہ میں اپنی ماں کیلئے روتی ہوں اور نہ اپنی سہیلی کیلئے، نہ اپنے معصوم غمگساروں کے لئے اور نہ بچپن کے مکان کیلئے۔ بلکہ میں صرف اپنے لئے روتی ہوں ــــ ایک مُرجھایا ہوا پھول..... ایک بے حس لاش"

یہ اندوہناک الفاظ سُنتے ہی بادشاہ جذبات سے مغلوب ہو گیا اور بے قابو ہو کر بولا "اے عورتوں کی ملکہ! اب میں سمجھا ـــــ تجھے اپنے قابلِ نفرین شوہر کا ماتم ہے جسے قسمت نے تیرے لئے لکھدیا..... آہ!!"

لیکن شعلۂ دل نے اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے ذرا زندہ دلی سے کہا۔

"اے شاہ دوراں! تیری بیش بہا زندگی کی قسم! خدا نکرے جو اس قسم کا خیال بھی تیری کنیز کے دل میں آئے..... مگر میں تجھ سے التجا کرتی ہوں مجھے مجبور نہ کر کہ میں اس راز کا انکشاف کردوں جو صرف میری ہی روح کی امانت ہے"

لیکن بادشاہ عاجزانہ التجا اور التماس نہ منت سے مُصر ہوا کہ وہ اس راز کو بتائے جس نے اُس کی جان پر بنا دی ہے۔ چنانچہ شعلۂ دل بولی "تو سُن ـــ اے شہنشاہِ وقت! ـــ ان آنسوؤں کی وجہ اور میری تمنائے موت کا سبب محض "عشق" ہے..... یعنی "سلطان کی محبت!" ..... کیونکہ ـــ اے حکمرانِ سلطنت! ـــ محبت ایک پودا ہے جسکی جڑ ارضِ قلب میں پیوست ہوتی ہے اور اُس پودے کو اکھاڑنے سے پیشتر اس دل ہی کو نیست و نابود کر دینا ضروری ہے۔ اے جلیل القدر بادشاہ! تیری لونڈی کا دل بچپن ہی سے ایک ایسے شخص کا ہو چکا ہے جو اقلیمِ عشق کا واحد حکمران ہے۔ ہاروت فرشتے کی مانند اُسکے حُسن کو وہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں جو مادی دُنیا کی متلاشی ہیں۔ اُس کی تمام ملکیت اور دولت وہ آگ ہے جو اُس کے سینے میں مسلسل روشن ہے، جلتی ہے اور جلاتی ہے۔ یہ وہ آتش کدہ ہے جس کا شعلہ اندرونی دُنیا کو منور کر دیتا ہے اور جس کی رنگین شعاعیں صرف وہی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں جن کے خوابوں کا مندر اس فانی دُنیا سے بلند ہو کر آسمانی فضاؤں میں معلق ہو جاتا ہے۔ اور یہ کبھی نہ بجھنے والا شعلہ ہمیشہ بھڑکتا رہتا ہے کیونکہ چشمۂ حیات کا آب اُسے سیراب کرتا ہے۔ اس شعلۂ دائم کے مالک کا مسکن ایک ایسا حجرہ ہے جس کا کوئی دریچہ اس دُنیا کی طرف نہیں کُھلتا۔ اگرچہ یہ مسکن بظاہر خالی ہے لیکن درحقیقت اُس میں وہ تمام خزانے مستور ہیں جو قدیم بادشاہوں شاید خسرو اور اردشیر کے قبضے میں تھے، بلکہ وہ تو جامِ جم اور آئینۂ سکندری پر بھی قابض ہے اور اس طرح ہم دونوں ـــــ شعلۂ دل اور سلطان، ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے میں سما گئے ہیں، گویا ہماری روحیں پگھلا کر ایک دوسرے میں جذب کر دی گئی ہیں۔ اگر ہمارے جسموں کو جلا دیا جائے تو ہم دونوں کی جلی ہوئی راکھ کو محبت کی سوزش سے دیوتاؤں کی طرح بقائے دوام حاصل ہو جائے گی!!"

جب بادشاہ یہ تمام باتیں سُن چکا تو اُس پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ دفعتاً وہ اُس مقدس ملکۂ محبت کے قدموں کی طرف سرنگوں ہو گیا اور پرستش کے والہانہ جذبات میں گم ہو گیا۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا..... وقت سے بے خبر اور مقام سے بیگانہ۔ گویا اُسکا دل اس بیوی کے سامنے ایک عود دان تھا جس میں سے تقدس اور پاکیزگی کے ارفع جذبات دھوئیں کی شکل میں نمودار ہو رہے تھے۔

اپنے جذبات پر بمشکل قابو پا کر اُس نے یہ الفاظ کہے "اے میرے خواب و خیال کی عارضی دُلہن! اُٹھ اور اپنی محبوب روح کو تسکین دے اور آنکھوں کو خشک کر! کون ایسا مجنوں فانی انسان ہو گا جو سلطان کی محبت میں رخنہ اندازی کرے۔ میں تجھے تمام پابندیوں سے آزاد

کر کے اپنے تمام حقوق سے دستبردار ہوتا ہوں..... اور آج سے — تو میری بیٹی ہے — تو میری زندگی میں شاہزادی ہوگی اور موت کے بعد تاج و تخت کی وارث!!..... لے اُٹھ بیٹھ جان پدر!! اور فوراً اُس کے پاس چلی جا جو تجھے دیکھ کر خیال کریگا کہ تو موت کے تاریک غاروں سے واپس آئی ہے"

اور جب وہ یہ کہہ چکا تو اُس نے آہستہ سے اُس دیوی کا — جو چند لمحات کیلئے اُس کی دُلہن تھی — ہاتھ نہایت نرمی سے پکڑا اور اس کو لیکر باغ کی پوشیدہ محراب کی طرف چلا۔ جب اُس نے دروازہ کھولدیا کہ وہ وہاں سے رخصت ہو جائے تو حسین ملکہ نے جھک کر اُس کے ہاتھ پر گرمجوشی سے بوسہ دیا — اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے!! اور بادشاہ نے دوزانو ہو کر لڑکی کے لباس عروسی کے سنجاف کو چوما.....

آدھی رات گذرنے کے بعد جب نازک اندام حسینہ اس حجرے پر پہونچی جس کا دروازہ اس قدر تنگ تھا کہ کوئی آسانی سے ہی داخل ہو سکتی ہو تو اس نے اندر سے سسکیوں کی آواز سُنی — یہ سسکیاں اُس شخص کی تھیں جو اس طرح بے حال ہو رہا تھا جیسے کوئی اپنے عمر بھر کے ساتھی کے بچھڑنے پر ماتم کر رہا ہو۔

اُس نے محراب پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے؟"

"میں ہوں" وہ آہستہ سے بولی۔

— ایک طویل خاموشی اور ..... دروازہ نہیں کھلا۔

ملکہ کے مرمریں چہرے پر خیالات کے دھندلکے نے نقاب ڈالدی۔ بغیر کچھ منہ سے کہے — اس نے آہ — بھی نہیں کھینچی — وہ زمین پر لیٹ گئی..... دروازے کے قریب۔

تمام دن اور دوسری رات وہ اسی طرح وہاں پڑی رہی — تصور کی نقاب میں ملفوف — اور اس طرح وہ دل میں فلسفہ محبت پر غور کرتی رہی جس کیلئے ضروری ہے کہ عشق کے بندے سلطان کی خدمت میں حاضر ہونے سے پیشتر مکمل طور سے اپنے آپ میں فنا ہو جائیں۔

اس خیال کے آتے ہی ایک دفعہ پھر اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت کی مگر پھر وہ اپنے آپ کو مصفا کرنے کی غرض سے دریا کی طرف چلدی۔ تھوڑی دیر بعد کامل اعتقاد کے ساتھ واپس آئی اور دروازے پر دستک دی۔

اندر سے آواز آئی — "کون ہے؟"

اور اس دفعہ شعلہ زن دل نے کہا "یہ تو ہے....."

دروازہ خود بخود کھل گیا۔

اس کے بعد کیا ہوا — ؟ یہ سب عشق و محبت اور حسن و جمال کے راز ہائے پنہاں ہیں! جن کا انکشاف نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

——— صادق الخیری دہلوی

قطعات

میں کہاں!

دور کنجِ باغ سے پچھلے پہر
جب پپیہا بولتا ہے میں کہاں
درد سے معمور ہو جاتا ہے دل
تازہ ہو جاتے ہیں زخمِ بے نشاں

موجِ نشاط

بس کہ دل سوگوار ہے میرا
یاد رہ رہ کے ان کی آتی ہے
یا مسرت کی موج بے پایاں
میرے احساس میں دوڑ جاتی ہے

محرومِ التفات

لطفِ پیہم ان کے تھا یعنی
باعثِ رونقِ حیات ہوں میں
اب کہ وہ عہدِ جنگ و آفات
آج محرومِ التفات ہوں میں

یاد

منفعل ہی سے آ کے بیٹھے ہیں
ہر طرف اک سکوتِ کامل ہے
یاد اسی کی آ رہی ہے
آج پھر بے قرار سا دل ہے

بشیر نیازی

زندگی

میں ایک پہاڑ کے دامن میں رہا کرتا تھا۔ رہنا کیا، بس تنہائی میں اور شور سے دور اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کو بھلایا چاہتا تھا۔ شہر کی ہر چیز میری شکست کے احساس کو زیادہ کر دیتی تھی ـــ میں زندگی میں نامراد رہا تھا!

میری اس محبت نے جسے میں نے نغمات کی لَے سے پرورش کیا تھا اور جس میں اُن کی نگاہوں کی حرارت نے رُوح پھونکی تھی، جب مجھے اپنا سرِ نیاز خم کرنے پر مجبور کیا تو انہوں نے اپنی تفویض کی ہوئی رُوح کو واپس لے لیا ـــ آہ! میری محبت بے جان رہ گئی!!

میں نے پھر اپنی لَے کو اپنا پیامبر بنایا۔ شاید وہ انہیں تاروں اور زمزموں کی جھنکار تک لے آئیں، اور وہ پھر اس دریچے سے جھانک کر یا تو میرا نذرانہ قبول کر لیں اور یا پھر میری محرومیت کو انتہا تک پہونچا جائیں۔ لیکن آہ ـــ میرے نغمے اُن کی کھڑکی کے پردوں کو حرکت تو دے سکے لیکن کھولنے سے قاصر رہے!!

میں نے اپنا بربط اُٹھایا، اور میرے ندیم! اپنی محبت کو اپنی زندگی کے سنہری خوابوں کے ساتھ یہاں، ہاں اس جھونپڑے میں دفن کرنے چلا آیا۔

محبت! جس میں میں نے اپنی زندگی کے بہترین رنگ بھرے تھے۔ اُن کی کم نگاہی کی وجہ سے ناتمام رہ گئی۔ اور پھر میرے ندیم! میں نے اپنے آنسوؤں سے اُن رنگوں کو اتارنا چاہا۔ لیکن دل کی زمین نے اُن رنگوں کو قبول کر لیا تھا۔ اور اس میں محبت کے نقوش اب اَمٹ تھے پھر وہ کیسے دفن کی جا سکتی تھی!!

میں نے ایک اور کوشش کی۔ آہ! میں نے اپنے گیتوں کے سوز سے اور شکست کی آگ سے اسکو جلانا چاہا۔ لیکن مقدس آگ بھی ناکام رہی۔ اور میرے ندیم! میں پھر واپس آ گیا۔ ہاں ہاں اسی شہر میں۔ اسی جھروکے کے نیچے جہاں سے میری زندگی شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کو ـــ جب چاندنی کی مدھم روشنی میں مجھے اپنے کمزور پیچ بستہ اور نیچے پیر کانپتے نظر آ رہے تھے۔ تو میں نے اپنا بربط اُٹھایا۔ اور اس پر اپنا شاہکار چھیڑا! میں نے دیکھا کہ فرشتے کسی کے سفید جسم کو اُٹھائے ہوئے دُور لئے جا رہے ہیں۔ انہیں واپس بلانے کیلئے میں نے زور سے چلانا شروع کیا۔ آہ! میری لَے بہت اونچی ہو گئی۔ میں نے بربط پر تیزی سے اُنگلیاں چلانی شروع کیں۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے اُسکے سب تار ٹوٹ گئے۔ آخر میں ایک آہ پر میرا نغمہ ختم ہو گیا۔

میری آنکھیں اس کھڑکی پر لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی سے کوئی چیز ٹکرائی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی کی رُوح باہر نکلا چاہتی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ دریچے کا در کھل گیا! اور کسی نے مجھے دیکھا۔ آہ میرے ندیم! میرا سر جھک گیا! میری محبت کی رُوح مجھے مل گئی تھی!!

صبح! صبح شہر میں اک کہرام تھا ... بیکاری مر گئی تھی!!

اور میرے ندیم! میں اپنے جھونپڑے میں واپس آ گیا۔ آہ! پھر میں نے محبت کا گیت گایا اور اپنے آنسوؤں سے اُسکو سیراب کیا۔

آہ! میری تمنائیں اور محبت کے رنگ جنہیں میں کبھی مٹانا چاہتا تھا اب میرے بربط کے تاروں میں سرایت کر گئے ہیں۔ یہ میری زندگی کے تار ہیں!! تو مجھے بلاتا ہے۔ کیا تو پھر انہیں توڑنا چاہتا ہے!!؟

نزہت رضی سلہری

[redacted]

اُردو کا غیر زبانوں سے تعلق

شعر و ادب میں زبان کا مسئلہ بڑا نازک اور اہم ہے، ایک ادیب و شاعر کو قدم قدم پر زبان کی نزاکتوں اور باریکیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جو ناثر یا ناظم خیالات کے تلاطم، معلومات کے جوش، جذبات کی رو اور الفاظ کی طلسم بندیوں میں نزاکتِ زبان کی پروا نہیں کرتا، وہ معلومات و خیالات کی حد تک تو ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ مگر "زبان" کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچا رہا ہے، وہ ایک ایسا درخت لگا رہا ہے، جس کے پھول، پتے، خوشنما اور پھل تلخ اور بدمزہ ہوں گے۔ فصاحت، سلاست، بلاغت اور شستگی، یقیناً شعر و ادب کے دل و دماغ ہیں، مگر زبان کی روح کے بغیر دل و دماغ ایک لمحہ کے لئے بھی کام نہیں کر سکتے۔

زبان کے تحفظ سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" اور رجب علی بیگ سرور کی "فسانۂ عجائب" کی من و عن تقلید کی جائے۔ اُردو زبان بہت کچھ سنور چکی ہے، جدید الفاظ بن چکے ہیں۔ اظہارِ خیالات کے لئے ایک جدید پاکیزہ اسلوب کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ پس ہمارے طرزِ بیان و کلام پر جدید اسلوب کا پرتو پڑنا چاہیئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہماری جدتِ نگارش، زبان کی اس بنیاد کو تباہ و برباد کر دے، جس پر اردو کی عمارت قائم ہے۔ محاورات اور الفاظ کے حقیقی معنوں میں ہم کو حذف و ترمیم اور حک و اصلاح کا کوئی حق نہیں ہے، نیز فعل، فاعل، مفعول، مبتدا، خبر اور متعلقات کی جو ترتیب و صورت قائم ہو چکی ہے، اس میں بھی ہم کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتے۔ مثلاً "میاں نے روٹی کھائی" کو کوئی شخص "میں روٹی کھایا" بولے، تو اس جملے کو غلط اور اس تبدیلی کو نادرست کہا جائے گا، کیونکہ اس ترمیم نے زبان کی قائم کردہ ترتیب کو بدل دیا۔ صرف و نحو کے اعتبار سے جس حد تک زبان کی ترتیب و نشست کا تعلق ہے، اردو زبان مکمل ہو چکی ہے۔ اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اسکے بعد زبان کی ترقی اور ادب کی وسعت کا درجہ آتا ہے۔ جسکے متعلق مجھے تفصیل سے عرض کرنا ہے۔

اُردو کا دوسری زبانوں سے تعلق

زبان کی ترقی کا مطلب یہ ہے کہ جدید مقتضیات کی خاطر ہم کو نئے الفاظ وضع کرنے چاہئیں اور جدید الفاظ کو زبان کے عنصر میں اس طرح سمو دینا چاہیئے کہ قدیم و جدید عنصر میں یک رنگی اور یکسانی پیدا ہو جائے۔ ادب کی وسعت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر صنف فن و ادب کو اردو میں منتقل کیا جائے، دوسری زبانوں کی تصنیفات کے تراجم کئے جائیں اور خود اپنی زبان میں تمام اصناف پر کتابیں لکھی جائیں، لیکن ادب کی وسعت زبان کی ترقی کے بغیر نہیں ہو سکتی، تراجم کے سلسلہ میں جدید الفاظ کا بننا ضروری ہے، لہٰذا جب تک جدید الفاظ وضع نہ کئے جائیں گے، غیر زبان کی کتابوں کا ترجمہ اپنی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ پس معلوم ہوا کہ جدید الفاظ کی وضع و تراش بہت ہی ضروری چیز ہے، اور اسکے بغیر نہ تو زبان ترقی پا سکتی ہے اور نہ ادب کو وسعت دی جا سکتی ہے۔

وضعِ الفاظ کی ماہیت و حقیقت پر غور کرنے سے پہلے، ہم کو اُردو زبان کی حقیقت پر غور کرنا ہوگا، کیونکہ اس مسئلے کے حل ہو جانے کے بعد "وضعِ الفاظ" کی مشکل خود بخود آسان ہو جاتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اردو، دوسری زبانوں کی طرح "بالذات" کوئی زبان نہیں ہے۔ بہت سی زبانوں کے امتزاج و تالیف سے یہ معجون تیار ہوئی ہے، سنسکرت، برج بھاشا، فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، تلنگی، مرہٹی، پنجابی،

بنگالی، دکنی وغیرہ زبانوں کے الفاظ اردو میں شامل ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ اس زبان کو اردو سے زیادہ تعلق ہے۔ سنسکرت سے اردو کا برج بھاشا کے واسطے سے علاقہ ہے، اور سنسکرت کے بعض الفاظ لفظاً، معناً اور صورتاً تبدیل ہو کر جو برج بھاشا میں شامل ہو گئے ہیں اردو میں مستعمل ہیں۔ برج بھاشا یا بعض بھاشا کے الفاظ افعال و مصادر اور استعاروں کی حد تک بکثرت شامل ہیں لیکن سنسکرت سے الفاظ ایسے بھی ہیں جو اردو میں آکر شکل کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ اور ان کو محض … کے اعتبار سے الفاظ کہہ سکتے ہیں اور یہ بھاشا کے ——— انگریزی اور فرانسیسی کے صرف وہ الفاظ اردو میں مستعمل ہیں جن کا تعلق جدید آلات اور سائنس اور دیگر فنون کی تشریحات سے ہے یعنی وہ ایجادات جن کے لئے اردو میں پہلے سے الفاظ موجود نہ تھے، انکے انگریزی نام اردو میں شامل ہو گئے۔ بعض الفاظ تو بعینہ باقی ہیں اور بعض کو "مولّد" کر لیا گیا ہے۔ ترکی کے الفاظ بہت کم ہیں اور تلنگی، مرہٹی، بنگالی، پنجابی اور دکنی وغیرہ کے الفاظ صرف اس حد تک پائے جاتے ہیں جس حد تک کہ اردو زبان کی وضع و ساخت ان کو گوارا کر سکتی ہے۔ اور ان کی … کچھ … زیادہ … سے … ان زبانوں کے الفاظ … زیادہ تر اپنی حالت میں باقی نہیں ہیں۔ اردو نے انکی ثقالت اور کرختگی کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے ——— اب رہی عربی اور فارسی … ——— ان دونوں زبانوں کے اردو میں اتنے زیادہ الفاظ شامل ہیں کہ اگر ان کو اردو زبان سے نکال دیا جائے تو پھر اردو کا وجود ختم ہو جائے گا۔ … جس کی روح نکل چکی ہو۔ بات یہ ہے کہ اردو کی وضع و ساخت نے فارسی و عربی کے الفاظ کو انتہائی پسندیدگی سے قبول کیا اور اردو میں سلاست، شستگی اور ملاحت کی قابلیت کی حامل تھی اسکے اقتضا کو عربی اور فارسی کے الفاظ نے بڑی حد تک پورا کر دیا۔

اردو کا تعلق عربی سے قریب اور فارسی سے قریب تر ہے لیکن اس اعتبار سے کہ فارسی پر عربی کا رنگ چھایا ہوا ہے اردو کو بھی عربی سے قربت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس حد تک نظم و شعر کا تعلق ہے قصیدہ، رباعی، غزل، مصرعہ، مستزاد، قافیہ، ردیف، تخلص، … مثنوی، تمام کے تمام الفاظ عربی کے ہیں جن میں فارسی نے کوئی تغیر نہیں کیا اور اردو نے … بعینہ … لیا۔ اردو نے بھاشا کے دوہے، کبت، ماترا، چھند اور لاونی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ "شہر آشوب" اور "واسوخت" وغیرہ … فارسی کی پیداوار ہیں ان کو اردو نے بغیر کسی تغیر کے اپنے میں شامل کر لیا۔ نثر و نظم کے معائب و محاسن بھی زیادہ تر فارسی کے واسطے سے عربی سے لئے گئے ہیں۔ "تقدیم و تاخیر، تعقید، تخلیع، ضعف تالیف، عدول، توارد، سرقہ، طباق، مراعات النظیر، ایہام، حسن تعلیل، مرجز، سجع، عاری، مقفیٰ، وغیرہ" یہ سب کے سب عربی الفاظ ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں۔ اور شعر و ادب کی بنیادیں ان پر رکھی ہوئی ہیں۔ اس تشریح سے واضح ہوتا ہے کہ اردو نے فارسی اور عربی کا قریب قریب ہر مسئلہ میں اتنا زیادہ اثر قبول کیا کہ ان دونوں زبانوں کے الفاظ، تراکیب اور صنائع بدائع اردو کا جزو لاینفک بن گئے اور اب ان کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

عربی اور فارسی پر اردو کا اتنا اثر پڑا کہ بجائے ہندوستانی کے … سے امتیاز قائم کرنے کیلئے فارسی اور عربی کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا۔ مثلاً ہم دو موتی، … او دو سنگھاڑے کہنا چاہتے ہیں تو اس کو دو دانہ موتی اور دو دانہ سنگھاڑہ کہا جائے گا۔ پالکی اور بگھی کو ایک منزل بلی یا جوڑی کہا جائے گا۔ اسی طرح ہتھیاروں کے لئے قبضہ، زیور، جوتہ اور موزے وغیرہ کے لئے "جفت"، روپیہ اور اشرفی کیلئے "مبلغ"، گھوڑا، ہیرا، موتی اور پیسوں کیلئے "موازی"، تالاب، کھیت اور چٹھی وغیرہ کیلئے "قطعہ"، نوکر یا مزدور کیلئے "نفر"، باربرداری اور دودھ کے جانوروں کیلئے "راس"، درندوں کے لئے "قلادہ"، ہاتھی کیلئے "زنجیر"، بندوق، توپ اور سلاح کیلئے … اردو میں … ہوئے۔

لاٹھی کیلئے "ضرب" تیر کے لئے "دسنہ" اونٹ کیلئے "مہار" زربفت، اطلس، بانات وغیرہ کے لئے "طاقہ" باجے کی پیداوار (مزامیر) کیلئے "ساز" کتاب کے لئے "جلد" قالین کے لئے "فرد" اردو میں استعمال کرتے ہیں۔ اور گاؤں کا متعصب سے متعصب ہندو پنڈت، اور جاہل سے جاہل چمار بھی ان میں سے بہت سے الفاظ بلا تکلف بولتا ہے۔ تحریروں میں بالکل یہی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں حتیٰ کہ دیوناگری لکھنے والے بھی ان الفاظ کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

زبان، الفاظ سے بنتی ہے۔ ہم لفظ (word) کو بھی لفظ بولتے ہیں "شبد" کبھی نہیں کہتے۔ کتاب (Book) کو "پستک" اور نقطے کو "بندی" نہیں بولا جاتا۔ خبر (news) کو "سماچار"۔ عالم (Scholar) کو "ودوان"۔ علم (Knowledge) کو "ودیا"۔ سبق (Lesson) کو "پاٹھ"۔ طالب علم (student) کو "ودیارتھی" عام طور پر نہیں کہتے یعنی ایسے الفاظ جن کے بغیر ہم اظہار مطلب کر ہی نہیں سکتے، فارسی اور عربی سے لئے گئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ فارسی، عربی اور اردو کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور فارسی و عربی کو اردو سے جدا کرنے کے یہ معنی ہیں کہ "اردو" کو زندہ درگور کر دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ روشنگ کدے ہونے کو "الاقشعرار" اور گھوڑا دوڑانے کو "الاجلواذ" بولا جائے۔ توپی کو "قلنسوہ" پائخانہ کو "ترفہ" الٹین کو "لالہ" پانی کو "ماء" اور میز کو "صدلی" کہا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ جو الفاظ عربی و فارسی کے اردو میں داخل ہو گئے ہیں ان کو بدستور باقی رکھا جائے۔ اور آئندہ انہی الفاظ کو لیا جائے جن کا بوجھ اردو سنبھال سکے۔

انگریزی کے الفاظ صرف جدید اشیا اور بعض مخصوص و جدید اصطلاحات کی حد تک ہم بولتے ہیں۔ جیسے انجن، سائیکل، ریل، ٹکٹ، پوسٹ، بس، ٹرین، لیمپ، سائنس، کوٹ، بٹن، بوٹ، بوٹ، اسٹیشن، ڈس انفکشن —— (disinfection) وغیرہ۔

بعض الفاظ کو ہم نے "مورد" بنا لیا ہے مثلاً لیلٹرن (Lantern) کو لالٹین۔ سپرنٹنڈنٹ (Superintendent) کو "سپرڈنٹ"۔ پوائنٹس مین (Points man) کو "پیٹ مین" کہتے ہیں۔ بعض الفاظ کو ہم نے "آدھا تیتر آدھا بٹیر" کی ضرب المثل کا مصداق بنا دیا ہے۔ جیسے "ریل گاڑی"۔ اور اس اجتماع مختلف الجنس کے باوجود اس لفظ کی ساخت میں نہ تو جھول ہے اور کانوں کو نامانوس معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی کے جو الفاظ اردو میں داخل ہو چکے ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے اور اس سے اردو کی خصوصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کا استعمال بدستور رہنا چاہیے۔ سائیکل کیلئے "دوچرخی" کا لفظ گھڑنے کی زحمت کرنا تحصیل حاصل کے مترادف ہے۔ اور بفرض محال ان مٹھی بھر الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ دوسرے الفاظ گھڑ بھی دیے جائیں تو اردو کو کسی عنوان سے کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا۔ باقی رہی ترکی، تلنگی، مرہٹی وغیرہ زبانیں تو ان کے الفاظ اول تو تعداد میں بہت کم ہیں اور پھر وہ اردو میں کچھ ایسے گھل مل گئے ہیں کہ ان کو بڑی تحقیق کے بعد مشکل ہی سے جدا کیا جا سکے گا۔ اس ساری داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ انگریزی کے چند مروج الفاظ کو اگر ہم چاہیں تو کسی اردو سے خارج کر سکتے ہیں۔ فارسی اور عربی کے جو الفاظ زبان میں داخل ہو چکے ہیں ان میں سے ایک لفظ کو بھی جدا نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کیلئے بھی اپنی زبان... سے کام لیا جائے گا۔ اور بھاشا کے وہ الفاظ جو عام طور پر بولے جاتے ہیں ان کے نکال دینے کا تو کوئی تصور نہیں کر سکتا۔

آپ کو یاد ہوگا، اوپر کہا گیا تھا کہ ترقی زبان کے لئے جدید الفاظ کا اضافہ ضروری ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اردو زبان کی ترقی کیلئے الفاظ کا اضافہ کس عنوان سے کیا جائے۔ کیا انگریزی، فرانسیسی، عربی، فارسی وغیرہ السنہ کے الفاظ کو بدستور اردو میں منتقل کر دیا جائے؟ ان کی "تارید" (اردو بنانا) کی جائے؟ یا کوئی اور شکل اختیار کی جائے؟

یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ اردو بالذات کوئی زبان نہیں ہے۔ دوسری زبانوں سے عبارت ہے، اور بھاشا، فارسی، عربی اور

انگریزی[1] سے اس کا خاص تعلق ہے۔ فارسی اور عربی کے تراجم میں تو جدید الفاظ بنانے کی اس لئے ضرورت کم پیش آئے گی کہ اُردو میں ان زبانوں کا بہت کچھ سرمایہ پہنچ چکا ہے اور اُردو ان زبانوں کے الفاظ کی بہت کچھ متحمل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اب تک طب، فلسفہ، منطق، ہیئت، ہندسہ اور عروض کے تمام تراجم جو اُردو میں کئے گئے ہیں، اُن میں بڑی حد تک فارسی اور عربی کے الفاظ کا کوئی ترجمہ نہیں کیا گیا۔ صرف وہ الفاظ، جن کیلئے اُردو میں قریب المعنی الفاظ پہلے سے موجود تھے یا بعض الفاظ کی عربیت اور فارسیت، اُردو کے لئے ناگوار تھی، اُن کے واسطے اُردو میں الفاظ بنائے گئے ہیں۔

انگریزی کے تراجم میں بھی اب تک یہی ہوا ہے کہ الفاظ کے مقابل الفاظ وضع کئے گئے۔ اور انگریزی کے بہت ہی کم الفاظ کو بدستور باقی رکھا گیا۔ جہاں تک میں نے اُردو ادب کا مطالعہ کیا ہے، مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی مرحوم کو ضرور انگریزی الفاظ کا شیدائی پایا کہ وہ بے ضرورت انگریزی الفاظ کے بار سے نازک اُردو کی گردن توڑے ڈالتے ہیں، ورنہ دوسرے مصنفین نے تو "لٹریچر، کمیڈی، ٹریجڈی، نیچر، آرٹ، تھیوری" جیسے الفاظ سے زیادہ کوئی اور لفظ استعمال نہیں کیا۔ مولانا حالی کا اُردو پر غیر فانی احسان ہے، اُن کا شمار قصر اُردو کے موسسین میں ہے۔ مگر میں اندھی تقلید کا قائل نہیں ہوں اگر حسن عقیدت کی رو میں عیب و صواب اور برائی کو بھلائی سمجھنے لگوں۔ انسان غلطی کر سکتا ہے، اور وہ غلطی کرتا ہی ہے لیکن کسی غلطی سے اس کے دوسرے کمالات پر پانی نہیں پھر جاتا۔ مولانا حالی نے جس کثرت اور دھڑلے کے ساتھ اُردو میں انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں وہ ایک غیر مستحسن فعل ہے۔ اور کسی دوسرے کو اس خصوص میں اُن کی تقلید نہیں کرنی چاہئے۔ لہٰذا انگریزی الفاظ کو بدستور اُردو میں منتقل کر دینے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اُردو کو اونچی ـــــ [illegible] بنا رہے ہیں، اور ہماری اس کوشش کا رخ تعمیر کے بجائے تخریب کی جانب ہوگا۔ اگر ہم نے اسی چیز کو اُردو ادب کی خدمت سمجھا اور انگریزی الفاظ کو اُردو میں شامل کرنا شروع کر دیا تو ہم کو بڑی دقت کا سامنا ہوگا۔ رسم الخط کے اختلاف کے سبب ہم انگریزی کے الفاظ صحیح طور پر اُردو میں نہیں لکھ سکیں گے۔ اور اس عدم صحت کے ہاتھوں ہم نئے الجھاؤ میں پڑ جائیں گے۔ انگریزی الفاظ کا تلفظ بھی ہندوستانیوں سے ٹھیک نہیں ہوتا اور وہ لوگ جو انگریزی سے نابلد ہیں انگریزی الفاظ کا صحیح تلفظ بہت مشکل سے کر سکتے ہیں، لہٰذا اس صورت میں ہم اُن لوگوں کیلئے جو صرف اُردو جانتے ہیں بڑی مشکلات پیدا کر دیں گے اور ایک ایک لفظ پر اُن بے چاروں کی زبان لڑکھڑاتی رہے گی۔ پس انگریزی کے الفاظ کے لئے ہم کو اُردو میں الفاظ ضرور وضع کرنا ہونگے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ الفاظ اُردو میں کس طرح وضع کئے جائیں؟ سطور بالا میں اس پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ بھاشا، عربی اور فارسی سے اُردو کا بہت ہی قریبی تعلق ہے، بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ ان زبانوں ہی سے اُردو عبارت ہے۔ بھاشا کو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ زبان ذاتی طور پر علمی زبان بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی، کیونکہ اب تک دوسری زبانوں کا ترجمہ کرنے میں بھاشا نے ہمارا بہت ہی کم ساتھ دیا۔ پھر اُردو سے اس کا رسم الخط بھی مختلف ہے۔ اگر برج بھاشا میں اتنی صلاحیت ہوتی کہ دوسری زبان کے تراجم اس میں منتقل کئے جا سکیں تو "تعزیرات ہند" کا بھاشا میں کوئی ترجمہ ضرور ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی کے تمام قانونی الفاظ کا ترجمہ فارسی و عربی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ (اور میں تمام ان الفاظ کو "اُردو" ہی سمجھتا ہوں) اگر بھاشا میں ذرا بھی جان ہوتی اور دیوناگری کوئی صلاحیت رکھتی، تو ابنائے وطن تعزیرات ہند کا ترجمہ ضرور ان زبانوں میں کرتے، لیکن ہم نے اپنے بعض ہندو وکیل دوستوں کو جن کے ماتھے پر قشقہ لگا ہوا تھا، عدالت میں قتل عمد کو "قتل عمد" اور زنا بالجبر کو "زنا بالجبر" کہتے ہوئے سُنا ہے۔

---

[1] انگریزی کو میں نے مسئلہ واضح کرنے کیلئے اور اپنے مغرب زدہ بھائیوں کی خاطر شامل کر لیا ہے۔ ورنہ اُردو کو اس سے کیا تعلق۔ ماہر القادری

عربوں کا ہندوستان سے تعلق

اَب فارسی و عربی باقی رہ جاتی ہیں، جن پر ہم ذرا تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

عربی اور فارسی کا "اُردو" سے اتنا زیادہ تعلق کیوں ہے؟ انگریزی کو یہ قدامت کیوں حاصل نہیں! ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں کے تعلقات ہندوستان سے بہت قدیم ہیں اور ایک ہزار سال قبل عربی کے الفاظ ہندوستان کے ساحلی علاقہ پر رائج ہو چکے تھے، عرب بڑے اچھے ملّاح تھے، عربوں کے جہاز اتنے بڑے ہوتے تھے کہ اُن میں بارہ بارہ سو آدمیوں کے لئے گنجائش ہوتی تھی۔ وہ ہندوستان سے بحری راستے کے ذریعے اپنے تعلقات قائم کر چکے تھے، اور بعض نے بود و باش بھی اختیار کر لی تھی۔ ہندوستانیوں نے اپنے نووارد مہمانوں کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا، اور یہ خیر مقدم بعض رسم و رواج تک محدود نہ تھا بلکہ انہوں نے مذہب اسلام بھی قبول لیا۔ یوں سمجھئے کہ ہندوستانیوں نے عربوں کی جو میزبانی کی، اُس کا بدلہ عربوں نے سونے چاندی کے ٹکڑوں کے بجائے "ایمان و روحانیت" کے سدا بہار پھولوں سے دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ مسعود میں ہی عربوں کا ہندوستان سے تعلق ہو چکا تھا۔ آپ نے ایک سیاح سے ہندوستان کا حال پوچھا تو اُس نے کہا: "ہندوستان کا دریا موتی، اُس کا پہاڑ یاقوت، اور اُس کا درخت عطر ہے"۔ اسی حقیقت کو ابوضلع سندھی نے ۲۸۶ھ میں ایک شعر کے ذریعے ادا کیا۔ وہ ہندوستان کی تعریف میں کہتا ہے ؎

العمری انہا ارض اذا انقطر بہا ینزل یصیر الدر و الیاقوت والدر لمن یعطل

"میری جان کی قسم! یہ وہ سرزمین ہے کہ جب اس میں پانی برستا ہے، تو وہ دُر، موتی، اور یاقوت اُس سے اُگتے ہیں، اُن کیلئے جو آرائش سے خالی ہیں"

اس سے آپ عربوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے عربی کے الفاظ کو دیگر زبانوں کے مقابلے میں اس لئے زیادہ استعمال کیا کہ وہ اُن سے بہت زیادہ مانوس ہو چکے تھے۔ غیر ہندی مسلم مورخین اور سیاحوں کو بھی ہندوستان سے خاص شغف تھا، انہوں نے اس ملک کے حالات بڑے مزے کیساتھ لکھے ہیں۔ چنانچہ ابن خردازبہ (۲۵۰ھ) نے "کتاب المسالک و الممالک" میں ہندوستان کا جغرافیہ بیان کیا، اور ابودلف معربن مہلیل مینوی (۳۳۱ھ)، بزرگ بن شہریار (۳۰۰ھ)، مسعودی (۳۰۳ھ)، اصطخری (۳۴۰ھ)، ابن حوقل (۳۳۱ھ)، بشاری مقدسی (۳۷۵ھ)، البیرونی (۴۰۰ھ) اور ابن بطوطہ (۱۳۲۷ء) نے اپنی کتابوں میں ہندوستان کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عربوں کو ہندوستان سے ہمیشہ تعلق رہا ہے، اور اسی سبب ہندوستان نے عربی زبان کا بہت کچھ اثر لیا، اور ہندوستان کی سب سے جامع وسیع اور شیریں زبان "اُردو" میں عربی، فارسی کے الفاظ بہت زیادہ داخل ہو گئے۔

عربی و فارسی کا رسم الخط چونکہ اُردو سے ملتا ہوا ہے، لہٰذا اُردو میں فارسی و عربی کے الفاظ بغیر کسی دقت کے منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں وہ تمام حروف موجود ہیں جو فارسی اور عربی میں علیحدہ علیحدہ پائے جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ اُردو داں اشخاص کو فارسی و عربی الفاظ بولنے میں بھی دقت نہیں ہو سکتی۔

انگریزی کے مُروّج الفاظ

انگریزی کے وہ الفاظ جو اُردو میں بدستور داخل ہو گئے ہیں، لیکن بعد میں جا کر اُن کی جگہ دوسرے الفاظ اُردو میں بن گئے ہیں۔

ان کے متعلق میرا خیال ہے کہ انگریزی الفاظ کو اردو سے بالکل خارج کر دیا جائے۔ اور جدید وضع شدہ الفاظ کو بولا جائے۔ ایسا کرنے میں اول اول قدرے زحمت ہوگی۔ مگر جب اخبار و رسائل میں ایسے الفاظ کی تکرار کی جائے گی تو عام لوگ خود بخود انگریزی الفاظ کو چھوڑ کر ان الفاظ کا استعمال شروع کر دیں گے۔ مثال کے طور پر "ایٹ ہوم" (At-Home) کو لیجئے۔ یہ لفظ بہت دنوں سے اردو میں استعمال ہو رہا ہے۔ اب اس کی جگہ لفظ "عصرانہ" بن چکا ہے لہٰذا "ایٹ ہوم" کو ترک کر کے "عصرانہ" لکھنا اور بولنا چاہیئے۔ اسی طرح اپیل (Appeal) کو مرافعہ، مارچ (March) کو "شب تاب" کہنا چاہیئے۔ وقس علیٰ ہٰذا۔

اصلاح اغلاط

ترقی زبان اور وسعت ادب کی دوسری شکل یہ ہے کہ وہ غلطیاں جو عوام کی ناواقفیت کے باعث رائج ہو چکی ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔ اس طریقے پر وہ تمام اغلاط دور ہو جائیں گی جو اردو کے لطیف چہرے پر بدنما داغ کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ اس دعوے پر کسی ثبوت کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں کہ غلط الفاظ کی اصلاح و تصحیح زبان و ادب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ عام طور پر رسائل و اخبارات میں دیکھتے ہیں کہ "یکسانی" کو "یکسانیت" اور "یگانگی" کو "یگانگت" لکھا جاتا ہے۔ "یکساں" اور "یگانہ" فارسی الفاظ ہیں۔ ہم کو کوئی حق حاصل نہیں کہ غیر زبان کے الفاظ پر حرف و ست تصرف دراز کریں۔ ایرانی انشاپرداز یکسانی کو یکسانیت اور یگانگی کو یگانگت نہیں لکھتے "یکسانی" اور "یگانگی" میں اگر کسی قسم کا نقص، الجھاؤ، بھول کر ثقالت یا نامانوسیت ہوتی تو ایران والے اس کو ضرور بدل دیتے۔ وہ ان الفاظ کو اسی حالت میں بولتے اور لکھتے ہیں جس طرح کہ ہم نے فارسی کے دوسرے الفاظ میں کوئی ترمیم و اصلاح نہیں کی اسی طرح ان لفظوں کو بھی اسی طرح استعمال کرنا چاہیئے۔ خواہ مخواہ "بیت" کا دم چھلا لگا کر اچھے خاصے لفظ کو غلط بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح بہت سے ایسے الفاظ عوام میں رائج ہیں جو قواعد و زبان کی رو سے غلط ہیں اور ان کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

جس طرح نظم میں شعرائے قدیم کے استعمال کئے ہوئے بعض الفاظ کو "متروکات" میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اور ان کو کوئی شاعر استعمال نہیں کرتا اسی طرح ہم کو اردو کے قدیم انشاپردازوں کی تصنیفات کی چھان بین کر کے اس قسم کے "متروکات" کی فہرست تیار کرنی چاہیئے۔ تاکہ غیر زبان والوں اور جدید انشاپردازوں کو سمجھنے بولنے اور لکھنے میں آسانی ہو۔ اگر کسی انشاپرداز نے کوئی غلطی کی ہو تو اس کی تصحیح بھی ضروری ہے۔ مثلاً سر سید احمد خاں نے "آثار الصنادید" میں "ہتھیلی" کو "ہاتھ کی ہتھیلی" اور اٹلی کے باشندے کو "اٹلی کا انگریز" لکھا ہے۔ ہتھیلی کو ہاتھ کی ہتھیلی کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی سنگ مرمر کو سنگ مرمر کا پتھر کہنے لگے۔ ہتھیلی میں خود ہاتھ کی رعایت رکھی گئی ہے۔ کان کا وہ حصہ جو سر سے قریب ہے اس کو "کنپٹی" کہتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص "کنپٹی" کو "کان کی کنپٹی" کہنے لگے تو اس کو غلط کہا جائے گا۔ اردو زبان کی غلطی ہر آئینہ قابل اصلاح اور ادب اور وسعت ہے۔ سر سید نہ معلوم کس رو میں یہ لفظ لکھ گئے۔ آثار الصنادید کی آئندہ اشاعتوں (editions) میں اس کی اصلاح کر دینی چاہیئے۔ لیکن اصلاح متن میں نہ ہونی چاہیئے بلکہ حاشیہ پر صحیح لفظ لکھ دیا جائے۔ اسی طرح "اٹلی کا انگریز" بھی غلط ہے۔ انگریز انگلستان کے باشندے کو کہتے ہیں۔ "اٹلی کا انگریز" بے معنی سی بات ہے۔ سر سید احمد خاں کا مطلب "اٹلی کے انگریز" سے اٹلی کا باشندہ معلوم ہوتا ہے۔ اور انگریز سے ان کی مراد "یورپ کا باشندہ" ہوگا۔ سر سید احمد خاں کے انگریزوں سے بہت اچھے مراسم اور تعلقات تھے۔ اور یورپین اشخاص کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اس لئے وہ یقیناً انگریز (English) اطالوی (Italian) فرانسوی (French) اور امریکن

(American) کے فرق سے واقف ہوں گے، لیکن اس زمانے میں شاید ہر گورے چٹے والے کو عوام و جہلا "انگریز" کہتے ہوں گے، سرسید بھی عوام کی غلطی کا شکار ہونے سے نہ بچ سکے، اور انہوں نے اطالوی کو "اٹلی کا انگریز" لکھ دیا۔ یقین ہے کہ جس شخص نے یہ عمومیت قائم کی ہوگی کہ گورے چٹے، سنہری بال، اور نیلی آنکھ والے کو "انگریز" کہا جائے، خواہ وہ اطالوی نژاد ہو یا یونان کا باشندہ، تو وہ یقیناً یورپی ممالک کے جغرافیہ، نسلی تباین، اور لسانی اختلاف سے ناواقف ہوگا۔ اب یہ لفظ عوام میں مشہور ہو گیا، اور لکھے پڑھوں نے کبھی اس کی اصلاح پر کوئی توجہ نہ دی۔

بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ایک بہترین ناقد اور شریف انشا پرداز بھی وہ الفاظ بلاتکلف لکھتا اور بولتا ہے جو غلط ہوتے ہیں مگر عوام میں رواج پا جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عام طور پر بچپن کے زمانے میں ایسے لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا ہے جن کا تعلق زبان و ادب کی حد تک "عوام" سے ہوتا ہے۔ ان کے الفاظ جو عوام بولتے ہیں وہ زبان پر چڑھ جاتے ہیں، بڑے ہونے کے بعد اگرچہ معلومات میں وسعت، خیالات میں بلندی پیدا ہو جاتی ہے، اور نگاہ دقیقہ بین اور دماغ نکتہ رس ہو جاتا ہے۔ مگر وہ الفاظ جو زبان پر چڑھ گئے ہیں، کان ان سے مانوس ہو چکے ہیں، اور دماغ کی لوحِ حساس پر وہ نقوش کی صورت میں مرتسم ہو چکے ہیں، ان کی اصلاح کی جانب مطلق توجہ نہیں ہوتی اور ہم ان کو تحریر و تقریر میں بلا کسی روک ٹوک و تکلف کے استعمال کرتے ہیں۔ سرسید احمد خاں نے بھی لفظ "انگریز" کو غیر ارادی طور پر استعمال کر دیا۔ ان اغلاط کی اصلاح کی سب سے بڑی ضرورت غیر زبان والوں کیلئے ہے۔ اردو ملکی زبان بن گئی ہے۔ دوسری زبان والے اسے سیکھ رہے ہیں، اب اگر ان کے سامنے ایسا لٹریچر پیش کیا جائے گا جس میں زبان و محاورات کی غلطیاں ہوں گی تو وہ بھی ان اغلاط و اسقام کا اعادہ کریں گے۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہماری ادبی تصنیفات غیر اہل زبان کے لئے کتنی عظیم الشان گمراہی کا باعث ہوں گی، اس لئے کہ دوسری زبان والا تو مصنف کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس کے ایک ایک حرف کو صحیح و درست سمجھے گا، اس میں اتنی قابلیت کہاں کہ وہ غیر زبان کی ان نزاکتوں کو سمجھ کر غلطی کی اصلاح و صحت کر سکے۔ میں نے ایک رسالے میں ایک افسانہ پڑھا تھا، جس میں ایک صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ "سیدھے ہاتھ کی انگشتِ شہادت"۔ کوئی بنگال یا برما کا باشندہ جو اردو حاصل کرنا چاہتا ہو، وہ اس افسانے کو پڑھ کر غلطی نہیں نکال سکتا، اور وہ زبان و قواعد کی رو سے اس ترکیب کو غلط سمجھ نہیں سکتا، جبکہ وہ اردو کے رسالہ میں شائع ہوا ہو، اب وہ شخص "سیدھے ہاتھ کی انگشتِ شہادت" کا بلاتکلف استعمال کرے گا۔ غور فرمائیے کہ اس قسم کی غلطیاں اردو ادب کو کس قدر نقصان پہنچا رہی ہیں، اور ان کی اصلاح کس قدر ضروری ہے۔

میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ زبان کا مسئلہ بڑا نازک اور اہم ہے۔ تاریخ، سائنس، جغرافیہ وغیرہ علوم و فنون کے سلسلے میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اس کی اصلاح غیر اہلِ زبان بھی کر سکتا ہے، مگر زبان کی غلطی کی اصلاح اس کے بس کا روگ نہیں! اور میرے خیال میں تو اہلِ زبان بھی ان غلطیوں کا شکار ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

اس تجویز سے میرا مقصد خدانخواستہ لائق مصنفین کی تنقیص نہیں ہے۔ بلکہ میری غرض نیک نیتی کے ساتھ خدمتِ زبان و ادب ہے کیونکہ غلطی ہر شخص سے ہو سکتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی میرے دل میں انتہائی وقعت ہے، اردو ان کے احسانات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی، مگر میں نے ایک جگہ دیکھا کہ وہ بھی خیالات و مضامین کی رو میں "جاگیروں" کو "جاگیرات" لکھ گئے۔ حالانکہ جاگیر فارسی کا لفظ ہے، اور ہم کو عربی کے قاعدے سے فارسی کے لفظ کی جمع بنانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یو۔پی میں "جاگیرات" کوئی نہیں بولتا، کچھ دنوں علامہ شبلی نے

دکن میں قیام کیا تھا اور یہ وہیں کی زبان کا اثر تھا کہ وہ بلا تکلف "جاگیرات" لکھ گئے۔ علامہ شبلی کے مقالات اُردو کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ اُن کی قومی و ملی تجاویز سر آنکھوں پر، مگر اس لفظ کی حد تک اُن کی تقلید نہیں کرنی چاہیئے۔ دکن میں جنگل کی جمع "جنگلات" بازار کی "بازارات" ملگی (دو کان کوٹھڑی) کی جمع "ملگیات" بولی جاتی ہے۔ اسی طرح جاگیروں کو "جاگیرات" کہا جاتا ہے، علامہ شبلی کے کان ان الفاظ کو سنتے سنتے عادی ہو گئے تھے، لہٰذا انہوں نے "جاگیرات" اپنی تحریر میں استعمال کر دیا۔ پس ایسی غلطیوں کی اصلاح کی جانب پہلی فرصت میں توجہ کرنی چاہیئے۔ تاکہ زبان چاند کی طرح نکھر جائے اور ادب اُردو کے دامن پہ کوئی دھبہ باقی نہ رہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایک مکمل ترین نظام کی ضرورت تھی کہ وسیع پیمانے پر کام ہوتا۔ مگر جب بدقسمتی سے یہ اسباب مفقود ہیں تو انشا پرداز صاحبان کو انفرادی طور پر اس منزل میں قدم بڑھانا چاہیئے اور اخبارات و رسائل کے مدیران محترم اگر اس پر توجہ فرمائیں تو ان کا اقدام سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوگا اور بڑی حد تک زبان کی اصلاح ہو جائے گی اور ادبِ اُردو وسیع ہو سکے گا۔

در جہاں، مال و پرِ خویش کشودن آموز — کہ پریدن نتواں با پر و بالِ دگراں

ماہر القادری

حیا

انجمن سرود تھی شغلِ شرابِ ناب تھا
چاروں طرف بہار تھی چاروں طرف شباب تھا

موجۂ آب پر رواں سینکڑوں ماہتاب تھے
رات کو آئینہ بدوش گویا ہر اک حباب تھا

جوشِ طرب میں کروٹیں لینے لگا بصد سرور
سبزہ جو فرشِ خاک پر دیر سے محوِ خواب تھا

انجمنِ فلک پہ تھا نور ہی نور منتشر
ذرہ فروغِ نور سے رشکِ ماہتاب تھا

مینا بدوش تھی کلی، جام بدستِ شاخِ گل
جھونکا اک نسیم کا موجِ شرابِ ناب تھا

شب کو تعینات کی ٹوٹ رہی تھیں سب حدیں
بزمِ جہاں کا ہر سکوں مائلِ اضطراب تھا

دشمنِ دیں، جفا شعار رہزنِ ہوش و آگہی
پہلو میں میرے اک حسیں حاملِ صد شباب تھا

ڈوبی ہوئی شراب میں تھی نگہِ فسوں طراز
برق فشاں تبسم عارضِ بے نقاب تھا

دل کی ہر ایک آرزو صرفِ امید و بیم تھی
برپا جہانِ شوق میں گویا اک انقلاب تھا

سر بسجود عشق تھا بارگہِ مجاز میں
حسنِ حقیقت آشنا مائلِ اجتناب تھا

عرقِ انفعال تھا جبینِ حسن پر
عشق کا ذوقِ بندگی اصل میں کامیاب تھا

سقراط

فلسفہ وادب کی تاریخ میں بالعموم اور تاریخ فلسفۂ یونان میں بالخصوص جو بلند مرتبہ حکیم سقراط کو حاصل ہے وہ محتاج تعریف نہیں۔ گو اُسے اس عالم فانی سے کوچ کیے ہزارہا سال گزر چکے ہیں۔ اور اُس کی ہڈیاں تک سرمہ ہو کر اس طرح مٹ چکی ہیں کہ گویا کبھی وجود ہی میں آئی ہی نہ تھیں۔ لیکن حکمائے عالم اور خاص کر حکمائے یونان کی صف میں اسے ایک ممتاز جگہ حاصل ہے اور آج تک اس کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اور جوں جوں اُس کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، اس کی شہرت اور وقعت زیادہ بلند ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اس کی شہرت کا سبب صرف یہی نہیں کہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں اس کا ذہن زیادہ فلسفیانہ اور نکتہ رس تھا، یا یہ کہ اُس نے کسی جدید فلسفے یا ادب کی بنا رکھی تھی بلکہ اُس کی شہرت کا خاص اور اہم سبب یہ ہے کہ اس کی زندگی کے مطالعہ سے طالب علم کو ایک نہایت مفید اور نیک سبق حاصل ہوتا ہے۔ اس کی زندگی نہایت خوبصورتی اور نرالی شان سے ختم ہوئی اور اسی وجہ سے اُسکے حالات بے حد عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔ ہم ساقی (ستمبر ۱۹۳۴ء) میں حکیم سقراط کی نیک سیرت بیوی کسانتھیپ کے مختصر حالات زندگی پیش کر چکے ہیں اور اب سطور ذیل میں حکیم سقراط کے حالات پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

ابتدائی حالات: تاریخ قدیم یونان کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حکیم سقراط کا باپ سقرونکس نامی ایک سنگتراش تھا اور اس کی ماں فیناریتی دایہ تھی۔ وہ ۴۶۹ سنہ قبل از مسیح پیدا ہوا تھا۔ اُسکے ماں باپ بہت تنگدست اور مفلوک الحال تھے، اس لئے انہوں نے اسے معمولی ابتدائی تعلیم دلوائی۔ اور سقراط نے بھی اپنے آبائی پیشہ [illegible] مگر بعض مشاہیر عالم کی طرح صرف اپنے ذہن رسا، روشن خیال طبیعت اور کاوش و محنت سے علم و فلسفہ میں کمال حاصل کیا۔ فطرت کا یہ راز بھی دیکھنے اور غور کرنے کے قابل ہے، اور تاریخ زمانہ زندگی میں اس کی صدہا مثالیں مل سکتی ہیں، کہ جن اصحاب نے کسی فن یا علم میں کمال حاصل کیا۔ اور جو ترقی کے بام عروج پر پہنچ کر حیات جاوید حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اُن کا فضل و کمال کسی غیر ہستی کا [illegible] نہ تھا۔ فطرت نے تو انہیں ایسے حالات اور ایسے ماحول میں پیدا کیا تھا کہ اگر وہ بھی اپنے گرد و پیش بھائیوں کی طرح ایک غیر مفید اور [illegible] انسان کی زندگی بسر کر کے ہمیشہ کیلئے نیست و نابود ہو جاتے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی لیکن نہیں انہوں نے اپنی حوصلہ شکن اور اندوہگیں حالات پر اپنی ذاتی کاوش اور محنت سے نہ صرف فتح پائی بلکہ اُن کو حیات جاوید حاصل کرنے کا آلہ بنایا۔ برخلاف اس کے بہت سی ایسی ہستیاں بھی تھیں اور ہیں اور ہونگی جو باسانی علم و فضل میں کمال کے درجے تک پہونچ سکتی تھیں۔ لیکن فطرت نے انہیں بڑھنے نہ دیا۔ یہاں تک کہ آج کوئی اُن کے نام تک سے بھی واقف نہیں ہے۔ تمول اور تنگدستی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ انسان کوتاہ بین اس راز کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ جب غریبوں اور امیروں کا فرق محسوس کرتا ہے تو قدرت کاملہ کو ظالم و جابر تک کہہ گذرتا ہے۔ مگر اس کی غلطی ہے۔ تاریخ عالم زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ جو مصیبت انسان پر پڑتی ہے گو وہ بظاہر کسقدر تکلیف دہ ہو اور ہم اُس کی حکمت کو نہ سمجھ سکیں اور اپنی غلط فہمی [illegible]

[illegible]

سقراط نے اپنا آبائی پیشہ [illegible] محنت و مشقت سے نفرت تھی اس لئے اس نے اپنے [illegible] معاصر پر کلیہ کی وفات کے بعد یہ کام ترک کر دیا۔ دیوجانس نے [illegible] کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایتھنز کا ایک مالدار آدمی کریٹو نامی سقراط کی

عادت سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اُسے دوکان سے اُٹھا لیا، اور اُس کی تعلیم کا تمام بار اپنے کندھوں پر لے لیا۔ آگے چلکر اسی کریٹو نے اپنے پرورش کنندہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور اسکے حلقۂ شاگردی میں شامل ہوکر اُس سے عقل و حکمت کا سبق سیکھنے لگا۔

اب یہاں یہ عجیب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سقراط کس کا شاگرد تھا؟ اسکے متعلق رائے میں سخت اختلاف ہے بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ انیکساغورس، پروٹاغورس اور پروڈکس کا شاگرد تھا۔ مگر خود سقراط نے اپنی ایک تقریر "کور فی وتیم" (جو زینوفن کی تصنیف ہے) میں بیان کیا ہے کہ اُس نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ لیکن بایں ہمہ ممکن ہے کہ وہ کبھی کبھی مذکورہ بالا معلمین کے درسوں میں حاضر ہوا کرتا ہو، اس زمانے کا طریقۂ تعلیم زمانۂ مابعد اور دورِ حال کے طریقۂ تعلیم سے بالکل مختلف تھا۔ اس وقت صرف تقریریں اور مباحثے ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ہمارے خیال میں سقراط نے باقاعدہ طور پر کسی کی شاگردی نہیں کی۔ اور سقراط کی داستانِ حیات کا بغور مطالعہ کرنے سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ایسا آزاد منش آدمی کسی خاص معلم کا شاگرد نہیں ہو سکتا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی اس کی تعلیم زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ اُس نے اپنے عصر کے نامور علماء اور خاصکر انیکساغورس کی تعلیم سے ضرور فائدہ حاصل کیا۔

ابتدا میں سقراط کو علم طبعیات سے خاص شغف تھا، مگر اس زمانے میں طبعیات کی تعلیم کچھ ایسے ناقص طریقے پر ہوتی تھی کہ اسکے سمجھنے اور سیکھنے میں مابعد الطبعیات سے بھی زیادہ اُلجھن پیدا ہوتی تھی۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُسوقت طبعیات زیادہ تر فلسفیانہ تخیلات اور نظریات کے مجموعہ کا نام تھا۔ اسلئے سقراط بہت جلد ان باتوں سے گھبرا گیا اور متنفر ہوکر اُسے ترک کر دیا۔

خانگی زندگی اس زمانے میں پرکلیز کی محبوبہ اسپاسیا ایتھنز کی محفلوں اور مجلسوں میں مایۂ صد جاذب و کشش بنی ہوئی تھی۔ اُس کے غیر معمولی حسن و جمال کے سبب سے اُس کے مکان پر اُسکے عاشقوں اور پرستاروں کا خوب جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ سقراط بھی ان محفلوں اور جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ وہ اسپاسیا سے والہانہ الفت رکھتا تھا، اور اس سے شادی کرنیکا خواہشمند، مگر اسکی مالی حالت بہت ہی خراب تھی اور اسی وجہ سے اسپاسیا نے اسکی خواہش پوری کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن اسپاسیا کی تحریک اور اسی کے توسط سے سقراط کی کسانتیپ سے شادی ہوگئی جو ایتھنز کے ایک دولتمند کسان کی لاڈلی بیٹی تھی اور اسکے بطن سے سقراط کے دو بچے ہوئے۔

مورخین نے کسانتیپ کو بدنام کرنے کی بیحد کوشش کی ہے۔ اُسے ایک سخت گیر، تندخو، جھگڑالو عورت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ بہت ہی نیک دل، شریف النفس، اور وفاشعار بیوی تھی۔ برخلاف اسکے سقراط ایک آزاد منش اور بے فکر انسان تھا۔ وہ گھر کی مطلق خبر نہ رکھتا تھا۔ اُسے پرواہ نہ تھی کہ آیا بیوی کے پاس کپڑا اور بچوں کیلئے ٹکڑا ہے یا نہیں۔ وہ اکثر اپنی بیوی سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ شب عروسی کو بھی اسکی کسانتیپ سے لڑائی ہوگئی تھی۔ اور اُسکے بعد وہ ہر رات کو سوتے وقت اُس سے لڑا کرتا تھا۔ مگر اس شوہر پرست خاتون نے اپنے سرتاج کو کبھی نشانۂ طعن و تشنیع نہ بنایا۔ وہ اُس کی کج مزاجی اور آوارگی کو حوصلے اور استقلال سے برداشت کرتی رہی۔ اُس نے اپنے نفس کو اپنے جان و دل کے مالک پر قربان کر دینے میں دریغ نہ کیا۔ اور اُسے گرسنگی کے آہنی پنجوں سے چھڑانے کے لئے اپنا مال و متاع اور عزت و جاہ سب کچھ فنا کر دیا۔ سقراط کی آوارگی کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ وہ تمام دن کوچہ گردی کرتا اور شہر کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ وہ سب سے لڑائی مول لیتا تھا اور ہر ایک سے یہی کہا کرتا تھا کہ "ہم اور تم سب جاہل ہیں۔ اور اگر اس میں کچھ شک ہے تو آؤ بحث کر لیں"۔

سقراط نے اپنی تمام عمر مفلسی اور تنگدستی میں گذار دی۔ اسے محنت و مشقت کرکے روزی کمانے سے سخت نفرت تھی اور طبیعت میں استغنا

اِس قدر تھا کہ اگر شاگرد کچھ نذر کرتے تو وہ اُس کے قبول کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔ وہ موٹا کپڑا پہنتا، معمولی کھانا کھاتا اور تمام عمر دُنیاوی خوشیوں سے محروم رہا۔ اگر کسانتیب اپنے ماں باپ کی دولت سے اُس کی مدد نہ کرتی تو اُس کے لئے گھر بار چلانا بھی دوبھر ہو جاتا۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے اُس سے دریافت کیا کہ اُس نے محنت مزدوری کرنا کیوں ترک کر دیا؟ تو اُس نے فوراً جواب دیا کہ "انسان کو صرف بحالتِ مجبوری کام کرنا چاہیئے، آجکل کسانتیب کی دولت پر بیٹھے آرام سے زندگی بسر ہو رہی ہے تو پھر محنت کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

سقراط کی شکل وصورت بہت بدنما تھی۔ اُس کا قد ٹھگنا، جسم موٹا اور بیڈول تھا۔ جب وہ عمر کا پختہ ہو گیا تو اُس کی چندیا بھی گنجی ہو گئی۔ اُس کی ناک چپٹی، موٹی اور اوپر کو اُٹھی ہوئی تھی۔ وہ عجیب چال سے چلا کرتا تھا اور آنکھیں پھڑکانے میں بہت مہارت تھی۔ گروٹ نے "تاریخ یونان" میں لکھا ہے کہ سقراط کی خاص صفات یہ تھیں کہ اُس نے اپنی تمام عمر قناعت آمیز مفلسی اور نصیحت آمیز اور نتیجہ خیز مکالموں اور مناظروں میں گذار دی۔ اسکی طبیعت پر گہرا مذہبی اثر تھا اور اُسے یقین تھا کہ قدرتِ کاملہ نے اُسے ایک خاص مطلب کی تکمیل کیلئے پیدا کیا ہے۔ اور اُسکے اقوال وافعال ایک مافوق الفطرت آواز کے زیرِ اثر تھے جسے وہ "ڈیمن" (Daemon) کہتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ "آواز" اُسے اُس کے افعال کے نیک و بد اثرات سے آگاہ کر دیتی ہے اور وہ کسی ترغیب اور کسی اثر سے بھی اس آواز کے حُکم کی خلاف ورزی کرنے کیلئے تیار نہ تھا۔ اُس کے قوائے عقلی میں ایجاد و اصلیت کا مادّہ موجود تھا۔ وہ اپنے ذہنِ رسا سے نئے نئے مضامین نکالتا تھا۔ اُس کا طریقۂ بحث بھی بالکل نیا تھا۔ وہ اپنی انہی صفات کی وجہ سے حکمائے یونان میں ممتاز مانا گیا ہے۔

مُفلسی، دُنیاوی دولت وطمع سے بے پرواہی اور عام ضروریات اور خواہشات سے آزاد وہ انہی باتوں کے حاصل کرنے میں مصروف تھا جو اُسکی نگاہوں میں قابلِ وقعت تھیں یعنی نیکی اور عقلمندی۔ اُس نے تعلیم وتلقین کا پیشہ اختیار کرنے سے قبل جنگِ اسپارٹہ اور ایتھنز کی تین لڑائیوں میں شرکت کر کے دادِ شجاعت دی۔ اس میں جسمانی اور اخلاقی قوت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ جنگ پلوپونیسین (Peloponnesian War) میں اُس نے اپنے ساتھیوں کو اپنی شجاعت اور مصائب برداشت کرنے کی قوت سے متحیر کر دیا تھا۔ دو مرتبہ اپنی جان تک خطرے میں ڈالکر اُس نے اپنے ساتھیوں کو موت سے مُنہ سے چھڑایا تھا۔ جنگِ ڈیلم (Delium) میں اہلِ ایتھنز کو شکست ہوئی تھی لیکن اس موقع پر بھی سقراط نے ہمت نہ ہاری۔ ایک اور مرتبہ دورانِ جنگ میں اس غضب کی سردی پڑی کہ تمام زمین برف سے پٹ گئی۔ مگر سقراط اسکی کوئی پروا نہ کرتے ہوئے برہنہ سر اور برہنہ پا اور بہت کم لباس پہنے ہوئے اس پر پھرتا رہا۔ ایک موقع پر وہ چوبیس گھنٹے تک ایک ہی مقام پر کھڑا غور کرتا رہا۔ ایتھنز کی پہلی جنگ کے بعد بہادری کا انعام بھی سقراط کو ملا۔ مگر یہ اُس نے اپنے دوست السی بائیڈیز کو دلوا دیا تاکہ اُس کا حوصلہ بڑھے۔ وہ ایک بہترین ساتھی تھا۔ اُس کی عادتیں سادہ تھیں، اُس نے نہ تو کبھی اپنی آزادی پر بے جا غرور کیا اور نہ کبھی سوفیانہ اور عزلت گزینی کی زندگی پسند کی۔ اُسے شراب خوری کی عادت نہ تھی لیکن موقع پڑنے پر وہ پی لیتا تھا اور پھر اس قدر کہ دوسرے متحیر ہو جاتے تھے۔ لیکن اس کا سقراط پر بظاہر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ افلاطون نے "بنکویٹ" (Banquet) میں دکھایا ہے کہ سقراط تمام رات شراب پیتا اور اپنے دوستوں سے باتیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ سقراط اور اُسکے دو دوستوں کے علاوہ باقی تمام مہمان مدہوش ہو گئے۔ آخر پو پھٹنے پر اُس کے دونوں دوست بھی سو گئے۔ لیکن سقراط پر اُسکا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ہاتھ مُنہ دھو کر اپنے کام پر چلا گیا۔

سقراط کے حالات کے ماخذ

حکیم سقراط کے حالات زیادہ تر اُسکے شاگردوں زینوفن (Xenophon) اور افلاطون (Plato) کی تصنیفات سے معلوم ہوتے ہیں۔ زینوفن ایک سیدھا

[illegible] سپاہی تھا اسے حکمت وفلسفہ سے زیادہ تاریخ کا ذوق تھا بلکہ وہ اعلیٰ انسان تھا۔ اُس نے سقراط کو بطور حکیم و فلاسفر پیش نہیں کیا ہے بلکہ وہ سقراط کے اوصاف اور اُسکے اعلیٰ چال چلن کا پرستار تھا۔ وہ اپنی کتاب "[illegible]" ([illegible]) میں اس بات کا مدعی ہے کہ اس نے سقراط کے اصل الفاظ اور تقریر قلمبند کی ہے۔ اور یہ کتاب اس غرض سے لکھی گئی تھی کہ سقراط پر جو الزام بے دینی اور مذہب یاست سے انحراف کا لگایا گیا تھا اُس کا اس سے ازالہ ہو سکے۔ اسکے افلاطون کی ضخیم تصنیفات اور بے شمار مکالموں کا نمبر ہے۔ اُن میں زیادہ تر حصہ سقراط کا ہے لیکن اس بات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ کب سقراط کے خیالات ختم ہوتے ہیں اور کہاں سے افلاطون کے خیالات کا آغاز ہوتا ہے۔ افلاطون خود ایک نامور حکیم اور فلسفہ میں سقراط کا ہم پایہ شاگرد تھا۔ اس لئے اکثر ناقدان ادب و فلسفہ کا خیال ہے کہ اُس نے سقراط کا طرز تحریر اختیار کر کے اپنے خیالات سقراط کی زبان میں بیان کئے ہیں۔ افلاطون کی چند مشہور تصنیفات "معذرت نامہ سقراط" ([illegible]) "فیڈیو" ([illegible]) اور کرٹو کے متعلق دو رسالوں کے متعلق محققین کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ یہ سقراط کے ہی خیالات اور الفاظ ہیں۔ اور مکالموں کی نسبت کہا گیا ہے [illegible] افلاطون کے [illegible] فلسفہ اخلاق جو افلاطون نے بیان کیا ہے وہ زیادہ تر سقراط کی تعلیم ہے جسے افلاطون نے وسعت دیدی ہے۔

سقراط کے خصائل و عادات کی جو تصویر زینوفن اور افلاطون نے کھینچی ہے یا جو کچھ لوگوں کی زبان سے بیان کی ہے اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ ان حالات میں یہ کہنا غلط نہیں کہ اگر سقراط کے دیگر شاگردوں کی تصنیفات آج موجود ہوتیں تو ان میں بھی وہی سقراط نظر آتا جس سے افلاطون کی تصنیفات پڑھنے والے واقف ہیں۔ زینوفن کا ذہن افلاطون کی طرح حکمت و فلسفہ کا مخزن نہ تھا چنانچہ اُس نے سقراط کی صرف عملی تعلیم قلمبند کی ہے۔ اُس کا مطلب عام طور [illegible] کرنا ہے [illegible] واضح ہوتا ہے کہ سقراط کی باتیں منطقی قسم کی ہوتی تھیں [illegible] خیالات کی [illegible] تھا اور ہر خیال کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُن سے الگ الگ بحث کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اُس کی [illegible] ہوتی ہے [illegible] مثال یا تشبیہ کو ایک عام قاعدہ بنا لیا جاتا تھا۔ زینوفن کی تصنیفات سے تو سقراط کی [illegible] افلاطون نے بھی نہایت حکیمانہ پیرائے میں یہی ظاہر کیا ہے کہ سقراط کے فلسفہ کا ماحصل یہی ہے۔ اور گو وہ سقراط کے فلسفہ کے عملی پہلو کو نہیں بلکہ اصولی پہلو کو بیان کرتا ہے لیکن وہ بھی اسی سقراط کو پیش کرتا ہے جس کی تصویر زینوفن نے کھینچی ہے۔

سقراط کی تعلیم

سقراط سوال و جواب کے ذریعے تعلیم دیا کرتا تھا۔ اور اس طریقہ تعلیم کی ایجاد کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ اسکی تعلیم کا بنیادی اور اساسی مسئلہ معرفت تھا جسے وہ حسن کے صحیح ادراک سے وابستہ مانتا تھا لیکن افلاطون اور زینوفن کی تصنیفات کے بغور مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ سقراط کسی خاص عقیدے یا اصول کی تعلیم نہیں دیتا تھا۔ اس کا قول تھا "جہالت تمام برائیوں اور گناہوں کی جڑ ہے۔ انسان گناہوں اور برائیوں کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو کر اُن کی طرف بہت کم رجوع کرے گا۔ اور اگر کوئی انسان عمداً گناہ کرے تو بھی وہ اس شخص سے بہتر ہے جو جہالت اور نادانی کی وجہ سے گناہ کرتا ہے کیونکہ پہلے انسان کو نیکی کا حقیقی مطلب معلوم ہے اور وہ جانتا ہے کہ نیکی کے کیا فوائد ہیں لیکن [illegible] نیکی اور بدی میں تمیز کرنے سے عاجز و لاچار ہے۔"

سقراط کی تعلیم کا اصل مقصد صرف یہ تھا کہ حکیم فلسفی اور [illegible] سلطنت [illegible] الغرض اہل فن اور اہل علم جو کسی خاص فن یا صنف میں ماہر ہونے کے مدعی ہیں اُن پر یہ ثابت کرے کہ وہ کچھ نہیں جانتے [illegible] سقراط کی [illegible] ([illegible]) تعلیم اگرچہ بادی النظر میں غیر مفید

معلوم ہوتی ہے لیکن فلسفہ و علوم کی تاریخ میں اس سے بہت مختلف انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کے ذہن میں صرف چند خیالات اور مسائل باتیں ہوتی ہیں کہ وہ علوم و معانی کے نام سے پکارتا ہے۔ سقراط نے سمجھ لیا ہے کہ دانائی غور و فکر اور محنت کئے بغیر محض سنی سنائی باتوں سے پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔

سقراط کی تعلیم اور اس کے اصول اخلاقی تھے۔ وہ علانیہ کہا کرتا تھا کہ زندگی کے سب طریقوں میں نیکی کو ترجیح ہے۔ اسکی ہدایت تھی کہ جرأت اور استقلال کے ساتھ انصاف کا دامن پکڑے رہو کیونکہ حقیقی خوشی یہی ہے۔ اس کا قول تھا "نامنصف مزاج آدمی ہی دُنیا میں ناخوش رہتا ہے" اور وہ اپنی اس زریں تعلیم اور اپنے ان اصولوں پر نہایت سختی سے عامل تھا۔ اس نے ایتھنز کی پارلیمنٹ کا ممبر ہونیکے وقت جس دلیری اور جرأت کا اظہار کیا وہ آج تک بطور مثال پیش کی جاتی ہے۔ اس میں اخلاقی جرأت اس قدر تھی کہ موت کے منہ میں نہیں گھبراتا تھا۔ اس نے عام رائے کی مخالفت کرنے میں کبھی بزدلی نہیں دکھائی۔ اس کی تاریخ میں بہت کم ملیں گی کہ ایک ہی شخص نے یکہ و تنہا اور بے یار و مددگار ہونیکے باوجود ظالم و جابر حکام اور ... گروہ کا مقابلہ کیا ہو مگر سقراط نے ایسا کر کے دکھا دیا۔

سقراط کے زمانے میں ایک مرتبہ تیس غاصب ایتھنز پر حکمران تھے۔ انہوں نے سقراط کو مع چار دیگر اشخاص کے روٹنڈا (Rotunda) (جو دار الامارت تھا) میں طلب کر کے حکم دیا کہ لیئون باشندہ سلیمیس (Zeon of Salamis) کو گرفتار کر کے ایتھنز میں لائے۔ تاکہ اُسے قتل کر دیا جائے۔ لیئون نے اہل ایتھنز کے حقوق حاصل کرنے تھے مگر غاصبوں کے ڈر سے سلیمیس میں مقیم تھا۔ سقراط نے اس غیر منصفانہ اور جابرانہ خدمت کو انجام دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اُس نے خود اپنی تقریر میں کہا ہے :-

"اگرچہ حکومت زبردست تھی مگر میں نے عتاب اور دھمکیوں کے باوجود ایسے غیر منصفانہ کام انجام دینے سے صاف انکار کر دیا۔ روٹنڈا سے رخصت ہو کر وہ چاروں شخص تو سلیمیس کو چلے گئے اور میں سیدھا اپنے گھر چلا آیا۔ مجھے اس حکم عدولی کی پاداش میں ضرور سزائے موت ملتی مگر خیریت ہوئی کہ چند روز بعد ان غاصبوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔"

ایتھنز میں ایک پارلیمنٹ یا پنچایت تھی جسے اُسکے افراد کی تعداد کی مناسبت سے "پانسو" کہتے تھے۔ اسکے افراد وہاں کے دس قبائل میں سے منتخب ہوتے تھے۔ ہر ۳۵ یا ۳۶ دن کے بعد ایک قبیلے کے صدر مجلس بننے کی باری آتی تھی۔ صدر مجلس کے رتبہ کو "پرائی ٹینس" کہتے تھے۔ پچاس "پرائی ٹینس" میں سے ہر ہفتہ دس آدمی میر مجلس چُنے جاتے تھے۔ اور ان دس میں سے ہر روز ایک آدمی قرعہ اندازی کے ذریعے سب کا افسر مقرر کیا جاتا تھا۔ ریاست میں سب سے زیادہ معزز ہستی وہی ہوتی تھی۔ اسی کا کام لوگوں کی رائے لینا اور اُن کو شمار کرنا تھا۔ الغرض صدر مجلس پارلیمنٹ کا تمام کام کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ریاست جمہوری کے خزانے کی چابیاں بھی اُس کی ہی تحویل میں رہتی تھیں۔ مگر کوئی شخص ایکدن سے زیادہ اس عہدے پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

جنگ آرگنوسی (Arginusae) کے بعد ایتھنز کے امیر البحر پر یہ جرم عائد کیا گیا کہ اُس نے مقتولین کی تجہیز و تکفین کرنے میں غفلت سے کام لیا۔ اس زمانے میں مقتولین کا دفن کیا جانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اہل ایتھنز کو یقین تھا کہ ان کی تجہیز و تکفین میں غفلت کی گئی تو اُن کی ارواح سنو برس تک قعر جہنم کے کنارے پریشان پھرا کریں گی۔ اس عجیب مقدمے کی کیفیت یہ ہے کہ جنگ کے بعد ایک سخت طوفان آیا جس کی وجہ سے مقتولین کی نعشیں دستیاب نہ ہوسکیں۔ امیر البحر نے اپنے ماتحت افسروں کو نعشوں کو تلاش کر کے دفن کر دینے کی تاکید کر کے بھیجا تھا مگر طوفان کے سبب سے وہ بھی اس فرض کو ادا نہ کر سکے۔ جب اہل ایتھنز کو ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے امیر البحر پر مقدمہ

کر دیا۔ امیر البحر نے صفائی کے گواہ پیش کئے جن کے بیانات سے یہ ثابت ہو گیا کہ طوفان کی وجہ سے نعشیں دستیاب نہ ہو سکیں۔ اگر اسیوقت رائے لی جاتی تو وہ افسر جو مجرم قرار دیے گئے تھے صاف بری ہو جاتے۔ مگر اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے اس دن مقدمہ ملتوی کر دیا گیا۔ دوسرے دن مقتولین کے خویش و اقارب اور دیگر اعزا ماتمی لباس پہنے تمام شہر میں گھومتے پھرتے اور عوام کو جوش دلاتے رہے۔ اس گریہ و زاری کا ممبران پارلیمنٹ پر بہت برا اثر ہوا۔ دوسرے دن حسن اتفاق سے حکیم سقراط "پرائی تینس" کا سردار تھا حل طلب سوال یہ تھا کہ کیا ان بحری افسروں نے (جن کی تعداد ...س تھی) غفلت کی یا نہیں؟ نیز یہ کہ کثرت رائے سے ان کو پھانسی اور ضبطی مال و متاع کی سزا ملنی چاہیئے یا نہیں؟ سقراط کی تحریک پر "پرائی تینس" نے اس غیر منصفانہ سوال پر رائے لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر عوام کو جوش آ گیا۔ انہوں نے اودھم مچا دیا اور چلا چلا کر کہنے لگے کہ "یہ شخص ہماری مخالفت پر آمادہ ہے، خود اسی پر مقدمہ ہونا چاہیئے"۔ اس دھمکی سے تمام "پرائی تینس" دم بخود ہو گئے لیکن سقراط ایک آہنی بنیاد کی طرح اپنی جگہ پر استقلال کے ساتھ قائم رہا۔ اور عوام کی دھمکیوں کی مطلق پرواہ نہ کی۔ اس نے اپنی تقریر میں (اس واقعہ کو بتفصیل تمام افلاطون نے "معذرت نامہ سقراط" میں لکھا ہے) کہا کہ "میں اس جگہ صرف انصاف کے لئے کھڑا ہوں قتل کے لئے نہیں۔ اس کے متعلق میں کوئی رائے دینے سے مجبور ہوں"۔ بالآخر اس روز اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ دوسرے دن کوئی اور شخص میر مجلس تھا، رائے لی گئی اور بحری افسروں کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔

سقراط کی موت۔

جب سقراط ستر برس کا ہوا تو اس کو گرفتار کر کے اس پر تین جرم عائد کئے گئے۔ (۱) وہ ملحد ہے اور قومی دیوتاؤں سے انکار کرتا ہے۔ (۲) ان کی بجائے نئے دیوتاؤں کی تلقین کرتا ہے۔ اور (۳) اس نے نوجوانوں کا اخلاق بگاڑ دیا ہے۔ یہ تینوں جرم بالکل غلط اور بے بنیاد تھے۔ قدما کے بیشتر یونانی حکماء پر ایک حد تک انصاف کے ساتھ پہلا الزام لگایا جا سکتا تھا۔ کیونکہ انہیں قومی مذہب پر اعتقاد نہ تھا۔ اور ان میں سے بعض نے تو علانیہ قومی دیوتاؤں کی مذمت کی تھی۔ لیکن صرف سقراط نے اس بات سے احتراز کیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ ہمیشہ دیوتاؤں کی تعظیم و تکریم کرنے کی ہدایت کیا کرتا تھا۔ زینوفن نے لکھا ہے کہ وہ دیوتاؤں اور خداوند ...میں تمیز کرنے کا سبق دیتا تھا۔ اس کی تعلیم تھی کہ دنیا کو بنانے والا، ہمارے افعال کا ذمہ دار اور رہبر صرف ایک ذات ہے جو سب سے برتر اور ...پرستش ہے۔ دوسرا الزام غالباً اس لئے لگایا گیا تھا کہ سقراط کا دعویٰ تھا کہ "ایک مافوق الفطرت آواز" کے احکام پر عمل کرتا ہے۔ لیکن ...کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ کسی نئے دیوتا کی تلقین کرتا تھا۔ تیسرا الزام یعنی نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنا بھی قطعی بے بنیاد تھا۔ گو اس میں شک نہیں ہے کہ سقراط کا ایک خاص شاگرد السی بیاڈیز (Alcibiades) نامی بعد میں اہل ایتھنز کے برخلاف ہو گیا تھا اور ایک آوارہ بے اصول زندگی بسر کرتا تھا لیکن السی بیاڈیز کی غلط کاریوں کا سقراط کسی صورت سے ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اسکے اثر سے ایتھنز کے نوجوانوں کا اخلاق ایک بڑی حد تک درست ہو گیا تھا۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ الزامات سقراط پر کیوں لگائے گئے تھے؟ اسکی دو اہم وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ اسکی حق گوئی، راست بیانی اور انصاف پسندی کی وجہ سے امراء اور باثر لوگوں کے طبقہ میں اسکے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ سقراط کے خلاف مقدمہ دائر کرنے والے میلیٹس (Meletus) لیکن (Lycon) اور انیٹس (Anytus) غریب آدمی تھے لیکن انہوں نے یہ حرکت باثر لوگوں کے اشارے سے کی تھی۔ دوسرے جمہوری حکومت کو سقراط سے نفرت تھی۔ سقراط دولتمند نہ تھا اور نہ ہی خود مختار حکمرانوں کا سرپرست تھا لیکن اسے حکومت سے جو اسوقت جمہوری حکومت کہلاتی تھی، سخت نفرت تھی۔

دوران مقدمہ میں سقراط نے کوئی ایسی بات نہ کی جو اسکے وقار اور غرور کے منافی ہوتی۔ اس وقت کچہریوں میں ملزموں کا رونا چیخنا

جج کی خوشامد کرنا۔ اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لاکر رحم کی درخواست کرنا معمولی بات تھی۔ لیکن سقراط نے کوئی ذلیل اور بزدلانہ حرکت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُس نے اپنی صفائی میں جو تقریر کی وہ الزامات کی تردید نہ تھی بلکہ اس میں ججوں سے اظہارِ نفرت اور اہلِ ایتھنز کی برائیاں اور عیوب نام لے لیکر بتائے۔ اور غالباً اسی وجہ سے اُسے سزائے موت دی گئی۔ اگر وہ ججوں سے نہ الجھتا اور نرم پڑ جاتا تو اُسے یقیناً بری کر دیا جاتا۔ کیونکہ اُسے ایک یا دو رائے کی کثرت سے ہی مجرم قرار دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں قاعدہ تھا کہ جب الزام ثابت ہو جاتا تھا تو سب سے پہلے الزام لگانے والے سزا تجویز کرتے تھے۔ اور اس کے بعد مجرم اپنی سزا آپ تجویز کیا کرتا تھا۔ اب یہ فیصلہ کرنا ججوں کا کام تھا کہ دونوں میں سے کون سی سزا دی جائے۔ سقراط پر الزام لگانے والوں نے اس کے لئے سزائے موت تجویز کی۔ اگر اس وقت سقراط اپنے لئے کوئی معمولی سزا تجویز کرتا تو ضرور [illegible] کیونکہ جج بھی صرف ناراض ہو کر سزا دلانا چاہتے تھے۔ لیکن سقراط نے جواب دیا کہ چونکہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے [illegible] کوئی سزا [illegible] نہیں ہے [illegible] سزا تجویز کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود کو مجرم جانتا ہے۔ مجرم ہونا تو درکنار وہ تو خود کو عوام کا محسن [illegible] یہ پرائٹنٹ کی کرسی پر بٹھایا جائے۔ لیکن بایں ہمہ چونکہ قانون کی رو سے سزا تجویز کرنا ضروری تھا اسلئے اُس نے کہا کہ اس پر [illegible] جرمانہ کر دیا جائے۔

اس کے اس جواب سے جج اس قدر ناراض ہوئے کہ ان کی ایک بڑی اکثریت نے اس کے لئے سزائے موت کا فتویٰ دیا۔ تقریباً ان اسّی ججوں نے جو اُس کی بے گناہی کے حق میں رائے دے چکے تھے اس کے موت کے فتوے پر دستخط کر دئے۔ مقدمہ فیصلہ ہونے کے بعد تیس دن تک وہ قید خانے میں رہا۔ اس دوران میں اس کے دوستوں نے اُسے فرار ہو جانے کیلئے بہت مجبور کیا۔ اور یہ بات اُس وقت بہت آسان تھی لیکن سقراط نے صاف انکار کر دیا۔ اُس نے یہ دن بہت بے فکری کی حالت میں گذارے۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ چونکہ قانون نے اُسکی موت کا حکم دیدیا ہے لہذا اُسے قانون کی تابعداری کرنی چاہیئے۔ اور کوئی حرکت ایسی نہ ہونی چاہیئے جو بزدلانہ قرار پائے۔ آخر اُسے زہر کا پیالہ پینے کو دیا گیا جو اپنا اثر کئے بغیر نہ رہا اور اس طرح اسکی مفید زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

سید محمود مورخ بی۔ اے

غزل

دل و جاں کے سوا یاں اور تھا کیا؟　تجھے اب دوں نگاہِ دلربا کیا؟
دمِ آخر بھلا عذرِ جفا کیا؟　ستانے سے مٹے اب فائدہ کیا؟
تمہاری کم نگاہی کا گلا کیا؟　خدا جانے کہ قسمت میں لکھا کیا
بہت اچھا کیا مجھ سے نہ پوچھا　بجز تیرے کسی کا دوست [illegible] تھا کیا
پشیماں کیوں ہو میرے قتل کے بعد　ندامت سے بھلا اب فائدہ کیا؟
مری خاک انکے دامن تک تو پہونچی　کہوں میں بخت کو اب نارسا کیا
سہارا زندگی کا جس کی تم ہو　تو پھر جینے کا اُس کے آسرا کیا
لگے گا پار بیڑا اپنا سنئے شرط　خدا جب ہے تو فکرِ ناخدا کیا
وہ کھنچتے ہیں میں جتنا کھینچتا ہوں　اثر الٹا ہے جذبِ عشق کا کیا!
جو ہے فردائے محشر وعدہ دید　مجھے پھر خاک میں مل کر ملا کیا؟
ہوئی ہے مدت [illegible]　بجز اس کے محبت کی دوا کیا
ترے جلوے کا ہے آئینہ ہر شے　نہیں معلوم پھر [illegible] کیا؟
جو پھر جائے تو پھر تیرِ دوستاں ہے　نگاہِ لطف تیرا آسرا کیا
یہاں بھی جب ہیں محرومِ تمنا　تو پھر ہوگی بھلا روزِ جزا کیا
انہیں پایا تو خود کھویا گیا ہوں　محبت بھی ہے کوئی کیمیا کیا

حبیب [illegible]

اعتراف

آہ میری روداد حیات کس قدر دردانگیز ہے جس پر عالم خیال میں ایک نظر ثانی بھی میرے توی دل کیلئے ناممکن ہے۔ آہ میری زندگی کا ہر لمحہ کس قدر تاریک ہے۔ تاریک اور بھیانک۔ میرے اعمال قبیحہ کی مذمت کس قدر ضروری ہے کہ اس کا تذکرہ میرے اندازے سے باہر ہے۔ رحمت ربی کی اُمید کس برتے پر جب حیات مستعار کا ایک لمحہ بھی اس کی بندگی [illegible] لفظ بخشش [illegible] ..... آہ کونسا گناہ کونسا جرم ہے جو میں نے نہیں کیا [illegible] جیل کی اس چار دیواری میں جہاں جرائم کی خلش گناہ آلود سانسوں کی بدولت [illegible] میں بھگت رہا ہوں۔ کہتے ہیں دوزخ کا عذاب بدترین عذاب ہوگا مگر میرا ایمان ہے کہ ضمیر کی ملامتوں کا پاسنگ بھی نہیں [illegible] عذاب کا کامیاب مقابلہ کر رہا ہوں مقابلہ شدید ترین مقابلہ۔ مگر اب ہمت جواب [illegible] مجھوں کو ضعیانہ بخشیگا اس نیلے آسمان کے نیچے [illegible] آپس میں کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس مقدس زمین پر [illegible] آغوش محبت میں لیکر مجھے دنیوی عذابوں سے [illegible] روشنی اپنی سالخوردہ گذر کر مجھ سے بدبخت کو بھی [illegible] قرطاس کرتا ہوں تاکہ میرے بعد آنے والوں کو عبرت ہو اور [illegible]

میرے والد کی [illegible] اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔ اوقاف کے جھگڑے [illegible] عدالت میں گذری یا مرافعے میں دوستوں سے مقدمات کے مشورات [illegible] مقدمہ بازی ہی تھی۔ دادا کی وفات پر والد صاحب [illegible] چچا میاں کے حق میں ہی ہوتا رہا۔ ہر شکست پر وہ اور زیادہ [illegible] چچا میاں بھی عجیب انسان تھے۔ مقدمات میں برابر حاضر ہوتے مگر اغیار کے سامنے [illegible] تو کہا کرتے کہ میاں وہ تو گھنا ہے گھنا ... مرتے وقت بھی وہ [illegible] خاندان سے نالوں اور ہمیشہ انہیں اپنا دشمن جانی [illegible] اس لئے میں کبھی بھی انجام پر نظر نہ کرتا تھا والد کی بات کو پلے باندھ [illegible] جان دینے پر بھی امید نہیں کہ اس کا بدلہ ادا کر سکوں۔

والد صاحب کے کوچ [illegible]

اجازت لی [illegible] ذمہ داری کی

وجہ سے میں اُس کی تعریفیں سُن سُنکر بلا وجہ کوئلوں پر لوٹتا اور اسی سوچ میں غلطاں وپیچاں رہتا کہ کیونکر اس شخص سے والد کی تمام توہین کا بدلہ لیا جاسکتا ہے۔ کئی کوششیں کیں، بدمعاش پیچھے لگوائے، جھوٹے مقدمات میں پھنسوایا مگر ہمیشہ وہ صاف نکل گیا۔

ایک دن شہر کے ایک بہت بڑے قمار خانے میں جوا کھیل رہا تھا کہ پولیس نے چھاپہ مارا اور میں دیوار پھاندنے کی کوشش کرتا ہوا گرفتار ہو گیا۔ تھانے پہونچا میرے ذہن میں ایک تجویز آئی کہ کیوں نہ محمود، اپنے چچازاد بھائی کو بُلا بھیجوں اور گرچہ کہ اُس کی شرافت کے متعلق افسانے زبان زد خلائق ہیں۔ اس نے میری مدد کی تو دوستی ہو جائے گی اور اس پردے میں میں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکوں میں نے انسپکٹر تھانے سے محمود کا ذکر کیا۔ وہ محمود کا بہترین دوست تھا۔ مجھے عزت سے سب سے الگ بٹھایا اور میرے الفاظ کی تصدیق کیلئے بلا بھیجا۔ محمود بیچارہ فوراً آیا اور مجھے پہچان لینے کے بعد فوراً اس بلا سے نجات دلوادی۔ میں نے محمود کا شکریہ ادا کیا اور اس دن سے ہم دوست بن گئے۔ محمود اپنے ایک رشتہ دار کو پالینے پر خوش تھا اور میں موقع کا منتظر۔

محمود کی کوششوں سے مجھے ایک دفتر میں پینتالیس ۴۵ روپے ماہوار پر ملازمت بھی مل گئی۔ آہ محمود کا یہ تازہ احسان میرے جذبہ انتقام کو بھڑکا رہا تھا۔ وہ اپنی شرافت سے میری مدد کر رہا تھا مگر میرے دل میں صرف یہ خیال تھا کہ بخت مجھے ذلیل جان کر احسانات کر رہا ہے تاکہ میں اپنے اور اپنے والد کے گذشتہ گناہوں پر شرمندہ ہوں۔ آہ میں سمجھتا تھا کہ وہ میری موجودہ غربت کو جو تجُوئے کی بدولت مجھے گھیرے ہوئے تھی حقارت کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ یہ خیال صرف خیال ہی تھا۔

میرے نوزائیدہ بچے کا عقیقہ تھا، دوست احباب مدعو تھے اور محمود کام کرنے والوں میں سب سے پیش پیش تھا۔ اتفاق سے محمود کی بیوی اس روز ناسازیٔ طبع کے باعث دعوت میں نہ آسکی۔ رات کو جب سب لوگ فارغ ہو کر گھر جانے لگے تو میں نے محمود کو روک لیا اس سے پہلے میں کئی گمنام خطوط لکھ کر محمود کو اُس کی باعصمت بیوی کی طرف سے بدگمان کر چکا تھا۔ اُس رات کھانے کے بعد چرس بھرا سگرٹ پلایا اور جب دیکھا کہ وہ نشے کی ترنگ میں ہے تب اُس کی بیوی کے متعلق کنایتاً بہت کچھ کہہ گیا۔ محمود کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور مجھے اپنی کامیابی کا یقین تھا۔

محمود گھر پہونچا بیوی نے دروازہ کھولا اور حسب عادت محبت سے استقبال کیا مگر محمود کا دماغ ماؤف تھا آنکھیں غصہ سے سُرخ ہو رہی تھیں بیچاری ڈر گئی۔ اور چپکے سے لوٹی، عین اُس وقت جب محمود نے اپنی بیوی سے پہلا سوال کیا پلنگ کے نیچے چھپا ہوا آدمی کھانسا جسکا میں نے پہلے سے ہی انتظام کر دیا تھا اور کھانستے ہی پلنگ کے نیچے سے نکل کر کھڑکی کی راہ سے باہر کود گیا۔

محمود جوشِ غضب سے دیوانہ ہو گیا، ادھر بیوی اس ناگہانی افتاد پر ہکا بکا تھی محمود نے بیوی کو پلنگ پر گرا دیا اور شکاری چاقو جو وہ ہمیشہ پاس رکھتا تھا اُسکے سینے میں بھونکدیا۔ اور پھر اس تڑپتی ہوئی لاش پر پے بہ پے اتنے وار کئے کہ مرحوم کا جسم چھلنی بنکر رہ گیا۔ محمود کو قتل کے جرم میں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی میں اپنی کامیابی پر خوش تھا مجھے امید تھی کہ میرے والد مرحوم کی روح میری اس فرزندانہ عقیدت پر عالم بالا میں خوشیاں منا رہی ہوگی۔ اس واقعہ کے دو مہینے بعد میں ایک قمار خانے میں چھوٹی سی بازی پر ایک شخص سے جھگڑا ہو گیا میں نے اُس پر چاقو سے حملہ کیا۔ ضرب شدید تھی مگر مہلک نہ تھی۔ اور اسکے علاوہ بھی چوری اور جعلسازی کے مختلف مقدمات مجھ پر قائم ہو چکے تھے، مجھے دس سال کیلئے اس کال کوٹھڑی میں بھیجدیا گیا۔ چار سال میں نے مردانہ وار مقابلہ کیا مگر آہ — اب ہمت جواب دیچکی ہے — یہ چند سطریں بطور اعتراف لکھ رہا ہوں کہ شاید سرکار عالیہ اس افسانۂ غم سے متاثر ہو کر محمود کو باعزت بری کر دے اور محمود سے استدعا ہے کہ وہ اُسے سُننے کے بعد مجھے معاف کر دے کہ شاید میری فردِ عصیاں میں ایک جرمِ عظیم کی کمی کچھ میری حیات آخری کو سنوار دے — قیدی نمبر ۲۰۹ بقلم خود۔۔

خمستان

خزاں

جاؤ، اونچی پہاڑیوں پر بیٹھو۔
اور چاروں طرف نظر کرو۔
جہاں جھومتے جنگل، اور بہتے پانی،
خزاں کا گیت گا رہے ہیں!...
گرمی کا آفتاب ان پر دھیمی شعاعیں ڈال رہا ہے —
گرمی کے پھول رخصت ہو رہے ہیں —
چُپ چاپ بیٹھو — بُت کی طرح بالکل بے حس و حرکت!
صرف دل کو دھڑکنے دو!...

* * * * * * * * * * *

گرمی میں تم وہاں کیسے بیٹھے تھے؟
— شاید اب بھی تمہارے خیال میں ہوگا —
اور کیسے سبز سبز جنگل کو گاتے سُنا،
خوشگوار ہوا کے جھونکوں سے!...
اگرچہ وہی ہوا اس وقت بھی چل رہی ہے،
لیکن کتنی دُرشت!...
ہر جھونکا اس کا جو درخت سے آ کے لگتا ہے،
ایک پتّی گرا دیتا ہے!....

* * * * * * * * * *

آہ! اسی ہوا کی طرح وہ تمام عیش ہیں،
جو دُنیاوی چیزوں سے ہمیں ملتے ہیں!
یہ ذرا بھی نہیں بھاتے،

جب دل میں یہ تبدیلی ہو جاتی ہے!
مذاق و ذوق کی تبدیلیاں تمہیں ہنسا سکتی ہیں،
جب تم جوان تھے!
لیکن شاید ہی کوئی چیز ہنسا سکے،
جب عمر زیادہ ہو.....
پیارے ہاتھ جن کی گرم گرفت نے ہمارے ہاتھوں کو تھاما — پھر نہ آ سکیں!
سب سے پیاری آوازیں جن سے ہمارے کان آشنا ہوئے،
پھر نہ سُنائی دے سکے!.....
شباب گذر جاتا ہے! — اور تب شباب کی مسرتیں
— جنہوں نے دل کی دھڑکن تیز کی تھی! —
آئیں گی! — جیسے ان کراہتے جنگلوں میں،
پہنچتی ہوئی باد خزاں!.....

* * * * * * * * * *

ہوا کی آواز سنو! جنگل کو مت دیکھو!
پہاڑوں، اور وادیوں کو دیکھو!
بہار میں آسمان انہیں گھیرے تھا —
آسمان اب بھی انہیں گھیرے ہوئے خاموش ہے!
خزاں کی بربادیاں آئیں! —
تبدیلیاں آئیں! — اور انسان کی تقدیر!.....
قدرت جو کچھ بھی دیتی ہے،
غیر دلچسپ نہیں ہو سکتا!......

——— (مسز براؤننگ)

سرگوشیاں

میری رُوح کے تاروں میں غم کے نغمے خفتہ تھے!
تم نے محبت کے مضراب سے چھیڑ دیا"
اور اب میں "شعر" کہتا ہوں!!

* * *

سورج نے سر نکال کر جھانکا،
دوشیزۂ اُفق کے عارض شرم سے سُرخ ہو گئے!!

* * *

تمنائیں تمہاری آنکھوں میں جھلک رہی ہیں،
جیسے جھیل کی ساکن سطح پر نکلتے ہوئے سورج کی کرنیں عکس ریز ہوں!

* * *

میں شراب پیتا ہوں تو لوگ ملامت کرتے ہیں،
آہ! تمہارے یاقوتی ہونٹوں کے بوسہ سے ایک بار مست ہو کر پھر
ہوش میں کون رہنا چاہیگا؟!...

* * *

میں تمہارے خط مخمل کے ڈبے میں حفاظت سے رکھتا ہوں،
یہ میری "یاد" کے لئے کھلونے ہیں!
لیکن جب میں نہ ہونگا،
آہ! کون درشت ہاتھ انہیں لاپروائی سے چھوئیں گے؟!

* * *

میں نے ستاروں کو چمکتے دیکھا۔
تمہاری آنکھیں یاد آگئیں!
گلاب پر شبنم کے قطرے دیکھے —
مجھ سے رُوٹھکر تمہارا اپنے گالوں کو آنسوؤں سے تر کر لینا یاد آیا!
خوشبو کی لپٹیں آئیں —
تمہاری زلفوں کا میری بانہوں پر پریشان ہونا یاد آیا!

* * *

تم روتے روتے ہنس پڑیں،
مجھے ایسا معلوم ہوا،
جیسے نرگس کی کٹوری میں رکھے ہوئے شبنم کے قطرے سورج کی پہلی
زریں کرنوں سے چمک اُٹھے!

* * *

موت اپنے دھیمے راگ میں پرسکون گیت گا گا کر بلا رہی ہے!
زندگی غم کی زنجیروں میں مجھے جکڑے ہوئے ہے۔

* * *

دیوی! میں تیری نذر کو کیا لایا ہوں؟.....
ایک ٹوٹے ہوئے آبگینہ میں آنسو کے چند قطرے!
دیوی! تو مسکرا دے،
یہ حقیر قطرے ستاروں کو ماند کر دیں گے؟

دعوتِ گناہ

آؤ! ہم محبت کریں،
محبت! —
جوانی کی تمام پُرجوش اُمنگوں کے ساتھ!

آؤ! ہم خود کو غرق کر دیں،
اس ہنگامہ خیز طوفانی سمندر میں!
سماج کی زنجیروں کو توڑ کر رکھدیں!

خدا اور اس کی کائنات کو الٹ دیں!
فطرت کے قوانین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں!
بس، ہم ہوں اور محبت!
محبت کے لطیف بوسے ——!
رگوں میں خون گرم کر دینے والے!
دل کی دھڑکن تیز کر دینے والے!

اور کچھ نہ ہو! کچھ نہ ہو!.....
دنیا کی اس تاریک گہرائی کو ہم اپنی معصیت خیز محبت سے منور کر دیں!
گناہ کے پر لگا کر فضا کی لاانتہائیت کو طے کر جائیں!

* * * * * * * * * *

آؤ، ہم محبت کریں،
جوانی کی تمام معصیت خیز گناہ آلود پرجوش امنگوں کے ساتھ!!

نغمۂ آبشار

آبشار گنگنا رہا ہے،
ایک خواب آلود راگ!.....
پتیوں کی سبز جھلملاہٹ،
بہار کو روشن بنا رہی ہے!.....

* * * * * * * * *

نیلے آسمان پر ایک منتظر روح ہے،
سفید خمیدہ چاند!.....
بہار، خاموش، سانس روکے انتظار کر رہی ہے،
اور میں بھی،
انتظار کر رہا ہوں بہار کے ساتھ!.....
آؤ، آہستہ آہستہ گنگنانے والی سہ پہریں،
آؤ میری پیاری.....

خیالاتِ پریشاں

نیلی چادر ہٹا کے چاند نے سر نکالا!
"تم اتنے زرد کیوں ہو؟" ستاروں نے پوچھا،
چاند ہنس پڑا،
ستارے سمٹ گئے!.....

بہار کی وسیع آغوش میں،
کتنی تتلیاں ہیں!...
کچھ ہوا میں پرافشاں!
کچھ ٹہنیوں سے آویزاں!.....

دہقان

غروبِ آفتاب، خاموشی! ایک انسان!.....
اس کے گرد سخت خشک زمین!... مٹی کے ٹوٹے ٹوٹے ڈھیلے!

اس کے نزدیک دو بیل! ایک ہل!...
سخت زمین! ٹوٹے ڈھیلے! جانور! اور ایک انسان! — غروبِ آفتاب

کے وقت ـــ اور ایک ہل!...

ہل، تلوار کا مددگار!... تلوار، ملکوں کو فتح کرنے والی!...

جانور پالنے والے! ہل چلانے والے! مٹی توڑنے والے، دہقان! تیرے اور ہمارے درمیان ایک حدِ فاصل قائم ہے!...

تُو اس غروبِ آفتاب کے وقت کیا کر رہا ہے؟ کیا تو کھڑا ہوا خدا کو یاد کر رہا ہے؟ ان خداؤں نے تیرے لئے کچھ بھی نہیں؟!...

اے زمین کے فرزند! تو کیوں خدا کو یاد کر رہا ہے؟...

اے انسان! تو زمین کی طرف منہ کر کے کیوں کھڑا ہے؟

تیری محنت کی زندگی کا ایک دن ختم ہو جائے گا — ہمارے خدا کا شکر کہ بس ختم ہو چکی!...

تمنائی

طیورِ آوارہ

"اے میرے آقا! جب میری زندگی کے سات تار چھیڑ جائیں گے تو تیری ہر ہر حرکت سے اس سے نغمۂ عشق کی صدا بلند ہوگی"

* * * * * * * * * * *

"اے رہروِ جاوداں! تو اپنے قدموں کا نقش میرے نغموں پر چھوڑ جائیگا"

* * * * * * * * * * *

"میں ایک ستارے کا خواب دیکھتا ہوں... ایک جزیرہ نور کا... جہاں میں پیدا ہوں گا... اور اس کی تیز رو فرصت میں میری زندگی اپنے کارناموں کو اسی طرح پختہ کرے گی جس طرح کشتِ گندم آفتابِ خزاں میں"

* * * * * * * * * * *

"میں تیری موجوں کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا لیکن تو مجھے اپنے قدموں کا نشان میرے دل میں رکھنے دے" ساحل دریا سے کہتا ہے۔

* * * * * * * * * * *

"اے بزدل خیالات! تم مجھ سے نہ ڈرو۔
میں شاعر ہوں"

* * * * * * * * * * *

جب انسان مسکرایا تو دنیا نے اس سے محبت کی لیکن جب وہ ہنس دیا تو یہ اس سے خوفزدہ ہو گئی"

* * * * * * * * * * *

"اختتامِ روز پر جب میں تیرے سامنے کھڑا ہوں گا تو تیری نظر میرے زخموں کے داغ پر پڑے گی اور اس وقت تجھے معلوم ہوگا کہ مجھے زخم لگے تھے ورنہ ... تھے"

* * * * * * * * * *

"جو مر گئے انہیں شہرتِ جاوداں عطا ہوئی تھی لیکن جو زندہ ہیں انہیں بس جاودانی الفت"

* * * * * * * * * *

"میں نے تجھے دیکھا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک نیم بیدار بچہ اپنی ماں کو صبح کے دھندلکے میں دیکھتا ہے اور مسکرا کر پھر دوبارہ سو جاتا ہے"

* * * * * * * * * *

جب میں ہجوم کے ساتھ سڑک پر سے گذر رہا تھا... میں نے تجھے جھروکے کے پاس مسکراتے دیکھا... اور ایک نغمہ گا کر میں تمام شور و غل بھول گیا"

* * * * * * * * * *

کاروبار کا دن رخصت ہو چکا! میرے چہرے کو تو اپنے بازوؤں میں چھپا لے میری ماں!
اور مجھے دیکھنے دے خواب"

* * * * * * * * * *

"میں نے تیرے دن کا نغمہ گایا ہے اے وقتِ شام تو اپنی شمع لے کر
طوفانی راستے سے لیجانے دے!"

* * * * * * * * *

"میں ایک طفل ہوں... تاریکی میں
چادرِ شب میں میں اپنا ہاتھ تیری طرف پھیلاتا ہوں... میری ماں!"

* * * * * * * * *

اس درخت کی متحرک پتیاں میرے سینے کو ایک طفل کے ہاتھوں
کی طرح مس کرتی ہیں"

* * * * * * * * *

"اے لبِ سڑک کی سبز گھاس! تم تاروں سے محبت کرو... تو تمہارے
خواب پھولوں میں ظاہر ہونگے"

* * * * * * * * *

(ٹیگور)

"اے چاند! تو کس کے لئے انتظار کر رہا ہے؟
آفتاب کو سلام کرنے کے لئے... جسکے واسطے میں [illegible] جگہ بناؤنگا"

* * * * * * * * *

"آبشار گاتا ہے کہ جب میں اپنی آزادی پالیتا ہوں تو مجھے میرا
نغمہ مل جاتا ہے"

* * * * * * * * *

[illegible]
[illegible]

* * * * * * * * *

"میں بار بار مرا ہوں تب مجھے معلوم ہوا کہ موت کوئی پریشان کن شے نہیں!"

* * * * * * * * *

"آنکھیں اپنی بصارت پر نہیں بلکہ اپنی عینک پر مغرور رہتی ہیں"

جمیل احمد کنڈھاپوری

مغائرت

تو بغیر کسی تنازعہ کے ہم لوگ ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہو گئے اخموشی سے جدا ہو گئے! نہ تمہیں اور نہ مجھے ہی اس کی کوئی قابلِ فہم وجہ معلوم ہو سکی۔ مگر اس فراق نے ہم دونوں کے لئے یکساں جراحت و درد کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اب متوکل و راضی برضا، جب تمہارا نام کسی شخص کی زبان سے اتفاقاً سن پاتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک اجنبی سایہ سامنے سے گذر گیا—— ایک ایسی شخصیت جس سے کہ میرا کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح جیسے کسی تنگ و تار حبس میں کوئی قیدی اپنے پہرہ داروں کے درمیان گفتگو میں سن لیتا ہے کہ بہار اپنی تمام رعنائی اور کارفرمائی کے جلو میں فاتحانہ انداز سے صحرا اور علم شاخوں کے درمیان محوِ خرام ہے، جبکہ یہ اسکے لئے ایک تمام پیچیدگیوں سے معرا افسانہ ہے، اور گلابوں کی کارفرمائی اسکے لئے بے معنی!

ع۔ نظیر

ساقی کا آئندہ پرچہ "ظریف نمبر" ہوگا جس میں ملک کے مشہور مزاح نگار حضرات کے مضامین شامل ہونگے۔ ہر مضمون سنجیدہ ظرافت اور خوش مذاقی کا عمدہ نمونہ ہوگا قیمت صرف دس آنے ہوگی مگر مستقل خریداروں سے کوئی قیمت نہیں لی جائیگی ؛

نقد و تبصرہ

رہنمائے تعلیم۔ لاہور کا "ریڈ کراس نمبر"

ماسٹر جگت سنگھ صاحب اُن گنتی کے چند لوگوں میں سے ہیں جو اپنا قیمتی وقت اور بے شمار روپیہ صرف کر کے عمدہ سے عمدہ رسالے شائع کرتے ہیں۔ آپ کی اعلیٰ حوصلگی تو اسی سے ظاہر ہے کہ پورے تین سال سے رہنمائے تعلیم نہایت پابندیٔ وقت اور دیانتداری سے شائع کر رہے ہیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ آپ نے رہنمائے تعلیم کا "جوبلی نمبر" شائع کر کے صحافتِ اردو میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ کیونکہ اس قدر ضخیم رسالہ آج تک ہندوستان میں شائع نہیں ہوا۔ اسکے بعد آپ کا دوسرا کارنامہ رہنمائے تعلیم کے "افسانہ نمبر" کی صورت میں ظاہر ہوا اور ایک دفعہ پھر ماسٹر صاحب کی ہمت اور انکے ایثار کا ہر شخص کو معترف ہونا پڑا۔ اب تیسرا کارنامہ رہنمائے تعلیم کا "ریڈ کراس نمبر" ہے جو مفید اور بکار آمد مضامین کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسکا ہر اس شخص کے پاس موجود ہونا ضروری ہے جو اس روشن زمانہ میں روشن خیال کہلانے کا مستحق ہے۔ لائق ایڈیٹر کو اس خاص نمبر کیلئے مضامین فراہم کرنے میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کامیابی کسی اور کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ اس خاص نمبر کی خوبیاں اسکے سرورق ہی سے شروع ہو جاتی ہیں جو چار رنگ کا ہے اور "ریڈ کراس نمبر" کیلئے اس سے بہتر اور موزوں سرورق اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ "ریڈ کراس سوسائٹی" کے اغراض و مقاصد اور اسکے کارہائے نمایاں پر بہترین مضامین صرف اسی خاص نمبر میں آپ کو ملیں گے۔ مضامین میں بھی اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ عام فہم اور سلیس ہوں تاکہ اسکولوں کے بچے بھی اس مفید سوسائٹی اور اسکے متعلقات سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ ریڈ کراس نمبر مشتمل ہے تین حصوں پر۔ پہلے حصے میں "ریڈ کراس سوسائٹی کی تاریخ"۔ "ریڈ کراس سوسائٹی کا اشاعتی کام"۔ "ریڈ کراس اور جاپان"۔ "ریڈ کراس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد"۔ "ریڈ کراس سوسائٹی کا میدانِ عمل"۔ جیسے مضامین شامل ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوسائٹی کیا ہے؟ کیا کام کر رہی ہے؟ اور ہمیں اسکے لئے کیا کرنا چاہیئے؟۔ دوسرے حصے میں حفظانِ صحت کے بلند پایہ مضامین ہیں مثلاً "ہر موسم کے لئے طبی ہدایات"۔ "عورتیں اور گھریلو علاج"۔ "فرسٹ ایڈ"۔ "سلیقہ کلب"۔ "زچہ اور بچہ"۔ "حفظ ماتقدم"۔ "وٹامین" وغیرہ۔ حصۂ سوم میں ریڈ کراس کے متعلق دلچسپ و مزاحیہ فسانے اور ڈرامے وغیرہ ہیں۔ مثلاً "دو فرشتے انسانی لباس میں"۔ "صفایا"۔ "چوہے"۔ "حکیم جی"۔ "ملیریا کا مریض"۔ "تمباکو نوشی" وغیرہ۔ ضخامت ۵۰۰ صفحے سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے۔ مگر قیمت صرف دو روپے رکھی گئی ہے جسے دیکھکر تعجب ہوتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ ع:

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

لیلےٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری

مصنف:۔ قاضی عبد الغفار صاحب۔

ناشر:۔ یعقوب حسن صاحب۔ ناظم دار الادب پنجاب، بارودخانہ۔ لاہور۔

قاضی عبد الغفار صاحب نے "لیلیٰ کے خطوط" کا کچھ حصہ نیرنگِ خیال میں شائع کرایا تھا اور یہ خطوط بہت مقبول ہو چکے ہیں۔ اسی طرز کے ۲۶ خطوط اس کتاب میں شامل ہیں۔ طوائف کی زندگی کے متعلق اُردو میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مرزا رسواؔ کی کتاب "اُمراؤ جان ادا" اس نوع کی سب سے پہلی اور مشہور تصنیف ہے۔ اسکے بعد قاری سرفراز حسین دہلوی نے اسی طرز کے آٹھ ناول لکھے جن میں "شاہد رعنا" بہت مقبول ہوا۔ بظاہر یہ موضوع بہت فرسودہ ہو چکا

تھا اگر قاضی عبدالغفار صاحب نے "لیلیٰ کے خطوط" لکھکر اس پامال صنفِ ادب کو چار چاند لگائے ؎

این جرعہ کہ ریختند بر خاک — من می کشمش بجامِ افلاک

"لیلیٰ کے خطوط" اسقدر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں کہ اُنکے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مُصنف سے زیادہ تصنیف مشہور ہے جس طرح سر آرتھر کانن ڈائل سے زیادہ شرلاک ہومز کی شہرت ہے۔ ہمیں صرف اسقدر کہنا ہے کہ "لیلیٰ کے خطوط" کی اشاعت سے خیال کی ایک جدید شاہراہ کھل گئی اور اُردو لٹریچر میں ایک غیر فانی کتاب کا اضافہ ہو گیا۔

جس طرح "لیلیٰ کے خطوط" ایک ہندوستانی "عورت کے خونچکاں کفن کے دھبّے" ہیں اسی طرح "مجنوں کی ڈائری"۔ ایک ہندوستانی "نوجوان کی معنوی کیفیات" کی دلخراش قلمی تصویر ہے۔ اس کتاب سے بھی ہماری زبان میں ایک وضع خاص کا اضافہ ہوتا ہے۔ اور زبانوں میں روزنامچے بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور بعض جرنل تو سر آنکھوں پر رکھے جاتے ہیں۔ مثلاً مارکس آریلیس کا جرنل۔ ایمیل کا جرنل۔ ایک مایوس انسان کا روزنامچہ از باربیلین وغیرہ۔ اردو میں "مجنوں کی ڈائری" اس طرز کی پہلی چیز ہے۔

یہ دونوں کتابیں علیحدہ علیحدہ شائع ہوئی ہیں مگر ناشر نے انہیں حصہ اول اور حصہ دوم قرار دیا ہے۔ مجموعی حجم ۴۸۰ صفحات ہے اور مجموعی قیمت تین روپیہ آٹھ آنے (۳؎) اگر یہ دونوں کتابیں ایک ہی وضع اور ایک ہی سائز کی ہوتیں تو انہیں پہلا اور دوسرا حصہ سمجھ لینے میں چنداں مضائقہ نہ ہوتا۔ حصہ اول سادہ ہے اور حصہ دوم مجلد۔ حصہ اول کا سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ہے اور حصہ دوم کا $\frac{22 \times 29}{16}$ یعنی ایک ساقی کا آدھا ہے اور دوسرا نیرنگِ خیال کا۔ نفسِ مضمون کے اعتبار سے بھی پہلے حصہ کو دوسرے حصہ سے کوئی ربط نہیں۔ "لیلیٰ کے خطوط" میں ایک بازاری عورت کی ظاہری اور باطنی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے اور "مجنوں کی ڈائری" میں ایک بلند نصب عیاش نوجوان کی تفسیرِ حیات۔ "لیلیٰ کے خطوط" کو "مجنوں کی ڈائری" سے اگر کوئی واسطہ ہو سکتا ہے تو صرف اسقدر کہ ایک کے نام کا جزو لیلیٰ ہے اور دوسرے کا مجنوں۔ یہ کہنا کہ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل ہے درخورِ قبول نہیں اور ان دونوں کو ایک ہی کتاب کے دو حصے بنا کر پیش کرنا اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ دونوں حصے علیحدہ علیحدہ نہیں مل سکتے "نامناسب و ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔

"ش"

چند تنقیدی مضامین

از جناب حامد حسن بلگرامی۔ ایم۔ اے۔ ریسرچ اسکالر الٰہ آباد۔ ملنے کا پتہ: سید عابد علی صاحب۔ راجہ پور، الٰہ آباد

یہ مجموعہ ہے نو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا جو بقول مُصنف چند دوستوں کے اصرار سے شائع کیا گیا ہے۔ عنوانات یہ ہیں۔ (۱) اردو زبان کا آغاز اور اسکی ابتدائی نشو و نما۔ (۲) منظر نگاری کی ابتدائی ترقی مصورِ قدرت میر حسن تک۔ (۳) رہنمایانِ اسالیب۔ (۴) نواب محسن الملک کا اندازِ بیان۔ (۵) ناول کیا ہے۔ (۶) سوانگ ایک ناول۔ (۷) کلامِ ناصری۔ ناصری مرحوم۔ (۸) غالب ساغر و مینا میں۔ (۹) حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم ان میں سے بعض مضامین اچھے ہیں۔ مثلاً پہلا، دوسرا، ساتواں اور آٹھواں۔ بعض معمولی ہیں مثلاً چوتھا اور نواں۔ اور بعض ایسے ہیں جو ایک ریسرچ اسکالر کے شایانِ شان نہیں۔ مثلاً تیسرا، پانچواں اور چھٹا۔ "رہنمایانِ اسالیب" میں اردو کے صاحبِ طرز (دیگر ز کا گرہ ملے) کا تذکرہ کیا ہے۔ صاحبِ مضمون کی رائے ہے کہ علامہ شبلی نے اردو زبان کو ہر قسم کے مضامین کے لائق بنا دیا۔ اسی جوشِ عقیدت میں اُنکے شاگردوں تک کے نام گنائے گئے۔ مولانا حالی اور اُنکے شاگرد مولوی عبدالحق کا ذکر بھی معقول الفاظ میں کیا ہے مگر منشی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد کا صرف نام لکھنے پر اکتفا کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلگرامی صاحب ان دو بزرگوں سے واقف نہیں ہیں ورنہ علامہ راشد الخیری اور مرزا فرحت اللہ بیگ جیسی مایۂ ناز ہستیوں کے استاد پر اسقدر چلتا ہوا فقرہ نہ لکھتے۔ آگے چلکر ہندی اور اُردو کی بحث چھیڑ دی گئی ہے اور مضمون "رہنمایانِ اسالیب" کا انجام یہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے اور ہندو مسلمانوں کے تمدن و فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ ہندی اور اُردو کے میل سے ایک عام زبان پیدا ہو جائے۔ پانچویں مضمون کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں یہ بتایا جائیگا کہ ناول کسے کہتے ہیں مگر آپ پورے ساڑھے چھ صفحے کا مضمون پڑھنے کے بعد بھی یہ معلوم نہیں کر سکیں گے [illegible]

کولتار اس کے بعض حصے ہنسانے والے اور بعض رلانے والے اور بعض پراسرار ہیں قیمت ۶؍

ومپائر ایک دوشیزہ کی عصمت ریزی کا عجیب وغریب درد انگیز و مضحکہ خیز قصہ قیمت (۶؍)

شریر بیوی ایک شوخ لڑکی کی داستان جس کو پڑھکر بے اختیار ہنسی آتی ہے قیمت عہ

گل بوٹ حسن و عشق کا بیچیدہ مختصر ناول جذبات و تاثرات کا دل آویز مرقع قیمت عہ

روح ظرافت صحیح معنوں میں ظرافت کی روح ہے آٹھ نہایت دلکش افسانوں کا مجموعہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (یعہ)

مرزا جنگلی لکھنؤ کی پرانی تہذیب اس دلاویز ڈرامہ میں دیکھکر ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے قیمت چھ آنے (۶ر)

دیکھا جائیگا شائقین کے بےحد اصرار پر کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے قیمت خوبصورت جلد کی ایک روپیہ (عہ)

روح لطافت جذبات لطیف کی روح ہے۔ آٹھ بیحد دلچسپ و عبرت انگیز افسانے قیمت عہ

جنت کا بھوت یہ افسانہ بھی اس قدر پسند کیا گیا ہے اس کو کتابی صورت میں شائع کرنا پڑا ہے قیمت ۱۲ر

تفویض ایک گریجویٹ خاتون کی شادی ایک سید کے ملا سے ہو جاتی ہے اس کے عجیب غریب نتائج قیمت پانچ آنہ (۵ر)

طوفان ظرافت یہ چند مزاحیہ قصائد کا مجموعہ ہے جو قصیدہ مرغن اور مشین جیسے بے بہا قصائد پر مشتمل ہے قصائد کی بحریں و قافیے اپنی طرز میں بالکل یگانہ ہیں ایک ایک شعر پڑھ پڑھ کر آپ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے اور مسلسل قہقہوں سے فضا گونج اٹھیگی قیمت صرف چھ آنے (۶ر)

چندر مکھی مصنفہ انصار علی صاحب ناصری حسن عشق کی داستان گرپاک محبت لطیف جذبات حسرتناک انجام قیمت ایک روپیہ (عہ)

نویس جناب ملا رموزی کی بہترین تصنیف جسمیں مصنف نے اپنی مخصوص طرز نگارش کے ذریعے مزاح اور دلچسپی کے دریا بہا دیئے ہیں اس کتاب کی شگفتگی اور دلآویزی خود اس کو پڑھنے کی سفارش کرتی ہے قیمت صرف عا۔ علاوہ محصول۔

نرگس جمال مترجمہ شاہد احمد بی اے قیمت عہ

کمزوری مرزا عظیم بیگ صاحب نے ایک ایسا دلچسپ

گھر پا بہادر

چغتائی صاحب کے مخصوص طرز تحریر کا

تازہ ترین شاہکار

نہایت ہی پر مذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف اپنے شوخ اور مذاقیہ طرز بیان کے ساتھ ساتھ لنگران اعظم کے جگمگاتے قطروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک اور شرمناک سازشوں کے ہولناک اور قہقہہ خیز سین دکھائے ہیں یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور اچھوتے پن نیز طرز بیان کی شوخی اور دلربائی میں چغتائی صاحب کے تمام دوسرے ناولوں سے بڑھا ہوا ہے۔ گھر پا بہادر کو پڑھکر آپ شریر بیوی سرکار حرام پور کو بھول جائیں گے۔ بہترین لکھائی چھپائی۔ فوٹو بلاک کا رنگین سرورق اور قیمت ان تمام خوبیوں کے بمقابل بالکل مفت یعنی صرف ایک روپیہ (عہ) محصول ۵ر مجلد عہ

ملنے کا پتہ: کتبخانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی

اخوان الشیاطین مصنفہ علامہ مشکی

افضل حسین صاحب چشتی کے سائنٹفک افسانوں کا بیحد دلکش مجموعہ۔ آپ کے مطالعہ کے بعد رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ (عہ)

صبح لطافت ملک کے مشہور اور یگانہ مزاحیہ

ناول لکھا ہے جو ان کی تمام موجودہ تصانیف سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ قیمت دو روپیہ (عا) محصول ۵ر

موج تبسم ہندوستان کے مشہور مذاقیہ نویس جناب شوکت تھانوی کا بہترین مجموعہ مضامین پہلا اڈیشن شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اب دوسرا ایڈیشن کچھ اجزا و ترمیم کے بعد شائع کیا گیا ہے

یہ وہ مجموعہ ہے جو "سودیشی ریل" اور "سودیشی ڈاک خانہ" جیسے مشہور مضامین پر مشتمل ہے دوسرا ایڈیشن بھی قریب الختم ہے اس لئے جلد منگا لیجئے۔ قیمت صرف دو روپے (عا) علاوہ محصول

سیلاب تبسم حضرت شوکت تھانوی کے بہترین تازہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہنسنے ہنسانے کا مستقل ذریعہ ایک ایک مضمون مزاحیہ خوبیوں اور دلچسپیوں کا حامل ہے قیمت صرف دو روپیہ (عا) علاوہ محصول۔

بحر تبسم حضرت شوکت تھانوی کے دس بہترین افسانوں کا مرقع ایک ایک افسانہ سیکڑوں قہقہوں کا ذمہ دار ہے۔ قیمت مجلد دو روپیہ (عا) علاوہ محصول۔

طوفان تبسم جناب شوکت تھانوی کے ۱۱ افسانوں کا یہ مجموعہ ایسے شگفتہ افسانوں پر مشتمل ہے جو ہر طرح پڑھنے کے لائق ہیں۔ قیمت صرف ۶؍۔ علاوہ محصول۔

شادی یہ کتاب مزاح میں اپنی شان کے اعتبار سے یکتا ہے ملک کے مشہور ترین مزاحیہ نویس جناب ملا رموزی کا نام نامی اس کتاب کی خوبیوں کے لئے کافی ضمانت ہے۔ اگر آپ معیاری مزاح کے ساتھ شگفتگی مضامین اور تحریری خوبیوں کو ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کیجئے۔ قیمت صرف ۱؍ علاوہ محصول

عورت (باتصویر) پھولوں کی سیجوں پہ حسن رعنائی دیکھنے سے پہلے جسم ناز کے تمام پوشیدہ رازوں سے واقف ہو جائے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب آپ کتاب عورت کا مطالعہ کریں جو نسوانی زندگی کا مکمل فوٹو ہے عورت کے پوشیدہ اعضائے جسم عورت کی خلقت

عورت کی تربیت عورت کے بارِ حسن کی خوشہ چینی غرض کہ عورت کی زندگی کے متعلق کوئی پوشیدہ بات ایسی نہیں ہے جو اس کتاب میں نہ ہو اس کتاب میں دو سو کے قریب رنگین فوٹو بلاک اور قلمی تصویریں ہیں بہت مقبول کتاب ہے اور ہاتھوں ہاتھ بکتی ہے۔ قیمت دو روپے ۸؍ محصول ۱۰؍

شاہی کوک شاستر

جو بادشاہوں کے لئے تھا اب وہ عام ہے اس کتاب میں رجوع اشیخ نے لذت کے سرچشمہ عورت کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ لذتیں جو ایک جوان آدمی کے ذہن میں صورتیں رکھتی ہیں شاید وہ اس کے پاسنگ بھی نہ ہوں ارباب مفتش نے عورت کے روئیں روئیں سے لذت ہی لذت ثابت کی ہے اور اسی طرح مرد کی قوت نہانی کو مزید طاقتور کرنے کے نسخے لکھے اور ہزار ہا گر بتلائے ہیں اور اسی علاج کے سلسلہ میں حکایات وصل جو بیان ہوئی ہیں وہ ہزار ہا معجونوں سے مقوی ہیں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ ۸؍ محصول ۱۰؍

قانونِ مباشرت

اردو کے صنفی لٹریچر میں غیر معمولی اضافہ ایک ماہر حکیم نے اپنے تمام عمر کے تجربات کو بغیر کسی قطع و برید کے اس کتاب پر تحریر دیا ہے طرز بیان نہایت دلچسپ ایسا کہ جہاں وہ اطبا اور ڈاکٹروں کے لئے مفید ہے عام لوگوں کے لئے بھی رہبر اعظم ہے شروع میں تمام تعلقاتِ جنسی کی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اسکے علاوہ علی الترتیب تمام امراضِ مخصوصہ ان کے اسباب علامات اور بہتر معالجات ویدک۔ طب یونانی ڈاکٹری وغیرہ نسخوں کے ذریعہ بتائے گئے ہیں غرض کتاب کیا ہے پیش بہا جوہر

کا مجموعہ ہے لکھائی چھپائی نہایت نفیس و دیدہ زیب قیمت صرف چار روپے (للعہ) محصول ۱۰؍

شبِ عروسی

پڑھ لینے کے بعد شبِ عروسی کی سب باتیں معلوم ہو جائیں گی شادی کے وقت عموماً دوستوں کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے دوستوں کو ایسے مواقع پر کوئی بہترین تحفہ دینا چاہتے ہیں تو صرف یہ کتاب دیجئے، شبِ عروسی اصل کتاب زندگی کا پہلا ورق ہے یا تکمیل انسانیت کے بام عروج کی پہلی سیڑھی ہے اگر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس زینہ پر قدم رکھا جائے گا تو وہ ایسا کامیاب قدم ہو گا کہ انسان کی یہ فطری مسرت ہمیشہ برقرار رہے گی قیمت عہ ہے جو اسکے منافع پر سوم مرتبہ صدقہ ہے محصول ۵؍

برتھ کنٹرول

مست کو شباب آفرین لذت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ تم اسکے حسن و جمال کے خزانہ کو محفوظ رکھنے کا راز سمجھ لو۔ والدین کی کثرت اولاد سے نہ صرف ماں کے حسن کا باغ جمال خزاں دیدہ ہو جاتا ہے بلکہ بچوں کیلئے ان کی پرورش سوہان روح ہوتی ہے اور انسان تا عمر اپنی ذوق و لذت سے محروم ہو جاتا ہے برتھ کنٹرول ایک حیرت انگیز علمی کتاب ہے جسکو پڑھنے کے بعد تمہارے سامنے زندگی کی ایک بڑی حقیقت بے نقاب ہو جائے گی اور یقین کے ساتھ اولاد کو پیدا کرنا تمہارے لئے اختیاری ہو جائیگی۔ قیمت ایک روپیہ محصول ۵؍

جنسی امراض اور انکا علاج

یہ معرکۃ الآرا تالیف اپنے موضوع کے لحاظ سے اس قدر اہم ہے کہ بیسویں صدی کی عظیم الشان تصانیف میں شمار کی جاتی ہے کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں امراض مخصوصہ کا تفصیلی بیان اور ڈاکٹری علاج ہے دوسرے میں یونانی اور ویدک نسخہ جات ہیں تیسرا حصہ برتھ کنٹرول سے متعلق ہے اس میں مشہور حکیموں کے کئی ضمیمے ہیں جو بذات خود گنج قارون سے کم نہیں ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف تین روپے (سے) ہے۔

کیفِ مواصلت

دنیائے لطف و مسرت اور لذت و کیف میں انتہائی چیز ایک مرد اور جوان مرد کے لئے عورت سے مواصلت ہے اور یہی وہ کیف افزا سرور ہے جس پر نسلِ انسانی کی بقا کا مدار ہے یوں تو فطرت کی بسیط دنیا میں ہزاروں ہستیاں ایسی ہیں جو صرف قانونی طریق پر دنیا کی آبادی میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں لیکن وہ زندگی کو جانور بھی گذار دیتے ہیں بات تو یہ ہے کہ اس کیف پرور شعبہ حیات سے اس درجہ تمتع حاصل کیا جائے جو دو مسرت زندگی حیات عالم سے ممتاز ہو۔ کتاب مواصلت کے اس درجہ پر پہنچا دیتی ہے جہاں لذت ہی لذت ہے۔ قیمت عہ محصول ۵؍

لذتِ شباب

شباب جاودانی کی جستجو ہو تو لذتِ شباب یعنی ایرانی کوک شاستر کا مطالعہ کیجئے جس سے آپکو معلوم ہو گا کہ شباب علاوہ در ازی کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں۔ عورت کے اثرات کیا ہیں حسن کی ملکہ سے کس طرح لطف اندوز ہونا چاہئے۔ گلزار شباب کس طرح نذرِ خزاں ہوتا ہے شباب کی بدگمانی ہوتی و بیوی کس طرح مفتی ہو عورت اگر عورت ہے اور مرد اگر مرد ہے اپنی خواہش پوری کرے تو کیسے خطرناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ لذتِ شباب میں مستانِ شباب کو لذت تازہ بخشنے کیلئے صد ہا عجیب نسخے۔ ۱۴ فوٹو بلاک قیمت ایک روپیہ (عہ) محصول ۵؍

دوشیزہ کی ڈائری

ایک دوشیزہ نازنین کے دل میں کس قسم کے پوشیدہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے کیا کرنا چاہتی ہے شادی کے بعد اسکے لئے کن باتوں کا علم ضروری ہے حسن و شباب کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے اور دوشیزہ کی پر کیف زندگی سے عیش و مسرت کی بہار کس طرح لوٹی جاتی ہے ان تمام باتوں کا جواب آپ کو دوشیزہ کی ڈائری میں ملیگا ایک مست شباب دوشیزہ کی زبان سے ان تمام پوشیدہ جذبات کی تصویر کھینچی گئی۔ فوٹو بلاک کی دو درجن حسین و جمیل تصویروں نے کتاب کی زینت میں اضافہ کر دیا ہے قیمت (عہ) محصول ۵؍

بہارِ شباب

صنفی کتابوں میں ہم اسلوب بیان کو امتیاز رہے نہ جذبات کی ہیجانی ہے چہ مطالعہ کے لئے خواہ کتنی لذیذ کیوں نہ ہو لیکن اصل فائدہ اس پروگرام کے ماتحت ہے جس کے ماتحت رہ کر انسان جوانی دیوانی کو قابو میں رکھنا چاہتا ہے کہ یہ لذات قائم ہو جائے بہارِ شباب میں ایسا ہی انتظام ہے۔ جوانی کی کیف انگیزی اور اس کو دوام کرنے کے لئے نسخہ ہائے عجیب طریقے قاعدے نسخے ہدایات حفظ ماتقدم کی ہزار ہا باتیں اور عورتوں کی اندرونی کیفیات کو مردوں پر آئینہ کر دیا متعدد عریاں فوٹو بھی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ (عہ) محصول ۵؍

شبِ عروسی کے افسانے

وہ لذیذ کتاب ہے جو شبِ عروسی کے تمام لذائذ کو یکجا جمع کرنے میں کامیاب ہوئی ہے اس کا دوسرا نام عروسِ نو ہے کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ کتاب دلاویز ہو گی اور واقعہ یہ ہے کہ عروسِ نو ہی کی طرح ہے۔ قیمت عہ محصول ۵؍

کی آئینہ دار ہے شب عروسی کے متعدد افسانے سچ مچ کی نئی دلہن بنکر سامنے آجاتے ہیں جتنے افسانے ہیں اتنی ہی طریق پر اس زندگی کی سب سے بہترات میں مزے لوٹے گئے ہیں۔ کامیاب زندگی کا مکمل لائحہ عمل ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ) محصول ۶ر

افشائے راز پنہاں

اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب اور ایسی عجیب غریب کہ آپ نے اس دلچسپ موضوع پر شاید کوئی کتاب سنی نہ ہوگی اس میں دو ہزار دو سو کنواری اور بیاہی عورتوں کی نفسانی خواہشات کے حالات خود ان کے قلم کے لکھے ہوئے امریکہ کی ایک من چلی عورت نے یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کئے اور امریکہ میں ایک ہلچل مچا دی اب اسکا ترجمہ بھی ہو گیا ہے خدا جانے کب تک یہ لوگوں کے مطالعہ میں جا سکے ہر وقت اس کے بند ہونیکا خطرہ ہے اسلئے جلد ہی منگا لیجئے قیمت ایک روپیہ چار آنہ (عہ) محصول ۶ر

دلہن کی ڈائری
ایک شوخ و طرار دلہن

کی آپ بیتی، شب زفاف کا پر کیف سماں۔ کچھ خوف، کچھ شرم، کچھ ہراس، کچھ گدگداہٹ دولہا میاں کی ہیبت۔ باغباں عشرت کی گل چینی، بے صبری کے جذبات۔ جیالی کے مظاہری پوشیدہ حالات کا انکشاف غرضکہ دلہن کا لاجواب مرقع ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ (عہ) محصول ۵ر

دلہنوں کی کانفرنس

سات دلہنوں کی شبہائے خلوت کی دلچسپ داستان۔ ساتوں ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اپنے واقعات شب عروسی کو صحیح صحیح لیکن شرمیلے الفاظ میں سناتے ہوئے اصلاح رسوم کا بیڑا اٹھاتی ہیں اور تعلیم و حقوق نسواں پر زور دیتی ہیں ہر ایک دلہن کی انوکھی سرگذشت ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ (عہ) محصول ۶ر

بہار عروس
یہ وہ کتاب ہے جس کو تجلی دلہن نے اپنی

سہیلی اختر دلہن کی ڈائری کے جواب میں اپنی شب عروسی کی سرگذشت لکھ کر بھیجدی ہے جو بجنسہ چھاپ دی ہے اس میں بڑے بڑے پوشیدہ دلچسپ واقعات ہیں بڑی ہی پر لطف و مزیدار کتاب ہے ایسی کتابیں کم ہوں گی قیمت ایک روپیہ چار آنہ (عہ) محصول ۵ر

سہاگ کی آٹھ راتیں

سہاگ کی راتیں جن کیفیتوں اور ولولوں کو اپنے اندر رکھتی ہیں ان پر مسرت لمحوں میں جذبات جو جو کروٹیں بدلتے ہیں ان کی عکاسی اس کتاب میں بدرجہ اتم کی گئی ہے کتاب پڑھنے کے بعد تمام نقشہ آپ کے نگاہوں کے سامنے پھر جائیگا قیمت صرف ۱ر علاوہ محصول

ہمدرد خاوند
ایک بےنظیر کتاب جو فی الحقیقت

خاوندوں کے لئے ہمدرد ہے اس میں ازدواجی زندگی کے متعلق تمام پوشیدہ رازوں کو ظاہر کر کے ایسی ایسی پتے کی باتیں بتائی گئی ہیں کہ آپ کبھی ناکامیاب نہیں ہو سکتے ساتھ ہی قوت باہ اور ہر قسم کے امراض مردانہ کے تیر بہدف نسخے بھی درج ہیں۔ قیمت صرف ۱ر علاوہ محصول۔

دیگر صنفی کتابیں

لذت النکاح	قانون مواصلت
عہد شباب ۱۲ر	ثمرۂ وصال ۱ر
قانون ازدواج ۱۰ر	تصویر حسن ۱۰ر
ایرانی کوک شاستر ۱۰ر	لطف شباب ۱۰ر
مرقع حسن ۱۰ر	شباب ۱۰ر
نغمات شباب ۱۰ر	صلاح کار میاں بیوی ۱۰ر
مرد و عورت ۱۰ر	زن و شوہر ۱۰ر
دولہا دلہن ۱۰ر	عیش و نشاط ۱۰ر
عورت کی فطرت ۱۰ر	مرد کی خصلت ۱۰ر

انگریزی سکھانیوالی بےنظیر اور سستی کتابیں

مخزن الفوائد اس میں اردو نام و عبارت کو انگریزی میں لکھنے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے انگریزی چٹھی لکھنے، ہجے کرنے اور تلفظ کے قاعدے انگریزی بول چال کے کئی سو فقرے ایک ہزار کے قریب اردو فقرے قاعدوں کے ساتھ اور تیس حکایتیں انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے درج ہیں اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ایسا مبتدی جو انگریزی سے واقف نہیں ہے قلیل عرصہ میں خاصی استعداد حاصل کر سکتا ہے قیمت چھ آنہ ۶ر علاوہ محصول

انگریزی اردو خط و کتابت

ہر قسم کی چٹھیاں، عرضیاں نوٹس اور ہر قسم کی تحریروں کے قاعدے اور نمونے معہ ترجمہ اردو قیمت ۴ر

اردو انگریزی ڈکشنری

سات ہزار پانسو ایسے اردو لغت جو اکثر تحریر و تقریر میں آتے ہیں بہ ترتیب حروف تہجی اردو خط میں ہیں ان کے آگے ان کی انگریزی انگریزی خط میں ہیں قیمت سات آنہ علاوہ محصول

انگریزی بولنا تین ہزار بول چال کے فقرے معہ ترجمہ اور مخزن الفوائد کے تمام اردو جملوں کا ترجمہ قیمت چھ آنہ (۶ر) علاوہ محصول

انگلش ٹیچر و لیٹر رائیٹر
یہ وہ لاجواب

کتاب ہے جس کے مطالعہ کے بعد بغیر استاد کی مدد کے بہت جلد انگریزی لکھنا پڑھنا اور بولنا آجاتا ہے۔ کتاب کے ساتھ ساتھ انگریزی خط و کتابت کی مکمل تعلیم بھی ہے۔ قیمت بارہ آنے (۱۲ر) علاوہ محصول۔

شرطیہ ۴ ماہ میں انگریزی آجائیگی

اگر آپ مومن صاحب کی انگلش ٹیچر کا ایک سبق روزانہ سمجھ کر پڑھ لیں گے صرف ایک گھنٹہ روزانہ محنت کی ضرورت ہے اور کسی استاد کی حاجت نہیں ہے یہ وہ کتاب ہے جو دو سال میں تیس ہزار فروخت ہو گئی اس سے بہتر انگریزی سکھانے والی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی ضخامت تقریباً ۴۳۲ صفحات قیمت صرف ایک روپیہ (عہ) محصول ۶ر کل عہ

مخزن الحکایات یعنی ۲۷ انگریزی کہانیاں مع اردو معنی و تلفظ درج ہیں قیمت ۵ر

خلاصۃ القواعد مبتدی کو بارسنگ کرنا اور اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنا بخوبی سمجھایا گیا ہے قیمت ۵ر علاوہ محصول۔

مخزن المحاورات اس میں ایک ہزار دو سو انگریزی محاورے اور چھ سو مثالیں معہ ترجمہ اردو جو انگریزی ترتیب حروف تہجی اور تین چار ہزار کے قریب ایسے ناموں پر حیثیتوں کی انگریزی جن سے کام پڑتا ہے قیمت ۶ر

کامل القواعد

اس میں صرف نحو کے تمام و کمال قاعدے جو ترجمہ کرنے اور انشا پردازی سے متعلق ہیں نہایت وضاحت سے درج ہیں۔ ۱۹۷ اعلیٰ درجے کی مستند انگریزی گرامروں کا لب لباب ہے قیمت صرف دس آنہ (۱۰ر) علاوہ محصول

ناظمہ کی آپ بیتی نہایت دلکش ناول جس میں

ناظمہ کے خطوط صرف پڑھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتابت طباعت دیدہ زیب ٹائیٹل سہ رنگ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنہ علاوہ محصول۔

گناہ کی راتیں رات کے تاریک پردہ میں عصمت وعفت کا خون، عورت کی بے بسی یہ کمزور مخلوق کس طرح اپنے گوہر عصمت کو ضائع کر دینے پر مجبور ہو جاتی ہے گناہ ومعصیت کی سات لرزہ خیز کہانیاں ٹائیٹل سہ رنگ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

نغمۂ حیات جناب ایم اسلم کے دو چھوٹے چھوٹے

ادب لطیف کے مضمون جن کو پڑھنے میں نظم ونثر دونوں کا لطف آتا ہے سرورق رنگین قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک۔

نرگس یہ کتاب ایک طوائف کی نہایت دلچسپ زندگی سے متعلق ہے

مصنف نے ہر واقعہ کو اس خوبی سے قلمبند کیا ہے کہ کم عمر لڑکیاں بھی اگر اسے پڑھیں تو مضائقہ نہیں اس نازک حسینہ کے پہلو میں ایک ایسا دل دھڑکتا ہے جس کی ہر جنبش سے محبت، ایثار، غم وکرب، صعوبت روحانی اذیت جسمانی، سوز وگداز غرض یہ جذبۂ انسانی کی لہریں اٹھتی ہیں جو حساس طبیعتوں کو مائل عسرت کے آنسو رلاتی ہیں۔ سرورق رنگین قیمت مجلد دو روپے علاوہ محصول ڈاک۔

دلی کا آخری دیدار غدر سے پہلے دلی

کی کیا حالت تھی۔ بادشاہ سلامت، شہزادوں اور شہزادیوں کے رسم ورواج اور روزانہ کا پروگرام، پھول والوں کی سیر، اہل وطن کی طرز معاشرت

نئی ہوئی بہاریں مٹی ہوئی تہذیب کا دلاویز مرقع، دہلی کی بیگماتی زبان میں سرورق رنگین۔ قیمت بارہ آنے (۱۲) علاوہ محصول ڈاک۔

دامن باغبان علامہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے

نہایت دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ضخامت ۲۰۰ صفحات لکھائی، چھپائی کاغذ بہترین قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

اسلامی میاں بیوی ازدواجی تعلقات

کے سلسلے میں یہ سب سے بہتر کتاب ہے اور بہت مؤثر پیرائے میں لکھی گئی ہے یہ کتاب میاں بیوی دونوں کے پڑھنے کے لائق ہے اور اگر دونوں اس کو اور اس کے پروگرام کو تعلق سے ذہن نشین کرلیں تو پھر ان کا گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ ضخامت ۳۱۲ صفحات قیمت صرف ۱۲ محصول ڈاک ۶ کل ۱۸

شاہان مغلیہ کی بیویاں اور رانیاں شاہان ہند کی وہ نامور خواتین جن کا اعزاز اب تک تاریخ ہند میں ثبت ہے اسی کتاب میں ان شاہی بیگمات اور رانیوں کے حالات ہیں جو اپنی اپنی جگہ کسی مخصوص شہرت کی مالک تھیں۔ ان میں حسین مہ جبین بھی ہیں اور شاعرہ ادیبہ بھی، ہری صف شکن بھی عصمت وعفت کی پیکر بھی اور ماہ پارے بھی ہیں جن کی چاندسی صورت پر سلطنتیں اور راجدھانیاں قربان ہو گئیں بڑی دلچسپ اور سرشار لٹریچر کی کتاب ہے ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحات قیمت صرف بارہ آنے محصول ۵

عصمتی کشیدہ اس کتاب کو ہندوستان کی نامور خواتین کی

مدد سے تیار کیا گیا ہے جس میں کشیدہ کاری کے لئے تقریباً ڈیڑھ سو خوبصورت نمونے ہیں جو لڑکیوں کے لئے کشیدہ

کاری کی مکمل تعلیم ہے قیمت ایک روپیہ محصول ڈاک ۶

موتیوں کا کام اس دستکاری کی مفید کتاب

کو ۲۷ ماہر عورتوں نے تیار کیا ہے اور دعوی ہے کہ ایسی مفید کتاب ہندوستان میں کہیں نہیں چھپی۔ قیمت دو روپے محصول ۸

عصمتی کروشیا کروشیا کی شوقین بہنوں کے لئے

نہایت کارآمد تحفہ جس کی تیاری میں ہندوستان کی ۲۵ نامور خواتین نے (جو کروشیا میں ماہر مانی جاتی ہیں) حصہ لیا ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے محصول ۶

ناشتہ مشرقی اور مغربی ناشتہ تیار کرنے کی بہترین کتاب

جو نئی روشنی کی بہنوں کے لئے کارآمد چیز ہے اس میں ہندوستان کے ہر حصہ کے مختلف قسم کے ناشتوں کی کئی کئی ترکیبیں ہیں قیمت دس آنے محصول ۴

موتی دنیا بھر کے حکماء، علماء، اور ادباء کے گرانقدر زریں اقوال مجموعہ بصیرت

افروز ملفوظات کا خزانہ۔ حکمت، فلسفہ پند و مواعظت۔ شعریت و رومان۔ ادب لطیف وانشاء، ادبیات نثر میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف کاغذ کتابت طباعت بہترین قیمت بارہ آنے۔ محصول ۵

عصمتی دسترخوان اردو زبان میں بہترین

کتاب جس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے جو اس موضوع کی اور کسی کتاب میں نہ نکلے گی اس میں تمام ترکیبیں تجربہ کرنے کے بعد لکھی گئی اس لئے ترکیبیں بالکل صحیح ہیں اور وزن بالکل درست اس کتاب کی تیاری میں ہندوستان کے ہر حصہ کی تقریباً ۸۰ بہنوں نے یہ کتاب بڑی محنت سے مرتب کی ہے باورچی

خانے کے انتظامات اور کھانوں کے متعلق بھی نہایت قیمتی ہدایات درج کی گئی ہیں یہ کتاب پانچ دفعہ چھپ چکی ہے قیمت دو روپے محصول ۸

پندرہ منٹ میں شعر کہنا آگیا

اس کتاب میں یہ کمال ہے کہ کیسا ہی معمولی سمجھ اور معمولی لیاقت کا آدمی ہو لیکن پندرہ منٹ میں شاعر بن سکتا ہے۔ اس میں صرف تین چھوٹے چھوٹے تجویز کر دیئے ہیں ان سے جس بحر کی چاہو تقطیع کر لو بس اگر آپ شاعر بننا چاہتے ہیں تو کتاب فن شاعری منگا لیجئے۔ قیمت ۸

جادو بیانی موجودہ زمانے میں انسان کی ترقی کے

لئے جہاں اور چیزوں کی ضرورت ہے وہاں گفتگو میں شائستگی اور تقاریر میں روانی بھی ہونی چاہیئے یہ کتاب آپ کو فی الحقیقت ایسا جادو بیان مقرر بنائیگی کہ سامعین آپ کی ہمنوائی کا دم بھرنے لگیں گے موجودہ زمانے کے تمام جدید اصول کو مدنظر رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے اسکے پڑھنے کے بعد آپ تقریر کرنے کے تمام اصول کو سمجھ کر ایک بہترین مقرر بن سکتے ہیں قیمت صرف ۶

آسان مضمون نویسی جیسا کہ نام سے

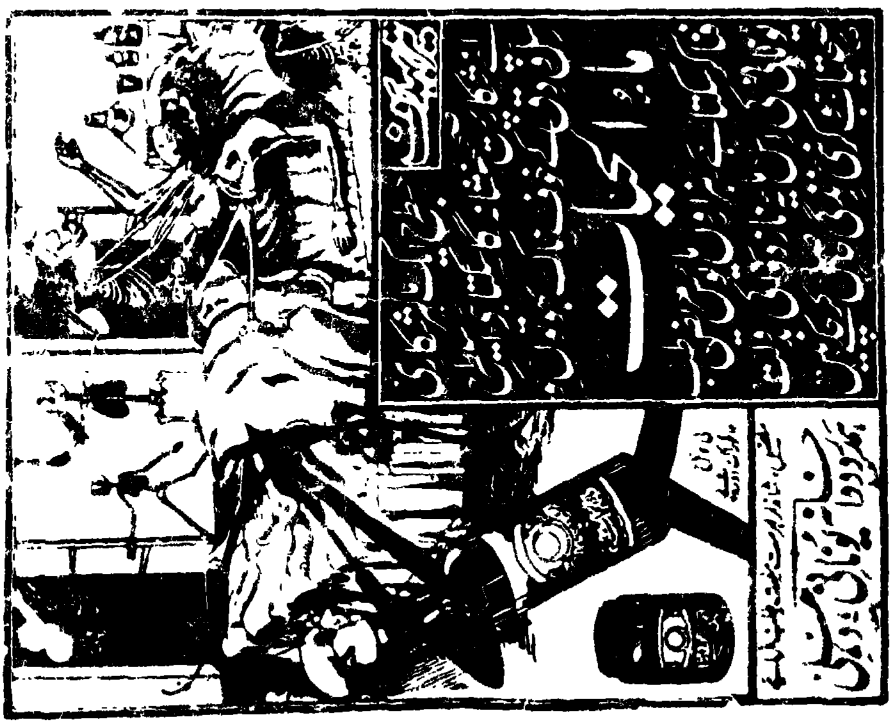
ظاہر ہے فی الواقع یہ کتاب مبتدیوں کے لئے آسان مضمون نویسی کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے اور تمام چیزیں اس طرح سمجھا دی گئی ہیں کہ کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی قیمت صرف ۸

پیغام فطرت دنیا کے موجودہ مصائب اور معاشرتی مشکلات سے

متاثر ہو کر ایک باکمال شاعر نے اپنے جذبات کی ترجمانی ایک لطیف نظم کی صورت میں کی ہے موجودہ دور میں بڑے بڑے سیاست دان بعد عملی اقتصادیات مصائب عالم کا حل تو ڈھونڈ کر ہی چکے تھے لیکن اس کشمکش کو دور کرنے کے لئے ایک شاعر کی آواز بھی سنئے کتاب نہایت خوبصورت سائز

[redacted]

REGD. No. L. 2627.



Publisher:—

SHAHID AHMAD B. A. (Hons).


ساقی
SAQI
MAY
1935
ایڈیٹر:- شاہد احمد بی اے (آنرز) دہلوی
SAM/. 32
Price per Copy As. 5.

ساقی بک ڈپو کی کتابیں

اخوان الشیاطین

سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ۔ آج تک اس قسم کے لرزہ خیز افسانے اردو میں شائع نہیں ہوئے۔ پہلا افسانہ بہت مشہور ہے۔

قیمت عہ

بنجھ نوے رمی

ماں کی مامتا کے متعلق ایک لندن تمثیل بنجھ کی المناک سرگذشت۔ مامتا کی ماری ماں کس طرح تڑپتی پھرتی ہے۔ گناہ کی لرزہ خیز تصویر۔ قیمت ۱۲ر

پروین و ثریا

مورس میٹرلنک کی تمثیل "پلیاس اینڈ میلی سانڈ" کا پاکیزہ ترجمہ۔ حسن و عشق کا ایک جدید نظریہ۔ بہت عمدہ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ

تعلیم زدہ بیوی

ایک جدید فیشن کی ہندوستانی عورت غلط راستے پر پڑ جانے کی وجہ سے کس قدر مصیبتوں میں مبتلا ہوتی ہے اور اس کا کیا عبرتناک انجام۔

قیمت صرف ۸ر

سرگذشت عروس

ایک اونچے گھرانے کی لڑکی کی شادی، ماں باپ نے روپے پیسے کے لالچ میں ایک مالدار بوڑھے سے کر دی۔ اسکے خوفناک نتائج اور بدمزہ زندگی کی جو تفصیلیں نوجوان دلہن نے اپنے روزنامچہ میں درج کی تھی وہ روزنامچہ من و عن کتابی صورت میں چھاپ دیا گیا ہے۔ اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ صرف نام اور مقام بدل دئے گئے ہیں تاکہ کسی کا راز فاش نہ ہو۔ واقعات سب وہی ہیں جو اس مظلوم دلہن کو پیش آئے۔ لڑکی کسی اور سے محبت کرتی تھی مگر اسکے خلاف مرضی اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی گئی جسکے بالوں کی سپیدی شرمندۂ خضاب تھی اور اسکی تندی بھی اتفاقی تھی۔ اس بڑھاپے کو بھی برداشت کر لیا جاتا مگر اس کی آوارگی اور بے پروائی نے ننھی دلہن کا دل توڑ دیا اور اس شکستہ دلی کے موقع پر وہ شخص آگیا جس سے دلہن کو دراصل محبت تھی۔ یہیں اس روزنامچے کی جان ہے کہ کیونکر عشق و ہوس میں بھی امتیاز ہوتا ہے اور اسکے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سمجھدار اور شریف بیویاں اپنے شوہروں سے حد درجہ ناشاکی، دل برداشتہ اور متنفر ہونے کے باوجود بھی اپنی عصمت کو ضائع نہیں ہونے دیتیں۔ بوڑھے میاں، جوان دلہن اور اس کے محبوب عاشق کا کیا حشر ہوا؟ یہ بیان کرنے کی چیز نہیں بلکہ پڑھنے کی چیز ہے۔ اس سے زیادہ دردناک اور عبرت انگیز آپ بیتی آپ نے کہیں نہ پڑھی ہوگی۔ یہ ڈائری اس لائق ہے کہ ماں باپ، لڑکے، لڑکیاں اور بڑی بوڑھی عورتیں سب پڑھیں تاکہ ان سے آئندہ کوئی لغزش نہ ہونے پائے۔ ۲۰۰ صفحوں کی مجلد کتاب ہے۔ اس پر شاہد احمد صاحب کا طرز بیان سونے پر سہاگہ ہے۔

قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ (عہ)

چندرا موہنی

حسن و عشق کی داستان خونچکاں۔ محبت کا مذہب میں کیا سکتا ہے؟ سچے عشق کی المناک کہانی۔ موثر اور مفید۔

قیمت ایک روپیہ

چار چاند

دلی کی ٹکسالی اور ستھری زبان کا اگر آپ لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو طلب کیجئے جو حضرت فراقؔ مرحوم کی تصنیف ہے۔ قیمت صرف ۸ر

دلی کا آخری دیدار

۵۷ء کے غدر سے پہلے دلی کی سوسائٹی کیا تھی؟ لال قلعہ جب آباد تھا تو اس چمنستان میں کیسی بہار تھی؟ سو سال پہلے کی ایک جھلک دیکھئے۔ قیمت صرف ۱۲ر

سلمیٰ

آسکر وائلڈ کی تمثیل "سالومی" کا ترجمہ۔ حسن خوں آشام کی ہوسناکی اور موت۔ تخیل اور طرز بیان خاص ہے۔

قیمت صرف ۸ر

ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو دہلی

پاکیزہ لٹریچر کی کتابیں

تصانیف شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد

- مراۃ العروس ۔ ۔ ۔ قیمت عہ
- بنات النعش ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- توبۃ النصوح ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- محصنات ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- رویائے صادقہ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- ایامیٰ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- ابن الوقت ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- موعظۂ حسنہ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- منتخب الحکایات ۔ ۔ ۔ ۸ر
- چند پند ۔ ۔ ۔ ۔ ۸ر
- صرف صغیر ۔ ۔ ۔ ۶ر
- نصاب خسرو ۔ ۔ ۔ ۶ر
- رسم الخط ۔ ۔ ۔ ۔ ۴ر
- مبادی الحکمۃ ۔ ۔ ۔ عہ
- مالغنیک فی الصرف ۔ ۔ ۔ ۱۲ر
- لکچروں کا مجموعہ ۔ ۔ ۔ صہ
- ترجمہ قرآن شریف مجلد ۔ ۔ ۔ للعہ
- متوسط ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معہ
- حمائل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

تصانیف مولوی بشیر الدین احمد

- اقبال دلہن ۔ ۔ ۔ قیمت عہ
- حسن معاشرت ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- اصلاح معیشت ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- تحفت جگر مکمل ۔ ۔ ۔ ۔ ۳ے
- فغان اشرف ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- حرز اطفال ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- نشاط عمر ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- عصائے پیری ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- شمع ہدایت ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- بچیوں سے دو دو باتیں ۔ ۔ عہ
- انشائے بشیر ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- مثنوی درد دل ۔ ۔ ۔ ۔ ۸ر
- عزم بالجزم ۔ ۔ ۔ ۔ ۴ر
- دیوان بشیر ۔ ۔ ۔ ۔ عہ
- حکایات لطیفہ مکمل ۔ ۔ ۔ ۳ے
- لطائف عجیبہ مکمل ۔ ۔ ۔ ۳ے
- فرامین سلاطین ۔ ۔ ۔ ۳ے
- واقعات مملکت بیجاپور ۔ ۔ عہ
- واقعات دار الحکومت دہلی ۔ ۔ عہ

شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم کی آخری تصنیف

اُمّہات الاُمّہ

علامہ مرحوم نے جس وقت یہ کتاب تحریر فرمائی تو بعض تنگ خیال مسلمانوں نے جن میں زیادہ تر طلباء مساجد شامل تھے اسکی سخت مخالفت کی۔ یہ کتاب جیساکہ اسکے موضوع سے ظاہر ہے ان غیر مسلموں کے اعتراض کا جواب تھا جو رسالت مآب صلعم کے تعدد ازواج پر رکیک حملے کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو جو غیر مسلموں کے سامنے پیغمبر اسلام صلعم کی صداقت کا مدعی ہو حسن عقائد کو الگ کرکے دعویٰ اس طرح ثابت کرنا چاہیے تھا جو منطق، فلسفہ، معقول اور تاریخ کی کسوٹی پر پارس ثابت ہو یہی تھا مصنف کا سب سے بڑا قصور جس کو بعض مسلمان برداشت نہ کرسکے اور کتاب دو دنیا سے ناپید کردی گئی۔

امہات الامہ پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ اور ان اعتراضات کے دنداں شکن جوابات جو صاحب احسن التفاسیر نے دئے ہیں (یہ جوابات اب تک کہیں نہیں چھپے) وہ بھی بطور ضمیمہ اس جلد میں شامل ہیں۔ ضخامت بڑے سائز کے تقریباً (۲۰۰) صفحات۔ کتاب کی قیمت نسبتاً بہت کم تجویز کی گئی ہے یعنی صرف دو روپے (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔

دو سورہ ۔ ۔ ۔ ۱۰ار، الحقوق والفرائض حصہ اول ۔ عہ، اجتہاد ۔ ۔ ۔ قیمت عہ — حیات النذیر
ادعیۃ القرآن ۔ ۔ ۔ ۱۰ار، حصہ دوم عہ، حصہ سوم عہ، نظم بے نظیر ۔ ۔ ۔ عہ — قیمت ۳ے

اپنے فائل مکمل کیجئے

ساقی کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر ساقی میں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض کی تعداد بہت کم ہے اسلئے جو پرچے آپ کو درکار ہوں بلا تاخیر طلب کیجئے۔

سنہ ۱۹۳۰ء

جنوری	۲ر
فروری	۲ر
مئی	۲ر
جون	۲ر
جولائی (افسانہ نمبر)	۸ر
دسمبر	۲ر

سنہ ۱۹۳۱ء

جنوری (سالنامہ)	۱۲ر
فروری	۳ر
مارچ	۳ر
مئی	۳ر
جون	۳ر
جولائی (افسانہ نمبر)	۸ر
اگست	۳ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر

سنہ ۱۹۳۲ء

فروری	۳ر
مارچ	۳ر
مئی	۳ر
جون	۳ر
اگست	۳ر
ستمبر	۳ر
اکتوبر (دلی نمبر)	۸ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر

سنہ ۱۹۳۳ء

جنوری، فروری (سالنامہ)	عہر
مارچ	۳ر
اپریل (ظرافت نمبر)	۸ر
مئی	۳ر
جون	۳ر
ستمبر (ناصر نمبر)	۸ر
اکتوبر	۳ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر

سنہ ۱۹۳۴ء

جنوری (سالنامہ)	۱۲ر
فروری	۳ر
اپریل (ظرافت نمبر)	۸ر
مئی	۳ر
جون	۳ر
اگست	۳ر
ستمبر	۳ر
اکتوبر (دلی نمبر)	۸ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر

سنہ ۱۹۳۵ء

جنوری (سالنامہ)	عہر
فروری	۵ر
مارچ	۵ر

سنہ ۱۹۳۳ء جلد ۸ مکمل

جولائی سے دسمبر تک
جس میں "افسانہ نمبر" اور "ناصر نمبر" شامل ہیں
قیمت دو روپے (عہ)

سنہ ۱۹۳۴ء مکمل فائل

جلد ۹ اور جلد ۱۰
چار خاص نمبر بھی اسی میں شامل ہیں
قیمت چار روپے (للعہ)

تصانیف حضرت خواجہ حسن نظامی

غدر کی صبح شام	عہر	گرفتار شدہ خطوط	عہہر
دہلی کی جان کنی	عہ	بہادر شاہ کا مقدمہ	عہ
غالب کا روزنامچہ	۱ر	محاصرہ دہلی کے خطوط	۴ر
غدر دہلی کے اخبار	۴ر	بیگمات کے آنسو	عہ

امور خانہ داری کی کتابیں

سنگھار خانہ	عہ	خانہ داری کے تجربات	۱۲ر
عصمتی دسترخوان	عہہر	مفید نسواں	۸ر
عصمتی کشیدہ	عہ	بچوں کی تربیت	۱۰ر
گلدستہ کشیدہ	عہر	مشرقی کھانے	عہ
عصمتی کروشیا	عہر	ہنڈکلیا	۸ر
سوئی کا کام	عہر	بچوں کے کھانے	۸ر
سلمہ ستارے کا کام	عہ	بیماروں کے کھانے	۱۰ر
خواتین کی دستکاریاں	۸ر	مذاقیہ کھانے	۴ر
موتیوں کا کام	عہ	ناشتہ	۱۰ر

ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو۔ دہلی

ہردلعزیز مصنفین کی کتابیں

نگارستان

نیاز فتحپوری کے مضامین کا پہلا مجموعہ جس میں انکے قلم کا پورا زور نظر آتا ہے عہد شباب کے لکھے ہوئے مضامین۔ ادب لطیف کا خزانہ۔ قیمت دو روپے۔

اُردو کا پہلا ناول نگار

ڈپٹی نذیر احمد کے ادبی کارنامے ڈپٹی صاحب ہی نے اردو زبان میں سب سے پہلے مکمل ناول لکھے ہیں۔ تحقیقی لٹریچر کی کتاب

قیمت عہ

نغمات موت

حجاب امتیاز علی کے غمناک مضامین کا مجموعہ ہر مضمون بیحد موثر ہے اور دنیا کی بے ثباتی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

قیمت صرف ۱؎

ایوان تصور

بلبل ہند سروجنی نائیڈو کے سینکڑوں دلکش و رنگین گیتوں کا ترجمہ۔ از ظفر قریشی دہلوی۔ بی۔ اے۔

قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ

نرگس جمال

ترجمہ ہے میٹرلنک کے ڈرامہ "جائزل" کا۔ مارس میٹرلنک بلجیم کا مشہور ڈرامہ نگار ہمارے شاہد صاحب کا نہایت محبوب مصنف ہے اور اس میں شک نہیں کہ انکا یہ ذوق نہایت مشکل پسند ذوق ہے۔

میٹرلنک کے ڈرامے عموماً چونکہ اسٹیج کیلیے نہیں ہوتے اسلیے انمیں علمی و فلسفیانہ شان زیادہ پائی جاتی ہے اور طبقہ خواص ہی کی تسکین ذوق انکا اصل مقصود ہوتا ہے میٹرلنک زیادہ تر "عشق و جمال" اور اسکے متعلقات سے گفتگو کرتا ہے اسی لئے اسکے یہاں جذبات کی نزاکت و وسعت اور فطرت انسانی کی وہ لچک جسے ہم چاہیں تو روحانیت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ وہ دہشت انگیز مناظر پیش کر کے دلوں کو دہلانا پسند نہیں کرتا وہ انسان کی خونی شامیوں کے فسانے سنا کر روح کے سکون کو مضطرب کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف ان لطیف پاکیزہ تعلقات کی داستان سناتا ہے جو حسن سے پیدا ہوتے ہیں محبت کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں اور روح میں جذب ہو کر شاہراہ انسانیت کو منور بنا جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس ادیب کا ذوق سخن یہ ہوگا اسکے یہاں خیال کی نزاکت بیان کی ندرت طرز ادا کی جدت اور معنی کے لحاظ سے الفاظ کا اشکال بھی کچھ ہوگا اور ایک غیر زبان سے ان تمام خصوصیات کو اپنی زبان میں منتقل کرنا یقیناً آسان کام نہیں لیکن مسٹر شاہد احمد بی۔ اے اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اور اسکا سبب یہی ہے کہ وہ خود بھی اسی ذوق کے ادیب ہیں۔ ایسی کتابوں کے ترجمہ میں دقت یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف جذبات کی سادگی یہ چاہتی ہے کہ الفاظ بھی ویسے ہی سلیس و سادہ ہوں اور دوسری طرف احساس کی بلندی جولانی بیان میں نزاکت پیدا کر دیتی ہے اسکی مقتضی ہوتی ہے کہ الفاظ و تراکیب بھی دقیق ہوں اور ایک مترجم گھبرا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں کو کیونکر ایک جگہ مجتمع کر سکتا ہے۔ شاہد صاحب نے ان دونوں باتوں کے امتیاز میں کافی احتیاط سے کام لیا ہے اور اسی لئے اصل مصنف کے کلام کی روح ترجمہ سے مفقود نہیں ہوئی۔

(نگار)

قیمت صرف ایکروپیہ (عہ)

شہاب کی سرگزشت

نیاز فتحپوری کا لکھا ہوا ناول جو اسقدر مشہور ہو چکا ہے کہ اسکے مزید تعارف کی ضرورت نہیں۔ اپنے طرز کی خاص چیز

قیمت ایکروپیہ (عہ)

سیرت محمد علی

ہندوستان کے مشہور رہبر مولانا محمد علی کے واقعات زندگی مکمل سوانحیات اور بہترین کتاب۔

قیمت تین روپے

دیوان شمس تبریز

مولوی عبدالمالک آروی نے یہ کتاب بڑی کاوش و تحقیق سے مرتب کی ہے اسکا دیباچہ نہایت قابل قدر ہے۔

قیمت دو روپے

خطوط کی ستم ظریفی

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تازہ ترین تصنیف جسے پڑھکر ہنستے ہنستے آپکے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔

قیمت صرف ۱۲؎

ساقی بک ڈپو۔ دہلی

چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
مع محصول ڈاک

جرعات

چندہ ششماہی دو روپے بارہ آنے
مع محصول ڈاک

جلد ۱۱ ساقی دہلی بابت ماہ مئی ۱۹۳۵ء نمبر ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

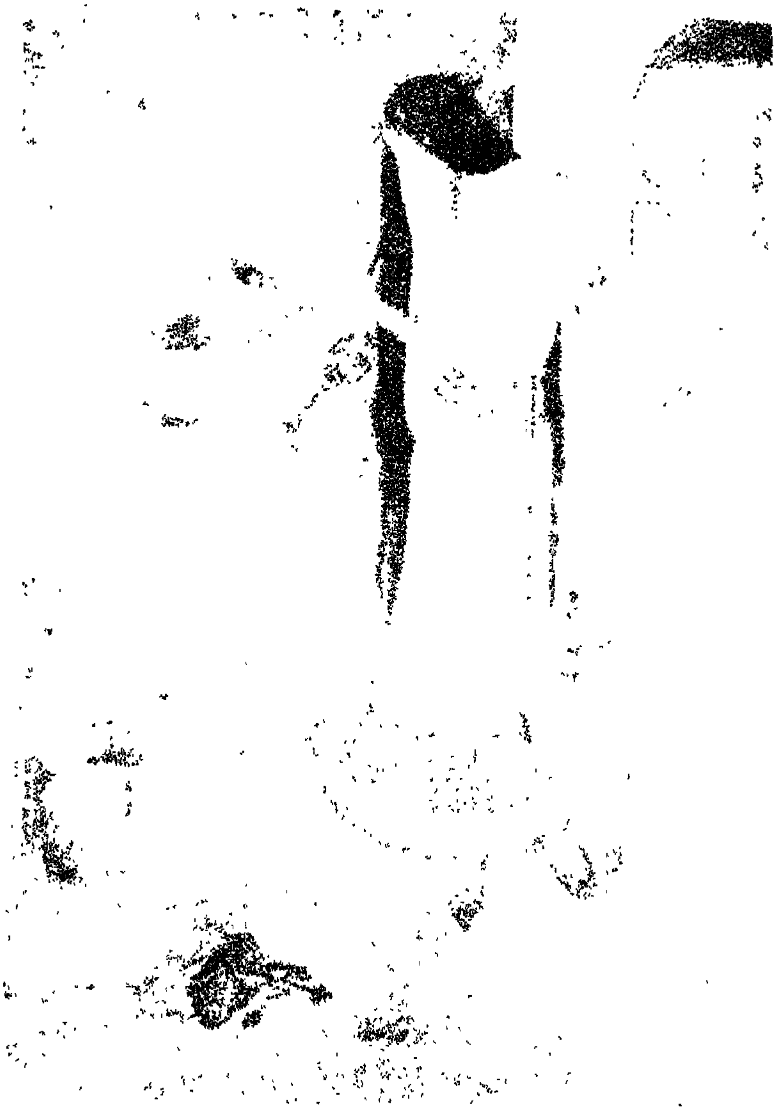
چغتائی صاحب نے ساقی کے "افسانہ نمبر" پر جو اعتراضات کئے تھے اُنکا جواب "ظریف نمبر" میں دیدیا گیا تھا۔ اِس سلسلہ میں اُنکا معذرت نامہ بغرضِ اشاعت موصول ہوا ہے جو زیرِ نظر اشاعت میں شامل ہے۔ ممکن ہے کہ اِسے بعض حضرات "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" سمجھیں لیکن چغتائی صاحب کی خلوصِ نیتی کا مجھے جس طرح پہلے یقین تھا اب بھی ہے۔ اُنکی غلطی صرف اسقدر ہے کہ اُنہوں نے اپنے مقررہ اصولوں سے افسانوں کو جانچا۔ اِس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر اِس سلسلہ کو یہیں ختم کر دینا مناسب ہے۔

جناب نیاز فتحپوری نے "نرگس جمال" پر تبصرہ کرتے ہوئے چند اعتراض بھی کئے ہیں مثلاً اُنہیں "بارشِ گل" کی ترکیب ناگوار گذری۔ اِسکے بجائے وہ "پھولوں کی بارش" دیکھنی چاہتے ہیں لیکن جب "سلام" کے بجائے "سامعین" کو فرقِ نازک تک زحمت جنبش" کہنا مناسب نہیں ہے تو "بارشِ گل" میں بھی چنداں مضائقہ نہیں۔ "تخیل" کو خواہ مخواہ "تخئیل" پڑھنے کی ذمہ داری لکھنے والے پر نہیں بلکہ پڑھنے والے پر عائد ہوتی ہے۔ "متلاشی" کو غلط اور "تلاشی" کو صحیح بتانا قواعدِ فارسی کے لحاظ سے صحیح ہو تو ہو اُردو میں تو متلاشی بمعنی تلاشی بولا جاتا ہے اور اِسے غلط کہنا صحیح نہیں ہے۔ ورق انداختہ پھولوں" کی ترکیب کے متعلق لکھا ہے کہ فارسی میں ورق انداختن زتاش کا پتہ پھینکنے کو کہتے ہیں۔ نیاز صاحب نے اس کا کوئی نعم البدل تجویز نہیں کیا۔ فارسی میں "ورقِ گل" پھول کی پتی کو کہتے ہیں۔ ایسے پھول کو جسکی پتیاں گر گئی ہوں اگر "گلِ ورق انداختہ" یا "ورق انداختہ پھول" کہا جائے تو کیا قباحت ہے؟ محض سوچ ہے کہ سند میں کسی اُستاد کا شعر پیش نہیں کیا جا سکتا کسی مناسب ترکیب کو چھوڑ دینا زبان کو محدود کر دینا ہے۔ رہا اُردو اور ہندی الفاظ کا سوال تو اِسے نہ چھیڑنا ہی بہتر ہے۔

زیرِ نظر اشاعت میں ایمرسن کا مضمون "مکافات" بہت قابلِ قدر ہے۔ ہندوستان کے بہترین مترجم مولوی عنایت اللہ صاحب نے اِسے اُردو میں جس خوبی سے منتقل کیا ہے اُسکی ستائش بے سود ہے۔ حکیم جمشید علی خاں صاحب نے "جہانگیر کی بیگموں کی چھیڑ چھاڑ" نہایت پاکیزہ مضمون لکھا۔ اِس طرز کے لکھنے والے اب کہاں۔ مورخ صاحب نے "دلی کا ایک باکمال ناولسٹ" کاوش و تحقیق سے لکھا ہے۔ یہ مضمون دو قسطوں میں مکمل ہو گا۔ صاحبِ مضمون نے فنِ ناول نویسی پر بہت اچھی معلومات بہم پہونچائی ہے۔ اِس قسم کے مضامین اگر زیادہ لکھے جائیں تو ہمیں اپنے اسلاف کے کارناموں سے باخبر ہونے کا موقع مل جائے گا۔

جولائی کا ساقی "افسانہ نمبر" ہو گا۔ ارادہ تھا کہ اِسکے بھی ایک ہی پلاٹ پر افسانے لکھوائے جائیں مگر گذشتہ سال جس مصیبت سے بارہ افسانے جمع کئے گئے تھے اُسے دیکھتے ہوئے اِس سال ہمت پست ہو گئی۔ کسقدر افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک میں سے صرف بارہ اچھے افسانے جمع ہو سکے۔ اکثر حضرات نے تو یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ ہم امتحان دینا نہیں چاہتے۔ اِس ذہنیت کا کیا علاج۔ جب پرچہ شائع ہو گیا تو اُسکی مقبولیت کا یہ عالم کہ آج تک اُسکی مانگ چلی آتی ہے اور پرچہ نایاب ہے۔ اِسدفعہ افسانہ نمبر مجموعہ ہو گا مختلف افسانوں کا۔ مفصل اعلان آئندہ اشاعت میں مُلاحظہ فرمائیں۔

شاہد



"دربارِ شاہانِ اودھ"

ہندوستان کی سرزمین سوادِ اعظم کے نام سے مشہور ہے اور ملکوں پر اسکو اس لئے ترجیح ہے کہ حضرت آدم بہشت چھوڑکر ہندوستان کی زمین پر آئے جہاں سردی گرمی برسات ہر فصل اعتدال سے ہوتی ہے ہندوستان میں بھی اودھ ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسکو گلشنِ ہند کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم دربار اودھ کی جھلک دکھانا چاہتے کیونکہ آجکل جب کہ ہر طرف سلور جوبلی کی دہوم دھام مچی ہوئی ہے اور تمام اہلِ ہند اپنے شاہنشاہِ معظم کی تخت نشینی کی پچیسویں سالگرہ اور جشن آرائی پر خوشی سے پھولے نہیں سمانے ہیں۔ شاہانِ اودھ کے دربار کی کیفیت کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا (۱) شاہی محل کی عالیشان عمارت کے وسط میں صدر مقام پر ایک نفیس بارہ دری بنی ہوئی اور شیشہ آلات سے سجی ہوئی ہے۔ نفیس نفیس جھاڑ، نازک نازک دیوار گیریاں، قلمی تصویریں، خوشخط قطعے لگے ہیں۔ کمروں میں تمام کا فرش بچھا ہے۔ سنہری، روپہلی چلمنیں زربفت کے پردے پڑے ہیں۔ بارہ دری کے سامنے پُرفضا چمن لگا ہے۔ سنگِ مرمر کی نہریں جن میں فوارے چھوٹ رہے ہیں، شہ نشین میں صدر مقام پر کارچوبی گاؤ تکیے لگائے ہوئے حضرت شاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ غازی جلوہ افروز ہیں۔ اُن کے پہلو میں بڑے تزک واحتشام سے نواب ملکہ زمانیہ بیٹھی ہیں۔ گرد اگرد خواصیں ماہتاب کے ہالے کی طرح اردلی کی خواص چنور اور مورچھل جھل رہی ہے۔ ڈومنیاں معہ سازندہ عورتوں کے بھاؤ بتا بتا کر نشیلے سروں میں گا رہی ہیں۔ کوئی بیچ کر بات نہیں کر سکتا۔ نظر سے نظر ملانے کا حکم نہیں ہے۔ کسیکو کھنکارنے کا حکم نہیں ہے۔ جو شخص جو کچھ کہتا ہے آتو جی سر جُھکا کر با ادب عرض کرتی ہیں۔ اتنے میں داروغہ ڈیوڑھی نے خبر بھجوائی کوئی بی حُسینی خانم ہیں۔ جنکو آتو جی نے محل کی ملازمت کے لئے طلب فرمایا تھا۔ وہ ڈولی میں آئی ہیں۔ کیا حکم ہوتا ہے ڈولی اُتروائی جائے یا نہیں۔ آتو جی نے کہا ہاں ہاں مجھ سے بیگم صاحبہ نے فرمایا تھا۔ ایک چٹھی نویسنی کے لئے۔ آنے دو۔ باہر سے ایک خواجہ سرا ہمراہ آیا۔ بی حُسینی خانم کی ستی بھول گئی یا الٰہی کس طرف جاؤں چاروں طرف اچھی پوشاک والی بی بیاں بڑے ٹھسّے سے بیٹھی ہیں۔ پہلے تو انا کو دیکھکر سمجھیں شاید یہی بادشاہ بیگم ہیں۔ جُھک کر سلام کیا۔ خواجہ سرانے کہا آگے چلو۔ اب یہ قدم قدم پر فرشی سلام کرتی ہیں۔ اتنے میں دُور سے آتو جی آتے ہوئے دکھائی دیں۔ ان کی جان میں جان آئی۔ انھوں نے کہا چلو ہم تو تمہارا راستہ دیکھ رہے تھے۔ بیگم صاحبہ سے تمہارا ذکر کر چکے ہیں غرض سارے محل کے صدقے ہوتی ہوئیں بارہ دری کے زینہ سے تہہ خانے کے اندر اُتریں۔ محلدار ساتھ ساتھ ہوئی محلدار نے کہا سامنے بادشاہ اور بیگم بیٹھے ہیں، ذرا ادب قاعدے سے، پھر آگے بڑھکر عرض کیا سرکار عالیہ کے فرمان سے بی حُسینی خانم حاضر ہیں۔ نگہ رو برو حسینی خانم نے نہایت ادب قاعدے سے سلام کیا اور بادشاہ کی خدمت میں اپنا لکھا ہوا خوشخط قطعہ نذر میں پیش کیا۔ اور بیگم صاحبہ کو پانچ اشرفیاں نذر میں دکھائیں۔ بیگم صاحب کے اشارے سے قطعہ اور اشرفیاں آتو جی نے قبول کر لیں۔ بیگم صاحبہ نے بیٹھنے کا حکم دیا۔ اور سرفرازی کا خلعت منگوایا۔ لونڈیاں دوڑتی ہوئی بھاری خلعت کی کشتیاں لے کر حاضر ہوئیں۔ ایک دوشالہ بھاری ایک رومال سُنہری جالدار ایک تھان کمخواب ایک تھان سُرخ اطلس کا، ڈھاکے کی

جامدانی، بنارسی دو دو پٹے، مشروع کے دو تھان اور سونے کے کڑے مرحمت ہوئے۔ بادشاہ نے ایک ہزار روپیہ کا توڑا منگوا کر انعام دیا اور پچاس روپیہ ماہوار پر چٹھی نویسوں میں اسم ہو گیا۔ دو گھنٹے یہاں دل بہلا کر بادشاہ سلامت نے بوچہ طلب فرمایا کہاریاں سواری لے کر حاضر ہوئیں۔ حضور سوار ہوئے۔ ڈیوڑھی کے باہر کہاروں نے کندھا دیا۔ حضور دربار میں تشریف لائے۔ دربار کی کوٹھی رمنہ میں فرح بخش کے نام سے مشہور تھی۔ تخت شاہی یہیں رہتا تھا۔ جب سواری معہ ماہی مراتب اور جلوس کے کوٹھی تک پہونچی سامنے عملے نے سروقد ہو کر سلامی دی۔ معتمد الدولہ آغا میر وزیر، ظفر الدولہ کپتان فتح علیخان بہادر، اقبال الدولہ، مکرم الدولہ، مجد الدولہ، میر محمد سرشتہ دار عدالت، نواب روشن الدولہ، افتخار الدولہ، مہاراجہ میوہ رام، راجہ امرت لال عرض بیگی۔ مرزا کیوان جاہ نے باری باری سے مجرا کیا اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔ خُدام داہنے بائیں چنور لئے کھڑے ہیں۔ پشت پر ایک خواص چھتر لگائے ہوئے ہے۔ درباری لوگ بہت ادب قاعدے سے بیٹھے ہوئے نگاہیں نیچی کئے ہوئے خاموشی کا عالم، پہلے معتمد الدولہ آغا میر نے ضروری کاغذات پیش کئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ حضور نے بعد ملاحظہ دریافت طلب باتیں پوچھکر دستخط فرمائے، پھر مقدمات عدالت پیش ہوئے۔ روبکاری سماعت فرما کر حکم احکام جاری کئے۔ اتنے میں مردہے نے عرض کیا شاہ عالم عالمیان نگاہ روبرو نواب عاشق علی حاضر ہو۔ آپ نے اشارہ فرمایا۔ داروغہ ڈیوڑھی نے کہا آنے دو بادشاہ نے طلب فرمایا ہے، چوبدار نے آواز دی نواب عاشق علی حاضر ہے۔ نگاہ روبرو۔ پہلی ڈیوڑھی کے چوبدار نے کہا کہ سب چوبداری کے بعد دیگرے آواز دینے لگے۔ اس کے بعد رستم علی مردہے نے بھی آواز دی۔ نواب عاشق علی پھاٹک سے دو طرفہ سلام کرتے ہوئے جھکے جھکے چلے آتے ہیں۔ دربار کے رعب سے کانپ رہے ہیں۔ راجہ امرت لال عرض بیگی نے ان کو سامنے بیجا کر عرض کیا۔ ملاحظہ ہو نواب عاشق علی حاضر ہے۔ نواب نے زمین دوز ہو کر مجرا کیا۔ دس اشرفیاں نذر میں پیش کیں، حضور نے اشارے سے قبول کیں۔ چوبیس جنوری ۱۸۲۸ء کو پیش ہوئے۔ نذر قبول ہوئی۔ اُسی روز خلعتِ سرفرازی ہوا۔ پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور عہدۂ سفارت مرحمت ہوا۔ اُسی روز کلکتہ جانے کا حکم ملا۔ تین لاکھ روپیہ نقد سرکار سے واسطے ضروریات کے مرحمت ہوا۔ اِسی طرح نجم الدولہ جعفر علی خاں ابن مظفر علی خاں گوالیار سے آئے، بادشاہ نے بہت مرحمت فرمائی اور عہدۂ توپخانہ سلمانی عنایت ہوا۔ پانچسو روپیہ مہینہ مقرر ہوا۔ (۲) نواب سعادت علیخاں قبل طلوع آفتاب کے دریا سواری کا فرماتے تھے، عرب اور جنگل کے تال میل سے خانہ زاد گھوڑے تھے۔ محل سے بوچہ پر سوار ہو کر برآمد ہوتے اور گھوڑے پر سوار ہوئے اس وقت آپ لباس انگریزی ولایتی جراب زیر کمر کئے ہوتے اور سیاہ مغلی ٹوپے دیئے ہوتے تھے۔ پہلے سلام مرشد زادہ دنکا ہوتا تھا۔ اس کے بعد امراء خاص کا۔ دو گھڑی میں ہواخوری سے فراغت کر کے ہاتھی پر معہ جلوس سوار ہوتے تھے۔ سواری معہ جلوس معہ ڈنکا دنشان ہوتی تھی۔ اُمرائے دولت ہاتھیوں پر سوار ہمراہ ہوتے تھے۔ خاص بردار چنور لئے ہوئے چوبدار سواری کے داہنے بائیں ساتھ ہوتے تھے۔ مرزا کریم بیگ، محمد غلامی سوار انگریزی پوشاک میں آگے آگے ہوتے تھے۔ بیس سوار اور بیس پیدل وقائع اہتمام سواری کرتے تھے اور کل اہتمام نواب انتظام الدولہ مظفر علی خاں کے سپرد تھا۔ نواب شرف الدولہ رمضان علی خاں

مرزا اشرف علی بھی ہمراہ ہوتے تھے۔ روزانہ پہرہ چوکی پر بائیس سوار آدمی مختلف فرقے کے ملازم تھے، ان میں دو سوار بھی تھے۔ دربار سواری کی بھی شان تھی۔ امرا در دولت سے رخصت ہو جاتے تھے۔ نو بجے صبح کو چائے پانی ہوتا تھا۔ کرسی نشین امرا مقربان خاص صمصام الدولہ مرزا ہجو۔ مرزا محمد تقی خان ہوس پہلو میں۔ مکلوڈ صاحب ڈاکٹر لا صاحب خاص کرسی کی پشت پر بیٹھتے تھے۔ میر انشا اللہ خان میر ابو القاسم خان۔ سراج الدولہ معتز بن خواجہ سرا بار یاب سلام ہوتے تھے۔ سلام کا قاعدہ یہ تھا کہ مرد ہا پہلے عرض خدمت کرتا تھا۔ پھر عرض بیگی اپنے سامنے پیش کر کے ادب قاعدے سے سلام کراتا تھا۔ اس میں بہت دیر موقع محل دیکھنے میں ہو جاتی تھی۔ ایک دربار وقت خاصے کے ہوتا تھا۔ جس میں مقربان خاص، اردلی و نواب جلال الدولہ، مہدی علی خاں، رکن الدولہ، نواب محمد حسن خاں شریک خاصہ ہوتے تھے۔ اس کے بعد حضور محل میں تشریف لیجاتے تھے۔ بارہ بجے برآمد ہوتے کچہری فرماتے تھے۔ کاغذات ملاحظہ ہوتے تھے۔ نواب نصیر الدولہ تمام رپورٹیں ایک بند لفافے میں رکھکر پیش کرتے تھے۔ نواب شمس الدولہ بھی کاغذات بند لفافے میں پیش کرتے تھے۔ اور آپ علیحدہ کمرے میں حاضر رہتے تھے۔ اسی طرح نواب منتظم الدولہ مہدی علی خاں، وزیر راجہ دیا کرشن رائے رتن چند صاحب، اخبار رائے رام اخبار نویس، خفیہ منشی رونق علی۔ منشی دانش علی اپنے اپنے لفافے میز پر رکھکر علیحدہ کمرے میں بیٹھتے تھے۔ استفسار کے لئے بلائے جاتے تھے۔ جناب عالی لفافے ملاحظہ فرما کر ضروری کاغذات پر دستخط فرماتے تھے اور جو قابل داخل دفتر ہوتے تھے وہ طشت آب میں ڈالدیئے جاتے تھے۔ ان کا ایک ایک حرف دھو ڈالا جاتا تھا۔ جس کاغذ پر مہر خاص کرنا ہوتی تھی ظفر الدولہ سامنے حضور کے مہر کرتے تھے، جو کاغذ باقی رہجاتے تھے رات کو ملاحظہ فرماتے تھے۔ پرچہ اخبار ہر وقت گذر سکتا تھا۔ بعد دستخط تمام کاغذ ہر دفتر میں بھجوا دیئے جاتے تھے۔ اور اسی روز تمام حکم احکام جاری ہوتے تھے۔ وقت شام دو اسپہ گاڑی پر سوار ہو کر ہوا خوری کو نکلتے تھے۔ جلوس سواری میں راجہ بختاور سنگھ کا رسالہ ترک سواران ہمراہ ہوتا تھا۔ کبھی نامدان پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ اکثر گنج میں جا کر نرخ غلہ کا دریافت کرتے تھے کہ رعایا کو گرانی غلہ سے تکلیف نہ ہو۔ بقال اس خوف سے اناج مہنگا نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت دو پیسے سیر آٹا بکتا تھا۔ (۳) نواب غازی الدین حیدر ایک بسنتی دربار بسنت کے موسم میں کرتے تھے، یہ دربار موتی محل اور شاہ منزل خاص میں ہوتا تھا۔ جس میں ہر فرقے کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ آپ کے دربار کا طریقہ یہ تھا کہ صبح نو بجے در دولت سے کوٹھی فرح بخش میں جلوس فرماتے تھے۔ کنارہ نہر بینڈ باجے سے سلامی ہوتی تھی۔ جب تخت شاہی پر متمکن ہوتے دو چنور بردار مورچھل ہلاتے تھے۔ پہلے صاحب زادے سلام کو آتے تھے، پھر بھائی نواب نصیر الدولہ کاظم علی خاں، جعفر علی خاں، حسین علی خاں، مہدی علی خاں، کلب علی خاں، نہایت ادب سے اپنی اپنی کرسی کے پاس کھڑے رہتے تھے۔ جب بادشاہ باشارۂ ابرو سلام قبول کرتے تو اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے۔ بائیں طرف ڈاکٹر مکلوڈ صاحب بیٹھتے جن سے فارسی میں بات چیت ہوتی۔ کمرے کے ایک گوشے میں ایک انگریز مشک بجاتا تھا جو بہت سریلی ہوتی تھی۔ رجب علی، فضل علی خیال گاتے تھے۔ سہر و بائی دکن کی رہنے والی نے غضب کی آواز پائی تھی۔ جس وقت صبح کے وقت گاتی تھی ع "اے نسیم سحر آرام گہہ یار کجا ست" سب کو وجد ہو جاتا تھا۔ اور جھومنے لگتے تھے۔ خصوصاً مکلوڈ صاحب کی کیفیت کچھ نہ پوچھیئے۔ جناب عالی کے سامنے ایک قد آدم آئینہ وسط میز پر رکھا جاتا تھا۔ آئینے کے سامنے ایک بلوریں جھاڑ تھا۔ جس کے ہر پیالے میں دھنیا، الائچی، مسالہ وغیرہ خوشنمائی سے چنا جاتا تھا۔ میز پر انگریزی

اور ہندوستانی عمدہ عمدہ کھانے چُنے جاتے تھے۔ اور گلدستے لگائے جاتے تھے۔ اہلِ دربار وہاں بیٹھ کر کھاتے پیتے اور آپس میں مذاق کرتے تھے۔ تمام مجرائی لال پردے کے باہر بیٹھے رہتے تھے۔ جب حکم ہوتا تھا سلام کو حاضر ہوتے تھے۔ نجم الدولہ رائے امرت لال شیخ فتح علی سلام کراتے تھے۔ اس کے بعد یہ دربار برخاست ہوتا اور جناب محلسرا میں تشریف لیجاتے تھے (۴) ابو الفتح معین الدین سلطان الزماں محمد علی شاہ جن کا مزار امام باڑہ حسین آباد مبارک میں ہے بوجہ کبر سنی کے ان کے ہاتھ پاؤں رہ گئے تھے۔ دربار کی صورت یہ تھی کہ آٹھ بجے برآمد ہوئے سونے کی پلنگڑی پر اجلاس فرمایا شہزادے، امراء، اہلِ دربار باریاب سلام ہوئے۔ نو بجے دربار برخاست ہوا۔ کچہری کے کاغذات عملے نے پیش کئے۔ دوپہر تک دستخط ہوا کئے۔ دوپہر کو خاصہ چُنا گیا (خود معذور تھے) رفیق الدولہ نے خاصہ کھلایا ایک گھنٹہ قیلولہ فرمایا پھر خفیہ رپورٹیں سماعت کیں۔ قریب شام تامدان میں سوار ہوکر نواب ملکہ جہان کے محل میں تشریف لے گئے۔ ثریا جاہ حضرت سلطان زماں امجد علی شاہ کا طریقِ دربار یہ تھا کہ صبح کو بوجہ خاص پر محل سے برآمد ہوتے۔ مع مختصر جلوس کے ہوا خوری کو تشریف لیگئے آٹھ بجے دربار میں آئے سب امراء دولت نے حاضر ہوکر سلام کیا، آپ اپنے قاعدے سے بیٹھ گئے۔ مقربین خاص نے دیتی اپنی تقریر خوش سے محظوظ فرمایا۔ انعام و اکرام ہوئے درباری لوگ رخصت ہوئے، عدالت کے کاغذات ملکی و مالی پیش ہوتے بارہ بجے کے بعد محلسرا تشریف لیجاتے تھے۔ سہ پہر کو مدبر الدولہ محل سرائے میں حاضر ہوکر کاغذات پیش کرتے تھے، شام کو پھر سوار ہوکر شہر کی حالت معائنہ فرماتے تھے۔ کبھی مدرسہ سلطانیہ میں تشریف لے جاتے تھے۔ جسے خود قائم کیا تھا۔ اس مدرسہ میں کئی ہزار لڑکا پڑھتا تھا۔ فی کس پانچ روپیہ ماہوار سرکار سے ملتا تھا۔ ایک ایک مدرس بیس بیس لڑکوں کو تعلیم دیتا تھا۔ آٹھ بجے سے چار بجے تک مدرسہ کھلا رہتا تھا۔ (۵) حضرت سلطان عالم محمد واجد علی شاہ نے کوٹھی فرح بخش قدیم بیت السلطنت شاہی کو چھوڑ دیا اور اپنا دربار شہنشاہ منزل میں قائم کیا۔ کوٹھی فرح بخش میں محض اتوار کو دربار ہوتا تھا۔ تمام شہزادے امراء دولت رفقا حاضر رہتے تھے؛ بادشاہ تشریف لاکر دس بجے تک قیام فرماتے تھے۔ عدالت کا دربار روزانہ ہوتا تھا۔ ۹ بجے نواب امین الدولہ مہاراجہ مدبر الدولہ اور تدبیر الدولہ، اہل دفتر خاص دولت خانہ قدیم (در دولت) پر تشریف لاتے تھے، دوپہر تک ملاحظہ کاغذات میں مصروف رہتے تھے۔ دوپہر کے بعد تخلیہ ہوجاتا۔ جب بادشاہ کی سواری شہر میں نکلتی تھی، چاندی کے مکلف صندوقچے سواری خاص کے داہنے بائیں دو ترک سوار لئے ہوتے تھے۔ ان صندوقچوں کا نام مشغلہ نوشیروانی تھا۔ عام لوگوں کو حکم تھا جس کسیکو کوئی خاص استغاثہ کرنا ہو (جبکی سماعت سرکاری عملے نے خلاف انصاف کی ہو) اپنی درخواست اس صندوقچہ میں ڈالدے۔ حضور خود ملاحظہ کرکے بااثر و رعایت احکام صادر فرماتے تھے۔ اس سے عملے کو مجبور ہوکر رعایا کے حقوق کی حفاظت کرنا پڑتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بادشاہ تک استغاثہ جائے۔

خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی

"یادِ وطن"

از افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش

پیارے وطن - لاج دلارے وطن! اے بائیس خواجہ کی چوکھٹ! دلّی شاہجہان آباد! کوئی دن نہیں جاتا جو میں تیرے لئے چلو دو چلو آنسوؤں سے نہ روتا ہوں - اے جنت سواد شاہجہان آباد تیری خاک مجھے پسے ہوئے موتیوں سے بڑھکر ہے - میں تجھ ہی میں پیدا ہوا کھیل کود کر بڑا ہوا - تو نے ہی پال پوس کر پروان چڑھایا - اور اب تجھی میں مرنا بھی چاہتا ہوں - تو کہاں ہے؟ کس مقام پر ہے - میں تو اُس جگہ ہر منٹ سو دفعہ سر کے بل جا کھڑا ہونے کو تیار ہوں جہاں تیری چھینٹ ہی پڑی ہو - تیری ہوا ہی اُدھر سے آتی ہو - اے میرے بچپن کے گہوارے - میری جوانی دیوانی کی گلزار دُنیا - میری زندگی کی خوشگوار چہل پہل اگر بردہ دُنیا پر کوئی محبوب ترین چیز ہے تو وہ میرے لئے تو ہے فقط تو - تیری وہ نفاست وہ پاکیزگی وہ تیری گہما گہمی، وہ چاندنی چوک - وہ لال کنواں - وہ زیر جامع مسجد جہاں تھالی پھینکو تو سروں پر چلی جائے، وہ ہر شام کو تیرے بازاروں کی رونق - وہ سفید پوش بانکے ترچھے نوجوانوں کا قہقہہ زن اِدھر سے اُدھر البیلا گیلا پھرنا - وہ پھولوں کی مہک - وہ کٹوروں کی جھنکار - سودے سلف والوں کی رنگیلی چٹکیلی آوازیں، موٹروں کا دوڑنا - ٹریموے کی ٹن ٹن - گاڑی گھوڑوں کی آمدورفت - یہ سامان کہاں سے لاؤں - اس دلِ مہجور کو کیونکر بہلاؤں - اے غریب نواز شہر - جس میں کبھی ایک پیسے کے چار سودے ملجایا کرتے تھے - اور غریب اپنا پیٹ پال لیتے تھے - اب بھی میں جہاں جاتا ہوں تیری ہی نسبت مجھے دی جاتی ہے - اور جہاں موجود ہوں تیرے ہی نام سے پکارا جاتا ہوں ؎

گو دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں ۔۔۔ میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

پیارے وطن! یہ تجھی میں وصف ہے کہ تیری پاک و پوتر نرمل جل سے لبریز جمنا جی گو اب پایاب رہ گئی ہے مگر پھر بھی ہزاروں انسانی گناہوں کے دُور کرنے کا اثر اس میں اب بھی موجود ہے - اے رشی اور منی جگت گروؤں کے باسی! اے راجا مہاراجاؤں کی مشہور راجدھانی - اے علم و حکمت کے مرکز تیری خاک سے اب بھی جو جوہر پیدا ہوتا ہے وہ آسمانِ شہرت پر تیرِ اعظم سے پہلو مارتا ہے - اے شاہانِ اسلام کے قدیم پایۂ تخت تو اب بھی اُسی مرکز پر ہے اور تجھ میں اسوقت بھی گورنمنٹ برطانیہ کا راج استھان مانا جاتا ہے - اے دلّی - ہماری دلّی - تو میرا ہی ایک دل نہیں بلکہ تمام ہندوستان کا دل ہے سارے جہان کا دل ہے - ہے کوئی جو میری آنکھوں سے تجھے دیکھے؟ ہے کوئی جو میری طرح اپنی نگاہیں تجھ پر نثار کرے - دیکھ - وہ لندن کا قصر بکنگھم اب بھی تیری لال قلعہ کی کرسی سے دیا جاتا ہے - اے مینو سوادِ سلیم گڈھ وہ تو ہی تو ہے جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا - آج بھی آنریبل فوج کے دستے کا مامن تو ہے - برطانیہ اعظم کا یونین جیک (جھنڈا) تجھی پر لہراتا ہے - اور اپنی ہر جنبش سے خشک و تر پر اپنی حکومت ثابت کر رہا ہے -

میرے پیارے وطن! یہ بھی عجیب بات ہے۔ باوصفیکہ میں تجھ سے کوسوں دُور ہوں جب تکیے پر سر رکھتا ہوں تو تجھ کو صدہا میل اپنے سے فاصلے پر پاتا ہوں، مگر اُس پر بھی رات دن تیرے بازار تیری گلیاں بلکہ تیرے در و دیوار تک میری آنکھوں میں پھرتے ہیں۔ ہاں ہاں تیرا تنکا تنکا مجھے حد سے زیادہ پیارا ہے۔ اگر زمانہ مجھے اتنا بلند کرے اتنا بلند کرے کہ فرش مخملی میرا بستر ہو۔ قاقم و سنجاب میرا لباس۔ دُنیا کی ہر نعمت خواہش سے پہلے میرے سامنے ہو۔ چاندی سونے کے برتنوں میں کھاؤں، اور بیویوں اور ہزاروں سر میرے سامنے جھکتے ہوں جب بھی میں یہی کہونگا۔ آہ وطن! وطن! میرا پیارا وطن کہاں ہے؟ مجھے میرا وہی بوریا جس پر میں کبھی بیٹھا کرتا تھا اور بڑے بڑے اُمرا۔ کُملا۔ دولت مند۔ فقیر۔ دوست۔ دشمن سب کے سب مجھے وہیں آکر سلام کرجاتے تھے وہ مجھے تختِ طاؤس سے بھی کہیں بہتر تھا۔ میرا وہی رین بسیرا، جہاں میں گرمی جاڑے برسات اپنی نیند سوتے اور اپنی نیند اُٹھنے میں کاٹتا تھا وہی مجھے سکندرِ اعظم کے مضبوط سے مضبوط قلعے سے بھی مستحکم تھا۔ ابھی تھوڑے ہی دن گذرے ہیں۔ ہولی کا زمانہ تھا۔ بہار کا موسم شروع تھا، اس وقت مجھے اپنے وطن کی ایک ہولی ضرور یاد آئی تھی۔ جب کبھی میں زندہ تھا اور سارے شہر میں مجمع احباب کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا پھرتا تھا یہ الفاظ ابھی زبانِ قلم سے ادا ہی ہوئے تھے جو کسی نے چُپکے سے کان میں کہا۔ اور وہ ٹوٹے کنوئیں کی سیر۔ وہ سیر کیا بُھول ہی گئے۔ ہاں ہاں۔ جبکہ ایک گلابی کرتا گلے میں تھا۔ لیس کی سر پر۔ سلمے کی پاؤں میں۔ بال بکھرے اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ العظمتُ للّٰہ ؎

کیفیتِ چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا　　　ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

رحمتِ خدا ہو اُس کی تُربت پر جس قادر الکلام کا یہ شعر ہے۔ ہاں پیارے وطن! اس وقت مجھے وہ نظارہ یاد آگیا۔ آنکھوں میں پھر گیا۔ فی الواقعی۔ دریا کے کنارے ٹوٹا کنواں تھا۔ اور میں۔ وہ سُریلی۔ رسیلی صدائیں تھیں اور میں۔ چاندی کے بالکل چاندی کے آدمی تھے اور میں۔

جھُولا پڑا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوہار پڑ رہی تھی، کچھ جھوتے۔ کچھ جھُلاتے۔ ایک نے پچکاری ماری، دوسرے نے عبیر چھڑکا تیسرے نے گلال برسایا۔ اور جھُولے کی پینگ کہیں سے کہیں جا پہونچی۔ جوان جان کھیل کود کے رسیا۔ جب وہاں سے پھرے تو دسترخوان بچھا۔ خوش ہو ہو کر مزے مزے کے کھانے کھائے۔ برسات کا موسم آیا۔ تل دھارا اوپر دھار برسنے لگا۔ باغوں کی سیر کی سُوجھی، آم اور جامنوں کے ٹوکرے پٹ گئے۔ جتنے کھائے اُتنے کھائے باقی سے چوتھی کھیلی۔ اور مہندی لگے پاؤں کیچڑ میں بھرے سنے لت پت قالینوں پر چھاپے مارنے لگے۔

اللہ اللہ! وہ سمے اب خواب و خیال ہو گئے۔ باتیں کہانیاں ہو گئیں، یہ سارے چونچلے تیرے ہی دم سے تھے۔ پیارے وطن! اب نہ وہ تو ہے اور نہ وہ ہم۔ خدا رہتی دُنیا تک تجھے آباد و شاد رکھے، تیرے کھنڈرے بسائے۔ اور تجھے دن دُونی عزت نصیب ہو۔ ہماری تو اب یہ حالت ہے کہ یہ مصرعے کم و بیش ہر وقت کا وظیفہ ہیں ؎

خاکِ وطن از روضۂ رضوان خوشتر　　　خارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر
یوسف کہ بمصر بادشاہی میکرد　　　میگفت گدا بودن و کنعان خوشتر

مکافات

از امرسن مترجمہ جناب مولوی عنایت اللہ بی۔ اے سابق ناظم دار الترجمہ حیدر آباد دکن

لڑکپن سے آرزو تھی کہ مکافات کے مسئلہ پر ایک مضمون لکھوں، بچپن ہی سے یہ خیال دلنشیں ہو گیا تھا کہ اس موضوع پر خود انسان کو اس کی زندگی جیسا اچھا سبق دیتی ہے مذہب نہیں دیتا۔ پادریوں اور واعظوں سے کہیں زیادہ معمولی لوگ اس کا علم رکھتے ہیں جن مثالوں یا قرائن سے قانون مکافات مترشح ہوتا ہے انہوں نے بھی اپنی کثرت و نیرنگی سے طبیعت پر کچھ ایسا قابو پالیا کہ بیداری تو درکنار خواب میں بھی انہی کی صورتیں پیش نظر رہنے لگیں۔ کھیت کھلیاں۔ سینے کا گھر، جنگیں میں رونق، کاریگر کے اوزار، بازاروں کا تجارتی بیوپار، آپس کی ملاقات، تعلقات، لین دین، خصومت کا اثر، انسان کی طبیعت اور اس کے جوہر، غرض کوئی چیز ایسی نہ تھی جس میں مکافات کا عمل پیدا اور ظاہر نہ معلوم ہوتا ہو۔ رفتہ رفتہ یہ مضمون ایسا معلوم ہونے لگا کہ اگر اس پر غور کیا جائے تو خدا کے نور کی جھلک اور کائنات کی روح جس طرح وہ اس وقت دنیا میں عمل کر رہی ہے انسان پر منکشف کی جا سکتی ہے۔ اور اس طرح منکشف کی جا سکتی ہے کہ اس کا دل عشق لازوال کی موجوں میں نہا کر بالکل صاف اور نکھرا نظر آنے لگے اور اس وجود بے ہمتا سے ہمکلام ہو جائے جسے انسان جانتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس لئے کہ اب موجود ہے۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ مسئلہ مکافات پر غور کرنے سے جیسے جیسے حسین و جمیل خیالات دل و دماغ میں وارد ہوتے رہتے ہیں اگر ان کے حسن کو کچھ بھی مشابہ صورت میں وہ سپرد قلم ہو سکے تو پھر وہ ایسے نورانی ستارے ہونگے جو زندگی کی تاریک ساعتوں اور اس کے دشوار مرحلوں میں انسان کو گمراہ نہ ہونے دینگے۔

مضمون لکھنے کا قصد شاید ارادے کی منزل سے آگے نہ بڑھتا۔ لیکن ایک دن گرجا میں پادری کا وعظ سننے کا اتفاق ہوا۔ اس دن سے قصد مصمم کر لیا کہ ضرور کچھ لکھوں گا۔ یہ پادری بڑا راسخ الاعتقاد عیسائی تھا اور اسی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اس کی بڑی عزت تھی۔ وعظ میں اس نے حشر و نشر، جزا و سزا کے مسئلے کو معمولی طریقے سے بیان کیا اور اس بیان میں یہ امر پہلے سے تسلیم کر لیا کہ جزا یا سزا کا حکم تو اعمال کرتے ہی فوراً ہو جاتا ہے لیکن جزا یا سزا کے حکم کی تعمیل اس دنیا میں نہیں ہوتی۔ بدکاروں اور شریروں کو دنیا میں کامیابی ہوتی ہے اور نیک بندے ہمیشہ تکلیف اور مصیبت میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد پادری نے عقلی دلائل اور انجیل کی عبارتوں سے ثابت کرنا چاہا کہ لوگ نیک ہوں یا بد، دونوں صورتوں میں اعمال کا اجر اس دنیا میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد ملیگا۔ جب وعظ ختم ہوا تو کسی نے اس کے برے بھلے ہونے کی نسبت کچھ نہ کہا اور سب چپ چاپ اٹھ کے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ پادری کی اس تعلیم سے کیا مراد تھی جس وقت اس نے کہا کہ اس دنیا کی زندگی میں جو لوگ نیک ہیں وہ ہمیشہ مصیبت میں رہتے ہیں، تو اس کہنے سے اس کا کیا مطلب تھا۔ کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ جائداد و املاک، بڑے بڑے محل، رتھ، عمدہ سے عمدہ رقیق لباس، ہاتھی گھوڑے، عیش و عشرت کے ساز و سامان صرف ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں جو کوئی اخلاقی اصول نہیں رکھتے۔ اور جو خدا کے بندے نیک اور پرہیزگار ہیں وہ ہمیشہ مفلس و ذلیل رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے حق میں جو کمی اس دنیا میں ہوئی ہے اس کی مکافات مرنے کے بعد کر دی جائے گی۔ اور یہ اس طرح کہ بروں کو جو نعمتیں یہاں میسر ہیں وہی نعمتیں اچھوں کو وہاں میسر ہو جائیں گی۔ مال و دولت ہوگا۔ کچھ درشنی ہنڈیاں ہونگی۔ کچھ قبالے اور ہبہ نامے ہوں گے۔ کھانے کے لئے شکار کا گوشت اور پینے کے لئے بادۂ ناب ہوگا۔ بجز اس قسم کے

معاوضے و مکافات کے یادی کا اور کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ اس کا یہ مطلب تو نہ ہو سکتا تھا کہ نیک بندے جب عالمِ بالا میں پہنچیں گے تو اُن کو حمدِ خدا میں مصروف رہنے کا حکم، انسان سے الفت رکھنے اور اُس کی خیر چاہنے کی اجازت مل جائے گی۔ کیونکہ ان چیزوں پر تو وہ اس عالم میں بھی عمل رکھ سکتے تھے۔ پس واعظ کا منشا، ایک سیدھی سادی طبیعت کا آدمی یہی سمجھ سکتا ہے کہ "ہم کو بھی وہی خوش وقتیاں مرنے کے بعد نصیب ہوں گی جو گنہگاروں کو اس دنیا میں نصیب ہیں"۔ یا اگر اس مضمون کو ذرا صاف کر کے کہئے تو یہ کہنا ہوگا کہ "تم اب گناہ کرتے ہو ہم آئندہ گناہ کریں گے"۔ ہم تو ابھی گناہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے لیکن بن نہ پڑا۔ آج گو دنیا میں ہمکو کامیابی نصیب نہیں ہوئی مگر اگلی کسر ہم کل نکالیں گے۔

یہاں سب سے بڑا مغالطہ اس بات کو باور کر لینے سے ہوا کہ بدکار اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں، اور انصاف اس زندگی میں نہیں ہوتا۔ سب سے بڑی نادانی واعظ کی یہ تھی کہ اس چیز کو جس سے حقیقی اور مردانہ کامیابی مراد تھی ٹال گیا۔ خریدار کو نافہم سمجھ کر جو جنس اصل تھی وہ اُس کے سامنے نہ لایا۔ بات اُٹھا رکھی۔ اس سے یہ نہ ہو سکا کہ کلمۂ حق کے بل بوتے پر دنیا کا مقابلہ کر کے نتیجہ ثابت کرتا۔ خدا کے سزا دینے اور یہ مقام پر موجود ہونے اور اس کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ کا اعلان کرتا اور اس طریقے سے بھلائی و برائی کامیابی اور کذب کے جانچنے کا معیار قائم کرتا، اور ماضی کو حال کی حالت میں طلب کر لیتا۔

یہی انداز میں آج کل کی مذہبی تصانیف میں جن کو بالعموم پسند کیا جاتا ہے دیکھ رہا ہوں۔ ارباب تصنیف و تالیف بھی جب اس مسئلہ پر کوئی مضمون لکھتے ہیں تو وہ بھی اسی اصول کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری عام پسند مذہبی تصنیفات نے بیان کی صفائی و شستگی میں تو بہت کچھ حاصل کیا ہے لیکن جن اصول یا خیالاتِ باطل پر وہ مرتب کئے جاتے ہیں اُن میں کوئی بات نفع کی حاصل نہیں کی۔ لیکن آدمی کتابوں سے بہتر ہیں۔ ان کی روزانہ زندگی دینیات کی غلطیاں دکھا دیتی ہے۔ عالی منش اور عالی ہمت طبیعتیں ذاتی تجربوں کی رو میں اصول کو پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔ اور سب لوگ بعض وقت اس کذب کو محسوس کر لیتے ہیں جس کو وہ دلیل و برہان سے ثابت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انسان جتنا جانتا ہے اُس سے زیادہ سمجھ رکھتا ہے۔ جو کچھ درست پا کر جامع میں سنتا ہے اور پھر اُس کا خیال تک نہیں کرتا۔ وہی اگر گفتگو میں اُس سے کہا جائے تو حالتِ سکوت اور تنہائی میں غور کر کے اس پر دل میں سوال کرنے لگتا ہے۔ اگر کوئی شخص مختلف العقائد لوگوں کے مجمع میں خدا کی حکمت اور اس کی کارسازی اور اُس کے احکام پر تقریر کرتا ہے تو سننے والوں کی طرف سے اس تقریر کا جواب سوائے خاموشی کے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک مبصر سمجھ جاتا ہے کہ انکو اس تقریر سے اطمینان نہیں ہوا لیکن وہ خود بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنا کوئی بیان پیش کر سکیں۔

میں یہاں اور آگے کی تقریر میں چند واقعات بیان کروں گا جو قانونِ مکافات کے رموز ... [illegible] ... توقع سے زیادہ خوش ہوں گا اگر اس وسیع دائرے کا چھوٹے سے چھوٹا قوس کسی کو بہت صحیح صحیح رسم پا گیا۔

قوائے متضاد یعنی عمل و ردِ عمل فطرت کے تمام اجزا میں عام ہے۔ نور و ظلمت میں حرارت و برودت میں، سمندر کے مد و جزر میں، عورت و مرد میں، حیوانات و نباتات کے تنفس میں کہ ہوا کو اندر لاتے اور باہر نکالتے ہیں۔ دل کے انقباض و انبساط میں۔ مائیات اور اصوات کے تموج میں کہ ہر موج میں نشیب بھی ہے اور فراز بھی۔ حرکتِ دوری کے مائل المرکز اور دافع المرکز کششوں میں۔ قوتِ کہربائی اور ربطِ کیمیائی میں۔ قوتِ مقناطیسی اگر سوئی کے ایک سرے پر پیدا کی ہے تو مخالف قوت دوسرے سرے پر پیدا ہو گئی ہے۔ ایک سرے میں اگر جذب ہے تو دوسرے میں دفع کی قوت آ گئی ہے۔ ایک جگہ خالی کرنا دوسری جگہ بھرنا ہے۔ غرض اس ازلی دوئی اور ... [illegible] ... ہر شے نصف ہے۔ اور اپنے دوسرے نصف کے ذہن کو منتقل کرتی ہے۔ تاکہ دونوں نصف مل کر ایک ہو جائیں ... [illegible] ... جفت و طاق ... [illegible] ... اندر اور باہر

اُوپر اور نیچے، حرکت اور سکون، ہاں اور نہیں۔

جبکہ کُل عالم میں دوئی ہے تو دوئی اس کی ہر چیز میں بھی ہے۔ اشیا کا پورا نظام ہر ذرہ میں بھی اُسی طرح پیدا ہے جیسے کہ وہ کُل میں ہے۔ زن و مرد میں، پانی کے اُتار چڑھاؤ میں، دن اور رات کے تغیر میں جو چیز موجود ہے اُسی کے مشابہ چیز درخت کے تنے، اناج کے دانے اور انواع حیوانات کی ہر فرد میں نظر آتی ہے۔ عناصرِ عالم میں جو عمل بڑی شان سے ہوتا رہتا ہے وہی چھوٹی سے چھوٹی مخلوق کے مختصر جسم میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً علمائے حیوانیات نے ثابت کیا ہے کہ کوئی حیوان ایسا نہیں جس کے ساتھ فطرت نے کوئی خاص رعایت یا طرفداری کی ہو۔ اس کی ہر خوبی اور عیب کی مکافات کر کے توازن قائم رکھا ہے۔ اگر ایک عضو میں زیادتی کی ہے تو دوسرے میں کمی کر دی ہے۔ اگر سر بڑا اور گردن لمبی بنائی ہے تو دھڑ اور ہاتھ پاؤں چھوٹے کر دئے ہیں۔

یہی دوئی انسان کی فطرت اور حالت میں بھی ہے۔ ہر زیادتی کمی پیدا کرتی ہے اور ہر کمی زیادتی کا سبب ہوتی ہے۔ ہر شیرینی تلخی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اور ہر بُرائی اپنے ساتھ ایک بھلائی بھی رکھتی ہے۔ ہر قوت جو آخذِ لذت ہے جس قدر صرف بیجا کی مرتکب ہوتی ہے اتنا ہی نقصان اُٹھاتی ہے۔ اگر اعتدال نہیں رکھا ہے تو جان کی سلامتی کی ذمہ داری اس کے سر ہے۔ ہر تیز عقل کے ساتھ ایک تیز حماقت بھی ہے۔ جو کچھ کھویا ہے اس کے بدلے کچھ پایا ہے۔ جو کچھ پایا ہے اس کے بدلے کچھ کھویا ہے۔ اگر دولت بڑھ گئی ہے تو اس کے مصرف بھی بڑھ گئے ہیں۔ اگر دہقان نے خرمن زیادہ جمع کر لیا ہے تو قدرت نے جو کچھ دیا تھا اس میں سے کچھ کم بھی کر دیا ہے۔ بلکہ بڑھانے سے اور مالک کو مار ڈالا ہے۔ قدرت کو مستثنیات سے نفرت ہے۔ اور کسی چیز پر فرد کا قبضہ بلا شرکتِ غیرے نہیں رہنے دیتی۔ سمندر کی موجیں اونچی سے اونچی اُٹھ کر ہموار سطح کو اس قدر جلد تلاش نہیں کرتیں جس قدر کہ انسانی حالتوں کی مختلف صورتیں جلد ایک ہی صورت اختیار کرنا چاہتی ہیں۔ فطرت میں وہ ہموار کرنے والے ذریعے ہمیشہ سے موجود چلے آتے ہیں، جو غرور، قوت، دولت اور حشمت والوں کو اسی سطح پر لے آتے ہیں جو اوروں کو حاصل ہے۔ اگر سوسائٹی میں کوئی شخص نہایت وحشی، تندخو، زشت مزاج ثابت ہوتا ہے، قزاقوں اور رہزنوں کے سے انداز رکھتا ہے تو خدا اس شخص کو بہت سی اولاد دیتا ہے۔ اب اس اولاد کی محبت، اس کی بیوی کی فکر، دکھ ماندگی کا خوف اس کی ساری بدخوئی سختی اور درشتی کو دُور کر دیتے ہیں۔ کوہسار کے چٹانوں میں جہاں فطرت نے سنگِ خارا کی رگیں پھیلائی ہیں وہاں نرم اور قیمتی جواہرات کی تحریریں بھی نظر آتی ہیں۔ کہیں کی مثل ہے کہ "جہاں سے قدرت ریچھ نکالتی ہے وہیں بھیڑ کا معصوم بچہ بھی بند کرتی ہے۔" اور ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھتی ہے۔

زمیندار سمجھتا ہے کہ حکومت اور منصب اچھی چیز ہے۔ لیکن صدرِ حکومت سے پوچھیے کہ اس حکومت کی کیا قیمت دینی پڑتی ہے۔ اور اپنی اس صدارت کو بحال رکھنے کے لئے اُن وزراء کے سامنے کیونکر پیشانی رگڑنی پڑتی ہے۔ جو فی الحقیقت سلطنت اور حکومت کے مالک ہیں مگر خود بھی تخت کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ اگر انسان اپنی قدرتی فراست اور کیاست کے جوہر دکھانے کی خواہش رکھتا ہے تو یہ چیزیں بھی نقصان سے محفوظ نہیں۔ جو شخص اپنی اولوالعزمی اور روشن ضمیری کی وجہ سے بڑا آدمی مانا جاتا ہے اور اپنی بزرگی کی بنا پر ہزار ہا آدمیوں کو نظر انداز کر کے اُن سے بے رُخی دکھاتا ہے اُس کو بھی اپنے اس قصور کا جواب دینا ہے۔ ہر روشنی کی رو کے ساتھ کچھ خطرے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اگر قلب میں نور کی طغیانی ہوئی ہے تو اس کی تصدیق کی زحمت اُٹھانی ہوگی۔ ذوق کشف و القا میں جس سے قلب ہر آن میں فیضیاب ہوتا رہے گا۔ اس ہمدردی اور محبت سے جو اب تک باعثِ اطمینان اور تسلی ہوئی تھی مفارقت کرنی ہوگی۔ پھر ضروری ہوگا کہ ماں باپ سے، بیوی بچوں سے نفرت کرنے لگے۔ کیا اس حالت میں ایسے شخص کو وہ سب کچھ مل گیا جس کی دُنیا قدر کرتی ہے یا جس کی دُنیا تعریف کرتی ہے؟ نہیں۔ دُنیا کی تعریف کا وہ مستحق ہوگا۔ اور

حق کیلئے اتنی وابستگی ہیں وہ دُنیا کو نہ دیگا۔ اور دنیا اسکو ضرب المثل بناکر اس پر معترض رہیگی۔

مکافات۔ وہ بڑا قانون ہے جس نے ملکوں اور قوموں کے قوانین وضع کرائے ہیں۔ جو غرض و غایت اس قانون کی ہے اس میں کوئی چیز سرمو فرق پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کے خلاف کوئی قانون یا ضابطے کی بنا ڈالنی یا اس سے سرکشی کرنی یا اس کے خلاف کوئی تحریک پیدا کرنی عبث ہے۔ اشیا بدنظمی کی حالت میں زیادہ نہیں رہ سکتیں۔ آج جو ایک نئی خرابی پیدا ہوئی ہے گو اس وقت اس کا کوئی علاج اور تدارک نظر نہیں آتا مگر تدارک موجود ہے اور وہ ظاہر ہوگا۔ اگر حکومت ظالم ہے تو صاحب حکومت کی جان کی سلامتی نہیں۔ اگر محصول زیادہ لگایا ہے تو حاصل ملک گھٹ کر صفر رہ جائے گا۔ اگر تعزیرات کا قانون سخت ہے تو جیوری ملزم کو مجرم نہ قرار دے گی۔ کوئی چیز جس میں زیادتی اور تحکم بے جا ہے کوئی چیز جس میں تعصب ہے اسے استقلام نہ ہوگا۔ اگر قانون نرم ہے تو خود ری یا انتقام کے درپے ہو جائے گی۔ اگر حکومت مطلقاً جمہور کے قبضے میں ہے تو رعایا کی جان پر وہ دباؤ پڑے گا جس سے اس کی حدت بڑھ جائے گی۔ اور انسان کو اس طرح زندہ رہنا پڑیگا جیسے آگ جلتی ہے۔ غرض انسان کی صحیح زندگی اور اس کا اطمینان تو یہ ہے کہ شدت کی مشکلوں اور افراط کی آسائشوں سے بچے۔ اور ہر قسم کے حوادث و حالات میں استغنا اور اعتدال کی شان اختیار کرے۔ ہر طرز اور قسم کی حکومتوں میں انسانی طبیعت کا اخلاقی اثر ایک سا رہا ہے۔ ٹرکی[1] کی شخصی سلطنت میں بھی یہ اثر اسی درجے پر ہے جس درجے پر نیو انگلینڈ کی جمہوری حکومت میں ہے اور تاریخ کے صفحے نہایت عدل و انصاف کے ساتھ بتاتے ہیں کہ فراعنۂ مصر کی قدیم سلطنتوں میں بھی انسان کو اس حد تک آزادی حاصل تھی جس حد تک تعلیم و تربیت نے اُسے آزاد بنایا تھا۔

یہی مثالیں ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ کُل کائنات اپنے ہر ذرّے میں پیدا ہے۔ فطرت میں ہر شے وہی طاقت رکھتی ہے جو کُل فطرت کی ہے۔ ہر شے ایک [illegible] پیدا ہوئی ہے جس سے خلق ہے۔ علم حیوانات کا ماہر ہر حیوانی صورت میں ایک ہی ٹائپ دیکھ لیتا ہے۔ اور گھوڑے کو دوڑتا ہوا مچھلی کو تیرتا ہوا پرند کو اڑتا ہوا درخت کو زمین سے اُگا ہوا انسان سمجھتا ہے۔ ہر نئی صورت میں وہ ایک ہی ٹائپ کی خصوصیات کو تکرار کے ساتھ نہیں دیکھتا بلکہ ہر ٹکڑے میں تفصیل کے ساتھ اُس کے مقاصد اس کے ارتقا اور ارتقا کی رکاوٹوں یہاں تک کہ اُس کے مکمل نظام کو وہ پاتا ہے جو ٹائپ کی ہر مثال کے نظام کا ہے۔ ہر ایک پیشہ اور ہنر تجارت اور کاروبار عالم کا ایک مختصر نمونہ ہے۔ اور یہ سب ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ان میں ہر ایک پوری علامت انسان کی زندگی اور اُس کے حسن و قبح کی علامت ہے۔ اسی زندگی کی آزمائشوں تکلیفوں اور عداوتوں کی، اور اسی زندگی کے دوران اور انتہا کی اور ان میں سے ہر ایک پر لازم ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے اپنی صورت میں انسان کی صورت کو پھر پیدا دکھائے اور اس کے نوشتۂ تقدیر کو پڑھکر سنا دے۔

کُل کائنات بوند بنکر شبنم کے قطرے تک میں سما جاتی ہے۔ خوردبین آج تک کوئی چھوٹے سے چھوٹا جانور بھی ایسا دریافت نہ کر سکی جو محض صفات کی وجہ سے نامکمل ہو۔ بصارت، ذائقہ، شامہ، حرکت، قوت مقابلہ، اشتہا، ترقی نسل کے اعضا جس کا قبضہ ازل سے ابد تک چلا جائے گا۔ ان سب کو چھوٹی سی چھوٹی جان میں بھی جگہ ملی ہے۔ اسی طرح ہم اپنے ہر عمل میں اپنی پوری لائف یا زندگانی کو دکھا دیتے ہیں۔ خدا کے ہر جگہ موجود ہونے کی حقیقت یہی ہے کہ وہ ظاہر ہے ہر برگ کاہ اور کائی کے ریشوں میں۔ مکڑی کے جالے اور اسکے تانے بانے میں۔ کائنات نے اپنی قیمت اپنے ہر ذرہ میں ڈال رکھی ہے۔ اگر نفع ہے تو نقصان بھی ہے۔ اگر قوت جاذبہ ہے تو دافعہ بھی موجود ہے۔ اگر زور ہے تو زور کی انتہا بھی ہے۔

اس طور پر یہ عالم زندہ ہے۔ سب چیزیں اخلاقی ہیں۔ وہ روح جو ہمارے اندر ہے وہی ایمان و اعتقاد ہے۔ ہم سے باہر وہ قانون ہے۔ اندر جو وہ کہتی ہے وہی

---

[1] یہ مضمون سلطنت ٹرکی کے انقلاب سے بہت پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

کشف و الہام ہے۔ اور باہر تاریخ کے دفتر ہیں جن میں ہم اس کی مہلک قوت کو دیکھتے ہیں۔ اس روح میں سب قدرت رکھی گئی ہے۔ تمام فطرت کو اسکے قبضہ اور قوت کا احساس ہے۔ یہ روح تمام عالم میں ساری ہے اور عالم کو اسی نے وضع کیا ہے۔ وہ ابدی و ازلی ہے اور زمان و مکان میں عامل ہے۔ انصاف میں التوا نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں نصفت کامل اپنی میزان کو درست رکھتی ہے خدا کے پاسوں میں سیسہ بھرا ہے۔ جس طرح چاہے پھینکو ایک ہی عدد نکلتا ہے۔ یہ کائنات حساب کا ایک پہاڑا ہے یا معدلات کا ایک سوال ہے۔ مقداروں کو جس طرح چاہے الٹو پلٹو ادھر کا ادھر رکھو توازن ہر حال میں اپنے کو قائم رکھتا ہے۔ کسی مجہول مقدار کو لے لو اس کی جو قیمت ور حقیقت ہے اس سے زیادہ نہ کم ہر صورت میں تمہیں حاصل ہو جائے گی۔ ہر راز افشا ہوتا ہے۔ ہر جرم کی سزا اور نیکی کی جزا اخیر ملتی ہے۔ ہر ایک بے انصافی یا بدسلوکی جو کسی کے ساتھ کی گئی چپ چاپ اور لازمی طور سے اس کا انصاف یقینی ہے۔ جس چیز کو ہم مکافات کہتے ہیں وہ ایک عالمگیر ضرورت ہے اور اس کی وجہ سے جہاں جزو ظاہر ہوتا ہے وہاں کل بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ اگر دھواں نکلتا دیکھا ہے تو وہیں آگ بھی ہو گی۔ اگر کوئی کٹا ہاتھ یا پاؤں پڑا دیکھا ہے تو تم جانتے ہو کہ دھڑ بھی وہیں کہیں چھپا ہو گا۔

ہر فعل اپنی مکافات خود حاصل کر لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ مکافات دو شکلوں میں ظاہر ہو کر مکمل ہوتا ہے۔ پہلی شکل تو یہ ہے کہ وہ نفس فعل یا انسان کی فطرت حقیقی میں ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ کسی شے یا فطرت خارجی میں وہ نمایاں ہو۔ لوگ عموماً اس دوسری شکل یعنی مکافات کے خارج میں ظاہر ہونے کو فعل کا معاوضہ یا پاداش سمجھتے ہیں۔ لیکن اصل مکافات اس کام میں خود پیدا ہے اور اس کی تمیز نفس ناطقہ کرتا ہے۔ خارج کی مکافات کو معمولی ادراک معلوم کرتا ہے۔ فعل سے وہ جدا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بسا اوقات یہ مکافات ایک بڑی مدت پر پھیلا ہوتا ہے اور جب تک کچھ برس نہیں گزر لیتے ظاہر نہیں ہوتا۔ جو جرم آج کیا ہے شاید ایک مدت کے بعد اس کی سزا میں بدن پر بدھیاں ابھریں مگر ابھریں گی ضرور، کیونکہ سزا جرم میں موجود ہے۔ جرم اور سزا ایک ہی شاخ سے پھوٹے ہیں۔ سزا وہ پھل ہے جسے کذب و فریب کے پھولوں نے اپنی سوکھی پنکھڑیوں میں چھپا کر آنکھ سے اوجھل کر رکھا تھا۔ لیکن پھل اندر ہی اندر چپکے چپکے پکتا چلا آیا۔ سبب و مسبب، تخم و ثمر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے کیونکہ سبب میں مسبب پہلے ہی جھلک رہا ہے۔ تخم میں ثمر پہلے ہی سے موجود ہے۔

غرض جب کہ عالم اپنے کو سالم اور بسیط رکھنا چاہتا ہے اور اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ تراش کر اس کے ٹکڑے کئے جائیں۔ ہم اس ادھیڑبن میں رہتے ہیں کہ جو کام کریں اس میں تقسیم و تفریق کو عمل میں لائیں اور اپنی کسی خاص غرض کیلئے اس کو اپنے مطلب کا بنالیں۔ مثلاً نفس کی خواہش سے حظ اٹھانے کے لئے ہم لذائذ نفس کو اخلاق کو الفت سے جدا کرتے ہیں۔ انسان کی ذہانت اور لیاقت صرف ایک ہی سوال کا حل کرنے میں صرف ہوئی ہے اور وہ یہ کہ شہوانی لذت شہوانی طاقت شہوانی حسن کو اخلاقی لذت اخلاقی طاقت اخلاقی حسن سے جدا کر لے یعنی کسی جسم کے اوپر اوپر کی سطح کو اس طرح تراش لے کہ اسکے ٹکنے کو بنیاد نہ رہے۔ کسی چیز کا ایک سرا ہاتھ آجائے۔ دوسرے سے بحث نہ ہو۔ روح کہتی ہے کہ زن و شو ایک ہی جسم اور ایک ہی جان ہو نگے مگر جسم صرف جسم کو ایک ہونے دیتا ہے۔ روح حکم دیتی ہے کہ تمام چیزوں پر نیکی کی غرض سے قبضہ کر لیکن جسم صرف اپنے ہی مقاصد کیلئے قبضہ کرنا پسند کرتا ہے۔

روح کوشش بلیغ کرتی ہے کہ زندہ رہے اور تمام چیزوں پر عمل کرتی رہے۔ واقعہ اور اصلیت وہی ہو۔ باقی تمام چیزیں اس میں شامل کی جائیں، قوت، لذت، علم، حسن یہ سب اس میں جمع رہیں۔ یہ خاص شخص چاہتا ہے کہ میں کچھ ہو جاؤں۔ اپنے لئے کوئی بڑی بات پیدا کروں۔ ذاتی نفع کے لئے دوسروں سے سودا کروں۔ جھک جھک کر کے کچھ خریدوں کچھ بیچوں۔ گھوڑے پر سوار ہوں اس لئے کہ شہسوار نظر آؤں۔ پہنوں اس لئے کہ خوش لباس اور جامہ زیب معلوم ہوں۔ کھاؤں اس لئے کہ خوب کھاؤں۔ حکومت کروں اس لئے کہ لوگ دیکھیں۔ لوگ چاہتے ہیں کہ بڑے آدمی بن جائیں دولتمند ہو جائیں، طاقت ور ہو جائیں۔ شہرت اور نام حاصل ہو لیکن وہ بڑائی اور بزرگی اس میں سمجھتے ہیں کہ فطرت کے صرف ایک پہلو کو فقط اسکے ایک رخ کو

جو شیریں ہے لے لیں اور دوسرے رخ کو جس میں تلخی ہے چھوڑ دیں۔

لیکن انسان کی اس قطع و برید میں رد عمل برابر جاری رہتا ہے آج تک دریہ بنا پڑے گا کہ اس وقت تک کی منصوبے گر گوا پنے منصوبے اور کسی چالاکی کو اپنی چال میں ذراسی بھی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ پانی کو کاٹتا ہے لیکن ہاتھ آگے بڑھتا جاتا ہے اور پانی پیچھے ملتا جاتا ہے۔ خوشی کی چیزوں میں سے صرف خوشی، نفع کی چیزوں میں سے صرف نفع، قوت کی چیزوں میں سے صرف قوت، جہاں جدا کرنا چاہو گے یعنی جزو کو اس کے کل سے قطع کرو گے نہ خوشی رہے گی نہ نفع رہیگا نہ قوت رہے گی۔ کسی جزو کو کاٹ کر اس میں سے صرف نفس کی لذت کو جدا کرنا ایسا ہی عبث ہے جیسے کسی ایسی چیز کو تلاش کرنا جس کا اندر کا رخ تو ہو باہر کا رخ نہ ہو۔ کوئی ایسی روشنی ملجائے جو نور ہی نور ہو اور اس سے سایہ نہ پڑتا ہو۔ فطرت دبی ہو گی اور دو تکو پھر وہیں لے آئیگی جہاں سے چلے تھے۔ تم اسکو بھگاتے ہو اور وہ تمہارے پیچھے پیچھے چلی آتی ہے۔

زندگی نے چند ضروری شرائط سے اپنے تئیں مشروط کر رکھا ہے جو لوگ ان سے وہ ان شرائط کو نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں اور جیسے اب تو کہتے ہیں کہ ہم ان سے واقف نہیں۔ ہم پر وہ عائد نہیں لیکن یہ [illegible] سے [illegible] اور [illegible] زندگی [illegible] بھی بڑی سخت اور امٹ ہیں کہ اگر ایک وار ان کا کسی طرف سے چا [illegible] ہو گئیں۔ اگر مکافات کی ظاہری شکل یعنی خارج میں پاداش سے بچ گیا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ مجرم نے اپنی جان [illegible] زندگی اپنی [illegible] کا [illegible] مقابلہ کیا اور بیا خود چور بنا۔ اپنی خودی سے بھاگا اور یہ مکافات وہ ہے جو موت نیستی اور نابودی سے بھی بڑھکر زشت و زبون ہے۔ تمام کوششیں جو اس نیت سے کی جاتی ہیں کہ کسی فعل میں اس کے نفع کو اس کے نقصان سے جدا کر لیا جائے تو عام اس سے کہ اس میں ظاہری مکافات کیا ہو ہمیشہ اس درجے ناکافی ہوتی ہے کہ اس کا دوبارہ تجربہ کرنا دیوانگی ہے کم ثابت نہیں ہوا ہے۔ جہاں انسان کی نیت میں اس سرکشی اور قطع برید کا مرض شروع ہوا تمام عقل مریض ہو جاتی ہے اور انسان اسی وقت سے خدا کو اس عالم اور اس کی ہرشے میں دیکھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ خدا کو وہ اب نہیں دیکھتا بلکہ اشیا میں اس کو صرف وہی دلفریبی نظر آتی ہے جو لذتوں سے محظوظ کرنے والی ہے۔ جو نقصان ان لذتوں میں مخفی ہے وہ اس کی نظر سے چھپ جاتا ہے۔ گویا سمندر کی سطح سے پانی کی پری ننگے گلے بال بکھرے کمر تک باہر نکلی دیکھتا ہے مگر وہ مچھلی کا دھڑ یا اژدہے کی دم جو نیچے لگی ہے وہ اسے نہیں سوجھتی۔ انسان سمجھتا ہے کہ جس چیز کو اس کا جی چاہتا ہے اس چیز کے ایسے حصہ سے علیحدہ کر لے جس کو جی نہیں چاہتا لے سکتا ہے۔ مگر کیسا بڑا راز ہے تو وہ جو آباد ہے سب سے اونچے آسمانوں پر عالم سکوت میں۔ ائے تو ہی اکیلے بڑے خدا جس نے اپنی دائم اور مستقل حکمت سے چھڑک رکھی ہیں شب کوریاں ان کی آنکھوں کیلئے جو دل میں نفس کی بری خواہش رکھکر انکو روکنا نہیں چاہتے۔" (مقدمہ سنٹ اگسٹائین)

انسان کی روح انہی واقعات کی تصدیق قصہ و داستان ہے۔ قوموں کی سرگذشت اور سلطنتوں کے قوانین ہر ملک کی زبان اور اسکی ضرب الامثال سے بھی کرتی ہے۔ ادیبوں کی تحریریں ان واقعات کو اس طرح بیان کی کہ لکھنے والوں کو خبر تک نہ ہوئی کہ قلم سے کیا نکلا۔ یونان کے صنم پرست جوپیٹر کو عقل مطلق مانتے تھے لیکن ان کی مذہبی روایات نے چند قبیح افعال بھی اس سے منسوب کر رکھے تھے۔ پس اس عقل مطلق کا علاج اس طرح کیا گیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کو ایسا مجبور کیا کہ جیسے انگلستان کا کوئی بادشاہ ہو۔ پرومیتھوس جو علم و دانش میں سب آدمیوں سے فوق تھا جس نے آسمان سے آگ چرا لی تھی اور مٹی کے پتلے آدمیوں کے بنا کر اس آگ سے ان میں جان ڈالتا تھا جس کی وجہ سے جوپیٹر کا اس پر عتاب ہوا اور وہ گرفتار ہو کر کوہ قفقاز کی چوٹی سے باندھا گیا۔ اور گدھ مقرر ہوئے کہ اس کے کلیجے کو نوچ نوچ کر کھائیں۔ وہی مظلوم پرومیتھوس جوپیٹر کے ایک ایسے راز سے واقف ہے کہ جوپیٹر کو مجبور ہو کر اس سے مصالحت کرنی پڑی گی۔ اسی طرح می نروا اثرانی کی دیوی بھی جوپیٹر کا ایک راز جانتی ہے

جوپیٹر اس فکر میں ہوتا ہے کہ برق و رعد سے اپنے دشمنوں کو غارت کردے مگر مجبور ہے۔ جہاں یہ برق و رعد رکھے ہیں اُس کی کنجی منروا کے قبضے میں ہے۔ ان افسانوں سے ظاہر ہے کہ وہ جو کل ہے اپنے اخلاق اور خو کے سبب یہاں بھی عمل کر رہا ہے۔ ہندوستان کی اصنام پرستی بھی انہی اخلاقی اصول پر مبنی ہے۔ کیونکہ صنم پرستی کا کوئی افسانہ اس وقت تک ایجاد و قبول نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس سے کوئی صریح اخلاقی نتیجہ نہ نکلتا ہو۔ ارودا صبح کی دیبی جس کی انگلیاں برگ گل سے زیادہ نازک ہیں جن کے پوروں سے شبنم کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ اس دیبی نے اپنے شوہر کیلئے عمرِ جاوید تو مانگ لی لیکن جوانی کو مانگنا بھول گئی۔ پس شوہر زندہ تو رہیگا مگر ہمیشہ بوڑھا ہوتا جائے گا۔ یونان کا مشہور شجاع اکیلیز ایسا نہیں ہے کہ وہ کبھی مغلوب نہ ہو سکے۔ کیونکہ جب اُس کی ماں نے ملک فنا کی سرحد پر تحت الثریٰ کے دریا میں غسل دیا تھا تو ایک پاؤں پکڑ کر غوطہ دیا تھا۔ سارا بدن تو تر ہوا لیکن پاؤں کی ایک ایڑی خشک رہ گئی۔ پس اسی ایڑی میں اس کی جان ہے۔ سگفرید بھی موت سے محفوظ نہیں۔ کیونکہ جب دیو کو مار کر اس کے خون میں نہایا تھا تو پیٹھ پر ایک پتا آن پڑا تھا۔ جہاں یہ پتہ گرا وہاں دیو کا خون نہ لگا۔ اس لئے یہ جگہ بے دی رہی جہاں صدمہ پہونچنے سے وہ ہلاک ہو سکتا ہے۔ اور ایسا ہی ہونا ضروری تھا کیونکہ مثل مشہور ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی کوئی چیز ایسی نہیں جس میں ایک آدھ درز نہ چھوڑ دی گئی ہو۔ یہ انتقام کی صورتیں بغیر معلوم ہوئے شعرائے قدیم کے نغموں سے بھی خود بخود پھوٹ نکلی ہیں۔ یہ نغمے وہ تھے جنہیں انسان اپنے جذبات کے جوش اور تصور کی بلند پروازیوں میں بیخود ہوکر بے قانون اور قید سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ یہ انتقام کی صورتیں کیا تھیں؟ وہی مکافات کے اصول تھے۔ تلوار کا پلٹا ہاتھ۔ توپ کا جھٹکا کرتے پیچھے کو ہٹنا۔ عمل اور ردّ عمل۔ یہ سب چیزیں بتاتی ہیں کہ مکافات کا قانون نہایت سخت اور مہلک ہے اور یہ کہ فطرت میں کوئی چیز مفت نہیں ملتی۔ فروخت ہوتی ہے۔

یہی وہ پرانا طریقہ اور مذہب ہے کہ جس میں نیمی سس دیوی کی پرستش ہوتی تھی۔ جس کا کام عالم کی نگہبانی تھا اور وہ کسی قصور کی سزا بغیر دئے نہ چھوڑتی تھی۔ نیمی سس کی کارپرداز قہر و عتاب کی دیبیاں تھیں جن کے متعلق یہ عالم تھا کہ اگر آفتاب بھی اپنی گردش میں راہ سے بے راہ ہو تو اس پر حد لگادیں۔ بڑے شاعروں نے لکھا ہے کہ پتھر کی دیواروں، فولاد کی تلواروں اور چمڑے کی پیٹیوں نے اپنے مالکوں سے اگر ان سے کوئی ظلم ہوا ہے خود انتقام لیا ہے۔ جو کمر بند ایجکس نے ہکٹر کو دیا تھا اسی کمر بند سے ہکٹر کی لاش اکیلیز کے رتھ سے باندھی گئی اور میدانِ جنگ میں گھسیٹی پھری۔ اور تلوار سے جو ہکٹر نے ایجکس کو دی تھی ایجکس کا کام تمام ہوا۔ جب کسی جانور کا مجسمہ اس کی یادگار میں نصب ہوا اور دشمن نے اسے توڑنا چاہا تو اُسے توڑنے میں دشمن بھی [illegible]

غرض ان قصوں میں بھی [illegible] تھا جو ان انسانوں کے موجد [illegible] کی قوت ارادی سے بالاتر تھا۔ مصنف کی تصنیف میں وہی حصہ ممتاز ہوتا ہے جس میں کوئی چیز اس کی اپنی نہ ہو جس کے پیدا ہو جانے کا علم اس کو خود نہ ہو جو اُس کی ایجاد سے نہ ہو بلکہ اس کے دل اور اس کی طبیعت سے خود بخود جیسے مسامات سے پسینہ نکلتا ہے پیدا ہو۔ یہ وہ چیز ہے جو کسی ایک ہنرمند کے ہنر میں صاف نظر نہیں آتی بلکہ جب بہت سے ہنرمندوں اور دانشوروں کے کاموں کو مطالعہ کرتے ہیں تو ان سے ایک جوہر لطیف کی طرح کشید کر لیتے ہیں۔ فیدیاس یونان کا مشہور صاحب کمال معمار اور بت تراش تھا۔ مگر مجھکو فیدیاس سے مطلب نہیں مجھے بحث اس کام سے ہے جو ایک خاص قدیم زمانے میں انسان سے عمل میں آیا تھا۔ فیدیاس کا دنیا میں سب سے بڑا ہونا اور نام پانا فن تاریخ کے لئے ایک عمدہ مضمون ہو لیکن نقاد و اہل [illegible] وہ نہیں ہے جو ہماری عقل کو دنگ کر دیتی ہیں۔ ہمیں جو کچھ دیکھنا ہے وہ یہ ہے کہ ایک وقت خاص میں انسان نے جو کام کرنا چاہا [illegible] یا یہ سمجھئے کہ انہوں نے

اُس کام کو ایک دوسری شکل کس طرح دیدی۔ اور یہی فیڈیاس، ڈانٹے اور شیکسپیر محض آلے اور اوزار تھے جن سے اُس زمانے میں انسان نے کام کیا تھا۔

ظاہر پرست اور پرشور دنیا جب کسی کو خود اُس کے الفاظ میں اپنا مفہوم ادا نہیں کرنے دیتی تو کہاوتوں سے وہ اپنا مطلب بلا خوفِ تناقض ادا کرتا ہے۔ اور مکافات جو قانون کا قانون ہے جس سے گرجا میں پادریوں کو سیاسی مجالس میں اہلِ سیاست کو مدرسوں میں اربابِ علم و فضل کو انکار ہے ہر وقت اور ہر آن دنیا کے بازاروں میں اور دنیا کی تمام زبانوں میں ضرب الامثال کے ذریعے بتایا اور سمجھایا جاتا ہے۔ اسکی تعلیم ایسی ہی سچی اور عام ہے جیسے ہوا کے پرندوں کی تعلیم سچی اور ظاہر ہے۔

ہر چیز دو چند ہے اور اس دو چند میں ایک کا مقابلہ دوسرے سے ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: "عوض معاوضہ گلہ ندارد"۔ "ادلے کا بدلہ" "آنکھ کے بدلے آنکھ" "دانت کے بدلے دانت" "پیار کے بدلے پیار" "دے اور تجھے دیا جائے گا" "سیراب کر سیراب ہوگا" "خدا پوچھتا ہے تجھے کیا چاہیئے؟ جو کچھ چاہیئے اس کی قیمت دے اور اُسے حاصل کر" "کوشش نہ کریگا حاصل نہ ہوگا" "جتنا کام اتنی ہی مزدوری" "زیادہ نہ کھا" "کام نہ کریگا روٹی نہ ملے گی" "نقصان کریگا نقصان اُٹھائیگا" "غلام کی گردن میں زنجیر کا ایک سرا ڈالے گا تو دوسرا اسی طرح تیری گردن کا طوق بنے گا" "بری نصیحت ناصح کو برباد کردیگی" "شیطان سب سے بڑا احمق اور گدھا ہے"۔

یہ کہاوتیں اس طرح لکھدی گئی ہیں جس طرح وہ پیش آئی ہیں۔ ہمارے اعمال پر قدرت کا قانون ہمارے ارادے سے بڑھکر مسلط ہے اسکا جانچنے پرکھنے والا ہے۔ ہم ایک چھوٹا سا کام ایسے کاموں سے علیحدہ ہوکر جو عام خلائق کے حق میں مضر یا مفید ہوں کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے کام کا بُرا یا بھلا اثر کسی پر نہ ہوگا۔ لیکن قانونِ فطرت ایسا قوی دست ہے کہ جس طرح مقناطیسی قوت تمام دنیا کے قبلہ نماؤں کی سوئیوں کو خواہ اُن میں کتنا ہی انحراف پیدا کیا جائے آخرالامر خطِ قطبین پر لے آتی ہے۔ اس لئے ہمارا وہ چھوٹا سا کام بھی اُن کاموں میں شامل ہو جاتا ہے جو تمام عالم پر اچھا یا بُرا اثر رکھتے ہیں۔

انسان جب کوئی بُرا لفظ مُنہ سے نکالتا ہے تو وہ اپنے حق میں ایک فیصلہ سُناتا ہے۔ اپنی مرضی سے یا مرضی کے خلاف جو بات زبان سے نکلتی ہے اس میں اپنی تصویر مخاطب کے سامنے کھینچتا ہے۔ ہر ایک رائے صاحبِ رائے پر پلٹ کر اثر کرتی ہے۔ گویا تاگوں کا گولہ ہے نشانے پر مارا ہے لیکن ایک سرا اس کا اپنے ہی کپڑوں میں اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ کشتی میں بیٹھے ہیں برچھی کا پھل رسی میں باندھکر وہیل مچھلی کو نشانہ بنایا ہے اگر برچھی کا پھل تیز نہیں ہے اور زخم کاری نہیں ہوتا تو یا تو کشتی بان رسی میں اُلجھکر زخمی ہوگا یا کشتی اُلٹ جانے کا اندیشہ ہوگا۔ تم کوئی بدسلوکی اور ظلم دوسرے کے ساتھ نہیں کر سکتے جو تمہارے ہی حق میں بدسلوکی اور ظلم نہ ہو جائے۔ برک کا قول ہے کہ کسی انسان میں آج تک کوئی بات غرور کی ایسی نہیں پائی گئی جو خود اُس کے حق میں مضر نہ ثابت ہوئی ہو۔ جتنے مغرور [illegible] نئے فیشن تراشتے ہیں جتنے مغرور نے کا لطف جاتا رہا۔ جنت اور دوزخ والوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ [illegible] جنت [illegible] پر بھی وہ بند ہو جائے گا۔ اگر کسی نے آدمیوں کو شطرنج کے مہروں یا پچیسی کی گوٹوں کی طرح بے حقیقت سمجھا ہے تو وہ خود بھی بے حقیقت سمجھا گیا ہے۔ اگر دوسروں کی پروا نہیں کی ہے تو اپنی پروا سے بھی ہاتھ کھینچنا پڑا ہے۔

سوشل تعلقات میں جب دوستی اور انصاف کے خلاف کسی سے کوئی بات عمل میں آتی ہے تو اُسکی سزا بھی فوراً مل گئی ہے۔ یہ سزا خوف کے پیدا ہونے سے ملتی ہے جس وقت تک میں اپنے ہمجنسوں سے سچے اور سادے تعلقات رکھتا ہوں مجھے اُن سے ملنے میں کوئی سبب ناخوشی کا نہیں ہوتا ہم دونوں اس

طرح ملتے ہیں جیسے زمین پر پانی سے پانی اور آسمان پر ہوا سے ہوا مل کر ایک دوسرے میں سما جائے۔ لیکن جہاں اس سچائی اور سادگی سے علیحدگی اختیار کی اور ایسے نفع اور بھلائی کی امید کی جو دوسرے کا نفع اور بھلائی نہیں ہے تو دوست اس بات کو تاڑ جاتا ہے۔ پھر وہ مجھ سے اُس حد تک رُکنے لگتا ہے جس حد تک میں اُس سے رُکا تھا۔ اب میری اُس کی آنکھیں چار نہیں ہوتیں۔ اَب مجھ میں اور میرے دوست میں لڑائی ہے۔ نفرت اُسکے دل میں اور خوف میرے دل میں۔

اسی طرح سوسائٹی کی بُرائی خرابیاں چاہے چھوٹی ہوں یا بڑی عام ہوں یا خاص، دولت اور اختیارات کا بیجا طریقوں سے فراہم کرلینا اس کا انتقام بھی اسی طور پر لیا جاتا ہے۔ مکر و فریب چالاکی کا سب سے بڑا معلم "خوف" ہے۔ اور یہی خوف تمام انقلابوں کا نقیب ہوتا ہے۔ سب سے بڑی چیز جو وہ بتاتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں کہیں خوف ہوگا وہاں خرابی بھی ضرور ہوگی۔ خوف ایک مُردار خور پرند ہے ہمیں نہیں معلوم وہ کس چیز پر اِس وقت منڈلا رہا ہے لیکن ضرور ہے کہ آس پاس کہیں کوئی لاش پڑی سڑتی ہوگی۔ ہمارا مال، ہمارا قانون، ہمارے زمیندار سب خوفزدہ ہیں۔ خوف نے برسوں سے بلکہ قرنوں سے ہماری حکومت اور سارے مال پر تصرف کر رکھا ہے یہ منحوس پرندہ ہمارے سر پر یونہی چکر نہیں کاٹتا۔ یہ بتلاتا ہے کہ بہت سی بدسلوکیاں کی گئی ہیں، اور بہت ہی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کا حساب دینا اور سدباب کرنا ہے۔

اسی طرح کا خوف اُس انقلاب اور تغیر کے انتظار میں پایا جاتا ہے جو کسی کام کو ختم کرتے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ نصف النہار کے مطلع روشن میں طوفان کا خطرہ۔ بہار میں خزاں کا اندیشہ۔ ثروت میں عسرت کا خوف اور وہ فطری احساس جس سے ہر فیاض طبیعت اپنے اوپر ایثار، شریفانہ نفس کشی اور بے صلہ نیکی کرنے کو لازم کر دیتی ہے۔ یہ سب کیا ہیں؟ یہ سب اُس میزان عدل کی لرزشیں اور جنبشیں ہیں جو انسان کے قلب میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

دنیا کے آزمودہ کار جانتے ہیں کہ اِس سفرِ حیات میں جو چیز حاصل کی جائے اُس کی قیمت پوری پوری ادا کر دینی ضروری ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بسا اوقات ادنیٰ چیز کیلئے بھاری قیمت دینی پڑتی ہے۔ قرضدار دوسرے سے قرض لیکر اپنے ہی قرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ کیا اس شخص نے کوئی نفع پایا ہے، جس نے دوسرے سے صدہا فائدے اٹھا کر خود کسی کو فائدہ نہیں پہونچایا۔ اگر کاہلی اور بیکاری میں اپنے ہمسایہ سے اُسکی چیزیں اس کے گھوڑے یا اس کا روپیہ مانگتا ہے تو کیا اس سے کوئی فائدہ ہوا ہے؟ ہرگز نہیں۔ جس وقت کوئی چیز دوسرے سے لی فوراً ایک طرف نفع حاصل کرنے کا اعتراف اور دوسری طرف قرض کی تکلیف شروع ہوگئی۔ ایک احساس اپنے ادنیٰ اور دوسرے کے اعلیٰ ہونیکا پیدا ہوگیا۔ معاملہ قرض لینے اور قرض دینے والے کے حافظے میں محفوظ ہے اور ہر نیا معاملہ اُن کے تعلقات میں اپنی نوعیت کی نسبت سے تغیر پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ اس وقت ہمسائے کا احسان اُٹھایا ہے۔ لیکن غالباً بہت جلد خیال ہوگا کہ بہتر تھا ٹانگیں ٹوٹ جاتیں مگر ہمسایہ کی گاڑی میں نہ بیٹھتا۔ اب سمجھ میں آیا کہ زیادہ سے زیادہ قیمت کسی شے کی اس شے کیلئے سوال کرنا ہے۔

ایک عقلمند اسی سبق کو زندگی کے ہر شعبہ پر عائد کر کے پیش نظر رکھے گا اور سمجھے گا کہ بہترین طریقہ یہی ہے کہ حقدار کا حق دیا جائے! اور دوسرا شخص جو دعویٰ از روئے انصاف دوسرے کے وقت اور دل و دماغ پر کرے اس دعوے کو تسلیم کر کے وا ادا کرے۔ ہمیشہ جو قرض لیا ہے اُسے بیباق کرو۔ کیونکہ اب یا آیندہ ہر حال میں تمہیں اپنا پورا قرض ادا کرنا ہے۔ شاید ایسے واقعات پیش آئیں یا ایسے لوگ پیدا ہوں جو تم میں اور انصاف میں حائل ہوجائیں۔ لیکن یہ تھوڑے وقت کی بات ہوگی۔ کم سے کم اپنے قرض سے فارغ ہوجاؤ۔ اگر ہوشمند ہو تو اس دولت و ثروت سے ڈروگے جو زیادہ ہو کر زیادہ قوت کا باعث ہوگی۔ بڑا آدمی وہی ہے جو دوسروں کو سب سے زیادہ نفع پہونچائے۔ اور اُسکے برابر کوئی کمینہ نہیں ہوگا جو خود

فائدہ اُٹھائے اور دوسروں کو نفع نہ پہونچائے۔ مگر دنیا کا انتظام کچھ ایسا ہے کہ جس سے ہم کو فائدہ پہونچتا تھا خاص اُس کی ذات کو ہم کوئی نفع نہ پہنچا سکے۔ اگر اس کا کوئی موقع کسی کو ملا بھی تو شاذ و نادر۔ لیکن جو نفع ہم نے اُٹھایا ہے ضرور ہے کہ وہ رتی رتی اور پائی پائی دوسرے کو پہونچا دیں۔ نفع کو اپنی ہی مٹھی میں بند رکھنے سے ڈرو۔ یہ ہاتھ کو گلانے گا۔ کیڑوں میں کیڑے ڈال دیگا۔ بہتر ہے کہ کسی نہ کسی صورت سے جہاں تک ممکن ہو جلد اُسے دوسرے تک پہونچا دو۔

یہی بے رحم قانون انسان کی محنت و مشقت، صنعت و حرفت پر بھی قادر ہے۔ جن لوگوں کے مزاج میں احتیاط ہے وہ کہتے ہیں کہ جس کام کی مزدوری اور جس چیز کی قیمت کم ہے وہی سب سے گراں اور ضروری ہے۔ اگر ٹاٹ کا ٹکڑا جھاڑو یا چاقو خریدا ہے تو ان میں تم نے انسان کی وہ عقل مول لی ہے جو ایک عام ضرورت کو رفع کرنے میں عمل میں لائی گئی تھی۔ باغ کیلئے باغبان کو مزدوری دینے کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اس عقل و شعور کو خریدا ہے جو چمن آرائی کے لئے درکار تھا۔ ماما میں کام کاج سینے پکانے کا سلیقہ، ملاح میں کشتی بانی کی عقل، گماشتے میں حساب کتاب معاملہ فہمی کی لیاقت، ان کو نوکر رکھ کر خریدی گئی ہے۔ اسی طرح دوسرے کے کام اور ہنر کی قیمت دے کر ہم اپنی عقل و ہنر میں اضافہ کرتے ہیں۔ اور ان چیزوں کو اپنی تمام املاک اور جائداد پر پھیلا دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ اشیائے عالم میں دو رخی ہے اس نے جس طرح زندگی میں دھوکا نہیں چلتا اسی طرح صنعت و حرفت میں بھی فریب کو کامیابی نہیں ہوتی۔ چور دوسروں کی نہیں اپنی چوری کرتا ہے۔ دغا باز دوسروں کو دغا نہیں دیتا اپنے کو دغا دیتا ہے۔ کیونکہ محنت اور عمل کی اصلی قیمت ہنر اور نیکی ہے۔ دولت اور اعتماد فقط علامتیں ہیں جو نیکی اور ہنر کو تعبیر کرتی ہیں۔ یہ علامتیں ایسی ہی ہیں جیسے کاغذ کا نوٹ روپے کی علامت ہوتا ہے کہ جس میں سرقہ اور جعل ممکن ہے لیکن جن چیزوں کی یہ علامت ہے یعنی ہنر اور نیکی اُن میں نہ سرقہ ہوسکتا ہے نہ جعل ہوسکتا ہے۔ محنت اور عمل کے مقاصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوتے جب تک سچی کوشش اور پوری توجہ اُن کے حاصل کرنے میں نہ کی جائے۔ کوئی مکار، نادہند، یا قمار باز کسی چیز کو حاصل کرکے اُس نیکی اور ہنر کو حاصل نہیں کرسکتا جو اس شے نے اپنے بنانے والے کو ایمانداری سے محنت کرنے کے بدلے دی ہے۔ قانون قدرت یہی ہے کہ ایک چیز کو بنا، ایک کام کو کر اور تجھ میں اُس چیز کے بنانے اور کام کرنے کی قوت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن جو نہ بنائیں گے اُن کو کبھی قدرت پیدا نہ ہوگی۔

انسان کے شغل اور پیشے اپنی تمام صورتوں میں چاقو اور چھری پر سان رکھنے سے لیکر ایک شعر کی تعبیر اور ایک نظم کی تصنیف تک ایک زبردست مثال اس بات کی ہے کہ مکافات کا قانون بدرجۂ کمال تمام عالم میں ساری ہے۔ وہ ترازو جس کا ایک پلڑا "لینا" اور دوسرا "دینا" ہے۔ وہ اُصول جس سے ثابت ہے کہ ہر شے قیمت رکھتی ہے اور اگر اس کی وہی قیمت جو مقرر ہے نہ دی جائے گی تو وہ چیز نہیں بلکہ کوئی اور چیز اُس کے بدلے میں ملے گی۔ اور یہ کہ بلا قیمت کسی چیز کا حاصل کرنا امکان سے خارج ہے۔ یہ باتیں وہ ہیں جو ساہوکار کے بہی کھاتے ہی میں اپنی شان نہیں دکھاتیں بلکہ ملک کے جمع خرچ، ظلمت و نور کے قوانین۔ فطرت کے عمل اور ردّ عمل کی قوتوں میں بھی انہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ مجھکو اس میں شبہ نہیں کہ ہر کاریگر کو خواہ اُس کا کام کتنا ہی ادنیٰ درجہ کا ہو اپنے کام میں بڑے بڑے گر سوجھتے ہیں۔ صنعت و صنائع کے وہ سنگین اُصول جو سنگتراش کی چھینی سے ہر ضرب پر چمک چمک کر نکلتے ہیں اور جو اپنے کام کو مسطر اور ڈوری سے جانچتا جاتا ہے اور جو اس کی دکان کے کھاتے میں بھی اسی طرح درج ہیں جیسے کہ سلطنت کی تاریخ میں اُن کی قدر ہوتی ہے اس کو اپنے شغل میں شوق و شغف پیدا کراتے ہیں اور اس کے کام کی قدر و منزلت اُس کے تصور میں بڑھاتے ہیں۔

نیچر اور نیکی میں ہمیشہ سے ایک اتحاد چلا آتا ہے جس سے یہ دونوں بدی کی مخالفت پر آمادہ رہتے ہیں۔ فطرت کی اشیاء اور فطرت کے

حسین قوانین، انسان کو جو فریب اور دغا کا مرتکب ہوتا ہے خود سزا دینے کو موجود ہو جاتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ فطرت میں ہر چیز راستی اور نفع کیلئے وضع اور مرتب ہوئی ہے اور ساری دنیا میں کوئی کالے منہ کا غار یا اندھا کنواں ایسا نہیں جس میں ایک دغاباز فریبی کو چھپنے کی جگہ ملے۔ چھپنا بیکار ہے۔ جرم کرو اور تمام زمین آئینے کی طرح عکس فگن ہو جاتی ہے جرم کرتے ہی معلوم ہوگا کہ زمین پر کسی نے سپید چادر بچھا دی ہے اور وہ ایسی اجلی ہے جیسے جنگل میں برف گری ہو اور اس پر چھوٹے چھوٹے جانوروں کے پنجوں کے نشان صاف نظر آ رہے ہوں۔

جو لفظ منہ سے نکال چکے ہو اس کو واپس لینا، پاؤں کے جو نقش زمین پر بن چکے ہیں ان کو مٹانا، جس سیڑھی کو لگا کر دوسرے کی چھت پر چڑھے ہو اس کو اس طرح تلپٹ کرنا کہ اس کا پتہ نہ چلے کسی طرح ممکن نہیں۔ کوئی نہ کوئی اتفاقی امر ایسا پیش آئیگا کہ مجرم کو اپنے جرم کی سزا مل جائے گی۔ نیچر کی قوتیں اور اس کے قانون، اس کے عناصر، اس کی اشیاء، آگ، پانی، ہوا، برف، قوت ثقل، ان میں سے ایک نہ ایک خود چور کے لئے سزا بن جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی نیکی اور اچھے کاموں کے لئے قانون قدرت ایسا ہی راسخ اور لاریب ہے جیسا کہ وہ جرم یا گناہ کے لئے ہے۔ محبت اور اچھا سلوک کرو گے لوگ تم سے بھی محبت اور اچھا سلوک کر سکیں گے۔ نیک آدمی میں وہ کامل نیکی ہوتی ہے جو آگ کی طرح ہر چیز کو آگ بنا لیتی ہے۔ نیک آدمی کو تم کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ نیپولین کے مقابلہ کے لئے جب فرانس کے بادشاہ نے فوج بھیجی تو نیپولین کو دیکھتے ہی فوج والوں نے اپنے جھنڈے چھوڑ دئے اور دشمن کے دوست بن گئے۔ اسی طرح نیک آدمی کے حق میں ہر طرح کی مصیبت، بیماری، خطا، افلاس انجام میں مفید ثابت ہوتے ہیں۔ طوفانی ہوائیں چلتی ہیں، بلاخیز موجیں اٹھتی ہیں مگر یہ سب آفات نیک بندوں میں قوت، ہمت اور صبر پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ بذات خود وہ کوئی چیز نہیں ہوتیں۔

جو نیک بندے ہیں ان کے ساتھ خطا اور قصور بھی اچھا سلوک کرتے ہیں۔ جس طرح انسان میں کوئی غرور کی بات ایسی نہیں جو اس کے حق میں مضر ثابت نہ ہوئی ہو۔ اسی طرح انسان کی کوئی خطا ایسی نہیں جس نے کسی نہ کسی موقع پر اس کو فائدہ نہ پہونچایا ہو۔ لقمان کی مشہور حکایت میں بارہ سنگھے نے اپنے سینگوں پر ناز کیا تھا اور ٹانگوں کو حقیر سمجھا تھا لیکن جب شکاری سر پر پہونچے تو انہی حقیر ٹانگوں نے جان بچائی اور جب آگے بڑھا اور درختوں میں سینگ الجھے تو سینگوں نے ہلاکت کو پہونچایا۔ ہر شخص کو اپنی زندگی میں اپنی خطاؤں کا کسی نہ کسی موقع پر احسانمند ہونا پڑتا ہے۔ جس طرح کبھی کوئی حق بات شروع میں بغیر حجت اور مخالفت کے سمجھ میں نہیں آتی اسی طرح انسان کی اعلیٰ قابلیتیں اور ایسی باتیں جو انسان کی راہ میں مزاحم ہوتی ہیں اس وقت تک سمجھ میں اچھی طرح نہیں آتیں جب تک کہ مزاحمت کی تکلیف نہ اٹھا چکا ہو۔ اور دوسروں کی اعلیٰ قابلیتوں کو دیکھکر اپنی کم قابلیت پر شرم نہ آئی ہو۔ اگر اسکے مزاج میں کوئی ایسا نقص ہے کہ سوسائٹی اس کو قبول نہ کرتی ہو تو مجبور ہو کر تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہے اور اپنی خود مدد کرنے کی عادت اس میں کچھ اس طرح پیدا ہو جاتی ہے جیسے کہ مشہور ہے اگر صدف کے خول میں کوئی سوراخ ہو جاتا ہے تو موتی لگا کر وہ اس روزن کو بند کرتی ہے۔

بیماری ناتوانی ہی ہماری توانائی کا سبب ہو جاتی ہے۔ سچا غصہ اور جذبہ مع اس کی مخفی قوتوں کے اس وقت تک نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ کوئی ہم پر حملہ نہ کرے کوئی ہم کو ٹہوکے نہیں۔ ہمارے دل کو مجروح نہ کرے۔ اگر یہ باتیں پیش نہ آتیں تو جو آج بڑے آدمی ہیں وہ چھوٹا آدمی ہی رہنا پسند کرتے۔ جب تک کوئی عیش و آرام کے تکیے لگائے بیٹھا ہے نیند کے جھونکے آ رہے ہیں لیکن جہاں ٹکر لگی، کسی نے صدمہ پہونچایا، ناکامی نے بار بار منہ دکھایا اس وقت موقع ملا کہ کچھ سیکھے، حواس درست کرے، مردانگی کو کام میں لائے۔ اب واقعات پر اسے نظر ہوگئی، اپنی لاعلمی کا علم ہوا۔

غرور اور نخوت کے مرض سے صحت پائی۔ اعتدال اور کام کی لیاقت کا خلعت پہنا۔ صاحبِ عقل اپنے مخالف کا طرفدار ہوجاتا ہی اُسی کی مخالفت سے اُس کو اپنی کمزوریوں کا پتہ چلتا ہی۔ اس میں فائدہ اس کا ہوا نہ کہ مخالف کا۔ زخم مندمل ہوگیا اور جلد پر سے مُردہ گوشت دُور ہوا۔ دُشمن خوشی سے تالیاں بجاتے ہی رہے اور یہ وہاں پہونچ گیا جہاں کسی کا وار اُس پر کارگر نہیں ہوسکتا۔ مذمت میں تعریف سے زیادہ سلامتی ہی۔ جس وقت تک جو کچھ کہا جاتا ہی اگر وہ میری مخالفت میں ہوتا ہے تو مجھے اپنی کامیابی کا یقین رہتا ہے۔ لیکن جہاں باتوں میں امرت ملاکر میری تعریف شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُشمن کے سامنے کھڑا ہوں اور خالی ہاتھ ہوں۔ اب دُشمن سے مجھے پناہ نہیں۔ بالعموم ہر خطا اور بُرائی اگر اُس نے بالکل اپنا ہی کرکے ہمکو ختم نہ کردیا ہو ہمارے حق میں سودمند ہوجاتی ہے۔ جس طرح ایک جزیرے کے وحشی باشندے دُشمن کو مار کر سمجھتے ہیں کہ اُس کی طاقت ہم میں آگئی۔ اسی طرح ہر بُرائی جسکو ہم روکتے ہیں اپنی قوت ہمکو دیجاتی ہی۔

تباہی، خطا، عداوت سے جو محافظ اور پاسبان ہم کو بچاتے ہیں اگر ہم چاہیں تو وہی محافظ ہم کو خودغرضی اور فریب سے بھی پناہ دے سکتے ہیں۔ مال کے لئے زنجیریں اور قفل ہرگز قابلِ اطمینان محافظ نہیں۔ اور نہ تجارت میں دھوکا اور فریب عقل پر دلالت کرتے ہیں۔ انسان اس وہم اور حماقت میں عمریں گذار دیتے ہیں کہ کہیں دوسروں سے دھوکا نہ کھاجائیں۔ یہ خیال کرنا کہ سوائے اپنے ہم دوسرے سے بھی دھوکا کھاسکتے ہیں ایسا غلط ہی جیسے کسی شے کے عدم اور وجود دونوں کو ایک ہی وقت میں تسلیم کیا جائے۔ ہر معاملے میں دو فریق ہوتے ہیں لیکن ایک تیسرا فریق بھی چُپ چاپ اُن میں شامل ہوجاتا ہے یعنی خود اشیاء کی فطرت جو ذمہ دار ہوتی ہے کہ ہر پیمان پورا کیا جائے گا۔ اس طرح ہر کہ جو خدمت ایمانداری سے کی گئی ہی اس میں کبھی کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اگر کسی آقا کی ملازمت میں ہو جو نامہربان ہی تو اُسکی خدمت میں اور زیادہ کوشش کرو۔ خدا کو درمیان لے آؤ۔ ہر ایک بے انصافی کی تلافی ہوجائے گی۔ اُجرت کے ملنے میں جتنی دیر ہوگی تمہارا نفع ہے۔ کیونکہ یہ سودا وہ ہی جس میں سود در سود پر بھی سود در سود ملتا ہی۔

ظلم و تعدی، تعذیب و ستم کی تاریخ محض اُن واقعات کی سرگزشت ہی جس میں انسان نے اپنی فطرت کو فریب دینا چاہا ہی جس میں کوشش کی ہی کہ پانی خود پہاڑ پر چڑھے اور ریت کی رسیاں بٹی جائیں۔ کچھ ضرور نہیں کہ ظلم اور عذاب کا دینے والا ایک بادشاہ جابر ہو یا آدمیوں کا ایک گروہ ہو۔ ہر حال میں چاہے وہ ایک متنفس ہو یا کوئی بڑی جماعت ہو، دونوں قصداً عقل سے گریز کرتے ہیں۔ اور عقل کے کاموں کو بگاڑتے ہیں۔ اس گروہ یا جماعت کی کیفیت بھی انسانِ واحد کی سی ہوتی ہے۔ مگر یہ انسان وہ ہوتا ہے جو اپنی فطرت کو چھوڑ کر درندوں کی سرشت اختیار کرتا ہی۔ اس کے کام بھی ایسے ہی مجنونانہ ہوتے ہیں جیسے کہ اُس کی طبیعت اور سمجھ مجنونانہ ہوتی ہے۔ وہ حق کو غارت اور انسان کے حقوق کو سنگسار کرتا ہی۔ لوگوں کے گھروں کو جلانے اور گھر والوں کا خون کرنے میں وہ عدل و انصاف کے چہرے کو داغ لگاتا ہے۔ اس کی مثال اس کھیل کی سی ہی جس میں صبح کی سُرخ روشنی میں جس کی چادرِ نور ستاروں کی طرح آسمان پر پھیلی ہوتی ہی، لڑکے اس سُرخی کو آگ سمجھکر اُسے بجھانے دوڑتے ہیں۔ رُوح ہر عیب و نقص سے محفوظ و مصوٗن ہی۔ وہ خطاکاری کا انتقام اپنے تنفر سے کرتی ہے۔ جو شخص خُدا کی راہ میں ایذائیں اُٹھاکر شہید ہوا ہی اُس کو کوئی بے عزت نہیں کرسکتا۔ ہر کوڑا جو اُس کی پیٹھ پر لگا ہے شہرت کی زبان ہی۔ ہر زنداں جس میں اُسے قید کیا ایک قصرِ رفیع الشان سے بھی اعلیٰ سمجھا گیا ہے۔ ہر کتاب جو جلائی گئی ہی اور ہر گھر جو پھونکا گیا ہی اُس کی روشنی نے دُنیا کو منوّر کردیا ہے۔ خلقِ خدا کے دل کو غیرت سے جنبش ہوئی ہے۔ ہر لفظ جسے صفحۂ باغارت کیا گیا ہی اس کی آواز صدائے بازگشت کی طرح دُنیا کے اس سرے سے دوسرے سرے تک گونجتی پھرتی ہی۔ عقل نے نظر دوڑا کر دیکھ لیا کہ اس کے سب کام عدل و انصاف پر مبنی تھے۔ بُغض و عناد بھی سمجھ گئے

کہ اُن کے کام ناصواب تھے۔ کوڑے اُسی پر پڑتے ہیں جو کوڑے لگاتا ہے۔ ظلم اُسی پر ہوتا ہے جو ظلم کرتا ہے۔ جس طرح ہر فرد بشر کو زندگی میں موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی ناانصافیوں پر نادم ہو کر عقل سیکھے، اِسی طرح قوموں کی حیات میں بھی جب اُن پر حقیقت کھلی ہے اور جن پر ظلم کئے تھے اُنکی نیکیاں اور بھلائیاں ثابت ہوئی ہیں تو اُنہوں نے اپنی ہی گردنوں میں طوق پڑے دیکھکر اپنے اوپر افسوس کیا ہے۔

اِسی طرح سب چیزیں بتاتی ہیں کہ خارج کے حالات سے بے پرواہ رہو۔ انسان ہی سب کچھ ہے۔ ہر چیز کے دو پہلو ہیں۔ ایک اچھا دوسرا بُرا۔ ہر سود کے لئے زیان اُٹھانا پڑتا ہے۔ مَیں رضا، وقناعت سے زندہ رہنا سیکھ رہا ہوں۔ لیکن مکافات کا قانون بے پروائی کا قانون نہیں ہے۔ ناسمجھ اِن باتوں کو سُنکر کہیں گے کہ پھر نیکی کرنے سے حاصل ہی کیا ہوا۔ بُرائی بھلائی سب کا نتیجہ واحد ہے۔ اگر مجھے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے تو اپنی گرہ سے اُس کی قیمت دینی پڑتی ہے۔ اگر ایک فائدہ ہاتھ سے جاتا ہے تو اُسکے بدلے دوسرا ل جاتا ہے۔ پس اب اپنے اعمال وافعال سے بالکل بے پرواہ ہو جانا چاہیئے؟"

لیکن وہ نہیں سمجھے۔ رُوح کی اہم تہ میں اس سے بھی عمیق تر واقعہ ایک اور ہے۔ وہ کیا ہے؟۔ وہ رُوح کی فطرت ہے۔ رُوح مکافات نہیں ہے۔ بلکہ وہ حیات اور زندگانی ہے۔ رُوح ہے۔ حالاتِ ظاہر کے پُر شور سمندر کی تہ میں رُوحِ حقیقی کا بحرِ مواج لہریں ہے۔ وجود یا خُدا کوئی نسبت یا محض جُزو نہیں ہے بلکہ کُل ہے۔ رُوح ایک زبردست اقرار ہے۔ انکار کو وہ خارج کرتا ہے۔ رُوح بذاتِ خود قائم ہے اور تمام تعلقات، جُزئیات اور اوقات اس میں شامل ہیں۔ فطرت، حق، نیکی، سب چشمے بنکر اس سے نکلے ہیں۔ اس کو نہ سمجھنا یا اس سے انکار بدی، نیستی، کذب اور تاریکی کی مثل ہے۔ جس کے پردے پر زندہ کائنات نے قلمِ ہزار رنگ سے اپنی تصویر کھینچ رکھی ہے۔ کوئی حقیقت تاریکی یا ظلمت سے پیدا نہیں ہوئی تاریکی یا ظلمت کوئی کام نہیں کرسکتی۔ اس سے کوئی نفع نہیں پیدا ہوتا۔ نقصان البتہ ایک حد تک ہے۔ کیونکہ نہ ہونا ہونے سے قبیح ہے۔

جب بُرے کاموں کی مکافات ظاہر میں نہیں دیکھتے تو سمجھتے ہیں کہ ہم کو دھوکا دیا گیا۔ مجرم اپنی بُری حرکتوں بغض وعداوت میں مصروف ہے۔ اور خارج میں کوئی بات ایسی پیدا نہیں ہوئی کہ اُس پر مصیبت پڑے اور اس کے کئے کی سزا اُس کو ملے۔ تاکہ انصاف پورا ہو۔ خُدا کی مخلوق اور آسمان کے فرشتوں کے سامنے اس کی برائیوں کی کوئی سنگین تردید نہیں ہوتی۔ مگر کیا اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ مجرم قانون پر غالب آگیا۔ نہیں ہرگز نہیں جس قدر کذب وعداوت وہ اپنے میں رکھتا ہے اُسی حد تک وہ اپنی فطرت سے مر چکا۔ اور اُس کی بُرائیوں کی سزا کا ایک دن اس طرح بھی ظاہر ہونا لازمی ہے کہ ہمارا ادراک اُس کو محسوس کرلے۔ آنکھیں دیکھ لیں اور کان سُن لیں۔ لیکن اس خارج کی مکافات کو اگر ہم دیکھ نہ سکیں تو قہم میں سے یہ منہائی کہ وہ اپنی فطرت سے علیحدہ ہوا ازلی حساب کو پورا کر دیتی ہے۔

اسکے ساتھ ہی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نیکی اور راستی کچھ نقصان کرکے خریدی جاتی ہیں۔ نیکی میں کوئی ضرر یا نقصان شامل نہیں۔ اس نفع پر کوئی جُرمانہ اور عقل پر کوئی مزدگنا مقرر نہیں۔ نیکی اور راستی فی الحقیقت زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ نیک کام کرتا ہوں اس سے ثابت کرتا ہوں کہ مَیں ہوں۔ نیکی ہی وہ چلن ہے جس کی مدد سے میں کائنات کو ترقی دیتا ہوں۔ نیستی اور ظلمت کے شورہ زار میں کھیتی کرتا ہوں۔ اس میں باغ لگاتا ہوں اور تاریکی کو دیکھتا ہوں کہ وہ ہٹتے ہٹتے خطِ اُفق تک پہونچ گئی ہے۔ محبت، علم، حُسن، اِن خوبیوں کو اگر اُن کی اصل صورت میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں افراط کا ہونا کوئی عیب نہیں۔ انسان کی رُوح حد بندیوں کو قبول نہیں کرتی۔ انسان میں رُوح کو بجنسہ اس بات کا دعویٰ ہے کہ حوادثِ کائنات بہتری کیلئے مرتب ہوتے ہیں، نہ کہ بُرائی کیلئے۔

انسان کی زندگی ایک ارتقا ہے سکون نہیں۔ ہماری عقل حیوانی اعتماد ہے یہی عقل حیوانی جب انسان کے متعلق "کمتر" یا "کہتر" کا

لفظ کہتی ہے تو اُس کی مراد انسان میں رُوح کی کم یا زیادہ موجودگی سے ہوتی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ بہادر بزدل سے، عاقل کاذب و مکار سے بڑھکر انسان ہوتا ہے۔ نیکی میں جو نفع ہے اُس پر کوئی محصول نہیں۔ کیونکہ نیکی کرنا تو ہم میں خدا یا واجب الوجود کا ظہور ہے، جس کا کوئی ثانی نہیں۔ خارجی نفع میں نقصان شامل کیا گیا ہے۔ اگر یہ نفع بغیر محنت و استحقاق کے حاصل کیا ہے تو اُس کی جڑ بودی ہے۔ ہوا کے پہلے ہی جھونکے میں یہ درخت گر جائے گا۔ نیچر میں جس قدر بھلائی ہے وہ رُوح کی بھلائی ہے اور وہ اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ نیچر کے سکہ رائج میں اس کی قیمت ادا کی جائے۔ یعنی اس محنت سے ملے جس کی دل و دماغ اجازت دیتا ہو۔ مجھکو ان باتوں کو سوچنے کے بعد اس نفع کی خواہش نہیں رہی جو بغیر محنت کے ملے۔ اگر اشرفیوں کی ہنڈیا کہیں گڑی ملے تو میں اُسے نہیں اُٹھاؤں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کے لینے سے نئی نئی ذمہ داریاں مجھ پر عائد ہو جائیں گی۔ جو آسودگی مجھے دُنیا میں حاصل ہے اس سے زیادہ کی حرص نہیں۔ نہ مال چاہیئے، نہ عزت، نہ حکومت اور نہ آدمی۔ کیونکہ یہ سب نفع ظاہری ہیں اور جو نقصان اس کے ساتھ شامل ہیں وہ یقینی ہیں۔ مگر اس علم پر کوئی محصول نہیں کہ عالم میں مکافات موجود ہے۔ پھر دفینے کھود کر نکالنے کی میں کیوں خواہش کروں۔ یہ علم وہ یقین ہے جس سے میرے قلب کو خوشی اور طمانیت میسر ہوتی ہے میں اس یقین سے برائی کی زمین کو تنگ کرتا ہوں اور ایک بزرگ نے اس عاقلانہ مقولے کی قدر کرتا ہوں کہ "کوئی چیز مجھکو سوائے میرے نقصان نہیں پہونچا سکتی۔ جو نقصان مجھکو پہونچ رہا ہے اس کی وجہ خود مجھ میں موجود ہے۔ میں کبھی مبتلائے مصیبت نہ ہوتا اگر میری ہی غلطی میری مصیبت کا باعث نہ ہوتی۔"

آدمیوں میں جو حالت کا تفاوت و ناہمواری ہے اس کی مکافات بھی انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ دُنیا میں انسان کا دردناک قصہ اسی تفاوت میں ہے کہ فلاں زیادہ ہے اور فلاں کم۔ جو کم ہیں وہ کس طرح اپنی اس کمی پر افسوس اور تکلیف نہ اٹھائیں۔ اور ان کی طرف سے جو زیادہ ہیں دل میں کینہ اور عداوت نہ رکھیں۔ ان لوگوں کو دیکھکر جو کم مقدرت ہیں افسوس ہوتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہے۔ ہم ان سے آنکھیں چُراتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ اپنی تکلیف میں خدا کو بُرا نہ کہنے لگیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی ہے۔ لیکن اگر حالات پر مردانہ نظر سے غور کرو گے اور اُن سے قریب ہو کر اُن کو دیکھو گے تو پھر یہ کم و زیادہ کا فرق مٹ جائے گا۔ محبت وہ چیز ہے جو اس فرق کی تمام ناہمواریوں کو اس طرح زائل کر دے گی جیسے آفتاب اپنی تمازت سے سمندر میں برف کے پہاڑوں کو تحلیل کر دیتا ہے۔ چونکہ تمام بنی نوع انسان کا دل اور رُوح ایک ہے اس لئے یہ "میرے" اور "تیرے" کی تمیز اور اُس کی تلخی دور ہو جاتی ہے۔ دوسرے کی چیز میری اور میری چیز دوسرے کی ہو جاتی ہے۔ میں اپنا بھائی اور میرا بھائی میں خود ہو جاتا ہوں۔ اگر ہمسایوں کی دولت اور عزت کے آگے میں پست نظر آتا ہوں تو آنے دو۔ میں اُن کے ساتھ محبت رکھ سکتا ہوں۔ اس لئے اُن کی چیز کو اپنا کر لیتا ہوں۔ کیونکہ جو شخص محبت رکھتا ہے وہ محبوب کی دولت کو بھی اپنا ہی بنا لیتا ہے۔ اب مجھکو معلوم ہو رہا ہے کہ میرا بھائی میرا محافظ ہے اور میری بھلائی کے لئے بہترین طریقوں سے کوشش میں مصروف ہے۔ اور اُس کا مال و منصب جسے دیکھ دیکھکر میں تعریف اور رشک کیا کرتا تھا اب وہ میرا ہی مال و منصب ہے۔ یہ رُوح کی فطرتِ لازوال کا مقتضیٰ ہے کہ قبضہ کرے اور سب چیزوں کو اپنا کر لے۔ مسیح اور شکسپیر محض اجزا ہیں اُس رُوح کے۔ اور محبت وہ چیز ہے جس کے ذریعے میں اُن کو اپنا بنا کر اُن کو اپنی ہستی میں شامل کر لیتا ہوں۔ کیا محبوب کی نیکی میری نیکی نہیں ہے؟ کیا اس کی عقل میری عقل نہیں ہے؟ اگر یہ نیکی اور عقل میری نہیں ہو سکتیں تو پھر وہ نیکی اور عقل ہی نہیں۔

یہی حال انسان کی مصیبتوں کی داستان کا ہے۔ وہ حوادث جو تھوڑے تھوڑے وقفوں پر انسان کی راحت اور آسودگی میں خلل

ڈالتے ہیں فی الحقیقت اُس کی فطرت کا اعلان ہیں، جس کا قانون ہی ترقی کرنا۔ نمو پانا اور آگے بڑھنا۔ فطرت کی اسی حقیقی ضرورت کی وجہ سے انسان تبدیلی اور انقلاب پر مجبور ہوتا ہے۔ اِس زندگی میں دوست، آشنا، گھربار، مذہب اور اعتقاد اسی طرح چھوٹ جاتے ہیں جیسے گھونگا اپنے خوبصورت مگر سخت خول کو جب وہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ سمانا مشکل ہو جاتا ہے، چھوڑکر دوسری جگہ آہستہ آہستہ ایک نیا گھر بنا لیتا ہے۔ انسان میں ان قواطبعی کی نسبت سے یہ انقلاب کمی یا زیادتی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض خوش نصیب طبیعتوں میں انقلاب متواتر پیدا ہوتا ہے اور دُنیا کے تمام تعلقات جو خفیف طور پر اس سے وابستہ تھے، ہلکے ہوتے ہوتے ہوا یا شبنم کی مثل ایک باریک لباس بن جاتے ہیں جس میں سے انسان اپنی اصل اور حقیقی شکل میں نظر آنے لگتا ہے، وہ اس کرخت خول کی طرح نہیں ہوتے جیسا کہ اکثر آدمیوں کا حال دیکھنے میں آیا ہے جن پہ مختلف زمانوں میں مختلف مادوں کی پپڑیاں جمتی چلی گئی ہیں اور جن میں انسان کیڑے کی طرح مقید ہے اب اس انقلاب کے ساتھ انسان کی ترقی ہے اور یہ ترقی ایسی ہے کہ آج کا آدمی کل کے آدمی کو نہیں پہچان سکتا۔ زمانے کے دَور میں انسان کے سوانح زندگی کی کیفیت، پہنے ہوئے لباس کو اتارنے اور نئے لباس کو پہننے کی مثل ہونی چاہیئے۔ جو حالات پیش آئے وہ پیش آئے اور گزر گئے۔ اب دوسرے حالات سامنے ہیں۔ لیکن ہم زدہ حال ایک جگہ تھک کر بیٹھ گئے ہیں۔ آگے نہیں بڑھتے۔ فطرت اپنے قانون ترقی کے مطابق زور سے ہمکو آگے بڑھانا چاہتی ہے لیکن ہم اپنی طاقت اِس زور کے مقابلہ میں صرف کرتے ہیں۔ اسلئے ہماری ترقی ایسی ہوتی ہے، جیسے کبھی کبھی زلزلہ آئے۔

عزیزوں اور دوستوں کی مفارقت گوارا نہیں ہوتی۔ جو فرشتے ساتھ ہیں اُن سے جدائی کو دل نہیں چاہتا۔ ہم نہیں جانتے کہ اُنکے جانے پر اُن سے بھی بڑھکر فرشتے ساتھ دینے کو آجائیں گے۔ خوب سے خوب تر کی تمنا نہیں۔ ماضی کو صنم بنا کر پوج رہے ہیں۔ رُوح کی دولت کا کہ وہ کیسی لازوال اور ہر جگہ موجود ہے یقین نہیں آتا کہ "امروز" وہ دولت ہے کہ "فردائے حسین" کو اور بھی زیادہ حسین شکل میں پیش کرے گی۔ مگر ہم ہیں کہ اسی اُجڑے گھر میں بیٹھے ہیں جہاں پہلے روٹی اور ڈھکا ملا تھا۔ اس کا یقین نہیں آتا کہ روح میں اتنی قدرت ہے کہ پیٹ کو روٹی، سر کو سایہ اور جسم کو قوت دے سکتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جو چیز کھوئی ہے۔ ویسی پیاری حسین اور شیریں چیز پھر کبھی نصیب نہ ہوگی۔ بیٹھ جاتے ہیں اور روتے ہیں۔ مگر خدا کی آواز کہتی ہے، اُٹھو اور آگے بڑھو اور ہمیشہ آگے بڑھتا رہ۔ ویران گھر میں ہمیشہ بیٹھا رہنا ممکن نہیں۔ نئے گھر میں آرام ملنے کا یقین نہیں، اس لئے جب ترقی پر فطرت کا قانون مجبور کرتا ہے تو ہم آگے بڑھتے ہیں مگر رونی صورت بنی ہے۔ اور گردن پھیر پھیر کر پیچھے دیکھتے جاتے ہیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مصیبتوں کی مکافات بھی ایک مدت وقت گذرنے کے بعد سمجھ میں آجاتی ہے۔ دوستوں کا مرنا، پیاروں کی جُدائی۔ مال کا تلف ہونا۔ مایوسی، بیماری، ہاتھ پاؤں کا کٹ جانا! ایسی مصیبتیں ہیں کہ جب آن ٹوٹتی ہیں تو وہ ناقابل تلافی نقصان معلوم ہوتی ہیں لیکن زمانہ، جس کے قدم مضبوط پڑ رہے ہیں تلافی کی اس قوت کو ظاہر کر دیتا ہے جو ہر واقعے اور حادثے میں موجود ہے۔ کسی پیارے عزیز کی موت، بیوی، بھائی یا محبوب کا مرنا جو مفارقت کے وقت ایک لاعلاج صدمہ اور نقصان معلوم ہوتا تھا۔ وہی کچھ دنوں بعد ہمارا ہادی اور رہنما بنکر اکثر ہمارا طرز زندگی بدل دیتا ہے۔ بچپن یا جوانی جو ختم ہونے کی منتظر تھی ختم ہو جاتی ہے۔ جو پیشہ یا کام کرتے تھے، جس گھر میں رہتے تھے اور جس طرح رہتے تھے وہ سب ترک کرا دیتا ہے۔ اور ایسے تعلقات پیدا ہو جاتے کا باعث ہوتا ہے کہ جو طبیعت میں زیادہ استواری پیدا کر دینے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہ سانحہ ایسا ہوتا ہے جو یا تو نئے دوست اور انہیں پیدا کرنے کی اجازت دیتا ہے یا اُس سے منع کر دیتا ہے۔ اور ہم میں ایسے اثرات موجود کر دیتا ہے جو آئندہ ہمارے حق میں مفید ہوں۔ وہ عورت یا مرد جس پر اگر

مصیبت نہ پڑتی تو ایک نازک پودے کی طرح پھولوں کے گملے ہی میں لگا رہتا جس کی شاخوں اور پتیوں کو روشنی تو خوب پہونچتی مگر جڑوں کے پھیلنے کو جگہ نہ ملتی۔ اب وہی پھولوں کا نازک پودا باغ کی دیواریں ٹوٹ جانے اور باغبان کی غفلت سے جنگل کا سب سے اونچا اور گھنا درخت ہوگیا ہے جس کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں کنبے کے کنبے آکر آرام پاتے اور اس کے پھلوں سے حظ اٹھاتے ہیں۔

(امر حسن) عنایت اللہ

لالۂ صحرا

از جناب تمنائی

وہ سترہ برس کی تھی،
جوان، الھڑ، گنوار، جاہل، کسان کی بیٹی!
میں چودہ برس کا تھا،
شرمیلا، تعلیم یافتہ، کمسن، اس کا مالک! . . .
اور مجھے اس سے محبت تھی —
اس کسان کی بیٹی سے،
اس جوان، گنوار لڑکی سے،
مجھ "بچہ" کو!
لیکن میں اس سے کہہ نہ سکتا تھا!
وہ بھی مجھے پیار کرتی تھی۔
اس کی آنکھوں نے مجھے بتا دیا تھا! . . .

* * *

وہ لالۂ صحرا تھی، خاموش!
میں چاندکی کرنوں کی طرح،
اسے چھوتا — اپنی نگاہوں سے — اور لرز جاتا! . . . . .

* * *

آہ کتنی محبت تھی مجھے اس سے!
آہ کتنی محبت تھی اسے مجھ سے!

وہ پھٹے کپڑوں والی،
الجھے بالوں والی۔
ننگے پیر کھیتوں میں دوڑنے والی،
دہقانی لڑکی!
کتنی پیاری تھی! . . . . .
کتنی محبت کرنے والی! . . . . .
اس کا دل معصوم تھا!
اس کی محبت تہذیب و شائستگی کی آلودگیوں سے پاک!

* * *

آہ لیکن چھو چھو کر لرز جانے والی،
چاند کی کرنیں،
لالۂ صحرا کو مرجھانے سے باز نہ رکھ سکیں!
خزاں کے ایک ہی جھونکے نے اسے پامال کر دیا!
اور بیچاری کرنیں،
کانپ کانپ کر، لرز لرز کر،
رہ گئیں ——
وہ چلی گئی! . . . . .

* * *

"جہانگیر کی بیگموں کی حاضر جوابی"

از جناب حکیم جمشید علی خاں صاحب

مکتوب:- میرے پیارے اس لئے کہ مجھ سے چھوٹے ہو دعائے عافیت و عاقبت۔ میرے کرمفرمایوں کہ علم و ادب کے محسن ہو۔ آداب سلام اور اظہار آرزوئے دیدار حضرت شاہد صاحب و ناصری صاحب سلمہا اللہ کے بعد التماس ہے کہ آپ دونو صاحبونکی بے غرض محبت اور لوجہ اللہ اعانت نے قیام دہلی میں مجھے بہت دلخوش رکھا۔ شاد باشید و جاودان مانید۔ واللہ آپ دونوں صاحبونکا تصور ہر وقت نصب العین رہتا ہے۔ اگرچہ شاہد صاحب کی خدمت میں زیادہ باریابی نہیں ملی، مگر ایک ہی ملاقات نے اسیر لیاقت اور رہین ذہانت بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ دونوں آفتاب ماہتاب دہلی کو اسی محبت اور یکدلی کے ساتھ دائم قایم رکھے۔ سب سے زیادہ تو مجھے آپ دونوں صاحبونکی آپسمیں محبت بھائی کہ جو اس زمانہ میں کبریت احمر ہے۔ پھر میں نے آپ صاحبونکی خاموش زندگی میں جو ادب کی سرگرم دھوم دہامی خدمت دیکھی تو اور بھی خوش ہوا کہ جو فروشی اور گندم نمائی سے قطعی نفرت ہے۔ جزاکما اللہ۔ کیوں نہ ہو۔ آخر شریف خاندان ہو۔ دہلی جہاں تصنع ریا سفاہت عام ہے وہاں ماشاءاللہ علم و لیاقت میں آپکا بھی نام ہے۔ آج میں "جہانگیر کی بیگموں کی حاضر جوابی" ٹوٹی پھوٹی اُردو میں ابلاغ خدمت کرتا ہوں، اگر پسند آجائے تو چھپوا دیجئے گا۔

جمشید علیخاں

صد قول بیک نزمطے میکنم انیک　　مستی نہ باندازۂ مے میکنم انیک

نور جہاں بیگم کا تو ہندوستان میں بہت نام ہے لیکن نورالدین جہانگیر بادشاہ کی ایک اور بھی چہیتی خوبصورت خوش سیرت عالمہ شاعرہ بیگم تھی جس کا نام قندہاری بیگم تھا۔ بہت سے تذکروںکی ورق گردانی کی تو مختصر اس نادرہ روزگار کے کلام کا پتہ چلا۔ فرماتی ہیں۔ ؎

چہرا و یک خلد حور و روئے او یک عرش نور　　خط او یک کلہ مور و زلف او یک سلسلہ مار
در دو لعل میفروشش ہر چہ در صہبا سرور　　در دو چشم بادہ نوشش ہر چہ در مستی خمار

اہل نظر انصاف فرمائیں۔ اور اس میں فصیحہ بلیغہ کی نازک خیالی کی خداراداد دیں۔ ہائے آج کو اگر مولانا خان بہادر ناصر علی خاں صاحب مغفور حیات ہوتے تو یا مجھے دہلی بلاتے یا بریلی تشریف لاکر اس شعر کی رنگینی مضمون کے مزے اڑاتے، ہائے مجھے اُن کے زمانہ حیات طیبہ میں مرضائے بریلی سے اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ اُن کے محبوب رسالہ صلائے عام کی خدمت کرتا حسن اتفاق سے ماہ اکتوبر میں جو دہلی جانا ہوا تو اُن کے صاحبزادوں اور پوتوں سے تعزیت کرنے جانا پڑا۔ سبحان اللہ کیسے ذیشان با اخلاق مجسمہ شرافت و لیاقت ہیں کہ آنکھیں ان کی حسن صورت سے اور دل ان کی خوبی سیرت سے اور روح ان کی بلند پایہ لیاقت سے خوش ہوئی اور میں

بندہ بیدام ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اس نامور گھرانے کو قایم رکھے۔ مجھے مولانا امام المناظرہ مولوی محمد منصور علی صاحب مُبرور سے بھی نیاز حاصل تھا اور خدا بخشے مولوی نصرت علی صاحب۔ خدا جانے مجھ پہ عاشق تھے یا میں اُن پر۔ اور مولانا خان بہادر ناصر علی خاں صاحب تو جب میں بزمانہ سی۔جی۔ ہیلی نیکسن صاحب ڈپٹی کمشنر گوڑگانوہ میں مقیم تھا تو مولانا مغفور اکثر فرخنگر سے تشریف لاکر غربتکدہ کو اپنے لکھائے مضامین سے رشک طبلہ عطار بنا دیتے تھے۔ کبھی فلسفہ الہیات کبھی طبیعات کی بحث۔ دو دن لطف سخن رہتا تھا۔ جس روز دور سخن شروع ہوگیا تو پھر کیا تھا ایک گنجینہ اشعار تھا کہ موتیوں کی لڑیوں کی طرح ایک سے ایک بالاتر۔ خیر وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھو۔ ان آنکھوں کا یہی ہر دیکھے، ہاں تو وہ قند پارسی بیگم کا کیا شعر ہے سہ ارغوان عارضش را حسن وطلعت رنگ بیست ۃ پیرنیاں پیکر کشی را لطف وخوبی پود وتار۔

حضرت شاہد صاحب فرمائیں گے کہ یہ کیا سر دربے آہنگ ہے میرے ساقی کو کیوں بدمزہ اور تلخ صہبائے اُردو کو کرکرہ کیا جاتا ہے۔ اے حضور خفا نہ ہوجیے۔ اُردو تو فارسی ہی سے نکلی ہے، یہ اپنی مہربان اتا کو کب بھول سکتی ہے ذرا ان خوباں پارسی کی دو دو نوک جھونکیں نوش جان کیجئے پھر اُردو میں اس کے جواب کی تلاش فرمائیے گا یہ کس زمانہ کا ذکر ہے۔ میں نے کسی مدرسے میں ہسٹری نہیں پڑھی ہے نہ طبابت میں یہ سوال کبھی امتحان میں پیش ہوا مگر آپ یہ یقین کیجئے کہ اکبر شاہ اعظم کا وہ فرزند رشید مرزا سلیم نجو تخت پر بیٹھکر جہانگیر بادشاہ مشہور ہوا جس کی عالی دماغی اور سخن دانی سے کتب سیر اور تذکرہ بھری پڑی، ہیں ایک روز آگرہ میں نور جہاں کی طرف مُنہ کرکے فرمایا سہ

گرچہ دروبرانہ زاہدمی گیرد قرار ۔۔۔ تو بہار آمد عزیزاں خیمہ در صحرا زنند

نور جہاں بیگم نے تسلیم بجا لاکر عرض کیا سہ

در موسم بہار خصوصًا بروز ابر ۔۔۔ واجب بود بہ بادہ کشاں سیر آب کرد

پھر کیا دیر تھی چاروں طرف دریائے جمنا کے قناتیں کھنچ گئیں اور بانات رومی مخمل کاشانی کے ڈیرے خیمے لگ گئے گلدوز سوزنیاں اور رنگین مسندیں بچھ گئیں جنپر شامیانے زربفت ولایتی مخمل کے اور کمخواب کے مخمل کے مقیشی اور کلابتونی ڈوریوں سے کھنچے ہوئے جلسِ سخن دم بھر میں جنگل میں منگل ہوگیا۔ ہائے آج کو سید باقر علی صاحب داستانگو شاہی ہوتے تو اس شاہی کیمپ کا لب دریا نظارہ سُننے والوں کو آنکھوں سے دیکھا دیتے ع کس کس کا ذکر کیجئے کس کس کو رو دیئے۔

کارپردازان سلطنت اور بیتیکاران دولت نے بموجب حکم عالی جلدی جلدی آرائشِ جشن بادشاہانہ اور بندوبست زنانہ کرکے عرض کیا سہ

شاہان بکوہ ودشت چمن زارہا کنند ۔۔۔ صحرا ز بارگاہ چو گلزار ہا کنند

حضرت ظل سبحانی مع قند پارسی بیگم اور نور جہاں بیگم اور دیگر بیگمات بجروں اور کشتیوں بیٹھکر سیر دریا فرمانے لگے۔ سہ

نادرہ صنع خدائے کریم ۔۔۔ خانہ روان دخانگیانش مقیم

ہر ایک جواہرات رنگ برنگ اور خلعت ہائے تنگا تنگ سے بنی ٹھنی سفینہ ہائے سفعی اور کشتی ہائے شجرفی میں سوار بادشاہ کے بجرہ کے اردگرد جیسے ستارے چاند کے گرد حلقہ کئے ہوئے اور ہر طرف گائیاں جا دونوا اور امشگراں طاؤس ادا طرح طرح کے گیت گو پادلی اور ترانہ ہائے تانسینی گاگا کر مچھلیوں کو دریا سے اور طائروں کو ہوا سے اسیرِ دام کر رہی تھیں سہ

درکشید از نوائے روح افزا　　ماہی از آب و مرغ را از ہوا
بروہ آواز شان ز روئے فریب　　ہم ز ماہی و ہم ز ماہ شکیب!

عاشق مزاج بادشاہ نے ایک ہاتھ قندہاری بیگم کے گلے میں دوسرا ہاتھ نورجہاں کے کندھے پر رکھے ہوئے کبھی اس طرف کبھی اُس طرف لبِ لعلیں و رعارضِ نگاریں کی داد دیتے ہوئے کبھی اسکو بھینچ کبھی اُسکو کھینچ کبھی اس کے سینہ پر سر رکھدیا کبھی اس کے کندھے پر جُھک گیا۔ سیر دریا کی اور حسنِ مواج کی بہار لوٹتے ہوئے قندہاری بیگم سے فرمایا ؎

زعشقت اے پری دیوانہ گشتم　　ز خویش و آشنا بیگانہ گشتم

قندہاری بیگم مچھلی کی طرح بغل سے نکل کر بولیں ؎

حدیثِ عشق من خوانی و دل با دیگراں بندی　　دو تیغ آخر نمیدانم چہسان دریک نیام آید

نورجہاں بیگم تنک کر بولیں ؎

جام می و خونِ دل ہر یک بکسے دادند　　در دائیرہ قسمت اوضاع چنیں باشد

بادشاہ نے فرمایا۔ ع لعل و گوہر راکے قیمت بچشم مشتری است۔

نورجہاں بیگم ہنسیں اور بولیں ؎

آہن کہ بپارس آشنا شُد　　فی الحال بصورتِ طلا شُد
خورشید نظر چو کرد بر سنگ　　تحقیق کہ لعل بے بہا شُد

بادشاہ نے دونوں کو راضی کرنے کے لئے نورجہاں بیگم سے فرمایا ؎

ساقیا برخیز و در دہ جام را　　خاک بر سر کن غمِ ایام را

نورجہاں بیگم نے حسب الحکم شاہی دوزانو ادب سے بیٹھکر جام بلوریں میں رحیق شنجرف گوں بھرکر بادشاہ کو پیش کیا۔ بادشاہ نے وہ جام بیکر خالی گلاس نورجہاں بیگم کو دیا۔ نورجہاں بیگم آداب بجا لاکر بولیں ؎

ما تنک حوصلہ و ساقی ما دریا دل　　پُر صریح است کہ در شیشہ نگنجد دریا

قندہاری بیگم نے جب جہاں پناہ کو نورجہاں بیگم کی طرف متوجہ پایا تو ایک آہ سرد بھرکر بولیں ؎

ساغر کشاں سحر سر مینا چو وا کنند　　آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

جہانگیر بادشاہ نے ایک ساغر قندہاری بیگم کو دیا۔ انہوں نے ادب بجا لاکر پی لیا اور خالی گلاس نورجہاں بیگم کو دے کر کہا کہ بہن تم بھی اس دلش میں حصّہ لو۔ نورجہاں بیگم نے خالی گلاس لیکر کہا ؎

ہنوز اندک شعورے دارم اے ساقی ازیں بگذر　　بچشمِ مست خود تکلیف کن ایں جام خالی را

پھر تو دور دمادم اور صدائے زیر و بم سے نہر چمن باغ عدن بن گئی ؎

خروش از صراحی در آمد بجوش　　سروش از سر خم ہمیں گفت نوش
شکر ریخت مطرب براشگری　　کمربست ساقی بجاں پروری

کوئی کہہ رہی ہے ؎ ساقی بنور بادہ برافروز جام ما　　مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما

کوئی فرطِ مستی ونشاط میں الاپ رہی ہے ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت　　کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلے را

جب ذرا دھوپ میں تیزی ہوئی تو جہانگیر بادشاہ بجرہ سے اتر کر ڈیرہ میں تشریف لیگئے' وہ دن قندہاری بیگم کا تھا۔ نورجہاں بیگم نے ڈومنیونکو حکم دیا کہ یہ شعر گائیں ؎

دوا مدار خدایا کہ در حریم وصال　　رقیب محرم و ہجراں نصیب من باشم

بادشاہ یہ شعر سنتے ہی خلوت خانہ سے باہر آگئے اور حکم دیا کہ سب تیریں! نورجہاں بیگم نے ہاتھ جوڑکر عرض کیا ؎

تو گر بر لبِ آب ہوسے بنشینی　　ورنہ ہر فتنہ کہ بینی ہمہ از خود بینی

تمام خواصیں اور خود بادشاہ سلامت دیر تک دریا میں تیرتے رہے' جونہی نورجہاں بیگم تیرتی ہوئی بادشاہ کے سامنے آئیں تو جہاں پناہ نے نورجہاں بیگم کا ہاتھ پکڑکر فرمایا ؎

سیر گلشن کن اگر تشنہ دیدار خودی　　آب از چشمہ چشم تو رود در جوہا

قندہاری بیگم بولیں۔ ؎ آب بہر دیدنت می آید از فرسنگ ہا۔

نورجہاں بیگم نے فوراً فرمایا۔ ؎ از ہیبتِ شاہِ جہاں سر منیر ند بر سنگ ہا۔

قندہاری بیگم نے بادشاہ کے گلے میں باہیں ڈالکر کہا ؎

زہے صلابت حشمت کہ ماہیانِ از آب　　زبیم ناوک مژگان تو زرہ پوشند

بادشاہ نے فرمایا ؎

گر بصحرا رُخ نمائی خار صحرا گل شود　　در بدریا رو بشوی آب دریا مل شود

ادھر بیگنیاں قلما قنیاں خواصیں۔ دوشیزہ ماہ پیکر گل اندام کوئی ڈبکی لگا رہی ہے' کوئی چت تیر کر دو حبابے ایجاد قمقمہ نور اور دونوں طرف گیسوے مشکیں زلفِ عنبریں پانی میں لہرا لہرا کر موجوں اور حبابونکو شرما رہے تھے۔ گویا ماہیانِ سیم اندام اور مرغابیاں مینا فام تیر رہی ہیں۔ کبھی خوشہ پروین کی طرح اکٹھا ہوکر ایک دوسرے کو غوطے دیتیں۔ قریب شام بادشاہ متوجہ دولت خانہ ہوئے۔ قندہاری بیگم بھی تیر کر ساحل دریا پر پیر لٹکائے پانی سے کھیل رہی تھیں گویا غرورِ حسن سے دونو پیر کہ پھول کی پنکھڑیوں سے بھی زیادہ نازک تھے' اسینہ دریا پر مار رہی تھیں کہ ملکہ بیگم جو نورجہاں بیگم کی چھوٹی بہن تھیں قندہاری بیگم سے بولیں ؎

پائے در آب منہ اینقدر اے گل برخیز　　کثرت آب گل برگ تری نقصان است

قندہاری بیگم نے ملکہ بیگم کی اس بدیہہ گوئی پر اپنے گلے سے مالائے مروارید جس کی قیمت اسی ہزار روپیہ تھی اتار کر ملکہ بیگم کو پہنا دی اور نورجہاں بیگم کی طرف منہ کرکے بولیں۔ آپ بھی کچھ فرمایئے تو احسان ہوگا۔ نورجہاں بیگم نے کہا اگر آج کی شب جہاں پناہ ہمیں دیدو تو میں کہوں۔ قندہاری بیگم نے کہا بسر و چشم۔

نورجہاں بیگم نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی ؎

پیراہن رنگ آسمان بردوشت　　گل ہائے ارم مست لبے نوشت
در پا سر بوسیدن یابت دارد　　دُر آمدہ تا عرض کند در گوشت

جہاں پناہ اور قندہاری بیگم اور دیگر بیگماتیں نورجہاں بیگم کی اس ذہانت پر عش عش کرنے لگیں اور چاروں طرف سے اُن پر جواہرات نثار کئے اور صدقے اُتارے گئے۔

قندہاری بیگم نے بادشاہ کو گلے لگا کر حسبِ وعدہ نورجہاں بیگم کے سپرد کیا۔ یہ تھی اُس زمانہ کی بیگموں کی علمی لیاقت۔

موت

از حضرت ایم۔ اسلم

ہمنشیں! تو میرے لئے دلگیر مت ہو!
بلکہ تجھے خوش ہونا چاہیئے کہ میں زندگی کے آلام سے آزاد ہو کر ایک گندے ماحول سے نکل کر اس وادی میں آبسا ہوں جسے "وادیِ قرار" کہتے ہیں، جہاں سود و زیاں کا اندیشہ گلوگیر نہیں ہوتا۔

ہمنشیں! تو میرے لئے غم نہ کر!
ہاں وہ جام جس میں تجھے صہبائے اُلفت جھلکتی نظر آیا کرتی تھی، اب ٹوٹ چکا۔ لیکن وہ بادہ خوار ہی کیا جو بے پیئے مدہوش نہ ہو۔ دل محبت کے زہر سے شگفتہ ہوتا ہے۔ اگر تیرے دل میں میری محبت موجود ہے تو پھر قُرب یا دُوری کا احساس بے معنی۔ نہ تو مجھ سے دُور، نہ میری طرف سے غافل!!

ہمنشیں! تو میرے لئے ماتم گُسار مت ہو!
کھلونا جب ٹوٹ جاتا ہے تو ٹکڑے مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتے ہیں لیکن کھیلنے والے کو اس کے ٹوٹ جانے کا افسوس ضرور ہوتا ہے۔

فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے
پھول مُرجھا جاتے ہیں تو باغباں نئے پودے لگا دیتا ہے۔
دُنیا کا دستور بھی یہی ہے
ایک فصل پک چکتی ہے تو دوسری کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔
آئینِ جہاں یہی مقرر ہے
رُوح جسدِ خاکی سے آزاد ہو کر بھولے سے بھی اس کا رُخ نہیں کرتی۔
قدرت نے یہی قاعدہ مقرر کر رکھا ہے
لیکن محبت اس نظام کی پابند نہیں۔
محبت غیر فانی ہے۔

ہمنشیں! میرے مرنے پر آنسو مت بہا!

ع

پہونچی وہاں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا!!

جوان اور بوڑھے

از جناب محشر عابدی بی۔ اے

موسم گرما کے طویل ایام میں روزانہ وہ دونوں بوڑھی عورتیں سبز رنگ کے اُس چھوٹے سے سائبان کے نیچے بیٹھا کرتیں جس کا رُخ سمندر کی جانب تھا، اور وہ نہایت مسرت کے ساتھ اُن چیزوں کو کھاتی تھیں جو ان دونوں میں سے کوئی ایک لاتی تھی اور جو کچھ مٹھائی، سنترہ یا کیک کے ٹکڑے پر مشتمل ہوتی تھیں۔ وہ بیٹھا کرتیں اور تعطیل کی وجہ سے لوگوں کے غیر معمولی ہنگامہ آفریں ہجوم کو سڑک پر سے گذرتا ہوا دیکھ کر لطف اندوز ہوا کرتیں۔ اس عالم میں اُن کو نہ تو اپنی ضعیف العمری کا خیال ستاتا تھا نہ اپنی دُکھ بھری زندگی کی فکر دامنگیر ہوتی تھی۔ وہ عورتیں بہت ہی تنگدست اور نادار تھیں۔ ان کے لباس بہت ہی سادہ اور معمولی تھے۔ ان کے عزیز اور رشتہ داروں نے اُن کو فراموش کر دیا تھا اور وہ دونوں چوہیوں کی مانند تنگ و تاریک کوٹھریوں میں رہا کرتی تھیں جہاں سورج کی شعاعوں کا گذر تک نہ ہوتا تھا۔

محض اتفاقیہ طور پر ان دونوں کی ملاقات ہو گئی تھی۔ اور اس طرح انہوں نے اُن دو کمانوں کے سائبان کو اپنی عبادت گاہ تصور کر لیا تھا۔ ایک بہت ہی مقدس مقام جہاں سے "زندگی" جس کے حدود سے تقریباً وہ بالکل باہر ہو چکی تھیں، ایک ہمدردانہ اور ترحم آمیز نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ وہاں بیٹھ کر وہ دونوں اپنے سروں کو جنبش دیتی ہوئی ایسی نظر آتی تھیں گویا کہ وہ اس مسرت آفریں اور کاروباری زندگی کے مناظر کا، جو اُن کے سامنے سے گذرتے تھے، ایک حصہ جذب کر رہی ہیں۔ اس کا اظہار اس طرح ہوتا تھا کہ اُن کی باتوں کا تار کبھی نہ ٹوٹتا تھا، اُن کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم ابھرتا اور اُنکے دماغ پھر ایک بار نوجوانی اور شعریت سے معمور ہو جاتے تھے۔

بعض وقت جب وہ وہاں آتیں تو اُن کی جگہ پر کوئی دوسرا شخص بیٹھا ہوتا اور اسلئے مجبوراً اُن کو دور ہٹ کر بیٹھنا پڑتا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ نرمی سے اپنی نشستوں کے چھن جانے پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتیں کہ لوگ اُن کو اس واحد مسرت سے بھی محروم کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے لیکن جونہی کہ وہ نشستیں خالی ہو جاتیں وہ دونوں فوراً کھڑی ہو جاتیں اور بڑی خواہش اور شوق کے ساتھ اپنے لباس کو سنبھالتی اور اپنی چھتریوں کو زور زور سے زمین پر ٹیکتی ہوئی آگے بڑھتیں اور ایک سرد آہ اور گنگناہٹ کے ساتھ وہ ان پر بیٹھ جاتیں اور اُن میں سے ایک کہتی "میرا خیال تھا کہ اب وہ یہاں سے کبھی نہ جائیں گے" اس کے بعد وہ نہایت مطمئن انداز سے اپنے سر کو جنبش دیتیں۔ ان میں سے ایک پرانی قدیم وضع کی عینک کے شیشوں کو صاف کرنے لگتی اور دوسری اپنے خراب و خستہ گرد آلود جوتے کے فیتے کھولنے لگتی۔ پوری طرح آرام سے بیٹھنے کے بعد وہ اپنا مختصر سا کھانے پینے کا ذخیرہ اپنے پرانے اور میلے تھیلوں سے نکال کر باہر رکھتیں اور اس کو دیکھ کر بچوں کی طرح کھل کھلا کر ہنس پڑتیں۔ اس کے بعد بہت دلچسپ اور سنجیدہ انداز سے عہد ماضی کی بھولی بسری باتوں کا اعادہ کرتیں اور جب آدمیوں کا کوئی ہنستا ہوا جمگھٹا اُن کے سامنے سے گذرتا تو وہ بھی ہنسنے لگتیں اور جب کوئی بچہ گر پڑتا تو وہ بھی پریشان ہونے لگتیں۔

اس طرح وہ دن اور ہفتے اس چوبی نشستگاہ پر بیٹھ کر گذار دیتیں۔ اوروں کو کبھی اس کی تختی کا احساس نہ ہوتا۔ اکثر وہ اپنی اس خوش قسمتی کا ذکر کر کے خوش ہوتی تھیں جس نے اُن کو اس طرح یکجا کر دیا تھا۔ اور اس امر پر حیرت بھی کرتی تھیں کہ ایسی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کیلئے قسمت نے ان ہی کو کیوں منتخب کیا ہے۔

موسم کے تغیر کے ساتھ ساتھ وہ اب جلد ہی وہاں آنے لگیں تاکہ انکو اپنی جگہ خالی مل سکے۔ وہ باغ میں کھلنے والے پھولوں کو دیکھکر بہت تعریفیں کرتی تھیں اور اُنکی بوڑھی اور کمزور آنکھیں دن بھر میں کئی بار پھولوں کے رنگ برنگ تختوں پر جاتی تھیں۔

بعض مرتبہ وہ اسقدر خوش قسمت ہوتی تھیں کہ اُن کو ایک خوبصورت پھول مل جاتا تھا جیسا کہ ایک دن ہوا تھا کہ جب راستہ پر سے گذرنیوالے ایک لڑکے نے سورج مکھی کے پھول پر لکڑی سے ضرب لگائی تو دو پھول ٹوٹ کر نیچے گر پڑے تھے۔

"ان پھولوں کو یہاں پڑا ہوا دیکھکر مجھے ترس آگیا اور اس لئے میں نے اُن کو اُٹھالیا!" انہوں نے ایک دوسرے کی باتوں کو سمجھکر مسکرا دیا۔ سورج مکھی کے پھول اُن کی گود میں پڑے ہوئے تھے۔ اور اُن کے برہنہ ہاتھ اُن کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ شروع شروع میں وہ تمام دن ہاتھوں میں دستانے پہنے رہتی تھیں لیکن بعد میں چل کر ان کو اس غلطی کا احساس ہوا کہ دستانے پہننا مفید نہیں۔ اور اب وہ سرد اور خوشگوار ہواؤں کو اپنے جھریاں پڑے ہوئے ہاتھوں سے محسوس کر کے خوش اور مسرور ہوتی تھیں۔ ایک دن — اور کیوں نہیں؟ — وہ اس ریتیلے ساحل کے پاس پانی سے کھیلنے جا رہی تھیں جہاں بچے پتنگ اُڑا رہے تھے اور جو ابھی زیادہ سیانے اور دلیر نہ تھے لیکن اگر انکو ذرا اطمینان اور صحبت ملجائے تو پھر وہ مہربات کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد پھر وہ کبھی نہ فراموش ہونے والا دن آیا جب ایک خوبصورت اور بڑا سیب، سڑک پر سے گذرنے والی ایک گاڑی میں سے نیچے گر پڑا اور پھر اُس سائبان میں لایا گیا تاکہ اُس کے حُسن اور ذائقہ کی تعریف کی جائے۔ اور اُس کی سُرخی اور خوبصورتی دیکھکر انکے پوپلے مُنہ میں پانی بھر آیا اور اُنہوں نے فوراً یہ ارادہ کر لیا کہ جب دوپہر کا اسٹیمر ساحل پر واپس آئے تو اس سیب کو تناول کریں۔

رحمدل اور مہربان ماؤں کی طرح وہ ایک خوش آیند خیال میں مُسکراتی ہوئی بیٹھی رہیں۔ لوگ اس سائبان میں آئے۔ بیٹھے اور پھر چلے گئے ایک ماں اپنے بچے کو لیکر آئی جس کو دیکھکر اُن بوڑھی عورتوں کو اپنے بچوں کا خیال آیا جو اب مر چکے تھے۔ اس کے بعد دو راہبائیں آئیں جن کے چہروں پر درشتی کے آثار تھے۔ وہ اپنی سیاہ کتابوں کے مضامین کے متعلق گفتگو کر رہی تھیں جن کو دیکھ کر ان بوڑھی عورتوں نے اپنے سروں کو جنبش دی اور اس حیرت و استعجاب میں پڑ گئیں کہ بعض لوگ کیوں ایسی زندگی پسند کرتے ہیں جو اس قدر نزاکت اور خطرے سے مملو ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک بہت موٹا تازہ آدمی اور اس کی بہت ہی لاغر اور نحیف بیوی آئی جن کو دیکھکر ان دونوں نے مُسکرا دیا گو ان کو اپنے مُسکرانے کا سبب جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ اور سب سے آخر میں ایک جوان، شرمیلی اور خوبصورت لڑکی، سفید اور نورانی لباس میں ملفوف وارد ہوئی۔

اس خوبصورت لڑکی کی آمد سے وہ دونوں عورتیں بہت مسرور ہو گئیں۔ اس کو دیکھکر اُن کے جسم میں تازگی اور فرحت کی رُوح دوڑ گئی۔ وہ از سر نو جوان ہو گئیں۔ ان کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس سے گفتگو کریں اور اسکے دل و دماغ میں مستور رہنے والی خوبصورت اُمیدوں کی ایک جھلک دیکھ لیں لیکن وہ خود بھی بہت شرمیلی واقع ہوئی تھیں۔ ان کو اپنی بدصورتی کا علم تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ لڑکی ان کی اس خواہش کی تکمیل کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھے گی۔ غالباً وہ بھی اس کی عمر میں ایسا ہی خیال کرتیں۔ اس لئے وہ آپس میں سرگوشی کرنے لگیں اور حیرت کرنے لگیں کہ وہ یہاں تنہا کیوں بیٹھی ہوئی ہے جبکہ اُس کو ایک جوان اور خوبصورت شخص کی دُلہن اور سرمایۂ افتخار بننا چاہیئے تھا۔

دماغ میں اس قسم کے خیالات لاتے ہوئے۔ اُن میں سے ایک یکایک جوشِ مسرت سے بول اُٹھی۔ اور اپنے سر کو سامنے کی تفریح گاہ کی طرف اُٹھایا۔ وہاں ویسا ہی ایک خوبصورت اور جوان لڑکا نظر آیا۔ جو اُن کے خیال سے اس لڑکی کا مدِمقابل بن سکتا تھا۔ اس کا قد لانبا تھا اور چہرے سے

متانت ٹپک رہی تھی۔ وہ تحسین آمیز اور تحریص انگیز نگاہوں سے اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن جب اُس نے یہ محسوس کیا کہ ان بوڑھی عورتوں نے اس بات کو دیکھ لیا ہے تو مارے شرم کے اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ پھر بھی وہ اس لڑکی کو دیکھے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

"کیسا خوبصورت جوان ہے!" اُن بوڑھی عورتوں نے آپس میں کہا۔ اور اس فکر میں مستغرق ہوگئیں کہ کونسا ایسا معجزہ انکی قوت میں ہے جس سے ان دونوں جوان لڑکی اور لڑکے کا تعارف ہو سکے۔ ان میں سے ایک نے بہت دیر تک عالمِ محویت میں کھوئے رہنے کے بعد یکایک چونک کر دوسری عورت سے کچھ کہا اور ساتھ ہی سیب اُسکی گود میں سے آہستہ سے نیچے گر کر صاف راستہ پر لڑھکتا ہوا اس نوجوان آدمی کے پیروں تک پہنچ گیا۔ اس نے صفائی مگر کسی قدر غصہ سے اُسکو اُٹھا لیا۔ اور راستہ کاٹتے ہوئے کہا "میں یقین کرتا ہوں......"

لیکن بوڑھی عورتوں نے اپنے سر کو سنجیدگی سے ہلاتے ہوئے لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ اس لڑکی کا ہوگا"

وہ جوان پہلے جھجکا۔ پھر ایک سرد آہ بھری اور آہستہ آہستہ اُس جوان لڑکی کے پاس پہونچ گیا جو غالباً خواب کی سی حالت میں بیٹھی تھی۔

"اگر تم اجازت دو تو میں......"

لڑکی نے اُسے گھور کر دیکھا۔ پھر شرماتے ہوئے اپنے سر کو جنبش دی جس سے انکار ظاہر ہوتا تھا۔

"لیکن یہ تمہارا ہی ہوگا —— یہاں اور کوئی نہیں ہے"

جوان لڑکے نے وہ سیب اُس کی گود میں رکھدیا۔ لڑکی نے پہلے سیب پر ایک غائر نگاہ ڈالی اور پھر اس لڑکے پر جو جواب کے انتظار میں کھڑا تھا۔ بوڑھی عورتیں کنکھیوں سے دیکھ دیکھکر مُسکرا رہی تھیں۔ لڑکی پریشان ہو کر کھڑی ہوگئی۔ سیب اُسکے ہاتھ میں تھا جوان لڑکے نے اپنے دل میں غور کیا کہ اُس نے آج سے قبل کبھی ایسا حُسن اور اُس کی ایسی نزاکت اور رعنائی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا دل پہلے اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔ پھر اس کی رُوح خود بخود بلندی کی طرف مائلِ پرواز ہوگئی۔

"آپ کا بہت..... بہت شکریہ" وہ کہہ رہی تھی۔

آفتاب اس وقت پہلے سے بہت زیادہ منّور نظر آرہا تھا اور جب اُسکی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے تو اُسوقت سمندر اور آسمان پہلے سے بہت زیادہ پُرشکوہ اور شاندار نظر آرہے تھے۔

"لیکن اگر آپ اسکو پسند کریں" اس نے لطیف اور رسیلی آواز میں کہا۔

"صرف آدھا" لڑکے نے جواب دیا۔

اُس نے لڑکے کو سیب دیدیا۔ اب اُسکو سیب کاٹنے کیلئے ایک چاقو کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اُس نے ساحل کی طرف دلیرانہ انداز سے سر ہلاتے ہوئے کہا "وہ مقام بہت زیادہ خوشگوار ہوگا —— وہاں چلو"

آہستہ آہستہ وہ دونوں اُٹھے۔ وہاں سے روانہ ہوئے اور پھر نظروں سے غائب ہوگئے۔

دونوں بوڑھی عورتیں جی بھر کر مسکرائیں۔

"کسقدر خوشگوار دن ہے" اُن میں سے ایک نے کہا! اور باقی تمام دن وہ دو شہزادیوں کی مانند بیٹھی رہیں! اُسوقت اُنکو نہ تو اپنی ضعیفی کا خیال ستا رہا تھا نہ عُسرت و تنگدستی کا۔ وہ اس بات کے احساس سے بہت فخر کر رہی تھیں کہ دُنیا میں اُن کا وجود بیکار نہیں ہے اور اس حالت میں بھی وہ "قوت" اور "شان و شوکت" کا ایک ضروری "عنصر" ہیں۔

(ایچ۔ اے مَین ہوڈ)

دلّی کا ایک باکمال ناولسٹ

از جناب سیّد محمود مورّخ۔ بی۔ اے۔

ہندوستان فی زمانہ علوم وفنون کی کساد بازاری اور بے وقعتی کے لئے خاص طور پر شہرت رکھتا ہے۔ عوام کے مذاق اور جوہر امتیاز سے محروم ہونے کے باعث اہل فضل وکمال کی ہمتیں شکستہ ہو چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں تحصیلِ کمال کی تشویق اور تحریص کے اسباب مفقود ہیں۔ لیکن اس افسوسناک اور اندوہگیں حالت کے باوجود ہندوستان میں ایسی مقتدر ہستیوں کا فقدان نہیں جو اپنے کمالات کے باعث آنکھوں پر بٹھائے جانے کے قابل تھیں یا ہیں۔ لیکن شومئی قسمت کہ ہم اُن کے وجود تک سے قطعی بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ گویا جس عالمِ گمنامی میں وہ پیدا ہوئی تھیں اُسی بے خبری میں پیوندِ خاک ہو گئیں یا ہو جائینگی۔

گو اُردو ادب ابھی تک اپنی نوعمری کے دور سے گذر رہا ہے لیکن اس کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد واضح ہو جائیگا کہ ادبائے اُردو قطار در قطار کھڑے ہوئے ہیں۔ نذیر احمد اور آزاد و شبلیؔ و شررؔ۔ راشد الخیری اور عبد الحق۔ سجاد حیدر اور نیاز بلا شبہ ہمارے علم و ادب کے قابلِ فخر محسنین ہیں۔ اور ان کے احسانات سے اُردو ادب کبھی سُبکدوش نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان محسنوں اور سرپرستوں کی تعداد یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ بہت سے اصحابِ قلم ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے آپ کو چھُپایا یا کسی وجہ سے منظرِ عام پر نہ آ سکے۔ درحقیقت اُنہوں نے ادبِ اُردو کی خدمت کی۔ لیکن کسی سے داد طلب نہ ہوئے اور پبلک اُن کے کارناموں سے ناواقف رہ گئی۔

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

مولوی بشیر الدین احمد خلف الرشید ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم اُردو ادبا کے اسی طبقہ میں شامل ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عوام ان سے ایک حد تک واقفیت کا فخر رکھتے ہیں: تاہم ان کی اجتہادی قابلیت اور بے نظیر علمیت کے لحاظ سے ان کا دائرۂ شہرت بالکل محدود رہا اور عام طور پر کسی کو ان کے کارناموں کی عظمت اور ان کے ذاتی اوصاف سے آگاہی نہیں ہوئی۔ مولوی بشیر الدین احمد اپنے زمانے کے سربرآوردہ ادبا میں سے تھے۔ ان کی علمیت اور نکتہ شناسی بلا شبہ انہیں بہت سے پیشرو مشاہیر سے ممتاز ثابت کر سکتی ہے۔ اُنھوں نے اپنی مختصر حیات میں اپنے نامور والد اور اُردو کے محسنِ اعظم کی پیروی کرتے ہوئے سلسلۂ تعلیم نسواں پر بیش بہا ناول قلمبند کئے۔ پیرانہ سالی میں قصّہ کہانیوں سے گذر کر تاریخ کی طرف رُخ کیا۔ اور اس موضوع پر نہایت تحقیق اور تلاش سے کئی ضخیم کتابیں لکھیں، جن میں تاریخ بیجاپور اور اس اُجڑے دیار دہلی کی تاریخ زیادہ مشہور ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فطرت نے انہیں شاعر بھی پیدا کیا تھا۔ گو انھوں نے شاعری میں کمال حاصل کرنے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ لیکن پھر بھی جو کچھ لکھا اس کی وجہ سے اُنہوں نے شعرا کی صف میں نمایاں جگہ حاصل کر لی۔ اور ایک مکمل دیوان بطور یادگار چھوڑا۔

مولوی صاحب کے جملہ علمی و ادبی کارناموں پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ اس صحبت میں ہم مولوی صاحب کی صرف اُن کتابوں پر جن کا تعلق تعلیم نسواں سے ہے اپنی ناچیز رائے کا اظہار کریں گے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اُنہوں نے ہندوستانی خواتین کی کسقدر گرانبہا خدمات انجام دی ہیں۔

ابتدائی حالات:- مولوی بشیر الدین احمد شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب کے اکلوتے بیٹے تھے۔ مولانا نذیر احمد کے یوں تو بہت اولاد ہوئی۔ لیکن سب بچے چھوٹی عمر میں چل بسے۔ بے دیگر صرف ایک لڑکا زندہ رہا جو عموماً "میاں بشیر" کے نام سے موسوم ہے۔ مولوی صاحب ۴ اگست ۱۸۶۱ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے اپنا بچپن اور پیری کا زمانہ دہلی میں گزارا۔ مولوی صاحب کے والد مولانا نذیر احمد اُردو داں طبقہ میں تعارف کے محتاج نہیں۔ مولانا نے "میاں بشیر" کی تعلیم و تربیت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیکر اسے کماحقہٗ انجام تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مولوی صاحب نے خود اس امر کا بہ الفاظ ذیل اعتراف کیا ہے:-

"میں نے جو کچھ پڑھا لکھا اپنے والد ماجد سے ہی مستفید ہوا۔ ہمت از صدم کریم طلب ؛ خاک از تودۂ کلاں بردار۔ یہ اسی طبع گرامی کا فیضان ہے جو تالیف و تصنیف کی طرف میلان ہے۔" (دیباچہ اقبال دُلھن)

مولانا نذیر احمد نے مولوی صاحب کو اُردو۔ فارسی۔ عربی۔ انگریزی سب کچھ خود ہی پڑھایا لکھایا۔ اِنہیں کے لئے چند پند اور مایغنیک فی الصرف تصنیف کیں۔ ابتداً کسی اسکول میں اس لئے نہیں بٹھایا کہ گھر کی سی نگرانی نہ ہو سکے گی۔ مشفق باپ نے اُردو اور قدرے فارسی کے بعد عربی کا درس دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزی کی نوشت و خواند بھی جاری رہی۔ صرف دو برس کے لئے گورنمنٹ اسکول دہلی میں داخل کرا دیا۔ جنہوں نے مواعظ حسنہ کا مطالعہ کیا ہے اُن کو معلوم ہو گا کہ پدر مہربان نے اس زمانہ میں کیسی دلسوزی اور شفقت کے ساتھ اپنے ہونہار بیٹے کی تعلیم و تربیت جاری رکھی۔ مولوی صاحب نے اپنے ذہن رسا اور شوق مطالعہ کی مدد سے انگریزی اور عربی ادب پر بہت جلد عبور حاصل کر لیا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں انگریزی اور عربی الفاظ اور محاورات بے تکلف استعمال کئے ہیں۔

مولوی صاحب میں خداداد قابلیت کا مادہ موجود تھا۔ جو باپ کی بزرگانہ توجہات کے ساتھ سونے پر سوہاگہ کا کام کر گیا۔ اِنہیں کُتب بینی کا بیحد شغف تھا اور اس کے ذریعے سے اُنھوں نے تجربے مشاہدے اور معلومات کے وہ تمام درجے بسہولت طے کر لئے جنپر عبور حاصل کرنا انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہوتا ہے۔ اُن کی بلند نظری اور وسعت خیال کا ثبوت انکی تحریروں سے بھی ملتا ہے۔ جن کے مطالعہ کرنے والوں کو بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ ادیب کا ذہن گوناگوں جذبات و کمالات کا ایک گرانبہا مخزن ہے۔

مولوی صاحب نے زمانۂ ملازمت ہی میں اپنے نامور باپ کی خوشہ چینی شروع کر دی تھی اور جب مولانا نذیر احمد نے اپنی پختہ عمری اور تجربہ کے لحاظ سے بہت اعلیٰ و ارفع مضامین کی طرف توجہ مبذول کی اور سلسلہ تعلیم نسواں پر لکھنا ترک کر دیا۔ تو مولوی بشیر الدین احمد نے اس نیک کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور ۱۹۰۸ء میں اقبال دُلھن تصنیف کرکے اپنے والد کے قصص میں پیوند لگا دیا۔ باپ پر پوت۔ پتا پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا ہی تھوڑا۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی اولین کوشش میں ہی اپنے پدر بزرگوار کا رنگ پیدا کر لیا۔

انبال دلہن کے بعد اسی موضوع پر حُسنِ معاشرت اور اصلاحِ معیشت وغیرہ ناول لکھے جو ایسے ہی دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں جیسے مراۃ العروس۔

مولوی صاحب کو علمی مشاغل سے اس قدر شغف تھا کہ اطباء کے منع کرنے کے باوجود اپنی پیرانہ سالی کا بیشتر حصّہ تصنیف و تالیف میں صرف کیا۔ اسی محنت شاقہ کے سبب سے صحت نے جواب دیدیا۔ لیکن نوشت و خواند بمجبوری اُس وقت بند کی جب مرض فالج میں مبتلا ہوئے۔ اُس زمانہ میں وہ اُردو زبان کی ایک ایسی لغت تیار کر رہے تھے جس میں ضرب الامثال، دوہے، اصطلاحیں، محاورے۔ وغیرہ بڑی تعداد میں جمع تھے۔ افسوس کہ یہ کتاب نامکمل رہی۔ اگر مکمل ہو جاتی تو آپ اپنی نظیر ہوتی۔

آخر وہ وقت بھی آگیا جس سے کسی ذی روح ہستی کو چھٹکارا نہیں۔ ۲۴ راگست ۱۹۲۷ء کو چھیاسٹھ برس بیس دن کی عمر پاکر بعارضہ فالج (ان کے والد مولانا نذیر احمد نے بھی اسی مرض میں انتقال کیا تھا) آسمان علم و فضل کا یہ درخشاں ستارہ بھی غروب ہوگیا۔ اور اپنے پدر بزرگوار کے قریب خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے احاطے میں دفن ہوئے۔ گو ان کی روح اعلیٰ علیین میں پہونچ چکی ہے۔ اربعہ عناصر منتشر ہوگئے ہیں لیکن اُن کا چشمۂ فیض اب بھی جاری ہے جو ہمیشہ قوم و ملک کی ادبی تشنگی بجھاتا رہے گا اور اہلِ ذوق اس سے ہمیشہ سیراب ہوتے رہیں گے۔ ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعلم — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

بحیثیت ناول نگار:- مولوی بشیر الدین احمد کی تحریروں کا معیار بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور وہ فضائل و محاسن کمال کے اس درجہ تک پہنچ گئے تھے جو معمولی ادیبوں کے منتہائے نظر سے بھی اُدھر ہے۔ علمیت۔ ذہن رسا۔ طبع کی جولانی۔ فکر کی بلندی۔ خیالات کی نیرنگی یہی باتیں ہوتی ہیں جو ایک ادیب یا شاعر کے کلام کو مستند اور قابلِ قدر بنا دیتی ہیں اور انہیں اوصاف کی بدولت مولوی صاحب نے اپنی لافانی عظمت کا سامان مہیا کیا ہے۔

مولوی صاحب کے ناولوں اور اُن کی تحریروں کا بغور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے شیر اور ہر میدان کے مرد تھے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ بہت زیادہ لکھتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں بھرتی کے مضامین کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے ہر رنگ اور ہر نوع کے مضمون پر قلم اُٹھایا ہے اور بہت زیادہ لکھا ہے۔ لیکن کسی جگہ مضمون آفرینی کا پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ خیالات و جذبات کو خوبصورت طور پر ادا کرنے میں انہیں پوری قدرت حاصل تھی۔ زبان گھر کی لونڈی تھی۔ موزوں الفاظ گویا ان کے سامنے ہروقت صف باندھے کھڑے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے پختہ کار ادیب ہونے کی یہی دلیل کافی ہے کہ جس موضوع پر قلم اُٹھایا۔ خوب لکھا۔ اس قسم کی ہمہ گیر طبیعت ہر کس و ناکس کے حصّہ میں نہیں آتی جن صاحبان کامل کو قدرتی طور پر فضل و کمال کا یہ مرتبہ ملتا ہے وہ بطنِ مادر سے ہی صاحب فن پیدا ہوتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں مشاہیر کے حالاتِ زندگی شرح و بسط سے قلم بند کرنے کا طریقہ مروج نہیں ورنہ مولوی صاحب کی تحریر کے مختلف مدارج پر غور کرنا خالی از دلچسپی نہ تھا۔

ناول نویسی پر ایک نظر:- ناول نویسی ادب کی ایک نہایت دلچسپ و نہایت اہم شاخ ہے۔ ناول لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لئے کہ ناول نویسی کے لئے وسیع مطالعہ تحقیق و تدقیق کی زیادہ ضرورت نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر زبان میں افسانہ نویسوں کی افراط ہے۔ اور مشکل اس لئے کہ طویل افسانہ میں تسلسل اور معیار قائم رکھنا

اور دلچسپی اور دلکشی پر ضرب نہ آنے دینا اور آئینِ فطرت کا ہر مقام پر خیال رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ ستر فیصدی بلکہ اس سے بھی زیادہ ناول ناکام رہتے ہیں۔

یہ بتانا کہ ناول نویسی کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی بہت مشکل ہے۔ سالہاسال کی دماغ سوزی اور کاوش کے باوجود بھی محققینِ علم تاریخ اس کا صحیح جواب دینے سے عاجز ہیں، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جہاں تک کھوج لگایا جاسکا ہے ہر ملک اور ہر زبان میں قصہ کہانیوں کا وجود پایا گیا ہے۔ اور اس لئے بعض محققین کا خیال ہے کہ افسانہ کا وجود ابتدائے آفرینش سے چلا آتا ہے۔ اور اس نے ارتقائی منازل طے کرکے موجودہ شکل اختیار کر لی ہے۔ اب چونکہ اہلِ مشرق نے ہی سب سے پہلے علم و ادب کی شمع روشن کی تھی اور اس میں انتہائی کمال حاصل کر لیا تھا۔ اس لئے ناول نویسی کی ایجاد کا سہرا انہیں کے سر باندھنا کوئی حیرت خیز بات نہیں ہے۔ لیکن قدیم زمانہ کے قصوں میں ایسے ایسے عجیب و غریب واقعات بیان کئے گئے ہیں جو کبھی نہ واقع ہوئے اور نہ ہونگے۔ انسان کے افعال اور کردار کا ذکر کچھ اس پیرایہ میں کیا ہے کہ نہ کبھی سرزد ہوئے ہوں اور نہ ہو سکیں۔ ان میں فطرت کے خلاف رزم آرائی ہے اور سچائی سے جنگ۔ تاریخ کی صورت مسخ کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر "داستان امیر حمزہ" پر غائر نظر ڈالئے۔ امیر حمزہؓ آنحضرتؐ کے چچا تھے۔ لیکن ہمارے افسانہ نویسوں نے جن افعال و کردار کو اُن کی طرف منسوب کیا ہے یا جو واقعات بیان کئے ہیں ان میں سے ایک بھی سچا نہیں ۔ اور اکثر مقامات پر تو وہ باتیں لکھدی ہیں جن کو عقل سلیم کبھی تسلیم نہیں کرسکتی اسی طرح "طلسم ہوشربا" میں غلط بیانی اور دروغگوئی کی انتہا کردی ہے۔ تاریخی ہستیوں سے وہ افعال سرزد کرائے ہیں جو فرشتوں سے بھی نہ ہوسکیں۔ اور اس دُنیا میں تو ان کا کبھی سرزد ہونا غیر ممکن ہے۔ نوشیرواں اور امیر حمزہؓ کے تاریخی نام لیکر بیہودہ نویسی کا طومار باندھدیا ہے۔ اگرچہ اس نوع کے بیہودہ قصے ایک عقلمند قاری کو گناہ کرنے پر مجبور نہیں کرتے لیکن ارتکابِ معصیت کا سبق ضرور پڑھاتے ہیں۔ عاشقِ ناشاد بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور بعض مقامات پر ایسے مخرب الاخلاق اور معیوب واقعات تحریر کر دیتے ہیں۔ اور ایسے واہیات الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ اگر خواتین اُن کا مطالعہ کریں تو اُن کی پاک دامنی پر دھبہ لگنے کا اندیشہ ہے۔

ادبِ اُردو میں اس نوع کے دقیانوسی قصوں کی کمی نہیں۔ نظم و نثر دونوں میں یہ زہر حلول کر گیا ہے مولانا نذیر احمد مرحوم کا یہ احسان اُردو اور اُردو داں طبقہ ہرگز نہیں بھُلا سکتا ہے کہ اُنہوں نے قصوں کی مخرب الاخلاق تعلیم سے متاثر ہو کر اُسکے خلاف عملی طور پر علم جہاد بلند کیا۔ اور اُردو ادب میں ناول نویسی کی ایک نئی بنیاد رکھی جو مذکورہ بالا جملہ عیوب سے پاک تھی مولانا نذیر احمد کے بعد اکثر ناول نویسوں نے اُن کی پیروی کرنے کی سر توڑ کوشش کی مگر اُن کا عشر عشیر بھی پیش نہ کر سکے۔ ہاں اگر مولانا نذیر احمد کے بعد کسی نے صحیح طور پر ان کی تقلید کی اور ان کا سا رنگ پیدا کیا تو وہ صرف مولوی بشیر الدین احمد ہی کی ذات ہے۔ مولانا نذیر احمد اور ان کے ساتھ ہی مولوی بشیر الدین احمد کے ناولوں کی خصوصیت، زبان کی فصاحت و بلاغت ہے ظرافت اور لطافت تفریحِ طبع کے لئے موجود ہے۔ پند و نصائح عاقلانہ مذہب کی چاشنی کے ساتھ ایسے بیان کئے ہیں کہ دلوں میں نیکی کا خیال پیدا کرتے ہیں اور عقل و شعور کو بڑھاتے ہیں اور اسلئے وہ ہر طبقہ اور ہر سوسائٹی میں مقبولِ عام ہیں۔

ناول کی قسمیں:-

چونکہ ناول پڑھنے میں ذہن اور طبیعت پر بہت کم زور پڑتا ہے۔ اور بغیر غور اور مطالعہ کی محنت کے دلچسپ مضامین نظر آتے ہیں اسی وجہ سے ناول نویسی کا بازار بہت گرم ہے۔ کُتب فروشوں کی دکانوں

بر اثر انداز ہے، لیکن ان میں کئی قسم اور نوع کے ناول ہوتے ہیں۔ ناقدان ادب نے ناولوں کو پانچ بڑی بڑی قسموں میں منقسم کیا ہے:۔

(۱) معاشرتی یا اصلاحی (۲) مقصدی (۳) تاریخی (۴) جاسوسی۔ اور (۵) ظریفانہ۔

مولوی بشیر الدین احمد کے ناول پہلی دو قسموں کے ناولوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں اور مولانا نذیر احمد کے ناول بھی اسی نوع کے ہیں۔ مولانا عبد الحلیم شرر، حکیم محمد علی خاں۔ علامہ راشد الخیری وغیرہ تاریخی اور معاشرتی ناول لکھنے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ مرزا فدا علی خنجر۔ آغا بہار۔ منشی سجاد حسین اور مرزا عظیم بیگ چغتائی وغیرہ کے جاسوسی اور ظریفانہ ناول بہت مشہور ہیں۔

مولوی صاحب کے ناولوں کے مقاصد:-

مولوی بشیر الدین احمد نے اپنے ناول اپنے والد بزرگوار کی تقلید میں لکھے ہیں جیسا خود اُنھوں نے بہ این الفاظ اعتراف کیا ہے کہ "مجھے مدت سے یہ خیال تھا کہ اگر ہو سکے تو اسی راستے پر چلوں جس کی داغ بیل اُنھوں (مولانا نذیر احمد) نے ڈالی۔ چنانچہ اسی طرز کی یہ کتاب (اقبال دُلھن) ناظرین کے ملاحظہ کے لئے پیش ہے۔" اُنھوں نے سلسلہ تعلیم نسواں پر اقبال دُلھن، حسن معاشرت، اصلاح معیشت وغیرہ شہرۂ آفاق ناول لکھے جو سراسر مقصدی اور اصلاحی ناول کہلانے کے مستحق ہیں۔ اگر آپ ان تینوں ناولوں کا بغور مطالعہ کریں تو آپ پر واضح ہو جائیگا کہ ان کے لکھنے میں تین مقاصد مولانا کے پیش نظر تھے۔ ان کا اولین مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں جو معیوب و مذموم رسومات اور فضول خرچیاں رائج ہو گئی ہیں اور جو مسلمانوں اور اسلام کو بدنام کر رہی ہیں اُن کی اصلاح کی جائے۔ اُن کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی اولاد اور خاص کر لڑکیوں کو تعلیم دلوانے کی ترغیب دی جائے۔ اور اس معاملہ میں بحث و مباحثہ اور وعظ و تقریر کے بالمقابل قصہ کہانیاں جس قدر زود اثر اور کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔ اس پر کچھ لکھنا بیکار ہے۔ اس لئے سب سے پہلے مولانا نذیر احمد نے اور اُن کے بعد مولوی بشیر الدین احمد نے علم جہاد بلند کیا تھا۔ اور مسلمان لڑکیوں میں جو کچھ تعلیم کا چرچا آج دیکھنے میں آتا ہے وہ اسی نیک جہاد کا نتیجہ ہے۔ مولوی صاحب کا تیسرا مقصد تعلیم کے لئے اعلیٰ معیار اور با اخلاق لٹریچر بہم پہنچانا تھا۔ مولوی صاحب نے خود اپنے قلم سے اقبال دُلھن لکھنے کا مقصد اس طرح بیان کیا ہے:-

"میں نے اس قصہ میں پرانے اور حال کے طریقۂ تعلیم کو بمقابلہ دکھلایا ہے۔ انگریزی تعلیم سے جو آزادانہ خیالات اور تنزل عقائد عموماً پیدا ہو جاتے ہیں حتی المقدور اس کی روک تھام کی کوشش کی ہے مسلمانوں کے شریف گھرانوں کے تمدنی حالات، بیاہ شادی۔ مرنے۔ جینے کی رسوم کو علی التسلسل بیان کیا ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات اور کس طرح ایک کو دوسرے کے ساتھ حسن سلوک سے زندگی بسر کرنی چاہیئے بالتفصیل لکھا ہے۔ بڑی احتیاط اس بات کی کی گئی ہے کہ کتاب بھر میں ایک لفظ بھی ایسا نہ ہو کہ جو شرفا کی بہو بیٹیوں کی نظر سے گذرنے کے قابل نہ ہو" (دیباچۂ اقبال دُلھن)

"اصلاح معیشت" کے متعلق لکھا ہے کہ "اقبال دُلھن" اور "حسن معاشرت" خوب چل پڑی ہیں، اور میں دیکھتا ہوں تو انھوں نے اچھا اثر دکھایا ہے۔ اس لئے مجھے جرأت ہوئی کہ لاؤ تیسری کتاب ایک اچھوتے مضمون پر لکھوں اور وہ یہ کہ عورتیں ہی مردوں کی بگاڑنے اور سنوارنے والیاں ہیں۔...... ہم نے اس قصہ میں ایک ہی گھر کی دو سگی بہنوں کے حالات قلم بند کئے۔ ایک نے اپنے بگڑے ہوئے شوہر کو سدھار لیا اور دوسری نے بنائے شوہر کو کھو بیٹھی...... ہماری غرض اس کتاب کے لکھنے سے یہی ہے کہ بیاہی عورتیں اس ہیبت ناک فوٹو سے متاثر ہوں اور جو اب دُنیا میں ازدواجی زندگی شروع کرنے والی ہیں وہ ان باتوں سے

جو دلوں میں تفرقہ ڈالتی ہیں اور بھلے چنگے شوہر کو دشمن بناتی ہیں محترز رہیں" مراۃ العروس کے لکھے جانے کا مقصد بھی یہی ہے۔ اور آپ غور کریں کہ تعلیم نسواں کے موضوع پر کتابیں لکھنے کا اس سے زیادہ اور کیا نیک مقصد ہو سکتا ہے۔

موضوع:- ناول کے مقصد کے بعد جو چیز دیکھی جاتی ہے وہ اُس کا موضوع ہے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر والٹر بلینٹ نے لکھا ہے کہ :" ناول کے موضوع کی وسعت خود ذاتِ انسانی سے کسی طرح کم نہیں۔ ناول نگار عورتوں اور مردوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا تعلق اُنکے افعال۔ اُن کے خیالات۔ اغلاط۔ خامیاں۔ ان کی عظمت اور ان کی فرومائیگی سے ہے۔ بے شمار حسین اشکال۔ ان کی متلون مزاجی۔ خوف۔ احساسات۔ جوش اور جذبات جو قلب انسانی میں تموج برپا رکھتے ہیں۔ یہ سب ناول کے موضوع ہیں۔ مختصر یہ کہ اس کا موضوع خود انسان ہے" اس کے علاوہ دُنیا کی ہر شے ناول کا موضوع بن سکتی ہے۔ خواہ وہ اچھی ہو یا بُری۔ مگر یہ ناول نویس کے رُجحانِ طبیعت اور قابلیت پر منحصر ہے کہ وہ ایک بہترین چیز کو اپنے ناول میں ذلیل اور معیوب حالت میں پیش کرے۔ اور ایک نہایت مذموم چیز کو اعلیٰ درجہ دے۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ موضوعِ ناول بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن ناول نویس نے اسے ایک عجیب و غریب جامہ پہنا دیا ہے۔ جس کی بدولت وہ بھی قابلِ اعتنا ہو گیا۔ اس سے ناول نگار کا فطری رجحان ظاہر ہوتا ہے۔ اگر آپ اُردو کے مشہور ناولوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا۔ کہ اکثر ناول نویس ایک شریف انسان کو اپنے ناول کا موضوع قرار دیتے ہیں اور پہلے اس میں وہ وہ خوبیاں پیدا کرتے ہیں جو اگر تلاش کی جائیں تو ممکن ہے کہ فرشتہ میں بھی موجود نہ ہوں۔ اور اس کے بعد اسی میں مذموم معیوب اور کمینی عادتیں پیدا کرتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس بھی دیکھنے میں آیا ہے۔

مولوی بشیر الدین احمد کے سب ناولوں میں انسان ہی کا ذکر ہے۔ اور پُرانے قصّوں کی طرح مافوق الفطرت باتیں تحریر کرکے اپنا اور قاری کا وقت خراب کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ اپنی اور ہماری گھریلو زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع قرار دیکر اور اپنی وسیع النظر اور عمیق مطالعہ سے کام لیکر قاری کی توجّہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ (باقی آیندہ)

انسان

مہر و مہ میرے لئے ہیں، کہکشاں میرے لئے گرم ہے محفلِ سیارگاں میرے لئے
یہ زمیں میرے لئے ہے، آسماں میرے لئے خلق کی قدرت نے بزمِ دو جہاں میرے لئے
وسعتِ گیتی ہے میری سلطنت، سلطاں ہوں میں
عرش و کرسی تک رسائی ہے مری انساں ہوں میں

ہوں وہ میکش عالمِ امکاں ہے میخانہ مرا مہر و مہ کی شکل میں چلتا ہے پیمانہ مرا
جامِ کوثر کی زباں سے سن لے افسانہ مرا ہے لبِ کروبیاں پر ذکرِ مستانہ مرا
لالہ و گل ہی نہیں ہیں ساغری کے واسطے
حوریانِ خلد ہیں ساقی گری کے واسطے

کون کہتا ہے فقط ترکیبِ آب و گل ہوں میں چشمِ عرفاں کے لئے اسرار کا حامل ہوں میں
الغرض جس رنگ میں ہوں دید کے قابل ہوں میں محفلِ ہستی ہے شاہد رونقِ محفل ہوں میں
جس کی شانِ دلفریبی میرے دم سے تازہ ہے
چار دانگِ صحنِ امکاں میں مرا آوازہ ہے

میں زمیں پر ہوں تخیل ہے فلک پیما مرا کاشفِ اسرارِ فطرت ہے لبِ گویا مرا
کائناتِ ہست ہے دھندلا سا اک نقشہ مرا اصل تو یہ ہے کہ دم بھرتی ہے یہ دنیا مرا
شورشِ ہستی مری ہنگامۂ پیغامِ "کن"
نامِ نامی ہے مرا سرنامۂ پیغامِ "کن"

نام ہے میرا ازل سے سرخوشِ صہبائے عشق میری فکرِ نکتہ رس ہے واقفِ ایمائے عشق
ہوں وہ عاشق، ہے تصرف میں مرے دنیائے عشق حسن میری مملکت ہے اور میں دارائے عشق
مجھ پہ روشن من و عن احوالِ مہر و ماہ ہے
آسمانوں کی بلندی میری جولانگاہ ہے

کاروانِ ارتقا کا مقتدا کہیئے مجھے رہروانِ زندگی کا رہنما کہیئے مجھے

جوہرِ آئینۂ قدر و قضا کہیے مجھے
بے تکلف مظہرِ شانِ خدا کہیے مجھے

ہیں مسخّر بحر و بر بھی دیکھیے لہنا مرا
کہتے ہیں "انسان" مجھکو واہ کیا کہنا مرا

اوجِ گردوں پر ہیں گرمِ سیر طیارے مرے
دیکھتا ہے آسماں حیرت سے نظارے مرے

اس علوئے عزم پر ہیں نغمہ خواں تارے مرے
مہر و مہ کہلائے جاتے ہیں جگر پارے مرے

حکم برداروں میں میرے غرب بھی ہے شرق بھی
ہے تصرف میں مرے موجِ ہوا بھی، برق بھی

تنگدل کیوں ہوں جفائے گردشِ دوراں سے میں
کام لے سکتا نہیں کیا ہمتِ انساں سے میں

ہمتِ انساں سے ہوتے کیا ڈروں طوفاں سے پَر
کھیلتا رہتا ہوں گردابِ بلا ساماں سے میں

وہ سفینے ہیں مرے جن کی جہاں میں دھاک ہے
سینۂ قلزم مری ہمت وری سے چاک ہے

اِس خمستانِ جہاں میں ہوں امیرِ میکدہ
میکدے والے مجھے کہتے ہیں پیرِ میکدہ

لغزشِ مستانہ میری دست گیرِ میکدہ
ہوئے رندانہ میں پنہاں ہے ضمیرِ میکدہ

سرخوشِ صہبائے فطرت کون ہے؟ میں ہی تو ہوں
قاسمِ انعامِ قدرت کون ہے میں ہی تو ہوں

پیکرِ منصور ہوں میں قطبِ جیلانی ہوں میں
مادّی ہستی ہے لیکن کیفِ روحانی ہوں میں

کیفِ روحانی نہیں اِک امرِ ربانی ہوں میں
کہیے جسکو زندۂ جاوید وہ فانی ہوں میں

ہیں نہاں معنائے ہست و بود میرے نام میں
"آدمی" کہتے ہیں لیکن اصطلاحِ عام میں

ڈر نہیں زہرابِ غم کی تلخ کامی سے مجھے
عار ہے ابنائے دوراں کی غلامی سے مجھے

پختہ مغزِ عشق ہوں کیا خطرہ خامی سے مجھے
نسبتیں حاصل ہیں اِک ذاتِ گرامی سے مجھے

اپنے منصب کو کسی صورت گنوا سکتا نہیں
جان دے سکتا ہوں لیکن سر جھکا سکتا نہیں

شہاب سیوہاروی

چوری

از جناب سعادت حسن منٹو

"بابا جی، کوئی کہانی سُنائیے"

سکول کے تین چار لڑکے الاؤ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور اُس بوڑھے آدمی سے جو ٹاٹ پر بیٹھا اپنے استخوانی ہاتھ آگ تاپنے کی خاطر الاؤ کی طرف بڑھائے ہوئے تھا کہنے لگے۔

مردِ معمّر نے جو غالباً کسی گہری سوچ میں غرق تھا اپنا بھاری سر اٹھایا، جو گردن کی لاغری کی وجہ سے نیچے کو جھکا ہوا تھا۔ "کہانی ——— میں خود کہانی ہوں مگر ———"

اس کے بعد کے الفاظ اُس نے اپنے پوپلے منہ میں ہی بڑبڑائے ——— شاید وہ اس جملے کو لڑکوں کے سامنے ادا کرنا نہیں چاہتا تھا جن کی سمجھ اس قابل نہ تھی کہ وہ اس قسم کے فلسفیانہ نکات حل کر سکیں۔

لکڑی کے ٹکڑے ایک شور کے ساتھ جل جل کر الاؤ کے آتشیں شکم کو پُر کر رہے تھے، شعلوں کی عنابی روشنی لڑکوں کے معصوم چہروں پر ایک عجیب انداز میں رقص کر رہی تھی، ننھی ننھی چنگاریاں سپید راکھ کی نقاب اُلٹ اُلٹ کر حیرت میں سر بلند شعلوں کا مُنہ تک رہی تھیں، درختوں کے خشک پتّے بڑی دلیری سے آگ کا مقابلہ کرتے ہوئے اس شعلہ افشاں قبر میں ہمیشہ کے لئے کود رہے تھے، سرد ہوا کے جھونکے کوٹھڑی کی گرم فضا کا استقبال کرتے ہوئے اُس کے ساتھ بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہو رہے تھے ——— کونے میں مٹّی کا ایک دیا اپنی کمزور روشنی پر آنسو بہا رہا تھا۔

"کہانی! ——— ہر روز کہانی! کل سُناؤنگا" بوڑھے آدمی نے الاؤ کی روشنی میں سے لڑکوں کی طرف نگاہیں اُٹھا کر کہا

لڑکوں کے تمتمائے ہوئے چہروں پر افسردگی چھا گئی ناامیدی کے عالم میں وہ ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے "آج رات کہانی سُننے کے بغیر سونا ہوگا"

یکایک اُن میں سے ایک لڑکا جو دوسروں سے بہت ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتا تھا، الاؤ کے قریب سرک کر بلند آواز میں بولا "مگر کل آپ نے وعدہ کیا تھا ——— اور وعدہ خلافی کرنا درست نہیں۔ کیا آپکو کل والے حامد کا انجام یاد نہیں جو ہمیشہ اپنا کہا بھول جایا کرتا تھا"

"درست: ——— میں بھول گیا تھا" بوڑھے آدمی نے یہ کہتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا، جیسے وہ اپنی بھول پر نادم ہے۔ تھوڑی دیر وہ اس دلیر لڑکے کی جرأت کا خیال کر کے مسکرایا۔ "میرے بچے! مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، معاف کر دو ——— مگر میں کونسی کہانی سناؤں؟ ——— ٹھہرو مجھے یاد کر لینے دو"

یہ کہتے ہوئے وہ سر جھکا کر گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ اُسے جن اور پریوں کی لایعنی داستانوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ بچّوں کو وہی کہانیاں سُنایا کرتا تھا جو اُن کے دل و دماغ کی اصلاح کر سکیں۔ اُسے بہت سے فضول قصّے یاد تھے جو اُس نے اپنے ایامِ طفلی میں سُنے تھے یا کتابوں میں پڑھے تھے۔ مگر وہ اس وقت اپنے بربطِ پیری کے بوسیدہ تار چھیڑ رہا تھا کہ شاید اُن میں کوئی خوابیدہ راگ جاگ اُٹھے۔

لڑکے باباجی کو خاموش دیکھ کر آپس میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے، غالباً وہ کسی لڑکے کا ذکر کر رہے تھے جسے کتاب چُرانے پر بید کی سزا ملی تھی، باتوں باتوں میں اُن میں ایک ذرا بلند آواز میں بولا "ماسٹر جی کے لڑکے نے بھی تو میری کتاب چُرائی تھی مگر اُسے سزا ذرا نہ ملی تھی۔

"کتاب چُرائی تھی"! ان تین لفظوں نے جو پوری آواز میں ادا کئے گئے تھے، بوڑھے کی خفتہ یاد میں ایک واقعے کو جگا دیا۔ اُس نے اپنا سپید سر اُٹھایا اور آنکھوں کے سامنے اس فراموش کردہ داستان کو انگڑائیاں لیتے ہوئے پایا۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی مگر ساتھ ہی وہیں غرق ہو گئی۔ ـــــ اضطراب کی حالت میں اُس نے اپنے نحیف جسم کو جنبش دیکر الاؤ کے قریب کیا۔ اُس کے چہرے کے تغیر و تبدل سے صاف طور پر عیاں تھا کہ وہ کسی واقعے کو دوبارہ یاد کر کے بہت تکلیف محسوس کر رہا ہے۔

الاؤ کی روشنی بدستور لڑکوں کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔ دیا اُسی طرح اپنے جلے نصیبوں کو رو رہا تھا۔ کوٹھڑی کے باہر رات سیاہ زلفیں بکھیرے روشنی کی طرف اپنی تاریک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ لڑکے آپس میں سکول کی باتیں کرنے میں مشغول تھے ـــــ چھت جُھک کر اُن کی معصوم باتوں کو کان لگا کر سُن رہی تھی۔

دفعتہً بوڑھے نے آخری ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ "بچو!ـــ آج میں اپنی کہانی سُناؤنگا"

لڑکے فوراً اپنی گفتگو چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ الاؤ کی چیختی ہوئی لکڑیاں ایک شور کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر اُبھر کر خاموش ہو گئیں ـــ ایک لمحہ کیلئے فضا پر مکمل سکوت طاری رہا۔

"اپنی کہانی سُنائینگے؟" ایک لڑکے نے خوش ہو کر کہا۔ باقی سرک کر آگ کے قریب خاموشی سے بیٹھ گئے۔

"ہاں اپنی کہانی" یہ کہہ کر بوڑھے آدمی نے اپنی جھکی ہوئی گھنی بھوؤں میں سے کوٹھڑی کے باہر تاریکی میں دیکھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر لڑکوں سے مخاطب ہوا۔

"میں آج تمہیں اپنی پہلی چوری کی داستان سُناؤنگا"

لڑکے حیرانی میں ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔ انہیں دراصل یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ باباجی کسی زمانے میں چوری بھی کرتے رہے ہیں ـــ باباجی جو ہر وقت انہیں بُرے کاموں سے بچنے کے لئے نصیحت کیا کرتا ہے۔

لڑکا جو اُن سب میں دلیر تھا، اپنی حیرانی نہ چھپا سکا۔ "مگر کیا آپ نے واقعی آپ نے چوری کا ارتکاب کیا تھا؟"

"واقعی!"

"آپ اُس وقت کونسی جماعت میں پڑھا کرتے تھے؟"

"نویں میں!"

یہ سُن کر لڑکے کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ اُسے اپنے بھائی کا خیال آیا جو نویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ وہ اُس سے عمر میں دوگنا بڑا تھا، اس کی تعلیم اُس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ انگریزی کی کئی کتابیں پڑھا ہوا تھا اور اُسے ہر وقت نصیحتیں کیا کرتا تھا۔ ـــ پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ اس عمر کا لڑکا اور اچھا پڑھا لکھا چوری کرے؟ اُس کی عقل اس معمّہ کو حل نہ کر سکی۔ چنانچہ پھر اُس نے سوال کیا۔

"آپ نے چوری کیوں کی تھی؟"

یہ مشکل سوال دیکھ کر بوڑھا بہت گھبرایا۔ آخر وہ اس کا کیا جواب دے سکتا تھا کہ فلاں کام اُس نے کیوں کیا؟ بظاہر اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا۔ "اس لئے کہ اس وقت دماغ میں یہی خیال آیا"

بوڑھے نے دل میں یہی جواب سوچا مگر اس سے مطمئن نہ ہو کر بہتر خیال کیا کہ تمام داستان من و عن بیان کر دی جائے،

اس لئے کہ وہ بذاتِ خود اس سوال کا سب سے آسان جواب ہے۔

اُس کا جواب میری کہانی ہے جو میں تمہیں سُنانے والا ہوں"۔

"سُنائیے"

لڑکے اُس بوڑھے آدمی کی چوری کا حال سُننے کے لئے اپنی اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئے جو الاؤ کے سامنے اپنے سپید بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا اور جسے وہ ایک بڑا آدمی خیال کرتے تھے۔

مردِ معمر کچھ عرصے تک خاموش اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ پھر اُس بھُولے ہوئے واقعے کے تمام ٹکڑے فراہم کرنے کے بعد بولا "ہر شخص خواہ وہ بڈھا ہو یا چھوٹا اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی ضرور ایسی حرکت کرتا ہے، جس پر وہ تمام عمر نادم رہتا ہے میری زندگی میں سب سے بُرا فعل ایک کتاب کی چوری ہے ـــــ"

یہاں تک پہونچکر وہ رُک گیا۔ اُس کی آنکھیں جو ہمیشہ ایک ناقابلِ بیان انداز میں چمکتی رہتی تھیں دُھندلی پڑ گئیں۔ اُس کے چہرے کی تبدیلی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے زبردست ذہنی تکلیف کا سامنا کر رہا ہے چند لمحات کے توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

"سب سے مکروہ فعل کتاب کی چوری ہے جو میں نے ایک کتب فروش کی دکان سے چُرائی۔

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب میں نویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ قدرتی طور پر جیسا کہ آپ کو کہانی سُننے کا شوق ہے، مجھے افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق تھا ـــــ نہیں خبط تھا۔ دوستوں سے مانگ کر یا خود خرید کر، میں ہر ہفتے ایک نہ ایک کتاب کا ضرور مطالعہ کیا کرتا تھا۔ وہ کتابیں عموماً عشق و محبت کی بے معنی داستانیں یا فضول جاسوسی قصے ہوا کرتے تھے۔

یہ کتابیں میں ہمیشہ چھُپ چھُپ کر پڑھا کرتا تھا۔ میرے والدین کو میری اس حرکت کی کوئی خبر نہ تھی۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ مجھے ہرگز ہرگز ایسا کرنے نہ دیتے، اس لئے کہ اس قسم کی کتابیں سکول کے لڑکے کے لئے سخت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ میں اُن کے مہلک نقصان سے غافل تھا۔ چنانچہ مجھے اس کا نتیجہ بھُگتنا پڑا ـــــ میں نے چوری کی اور پکڑا گیا ـــــ"

"آپ پکڑے گئے؟" ایک لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ہاں پکڑا گیا ـــــ چونکہ میرے والدین اس واقعے سے بالکل بے علم تھے، یہ عادت پکتے پکتے میری طبیعت بن گئی۔ اب مجھے ہر روز ایک کتاب یعنی ناول کی ضرورت لاحق رہنے لگی۔ گھر سے جتنے پیسے ملتے میں انہیں جوڑ جوڑ کر بازار سے افسانوں کی کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتا۔ سکول کی پڑھائی سے رفتہ رفتہ مجھے نفرت ہونے لگی۔ بس ہر وقت میرے دل میں یہی خیال سمایا رہتا تھا کہ فلاں کتاب جو فلاں ناول نویس کی لکھی ہوئی ہے، ضرور پڑھنی چاہیئے، یا فلاں کُتب فروش کے پاس نئے ناولوں کا ایک ذخیرہ موجود ہے، وہ ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیئے ـــــ شوق کی یہ انتہا دوسرے معنوں میں دیوانگی ہے۔ اس حالت میں انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے والا ہے یا کیا کر رہا ہے۔ اُس وقت وہ ایک بے عقل بچے کے مانند ہوتا ہے جو اپنی طبیعت خوش کرنے یا شوق پورا کرنے کے لئے جلتی آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اُسے یہ خبر نہیں ہوتا کہ وہ چمکنے والی شے جسے وہ پکڑ رہا ہے اُس کا ہاتھ جلا دیگی ـــــ ٹھیک یہی حالت میری تھی، فرق صرف اتنا ہے کہ بچہ شعور سے محروم ہوتا ہے اسلیئے وہ بغیر سمجھے بوجھے بُری سے بُری حرکت کر بیٹھتا ہے۔ مگر میں نے عقل کا مالک ہوتے ہوئے ایسے مکروہ جُرم کا ارتکاب کیا ـــــ یہ آنکھوں کی موجودگی میں میرے اندھے ہونے کی دلیل تھی میں ہرگز ایسا نہ کرتا اگر میری عادت مجھے مجبور نہ کرتی۔

ہر انسان کے دماغ میں شیطان موجود ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً اُسے بُرے سے بُرے کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ شیطان مجھ پر

اُس وقت غالب آیا۔ جبکہ مجھے سوچنے کا بہت کم وقت تھا۔ "خیر!" لڑکے خاموشی سے بُوڑھے آدمی کے ہلتے ہوئے لبوں کی طرف نگاہیں گاڑے اُس کی داستان کوسُن رہے تھے۔ داستان کا تسلسل اس وقت ٹوٹتے دیکھ کر جبکہ اصل واقعہ بیان کیا جانے والا تھا وہ بڑی بیقراری سے بقایا تفصیل کا انتظار کرنے لگے۔

"مسعود بیٹا، یہ سامنے والے دروازہ تو بند کر دینا ۔۔ سرد ہوا آرہی ہے" بُوڑھے نے اپنا کمبل گھٹنوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔ مسعود۔ "اچھا باباجی!" کہہ کر اُٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"ہاں، تو ایکدن جبکہ والد گھر سے باہر تھے" بُوڑھے نے اپنی داستان سُنانا شروع کر دی۔ "مجھے بھی کوئی خاص کام نہ تھا۔ اور وہ کتاب جو میں اُن دنوں پڑھ رہا تھا قریب الاختتام تھی، اس لئے میرے جی میں آئی کہ چلو فلاں کُتب فروش تک ہو آئیں جس کے پاس بہت سے جاسوسی ناول پڑے ہوئے ہیں۔

میری جیب میں اُس وقت کچھ پیسے موجود تھے جو ایک معمولی ناول کے دام ادا کرنے کیلئے کافی تھے۔ چنانچہ میں گھر سے سیدھا اُس کُتب فروش کی دُکان پر گیا۔ یوں تو اُس دُکان پر ہر وقت اچھے اچھے ناول موجود رہتے تھے، مگر اُس دن خاص طور پر بالکل نئی کتابوں کا ڈھیر باہر تختے پر رکھا ہوا تھا ۔۔ ان کتابوں کے رنگ برنگی سرورق دیکھ کر میری طبیعت میں ہیجان سا برپا ہو گیا۔ دل میں یہ خواہش چٹکیاں لینے لگی کہ وہ تمام میری ملکیت بن جائیں۔

میں دُکان دار سے اجازت لیکر اُن کتابوں کو ایک نظر دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ ہر کتاب کے شوخ رنگ سرورق پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی۔ "ناممکن ہے کہ اِس کا مطالعہ آپ پر سنسنی طاری نہ کر دے" "مصوّر اسرار کا لاثانی شاہکار" "تشلیل، ہیجان! سنسنی! رومان! ۔۔ سب کچھ!"

اِس قسم کی عبارتیں اشتیاق بڑھانے کے لئے کافی تھیں۔ مگر میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اِس لئے کہ میری نظروں سے اکثر ایسے الفاظ گذر چکے تھے۔ گو اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خواہش ضرور تھی کہ میں اُن کتابوں کا مالک بن جاؤں ۔۔ خیر! میں تھوڑا عرصہ کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اُس وقت میرے دل میں چوری کرنے کا خیال مطلقاً نہ تھا بلکہ میں نے خریدنے کے لئے ایک کم قیمت کا ناول چُن کر علیحدہ کر رکھا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد دل میں یہ ارادہ کر کے کہ میں دوسرے ہفتے ان ناولوں کو دوبارہ دیکھنے آؤنگا، میں نے انتخاب کردہ کتاب اُٹھائی ۔۔ کتاب کا اُٹھانا تھا کہ میری نگاہیں ایک مجلّد ناول پر گر گئیں۔ سرورق کے ایک کونے میں میرے محبوب ناولسٹ کا نام سُرخ لفظوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے ذرا اوپر کتاب کا نام تھا:۔

"منقسم شعاعیں۔ کس طرح ایک دیوانے ڈاکٹر نے تمام لندن کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا"

یہ سطور پڑھتے ہی میرے اشتیاق میں ایک قسم کی طغیانی آگئی۔ کتاب کا وہی مصنف تھا جس نے اس سے پیشتر مجھ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ ناول کو دیکھتے ہی میرے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔

"منقسم شعاعیں ۔۔ دیوانے ڈاکٹر کی ایجاد ۔۔ کیسا عجیب افسانہ ہوگا!"

لندن تباہ کرنے کا ارادہ ۔۔ یہ کسطرح ہو سکتا ہے؟ اس مصنف نے فلاں فلاں کتابیں کتنی سنسنی خیز لکھی ہیں! یہ کتاب ضرور اُن سب سے بہتر ہوگی!

میں خاموش اُسی کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ خیالات یکے بعد دیگرے میرے کانوں میں شور برپا کر رہے تھے۔ میں نے اُس کتاب کو اُٹھایا اور کھولکر دیکھا تو پہلے ورق پہ یہ عبارت نظر آئی۔

مصنّف اِس کتاب کو اپنی بہترین تصنیف قرار دیتا ہے۔

اِن الفاظ نے میرے اشتیاق کی آگ میں ایندھن کا کام دیا۔ دفعتاً میرے دماغ کے خدا معلوم کس گوشے سے ایک خیال کود پڑا۔ وہ یہ کہ میں اس کتاب کو اپنے کوٹ میں چھپا کر لے جاؤں —— میری آنکھیں بے اختیار کتب فروش کی طرف مڑیں جو ایک کاغذ پر کچھ لکھنے میں مشغول تھا۔ دُکان کی دوسری طرف دو نوجوان کھڑے میری طرح کتابیں دیکھ رہے تھے —— میں سر سے پیر تک لرز گیا ——"

یہ کہتے ہوئے بُوڑھے کا نحیف جسم اُس واقعے کی یاد سے کانپا۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر اُس نے پھر اپنی داستان شروع کردی۔

"ایک لحظہ کے لئے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چوری کرنا بہت بُرا کام ہے مگر ضمیر کی یہ آواز سرورق پر بنی ہوئی لانبی لانبی شعاعوں میں غرق ہو گئی۔ میرا دماغ "منقسم شعاعیں"، "منقسم شعاعیں" کی گردان کر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر جھانکا اور جھٹ سے وہ کتاب کوٹ کے اندر بغل میں دبا لی —— یہ کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ اور ٹانگیں بڑے زور سے کانپ رہی تھیں۔

اِس حالت پر قابو پا کر میں کتب فروش کے قریب گیا اور اُس کتاب کے دام ادا کر دئے جو میں نے پہلے منتخب کی تھی۔ قیمت لیتے وقت، اور روپے میں سے باقی پیسے واپس کرنے میں اُس نے غیر معمولی تاخیر لگا دی۔ اس کے علاوہ وہ میری طرف اُس وقت عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جس سے میری طبیعت سخت پریشان ہو رہی تھی۔ جی یہی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلوں۔

اِس دوران میں مَیں نے کئی بار اُس جگہ پر جو کتاب کی وجہ سے اُبھری ہوئی تھی، نگاہ ڈالی —— اور شاید اُسے چھپانے کی بے سود کوشش بھی کی۔ میری ان عجیب حرکتوں کو دیکھ کر اُسے شک ضرور ہوا اس لئے کہ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرکے پھر خاموش ہو جاتا تھا۔

میں نے باقی پیسے جلدی سے لئے، اور وہاں سے چل دیا۔ دو سو قدم کے فاصلے پر میں نے کسی کی آواز سُنی۔ مُڑ کر دیکھا تو کتب فروش ننگے پاؤں چلا آ رہا تھا اور مجھے ٹھہرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کدھر بھاگ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اپنے گھر کی جانب رُخ کئے ہوئے نہ تھا بلکہ میں شروع ہی سے اُس طرف جا رہا تھا جدھر بازار کا اختتام تھا —— اس غلطی کا مجھے اس وقت احساس ہوا جب دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا ——"

بُوڑھا اتنا کہہ کر اضطراب کی حالت میں اپنی زبان خشک لبوں پر پھیرنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد وہ ایک لڑکے سے مخاطب ہوا۔

"مسعود، پانی کا ایک گھونٹ تو پلاؤ"

مسعود خاموشی سے اُٹھا اور کوٹھڑی کے ایک کونے میں رکھے ہوئے گھڑے سے گلاس میں پانی اُنڈیل کر لے آیا۔ بوڑھے نے گلاس کو لیتے ہی مُنہ سے لگا لیا اور ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی پی لیا۔

"ہاں —— میں کیا بیان کر رہا تھا" بوڑھے نے خالی گلاس زمین پر رکھتے ہوئے کہا:۔

"آپ بھاگے جا رہے تھے" ایک لڑکے نے جواب دیا۔

"میرے پیچھے کتب فروش "چور چور" کی آواز بلند کرتا ہوا بھاگا چلا آ رہا تھا۔ جب میں نے دو تین آدمیوں کو اپنے قریب پہنچتے دیکھا تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ جیل کی آہنی سلاخیں، پولیس اور عدالت کی تصویریں ایک ایک کرکے میری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگیں۔ بے عزتی کا خیال آتے ہی میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ میں لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ اُٹھنا چاہا تو ٹانگوں نے جواب دیدیا۔ اُس وقت میرے دل و دماغ کی عجیب حالت تھی۔ ایک تُند ہوا سا

میرے سینے میں کروٹیں لے رہا تھا۔ آنکھیں فرطِ خوف سے اُبل رہی تھیں۔ اور کانوں میں ایک زبردست شور برپا تھا جیسے بہت سے لوگ آہنی چادروں کو ہتھوڑوں سے کوٹ رہے ہیں ـــــ میں ابھی اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کتب فروش اور اُس کے ہمراہ دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا ـــــ اُس وقت میری کیا حالت تھی۔ اس کا بیان کرنا بہت دشوار ہے سینکڑوں خیالات پتھروں کی طرح میرے دماغ کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر مختلف قسم کی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ جب اُنہوں نے مجھے پکڑا تو ایسا معلوم ہوا کہ آہنی پنجے نے میرے دل کو مسل ڈالا ہے ـــــ میں بالکل خاموش تھا اور وہ مجھے دُکان کی طرف کشاں کشاں لیجا رہے تھے۔

جیل خانے کی کوٹھڑی یا عدالت کا دروازہ دیکھنا یقینی تھا۔ یہ خیال کرتے ہوئے میرے ضمیر نے مجھ پر لعنت و ملامت کرنا شروع کر دی۔ چونکہ اب جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا اور میرے پاس اپنے ضمیر کو جواب دینے کے لئے کوئی الفاظ موجود نہ تھے، میری گرم آنکھوں میں آنسو اُتر آئے اور میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا ـــــ"

یہ کہتے ہوئے بُوڑھے کی دُھندلی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

"کتب فروش نے مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا۔ اپنی کتاب لے لی اور تھوڑی دیر نصیحت کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔" بُوڑھے نے اپنے آنسو کمبل سے خشک کرتے ہوئے کہا۔ "خدا اُس کو جزائے خیر دے ـــــ میں عدالت کے دروازے سے تو بچ گیا مگر اس واقعے کی والد اور سکول کے لڑکوں کو خبر ہو گئی۔ والد مجھ پر بہت خفا ہوئے اور ہر ممکن طریق پہ مجھے اس مکروہ فعل پر شرم دلانے کے بعد معاف کر دیا۔

دو تین روز مجھے اسی ندامت میں بخار آتا رہا۔ اس کے بعد جب میں نے دیکھا کہ میرا دل کسی کروٹ آرام نہیں پاتا اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں لوگوں کے سامنے اپنی نگاہیں اُٹھا سکوں تو میں شہر چھوڑ کر وہاں سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک میں نے مختلف شہروں کی خاک چھانی ہے۔ ہزاروں مصائب برداشت کئے ہیں ـــــ صرف اُس کتاب کی چوری کی وجہ سے جو مجھے تا دمِ مرگ نادم و شرمسار رکھے گی۔

اس آوارہ گردی کے دوران میں میں نے اور بہت سی چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے اور ہمیشہ پکڑا گیا ـــ مگر میں اُن پر نادم نہیں ہوں، مجھے فخر ہے ـ!"

یہ کہتے ہوئے بُوڑھے کی دُھندلی آنکھوں میں پھر پہلی سی چمک نمودار ہوئی، اور اُس نے الاؤ کے شعلوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔

"ہاں، مجھے فخر ہے" یہ الفاظ اُس نے تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ کہے۔

آگ کا ایک شعلہ نہ معلوم کیوں بلند ہوا اور ایک لمحہ فضا میں تھرتھرا کر پھر الاؤ کے آغوش میں سو گیا۔ بُوڑھے نے شعلے کی یہ جرأت دیکھی اور مسکرا دیا۔ پھر لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "کہانی ختم ہو گئی ہے، اب تم جاؤ ـــــ تمہارے والدین انتظار کرتے ہونگے۔"

"مگر آپکو اپنی دوسری چوریوں پر فخر کیوں ہے؟"

"آہ! فخر کیوں ہے؟ ـــــ" بُوڑھا مُسکرایا۔ "اس لئے کہ وہ چوریاں نہیں تھیں ـــ اپنی سرقہ شدہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری نہیں میرے عزیز! بڑے ہو کر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ہر وہ چیز جو تم سے چُرا لی گئی ہو، تمہیں حق حاصل ہے کہ اُسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قبضے میں واپس لے آؤ ـــــ مگر یاد رہے تمہاری کوشش کامیاب ہونی چاہیئے ورنہ ایسا کرتے ہوئے

پکڑے جانا اور اذیتیں برداشت کرنا عبث ہے۔"
لڑکے اُٹھے اور باباجی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھڑی کے دروازے سے باہر چلے گئے۔ بُوڑھے کی نگاہیں اُنکو تاریکی میں گم ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر اسی طرح دیکھنے کے بعد وہ اُٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔
"آہ! اگر بڑے ہو کر وہ صرف کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے سکیں!!"
بُوڑھے کو خدا معلوم اُن لڑکوں سے کیا اُمید تھی۔

قابل ہوجائے

اِس سے پہلے کہ پریشان مرا دل ہوجائے
وہ کرم کر جو انیسِ غمِ مشکل ہوجائے

خونِ دل اشکِ محبت میں جو شامل ہوجائے
اک نئی چیز تری نذر کے قابل ہوجائے

حُسن کا نور جو شمعِ رہِ مشکل ہوجائے
عشق ہر حال میں آسودۂ منزل ہوجائے

دی کہاں تُونے ابھی بھیک محبت کی مجھے
دُور کیوں دل سے ابھی حسرتِ باطل ہوجائے

تم کئے جاؤ خرابِ نگہِ ناز مجھے
میرا ذمّہ جو پریشان مرا دل ہوجائے

ہمتیں پائے طلب میں نہیں ضعفِ دل سے
چاہتا ہوں کہ خود آساں مری مشکل ہوجائے

وہ ابھی آنے کہاں پردہ سرا سے باہر
کسے معلوم ہے کیا کچھ سرِ محفل ہوجائے

حُسن کو طعنِ تغافل کے نہ دے دیوانے
فطرتِ حُسن یہی ہے کہ وہ غافل ہوجائے

ڈوب کر بحرِ محبت میں اگر میں اُبھروں
تنگ میرے لئے ہر گوشۂ ساحل ہوجائے

رات تاریک ہے، تارے ہیں، نہ مہتاب کہیں
کوئی بجلی ہی رفیقِ رہِ منزل ہوجائے

حُسن ہو، برق ہو، شعلہ ہو، کہ بوئے گل ہو
جو مرے دل میں سما جائے وہی دل ہوجائے

ہاں وہ اک جرم کہ بخشے نہ خدا بھی جسکو
کیوں مری فردِ عمل ہی میں شامل ہوجائے

تیرے قدموں میں ادا ہو جو نمازِ اُلفت
ایک سجدہ مرا کونین کا حاصل ہوجائے

فطرتِ حُسن بجا، پھر بھی ستم ہے منظر
کہ جسے دل میں جگہ دوں وہی قابل ہوجائے

منظر صدیقی اکبرآبادی

رُوحِ جذبات

آگہی کے فیض سے سادہ دلی جاتی رہی
ہر فریبِ آرزو کی دلکشی جاتی رہی

دل کو تیری ذات سے جو ربطِ پنہاں تھا کبھی
وہ تو اب بھی ہے، مگر اُس کی خوشی جاتی رہی

چھوٹی چھوٹی رنجشیں اک حادثہ سا بن گئیں
چھوٹی چھوٹی رنجشوں سے دوستی جاتی رہی

انقطاعِ رسم و راہِ دوستی سے اے عدمؔ
شکر ہے اک بیوفا کی بدظنی جاتی رہی

آہ کیا، از روئے کافر ماجرائی، دے گئے
دے کے اک چھوٹی تسلّی سب خدائی دے گئے

اک نظر، پھر خوفِ رسوائی کا رُخ پر انعکاس
حالِ دل کہہ کر وہ دادِ پارسائی دے گئے

مسکرا کر مجھکو دیکھا اور نگاہیں پھیر لیں
جاتے جاتے خوب دادِ آشنائی دے گئے

کیا کہوں اُن کو عدمؔ، جو یونہی ازراہِ مذاق
میرے دل کو لذّتِ غمِ آشنائی دے گئے

عدم

جامِ صہبائی

ناپیدِ علوم آگہی تو نے ہستی بخشی
ظالم، جاہل کو یا قوی پرستی بخشی
یارب! یہ ترا کرم ہے مجھ بیکس کو
بے بادہ و بے خمار مستی بخشی

یہ بیکس کائنات میں، دل کیا ہے
یہ شمع، یہ روح و جانِ محفل کیا ہے
دل حاملِ سرگشتِ دو جہاں ہے لیکن
یارب میری سرگشتِ دل کا حاصل کیا ہے

طاقت ہے اگر، کسی پہ بیداد نہ کر
بیکس ہے اگر، تو آہ و فریاد نہ کر
یا عیش و طرب میں بھی خدا یاد رہے
یا رنج و الم میں بھی خدا یاد نہ کر

اے دل غمِ بیش و کم رہے گا کب تک
یہ شکوہ و سیم و زر رہے گا کب تک
تو خود ہی جہاں نما ہے اے دل! اے دل!
منت کشِ جامِ جم رہے گا کب تک!

اثر صہبائی

شیطان

از جناب فضل حق قریشی دہلوی

ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر جس کا بستر بھی نہایت بوسیدہ میلا اور خراب تھا۔ مریضہ اپنی زندگی کے آخری لمحات پورے کر رہی تھی۔ اس کی پٹی کے قریب ڈاکٹر کھڑا ہوا اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور دوسری طرف اُس بڑھیا کا لڑکا اس انتظار میں تھا کہ ڈاکٹر اپنے علم اور تجربہ کی بنا پر کیا فیصلہ کرتا ہے۔ بالکل خاموشی تھی۔ اور مریضہ بھی جس کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا بالکل ساکت وصامت اور غیر متفکر تھی۔ ملک الموت کے خلاف جہاد کرنے کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں تھی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ اب آخری وقت آگیا ہے۔ اس کی عمر بانوے ۹۲ سال کی تھی۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے طلسم سکوت توڑا۔ اور لڑکے سے مخاطب ہو کر بولا۔

"نرائن! تم اپنی ماں کو ایسی حالت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ خدا جانے وہ کس وقت مر جائے"

نوجوان کسان کے چہرے پر خفیف ملال کے آثار نمودار ہوئے۔ اور اس نے اظہار ناراضگی کے طور پر جواب دیا۔

"لیکن مجھے اپنے اناج کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ گندم کے کھیت بالکل تیار ہیں۔ اور تمام فصل کٹی ہوئی زمین پر پڑی ہوئی ہے۔ اُس کو ٹھکانے لگانے کا یہی موزوں وقت ہے"

پھر اپنی ماں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "کیوں ماں! تمہارا کیا خیال ہے؟"

مرنے والی بوڑھی عورت نے جو نقاہت کے باعث بول نہیں سکتی تھی۔ صرف آنکھوں کی حرکت اور پیشانی کی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔ اُس نے لڑکے کو اجازت دیدی کہ وہ کھیت میں جاکر دنیوی منفعت کی خاطر اناج کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جائے۔ اور خود اُسے مرنے کے لئے بالکل تنہا چھوڑ دے۔ لیکن ڈاکٹر بہت ناراض ہوا۔ اور ذرا آگے بڑھ کر اس نے کسی قدر تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"تم ایک وحشی جانور سے بھی زیادہ ذلیل ہو۔ سُنا تم نے۔ میں تم کو یہاں سے جانے کی ہرگز اجازت نہیں دونگا۔ سمجھے؟ اور اگر تم کو اپنی فصل کا بہت زیادہ خیال ہے تو ابھی جاکر سُرلا کو بُلا لاؤ۔ جو مریضوں کی تیمارداری اور مرنے والوں کے آخری لمحات میں ان کی خبر گیری کرتی ہے ـــــ اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا تو یاد رکھو کہ میں تم کو ایک کُتے کی موت مرنے دونگا۔ کیونکہ ایک نہ ایک دن یہی وقت تمہارے لئے بھی آرہا ہے"

کسان ایک عجیب مذبذب حالت میں تھا۔ ایک طرف ڈاکٹر کے آخری جُملے سے پیدا ہونے والا خوف دامن گیر تھا۔ اور دوسری طرف دولت میں اضافہ کرنے کی طمع وہاں سے چلے جانے کی ترغیب دے رہی تھی۔ اس کا دماغ چکر میں تھا۔ وہ جلدی ہی کسی نہ کسی فیصلہ پر پہونچ جانا چاہتا تھا۔ آخر دل ہی دل میں کچھ حساب لگا کر اُس نے ڈاکٹر سے پوچھا:-

"اچھا یہ تو بتایئے کہ سُرلا بیمار لوگوں کی خبر گیری کرنے کے عوض کیا اُجرت لیتی ہے؟"

"مجھے کیا معلوم" ڈاکٹر نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "اُجرت کا فیصلہ مدّتِ وقت کے لحاظ سے ہوتا ہے کہ بیمار کی خبرگیری کتنے عرصہ تک کرنی ہے۔ خدا کیلئے اس سے باہمی فیصلہ کرلو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ایک گھنٹہ میں اس جگہ آجائے۔ سُنا تم نے"

نوجوان کسان نے اس عورت کو متعین کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور ڈاکٹر کو یقین دلایا کہ اب برہم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بھی مطمئن ہوکر اس جگہ سے چل دیا۔ اور جاتے جاتے کہہ گیا:۔

"خبردار! اس امر کا لحاظ رہے کہ جب تک میں ناراض ہوتا ہوں کوئی مذاق نہیں کرتا۔ میں نے جو کچھ کہا سنجیدگی سے کہا ہے"

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد وہ اپنی ماں سے مخاطب ہوا۔

"ماں! میں جاکر ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سُرلا کو لے آتا ہوں۔ تم میری واپسی تک اسی طرح پڑی رہنا"

یہ کہہ کر وہ خود بھی باہر چلا گیا۔

سُرلا ذات اور پیشے کے لحاظ سے دھوبن تھی۔ لیکن زیادہ تر اس کا مشغلہ پڑوس کے بیمار اور قریب الموت لوگوں کی خبرگیری کرنا تھا۔ وہ اس طرح پیدا کی ہوئی روزی کو بہتر سمجھتی تھی۔ کہ اس میں اُجرت زیادہ تھی۔ چنانچہ جب ایک مُردے کا کفن سی سلا کر فارغ ہوتی تو گھر آکر دوسرے زندہ لوگوں کے کپڑوں پر استری کرنے لگتی۔ اس کا دل سخت تھا۔ اور وہ حد درجہ بے رحم ہوگئی تھی۔ اور اختتامِ فصل پر توڑے ہوئے سیب کی طرح اُس کے چہرے پر جھریاں پڑگئی تھیں۔ اس کی شکل پر وہ تمام خباثتیں نمایاں تھیں جو عموماً ایسی ہستیوں کی فطرت کا جزو بن جاتی ہیں۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ موت وحیات کی اس آخری کشمکش کو دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوتی تھی، جو جانکنی کے عالم میں ہر انسان پر طاری ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ انہی لوگوں کا ذکر کرتی جنکو مرتے وقت اُس کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ وہ موت کی مختلف حالتوں کو نہایت فصاحت کے ساتھ بیان کرسکتی تھی۔ کیونکہ اس نے خفیف سے خفیف کیفیت کا غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ ہر مرنے والے کے چہرے کو گھُور کر دیکھنے میں اسے بڑا مزا آتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مختلف بیماریوں کی حالت میں انسان کی موت کس کس طرح واقع ہوتی ہے ۔ اسے کبھی ڈر محسوس نہ ہوتا کیونکہ وہ بے شمار مُردوں کی آنکھیں اس طرح بند کرچکی تھی۔ گویا وہ کسی چھوٹے سے بچے کو سُلا رہی ہے۔

جب نرائن اس کے جھونپڑے پر پہونچا تو وہ کپڑوں میں دینے کا کلف تیار کررہی تھی۔ اُس نے رسمی سلام کے ذریعہ سے مخاطب کرلیا۔

بوڑھی سُرلا مڑی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آنے والا کون شخص ہے۔ وہ فوراً پہچان گئی۔ کیونکہ ایک ہی گاؤں میں رہنے کے باعث وہ ایک دوسرے سے کسی قدر واقف تھے۔ معمولی گفتگو کے بعد نرائن نے اُسے بتایا کہ میری ماں کی زندگی ختم ہونے کے قریب ہے آخری لمحات آپہونچے ہیں۔ وہ عرصہ دراز سے بیمار ہے، اور اب ڈاکٹر کو اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں رہی۔ اس کا خیال ہے کہ صبح پکڑنی بھی محال ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ ابھی تمہید کو جاری رکھے اور کچھ دیر بعد اُجرت کا سوال اُٹھائے لیکن آخر کہے تو کیا کہے۔ اُدھر کھیت میں جانے کی دیر ہورہی تھی اس لئے اُس نے سوچا کہ جو کچھ فیصلہ ہونا ہے جلد ہوجائے۔ آخر اُس نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

"تم میری ماں کے پاس آخر وقت تک رہنے کی اُجرت کیا طلب کرو گی؟ تم جانتی ہو کہ میں امیر آدمی نہیں ہوں اور اس لئے کسی دوسری خدمتگار عورت کو متعین کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ میری ماں کی حالت روز خراب ہوتی گئی۔ محنت و مشقت نے اسے بیمار ڈالدیا۔ اور اب وہ بستر مرگ پر پڑی ہے۔ بانوے سال کی عمر ہونے کے باوجود وہ دس آدمیوں کا کام اکیلی کر لیتی تھی۔ تم خود جانتی ہو کہ آجکل کی عورت کے قویٰ اس قدر مضبوط اور چست و چالاک نہیں ہوتے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم مجھ سے زیادہ اُجرت نہیں مانگو گی۔"

سُرلا نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"میں دو قسم کی اُجرت لیتی ہوں۔ امیروں سے دن کے وقت دو روپے اور رات کے وقت ڈھائی روپے۔ لیکن غریبوں سے دن کے وقت ڈیڑھ روپیہ اور رات کے دو روپے لینے منظور کر لیتی ہوں۔ اِس سے کم ہرگز نہیں ہونگے۔"

کسان نے سوچنا شروع کیا۔ وہ اپنی ماں کی حالت سے بخوبی واقف تھا۔ تندرستی کے زمانے میں وہ بہت ہٹی کٹی اور طاقتور تھی۔ ہر چند اب طویل بیماری۔ نے اسے نحیف اور کمزور کر دیا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ وہ ایک ہفتہ سے پہلے ہرگز نہیں مریگی۔ ڈاکٹر کی رائے غلط ہو سکتی ہے۔ وہ بڑی جانہار عورت ہے۔ چیونٹی کی طرح سسکے جائیگی۔ اور اس طرح بہت روپے صرف ہو جائینگے۔ اس لئے اُس نے فیصلہ کیا کہ یکمشت سودا کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اُس نے کہا۔

"تمہیں میری ماں کے پاس اُس کے آخری وقت تک رہنا ہوگا۔ اس کے عوض ایک رقم مقرر کر لو۔ روز کا حساب ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹر کا خیال تو یہی ہے کہ وہ بہت جلد مر جائیگی۔ تم تسلیم کر سکتی ہو کہ اس صورت میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔"

سُرلا پہلے تو اس عجیب شرط پر رضامند ہی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس سے قبل اُس نے ایسا معاہدہ کسی کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ یہاں صورت ہی دوسری تھی۔ ہمیشہ وہ یہی چاہتی تھی کہ مریض نہ تندرست ہو اور نہ مرے۔ کسی کے مرنے کا اُسے اس لئے رنج نہیں ہوتا تھا کہ وہ مر گیا۔ بلکہ محض اس لئے کہ اسکا اپنا روزگار ختم ہو گیا۔ بصورت دیگر یہاں اُسے یہ آرزو کرنی پڑتی کہ مریضہ جتنے جلد مر جائے اچھا ہے۔ تاکہ وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر کسی دوسری جگہ موقع لگائے۔ لیکن نرائن کے اصرار سے وہ مجبور ہو گئی۔ کیونکہ ان دنوں وہ نکمی بھی بیٹھی تھی۔ اُس نے تصورات کے آئینے میں نظر ڈال کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ فلاں فلاں بیماری کے لوگ کتنی کتنی مدت میں مرے۔ پھر بھی وہ کسی خاص نتیجہ پر نہ پہونچ سکی۔ آخر اس نے کہدیا کہ جب تک مریضہ کو اپنی نظر سے نہ دیکھا جائے اجرت کا قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

اُس نے کلف میں لتھڑے ہوئے ہاتھ جلدی سے صاف کر لئے اور کسان کے ہمراہ روانہ ہو گئی۔ راستے میں اُنہوں نے بات چیت نہیں کی۔ نرائن اس خیال محو تھا کہ کسی ترکیب سے اُسے کم از کم اُجرت پر راضی کرلے۔ اور سُرلا اس امر پر غور کر رہی تھی کہ وہ اپنے سابقہ تجربات کی بنا پر یہ معلوم کرے کہ اس کسان کی ماں ٹھیک کتنے دن میں مرے گی۔ تاکہ اس مدت میں دو چار دن کا اضافہ کر کے اپنا نظریہ پیش کرے اور زیادہ سے زیادہ اُجرت وصول کرے۔ وہ دونوں خیالات کے استغراق میں چلے جا رہے تھے اور سورج کی اس شدید تمازت کا مطلق احساس تھا۔ جس سے پریشان ہو کر مویشی سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں کے سایہ میں جا کھڑے ہوئے تھے۔ اور ان کو قریب سے گذرتا ہوا دیکھ کر اپنے منہ اونچے کر لئے تھے۔ اس اُمید میں کہ شاید کوئی تھوڑی سی ہری گھاس ان کے سامنے ڈال جائے۔

گھر کے قریب پہونچنے سے قبل نرائن کے دل میں خیال آیا کہ ممکن ہے اس وقفے میں ماں کا انتقال ہوگیا ہو۔ اگر یہ صحیح ہے تو مجھے اُجرت چکانے کی زحمت گوارا کرنی نہیں پڑے گی لیکن خلافِ آرزو بوڑھی عورت زندہ تھی۔ وہ چت لیٹی تھی۔ اور اسکے دونوں ہاتھ پہلوؤں کے قریب اس طرح پڑے تھے گویا وہ اس کے جسم کا حصّہ نہیں ہیں۔ بدن کی تمام کھال اس طرح جھریائی ہوئی تھی گویا سانپ کی کینچلی کی طرح ابھی اُترنے والی ہو۔ اسکی شکل نہایت ڈراؤنی اور ایک حد تک مضحکہ خیز ہوگئی تھی۔

سُرلا چارپائی کے قریب کھڑی ہوگئی۔ مریضہ پر ایک نظر ڈالی۔ اُس کی نبض کو محسوس کیا۔ سینے کی ہڈیوں کو ٹھونک ٹھونک کر کچھ معلوم کرنا چاہا۔ سانس سے پھیپھڑوں کی کیفیت کا اندازہ کیا۔ کچھ سوالات کئے۔ اور اس کے بعد باہر چلی گئی۔ نرائن اس کے پیچھے پیچھے گیا۔

اس کا بھی اندازہ یہی تھا کہ مریضہ صبح تک مشکل سے زندہ رہ سکیگی مگر اُس نے یہ ظاہر نہیں کیا۔ نرائن سے کہا۔

"تمہاری ماں ابھی تین چار روز تک نہیں مرتی۔ اور ممکن ہے وہ تندرست بھی ہوجائے۔ اگر تم یکمشت اُجرت طے کرنے کے لئے مصر ہو تو میں کہے دیتی ہوں کہ چھ روپے سے کم ہرگز نہیں لوں گی۔ کیونکہ یوں بھی دن رات کے ملاکر تم کو ساڑھے تین روپے روز دینے پڑینگے۔"

نرائن نے اسے بہت یقین دلایا کہ وہ پانچ چھ گھنٹے کی مہمان ہے۔ لیکن اس نے ایک پائی تک کم نہیں کی۔ وہ راضی ہوگیا۔ کیونکہ اپنے اندازے کے مطابق دل میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مرے گی۔ اور دل میں خوش تھا۔ کہ اپنی چالاکی سے اس تجربہ کار خادمہ کو دھوکا دیدے گا۔

خیر چھ روپے میں فیصلہ ہوگیا۔ نرائن نے کھیت کی راہ لی۔ کیونکہ باقی آدمی بھی اُسی کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ اور سرلا اپنے ذاتی کپڑے سینے کے لئے چارپائی کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ اس کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ مریضہ کے قریب رہے۔ اور اگر اُسکو کسی چیز کی حاجت ہو تو اُسے پورا کردے۔ وہ اپنے کام میں مشغول رہی۔ البتہ کبھی کبھی نظر اُٹھا کر دیکھ لیتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مرجائے۔ اسے علم تک نہ ہو۔ اور فضول وقت ضائع ہوتا ہے۔ ہر لمحہ وہ یہی سوچتی کہ بس تھوڑی دیر بعد اُس کا کام تمام ہوجائے گا۔ لیکن ہمیشہ اُس کی اُمید غلط ثابت ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ سورج غروب ہوگیا۔

کھڑکی میں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے شروع ہوگئے۔ مگر سرلا نے ان کو بند نہیں کیا۔ تاکہ وہ مریضہ کے حق میں مُضر ثابت ہوں۔ چُنانچہ خُنکی کے باعث اُسے دو چار چھینکیں آگئیں۔ اُس نے خیال کیا کہ اب ضرور اس کا سانس اُکھڑنے لگے گا۔ اور اس کے قلب کی حرکت بند ہوجائیگی۔ مریضہ نے پانی کیلئے اشارہ کیا تو اُس نے ایک قطرہ بھی نہیں دیا۔ اس خیال سے کہ اگر یہ کسی طرح نہیں مرتی تو پیاس سے ہی مرجائے۔ وہ جانتی تھی کہ اسکی باتوں پر غور کرنے والا کوئی نہیں ہے! اور مریضہ بول نہیں سکتی۔

کچھ دیر بعد نرائن کھیت سے واپس آگیا۔ اُس نے چارپائی پر ایک نظر ڈالی اور یہ معلوم کرکے کہ ابھی اُسکی ماں زندہ ہے مُسکرا دیا۔ اسے دل ہی دل میں ہنسی آرہی تھی۔ کہ اپنی نرالی شرط سے اُس نے ایسی تجربہ کار عورت کو خوب ہی اُلو بنایا جو سینکڑوں مُردوں کا کفن سی چکی ہے۔

وہ بہت تھک گیا تھا۔ اسلئے زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ اور نہایت غفلت کی نیند سوگیا۔ سرلا بھی اپنی ذمہ داری کا خیال نہ کرتے ہوئے لیٹ گئی۔

اور ایسی سوئی کہ صبح تک اُسے مطلق خبر نہ ہوئی۔ کہ مریضہ پر کیا گذری۔ اُس نے سوچا کہ جب بیٹا ہی ماں کی موت کا خواہاں ہے اور اُسے مطلق فکر نہیں ہے۔ تو وہ اسکی لاپرواہیوں پر معترض نہیں ہوگا۔ صبح پانچ بجے بیدار ہوئی تو اُس نے دیکھا کہ بڑھیا کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ اور وہ کسی سوچ میں مبتلا ہے۔ اُس نے نفرت و حقارت سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیسے۔ اور دل ہی دل میں خوب کوسا کہ کمبخت مر نہیں چکتی۔ کسی طرح تو یہ بلا سر سے ٹلے۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ گلا گھونٹ کر مار ڈالتی۔ مگر جانتی تھی کہ اگر کسی کو پتہ لگ گیا تو مجرم ٹھہرائی جائیگی۔ کیونکہ ڈاکٹر کو مرنیوالی کے ساتھ فطری طور پر بہت زیادہ ہمدردی تھی۔ وہ تشخیص کے ذریعے معلوم کر لیتا کہ اُسے عمداً مارا گیا ہے۔

نرائن بیدار ہوا تو اس نے سب سے پہلے قہقہہ لگاتے ہوئے ہی پوچھا کہ وہ مری یا نہیں؟۔ وہ خوش تھا کہ اگر اسی طرح دن بڑھتے گئے تو سرلا کو بہت نقصان ہوگا۔ آیندہ شاید وہ کسی سے بھی ایسا معاہدہ نہیں کرے گی۔ اور ہمیشہ روزانہ اُجرت طے کر لیا کرے گی۔ کچھ دیر کے لئے وہ اپنے گھر گئی۔ اور پھر چلی آئی۔ کیونکہ نرائن کو حسبِ معمول کھیتوں میں جانا تھا۔ اب پھر موسم گرما کا طویل دن سامنے تھا۔ اور مریضہ کی چارپائی۔

سرلا اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ مگر اس کا ہاتھ اتنا نہیں چل رہا تھا جتنا دماغ کام کر رہا تھا۔ وہ اسی سوچ میں تھی کہ آخر کسی طرح سے بڑھیا کی موت جلدی واقع ہو سکتی ہے!۔

تمام دن گذر گیا۔ اور کوئی خاص بات ظہور میں نہ آئی۔ سرلا کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ اُس نے سوچا کہ رات کی تاریکی نمودار ہونے سے قبل اس کا مرجانا ضروری ہے۔ ورنہ پھر تمام رات وہیں گذارنی پڑے گی۔ لہذا وہ اپنے کام کو الگ رکھکر مریضہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ پہلے تو کچھ ہیبتناک قصے سنائے۔ پھر اس سے پوچھا۔

"کیا تم نے کبھی شیطان بھی دیکھا ہے؟"

بوڑھی عورت نے نفی میں گردن ہلائی تو اُس نے کہنا شروع کیا۔

"مرنے سے کچھ دیر پہلے ہر مرد اور عورت کو شیطان دکھائی دیتا ہے۔ اسکے ایک ہاتھ میں جھاڑو ہوتی ہے۔ اور دوسرے میں بالٹی۔ سر پر کڑھائی ڈھکی ہوتی ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک سفید چادر میں لپٹ کر آتا ہے۔ اور عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے۔ بعض لوگ اسی وقت مر جاتے ہیں۔ اور بعض دو تین منٹ بعد۔ کیونکہ اسکا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اب آخری لمحے قریب آگئے ہیں"

اُس نے جھاڑو، بالٹی اور کڑھائی کا ذکر اس لئے کیا کہ جھونپڑے میں یہ تمام چیزیں موجود تھیں۔ اسکی باتوں سے غریب مریضہ کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ خوف کے باعث اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس خیال سے کہ شیطان کو نہ دیکھ سکے۔ سرلا نے سوچا کہ اب دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ فوراً اٹھی اور ایک چادر تمام بدن پر لپیٹ لی۔ پھر جس طرح بیان کیا تھا ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرے میں بالٹی لے لی۔ سر پر کڑھائی رکھی اور چارپائی کے سامنے کھڑے ہو کر نہایت ہیبت آواز میں چلائی۔

غیر ارادی طور پر مریضہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس نے دیکھا کہ شیطان سامنے کھڑا ہے اور ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلا رہا ہے۔ خوف سے اسکی گھگھی بندھ گئی۔ اُس نے کوشش کی کہ اُٹھکر بھاگ جائے۔ مگر اس کشمکش میں وہ تکیہ سے اپنا سر بھی بمشکل اُٹھا سکی۔ وہ پھر بستر پر گر گئی۔ اور خوف کے ساتھ ہی دل کی حرکت ہمیشہ کیلئے بند ہوگئی۔

سُرلا نے اطمینان کا سانس لیا اور جلدی سے تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ رکھدیں۔ اور رسم و رواج کے مطابق چند خوشبودار چیزیں روشن کیں۔ کتابِ مقدس کی چند الہامی آیات متوفیہ کے سامنے پڑھیں اور اسکی مغفرت کیلئے رو رو کر دُعا کرنے لگی۔

عین اس وقت نرائن اندر داخل ہوا اور ایک ہی نظر میں سمجھ گیا کہ ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اُسے تھوڑا سا افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ روپیہ زیادہ دیا۔ اگر روزانہ اُجرت کے حساب سے سرلا کو مقرر کرتا تو صرف پانچ روپے دینے پڑتے۔ اور اس طرح اسکی جیب سے چھ روپے نکل گئے۔

پھر وہ سرہانے بیٹھکر رونے لگا اور چلا چلا کر کہنے لگا۔

"میری ماں! تو مجھے اکیلا کیوں چھوڑ گئی؟"

(موپاساں) فضل حق قریشی دہلوی

شانِ جلال

اے ترے غیظ کے قربان دلِ عشق آگاہ ہائے یہ چینِ جبیں یہ شکنِ طرفِ کلاہ!
کھل کے انداز یہ کاکل کا، الٰہی توبہ! کھنچ کے یہ خم لبِ زریں کا، عیاذاً باللہ!
سانس ہے تیز تو سینے میں بپا ہے ہلچل کوچۂ تنگ سے جس طرح گزرتی ہے سپاہ
تند جھونکوں سے ہو جس طرح گھٹا زیر و زبر جنبشِ سر سے کشاکش میں ہے یوں زلفِ سیاہ
چاندنی رخ کی ہے یوں رنگِ غضب سے پھیکی یورشِ ابر سے مجروح ہو جیسے شبِ ماہ
دھار پر خنجرِ سرتیز کی، رقصاں ہے کرن سرخیِ غیظ میں یا غرق ہے تابندہ نگاہ
چبھ رہی ہے دلِ ناکام میں ابرو کی شکن رکھ بھی لے میان میں اس تیغِ ادا کو للہ!

اللہ اللہ اثرِ غیظ، کہ شرمندہ ہوں میں
جوشؔ گو دل سے یقیں ہے کہ ہوں ناکردہ گناہ

جوش
(ملیح آبادی)

قطعات

آؤ دیکھو کہ جسم سانچوں میں
پھر نقوشِ وفا میں آ کے بسی
مسکراہٹ لبوں سے ہے پیدا
بادۂ جوش و فور سے چھلکی

شب کی خاموشیوں سے چہرہ مرا
اپنی یادیں ہیں آہیں درد بھری
چپکے چپکے سنا رہا ہے کوئی
پھر حکایات ہوتی ہیں جب گری

حسن بالا کا بھرا ہوا ہے ملال
مطرب دوست نوازی سے لیں
روح میں ہو رہے ہیں پیدا نے
درد وافر سے دل کی رگ رگ میں

جب لطف دیتی ہے پیہم مرا
پھول نے دیا سے جیسے نہیں کھلتا
پوچھی یا یہی سے کیسے آ
زندگی کا نشان ہی نہیں ملتا

بشیر نیازی

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

از جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی. بی. اے، ایل ایل. بی (علیگ)

ساقی "ظریف نمبر" میں بھائی شاھد نے ساقی کے "افسانہ نمبر" پر جو "تنقید" میں نے نیرنگ خیال میں شائع کی تھی اُس کا جواب شائع کیا ہے۔ میں جواب الجواب نہیں بلکہ معذرت پیش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے اپنے مُنہ میاں مٹھو بننے کا سوال ہے۔ بدقسمتی سے نیرنگ خیال میں جو تنقید شائع ہوئی، اُس سے قبل میری طرف سے اشتہار بطور سُرخی چھپ گیا نیچے میرے دستخط۔ یہ ہرگز نہ ہونا چاہیئے تھا۔ مجھکو تسلیم ہے۔ تم ہی مجھ سے پوچھو کہ بھئی کوئی کتاب لکھ رہے ہو۔ میرے بے تکلف دوست ہو تو لازمی ہے کہ مختصراً عرض کردوں کہ ایسی کتاب لکھنے کا ارادہ ہے اور وہ ایسی ہے تاکہ تم کسی کو بتا سکو۔ اس کے یہ مطلب نہیں کہ میری طرف سے اور میرے نام سے وہ بطور اعلان اور اشتہار کے سُرخی کے ساتھ چھپ جائے۔ بہر حال غلطی مجھے منظور ہے قابل معافی؟ دوسری بات لفظ "باب" کی تکرار یا لفظ "رومانی" کے بجائے "روحانی" کا سوال ہے۔ اس کا جواب اس وجہ سے دینا بیکار ہے کہ کون ٹھیک، یہاں بھی وہی غلطی مجھ سے یا آپ کے کاتب سے ہو جائے۔ اور قصہ پھر تنقیح طلب ہو جائے کہ خطا کس کی۔ نفسِ مضمون کے بارے میں حسبِ ذیل عرض ہے۔

چونکہ یہ نام نہاد "تنقید" سمجھکر دیکھی گئی ہے اس وجہ سے آپ کو اور دوسرے احباب کو تکلیف پہونچی جس کی معافی چاہتا ہوں۔ بدقسمتی سے جیسا عرض کر چکا یہ میری کتاب افسانہ نویسی کا باب ہے، اور جب تک دوسرے باب کتاب کے پیش نظر نہ ہوں بیشک اس تنقید کو دیکھتے ہوئے آپ کی شکایت بجا ہے۔ کیوں؟ محض اس واسطے کہ جو کچھ میں اپنی کتاب فسانہ نویسی میں لکھوں گا اور لکھا ہے وہ ذاتی تجربہ اور خیال کی بنا پر ہے اور جگہ جگہ اس کی تکرار موجود ہے کہ ہوشیار رہنا کہیں غلطی سے یہ نہ سمجھ لینا کہ میرا کہنا دُرست ہے۔ مجھ سے بہتر افسانہ نویس اور افسانہ نویسی پر مجھ سے بہتر لکھنے والے موجود ہیں اور میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ ایک خود ساختہ اور خود رو افسانہ نویس کے ذاتی خیالات کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ لہذا میں جو کچھ لکھ رہا ہوں یا جو خیالات پیش کر رہا ہوں وہ سند نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ لوگ یہ معلوم نہ کریں یا میں اُن کو معلوم نہ کرانا چاہوں کہ میری دانست میں ایک فسانہ میں نقص کس کو کہتے ہیں اور غلطی کس کو کہتے ہیں۔ اگر میرے نزدیک ایک افسانہ میں کوئی فنی غلطی ہے تو وہ میرے نزدیک جوں کی توں رہیگی خواہ دُنیا کے افسانہ نویس ایک طرف جمع ہوں۔ پھر جبکہ میں خود تسلیم کر چکا کہ میری کتاب کے اُصول ممکن ہے غلط ہوں، تب تو شکایت کی گنجائش نہیں رہی۔

نیرنگ خیال میں کئی افسانہ نویسوں نے مضمون اس عنوان پر لکھے ہیں کہ "میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں"۔ میری دانست میں اس سوال کا جواب میری طرف سے میری کتاب ہے۔ میں کس بات کو افسانہ نویسی میں غلطی سمجھتا ہوں اور کس بات کو اچھائی سمجھتا ہوں۔ یہ باتیں اس سلسلہ میں مجھے بتانا پڑیں گی۔ اور اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ وضاحت کے لئے اس کتاب کا نام بجائے "افسانہ نویسی" کے "میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں" رکھدیا جائے تاکہ بحث یا تنقید کا سوال جاتا رہے۔

اِس مختصر تمہید کے بعد میں شکر گذار ہوں کہ آپ نے اخلاقی جرأت سے کام لیکر مجھے ٹوک دیا۔ واضح رہے کہ میں نے اس باب کا عنوان رکھا تھا "رسالہ ساقی کا افسانہ نمبر ۳۶ء" اور اسی عنوان سے نیرنگ خیال میں مضمون بھی بھیجا گیا تھا۔ مگر کارکنانِ نیرنگ خیال نے غالباً اس وجہ سے بدل دیا کہ شاید آپکو ناگوار گذریگا اور ہمعصرانہ چشمک نہ پیدا ہو۔ مگر افسوس کہ نتیجہ باوجود نیرنگ خیال والوں کی نیک نیتی کے اُلٹا نکلا۔ میں اس سلسلہ میں اپنی اور نیرنگ خیال دونوں کی نیک نیتی کا آپکو یقین دلاتا ہوں۔

بیجا نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں بھائی تحلیمی رامپوری کا شکریہ ادا نہ کروں۔ اُنہوں نے اس کتاب کا حال سُنکر کہا تھا کہ تم ضرور غلط سلط لکھ مارو گے اور اوندھی سیدھی باتیں گڑھ کر لکھو گے، لہذا بہتر ہے کہ مغربی افسانہ نگاروں کی کتب سے استفادہ کرو۔ مگر میرا خیال تھا اور اب بھی اس پر قائم ہوں کہ مَیں ایسا نہ کروں گا کیونکہ ایسا کرنے والے مجھ سے بہتر موجود ہیں اور مَیں جانتا ہوں کہ وہ اس کام کو مجھ سے بہتر انجام دے سکیں گے مَیں وہ کام کیوں نہ انجام دوں جو اور کسی سے نہیں ہو سکتا یعنی کیوں نہ ایک کتاب بحیثیت افسانہ نویس کے ایسی لکھوں جس میں تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ خود میرے نزدیک افسانے میں کیا چیز بمنزلہ خوبی کے ہے اور کیا چیز بمنزلہ نقص کے ہے اور میں کس طرح ان نقائص سے بچتا ہوں اور کس طرح خوبیوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کس طرح افسانے کو ترتیب دیتا ہوں اور کس طرح پلاٹ کو تیار کرتا ہوں اور کیا کیا باتیں پلاٹ میں ضروری سمجھتا ہوں اور کس حالت میں پلاٹ کو غلط سمجھتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ گویا خود میرے ذاتی تجربات مشاہدات وخیالات اور اپنے اُصول وغیرہ وغیرہ جنکی پابندی سے میں نے افسانہ نگاری میں کامیابی یا ناکامی حاصل کی۔

لہذا جہانتک اس نام نہاد "تنقید" کے وجود اور عدم وجود کا سوال ہے یہ باب بجنسہ مع انہی خیالات اور اعتراضات کے شامل کتاب "افسانہ نویسی" رہے گا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ لیکن اس میں سے جو حصہ آپ یا کوئی اور صاحب متعلق "دل شکن" لائے زنی بتائیں وہ حصہ نکال دیا جائیگا۔ مثلاً کوئی افسانہ نویس غرق نہ کیا جائے گا بلکہ وہ ریمارک، "دل شکن" جملہ سب کے سب مجھے میرے دوست واپس مرحمت کریں۔ مگر چلتے چلتے ایک "نکتہ" لگانے کو جی چاہتا ہے۔ افسانہ لکھنے والوں میں کون صاحب ہیں جو اپنے افسانے پر فخر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نام سے مطلع فرمائیں تاکہ شامل کتاب کر دیا جائے۔ والسلام

خواستگار معافی
عظیم بیگ چغتائی وکیل

خمستان

سرگوشیاں

ننھے پھول ——
ہوا تجھ سے کیا کہتی ہے؟
کہ تو مستانہ ادا سے جھوم جھوم جاتا ہے!

* * *

ننھے پھول ——
مدھ مکھی تجھ سے کیا سرگوشیاں کرتی ہے؟
کہ تو چپ چاپ ہو جاتا ہے!

* * *

ننھے پھول ——
بلبل تجھے کیا سناتی ہے؟
کہ تیرا چہرہ کھلا جاتا ہے!

* * *

خاموشی مجھے پاگل بنائے دیتی ہے!
مہیب خاموشی!
ہیبتناک خاموشی!
ڈراؤنی، گھناؤنی، مکروہ خاموشی!
اُس کی سرد آغوش میں میرا دم گھٹنے لگتا ہے!
اُس کے کرخت قہقہے سے میرے کان پھٹنے لگتے ہیں!
اُس کی شیطانی تبسّم خیز نظریں،
میری رُوح کو برماتی ہیں! ——

* * *

آہ! جان لیوا خاموشی!
پُرسکون ہنگامہ!

* * *

اگر مَیں شاعر ہوتا ——
تو حسین لفظوں کی ایک نظم میں،
اپنے جذبات کا اظہار کرتا!

* * *

اگر مَیں مصوّر ہوتا ——
تو سُنہرے، زرد، نیلے رنگوں کی ایک پُراسرار تصویر میں،
اپنے تخیلات کا اظہار کرتا!

* * *

اگر مَیں بُت تراش ہوتا ——
تو سنگِ مرمر کے سفید پردوں میں سے،
اپنے احساسات کی جھلک دکھاتا!

* * *

لیکن مَیں ایک پریمی ہوں!
اور آنسو میرے پیامی!

* * *

دیوی!
اپنے دل کے مندر کو میں نے تیرے لئے آراستہ کیا ہے! ——
آنسوؤں سے اُس کی دیواروں اور چھت کو صاف کیا۔
آرزوؤں کے پھول میں بکھیرے ہیں!
جب تو آئیگی ——
خوشبوئیں تجھ سے لپٹ جائیں گی۔
اور مَیں "آہ" کی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں سے تجھے ہوا دوں گا۔
دیوی! تو کب آئے گی! .....

تمنائی

طیورِ آوارہ

یہ زمین کے آنسو ہیں جو اُس کی مُسکراہٹوں کو سبز و شاداب رکھتے ہیں۔

* * *

صحرائے عظیم گھاس کی اُس ایک پتّی کی محبت میں جل رہا ہے جو اپنا سر ہلاتی ہے
ہنستی ہے اور اُڑ جاتی ہے۔

* * *

"اے آبِ رقصاں! تیری راہ کی ریت تیرے نغمے اور تیری حرکت کی
التجا کر رہی ہے! کیا تو اسکی از پا رفتگی کا بار اُٹھائیگا؟"

* * *

دُنیا اپنے عاشق کے سامنے اپنی وُسعت کا نقاب اُتار دیتی ہے،
اور سمٹ کر چھوٹی ہو جاتی ہے ایک نغمہ کی طرح؛
جاوداں کے ایک بوسے کی مانند!

* * *

"اے سمندر تیری زبان کیا ہے؟"
"میری زبان ابدی سوال ہے"
"اے آسمان تیری زبان کیا ہے؟"
"میری زبان ابدی سکوت ہے"

* * *

اگر آفتاب کے غروب ہوتے وقت تم اشکریزی کرو،
تو تم ستاروں کو بھی نہ دیکھ سکو گے۔

* * *

ایک بار ہم دونوں نے خواب دیکھا۔
کہ ہم آپس میں بالکل اجنبی ہیں۔
لیکن جب ہماری آنکھیں کھلیں
تو ہم ایک دوسرے کے عزیز ترین دوست نظر آئے۔

* * *

اے دل! تو دُنیا کی ان سرگوشیوں کو بغور سُن جن سے کہ یہ تیرے
سامنے اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے؛

* * *

آج کی صبح میں اپنے دریچے کے پاس بیٹھا ہوں۔
جہاں کہ دُنیا مُسافر کی طرح،
ایک لمحہ کے لیے ٹھہرتی ہے، اپنی گردن ہلاتی ہے،
اور پھر رخصت ہو جاتی ہے۔

* * *

یہ باریک خیالات پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ ہیں۔
اور ان کی مسرتوں کی سرگوشیاں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

* * *

اپنی حقیقت پہ کبھی تمہاری نظر نہیں پڑتی۔
بس تمہاری نظر صرف اپنے سائے پر پڑتی ہے۔

* * *

"تم متحرک پتیوں کی ایک ایسی آواز ہے جو طوفان کا جواب دیتی ہے۔
لیکن تم خاموش کیوں ہو؟"
"میں محض ایک پھول ہوں"

* * *

"آرام کام سے اسی طرح تعلق رکھتا ہے جس طرح مژگاں آنکھوں سے"

* * *

اے حُسن! تو خود کو محبت میں دیکھنے کی سعی کر، نہ کہ آئینے کے مغرور کُن
نظارے میں!

* * *

میرا دل دُنیا کے ساحل پر اپنی موجوں کا تلاطم برپا کرتا ہے۔
اور اس پر اشکوں سے یہ الفاظ لکھکر "میں تجھ کو پیار کرتا ہوں" دستخط
کر دیتا ہے۔

* * *

زندگی اپنی دولت دُنیا کے دعووں سے پاتی ہے۔

(ٹیگور)

لیکن اپنی قدر محبت کے دعووں سے۔

جمیل احمد کنڈھاپوری

ٹھہر جا!

ٹھہر جا! اے بوڑھے خانہ بدوش وقت، ٹھہر جا!
کیا تو نہیں ٹھہرے گا؟ صرف ایک روز کے لئے اپنی گاڑی نہیں کھولیگا؟
میں تجھے ہر چیز دوں گی؟ کیا تو میرا مہمان نہ رہیگا؟
میں تیرے ٹٹو کے لئے چاندی کی گھنٹی دونگی!
زرگر تیرے لئے سونے کی ایک بڑی انگوٹھی بنائیں گے!
مور تیرے سامنے رقص کریں گے، اور بچے گائیں گے!
ہاں! اور لڑکیاں تیرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالیں گی!
اے بوڑھے خانہ بدوش وقت! اتنی جلدی کیا ہے؟

گذشتہ ہفتے تو شہر بابل میں ٹھہرا تھا!
اور گذشتہ شب شہر روما میں!
اور آج تو یہاں سینٹ پال کے گنبد کے نیچے لوگوں کے اجتماع میں مقیم ہے!
صرف ایک لمحہ کے لئے تو خیمہ زن ہے۔
اور پھر دوسرے شہر کو جو ابھی وجود میں نہیں ہے!
اور پھر دوسرے شہر کو قبل اس کے کہ وہ نابود ہو!
ٹھہر جا! اے بوڑھے خانہ بدوش، وقت، ٹھہر جا!
کیا تو نہیں ٹھہریگا؟ صرف ایک روز کیلئے اپنی گاڑی نہیں کھولے گا؟

(رالف ہوجسن)

انعام الحق۔ شیدائی

میں تم سے محبت کرتا ہوں

میں تم سے محبت کرتا ہوں، نزہت!
ان بھونروں سے زیادہ،
جو کلیوں پہ منڈلاتے رہتے ہیں،
بہاروں میں ان کا رس چوستے ہیں!
آہ! اور پھر خزاں میں چلے جاتے ہیں۔
کسی نئی کلی کی تلاش میں، کسی نئے پھول کی جستجو میں،

٭ ٭ ٭

نزہت! میں تم سے محبت کرتا ہوں!
ان قمریوں سے زیادہ
جو اپنی چیخ اور اپنی پکار سے
ہر ننھی کلی کے دل میں ٹیس پیدا کر دیتی ہیں۔
اور وہ بے چین و بے قرار کلی۔
چاند کی مغموم روشنی میں!
آنسوؤں سے اپنے دامن کو تر کر لیتی ہے!

آہ! نزہت میں تم سے محبت کرتا ہوں!
ان بلبلوں سے زیادہ
جن کے نغمات کو—
شاعر "نالے" کہتے ہیں۔
جن کے سُریلے گیتوں کو—
لوگ رُونا کہتے ہیں۔
آہ! اور گلشن کا پتہ پتہ
بلبلِ نالاں سے ہمدردی کرتا ہے!
رقص کناں تتریاں اُن کی آواز پر کان دھرتی ہیں— !
اور خوش الحان طیور اُس کی ہم آوازی کرتے ہیں۔
لیکن وہ بلبل—
خزاں کے قریب—
جب شگفتہ پھول مُرجھا جاتا ہے۔
اپنے پیارے کو، اپنے محبوب کو—

چھوڑ کر دور شمالی دنیا میں دوسرے نیم خفتہ پھولوں کو اپنی محبت کا راگ
سنانے چلا جاتا ہے!
آہ لوگ مسکرانے والے کے ساتھ مسکراتے ہیں۔
لیکن رونے والے کی طرف سے منہ پھیر لیتے ہیں!!

* * * *

ہاں! نزہت میں تم سے محبت کرتا ہوں،
اپنی تمام قوتوں کے ساتھ!
اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ!
تم ــــــ میری نزہت!
بھونرے کی راگنی پر نہ جاؤ ــ
وہ چند لمحات میں ختم ہو جائے گی۔
قمری کے شور کا خیال نہ کرو۔
وہ وقتی ہے ابھی مدھم پڑ جائے گا۔
بلبل کے رونے سے دل نہ دکھاؤ۔
وہ عارضی ہے۔ اُس کے آنسو چڑھتے ہوئے سورج کی روشنی میں
خشک ہو جائیں گے!
ہاں میں کم آواز ہوں۔
پھر بھی تم سے محبت کرتا ہوں!
آہ، تم ان جھلملاتے تاروں سے پوچھو!
رات کی سرد سنسناتی ہوا سے پوچھو!
نزہت! میرے دل کی دھڑکن سے پوچھو!
میری خاموشی میرا ورد ہے۔
میرا سکون میری تڑپ ہے۔
میں اپنے آنسوؤں کو اور اپنی آہوں کو دعاؤں کے سپرد کر دیتا
ہوں ــــ!
کاش کہ تم سنو!! ــــ؟

ضیاء الدین احمد

سرگذشت عروس

ایک اونچے گھرانے کی لڑکی کی شادی ماں باپ نے روپے پیسے کی لالچ میں ایک مالدار بوڑھے سے کر دی۔ اس کے خوفناک نتائج اور بدمزہ زندگی کی جو تفصیل نوجوان دلہن نے اپنے روزنامچہ میں درج کی تھی وہ روزنامچہ من و عن کتابی صورت میں چھاپ دیا گیا ہے۔ اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے صرف نام اور مقام بدل دئے گئے ہیں تاکہ کسی کا راز فاش نہ ہو۔ واقعات سب وہی ہیں جو اس مظلوم دلہن کو پیش آئے۔ لڑکی کسی اور سے محبت کرتی تھی مگر اسکے خلاف مرضی اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی گئی جس کے بالوں کی سیاہی شرمندۂ خضاب تھی اور اسکی بتیسی بھی نقلی تھی۔ اس بڑھاپے کو بھی برداشت کر لیا جاتا مگر اس کی آوارگی بے پروائی نے نئی دلہن کا دل توڑ دیا اور اسی شکستہ دلی کے موقعہ پر وہ شخص آ گیا جس سے دلہن کو کنوارپنے میں محبت تھی۔ یہ سین اس روزنامچہ کی جان ہے کیونکہ عشق و ہوس میں یہیں امتیاز ہوتا ہے اور اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سمجھدار اور شریف بیویاں اپنے شوہروں سے حد درجہ شاکی، دل برداشتہ اور متنفر ہونے کے باوجود بھی اپنے گوہر عصمت کو ضائع نہیں ہونے دیتیں۔ بوڑھے مہاجن، جوان دلہن اور اس کے محبوب عاشق کا کیا حشر ہوا؟ یہ بیان کرنے کی چیز نہیں، بلکہ پڑھنے کی چیز ہے۔ اس سے زیادہ دردناک و عبرت انگیز آپ بیتی آپ نے اور کہیں نہ پڑھی ہوگی۔ یہ ڈائری اس لائق ہے کہ ماں باپ، لڑکے لڑکیاں اور ہر عمر کی عورتیں اسے پڑھیں تاکہ خود ان سے آئندہ کوئی ایسی لغزش نہ ہونے پائے (۲۸۰) صفحے کی بیحد دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/)

ملنے کا پتہ

ساقی بکڈپو۔ دہلی

بال بچوں کو کیا اور کہا کہ جاکر وائی یچین کے گھر سے تموچن کو لے آنا۔ اتنا کہکر یسوکائی بہادر نے انتقال کیا۔ (۱۱۶۵ء)

منلیک اپنے آقا کے آخری حکم کو بجالانے روانہ ہوا جب وہ وائی یچین کے گھر پہونچا تو اس خیال سے کہ کوئی پیچیدگی نہ پیدا ہو جائے اس نے وائی یچین سے یسوکائی کے زہر دیے جانے یا مرنے کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا کہ یسوکائی تموچن کو بہت یاد کرتا ہے۔ اور اس کو فوراً بلایا ہے۔ وائی یچین نے تموچن کو جانے کی اجازت دیدی۔ مگر یہ کہا کہ جسقدر جلد ممکن ہو اسے واپس آنے کی اجازت دلوا دینا۔ اب تموچن منلیک کے ساتھ اپنے گھر آیا۔ منلیک کو اب سارا گھر یسوکائی کی وصیت کے مطابق "اچیگی" یعنی "باپ" کہنے لگا۔

اس کے تھوڑے دن بعد تموچن اور اس کی ماں بہنوں بھائیوں کیلئے بڑی سختیوں کا وقت آیا۔ اب کسی طرح کا آرام اور سکون ان کو میسر نہ رہا ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت کا سامنا رہنے لگا۔ تموچن سمجھا کہ اب یہ ناؤ ڈوبنے کو ہے۔ مگر ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی کہ ورطۂ ہلاکت سے بچ جاتا۔ کئی دفعہ مرنے سے بال بال بچ گیا۔ بار بار سخت خطرے سے صحیح سلامت نکل آنے سے اس کے دل پر اثر پڑا۔ غرض ہر مصیبت میں دل کو مضبوط رکھنے کی عادت شروع جوانی سے تموچن سے ظاہر ہوتی رہی تھی۔ دلیری اور جوانمردی کی جگہ ہوشیاری اور احتیاط مزاج میں زیادہ تھی۔ صبر کیساتھ ہمت اور عزم چنگیز خاں کی طبیعت کا خاصہ عمر بھر رہا۔

تموچن کی تکلیفیں باپ کے مرتے ہی شروع ہو گئی تھیں۔ الوس تائیجوت کا سردار ترغاتائی کریلتوک اور تو دان گرتی جو انباغائی خاں کے بیٹے تھے اور ان سے عزیز داری بھی تھی۔ سوچنے لگے کہ جب یسوکائی بہادر ہی نہ رہا تو پھر ہم آزاد ہیں اور خود اپنے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔ انباغائی خاں کی بیوہ امیر بھی اولون سے کسی بات پر لڑی تھیں۔ اس نے اس جھگڑے کو اور بھی بڑھا دیا۔ غرض تائیجوت نے اب فیصلہ کر لیا کہ وہ یسوکائی بہادر کی بیوی بچوں سے تعلق قطع کر کے ان کو ان کی تقدیر پر چھوڑ کر ان سے علیحدہ ہو جائیں۔

جب یسوکائی یادگار بورجیجن کے یورت سے تائیجوت چلنے کا سامان کرنے لگے تو منلیک کے باپ چراگا نے انکو جانے سے منع کیا۔ لیکن تائیجوت نے اسکا کہا نہ سنا اور اس بڈھے کو برچھی مار کر زخمی کر دیا۔ اولون بڑی عقل اور ہمت کی عورت تھی۔ اس نے بھی تائیجوت کو جو ابتک اسکے شوہر کے خیر خواہ رہے تھے، جانے سے روکا۔ اور یسوکائی کا نشان اور جھنڈا اٹھا جو لوگ چھوڑ کر جا رہے تھے ان کے پیچھے چلی۔ اور کچھ آدمیوں کو واپس بھی لے آئی لیکن پھر جلد ثابت ہوا کہ یہ بات کسی کے بس کی نہیں ہے۔ یسوکائی اب زندہ نہ تھا۔ اولاد کمسن تھی۔ عورت خواہ کیسی ہی ہمت رکھتی ہو کیا کر سکتی تھی۔ غرض تھوڑے دنوں میں اولون اور اسکے بچوں کو سب چھوڑ کر چلے گئے۔ تائیجوت کے چلے جانے پر اور عزیز رشتہ دار، نوکر چاکر، غلام جو یسوکائی کے ساتھ بکثرت رہتے تھے سب ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ حتیٰ کہ منلیک بھی جس کے سپرد یسوکائی اپنے بیوی بچوں کو کر گیا تھا وہ بھی آقا کے اہل و عیال سے علیحدہ ہو گیا۔ اور ان سے اپنا یورت علیحدہ قائم کر لیا۔ اب یسوکائی بہادر کی بیوہ اولون کے پاس سوائے اسکے بچوں یا یسوکائی کی دوسری بیوہ اور اسکے چند بچوں کے یا دو چار ماماؤں کے اور کوئی نہ رہا۔

اب یہ کنبہ جس سے سب نے علیحدگی اختیار کی تھی اس قابل بھی نہ رہا کہ اپنے گلوں کو اپنے ہی چراگاہوں میں چرا سکے۔ گلے چرانے کے لئے ان کے پاس اب زمین بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ لیکن اولون ایکی نے ہمت نہ ہاری۔ اپنے بچوں سے ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ تم شریف گلہ بانوں کی اولاد ہو، اور ان کے دل میں ہمیشہ یہ بات بٹھاتی رہی کہ تم سب جماعت اشراف کے رتبے اور منزلت پر پہونچنے کے حقدار ہو اور تمہارا فرض ہے کہ اس بے کسی اور تنگدستی کی حالت سے نکلنے کی کوشش کرو۔ کچھ عجب نہیں کہ اپنے ایماق کی قدیم روایات النقوا اور بوزنجر کے قصے جو ایماق بورجیجن کے مورث اعلیٰ تھے اور ان قصوں کے بعد کے حالات جنکو گذرے ہوئے زیادہ زمانہ نہ ہوا تھا یعنی قبل خاں کے کارنامے اور انباغائی خاں کے حالات جسے قن کے شہنشاہ نے ملک چین میں بڑی اذیتیں پہنچا کر جان سے مارا تھا۔ ان بچوں نے اپنی ماں ہی کی زبان سے سنے ہوں کیونکہ اولون ایکی بڑی دانشمند

خاتون تھی اور پرانے قصے روایات اور حکایات اس کو بہت یاد تھیں۔

یسوکائی بہادر کے فرزندوں کے لئے اب روز کا کام یہ رہ گیا تھا کہ گھوڑوں کے گلے چرائیں یا اپنے چرواہوں کے کام کی نگرانی کریں۔ اب پیٹ کے لئے اُن کو مچھلیاں پکڑنی اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کا شکار کرنا پڑتا تھا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ جنگلی پیاز اور لہسن یا ایسی ہی اور جڑیلی چیزیں ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ کہ اگر مل جائیں تو انہیں کھود کر گھر لے جائیں۔ کاہستانوں کے شریف گھرانوں میں اس طرح کی زندگی بڑی ذلیل اور خوار سمجھی جاتی تھی۔

غرض اسی محتاجی اور مفلسی کی حالت میں تموچن اور اس کے بھائی پل بڑھ کر جوان اور جوانی سے پورے مرد ہو گئے۔ تموچن دراز قد تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی اور چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ قدرت نے بہت سے اوصاف اس کی طبیعت میں رکھے ہیں۔ جوچی قسار اس کا سگا بھائی اور بکتمر سوتیلا بھائی طاقت جسمانی میں اس سے بڑھ کر تھے۔ لیکن تموچن میں قوت اور اختیار حاصل کرنے کا شوق ایسا تھا جو مرتے دم تک اُس کے ساتھ رہا۔ تموچن کو ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ اس کو کوئی متنفس اُس کے کسی حق سے محروم کر دے۔ طبیعت کا یہ پہلو ایسا سخت تھا کہ اس کی وجہ سے اُس نے اپنے ایک بھائی کو جان سے مار ڈالا لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جوانی میں تموچن سنگدل یا انسان کے خون کا پیاسا تھا۔ چنانچہ پڑھنے میں آتا ہے کہ جب اس نے سنا کہ بڈے چیراگا کو تائجوت نے زخمی کر دیا ہے تو لپکتا ہوا اس کے پاس گیا اور یہ دیکھ کر کہ باپ کے اس بڈھے نمک خوار کو دشمنوں نے کیسی بری طرح زخمی کیا ہے، زار و قطار رونے لگا۔

بھائی کے مارے جانے کا یہ واقعہ ہے کہ کچھ دنوں سے تموچن اور قسار کو یہ گمان ہو چلا تھا کہ جو شکار وہ مار کر لاتے ہیں اُس میں سے اُن کے سوتیلے بھائی بکتر اور ملکوتی ہمیشہ کچھ نہ کچھ نکال لیتے ہیں۔ اس کی شکایت دونوں نے اپنی ماں سے کی۔ اولون شکایت سنکر اپنے ہی بیٹوں پر خفا ہوئی اور کہا کہ تم بھائی بھائی آپس میں لڑائیاں کرتے ہو۔ اب تو ہماری بے کسی کا حال یہ ہے کہ سوائے اپنے سائے کے کوئی ہمارا ساتھی نہیں رہا۔ اور ناداری کا حال یہ ہے کہ ایک چابک تک سوائے گھوڑے کی دُم کے ہم نہیں رکھتے۔ اب تمہارا کام یہ نہیں کہ آپس میں لڑو بلکہ تمہارا فرض یہ ہے کہ تائجوت کو سزا دو جنہوں نے ہم کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔" ماں کی اس نصیحت کا اثر نہ کچھ تموچن پر ہوا اور نہ قسار پر اور ان دونوں نے آگے پیچھے سے گھیر کر بکتر کے ایک ایسا تیر مارا کہ وہ اس کے صدمے سے مر گیا۔ اولون نے جب یہ سنا تو غصہ سے آگ ہو گئی۔ لیکن تموچن کو بھائی کا اس طرح تیر سے مرنا کچھ معلوم نہیں ہوا، وہ اس کو کوئی بڑی بات نہ سمجھا اور نہ بکتر کی ماں اور اس کے بھائیوں نے بھی اس کا کچھ خیال کیا۔

یہ زمانہ رات دن کی لوٹ مار اور کشت و خون کا ایسا تھا کہ قتل کے وقوعے سننے کی لوگوں کو عادت سی پڑ گئی تھی۔ یہاں تک کہ اگر کسی خاندان کا کوئی آدمی مارا جاتا تو کنبے والوں کو اس کا چنداں خیال نہ ہوتا تھا۔ قتلِ انسان کوئی جرم نہ تھا۔ عدم قانون اور ایسے طرز حکومت میں جو خانہ بدوشوں کا تھا فتنہ و فساد ہمیشہ برپا رہنا ایک قدرتی امر تھا۔ مغلوں کے تمام یورتوں اور لشکروں میں اس قسم کے واقعات رات دن پیش آتے رہتے تھے۔ اور تاتاری بالخصوص ان باتوں میں سب سے بڑھ کر شہرت رکھتے تھے۔

جوانی اور شادی

کچھ عرصے بعد ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ تموچن جہاں دنیا کی اور باتوں کو سوچا کرتا تھا وہاں اب اپنی تقدیر پر بھی خصوصیت کے ساتھ غور کرنے لگا۔ اور اس غور کے بعد اُس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ خود اُس سے اور اس کے ارادے سے بالاتر اس ازلی فلکِ نیلگوں (منگکی تنگری) کی مشیت ہے۔ اس امر کا یقین اُسے ہمیشہ سے تھا کہ جن معبودوں کی پرستش وہ کرتا ہے اُن میں سب سے افضل و بالا ایک ذات واحد ہے جس کی مشیت

اب اُسکے دل پر قوت کے ساتھ منکشف ہو رہی ہے۔

تائجوت کے سردار ترغاتائی کریلتیک کو اس کا علم ہو گیا تھا کہ یسوکائی بہادر کا خاندان ترغاتائی کی علیحدگی کے بعد بھی غارت نہیں ہوا بلکہ یسوکائی بہادر کا بڑا بیٹا جوان ہو کر ایسا لائق اور ہونہار نکلا ہے کہ جس سے اِس خاندان کو اپنی بہتری کے لیے بہت کچھ توقع ہو سکتی ہے۔ ترغاتائی ڈرا کہ کہیں یہ لڑکا ایسا آدمی نہ ہو جائے جو تائجوت اور خود ترغاتائی کے حق میں خطرناک ثابت ہو۔ پس اُس نے ارادہ کیا کہ تموچن کو کسی طرح گرفتار کرے۔ اور ایک دن اُس نے اپنے ساتھیوں کو لیکر اونون کے یورت پر چھاپہ مارا۔ اس یکایک حملے نے اس غریب کُنبے کو بڑی مصیبت میں ڈالدیا۔ حملہ ہوتے ہی سب جنگل کی طرف بھاگے۔ چھوٹے بچے ایک بڑے چٹان کے شگاف میں چھپ بیٹھے۔ بلگوتی نے درخت کاٹ کاٹ کر گرانے شروع کیے تاکہ دشمن کا رستہ بند ہو۔ قسار نے جو بڑا تیر انداز تھا بھاگنے میں مُڑ مُڑ کر حملہ آوروں پر تیر چلائے۔ تائجوت نے پکار کر کہا کہ "ہم کو تموچن کے سوا اور کسی سے بحث نہیں ہے۔ صرف وہی ہمارے حوالے کر دیا جائے۔" تموچن اتنا سُنکر ڈرا اور گھوڑے پر سوار ہو ایک پہاڑ میں جس پر جنگل کھڑا تھا جا چھپا۔ تائجوت نے اُسے بھاگتا دیکھکر پیچھا کیا۔ لیکن پہاڑ پر درخت اس کثرت سے تھے کہ وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ اب اُنھوں نے اس جنگل کو گھیر کر ناکوں پر اپنے آدمی بٹھا دیے۔

کئی دن تک تموچن اسی جنگل میں چُھپا رہا۔ وہ ہر مرتبہ باہر نکلنا چاہا مگر دونوں مرتبہ کوئی نہ کوئی صورت ایسی پیش آئی کہ اس ارادے سے باز رہا۔ جو صورت پیش آئی اُس کو وہ تنگری (آسمان) کی طرف سے ایک ہدایت سمجھا گویا اس کی حفاظت منظور ہے اس لیے باہر نکلنے کو منع کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ گھوڑے کی راسیں پکڑے پیدل جاتا تھا کہ اب گھوڑے پر سوار ہو کہ دفعتاً گھوڑے کی پیٹھ سے کاٹھی پھسل کر گر پڑی۔ حالانکہ تنگ کہیں سے ٹوٹا نہ تھا۔ دوسری دفعہ جب جنگل سے باہر نکلنے کا قصد کیا تو راستے میں ایک بڑا اُجلا سا پتھر حائل نظر آیا کہ اس سے گذرنا ممکن نہ تھا۔ غرض کئی دن تک جنگل میں رہنے کے بعد بھوک اور پیاس سے مر جانے کا اندیشہ ہوا۔ اور آخرکار جنگل سے نکلنا پڑا۔ نکلتے ہی تائجوت نے اُسے گرفتار کر لیا۔ اور اسکے کندھوں پر کنگ (لکڑی کا بھاری جوا) باندھ دیا۔ تاکہ وہ بھاگ نہ سکے۔ اس حال میں تائجوت اُس کو اپنے یورت میں لائے۔ اور روزانہ ایک خیمے سے دوسرے خیمے میں قیدی کو تبدیل کرتے رہے۔

بہار کا موسم تھا چوتھے ماہ کے سولھویں دن دریائے اونان کے کنارے تائجوت نے ایک بڑی ضیافت دی تھی۔ سب لوگ اُس میں شریک ہوئے۔ تموچن پر جن لوگوں کو پہرہ دینے بٹھایا تھا وہ بھی سب ضیافت کھانے چلے گئے۔ صرف ایک جوان لڑکا رہ گیا۔ تموچن کو یہ موقع اچھا ملا۔ لکڑی کا جوا جو اُس کے کندھوں پر بندھا تھا۔ اس کے ایک سرے سے لڑکے کو ایسی زور کی ٹکر دی کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ اسکے گرتے ہی تموچن نکل کر بھاگا اور اونان کے کنارے اُس جگہ پہنچکر جہاں درخت کثرت سے تھے، دریا میں کودا۔ اور پانی میں گردن تک اپنے تئیں چھپا لیا۔ صرف سر پانی سے باہر نکلا رہا۔

تائجوت کو جس وقت معلوم ہوا کہ اُن کا قیدی نکل بھاگا ہے تو انہوں نے اُس کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ رات کا وقت تھا چاندنی خوب کھلی تھی۔ سورگن شیرا قبیلے سلدوز کا ایک شخص آج کل تائجوت کے پاس ٹھیرا ہوا تھا۔ اتفاق سے وہ اُدھر سے گذرا جہاں تموچن پانی میں چھپا کھڑا تھا۔ اُس نے تموچن کو پہچان لیا۔ اور اس سے کہا کہ "یہی اوصاف تو تم میں ہیں جن کی وجہ سے تائجوت تمہارے دشمن ہو رہے ہیں۔ اچھا جہاں ہو وہیں رہو۔ میں تائجوت کو تمہاری کچھ خبر نہ دونگا۔" اب سورگن شیرا نے تائجوت سے کہا کہ بہتر ہو کہ قیدی کو صبح تلاش کیا جائے۔ تائجوت نے اسکی بات مان لی۔ سورگن شیرا نے اس کی اطلاع تموچن کو کر دی۔ اور اس کو ہدایت کی کہ جسقدر جلد ممکن ہو اپنے یورت کو چلا جائے۔ لیکن تموچن خوب جانتا تھا کہ جب تک لکڑی کا بھاری "کنگ" (جوا) اُس کے کندھوں پر بندھا ہے وہ کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ غرض سرگن شیرا کے چلے جانے پر تموچن پانی سے نکلا اور سورگن شیرا کے خیمے کی طرف اس غرض سے چلا کہ بھاگنے میں وہاں سے کچھ مدد مل جائے۔ یہ خیمہ اُس کو آسانی سے

مل گیا۔ کیونکہ وہاں سے دودھ بلونے کی آواز آرہی تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ وہاں کی عورتوں کا یہی شغل ہے۔ اور یہ بات اُس کو اس وجہ سے معلوم تھی کہ جب تائیجوت کی قید میں تھا تو وہ ایک خیمے سے دوسرے خیمے میں منتقل ہوتا رہا تھا۔ چنانچہ ایک دن سورگن شیرا کے خیمے میں بھی وہ رہا تھا۔ گو قیدی تھا مگر اس خیمے کے لوگوں نے اُسے آرام سے رکھا۔ تموجن کو ڈھارس بندھی۔ سورگن شیرا نے اپنے بیٹوں چیلاؤن اور چنتائی کے کہنے سے کچھ تامل کے بعد تموجن کو اندر بلالیا۔ اور پھر اُسکو ایک گاڑی میں چھپا کر اُس پر بہت سی اُون ڈالدی لکڑی کا کنگ اب اُسکے کندھوں سے اتار دیا گیا تھا۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی تائیجوت نے پھر تموجن کو سارے لشکر میں تلاش کرنا شروع کیا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ سورگن شیرا کے خیمے کے قریب آئے، اور قیدی کو ڈھونڈنے کی غرض سے جب وہ گاڑی کی طرف آئے تو سورگن شیرا نے یہ کہکر اُن کو اُدھر سے پھیر دیا کہ "بھلا اِس اون کی گرمی میں کوئی چھپ کر زندہ رہ سکتا ہے۔" غرض جب تائیجوت چلے گئے تو سورگن شیرا اور اُسکے گھر کے لوگوں نے سفر کا سامان مہیا کر کے تموجن کو خدا حافظ کہا۔

جب تموجن گھر آیا تو وہ اپنے یورت اور سارے کنبے کو برخان خلدوں کے پہاڑ پر لے گیا۔ یہ مقام پرانے زمانے سے ایماق بورجیجن کا یورت اصلی (دنتوک) تھا۔ اب یہاں یہ کنبہ جنگل کے چوہوں کا شکار کر کے اپنا گذر کرنے لگا۔ حیرت سے حیرت کا مقام ہے کہ جس شخص کی زندگی جوانی میں اس ذلت و خواری سے گذری ہو آگے چل کر اُس کے سامنے دنیا کی زبردست سلطنتیں لرزہ براندام ہو جائیں اور جسکو اپنے دل کی آرزوئیں پوری کرنے کیلئے کوئی نعمت ایسی نہ تھی جو نہ ملی ہو۔

تموجن کے کنبے والوں کے پاس اب نو (۹) گھوڑے رہ گئے تھے۔ ایک دن اُن میں سے آٹھ گھوڑے خدا جانے کہاں کے چور آکر ہانک لے گئے۔ نواں گھوڑا اتفاق سے اس طرح بچ گیا کہ جب چور گھسے تھے تو بلکوتی اس گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل میں چوہے مارنے نکل گیا تھا۔ جب بلکوتی گھر آیا تو تموجن اس گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑوں کا سراغ لگانے نکلا۔

چوروں کو پکڑنے کی فکر میں جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے ایک نوعمر آدمی ملا جو بہت ہی ہوشیار اور پھرتیلا تھا۔ یہ جوان آدمی بڑی مستعدی سے تموجن کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کا نام بغورچی تھا۔ اور وہ بیٹا تھا ناگو بایاں کا۔ اور یہ شخص قبیلۂ ادولات سے تھا۔ تموجن جب گھوڑے لیکر واپس آنے لگا تو اس کا گذر ناگو بایاں کے یورت سے ہوا۔ ناگو بایاں نے تموجن اور اپنے بیٹے بغورچی سے کہا کہ "تم دونوں نوجوانوں کو چاہیئے کہ ہمیشہ دوست رہو اور کبھی جدا نہ ہو۔" ان دونوں نے اس بڈھے سردار کی نصیحت پر ہمیشہ عمل رکھا۔ شروع سے دونوں میں اس درجہ تعلق اور دوستی ہوئی کہ تمام عمر وہ گاڑھے دوست اور رفیق رہے۔ بعد کو بغورچی چنگیز خاں کا مشہور سپہ سالار اور لڑنے والوں میں اُسکا ہمیشہ وفادار رہا۔ چنگیز خاں نے بھی جو اعتبار اس دوست کا شروع سے کیا تھا۔ اور جو محبت اس سے ہوئی تھی اُسکو آخر دم تک برقرار رکھا۔

بہرکیف اس معرکے نے کہ گھوڑے چوروں سے چھین لایا، تموجن کی ہمت بڑھادی۔ اب وہ اپنے تئیں مرد میدان سمجھنے لگا۔ اور اب اُسمیں اتنی قوت آگئی تھی کہ وہ اپنے اور اپنے متعلقین کو دشمنوں سے پناہ میں رکھ سکے۔ اور وہ اب اس دنیا میں بے یار و مددگار نہ رہا۔ یہی زمانہ تھا کہ اُسنے قبیلہ قنقرات میں اپنی منگیتر کے پاس جانا چاہا۔ یہ منگیتر وہی تھی جس سے باپ نے لڑکپن میں شادی ٹھہرادی تھی۔ پس تموجن وائی سیچین کی چراگاہوں کی طرف چلا۔ اس کا سوتیلا بھائی بلکوتی ساتھ تھا۔ وائی سیچین تموجن سے مل کر بہت خوش ہوا اور بیٹی کو رخصت کرنیکا وعدہ اُسنے پورا کیا۔ اور اب بورتہ تموجن کی بیوی ہوگئی۔ سسرال سے تموجن کو خلعت میں کالے سمور کا ایک بڑا قیمتی پوستین ملا۔ تموجن ابھی تک اسقدر مفلس تھا کہ اس پوستین کا گھر میں آنا بڑی دولت سمجھا گیا۔ اور تموجن نے سوچا کہ یہ پوستین کسی بڑے آدمی کو نذر دونگا۔

مغلوں کے ایماق اور الوس اب حکومت و سیاست سے بالکل محروم ہوگئے تھے۔ تاتاریوں نے ایسا زور پکڑا کہ وہ بجائے مغلوں کے

شاہانِ قن کے حق میں خطرناک ثابت ہونے لگے۔ پس قن کے بادشاہوں نے اس حکمت عملی سے کام لیا جو چینی حسب روایاتِ قدیم شمال کی خانہ بدوش قوموں کے ساتھ رکھتے چلے آئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مغلوں کی خانہ بدوش قوموں کو تاتاریوں کے خلاف اُبھارا۔ اِن مغلی اقوام میں قرایت چین کے سب سے بڑے حریف تھے۔ پس قن نے قرایت کو تاتار کے مقابلہ پر آمادہ کر دیا۔ اور اس طرح تاتاریوں اور قرایت میں لڑائی کروا دی طغرل خاں بادشاہ قرایت کو چینیوں کی طرف سے ونگ کا خطاب ملا۔ اسی خطاب کی وجہ سے طغرل ونگ خاں کے نام سے مشہور ہوا۔ قرایت گلہ بانی کرتے تھے اور مغلی زبان بولتے تھے۔ شائستگی میں وہ تاتاریوں اور تائجوت سے کسی قدر بڑھے ہوئے تھے۔ اور ان میں اکثر لوگ نسطوری عقائد کے نصرانی تھے اور وہ اقوام تنگوت یا سی ہیا جو متمدن اور شائستہ قومیں تھیں تعلقات بھی رکھتے تھے۔ قوم سی ہیا اسوقت چین کے شمال مغربی علاقوں پر حکومت کرتی تھی۔ قرایت کے تعلقات چینی ترکستان اور جتی سو[1] کے ملک والوں سے بھی تھے۔

ونگ خاں گو اس لائق نہ تھا مگر اُس کی شہرت بہت ہوگئی۔ خاصکر یورپ میں وہ بہت مشہور ہوگیا۔ یورپ میں طرح طرح کے قصے اور افسانے ایک حکمران پادری یوحنا (پریسٹر جان) کے متعلق زبان زد خلائق ہوگئے۔ اہلِ یورپ نے اِن قصوں اور افسانوں کو سچ سمجھکر دل سے یقین کیا۔ اور بڑے جوش و خروش سے اس بات کو تسلیم کرنے لگے کہ یوحنا شرق میں کسی دور کے مقام پر ایک بڑی زبردست عیسائی قوم کا بادشاہ ہے۔ ونگ خاں کے خطاب نے اور بھی موقع دیا کہ اس فرضی یوحنا اور بادشاہ قرایت میں تطبیق کر دی جائے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ طغرل خاں بادشاہ قرایت ایک کم حیثیت سردار بڑا جابر و جفاکار تھا۔ اور باوجود صاحبِ قوت و ہمت ہونے کے اُس میں وہ اوصاف کم تھے جو ایک خانہ بدوشوں کے بادشاہ اور حاکم میں ہونے ضروری تھے۔ اس وجہ سے کئی موقعوں پر طغرل خاں سخت مشکلوں میں مُبتلا ہوگیا۔ اور اکثر مرتبہ یسوکائی بہادر نے اُس کی مشکلوں کو دُور کیا۔

ونگ خاں اور تموچن کا باپ یسوکائی بہادر بڑے دوست تھے۔ اور اسی دوستی کی وجہ سے اُن میں بھائی چارہ بھی ہوگیا تھا۔ یعنی وہ آپس میں مغلوں کی اصطلاح کے مطابق اَندہ ہوگئے تھے۔ غرض جب تموچن بورتہ کو اپنے گھر لے آیا تو ارادہ کیا کہ ونگ خاں کو اپنی نسبت کچھ کہلا بھیجے تاکہ اُسکی مدد سے اپنی حالت میں کچھ بہتری ہو اور دُشمنوں سے بھی پناہ ملتی رہے۔

اگرچہ زیادہ نہیں مگر کسی قدر حالت تموچن کی پہلے سے بہتر ہوگئی تھی۔ اور اب وہ ایسا آدمی نہ رہا تھا جس کی نسبت سمجھا جاتا کہ "خدا کا سایہ اُسکے سر سے اُٹھ گیا ہے"۔ اب وہ ایک حد تک سمجھنے لگا تھا کہ وہ کاہستانوں کے شریف گلہ بانوں میں سے ایک بااختیار شریف ہے۔ کیونکہ جماعت اشراف سے ہونے میں اُسکے کلام نہ تھا۔ اور اسوقت وہ ایک خاندان کا سردار بھی تھا۔ اس خاندان میں کم سے کم دو اچھے لڑنے والے یعنی قسار اور بلکوتی شامل تھے۔ شادی بھی تموچن کی اچھے خاندان میں ہوئی تھی۔ اور کم سے کم ایک وفادار شخص جسکو تموچن اپنے توابع میں سمجھ سکتا تھا موجود تھا۔

تموچن جب دُلہن بیاہ کر گھر لانے لگا تو اُس نے بلکوتی کے ہاتھ بغورچی کو کہلا بھیجا کہ وہ تموچن کے یورت میں آئے۔ بیان ہوا ہے کہ بغورچی تموچن کی اس دعوت کو سُنکر ایسا بیتاب ہوا کہ اس نے اپنے باپ سے اجازت بھی نہ لی اور تموچن کے یورت کی طرف چل پڑا۔

چنگیز خاں کا عروج

تموچن اپنے بھائی قسار اور بلکوتی کو ساتھ لئے ونگ خاں بادشاہ قرایت سے ملنے گیا۔ ونگ خاں اس زمانے میں دریائے تولہ کے

[1] جتی سو کے ملک کو روسی سمی ریچی کہتے ہیں۔ جتی سو کے معنی سات دریاؤں والی زمین کے ہیں۔ اس ملک میں کوہستان طیان شان کا شمالی علاقہ اور اپر ہنگاریا شامل ہے۔ فی زمانہ جتی سو مراد قزاقستان اور قرغیزیا کی جمہوری ریاستوں سے ہے۔

کناٹ ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ بورتہ کے گھر سے جو قیمتی پوستین ملا تھا وہ بھی تموچن اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ ونگ خاں اپنے منہ بولے بھائی لیسوکائی کے بیٹوں سے ملکر بہت خوش ہوا اور ان کی مہمان نوازی میں مصروف ہوا۔ پوستین جو تموچن نے نذر پیش کیا اسکو دیکھکر بھی بہت پسند کیا۔ اور اس نے تموچن سے مدد دینے کا وعدہ کیا اور کہا کہ جو عزیز اور ساتھی اسکو چھوڑ کر چلے گئے ہیں انکو پھر اسکے پاس بلا دیگا۔

تموچن جب ونگ خاں سے ملاقات کرکے اپنے یورت کو آیا تو ایک اور بات خوشی کا موجب ہوئی۔ چرچیوتائی ایک بڈھا لوہار تھا وہ اپنے بیٹے جلمی کو لیکر آیا۔ اور تموچن سے کہنے لگا کہ "جب تم ویلون بلداق میں پیدا ہوئے تھے تو میں تمہارے لئے ایک کرتہ سی کر لایا تھا۔ اور اس پر میں نے قاقم کی گوٹ لگائی تھی۔ اور اسکے ساتھ اپنے اس بچے جلمی کو بھی تمہاری نذر کیا تھا لیکن وہ اس زمانے میں اس قدر چھوٹا تھا کہ میں خود اس کی پرورش کرتا رہا۔ اب وہ بڑا ہوگیا ہے اس کو اپنی خدمت میں رکھو۔ یہ تمہارا گھوڑا کسا کرے گا اور تمہارے گھر کا دروازہ کھولا کرے گا۔ اتنا کہہ کر بڈھا لوہار چرچیوتائی اپنے بیٹے جلمی کو تموچن کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ علاوہ اس بات کے جلمی تموچن کی مدد کرسکتا تھا اس خیال سے بھی تموچن کو تسکین ہوئی کہ جماعت اشراف کا رکن ہونے کی وجہ سے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ دوسرے اس کی اطاعت کریں۔ غرض تموچن سمجھنے لگا کہ میں فی الواقع ایک شریف حاکم اور سردار ہوں اور جو لوگ میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ بھی مجھکو حاکم اور سردار مانتے ہیں۔

اسکے بعد بھی تموچن کو بہت سی مشکلیں پیش آتی رہیں۔ اور پھر اس کو انہیں مصیبتوں کا سامنا ہوا جو ایک خانہ بدوش قوم کے سردار کو پیش آتی ہیں۔ اس موقع پر اس نے ہوشیاری سے کام لیا۔ گو یہ ہوشیاری بزدلی کے درجے کو پہونچی ہوئی تھی لیکن صورت حالات ایسی مساعد و موافق ہوئی کہ تموچن جس نے صبر کرنا سیکھ لیا تھا آخر کار اپنی مراد کو پہونچا۔

مرکیت کا ایک گروہ توقتا کی سرکردگی میں جو اوویت مرکیت کا سردار تھا ایک دن تموچن کے یورت پر قبضہ کرنے اچانک آن موجود ہوا۔ غرض اس حملے کی یہ تھی کہ تموچن کے باپ لیسوکائی بہادر نے قوم مرکیت کے آدمی کی بیوی کو جو چھین لیا تھا اس کا انتقام۔ تموچن کے کنبے والوں نے ان اچانک حملہ کرنے والوں کو تائید آسمانی سمجھا۔ فوراً سب گھوڑوں پر سوار ہو بھاگے۔ تموچن بھی گھوڑے پر سوار ہو کر برخان خلدون کے پہاڑ کی طرف بھاگا۔ اور اس بات کا مطلق خیال نہ رہا کہ بورتہ کے بھاگنے کو کوئی گھوڑا نہیں رہا۔ غرض مرکیت نے یورت میں آکر بورتہ کو پکڑ لیا اور اسکو اور تموچن کی سوتیلی ماں کو گرفتار کرکے اپنے یورت کو لے گئے۔

کچھ دنوں پوشیدہ رہنے کے بعد تموچن نے اپنے آدمی خبر خبر کو بھیجے۔ ان لوگوں نے خبر دی کہ مرکیت بہت دور نکل گئے ہیں۔ تموچن اس خبر کو سنکر پہاڑ کے نیچے اترا۔ چھاتی پیٹی اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بلند آواز سے کہا "کوہ برخان، تو نے مجھ مصیبت زدہ کی جان بچائی ہے اس لئے میں تجھ پر قربانی چڑھاؤں گا۔ اور اپنے بیٹوں اور پوتوں سے کہہ جاؤں گا کہ وہ تجھ پر ہمیشہ قربانی چڑھایا کریں۔" اسکے بعد تموچن نے کمر سے پیٹی کھولکر اسکو گلے میں ڈالا اور سر سے ٹوپی اتار کر ہاتھ میں لی۔ پھر چھاتی پیٹ کر نو بار پیشانی زمین پر رکھی اور گھوڑی کا ترش دودھ زمین پر چھڑکا۔ مغلوں میں اپنی متبرک چیزوں کی پرستش کرنیکا یہی طریقہ تھا۔ کہ کمر سے پیٹی کھول کر سر سے ٹوپی اتارتے تھے تاکہ جبروت ایزدی کے سامنے اپنا بے حقیقت ہونا تسلیم کریں۔ کمر میں پیٹی اور سر پر ٹوپی ہونے کے معنی یہ تھے کہ اس شخص کو پوری آزادی حاصل ہے۔

خدا کے سامنے اس طرح جھکنے کے بعد تموچن نے ارادہ کیا کہ جن لوگوں نے اس کے ساتھ یہ زیادتی اور بدسلوکی کی ہے ان کی اچھی طرح خبر لے۔ اب تموچن نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ جاموقہ سیچین اور ونگ خاں کو اپنی مدد پر آمادہ کیا۔ اور اب ان دونوں سرداروں نے مرکیت کی قوم سے جو بورتہ کو اٹھا لے گئے تھے، لڑائی کا اعلان کر دیا۔ جاموقہ سیچین تموچن کا رشتہ دار تھا۔ کیونکہ وہ ایماق جاجرات سے تھا اور جاجرات اور تموچن کے ایماق کا مورث اعلیٰ ایک ہی شخص یعنی بودنجر (بوزنجر) تھا۔ جاموقہ بڑا چست و چالاک و ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے بہت سے

گلہ بان شرفا اور عوام کو اپنے ساتھ کر رکھا تھا۔ اور اُسکے ہمراہیوں میں بہت سے لوگ وہ تھے جو کسی زمانے میں یسوکائی بہادر کے تابع تھے اور اس کے مرنے کے بعد یسوکائی کے کہنے سے وہ علیحدہ ہو گئے تھے۔ جاموقہ اور تموچن جب بچے سے تھے تو آپس میں بہت ملا جلا کرتے تھے۔ ایک دفعہ دریائے اونان برف سے جم گیا۔ اس برف پر یہ دونوں لڑکے کھیل رہے تھے کہ ان میں سے ایک نے دوسرے کو کوئی سوغات دی اور اس طرح وہ آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔ اس قسم کے بھائی چارہ کو آندہ کہتے تھے۔ تموچن کو اپنے باپ کے منہ بولے بھائی ونگ خاں اور اپنے منہ بولے بھائی جاموقہ سے مرکیت کے خلاف مدد مانگنے میں کچھ دقت پیش نہ آئی کیونکہ ونگ خاں اور جاموقہ کو خود مدت سے مرکیت سے شکایتیں چلی آتی تھیں۔

ونگ خاں اور جاموقہ نے مل کر جو لڑائی (جس میں تموچن کے آدمی بھی شریک تھے) مرکیت سے لڑی اس میں مرکیت بالکل شکست کھا گئے بورتہ تموچن کی بیوی قید سے رہا ہوئی۔ مرکیت اور اس کا سردار توقتا اپنا مال اسباب میدان میں چھوڑ کر بھاگے۔ فاتحوں کو مالِ غنیمت بہت ملا۔ مغلوں کی تاریخ میں بیان ہوا ہے کہ تین سو آدمی جنہوں نے برخان خلدون میں تموچن کے یورت پر اچانک حملہ کیا تھا وہ سب کے سب قتل کر دئے گئے۔ ان کی بیویوں کو جو شادی کے قابل تھیں شادی کر دی گئی اور جو لونڈیاں بننے کے قابل تھیں وہ لونڈیاں بنائی گئیں۔ جب بورتہ صحیح سلامت تموچن کو مل گئی تو پھر تموچن نے ایسی تدبیر کی کہ مرکیت کا زیادہ تعاقب نہ کیا جائے۔ کیونکہ خاص وجود ایسی تھیں جس کی بنا پر تموچن یہ نہ چاہتا تھا کہ ونگ خاں اور جاموقہ مرکیت کو بالکل ہی غارت کر دیں۔ یہ لڑائی تموچن کے حق میں خاص طور پر مفید ہوئی۔ کیونکہ تموچن کے باپ کے زمانے کے جو لوگ جاموقہ کے ساتھ ہو گئے تھے وہ اب تموچن کے پاس آنے شروع ہو گئے۔ لیکن بڑی بات اس لڑائی سے یہ ہوئی تھی کہ تموچن اب سب کے سامنے آگیا تھا چونکہ ونگ خاں، جاموقہ اور تموچن نے مل کر یہ لڑائی لڑی تھی اس لئے بہت سے ایماقوں اور الوسوں سے تموچن کے تعلقات پیدا ہو گئے۔ اور سب میں تموچن کا چرچا ہونے لگا۔ جن لوگوں نے اُسکی مدد کی اُن کی شکر گذاری میں تموچن نے جو تقریر کی اس میں تنگری (آسمان) کا نام بار بار لیا تھا چنانچہ اُس نے کہا کہ "ونگ خاں جو میرے باپ کے برابر ہیں اور تم میرے منہ بولے بھائی جاموقہ تمہاری مدد اور آسمان کی تائید سے مجھ میں اتنی قوت آئی کہ دشمن سے اُسکی بدسلوکی کا بدلہ نکال سکوں۔

مرکیت سے لڑنے کے بعد تموچن اور جاموقہ نے اپنے اپنے لشکر دریائے اونان کے کنارے ایک مقام پر ڈالے جس کو "کورگناک جابور" کہتے تھے۔ یہاں تموچن اور جاموقہ لڑکپن کی دوستی کا ذکر کرنے لگے۔ ایک بڑے درخت کے سایہ میں انہوں نے ضیافت دی۔ رات جب ہوئی تو ایک ہی کمبل دونوں اوڑھ کر سوئے۔ جاموقہ کے لشکر میں تموچن کو بہت سے الوسوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ باوجودیکہ جاموقہ سے دوستی تھی مگر تموچن نے ایماق جیلیر کے سردار مقولی کی باتیں بہت غور اور توجہ سے سنیں۔ مقولی نے اس موقع پر جو باتیں تموچن سے کیں وہ یہ تھیں :۔

مقولی نے کہا "اِسی سایہ دار درخت کے نیچے اور اسی مقام "کورگناک جوبور" میں جہاں تم نے ابھی جاموقہ سیچین کے ساتھ ضیافت کھائی ہے جب مغلوں کے آخری خان قتولہ خاں کا انتخاب مسندِ خانی پر ہوا تو وہ ناچا اور خوش ہوا تھا۔ قتولہ خاں کے بعد ایماقِ مغل کی حکومت کا چراغ گل ہو گیا۔ اور ان میں خان ہونے موقوف ہوئے۔ لیکن "منگ کی تنگری" (ازلی نیلے آسمان) نے اپنے پسندیدہ ایماق پر جو اسی کی اولاد سے تھا اپنا لطف و کرم جاری رکھا۔ اور اب اسی ایماقِ مغل سے ایک بہادر نمودار ہونے والا ہے جو ایک مرتبہ پھر اپنے عزیزوں اور اپنی قوم کے آدمیوں کو یکجا کرے گا۔ اور وہ بڑا ہی زبردست خان ہوگا۔ اور وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے گا اور یہ بہادر خان بڑا سورما تموچن ہوگا۔ یہ مقولی کی زبان سے جو کچھ نکلتا تھا اس کو لوگ سمجھتے تھے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے آسمان کی تائید سے کہتا ہے۔ اس کا چرچا سب میں ہونے لگا۔ یہاں تک کہ مقولی کے بڈھے باپ نے بھی کہا کہ یہ بات کہ ایک نہ ایک دن تموچن "خان" ہوگا سب میں مشہور ہو گئی ہے۔ اور سب کو اس کا یقین بھی ہو گیا ہے کہ ایک دن یہی ہونے والا ہے۔ یعنی تموچن اپنی قوم کا

"خاں" ہو کر قومِ مغل کو بزرگی اور امتیاز بخشیگا۔
ڈیڑھ برس تک تموچن اور جاموقہ ساتھ رہے۔ تموچن کے لئے یہ زمانہ اس بات کے اندازہ کرنے کے لئے کافی تھا کہ جو طریقہ تموچن کا ہے وہ جاموقہ کا نہیں ہو سکتا۔ رفتہ رفتہ تموچن کو مقولی جیلیر کی باتوں کا یقین ہو گیا۔ خود بھی اُس کی طبیعت ان باتوں کے یقین کی طرف مائل تھی۔ اور اب اُسکے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ آسمان نے اُسی کو اپنی قوم کی ترقی اور شاہانِ مغل کا جانشین ہونے کو منتخب فرمایا ہے۔ تموچن نے یہ سمجھ لیا کہ یہ بات اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ قابلِ اعتبار اور مضبوط دل کے ساتھی میسّر آئیں، جو اُسکے تحت اور زیرِ فرمان زبردست آلہ اُس کی قوت اور سطوت کا بن جائیں۔ اب جو اُسے شوق ہوا کہ اپنی قوم کے لوگوں اور اُنکے ساتھ گلہ بان جماعتِ اشراف کے افراد کو جمع کرے۔ اس جماعت اشراف میں ایسے بہت لوگ تھے جو اُسکے خیالات سے واقف اور اُسکے سچے ہمدرد تھے۔ اب اُسے شوق ہوا کہ اپنی قوم کے لوگوں اور گلہ بان شریفوں کو اپنے پاس جمع کرے۔ گلہ بانوں کی شریف جماعت میں بہت لوگ ایسے تھے جو اُس کے خیالات سے واقف تھے اور اس کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ جوانی کے مصائب کو یاد کر کے دل میں آرزو پیدا ہوتی تھی کہ ایک خانہ بدوش رئیس اور سردار کی طرح آزاد اور مرفہ الحال زندگی بسر کرے۔ کیونکہ اس بات کو وہ جانتا اور محسوس کرتا تھا کہ اپنی خاندانی شرافت اور ذاتی وجاہت کے باعث وہ قوم کا سردار اور حاکم ہونے کا استحقاق رکھتا ہے۔ جاموقہ سیچین کی طبیعت میں اُس نے اور بات پائی۔ اور دیکھا کہ وہ عوام کا یعنی مغلوں میں جو بہت ہی ادنیٰ درجے کے لوگ ہیں اُن کا زیادہ خیال رکھتا ہے۔ تموچن کو اشراف اور صاحبِ حکومت جماعت سے بحث تھی۔ یا یہ سمجھئے کہ تموچن اشراف اور اعیانِ قوم کی طرف میلانِ خاطر رکھتا تھا اور جاموقہ جمہور اور عوام کی طرف راغب تھا۔ پس یہ مقامِ تعجب نہیں کہ کچھ مدت کے بعد تموچن اور جاموقہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ تموچن کی زندگی کے اس واقعہ کو "خفیہ تاریخ مغل" میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"ایک دن تموچن اور جاموقہ نے کورگناک جوبور سے اپنے ڈیرے خیمے اکھاڑ کر دوسری جگہ جانے کا قصد کیا۔ گرمی کا موسم تھا چوتھے ماہ کی سولہویں تاریخ تھی۔ تموچن اور جاموقہ گاڑیوں کے آگے آگے گھوڑوں پر سوار جا رہے تھے کہ جاموقہ بولا: اگر آج ہم پہاڑی کے دامن پر قیام کرتے ہیں تو ڈیرے اُن لوگوں کو مل سکیں گے جو گھوڑوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اور اگر ہم دریا کے کنارے ڈیرے ڈالتے ہیں تو اُن لوگوں کو جو بھیڑوں اور بھیڑوں کے بچوں کی رکھوالی کرتے ہیں اُن کے پیٹ کو دانہ پانی مل سکے گا۔" تموچن نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور چلتے چلتے گھوڑا روک کر اپنی ماں اولون کا انتظار کرنے لگا۔ اولون کی سواری پیچھے آ رہی تھی۔ جب اولون قریب آئی تو تموچن سے جاموقہ نے جو کچھ کہا تھا وہ ماں کو سُنایا اور کہا کہ نہ تو میں جاموقہ کی ان باتوں کا کچھ مطلب سمجھ سکا اور نہ اس کو کچھ جواب دے سکا۔ اس لئے میں تمہارا انتظار کرنے لگا کہ جب آؤ گی تو تم سے پوچھونگا کہ جاموقہ نے یہ باتیں کس غرض سے کہی تھیں۔" اولون نے ابھی کچھ کہا نہ تھا کہ بورتہ بیچ میں بول اُٹھی: "بھائی جاموقہ کو تو لوگ کہتے ہیں کہ اُن کو نئے نئے ملنے والوں سے تو محبت ہوتی ہے اور پُرانے ملنے والوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اب ہم پُرانے ہو گئے ہیں اس لئے جاموقہ کا جی ہم سے پھر گیا ہے، جو کچھ اُنہوں نے کہا اُس میں ہمارے خلاف کوئی بات ضرور چھپی ہے۔ ہم کو یہاں قیام نہ کرنا چاہئیے بلکہ رات بھر چلتے رہنا چاہیئے۔ بہتر تو یہی ہے کہ جاموقہ سے ہم لوگ اب علیحدہ ہو جائیں۔" بورتہ سے یہ باتیں سُنکر تموچن نے وہاں قیام نہیں کیا اور رات بھر چلتا رہا۔ جاموقہ وہیں ٹھہر گیا۔ جب رات بھر کی یہ منزل ختم ہوئی اور صبح کے آثار نمودار ہوئے تو کیا دیکھتا ہے کہ ایماق جیلیر اور ایماق قیان اور ایماق بارین کا سردار قورچی اور بڈھا اوسون اور قبیلہ مینی بارین کے سب لوگ تموچن کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔"

جاموقہ کی گفتگو میں جو اوپر بیان ہوئی۔ گھوڑوں کی نگہداشت کرنے والوں سے مُراد شرفا یا اعلیٰ جماعت یعنی کاہستانوں کے سرداروں اور مالکوں سے تھی اور بھیڑوں اور بھیڑ کے بچوں کے رکھوالوں سے مُراد عام لوگ تھے جنکو قراچو کہتے تھے۔ اور جنکے ساتھ جاموقہ کو خاص طور پر ہمدردی تھی۔ تموچن جاموقہ کی اس پیچیدہ تقریر کو سمجھا نہیں مگر اتنا ضرور تاڑ گیا کہ اُس میں جاموقہ کا قصد کسی دُشمنی کے ظاہر کرنے کا ہے۔ بورتہ سے اتنی بات سُنکر

کوتاہ اس کے بعض حصے ہنسانے والے اور بعض رلانے والے اور بعض پراسرار ہیں قیمت ۶؍

ومپائر ایک دوشیزہ کی عصمت ریزی کا عجیب و غریب دردانگیز و مضحکہ خیز قصہ قیمت (۶؍)

شریر بیوی ایک شوخ لڑکی کی داستان جس کو پڑھکر بے اختیار ہنسی آتی ہے قیمت ۸؍

فل بوٹ حسن و عشق کا بیحد دلچسپ مختصر ناول جذبات و تاثرات کا دل آویز مرقع قیمت ۸؍

روح ظرافت صحیح معنوں میں ظرافت کی روح ہے آٹھ نہایت دلکش افسانوں کا مجموعہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (۱؍۸)

مرزا جنگی لکھنؤ کی پرانی تہذیب اس ولاویز پیرایہ میں دیکھ کر ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے قیمت چھ آنے (۶؍)

دیکھا جائیگا شائقین کے بیحد اصرار پر کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت خوبصورت جلد کی ایک روپیہ (۱؍)

روح لطافت جذبات لطیف کی روح ہے۔ آٹھ بیحد دلچسپ و عبرت انگیز افسانے قیمت ۸؍

جنت کا بھوت یہ افسانہ بھی اس قدر پسند کیا گیا ہے اس کو کتابی صورت میں شائع کرنا پڑا ہے قیمت ۱۲؍

تفویض ایک گریجویٹ خاتون کی شادی ایک بیہودہ کے ملاّ سے ہو جاتی ہے اس کے عجیب و غریب نتائج قیمت پانچ آنہ (۵؍)

طوفان ظرافت یہ چند مزاحیہ قصائد کا مجموعہ ہے جو قصیدہ مرغن اور مشین جیسے بے بہا

قصائد پر مشتمل ہے قصائد کی بحر بلحاظ اپنی طرز کے بالکل یگانہ ہیں ایک ایک شعر پڑھ پڑھ کر آپ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے اور مسلسل قہقہوں سے فضا گونج اٹھیگی۔ قیمت صرف چھ آنے (۶؍)

چندر موہنی مصنفہ انصار علی صاحب ناصری حسن و عشق کی داستان مگر پاک محبت کے لطیف جذبات حسرت ناک انجام قیمت ایک روپیہ (۱؍)

نویس جناب ملا رموزی کی بہترین تصنیف جس میں مصنف نے اپنی مخصوص طرز نگارش کے ذریعے مزاح اور دلچسپی کے دریا بہا دیئے ہیں اس کتاب کی شگفتگی اور دلآویزی خود اس کو پڑھنے کی سفارش کرتی ہے قیمت صرف ۱۲؍، علاوہ محصول۔

نرگس جمال مترجمہ شاہد احمد بی اے قیمت (۱؍)

کمزوری مرزا عظیم بیگ صاحب نے ایک ایسا دلچسپ

گھر پا بہادر

چغتائی صاحب کے مخصوص طرز تحریر کا

تازہ ترین شاہکار

نہایت ہی پر مذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے مصنف اپنے شوخ اور مذاقیہ طرز بیان کے ساتھ ساتھ لنگران اعظم کے جگمگاتے کمروں میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک اور شرمناک سازشوں کے ہولناک اور قہقہہ خیز سین دکھائیگا یہ بہترین ناول اپنے پلاٹ کی ندرت اور اچھوتے پن نیز طرز بیان کی شوخی اور دلربائی میں چغتائی صاحب کے تمام دوسرے ناولوں سے بڑھا ہوا ہے۔ گھر پا بہادر کو پڑھکر آپ شرر کے دربار حرام پور کو بھول جائیں گے۔ بہترین لکھائی چھپائی۔ فوٹو بلاک کا رنگین سرورق اور قیمت ان تمام خوبیوں کے بمقابل بالکل مفت یعنی صرف ایک روپیہ (۱؍) محصول ۵؍ مجلد ۱؍۴

ملنے کا پتہ:۔ کتبخانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی

اخوان الشیاطین مصنفہ علامہ مشکک اعظم
افضل حسین صاحب چشتی کے سات سائنٹفک افسانوں کا بیحد دلکش مجموعہ۔ آپ کے مطالعہ کے بعد رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ (۱؍۴)

صبح لطافت ملک کے مشہور اور یگانہ مزاحیہ

ناول لکھا ہے جو ان کی تمام موجودہ تصانیف سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ قیمت دو روپیہ (۲؍) محصول ۵؍

موج تبسم ہندوستان کے مشہور مذاقیہ نویس جناب شوکت تھانوی کا بہترین مجموعہ مضامین پہلا اڈیشن شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اب دوسرا اڈیشن بیحد اضافہ و ترمیم کے بعد شائع کیا گیا ہے

یہ وہ مجموعہ ہے جو سودیشی ریل اور سودیشی ڈاک خانہ جیسے مشہور مضامین پر مشتمل ہے دوسرا ایڈیشن بھی قریب الختم ہے اس لئے جلد منگائیے۔ قیمت صرف دو روپے (۲؍) علاوہ محصول

سیلاب تبسم حضرت شوکت تھانوی کے بہترین تازہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہنسنے ہنسانے کا مستقل ذریعہ ایک ایک مضمون مزاحیہ خوبیوں اور دلچسپیوں کا حامل ہے قیمت صرف دو روپیہ (۲؍) علاوہ محصول۔

بحر تبسم حضرت شوکت تھانوی کے دو بہترین افسانوں کا مرقع ایک ایک افسانہ سیکڑوں قہقہوں کا ذمہ دار ہے۔ قیمت مجلد دو روپیہ (۲؍) علاوہ محصول۔

طوفان تبسم جناب شوکت تھانوی کے ۱۱ افسانوں کا یہ مجموعہ ایسے شگفتہ افسانوں پر مشتمل ہے جو ہر طرح پڑھنے کے لائق ہیں۔ قیمت صرف ۱۲؍۔ علاوہ محصول۔

شادی یہ کتاب مزاح میں اپنی شان کے اعتبار سے یکتا ہے ملک کے مشہور ترین مزاحیہ نویس جناب ملا رموزی کا نام نامی اس کتاب کی خوبیوں کے لئے کافی ضمانت ہے۔ اگر آپ معیاری مزاح کے ساتھ شگفتگی مضامین اور تحریری خوبیوں کو ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کیجئے۔ قیمت صرف ۱۲؍ علاوہ محصول

عورت (با تصویر) پھولوں کی سیجوں پر حسن رعنائی دیکھنے سے پہلے مجموعہ کے تمام پوشیدہ رازوں سے واقف ہو جائے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب آپ کتاب عورت کا مطالعہ کریں جو نسوانی زندگی کا مکمل فوٹو ہے عورت کے پوشیدہ اعضائے جسم عورت کی فطرت

عورت کی تربیت عورت کے بلوغ حسن کی خوشہ چینی غرض کہ عورت کی زندگی کے متعلق کوئی پوشیدہ بات ایسی نہیں ہے جو اس کتاب میں نہ ہو اس کتاب میں دو سو کے قریب رنگین فوٹو بلاک اور فلمی تصویریں ہیں بہت مقبول کتاب ہے اور ہاتھوں ہاتھ بکتی ہے۔ قیمت دو روپیہ عہ، محصول عہ

شاہی کوک شاستر

جو بادشاہوں کے لئے تھا اب وہ عام ہے اس کتاب میں رجوع الشیخ نے لذت کے سرچشمہ عورت کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ لذتیں جو ایک جوان آدمی کے ذہن میں صورتیں رکھتی ہیں شاید وہ اس کے پاسنگ بھی نہ ہوں ارباب مفتش نے عورت کے رونگٹے رونگٹے سے لذت ہی لذت ثابت کی ہے اور اسی طرح مرد کی قوت نہانی کو مزید طاقتور کرنے کے نسخے لکھے اور ہزار ہا گر بتلائے ہیں اور اسی علاج کے سلسلہ میں حکایات وصل جو بیان ہوئی ہیں وہ ہزار ہا معجونوں سے مقوی ہیں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) محصول ۸/

قانون مباشرت

اردو کے صنفی لٹریچر میں غیر معمولی اضافہ ایک ماہر حکیم نے اپنے تمام عمر کے تجربات کو بغیر کسی قسم کے بخل کے کتاب پر بکھیر دیا ہے طرز بیان نہایت دلچسپ ایسا کہ جہاں وہ اطبا اور ڈاکٹروں کے لئے مفید ہیں عام لوگوں کے لئے بھی رہبر اعظم ہے شروع میں تمام نظام جنسی کی تحقیق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اسکے علاوہ علی الترتیب تمام امراض مخصوصہ ان کے اسباب علامات اور بہتر معالجات وید ک۔ طب یونانی ڈاکٹری و جنتر منتر کے ذریعہ بتائے گئے ہیں غرض کتاب کیا ہے بیش بہا جواہر کا مجموعہ ہے لکھائی چھپائی نہایت نفیس و دیدہ زیب قیمت صرف چار روپے (للعہ) محصول ۸/

شب عروسی

پڑھ لینے کے بعد شب عروسی کی سب باتیں معلوم ہو جائیں گی شادی کے وقت عموماً دوستوں کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے دوستوں کو ایسے مواقع پر کوئی بہترین تحفہ دینا چاہتے ہیں تو صرف یہ کتاب دیجئے، شب عروسی اصلی کتاب زندگی کا پہلا سبق ہے یا تکمیل نسائیت کے بام عروج کی پہلی سیڑھی ہے۔ اگر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس زینہ پر قدم رکھا جائے گا تو وہ ایسا کامیاب قدم ہوگا کہ انسان کی یہ فطری مسرت ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہے گی قیمت عہ ہے جو اسکے منافع پر سو مرتبہ صدقہ ہے محصول ۸/

برتھ کنٹرول

صحت کی شباب آفرین لذت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ تم اسکے حسن و جمال کے خزانہ کو محفوظ رکھنے کا راز سمجھ لو اولاد کی کثرت سے نصف ملک حسن کو بلوغ جمال کے خزانے کی خجالت بن [illegible] کیلئے افلاس کی پرورش سوہان روح ہوتی ہے اور انسان انعام ای ذوق و لذت سے محروم ہو جاتا ہے برتھ کنٹرول ایک حیرت انگیز طلسمی کتاب ہے جسکو پڑھنے کے بعد تمہارے سامنے زندگی کی ایک بڑی حقیقت بے نقاب ہو جائیگی اور یقین کے ساتھ اولاد کو پیدا کرنا تمہارے لئے اختیاری ہو جائیگی۔ قیمت ایک روپیہ محصول ۸/

جنسی امراض اور انکا علاج

یہ معرکۃ الآرا تالیف اپنے موضوع کے لحاظ سے اس قدر اہم ہے کہ بیسویں صدی کی عظیم الشان تصانیف میں شمار کی جاتی ہے کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں امراض مخصوصہ کا تفصیلی بیان اور ڈاکٹری علاج ہے دوسرے میں یونانی اور ویدک نسخہ جات ہیں تیسرا حصہ برتھ کنٹرول سے متعلق ہے اس میں مشہور حکیموں کے کئی ضمیمے ہیں جو بذات خود گنج قارون سے کم نہیں ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف تین روپے دستے ہیں

کیف مواصلت

دنیائے لطف و مسرت اور لذت و کیف میں انتہائی چیز ایک مرد اور جوان مرد کے لئے عورت سے مواصلت ہے اور یہی وہ کیف افزا سرور ہے جس پر دنیا کی بقا کا مدار ہے یوں تو فطرت کی اس بسیط دنیا میں ہزاروں ہستیاں ایسی ہیں جو صرف قانونی طریق پر دنیا کی آبادی میں اضافہ کرتے کرتے چل بستے ہیں لیکن یہ زندگی تو جانور بھی گذار دیتے ہیں بات تو یہ ہے کہ اس کیف پرور شعبہ حیات میں اس درجہ تمتع حاصل کیا جائے جو دوسرے ذی حیات عالم سے ممتاز ہو۔ کتاب مواصلت کے اس درجہ پر پہنچا دیتی ہے جہاں لذت ہی لذت ہے۔ قیمت عہ محصول ۸/

لذت شباب

شباب جاودانی کی جستجو ہو تو لذت شباب یعنی ایرانی کوک شاستر کا مطالعہ کیجئے جس سے آپکو معلوم ہو گا کہ شباب کو عرصہ دراز تک کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں۔ عورت کے تاثرات کیا ہیں حسن کی ملکہ سے کس طرح لطف اندوز ہونا چاہئیے۔ گلزار شباب کس طرح وقف خزاں ہوتا ہے شباب کی روٹھی ہوئی دیوی کس طرح منتی ہے عورت اگر عورت سے اور مرد اگر مرد سے اپنی خواہش پوری کرے تو کیسے خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ لذت شباب میں صرف مستان شباب کو لذت تازہ بخشنے کیلئے صدہا مجرب نسخے۔ ۱۴ فوٹو بلاک قیمت ایک روپیہ (عہ) محصول ۸/

دوشیزہ کی ڈائری

ایک دوشیزہ نازنین کے دل میں کس قسم کے پوشیدہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے کیا کرنا چاہتی ہے شادی کے بعد اسکے لئے کن باتوں کا علم ضروری ہے حسن و شباب کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے اور دوشیزگی کی پر کیف زندگی سے عیش و مسرت کی بہار کس طرح لوٹی جاتی ہے ان تمام باتوں کا جواب آپ کو دوشیزہ کی ڈائری میں ملیگا ایک مست شباب دوشیزہ کی زبان سے ان تمام پوشیدہ جذبات کی تصویر کھینچی گئی۔ فوٹو بلاک کی دو درجن حسین و جمیل تصویروں نے کتاب کی زینت میں اضافہ کر دیا ہے۔ قیمت (عہ) محصول ۸/

بہار شباب

صنفی کتابوں میں ہم اسلوب بیان کو امتیاز رہا ہے وہ جذبات کی ہیجانی ہے، چیز مطالعہ کے لئے خواہ کتنی لذیذ کیوں نہ ہو لیکن اصل فائدہ اس پروگرام کے ماتحت ہے جس کے ماتحت رہ کر انسان جوانی دیوانی کو قابو میں رکھنا چاہتا ہے، کہ یہ لذات قائم ہو جائے بہار شباب میں ایسا ہی انتظام ہے۔ جوانی کی کیف انگیزی اور اس کو دوام کرنے کے لئے بڑے بڑے عجیب طریقے قاعدے نسخے ہدایات حفظ ماتقدم کی ہزار ہا باتیں اور عورتوں کی اندرونی کیفیات کو مردوں پر آئینہ کر دیا متعدد عریاں فوٹو بھی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ (عہ) محصول ۸/

شب عروسی کے افسانے

وہ لذیذ کتاب ہے جو شب عروسی کے تمام لذائذ کو یکجا جمع کرنے میں کامیاب ہوئی ہے اس کا دوسرا نام عروس نو ہے کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ کتاب کیسی لذیذ ہوگی اور واقعہ یہ ہے کہ عروس نو ہی کی طرح ہے۔ قیمت عہ محصول ۸/


SAQI
JUNE
1935.
ایڈیٹر:- شاہد احمد بی اے (آنرز) دہلوی
SAM/.32
Price per Copy As. 6.



کتب مصنفہ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی
اردو لٹریچر کی پاکیزہ کتابیں
کولتار
ملنے کا پتہ
ساقی بکڈپو دہلی
اخوان الشیاطین
تعلیم زدہ بیوی
چار چاند
نجمہ نوری

صنفی لٹریچر جوانوں کیلئے

نفسیاتِ شباب
جرمنی کے ایک پروفیسر کی مشہور تصنیف کا ترجمہ ڈاکٹر محمد جعفر حسین صاحب نے سلیس اُردو میں کیا ہے۔ شباب پر بہترین تصنیف۔
قیمت صرف تین روپے

عورت
مجسمۂ ناز کے تمام پوشیدہ رازوں سے واقفیت حاصل کیجئے۔ جسم اور فطرت دونوں کے راز طشت از بام کرد یئے گئے ہیں۔
قیمت دو روپے

شبِ عروسی
یہ کتاب اسلئے ضروری ہے کہ اسکے پڑھ لینے کے بعد آپ تکمیل انسانیت کے بام عروج پر کامیاب قدم اٹھا سکیں گے۔
قیمت ایک روپیہ

کیفِ مواصلت
دُنیائے لذت و کیف میں انتہائی چیز ایک مرد کیلئے عورت سے مواصلت ہے۔ اسکے مطالعہ سے آپ اس حد پر پہنچ جائینگے جہاں لذت ہی لذت ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

بہارِ شباب
جوانی کی کیفیت انگیزی اور اُسے دوام کرنے کیلئے کیا صورتیں اختیار کرنی چاہئیں۔ مجرب طریقے قاعدے اور نسخے درج کئے گئے ہیں۔ قیمت عمہ

شاہی کوک شاستر
جو بادشاہوں کیلئے تھا اب وہ عام ہے۔ طاقت اور قوتِ مردمی کو قائم و دائم رکھنے کے ٹوٹکے اور نسخے۔ عام فہم تدبیریں اور ہزاروں گر بتائے گئے ہیں۔ قیمت عمہ

جنسی امراض
از کرنل بھولاناتھ کی یہ معرکۃ الآرا تالیف اپنے موضوع کے لحاظ سے اسقدر اہم ہے کہ بیسویں صدی کی عظیم الشان مطبوعات میں شمار کی جاتی ہے۔ قیمت ۲ـــہ

شبِ عروسی کے افسانے
یہ وہ لذیذ کتاب ہے جو شبِ عروسی کے جملہ لذائذ کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوئی ہے اسکا دوسرا نام عروسِ نو ہے۔ کامیاب زندگی کا مکمل لائحہ عمل۔ قیمت عہ

ایرانی کوک شاستر
شباب جاودانی کی تلاش ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ عورت کے تاثرات اور اسکے جذبات سے پورا پورا لطف کس طرح اٹھایا جائے؟ قیمت عہ

دوشیزہ کی ڈائری
شادی سے پہلے اور شادی کے بعد ایک دوشیزہ کے جذبات و تاثرات کیا ہوتے ہیں؟ پُر کیف زندگی کی بہار کس طرح لوٹی جاتی ہے؟ قیمت ۲ روپے۔

افشائے رازِ نہاں
بیشمار عورتوں کی پرائیویٹ زندگی منظرِ عام پر رکھدی گئی ہے تاکہ ان سے آپ لطف اندوز بھی ہوں اور آپکے علم میں اضافہ بھی ہو۔ قیمت عمہ

بہارِ عروس
شبِ عروسی کی سرگذشت۔ پوشیدہ باتوں کا انکشاف۔ سربستہ رازوں کو کھولدیا گیا ہے۔ ایک دُلہن کی آپ بیتی پڑھئے۔
قیمت عمہ

دُلہنوں کی کانفرنس
سات دُلہنوں کی شبہائے خلوت کی دلچسپ داستان۔ ساتوں ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اپنے واقعات شبِ عروسی کو مبہم مبہم لیکن شرمیلے الفاظ میں سُناتی ہیں۔ قیمت عہ/

دُلہن کی ڈائری
ایک شوخ و طرار دُلہن کی آپ بیتی۔ شبِ زفاف کا پُر کیف سماں۔ پوشیدہ حالات کا انکشاف۔
قیمت صرف عہ/

ہمدرد خاوند
ایک بینظیر کتاب جو فی الحقیقت خاوند کیلئے ہمدرد ہے اسمیں ازدواجی زندگی کے متعلق تمام پوشیدہ رازوں کو ظاہر کر دیا ہے۔ قیمت عمہ

قانونِ مواصلت
عیش و نشاط کا رہبر شباب کی پوری کیفیت سے لطف اندوز ہونیکا طریقے۔ مواصلت کے جملہ قوانین کیا ہیں؟ ضروری ہدایات سے واقف ہو جایئے۔ قیمت عہ/

ملنے کا پتہ: ادارہ ادبستان۔ کٹرہ بڑیاں۔ دہلی

اپنے فائل مکمل کیجئے

ساقی کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر ساقی میں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض کی تعداد بہت کم ہے اسلئے جو پرچے آپ کو درکار ہوں بلا تاخیر طلب کیجئے۔

سنہ ۱۹۳۰ء

جنوری	۲ر
فروری	۲ر
مئی	۲ر
جون	۲ر
جولائی (افسانہ نمبر)	۸ر
دسمبر	۲ر

سنہ ۱۹۳۱ء

جنوری (سالنامہ)	۱۲ر
فروری	۳ر
مارچ	۳ر
مئی	۳ر
جون	۳ر
جولائی (افسانہ نمبر)	۸ر
اگست	۳ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر

سنہ ۱۹۳۲ء

فروری	۳ر
مارچ	۳ر
مئی	۳ر
جون	۳ر
اگست	۳ر
ستمبر	۳ر
اکتوبر (دلی نمبر)	۸ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر

سنہ ۱۹۳۳ء

جنوری، فروری (سالنامہ)	عہ
مارچ	۳ر
اپریل (ظریف نمبر)	۸ر
مئی	۳ر
جون	۳ر
ستمبر (ناصر نمبر)	۸ر
اکتوبر	۳ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر

سنہ ۱۹۳۴ء

جنوری (سالنامہ)	۱۲ر
فروری	۳ر
اپریل (ظریف نمبر)	۸ر
مئی	۳ر
جون	۳ر
اگست	۳ر
ستمبر	۳ر
اکتوبر (دلی نمبر)	۸ر
نومبر	۳ر
دسمبر	۳ر

سنہ ۱۹۳۵ء

جنوری (سالنامہ)	[illegible]
فروری	۵ر
مارچ	۵ر

سنہ ۱۹۳۳ء جلد ۸ مکمل

جولائی سے دسمبر تک

جس میں "افسانہ نمبر" اور "ناصر نمبر" شامل ہیں

قیمت دو روپے (عہ)

سنہ ۱۹۳۴ء مکمل فائل

جلد ۹ اور جلد ۱۰

چار خاص نمبر بھی اسی میں شامل ہیں

قیمت چار روپے (للعہ)

تصانیف حضرت خواجہ حسن نظامی

غدر کی صبح شام	[illegible]	گرفتار شدہ خطوط	[illegible]
دہلی کی جان کنی	عہ	بہادر شاہ کا مقدمہ	[illegible]
غالب کا روزنامچہ	۱۲ر	محاصرہ دہلی کے خطوط	۴ر
غدر دہلی کے اخبار	۴ر	بیگمات کے آنسو	[illegible]

امور خانہ داری کی کتابیں

سنگھار خانہ	[illegible]	خانہ داری کے تجربات	۱۲ر
عصمتی دسترخوان	[illegible]	مفید النسواں	۸ر
عصمتی کشیدہ	عہ	بچوں کی تربیت	۱۰ر
گلدستہ کشیدہ	[illegible]	مشرقی کھانے	[illegible]
عصمتی کروشیا	[illegible]	ہنڈکلیا	۸ر
سوئی کا کام	[illegible]	بچوں کے کھانے	۴ر
ستر ستارے کا کام	[illegible]	بیماروں کے کھانے	۱۰ر
خواتین کی دستکاریاں	۴ر	مذاقیہ کھانے	۴ر
موتیوں کا کام	[illegible]	ناشتہ	۱۲ر

ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو، دہلی

تصانیف مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری دہلوی

حیات صالحہ یا صالحات۔	عمہ	موودہ	۸ر	طوفان اشک	عہ	قلب حزیں	۸ر
صبح زندگی۔	عمہ	تفسیر عصمت	۵ر	قطرات اشک	عہ	وداعِ خاتون	۵ر
شام زندگی۔	عہ	انگوٹھی کا راز	۶ر	شہید مغرب	عہ	امین کا دم واپسیں	۴ر
شب زندگی حصہ اول۔	عہ	ولایتی نخی	۶ر	نسوانی زندگی	۸ر	لڑکیوں کی انشار	۱۰ر
شب زندگی حصہ دوم	عار	منازل ترقی	۴ر	نانی عشو	۱۰ر	عروس کربلا	عمہ
نوحۂ زندگی	۱۲ر	بچے کا کرتا	۴ر	روداد قفس	۱۰ر	محبوبۂ خداوند	۱۲ر
طوفانِ حیات	عہ	ویڈیا کی سرگذشت	۴ر	گرفتار قفس	۴ر	شہنشاہ کا فیصلہ	۴ر
جوہر قدامت	عمہ	چہار عالم	۴ر	گلدستۂ عید	۸ر	منظر طرابلس	۵ر
منازل السائرہ حصہ اول	عہ	بنت الوقت	۸ر	گوہر مقصود	۴ر	دُرِ شہوار	۸ر
منازل السائرہ حصہ دوم	عہ	سراب مغرب	۸ر	آمنہ کا لال	عجہ	سودائے نقد	۵ر
تمغۂ شیطانی	۱۲ر	فسانہ سعید	مہر	سیدہ کا لال	عہ	یاسمین شام	۴ر
سات روحوں کے اعمالنامے	۸ر	سنجوگ	۴ر	امت کی مائیں	۱۲ر	تیغ کمال	عمہ
غدر کی ماری شہزادیاں	۱۲ر	جوہر عصمت	عمہ	الزہرا	۱۲ر	اندلس کی شہزادی	۸ر

ملنے کا پتہ :- ساقی بک ڈپو۔ دہلی ؁

شاعری سیکھیے

مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کی معرکۃ الآرا تصنیف شاعری کا سٹ، جس سے بیشمار شاعر اسوقت تک مستفیض ہو چکے ہیں اور برابر ہو رہے ہیں جس میں تقطیع کرنے کا آسان قاعدہ، علم عروض، علم قافیہ، محاسن و معائب، شاعری تاریخ گوئی کے قوائد، صنائع و بدائع کا بیان، اصلاح دینے کے اُصول اور ابتدائی مشق کے آسان قاعدے بالتفصیل مذکور ہیں۔ ابتک اس سے زائد آسان کتاب جسکو مبتدی پڑھکر بآسانی سمجھ سکتے ہیں شائع نہیں ہوئی۔ اگر آپ کو اُردو زبان دانی و شاعری کا شوق ہے تو پہلے اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ اور مشق کی ترکیب پر عمل کیجیے۔ ایک سال میں آپ شاعر کامل بن جائینگے۔ حال میں کچھ مفید اضافہ کرکے کتاب کا حجم اور زیادہ کیا گیا ہے۔ مکمل سٹ کی قیمت دو روپے ہے۔ نیز تمام کتب مولفہ خواجہ عشرت و دیگر مشہور مصنفین کی نادر و نایاب کتابیں عشرت بکڈپو لکھنؤ سے طلب فرمائیے۔

ملنے کا پتہ :- مینیجر عشرت بکڈپو کیننگ اسٹریٹ احاطہ خانسامہ لکھنؤ

ہردلعزیز مصنفین کی کتابیں

نگارستان

نیاز فتحپوری کے مضامین کا پہلا مجموعہ جس میں اُنکے قلم کا پورا زور نظر آتا ہے عہدِ شباب کے لکھے ہوئے مضامین۔ ادبِ لطیف کا خزانہ۔ قیمت دو روپے۔

اُردو کا پہلا ناول نگار

ڈپٹی نذیر احمد کے ادبی کارنامے ڈپٹی صاحب ہی نے اُردو زبان میں سب سے پہلے مکمل ناول لکھے ہیں۔ تحقیقی لٹریچر کی کتاب

قیمت عہ

نغماتِ موت

حجاب امتیاز علی کے غمناک مضامین کا مجموعہ ہر مضمون بیحد موثر ہے اور دُنیا کی بےثباتی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

قیمت صرف ۱۲ر

ایوانِ تصور

بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کے سینکڑوں دلکش و رنگین گیتوں کا ترجمہ ۔ از ظفر قریشی دہلوی۔ بی۔ اے۔

قیمت دو روپے

مِلنے کا پتہ

نرگسِ جمال

ترجمہ ہے مٹرلنک کے ڈرامہ "جانزل" کا۔ مارس مٹرلنک (بلجیم کا مشہور ڈرامہ نگار) ہمارے شاہد صاحب کا نہایت محبوب مصنف ہے! اور اس میں شک نہیں کہ انکا یہ ذوق نہایت مشکل پسند ذوق ہے۔

مٹرلنک کے ڈرامے عموماً چونکہ اسٹیج کیلئے نہیں ہوتے اسلئے انمیں علمی و فلسفیانہ شان زیادہ پائی جاتی ہے اور طبقہ خواص ہی کی "تسکینِ ذوق" انکا اصل مقصود ہوتا ہے میٹرلنک زیادہ تر "عشق و جمال" اور اسکے متعلقات سے گفتگو کرتا ہے، اسی لئے اُسکے یہاں جذبات کی نزاکت وسعت اور فطرتِ انسانی کی وہ لچک جسے ہم چاہیں تو روحانیت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ وہ دہشت انگیز مناظر پیش کرکے دلوں کو دہلانا پسند نہیں کرتا، وہ انسان کی خون آشامیوں کے فسانے سنا کر رُوح کے سکون کو مضطرب کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف ان لطیف و پاکیزہ تعلقات کی داستان سناتا ہے جو حُسن سے پیدا ہوتے ہیں، محبت کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں اور رُوح میں جذب ہو کر شاہراہِ انسانیت کو منور بنا جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس ادیب کا ذوقِ سخن یہ ہوگا اُسکے یہاں خیال کی نزاکت، بیان کی ندرت، طرزِ ادا کی جدت اور معنی کے لحاظ سے الفاظ کا اشکال بھی کچھ ہوگا اور ایک غیر زبان سے ان تمام خصوصیات کو اپنی زبان میں منتقل کرنا یقیناً آسان کام نہیں لیکن مسٹر شاہد احمد بی۔ اے اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں! اور اسکا سبب یہی ہے کہ وہ خود اسی ذوق کے ادیب ہیں۔ ایسی کتابوں کے ترجمہ میں بڑی دقت یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف جذبات کی سادگی یہ چاہتی ہے کہ الفاظ بھی ویسے ہی سلیس و سادہ ہوں اور دوسری طرف احساس کی بلندی جولانئ بیان میں نزاکت پیدا کر دیتی ہے، اسکی متقضی ہوتی ہے کہ الفاظ و تراکیب بھی دقیق ہوں اور ایک مترجم گھبرا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں کو کیونکر ایک جگہ جمع کر سکتا ہے۔ شاہد صاحب نے ان دونوں باتوں کے امتیاز میں کافی احتیاط سے کام لیا ہے اور اسی لئے اصل مصنف کے کلام کی رُوح ترجمہ سے مفقود نہیں ہوئی۔

(نگار)

قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

شہاب کی سرگزشت

نیاز فتحپوری کا لکھا ہوا ناول جو اسقدر مشہور ہو چکا ہے کہ اسکے مزید تعارف کی ضرورت نہیں۔ اپنے طرز کی خاص چیز

قیمت ایک روپیہ (عہ)

سیرت محمد علی

ہندوستان کے مشہور رہبر و مولانا محمد علی کے واقعاتِ زندگی مکمل سوانحیات اور بہترین بھی۔

قیمت تین روپے

دیوان شمس تبریز

مولوی عبدالمالک آروی نے یہ کتاب بڑی کاوش و تحقیق سے مرتب کی ہے! اسکا دیباچہ نہایت قابلِ قدر ہے۔

قیمت دو روپے

خطوط کی ستم ظریفی

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تازہ ترین تصنیف جسے پڑھکر ہنستے ہنستے آپکے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔

قیمت صرف ۱۲ر

ساقی بک ڈپو۔ دہلی

جرعات

چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
مع محصول ڈاک

چندہ ششماہی دو روپے بارہ آنے
مع محصول ڈاک

جلد ۱۱ — ساقی دہلی. بابت ماہ جون ۱۹۳۵ء — نمبر ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

گذشتہ مہینے آغا حشر کاشمیری کے انتقال کی وحشتناک خبر سنی گئی۔ افسوس جس شخص نے اُردو ڈرامہ کو قعرِ پستی سے نکال کر بامِ عروج پر پہونچایا وہ اب ہم میں نہیں رہا۔ ابھی منشی نور الٰہی کی موت کا صدمہ تازہ ہی تھا کہ حشر کا مرنا ہم پر اور بھی قیامت ڈھا گیا۔ اُردو لٹریچر کے ایسے مربی کہاں سے آئیں گے۔ آغا حشر نے ساری عمر اُردو ڈرامے کی مشاطگی کی اور اُسے نک سے سُک بنایا مگر اسکی بہار دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے۔ اسے اُردو کی انتہائی بدنصیبی سمجھیے کہ اسکے سرپرست اُٹھتے جارہے ہیں۔ اُردو کے لئے حشر کا مرنا ——— عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے۔ حشر جیسے جوہرِ قابل صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی جدائی پر جس قدر بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ ع۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

کچھ عرصے سے دہلی کے زنانہ رسالہ "رہبرِ نسواں" کے متعلق بُری بُری خبریں سننے میں آرہی ہیں۔ ساقی کو بُری باتوں سے ہمیشہ اجتناب رہا ہے اور اسی لئے ایسی باتوں پر توجہ نہیں دی جاتی۔ ساقی کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ "ساقی دہلی کا نمائندہ ہے" حالانکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ "ساقی اُردو لٹریچر کا ادنیٰ خادم ہے"۔ مجھ سے اصرار کیا جارہا ہے کہ دلی کے اس زنانہ رسالہ کے متعلق اظہارِ خیال کروں اور یہ پاداش ہے اسکی کہ "ساقی دہلی کا نمائندہ ہے"! مجھے افسوس ہے کہ میں ایسے پرچوں کے منہ لگنا نہیں چاہتا جن کے کارکن غیر ذمہ دار حضرات ہوں اور جو خواہ مخواہ ایک ایک سے اُلجھنے کے آرزومند ہوں کہ اس طرح تشہیر کا اچھا موقع نکل آتا ہے۔ مختصراً صرف اتنا عرض کرونگا کہ مشہور رسالہ عصمت کے ایک کاتب نے اُس کے سے چُرا کر یہ نیا پرچہ جاری کیا ہے اور اس طرح گویا حقِ نمک ادا کیا ہے۔ جن حضرات کو مفصّل واقعات معلوم کرنے ہوں رسالہ شاہجہاں دہلی بابت ۵ امئی کی ایک کاپی طلب کرلیں۔

ساقی کی خوش نصیبی ہے کہ اُس کے لکھنے والوں میں مستند اہلِ قلم کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ مولوی عنایت اللہ صاحب جیسے کہنہ مشق مترجم کی مستقل قلمی اعانت صرف ساقی ہی کو حاصل ہے۔ موصوف دار الترجمہ حیدرآباد دکن کی ذمہ داریوں سے سُبکدوش ہوچکے ہیں اور اب جو کچھ لکھتے ہیں نذرِ ساقی کردیتے ہیں۔ گذشتہ اشاعت میں آپ کا ایک بے مثل ترجمہ "مکافات" شائع ہوا تھا جس کی تعریف میں بے شمار خطوط آچکے ہیں۔ زیرِ نظر اشاعت میں آپ کا قابلِ قدر تاریخی مضمون "شہاب الدین ابنِ ماجد" شریک ہے۔ یہ مضمون بجد تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہے۔

ساقی کا آئندہ پرچہ "افسانہ نمبر" ہوگا جس میں اُردو کے بہترین افسانہ نگار حضرات کے افسانوں کے علاوہ انگریزی۔ فرانسیسی۔ روسی۔ جرمنی۔ اطالوی جاپانی وغیرہ کے شاہکار افسانوں کے تراجم بھی شامل ہونگے۔ چند افسانوی نظمیں بھی شامل کی جائیں گی۔ اُمید ہے کہ یہ خاص نمبر بہت کامیاب ہوگا۔

"شاہد"

درِ دولت کی چہل پہل

اللہ رکھے ہمارے شہر لکھنؤ پایۂ تخت اودھ میں اِس گئے گذرے حال پر بھی گنتی بے شمار پوتروں کے شہزادے موجود ہیں جو معقول وثیقہ پاتے ہیں اور عزت و وقار سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ شاہی شان سے آٹھویں دن دربار ہوتا ہے۔ ان کی محفل میں ہر کس وناکس ایرا غیرا نتھو خیرا بار نہیں پاتا۔ اسی طرح نستعلیق شہزادیاں ہیں جنہوں نے بادشاہ کی اور وزیروں کی گودیوں میں پرورش پائی ہے اور آنکھ کھول کر شاہی محلات کی چہل پہل دیکھی۔ اُن میں سے ایک شہزادی نواب جہاں آرا بیگم ہیں ——— ماں کا نام اشرف جہاں بیگم۔ باپ شہزادہ مرزا رفیع الشان نقی علی خاں۔ دادا نواب نصیر الدولہ مرزا محمد علی خاں بادشاہ سلطنت اودھ۔ جہاں آرا بیگم مرزا محمد علی خاں شاہ بادشاہ کے آخری زمانے میں پیدا ہوئیں اور شہزادیوں کی طرح پرورش پائی۔ انا چھوچھو کھلائی سب کچھ موجود۔ جہاں آرا بیگم مرزا امجد علی شاہ بادشاہ کے آخری زمانے میں پیدا ہوئیں۔ مرزا واجد علیشاہ آخری شاہ اودھ کے معزول ہونے کے وقت اُن کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ خود کہتی ہیں کہ واجد علی شاہ مجھے جان و دل سے چاہتے تھے اور میری شوخیوں کو دیکھکر میرا نام بجلی رکھا تھا۔ اکثر مجھے اپنے خاصے پر یاد فرماتے تھے۔ آج ماشاء اللہ ان کی عمر شریف اٹھانوے برس کی ہے۔ پڑھی لکھی ہیں۔ بینائی بھی اچھی ہے۔ وظیفہ وظائف کی پابند ہیں۔ قویٰ بھی اچھے ہیں۔ اور دماغ بھی صحیح ہے۔ شاہی حال جو اُن سے پوچھا تو ایک آہ سرد بھر کر کہنے لگیں۔ ہم جو کچھ بیان کریں گے تمہیں اس کا یقین آنا مشکل ہے اور جنہوں نے شاہی زمانہ نہیں دیکھا ہے وہ اُسے جھوٹی کہانی بتائیں گے کیونکہ یہ باتیں تک ایک محل میں محفوظ رہیں اور ہم نے تو کیا دیکھا ہے۔ مگر ہاں ہماری پھوپی نے جو کچھ شاہی زمانہ دیکھا تھا اور جو کچھ وہ بیان کرتی تھیں وہ ہم بھی سُنکر ہکا بکا رہ جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ سب داستان ہے۔ جو ہماری پھوپی تھیں وہی ہماری ساس بھی تھیں کیونکہ ہم کسی غیر خاندان میں نہیں بیاہے گئے تھے۔

ہماری شادی پھوپی حاجی بیگم یعنی نواب زیب النساء بیگم زوجہ نواب اقتدار الدولہ محتشم الملک نواب مہدی خاں ضیغم جنگ عرف نواب دولہا صاحب کے فرزند دلبند نواب ذکاء الدولہ عرف آغا مرزا سے ہوئی تھی۔ دُنیا بھر کا عیش دیکھا۔ پلپل آرام پایا۔ پان والی گلی میں عالیشان محل تھا۔ کیونکہ بادشاہ محمد علی شاہ کی بیٹی تھیں اُن کے جاہ و حشم کا پوچھنا کیا۔ دولت کا دریا سُسرال میں بہتا تھا۔ گنگا جمنی چھپر کھٹ میں آرام کرتی تھیں۔ ہزاروں لونڈیاں ہزاروں نوکر چاکر سربفلک عمارت۔ مگر ہائے افسوس کہ ابھی دس برس شادی کو ہوئے تھے کہ نازوں کے پلے نواب ذکاء الدولہ نے مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر انتقال فرمایا۔ نہ کسی حکیم کی چلی نہ ڈاکٹر کی۔ محل میں کہرام مچا ہوا تھا۔ علاج میں لاکھوں روپیہ پھونک دیا مگر قضا سے کسی کا زور نہیں چلتا۔ رہے نام اللہ کا۔ جب میرے سر کا تاج نہ رہا تو دل ٹوٹ گیا آس جاتی رہی۔ مگر پھوپی حاجی بیگم نے کہا "بٹیا یہ نہ سمجھنا کہ میں تم کو زندگی میں اپنی آنکھوں سے جُدا کروں گی۔ آغا مرزا آج نہیں رہا تو تم میری آغا مرزا ہو، تمہیں کو دیکھکر زندہ رہوں گی۔ تمہارے سوا میرا کون ہے۔ میرے تو حواس نہیں رہے اور کمر ٹوٹ گئی۔ دل میں داغ پڑ گئے۔ اب تمہیں اس ناؤ کی ملاح ہو جس طرح ہو تمہیں سب انتظام کرو۔ اور کیا تم غیر ہو، میرے بھائی کے کلیجے کا ٹکڑا ہو۔ پہلے بہو تھیں اب تو بیٹا ہو" وہ مر گئیں ہیں اور مجھکو مرنا ہے۔ اس قدر آرام دیا کہ میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی۔ اپنا دل بہلانے کو اپنے بھائیوں کو بھی اپنے پاس بُلا لیا۔ اکثر اُن کے چشم دید واقعات یاد رہ گئے ہیں اور کچھ میں نے نوٹ کر لئے ہیں۔ آخر مجھ کمبخت کی شامت اعمال سے غدر کے بعد نہ ساس رہیں نہ ماں باپ اپنی قسمت کا رونا کس سے روئیں کہ کیا صعوبتیں اٹھائیں اور کیا کیا ہم پر ظلم

ہوئے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ باآبرو باعزت آن بان سے رکھا۔ لیکن دولت کے دشمن بہت ہوتے ہیں۔ جس محلہ میں کم نصیب قیام کرتی ہوں ہزاروں چور اُچکے بدمعاش لٹیرے گھر کا اسباب بھانپتے ہیں پھر وہاں سے اٹھ جانا پڑتا ہے۔ خدا نے کسی کا محتاج نہیں رکھا۔ خود سو روپے ماہوار گورنمنٹ انگلش سے آج تک ملتا ہے۔ بہرحال آپ پوچھتے ہیں تو جو کچھ ان ہی ساس حاجی بیگم سے سُنا ہے بیان کر دوں گی میں زندہ تاریخ ہوں۔

جانِ عالم حضرت محمد امجد علی شاہ اودھ کے تخت نشیں ہوئے تو چھٹیا وقت تھا محل خانہ در دولت میں حضرت امجد علی شاہ کا ماتم ہو رہا تھا۔ جانِ عالم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے دنیا سیاہ ہو رہی تھی چار گھڑی رات آچکی تھی کہ بڑے صاحب نے چھوٹے صاحب کے بدلے ایک افسر کو بھیجا اور کہا اِس وقت چھوٹے صاحب نہیں ہیں اس سبب سے نہ آسکے حضور صاحب کے ساتھ میں خدم و حشم و بندگان عالی شان کوٹھی فرح بخش میں تشریف لاکر فوراً جلوس فرمایئے۔ جانِ عالم نے بہت عذر کیا مگر صاحب نے یہی کہا کہ اس وقت تشریف لانا انسب ہے۔ اسی حالت میں بوچہ پر در دولت سے سوار ہو کر فرح بخش کوٹھی میں رونق افروز ہوئے۔ امیرالدولہ میر مہدی علی خاں نے دست بستہ گذارش کی ایک مسافر منزلِ ہستی سے عازمِ سفر ہے کچھ زادِ راہ کی ضرورت ہے حضور نے سات لاکھ واسطے تعمیر املاک اور تین لاکھ واسطے اخراجات کے عطا کیا۔ اِس کثیر رقم سے امجد علی شاہ کا مقبرہ عالی شان تعمیر ہوا۔ اسی وقت بادشاہ نے بعد فراغت دو رکعت نماز شکرانہ تخت سلطنت پر جلوس فرمایا۔ سلطان العلما مولوی سید محمد مجتہد نے نام شان زیب کو کہا۔ اراکین سلطنت نے نذریں پیش کیں۔ سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ ناچ رنگ ہونے لگا۔ کئی لاکھ طبلہ پر تھاپ پڑنے لگی۔ شہنائیاں اونچی سُر میں بجنے لگیں۔ تانیں اُڑنے لگیں۔ نور کے سانچے میں گلے ڈھلے تھے جسین جسین طوائفیں اپنا اپنا کمال دکھانے لگیں۔ دوپٹے پر چھپڑیاں کامدانی کے لچکے تیلیاں اطلس کی لوٹ نور کی گاتیاں لگائے ہوئے سینے اُبھرے ہوئے گتیں بھر رہی تھیں غضب کی کمر میں لچک تھی۔ دوپٹے کا آنچل جو منہ پر ڈالا تو آفتاب جہانتاب بدلی میں نظر آیا۔ سر سے دوشالہ ناچتے میں ہٹا کانوں کی بجلیاں تڑپنے لگیں بھاؤ بتا کے پھر سارنگی کا پردہ ساز سے نکلتا جہاں مانگ توڑی سستم کر دیا۔ گھنگرو یہ صدا دیتے تھے کہ آٹھوں پہر ناچ موقوف نہ ہو۔ ایک سے ایک بڑھ کے توڑا لیا اور انعام کے توڑے ملے۔ کوئی سروقد پیشواز پہنے ہوئے جس کی ہوا سے ہو چمن صدقہ تھی پرگاس پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ ٹپے کی تان جواہر کے ٹکڑے تھے۔ ٹھمری گانے کا عجب انداز تھا۔ غزل کا قافیہ تنگ تھا۔ پربین کا نوبت کندھوں پر بین رکھے تھے انہیں گانے کی چیزوں میں کمال تھا۔ غزل، ٹپہ، ٹھمری، ترانہ، خیال کو نئے انداز سے ادا کرتے تھے، آواز میں سمندر کا پاٹ تھا۔ ساز میں تار تھے یا دریا کی موجیں تھیں چینی، جلترنگ بجاتے تھے فرنگی ارگن کا رنگ جاتے تھے۔ بیلا لاجواب بجتا تھا۔ سلامی کی پلٹنیں پرا جمائی کھڑی تھیں۔ ایک طرف سیر چراغاں تھی۔ لوہے کے پل پر سنگ مرمر کا گھاٹ عجب رنگ دکھاتا تھا۔ کٹہروں پر گلاس چڑھائے گئے تھے۔ چاندنی دھوپ کی طرح نکلی تھی کناروں پر روشنی کے ٹھاٹر لگے تھے۔ کہیں بارہ دری تھی کہیں گنبد تھے برجوں پر تامی کی جھنڈیاں تھیں۔ روند پھر رہی تھی۔ تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ آپس میں احباب سرگرمیاں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ دیوالی کی رت ہے کوئی کہتا تھا کہ سلطان عالم کی ذات کی روشنی ہے چراغوں کا عکس دریا میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پانی میں آگ لگا دی ہے مچھلی کے بجرے مچھلی کے جہاز جو کسی نے نہ دیکھے تھے۔ دوشالوں کے بادبان چھوٹے ہوئے تھے کسی پہ نوبت کسی پر نشان رکھا تھا۔ مچھلی کے بجرے بڑوں کا ترم بج رہا تھا مانجھی ڈانڈوں سے جلترنگ بجاتے تھے کوٹھی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ کنول، جھاڑ، آئینے، ہانڈیاں قرینے سے لگائے گئے تھے۔ یہ جشن مہینوں رہا۔ دربار میں روز عید تھی۔ تمامی اہلِ دربار کو خلعت ملے معافی کے فرمان جاری ہوئے۔ شہر میں ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ سلطان عالم بادشاہ ہوئے۔ دوسرے اجلاس میں گرانقدر خلعت اور خطابات مصاحبوں کو

دیے گئے۔ تنخواہوں میں اضافہ ہوا۔

کسی رئیس کے ہاں ایک فقیر نے آواز دی "مائی بہت بھوکے ہیں کچھ کھانے کو دو۔" گھر کی ماما لال پیلی ہو کر بولی "موئے اپنی ہڈیاں چبا، بھوکا ہے اپنی بوٹیاں نوچ کر کھا جا۔ آج سے کسی شریف آدمی کے گھر پر بھیک مانگنے نہ جانا۔ نہیں تو مارے جوتیوں کے بھیجا پلپلا کر دیا جائیگا۔

نواب ولایتے صاحب کہنے لگے "ہم نے مظفر پور کے خاص لیچو منگائے تھے کہ اتنے اتنے بڑے تھے تخمیناً بیل کے برابر۔" نواب جاقی بولے۔ "ذرا اپنے ہاتھ کو تو ملاحظہ کر لیجیے۔" کہنے لگے۔ "تو یہ اتنے بلکہ اتنے۔" یعنی نارنگی کے برابر بتائے۔ نواب جاقی نے کہا "ایک مرتبہ اور اپنے ہاتھ پر نظرِ ثانی کیجیے۔" کہنے لگے "آپ کا شکریہ، نہیں اتنے بڑے۔" یعنی کبوتر کے انڈے کے برابر۔ وہ بولے "اتنے تو ہوتے ہی ہیں، آپ نے تعریف ناحق کی۔"

آغا میر کی ایک ہی لڑکی تھی لولی، مال و دولت خدا نے بہت کچھ دیا تھا۔ شمس آباد میں ان کا میکہ تھا۔ لکھنؤ میں تشریف لائیں تو کہنے لگیں "ہمارے شمس آباد میں اتنے اتنے بڑے کوے ہوتے ہیں۔" بغل سے پیش خدمت نے ہاتھ نکال کر کوے کی جسامت بتائی۔ "ہمارے شمس آباد میں اتنے اتنے بڑے تربوز ہوتے ہیں۔" بغل کے پیش خدمت نے ہاتھ پھیلا تربوز کی مقدار بتائی۔

ایک زمانے میں نواب صاحب رامپور کو مرغ بازی کا شوق ہوا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے نامی مرغ باز ڈھونڈ کر بلوائے۔ لکھنؤ سے بھی ایک افیونی وثیقہ دار نواب پچاس روپے ماہوار کے نوکر ہو کر رامپور گئے۔ دل میں سوچے کہ نوکری ناحق کی۔ کاش اپنے لکھنؤ میں رہتے یار دوستوں سے ملتے ہر وقت جلسے رہتے۔ ہم بھی کس غیر مہذب شہر میں آ پھنسے کوئی آدمی ایسا نہیں جہاں دل بہلائیں۔ سب گنوار کے لٹھ، بدتمیز، جاہل۔ یہ سوچکر خاموش ہو رہے۔ ایکدن نواب کے دربار میں مرغوں کا ذکر چلا۔ کسی نے کہا تابدار مرغ بڑا بہادر ہوتا ہے۔ کسی نے کہا اصیل تو شاہجہانپور سے بڑھکر کہیں نہیں ملتا۔ سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ آپ نے کہا حضور جاوا سے بڑھکر دنیا کے پردے پر مرغ نہیں ہوتا۔ زمین سے گز بھر اونچا ہاتھ بلند کر کے کہا بس حضور اتنا بڑا ہوتا ہے۔ نواب نے کہا تم نے دیکھے ہیں؟ کہنے لگے جی ہاں۔ نواب نے پوچھا تم جاوے جا سکتے ہو؟ کہنے لگے جی ہاں۔ نواب نے ایکہزار روپیہ مرحمت کیا۔ یہ سفر کی تیاری کر کے چل کھڑے ہوئے۔ اور دو مہینے لکھنؤ میں آرام سے رہے اسکے بعد نخاس سے جاوے کے چار مرغ لیکر پنجرے میں بند کر کے رامپور تشریف لائے۔ نواب صاحب نے پوچھا مرغ لائے۔ کہنے لگے حضور کے اقبال سے اچھے مرغ مل گئے کل حضور کے سامنے پیش کروں گا۔ دوسرے دن مرغوں کو بڑے بڑے پنجروں میں لے گئے اور نواب کے سامنے کپڑا اٹھا کر دکھایا۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ نواب منے صاحب تم نے کہا تھا اتنے اتنے بڑے مرغ ہوتے ہیں۔ تمہارے بیان سے تو ایک گز سے کم نہ ہونا چاہیے۔ کہنے لگے قربان جاؤں شاید غلام نیچے ہاتھ رکھکر بتانا بھول گیا ہوگا ورنہ مرغ تو اس سے بڑا کہیں نہیں ہوتا۔ یہ غلام کی خطا ہے کہ نیچے ہاتھ رکھکر نہیں بتایا۔ نواب خاموش ہو رہے اور کچھ دن کے بعد نواب منے کو رخصت کر دیا۔ یہ پھر لکھنؤ میں آرام سے رہنے لگے۔

نواب آصف الدولہ کے باورچی خانے میں ایک رکابدار تھا جو فقط چار گلگلے تل کر خاصہ پر لگاتا تھا۔ اور پانچ سیر گھی ان کے واسطے لیتا۔

سب خاصہ برداروں نے شکایت کی کہ حضور کارکابدار نہایت چور ہے۔ چار گلگلوں میں پانچ سیر گھی روزانہ لیکر خرچ کرتا ہے۔ آپ نے کہا اچھا ہم تحقیق کرینگے۔ ایکدن حضور باورچیخانہ دیکھنے تشریف لائے تو رکابدار سے پوچھا تم کتنا گھی لیتے ہو۔ اس نے ہاتھ باندھکر عرض کی پانچ سیر گھی ملتا ہے۔ کہا آج ہمارے سامنے گلگلے تل کر دکھاؤ اس نے سوا سیر گھی لیکر ایک گلگلہ تلا اور گلگلہ نکال کر جلا ہوا گھی نالی میں بہا دیا۔ اسی طرح ہر گلگلے کے ساتھ سوا سیر گھی جلا ہوا پھینکدیتا تھا اور کہتا تھا کہ اگر یہ گھی نہ بہا دیا جائے تو گلگلے میں چراہند آ جائے اور سرکار کے کھانے کے قابل نہ ہو۔

ایک لڑکی دوسری لڑکی کے سینے پر ہاتھ رکھتی ہے اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھتی ہے اور کہتی جاتی ہے۔ اٹکن بٹکن دہی چٹاخن۔ اگلا جھولے بگلا جھولے ساون ماس کریلا پھولے۔ پھول پھول کی مالی۔ راجہ گئے دلی۔ لائے سات کٹوری۔ ایک کٹوری ٹوٹی۔ نیولے کی ٹانگ ٹوٹی۔ کھنڈا لیہو کہ چہری۔ دوسری بولی کھنڈا۔ اس نے ماتھا انگلی سے بجا کر کہا۔ کھنڈا تمہاری ماں کا پیٹ ٹھنڈا۔

چاندنی رات میں نواب آصف الدولہ اپنے محل میں رات کو آرام خاص فرماتے ہیں کہ گیدڑوں نے چیخنا شروع کیا۔ حضور کی آنکھ کھل گئی صبح کو مصاحبین دربار سے کہا کہ رات کو گیدڑوں نے بہت غل مچایا۔ آنکھ لگنا دشوار ہو گئی۔ مصاحبین نے ہاتھ باندھکر عرض کیا خداوند سردی کا زمانہ ہے گیدڑ حضور سے سردی کی فریاد کرتے ہیں۔ فرمایا اچھا ہمارے توشہ خانے سے دو ہزار دوشالے ان کو تقسیم کئے جائیں کہ سردی سے محفوظ رہیں۔ دوسری رات پھر غل مچانا شروع کیا۔ آپ نے رفقا سے کہا رات کو پھر گیدڑوں نے شور کیا اس کا کیا سبب ہے۔ رفقا نے بیان کیا وہ اس خوشی کے سبب سے رات کو دعائے دولت دیتے ہے کہ خدا ہمارے نواب کو برقرار رکھے ہم بے زبانوں کو سردی سے بچا لیا۔

ایک شریف آدمی بہت سعی و سفارش سے نواب آصف الدولہ کے دربار تک قسمت سے پہونچ گئے۔ ایک روز ایک ڈبیا چاندی کی لائے حضور کے سامنے کھولی اور اس میں سے ایک جوں روئی کے پہل سے نکال کر نواب صاحب کو دکھائی اور کہا حضور اتنی بڑی جوں کہیں نہ دیکھی ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ اتنی بڑی جوں تو کبھی نہیں دیکھی۔ کہا حضور میں اسکو سال بھر سے دو بکروں کا روز خون پلاتا ہوں۔ اب میری وقات اتنی نہیں رہی کہ اس کی پرورش کر سکوں۔ فرمایا اچھا ہماری طرف سے دو بکرے روز ملا کریں گے۔ وہ دعاء دولت دیکر رخصت ہو گئے۔ اس دن سے آٹھویں روز برابر حاضر خدمت ہوتے تھے اور جوں کو دکھا کر کہتے تھے دیکھی حضور آپ کے اقبال سے اب کیسی فربہ ہو رہی ہے۔ جب ایک جوں مرجاتی دوسری جوں کہیں سے لے آتے۔ اور دو بکرے روز کی قیمت ماہوار لیکر مزے اڑاتے رہے۔

عشرت لکھنوی

خمکدۂ جوش

پینے سے نہیں کچھ بجز کام اے ساقی!
گردوں سے بلند ہے پیام اے ساقی!
میں شاعر و دانا ہوں پلا جلد وہ شے
نادانوں کے لئے ہے جو حرام اے ساقی!

⁂

اب روحِ مفرح والی ہی شراب اے ساقی!
یعنی یہ پئے جگر میں شتاب اے ساقی!
دے جب تک کہ ہے دم میں دم دمادم مے دے
ہے عمرِ رواں پا بہ رکاب اے ساقی!

⁂

ہستی کو نصیب کس طرح فراغ اے ساقی!
آندھی کی ہے زد پہ جب چراغ اے ساقی!
دے بادۂ دلکشا کہ اک مدت سے
انسان کا علیل ہے دماغ اے ساقی!

⁂

بے وجہ نہیں دل کا دھڑکنا اے ساقی!
کانٹوں کا سا سینے میں کھٹکنا اے ساقی!
دے بادۂ جاں بخش کہ میں دیکھ سکوں
ہونٹوں سے امرت کا ٹپکنا اے ساقی!

جوش ملیح آبادی

جوانی

ہیں کتنے جوانی کے یہ دلچسپ نظارے
پیغامِ جنوں دیتے ہیں ہنستے ہوئے تارے

بیٹھا ہوں لئے سینے میں جذبات کا محشر
ہر صبح نظر آتا ہے فردوس کا منظر

انجام سے غافل ہوں میں انجام سے غافل

سنتا ہوں میں تاروں سے محبت کے فسانے
کس طرح ہیں پُرکیف جوانی کے ترانے

گویا کہ ہیں مسحور یہ دریا کے کنارے
ہیں چاند کے کس درجہ دل آویز اشارے

اب مجھ کو خبر کچھ نہیں آلامِ جہاں کی

اِک سکر سا برساتی ہیں گھنگھور گھٹائیں
معمور نظر آتی ہیں نزہت سے فضائیں

کہتا ہے ہر اک ذرہ محبت کی کہانی
ہر چیز میں نغمہ ہے ہر اک شے پہ جوانی

اِک خواب سی ہے شورشِ ہنگامۂ ہستی

ندی کی روانی میں ہے اک کیف پُر افشاں
ہر چیز سے ہے رنگ جوانی کا نمایاں

جو نقش نظر آتا ہے ہوتا ہے گہربار
جو منظرِ ہستی ہے جوانی سے ہے سرشار

اللہ رے جوانی کا یہ رنگِ طرب انگیز

شوق نگینوی

شہاب الدین ابن ماجد

رسالہ تاریخ جسکو میرے محترم دوست حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب حیدرآباد دکن سے شائع کرتے ہیں، اس رسالہ کی جلد دوم حصہ پنجم و ششم و ہفتم میں، اپنے ایک مضمون میں جس کی سُرخی "سواحلِ ہند پر پرتگیزوں کا اقتدار" ہے، اس کے صفحہ ۲ پر یہ عبارت لکھتے ہیں:.....

"...۱۴۹۷ء میں پرتگال کے بندرگاہ لزبن (لشبونہ) سے واسکوڈی گاما کی (بحری) مہم روانہ ہوئی۔ یہ مہم راس الرجا (کیپ آف گڈ ہوپ) سے گذر کر جزیرہ زنقاریق (غالباً موزمبیک) سے مروہ ... میں آئی یہاں واسکوڈی گاما کو ایک مسلمان جہازران مل گیا اور اسکی رہنمائی میں ڈی گاما کے جہازوں نے ہندتک آکر ساحل ملیبار پر لنگر ڈالا۔ اس تاریخ سے اہلِ یورپ کو ہندوستان کا رستہ معلوم ہوگیا۔"

اس فقرے کو پڑھکر لانحالہ شوق ہوا کہ وہ مسلمان جہازران کون تھا جس نے یورپ والوں کو ہند کا راستہ بتایا اور یورپ کے علم و تمدن کی روشنی ہم تک پہونچائی۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک عرب مسلمان صوبہ عمان کے مقام جلفار کا رہنے والا شہاب الدین احمد ابن ماجد تھا۔ اس کے ذاتی حالات اور اسکی تصانیف پر ایک مضمون انگریزی میں لکھا ہوا ہم کو ملا جس کا ترجمہ ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

بعض جگہ ترجمہ صاف نہیں ہے کیونکہ مترجم کو علم بحر اور علم کواکب سے مطلق واقفیت نہیں ہے۔ مگر پھر بھی مضمون کے وہ حصے جن سے ابنِ ماجد عرب معلم کے حالات آسانی سے عام ناظرین کی سمجھ میں آسکتے ہیں کسی قدر صاف ترجمہ ہو گئے ہیں۔ اور ابنِ ماجد پر فاتحہ پڑھنے کے بعد یہی کہنا پڑتا ہے کہ "گئے ... اور وہ قسمت" جو اسلام کو ہند میں لانے والے تھے، وہی یورپ کی تہذیب اور علم کو بھی ہند میں شائع کرنے کا ذریعہ ہو گئے۔

محمد عنایت اللہ

شہاب الدین ابنِ ماجد، پندرھویں صدی عیسوی کا ایک جہازران تھا اور مصنف تھا ایک مجموعہ ہدایات کا جو بحرِ ہند، بحرِ قلزم، خلیج فارس اور مغربی چین کے سمندروں میں بادبانی جہازوں کے چلانے کے متعلق اُسنے تحریر کیے تھے۔

جب واسکوڈی گاما پرتگیزی[1]، افریقہ کے جنوبی ساحل مقام مالندی پر اپنا بیڑا جہازوں کا لایا تو اُسنے وہاں ایک معلم مقرر کیا جسنے اسکو براہ راست ہند کے مغربی ساحل پر مقام کالی کٹ پہونچا دیا۔

---

[1] واسکوڈی گاما، یہ پہلا جہازران تھا جسنے مشرقی ہند کا بحری سفر راس گڈ ہوپ (راس الرجاء) کی راہ سے کیا۔ ۱۴۶۹ء میں پرتگال کے شہر ... میں پیدا ہوا۔ خاندان کا شریف تھا۔ مشرقی ہند (ایسٹ انڈیز) کی طرف اس کا بحری سفر بادشاہ پرتگال جان دوم اور اسکے جانشین عمانویل کے دورِ حکومت میں تجویز ہوا تھا۔ ان بادشاہوں نے چار جہاز اس کام کے لئے تیار کرائے اور گاما کو اُن کا کمانڈر مقرر کیا۔ گاما ان جہازوں کو ۸ جولائی ۱۴۹۷ء میں لشبونہ سے ہند کی تلاش میں لے چلا۔ افریقہ کو مغربی ساحل سے گذر کر اس کے جنوب میں راس امید پر آیا۔ اور یہاں سے موزمبیک ... ہوتا ہوا مقام مالندی میں آیا اور مالندی سے سیدھا کالی کٹ ہند کے مغربی ساحل پر پہونچ گیا۔ ۱۴۹۹ء میں وہ پھر لشبونہ واقع ملک پرتگال میں واپس آیا۔ اس کامیابی کے صلہ میں بادشاہ پرتگال نے اسکو امیر البحر ہند کا خطاب دیا۔ ۱۵۰۲ء میں گاما پھر ایک زبردست بیڑا لیکر مغربی ہند کے ساحل پر گیا۔ راستے میں اُس نے جہازوں کی حفاظت کا سامان موزمبیک اور سوفالا کے مقامات پر کیا۔ اس اثنا میں کالی کٹ کے لوگوں نے چند پرتگیزوں کو قتل کر دیا۔ گاما نے کالی کٹ کے باشندوں کو اس قصور میں نہایت سنگین سزائیں دیں۔ اور ہند میں سب سے پہلی فیکٹری

اس واقعہ کو بہت مختصر طور پر ایک پرتگیزی ملاح نے، جو واسکوڈے گاما کے ساتھ تھا، تحریر کیا تھا۔ مگر زیادہ تفصیل سے سولہویں صدی عیسوی کے پرتگیزی مورخوں نے اپنی تصانیف میں بیان کیا ہے۔ ایک پرتگیزی مورخ نے اس معلم کا نام جس نے گاما کی رہبری کالی کٹ تک کی تھی مالیمو کاناکا لکھا ہے۔ دوسرے مورخ نے صرف مالیمو کانا لکھا ہے۔ مگر اسکی مراد مالیمو کاناکا سے ہے۔ ان الفاظ کے معنی علم کواکب کے ذریعے جہازرانی کے اُستاد یا سکھانے والے کے ہیں۔

اس پرتگیزی ملاح یا پرتگیزی مورخوں نے جو واقعات لکھے ہیں انکی تصدیق ایک عربی کتاب سے بھی ہوتی ہے جس کا نام البرق الیمانی فی فتح العثمانی ہے۔ اور مصنف اس کتاب کا قطب الدین نہروالی ہے۔ لیکن اس عرب مصنف نے جو نام اس معلم کا لکھا ہے وہ قطب الدین احمد ابن ماجد ہے۔ اس عربی کتاب میں بیان ہوا ہے کہ:

"بہت سی ناکام کوششوں کے بعد آخر کار ایک بیڑا پرتگیزی جہازوں کا بحر ہند میں آیا۔ اور ہند کے مغربی ساحل پر پہونچنے سے پہلے یہ بیڑا افریقہ کے مشرقی ساحل پر تھا۔ چونکہ آگے جانے کی راہ معلوم نہ تھی اس لئے پرتگیزوں کو فکر ہوئی کہ ہند کے مغربی ساحل سے جو سمندر ملا ہوا ہے اس کے حالات کسی طرح دریافت ہوجائیں تو آگے بڑھیں۔ اس اثنا میں ایک بادبانی جہاز چلانے والا جس کا نام احمد ابن ماجد تھا انکے پاس آیا۔ اور اس نے راہ بتانے کا وعدہ کیا۔ اب افرنجیوں (یعنی پرتگیزوں) کے سردار نے جسکو المیرانڈی کہتے تھے۔ (پرتگیزی لفظ المیرانتی ہے اور یہی لفظ انگریزی میں ایڈمیرل بولا جاتا ہے) اور ابن ماجد سے خوب دوستی ہوگئی۔ غرض اس المیرانڈی کی صحبت میں بیٹھکر ابن ماجد اتنی شراب پی لیتا تھا کہ اس کو نشہ ہوجاتا تھا اور حواس درست نہ رہتے تھے۔ چنانچہ اسی بدحواسی کی حالت میں احمد ابن ماجد نے اس افرنجی المیرانڈی کو ساحل ہند کا راستہ بتادیا اور اس نے پرتگیزوں سے یہ بھی کہا کہ جس مقام پر اس وقت ان کا بیڑا ہے اس کے شمال میں جو ساحل افریقہ کا ہے اس طرف ہرگز نہ جانا۔ بلکہ ان کو چاہیے کہ وہ سیدھے کھلے سمندر میں اپنا بیڑا لے جائیں۔"

نشے کی حالت میں ہند کا راستہ بتانا محض اپنی ایجاد ہے اور اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ مصنف کتاب البرق الیمانی، قطب الدین پکا مسلمان مکہ معظمہ کا رہنے والا تھا۔ اسکی غیرت گوارا نہ کرتی تھی کہ ایک مسلمان آدمی ایک کافر کو کسی مقام پر پہونچنے کا صحیح راستہ بتائے، اسلئے نشے کا حیلہ دل سے جوڑ کر لکھدیا۔ یورپ کے محققوں کا خیال ہے کہ احمد ابن ماجد نے اس خدمت کا ایک معقول صلہ لیکر گاما کو ساحل ہند کا راستہ بتایا تھا۔ کیونکہ پرتگیزوں نے جو حالات اس سفر کے لکھے ہیں ان کی نسبت یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے کوئی بات چھپائی ہوگی۔

پرتگیزی مورخ گوئیس نے اس واقعہ کو مفصل لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس زمانے میں واسکوڈے گاما کا بیڑا افریقہ کے مقام مالندی میں ٹھہرا ہوا تھا تو چند ہندو جو ملک گجرات میں ریاست کھمبایت کے رہنے والے تھے گاما کے پاس آئے۔ یہ ہندو ایک باکرہ کو پوجتے تھے اور اسکو اپنی دیبی سمجھتے تھے۔ واسکوڈے گاما نے ان کو عیسائی سمجھا۔ کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ مقدس توما کے عیسائی کئے ہوئے لوگ ہند میں موجود ہیں۔ ان ہندوؤں کے ساتھ ایک مسلمان بھی تھا۔ یہ مسلمان گجرات کا رہنے والا تھا اور نام اس کا مالیمو کاناکا (مالیمو کاناکا) تھا۔ اس

(بقیہ صفحہ گذشتہ) پرتگیزوں کی اس نے قائم کی۔ ۱۵۰۳ء میں وہ اشبونہ واپس آیا۔ اس کے بعد بیس برس تک بالکل حالت گمنامی میں بسر کرتا رہا۔ ۱۵۲۴ء میں وہ بادشاہ پرتگال جان سوئم کی طرف سے پرتگیزی مقبوضات ہند کا نائب السلطنت مقرر ہوا۔ لیکن تین ماہ تک یہ خدمت کرنے پایا تھا کہ مقام گوا میں دسمبر کے مہینے میں اسی سال اس کا انتقال ہوگیا۔

مسلمان نے یا تو اس خیال سے کہ اچھی صحبت میسر آتی ہے یا بادشاہ مالندی کو جو پرتگیزوں کے لئے ایک معلم کی تلاش میں تھا خوش کرنے کو واسکوڈ گاما سے ربط پیدا کیا۔ اور یہ مسلمان اس بات پر راضی ہو گیا کہ پرتگیزوں کے ساتھ جہاز پر سوار ہو کر ساحل ہند تک اُن کی رہنمائی کرے۔ واسکوڈ گاما نے جب اس مسلمان معلم سے بات چیت کی تو اسکو بہت اطمینان ہوا۔ اور جب اس مسلمان معلم نے گاما کو ایک نقشہ سواحل ہند کا دکھایا جو مسلمانوں کے طریقے کے مطابق بنا ہوا تھا تو واسکو کو اور بھی اطمینان ہوا۔ اس نقشے میں دوائر معدل النہار مع درجات کے بنے ہوئے تھے لیکن وہ خطوط اس میں کم تھے جن سے ہوا کا رُخ معلوم کیا جاتا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ دوائر طول وعرض کے تقاطع سے جو مربع یا خانے بنتے ہیں وہ اس قدر تنگ ہوتے ہیں کہ ان میں ہوا کا رُخ بتانے والے خطوط بنانے مشکل ہو جاتے ہیں۔ ان خطوط کو نہ بنانے میں نقشہ میں گنجلک کم تھی۔ ہمارے پرتگیزی نقشے جو تمام دُنیا کے لئے نمونہ سمجھے جاتے ہیں انہیں ان خانوں میں باوجود تنگی کے علامتیں اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ اُن کا پڑھنا دُشوار ہو جاتا ہے۔

واسکوڈ گاما نے ایک لکڑی کا اسطرلاب بھی اسکو دکھایا جس سے ارتفاع آفتاب دریافت کیا جاتا تھا۔ ان اسطرلابوں کے دیکھنے سے اس مسلمان معلم کو مطلق تعجب نہ ہوا۔ اور وہ واسکوڈ گاما سے کہنے لگا کہ بحر قلزم کے عرب معلم اس کام کے لئے پیتل کے ایسے آلات استعمال کرتے ہیں جن کی شکل مثلث یا مربع دائرے کی ہوتی ہے۔ اور انہی آلات سے وہ ارتفاع شمس یا قطب تارے کو معلوم کرتے ہیں۔ قطب تارے سے عرب جہازرانی میں بہت مدد لیتے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی عرب معلم نے یہ بھی کہا کہ میں خود اور کھمبایت اور باقی ہند کے ملاح اور معلم چند ستاروں کی مدد سے جو مرکز سما میں شرق سے مغرب کی سمت میں گردش کرتے ہیں، جہازرانی کرتے ہیں۔ مسلمان معلم اُن آلات سے ارتفاع شمس دریافت نہیں کرتے جو واسکوڈ گاما نے اسکو دکھائے ہیں۔ بلکہ وہ ایک دوسرا آلہ ہے جس سے وہ یہ چیز معلوم کرتے ہیں۔ اور میں خود بھی اسی آلہ کو استعمال کرتا ہوں۔ یہ کہکر احمد بن ماجد گیا اور وہ آلہ واسکوڈ گاما کو دکھانے لایا۔ (اس آلے کی نسبت مورخ گوئیں لکھتا ہے کہ میں نے اسکو اپنی کتاب جغرافیہ عالم میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اب یہ کتاب معدوم ہے) غرض جب پرتگیزی امیر البحر اور ابن ماجد میں یہ گفتگو ہوئی تو وگاما سمجھا کہ یہ مسلمان کیا ملا ہے ایک دولت مل گئی ہے اور اس خیال سے کہ کہیں وہ ہاتھ سے نکل نہ جائے، وگاما اس مسلمان معلم کو ساتھ لئے سمندر پر چل پڑا۔ اور ۲۴ اپریل ۱۴۹۸ء کو ساحل ہند کا رُخ کر کے پرتگیزی بیڑا روانہ ہو گیا۔

دو پرتگیزی مورخ ایسے ہیں جن کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس معلم کا ذکر اوپر آیا ہے وہ گجرات کا مسلمان تھا اور ایک مورخ اسکو گجراتی معلم لکھتا ہے۔ یہ دونوں مختلف زمانوں کے مورخ ہیں اور انہوں نے اس مسلمان معلم کا نام بھی کسی قدر مختلف شکل میں لکھا ہے۔ کسی نے ماکیمو (عربی معلم) اور کسی نے مالیمو کانا کا لکھا ہے۔ (معلم جہازرانی کے فن کی ایک اصطلاح ہے جسکے معنی جہازرانی کے اُستاد یا سکھانے والے کے ہیں اور اسکے بعد جو لفظ کانا کا آیا ہے وہ سنسکرت کانکا کی بگڑی شکل بزبان تامل ہے اور اسکے معنی ماہر علم کواکب کے ہیں۔) بجانب دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مالیمو کانا کا وہی شخص ہے جو احمد بن ماجد ہے۔ اور اس کا ذکر کتاب "برق الیمانی فی فتح العثمانی" میں بھی آیا ہے۔ خود احمد بن ماجد نے بھی اپنے ایک ارجوزہ (نظم) میں اپنی نسبت لکھا ہے کہ وہ عرب اور عربی النسل ہے اور جلفار کا رہنے والا ہے۔ جن پرتگیزی مورخوں نے اسکو گجراتی مسلمان یا گجراتی معلم لکھا ہے انہوں نے غلطی کی ہے مگر یہ غلطی اُن ماخذوں میں غلطی کی وجہ سے ہوئی ہے جن سے ان مورخوں نے اس مضمون کو اقتباس کیا تھا۔ اور کوئی معقول وجہ اس غلطی کی بیان نہیں ہو سکتی۔

ابن ماجد کے حالات اور ذرائع سے بھی دریافت ہوتے ہیں۔ ترکی امیر البحر سیدی علی نے اپنی کتاب "محیط" میں جو جہازرانی کے

متعلق ہدایات میں لکھی ہے، لکھا ہو۔

"شہر بصرہ کے زمانۂ قیام میں جس کی مدت پانچ ماہ کی تھی، اور یہ قیام اُس وقت ختم ہوا جبکہ مونسون چلنی شروع ہوگئی تھی، اور بصرہ سے ہند تک پہونچنے کے دوران میں جس کی مدت تین ماہ کی تھی۔ غرض اِن پورے آٹھ مہینوں میں کوئی رات یا دن ایسا نہ ہوتا تھا کہ جہاں کے ساحلوں کے معلموں اور ملاحوں اور اہلِ جہاز سے جو میرے ساتھ تھے جو جہاز رانی کے متعلق کسی نہ کسی مضمون پر بحث نہ رہتی ہو۔ اس قسم کی بحثوں میں مجھکو معلوم ہوا کہ ہرمز اور ہند کے پرانے ملاحوں میں لیث بن کہلان، محمد بن شاذان اور سلیمان ابن ابان بڑے پائے کے لوگ ہوئے ہیں" چنانچہ سیدی علی اپنی اسی کتاب محیط میں لکھتا ہو کہ "میں نے وہ کتابیں جو زمانہ حال کے مصنفوں نے ان پرانے ملاحوں کے حال میں لکھی تھیں، جمع کیں۔ اُن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر اور لائق شخص احمد بن ماجد جلفاری تھا۔ (جلفار عرب عمان کا ایک شہر ہے۔) دوسرا لائق شخص ان حال کے مصنفوں سلیمان بن ابان ہے۔ یہ سلیمان شہر شحر کا رہنے والا تھا، جو جنوبی عرب کے ملک ... سیدی علی لکھتا ہو کہ "ان مصنفین کی کتابوں کے علاوہ مجھکو چند کتابیں اور بھی ملیں مثلاً ابن ماجد کی کتاب فوائد، حاویہ، تحفۃ الفحول، منہاج اور کلید الشموس مصنفہ سلیمان المہری۔ ان تمام کتابوں کو دستیاب کر کے میں نے اُن کا مطالعہ کیا، کیونکہ بحرِ ہند میں بغیر ان کتابوں کو پڑھے اور ان سے مدد لئے جہاز رانی سخت دشوار ہے۔ باہر والے ناخدا افسر اور ملاح اس سمندر میں جہاز رانی کرنی مطلق نہیں جانتے۔ اور ہمیشہ اس بات کے محتاج رہتے ہیں کہ کوئی رہبر ان کو ملے۔ کیونکہ وہ خود یہاں کے بحری راستوں سے واقف نہیں ہوتے۔ پس میں نے اپنا فرض سمجھا کہ ان کتابوں میں جو میں نے جمع کی تھیں، جو باتیں زیادہ مفید معلوم ہوں اُن کا انتخاب کروں اور پھر اُن کا ترجمہ ترکی زبان میں کروں، اور پھر ایک علٰحدہ کتاب لکھوں۔ اور یہ کتاب ایسی ہو کہ جو لوگ اسکو پڑھیں وہ بغیر کسی رہبر کی وساطت کے بحرِ ہند میں جہاز رانی کر سکیں۔ اور ان کو کسی رہنما کی رہنمائی اور کسی ہادی کی ہدایت کی ضرورت نہ رہے۔ ان عربی تصانیف سے جو کچھ اخذ کرنا تھا وہ تھوڑی مدت میں میں نے اخذ کر لیا اور خدا کی مدد سے یہ کام انجام کو پہونچا۔ چونکہ میری اس تصنیف میں تمام باتیں جہاز رانی کے متعلق بیان ہوئی ہیں اس لیے میں نے اس کا نام محیط رکھا یعنی اس میں وہ کل باتیں جو ہمارے ساحلوں پر پائی جاتی ہیں" آگئی ہیں اور تمام ضروری اُمور اُس میں درج کر دئے گئے ہیں۔ اس کتاب محیط کا ترجمہ جرمن زبان میں مع تمین نقشوں کے ۱۸۹۷ء میں وائنا میں شائع ہوا ہے۔

سیدی علی نے ابنِ ماجد کی بہت تعریف کی ہو اور اس کو جہاز رانوں میں سب سے معتبر اور بحرِ ہند کے معلموں میں سب سے لائق لکھا ہو اور لکھا ہو کہ آجکل کے معلموں میں جو جہاز رانی کے متعلق ہدایات تحریر کرتے ہیں اور ان میں ابنِ ماجد سب سے زیادہ بھروسے کا معلم ہو اور اسکی ہدایتیں ایسی ہیں کہ یقین کیساتھ ان پر عمل کیا جا سکتا ہو۔

سیدی علی نے اپنی کتاب محیط میں دوسرے مصنفوں کی تحریروں کے جو اجزا شائع کئے ہیں اُن کو پڑھنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ترکی امیر البحر نے ابنِ ماجد اور سلیمان المہری کی کتاب منازل اور ہدایات متعلق بہ جہاز رانی کا ترجمہ ترکی میں کر کے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ کسی مستشرق نے کوشش نہیں کی کہ ان عربی نسخوں کا پتہ چلائے اور ان تصنیفوں کے پورے نام جن کو سیدی علی نے بہت اختصار سے لکھا ہے دریافت کرے۔ نہ ان کتابوں کا ذکر کسی ادبی تاریخ میں ملتا ہے۔ البتہ عربی مخطوطات کی فہرست میں وہ نمبر ۲۲۹۲ اور نمبر ۲۰۰۹ پر مذکور ملتی ہیں۔

یہی دو کتابیں یعنی ابنِ ماجد اور سلیمان المہری کی کتب منازل وہ ماخذ ہیں جن سے ترکی امیر البحر سیدی علی نے اپنی کتاب محیط تیار کی معلوم

ہوتا ہے کہ مصنفِ محیط کو اور کوئی کتاب اس فن پر معلوم نہ تھی۔

مخطوطہ نمبر ۲۲۹۲ کے ۱۸۱ اوراق ہیں اور یہ اصل نسخے کی نقل ہے۔ ہر صفحے پر ۱۹ سطریں ہیں۔ اس مخطوطے میں ۱۹ کتب منازل اور چند رسالے ابنِ ماجد کے قلم سے نکلے ہوئے شامل ہیں لیکن نقل نویس نے بلا قیدِ زمانہ اسکو حسبِ ذیل ترتیب سے نقل کر دیا ہے۔

(۱) **کتاب الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد**۔ مصنفِ کتاب ابنِ ماجد ہے۔ سیدی علی نے اپنی کتاب محیط میں جہاں کہیں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے وہاں اس کو صرف فوائد لکھا ہے۔ یہ کتاب ابنِ ماجد کی نثر میں لکھی گئی ہے۔ تاریخ تصنیف ۸۹۵ ہجری (۱۴۹۰ء) ہے۔ کتاب کی ابتدا اُن افسانوں سے ہوئی ہے جو جہاز رانی کے متعلق مشہور تھے۔ پھر مقناطیس کی سوئی کا حال لکھ کر ۲۸ مقاماتِ قمر بیان کئے ہیں اور ان ستاروں کا ذکر کیا ہے جو دوّارہ ملاحین میں ۳۲ اخنان سے مطابق ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بحرِ ہند میں بحری راستوں کا ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد بہت سے بندرگاہوں کا عرض بلد بیان کیا ہے جو بحرِ ہند اور مغربی چین کے ساحلوں پر واقع ہیں۔ پھر وہ علامتیں اور اشارے بتائے ہیں جو پرندوں کو اُڑتے دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسکے بعد ساحل کی شکل بیان کی ہے۔ پھر اُن زمینوں کا بالخصوص ندخات کا بیان ہے جو بحری سفر کے خاتمہ کے قریب سب سے پہلے ہند کے مغربی ساحل پر نظر آتی ہیں۔ اسکے بعد دس مشہور جزیروں کا ذکر ہے یعنی جزیرہ نمائے عرب۔ جزیرہ قمر (یعنی مدغاسکر) سماترا، جاوا۔ الفور یا فور موسا۔ سیلان، زنجبار، بحرین۔ ابن گاواں۔ واقع خلیج فارس اور سقوطریہ پھر ان موسمی ہواؤں کا بیان آتا ہے جو بحری سفر میں موافق ہوتی ہیں۔ موسمی ہواؤں کے چلنے کی تاریخیں نجمی طریقے پر دی ہیں۔ ابنِ ماجد کی یہ تصنیف یعنی کتاب الفوائد فی علم البحر والقواعد، ختم ہوتی ہے۔ بحرِ قلزم کے ایسے مقامات کے حالات پر جہاں جہازوں کو مقام کرنا پڑتا ہے اور ایسے مقامات کے حال پر جہاں سمندر میں پانی جہاز چلانے کے لئے کافی گہرا نہیں ہے۔ یا جب کنارے سے قریب پانی کے اندر پہاڑ اُٹھے ہوئے ہیں۔ ایسے کل مقامات کا حال درج ہے۔ یورپ کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ "ابنِ ماجد کی تحریر اس کتاب میں نہایت مفصل ہے اور اصطلاحات اُس میں بکثرت ہیں۔ یہ اصطلاحیں ایسی ہیں کہ سوائے اُنکے جو بحرِ ہند میں بادبانی جہاز چلاتے تھے، دوسروں کو اُنکے معنی معلوم نہیں تھے۔ یورپ کا یہ محقق لکھتا ہے کہ جہاز رانی کی یہ اصطلاحیں جو ہمکو ملی ہیں اتنی ہیں کہ اگر عربی کی کسی لغت میں شامل کی جائیں تو وہ بہت بڑا اضافہ ہونگی۔

(۲) **حاویہ الاختصار فی اصول علم البحر**۔ سیدی علی اپنی کتاب محیط میں اس کتاب کا نام صرف حاویہ لکھتا ہے۔ یہ کتاب منظوم ہے اور بحرِ رجز میں لکھی گئی ہے۔ اس میں ۱۱ فصلیں ہیں اور کتاب کے شروع میں ۲۰ سطروں کا ایک دیباچہ نثر میں ہے۔ دیباچے کے بعد پہلی فصل شروع ہوتی ہے۔ اس پہلی فصل میں وہ علامتیں بیان کی ہیں جن سے سمندر پر چلتے چلتے ملاح پہچان لے کہ اب زمین قریب ہے۔ دوسری فصل میں مقاماتِ قمر اور ہواؤں کے رُخ بیان کئے ہیں۔ تیسری فصل میں عربی، قبطی، بیزنطی اور نجمی سال کا ذکر ہے۔ چوتھی فصل میں علم باشی کے ذریعے یعنی اُن اصلاحوں کے علم سے جو بعض ستاروں کے مقامات میں کی گئی ہیں موسمی ہواؤں کے چلنے اور بند ہو جانے کا حال لکھا ہے۔ اور یہ کہ کونسے عرض بلد کے ملکوں میں وہ مقررہ وقت پر چلتی اور بند ہوتی ہیں۔ تاریخیں ہواؤں کے چلنے اور بند ہونے کی نجمی طریقے پر بیان ہوئی ہیں۔ پانچویں فصل میں ——— ساحلِ عرب کے بحری راستے اور حجاز اور سیام کے بندرگاہ بیان کئے ہیں۔ سیام کے متعلق ابنِ ماجد کے الفاظ یہ ہیں کہ اسکی مراد جزیرہ نمائے ملایا کے مغربی ساحل سے ہے جو اس زمانہ میں سلطنتِ سیام کے پاس تھا۔ اس فصل میں ملک حبش کے مشرق میں اسکے آخری سرے کے حالات درج ہیں۔ اس سرے کو ابنِ ماجد نے ساحلِ حبش لکھا ہے۔ چھٹی فصل میں مغربی ساحلِ ہند کے بحری رستے اور مغربی ہند کے کنارے کنارے ان ملکوں تک جانے میں جو زیر باد میں شمار ہوتے ہیں جو جو مقامات آتے ہیں اُنکے حالات لکھے ہیں۔

ابن ماجد لکھتا ہے کہ زیر باد سے مراد راس کماری سے مشرق کے مقامات ہیں۔ مثلاً جزیرہ طلیتون جو سماترا کے مشرقی ساحل پر سماترا کے مہاراجہ کے علاقے میں ہے۔ ملک چین، جزیرہ فورموسا۔ یہ سب زیر باد ہیں۔ ساتویں فصل میں مشرقی جزیروں کے ساحل تک پہونچنے کی بحری راہیں بیان کی ہیں۔ مشرقی جزائر میں سماترا، فال یا خرا، لکادیپ، مدغاسکر، یمن، جلش، ارض سومالی۔ اطواہ یعنی جنوبی عربستان اور مکران کے جزیرے ہیں۔ آٹھویں فصل میں عرب کے ساحل سے مغربی ساحل ہند کا فاصلہ بیان کیا ہے۔ نویں فصل میں سمندر کے اردگرد کے بندرگاہوں کا عرض بلد لکھا ہے۔ یہ سمندر شمال کی سمت میں گہرا ہوتا گیا ہے یعنی مغربی ہند کے سمندر کی یہ کیفیت ہے۔ دسویں فصل جہازرانی کے متعلق ہے۔ جہازرانی اپنے حقیقی معنوں میں لی گئی ہے۔ اس فصل میں گہرے سمندروں کی امواج کے متعلق کچھ حسابات بیان کئے ہیں۔ اور بحر محیط کا حال لکھا ہے جو حبشیوں والے سمندر کے ساحل اور ہند اور چین کے درمیان ہیں۔ گیارھویں فصل میں علم نجوم سے جہاں تک اس کا تعلق علم البحر سے ہے بیان کیا ہے۔

الحاویہ کا ذکر بار بار ابن ماجد کی کتاب الفوائد میں آیا ہے اور حاویہ میں اس کتاب کے ختم ہونے کی تاریخ اس طرح بیان کی ہے:۔

"یہ نظم ماہ ذوالحجہ میں بمقام جلفار جو خلیج فارس سے جنوب مغرب میں ہے ختم کی۔ مصنف اس کا اسد البحر (یعنی احمد بن ماجد) ہے جو یوم الغدیر کو پیدا ہوا تھا۔ سب دنوں میں یہ دن اچھے کاموں اور روزہ رکھنے کے لئے نہایت مبارک ہے۔ اے دوست۔ یہ کتاب (حاویہ) ختم ہوئی ۸ ذوالحجہ ۸۶۶ھ کو" (مطابق ستمبر ۱۴۶۲ء)

۳۔ ایک نظم خلیج بربیرا پر (جسے آجکل ہم خلیج عدن کہتے ہیں۔)

۴۔ ایک نظم جس کے شروع میں ۳۳ سطروں کا ایک دیباچہ نثر میں ہے۔ اس نظم کا نام "قبلۃ الاسلام" تمام عالم کے لئے ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ یہ نظم خاصکر ان شہروں کے متعلق ہے جو ساحل سے قریب ہیں اور وہ ایسے شہروں کے لئے بالخصوص لکھی گئی ہے جہاں زائرین بکثرت آتے ہیں۔

۵۔ ایک نظم خلیج فارس اور اسکے ساحل کے متعلق جو عربستان سے ملا ہوا ہے۔

۶۔ ایک نظم (ارجوزہ) جس میں بنات النعش، دُب کبر اور دُب اصغر کا ذکر ہے۔

۷۔ ایک ارجوزہ (نظم) جس کا نام "حزنیۃ المعلمات" یعنی یہ نظم اساتذہ فن جہازرانی کے لئے معلومات مفیدہ کا مخزن ہے۔ اور وہ ایک ایسا خزانہ ہے جس میں علم البحر کے متعلق ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جو ابتک کسی کو معلوم نہ تھیں اس میں ستارے اور سیاروں کے نام اور انکے قطبین کا تذکرہ ہے۔

۸۔ ایک ارجوزہ (نظم) جو مغربی ساحل ہند اور ساحل عرب پر لکھی گئی ہے۔

۹۔ ایک نظم جس میں شمال کے ستاروں کا حال درج ہے۔

۱۰۔ نظم مخمس چند کواکب شمال کا بیان ہے۔

۱۱۔ ایک نظم جس میں بیزنطیہ کے مہینوں کا ذکر ہے۔

۱۲۔ ایک نظم جس کا نام "ضرب الضراب" ہے۔ اس میں چند کواکب کی گردشوں کا ذکر اور ان سے استفادہ حاصل کرنیکا بیان ہے۔

۱۳۔ ایک نظم جس کا نام ارجوزہ ہے۔ اس میں مقامات قمر کا ذکر ہے۔ یہ ارجوزہ منسوب ہے امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے۔ مقامات قمر کا حال کہ وہ سماء میں کہاں کہاں ہیں انکی شکلیں، تعداد اور پورا پورا حال بیان کیا ہے۔

۱۴۔ ایک نظم جسکو مکہ والی نظم کہا گیا ہے۔ اس میں جدّہ سے لیکر جنوبی عرب کی راس فرتق تک اور کالی کٹ، دابل، کوکن، گجرات مغربی ہند سے لیکر الاطوہ (جنوبی عرب) اور ہرمز تک کے بحری راستے بیان کئے ہیں۔

۱۵۔ ایک نظم جس کا نام "نادر الابدال" یا "الواقع دزمان" ہے۔

۱۶۔ ایک نظم جس کا نام مذہب ہے۔ اس میں پانی کے اندر یا سطح آب سے کچھ اوپر پہاڑوں یا ریت کے ٹیلوں کے آجانے کا حال درج ہے۔ اور سمندر کی بڑی بڑی گہرائیوں کا حال لکھا ہے۔ اور یہ کہ وہاں ملّاح کو کیا کرنا چاہیئے۔ ایسے مقامات بھی بیان ہوئے ہیں جہاں پانی بہت کم ہے اور زمین کے قریب آجانے کی علامتیں بھی بیان کی ہیں۔ یہ علامتیں پرندوں کے اڑنے اور ہواؤں کے چلنے سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اور زمین کے قریب آجانے کا پتہ ان سے چلتا ہے۔ لیکن یہ پتہ اُس وقت چلتا ہے جبکہ بادِ موسمی (مونسون) جنوب مغرب کی طرف سے یا بادِ مغرب چلنی شروع ہوتی ہے۔

۱۷۔ ایک نظم جس کا نام الذنذع (مینڈک) ہے اس میں اس جانور کے متعلق جسقدر مشاہدات ہیں انکو بیان کیا ہے۔

۱۸۔ ایک نظم جس کا نام البالغہ ہے اس میں ستارہ کانوپس ورارکتورس کے متعلق مشاہدات کا ذکر ہے۔

۱۹۔ نو مختصر فصلیں نثر میں ہیں جس میں سے ایک کی تاریخ تحریر بھی درج ہے۔ ان میں بحرِ ہند کے مختلف حصّوں میں پانی کی گہرائی بتائی ہے۔

ابنِ ماجد کے ایک رسالے کی دوسری نقل بیلوتھیک نیشنال کے مجموعہ مخطوطات عربی میں موجود ہے۔ جس میں ابنِ ماجد کا لکھا ہوا مندرجہ ذیل رسالہ شامل ہے۔

۲۰۔ ایک نظم (ارجوزہ) جس کا نام السبیعہ ہے یہ نظم سات حصّوں میں تقسیم ہے اس لئے کہ اسمیں جہاز رانی کی سات شاخوں سے بحث کی ہے آخر میں اس نظم کو نظم مذہب لکھا ہے۔ اور بعض اور صفحوں پر بھی اس نام کا اعادہ کیا ہے۔

۲۱۔ ایک قصیدہ جسکو علم کواکب سے تعلق ہے۔

۲۲۔ ایک قصیدہ ...... ہے اس میں ...... کے متعلق اور ایسے ستاروں کے متعلق مشاہدات درج ہیں جو بحری سفر میں پہلے بار زمین کے قریب آجانے کی علامتوں کو معلوم کرنے میں بکار آمد ہیں اور ایسے مقامات کا ذکر ہے جہاں سے بحری سفر کرتے کرتے زمین ظاہر ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ دین سے دابل تک ساحل کے حالات بھی اس میں مذکور ہیں۔ پورا نام اس نظم کا مصنف نے ایک شعر میں بیان کیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ یہ معلم کے لئے ایک مفید ہدایت ہے کیونکہ اس میں غلطی نہیں ہے۔ اس قصیدے کے آخری حصّہ کو ابنِ ماجد الہدایا لکھتا ہے کیونکہ اس سے صحیح راہ معلوم ہوتی ہے۔

(۲۳ سے ۳۲ تک) سب سے پہلے بحری رسالے میں جو نثر میں لکھا تھا ابنِ ماجد کے دس اور رسالوں سے اشعار نقل کئے گئے ہیں یہ دس رسالے جنکو نمبر ۲۳ سے ۳۲ تک شمار کرنا چاہیئے افسوس کہ ہم تک نہیں پہونچے۔

زمانہ جس میں ابنِ ماجد نے اپنے رسائل علم البحر پر لکھے ان میں کچھ تو ۱۴۶۲ء سے پیشتر کے ہیں اور کچھ ۱۴۸۹ء اور ۱۴۹۰ء کے درمیانی زمانہ کے ہیں۔

اس مشہور و معروف معلم کی سب سے اہم بالشان تصنیف خواہ ضخامت کے لحاظ سے اور خواہ علمی فوائد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو

اسکی تصنیف الفوائد ہے۔ اس تصنیف میں ابن ماجد نے علم البحر کا خلاصہ خواہ وہ نظری ہو خواہ عملی قلمبند کر دیا ہے۔ اس لئے اسکو مصنف کے ذاتی تجربے تحقیق و مشقت سے بھی زیادہ سمجھنا چاہئیے۔ بلکہ یہ کتاب وہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد وسطےٰ کے آخری زمانہ میں فن جہاز رانی کیونکر مدوّن ہوا۔ علاوہ اسکے زمانہ حال کے مصنفوں نے جنہوں نے جہاز رانی پر کتابیں لکھی ہیں اُن میں ابن ماجد سب سے بڑھا ہوا ہے۔ اسکی تصنیفات قابل تعریف ہیں۔ بحرِ قلزم کے حالات کبھی کسی نے آج تک اس سے بہتر یا اسکی مثل نہیں لکھے۔ عرض بلد کی غلطیاں جو بادبانی جہاز رانی کی کتابوں میں اکثر کی گئی ہیں اگر اُن سے قطع نظر کی جائے تو بادبانی جہازوں کے چلانے میں ابن ماجد سے بہتر ہدایات کسی دوسرے ملاح یا معلم کے قلم سے نہیں نکلے۔ بادہائے موسمی اور دیگر مقامی ہواؤں، ارض بلد اور بحرِ ہند میں سفر کرنے اور اسکو عبور کرنے کے متعلق جو باتیں صحیح علم اور تفصیل سے لکھی ہیں وہ ان توقعات سے کہیں زیادہ ہیں جو اس زمانے میں کی جاسکتی تھیں۔

انڈونیسیا سے (غالباً جزائر شرق الہند سے مراد ہے) ابن ماجد کو اتنی واقفیت نہ تھی جس قدر کہ بحرِ ہند سے وہ واقفیت رکھتا تھا۔ جزیرۂ جاوا کے متعلق ایک غلطی اس سے یہ ہوئی کہ اُس نے اس جزیرے کے متعلق لکھا کہ وہ شمال سے جنوب کی طرف پھیلا ہے درحالیکہ وہ مشرق سے مغرب کی سمت میں پھیلا چلا گیا ہے۔ یہی غلطی سلیمان المہری نے اپنے جہاز رانی کے رسالوں میں کی ہے۔ سلیمان المہری سولھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں زندہ تھا۔ سیدی علی ترکی امیر البحر کے ترکی ترجمے میں بھی یہی غلطی موجود ہے۔ ابن ماجد کی تمام تصنیفات میں صرف یہی ایک غلطی ہے جس کی صحت کرنی ضروری ہے۔

الفوائد کے قلمی نسخے میں ابن ماجد اور اسکے خاندان کے حالات کسی قدر بیان ہوئے ہیں۔ ابن ماجد کا پورا نام شہاب الدین احمد بن ماجد بن محمد بن عمرو بن فضل بن دویق بن یوسف بن حسن بن حسین بن ابی معلق سعدی بن ابی رکائب النجدی تھا۔ شاعری میں اس کا لقب قبلتین تھا یعنی مکہ اور بیت المقدس دونوں قبلوں کا وہ شاعر تھا۔ ان دونوں مقدس مقامات کا حج اور زیارت کرچکا تھا۔ اور وہ اپنے کو اولادِ اسد میں بنی اسد سے بتاتا تھا۔ اور اسی رعایت سے سمجھنا چاہئیے کہ بحرِ متلاطم کا شیر غراں وہ اپنے کو تصور کرتا تھا۔ ایک جگہ اُس نے اپنا نام اس سادگی سے بھی لکھا ہے "احمد بن ماجد میں عرب معلم ہوں۔"

کتاب الفوائد میں بعض عبارتیں ایسی آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد کا باپ ماجد اور دادا محمد بھی معلم تھے اور انہوں نے جہاز رانی کے فن پر جس تحقیق کا سلسلہ شروع کیا تھا بیٹے اور پوتے نے اسکو جاری رکھا۔ بحرِ قلزم کے جنوبی حصے میں جہاز ران وہی راستہ اختیار کرتے ہیں جس سے حاجی حج بیت اللہ کو جاتے ہیں۔ چنانچہ ابن ماجد ایک موقع پر لکھتا ہے کہ "میرا دادا اس راستے سے صحت و تفصیل کیساتھ واقف تھا۔ اس علم اور واقفیت میں وہ کسی سے کم نہ تھا۔ میرے باپ نے اپنے ذاتی تجربے سے جو نتائج پیدا کئے اُن کو دادا کی معلومات پر اضافہ کیا۔ میرے باپ کا تجربہ دادا کے تجربے سے بڑھا ہوا تھا جب میرا وقت اور باری آئی اور ۴۰ برس تجربہ کرتے گذر گئے اور میں نے اپنے باپ اور دادا کی تصانیف کی صحت کر دی اور اپنے مشاہدات اور تجربات بھی سپرد قلم کر دئے تو میں نے دیکھا کہ واقعات اور اُصول اس طرح یکجا ہو کر ظاہر ہوئے ہیں کہ میرے وقت میں کسی دوسرے سے ایسا ممکن نہیں ہوا۔ سابق میں واقعات اکثر پراگندہ اور منتشر مختلف مصنفوں کی کتابوں میں ملتے تھے۔"

ایک موقع پر ابن ماجد لکھتا ہے کہ "تمام معلم اور ناخدا میرے باپ کو دونوں ساحلوں کا معلم کہا کرتے تھے۔ اس سے اُن کی مُراد بحرِ قلزم کے دونوں ساحلوں سے تھی۔ میرے باپ نے مشہور ارجوزہ (بحری نظم) حجازیہ لکھی تھی۔ اس نظم میں ایک ہزار اشعار سے زیادہ تھے۔ میں نے

اس نظم میں جو غلطیاں پائیں اُن کی صحت کی۔ اور اس نظم کو باقاعدہ طریقے پر ختم بھی کیا۔ اپنے باپ کی اِس بحری نظم کے متعلق ایک موقع پر لکھتا ہے۔

بحر قلزم کے مشرقی ساحل پر جزیرہ دمریا کے قریب جو پہاڑوں کا سلسلہ پانی کے باہر نکلا نظر آتا ہے اور جنوب میں ۲۰ درجہ عرض بلد میں واقع ہے ابنِ ماجد لکھتا ہے کہ اس پہاڑی سلسلہ کو لوگ ریفِ ماجد کہنے لگے تھے۔ وجہ یہ ہوئی تھی کہ اُسکے باپ ماجد نے اپنا جہاز یہاں لنگر انداز کیا تھا۔ اس وجہ سے سمندر کے مسافروں میں میرے باپ کی بڑی شہرت ہو گئی۔

کئی موقعوں پر دورانِ سفر میں ابن ماجد نے اپنے باپ کی بحری ہدایات پر پورا بھروسا کیا اور پندرھویں صدی کے معلموں کے عمل سے اختلاف کیا۔ ایک موقع پر لکھتا ہے کہ میرے باپ نے جو ہدایات لکھی تھیں اُن پر عمل کرنے سے میری جان بچ گئی۔ دوسرے معلموں کی ہدایات کو یہ بات نصیب نہ تھی۔ اتنا لکھکر ابن ماجد ایک واقعہ بیان کرتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنے باپ کی تحریروں پر بھروسا کرنا بالکل درست اور صحیح تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ جب ہم بحر قلزم میں ساحل عرب کے قریب جزیرہ اسما اور جزیرہ مسند کے قریب ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور یہ مقام ۷۰ درجہ طول بلد سے سمت جنوب میں تھا اور زمانہ ۸۹۰ھ (۱۴۸۵ء) تھا۔ اب ناخدا اور معلم دونوں کی رائے ہوئی کہ ہم ان دونوں جزیروں کے قریب سے جہاز نکال لے جائیں گے۔ لیکن میں نے اُن کی رائے سے اختلاف کیا کیونکہ میں اپنے والد کی ایک نظم میں پڑھ چکا تھا کہ ان دونوں جزیروں کے قریب سے جہاز کے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ پس میں نے ناخدا اور معلم کو سمجھایا کہ ان جزیروں سے بچکر جہاز لیجانا چاہیئے کیونکہ وہاں پانی میں چھپے ہوئے پہاڑ اور ریت کے ٹیلے ہیں۔ جہاز کے نکلنے کے لئے صرف ایک راستہ پانی پر ساٹھ فیٹ چوڑا ہے۔ اب ہم نے اس معاملہ پر باقاعدہ بحث شروع کی۔ ابن ماجد لکھتا ہے کہ میں نے اپنے والد کی نظم سے وہ اشعار پڑھے جن میں بیان تھا کہ ان دونوں جزیروں کے قریب سے جہاز کے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ پس میں نے ناخدا اور معلم سے کہا کہ ایسا قصد ہرگز نہ کریں اور اس ارادے سے باز آئیں کیونکہ ان جزیروں کے قریب صرف ایک راستہ ہے اور وہاں بھی پانی صرف ۱۲ فیٹ گہرا ہے۔ اسکے بعد قرار پایا کہ روانگی سے ایکدن پہلے ایک سنبوق (چھوٹی کشتی) وہاں بھیجی جائے۔ چنانچہ مقررہ دن ایک سنبوق مع گہرائی ناپنے کی ڈوری کے وہاں بھیجی گئی تو معلوم ہوا کہ پانی وہاں صرف ۱۲ فیٹ گہرا ہے۔ سنبوق میں جو لوگ گئے تھے انہوں نے اس امر کی تصدیق کی۔ سنبوق واپسی میں سوما اور مسند کے جزیروں کے بیچ میں ہو کر گذر کر دوسرے دن شام کو ہمارے پاس پہونچا۔ اور میرے باپ نے جو ہدایتیں اپنی نظم میں لکھی تھیں وہ میرے لئے باپ کی چھوڑی ہوئی بہترین دولت ثابت ہوئیں۔

جہاز رانی کی ابتدا، مقناطیس کی سوئی کی ایجاد، قبلہ نما، اسطرلاب کی نسبت جو باتیں قصوں اور روایتوں میں مشہور ہیں اُن کی نسبت ابن ماجد لکھتا ہے کہ پہلا شخص جس نے جہاز تیار کیا وہ حضرت نوح علیہ السلام تھے اور اُنہوں نے حضرت جبرئیل کی ہدایت کے مطابق جہاز تیار کیا تھا۔ جبرئیل کو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس بھیجا اور پھر سفینہ نوح اس شکل پر بنا جو برج دب اکبر کے پانچ ستاروں میں خطوط کے ملانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس زمانے میں بھی اہلِ زنج (یعنی زنگی) افریقہ کے شرقی ساحل کے لوگ جنکے ملک سے خطِ استوا گذرتا ہے اور جزیرہ قمر (مدغاسکر) اور ریما کے لوگ یعنی وہ لوگ جو جزیرہ زنجبار کے مقابل افریقہ کے مشرقی ساحل پر رہتے ہیں اور ارض سومالی کے رہنے والے برج دب اکبر کے ۴ ستاروں کو الہیراب کہتے ہیں۔ جسکے معنی جہاز کے ہیں۔

محدثوں کو سفینہ نوح کے طول اور عرض کے متعلق اختلاف ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ چار سو ہاتھ لمبا اور ۱۰۰ ہاتھ چوڑا تھا۔ اور اتنا ہی گہرا یا بلند تھا۔ اس بلندی میں مستولوں کی اونچان شامل نہیں ہے۔ اس میں ۲ چبوترے تھے اور وہ جہاز کے پچھلے حصے میں بطور مکان کے تھے۔

جب حضرت نوحؑ کا سفینہ تیار ہو گیا اور طغیانی آئی اور حضرت نوحؑ مع اپنے ہمراہیوں کے جہاز میں بیٹھ لئے تو جہاز پانی کی سطح پر چلا۔ اور اس سفینے نے سب کو جو اس میں تھے غارت ہونے سے بچا لیا۔ حضرت نوحؑ کا یہ جہاز سات مرتبہ اُس مقام کے سامنے سے گذرا جہاں بعد کو خانہ کعبہ بنا۔ یہ مقام اس زمانے میں ریگِ سُرخ کا ایک قطعہ تھا اور طوفان کا پانی وہاں تک نہیں پہونچا تھا۔ غرض اس سفینۂ اوّل کے بنجانے سے لوگوں نے جہاز رانی سیکھی اور وہ تمام اقالیم میں ساحل سے جہاز رانی کرنے لگے۔ اب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی اولاد میں یعنی حضرت نوحؑ کی اولاد میں یعنی حام، سام، یافث میں تمام اقلیموں کو تقسیم کر دیا۔

حضرت نوحؑ آدمِ ثانی کہلائے گئے۔ پھر وہ قومیں جو سمندر یا خلیجوں یا ساحلِ بحر کے قریب بستی تھیں اُنہوں نے جہاز رانی شروع کی حتیٰ کہ زمانہ گذرتے گذرتے عہدِ بنی عباس تک پہونچا۔ (۱۳۲ء تا ۸۷۵ء) بنی عباس کا دار الحکومت بغداد تھا جو عراق عرب میں واقع تھا تمام ملک خراسان بنی عباس کے قبضے میں تھا۔ اور خراسان سے بغداد تک ایک سڑک تھی جو چار ماہ کے سفر میں طے ہوتی تھی۔

بنی عباس کے دورِ حکومت میں تین بڑے مشہور شخص ہوئے۔ ایک محمد بن شاذان، دوسرا سہل بن ابان، تیسرا لیث بن کہلان۔ اس ابن کہلان کو ایک کتاب رہمانی میں ابن کہیلان لکھا دیکھا ہے۔ (اس کتاب کا ایک نام رہمانی تھا۔ دوسرا نام رہ نامک تھا۔ پہلودی زبان میں یہ نام دراصل راہ نامک۔ کتاب منازل تھا) اس کتاب رہمانی کا مصنف ابن ابان کا پردادا اسماعیل بن حسن تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں یہ کتاب لکھی گئی تھی جن تین بڑے لوگوں کے نام اوپر لکھے گئے ہیں (یعنی ابن شاذان، سہل ابن ابان، لیث بن کہلان) انہوں نے اس کتاب رہمانی کو دوبارہ لکھنے میں بڑی کوشش کی۔ اور اس کتاب منازل کو انہوں نے اس فقرے سے شروع کیا ہے کہ "ہم تجھے بتاتے ہیں" اس کتاب کا غالباً کوئی حصہ نظم نہیں ہے۔ اور نہ اسکے مضامین ایک دوسرے سے متعلق و وابستہ ہیں۔ اگر کتاب کے اجزا جُدا کر دئے جائیں تو ہر جزو بجائے خود ایک مضمون سمجھا جا سکتا ہے۔ اصل میں یہ لوگ مرتب و مؤلف تھے مُصنّف نہ تھے۔ انہوں نے بحرِ قلزم میں سیراف سے ساحل مکران تک بادبانی جہازوں میں سفر کیا تھا۔ اس سفر میں اُن کو سات دن لگے تھے۔ اور پھر مکران سے وہ خراسان ایک ماہ میں پہونچ گئے۔ اس طریقے سے انہوں نے راستہ کم کر دیا تھا کیونکہ انکے زمانہ سے پہلے بغداد کا سفر خراسان کا تین مہینے میں ختم ہوتا تھا ان لوگوں نے ساحل کے رہنے والوں سے ساحل کے حالات پوچھے اور اپنے بحری سفر کے حالات لکھکر چھوڑ گئے۔

ان تینوں بزرگوں کے زمانے میں مشہور معلم ابن عبد العزیز بن احمد المغربی، موسیٰ القلندری، میمون بن جلیل اور احمد تبرویہ اور ان سے پہلے صدہا لوگ گذرے تھے۔ احمد بن تبرویہ نے جہاز رانی پر کتابیں لکھی تھیں۔ انکی کتابوں سے ان تینوں نے یعنی ابن شاذان، سہل ابن ابان اور لیث بن کہلان نے مضامین نقل کئے تھے اور انہوں نے معلم خواشیر بن یوسف بن صالح الافریقی سے بھی اپنی کتابوں میں مضامین اخذ کئے تھے۔ خواشیر بن یوسف نے ۴۰۰ھ (۱۰۰۹ء) یا اس سے قریب زمانے میں بحری سفر کیا تھا جس جہاز میں اُس نے سفر کیا تھا وہ ایک ہندو دیوکار نامی کا تھا۔ ان تینوں بزرگوں کے زمانے کے مشہور ناخداؤں میں رحمان بن فضل المغیری (یا مُغیری) تھا۔ ان سب لوگوں کا بڑا علم یہ تھا کہ وہ ساحلوں کا حال اُن کا طول اور وسعت لکھنا خوب جانتے تھے۔ اکثر ممالک جن کا ذکر انہوں نے کیا ہے وہ ممالک زیرِ آب ہیں سے تھے (یعنی اُن ملکوں میں سے تھے جو راس کماری سے مشرق میں یا ساحلِ چین کے قریب تھے) جن بندرگاہوں سے وہ گذرے تھے اب انکا وجود نہیں بلکہ ان کے نام تک اب باقی نہیں رہے۔ ایسے مقامات کے موقع اور ان کی علامات جو انہوں نے بیان کی ہیں وہ ہمارے زمانے میں مفید نہیں۔ اور جو اکتشافات اُن کی کتابوں میں مذکور ہیں وہ ہمارے موجودہ علم اور تجربے کی بنیاد پر قائم نہیں ہیں۔ زمانہ حال میں جو تحقیقات

ہوئی ہیں ان میں اُس کا پتہ نہیں۔ ہماری کتاب ایسی ہے جس میں ہر بات کو اچھی طرح جانچ کر لکھا گیا ہے۔ اور تجربے سے اسکی پہلے تصدیق کر لی گئی ہے۔ تجربے سے بڑھکر کوئی چیز نہیں۔ سابقین کو چاہیئے تھا کہ وہ علم کو اس مقام تک پہونچاتے جہاں سے بعد کے لوگ جدید تحقیقات شروع کر دیتے۔ ہم اپنی کتاب سے ان سابقین کے علم میں اور ان کی تصنیفات میں بڑا اضافہ کرتے ہیں۔ ہم نے ان کی تصانیف کی تعریف اس جملے پر ختم کر دی ہے کہ ان تین بزرگوں یعنی ابن شاذان۔ ابن اَبان اور ابن کہلان کے بعد ہم چوتھے ہیں۔ ہم نے جو کتاب سمندر کے حالات میں لکھی ہے بعض وقت اس کا ایک ورق صحت اور فوائد کے لحاظ سے ان پرانے مصنفین اعلیٰ کی پوری پوری تصنیف سے بھی بڑھکر ہے۔

ان تینوں مصنّفوں نے جو باتیں صحیح اور مفید لکھی ہیں وہ دوسرے مصنفوں یعنی ابن عبد العزیز۔ احمد المغربی۔ موسیٰ القلندرانی۔ میمون بن خنیس۔ احمد ابن تبرویہ اور خواشیر بن یوسف الافریقی کی کتابوں سے اخذ کر کے لکھی ہیں اور ان تینوں بزرگوں نے جن کے نام اوپر آچکے ہیں، موخر الذکر مصنفوں میں سے ہر مصنف کے علم کو جو ساحل اور سمندر کا اس نے لکھا تھا نقل کر دیا ہے۔ اور ان باتوں کو انہوں نے ایک کہانی اور قصہ بنا دیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابن شاذان، ابن اَبان اور ابن کہلان ترتیب دینے والے اور انتخاب کرنے والے تھے۔ وہ ایسے مصنف نہ تھے جو اپنے ذاتی تجربات کو سپرد قلم کرتے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی چوتھا شخص سوائے میرے ان تین شخصوں کے بعد بیان کیا جاسکے۔ میں ان لوگوں کی عزت اس خیال سے کرتا ہوں کہ سنین ہجری میں وہ مجھ سے پہلے گذرے ہیں۔ میرے مرنے کے بعد یقیناً دوسرے لوگ آئیں گے اور ایسے لوگ پیدا ہونگے جو اپنے سے پہلوں کو وہ جگہ دیں گے جس کے لائق وہ ان کی نظر میں ثابت ہونگے۔ جب میں نے اپنے سے پہلوں کی کتابیں پڑھیں اور دیکھا کہ وہ کمزور ہیں اور ان میں ایسی باتیں موجود نہیں ہیں جو اصلیت رکھتی ہوں یا قابل یقین و اعتبار ہوں اور جو تجربے انہوں نے کئے اُن سے کوئی فائدہ بھی نہ نکلا تو میں نے صرف ان کی ایسی باتوں کو جو حقیقت میں معتبر تھیں بیان کیا۔ باقی جو تجربے میں نے خود کئے ان کو تحریر کیا۔ میں ہر سال اپنی کتاب میں جو غلطیاں نظر آتی تھیں اُنکی صحت کرتا رہتا تھا۔ اور جو کچھ تحقیق کرتا تھا اُسکو بحری نظموں (ارجوزوں) میں اور اس کتاب میں درج کرتا تھا۔ اپنی اس کتاب الفوائد کو میں نے ۸۹۵ھ ہجری (۱۴۹۰ء) میں ختم کر کے شائع کیا۔ جو لوگ علم بحر میں ماہر اور تجربہ کار ہیں انہوں نے میری کتاب کو پسند کیا۔ اور اس سے انہوں نے کام بھی لیا۔ اور انکی مشکلوں کو حل کرنے میں میری کتاب مفید اور بکار آمد ثابت ہوئی۔ ان لوگوں کی مشکلات اس قسم کی تھیں، مثلاً پہاڑوں کو دور سے اُن کی شکل دیکھکر پہچاننا علم کواکب میں، مشاہدات کے بارے میں اُن کی شکلیں یہ تھیں کواکب کے نام معلوم کرنے اور اسکے متعلق دیگر معلومات حاصل کرنا اور وہ طریقے جن کے مطابق ستاروں کی مدد سے جہاز چلاتے ہیں۔ میرے زمانے کے لوگوں کو سمندر کے راستوں، ترفات اور رحوبات کے متعلق جو کچھ علم ہے وہ متقدمین کے علم سے کچھ بڑھا ہوا نہیں ہے۔ رہے فاصلے تو اسکا علم اُن کو کچھ تھا ہی نہیں۔ ہم نے ان فاصلوں کا ذکر اپنی نظم ذہبیہ کی شرح میں کیا ہے اور ان فاصلوں کا ذکر ہم پھر بھی کرینگے۔

واقعہ یہ ہے کہ پرانے لوگ بڑے عزم اور ہمت کے لوگ ہوتے تھے۔ بحری سفر وہ ملاحوں کے سہارے کر لیا کرتے تھے۔ یہ ملاح بھی بڑی ہمت اور جرأت کے لوگ تھے۔ کیونکہ سمندر سے لوگ بالعموم ڈرتے تھے اور نفرت کرتے تھے۔ ملاح اپنی کشتیوں اور جہازوں کو خوب ساز و سامان سے آراستہ رکھتے تھے اور جب بادِ موسمی چلتی تھی تو وہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے اور وہ اپنی کشتیوں اور جہازوں کو معمول سے زیادہ بوجھ بھر کر بوجھل نہ بناتے تھے لیکن ہم ان پرانے لوگوں سے علم اور تجربے میں بڑھے ہوئے ہیں۔ بحری

معاملات میں ہر ترقی کا ایک نہ ایک موجد اور بانی ہوا ہے۔ سفینۂ نوح کے بنانے والے خود حضرت نوحؑ تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ مقناطیس کی سوئی جس پر جہازرانی کا دارومدار ہے جسکے بغیر جہازرانی درجۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتی تھی اسکے موجد حضرت داؤدؑ تھے۔ اور یہی مقناطیس پتھر تھا جس سے انہوں نے گولیاتھ (جالوط) کو مارا تھا۔ اب رہے مقاماتِ قمر اور منطقۃ البروج کی شکلیں تو اُن کے دریافت کرنے والے حضرت دانیال تھے۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی جسکو نصیر الدین طوسی (سال وفات ۶۷۲ھ) نے ختم کیا تھا۔ لیکن اب ہم کو اپنے اصل مضمون کی طرف رجوع کرنا ہے۔ ستارے جو ملاحوں کے دوائر میں اس کے درجوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ ان ستاروں کے نام بھی ایک پرانی کتاب میں ملتے ہیں۔ جو شیث یعنی نبی اللہ ہمارے بزرگوں سے بھی پہلے زمانہ کی ہے۔ لیکن ملاحوں کے دوائر کے یہ مدارج اور زام (جو مساوی ہیں تین گھنٹے کے بحری سفر کے) کافی ہوا کی نتیجے پر پہونچنے کا نہیں ہیں۔ مطلب یہ کہ زاموں میں جو سمتیں راستوں کی اور سفر کرنے کے اوقات بیان ہوئے ہیں وہ محض تخمینی ہیں یقینی نہیں ہوتے۔ اب سب سواحل کے حالات تو ہم نے اپنے ذاتی تجربے سے اُن کو بڑی احتیاط سے تحریر کیا ہے اور لکھنے سے پہلے بارہا ان کو جانچ لیا ہے۔ اور سواحل کے حالات جس قدر ہم نے لکھے ہیں وہ ہمارے سابقین کے لکھے ہوئے حالات سے کہیں بہتر اور صحیح ہیں۔ اب رہا بیت مقناطیس کا خانہ یعنی وہ گھر جس میں مقناطیس کی سوئی رہتی ہے (یعنی دوائرۂ ملاحین) تو اس کی نسبت بیان ہوا ہے کہ اس کے موجد حضرت دانیال تھے اور یہ علم ان ہی کو تھا کہ لوہا اور اُسکے خواص کیا ہیں۔ اور اس کا استدلال کیونکر کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے حضرت دانیال کی جگہ حضرت خضرؑ کا نام لکھا ہے کہ دوائرہ دراصل اُن کی ایجاد ہے کیونکہ جب چشمۂ حیات کی تلاش میں وہ نکلے ہیں تو اسی تلاش میں وہ ارض ظلمت اور بحر ظلمت میں پہونچے۔ اور جب وہ قطبین میں سے ایک قطب میں پہونچے جہاں ان کو قرصِ آفتاب کا نظر آنا بند ہو گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مقناطیس کی سوئی سے سمتیں دریافت کیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سمت کا اندازہ اُن کو روشنی سے ہوا۔ مقناطیس ایک قسم کا پتھر ہے جو لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور سوائے لوہے کے اور کسی چیز کو نہیں کھینچتا۔ بیان ہوا ہے کہ ساتوں آسمان اور کرۂ زمین مقناطیس کے ذریعہ خدا کے حکم سے فضا میں معلق ہیں۔ اس مضمون پر اور بہت سے خیالات ظاہر ہوئے ہیں۔

قیاس کا پہلا موجد یعنی اسطرلاب کے ذریعے علم ہیئت کا پہلا دریافت کرنے والا ابنِ ماجد کے قول کے مطابق حضرت ادریسؑ تھے اور انہوں نے وہ اسطرلاب جس میں درجے دکھائے گئے ہیں بنایا تھا۔ متاخرین نے ان درجوں کو اصبع (انگلیوں) میں تبدیل کیا۔ اور اس کا ذکر انہوں نے تانیے کے شہر کے حالات میں کیا ہے۔ ابن شاذان اور اسکے دو ساتھیوں کے اسطرلاب کو ماہرین فن نے جہازرانی کے ضروری آلات میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ اسطرلاب کے ذریعے کواکب کے جو مشاہدات ہوتے تھے تو اُنہیں سے جہاز سمندر میں اپنا راستہ نکالکر چلتے تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل کے زمانے میں بھی یہی حال تھا۔ ہمارے یہ تینوں سابقین یعنی ابنِ شاذان۔ ابنِ ابان اور ابنِ کہلان خلفائے بنی عباس کے زمانے میں گذرے ہیں۔ اور یہی حالات ہیں جو اُنکی لکھی ہوئی تاریخوں میں بیان ہوئے۔

ابنِ ماجد کی کتاب فوائد کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن شاذان، سہل بن ابان اور لیث بن کہلان نہ تو معلم تھے اور نہ وہ علم البحر کے اُستاد اور ماہر تھے اور نہ وہ جہازران تھے۔ بلکہ وہ اعلیٰ درجے کے مولف تھے جنہوں نے فنِ جہازرانی کے متعلق ہدایات تحریر کیں اور کتب منازل لکھیں۔ اُنہوں نے اپنی تالیفات میں اسفارِ بحر کے قصے جمع کر دئے ہیں۔ علاوہ اس بیان کے جو ابن ماجد نے اپنی کتاب "فوائد" میں کیا ہے دو بیانات اور بھی ہیں جو ان تینوں مصنفوں میں سے خاصکر ایک یعنی سہل بن ابان کے ہیں۔ جو بارھویں صدی عیسوی کے

پہلے نصف میں گذرا تھا اور جن اسفار بحر کا ذکر اوپر آیا ہے وہ زیادہ تر اُن ملکوں میں ہوئے تھے جنکو ممالک زیر باد میں شمار کیا جاتا تھا۔ یعنی وہ ملک جو اس بحار ہی سے مشرق میں مغربی ساحل چین سے قریب تھے۔) اس سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان تینوں مصنفوں کی کتابیں صرف اُن ملکوں کے حالات میں ہیں جو ہند اور سندھ ماورا گنگا، جزائر شرق الہند اور چین میں پیش آتے تھے۔ اور یہی حال سلیمان تاجر کی تصنیف کا ہے جو سنہ ۸۵۱ء میں شائع ہوئی۔ سلیمان تاجر کی کتاب کی نظر ثانی مع اضافوں کے ابو زید حسن سے عمل میں آئی۔ یہ واقعہ سنہ ۹۱۶ء ہجری کا ہے۔ ابو زید حسن علم جغرافیہ کا مبتدی تھا۔ اسکی سکونت بغداد میں تھی۔ اور اسی شہر میں بیٹھکر اُس نے جس قدر مواد اسکو قلمی نسخوں میں ملا یا ملاحوں کی زبانی سُنا اُن سب کو یکجا کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابو زید حسن کی طرح ابن شاذان۔ ابن آبان اور ابن کہلان نے بھی یہی کام کیا تھا اور انکے کاموں کا جاری رکھنے والا ابن ماجد اس امر کی طرف خاص طور پر اشارہ کرتا ہے کہ بحری معاملات میں اسکو دوسروں سے اختلاف ہے اور یہ اختلاف اپنے ذاتی تجربے سے پیدا ہوا ہے۔

ابن ماجد لکھتا ہے کہ ابن شاذان۔ ابن آبان اور ابن کہلان نے ایسے شہروں اور بندرگاہوں کا ذکر کیا ہے جو پندرھویں صدی عیسوی میں باقی نہ تھے۔ ان کی کتابوں میں اسمائے مقامات کا حوالہ ہمارے لئے اس وجہ سے مفید ہے کہ چینی اور بطلیموسی جغرافیوں میں جن مقامات کا نام آیا ہے انکی شناخت ہو سکے۔ لیکن اب اس شناخت کے وسائل بھی ناپید ہیں۔ بہر کیف اتنا معلوم رکھنا بھی بڑی بات ہے کہ مقامات کی اس شناخت کے وسائل کبھی موجود تھے۔ مشرق میں سب کچھ ممکن ہے کہ حسن اتفاق سے ان پُرانے مصنفوں کی کتابیں بھی کسی کو دستیاب ہو جائیں اور اسی طرح احمد بن تبرویہ یا خواشیر ابن یوسف الافریقی کی تصانیف بھی کہیں مل جائیں۔ چنانچہ یہی حسن اتفاق تھا کہ کتاب خانہ علوم مشرقی کو مخطوطات شمار ۲۲۹۲ اور ۲۵۵۹ مل گئے۔ اور ایسا ہی اتفاق اِن پُرانے مصنفوں کی کتابوں کے مل جانے کا بھی ہو سکتا ہے۔

ابن ماجد کی کتاب "الفوائد فی علم البحر والقواعد" کا قابل قدر ہونا اُسکی تلخیصات و اقتباسات سے بھی دریافت ہوتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ ابن ماجد کی یہ تصنیف اسکے زیادہ پختہ تجربات کا ثمرہ ہے۔

ابن ماجد کا سال ولادت معلوم نہیں۔ سنہ ۱۴۶۲ء میں جب اُس نے اپنی کتاب الحاویہ لکھی ہے تو اُسکی عمر ۲۵ یا ۳۰ برس کی تھی اگر یہ درست ہے تو جب اُس نے الفوائد لکھنی شروع کی ہوگی تو اُسکی عمر ۵۲ یا ۵۷ برس کی ہوگی۔ اُس نے اپنی نظم "بنات النعش" اور دب اکبر اور دب اصغر پر لکھی ہے جس پر سنہ ۱۴۸۹ء یا سنہ ۱۴۹۰ء تحریر ہے تو ۹ یا ۸ برس کے بعد اپریل سنہ ۱۴۹۸ء میں واسکو دگاما مشرقی ساحل افریقہ پر مقام مالندی میں اپنا بیڑا جہازوں کا لیکر آیا۔ یہاں سے ابن ماجد اس پرتگیزی بیڑے کا معلم بنکر دگاما کے ساتھ ہوا۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسکی تاریخ وفات کیا تھی۔

جیمس پرنسپ لکھتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں ہند اور جزائر مالدیپ میں لوگ ابن ماجد کو یاد کیا کرتے تھے۔ یہی پرنسپ لکھتا ہے کہ ہم کو ایک عربی دوائرے (کمپاس) کی تلاش تھی۔ لیکن جس قدر جہاز تھے ان میں کسی میں بھی یہ چیز موجود نہ تھی۔ آخر کار میرے دوست سید حسن سیدی کو ایک کتاب ملی جو اعمال جہازرانی پر تھی۔ اس میں ایک تصویر عربی دوائرے کی بنی تھی۔ اس کتاب کو لوگ ماجد کتاب کہتے تھے۔ میرے دوست سیدی نے مجھ سے کہا کہ یہ کتاب عربوں کا جان ہملٹن ہے۔ یہ کتاب اُس وقت ایک ناخدا کے قبضے میں تھی۔ سید حسین نے بلا تکلف وہ ورق جس پر تصویر تھی کتاب میں سے پھاڑ لیا۔ کیونکہ پوری کتاب جہاز کا ناخدا دینے سے ڈرتا تھا۔

وجہ یہ تھی کہ اگر کتاب دیدیتا تو وطن پہونچنا اُسکو دشوار ہو جاتا۔

برٹن اپنی کتاب میں جس کا نام "شرقی افریقہ میں پہلا قدم" ہے لکھتا ہے کہ "اتوار کے دن کہا گیا کہ ہمارا سامان روانگی بالکل تیار ہے۔ اور میرے دوستوں نے روانگی سے پہلے سفر میں برکت کے لئے میری پیٹھ پر پاپوش لگائی اور ۲ بجے سہ پہر کو ہم مالا بندر پر پہونچے جو بندر گاہ عدن کا ایک حصّہ ہے اور وہیں کے باشندوں کی کشتیوں کے لئے یہ مقام ٹھہرنے کا مخصوص ہے۔ سب نے ہم کو خدا حافظ کہا اور ہم اس گرم مقام سے جہاز پر بیٹھکر روانہ ہوئے۔ جب پہرے والی کشتی کے قریب آئے تو ہم نے اپنا پروانہ راہ داری دکھایا اور اسکے بعد ہم کھلے سمندر میں داخل ہوئے۔ اب جو ہمارے ساتھ مسلمان ملاح تھے اور باقی سب نے شیخ ماجد کی روح کو ثواب پہونچانے کے لئے فاتحہ پڑھی۔ یہ شیخ ماجد دوائرہ ملاحین کا موجد سمجھا جاتا تھا۔ جب رات شروع ہوئی تو ہم سب جہاز کے عرشے پر ناچنے گانے میں مصروف ہوئے۔ سمندر میں اس وقت مد آیا ہوا تھا اور روشنی میں چاروں طرف موجیں چمک رہی تھیں۔ برٹن لکھتا ہے کہ اس حالت عیش و طرب میں مشرق کے لوگ اگر دائرہ یا کمپاس کی نسبت کوئی قصہ گھڑ لیتے تو ضرور مقام حیرت ہوتا۔ شیخ ماجد کی نسبت لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ملک شام کے ایک ولی اللہ تھے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ قوت بخشی تھی کہ وہ کرۂ ارض کا معائنہ اس طرح کرتے تھے جیسے کہ ایک گیند اُن کی ہتیلی پر رکھی ہو اور وہ اس کا معائنہ کرتے ہوں۔ اکثر لوگ اس امر میں متفق الرائے ہیں کہ دائرہ (کمپاس) شیخ ماجد کی ایجاد ہے۔ بس ایسے شخص کے لئے فاتحہ پڑھنی لوازمات سے تھی۔ اور ہر پرہیزگار مسلمان اب تک ان بزرگوں کے لئے فاتحہ پڑھنی ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن ہمارے پاس اس کا ثبوت موجود ہے کہ شیخ ماجد ولی اللہ نہ تھے۔ بلکہ وہ صرف ایک معلّم تھے جن کا نام ابن ماجد تھا مگر ان کو مسلمانوں کے مشائخ میں کس طرح جگہ مل گئی تو اسکی وجہ ظاہر ہے یعنی یہ کہ علم البحر میں انکی تصانیف پندرھویں صدی سے لیکر اب تک جہازرانی کے معاملات میں بڑی خدمت ادا کرتی رہی ہیں۔ جو لوگ ایسی خدمات عامہ ادا کرتے ہیں مسلمانوں میں ان کا شمار اولیائے کبار میں ہونا ایک معمولی بات ہے۔ ابن ماجد کی اس طرح کی مثالیں مسلمانوں میں بکثرت موجود ہیں۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں میرا دوست اور ساتھی پال اوٹمارے، جس کے مرنے کا سخت افسوس ہے۔ پندرہ برس تک زنجبار اور مسقط میں رہا تھا۔ اس نے ایسے مقامات میں جو جہازرانی کا مرکز تھے، ابن ماجد اور سلیمان المہری کی تصانیف علم البحر پر بہت تلاش کیں۔ مگر وہاں کے عرب ملاحوں نے ان مصنفوں کے ناموں تک سے لاعلمی ظاہر کی۔"

عنایت اللہ

جامِ صہبائی

بادۂ سرکشِ عشق آبِ زندگانی ہو جائے
فردوسِ نشاط و شادمانی ہو جائے!
یہ دورِ شباب و عشق اِک خواب اثرؔ
اے کاش یہ خوابِ جاودانی ہو جائے!

***

اے ساقیِ نوبہار اے حورِ سرشت
اے سروِ روانِ نکہتِ عنبر سرشت
اے میرے ہی نغمہ کا اِک سرعزق مرغ و درخ
اے میری ہی آرزو کی تصویرِ بہشت

***

افلاک پہ ہے سرودِ وابستہ تیرا
ہے سینۂ بحر میں تلاطم تیرا
ہو فصلِ خزاں میں یا تیری فکر خاموش
اور رنگِ بہار سے تبسم تیرا

***

وہ کیف و سرور اب کہاں سے لاؤں
وہ عشق کا نور اب کہاں سے لاؤں
روشن تھی یہ کائنات جس سے ہمدم
وہ شعلۂ طور اب کہاں سے لاؤں

اثرؔ صہبائی

تبصرہ

سحر کی طرح خنک اور جانفزا ہو تم | کہ اک مجسمۂ نکہت و ضیا ہو تم
مرے شباب کی شیریں و مست راتوں کا | کوئی سرودِ دل آویز و جانفزا ہو تم
گھنی بھویں ہیں تمہاری دراز پلکیں ہیں | کسی حسین مصوّر کی التجا ہو تم
تمہارے نازک و باریک لب ہیں پرتوِ مے | طلوعِ ماہ سے پوچھوں گا میں کہ کیا ہو تم
تمہاری آنکھوں سے یوں جھانکتی ہے موسیقی | کہ جیسے جسم کے بربط میں اک نوا ہو تم
یہ ایک لمحہ تمہارا ہے زندۂ جاوید | اس ایک لمحے میں آئینۂ بقا ہو تم
اس ایک لمحے میں آئینۂ بقا ہو تم | اس ایک لمحے میں دُنیا سے ماورا ہو تم

لپٹ رہی ہیں نگاہیں تمہارے قدموں سے
میں کیا بتاؤں تمہیں جانِ من کہ کیا ہو تم .

بسلسلۂ ماسبق

دلّی کا ایک باکمال ناولسٹ

مولوی صاحب کے ناولوں کی خصوصیت

طرز قدیم کے قصوں اور دورِ جدید کے ناول پر ایک سرسری نظر سطور بالا میں ڈالی جا چکی ہے اب یہ دیکھنا مقصود ہے کہ موجودہ ناول نگاری اور خاص کر مولوی صاحب کے ناولوں کی عام خصوصیات کیا ہیں۔ ہر ناول میں سات باتیں دیکھی جاتی ہیں۔ (۱) موضوع بیان (۲) پلاٹ (۳) مکالمہ (۴) اشخاص قصہ یا کردار نگاری (۵) مقصد (۶) اسلوب بیان اور (۷) طوالت۔ اور انہی پر ایک ناول کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے۔ گو بعض ناقدان ادب نے آخرالذکر بات کو ضروری اور اہم خیال نہیں کیا ہے لیکن ہم ان سے اتفاق نہیں۔ بلکہ ہمارے خیال میں قصہ کی طوالت اسکے مقبول عام و خاص ہونے پر بہت بڑی حد تک اثرانداز ہوتی ہے۔ ناول تفریح کے لئے پڑھا جاتا ہے اب اگر کوئی ناول اس قدر طویل ہے کہ اسکے پڑھنے کیلئے ایک مدت درکار ہو تو قاری اسکی طرف بہت کم متوجہ ہوتا ہے اور اکثر مصروف ہستیاں تو طویل ناولوں سے نفرت کرتی ہیں۔ اس سے میری صرف یہ مراد ہے کہ کسی قصہ میں فضول اور دور از کار باتوں کو زبردستی ٹھونس کر یا جو بات دو لفظوں میں پوری طرح بیان ہو سکے اُسے ایک صفحہ میں بیان کر کے ناول کو فضول طول دیدیا جائے، ایسا ناول ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا، بلکہ اسے ناول موسوم کرنا بھی مناسب نہیں۔ مثال کے طور پر "فسانۂ آزاد" کو لیجئے، یہ کتاب شیطان کی آنت کی طرح اس قدر ضخیم ہے کہ ایک گدھے کا بوجھ ہے اور سرشار نے اس میں نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ فضول اور غیر متعلق باتیں لکھدی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ "فسانۂ آزاد" آجکل صرف لائبریریوں یا کتب فروشوں کی الماریوں میں نظر آتا ہے، اور عام ناول پڑھنے والوں کے ہاتھوں میں بہت کم دیکھا جاتا ہے، اسکی طوالت نے اسکی دلچسپی پر ضرب کاری لگائی ہے اور قاری پڑھتے پڑھتے اس قدر تھک جاتا ہے کہ پھر کبھی اسکی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ہے اور اسی وجہ سے "فسانۂ آزاد" بھی "طلسم ہوشربا" اور "بوستان خیال" کی طرح اب بازار سے ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اسکے برخلاف دورِ موجودہ کے ناول صرف اس قدر طویل ہوتے ہیں کہ قاری اُن کا آسانی اور دلچسپی سے مطالعہ کر لیتا ہے۔

مذکورۂ بالا باتوں کے علاوہ سلاست تحریر بھی ناول کی کامیابی پر بہت حد تک اثرانداز ہوتی ہے۔ ناول نویس کے لئے یہ لابدی ہے کہ اپنی کہانی بالکل سادہ اور سلیس عبارت میں تحریر کرے، فلسفیانہ اور ثقیل پیدا کرنے والی ترکیبوں سے پہلوتہی کرتا رہے اور اپنی تحریر میں اس قدر جاذبیت اور واقعات میں اس قدر ربط پیدا کرے کہ نہ صرف قاری کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لے، بلکہ اُس کو مجبور کر دے کہ وہ دُنیا و مافیہا سے بیخبر ہو کر ناول کے مطالعہ میں مصروف ہو جائے، اگر کسی ناول میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں، تو وہ ناول کامیاب کہے جانیکا مستحق ہے۔ مولوی صاحب کے ناولوں میں یہ دونوں وصف بدرجۂ کمال موجود ہیں۔

یہ تو آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ عشقیہ، جاسوسی یا ظریفانہ ناول لکھنے کے مقابلہ میں اخلاقی اور اصلاحی ناول لکھنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ عشقیہ جاسوسی یا ظریفانہ باتیں ہمیشہ دلچسپ ہوتی ہیں۔ ان میں تھوڑی سی احتیاط سے بے انتہا جاذبیت پیدا کی جا سکتی ہے لیکن اصلاحی اور معاشرتی ناول لکھنا درحقیقت ایک ایسی تلخی ہے جسکا حلق سے نیچے اتارنا دنیا پیش نظر ہوتا ہے اور اس صنعت کا ناول نگار اُس وقت تک کامیاب ناول نویس نہیں کہا جا سکتا [illegible] جاذبیت اور دلچسپی پیدا نہ کرے۔ مولوی صاحب نے اس سنگلاخ زمین میں قدم رکھا ہے

اور طرز قدیم سے ہٹ کر بالکل جدید طریقہ پر روزمرہ کے واقعات لیکر زبان اور حسن ترتیب کی یکجائی سے وہ جاذبیت پیدا کردی ہے جو ایک کامیاب ناول میں ہونی چاہیئے، اور یہی وہ خصوصیت ہے جو مولوی صاحب کے تمام ناولوں میں نمایاں ہے اور صرف اسی لئے مولوی صاحب کے ناول عوام الناس ذی ناتھوں ہاتھ لئے، اور یہی وہ خصوصیت ہے جو مولانا نذیر احمد صاحب کے ناولوں میں پائی جاتی ہے اور مولوی بشیر الدین احمد کو ورثہ میں ملی ہے۔ اگر آپ "مراۃ العروس" "بنات النعش" "اقبال دلہن"۔ "حسن معاشرت" وغیرہ کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان ناولوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زبان کی عمدگی اور طرز بیان کی دلنشینی کی وجہ سے عبرت انگیز واقعات اور نصیحتیں ہر واقعہ کے ساتھ ساتھ ذہن نشین ہوتی چلی جاتی ہیں اور پڑھنے والا موضوع کی بے نمکی سے نہیں گھبراتا اور پھر یہ کہ پورے واقعہ میں کوئی چیز ایسی نہیں آتی جو کسی حیثیت سے نوجوان طبقہ کے احساسات پر بُرا اثر ڈالے۔

پلاٹ پلاٹ کو عموماً ناول کی جان یا روح کہا جاتا ہے، ہڈسن HUDSON نے پلاٹ کی اس طرح تعریف کی ہے کہ "وہ واقعات جو اشخاص قصہ کو پیش آئیں، اور وہ افعال جو ان سے سرزد ہوں، بحیثیت مجموعی پلاٹ کہلاتے ہیں" مگر مشہور امریکن افسانہ نگار اڈگر ایلن پو کا خیال ہے کہ جاذبیت اور دلچسپی کے علاوہ واقعات میں لگاؤ اور تعلق ہونا ضروری ہے۔ اب اگر ان قیود اور تعریفوں کے لحاظ سے مولوی بشیر الدین احمد کے ناولوں کو جانچا جائے تو مولوی صاحب کے ناول کسی طرح کسی ناول سے پیچھے نہیں رہینگے۔ ان کے ناولوں میں بھی ان کے اشخاص قصہ سے حرکات و افعال سرزد ہوتے ہیں ان کو زندگی کے طرح طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ اسی لئے ہڈسن کی تعریف کے مطابق پلاٹ تو یہیں پورا ہوگیا اب رہی دلچسپی وہ اس سے ظاہر ہے کہ مولوی صاحب نے یہ ناول صرف اس لئے لکھے تھے کہ لڑکیوں کے لئے دلچسپ اور مفید لٹریچر پیدا کیا جائے، اندریں حالات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ناول کس قدر دلچسپ ہونگے، اور قاری کی توجہ کو کس حد تک جذب کرلینگے۔ اکثر نامور ناول نویسوں نے بھی ایسے ناول لکھے ہیں جن کے پلاٹ کا ارتقاء غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مولوی صاحب کے ناول اس سقم سے مبرّا ہیں۔ ان کے ناولوں کو پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ واقعات خود بخود پیدا ہو رہے ہیں، اور جو افعال و حرکات اشخاص قصہ سے سرزد ہوتے ہیں وہ ارادتاً نہیں ہوتے بلکہ بالکل فطری ہیں۔

مولوی صاحب کے ناولوں کے پلاٹ سرزمین دہلی سے تعلق رکھتے ہیں جن میں مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور معیشتی واقعات کو یکجا کردیا ہے انہوں نے مروجہ رسومات کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا ہے اور باریک سے باریک بات بھی تحریر کرنے میں خاص احتیاط سے کام لیا ہے مولوی صاحب نے پہلے واقعات کا انتخاب کرلیا ہے اور پھر انکی موزونیت کے لحاظ سے کردار کو بھی اپنے وجود میں لے آئے ہیں۔ ہم طوالت کے خوف سے اس جگہ صرف "اقبال دلہن کا پلاٹ بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

"اقبال دلہن" کا پلاٹ نہایت منظم ہے، واقعات ترتیب کیساتھ بیان کئے ہیں۔ ناول کا ہیرو اقبال مرزا ہے، اور اسی کے حالات زندگی بیان کئے ہیں، ناول کی ابتداء اقبال مرزا کے خاندانی حالات سے اور ہیرو کی زندگی کا آغاز تعلیم سے کیا گیا ہے، طرز قدیم اور طرز جدید علیگڈھ اور ولایت کی تعلیم کا نقشہ کھینچکر دکھایا ہے، شادی کی چھیڑ چھاڑ، دلہن کی تلاش، منگنی، جہیز کی تیاری، دولہا والوں کی تیاری۔ مائیوں بیٹھنے کی جملہ رسومات، سانچق، بارات، جہیز، دلہن کی رخصت کا نظارہ۔ وغیرہ، پھر خانگی حالات، میاں بیوی کے تعلقات پر مسبوط اور مفصل تبصرہ، باہمی محبت، بیوی کی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری، میاں کے دل پر قبضہ کرلینے کا مفصل حال تحریر کرکے انہوں نے ایک نئے باب کی ابتدا کی ہے یعنی۔ پہلی بیوی کے لاولد ہونے اور باوجود انتہائی علاج و معالجے کے اولاد سے محروم رہنے کے سبب سے نکاح ثانی کی چھیڑ چھاڑ۔ دوسرا نکاح، سوکنوں کا باہمی برتاؤ۔ وغیرہ واقعات کی مناظر کشی کی ہے۔ اس ناول میں وہ سین بیحد دردناک ہے جہاں دکھایا ہے کہ اقبال مرزا کی پہلی بیوی کو جب علم ہوا کہ اسکے شوہر نے نکاح ثانی کرلیا ہے تو اسے باوجود صابر ہونیکے جو صدمہ ہوا ہے۔ اسے اس دردناک پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ پتھر کا دل رکھنے والا انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے، مولوی صاحب نے عقد ثانی کے جواز کیساتھ

"SAQI"



مولوی بشیر الدین احمد دہلوی مرحوم

Calcutta Art Press, Delhi.

اُسکی مشکلات کو جس انداز سے واضح کیا ہے وہ ایک کامیاب اور وسیع النظر ادیب ہی کر سکتا ہے اُنہوں نے اس ناول میں اقبال مرزا کو ایک روشن خیال اور تعلیمیافتہ لیکن سعادتمند اور فرمانبردار بیٹے کی حیثیت سے پیش کیا اسکے برخلاف اقبال مرزا کی والدہ بیگم صاحبہ کو مولویانہ خیالات کی عورت دکھایا ہے۔

"اقبال دلہن" کے پلاٹ کی ایک بہت بڑی خوبی جاذبیت ہے۔ اس میں ان تینوں عناصر کو جنکا مقاصد ناول کے زیرعنوان ذکر کیا ہے نہایت موزونیت اور ضرورت کے مطابق یکجا کر دیا ہے۔ ان میں بے ربطی کا پہلو کہیں پیدا نہیں ہونے پاتا "اقبال دُلہن" میں جو انتہائی جاذبیت موجود ہے اُسکی وجہ ترتیب واقعات بھی ہے، مولوی صاحب کو اس میں خوب مہارت حاصل تھی وہ واقعات کو اس طرح ایکدوسرے سے وابستہ کرتے چلے جاتے ہیں کہ کہیں کوئی خامی باقی نہیں رہتی۔ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتے ہیں، اُنہوں نے اپنے ناولوں کے پلاٹ کی تشکیل پر انتہائی کوشش کی ہے، اسکے ساتھ ہی اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ تمام واقعات ایک ہی طرز اور ایک ہی پیرایہ میں بیان نہ کئے جائیں، بلکہ موقع و محل کے لحاظ سے اسلوب بیان کو برابر تبدیل کرتے چلے گئے ہیں۔ دراصل اُنہوں نے یہ خوب سمجھ لیا تھا کہ ناول کے حُسن اور اسکی کامیابی کا راز صرف اس نکتہ میں مضمر ہے کہ حسب موقعہ واقعات کو اہمیت دی جائے، چنانچہ اُنہوں نے واقعات کے انتخاب میں خاص احتیاط سے کام لیا ہے۔

اشخاص ناول

ایک ناول میں مختلف طبیعتوں اور مختلف چال چلن کے اشخاص کا حسب موقع ذکر کیا جاتا ہے۔ ان میں بعض مستقل حیثیت رکھتے جن کے گرد ناول کے واقعات کو یکجا کیا جاتا ہے۔ اُن کو ہیرو، و ہیروئن کے نام سے پکارا جاتا ہے وہی ناول اور پلاٹ کا مرکز ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر ان کو قصہ سے علیحدہ کر لیا جائے تو اسکی اہمیت اوراقِ پریشاں سے زیادہ نہیں رہتی تسلسل اور ربط بھی قائم نہیں رہتا اسکی وجہ یہ ہے کہ ناول کے ہر واقعہ کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے ضرور تعلق ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ہر ناول میں ایسے اشخاص بھی ضرور ہوتے ہیں جو محض وقتی ہوتے ہیں جو وقت پر اپنا پارٹ ادا کر کے غائب ہو جاتے ہیں اور پھر قصہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر "اقبال دلہن" میں اقبال مرزا کی والدہ کے پارٹ پر غور کیجئے، گو بیگم صاحبہ کا اصل واقعات سے بہت کم تعلق ہے لیکن قصہ کے لئے ان کا وجود نہایت ضروری اور لازمی ہو گیا ہے (وہ اشخاص جن کو اس ناول میں خاص اہمیت دیگئی ہے۔ اقبال مرزا اور اسکی پہلی بیوی ہیں، یہی دونوں اس ناول کے ہیرو اور ہیروئن ہیں، مولوی صاحب نے اقبال مرزا کو بحیثیت ایک تعلیمیافتہ اور سعادتمند شریف زادے کے پیش کیا ہے، جو جوہر تعلیم سے آراستہ ہونیکی وجہ سے اسے معیوب و مذموم رسومات سے فطری طور پر نفرت تھی لیکن اسکی شرافت اور سعادتمندی اس بات کی اجازت نہیں دیتی ہے کہ انکی اعلانیہ مخالفت کر کے اور دلیلوں کی ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیکر اپنی معمر والدہ کا دل دکھائے۔ گو اقبال مرزا دبی زبان سے ان معیوب رسومات کی مخالفت ضرور کرتا ہے لیکن پھر بھی اپنی والدہ کے زیر حکم ان سب کو با دلِ نخواستہ ہی سہی برداشت کرتا ہے اور شادی کے لبعد جب اس کا ایک نئی عورت سے جو اسکی بیوی بنجاتی ہے واسطہ پڑتا ہے تو وہ اسکے ساتھ شریف زادوں کا سا سلوک کرتا ہے اور اپنی بیوی کی اطاعت شعاری اور وفاداری سے متاثر ہو کر اسکا عاشق بن جاتا ہے، گو شادی کے دس برس بعد تک وہ اولاد سے محروم رہتا ہے اور گو اُسے فطری طور پر اولاد کی تمنا ہوتی ہے وہ بے اولادی کے غم میں دن رات گھلتا ہے، لیکن اسکی شرافت اور سعادتمندی اجازت نہیں دیتی کہ اس تمنا کو پورا کرنے کیلئے نکاح ثانی کر کے اپنی محبت کرنے والی اور لونڈیوں اور باندیوں کی طرح خدمت کرنے والی بیوی کا دل دکھائے گو اسکے دوست اور خویش و اقارب اور یہانتک کہ خود اسکی بیوی اسے دوسری شادی کر لینے کی ترغیب دیتی ہے لیکن وہ اس جنجال اور مصیبت کا بار اُٹھانے سے گھبراتا ہے لیکن آخر ایک انسان ہونے کی وجہ سے عزیزوں کے بیحد مجبور کرنے پر جب نکاح ثانی کر لیتا ہے تو پھر بھی وہ یہی کوشش کرتا ہے کہ اسکی طرف سے کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے اسکی پہلی بیوی کو رنج اور تکلیف پہنچے اور اسی لئے وہ اس قدر محتاط رہتا ہے کہ ایکسال تک اقبال دُلہن کو معلوم نہیں ہونے پاتا کہ کوئی اور بھی اسکے شوہر میں برابر کا شریک ہو گیا ہے اور آخر جب بھانڈا پھوٹ ہی جاتا ہے تو بھی وہ اپنے قول و فعل سے بڑی دلہن کے مصائب میں اضافہ

نہیں کرتا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی دوسری بیوی کو اپنے گھر تک نہیں لاتا ہے اور نکاح کے دو سال بعد جب چھوٹی دلہن کے ہاں بچہ پیدا ہونے کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں، اور پہلی بیوی خود ہی اقبال مرزا کو اجازت دیدیتی ہے تو وہ اپنی دوسری بیوی کو اپنے گھر لاتا ہے لیکن اس حالت میں پہلی بیوی کیساتھ اسکی محبت اور نیک سلوک میں کوئی فرق نہیں آتا ہے، اس سے زیادہ صحیح کردار نگاری اور کیا ہو سکتی ہے؟

اقبال دلہن کا کردار دکھلاتے وقت بھی مولوی صاحب نے اس بات کی خاص احتیاط کی ہے کہ کہیں کوئی بات ایسی تحریر نہ ہو جائے جو قاری پر (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) کوئی برا اثر کرے۔ گو اقبال دلہن کو اسکے والدین نے ایک غیر اور اجنبی مرد کے اسکی صلاح کے بغیر ہی حوالہ کر دیا تھا۔ اور گو وہ خدا کے فضل سے حسن ظاہری سے آراستہ تھی لیکن وہ حسینوں کی طرح مغرور اور سرکش نہ تھی گو وہ ایک متمول ماں باپ کی بیٹی تھی، اور اسکا شوہر بھی دنیاوی دولت سے مالا مال تھا لیکن آفرین ہے اس پر کہ اس نے ہاتھ پیر توڑ کر اپاہجوں کی طرح زندگی بسر کرنی پسند نہ کی سسرال آتے ہی سب سے پہلے ساس اور نند کے دلوں میں گھر کیا اور انکی خدمت گذاری کر کے ان کو اپنا پرستار بنا لیا۔ اور اسکے بعد جب وہ اقبال مرزا کیساتھ پردیس چلی گئی تو اس نے اپنے شوہر کی اس حد تک خدمت کی کہ اقبال مرزا اسکا شیدا ہو گیا مگر افسوس قدرت کاملہ نے اسے اولاد جیسے بیش بہا عطیہ سے محروم رکھا۔ گو اقبال مرزا نے بظاہر اس امر کی کبھی شکایت نہیں کی لیکن اقبال دلہن کو ہر وقت یہ فکر ستاتا تھا جو ایک بانجھ عورت کو ہوتا ہے اور اسلئے دو پردہ حکیموں، ڈاکٹروں اور ملا سیانوں سے اپنا علاج کرایا کرتی تھی اور اسی وجہ سے اس نے اپریشن اور فصد وغیرہ کی تکالیف خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔

اقبال دلہن صابر اور اپنی تقدیر کے لکھے پر شاکر تھی لیکن اولاد کی تمنا کچھ ایسی ہوتی ہے کہ کوئی انسان اس خواہش سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا لیکن جب وہ اس طرف سے بالکل مایوس ہو گئی تو اس نے شریف بیویوں اور دور اندیشوں کی طرح خود ہی اقبال مرزا کو دوسری شادی کر لینے کی ترغیب دی اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس کا یہ کہنا صرف ظاہری نہ تھا کیونکہ دنیا میں ایسی عورتیں نہ ہونے کے برابر ہیں کہ جو سوکن کے خیال کو بغیر متاثر ہوئے بھلا دیں اور یہی وجہ ہے کہ جب اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اسکے پرستار شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے تو اسے اس قدر رنج ہوا کہ وہ غش کھا کر گر پڑی اور اس قدر بیمار ہو گئی کہ کئی ماہ تک بستر پر پڑی رہی لیکن پھر بھی وہ اپنی عقلمندی اور دور اندیشی کی مدد سے اپنی حالت سنبھالنے میں کامیاب ہو گئی، دوسری کوئی عورت ہوتی تو میاں سے دست و گریباں ہو جاتی اور نہیں معلوم کیا کیا پاکھنڈ مچاتی مگر اللہ رے صبر اور واہ رے ضبط کہ زبان سے اف تک نہ کی لیکن بعد جب اسکی حالت کسی قدر سنبھل گئی اور رنج کم ہو گیا تو اسے صبر و شکر کی برکات پر وعظ سنایا گیا جسکا اسکے دل پر ایسا اچھا اثر ہوا کہ وہ سوکن کے رنج و غم کو بالکل بھول گئی۔ خدا ترسی اس کا شعار ہو گیا اس نے اپنے شوہر کو بلا کر اس سے صلح صفائی کی اور پھر اپنی سوکن کو گھر بلایا اور اسکے ساتھ ایسا اچھا اور نیک سلوک کیا کہ دونوں میں سدا سے دانت کاٹی روٹی تھی اور دونوں کی یہی متفقہ کوشش تھی کہ کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے بدنامی ہو یا شوہر کو تکلیف پہنچے یا آپس میں فضیحتی ہو، اسلئے وہاں نہ روز روز کی جھک جھک پٹ پٹ تھی نہ تو تو میں میں اور نہ جوتیوں میں دال بٹتی تھی اب آپ ہی غور کریں کہ یہ عورت کی فطرت اور شریف بیویوں کی کیسی عمدہ تصویر ہے۔

ان دونوں کے بعد بیگم صاحبہ (والدہ اقبال مرزا) کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے وہ بھی بہت عقلمند اور دور اندیش عورت تھی لیکن چونکہ وہ تعلیم یافتہ اور تہذیب جدیدہ سے شناسا نہ تھی اس لئے اسکے خیالات اور احساسات فرسودہ اور مولویانہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ جب اقبال مرزا تعلیم پانے کی غرض سے ولایت گیا تو اسے حد سے زیادہ رنج و فکر ہوا یہ بھی صحیح ہے کہ اسکی مامتا بھی ایک حد تک اس جذبہ کی ذمہ دار تھی لیکن اگر وہ تعلیم یافتہ ہوتی تو اس کا رنج و فکر یقیناً یہ صورت اختیار نہ کرتا۔ اور بیاہ شادی کے وقت جو فضول خرچیاں روا رکھیں اور جن بیہودہ رسوم پر عمل کیا وہ بھی اسکی جہالت اور قدامت پرستی کا لازمی نتیجہ تھیں۔

مکالمہ اشخاص قصہ کا کرداری ارتقاء اور پلاٹ کی کامیابی و دلچسپی کا انحصار ایک بڑی حد تک مکالمہ پر ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ ذریعہ ہے جسکے وسیلہ سے ہم اصل قصہ اور اشخاص قصہ سے روشناس ہوتے ہیں اور ہمیں ان کے کردار اور انکے افعال کے متعلق علم ہوتا ہے، اسکے علاوہ مکالمہ سے ناول میں ڈرامہ کا لطف آنے لگتا ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہماری زبان میں مولانا نذیر احمد نے سب سے پہلے صحیح معنوں میں مکالمہ کی ابتدا کی۔ یہ صحیح ہے کہ ان سے پیشتر بھی اردو میں قصے اور کہانیاں قلمبند کیگئی تھیں لیکن ان میں مکالمہ سے کسی گفتگو یا واقعہ کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا۔ گو مولانا حالی نے اردو میں مکالمہ کی ایجاد کا سہرا مرزا غالب کے سر باندھا ہے لیکن ناول نگاران اُردو میں اس بدعت کی ابتدا کا افتخار مولانا نذیر احمد ہی کو حاصل ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ وہ ہمیں بہت بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ ناول نگار قصہ کو طول دینے کی غرض سے مکالمہ کو استعمال کرتا ہے لیکن اس فن میں کامیاب ہونیکے لئے اس بات کی احتیاط رکھنا نہایت ضروری ہے کہ گفتگو میں بے مطلب باتیں شامل نہ ہو جائیں چنانچہ مولانا نذیر احمد ہر موقعہ پر اس امر کا خیال رکھتے ہیں، اور فضول اور غیر متعلق باتوں کو نظر انداز کرتے جاتے ہیں

مولوی بشیر الدین احمد کو بھی اس سلسلہ میں فراموش نہیں کیا جاسکتا اُنہوں نے مولانا نذیر احمد کے مکالمہ کو چار چاند لگا دئے ہیں واقعات کے بیان کرنے میں اپنے والد بزرگوار کے خاص انداز کو ملحوظ رکھا ہے اور یہ بات اُن کے ہر ناول سے ظاہر ہے، اُن کے مکالمے اس قدر دلچسپ ہوتے ہیں اور قصہ میں اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کو ان سے علیحدہ کرلیا جائے تو کم از کم قصہ کا وہ جزو بالکل بیکار ہو جائیگا۔

اس جگہ ہم "اقبال دُلہن" میں سے مکالمے کا ایک نمونہ درج کرتے ہیں۔ یہ گفتگو اقبال مرزا اور اُسکے ایک دوست کے درمیان اس وقت ہوئی جب کہ اقبال مرزا لاولدی کے غم سے نڈھال تھا اور بیوی کا علاج و معالجہ کر کے مایوس ہو چکا تھا۔ دوست احباب اُسے دوسری شادی کر لینے کا مشورہ دیتے تھے لیکن وہ اس مصیبت اور جنجال میں دیدہ و دانستہ گرفتار ہونے سے گھبراتا تھا اور گو اولاد کی تمنا اسکی دیگر خواہشات پر غالب تھی لیکن اسکا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے اپنی نہایت شریف اور خدمت گذار بیوی کی چھاتی پر مونگ دلنے کو لئے سوکن لے آئے۔

اقبال :- اچھا فرض کرو کہ دل سخت کر کے تمہارے کہنے کے موافق میں نے دوسری شادی کر بھی لی لیکن اگر اس سے بھی بال بچہ نہ ہوا تو پھر بتاؤ کہ کیسی گت بنے گی؟

دوست :- نہ ہوا تو مرضی خدا کی۔

اقبال :- تو پھر اس بچاری کا حشر؟

دوست :- حشر یہ کہ چھوڑ چھاڑ الگ کرنا۔

اقبال :- چہ خوش، ع بریں عقل و دانش بباید گریست، کسی شریف زادی کو میں اپنے نکاح میں لاؤں اور اس سے اولاد نہ ہو تو اُسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں کہ وہ دربدر بھیک مانگے یا یہ کہ دوسرا نکاح کرلے تو فرمائیے کہ ناک کسکی کٹے گی اور خدا کو میں کیا جواب دوں گا؟ اور اگر اسی نیت سے نکاح کرنا ہو تو بس اولاد بھی ہو چکی، جیسی نیت ویسا پھل، انما الاعمال بالنیات۔

دوست :- اچھا تو پھر کوئی ماما ڈال لو، کم خرچ بالا نشین۔

اقبال :- نورٌ علےٰ نور، یہ اس سے بھی عمدہ صلاح ہے مگر اس سے اولاد ہو گئی تو ذات برادری میں رذیل اور نکو بنے گی، پھر ایسی اولاد سے فائدہ؟ کیا ایسی ہی اولاد سے نام چلے گا؟ ایسا ہی ہے تو پھر کسی کا بچہ لیکر کیوں نہ پال لوں۔

دوست :۔ ارے میاں اپنی اولاد کی اور ہی بات ہوتی ہے ۔ قدر بابا آں زماں دانی کہ خود بابا شوی ، دوسرے کا بچہ لیکر پالنا تو ایسا ہی ہے جیسے مرغی کے تلے انڈوں کی جگہ پتھر بٹھائے جائیں ۔ ہر کس راعقل خود بکمال و فرزند خود بہ جمال ۔

اقبال :۔ یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں بس سمجھ گیا پیاس بجھتی ہے تب ہی تو آجتک میں نے کسی کا بچہ نہیں لیا ورنہ ہمارے کنبے میں بہت سے بچے موجود تھے ۔

دوست :۔ پھر بھائی تم کو کسی طرح چین نہیں کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ۔ اور کیوں آنے لگی ۔ تم تو جورو کے غلام ہو عجب نہیں کہ تم انہیں سجدہ بھی کرنے لگو ۔

اقبال :۔ غلام ہونے کی اس میں کیا بات ہے ، جناب اطاعت اور فرمانبرداری اور ملنساری وہ چیز ہے کہ جنگل کا درندہ جانور رام ہو جاتا ہے ، میں تو بے چارہ انسان ہوں جس شخص نے ہمارے ساتھ جان لڑادی ہو اپنی جان کو جان نہ سمجھا ہو ، اپنا آرام و چین ہم پر قربان کر دیا ہو ، اپنا گھر دار ، ماں باپ سب کو ہمارے واسطے چھوڑا ہو ، جو دیس بدیس ہمارے ساتھ پھرے ، غرض یہ کہ ہماری رنج و راحت کی شریک اور ہماری سچی ہمدرد و غمگسار ہو اسی کے ساتھ ہم یہ سلوک کریں ۔ تف ہے ہماری انسانیت پر ۔

دوست :۔ تمہاری وہی کہاوت ہے ۔

حکم زوجہ بہتر از حکم خدا است   انچہ زوجہ حکم فرماید رواست

ہم نے تو ایک صلاح کی بات کہی اور جس سے پوچھو وہ یہی کہے گا اور ہم دکھلا دینگے کہ یہی ہو کر رہیگا ۔ اور یہی ہونا بھی چاہیئے مگر تم تو بال کی کھال نکالتے ہو ۔ میں نے کئی جگہ دیکھا ہے کہ دوسرے نکاح کے ساتھ ہی اولاد ہو گئی بلکہ بعض جگہ تو پہلی بیوی سے بھی بچہ ہو گیا ۔ چپڑی اور دو دو

اقبال :۔ اور بعض جگہ ایک سے بھی نہ ہوا الٹی آنتیں گلے پڑیں ۔

دوست :۔ یہ دوسری بات ہے مگر اپنی طرف سے تو تدبیر کرنی چاہیئے ، آگے تقدیر ۔

یہ ہے اقبال مرزا کا انداز گفتگو ۔ اس کے ایک ایک لفظ سے اخلاق شرافت ، انسانیت اور ہمدردی ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے دیکھیئے باتوں ہی باتوں میں اخلاق اور شرافت کی کس قدر ٹھوس تعلیم دی ہے اور کیسے دلنشین اور موثر انداز میں ۔ مولوی صاحب کے تمام ناولوں میں یہ خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے کہ اشخاص قصہ تمامتر نہایت موزوں اور مکمل گفتگو کرتے ہیں جو کردار کو ذہن نشین ہونے میں بہت مدد دیتے ہیں ۔

تعلیم اور فلسفہ تعلیم کے متعلق "مقاصد" کے زیر عنوان بہت کچھ لکھا جا چکا ہے یہ ناول شریف گھرانے کی لڑکیوں کے لئے لکھے گئے تھے اس لئے ان میں وہ عیوب چن چن کر بتلائے گئے ہیں جو وہاں عام طور پر مروج تھے ۔ نہ تو ان میں غیر مہذب اور سوقیانہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور نہ کوئی ایسی بات بھول کر بھی تحریر کی ہے جس سے ہمارے اخلاقی احساسات کو صدمہ پہنچے ۔ مولوی صاحب نے اشخاص قصہ کے کردار میں استقلال دکھایا ہے ۔ وہ بڑی سے بڑی تکلیف پڑنے پر بھی جان دینے کیلئے آمادہ نہیں ہو جاتے ہیں ۔ صبر ایک ایسی چیز ہے جو "اقبال دلہن" کی ہیروئن کے کرداری ارتقاء کا جزو لازمی ہے ۔ وہ ہر قسم کی تکالیف اپنے اوپر برداشت کرتی ، یہاں تک کہ جب اسے اپنے پرستار شوہر کے نکاح ثانی کی خبر ملتی ہے تو اسے صدمہ ضرور ہوتا ہے جو ایک فطری امر ہے مگر وہ اف تک بھی نہیں کرتی ۔ اقبال مرزا اور اسکی دلہنوں کے کردار اس قدر زبردست ہیں کہ ہر شریف انسان انکی پیروی کر لیے اپنا دین و دنیا دونوں سنوار سکتا ہے چند ایک مشہور ناول نگاروں کو چھوڑ کر اردو کے عام ناول نگاروں میں

یہ عیب بہت نمایاں ہے کہ ان کے کیرکٹروں میں ہمواری اور یکرنگی نہیں۔ وہ دوران قصہ میں بے شمار رنگ بدلتے رہتے ہیں وہ وقتی ضروریات کو مدّنظر رکھتے ہیں اور کیرکٹروں کے خصائص ان کے ذہن میں قائم نہیں رہتے۔ اسی سبب سے وہ اس میدان میں بُری طرح ناکام رہتے ہیں۔ فطری بے صبری اور جلد بازی کی وجہ سے ان کا رہوار قلم سرپٹ دوڑنے لگتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انکی فکر میں قوتِ پرواز نہیں رہتی اور وہ بیہودہ اور غیر متعلق باتیں لکھنے لگتے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب کے ناول ان جملہ عیوب سے پاک و صاف ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنے ناولوں میں اپنے گھریلو حالات قلمبند کئے ہیں، اور عملی زندگی سے مواد لیا ہے۔

اسلوب بیان مولوی بشیر الدین احمد نے اپنے ناول کچھ ایسے دلچسپ پیرایہ میں لکھے ہیں کہ اکثر مقامات پر مولانا نذیر احمد کی تحریر ہونیکا دھوکہ ہوتا ہے۔ شرفائے دہلی کی زبان پر انہیں پُورا عبور حاصل تھا اور یہی زبان اُنہوں نے اپنے ناولوں میں استعمال کی ہے۔ عبارت کو موزوں اور برجستہ اشعار سے رنگین کر دیا ہے۔ محاورات، ضرب الامثال، اور انگریزی و عربی و فارسی کے الفاظ بے تکلف استعمال کئے ہیں۔ جن کی وجہ سے کہیں کہیں فصاحت اور روانی پر ضرب آگئی ہے مولوی صاحب کی تحریر میں ایک لطف یہ ہے کہ حسب موقعہ زبان بھی بدلتی جاتی ہے جہاں انگریزی نصاریٰ ہیں اس جگہ انگریزی الفاظ کی بھرمار ہے اور جب مولویوں کی باتیں لکھی ہیں تو عربی فقرات استعمال کئے ہیں جنکی وجہ سے سین بالکل فطری معلوم ہوتا ہے مثال کے طور پر اقبال دلہن میں جب علیگڈھ اور لندن کی فضا کی مناظر کشی کی ہے تو اس قدر انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں جو وہاں عام طور پر بولے جاتے ہیں۔ اور جب اقبال مرزا نے ایک مولوی کی لڑکی سے شادی کرنے کے معاملہ میں اقرار نامہ لکھنے سے انکار کر دیا تو اس مولوی نے بطور انتقام کفر و الحاد کا فتویٰ اقبال مرزا کے خلاف دیا ہے تو فتوے کی عبارت میں اگر وہ عربی فقرات نہ دیتے تو وہ غیر فطری معلوم ہوتی، چماروں اور نیچ قوم کی زبان سے انہی کی زبان بلوائی ہے اس مختصر مضمون میں اس قدر گنجائش نہیں کہ طول و طویل عبارت بطور نمونہ پیش کی جائے اسلئے اس جگہ صرف چند سطور پر اکتفا کرتے ہیں۔ اقبال مرزا کی پہلی بیوی سوکن آجانے کے غم سے نڈھال ہے اس وقت اسے وعظ سنایا جا رہا ہے تاکہ وہ خدا سے ڈرے اور غم کو بھول جائے اُس وقت مولوی صاحب نے لکھا اور کس قدر فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں لکھا ہے (اور یہی ان کا فلسفہ اور تعلیم بھی ہے)

”جو مصیبت انسان پر پڑتی ہے، گو وہ بظاہر کیسی ہی کٹھن ہو اور تم اسکی لم کو نہ سمجھ سکو اور اپنی غلط فہمی سے اسے بلا وجہ ہی سمجھو مگر یاد رکھو کہ اس میں در پردہ کوئی نہ کوئی فائدہ انسان کا ضرور ہوتا ہے جس طرح کہ ڈاکٹر بیمار کو کڑوی دوا پلاتا ہے کبھی پھوڑے پھنسی کو چیرتا پھاڑتا بھی ہے بلکہ ضرورت ہو تو عضو ماؤف کو کاٹ بھی ڈالتا ہے، مگر کوئی سمجھدار آدمی کہہ سکتا ہے کہ یہ فعل اس نے مریض کو نقصان پہنچانے یا خدانخواستہ کسی عداوت سے کیا۔ بلکہ جو کچھ کیا تمہارے ہی فائدے کیواسطے کیا، اسی طرح جو تکلیفیں ہمکو دنیا میں پہنچتی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے پہنچتی ہیں۔ بندے کا رتی برابر بھی دخل نہیں ہے۔ مصیبت ہمیشہ راحت کا پیش خیمہ ہوتی ہے مصیبت اس وجہ سے زیادہ تر ناگوار اور گراں گذرتی ہے کہ ہم اسکے اندازہ کرنے میں غلطی کرتے ہیں، صبر و تحمل کو بالائے طاق رکھدیتے ہیں، صبر اور استقلال سے اسے برداشت نہیں کرتے۔“

دیکھئے یہ کس قدر سلیس۔ سادہ، زود فہم، بامحاورہ اور موثر عبارت ہے ان الفاظ کو بغور پڑھئے۔ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے یعنی فلسفۂ حیات چند سادہ اور سلیس الفاظ میں بیان کر دیا ہے اسیطرح بیماری اور موت کو تو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔ خوشی کے موقعہ کو پڑھکر قاری خواہ کسی حالت میں ہو تھوڑی دیر کے لئے تو ضرور خوش ہو لیتا ہے۔

خاتمہ مذکورہ بالا سطور کے مطالعہ سے یہ تو آپ بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ مولوی بشیر الدین احمد ایک کامیاب ناول نگار تھے اور ان کے

ناول مسلمہ اُصول کے مطابق ناول کے معیار پر پورے اُترتے ہیں اس جگہ بہت ممکن ہے کہ بعض احباب کو یہ اعتراض ہو کہ میں نے مولوی صاحب کی تحریر کی خوبیوں پر تو اس قدر طول وطویل مضمون لکھدیا ہے لیکن خامیوں پر پردہ پوشی کرنے کی سعی کی ہے. لیکن ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہمیں بھی شک نہیں کہ ایک انسان کی تحریر ہونے کی حیثیت سے ہمیں متعدد خامیاں ہونا لازمی بات ہے لیکن یہ خامیاں خوبیوں کے مقابلہ میں اس قدر کم اور ہیچ ہیں کہ انہیں نظر انداز کرد ینا ہی بہتر ہے. مگر بایں ہمہ ایک بات جو میری نظر میں بہت بُری طرح کھٹکتی ہے وہ یہ کہ مولوی صاحب نے اپنے ناولوں کے ناموں کے انتخاب میں کوئی خوبی نہیں دکھائی "اصلاح معشیت" اور "حسن معاشرت" میں کوئی دلکشی اور دلچسپی نہیں، یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ ناموں کے انتخاب میں خاص احتیاط برتنی چاہیئے کیونکہ ان میں بھی ایک مستقل دلچسپی اور دلکشی پوشیدہ ہے نام کا حسن ہر جگہ اپنا کام کرتا ہے اسی وجہ سے انسان تو کیا جانوروں کے نام بھی دلکش اور دلچسپ رکھے جاتے ہیں. اگر ایک حسین عورت کا نام وحشیانہ ہو تو یقیناً اسکے حسن کی دلکشی اور دلفریبی پر ضرب کاری لگے گی بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جنکی طرز تحریر اور موضوع مضمون تو بہت گندے ہیں لیکن ان کے دلکش ناموں کی وجہ سے بازار میں انکی مانگ ہے، سوائے ان اصحاب کے جنہیں علمی مضامین پڑھنے کا شغف ہے بہت کم لوگ "حسن معاشرت" اور "اصلاح معشیت" کی خریداری کرنے کی رغبت رکھیں گے یہ بھی صحیح ہے کہ یہ دونوں کتابیں بہت دلچسپ ناول ہیں لیکن ان کے نام کچھ ایسے ہیں کہ صرف اشتہار دیکھ کر ان کو ناول مان لینا بہت مشکل ہے۔

ان سطور میں، میں نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کر دیا ہے. مجھے اعتراف ہے کہ طبائع انسانی میں بہت زیادہ اختلاف ہے، رجحان، ذہنیت اور خیال کے اختلاف کی وجہ سے ہر شخص کی پسند علیحدہ علیحدہ ہے جو چیز مجھے بہترین معلوم ہوتی ہے وہ خواہ کتنی ہی معیاری اور فنی خوبیوں سے مالا مال کیوں نہ ہو ضروری نہیں کہ آپ کو بھی بہترین معلوم ہو، اور نہ ہی انسانی پسندی کا کوئی معیار مقرر ہے. اندریں حالات آپ کا یا کسی دوسرے نقاد کا میری رائے سے خلاف کرنا بہت معمولی بات ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس بات سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ تعلیم نسواں کے متعلق جو کام چُپ چپاتے مولانا نذیر احمد اور اُنکے بعد مولوی بشیر الدین احمد کر گئے ہیں وہ اپنے عملی نتائج کے اعتبار سے ان تمام نقش بر آب کوششوں سے (جو آجکل زنانہ رسالے جاری کرکے زنانہ نمائشیں منعقد کرکے اور زنانہ کانفرنسوں کا خواب دکھا کر اس سلسلہ میں کیجا رہی ہیں) کہیں افضل و اعلیٰ ہے اور لطف یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا اسوقت کیا، جسوقت اسکے موافق شاذ و نادر اور مخالفتوں کا طوفان بے تمیزی برپا تھا۔

مولوی بشیر الدین احمد نے "اقبال دلہن"، "حسن معاشرت" اور "اصلاح معشیت" لکھکر نہ صرف اردو ادب کی بڑی زبردست خدمت انجام دی بلکہ خواتین ہند پر بہت بڑا احسان کیا جسکو رہتی دنیا تک بھلایا نہیں جا سکتا. مولانا نذیر احمد کے بعد اگر کسی مصنف کی کتابیں بلا خدشہ مستورات کے ہاتھوں میں دیجا سکتی ہیں تو وہ مولوی بشیر الدین احمد کی تصنیفات ہیں انکی زندگی میں اور ان کے بعد بھی اکثر اصحاب نے ان کے باغ علم کی خوشہ چینی کرنی چاہی مگر کوئی کامیاب نہ ہو سکا اور نہ آئندہ کوئی اُمید ہے زمانہ ایسے باکمال بزرگ بہت کم پیدا کرتا ہے، وہ ایک جامع کمال بزرگ تھے، انکی ادبی حیثیت ناظم و ناثر ہونیکے اعتبار سے یکساں ممتاز و مستفید ہونی چاہیئے اور ہے. افسوس ہے کہ انکی عمر نے وفا نہ کی ورنہ ادب اردو کی بہت سی خوشگوار اُمیدیں ان سے پوری ہوتیں۔ ایسے باکمال مشاہیر کی تلافی اگر کوئی چیز کر سکتی ہے تو وہ انکے گرانبہا علمی کارنامے ہیں. گو آج مولوی بشیر الدین احمد اس دنیا میں موجود نہیں. لیکن ان کے کارنامے، انکی علمی خدمات ہمیشہ ان کے نام کو صفحۂ تاریخ پر روشن رکھے گی ؎

نفس گم اور سخن باقی رہیگا
نہ ہوگا تار اور ہونگے ترانے

گلنار

بسا اوقات کوئی معمولی سا واقعہ بھی ایک دلچسپ افسانہ بن جاتا ہے۔

شام کا وقت تھا اور ہوٹل میں خاصی رونق تھی۔ آنے جانے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ایک وسیع کمرے میں بہت سے آدمی اِدھر اُدھر کرسیوں پر بیٹھے تھے اور ایک نوجوان لڑکی جس کا آنکھوں میں کھبتا ہوا لباس اور اُس پر اس کا بناؤ سنگار دیکھنے والوں کو خود بخود اپنی طرف متوجہ کئے لیتا تھا دونوں ہاتھوں میں پیتل کی ایک سینی اٹھائے اِدھر سے اُدھر لپکی لپکی پھرتی تھی۔

میری میز پر اس نے چائے کا سامان رکھا ہی تھا کہ ایک طرف سے آواز آئی "اے ہوٹل والی! دو چاپ لائیو ادھر"

"اچھا جناب!" اس نے وہیں سے آواز دی۔

ایک اور بولا "ایک پلیٹ مچھلی کی لانا ادھر"

"اچھا جناب!"

ایک نووارد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے آواز دی "چائے اور بسکٹ لاؤ"

"اچھا جناب!"

ایک طرف دو تین لڑکے بیٹھے تھے، ان میں سے ایک نے آواز دی "بڑی بی! تین پیالی چائے ادھر بھی لانا"

بڑی بی کے نام پر ہوٹل والی مسکرا کر بولی "ابھی لائی بابا جان"

یہ سنکر اکثر لوگ ہنسنے لگے۔

پانچ سات منٹ بعد اسی پیتل کی سینی میں سب چیزیں رکھے وہ پھر آگئی اور جس نے چاپ مانگے تھے اُسکے آگے چاپ رکھکر بولی۔

"لیجئے جناب! چاپ آگئے"

پھر جس نے مچھلی منگوائی تھی اُسکے سامنے مچھلی رکھکر "لیجئے جناب! مچھلی آگئی"

پھر دوسرے کے سامنے چائے اور بسکٹ رکھتے ہوئے۔

"لیجئے جناب! چائے اور بسکٹ حاضر ہیں"

پھر ان لڑکوں کے آگے چائے کا سامان رکھتے ہوئے "لیجئے جناب! تین پیالی چائے آگئی"

وہ اپنے کام میں اسقدر ہوشیار تھی کہ کیا مجال جو ایک کی چیز دوسرے کے سامنے رکھدے۔

اتنے میں ایک نوجوان آیا۔ ہلکا سانولا رنگ تھا، کشادہ سینہ اور کھلی ہوئی پیشانی، مونچھیں فیشن عقرب کی طرح دونوں جانب سے اوپر کو اٹھی ہوئیں سیاہ رنگ کے معمولی سے کپڑے کا سوٹ تھا اور سر پر سفید ہیٹ تھی۔ یہ نوجوان میرے دائیں جانب ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ہوٹل والی ذرا لچک لچک کر چلتی ہوئی اُسکے پاس آئی اور دونوں کہنیاں میز پر ٹیک کر بولی "کل کہاں تھے؟"

"گلنار!" نوجوان بولا "یہ پھر پوچھ لیجیو۔ کچھ کھانے کو لاؤ سخت بھوک لگ رہی ہے"

گلنار کسقدر پیارا نام تھا۔ اب جو میرے پاس سے گذرنے لگی تو میں نے اُسے ذرا غور سے دیکھا۔ سرو قامت اور آہو چشم حُسن اور رعنائی کے دوش بدوش شباب کی مستیاں خود بخود عریاں ہو رہی تھیں۔ گلنار کا خوبصورت لباس اس کے کسے ہوئے بدن پر خوب سجتا تھا۔ اور پھر اس کا مٹک مٹک اور لچک لچک کر چلنا بھی فتنۂ محشر سے کچھ کم نہ تھا۔

اتنے میں پھر آواز آئی "اے چھوکری! ایک پلیٹ چاپ لائیو"

"لائی جناب"

میں نے کہا "بی بی! ایک پلیٹ کٹلس میرے لئے بھی"

"اچھا جناب!" گلنار نے ذرا سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔
پھر ایک اور بولا "اے ہوٹل والی! ایک ٹکڑا کیک کا دیجیو!"
"اچھا جناب!"
اور ایک اور ذرا کرخت آواز سے بولا "چائے!"
"بہت بہتر!" کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئی اور دس بارہ منٹ بعد ٹرے میں سب چیزیں رکھے جو جس نے مانگا تھا وہی اس کے سامنے رکھتی ہوئی اسی نوجوان کے پاس آئی اور کھانے کا کچھ سامان اسکے آگے رکھکر بولی "تو کل کہاں رہے؟!"
"سفر کی تیاری کرتا رہا!" نوجوان نے جواب دیا "کل مجھے جانا جو ہے!"
"کہاں؟" گلنار نے پوچھا۔
"مدراس!"
"مذاق کرتے ہو؟!"
"ہرگز نہیں، سچ کہہ رہا ہوں!"
"کیوں؟" گلنار نے پوچھا۔
نوجوان پیالی منہ سے لگا کر اور گلنار کی طرف دیکھکر بولا۔
"میرے ایک چچا تھے وہاں، ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ کچھ جائداد میرے نام چھوڑ گئے ہیں!"
"کب؟" گلنار بولی "تم نے تو کبھی مجھ سے ذکر تک نہیں کیا!"
"کبھی موقع ہی نہیں ملا!"
"کب واپس آؤ گے؟!"
"اب واپس آکر کیا کروں گا!" نوجوان نے کہا "یہاں میرا ہے ہی کون ؟!"
"تم مجھے بھی ساتھ لے چلو گے؟"
"وہ کیوں؟!"
"کیوں؟" یہ الفاظ گلنار نے ذرا نیچے کرتے کہے۔ نوجوان بولا "فی الحال تو ارادہ نہیں!"
"کیا مطلب؟!"
"مطلب!" نوجوان نے کہا "وہی جو تم سمجھ لو!"
"صابر!" (یہ نوجوان کا نام تھا) "تو گویا چار سال کی محبت اور خدمت کا یہی انعام ہے!" گلنار نے ذرا بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"میں نے مجبور تھوڑی کیا تھا!" نوجوان بولا۔
"مجبوری!" گلنار نے کہا "اور وہ شادی کا وعدہ؟!"
"شادی!" نوجوان نے ذرا تمسخرانہ آواز سے کہا "ہوں، شادی!"
اتنے میں پھر آواز آئی "اے لڑکی! چائے لائیو!"
"لائی جناب!" گلنار سینی اٹھا کر اب جو میرے پاس سے گذری تو پہلی سی شگفتگی چہرے پر موجود نہ تھی۔
ایک اور بولا "کباب دے جائیو!"
"اچھا جناب!"
"کچھ کھانے کو ادھر بھی!" ایک اور طرف سے کسی نے کہا۔
"بہت اچھا!" کہتی ہوئی وہ پھر اندر چلی گئی اور واپس آکر ادھر ادھر چیزیں دیتی ہوئی اسی نوجوان کے پاس پھر آ بیٹھی اور بولی "صابر! تو گویا تم آج تک مجھے دھوکا ہی دیتے رہے!"
"دھوکا!" صابر نے ذرا ہنسکر کہا "نہیں! حالات نے مجبور کر دیا!"
"حالات نے!" اب گلنار نے ذرا طنزیہ آواز سے کہا "یہی نا کہ چار پیسے مل گئے!"
"جو چاہو سمجھ لو!" صابر بولا "لیکن دنیا کا دستور یہی ہے!"
"اور وہ محبت کے قول و اقرار؟!"
"وہ سہانے خواب تھے!" صابر قہقہہ لگا کر بولا۔
کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ گلنار پھر بولی "سچ کہتے ہو یا مذاق کرتے ہو؟!"

"تم تو مفت میں مغز چاٹ رہی ہو" نوجوان کرسی سے اٹھتا ہوا بولا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے کی طرف چلا گیا۔ لیکن گلنار ابھی وہیں بیٹھی تھی کہ اِدھر اُدھر سے گاہکوں کی آوازیں آنے لگیں اور وہ "اچھا جناب!" "لائی جناب!" کہتی ہوئی اندر چلی گئی اور پھر چیزیں لاکر سب کے سامنے رکھتی ہوئی۔ صابر کے برتن اٹھا اٹھا کر سینی پر رکھنے لگی۔

اتنے میں صابر پھر لوٹ کر آیا۔ اور گلنار کے پاس آکر بولا "میرا چاقو تو یہاں کہیں نہیں رہ گیا؟"

"دیکھ لو" گلنار نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

"ناراض ہو!" صابر نے پوچھا۔

"اپنے دل سے پوچھو" گلنار نے جواب دیا۔

"دل سے پوچھنے کی فرصت نہیں" یہ کہکر کمرے سے نکل گیا۔ اور ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔

اب میں نے پلٹ کر اس ناکامِ الفت کی طرف دیکھا۔ سینی میز پر رکھی تھی۔ وہ گردن جھکائے کھڑی تھی۔ اسکے خوبصورت سیاہ بال شانوں سے ڈھلک کر سینے پر آپڑے تھے۔ اتنے میں پھر ایک طرف سے آواز آئی۔

"اے ہوٹل والی! کے پیسے ہوئے؟"

یہ آواز سنکر وہ چونکی اور ایک اندازِ محبوبانہ سے سر کو جھٹکا دیکر بالوں کو پیچھے کیا۔ اسوقت اسکی غزال جیسی پیاری پیاری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ اس نے سر کو اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر "آئی جناب!" "لائی جناب!" کہتی ہوئی گاہکوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

ایم۔ اسلم

محسوساتِ ماہر

آرزو اک فریبِ باطل ہے
عشق خود عشق ہی کا حاصل ہے

عیش و غم سے فراغ حاصل ہے
بے حسی پوجنے کے قابل ہے

مرحبا اے وفورِ ناکامی!
تو مری کوششوں کا حاصل ہے

عیش اک وہم، رنج و درد خیال
زیست کا ہر نظام باطل ہے

مختلف ہیں حیات کے پہلو
موت اک زندگی کی منزل ہے

درد میں کیوں سکون پاتا ہوں
زہر بھی کیا دوا میں شامل ہے

نبضِ امید چھٹ گئی شاید
آج دل کچھ سکوں پہ مائل ہے

میں ہوں اور موجِ بحرِ غم ماہر
غمِ کشتی نہ فکرِ ساحل ہے

ماہر القادری

ثمرات تخیل

جہاں محوِ خوابِ گراں دیکھتا ہوں
تماشائے اہلِ جہاں دیکھتا ہوں

کیا ہے مجھے قطرہ سے بحر ساماں
کراماتِ پیرِ مغاں دیکھتا ہوں

یہ مشقِ تصور ہے جلوہ تمہارا
جہاں چاہتا ہوں وہاں دیکھتا ہوں

بنا دی یہ کیا شکل اے برق تو نے
میں کیا حالتِ آشیاں دیکھتا ہوں

یہ کس رشکِ ناہید نے نغمہ چھیڑا
کہ خود رفتہ کون و مکاں دیکھتا ہوں

سمجھتا ہوں جورِ زمانہ کو باطل
جب اس شوخ کو مہرباں دیکھتا ہوں

دماغِ نظر فرش سے عرش پہ ہے
کہاں دیکھتا تھا کہاں دیکھتا ہوں

یہ کالی گھٹائیں، یہ جوشِ بہاراں
لبِ نہر پہ الاماں دیکھتا ہوں

برابر صدائے نفس آرہی ہے
رواں عمر کا کارواں دیکھتا ہوں

یہاں تک وہ نظروں پہ چھائے ہوئے ہیں
انہیں دیکھتا ہوں، جہاں دیکھتا ہوں

تری یاد ہو کیا فراموش دل سے
اسے وجہِ تسکینِ جاں دیکھتا ہوں

کوئی دل نہیں خالی از خونِ حسرت
ستمگاریِ آسماں دیکھتا ہوں

نہالؔ آنکھ مل مل کے شک دور کرلوں
اسے وارِدِ گلستاں دیکھتا ہوں!!

نہال سیوہاروی

"ریڈنگ جیل" سے آسکر وائلڈ کے خطوط

آسکر وائلڈ کو ۱۸۹۵ء میں مارکوئیس آف کوئنز بیری کی ہتک کرنے کی پاداش میں دو سال قید با مشقت کی سزا ملی۔ عوام الناس کی صدائے احتجاج اور اسکے رفیقوں کی کوششیں سب بیکار گئیں اور اُسے طوعاً و کرہاً یہ سزا بھگتنی ہی پڑی۔ ظاہر ہے کہ اس المناک حادثے سے آسکر وائلڈ سا ذکی الحس شاعر کس درجہ متاثر ہوا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی افتادِ ذہنی اور طبعی رجحانات میں ایک انقلابِ عظیم ہو کر رہا۔ وہ خود کہتا ہے "...... میری زندگی میں دو انقلاب انگیز مقام آئے، ایک وہ جبکہ میرے والد نے مجھے آکسفورڈ بھیجا اور دوسرا یہ جبکہ سوسائٹی نے مجھے قید خانے بھیجا" اپنی قید کے آخر ایام میں اُس نے "ڈی پرو فنڈس" لکھی جس میں زمانۂ قید کے تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ یہ معرکتہ الآرا تصنیف اسکی زندگی میں نہ چھپ سکی۔ بعد میں شائع ہوئی اور اُس کی تمام تصنیفات سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اسکے علاوہ وہ قید خانے سے اپنے دوستوں کو طول طویل خط بھی لکھا کرتا تھا جن میں بلا تکلف وہ اپنے احساسات کی ترجمانی کیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے یہ خطوط کتنے بیش قیمت ہونگے زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ شائع ہونے کیلئے نہیں لکھے گئے تھے۔ اس قسم کے بہترین خطوط اُس نے اپنے عزیز ترین دوست رابرٹ راس کو لکھے۔ ان میں سے چار کا ترجمہ میں یہاں پیش کرتا ہوں۔ ہر چند ترجمے میں اصل کی تمام و کمال خوبیاں تو برقرار نہیں رہ سکیں تاہم میں نے کوشش کی ہے کہ مفہوم اور زورِ بیان میں حتی المقدور فرق نہ آنے پائے۔ ان خطوں میں بعض ایسے مقامات جو عام دلچسپی کا سبب نہ بن سکتے تھے۔ حذف کر دئے گئے ہیں۔

۱

۱۰ مارچ ۱۸۹۶ء

"عزیز روبی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک خط مسٹر ——— وکیل کو فوراً لکھدو۔ کہ چونکہ میری بیوی نے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ مجھ سے پہلے انتقال کر گئی تو وہ اپنا ۱/۳ حصہ میرے نام کر دیگی۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ میرا "حق حیات" خریدنے میں اُسکی مخالفت کی جائے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اسکو اس حد تک ناخوش کرنے اور اپنے بچوں پر اس درجہ تباہی لانے کے بعد مجھے کوئی حق نہیں رہا کہ میں کسی معاملے میں بھی اسکی مرضی کے خلاف کروں۔ وہ مجھ سے ملنے جب یہاں آئی نہایت تپاک اور شرافت سے پیش آئی تھی اور مجھے اُس پر کامل اعتماد ہے۔ از راہِ کرم یہ کام فوراً کر دینا اور میری طرف سے میرے احباب کا شکریہ ادا کرنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی بیوی کیلئے میرا یہ سب کچھ چھوڑ دینا بجا اور درست ہے۔

برائے مہربانی اسٹیوارٹ میرل اور رابرٹ شرارڈ[۱] کو پیرس میں ضرور خط لکھنا اور کہنا کہ میں اپنے ڈرامے کے اسٹیج ہونے کی خبر سنکر بہت ممنون ہوا۔ اور لونے پوئی[۲] (Lugné Poë) کی خدمت میں میری طرف سے اظہار تشکر و امتنان کرنا۔ یہ امر خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس شرمناک ذلالت کے دوران میں بھی میں ایک آرٹسٹ سمجھا جا رہا ہوں۔ کاش میں اس مسرور کن امر سے زیادہ سے زیادہ خوشی محسوس کر سکتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں ناکامی اور ہراسانی کے علاوہ ہر احساس کے لئے مُردہ ہو چکا۔ بہرحال، لونے پوئی کو لکھ بھیجنا کہ مجھے اس اعزاز کا احساس

[۱] رابرٹ شرارڈ آسکر وائلڈ کا محبِ صادق اور اُس کے مفصل حالاتِ زندگی کا مصنف۔ [۲] سلومی کے ہیرو ہیروڈیہ کا سب سے پہلا اداکار اور سلومی کو پیرس میں ۱۸۹۶ء میں پہلی مرتبہ اسٹیج کرنے والا اہتمام۔

ہے جو انہوں نے مجھے بخشا۔ وہ خود بھی تو شاعر ہیں۔ اندیشہ ہے کہ اس خط کو تم بمشکل پڑھ سکو گے لیکن چونکہ مجھے لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں اسلئے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں لکھنا بھول گیا ——— تم مجھے معاف کر دو گے۔ مور کا بھی شکریہ ادا کرنا کہ انہوں نے کتابیں فراہم کرنے میں خاصی زحمت اُٹھائی۔ یونانی اور رومی شاعروں کا مطالعہ کرتے وقت میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ اس لئے یہ کتابیں کچھ زیادہ فائدہ مند ثابت نہ ہوئیں۔ بہرحال اُن کی عین نوازش کہ انہوں نے یہ سٹ فراہم کر دیا۔ ان سے کہنا کہ وہ میلے[1] اُن میں رہنے والی خاتون کی خدمت میں میری عقیدت کا اظہار کریں۔ اس خط کا جواب ضرور دینا اور لٹریچر کے متعلق بھی لکھنا کہ کون کون سی نئی کتابیں وغیرہ ہیں ——— جاں کے ڈرامے اور فوربس رابرٹسن کے اہتمام کی بابت بھی لکھنا۔ پیرس یا لندن کے اسٹیج پر کیا کیا نئے رجحانات پیدا ہوئے اور کوشش کرکے دیکھنا کہ لیمتر (Lemaitre) باوئر (Bauer) اور سارسے (Sarcey) نے "سلومی" کے متعلق کیا رائے ظاہر کی اور خط ذرا جامع لکھنا۔ ہنری باوئر کو بھی خط لکھنا اور کہنا کہ میں اُن کی تحریرات سے بہت متاثر ہوا۔ رابرٹ شرارڈ اُن سے واقف ہیں ——— تم نے بڑا کرم کیا کہ مجھ سے آکر مل گئے۔ دوبارہ پھر آنا یہاں مجھ پر موت کی سی دہشت طاری رہتی ہے اور اُس سے زیادہ دہشت اس المناک احساس کی کہ میں اب تک زندہ ہوں۔ اور خاموش اندوہگیں حالت میں ....

میں تمہیں ہمیشہ دلی محبت کے ساتھ یاد کیا کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں آرنسٹ وہ کلی[2] اسٹریٹ سے میرا پورٹ منٹو۔ فر کوٹ۔ کپڑے اور میری وہ کتابیں لے آئے جو میں نے اپنی پیاری اماں کو دی تھیں .... سے پوچھنا میری والدہ کی قبر کی زمین کس کے نام سے خریدی گئی۔

ہمیشہ تمہارا دوست
آسکر وائلڈ

——— ۲ ———

ستمبر ۹۶ء

"...... ان خالص کاروباری معاملات کا جواب غالباً مور ایڈے براہ کرم ضرور دیں گے۔ مجھے ان کا خط جو قطعی کاروباری ہوگا، وصول کرنے کی اجازت مل سکے گی۔ بہرکیف انکے خط کا تمہارے اس ادبی خط پر کوئی اثر نہیں پڑے گا جس کی بابت گورنر نے مجھے ابھی تمہارا پیغام پڑھ کر سنایا۔

اپنے متعلق ——— عزیز روبی ——— میں شاید ہی کوئی ایسی بات کہہ سکوں جس سے تم خوش ہو۔ میرے حکم سزا کے نہ بدلے جانے کی خبر نے مجھ پر ایک کند تلوار کی ضرب کا اثر کیا۔ اور میں ایک کرب آفریں احساس درد سے بیہوش سا ہو گیا۔ میں اُمید کے آسرے بیٹھا تھا اور اب مایوسی و تلخ کامی کا احساس جو اپنے من بھاتے کھاجے سے اتنے عرصے تک محروم رہا میری زندگی سے مجھے ہضم کر رہا ہے۔ لیکن اس قید خانے کی امتلا انگیز فضا میں اب پہلے سے کہیں زیادہ ترحم اور نیکی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ اور اب میں محبت افزا اثرات سے اپنے آپ کو پہلے کی نسبت بہت زیادہ دور نہیں پاتا۔ پہلے تو اسکے فقدان کا احساس ہی مجھ پر خوف و دہشت طاری کر دیا کرتا تھا۔ اور اب میں دانتے پڑھتا ہوں، اور محض قلم دوات کے استعمال سے محظوظ ہونے کی خاطر اقتباسات کیا کرتا ہوں۔ یا نوٹ لکھا کرتا ہوں۔ میری حالت پہلے سے فی الجملہ بہتر ہے

---

[1] اس قلعہ و قید کے ذمہ دار میجر آئزکسن، گورنر ریڈنگ جیل ہیں۔ ان کے بعد میجر نلسن گورنر مقرر ہوئے جو آسکر وائلڈ پر بطور خاص مہربان تھے۔

[2] یہاں آسکر وائلڈ کا مکان تھا۔

اور اب میں جرمن (زبان) کا مطالعہ شروع کرنے والا ہوں۔ فی الحقیقت اس قسم کے مطالعہ کے لئے قید خانہ بہترین جگہ ہے ــــ لیکن ان سب کے درمیان ایک کانٹا ہے جسکی زہریلی خلش سینٹ پال کی طرح مجھے بے چین رکھتی ہے۔ (اگرچہ نوعیت جداگانہ ہے) اس کھٹکتے خار کو میں اپنے دل سے نکال کر اس خط میں بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ خلش تمہارے اُس پیام سے پیدا ہوئی جو تم نے ایک کاغذ پر میرے مُطالعہ کے لئے لکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں نے اُسے پوشیدہ رکھا تو یہ میرے دماغ میں غیر معمولی نشو و نما حاصل کر کے (کیونکہ زہریلی چیزیں اکثر تاریکی ہی میں بڑھتی ہیں۔) کہیں اُن دیگر ہول آفریں تفکرات سے نہ جا ملے جو ہر لحظہ میرے دل پر نیش زنی کرتے رہتے ہیں ــــ تخیل، خاموش تنہائیوں میں پڑے رہنے والے قیدیوں کے نزدیک پلیٹو کے قول کے مطابق کوئی "ذی حیات طائر" نہیں ہے بلکہ ایک ایسا مردار ہے جس سے ہیبتناک اشیاء پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اُس غلیظ دلدل کی مانند جو چاند کے حضور دہشت خیز بلاؤں کا مظاہرہ کرتی ہے۔

میرا مطلب یقیناً تمہارے اُس بیان سے ہے جس کا مفہوم یہ تھا کہ لوگ مجھ سے ہمدردی کرنی چھوڑ دیں گے یا یہ کہ مجھے اس کا ڈر ہے وغیرہ وغیرہ ــــ مجھے یقین ہے کہ تم نے میرا خط اوروں کو دیا اور دکھایا۔ سنو، میں نہیں چاہتا کہ میرے خطوط عجائبات کے طور پر پیش ہوتے پھریں۔ مجھے یہ کسی طرح گوارا نہیں۔ میں تم کو بے تکلفی سے خط لکھتا ہوں یہ سمجھکر کہ تم میرے عزیز ترین دوست ہو اور باستثناء چند، اور لوگوں کا مجھ پر ترس کھانا یا نہ کھانا میرے دل پر کچھ ایسا زیادہ اثر نہیں رکھتا کہ میں اس اعزاز کو کھو بیٹھنے پر کفِ افسوس ملوں ــــ میرے رتبے اور حیثیت کا کوئی انسان بھی زندگی کے قعرِ مذلت میں گر کر کمتر درجے کے لوگوں سے خراجِ ہمدردی وصول کر سکتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ کھیل جب بہت زیادہ لمبے ہو جاتے ہیں تو تماشائی تھک جاتے ہیں۔ میری غمناک داستان بھی بہت طویل رہی۔ اسکی انتہا ہو چکی اور اس کا انجام بہت ہی ذلیل اور درد انگیز ہے۔ میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ جب میری کہانی انجام پذیر ہوگی تو میں ایک ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے اس دنیا میں داخل ہونگا جسکو میری کوئی ضرورت نہیں۔ طویل قید سے میرا چہرہ بدرنگ ہو چکا ہوگا اور میری کمر مصیبتوں کے بھاری بوجھ سے دُہری ہو چکی ہوگی ــــ جب مُردے اپنی قبروں سے اُٹھتے ہیں تو بھیانک ہوتے ہیں لیکن جب زندہ انسان اپنی قبروں سے برآمد ہوتے ہیں تو وہ اور بھی زیادہ بھیانک ہوتے ہیں۔ میں ان تمام امور سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جب ایک شخص اٹھارہ اندوہگیں مہینوں تک حوالات کی تاریک کوٹھری میں بند رہے تو وہ لوگوں کو اور دُنیا کی تمام چیزوں کو حقیقی روشنی میں دیکھنے لگتا ہے۔ اور یہ نظارہ اُسے ایک پتھر کے مجسمے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنی برائیوں اور عیبوں کا الزام کسی اور کے سر تھوپنا چاہتا ہوں۔ میرے احباب کو میرے عیبوں سے اتنا ہی سروکار رہا جتنا کہ مجھے اُن کے عیوب سے۔ فطرت اس معاملے میں ہم سب کے نزدیک سوتیلی ماں کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں اُن کو صرف اس حد تک گناہگار سمجھتا ہوں کہ اُنہوں نے جس انسان کو تباہ و برباد کر ڈالا اُسکی قدر نہ جانی جبتک کہ میری محفل سامانِ عیش سے رنگین و مُزین رہی! انہوں نے میری کیا پرواہ کی؟ میری ہنروری! ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے میری زندگی۔ میری خدمات اور وہ سکون، اطمینان جو مجھے درکار تھا ان سب چیزوں سے انہیں کیا واسطہ رہا! میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا سر پھر گیا تھا۔ میرے ہوش و حواس مختل ہو چکے تھے میری قوتِ فیصلہ سلب ہو گئی تھی اور میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ میں نے ایک خطرناک قدم بڑھایا اور اب میں اِس قید خانے میں ایک بنچ پر بیٹھا نظر آتا ہوں۔ ہر ایک ٹریجیڈی میں ایک نہ ایک مُہیب عنصر ضرور ہوتا ہے اور تم جانتے ہو کہ میری ٹریجیڈی میں وہ عنصر کون سا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے آپ کو ملامت نہیں کرتا۔ میں دن رات اپنے آپ کو کوستا رہتا ہوں کہ میں نے کیوں کسی لائقِ نفرین جذبے کو اپنے اوپر غلبہ پانے دیا۔ اگر ان دیواروں میں کوئی آواز ہوتی تو وہ ہمیشہ تک "احمق" کی بازگشت سے گونجتی رہتیں۔ میں اپنے دوستوں سے

بےحد شرمسار ہوں اس لئے کہ دوستی ہی انسان کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ میں ایک محسوس ذلالت کے ساتھ اپنے دوستوں سے شرمساری کا احساس رکھتا ہوں جس کے متعلق تفصیلی حالات تم میری کارروائی مقدمہ میں پڑھو گے۔

یہ میرے لئے روزمرہ کی روحانی اذیت کا باعث ہے۔ بعض کے متعلق میں کبھی غور نہیں کرتا۔ اور نہ اُن سے مجھے کبھی کوئی تکلیف پہونچی۔ درحقیقت میری ٹریجیڈی از سرتاپا ایک وحشت خیز اور ہولناک داستان ہے اور بس۔ کیونکہ اپنے آپ کو ایک مکروہ جال میں پھنسانے کا نتیجہ یہی ہے کہ میں میل بوج (Malebolge) کی مذموم ترین بدروں میں جلے ڈی ریٹز (Gilles de Retz) اور مارکوئی ڈی سیڈ (Marquis de Sade) کے درمیان بیٹھتا ہوں ــــ یہاں سوائے پاگلوں کے کسی کو ہنسنے کی اجازت نہیں۔ اُنکا ہنسنا بھی خلاف قانون سمجھا جاتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو میرا خیال تھا کہ میں اس مضحکہ خیز بوقلمونی پر جی کھول کے ہنستا!!

کسی کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میں اور لوگوں کی اس لئے توصیف کرتا ہوں کہ وہ چند غیر وقیع نیتیں رکھتے ہیں ــــ نیت ایک ذہنی اور شعوری چیز ہے ــــ وہ لوگ صرف نفس کے بندے ہیں اور اُن کی یہ نفس پروری بہرطور اپنا شکار تلاش کر لیتی ہے اور موجودہ صورت میں بھی اُسنے اپنا شکار جھپٹ ہی لیا ــــــ اب میں نے وہ کانٹا نکال دیا۔ تمہاری اس چھوٹی سی سطر کی خلش بے پناہ تھی اور اب میں سمجھتا ہوں کہ تم راہِ راست پر آجاؤ گے اور بالآخر...... کی دلچسپ کہانی لکھ بھیجو گے اپنی والدہ اور الیک (Aleck) کی خدمت میں سلام و شوقِ نیاز۔ "رنگین[1] ابوالہول" اب بھی میں سمجھتا ہوں بطور سابق حیرت انگیز ہوگی۔ ومبلے ڈن والی خاتون کی خدمت میں میرے تصورات کی بہترین ارادت کیشی اور نیاز وعقیدت کا ہر وہ احساس جسے وہ قبول کریں۔ اُن کا تقدس آب دل، دلفگاروں کیلئے ایک مندر اور مصیبت زدوں کے لئے ایک پرسکون جائے پناہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ خط کسی کو مت دکھانا اور نہ کسی کو یہ بتانا کہ میں نے تمہیں کیا جواب لکھا اور "اس سایوں کی دنیا" اور "حیات وروح" کی بابت مجھے مفصل لکھنا۔ میں اُن اشیاء کے متعلق معلوم کرنے کے لئے بےچین ہوں جنہوں نے میرے دل پر زہریلے نشتر لگائے اور میرے درد و کرب میں ترس کی کسک ہے۔

تمہارا

"آسکر"

یکم اپریل ۱۸۹۷ء

عزیز روبی

میں تمہیں اس خط سے علیحدہ ایک مسودہ[2] بھیجتا ہوں جو اُمید کہ بخیریت پہونچے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اُسے پڑھنے کے بعد مجھے اسکی

---

[1] "رنگین ابوالہول" ــــ Gilded Sphinx ــــ ایک فاضل مصنفہ کا لقب تھا۔ یہ فاضلہ "لندن پنچ" میں وائلڈ کے ملفوظات پر دلچسپ پیروڈیز لکھا کرتی تھی۔ اور جب ہی سے وائلڈ کے اور اسکے مراسم قائم ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں جبکہ وائلڈ دورانِ مقدمہ میں ضمانت پر رہا ہوا تو اس نے اپنے گھر پر وائلڈ کی شاندار مہمان نوازی کی۔ [2] یہ مسودہ وائلڈ کی بے پناہ تصنیف (De Profundis) کا ہے جو ایک خط کی صورت میں ہے۔ یہ کتاب اُس نے اپنی قید کی آخری ایام میں لکھی۔ وہ یہ مسودہ R. Ross کو بھیجنا چاہتا تھا مگر اُسے اجازت نہ مل سکی۔ عین رہائی والے دن اس نے یہ مسودہ Robert Ross کو دیا۔ مگر اسکی زندگی میں یہ کتاب نہ چھپ سکی۔ بعد میں چھپی اور اسکی تمام تصنیفات سے زیادہ مقبول ہوئی۔ کتاب کا نام De Profundis رابرٹ راس کا تجویز کردہ ہے۔

نقل کرا دو۔ اسکی بہت سی وجوہ ہیں۔ ایک کافی ہوگی۔ وہ یہ کہ اگر میں مرگیا تو میں چاہتا ہوں کہ تم میرے "ادبی جانشین" بن جاؤ۔ اور میرے ڈراموں، کتابوں اور دیگر کاغذات پر پورا قبضہ حاصل کرلو۔ جس وقت بھی مجھے یہ معلوم ہوا کہ مجھے وصیت کرنے کا قانونی حق حاصل ہے میں فوراً ایک وصیت نامہ تیار کروں گا۔ میری بیوی میرے آرٹ کو نہیں سمجھتی اور نہ ہی اس سے اسکی توقع کی جاسکتی ہے اور سیرل تو بچہ ہی ہے۔ اس لئے میں دیگر امور کی طرح اس معاملے میں بھی تمہارا ہی آسرا ڈھونڈتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم میری تصنیفات کے مالک بن جاؤ۔ اُن کے فروخت کرنے میں جو کچھ نقصان ہو وہ تم مسٹر اِسمتھرز ([illegible]) اور رولیویاں ([illegible]) کے ذمے ڈال سکتے ہو۔ خیر، جب تم میرے ادبی جانشین ہی بن گئے تو تمہارے قبضے میں کم ازکم وہ ایک دستاویز تو ضرور ہونی چاہیئے جس سے میرا یہ عجیب وغریب طرزِ عمل ظاہر ہوتا ہو ۔۔۔ جب تم اس خط[1] کو پڑھ چکو گے تو تمہیں میرے اُس طرزِ عمل کا نفسیاتی سبب معلوم ہو جائے گا جو بظاہر مکمل حماقت اور عاصیانہ دیدہ دلیری کا نادر مرکب معلوم ہوتا ہے ۔۔۔۔۔

ایک نہ ایک دن حقیقت کا انکشاف ہوکر رہیگا۔ یہ ضروری نہیں کہ میری ہی زندگی میں ہو لیکن میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں کہ تمام عمر اس گھناؤنے قید خانے میں پڑا رہوں، صرف اس لئے کہ مجھے اپنی ماں اور باپ سے لٹریچر اور آرٹ میں امتیازی نمود وشہرت کا مرتبہ ورثہ میں ملا ہے۔ میں کسی طرح ابد تک اس نیک نام کی تذلیل گوارا نہیں کرسکتا۔ میں اپنے وطیرے کی سفارش یا صفائی پیش نہیں کر رہا بلکہ صرف توضیح کیا چاہتا ہوں۔

میرے خط میں چند ایسے مقام بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قید خانے میں رہ کر میری ذہنیت میں کتنا وسیع انقلاب ہوگیا۔ میری سیرت اور زندگی کی طرف سے میرے طبعی رُجحانات میں کیا کیا نمایاں تبدیلیاں ہوگئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اور میرے تمام وہ احباب جو اب بھی میری رفاقت کرتے ہیں اور مجھ سے محبت رکھتے ہیں اچھی طرح جان لیں کہ میں کس حالت اور کس طریقے پر دُنیا میں داخل ہونے کی توقع رکھتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ ایک لحاظ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس دن مجھے رہائی حاصل ہوگی مجھے صرف ایک قید خانے سے نکل کر دوسرے میں داخل ہونا پڑے گا۔ اور بعض اوقات تو مجھے ساری دُنیا اپنی اِس کال کوٹھڑی سے زیادہ وسیع نظر نہیں آتی۔ بلکہ اتنی ہی ہیبتناک معلوم ہوتی ہے ۔۔۔ میرا عقیدہ ہے کہ روزِ ازل خُدا نے ہر شخص واحد کے لئے ایک دُنیا بنائی تھی اور ہمیں صرف اُسی دنیا کے اندر جو ہمارے من میں آباد ہے رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔۔۔ بہرحال تمہیں میرے خط (De Profundis) کے اُن حصّوں کے پڑھنے سے نسبتاً کم تکلیف پہونچے گی۔ ہاں! تمہیں یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ تخیل میرے لئے ۔۔۔ بلکہ ہم سب کیلئے ۔۔۔ کتنی تیز رو چیز ہے اور یہ کہ ہمارے جذبات کتنے سریع الزوال مادوں سے ممزوج ہیں۔ بہرحال میرے سامنے ایک ایسا ممکن الحصول مطمحِ نظر ہے جسکی طرف آرٹ کے وسیلے سے بڑھ سکتا ہوں اور یہ غیر ممکن نہیں کہ اس سلسلے میں تم میری معاونت کرسکو۔

نقل کے متعلق یہ ہے کہ یہ کام کسی نقل نویس کے لئے بہت دُشوار اور طول عمل ثابت ہوگا اور خود تمہارا خط ۔۔۔ عزیز روبی ۔۔۔ تمہارے گذشتہ خط میں کچھ ایسا تھا کہ مجھے مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ یہ کام تمہارے بس کا نہیں۔ میرے خیال میں اسکے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ جدید روش کے مطابق اسے ٹائپ کرالو۔ یہ ضرور ہے کہ مسودہ تمہارے ہاتھ سے نہ نکلنا چاہیئے۔ کیوں نہ تم مسز مارشل سے کہو کہ وہ اپنی ٹائپسٹ لڑکیوں میں سے کسی کو ہارٹن اسٹریٹ یا فلی مور گارڈن بھیجدیں اور تم اپنی نگرانی میں ٹائپ کرالو۔ (عورتیں ایسے معاملوں میں ہمیشہ لائقِ اعتماد ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ اہم چیزوں کو یاد نہیں رکھ سکتیں) میں چاہتا ہوں کہ نقل معمولی کھُردرے کاغذ پر نہ ہو بلکہ عمدہ کاغذ پر ہو اور تصحیح کے لئے چوڑا سا حاشیہ چھوڑ دیا جائے۔ ....

[1] وائلڈ کے بچے کے لئے De Profundis

....

...... درحقیقت رو بی! قید خانے کی زندگی کا ماحصل یہی ہے کہ ہم، لوگوں کو اور دنیا کی تمام چیزوں کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے لگتے ہیں اور اسی لئے ہم لوگ پتھر کے مجسمے بن جاتے ہیں ـــــ یہ دراصل باہر کے پھرنے والے لوگ ہی ہیں جو مسلسل حرکت کے سبب زندگی کے نظر فریب سراب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے دوش بدوش سرگرداں رہ کر اس کے ابتذال میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اور ہم لوگ جامد و ساکن رہنے کے باعث دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں ـــــ پست سیرتوں اور جوشیلی ذہنیتوں کو یہ خط (De Profundis) فائدہ پہونچائے یا نہ پہونچائے لیکن میرے لئے تو یہ بہت سود مند ثابت ہوا۔ بقول اُس شاعر کے جسے کبھی میں اور تم ...... سے حاصل کرنا چاہتے تھے: "میں نے اپنا سینہ بہت سے تباہ کن دلدر سے صاف کردیا" تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آرٹسٹ کے نزدیک صرف "اظہار" ہی اعلیٰ ترین اور واحد طریقہ زندگی ہے ـــــ ہم زندہ اسی لئے ہیں کہ ہم بولتے رہتے ہیں ـــ منجملہ ان بے شمار احسانات کے جو گورنر نے مجھ پر کئے میں اُس کے اِس احسانِ عظیم کا ہزار بار ممنون ہوں کہ اُس نے مجھے جی بھر کے لکھنے کی اجازت دیدی۔ دو برس سے میرے دل پر زہر آلود تلخ کامی کا بوجھ بڑھتا چلا جارہا تھا جس سے اب میں سبکدوش ہوگیا ـــ قید خانے کی دیوار کی دوسری طرف کچھ خشک و سیاہ بدرنگ کے درخت ہیں جن میں اب خوش رنگ ہری ہری کونپلیں نمودار ہورہی ہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ کس دور سے گذر رہے ہیں۔ وہ اظہار کا ذریعہ تلاش کررہے ہیں۔

ہمیشہ تمہارا
"آسکر"

۴

عزیز روبی!

میری تجویز پر غور کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بیوی جو روپے پیسے کے معاملے میں بہت عالی ظرف اور باعزت ہے، میرے حصے کے ...... پونڈ واپس دیدے گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور ادا کردے گی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ رقم مجھے ادا کرنی چاہیئے تھی۔ مجھے اعلیٰ ذوق کی کوئی چیز بھی اس سے نہ وصول کرنی چاہیئے۔ میں ہر وہ چیز قبول کرسکتا ہوں جو محبت اور شفقت کے ساتھ دی جائے۔ لیکن اس چیز کو قبول نہیں کرسکتا جو بددلی یا شرائط کے ساتھ پیش کی جائے ـــــ میں جلد ہی اپنی بیوی کو آزاد کردوں گا۔ وہ اگر چاہے تو دوسری شادی کرسکتی ہے۔ بہرطور میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ آزاد ہوگئی تو وہ مجھے کاہے کا ہے میرے بچوں سے ملنے دیگی اور یہی میں چاہتا ہوں۔ لیکن پہلے مجھے ہر شرط منظور کرنے کے بعد ایک شریف انسان کی طرح بہ تسلیم و رضائے آزاد کردینا چاہیئے۔ تم اس مسئلہ پر غور کرنا اس لئے کہ یہ سب کچھ تمہاری ہی غلط کاری کی وجہ سے ہے، اور مجھے بتانا کہ تم اور اور لوگ اُسکے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تم نے جو کچھ کیا بہتری کے لئے کیا لیکن تمہارا خیال غلط تھا اور سچ پوچھو تو میں رفتہ رفتہ اُس افتادِ ذہنی کی طرف آرہا ہوں جہاں میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہوتا ہے ہمیشہ بہتری ہی کے لئے ہوتا ہے۔ تم اسے فلسفہ کہو یا شکستہ دلی۔ مذہب کہو یا مایوسی و حسرت کامی۔ اصل کچھ بھی ہو لیکن یہ جذبہ میرے دل میں استقامت حاصل کرچکا ہے۔ اپنی بیوی کو اسکی مرضی کے خلاف اپنے سے وابستہ رکھنا ناانصافی ہے۔ اُسکو آزاد رہنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اور اُس کا دست نگر نہ رہنا خود میرے لئے مسرت کا سبب ہوگا۔ اُسکی پنشن پاتے رہنا سفلہ پن ہے۔ اسکے متعلق مور اینڈے

سے بات چیت کرنا اور اُن سے کہنا کہ تمہیں میرا خط دکھائیں۔ اپنے بھائی ایک ([illegible]) سے کہنا کہ وہ مجھے صلاح دیں۔ وہ ایسے اُمور پر بہت صائب رائے رکھتے ہیں۔

اب دیگر احوال کی بابت سُنو۔ مجھے اب تک تمہاری خدمت میں کتابوں کا شکریہ ادا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں اُنہیں پاکر بہت مسرور ہوا۔ رسالوں کی بندی ایک طرح کا ظلم تھا لیکن میریڈیتھ کے ناول نے مجھے مسحور کر لیا ....

....

.... یہاں قیدخانے کی لائبریری میں اُن غریب قیدیوں کے لیے جن کے ساتھ میں رہتا ہوں کوئی ناول وغیرہ نہیں ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ اس لائبریری میں چند عمدہ ناول دیدوں۔ کچھ اسٹیونسن کے (یہاں سوائے ایک کے کوئی نہیں) کچھ تھیکرے کے (یہاں ایک نہیں) جین آسٹن کے (یہاں کوئی نہیں) .... ایسٹر کے بعد تم چودہ پندرہ ناولوں کی ایک فہرست بنا کر مجھے بھیجدینا۔ وہ لوگ ضرور ان ناولوں سے خوش ہونگے جو ..... کے جرنل کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ اور ہاں یہ مت بھولنا کہ اُن کی قیمت میں خود ادا کروں گا۔ مجھے یہ خوف کھائے جاتا ہے کہ جب میں دنیا میں جاؤنگا تو میرے پاس میری کوئی کتاب نہیں ہوگی۔ کیا میرے احباب میں سے کوئی صاحب مثلاً ... .

..... مجھے کچھ کتابیں دیدیں گے؟ تم جانتے ہو میں کس قسم کی کتابیں چاہتا ہوں۔

فلابرٹ، اسٹیونسن، باڈلیر، میٹرلنک، ڈوماس، کیٹس، مارلو، چیٹرٹن، کولرج۔ اناطول فرانس۔ گاٹیر۔ دانتے اور دانتے کا سارا لٹریچر۔ گوئٹے اور گوئٹے کا لٹریچر وغیرہ وغیرہ۔

میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھونگا کہ اگر یہاں سے جانے پر کتابوں کو اپنا منتظر پاؤں اور شاید میرا کوئی دوست میرے حال پر اتنی عنایت ضرور کریگا۔ میں بہت احسانمند ہوں حالانکہ بعض اوقات میں اپنی ممنونیت کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ لیکن تم جانتے ہو کہ مجھے قیدخانے کی دردناک زندگی کے علاوہ اور بہت سی کرب آفریں پریشانیاں رہی ہیں۔

اس خط کے جواب میں تم مجھے تمام و کمال ڈراموں اور کتابوں کے متعلق ایک طویل خط بھیج سکتے ہو۔ تمہارا طرزِ تحریر گذشتہ خط میں ایسا خطرناک تھا گویا تم متموّل طبقے میں قومی و ملی احساس کی ترویج کے متعلق کوئی تین جلد والا ناول لکھ رہے ہو یا کسی اور قبیح طریقے پر ایک ایسی جوانی کو تباہ کر رہے ہو جو ہمیشہ سے ہمیشہ تک ہونہار ہے اور رہیگی۔ اگر میرا اندازہ غلط نکلے تو میری ان مرگ آسا کمزوریوں پر نظر رکھتے ہوئے جو طویل قید کا لازمی نتیجہ ہیں، مجھے معاف کر دینا۔ لیکن خدا کے لئے خط ذرا صاف لکھا کرو ورنہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کچھ چھپانا چاہتے ہو۔ تمہارے اس خط میں بہت سے خوفناک مقام آئے لیکن میں نے تمہارے عیب تم ہی کو جتائے نہ کہ اَوروں کو۔

مور کو میرا خط سُنانا۔ ہیری غالباً شنبہ کو مجھ سے ملنے آئیں گے۔ آرتھر کلفٹن اور ان کی بیوی کی خدمت میں میرا شوقِ نیاز اُن کی بیوی مجھے بالکل روزیٹی کی بیوی کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ ویسے ہی پیارے پیارے بال ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ من موہنی سیرت ہے۔ گومس سڈل غضب کی دلفریب ہیں اور اُن کی نظم بے مثل۔

ہمیشہ تمہارا
آسکر

دعوتِ نشاط

جب آکاش پر چھا رہی ہوں گھٹائیں
معطّر ہوں سرمست و بیخود ہوائیں
ہوں لبریزِ موسیقیت سے فضائیں
محبت کا اک سرمدی گیت گائیں!
غم و رنجِ امروز کو بھول جائیں!!

سُہانی مہورت اور برکھا کا موسم
ٹپکتی ہوں سبزہ پہ بوندیں بھی رم جھم
ہم ایسے سہانے سمے میں پریتم!
محبت کے پھولوں میں پینگیں بڑھائیں!
غم و رنجِ امروز کو بھول جائیں!!

بہت دور سنسار کی شورشوں سے
بہت دور افکار کی الجھنوں سے
بہت دور ہر آشنا دشمنوں سے
دیارِ محبت میں اک گھر بنائیں!
غم و رنجِ امروز کو بھول جائیں!!

وہ دنیا، جہاں شادماں زندگی ہو
وہ دنیا، جہاں جاوداں زندگی ہو
جہاں موت پر حکمراں زندگی ہو
وہاں میں ہوں اور تیری کافر ادائیں!
غم و رنجِ امروز کو بھول جائیں!!

جہاں بارشِ کیف و نکہت ہو ہر سو
جہاں مستی و عیش و راحت ہو ہر سو
جہاں سرخوشی و مسرت ہو ہر سو
محبت کی دنیا اک ایسی بسائیں!
غم و رنجِ امروز کو بھول جائیں!!

جہاں جھونکے فردوس سے آ رہے ہوں
جہاں نغمے کرنوں پہ تھرا رہے ہوں
جہاں چاند پر چاند آ، جا رہے ہوں
وہاں ہم محبت کا ساگر بہائیں!
غم و رنجِ امروز کو بھول جائیں!!

ادھر روٹھو تم، ہم ادھر روٹھ جائیں
ہمیں تم مناؤ، تمہیں ہم منائیں کہ
خوشی سے نہ جامے میں پھولے سمائیں
تمہاری معیت میں وہ لطف آئیں!
غم و رنجِ امروز کو بھول جائیں!!

مرے دکھ پہ اب رنج اٹھانے سے حاصل
جفاؤں اپنی پہ اب تلملانے سے حاصل
مرے حال پر دل دکھانے سے حاصل
نہ اب تم کرو یاد میری وفائیں!
غم و رنجِ امروز کو بھول جائیں!!

وہ عہدِ زبوں دل سے اب تم بھلا دو
مری زیست کو رشکِ جنت بنا دو
محبت کا میٹھا ترانہ سنا دو
کہیں ایسے یہ بھی نہ دن بیت جائیں!
غم و رنجِ امروز کو بھول جائیں!!

بشیر نیازی

سنجیدہ ڈرامہ

ڈرامہ میں کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے؟ اس سوال کا جواب دینے کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں۔ اکثر حضرات نے قواعد بھی متعین کرنے چاہے ہیں مگر اس قسم کی سب کوششیں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ ڈرامے کے ذریعے ہزاروں باتیں پیش کی جاسکتی ہیں اور کی گئی ہیں اور یہ سب باتیں ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور اچھی بھی۔ ابسن کے ڈرامے بھی اچھے ہیں اور ییٹس کے بھی لیکن انکی عمدگی کے اسباب جداگانہ ہیں۔ ہر ڈرامہ نگار اپنے رجحانات کے مطابق ڈرامہ لکھتا ہے اور اپنے خیالات کی نشرو اشاعت کرتا ہے۔ کسی ڈرامہ کو صرف اس طرح پرکھا جاسکتا ہے کہ اس میں یہ دیکھا جائے کہ ڈرامہ نگار نے اپنا مقصود حاصل کرلیا ہے یا نہیں اور اس کا مقصود حاصل کرنے کے لائق ہے بھی یا نہیں؛ ڈرامے کا کوئی ایک خاص آرٹ نہیں ہے اور یہ سوال کہ اچھے ڈرامے کی خصوصیات کیا ہیں؟ ایسا ہی ہے جیسے یہ پوچھا جائے کہ بادلوں کی شکل کیا ہے؟ ڈرامے کو جانچنے کے لئے کوئی معیار مقرر نہیں ہے جس طرح سب کتابوں کی عمدگی کو ناپنے کے لئے کوئی خاص پیمانہ اب تک وضع نہیں ہوا ہے۔ اٹھارویں صدی کے لوگ شکسپیر کے ڈراموں کو برا کہتے تھے محض اس لئے کہ وہ چند مقررہ اصولوں کے مطابق نہیں تھے۔ برنارڈ شا کے متعلق شروع شروع میں نقادوں کی یہ رائے تھی کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے بہت عمدہ ہے مگر اسے ڈرامہ نہیں کہا جاسکتا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈرامہ کی خصوصیات متعین نہیں کی جاسکتیں اور نہیں بتایا جاسکتا کہ ڈرامہ کیا ہوتا ہے؛ اس کا مقصد کیا ہے اور اسکے محاسن کیا ہیں؟ ایسے قواعد نہیں بنائے جاسکتے جو یکساں طور پر سب ڈراموں پر منطبق ہوسکیں۔ لیکن آئے دن ہم اخبارات میں لفظ "ڈرامائی" دیکھتے ہیں جس سے ایک خاص مفہوم ذہن نشین ہوتا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض مقررہ اور خاص باتیں ایسی ہیں جو صرف ڈرامہ ہی سے متعلق ہوسکتی ہیں خواہ ڈرامہ کسی قسم ہی کا کیوں نہ ہو۔ جب ہم ان خصوصیات کو گننا چاہتے ہیں تو ناکام رہتے ہیں۔ مثلاً مشہور نقاد ولیم آرچر نے جب یہ بتانا چاہا کہ واقعات کو ڈرامائی طریقے پر کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے تو اس نے صرف ایک لفظ "اچھوتے" سے اپنا مفہوم ادا کرنا چاہا۔ مگر اس لفظ کے معنی اب تک صیغۂ راز ہی میں ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ لفظ ڈرامائی کا کچھ نہ کچھ مفہوم ہمارے ذہن میں ہے جیسے کوئی دھندلا سا منظر ہمارے پیش نظر ہو۔ اخباروں میں یہ لفظ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کوئی غیر معمولی یا جاذب توجہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ ولیم آرچر کا بیان ہے کہ یہ متوجہ کرلینے والا واقعہ عموماً وہ ہوتا ہے جو کسی انسان کے سیلاب زندگی کی سب سے اونچی موج ہوتی ہے۔ انسان کی روزمرہ کی زندگی ——— سونا، اٹھنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا، کام کرنا ——— کو ہم ڈرامائی نہیں سمجھتے، سرکشی یا بغاوت کی خبر جب پھیلتی ہے تو ڈرامائی صورت پیدا ہونے لگتی ہے۔ عام طور سے ڈراموں میں اسی قسم کے واقعات پیش کئے جاتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ہر ڈرامہ میں ایسے ہی واقعات کا ہونا لازمی ہے۔ آج کل ایسے بے شمار ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں جن میں صبر آزما واقعات یا تو سرے سے ہوتے ہی نہیں یا اگر ہوتے بھی ہیں تو انہیں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ طربیہ ڈراموں میں تو ہر زمانے میں یہ عنصر مفقود رہا۔ سنجیدہ ڈرامے کو سمجھنے کے لئے فی الحال ہمیں یہ تسلیم کرلینا پڑیگا کہ فن ڈرامہ کا تعلق انسانی زندگی کے صبر آزما واقعات سے ہے کیونکہ دنیا کے بے شمار سنجیدہ ڈراموں کا جزو لاینفک یہی ہے۔ اس نوع کے ڈراموں کی تعداد اسقدر زیادہ ہے کہ اسے سنجیدہ ڈراموں کے لئے کلیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ استثنا سے آئندہ بحث کی جائیگی۔

یونانیوں نے چار سو سال قبل مسیح حزنیہ ڈرامے کی تکمیل کی اور ان میں اسی اصول پر کاربند رہے۔ ایسچیلس کے ڈرامہ The Libation Bearers

میں ایک پرانی کہانی بیان کی گئی ہے جس میں ایک ملکہ نے اپنے شوہر کو ٹرائے کی جنگ سے فتحیاب واپس آنے پر اسی دن ہلاک کر دیا تھا۔ برسوں پہلے جب وہ جنگ پر جا رہا تھا تو اس نے اپنی چھوٹی سی معصوم بچی کو دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ ماں نے اس واقعہ کو فراموش نہیں کیا۔ بادشاہ فتح و نصرت کے جلو میں واپس آتا ہے اور آتے ہی ملکہ اُسے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دیتی ہے۔ یہ سب کچھ اس سے پہلے ڈرامے میں بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن اب بہت عرصہ گذر چکا ہے اور مقتول بادشاہ کا لڑکا جوان ہو چکا ہے۔ اولین فرض کے متعلق قدیم دنیا کا نظریہ یہ ہے کہ بیٹا اپنے باپ کے قتل کا انتقام لے۔ اپالو اُسے انصاف کرنیکا حکم دیتا ہے اگرچہ انتقام جس سے لینا ہے وہ ماں ہے۔ ڈرامہ ایکدم سے اس طرح شروع ہوتا ہے ـــــ فوراً تمامتر توجہ اپنی طرف جذب کر لیتا ہے ـــــ کہ مقتول بادشاہ کا بیٹا اورسٹیز اپنے باپ کے گھر واپس آتا ہے۔ چند گھنٹے بعد وہ اپنی ماں سے دوچار ہوگا اور اپنے ہی ہاتھ سے باپ کے خون کا بدلہ لیگا ـــــ بشرطیکہ اُسکی ہمت نے اس کا ساتھ نہ چھوڑ دیا۔ اس واقعہ کی صبر آزمائی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔

برنارڈ شا کے ڈرامے "سینٹ جون" میں بھی صبر آزما واقعات کی کمی نہیں۔ منظر اول میں جون کو پہلا مذبذب واقعہ پیش آتا ہے۔ کیا باڈری کورٹ کو وہ اس پر آمادہ کر سکیگی کہ ڈافن کے پاس جانے کی اُسے اجازت دیدے؟ اُسے اجازت مل جاتی ہے اور یہ واقعہ کامیابی سے گذر جاتا ہے مگر اب اس سے بھی زیادہ پیچیدہ صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہانتک کہ منظر ششم میں ہم اُسے آخری صبر آزما واقعہ سے دوچار دیکھتے ہیں۔ اُسکے ساتھیوں نے اُسے چھوڑ دیا ہے اور اس پر کفر و الحاد کا مقدمہ ہو رہا ہے۔ اُسکے سامنے دو چیزیں ہیں۔ شاندار فتح یا دہکتی ہوئی آگ۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس نے شعلوں کو کیسے قبول کیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر سنجیدہ ڈراموں میں انسانی زندگی کے صبر آزما لمحات پیش کئے جاتے ہیں۔ اور یہ لمحے وہ ہوتے ہیں جبکہ انسان اپنی شاہراہ زندگی کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے اُسے یا تو دائیں جانب مڑ جانا پڑتا ہے یا بائیں جانب۔ واپسی اسکے لئے ناممکن ہوتی ہے۔ وہی جاذبیت جو ہمیں تماشہ گاہوں میں لیجاتی ہے اسی سے کچھ ملتی جلتی کشش ہمیں عدالتوں میں بھی لیجاتی ہے کیونکہ ملزم کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو ڈرامہ کا موضوع خاص بن سکتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے جو خصوصیات ڈرامائی موسوم کی گئی ہیں وہ ناولوں میں بھی اس قدر عام ہو سکتی ہیں جسقدر کہ ڈراموں میں بلکہ یہ کہا جائیگا کہ بہترین ناول وہی ہوتے ہیں جن میں ڈرامائی خصوصیات ہوں۔ انکو ڈرامائی تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہیں ہو سکتا۔ ڈرامہ اور ناول میں فرق صرف اسقدر ہے کہ ڈرامہ میں حیات انسانی کی خاص خاص باتیں اجمالاً پیش کی جاتی ہیں اس طرح کہ ضروری عناصر چھوٹنے نہ پائیں۔ ڈرامہ چونکہ خود مختصر ہوتا ہے اسلئے اختصار لازمی ہے۔ زندگی کی تفصیلات سے ڈرامہ میں بحث نہیں کی جا سکتی۔ ڈرامہ میں صبر آزما لمحات اور تذبذب پیدا کرنے والے واقعات ہی پر توجہ مرکوز رہتی ہے۔ ناول میں بھی ان سب سے بحث کی جا سکتی ہے لیکن اس میں ہر واقعہ کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے اور عموماً ہوتا بھی یہی ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے عام واقعات کی تصویریں ہمیں ناول میں ڈرامے سے بہتر مل سکتی ہیں۔ سنجیدہ ڈراموں میں تو تفصیل کی اور بھی کم گنجائش ہے۔ ناولوں کے مطالعہ سے ہمیں تفصیل کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے کہ جین آسٹن کے زمانے میں کسی رئیس کے ساتھ چاء پینے کا کیا طریقہ تھا یا ٹامس ہارڈی کا جب لڑکپن تھا تو دیہاتوں میں الاؤ کے گرد شراب خوری کس طرح ہوتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس قسم کی تصویریں ڈرامہ کی حدود سے باہر نہیں ہیں کیونکہ شکسپیر کے سر ٹوبی بلچ سے واقفیت حاصل کر لینے کے بعد ہمیں کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ملکہ الیزبتھ کے زمانے میں شراب خوروں کی سوسائٹی کی کیا کیفیت تھی۔ تقریباً ایسی ہی تھی جیسی کہ بیسویں صدی کے شراب خوروں کی۔ لیکن آئے دن کے واقعات کی تصویریں جو ڈراموں میں پیش کی جاتی ہیں اس قدر واضح اور مفصل نہیں ہوتیں جتنی کہ ناول نگار پیش کرتے ہیں۔ ناول میں ذرا ذرا سی بات بیان کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی پیشے کی کل جزئیات بیان کی جا سکتی ہیں۔ ٹامس ہارڈی سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ شلغموں کی کاشت کس طرح ہوتی ہے۔ جوزف کانراڈ نے ملاحوں اور جہازرانوں کی زندگی ہمارے لئے آئینہ کر دی ہے۔ ملول نے وہیل

کے شکاریوں کی سست و کاہل زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے مفصل سوانحِ جوش و ولولہ سے ہمیں آشنا کر دیا۔ ڈرامہ ان چیزوں میں سے ایک کو بھی عمدگی سے پیش نہیں کر سکتا۔

اکثر عمدہ ناولوں میں روزمرہ کی زندگی کے بیان ہی میں ایک کہانی ایسی بھی رفتہ رفتہ متشکل ہوتی نظر آتی ہے جس میں ڈرامہ کی جملہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہی ناول فی الحقیقت بہترین ناول ہوتے ہیں ــــ ناول جو اپنی اثر آفرینی کے لحاظ سے بیانیہ ڈرامے کہے جا سکتے ہیں۔ ہارڈی کی عزت و وقعت ہمارے دلوں میں اسلئے ہے کہ اُس نے مائیکل ہنچرڈ یا جوڈ کی زندگی کا زبردست ڈرامہ پیش کیا ہے۔ لیکن ہم اسلئے بھی ہارڈی کی پرستش کرتے ہیں کہ اُس نے ریوبن ڈیوی کے نہانے کی دلچسپ تفصیل اور مناظرِ قدرت کی خوبصورت تصویریں پیش کی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہارڈی کے کسی ناول کو ڈرامے میں تبدیل کرنا بالکل بے سُود ہے۔ اگر کسی شخص میں روزمرہ کی ذرا ذرا سی باتوں کو دلکشی سے بیان کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے اور وہ اُن کے بیان کرنے پر قادر ہے تو اُس کا رجحان فطرتاً ناول کی طرف ہوگا۔ کسی کسان کی روزانہ کی بامشقت زندگی یا کسی غلہ بیچنے والے کے پُرمصائب واقعات کو ہارڈی کس طرح ڈرامے کی صورت میں پیش کر سکتا تھا؟ ڈرامے میں تو یہ کہنے کی بھی مشکل سے جگہ نکل سکتی ہے کہ کیسٹربرج کے بڑے بازار میں تیتریاں محوِ پرواز ہوتی ہیں۔

سنجیدہ ڈرامے کو توحیاتِ انسانی کے صرف صبر آزما واقعات سے متعلق ہونا چاہیئے۔ اس میں زندگی کا ست نظر آتا ہے۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ڈرامے ناولوں سے زیادہ جذبات کو اُکساتے ہیں اور بعض سنجیدہ سے سنجیدہ نقادوں نے بھی ڈرامے کے تفوق کو تسلیم کیا ہے۔ "میئر آف کیسٹربرج" جیسا ڈرامائی ناول ایک بہت شاندار ادبی کارنامہ ہے غالباً شکسپیر کے مشہور حزنیہ "آتھیلو" کے برابر۔ مگر اس کا زورِ کم و بیش چار سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اِس ناول کو ختم کر کے جب کوئی اُٹھتا ہے تو اسکے جذبات میں خوفناک حد تک ہیجان برپا ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی صرف تین یا چار گھنٹے میں ایک ایسا ڈرامہ دیکھتا ہے جس میں ایک انسان کی زندگی صبر آزما واقعات سے مسلسل دوچار ہوتی چلی جاتی ہے، مصائب کے سیلاب میں وہ شخص بہا چلا جاتا ہے اور اُسے آخیر تک بچنے کا موقع نہیں ملتا یہاں تک کہ وہ موت سے ہم آغوش ہو جاتا ہے، تو دیکھنے والے کے دل و دماغ پر اور بھی زیادہ خوفناک اثر ہوگا۔ عُمدہ ناولوں میں زندگی کا ست نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے مگر ڈراموں میں اِس ست کی بھی روح کھینچکر رکھدی جاتی ہے۔

ایک عنصر ایسا ہے جو عام طور سے ڈراموں میں پایا جاتا ہے اور جسے اکثر نقادانِ فن نے ڈرامہ کیلئے ضروری قرار دیا ہے بلکہ اُسے ڈرامہ کی رُوح بتایا ہے۔ یہ عنصر ہے "کشمکش"۔ برنارڈ شا نے بھی اس پر صاد کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ہر ڈرامے میں کشمکش کا حُسن کارانہ طریقے پر پیش کیا جانا ضروری ہے" لیکن یہ صرف ایک نظریہ ہے جسے تسلیم کر لینا ضروری نہیں ہے۔ اِس کا تذکرہ اِس لئے کیا گیا ہے کہ جدید مغربی ڈراموں پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑا ہے۔ سینٹ جون ایک عمدہ کشمکشی ڈرامہ ہے جس میں عیسائی مذہب کے دو فرقوں میں کشمکش دکھائی گئی ہے اور جاگیرداری (Feudalism) اور قومیت (Nationalism) کی کشمکش پیش کی گئی ہے۔ اس نظریہ کی تائید بے شمار ڈراموں سے ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سنجیدہ ڈرامہ چونکہ ہماری زندگیوں کے خاص خاص لمحات سے متعلق ہوتا ہے اس لئے وہ صرف اُن مواقع کو اپنا موضوع بناتا ہے جو نتائج ہوتے ہیں کشمکش کے۔ ایسی لاتعداد زندگیاں ہیں جن میں زندگی کا رُخ بدلنے والا موقع سخت کشمکش کے بعد آتا ہے۔ یہ عرصہ بہت طویل ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ڈرامہ نگار نمایاں کشمکشوں میں بہت دلچسپی لیتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ کشمکش ایک ایسی چیز ہے جس سے دیکھنے والوں کے جذبات میں ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ شیکسپیر کو معلوم تھا کہ جنگ کا منظر اسٹیج پر کس طرح پیش کیا جاتا ہے اور گالزوردی اور شا جانتے ہیں کہ دو آدمیوں کا آپس میں زندگی اور موت کی لڑائی لڑنا کسقدر مؤثر ہوتا ہے۔

بآسانی سے دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ نظریہ کشمکش برنارڈ شا جیسے ڈرامہ نگار کے لئے صحیح ہو تو ہو لیکن ہر ڈرامے پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا

یہ کچھ مشکل امر نہیں ہے کہ ان سب بے شمار باتوں کو جنکو ڈرامہ پیش کر سکتا ہے صرف اس نظریہ میں محدود کر دیا جائے کیونکہ ذرا سی کوشش سے ہر بات میں کشمکش کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ سر اسحاق نیوٹن نے ہمیں بہت عرصے پہلے بتا دیا ہے کہ سادہ سے سادہ طبعی حرکت میں بھی قوتوں کی کشمکش ہوتی ہے۔ اگر کوئی نحیف بوڑھا آدمی اپنے کتے کے ساتھ چہل قدمی کرے تب بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ متعدد کشمکشوں میں مصروف ہے۔ مثلاً کشش ارضی اور رگڑ ہی سے اُسے مقابلہ کرنا پڑیگا۔ نشیب و فراز میں اُترنے اور چڑھنے میں اُسے کشمکش کرنی پڑے گی۔ جب اس چہل قدمی میں کشمکش کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے تو معمولی سے معمولی ڈرامہ میں بھی کشمکش تلاش کی جاسکتی ہے۔ میکبتھ جیسے ڈراموں کا تو پھر ذکر ہی کیا۔ میکبتھ کی اولوالعزمی جو اُسے ارتکاب جرم کی جانب دھکیلتی ہے اور اُسکی طبیعت کی نیکی جو اُسے اس سے باز رکھنا چاہتی ہے۔ ان دونوں میں بھی قوار کی کشمکش دیکھی جاسکتی ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈرامہ دیکھنے والا کیا یہ بات محسوس کرتا ہے کہ وہ کشمکش کو دیکھ رہا ہے؟ میکبتھ کا گرنا ایسا ہے جیسے کسی ڈھلواں چٹان پر سے کسی کا پاؤں پھسل جائے۔ وہ سنبھلنے کی بے سود کوشش کرے لیکن سر کے بل غار میں گرتا ہی چلا جائے۔ چٹان کے نکلے ہوئے ٹکڑوں سے وہ الجھتا ضرور رہے مگر سنبھل نہیں سکتا۔ اب اگر کوئی ایسے گرنے کو دیکھنے کے بعد اپنے دوستوں سے یہ کہے کہ میں نے ایک خوفناک کشمکش دیکھی ہے تو سننے والوں کو اُسکی صحت دماغی میں شبہ ہونے لگے گا۔ یہ کہنا کہ ڈرامہ مشتمل ہوتا ہے قوار کی کشمکش پر ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ ڈرامہ زندگی جیسا ہوتا ہے۔ اس سے ہمیں ڈرامے کی مخصوص صلاحیتوں کے متعلق تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اگر ایک شخص کو صرف کام کرتے دکھایا جائے تو قوار کی کشمکش تو وہاں بھی موجود ہوگی خواہ وہ زمین کھودنے ہی میں مصروف کیوں نہ ہو۔

ڈرامہ اور عمل

بیشتر ڈرامے انسانی افعال و اعمال سے متعلق ہوتے ہیں۔ اگر کسی انسان کو متحرک دکھایا جائے تو کیا ڈرامہ متشکل ہو جائیگا؟ یہ سوال غور طلب ہے اور اکثر لوگ جو فن ڈرامہ سے بخوبی واقف نہیں ہوتے اسی سے مغالطے میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا ڈرامہ یہ دیکھیں جس میں سیاسی یا سماجی مسائل پیش کئے گئے ہوں تو فطرتاً اُن آرا کو سننے کے منتظر رہیں گے جو مکالمہ کی صورت میں پیش کی جائینگی۔ انکو جلدی ہی معلوم ہو جائے گا کہ افراد تمثیل بالخصوص اسلئے بولتے ہیں کہ وہ ہمیں یہ جتادیں کہ خود کیا کر رہے ہیں۔ ڈرامہ نگار جانتا ہے کہ ہماری آرا نہیں بلکہ ہماری حرکات ہی ہماری زندگی کو بگاڑتی یا سنوارتی ہیں۔ رائے کا کیا ہے؟ پرانی جوتی کی طرح اُسے مسترد کیا جاسکتا ہے یا پرانے کپڑوں کی طرح اس میں پیوند لگا کر سنوارا جاسکتا ہے۔ مگر حرکات کے ساتھ یہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ناقابل تنسیخ ہوتی ہیں۔ انہیں اٹل سمجھیے۔ انہیں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم کیسے ہیں اور کیا ہیں۔ ہماری آرا اور ہمارے اصول فی الحقیقت کس نوع کے ہیں۔ مستقل ہیں یا ذاتی اغراض اور اپنے مفاد کی صورت میں اُن میں تبدیلی ہو جاتی ہے؟ خوف، ڈر یا لالچ سے ہم اُن سے منحرف تو نہیں ہو جاتے؟ آرا اور اصول اچھے سے اچھے انسان کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں لیکن ایک ڈرامہ نگار کے لئے یہ صرف اس وقت لائق توجہ ہوتے ہیں جب یہ اُسے کسی عمل پر آمادہ کر دیں۔ گالزوردی نے "اسٹرائف" میں یہ نہیں بتانا چاہا ہے کہ اسٹرائیک کے متعلق لوگوں کا کیا خیال ہے بلکہ بتانا یہ چاہا ہے کہ اگر کبھی ایسا موقع ہو تو لوگ واقعی کیا کرینگے۔ جون کے بارے میں کوشاں کی جو رائے تھی اس سے سینٹ جون عبارت نہیں ہے بلکہ اس ڈرامہ میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ جون کو وہ دراصل جلا ڈالے گا۔

ڈرامہ اور افعال انسانی کے متعلق جو کلیہ قائم کیا گیا ہے اس کی مستثنیات سے آگے بحث کی جائیگی۔ چند بہت پُر زور ڈرامے ہی بطور امثال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً "ہیملٹ" ہی کو لیجیے۔ سینکڑوں ہی کتابوں میں تو آپنے دیکھا ہوگا کہ اُسکے ہیرو کو کاہل اور مجہول بتایا گیا ہے۔ ہمیشہ خیالات میں غرق رہتا ہے اور اسقدر سوچتا ہے کہ اس کا ارادہ مفلوج ہو جاتا ہے لیکن ہم اُسے کاہل یا بے حرکت اسی وقت کہہ سکتے ہیں جبکہ ان الفاظ سے ہم وہ معنی سمجھیں جو عام طور سے

سمجھے جاتے ہیں۔ اصطلاحاً ہیملٹ فعل و عمل سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کو قتل نہیں کر ڈالتا لیکن وہ ایک ایسے تماشے کا انتظام کرتا ہے جسے دیکھکر مجرم چونک پڑتے ہیں۔ ایکٹروں سے آرٹ پر بحث مباحثہ کرتا ہے جنگجو فارٹنبرا کے کاموں سے دلچسپی لیتا ہے۔ مناسب موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ——— پہلے اپنی ماں سے اس کا سبب دریافت کرتا ہے کہ اُسکے باپ کے قاتل سے اُس نے شادی کیوں کی؟ پھر غلط ارادے کے غلبے میں پولونیس کو مار ڈالتا ہے ——— لیرٹیز سے قبر میں لڑتا ہے اور بالآخر مرنے سے چند لمحے پہلے اپنے عمل مکافات کی تکمیل کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم اُسے وہ کام کرتے دیکھتے ہیں جو اُسے نہیں کرنے چاہئیں اور وہ کام نہیں کرتا جو اُسے کرنے چاہئیں۔ ہیملٹ چونکہ بلحاظ کردار مسحور کن ہے اسلئے جیسے جیسے وہ عمل سے نزدیک ہوتا جاتا ہے ہم اگر محو نہ ہوتے جائیں تو زندگی، آرٹ، جذبہ، موت، پر اسکی تقریریں سب بیجان و بیکار ہو جائیں۔ ہم یہ دیکھنے میں محو ہوں کہ وہ اپنا وقت ہر اُس چیز میں مستعدی سے صرف کرتا ہے جو اس وقت اُسکی توجہ کو جذب کرے اور اُس دن کو دور ہٹا دے جس دن کہ آخری فیصلہ کیا جائیگا اور آخری فعل عمل میں آئیگا۔ لیکن آخری فعل بھی عمل میں آجاتا ہے۔ کل ڈراما اس گہرے مشاہدے کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ جاتا کہ دُنیائے عمل میں ایک ہیملٹ نے اپنے تئیں کسقدر غمناک ناموزوں طریقے پر پیش کیا۔ یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ شیکسپیر نے اپنا سارا زور ہیملٹ کی تحلیلِ نفسی میں اسی طرح صرف کیا ہے جس طرح کوئی ماہرِ حیاتیات تشریحِ دماغ میں کاوش کرتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ چند قتل اور دیگر سنسنی پیدا کرنے والے واقعات ڈرامے میں شیکسپیر جا بجا اسلئے ڈالتا گیا ہے کہ ڈرامہ دیکھنے والوں کا دھیان لگا رہے اور وہ جگتے رہیں۔ شروع سے آخر تک شیکسپیر اس بات میں دلچسپی لے رہا ہے کہ ہیملٹ کا عملی قدم کیسا ہوگا۔ کوئی اگر یہ سوچتا ہے تو سوچا کرے کہ میں خود بھی ایک ہیملٹ بن جاؤں اور اپنے کاموں کی دیکھ بھال اتنی ہی بُری طرح کروں جتنی کہ ایک شاہزادہ کر سکتا ہے تو میرے لئے بہتر ہوگی یا نہیں؟ یا ایک قاتل جو بن جاؤں اور صمیم قلب سے مکافات کے معاملات کی نگہداشت کروں تو کیسا رہیگا؟ یہ ڈرامہ آج تک شیکسپیر کا سب سے زیادہ مسحور کن ڈرامہ ہے جس میں اس نے اپنی دلچسپی کا اظہار اس سلسلہ میں کیا ہے کہ انسان زندگی سے کس طرح مقابلہ کرتے ہیں۔ صرف خیال ہی نہیں بلکہ عمل بھی۔

تنقید کا قدیم مسئلہ ہے کہ ڈرامے عموماً انسانی افعال و حرکات سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ایسکلس سے لیکر ابسن کے ڈراموں تک جتنے بھی سنجیدہ ڈرامے ہیں ان میں سے بیشتر میں یہی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ مگر جب طربیہ ڈراموں کا ذکر آئیگا تو اُسکی حدود متعین کی جائیں گی اور ان جدید اختلافات کا بھی ذکر کیا جائیگا جنہوں نے قدیم روایاتِ بندش کو توڑ دیا۔ فی الحال ہم یہاں لفظ "عمل" کے ایک ناموزوں مفہوم سے آگاہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ بہت عرصہ ہوا شا نے اپنے نقادوں سے کہا تھا کہ تمہارا عقیدہ "عمل" کے متعلق یہ ہے کہ ایک مشہور شریف زادہ کسی مشہور شریف زادی کے تعاقب میں میز کے چکر لگاتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت اس چیز کو اداکار "اسٹیج بزنس" کہیں گے کیونکہ اسٹیج پر جتنی ایسی حرکتیں، اشارے اور جنبشیں کی جاتی ہیں جو ڈرامہ کی ادائیگی ہی کا ایک جزو ہوں "اسٹیج بزنس" کہلاتی ہیں۔ اسٹیج بزنس اور عمل کو ایک ہی سمجھ لینا غلطی ہے۔

اکثر بُرے ڈرامے بھی عمل سے مملو ہوتے ہیں۔ مثلاً میلو ڈرامے کو لیجئے۔ دُھن کے پکے بدمعاش اپنے کام تیزی و یقین کے ساتھ کرتے ہیں اور جو ہیرو ہوتے ہیں وہ معصوموں اور بے گناہوں کا بدلہ لینے کے لئے انتھک کوششیں کرتے ہیں مگر بیوقوفی اور نادانی کے ساتھ۔ ایسے ڈرامے قطعی بیکار ہوتے ہیں۔ اسلئے نہیں کہ ان میں حد سے زیادہ عمل ہوتا ہے بلکہ اسلئے کہ جتنے اعمال و افعال ہوتے ہیں سب خارج از قیاس اور ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ ویسے ڈراموں سے فطرتِ انسانی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ محض سنسنی پیدا کرنے والے ڈرامے بھی جو چونکا دینے والے واقعات سے اور اسٹیج کے شور و غل سے حد سے بڑھے ہوں اسی وجہ سے بُرے سمجھے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اگر کوئی ڈرامہ نگار افعال و اعمالِ انسانی میں دلچسپی لیتا ہے تو وہ اُن کے افعال و اعمال کے سبب میں بھی دلچسپی ضرور لیتا ہے، اور انہیں وہ اُنکے کوائفِ ذہنی میں تلاش کرتا ہے، انکے قرب و جوار میں، انکے ماحول میں اور جماعتی تعصبات میں تلاش کرتا ہے۔ کوئی عمدہ ڈرامہ ایسا نہیں ہوتا جو یہ نہ بتائے کہ افعال آخر سرزد کیسے ہوئے۔ اچھے ڈراموں میں ناممکن العمل باتیں پیش نہیں کی جاتیں۔ شیکسپیر کے "میکبتھ" کا مطالعہ کیجئے اور آپ دیکھیں گے کہ میکبتھ کی سنسنی پیدا کرنے والی زندگی کا ہر واقعہ اپنے ثبوت میں ایک نفسیاتی شہادت رکھتا ہے کہ اس نے یہ فعل کیوں کیا۔ تین پیشین گوئی کرنیوالی چڑیلیں اسکے ارادے کو ابھارتی ہیں ـــــ مگر شیکسپیر اسے واضح کر دیتا ہے کہ ارادہ تو اسکے دل میں پہلے ہی سے چھپا ہوا تھا۔ بظاہر اسکی بیوی نے اسے بادشاہ کے قتل کی ترغیب دلائی ـــــ لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ صرف میکبتھ کی ان آرزوؤں کو ابھارتی ہے جو اسکے دل میں پہلے ہی پوشیدہ ہیں اور اسکی حوصلہ افزائی کرتی ہے (جس طرح سب اچھی بیویاں کرتی ہیں) کہ وہ اس کام کو کر گذرے جسے وہ خود کرنا تو چاہتا ہے مگر کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ یہ ڈرامہ محض سنسنی پیدا کرنے والے واقعات پر مشتمل نہیں ہے بلکہ وہ صحیح توضیح ہے اس کی کہ میکبتھ جرائم کے سیلاب میں کیسے بہہ نکلا۔

شا نے بھی اسی طرح ان لوگوں کے مقاصد کی وضاحت کی ہے جنہوں نے جون کو جلا دیا۔ بشپ کوشان کے نزدیک اس کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ بغیر گرجا کی وساطت و توضیح کے خدا کی مرضی کو جاننے کا دعویٰ کرتی ہے۔ بشپ کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کی مرضی کلیتاً صرف گرجا والوں ہی پر منکشف ہوتی ہے اور یا چند خاص خاص اولیا پر۔ لیکن یہ گاؤں کی لڑکی جو مردانہ لباس پہنتی ہے اور گھوڑے پر مردوں کی طرح سوار ہوتی ہے اس کا شمار خدا رسیدہ لوگوں میں نہیں ہو سکتا۔ اور کوشان اسکے مطالبات میں اس نظریہ کی ابتدا دیکھتا ہے جو گرجا کو جڑ بنیاد سے کھو دیگا ـــــ اور وہ نظریہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک پر خود خدائی انکشافات بھی ہوتے ہیں۔ اور کوشان جانتا ہے کہ یہ کیتھولک گرجا ہی ہے جس نے اس تہذیب کو پروان چڑھایا جو سلطنتِ روما کے کھنڈروں پر بہ ہزار دقت قائم ہوئی۔ اسکے نزدیک گرجا کے لئے اگر کوئی خطرہ ہے تو تہذیب معرضِ خطر میں ہے۔ ایسی صورت میں کہ جب اسکا یہ عقیدہ ہو وہ سوائے اسکے کیا کر سکتا ہے کہ خطرے کو کچل ڈالنے کی کوشش کرے۔ وارک کے مقاصد اور نوعیت کے ہیں، وہ جاگیردار حکمرانوں کیلئے جون کے وجود کو خطرناک سمجھتا ہے اور اس سے چھٹکارا پانے میں خوش ہے۔ ان تمام مقاصد کو ہم پر واضح کرنے کیلئے بہت طول طویل مباحثوں کی ضرورت ہے۔ ملوڈرامہ لکھنے والا تو بہت سادگی سے بس چند الفاظ کوشان سے کہلوا دیتا جن سے سامعین کو معلوم ہو جاتا کہ وہ انسان کے روپ میں شیطان ہے اور بہ عجلت تمام جلانے کا منظر پیش کر دیتا۔

تنقیدی نظر سے پڑھنے والے جو شیکسپیر کو مگر اور شیلی جیسا نہیں سمجھتے بلکہ [illegible] کی ایسی تفصیل سمجھتے ہیں جسے تسلیم کر لینے سے پہلے سختی سے جانچ لیا جائے کہ معیار پر پوری بھی اترتی ہے یا نہیں، ایسے ڈرامے سے ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتے۔ [illegible] ان مرد اور عورتوں کے کوائفِ ذہنی پیش کئے گئے ہوں جنکی نقل و حرکت وہ دیکھ رہے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ڈرامے کے کرداروں کے اقوال اور اعمال ہی سے ڈرامے میں جاذبیت پیدا ہوتی ہے لیکن سب سے زیادہ جاذب و مسحور کن انسانی اعمال وہ ہوتے ہیں خصوصاً زمانہ جدید میں، جو دماغ میں متشکل و مرتب ہوتے ہیں۔ انکی تشکیل و ترتیب خاموشی سے ہوتی ہے۔ انکے ساتھ نہ تو تلواروں کی جھنکار ہوتی ہے اور نہ باجے گاجے کا شور ہوتا ہے جیسے چند لوگ کسی ایوانِ مجلس میں میز کے گرد بیٹھے ہوں یا آہستہ آہستہ بول رہے ہوں۔ اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ڈرامہ عمل سے بھرا ہوا بھی ہو اور شور و غل اور نظری ہیجان سے قطعاً [illegible] بھی ہو۔

سینٹ جون کے چوتھے منظر کو مثال کے طور پر لیجئے۔ اسی منظر میں شا نے استادانہ طریقے پر ان تمام اعتقادات، اغراض و تعصبات

کو واضح کیا ہے جو کوشاں اور وارک کے افعال و اعمال کے محرک ہوئے۔ وارک کے خیمے میں یہ دونوں میز کے قریب بیٹھے ہیں اور ایک مضحک انگریز پادری اُنکی گفتگو میں دخل دیتا جاتا ہے۔ ڈرامہ بینی کی عجیب و غریب نوخیز لڑکی (جوَن) اپنی کامیابی کی معراج پر پہونچ چکی ہے اور اب گرجا اور حکومت دونوں کو خوب معلوم ہو گیا کہ اُس کا وجود ان کیلئے خطرناک ہے۔ کوشاں اور وارک طویل منظروں میں اس لڑکی پر بحث کرتے ہیں جن میں یہ دونوں آدمی کچھ تو اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کرتے ہیں اور کچھ ان ارادوں کو ظاہر کرتے ہیں جو انہوں نے جوَن کے متعلق قائم کئے ہیں۔ ہر شخص نہ صرف اپنی رائے اور ارادے ظاہر کرتا ہے بلکہ اُس جماعت کا خیال اور ارادہ پیش کرتا ہے جس کی وہ نمائندگی کر رہا ہے۔ بعض حضرات کو جنہیں شا کے خیالات سے تکلیف پہونچتی ہے یا یوں سمجھئے کہ جنہیں ہر قسم کے خیالات سے تکلیف پہونچتی ہے اس منظر کو ناقابلِ برداشت بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو باتیں ہی باتیں ہیں اور شا بھول گیا کہ ڈرامہ کا تعلق عمل یا حرکت سے ہونا چاہئے۔ لیکن اُن لوگوں کو جنکو نہ تو شا سے اور نہ تخیّل کی محنت سے تکلیف پہونچتی ہے اس منظر میں جس میں صرف تین آدمی ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں شدید ترین تحرک یا عمل نظر آتا ہے۔ جب منظر کی ابتدا ہوتی ہے تو جوَن کی قسمت گویا ترازو میں ہوتی ہے۔ جب بحث مباحثہ ختم ہوتا ہے تو اُسکی تباہی ایک قدم اور بھی قریب ہو جاتی ہے۔ وارک کہتا ہے "ہم دونوں متفق الرائے ہیں" اور اگرچہ یہ قطعی صحیح تو نہیں ہے تاہم وہ اسے تسلیم کر لینے میں حق بجانب ہے کہ اگر لڑکی گرفتار کر لی گئی تو کوشاں اُسے قتل کرا دیگا۔ سوائے گفتگو کے اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ لیکن تباہی کے چنگل کو ہم نے صاف دیکھ لیا کہ جوَن پر اُس کی گرفت تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ خوف انگیز اثر پیدا کرنے کیلئے اُس چنگل کی خفیف ترین جنبش بھی کافی ہے۔ اس میں جنبش ہوتی ہے۔ ڈرامہ کا تحرک سنسنی پیدا کرنے کی حد تک بڑھ جاتا ہے۔

ڈرامہ نگار اپنے ڈرامہ کے واقعات فردِ خاص یا افرادِ خاص کے متعدد واقعات یا افعال سے ڈرامہ مرتب کرتا ہے۔ ان واقعات و افعال کو جو ڈرامہ میں پیش کئے گئے ہیں مجموعی حیثیت سے ڈرامہ کا "تحرک" کہا جاتا ہے۔ "میکبتھ" میں ایک زبردست جرنیل اولو العزمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ تخت حاصل کرنے کیلئے وہ اپنے بادشاہ کو قتل کر دیتا ہے۔ اسکے بعد ہی وہ اور قتل کرتا ہے۔ پہلے شاہی محافظین کو قتل کرتا ہے پھر ایک اپنے ہی جیسے سردار کو، بالآخر اپنے کل ہمسروں اور اُنکی آل اولاد کو موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔ اُسکے زمانِ حکومت میں چاروں طرف برہمی پھیلتی ہے۔ اُسکے خلاف ایک پارٹی تیار ہوتی ہے اور ڈرامہ کے اختتام پر اُسکی شکست اور موت نظر آتی ہے۔ یہ اس ڈرامہ کا "تحرک" ہے۔

ختم کرنے سے پہلے مختصراً یوں سمجھئے۔ دنیا کے بہترین سنجیدہ ڈراموں میں مردوں اور عورتوں کے افعال و اعمال کا زبردست مشاہدہ پیش کیا گیا ہے۔ ہم انہیں زندگی کے خاص خاص صبر آزما مواقع پر دیکھتے ہیں اور یہ دیکھکر کہ وہ کیا کرتے ہیں اور اُنکے افعال کے پوشیدہ اسباب کیا ہیں ہمیں اُن کے کرداروں کو بخوبی سمجھ لینے کا موقع ملتا ہے۔ اگر ہم روزمرہ کی زندگی کی تفصیلات کا ہمیں بہت کم علم ہوتا ہے۔ ان کا گہرا مشاہدہ کرنے کیلئے ناول کا مطالعہ کیا جائے۔ مگر انکے خاص خاص فطری رجحانات ہم پر بالکل آئینہ ہو جاتے ہیں۔ تو کیا ڈرامہ سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہے کہ یہ بھی کہانی کہنے کا ایک طریقہ ہے؟ کیا بڑے بڑے ڈرامہ نگار صرف تھوڑی دیر کیلئے ہمیں خوش کرتے ہیں؟ لوگوں کے افعال کو جس طرح ڈرامہ نگار پیش کرتا ہے اس کا کیا اثر ہوتا ہے؟ اثر یہ ہوتا ہے کہ چیزوں کے معنی کے متعلق اس کا جو ذاتی خیال ہوتا ہے اُسے پیش کر دیتا ہے۔ یا جیسا کہ کہا جاتا ہے زندگی کا ایک نظریہ پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا جس سے یہ بتایا جا سکے کہ ڈرامہ کے ذریعہ ہم زندگی کے کس نظریہ کو قبول کریں۔ کیونکہ ہر ڈرامہ نگار اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔ جب ہم حزنیہ ڈراموں اور سماجی ڈراموں کا ذکر کرینگے تو یہ بتانا ممکن ہوگا کہ دو ایک خاص ڈرامہ نگاروں نے چیزوں کے متعلق کس طرح خاص خاص نظریے پیش کئے ہیں جنہیں تسلیم کر لینے میں پس و پیش نہیں ہوتا اور وہ بھی اس طرح کہ انہوں نے صرف یہ بتایا ہے کہ لوگ کیا ہیں اور وہ کیا کام کرتے ہیں۔

(ا۔ آر۔ ولیمز)　　　　ش۔ ا۔

راہبہ

اس دنیا کے ہنگاموں سے کوسوں دور سر بفلک پہاڑ کی ایک بلند چوٹی ہے جس کی جبیں بوسی کیلئے آفتاب کی اولین شعاعیں ہمیشہ بیتاب نظر آتی ہیں۔ عرصۂ دراز سے ایک پرانی وضع کی خانقاہ اپنے کمزور شانوں پر ضعیف سر اٹھائے اب بھی قریب سے گذرنے والے لوگوں کو تارک الدنیا ہو جانے کی ترغیب دیتی ہے۔ اگرچہ اس وقت اسکی چار دیواری میں صرف پہاڑی الوؤں کی آماجگاہ ہے تاہم وہاں کی کائنات کا ایک ایک ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ کسی گذرے ہوئے زمانے میں ہمارے سینوں کو حسین و جوان دوشیزہ لڑکیوں اور ضعیف العمر کنواری عورتوں کے نازک قدموں کا بوجھ اٹھانا پڑا ہے۔ وہاں اب بھی ہری ہری گھاس ہے اور رنگ برنگ کے پھول نیچی نیچی وادیاں ہیں اور اونچی اونچی پہاڑیاں۔ سورج کا طلوع و غروب بدستور ہے۔ اور چشمے کی روانی حسب معمول۔ مگر وہ تمام رعنائیاں جو صرف عورت ذات سے وجود [illegible] ہیں قطعی معدوم ہو چکی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ اس خانقاہ کی چار دیواری میں ان حسین و جمیل عورتوں کا مسکن تھا جنہوں نے دنیا کے آب و گل کے ہر عیش و طرب سے منہ موڑ کر اور یہ سمجھ کر کہ معبود حقیقی کی خوشنودی صرف خواہشات نفس کو پامال کرنے کے بعد حاصل کی جا سکتی ہے [illegible] سے اس درجہ اجتناب روا رکھا تھا کہ [illegible] اس سایہ تک سے بچنے کی کوشش کرتی تھیں جس پر اس کا احتمال بھی ہو سکتا ہو۔

ان میں سے بعض ہستیاں اپنی زندگی کی آخری منازل طے کر رہی تھیں۔ اور ان کی خواہشات عرصہ ہوا کہ خون ہو چکی تھیں۔ نہ وہ ہمت تھی اور نہ دل میں وہ جذبہ جو صرف عہد شباب میں ممکن ہے۔ بلکہ اس پژمردہ پھول کی طرح تھیں جو مرجھا جانے کے باوجود بھی شاخ سے لگا ہو۔ برعکس انکے وہاں بعض ایسی نوخیز کلیاں بھی تھیں جنکو مذہبی تقدس نے شگفتہ ہونے سے روک رکھا تھا۔ ان کا تمام دن انجیل مقدس کی تلاوت اور مجسمۂ مریم کے سامنے رکوع و سجود میں گذرتا۔ اور ان کے وہ نازک ہاتھ جنکی نزاکت ظاہر کر رہی تھی کہ وہ صرف چومے جانے کیلئے بنائے گئے ہیں خانقاہ کے فرش پر جاروب کشی کرتے نظر آتے تھے۔ تمام دن گذارنے کے بعد جب وہ لیٹنے کیلئے بستر پر دراز ہوتیں تو خواب کی نگری میں زندگی کے وہ پہلو منور ہو کر ان کی نگاہ کے سامنے آتے جن کو الہامی کتابوں کے مطابق وہ تاریک سمجھتی تھیں۔ انہیں سا دکھائی دیتا کہ وہ ایک مرد کے بازوؤں میں ہیں۔ سینہ بہ سینہ لب بہ لب۔ اور زندگی کی اس شیرینی کو حاصل کر رہی ہیں جو ان کا پیدائشی حق ہونا چاہئے تھا۔ ان کی آنکھ کھل جاتی اور اس عادت کے مطابق جو ایک حد تک ان کی فطرت بن چکی تھی وہ ان آیات مقدسہ کا ورد کرنے لگتیں جن کے اثر سے شیطان بھاگ جاتا ہے کیونکہ ان کو بھی بتایا گیا تھا کہ ایسے خیالات صرف شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں لیکن اسکے باوجود ان کا ذہن اس کاوش میں مبتلا ہو جاتا کہ زندگی کا اصل مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ وہ سب جنسی قوتی کو موت [illegible] اگر انہیں اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتا۔ وہ جانا چاہتی تھیں مگر خود نہیں جا سکتی تھیں۔ اگر یہ خیال بھی انکے دل میں آتا تو اس خستہ خانقاہ کا ہر ذرہ ایک آنکھ بنکر ان کے اندر یہ احساس پیدا کر دیتا کہ وہ ان کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔

بیٹرس اپنے تقدس کی بنا پر ایک معمولی راہبہ سے ترقی کرتے کرتے خانقاہ کی سب سے بڑی منتظم بن گئی تھی۔ لیکن اسی نسبت سے اسکے جذبات میں بھی پراگندگی ہوتی گئی تھی۔ وہ عبادت میں سب سے زیادہ حصہ لیتی لیکن عبادت کے نقطۂ نظر سے نہیں۔ بلکہ اپنے جذبات کو کسی قدر تسکین دینے کے لئے کہ وہ مریم کے مجسمہ مریم کے سامنے دو زانو ہوتی صرف اس خیال سے کہ ان کے بطن میں ایک مرد نے جنم لیا تھا وہ

بیتاب ہو کر اِس پیکر کی بے حس انگلیوں کو چوم لیتی۔ اِس آرزو میں کہ کسی طرح اُس کے لبوں کو ایک مرد کے اعضا کا مس حاصل ہو جائے۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ بے جان مجسمہ ایک مردِ سنگتراش کا اعجازِ کمال ہے، اور دورانِ تشکیل میں اُسکے ہاتھوں نے لازمی طور پر اُسکو چھُوا ہوگا۔ وہ کتابِ مقدس میں سے حضرت یوسف کے حالات کا بار بار مطالعہ کرتی کیونکہ اُن کی زندگی کے ساتھ ایک افسانۂ حُسن و عشق وابستہ ہے۔ اکثر اتنی محویت اُس پر طاری ہو جاتی کہ انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جانے کے باعث کتاب تو قدموں میں آگرتی اور اُس کے بازو غیر ارادی طور پر آگے کی طرف بڑھ جاتے اِس اُمید میں کہ شاید کسی ایسے یوسف کا دامن اُسکے بھی ہاتھ میں آجائے جس کو دیکھنے سے آنکھ قاصر ہو مگر ہاتھ کی قوتِ لامسہ اس کا وجود محسوس کرلے۔

موسمِ بہار کا عالمِ شباب تھا یعنی وہ زمانہ جب جوششِ نمو زمین بھی اپنے سینے کے تمام پوشیدہ خزانے سطح پر اس طرح ڈالدیتی ہے کہ کوئی حصہ سبزے سے خالی نظر نہیں آتا۔ غنچے چٹکتے ہیں۔ طیور چہچہاتے ہیں۔ شبنم کی طراوت اور نسیمِ صبح کی اٹھکھیلیاں ایک انسان ——— اور وہ بھی صنفِ نازک ——— کے دل میں ان تمام جذبات کو بیدار کر دیتی ہیں جنکی حشر سامانیوں کے مقابلے میں بڑے بڑے سمندروں کا تلاطم بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ٹھیک اس موسمِ رنگ و بو میں بیٹرس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ ضبط کی حدیں ٹوٹ گئیں اور اُسکے سینے میں پیدا ہو جانے والا انقلاب کائنات کے برزورے سوسائٹی کے مرتب کئے ہوئے جملہ اصول حتیٰ کہ ان تمام احکامِ خداوندی کے بھی خلاف جہاد کرنے کے لئے محرک بن گیا جو اُس کے جذباتِ قلب کی تسکین میں سدِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس نے اپنے دن بھر کے لائحۂ عمل پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ عبادت اُسکی نگاہ میں ایک ایسا گناہ معلوم ہونے لگی جسکی اصلیت کو سماوی پیغامات کے پردوں میں اس طرح چھپا دیا گیا ہو جیسے گرجا کے مقدس پادری اپنے مسخ شدہ خدوخال کو لمبی لمبی داڑھیوں سے یہ کہکر پوشیدہ کر لیتے ہیں کہ یہ بھی خدا کا حکم ہے ——— اس نے تہیہ کر لیا کہ اس خانقاہ کی چار دیواری کو جس میں ایک زاہدہ کی زندگی بسر کرتے کرتے وہ تھک گئی ہے، خیر باد کہہ کر اس فضائے دلنواز میں چلی جائے جو راہبوں کی زبان میں کارگاہِ معصیت کہلاتی ہے۔

چاندنی رات تھی۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ اور سطحِ آسمان پر منور ہونے والی قندیلیں کرۂ ارض پر ضیا باری کر رہی تھیں۔ بیٹرس نے دریچے سے باہر نگاہ ڈال کر اس پُرکیف منظر کو دیکھا۔ اور اُس کے جسم میں وہ خفیف ارتعاش پیدا ہو گیا جو انتہائی مسرت کی علامت ہے۔ اُس نے فوراً ایک نئی پوشاک زیبِ تن کی۔ بالوں کو سنوارا اور خوب اچھی طرح تزئینِ جمال کرنے کے بعد اس سفر کے لئے آمادہ ہو گئی جس کی کوئی منزل اُس نے متعین نہیں کی تھی۔

روانہ ہونے سے قبل وہ آخری بار مقدس مریم کی بارگاہ میں گئی تاکہ رخصت کی اجازت لے لے۔ ایک معمولی مشعل کی مدھم روشنی میں جب اُسکی پہلی نظر اس مجسمہ پر پڑی تو اُسے اندیشہ ہوا کہ مجھے روکنے کے لئے کہیں ان ساکت و صامت اور بےحس اعضا میں قوتِ عمل پیدا نہ ہو جائے۔ اُس نے سراسیمگی کے عالم میں مڑ کر پیچھے نظر ڈالی۔ یہ معلوم کرنے کیلئے کہ وقتِ ضرورت فرار ہونے میں کوئی رکاوٹ تو درپیش نہیں ہوگی۔ پشت کی دیوار پر اس کا سایہ ایک عفریتی پیکر کی طرح رقص کر رہا تھا۔ وہ سہم گئی جسم کپکپانے لگا۔ مگر ہمت کرکے آگے بڑھی۔ اس نے دیکھا کہ آج غیر معمولی طور پر مریم کے لبوں پر تبسم کی ایک ہلکی جھلک نمودار ہے۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور ان کنجیوں کا گچھا مجسمے کے قدموں میں ڈالدیا جن سے روزانہ وہ خانقاہ کے تمام دروازوں اور صندوقوں کو کھولتی اور بند کرتی تھی۔ پھر دوزانو ہو کر اس نے کہا۔

"مقدس ماں! میں نے اپنے موسمِ حیات کی اٹھارہ بہاروں کو تیرے نذر کر دیا۔ لیکن انکے عوض تو نے مجھے کچھ بھی نہیں دیا۔ تو اتنا بھی نہ کر سکی کہ میرے سینے میں کسی طرح جذبات مشتعل نہ ہوتے۔ میرے دل میں یہ احساس پیدا نہ ہوتا کہ اس محدود زندگی کے علاوہ ایک زندگی اور بھی ہے جہاں روحانی انبساط کے ساتھ جسمانی لذت بھی ہوتا ہے۔ تجھے چاہیئے تھا کہ اس خانقاہ کی دنیا میں میرے لئے وقت اور جگہ کے تعینات قائم کر دیتی۔ اقتضائے عمر مجھے ترغیبِ معصیت نہ دیتا۔ باقی دنیا کی رنگینیاں میرے لئے ایک عورت گناہ نہ تھیں۔ تو نے میری خدمات کا اعتراف بھی نہیں کیا۔ تو نے چشم و ابرو کی حرکت سے یا ہاتھ کی جنبش سے میرے طریقہ کار کو سراہتے ہوئے کبھی اپنی خوشنودی ظاہر نہیں کی۔ آخر میں کس طرح سمجھوں کہ تارک الدنیا ہو کر تمام عالمِ رنگ و بو سے اپنے آپ کو محروم کر لینا حقیقی زندگی ہے! تو بے جان ہے تیرے جسم میں خون نہیں ہے لیکن میں ذی حیات ہوں۔ اور چاروں طرف سے طوفانِ شباب نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ تو میرے جذبات کی حقیقت سمجھ ہی نہیں سکتی۔ تیرے پاس نہ دل ہے نہ دماغ۔ تصورات کی نگری میں تو اپنے اس عہد کو بھی نہیں دیکھ سکتی جب میری طرح زندہ اور جوان تھی۔ قوتِ حافظہ تیرے اندر سے مفقود ہو چکی ہے۔ مذہبی احکام کے مطابق میں نے ایک مدت تک تیری پرستش کی حتیٰ کہ خود میرے دل میں یہ معلوم کرنے کی آرزو پیدا ہو گئی ہے کہ آخر بت بنے جانے میں کیا لطف ہے جو تو اس طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہتی ہے! اور اپنی اس بے جان زندگی سے نہیں اکتاتی۔ آج رات تک میں خلوصِ قلب کے ساتھ تیری اور صرف تیری پرستار رہی۔ لیکن اب نمودِ سحر سے قبل خود اپنی ہستی کو پرستیدۂ عالم بنانے کیلئے اس خانقاہ کی محدود دنیا کو خیرباد کہہ دوں گی۔ یہاں سے رخصت ہو جانے کی مجھے اجازت دیدے کہ یہ تیرا فرض ہے۔ ورنہ میں خود چلی جاؤں گی کہ یہ میرا حق ہے۔ اٹھ! اور ان کنجیوں کو اٹھا لے۔ اپنے بے جان مجسمے کو میرے پیکرِ ذی حیات میں تبدیل کر کے بیٹرس بن جا۔ اگر تجھے میری نیک خدمات کا ذرا بھی پاس ہے تو میرے آئندہ ہونے والے ان افعال کو جو خانقاہ کی زبان میں معصیت کے مترادف ہیں اپنے خطاپوش دامن سے ڈھانک دے۔ میں واپس آؤنگی اور ضرور آؤں گی لیکن اس وقت جب آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے بعد کوئی رکاوٹ ایسی باقی نہیں رہتی جو عبادت میں خلل انداز ہو سکے۔ اچھا اب رخصت ہوتی ہوں۔ وقت آگیا ہے کہ تو ان کنجیوں کو اٹھا کر عارضی طور پر بیٹرس بن جائے۔"

یہ کہہ کر اپنے دامن سے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے وہ خانقاہ کے باہر چلی گئی۔ وہ حیران و ششدر تھی کہ آخر کونسی راہ اختیار کرے۔ کچھ دیر وہ ایک راہ گم کردہ مسافر کی طرح کھڑی رہی جسے منزل کا پتہ نہ ہو۔ مگر اس خوف سے کہ نمودِ سحر سے قبل اُسے خانقاہ سے کافی دور چلا جانا چاہیئے۔ ورنہ سب بھید کھل جائیگا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے سب سے زیادہ چوڑی سڑک پر روانہ ہو گئی کیونکہ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ کافی دور جانے کے بعد ختم ہو گی۔ وہ سہمی ہوئی جا رہی تھی کہ کوئی اُسے فرار ہوتے ہوئے دیکھ نہ لے۔ یا کوئی جنگلی جانور حملہ نہ کر بیٹھے۔ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ اس کا دل ہلنے لگتا۔ واہمہ کے کرشمے عجیب و غریب ہیولے اُسکی نظر کے سامنے پیدا کر دیتے۔ کبھی کبھی وہ منفعل بھی ہونے لگتی ہے اس کا ہر قدم قعرِ معصیت کی طرف اٹھ رہا ہے۔ لیکن جوانی کا جوش ان تمام احساسات پر غالب آجاتا اور وہ ایک استدلال بے دلیل کے ساتھ اپنے دل کو تسلی دینے لگتی کہ حقیقتاً مقدس طرزِ زندگی وہی ہے جسے اختیار کرنے کا اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ہوا کے تیز جھونکے اسکے دامن کے ساتھ اٹکھیلیاں کر کے بعض حصوں کو عریاں کر دینے کی کوشش کرتے اور وہ محجوب ہو کر جلدی سے دامن سنبھال لیتی کہ کہیں ان حصۂ جسم پر جسے چشمِ ماہتاب نے بھی اس وقت تک نہ دیکھا تھا کسی نامحرم کی نظر نہ پڑ جائے۔ وہ تھک گئی بہت جلد تھک گئی۔ کیونکہ اُسے زیادہ چلنے پھرنے کی عادت نہ تھی۔ مگر تخیل کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ ہوا۔ آخرکار وہ ایک چشمے کے کنارے کچھ دیر سستانے کے لئے بیٹھ گئی۔ اس کا دماغ کام کرنے سے عاجز تھا۔ وہ تصورات کی دنیا میں اپنے مستقبل کو دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر سوائے ماضی کے نقوش کے

اُسے کچھ نظر نہ آتا تھا جس نے کبھی ڈالی پر کھلا ہوا پھول نہ دیکھا ہو وہ کس طرح اُسکے رنگ و بو سے آشنا ہو سکتا ہے۔ وہ کافی دیر تک اپنے خیالات میں محو وہیں بیٹھی رہی حتیٰ کہ سورج کی شعاعوں نے مشرقی جہت میں نور پاشیاں شروع کر دیں۔ اُس نے کئی مرتبہ اُٹھنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار اس سوچ میں رہ گئی کہ اب کس طرف جائے۔ وہ اپنے خیالات میں تھی کہ اچانک ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور تھوڑی دیر میں ایک فوجی افسر گھوڑے کو پانی پلانے کے لئے چشمے کے کنارے آگیا۔

نگاہوں کا ملنا تھا کہ بیٹرس کے تمام جسم میں کپکپی سی پیدا ہو گئی۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی اس احساس کے ساتھ کہ اگر یہ اجنبی شخص بدمعاشی پر اتر آیا تو آج عزت و آبرو کی خیر نہیں ہے۔ فوجی افسر نے گھوڑے کو پانی پلاتے وقت ایک دو بار نظر اُٹھا کر اُسکی طرف دیکھا۔ اور جب اس کام سے فارغ ہو گیا تو واپس جانے سے قبل کسیقدر ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا۔ "محترم خاتون! کیا میں کسی طرح آپ کی خدمت کر سکتا ہوں؟"

بیٹرس پر گویا بجلی سی گر پڑی ہوش سنبھالنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ بالکل تنہائی کے مقام پر ایک ناواقف شخص نے اُسے اسقدر قریب سے مخاطب کیا کہ اگر وہ اپنے بچاؤ کیلئے وہاں سے فرار ہو جانے کی کوشش کرتی تو ہرگز کامیاب نہ ہوتی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ باوجود کوشش کے آنکھیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔ اور ایک اضطراری کیفیت میں گھاس کے ایک تنکے کو اس طرح چبانے لگی۔ گویا وہ سب قصور اس کا تھا۔ وہ اعراب میں آچکی تھی۔ نہ بھاگ نکلنے کا موقع تھا نہ بالکل خاموش رہنے کا محل۔ چنانچہ جب افسر نے اپنے استفسار کو دہرایا تو اُسے مجبوراً بولنا ہی پڑا۔ مگر اس طرح گویا کہ وہ خود نہیں بول رہی بلکہ الفاظ اپنے آپ نوکِ زبان پر ادا ہو رہے ہیں اُس نے نہایت مختصر الفاظ میں افسر کے ہمدردانہ التفات کا شکریہ ادا کر دیا۔ اور یہ پھر بھی نہ کہا کہ کسی قسم کی خدمت درکار ہے یا نہیں۔

نو وارد نے دو ایک قدم آگے بڑھا کر پھر پوچھا "مجھے بتا دیجئے آپ کون ہیں؟ کہاں سے آرہی ہیں؟ اور کس طرف کا ارادہ ہے؟ آبادی یہاں سے بہت دور ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ پیدل گئیں تو تھک جائیں گی۔ آپ کو ناگوار معلوم نہ ہو تو میرا گھوڑا سواری کیلئے موجود ہے"۔

اُس نے خاص طور پر آخری جملہ کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ بیٹرس کو تابِ ضبط نہ رہی۔ اُسکی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اور اُس نے فرار ہو جانے کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے صحیح جذبات بھی اس پر ظاہر کر دئے۔ اس نے صاف کہدیا کہ میں دُنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کیلئے خانقاہ کی محدود دُنیا سے بھاگ رہی ہوں۔

یہ سُنکر فوجی افسر مسکرانے لگا۔ اور ان چھوٹے چھوٹے سنگریزوں پر جو پانی کی روانی کے ساتھ پہاڑوں سے بہ آئے تھے ٹکٹکی باندھکر گھورنے لگا۔ اس کا دماغ کسی کاوش میں مبتلا ہو گیا۔ وہ بیٹرس کی زبان سے سُنے ہوئے واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسکے لئے کوئی لائحہ عمل مرتب کر رہا تھا۔ اسکے سینے کا نشیب و فراز، سانس کی سرعت، اور چہرے کا اُترتا چڑھتا رنگ ظاہر کر رہا تھا کہ خود اسکے جذبات میں بھی ایک ہیجان رونما ہو رہا ہے۔ آخر اُس نے نہایت محبت بھرے الفاظ میں بیٹرس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اگر تم میرے ہمراہ چلنے اور میرے ساتھ رہنے کے لئے تیار ہو جاؤ تو تمہارے لئے وہ لطیف اور خوشگوار فضا میسر آسکتی ہے جس میں سانس لینے کے لئے تمہارا دل بیتاب ہے۔ میری طرف دیکھو میں بھی جوان ہوں، اور مجھے ایک شریک حیات کی ضرورت ہے۔ ہر چند مجھے ایک راہ چلتی خاتون سے اسقدر جلدی بے تکلف ہونا نہیں چاہئیے تھا لیکن جب تم نے اپنی رام کہانی کہہ سنائی تو مجھ سے کیوں خاموش رہا جائے۔ میرے دل کی بیتابیاں بھی تم سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ میرا قیاس ہے کہ ہماری باہمی زندگی خوشگوار گذریگی"۔

بیٹرس کو کیا پس و پیش ہو سکتا تھا۔ وہ کوئی خاص فیصلہ کر کے روانہ نہیں ہوئی تھی۔ اُسے دُنیا کا تجربہ نہیں تھا۔ اور یوں بھی عورت ذات مرد کے سامنے مجبور ہو جانے والی ہستی۔ لہذا کوئی جواب دئے بغیر وہ چلنے کیلئے تیار ہو گئی۔ افسر نے کاٹھی کے آگے اپنا لمبا چغہ باندھکر ایک زائد نشست کا انتظام کیا۔ دونوں سوار ہوئے۔ اور ایک نامعلوم دُنیا کی روشنی میں بیٹرس کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔

سہانا وقت، سبزہ زار، اور ہوا کے لطیف جھونکے ـــــ قریب و جوار کی فضا بھی کچھ کم خوشگوار نہیں تھی مگر بیٹرس نے کسی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس وقت اُسکے خیال کے مطابق دُنیا کی تمام رنگینیاں اور رعنائیاں محدود ہو کر صرف دو حصّوں میں ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھیں۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ دُنیا میں انسانی آبادی کی ابتدا محض چند لمحے پیشتر ہوئی ہے۔ اور خالقِ حقیقی نے کرۂ ارض پر پہلی مرتبہ آدم و حوا کو ایک ہی گھوڑے پر سوار کر کے جنت سے بھیجا ہے۔ کچھ دیر وہ سیدھی بیٹھی رہی۔ اور اُسکے بعد پیچھے کی طرف جھکتے جھکتے اپنے شریکِ سفر کے آغوش میں اسطرح پہنچ گئی کہ اُسے بھی راسیں کھینچکر کچھ دیر کیلئے رفتار کو کم کر دینا پڑا۔ پھر وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا ـــــ آنکھیں ملیں، سینہ ملا، چار لب ملے، انتہائی پیار کے ساتھ۔ اور ایک دفعہ نہیں، بار بار۔

دس سال گذر گئے۔

فوجی افسر کے مر جانے کے بعد بیٹرس کے جذبات کی حدود دُنیا صد درجے وسیع ہو گئی۔ ہر رات وہ ایک نئے آدمی کی زینتِ آغوش ہوتی۔ اور اپنے اس فعل پر کبھی منفعل نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ اپنے پندار میں قدرت سے زبردست انتقام لے رہی تھی۔ اسکی اس بے توجہی کا کہ اُسنے عہدِ شباب میں خانقاہ کی چار دیواری کے اندر کیوں قید رکھا گیا جبکہ وہ دُنیا کی رنگینیوں میں ایک شریف ناتواں کی طرح سانس لینے کی حقدار تھی اسی لئے وہ اس مذموم فعل کو بھی مقدس سمجھکر روا رکھتی تھی۔

ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے جس طرح ایک روز اس نے اپنے زہد و اتقا کو خیرباد کہہ دیا اسی طرح ایک وقت آیا کہ اس کے جذبات بالکل سرد ہو گئے۔ اور اس نے سوچا کہ پھر اسی خانقاہ میں چل کر عبادت میں باقی زندگی گذار دی جائے۔ حالانکہ وہ خائف تھی کہ وہاں کی راہبات اسے دھتکار دیں گی لیکن مذہب کے اس اصول نے اسکی ہمت بندھا دی کہ اگر مقدس مریم کے مجسمے کے سامنے جھک کر اعترافِ گناہ کر لیا جائے تو تمام تردامنیاں دور ہو جاتی ہیں۔

دس سال کا طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود وہ خانقاہ کے چپے چپے سے واقف تھی چنانچہ ایک چور دروازے کی راہ اس چاردیواری میں داخل ہو کر سیدھی اس جگہ پہونچ گئی جہاں مریم کا مجسمہ سنگین چبوترے پر رکھا تھا۔ وہ اس مقام پر رک گئی جہاں کھڑے ہو کر ہیجانِ جذبات کے باعث ایک دفعہ اپنی مقدس ماں کے ساتھ سخت کلامی کی تھی۔ ماضی کی اس یاد سے وہ لرز گئی۔

رات کا وقت تھا حسبِ معمول ایک چھوٹے سے چراغ کی مدھم روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اور دیواروں پر پڑنے والے سائے تھرتھراتی ہیکلوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ بیٹرس معصوم مورت کے قدموں کی طرف جھکی ہی تھی کہ اس میں حرکت پیدا ہو گئی۔ پہلے صرف دایاں ہاتھ اٹھا اور پھر تمام جسم۔ مقدس ماں سیڑھیوں پر سے اتر کر بیٹرس کے بالکل قریب کھڑی ہو گئی۔ اور ایک ایسے سماوی لہجے میں جسے ہمیشہ الہام سے تعبیر کیا گیا ہے اس سے کہنا شروع کیا۔

"میں خوش ہوں کہ تم واپس آگئیں۔ اور اب میرے لئے اپنے فرائض سے سُبکدوش ہونا ممکن ہو جائے گا۔ تمہارے جانے کے فوراً بعد

میں زندہ ہوجانے کیلئے مجبور ہوگئی تھی میں نے ایک دوسرا مجسمہ اپنی جگہ رکھدیا اور خود تمہاری شباہت اختیار کرکے بیٹرس کے فرائض انجام دینے لگی۔ حتی کہ خانقاہ کی کسی راہبہ کو شبہ تک نہ ہوا کہ اصل بیٹرس اسوقت کہاں ہے۔ وہ مجھ سے اس طرح ملتی تھیں گویا تم ہی سے مل رہی ہیں۔ میں نے اس تمام عرصے میں تمہاری طرح روزانہ فرش کی جھاڑو دی۔ عبادت گاہ کی گھنٹیاں بجائیں۔ تمام دروازوں اور صندوقوں کو ہر شب بند کرتی اور ہر صبح کھولتی رہی۔ میں نے خود اپنے نام پر درود پڑھا اور اپنے ہی مجسمے کے سامنے سر جھکایا کیونکہ اس وقت میری انانیت تمہارے وجود میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اب تم واپس آگئی ہو اپنے فرائض کو انجام دو۔ اُٹھالو ان کنجیوں کو، یہ تمہارے سپرد ہیں۔ آج رات دروازے میں نے بند کئے تھے۔ لیکن صبح کے وقت تمہیں کھولنے ہونگے۔ مطمئن رہو، کوئی راہبہ تم کو شبہ کی نگاہوں سے نہیں دیکھے گی۔ خبردار! اپنا راز کسی سے نہ کہنا۔ میں تمہیں مجبور بھی نہیں کرونگی کہ اعترافِ گناہ کرو کیونکہ اس طرح تمہیں روحانی اذیت ہوگی۔ تمہارا ہر فعل میرے علم میں ہے۔ میں یہیں رہکر تمہاری نقل و حرکت دیکھا کرتی تھی۔ تم نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ کیونکہ عہدِ شباب کا اقتضا یہی تھا کہ تم خانقاہ سے مُنہ موڑ کر دُنیا کی رنگینیوں میں محو ہوجاؤ اور سوائے اپنے جذبات کے ہر چیز کو عارضی طور پر فراموش کردو۔ چار دیواری میں قدم رکھتے ہی تمہارے گناہ معاف کردئے گئے تم اسی طرح پاک و معصوم ہو جس طرح دس سال پہلے تھیں۔ میں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ تم نے اپنی عبادت کا صلہ طلب کیا تھا۔ جاؤ اب نفس کی کوئی خواہش تمہیں عبادت سے منحرف نہیں کرے گی۔"

کنجیاں بیٹرس کے سپرد کرکے مقدس ماں پھر بے حس و حرکت ہوکر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ اور کسی راہبہ کو کانوں کان خبر تک نہوئی کہ دس سال کے وقفے سے دو راتوں میں اس خانقاہ کی چار دیواری کے اندر ایک ہی ڈرامے کے دو منظر ہوئے اور ہوکر رہ گئے۔

دوسرے دن سے بیٹرس ان راہبات کے ساتھ اس طرح ل جل گئی گویا جدائی کا وقفہ ایک رات سے زیادہ نہیں تھا۔

فضل حق قریشی دہلوی

ساقی کا آئندہ پرچہ "افسانہ نمبر" ہوگا

"افسانہ نمبر" کیلئے مندرجہ ذیل حضرات کے مضامین آچکے ہیں:

مولوی عنایت اللہ بی۔ اے۔	اختر حسین رائے پوری بی۔ اے	شاہد احمد بی۔ اے (آنرز)	سعادت حسین منٹو۔
خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی۔	دیوانہ بریلوی۔	ظفر قریشی۔ بی۔ اے۔ دھلوی۔	طاہرہ دیوی شیرازی۔
ایم۔ اسلم۔	ڈاکٹر اعظم کریوی۔	انصار ناصری۔ بی۔ اے دہلوی	تمنائی
مرزا عظیم بیگ چغتائی۔	آرزو جلیلی۔ ایم۔ ایس۔ سی۔	فضل حق قریشی۔ دھلوی۔	ابو طاہر داؤد۔ بی۔ ایس۔ سی۔
علامہ مضحک دھلوی۔	سید وقار عظیم۔ ایم۔ اے۔	سید ممتاز حسین۔ بی۔ اے (آنرز)	ماہر القادری
ناکارہ حیدرآبادی	سید محمود مورخ۔ بی۔ اے۔	صادق الخیری دھلوی	منظر صدیقی اکبرآبادی

ان کے علاوہ اور حضرات کے افسانے بھی شامل ہونگے

قیمت فی پرچہ ۱ر مستقل خریداروں کو مفت

رات کی کہانی

میرے دماغ کی تاریک گہرائیوں میں بہت سی باتیں ہیں، میں چاہتی ہوں انہیں بھولجاؤں، لیکن جیسے تیز ہوا کے جھونکے راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکا دیتے ہیں، ماضی کی یاد بھی ان گذری ہوئی باتوں کو اُکساتی ہے۔ میں سب کچھ کہدینا چاہتی ہوں۔ ایکبار، صرف ایکبار پھر ہمیشہ کیلئے خاموش ہوجانیکو۔ .... لیکن کون ہے جو انہیں سنے گا؟ یہ دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اُٹھنا چاہتی ہیں، پھر ہمیشہ کے لئے سرد ہوجانیکو.... لیکن کون ہے جو ان کی کمزور چمک کو دیکھے گا؟.... تاہم میں کہوں گی چاہے کوئی سُنے یا نہ سُنے۔ میرے حافظہ میں بہت سی باتیں ہیں کتنی داستانیں۔ میں نے کیا کیا دیکھا؟ اگر سب کی سب کہنے بیٹھوں تو کبھی ختم نہ ہو.... تاہم میں کہونگی، کہنے کی کوشش کرونگی۔

میری کہانیاں سب کی سب گناہ کی کہانیاں ہیں، یا پھر غم کی۔ اور دُنیا میں گناہ اور غم کے سوا اور ہے ہی کیا؟ دلکش، رنگین، ہیبتناک گناہ.... سرد، تاریک، چبھتے ہوئے غم!.... میں نے صرف گناہ ہی دیکھا ہے یا پھر انکا عکس ــــ غم!.. میں نے صرف گناہ ہی کے نغمے سُنے، یا پھر انکی بازگشت ــــ غم!.. میں نے نفس و ہوس کی دہکتی ہوئی آگ دیکھی ہے جس سے میرا رُواں رُواں ٹھٹھر گیا! اور دکھ کی سیاہ آنسو بھری تپش سے میں جل اٹھی!... یہی گناہ، فریب، ہوس کی داستانیں ہیں جو میرے دماغ میں ہلچل مچاتی ہیں، جو میرے تمام احساسات و تفکرات کا گلا گھونٹے ڈالتی ہیں۔ میں انہیں آج کہدینا چاہتی ہوں... شاید اس طرح میرا سینہ ہلکا ہوسکے۔

میری داستان کا کوئی اور چھور نہیں۔ نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا.... میں جب نظریں گھما کر اپنے نہاںخانۂ دل میں دیکھتی ہوں کہ کہاں سے شروع کروں تو مجھے کچھ پتہ نہیں ملتا۔ ماضی کی روش پر میرا حافظہ دوڑتا ہے لیکن تمام تاریکیاں ہی تاریکیاں ہیں۔ گناہ کی غلیظ تاریکیاں...

میں نے فریب خوردہ انسان کے دعوہ ہائے باطل و ابلہ سُنے ہیں اور اپنے تجربات کی بنا پر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے، نفرت و افسوس کی ہنسی، یہ بزعم خود عاقل انسان کتنا مکار ہے، کتنا نادان! اپنے کو دو جنس میں بانٹ کر ایکدوسرے پر کتنی تہمتیں تراشتا ہے، مرد عورت کو گناہ کی دیوی معصیتِ مجسم کہتا ہے۔ عورت مرد کو ہوس کا بندہ، نفس کا غلام گمراہ کرنے والا کہتی ہے!... آہ! نادان احمق، نہیں جانتے کہ دونوں ہی گناہ ہیں۔ انسان کی آفرینش ہی معصیت ہے! یہ دُنیا پاپ ہے! کائنات بھی پاپ ہے! سب کچھ صرف گناہ ہے اور آنسو!...

اگر تم دیکھ سکتے جو کچھ میں دیکھتی ہوں!.... میں نے منصوبوں کو دیکھا ہے جو بھائی اپنے بھائی کو قتل کرکے اسکی جائداد اسکی ملکیت پر قبضہ کرنیکو باندھتا ہے، میں نے ان شیطانی ارادوں کو بھی دیکھا ہے جو دوست اپنے دوست کی عورت کو حاصل کرنے کیلئے کرتا ہے.... میں نے ان مشوروں کو بھی دیکھا ہے جو مرد عورت چھپ چھپ کر اپنے نفس کی پیاس بجھانیکو کرتے ہیں.... میں نے اس بہیمانہ چمک کو بھی دیکھا ہے جو مرد کی آنکھوں میں ایک جوان عورت کو دیکھکر آتی ہے! اور اُس پُرہوس حریص تبسم کو بھی جو عورت کے ہونٹوں پر ایک جوان مرد کو دیکھکر جھلکتا ہے۔ میں نے کمزور کمسن چھوکروں کے جذبات کو بھی پڑھا ہے جو رنگین تیتریوں تک ہاتھ بڑھانے سے ڈرتے ہیں اور صرف خیال ہی کرکے اپنی خواہشات پوری کر لیتے ہیں!.... ان کنواری ڈرپوک مجبور لڑکیوں کے احساسات سے بھی واقف ہوں جو ڈر سے صرف مردوں کا تصور کرکے کانپتی ہیں اور ان تک پہنچ نہیں سکتیں!.... انسان کی تمام سیہ کاریاں مجھ پر عیاں ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کس طرح مرد، عورت، لڑکے، لڑکیاں، میری تاریکیوں کی آڑ لیکر کھل کھیلتے ہیں، کس کس طرح اپنے ہاتھ رنگتے ہیں۔ میں انکی ہوسناکیوں کے کھیل سے آگاہ ہوں!....

میں نے دیکھا ہے، میں دیکھتی ہوں کہ میری تاریکیوں میں نفس و ہوس کی انتہائی سیہ کاریوں میں غرق ہو جاتے ہیں . . . . اور پھر روشنی میں آنکھیں جھپکاتے، دامن جھاڑکر اپنی پارسائیوں اور نیکیوں کی داستان سنانے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر میری طرح تم بھی دیکھ سکتے کہ ان کی خلوتوں میں کیا ہوتا ہے۔ کیسے یہ ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھاکر کچل دینے کی فکر میں ہوتے ہیں! یہ باطل پرست، حرص و ہوس کا غلام، انسان!

لیکن ان تمام سیہ کاریوں اور ہوسناکیوں کیساتھ آنسو بھی ہیں۔ آہ! یہی تو ستم ظریفی ہے! اسکی نفس پرستی دیکھ کر میں غصہ سے جل اُٹھتی ہوں لیکن اسکی جگر خراش آہیں، اسکے لالہ گوں آنسو میری رگوں میں خون جما دیتے ہیں، اسکے گناہ و معصیت کی حرکات پر میں اسے اپنی غصہ کی آگ میں جلا ڈالنا چاہتی ہوں، لیکن اسکے آنسوؤں پر مجھے افسوس بھی آتا ہے . . . .

مرد محبت کرتا ہے، محبت! ؟! غزلیں لکھتا ہے نظمیں لکھتا ہے۔ دعوتِ گناہ دیتا ہے! عورت جھجکتی، لجاتی — بادلِ ناخواستہ نہیں کیونکہ اسے خود اسکی تمنا ہے! — آگے بڑھتی ہے اور اسکے گود میں جاگرتی ہے . . . . اور پھر جب سب کچھ ہو جاتا ہے طلسم ٹوٹ جاتا ہے تو وہ رو پڑتے ہیں! کیوں؟ اپنی کامیابی پر؟ . . .

عورت اپنی اداؤں کے جال پھیلاتی ہے، دونوں معصیت کے خوشنما دروازہ کیطرف بڑھتے ہیں . . . . اور پھر؟ اس "دیوانہ قہقہہ" یا گریہ ہا کے پیچھے کیا ہوتا ہے؟ . . .

کون ہے جو گناہ اور آنسو کے پردہ پر ان کٹھ پتلیوں کو نچاتا ہے؟ . . . . . یہ کیا ہے؟ کیسے ہے؟ کیوں ہے؟ . . . کون جانے! کون اس گتھی کو . . . . ؟

لیکن میں کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ فلسفہ کی موشگافیوں سے مجھے کیا مطلب، مجھے تو صرف داستان سنانی ہے —

— لیکن ستارے آنکھ جھپکانے لگے۔ اچھا تو پھر . . . .

تمنائی!

انجام

میں سیر کے لئے باغ کی روش پر سے گذر رہا تھا۔ دونوں طرف آم، جامن، اور نخلِ حیات کے گھنے درخت اُگے تھے، کہیں کہیں حِنا اور سرو باغ کی بہار کو دوبالا کر رہے تھے۔ نیچے زمین پر سرسبز گھاس کا مخملی فرش بچھا ہوا تھا۔

چلتے چلتے، دور سے، اچانک میری نظر شوخ رنگ کے ایک دلکش سُرخ پھول نے اپنی طرف کھینچ لی۔ میں نرم نرم، ٹھنڈی گھاس کو مسلتا ہوا اُس تک جا پہونچا . . . . . یہ گلاب کا پھول تھا، اور گلاب کے پودے کی چوٹی پر پتیوں میں چھپا ہوا تھا، اسکی ننھی ننھی سُرخ پنیاں دوسرے پھولوں سے کہیں زیادہ دلکش تھیں اور پودے کے بارش سے دُھلے ہوئے سرسبز پتوں میں سے عجب انداز میں جھانک رہی تھیں . . . . . میں اُسکے پاس قدرت کے بچھائے ہوئے سبز مخملی فرش پر بیٹھ گیا۔ اور دیر تک صانعِ عالم کی صنعت گری پر جو پھول کے شوخ رنگ میں نمایاں ہو رہی تھی، غور کرتا رہا۔ اس وقت میں دنیا و ما فی آلام سے اپنے دل میں ایک سرمدی سکون محسوس کر رہا تھا۔

قدرت کاملہ کے اس بہترین منظر کا مطالعہ کرتے کرتے میری نظر اچانک پودے کی جڑ پر کسی غم انگیز چیز نے جذب کر لی . . . . . یہ گلاب کا پژمردہ پھول تھا۔ شاید ابھی پودے پر سے زمین پر گر پڑا ہوگا۔ اس کا رنگ خراب ہو چکا تھا اور اسکی مرجھائی ہوئی پتیاں سُکڑ کر ساتھ ساتھ مل چکی تھیں۔ نہ اس میں پہلی سی تروتازگی دکھائی دیتی تھی اور نہ دلکشی میں نے اُسے زمین پر سے اٹھا لیا اور پودے پر کے نوشگفتہ پھول پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی۔ میرے دل سے ایک

"محبت دُور کرنے کی دوا"

پروفیسر گیو کونی، نیپلز کے ایک مشہور ڈاکٹر تھے۔ ان کا مکان جو دواؤں کی بُو سے ایک گونہ ممتاز معلوم ہوتا شہر کے ایک بہت ہی آباد حصہ میں واقع تھا اور لازماً ہر قسم کے لوگوں کی آماجگاہ تھا خصوصاً وہ عورتیں جو بحری سفر کے بعد طبیعت کو بحری ہوا کے اثر سے سکون دینے کیلئے دواؤں کی حاجتمند ہوتیں، پروفیسر انسانی جسم کے ہر مرض میں دخل رکھتا تھا خصوصاً دانت نکالنے میں تو اسے مہارت تامہ حاصل تھی۔ کاروباری گفتگو میں اسے بڑے بڑے الفاظ اور محاورات استعمال کرنے کی بہت ہی عادت تھی چونکہ ایسی گفتگو مریضوں پر اسکی قابلیت کا خاطر خواہ رعب بٹھانے میں کامیاب ہو جاتی، اسکی جراحی کی میز اپنی نفاست اور گندگی کے لئے ذُوب وجوار میں ایک حیثیت دوام رکھتی تھی۔ خود پروفیسر بھی اپنی لمبی ناک، پتلے ہونٹوں، اور موٹے جسم کے ساتھ شہر میں ایک خاص شخصیت کا مالک تھا۔

زندگی کے آخری ایام میں اس نے ایک حسین دوشیزہ جائرہ سے شادی کرلی تھی جائرہ نیپلز کے ایک مشہور مجرم کی بیٹی تھی جسکی موت پر سارے شہر نے افسوس کیا تھا، آفتاب کی تمازت نے جوان جائرہ کے حسین چہرہ کو نارنگی کے پختہ پھل کی طرح سرخ و سبز بنا رکھا تھا جوانی میں اس پر اپنی پوری کا فرماجرائی کیساتھ جلوہ ریز تھی، پروفیسر بیوی کے حسن سے متاثر ہو کر اس طبقہ میں داخل ہو چکا تھا جسے دنیا "زن مُرید" کہتی ہے وہ اپنی بیوی کو اتنا ہی نیک طینت بھی سمجھتا تھا جتنی کہ وہ حسین تھی، لیکن وہ نفسیات کا ماہر ہونے کی وجہ سے اس سے بھی واقف تھا کہ عورت دنیا میں کن کن اثروں کو آسانی سے قبول کر سکتی ہے، اسکی تشویش ایک نئے شخص کی آمد سے بہت بڑھ گئی تھی، اس نے شہر میں کپڑے کی ایک بڑی سی دکان کھول رکھی تھی اور اسکانیو ریزی کے نام سے مشہور تھا اُسے دیکھکر ایک شخص پہلی ہی نظر میں کہہ سکتا تھا کہ وہ مردانہ حسن کی بہترین مثال ہے۔ آغاز شباب کا زمانہ تھا تبسم اسکے لبوں پر ہمیشہ کھیلتا رہتا تھا

سچ پوچھیے تو اس محب وطن مجرم کی بیٹی جائرہ بھی اسکی آمد سے بہت ہی خوش تھی، یہ بات بھی کم تعجب خیز نہ تھی کہ اسکانیو ہمیشہ پروفیسر کی غیر حاضری ہی میں اسکے گھر جایا کرتا تھا۔

ایکدن پروفیسر خلافِ توقع کچھ سویرے گھر آگیا اُس نے دیکھا کہ نوجوان جائرہ کے سامنے جُھکا ہوا ہے۔ پروفیسر کی آمد پر جائرہ متانت کے ساتھ اسکے پاس سے چلی گئی اور اسکانیو ایک مجرم کی طرح پروفیسر کے سامنے نیچی نظریں کئے کھڑا تھا۔

پروفیسر بہت ہی ہمدردانہ انداز سے اُسکی طرف بڑھا۔

" میرے دوست! تم کچھ بیمار سے نظر آرہے ہو، تم نے بہت خوب کیا کہ یہاں آگئے، میں ڈاکٹر ہوں، لوگوں کو انکی تکالیف سے نجات دلانا ہی میرا فرض ہے............ تمہیں کچھ تکلیف ہے؟........ انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔ افسوس.......... خیر تم نے بہت ہی خوب کیا کہ یہاں آگئے.......... تمہیں میرا بہت انتظار کرنا پڑا ہوگا......... کیا سر میں درد ہے؟" یہ کہتے ہوئے پروفیسر جو جنگلی بھینسے کی طرح مضبوط تھا اسے کھینچ کر اپنے خاص کمرے میں لے گیا اور اپنی مشہور جراحی کی میز پر جو چالیس برس کے عرصہ میں سینکڑوں مریضوں کو دیکھ چکی تھی لٹا دیا۔

پروفیسر نے اسے اچھی طرح اپنی گرفت میں لاتے ہوئے کہا:-

"اچھا میں اب سمجھا۔ تمہیں دانت کی تکلیف ہے۔ میں جانتا ہوں۔ دانت کا درد نہایت ہی روح فرسا مرض ہے .... تم نے بہت ہی خوب کیا کہ یہاں آگئے۔"

اُس نے اپنی جراحی کی عظیم الشان الماری کھول کر چند آلے نکالے۔ اسکاتیو کا مُنہ کھولکر ہاتھ کی ایک ہلکی سی جُنبش سے اسکا ایک دانت اُکھاڑ کر میز پر رکھدیا۔

غریب نوجوان زخمی ہرن کی طرح اس سے جان چُھڑا کر بھاگا۔ خون اسکے زخمی جبڑوں سے راستہ بھر بہتا جا رہا تھا اور پروفیسر اسکے پیچھے ایک مجنونانہ مسرت سے چلّا رہا تھا۔

"کیا ہی نفیس دانت ہے۔ نہایت ہی نفیس .... آؤ میں تمہارا سارا درد دور کردوں !!!"

(اناطول فرانس) (شمسی کاکوی)

جُگنو!

برسات کی اندھیری اور بھیانک راتوں میں جنگل کو جگمگا دینے والے ..... یہ کرہائے شب ——

شاید حسینوں کے جھُرمٹ میں مُسکراہٹ کی بجلیاں ہیں!

برگ ہائے سبز سے چمٹ جانیوالے ننھے ننھے پروانے ——

جنکو کسی حنائی ہاتھوں والی نے اپنے یاقوتی لبوں سے چوما تھا ——

جو اپنی محبوبہ کو راستہ دکھانیکے لئے تاریکی کو اُجالے میں بدل دیتے ہیں

..... تاریک راتوں میں ستارے ہیں ——

بھٹکے ہوئے مسافروں کے لئے!

یا —— غضبناک، شعلہ بار آنکھوں سے نکلی ہوئی

—— چنگاریاں

(۲)

چاند کی آخیر راتوں میں ——

جب لیلئی شب اپنے سیاہ و تاریک پر تول کر مسحور کائنات پر چھا جاتی ہے ....

اور طلسم سکوت کو توڑنے کیلئے کبھی کبھی —— بستی سے دُور، اور آبادی سے الگ —— جنگلی درختوں میں دبکے ہوئے

پنکھ پکھیرو اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں.....

جنگل کا ہر درخت —— سرسبز و شاداب، جسکی زمردیں شاخیں فضائے بسیط میں موسیقی پیدا کردیتی ہیں —— اور درخت کا ہر پتہ —— معصوم اور لرزاں —— پٹا ہوتا ہے...

چمکیلے، روشن اور برق پاش، سُرخ پروالوں سے جو اپنے پیچھے بجلیاں گراتے جاتے ہیں۔

رات بھر عروسِ شب ان کے حُسن سے لطف اندوز ہوتی ہے

لیکن —— جب شہزادۂ مشرق اپنی دُلہن کو جھانکنے لگتا ہے

تو وہ سب یکلخت فنا ہوجاتے ہیں اور ان کا حُسن اس طرح زائل ہوجاتا ہے گویا اس کا وجود ہی نہیں تھا ——

تو میں سوچنے لگتا ہوں :-

"اے معبود! کہیں اسی طرح میری شمعِ حیات کا شعلۂ رنگین بھی بادِ حوادث سے ٹکرا کر گل تو نہ ہوجائیگا؟"

صادق الخیری دہلوی

خُمستان

سرگوشیاں

میرے خیالات کی پری بڑی شرمیلی ہے!
اور اتنی نازک کہ جب مصنوعی لیمپوں کی تیز روشنی
اُسکے ریشمی پروں میں چُبھ جاتی ہے اور اُسکی شبنمیں آنکھوں کو جلاتی ہے!

◆ ◆ ◆

میں روشنی گُل کر دیتا ہوں،
اور وہ مُسکراتی، چاند کی مرمریں کرنوں پر ناچتی، میری آغوش میں
آجاتی ہے!

◆ ◆ ◆

دیوی! ــــــ
تیری آنکھوں کی چمک میں،
تیرے لبوں کی مُسکراہٹ میں،
میں نے سکون کا پیام دیکھا،
ــــ اور اپنی کشتی ڈال دی!
لیکن یہ سمندر تو،
اتنا پُرشور ہے! اتنا طوفان خیز!

◆ ◆ ◆

میری رُوح آنسوؤں کی آغوش میں سو رہی ہے!
میرا دل غم کے تھپیڑوں میں سسک رہا ہے!
تو اپنے سازِ مسرت سے ایک بچا کھُچا نغمہ،
ان کی طرف پھینک دے!
اور انہیں الم کی نیند سے جگا دے!....

◆ ◆ ◆

تمہاری یاد نے میرے تمام آنسو چھین لئے! ــــ

ــــ جیسے چیت کی ہوا درختوں سے پتیاں چھین لیتی ہے!
اور میری آنکھیں اب بالکل خشک ہیں!...
ــــ جیسے خزاں میں برہنہ درخت! ــــ

◆ ◆ ◆

ابھی صبح نہیں ہوئی تھی! ــــ
زردی مائل نیلے آسمان پر اکّے دکّے ستارے تھے!
دُنیا تاریک تھی!
آسمان پر نور! روشن!
گھاس کی پتیوں میں ایک لرزش سی تھی!
فضا پر ایک پُراسرار طلسمی کیفیت چھائی تھی!
ہوا کی سرسراہٹ، ستاروں کی جھلملاہٹ سے مل کر ایک نغمہ پیدا
کر رہی تھی!......

◆ ◆ ◆

پروانہ کہتا ہے:۔ "جل جا!"
شمع کہتی ہے:۔ "جلا دے!"
شمع کا پیام ہے: "جل بھی اور جلا بھی!"

◆ ◆ ◆

میں پھول ہوں!
میرے پاس بلبل آتی ہے،
اور مدھ مکھیاں اور تتلیاں بھی!
شبنم بھی آتی ہے!
اور سورج کی کرنیں بھی!"

◆ ◆ ◆

میری روح بھٹک رہی ہے اس ہنگامہ زار میں،
آہ اسے کہاں سکون ملے گا!

* * *

آہ! یہ طلسم زا چاندنی!
دھیمی دھیمی! جذبات انگیز!
اس کی مس سے پتوں سے عجیب نغمہ نکلنے لگتا ہے!
ہوا بھی راگ سے بھری سرسراتی معلوم دیتی ہے!
آہ چاندنی ایک راگ ہے درد خیز!
ایک نغمہ ہے، پرسوز!....

* * *

تم تھیں
تو میری دُنیا کے کونے کونے میں مسرت کی روشنی تھی!
اب کہ تم مجھ سے دور ہو،
اُداسی اور افسردگی کی تاریکیوں میں غلطاں ہوں!.....

* * *

پھول مہک مہک کر،
چڑیاں چہک چہک کر،
تارے دمک دمک کر،
مالک! مجھے تیرا نام سُناتے ہیں!.....
لیکن میری رُوح، تیری زبان بھول چکی ہے!!

تمنائی

خزاں اور بہار

حُسن کا نشہ، طاقت کا غرور اور شباب کی پُرکیف مستی — یہ پھول ہیں، جن کی پنکھڑیاں ایک دن بادِ خزاں کے جھونکے سے الگ الگ ہو کر زمین بوس ہو جایا کرتی ہیں.... لیکن

دوستی، وفا اور محبت، یہ ایسے پھول ہیں جو کبھی پژمردہ نہیں ہوتے، یہ ہمیشہ سبز و شاداب رہتے ہیں، ان میں کبھی خزاں نہیں آتی۔

"....سے"!

نہ میں تجھ سے بوسہ طلب کرنے کی ہمت کرتا ہوں
اور نہ مجھے ایک نظر تبسم سے دیکھ لینے کو..... کہنے کی
کہ شاید ان دونوں سے کسی کو پاکر
میں مغرور ہو جاؤں!

میری ساری خواہش... میری ساری تمنا۔
بس صرف اسی تک محدود ہے کہ
میں اس بادِ صبا کا بوسہ لوں،
جس نے ابھی ابھی تجھے چوما!

محبت کی قیمت

شب کی ہزار ہا آنکھیں ہیں
اور دن کی صرف ایک
لیکن ساری کائنات کی ضیا رخصت ہو جاتی ہے
آفتاب کی موت کے ساتھ

دماغ کی ہزار ہا آنکھیں ہیں،
اور دل کی صرف ایک،
لیکن تمام زندگی کا نور ختم ہو جاتا ہے۔
محبت کی رُخصت کے ساتھ ساتھ۔

جمیل کندھائیپوری

کہ جاموقہ نئے لوگوں کو پسند کرتا ہے اور پرانوں سے نفرت کرتا ہے۔ تموچن نے جاموقہ سے جو جمہور و عوام کا طرفدار تھا علیحدگی اختیار کرنے کا ارادہ پختہ کر لیا۔ کیونکہ اس ساتھ سے جاموقہ کی طرف سے تموچن جن باتوں میں اپنا فائدہ سونچتا تھا ان کو نقصان پہونچتا تھا۔ اور ایسی صورت میں وہ جاموقہ کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔

جاموقہ سے تموچن کا علیحدہ ہونا تھا کہ بہت سے اشراف خاندان جو ابتک جاموقہ کے ساتھ تھے اس سے علیحدہ ہو کر تموچن سے آملے اور مختلف اولوسوں کے گلہ بان سردار مع اپنے خاندانوں اور ایماقوں کے تموچن کے پاس چلے آئے۔ اس وقت جو لوگ تموچن کے پاس گئے ان میں اسکا چچا دارتائی اتچگین جو قبیلہ جرکی کا سردار تھا اور قبل خاں کے فرزند اکبر کی اولاد میں تھا اور تموچن کے سگے چچازاد بھائی قوچار اور التان اتچگین فرزند قتولہ خاں (جو مغلوں میں آخری خان گذرا ہے) تھے۔ ان لوگوں کو تموچن کا ہستانوں کے لڑنے والوں میں اعلیٰ ترین مبارز نظر آیا۔ اور یہی تموچن ان کو ایسا معلوم ہوا جو جماعت اشراف کی سرداری اور اس بات کے لئے کہ وہ بہترین چراگاہوں اور محنتی چرواہوں اور اچھے مویشیوں کو حاصل کرنے میں ان کی مدد کرے گا۔ بعض سرداروں کو اس میں مطلق شبہ نہ تھا کہ تموچن کو آسمان نے سب پر حاکم اور بادشاہ ہونے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ایماق بارین کا سردار قورچی تموچن کے پاس آیا اور کہا کہ تنگری (آسمان) کی مرضی یہی ہے کہ تموچن سب کا بادشاہ ہو۔ اور یہ ایسی بات ہے جو روح نے مجھ سے کہی اور ہم کو دکھائی ہے۔ اور جو بات میں نے سُنی اور دیکھی ہے وہ تم سے کہدی۔ دوسرے لوگوں نے جن میں التان پسر قتولہ خاں شامل تھا تموچن کو اس وجہ سے پسند کیا کہ بہ نسبت اور سرداروں کے وہ ان کو کم خطرناک معلوم ہوا۔ اور ان کو امید ہوئی کہ تموچن کو اگر سردار بنایا تو وہ ایک زبردست آلہ دشمنوں کے مغلوب کرنے کے لئے اُن کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ان سرداروں میں بعض سردار ایسے تھے جو یسوکائی بہادر کے فرزند سے بھی شرافت میں اونچا درجہ رکھتے تھے۔

غرض کسی قدر تامل کے بعد اور اس صورت میں کہ قوچار، التان اور دوسرے نہایت شریف خاندان والوں نے خان بننے سے انکار کیا سب نے تموچن کو اپنا سردار تسلیم کر لیا۔

"خفیہ تاریخ مغل" میں بیان ہوا ہے کہ سب سے صلاح مشورہ لینے کے بعد گوچا اور ساچابیکی نے جو قبل خاں کے بڑے فرزند کے پوتے تھے تموچن سے کہا کہ ہم نے تم کو خاقان بنایا ہے۔ چونکہ اب تم خاقان ہو گئے ہو اس لئے ہم تمہارے دشمنوں سے لڑنے کے وقت صف اوّل میں ہو کر مقابلہ کریں گے۔ اگر ہم نے خوبصورت عورتیں اور لڑکیاں گرفتار کیں تو سب سے پہلے تمہارے سامنے اُن کو پیش کریں گے۔ شکار کے لئے ہم سب سے پہلے اُٹھیں گے اور جو جانور ماریں گے وہ بھی تم ہی کو پیش کریں گے۔ اگر لڑائی میں تمہارے حکموں کے خلاف کوئی بات ہم کریں یا زمانہ امن میں ہم کوئی حرکت ایسی کریں جو تمہارا موجب نقصان ہو تو پھر تم ہماری بیویاں اور ہمارے مویشی ہم سے چھین لینا۔ اور ہم کو ہماری تقدیر پر صحرا میں چھوڑ دینا۔" ان باتوں پر قسم کھا کر انہوں نے تموچن کے خاقان ہونے کا اعلان کیا۔ اور اب تموچن کا نام چنگیز رکھا گیا۔

غرض مغلوں کے شریف گلہ بانوں نے خاقان یا پیشوا سے متذکرہ بالا عبارت میں اپنے تعلقات بیان کر کے حلف اطاعت لیا۔ مگر اسکے ساتھ ہی اپنے مطالبات بھی اس طرح بیان کئے "گلہ بان بادشاہ کا فرض ہوگا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو اس طرح لڑائے کہ انکو دشمن پر فتح ہو تاکہ کاہستانوں کے خانہ بدوشوں کو جو چیزیں پسند ہوں وہ انکو نصیب ہوں یعنی خوبصورت عورتیں، عمدہ گھوڑے اور شکار کھیلنے کیلئے عمدہ زمینیں انکو ملتی رہیں۔ اور گلہ بان لڑنے والے جنگجو یہ چیزیں لیں اپنے خان کو معاوضہ میں مالِ غنیمت کا بہترین حصہ پیش کریں۔

چنگیز کے معنی بیان کرنے مشکل ہیں۔ یہ لفظ تموچن کے نام کا ایک جز بنکر دنیا میں مشہور ہوا۔ قیاس ہے کہ روشنی اور نور کی روح کو چنگز

کہتے تھے۔ اور اس روحِ نور کی مغلوں کے شاہان پرستش کرتے تھے۔ اس خیال میں اس وجہ سے اور بھی پختگی ہوتی ہے کہ تموچن کی نسبت بہت لوگوں کا خیال تھا کہ آسمان نے اپنی طرف سے اُسکو یہ اعلیٰ منزلت بخشی ہے۔ اس لئے اسکے نام میں ایک لفظ ایسا اضافہ کیا جائے جسکو آسمان سے خصوصیت ہو۔ خود تموچن کے دل میں بھی یہ خیال جم گیا تھا کہ تنگری (آسمان) ہی نے اُسکی تقدیر میں بڑا ہونا اُتارا تھا۔ یہ خیال عام طور پر بھی مشہور ہو گیا تھا۔ بہرکیف اس خیال کی عام شہرت سے تموچن کا فائدہ ہی تھا اور خود اس خیال سے نفع اُٹھانے کے لئے اُس نے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

تموچن جب منصب خانی کے لئے منتخب ہو چکا تو پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ اپنے یورت کا جہاں وہ رہتا تھا بخوبی انتظام کرے۔ تموچن کو اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ کوہستانوں اور ریگستانوں کے خانہ بدوشوں کے لئے دوسروں پر اچانک حملہ کر کے ان کو لوٹنا کیسا آسان کام ہے۔ تموچن نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ حالت قیام میں اپنی سکونت کے لئے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرے اور نقل و حرکت کی حالت میں کوئی صدر مقام ایسا تجویز کرے کہ جہاں وقت پر سب جمع ہو سکیں۔ اور یہ محفوظ مقام اُسکی سلطنت کا دار القرار ہو جہاں دشمنوں سے پناہ ملتی ہے۔ تیر اور تلوار چلانے والوں کی ایک مختصر سی فوج بھرتی کی۔ اس فوج کا کام ہمیشہ یورت کی حفاظت تھا۔ اسکے ساتھ ہی گھوڑوں کی حفاظت اور نگہداشت اور انکے سدھانے کا انتظام کیا۔ یہ تمام اُمور ایک خانہ بدوش قوم کے لئے مقدم تھے۔ تموچن نے چند آدمی ایسے بھی مقرر کئے جو ہر وقت اس کے قریب رہیں۔ اور جب کسی کام پر وہ بھیجے جائیں تو اس تیزی اور سُرعت سے منزلِ مقصود پر پہونچیں جیسے تیر کمان سے نکل کر ہدف پر پہونچتا ہے۔

یہ باتیں گو اس زمانہ میں کیسی ہی خفیف معلوم ہوں مگر اس زمانے اور ملک میں انکا انتظام کرنا ایک مشکل اور پیچیدہ سیاسی مسئلہ کو حل کرنیکے برابر تھا۔ اور جب انتظام ہو لیا تو اس سے مفید نتائج پیدا ہوئے۔ وسط ایشیا کی خانہ بدوش قومیں مفلس اور کاہل وجود تھیں۔ خانہ بدوش قوموں کی زندگی میں جہالت اور بیکاری اس درجہ تھی کہ مفلسی اور کاہلی اس کا ضروری نتیجہ تھیں۔

خان ہونے کے بعد تموچن کو اپنے پُرانے دوست اور رفیق یاد آئے۔ ان کی قدر افزائی کی اور ان کو انعام و اکرام دیا۔ اس قسم کی فیاضی تموچن کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ وہ سخت مزاج ضرور تھا۔ لیکن جو خدمتیں اُسکی کی جاتی ہیں اُن کا معاوضہ دینے میں وہ بڑا سخی اور فیاض تھا۔ اُسنے بغورچی اور جلمی کو بلا کر ان سے کہا کہ میں یہ بات کبھی دل سے فراموش نہیں کر سکتا کہ تم نے میری ہمراہی اور ہوا خواہی اُس وقت قبول کی تھی جبکہ کوئی میرا ساتھی اور مددگار نہ تھا۔ اب تم کو میرے تمام ساتھیوں اور رفیقوں میں فضیلت حاصل ہے۔ قوم کے بہادر اور شرفا جب اُس کے پاس آتے تو اُن سے کہتا کہ تم سب میرے پاس جمع ہوئے ہو۔ جاموقہ کا ساتھ چھوڑ کر میرا ساتھ دینا تم نے پسند کیا۔ اگر تنگری تعالیٰ نے مجھے سلامت رکھا اور میری مدد فرمائی تو تم میرے پُرانے رفیقو میرے زندہ دل ہمراہی ہو جاؤ گے۔"

چنگیز خاں مغلوں کے ایماقوں کو متحد کر کے ان سے ایک خانہ بدوش سلطنت قائم کرتا ہے۔ ونگ خاں سے کشمکش

ونگ خاں تدابیرِ مملکت میں ایک کوتاہ اندیش آدمی ثابت ہوا۔ تموچن کے خلاف اُس نے کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ اپنے دوست یسوکائی کے فرزند کے خان ہو جانے سے خوش ہوا۔ اور اس نے کہا کہ یہ اچھا ہوا کہ چنگیز خاں کو مسندِ خانی حاصل ہو گئی۔ کیونکہ مغل بغیر خاقان کے

کیا کر سکتے تھے۔ بس جو کچھ تم نے اس وقت مل کر کیا ہے اسکو بگاڑنا نہیں۔ کچھ زمانے تک چنگیز خاں کے تعلقات جاموقہ سے اچھے رہے لیکن اسکے بعد اسکی علیحدگی نے قطعی دشمنی کی شکل اختیار کرلی۔ تموجن حکومتِ اشراف کا طرفدار تھا اور جاموقہ کے دماغ میں جمہوری حکومت کے خیالات گردش کرتے رہتے تھے۔ ان دونوں باتوں نے تموجن اور جاموقہ میں اختلاف پیدا کردیا۔

اب ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس سے خانہ بدوش قوموں کے طرزِ معاشرت کا حال کھلتا ہے۔ یہ واقعہ تموجن اور جاموقہ میں اور زیادہ عداوت کا باعث ہوگیا۔ جاموقہ کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ وہ ایک دن چنگیز خاں کے ایک ساتھی کے گھوڑے ہانک لے گیا۔ گھوڑوں کا مالک اُس کے پیچھے دوڑا اور جو آدمی گھوڑے چرانے لئے جاتا تھا اُسکو قتل کر کے اپنے جانور اپنے یورت میں لے آیا۔ جاموقہ کو جب خبر لگی تو اُس نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے چنگیز خاں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ چنگیز خاں بھی مقابلہ پر آیا۔ مگر شکست کھا کر دریائے اونان کی طرف اُسکو ہٹنا پڑا۔ جاموقہ نے چنگیز کا تعاقب نہیں کیا۔ لیکن چند اشراف گلہ بانوں سے جو جاموقہ کے پنجے میں پھنس گئے اُن سے جاموقہ نے نہایت سختی سے انتقام لیا۔

اس کا بُرا اثر جاموقہ کے حق میں فوراً ظاہر ہوا۔ بہت سے شریف گلہ بان جو اب تک جاموقہ کے ساتھ رہتے تھے اس سے علیحدہ ہو کر چنگیز خاں سے جا ملے۔ اس موقع پر جن لوگوں نے جاموقہ کا ساتھ چھوڑا ان میں منلیک بھی تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کو یسوکائی بہادر نے مرتے وقت اپنے اہل وعیال کی نگرانی سپرد کی تھی۔ منلیک کے سات بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام کوکچو تھا۔ اور یہ بڑا مشہور ساحر اور سامان تھا۔

یہ زمانہ تھا کہ خاندانِ قن کے بادشاہوں کو موقع ملا کہ وہ فوجیں جمع کر کے تاتاریوں سے جنگ کریں۔ پس تجویز ہوا کہ ایک جانب سے قن کا لشکر اور دوسری جانب سے ونگ خاں اپنی قوم قرایت کو لیکر تاتاریوں پر حملہ کرے۔ چنگیز خاں بھی خوش ہو کر قن کی طرف سے تاتاریوں سے لڑنے پر آمادہ ہوا۔ اس میں اسکو دو باتوں کا موقع ملتا تھا۔ ایک تو یہ کہ اپنے باپ کے خون کا بدلہ تاتاریوں سے نکالے۔ دوسرے یہ کہ ونگ خاں کی خیرخواہی کا ثبوت دے۔ تیسرے اس بات کی اُمید تھی کہ تاتاریوں کو نقصان پہونچا کر اپنے ساتھیوں کا بھلا کرے۔ تاتاری ایک مرتبہ پہلے بھی قن سے شکست کھا کر میدان سے فرار ہو چکے تھے۔ اس جنگ میں ایک طرف سے ونگ خاں اور تموجن نے مل کر تاتاریوں پر حملہ کیا تھا۔ اس خدمت اور فتح کے صلہ میں شہنشاہِ قن نے سردار قرایت کو ونگ کا خطاب دیا اور اسی خطاب کی وجہ سے ونگ خاں کے نام سے مشہور ہوگیا۔ تموجن کو اسکی خدمت کے صلہ میں شہنشاہِ قن نے چوخوری کا خطاب دیا۔ اس لفظ کے معنی "سرحد کے فوجی سردار" کے ہیں۔ لیکن یہ خطاب ونگ سے کم درجے کا تھا۔

لڑائیوں کے اس سلسلے کے ختم ہونے کے تھوڑے عرصے بعد چنگیز خاں نے یہ بات سب پر روشن کردی کہ تمام ایل اور الوسات کا سردار اور خان وہی ہے۔ اور کسی کی مجال نہیں کہ اُس کا حکم ٹال سکے۔ قبیلہ جرکی نے جسکے سردار ساچابیکی اور روائی چو تھے اور یہ دونوں قبل خاں کے فرزند اکبر کی اولاد میں تھے تاتاریوں کے خلاف لڑنے سے انکار کیا۔ اس کنارہ کشی کے علاوہ اور الزام بھی جرکی کے سرداروں پر تھے۔ اب چنگیز خاں نے جس قدر لشکر اُسکے پاس تھا اُسکو لیکر جرکی کے قبیلہ پر حملہ کیا اور ان کے لشکر گاہوں کو غارت کر کے سب آدمیوں کو قید کرلیا۔ ساچابیکی اور روائی چو کو جو بڑے شریف گھرانے کے آدمی تھے، قتل کا حکم دیا اور وہ دونوں قتل کر دئے گئے۔ اسی الزام میں ایماق بوری بوکی کا ایک رکن بھی قتل کیا گیا۔ اس سردار کو چنگیز خاں کے حکم سے دھوکا دے کر مارا گیا۔ چنگیز خاں کو اس سے پرانی عداوت اس بنا پر تھی کہ ایک مرتبہ شراب کے جلسے میں کچھ جھگڑا ہوگیا اور قبیلہ بوری بوکی کے سردار نے چنگیز خاں کے بھائی بلگوتی کا ایک شانہ زخمی کردیا۔

سنہ ۱۲۰۱ء میں جاموقہ کے پاس ایسے ایماق اور الوس جمع ہو گئے جنہوں نے چنگیز خاں کے پاس جانا پسند نہ کیا تھا۔ اس زمانے میں تموچن اور ونگ خاں اپنی اپنی خانہ بدوش سلطنت قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ اس وجہ سے تمام ایماقوں اور الوسوں نے ان کو اپنا دشمن سمجھ لیا تھا۔ دریائے ارگون[1] (ارخون) کے کنارے جاموقہ چیچن کو ایسے الوسات نے جو تموچن اور ونگ خاں کو اپنا دشمن جانتے تھے، سردار مان کر اسکو گور خاں کا خطاب دیا تھا (گور خان کے معنی "تمام قوموں کے سردار" کے ہیں)۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جاموقہ کے ساتھیوں میں جمہوری حکومت قائم کرنے کا خیال تھا اور انکو اپنی نسبت تموچن اور ونگ خاں کے زیادہ صاحب حکومت ہو جانے کی وجہ سے خطرہ تھا جماعت اشراف کے ایماقوں نے بھی جو جاموقہ کیساتھ تھے اسکو گور خاں کا لقب دینے میں شرکت کی تھی۔

زیادہ مدت نہ گذرنے پائی تھی کہ ایک طرف جاموقہ اور دوسری طرف ونگ خاں اور تموچن میں معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ تقدیر جاموقہ سے برگشتہ تھی، اسکی سپاہ نے اس سے علیحدگی اختیار کی۔ ونگ خاں نے جاموقہ کا تعاقب کیا۔ جاموقہ نے جسقدر الوسات اسکے ہمراہ تھے اُن کو دریائے ارخون کے گذرگاہ کی طرف ہٹا لیا۔

اب چنگیز خاں کو موقع ملا کہ اپنے پرانے دشمنوں تائجوت پر حملہ کرے۔ شروع میں اس حملے میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔ چنگیز خاں تائجوت کو شکست نہ دے سکا۔ بلکہ بجائے شکست دینے کے خود گردن میں زخم کھایا۔ اور بیہوش ہو کر زمین پر گرا۔ قصہ مشہور ہے کہ اس وقت تموچن کے ایک نوکر اور ایک ہمراہی جلمی نے اسکے زخم سے جما ہوا خون چوسا۔ اور پھر چپکے سے دشمن کے لشکر میں جا کر ترش دودھ (آیران) کا ایک لوٹا بھرا چرا لائے۔ تاکہ آقا کی پیاس دور کریں۔ تائجوت کے لڑنے والے اپنے سرداروں کے حق میں وفادار ثابت نہ ہوئے۔ ایک ایک کر کے اپنے گھر چلنے شروع ہوئے۔ آخرکار نوبت یہاں تک پہونچی کہ تموچن نے ایماق تائجوت کے تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ اور اپنے دشمنوں میں سے بعض کو وہیں ہلاک کر دیا۔ یہی زمانہ تھا کہ قبیلہ بیسوت کا ایک آدمی جو تائجوت کے ماتحتوں میں تھا چنگیز خاں کے پاس آیا۔ اس آدمی کا نام جرگوادائی تھا۔ اسنے بیان کیا کہ جب جاموقہ سے لڑائی ہوئی ہے تو میں اُسکے ساتھ تھا۔ اور لڑائی میں میرا ہی تیر تمہارے گھوڑے کے لگا تھا۔ لیکن خان، اگر تم میرے قتل کا حکم دوگے تو زمین کا ایک ذرا سا ٹکڑا جو ہاتھ کی ہتیلی سے زیادہ نہ ہوگا، خراب کر دوگے۔ لیکن اگر مجھکو زندہ رکھا تو میں آپ کی خدمت دل و جان سے ادا کروں گا۔ میں بہتے پانی کو روک دونگا اور چٹانوں کے ٹکڑے اڑا دونگا۔ چنگیز خاں نے اس کا جواب جو کچھ دیا وہ اپنی طبیعت اور مزاج کے ایک خاص پہلو کے مطابق تھا۔ چنگیز خاں کہنے لگا "جب کوئی کسی کو مار ڈالتا ہے تو وہ خاموش رہتا ہے۔ کسی سے کچھ کہتا نہیں۔ مگر تم نے بات چھپائی نہیں۔ اس لیے آج سے تم میرے ساتھی، ہر حال میں شریک ہو"۔ اتنا کہکر چنگیز خاں جرگوادائی کو اپنے خیمے میں لے گیا اور وہاں اس کا نام بدل کر جبتی رکھا۔ یہی جبتی وہ تھا جو چنگیز خاں کے امرائے عساکر میں سب سے بڑا لائق ہوشیار اور نامور سپہ سالار ثابت ہوا۔ اور یہی جبتی نویان مغل فوجوں کا سالار اور سردار اُسوقت تھا جبکہ دریائے کلکہ[2] پر روسیوں کو مغلوں نے شکست دی ہے۔

چنگیز خاں کی قوت اور جو ایماق اسکے شریک تھے اُن کی تعداد بڑھتی گئی۔ ونگ خان سے چنگیز خاں کی دوستی برقرار رہی۔ اور اب خود چنگیز اس قابل ہو گیا کہ جب چاہے بلا مدد غیرے تاتاریوں کا قلع قمع کر دے اور ان بد سلوکیوں اور سفاکیوں کا پورا انتقام لے جو سابق میں تاتاری اُسکے ساتھ کرتے رہے تھے اور وسط منگولیا میں جو لڑائیاں آئندہ لڑنی تھیں اُن کے لیے پہلے ہی سے تاتاریوں کی طرف سے اطمینان کر لے۔ تاتاریوں

۱؎ ارگون یا ارخون دریائے آمور کے بالائی گذرگاہ کی جنوبی شاخ یعنی داہنی شاخ ہے اور اس کا بالائی گذرگاہ کلوران کا دریا ہے۔

۲؎ کلکہ، یورپ میں ملک روس کا دریا ہے۔ آجکل اسکو کلمیوس کہتے ہیں۔ یہ صوبہ بکرین کے مشرق میں بحر ازف (ازق) سے نکلا ہے۔

کی آخری لڑائی کے موقع پر جس کا نتیجہ تاتاریوں کی قطعی شکست ہوا، چنگیز خاں نے اپنی سپاہ کو حکم دیا۔ "دیکھو، اگر تم کو فتح ہو تو فتح ہوتے ہی مالِ غنیمت پر نہ پل پڑنا۔ جس وقت لڑائی ختم ہو جائے گی تو جس قدر مالِ غنیمت ہوگا وہ حصہ رسد سب میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اگر لڑائی میں ہٹ کر اپنی پہلی جگہ جانا پڑے تو اسکے بعد بھی تم کو آگے بڑھنا ہوگا۔ اور پھر حملہ پہلے سے بھی زیادہ ہمت و قوت کے ساتھ کرنا پڑیگا۔ جو سپاہی ہٹنے کے بعد پھر لڑنے کو آگے نہ بڑھے گا تو وہ قتل کیا جائے گا۔"

غرض جب تاتاری میدان جنگ سے بھاگے تو چنگیز خاں نے اُنکے لشکرگاہ پر قبضہ کیا۔ اس لڑائی کے انجام نے القان، قوچار اور دیگر جماعت اشراف کے سرداروں کو بتا دیا کہ تموچن فی الحقیقت اب چنگیز خاں ہے۔ اور بجائے اسکے کہ وہ ان سرداروں کے ہاتھ میں ایک آلۂ قوت بنے وہ کسی شخص کو بھی خواہ وہ شرافت میں کیسا ہی درجہ رکھتا ہو اپنے حکم کے خلاف نہ چلنے دیگا۔ یا جو قواعد اُس نے بنائے ہیں اُنکی نافرمانی کسی کو کسی حال میں نہ کرنے دیگا۔ چنانچہ جس وقت لڑائی ختم ہوئی تو ان سرداروں نے غنیمت کا مال لوٹنا شروع کیا۔ جس وقت چنگیز خاں کو اسکی خبر ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ جسقدر مال غنیمت انہوں نے لوٹا ہے فوراً ان سے واپس لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

چنگیز خاں نے اپنے عزیزوں سے مشورہ کر کے تاتاریوں کا قتل شروع کیا۔ یہ قتل عام تاتاریوں کا غضب کا تھا۔ چنگیز اس کوشش میں رہا کہ اپنے خاندان کے ان جانی دشمنوں میں سے ایک متنفس کو بھی زندہ نہ چھوڑے۔ غرض اکثر تاتاری قتل ہوئے اور جو قتل سے بچے ان کو مختلف ایماقوں اور اُلوسوں میں تقسیم کر دیا۔ اب تاتاریوں کی کوئی ہستی من حیثیت القوم نہ رہی۔ دو حسین تاتاری عورتوں کو چنگیز خاں نے اپنی بیوی بنایا۔ ان میں ایک کا نام یسوئی تھا اور دوسری کا نام یسوگن تھا۔ اس طرح اب اسکی تین بیویاں ہو گئیں۔ خانہ بدوش قوموں کے دستور کے موافق ہر بیوی کا خیمہ و خرگاہ مع اسکے ملازمین اور ضروریات کے جُدا ہوتا تھا۔

تاتاریوں کی شکست سے گو چنگیز خاں کی قوت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی مگر وہ ابھی تک ونگ خاں کی سیادت تسلیم کرتا تھا۔ اور اپنے تئیں بادشاہ قرایت کا تابع سمجھتا تھا۔ مگر اب ونگ خاں کا رنگ بدلنے لگا۔ اُس نے جاموقہ سے ایک عہد نامہ کیا۔ وجہ یہ ہوئی تھی کہ جاموقہ نے چنگیز خاں اور ونگ خاں میں دشمنی پیدا کر کے ونگ خاں کو اور بھڑکانا چاہا۔ اور ونگ خاں سے کہا کہ چنگیز نے قوم نائمان سے تعلقات پیدا کئے ہیں اور اب وہ قرایت کو عنقریب کوئی دھوکا دینے والا ہے۔ جاموقہ نے ونگ خاں سے کہا میرا حال تو چکور کا سا ہے۔ ہمیشہ ایک ہی جگہ اور ایک ہی بات پر قائم رہتا ہوں۔ لیکن تموچن کا حال ایک موسمی پرند کا سا ہے جسکی آواز آسمان کے چاروں گوشوں میں گونجتی رہتی ہے۔ اکثر موقعے ایسے ہوئے تھے کہ ونگ خاں اور چنگیز خاں مل کر کسی دشمن سے لڑے تھے اور لڑائی میں مال غنیمت حاصل کیا تھا۔ لیکن ونگ خاں نے اس مال غنیمت سے چنگیز خاں کو حصہ دینے سے انکار کیا تھا۔ نائمان سے لڑائی میں ایک مرتبہ ونگ خاں کے ساتھ چنگیز خاں بھی تھا۔ ان دونوں نے ملکر نائمان کو شکست دی تھی۔ جب لڑائی سے واپس آنے لگے تو نائمان کے ایک سردار نے بہت سی فوج جمع کر کے ونگ خاں اور چنگیز دونوں پر حملہ کیا۔ اس موقع پر ونگ خاں نے چنگیز کو دغا دی۔ رات کے وقت چنگیز خاں کو اکیلا چھوڑ کر اپنے چراگاہوں کی طرف چلا۔

لیکن ونگ خاں کے اس دھوکے اور دغا کا کچھ اثر چنگیز خاں پر نہ ہوا۔ اور چنگیز بڑی ہوشیاری سے اپنی فوج ہٹا کر خیریت سے اپنے یورت میں پہونچ گیا۔ لیکن ونگ خاں پر جس کے ساتھ مالِ غنیمت تھا، نائمان نے آگے بڑھکر حملہ کر دیا۔ اب ونگ خاں مجبور ہوا کہ چنگیز خاں سے مدد مانگے۔ چنانچہ اس نے چنگیز خاں کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنے چاروں "کواکب" (یعنی بڑے بہادر لڑنے والوں) بغورچی، مقولی، بورولا اور چیلاوٹن کو اسکی کمک پر بھیجے۔ یہ چاروں بہادر وہ تھے جن کی خدمات اور انتظامی قابلیت کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اور ونگ خاں کی توقعات ان سے پوری ہوئی تھیں۔

لڑائیوں میں تموچن کو بار بار فتح ہو چکی تھی لیکن ابھی تک اسکو ونگ خاں سے لڑنے کا خیال پیدا نہ ہوا تھا۔ مغلوں کی نظر میں تموچن اس سے زیادہ نہ تھا کہ وہ ایک لائق سردار چند اشراف قبیلوں کا ہے۔ ان قبائل کو متحد و متفق کر کے انکے انتظام میں کامیاب ہوا ہے۔ بہرکیف تموچن کو ایک نو دولت سمجھا جاتا تھا۔ برعکس اسکے ونگ خاں ایک بڑی ریاست کا حاکم اور شاہی خاندان کا ایک رکن مانا جاتا تھا۔ گو یہ سچ ہے کہ اس ریاست کے لوگ منتشر تھے اور کسی اچھے انتظام میں نہ تھے۔ ونگ خاں کے خیموں اور چراگاہوں میں تکلف کے سامان تھے اور قن کے شہنشاہ نے جو شمالی چین جیسے دولتمند ملک کا مالک اور بادشاہ تھا اسکو "ونگ" کا خطاب دیا تھا۔ ان تمام باتوں کا اثر کاہستانوں کی سیدھی سادی مخلوق پر بہت تھا اور وہ ونگ خاں کو منگولیا کے تمام سرداروں میں سب سے بڑا سردار مانتے تھے۔ تموچن کے لئے بھی معقول وجہ تھی کہ بادشاہ قرابت سے اچھے تعلقات رکھکر فائدہ اٹھاتا رہے۔ ان تعلقات کو برقرار رکھکر تموچن نے ان میں اور بھی استحکام پیدا کرنے کی کوشش اور وہ بھی اس طریقے سے کرنی چاہیئے کہ ونگ خاں اور اپنے خاندان والوں میں کچھ شادیاں کرائے۔ کاہستان کے خانہ بدوشوں میں کسی زبردست خان یا سردار کا داماد بن جانا بڑی بات سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ چنگیز خاں نے اپنے بڑے فرزند جوجی کا پیغام چوریکی دختر ونگ خاں سے اور اپنی بیٹی کوجن کا پیغام ونگ خاں کے ایک پوتے سے دیا۔ ونگ خاں کا یہ پوتا شنگون پسر ونگ خاں کا فرزند تھا۔ شنگوں ونگ خاں کے لڑکے کا نام نہ تھا بلکہ دراصل وہ ایک چینی خطاب تھا۔ اور یہی خطاب مشہور ہوتے ہوتے اُس کا نام بن گیا۔ لیکن ونگ خاں نے یہ دونوں پیغام نامنظور کئے۔ خفیہ تاریخ مغل میں لکھا ہے کہ ونگ خاں کے اس انکار نے تموچن کا دل سرد کر دیا۔ اور اسکو اس انکار سے فی الحقیقت بہت صدمہ ہوا۔ کیونکہ اسکو اس امر کا یقین ہو چلا تھا کہ اس کے خاندان سے اور ونگ خاں کے خاندان سے جو شاہی خاندان تھا، رشتہ اور قرابت پیدا ہو جائے گی۔ اب اسکو اس طرف سے مایوسی ہوئی۔ اسکے تھوڑے دن بعد تموچن کو اس سے بھی زیادہ ناامیدی اور مشکلوں کا سامنا ہوا اور یہی اس کا نوشتہ تقدیر تھا۔

التان اور تموچن کے دوسرے عزیز بھی اب علانیہ اس سے علیحدہ ہو کر جاموقہ سے جا ملے۔ اب تک انکے ڈیرے خیمے تموچن کے خیمہ گاہ کے قریب تھے۔ اب انہوں نے شنگوں ونگ خاں کے پوتے کے خیمہ گاہ کے قریب ان کو نصب کیا۔ شنگوں نے مخاصمانہ طور طریقہ چنگیز خاں کے ساتھ برتنا شروع کیا۔ جو سردار چنگیز خاں سے اس وقت علیحدہ ہوئے تھے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ جب تک چنگیز خاں قوم کا خان رہا تو اس کا قطعی محکوم اور پابند ہو کر رہنا پڑے گا۔ اور اس طرح کی محکومی اور پابندی ان سرداروں کو ناگوار تھی۔ شنگوں اور اسکے فریق والوں نے ونگ خاں سے کہا کہ نائمان سے جو ہمارے دشمن ہیں چنگیز خاں نے تعلق پیدا کیا ہے اور اب چنگیز خاں شرارت پر آمادہ ہے۔ ونگ خاں نے اتنا سنکر با دلِ ناخواستہ چنگیز خاں سے جنگ کرنے کا فیصلہ قطعی کر لیا۔

شنگوں کے فریق نے سوچا کہ چنگیز خاں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادیوں کا جو پیغام بھیجا ہے اسکو بظاہر قبول کر لیا جائے اور اس طرح چنگیز خاں کو اپنے قابو میں لایا جائے۔ مگر یہ تدبیر نہ چلی۔ پھر انہوں نے چاہا کہ چنگیز خاں پر اچانک حملہ کر کے اسکو گرفتار کیا جائے۔ مگر یہ بھی نہ ہو سکا۔ اس ارادے کی کہ اچانک حملہ کیا جائے، چنگیز خاں کو دو نوعمر چرواہوں نے اطلاع کر دی۔ یہ چرواہے ونگ خاں کے لشکر میں رہتے تھے۔ دوسرے دن جب ونگ خاں اپنا پورا لشکر لئے چنگیز خاں کے سر پر پہونچا تو چنگیز خاں کی سپاہ کو لڑائی کے لئے تیار پایا۔ بادشاہ قرابت ونگ خان نے جاموقہ سے پوچھا کہ چنگیز خاں کی سپاہ میں کون کون لوگ ہیں۔ جاموقہ نے جواب دیا کہ دو ایماق اروت اور منگوت کے ہیں۔ ان کے آدمی سب اچھے لڑنے والے ہیں۔ لڑائی میں جب گھمسان ہوتا ہے تو اُن کی ترتیب اور صف بندی میں فرق نہیں آتا اور یہ لوگ بچپن ہی سے برچھوں اور تلواروں سے لڑنے کی مشق رکھتے ہیں۔ ان دونوں ایماقوں کے جھنڈے سیاہ یا اور رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور جس وقت وہ مقابلے

پڑائیں تو ہم کو بہت ہی ہوشیار رہنا ہوگا۔ اب جو لڑائی ہوئی تو چنگیز نے ونگ خاں اور اُسکے ساتھیوں کے سخت حملے کا پورا جواب دیا شنگوں تیر سے زخمی ہوا۔ چنگیز باوجودیکہ سپاہ اچھی رکھتا تھا مگر اُس نے لڑائی سے ہٹنا چاہا۔ اور میدان سے ہٹ کر ایک جگہ رات بسر کی۔ صبح ہوتے ہی چنگیز خاں کی سپاہ اسکے پاس آئی۔ چنگیز نے دیکھا کہ اس میں آدمی کم ہیں۔ اوکتائی، بوروکولو اور بغورچی نہیں ہیں۔ چنگیز نے کہا کہ اوکتائی، بغورچی اور بوروکولو میرے بڑے بہادروں میں تھے۔ ہمیشہ وہ میرے ساتھ رہے۔ اب چاہیئے تھا کہ ساتھ ہی مرتے بھی۔ تاکہ زندگی اور موت دونوں میں جُدا نہ ہوتے۔ اتنا کہنا تھا کہ بغورچی گھوڑے پر سوار سامنے سے آرہا ہے۔ چنگیز نے سینہ کوٹ کر آسمان کی طرف دیکھا اور ایک آہ سرد بھری۔ خفیہ تاریخ مغل میں بیان ہوا ہے کہ اس سرد آہ کے بھرتے ہی ایک اور سوار نظر آیا۔ جب وہ قریب آیا تو گھوڑے سے چار ٹانگیں لٹکی دکھائی دیں۔ دو آدمی یعنی اوکتائی اور بوروکولو ایک ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ بوروکولو کے منہ میں خون لگا تھا۔ اوکتائی کی گردن میں تیر لگا تھا۔ اِس زخم سے بوروکولو نے خون چوسا تھا یہی وجہ تھی کہ اسکے منہ میں خون لگا تھا۔ یہ دیکھکر چنگیز خاں رویا اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔ چنگیز کے پاس اس وقت سپاہ کافی نہ تھی، وہ دُشمن کا مقابلہ اِسوقت نہ کرسکتا تھا۔ اب سوائے پیچھے ہٹتے چلے جانے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ اسوقت لشکر والوں کا گذر اُس گوشت پر تھا جو بڑے جرگہ شکاروں میں جانوروں کو مار کر جمع کر لیا جاتا تھا۔ چنگیز کا لشکر میدان جنگ سے ہٹ کر دریائے کلکا[1] کے کنارے کنارے چلا۔ کچھ دُور جانے کے بعد جب سپاہ کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو چنگیز نے ونگ خاں اور شنگوں اور التان کے پاس ایلچی اِس پیغام سے بھیجے کہ میں صلح چاہتا ہوں۔ اور اطاعت قبول کرتا ہوں۔ چنگیز نہ خود پڑھا لکھا تھا اور نہ اُسکے ماتحت سردار پڑھے لکھے تھے۔ تمام پیغام سلام زبانی ہوا کرتے تھے۔ اور ایسے لوگوں کی معرفت ہوتے تھے۔ جن کا حافظہ قوی ہو۔ اور اس خیال سے کہ پیغام کا مضمون آسانی سے یاد رہے۔ اس کا ایک ایک لفظ انکو خوب یاد کرا دیا جاتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پیغام کی عبارت نظم کر کے قاصد کو حفظ کرا دی جاتی تھی۔ اور اس نظم میں تشبیہات و ضرب الامثال بکثرت ہوتے تھے چنگیز خاں نے جو پیغام ونگ خاں کو اسوقت بھیجا اُس کا مفہوم حسب ذیل تھا۔

"پدرم۔ آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں اور کیوں آپ میرے دل میں اپنا ڈر بٹھاتے ہیں۔ اگر مجھکو کسی بات پر تنبیہ کرنی آپ کو منظور تھی تو وہ بطریق مصالحت بغیر میرے مقبوضات کو تباہ و غارت کئے ممکن تھی۔ .... گو میں کم ہوں پھر بھی زیادہ کے برابر ہوں۔ گو میں بُرا ہوں مگر اُن سے بہتر ہوں جو اچھے مانے جاتے ہیں۔ علاوہ اسکے میں اور آپ تو گاڑی کی دو چوبیں ہیں۔ جب ایک چوب ٹوٹ گئی تو گاڑی نہیں چل سکتی۔ کیا میں آپ کو اس ایک چوب اور ایک پہیے سے تشبیہ نہیں دے سکتا؟"

چنگیز نے التان اور قوچار کو جو پیغام بھیجا اُس میں اُسکو وہ حلف یاد دلایا جو اُنہوں نے چنگیز خاں کے منصب خانی پر منتخب ہونیکے وقت لیا تھا۔ اور اس حلف کے جواز اور صحت کو باور کرایا جس طریقے سے چنگیز خاں نے اپنے فرائض منصب اس حیثیت سے کہ وہ اشراف جماعت گلہ بان سے تھا ادا کئے تھے، یاد دلایا چنگیز خاں نے ان سرداروں کو یہ بھی کہلا بھیجا کہ "میں نے بہت سے گھوڑے، گاڑیاں، گلے اور عورتیں اور بچے گرفتار کئے اور وہ سب تم کو دئے۔ صید و شکار کے بڑے بڑے ہانکوں میں میں نے تمہارے لئے انتظام کیا۔ پہاڑوں سے شکار گھیر گھیر کر تمہاری طرف لایا۔"

ونگ خاں نے دشمنوں سے صلح کی باتوں پر کچھ توجہ نہ کی۔ شنگوں نے کہا کہ چنگیز خاں کی ان باتوں میں خاص معنی مخفی ہیں جن کو میں خوب سمجھتا ہوں۔ بس اب قطعی فیصلہ یہی ہے کہ چنگیز سے لڑنا چاہیئے۔ بس اب مجھکو اپنا علم بلند کرنا اور اپنے آختہ گھوڑوں کو چراگاہوں میں موٹا کرنا چاہیئے۔

[1] یہ دریائے کلکہ دوسرا دریا ہے۔ ملک روس والا دریا نہیں ہے۔

اب تذبذب کا وقت نہیں رہا۔ اب چنگیز خاں مجبور ہو کر جھیل بلجون کی مرطوب اور دلدل والی زمین پر چلا گیا۔ یہاں اگر وقت پڑے تو چھپنا آسان تھا اور دشمن اچانک حملہ بھی نہ کر سکتا تھا لیکن پھر بھی حالت نازک تھی اور ایسی پانی اور دلدل کی زمین میں رہنے سے طبیعت گھبراتی تھی۔

لیکن اب پھر چنگیز خاں کے ساتھیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اور وہ تمام لوگ جنہوں نے چنگیز خاں کا ساتھ دینے میں اپنا نفع سمجھا اُسکے پاس آ گئے۔ ان کو چنگیز خاں کی قسمت کا کہ ایک دن وہ بڑا سردار ہوگا دل سے یقین تھا۔ جو لوگ اس وقت اُسکے پاس آئے ان میں چند مسلمان تاجر بھی تھے وسط ایشیا کی تجارت اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمان تاجر مشرق کے دور دور ملکوں میں پہونچے ہوئے تھے۔ ان تاجروں سے ملکر چنگیز خاں دُنیا کے حالات معلوم کر کے اپنے خیال میں وُسعت اور معلومات میں اضافہ کرتا تھا۔ اور اسکو مختلف ملکوں اور قوموں کا حال ان مسلمان تاجروں سے دریافت ہوتا رہتا تھا۔ یہ تاجر زیادہ تر اسکی فیاضی کی وجہ سے اُسکے پاس آتے تھے کیونکہ لوگ کہا کرتے تھے کہ تموچن اپنے تن کے کپڑے تک اُتار کر دوسروں کو دیدیتا ہے۔ اور وہ گھوڑا جس پر سوار ہوتا ہے اگر ضرورت ہو تو دوسرے کو بخشدیتا ہے۔

تموچن کا بھائی قسار اپنے بیوی بچے اسوقت ونگ خاں کے پاس چھوڑ کر تنہا چنگیز خاں کے پاس آیا۔ اسکے آتے ہی چنگیز خاں کو ایک موقع ایسا ملا کہ اُسکو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ بلاشش و پنج یا ایمانی تذبذب کے چنگیز خاں نے ایک فریب اُس شخص کے خلاف سوچا جسکو کل تک خط میں اپنا باپ لکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت چنگیز خاں کی حالت خراب تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ونگ خاں کو فتح ہوگئی تو پھر یہ قرایت کا سردار اس پر ہرگز رحم نہ کریگا۔ اس نے سوچا کہ زندگی میں جو اپنا مقصد ہے اُسکے حاصل کرنے میں اب پس و پیش کی ضرورت نہیں۔ مقدر میں یہی لکھا تھا کہ مغلوں کی گئی گذری عظمت اور شان کو پھر زندہ کرے۔ اور تمام گلہ بان شرفا کا خود سردار ہو۔ علاوہ اس کے جن خیالات میں اس نے پرورش پائی تھی اور جس طرح کی زندگی اب تک بسر کی تھی اُس میں کوئی روک ایسی نہ تھی جس سے وہ اپنے کسی خیال کو عمل میں لانے سے باز رہتا۔ غرض چنگیز خاں نے اپنے بھائی قسار کی طرف سے ایک آدمی کے ہاتھ ونگ خاں کو یہ کہلا بھیجا: "مجھکو اپنے بھائی تموچن سے ملنا ملاقات کرنا تو کیسا ابھی تک مجھکو اسکی پرچھائیں تک نظر نہیں آئی ہے۔ تمام راہیں میں نے تلاش کیں مگر اس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ میں نے اُسکو پکارا مگر میری آواز اس تک نہ پہونچی۔ آج میں آسمان کے نیچے زمین پر سر رکھے پڑا ستاروں کو دیکھ رہا ہوں۔ میری بیوی بچے آپکے پاس ہیں۔ اے میرے باپ اور خاقان اگر آپ کوئی معتبر آدمی میرے پاس بھیجدیں تو میں اُسکے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں"۔

ونگ خاں نے ان باتوں کو سچ سمجھا۔ اور اُس نے اپنا ایک معتبر آدمی قسار کے دونوں قاصدوں کے ساتھ بھیجدیا۔ چنگیز خاں نے اس اثنا میں یہ کیا کہ اپنے پورے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا۔ راستے میں دونوں قاصدوں نے چنگیز خاں کو خبر دی کہ حاکم قرایت (ونگ خاں) اس وقت اپنے مستقر میں ضیافتوں میں مصروف ہے اور کسی قسم کی احتیاط کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر سکے، اُس نے نہیں کی ہے۔ قاصدوں سے اتنا سُنتے ہی چنگیز منزل پر منزل مارتا بہت جلد قرایت کے لشکر گاہ تک پہونچ گیا۔ اور پہونچتے ہی اس نے ونگ خاں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور پھر اس پر حملہ کر دیا۔ اس طرح یکایک گھر جانے سے قرایت نے بھی جی توڑ کر حملے کا جواب کیا لیکن قرایت نے آخر کار شکست کھائی۔ ونگ خاں اور اس کا پوتا شنگوں دونوں میدان چھوڑ کر بھاگے۔ ونگ خاں کو نائمان کی سرحد کے قریب کسی نے مار ڈالا۔ ونگ خاں کا پوتا شنگوں بھاگتا ہوا کسی دور کے ملک میں پہونچا اور وہاں مر گیا۔

غرض ایک ہی وار میں چنگیز خاں منگولیا کے سب سے زبردست فرمانروا کے مقابلہ میں کامیاب ہو گیا۔ اور جو رتبہ اُسے حاصل تھا خود چنگیز کو حاصل ہو گیا۔ قوم قرایت کے قبائل کو اس نے اپنے سرداروں پر تقسیم کر دیا۔ اور جو لوگ ان میں شریف تھے ان کو اپنے رفقا کا تابع کر دیا۔ ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح کے بعد چنگیز خاں کا برتاؤ مفتوحوں کے ساتھ کیسا ہوتا تھا اور اس سے اس کا پتہ بھی چلتا ہے کہ خانہ بدوش قوموں کے دستور اور طریقے کیسے

سنگھار خانہ

مختلف قسم کے منجن، پوڈر، سرمہ، کریم
سنو، تیل وغیرہ کے نسخے اور آرائش
جمال کے بے شمار طریقے بتائے گئے ہیں
قیمت دو روپے چار آنہ ؎

بچوں کے کھانے

اصول صحت کے مطابق ننھے بچوں کو کس
قسم کی غذا دینی چاہیئے۔ ڈاکٹروں اور
تجربہ کاروں کے کارآمد مضامین بھی شامل
ہیں۔ قیمت آٹھ آنہ ۸ر

عصمتی کروشیا

فن کروشیا کی ترکیبیں سلیس پیرایہ میں
بتائی گئی ہیں اور نمونوں سے اُن کی وضاحت
کی گئی ہے۔ ہدایات اس قدر آسان ہیں
کہ بچیاں بھی سمجھ لیں۔ قیمت عہ

موتیوں کا کام

یہ کام بہت مشکل سمجھا جاتا ہے مگر اس
کتاب کے پڑھنے سے آسانی سے سمجھ میں آجاتا
ہے نقشوں اور تصاویر کے علاوہ عام فہم
ہدایتیں۔ قیمت دو روپے عما

گلدستہ کشیدہ

کشیدہ کاری کی اس قدر خوبصورت
اتنی کارآمد کتاب آج تک نہیں چھپی
بے شمار نمونے اور آسان ہدایتیں
لکھی گئی ہیں۔ قیمت عمر

اتالیق نسواں

عورتوں کو گھر کا اور انتظام خانہ داری کھانے
بہو بیٹیوں کو سگھڑ اور سلیقہ شعار بنانے
والی مشہور و مقبول کتاب۔ ایک شریف
لڑکی کو جو کچھ ضرور جاننا چاہیئے وہ سب
اس کتاب میں ہے۔ ۱۰ حصے ۱۲۰۰ تفصیلیں
۱۳۰۰ صفحے مشاہیر قوم نے بے انتہا پسند
کیا ہے۔ قیمت چار روپے آٹھ آنہ للعہ

عصمتی دسترخوان

باورچی خانے کے انتظام اور کھانوں کے
متعلق نہایت قیمتی ہدایات اور مضامین
اس میں درج ہیں۔ ہر ترکیب آزمودہ ہے
قیمت دو روپے عما

بیماروں کے کھانے

جو کھانے بیماروں کے لئے بیحد مفید
ہوتے ہیں اسمیں صرف انہی کی ترکیبیں
درج ہیں۔ کتاب باتصویر ہے ہر گھر میں
اس کا ہونا ضروری ہے۔ قیمت ۱۰ر

مشرقی مغربی کھانے

یورپ و ایشیا کے کھانوں کی ترکیبیں
اس میں درج ہیں اور ہر ترکیب تجربے
کے بعد درج کی گئی ہے۔ عمدہ مضامین
بھی شامل ہیں۔ قیمت ما

مذاقیہ کھانے

دولہا، نندوئی اور سہیلیوں وغیرہ سے
مہذب مذاق۔ اسمیں ایسے ہی کھانے
تیار کرنیکی ترکیبیں درج کی گئی ہیں۔
قیمت ٦ر

فن کڑھت و چکن سازی

اُردو و ہندی میں

جس طرح ہر چھوٹے بڑے مرد و عورت کا دل باغ کے خوشنما پھولوں کو دیکھ کر خوش ہوتا
ہے اسی طرح کپڑے پر کاڑھے ہوئے بیل بوٹوں اور اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چکن کے لباس کو
زیب تن کرنے سے بھی مسرت ہوتی ہے۔ اس امر کو مدنظر رکھ کر یہ کتاب جس میں ہر قسم کی
کڑھت کاڑھنے کے قاعدے سوئیاں نکالنے کی ترکیبیں اور بہت سی شکلیں بنا کر
دکھلائی ہیں ہندو مسلمان بہنوں کے شوق کے پورا کرنے کیلئے تیار کی ہے کئی صفحے رنگین
چھاپے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ دو بڑی تقطیع کی کتابیں دی ہیں جن میں سینکڑوں
ہندوستانی و انگریزی قسم کے بیل بوٹے سلیپر وغیرہ جانوروں کی شکلیں اردو عربی
ہندی انگریزی حروف لکھے ہیں۔ اس فن میں یہ کتاب اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ ہر قسم
میں چھپے سو سے زیادہ شکلیں ہیں ایک جلد میں رکھی ہوئی بھیجی جاتی ہیں۔ مدرسوں کی استانیوں
اور معزز خواتین کے علاوہ ہر شخص نے اس کتاب کو پسندیدگی سے دیکھا ہے
ہر گھر میں ایک جلد اس کی ضرور رکھنی چاہیئے۔ قیمت مکمل کتاب مع جلد دو روپے دس آنہ
علاوہ آرڈر کے ساتھ تحریر کریں کہ کتاب ہندی میں مطلوب ہے یا اردو میں

ملنے کا پتا:۔ شاہجہاں بک ایجنسی دہلی

فلاح دین و دنیا

ہر مسلمان کے لئے جو دین و دنیا کی بھلائی
چاہتا ہے جو اسلام کی معلومات اور دینی
مسائل سے واقف ہونیکے علاوہ دنیا میں
بھی عزت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہو اس کے
لئے فلاح دین و دنیا نہایت ضروری کتاب
ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہر مسلمان علم دین
اور واقف دنیا بن سکتا ہے قیمت عہ

محبوبہ کربلا

کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں حق پرستوں
کا خون کس بیدردی سے بہایا گیا معصوم
بچوں اور عورتوں پر مظالم محبوبہ کربلا میں
پڑھئے غمناک داستان بھی ہے اور ظالموں کی
ستم آرائیوں کے افسانے بھی ساتھ ہی یزید
کی نفس پرستیاں اور عیاشیاں جن کا عوام کو
علم نہیں آخر میں یزید کا عبرتناک انجام عہ

ہندکلیا

بچیوں کیلئے تاکہ شادی سے پہلے کھانا
پکانے کے فن میں ماہر ہو جائیں ترکیبیں اور
کھانے کنواری بچیوں ہی کے مطلب کے
درج کئے گئے ہیں۔ قیمت ۸ر

ناشتہ

دوپہر اور رات کے کھانے سے قبل صبح اور
تیسرے پہر کیا کیا ناشتہ کیا جاتا ہے
ہر ملک کے مہمان کے لئے اس میں ترکیبیں
درج کی گئی ہیں۔ قیمت ۱۰ر

عصمتی کشیدہ

کشیدہ کاری کے نہایت اچھے اچھے
نمونے ضروری اور کارآمد ہدایتیں اس قدر
آسان ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی سمجھ لیں
قیمت ایک روپیہ عہ

سوئی کا کام

کتابی اور سلائی پر پہلی اور بہترین کتاب
قیمت عہ
سلمہ ستارے کا کام ۲۵۰ قابل قدر
نمونے مع ہدایات و ترکیب قیمت عما

شمیم

نہایت دلچسپ معاشرتی اخلاقی ناول جسمیں
افسانہ نگاری کے اصول پر سبق آموز قوت
انگیز عبرتناک ضخیم جلدوں میں دوسری دفعہ
چھپا ہے رنگین تصاویر بھی کئی ہیں قیمت للعہ

یزید تھیٹر میں

کربلا کے واقعات کا دردناک ڈرامہ اسٹیج پر
لایا گیا ہے یزید کی خلاف شریعت حرکات
نفس پرستی کے حیا سوز مناظر نمایاں کئے گئے
ہیں یہ ڈرامہ قومی امر دھوی کی یادگار ہے
ڈرامہ کا نام انجام یزید ہے ایک باعصمت
حسینہ نے اس لعین کا نہایت دلیری کا مقابلہ
کیا اور کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کیں قیمت عہ

جوانی اور شادی کی مسرتیں حاصل کرنی ہوں تو

مندرجۂ ذیل کتابیں پڑھئے۔ ان کتابوں میں جوانی اور شادی کی مسرتیں بھی ہیں، عورتوں کے دلوں کو مسخر کرنے کی تدابیر بھی ہیں اور اس کے علاوہ صحت اور تندرستی کے قیام کے اصول بھی ہیں جس کے پاس یہ کتابیں ہونگی وہ بڑھاپے میں بھی جوانی کا کیف حاصل کریگا

شب عروسی

پڑھ لینے کے بعد عروسی کی سب باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ شادی کے وقت عموماً دوستوں کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیا جاتا ہے اگر آپ اپنے دوستوں کو ایسے مواقع پر کوئی بہترین تحفہ دینا چاہتے ہیں تو صرف یہ کتاب دیجئے۔ شب عروسی اصلی کتاب زندگی کا پہلا ورق ہے یا تکمیل انسانیت کے بام عروج کی پہلی سیڑھی ہے اگر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس زینہ پر قدم رکھا جائیگا تو وہ ایسا کامیاب قدم ہوگا کہ انسان کی یہ فطری مسرت ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہیگی قیمت ۸ ہے جو اس کے منافعہ پر سو مرتبہ صدقہ ہے محصول ۵

افشائے راز نہاں

اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب اور ایسی عجیب و غریب کہ آپ نے اس دلچسپ موضوع پر شاید کوئی کتاب سنی نہ ہوگی۔ اس میں دو ہزار دو سو کنواری اور بیاہی عورتوں کی نفسانی خواہشات کے حالات خود ان کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں امریکہ کی ایک سن چلی عورت نے یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کئے اور امریکہ میں ایک ہلچل مچادی۔ اب اس کا ترجمہ بھی ہو گیا ہے خدا جانے کب تک یہ لوگوں کے مطالعہ میں جا سکے ہر وقت اس کے بند ہونے کا خطرہ ہے اس لئے جلد منگا لیجئے۔ قیمت ۱۲ محصول ۶

دلہنوں کی کانفرنس

سات دلہنوں کی شب ہائے خلوت کی دلچسپ داستان۔ ساتوں ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اپنے واقعات شب عروسی کو صحیح صحیح لیکن شرمیلے الفاظ میں سناتی ہوئے اصلاح رسوم کا بیڑا اٹھاتی ہیں اور تعلیم و حقوق نسواں پر زور دیتی ہیں ہر ایک دلہن کی انوکھی سرگذشت سنی

شاہی کوک شاستر

جو بادشاہوں کے لئے تھا وہ اب عام ہے اس کتاب میں رجوع الشیخ نے لذت شباب کے سرچشمہ عورت کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ لذتیں جو ایک جوان آدمی کے ذہن میں عورتوں میں ہوتی ہیں شاید وہ اس کے پاس تک بھی ہوں ارباب نفس نے عورت کو رو میں رو میں سے لذت ہی لذت ثابت کی ہے اور اس طرح مرد کی قوت رہائی کو مزید طاقتور کرنے کیلئے نسخے لکھے اور ہزاروں گر بتلائے ہیں اس علاج کے سلسلہ میں حکایات وصل بیان کی ہیں وہ صدہا مجرب لاکھوں مقویات ادویات سے زیادہ مقوی ہیں۔ قیمت ۱۲

لذت شباب

شباب جاوداں کی جستجو ہو تو لذت شباب یعنی ایرانی کوک شاستر کا مطالعہ کیجئے جس سے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ شباب کو عرصۂ دراز تک کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں عورت کے تاثرات کیا ہیں حسن کی ملکہ کیونکر لطف اندوز ہو سکتی ہے گلزار شباب کس طرح وقف خزاں ہوتا ہے شباب کی روشنی ہمنی دیوی کس طرح منتی ہے عورت اگر عورت ہے اور مرد اگر مرد ہے اپنی خواہش پوری کر کے کیونکر کیسی خطرناک نتائج پیدا کرتے ہیں لذت شباب کو حیات تازہ بخشنے کیلئے صدہا مجرب نسخے متعدد ہیں قیمت ۱۲

قانون مواصلت

عیش و نشاط کی زندگی کا رہبر اگر اس کتاب کی ہدایتوں پر عمل کیا گیا تو ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ وقت سے پہلے آپ کی قوت میں کمزوری نہیں پیدا ہو سکتی اور شباب کی پوری کیفیت سے آپ لطف اٹھائیں گے اس میں مواصلت کی بابت تمام ضروری باتیں درج ہیں قیمت ۱۲

برتھ کنٹرول

عورت کی شباب آفریں لذت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ تم اس کے حسن و جمال کے خزانہ کو محفوظ رکھنے کا راز سمجھ لو اولاد کی کثرت سے نہ صرف ملکۂ حسن کے باغ جمال پر خزاں چھا جاتی ہے بلکہ عزیز الدین کے لئے ان کی پرورش ہو بال روح ہوتی ہے اور انسان ازدواجی ذوق و لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔ برتھ کنٹرول ایک حیرت انگیز طلسمی کتاب ہے جس کو پڑھنے کے بعد تمہارے سامنے زندگی کی ایک بڑی حقیقت بے نقاب ہو جائیگی اور یقین کے ساتھ اولاد کی پیدائش تمہارے لئے بے اختیار ہو جائیگی قیمت ۱۲ محصول ۴

شب عروسی کے افسانے

وہ لذیذ کتاب ہے جو شب عروسی کے تمام لذائذ کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوئی ہے اس کا دوسرا نام عروسی ناول ہے کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب کیسی دل آویز ہوگی اور واقعہ یہ ہے کہ عروس نو ہی کی طرح یہ کتاب حسین پر لذت اور معطر جذبات کی آئینہ دار ہے شب عروسی کے متعدد افسانے ہیں جتنے ہی دقیق پر اس زندگی کی سب سے بہتر رات کے مزے لوٹے گئے ہیں۔ فقط یہ باتیں یا حکایتیں ہی نہیں بلکہ ہر حکایت ایک نتیجہ خیز قصہ ہے جو بہت سے آنیوالے خطروں سے محفوظ رکھتا ہے قیمت ۱۲ محصول ۵

عیش و نشاط

اس کتاب میں شادی شدہ حضرات کے لئے وہ تجارب ہیں جن کے معلوم ہونے کے بعد عیش و لطف کیف تندرستی تندرست اولاد عورت کی محبت اور شادی کی لذتیں چند دن کے مطالعہ کے بعد حاصل کی جاتی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ ۱۴ / ۳

عورت باتصویر

پھولوں کی سیج پر حسن کی رعنائیاں دیکھنے کے پہلے مجسمہ ناز کے تمام پوشیدہ رازوں سے واقف ہو جائیے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب آپ یہ کتاب پڑھ لیں۔ اس کتاب میں یورپ و امریکہ کی بہترین صنفی کتابوں کا عطر کھینچا گیا ہے عورت میں نسوانی زندگی کا مکمل فوٹو ہے عورت کے پوشیدہ اعضائے جسم عورت کی فطرت عورت کی زینت عورت کے باغ حسن کی خوشہ چینی غرضکہ عورت کی زندگی کے متعلق کوئی بھی پوشیدہ بات ایسی نہیں جو اس کتاب میں نہ ہو دو سو کے قریب عکسی قلمی تصویریں ہیں۔ قیمت ۱۲ محصول ۴

تسخیر کیا ہے؟

ایک خوش رو نوجوان مرد ہو یا عورت اس کی صحت تندرستی اعضاء کا تناسب اور رنگ کی شگفتگی کا دہ لافانی عمل ہے جس سے ہر مرد و عورت کا دل مسخر ہو جاتا ہے اور اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی عمل حب ہے نہ کوئی عمل تسخیر اگر آپ اپنی لذت یہ خوبی اور جوہر پیدا کر کے تمام دنیا کو مسخر کرنے میں کیا آپ کو اس کی تمنا نہیں اور اگر ہے تو ہماری مشہور و معروف کتاب **اکسیر باہ** کا مطالعہ کیجئے جو متعدد بار شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی کتاب عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہے حصہ اول میں مردوں کی ضروریات کے امراض و معالجے حصہ دوم میں عورتوں کی زیب و زینت امراض و معالجات و حکایات درج ہیں۔ قیمت ہر دو حصہ ۱۲

زن و شوہر

یہ طلسمی کتاب شادی شدہ نوجوانوں کی زندگی کو راحتوں سے لبریز کردیگی اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مرد و عورت کی فطرت سے اس قدر آگاہ ہو جاتے ہیں کہ وہ عورتوں کو بھوکا ننگا رکھ کر بھی خوش رکھ سکتے ہیں

قیمت ایک روپیہ ۱۲

کیف مواصلت

معہ آٹھ پر شباب فوٹو دنیائے لطف و مسرت اور لذت و کیف میں ایک مرد اور جوان عورت سے مواصلت ہے اور یہی وہ کیف افزا سرور ہے جس پر دنیا کی بقا کا مدار ہے یوں تو فطرت کی بسیط دنیا میں ہزاروں ہستیاں ایسی موجود ہیں جو صرف قانونی طریق پر دنیا کی آبادی میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں، لیکن یہ زندگی تو جانور بھی گذار لیتے ہیں۔ بات تو یہ ہے کہ اس کیف پرور شعبہ حیات سے اس درجہ تمتع حاصل کیا جائے جو دوسرے ذی حیات عالم سے نا بلد ہو یا لا متناہی ہو یہ کتاب مواصلت کو اس درجہ پر پہنچا دیتی ہے جہاں لذت ہی لذت ہے۔

قیمت صرف ایک روپیہ محصول ۵؍

دوشیزہ کی ڈائری

ایک دوشیزہ نازنین کے دل میں کس قسم کے پوشیدہ خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ شادی سے پیشتر کیا معلوم کرنا چاہتی ہے شادی کے بعد اس کے لئے کن باتوں کا علم ضروری ہے حسن شباب کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے ان باتوں کا جواب آپ کو دوشیزہ کی ڈائری میں ملیگا۔ ایک مست شباب دوشیزہ کی زبان سے ان تمام پوشیدہ جذبات کی تصویر کھینچی گئی ہے فوٹو بلاک کی دو درجن حسین و جمیل تصویروں سے کتاب کی زینت میں اضافہ کر دیا ہے۔ قیمت دو روپے ؏

دلہن کی ڈائری

ایک شوخ و طرار دلہن کی آپ بیتی شب زفاف کا پر کیف سماں، کچھ خوف، کچھ شرم کچھ ہراس کچھ گدگداہٹ دولہا میاں کی بہیمیت، باغبان عشرت کی گلچینی بصبری کے جذبات، بیتابی کے مظاہرے، پوشیدہ حالات کا انکشاف غرضکہ دلچسپیوں کا لاجواب مرقع ہے۔

قیمت صرف ؏

شباب کی آٹھ بہاریں

شباب کی راتیں جن کیفیتوں اور دلآویزیوں کو اپنے اندر رکھتی ہیں ان پر مسرت ساعتوں میں جذبات جو جو کروٹیں بدلتے ہیں ان کی عکاسی اس کتاب میں بدرجہ اتم کی گئی ہے کتاب پڑھنے کے بعد تمام نقشہ آپ کی نگاہوں کے سامنے پھر جائیگا۔

قیمت صرف ۸؍ علاوہ محصول۔

ہمدرد خاوند

ایک بےنظیر کتاب جو فی الحقیقت خاوندوں کے لئے ہمدرد ہے اس میں ازدواجی زندگی کے متعلق تمام پوشیدہ رازوں کو ظاہر کرکے ایسی ایسی پتے کی باتیں بتائی گئی ہیں کہ آپ کبھی ناکامیاب نہیں ہو سکتے ساتھ ہی قوت باہ اور ہر قسم کے امراض مردانہ کے تیر بہدف نسخے بھی درج ہیں۔ قیمت صرف ؏ مجلد۔

بہار عروس

یہ وہ کتاب ہے جس کو سچیا دلہن نے اپنی سہیلی اختر دلہن کی ڈائری کے جواب میں اپنی شب عروسی کی سرگذشت لکھ کر بھیجدی ہے جو بجنسہ چھاپ دی ہے اس میں بڑے بڑے پوشیدہ دلچسپ واقعات ہیں بڑی ہی پرلطف و مزیدار کتاب ہے ایسی کتابیں کم ہوں گی۔

قیمت ایک روپیہ چار آنہ ؏

دولہا دولہن

یہ کتاب نئے شادی شدہ نوجوانوں کو اپنی بیوی سے حقیقی لذت حاصل کرنا سکھلاتی ہے اور ناتجربہ کاروں کو ناتجربہ کاری سے جو نقصان پہنچ جاتے ہیں ان سے بچاتی ہے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مواصلت میں غیر معمولی لذت پیدا ہو جائیگی اس کتاب کی مجرب اور عمدہ تدابیر معلوم ہونے کے بعد تمام عمر مسک اور طلاء وغیرہ دوسری دواؤں کی ضرورت نہ ہوگی ؏

بہار شباب

صنفی کتابوں میں اسلوب بیان کو امتیاز رہا ہے۔ وہ جذبات کی ہیجانی ہے یہ چیز مطالعہ کے لئے خواہ کتنی لذیذ کیوں نہ ہو لیکن اصل فائدہ اس پروگرام کے ماتحت ہے جس کے ماتحت وہ کہ انسان جوانی دیوانی کو قابو میں رکھنا چاہتا ہے کہ یہ لذت قائم ہو جائے بہار شباب میں ایسا ہی انتظام ہے جوانی کی کیف انگیزی اور اس کو دوام کرنے کے لئے بڑے بڑے مجرب طریقے قاعدے نسخے ہدایات حفظ ماتقدم کی ہزار ہا باتیں اور عورتوں کی اندرونی کیفیات کو مردوں پر آئینہ کر دیا متعدد عریاں فوٹو بھی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ

لطف شباب

جو عربی زبان میں سلطان سلیم خان کی کیلئے لکھی گئی تھی صدیوں سے نایاب تھی امراء رؤسا دکھانے میں بخل کرتے تھے اور چونکہ عربی میں تھی اس لئے خاص ذی علم اور صاحب ثروت فضلاء اطباء ہی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس کا مطالعہ کمزوروں کیلئے اکسیر اور بے اولادوں کیلئے مژدہ اولاد ہے اور مقوی باہ مجرب نسخوں اور طلسموں کا نادر و نایاب مجموعہ ہے نسخے نہایت آسان جس کو آپ آزمائیں گے تیر بہدف پائیں گے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

میاں بیوی

یہ کتاب دراصل بے تکلف احباب کیلئے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں زن و شوہر کے تمام تعلقات پر بحث کی گئی ہے اور ان تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جسے لوگ بیوقوفی سے خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ قابل دید کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ ؏

آرائش جمال باتصویر

اس کتاب میں عورتوں کے سنگھار اور جسمانی آرائش کے تمام مشرقی و مغربی طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ دو درجن فوٹو بلاک کی خوبصورت تصاویر کے علاوہ دو سو مجرب نسخے جو معمولی لاگت پر گھر میں تیار ہو سکتے ہیں بتائے گئے ہیں۔ کتاب کی خوبی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ (۱) ملک کے مشہور ڈاکٹر کرنل بھولا رام صاحب آئی ایم ایس سی آئی ای نے ڈاکٹری نقطۂ نظر سے اس کتاب کی نظرثانی کی ہے اور ایک طویل علمی دیباچہ بھی لکھا ہے۔

قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنہ

محبت کے پیغام

اگر آپ کو کسی سے محبت ہے اور اس پر آپ اپنے عاشقانہ جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اور مہذب عاشقانہ خطوط کے ذریعہ اس کے دل میں گھر کرنا چاہتے ہیں اور ایسے خطوط لکھنے کا ملکہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جس کو دیکھ کر پڑھنے والے تڑپ جائیں تو ہماری نئی کتاب محبت کے پیغام پڑھیئے اس میں عاشق مزاج میاں بیوی کے وہ خطوط ہیں جن کے ہر لفظ سے جیتی جاگتی اور پھبتی ٹپکتی ہے اور تمام خطوط نہایت مہذب اور شائستہ ہیں متعدد حسین و جمیل فوٹو بلاک بھی ہیں۔ قیمت ۸؍

مرد و عورت

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آخیر عمر تک زوجین تندرست رہیں گے اور انہیں وہ تجربے معلوم ہوں گے جن سے شاید اسی سال کے بوڑھے بھی ناواقف ہیں۔ قیمت ایک روپیہ ؏

نوٹ:- ان کے علاوہ ہر قسم کی کتابیں ہمارے کتبخانہ سے صرف ایک کارڈ آنے پر کفایت روانہ کی جاتی ہیں۔

کتب طب اردو داخل نصاب طبیہ کالج دہلی و مطبوعات عالم مسیح

آسان نسخے

چٹکلہ تمام امراض کا سہل الاصول مجرب علاج دیہات وغیرہ میں جہاں ڈاکٹر نہ ہو نہایت کارآمد ہے۔ قیمت ۸ ؎

افادہ کبیر

ترجمہ موجز القانون مع شرح یونانی طب کے اصول قواعد نبض قارورہ کے حالات نہایت سلیس اردو میں موقع بموقع بعض اعضاء کے انسان کی تصویریں بھی ہیں۔ قیمت دو روپے آٹھ آنہ ۸ ؎

امراض صبیان

بچوں کے امراض معہ تشریحی بیانات و تصاویر۔ قیمت بارہ آنہ ۱۲ ر

بخاروں کا اصول علاج

بخاروں کے اصول و علاج پر ایک علمی مقالہ قیمت آٹھ آنہ ۸ ر

بیاض کبیر حصہ اول اردو

(دہلی کا مطب) طب یونانی کے مجربات اور اصول مطب و علاج طبع دوم معہ اضافات جدیدہ قیمت دو روپے ۸ ؎

حصہ دوم اردو (دہلی کے مرکبات) اسمیں تمام ادویہ کے مشہور نام و اوزان مستعملہ درج ہیں۔ قیمت دو روپے ؎

حصہ سوم اردو (دہلی کی دوا سازی) یونانی دوا سازی کے اصول اور ان کے راز عرق، روغن اور طلا کشید کرنے کی بہتر سے بہتر ترکیبیں۔ قیمت بارہ آنہ ۱۲ ر

کتاب الادویہ

ادویہ مفردہ کا جدید اور معتبر مخزن، قیمت دو روپے ؎

ترجمہ موجز القانون

(مع متن عربی) افادہ کبیر موجز کا صرف ترجمہ و شرح بلا اصل متن ہے اور اس میں اصل متن مع لفظی ترجمہ اور ضروری مقامات کی شرح کی ہیں۔ قیمت عہ

تشریح کبیر

اعضاء اور ان کی ہیئت ترکیبی اردو تشریح حصہ اول معہ تصاویر قیمت ۵ ؎ بلا تصویر ستہ حصہ دوم معہ تصاویر ستہ بلا تصویر چار روپے للعہ

تشریح صغیر

تشریح کبیر کا خلاصہ آسان اردو میں قیمت دو روپے ؎

تعلیم القابلہ

تشریح اعضائے مخصوصہ نسواں معہ افعال و منافع۔ قیمت ؎

ایضاً دوم (معالجات امراض نسواں) امراض مخصوصہ زناں کی ماہیت، تشخیص اور علاج وغیرہ معہ تصاویر و آلہ جات۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تمام تشریحی مقامات امراض در آلات کے طبی ناموں کے ساتھ انگریزی اصطلاحات اردو انگریزی رسم الخط میں تحریر ہیں۔ قیمت پانچ روپے

حمیات آجامیہ

ملیریا کی تاریخ، اسباب، اقسام اور مفصل مجرب علاج۔ قیمت دو روپے ؎

کتاب التکلیس

کشتہ جات کی مصدقہ ترکیبیں قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

شرح اسباب اردو

معہ توضیحات مفیدہ حصہ اول قیمت ؎ حصہ دوم للعہ حصہ سوم ؎ حصہ چہارم ؎

القرابادین

موجودہ زمانہ کی جدید قرابادین۔ جو تمام بڑی بڑی قرابادینوں کا عطر ہے معہ زائد تر آزمودہ نسخہ درج ہیں۔ قیمت سات روپے

کتاب التشخیص

امراض کے علامات اور اس کا طریق تشخیص اور بعض خاص نسخے ہیں۔ قیمت ستہ

ہدیہ ذکور

مردوں کے لئے آسان زبان میں مردانہ امراض اور علاج بطریق سوال و جواب تمام نسخے معتبر اور مستند ہیں قیمت عہ

لغات کبیر

طبی یونانی۔ اصطلاحات کا نفیس ذخیرہ قیمت حصہ اول تین روپے ستہ

ایضاً حصہ دوم۔ اس میں دواؤں کے عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، کیمیاوی، انگریزی، یونانی اور دیگر زبانوں کے ناموں کی توضیح ہے قیمت تین روپے ستہ

مخازن التعلیم

کلیات و معالجات کا ضروری مجموعہ خاندان شریفیہ کے طریق علاج اور معمولات مطب نسخوں کا گنجینہ قیمت ستہ

منافعہ کبیر

اعضائے انسان کے افعال و وظائف قیمت چار روپے آٹھ آنہ للعہ

میزان الطب جدید

مع فوائد و تنبیہات و نقشہ جات چشم قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

علم الجراحت

باتصویر علم جراحی کی عظیم الشان کتاب جو ڈاکٹروں اور حکیموں کی متفقہ عرق ریزی کا نتیجہ ہے قیمت حصہ اول ۵ ؎ حصہ دوم ؎

علاج الامراض اردو

حکیم اجمل خاں مرحوم کے مجرب و معمول مطب کے نسخے جن کے مقابلہ میں ہندوستان کا کوئی مطب ایسے بہتر نسخے نہیں پیش کر سکتا۔ قیمت تین روپے ستہ

القابلہ ؎ قانونچہ اردو عہ
قانون نسل عہ علم الجکشن عہ
طب قدیم و جدید ۲
طبی نغانچہ ۸ ر
رسالہ نبض ۱۰ ر
" ہیضہ ۶ ر
" آتشک ۴ ر
" مقیاس الحرارت ۴ ر
" مسماع الصدر ۲ ر
" بواسیر ۶ ر
" ۶ ر
" دیدان ۲ ر
" ذیابیطس ۲ ر
" سل و دق ۲ ر
" سم الفار ۸ ر
" سوزاک ۸ ر
" قارورہ ۸ ر
" پارہ ۵
طبی فرہنگ عہ
نفیسی (علم الادویہ) ؎

اسلامی میاں بیوی

ازدواجی تعلقات کے سلسلے میں یہ سب سے بہتر کتاب ہے اور بہت مؤثر پیرایہ میں لکھی گئی ہے یہ کتاب میاں بیوی دونوں کے پڑھنے کے لائق ہے اگر دونوں اس کو اور اس کے پروگرام کو تعمق سے ذہن نشین کرلیں تو پھر ان کا گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے ضخامت ۲۰۳ صفحات قیمت بارہ آنہ ۱۲/

شاہان مغلیہ کی بیویاں اور رانیاں

شاہان ہند کی وہ نامور خواتین جن کا اعزاز اب تک تاریخ ہند میں ثبت ہے اسی کتاب میں ان شاہی بیگمات اور رانیوں کے حالات ہیں جو اپنی اپنی جگہ کسی مخصوص شہرت کی مالک تھیں۔ اس میں حسین مہ جبین بھی ہیں اور شاعرہ ادیبہ بھی! جری صف شکن بھی عصمت و عفت کی پیکر بھی اور ماہ پارے بھی ہیں جن کی چاند سی صورت پر سلطنتیں اور راجدھانیاں قربان ہوگئیں بڑی دلچسپ اور سرشار لٹریچر کی کتاب ہے ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحات قیمت بارہ آنہ ۱۲/

موتی

دنیا بھر کے حکما، علما، اور ادبا کے گرانقدر زرّین اقوال مجموعہ بصیرت افروز ملفوظات کا خزانہ، حکمت، فلسفہ، پند و موعظت، شعر و رومان ادب لطیف و انشا و ادبیات نثر میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف کاغذ کتابت طباعت بہترین قیمت بارہ آنہ محصول

پندرہ منٹ میں شعر کہنا آتا ہے

اس کتاب میں یہ کمال ہے کہ کیسا ہی معمولی سمجھ اور معمولی لیاقت کا آدمی ہو لیکن پندرہ منٹ میں شاعر بن سکتا ہے۔ اس میں صرف تین تین چھوٹے چھوٹے لفظ تجویز کر دیئے ہیں ان سے جس بحر کی چاہو تقطیع کر لیں اگر آپ شاعر بننا چاہتے ہیں تو کتاب فن شاعری منگایئے۔ قیمت ۸/

جادو بیانی

موجودہ زمانے میں انسان کی ترقی کے لئے جہاں اور چیزوں کی ضرورت ہے وہاں گفتگو میں شائستگی اور تقاریر میں روانی بھی ہونی چاہیئے یہ کتاب آپ کو فی الحقیقت ایسا جادو بیان مقرر بنا دیگی کہ سامعین آپ کی ہمنوائی کا دم بھرنے لگیں گے۔ موجودہ زمانہ کے تمام جدید اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کے پڑھنے کے بعد آپ تقریر کرنے کے تمام اصول کو سمجھ کر ایک بہترین مقرر بن سکتے ہیں قیمت ۶/

فالنامہ ناصری

ہر کام شروع کرنے سے پہلے احسن طریقہ یہ ہے کہ استخارہ کر لیا کریں تاکہ اس کا انجام اگر ٹھیک نہ ہو تو اس کو ترک کر دیا جائے۔ اسمیں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب استخارہ قرآنیہ کا ترجمہ ہے اور اس کے علاوہ قرعۃ الانبیا فالنامہ پیغمبران، فالنامہ اولیائے کرام، فالنامہ غوث الاعظم، فالنامہ دیوان حافظ، فالنامہ مثنوی شریف شامل کر دیا ہے یہ فالنامہ بہت ہی مقبول ہے۔

قیمت صرف ۸/ محصولڈاک ۴/

تذکرہ اولیائے ہند

جس میں تمام مشہور و معروف سات سو اولیائے عظام ہند چشتیہ، صابریہ، نظامیہ قادریہ سہروردیہ کے پاک زندگی کے حالات مع کشف و کرامات نہایت معتبر تاریخی کتب سے اخذ کرکے مع جائے ولادت، مدفن زبان اُردو سلیس میں درج کئے گئے ہیں۔ بادۂ توحید کے شیدائی و متوالوں کے لئے نہایت مفید و کار آمد کتاب ہے جو تین جلدوں میں تمام ہوئی ہے قیمت مکمل جلد چار روپے ۴/

صبح لطافت

ملک کے مشہور اور یگانہ مزاحیہ نویس جناب ملا رموزی کی بہترین تصنیف جس میں مصنف نے اپنی مخصوص طرز نگارش کے ذریعے مزاح اور دلچسپی کے دریا بہا دیئے ہیں اس کتاب کی شگفتگی اور دل آویزی خود اس کو پڑھنے کی سفارش کرتی ہے۔ قیمت دو روپے ۲/

شادی

یہ کتاب مزاح میں اپنی شان کے اعتبار سے یکتا ہے ملک کے بہترین مزاحیہ نویس جناب ملا رموزی کا نام نامی اس کتاب کی خوبیوں کے لئے کافی ضمانت ہے اگر آپ معیاری مزاح کے ساتھ شگفتگی مضامین اور تحریر کی خوبیوں کو ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور مطالعہ کیجئے۔ قیمت ۱۲/

مکمل شرح دیوان غالب

ہندوستان میں اس سے بہتر شرح آج تک شائع نہیں ہوئی از عبدالباری آسی قیمت تین روپے محصولڈاک ۸/

سی پارۂ دل

خواجہ حسن نظامی کے مضامین کا دلکش مجموعہ جو اعلیٰ جماعتوں کے سرکاری نصاب میں داخل ہے قیمت ۱۲/

فن تسخیر

دلوں کے مسخر کرنے والے اخلاق و آداب سکھانے والی کتاب قیمت ۸/

شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی آخری تصنیف

اُمّہات الاُمّہ

علامہ مرحوم نے جس وقت یہ کتاب تحریر فرمائی تو بعض تنگ خیال مسلمانوں نے جس میں زیادہ تر طلبا مساجد شامل تھے اس کی سخت مخالفت کی یہ کتاب جیسا کہ اس کے موضوع سے ظاہر ہے اُن غیر مسلموں کے اعتراض کا جواب تھا جو رسالتمآب صلعم کے تعداد ازدواج پر رکیک حملے کرتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو جو غیر مسلموں کے سامنے پیغمبر اسلام صلعم کی صداقت کا مدعی ہو حسن عقائد کو الگ کرکے دعویٰ اس طرح کرنا چاہیئے تھا جو منطق فلسفہ معقول و تاریخ کی کسوٹی پر پارس ثابت ہو۔ یہی تھا مصنف کا سب سے بڑا قصور جس کو بعض مسلمان برداشت نہ کرسکے اور کتاب پردۂ دنیا سے نابید کر دی گئی۔

اُمّہات الامہ پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ اور اُن اعتراضات کے دندان شکن جوابات جو صاحب "احسن التفاسیر" نے دیئے ہیں (یہ جوابات ابتک کہیں نہیں چھپے) وہ بھی بطور ضمیمہ اس کتاب میں شامل ہیں۔ ضخامت بڑے سائز کے تقریباً ۲۰۰ صفحات۔ کتاب کی قیمت نسبتاً کم تجویز کی گئی ہے صرف دو روپے علاوہ محصولڈاک

لیلائے نجد

حسن کی ستم آرائیاں جہاں پیرس کے ہوٹلوں میں کرشمہ سازیں وہاں صحرائے لق و دق میں بھی اپنی ستم آرائیوں سے نہیں چوکتیں لیلائے نجد قیس عامری کی دلدادہ نہیں بلکہ سلطان نجد والئی حجاز کی دلربا ہے۔ ابن سعود نے جو مظالم طائف و مکہ میں کئے ان کا بھی اس کتاب میں مفصل حال درج ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ

افسانۂ ثریا

یہ کوئی ناول نہیں ہے یہ ایسا واقعہ ہے جو درحقیقت رونما ہوا اور ایسے واقعات برابر پیش آتے رہتے ہیں۔ افسانہ میں سحر نگاری منظر آرائی علاوہ ادب فطرت و جذبات شاعری تمام چیزیں دوش بدوش چلتی ہیں۔

قیمت صرف ایک روپیہ ۱/

علامہ راشد الخیری کی تصانیف

لڑکیوں اور عورتوں کے لئے بیش بہا کتابیں

آمنہ کا لال	عہ/
ستیدہ کا لال	عہ/
اُمّت کی مائیں	۱۲/
وداعِ خاتون	۸/
صبحِ زندگی	عہ/
شامِ زندگی	عہ/
شبِ زندگی	عہ/
نوحۂ زندگی	۱۲/
نسوانی زندگی	۸/
حیاتِ صالحہ	عہ/
طوفانِ حیات	عہ/
جوہرِ قدامت	عہ/
تمغۂ شیطانی	۱۲/
ستونتی	۸/
غدر کی ماری شہزادیاں	۱۲/
وداعِ سفر	عہ/
عروسِ کربلا	عہ/
محبوبۂ خداوند	۱۲/
یاسمین شام	عہ/
شہنشاہ کا فیصلہ	۴/
دُرِّ شہوار	۸/
قلبِ حزیں	۸/
گلدستۂ عید	۸
سعادتِ قفس	۱۲/
انگوٹھی کا راز	۸/
جوہرِ عصمت	عہ/
سیلابِ اشک	عہ/
طوفانِ اشک	عہ/
نانی عشو	۱۰/
ولایتی نسخہ ۸/ شہیدِ مغرب	۸/
منازل السائرہ	۸
بنت الوقت	۸/
فسانۂ سعید ۸/ سراب مغرب	۸/
تحفۂ کمال	عہ/
اندلس کی شہزادی	۸/
سات روحوں کے اعمالنامے	۸/

تصانیف مولوی عبدالحلیم شرر

گروہِ مشاہیر	عہ/
بیانِ سلف	۱۰/
مقالاتِ شرر	عہ/
سفرنامۂ ہمبئی	عہ/
مخدراتِ مشاہیرِ عالم	عہ/
اسلامی سوانحِ عمریاں	عہ/
پردہ	عہ/
تذکرۂ مشاہیرِ عالم کامل	عہ/
فلورا فلورنڈا	عہ/
ملکُ العزیز ورجنا	۱۲/
حسن انجلینا	۱۲/
منصور موہنا	۱۲/
شہیدِ وفا	۱۲/
بدرالنساء	۶/
دلکش	عہ/
حسن بن صباح	۴/
فردوسِ بریں	۱۲/
میوۂ تلخ	۱۰/
درگیش نندنی	۶/
دربارِ حرام پور	۱۰/

تصانیف مولانا شبلی نعمانی

الفاروق	۱۲/
سیرۃ النعمان	۱۲/
سفرنامہ روم و مصر و شام	عہ/
المامون	عہ/
سوانحِ عمری امام غزالی	۱۲/
سوانحِ فیضی	۳/
" فردوسی	۶/
نظامی گنجوی	۶/
مقالاتِ شبلی	۱۲/
اورنگزیب پر ایک نظر	۶/
حیاتِ سعدی	۶/
آغازِ اسلام ۶/ حیاتِ حافظ	۶/
حیاتِ خسرو ۶/ الکلام	عہ/
مجموعۂ نظمِ شبلی عہ/ سوانح مولانا روم	عہ/
شعر العجم کامل	عہ/

انگریزی سکھانیوالی بلینظیر اور درسی کتابیں

مخزن الفوائد

اس میں اُردو تمام و عبارت کو انگریزی میں لکھنے اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے انگریزی چٹھی لکھنے ہجے کرنے اور تلفظ کے قاعدے انگریزی بول چال کے کئی سو فقرے ایک ہزار کے قریب اُردو فقرے قاعدوں کے ساتھ اور بیس حکایتیں انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے درج ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ایسا ابتدی جو انگریزی سے واقف نہیں ہے قلیل عرصہ میں خاصی استعداد حاصل کرسکتا ہے قیمت ۲/ علاوہ محصول

انگریزی اُردو خط و کتابت

ہر قسم کی چٹھیاں، عرضیاں، نوٹس اور ہر قسم کی تحریروں کے قاعدے اور نمونے معہ ترجمہ اُردو قیمت ۱۲/

اُردو انگریزی ڈکشنری

سات ہزار پانسو ایسے اُردو لغت جو اکثر تحریر و تقریر میں آتے ہیں بہ ترتیب حروف ہجی اُردو خط میں ہیں ان کے آگے انکی انگریزی انگریزی خط میں ہے قیمت ۷/

انگریزی بولنا

تین ہزار بول چال کے فقرے معہ ترجمہ اور مخزن الفوائد کے تمام اُردو جملوں کا ترجمہ۔ قیمت چھ آنہ ۶/

مخزن الحکایات

یعنی ۲۷ انگریزی کہانیاں مع اُردو معنی و تلفظ درج ہیں۔ قیمت ۵/

خلاصۃ القواعد

ہندی کو پارسنگ کرنا اور اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنا بخوبی سمجھایا گیا ہے قیمت ۸/

مخزن المحاورات

اس میں ایک ہزار دو سو انگریزی محاورے معہ چھ سو شالیں معہ ترجمۂ اُردو جو انگریزی حروف اور معین چار ہزار کے قریب ایسے ناموں اور چیزوں کی انگریزی

کامل القواعد

اس میں صرف نحو کے تمام و کمال قاعدے جو ترجمہ کرنے اور انشا پردازی سے متعلق ہیں نہایت وضاحت سے درج ہیں ۱۶۷ اعلیٰ درجہ کی مستند انگریزی گرامر کا لب لباب ہے قیمت صرف ۱۰/

ہادی الترکیب

اس میں انگریزی ڈکٹیشن لکھنے انگریزی بے پڑھ بولنے کیلئے لفظوں کے صحیح ہجے اور تلفظ اور پارسنگ کے تمام قاعدے ابتدا سے انتہا تک بہت سہل انداز بیان میں سمجھائے گئے ہیں۔ قیمت ۶/

ضمیمہ مخزن الفوائد

اس کتاب میں علاوہ ترجمہ کے ۳۰ قاعدے اور سمجھائے گئے ہیں اور ترجمہ کے واسطے ایک ہزار فقرے اور بہت سی عبارت بھی درج کی گئی ہے قیمت ۶/

ضمیمہ مخزن المحاورات

اس کتاب میں مخزن المحاورات کے علاوہ ڈھائی ہزار محاورے اور آٹھ سو مخصوص پریپوزیشنوں کے استعمال کے انگریزی فقرے معہ ترجمہ اُردو درج کئے گئے ہیں قیمت صرف چھ آنہ ۶/

انگریزی خوشنویسی

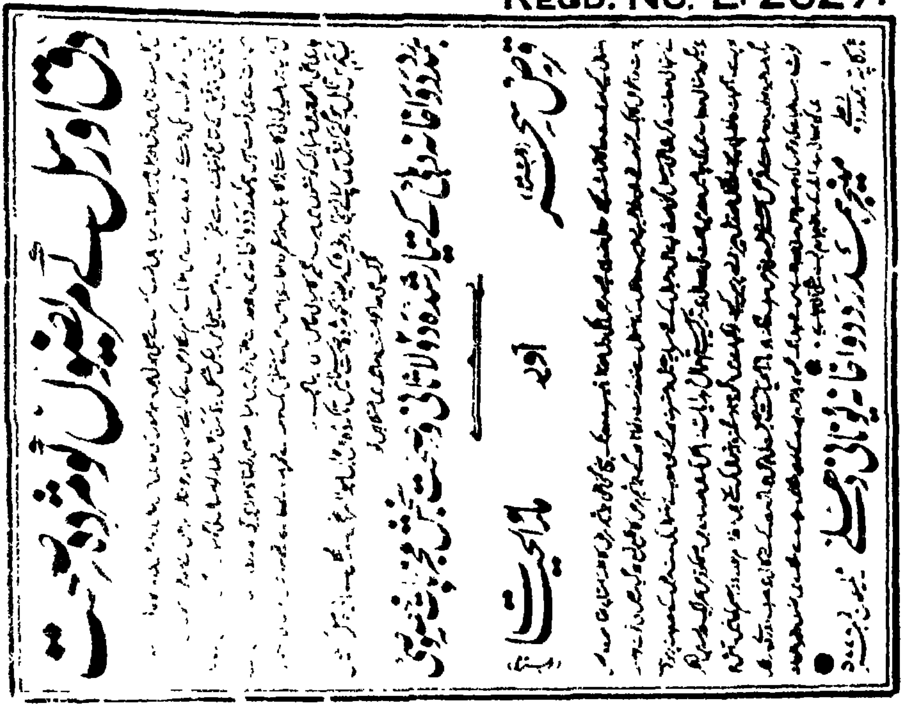
شرطیہ ڈھائی مہینہ میں انگریزی لکھئے اگر آپ مومن صاحب کی انگلش ٹیچر کا ایک سبق روزانہ سمجھ کر پڑھ لیں تو کبھی استاد کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک گھنٹہ روزانہ کی محنت میں آپ بہتر سے بہتر انگریزی بول سکتے ہیں اور لکھ سکتے ہیں۔ یہی وہ کتاب ہے جو دو سال میں تیس ہزار فروخت ہو گئی۔ ضخامت تقریباً ۲۲۲ صفحات قیمت ایک روپیہ محصول ۱/

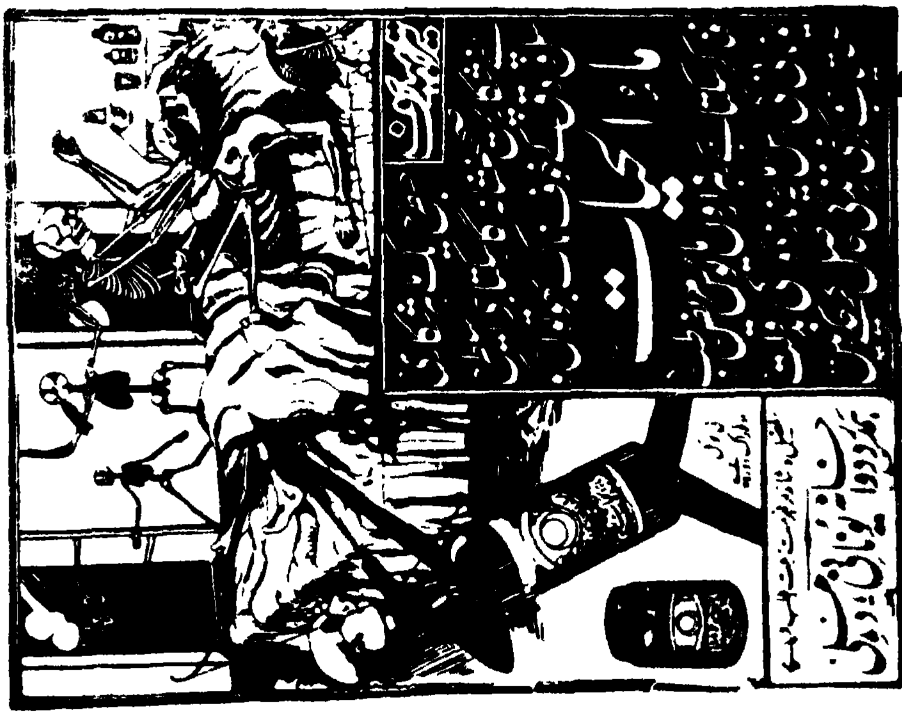
فہیم و بہرام

فن سراغرسانی پر بہترین جاسوسی ناول ضخامت ۲۷۲ صفحات قیمت ۱/ محصول ڈاک ۵ کل ۱۲/

علاوہ ان کتب کے ہر قسم کی کتابیں پتہ ذیل سے طلب فرمائیے۔

REGD. No. L. 2627.





Publisher —

SHAHID AHMAD B. A. (Hons)

ساقی ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ للعہ ششماہی ۳؎ مع محصولڈاک۔ نمونے کا پرچہ مفت۔

جُرعات

ہر سال ساقی کے چار خاص نمبر شائع ہوتے ہیں۔ مُستقل خریداروں سے اُن کی قیمت الگ نہیں لی جاتی۔

جلد ۱۲ | ساقی دہلی "افسانہ نمبر" بابت جولائی ۱۹۳۵ء | نمبر ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

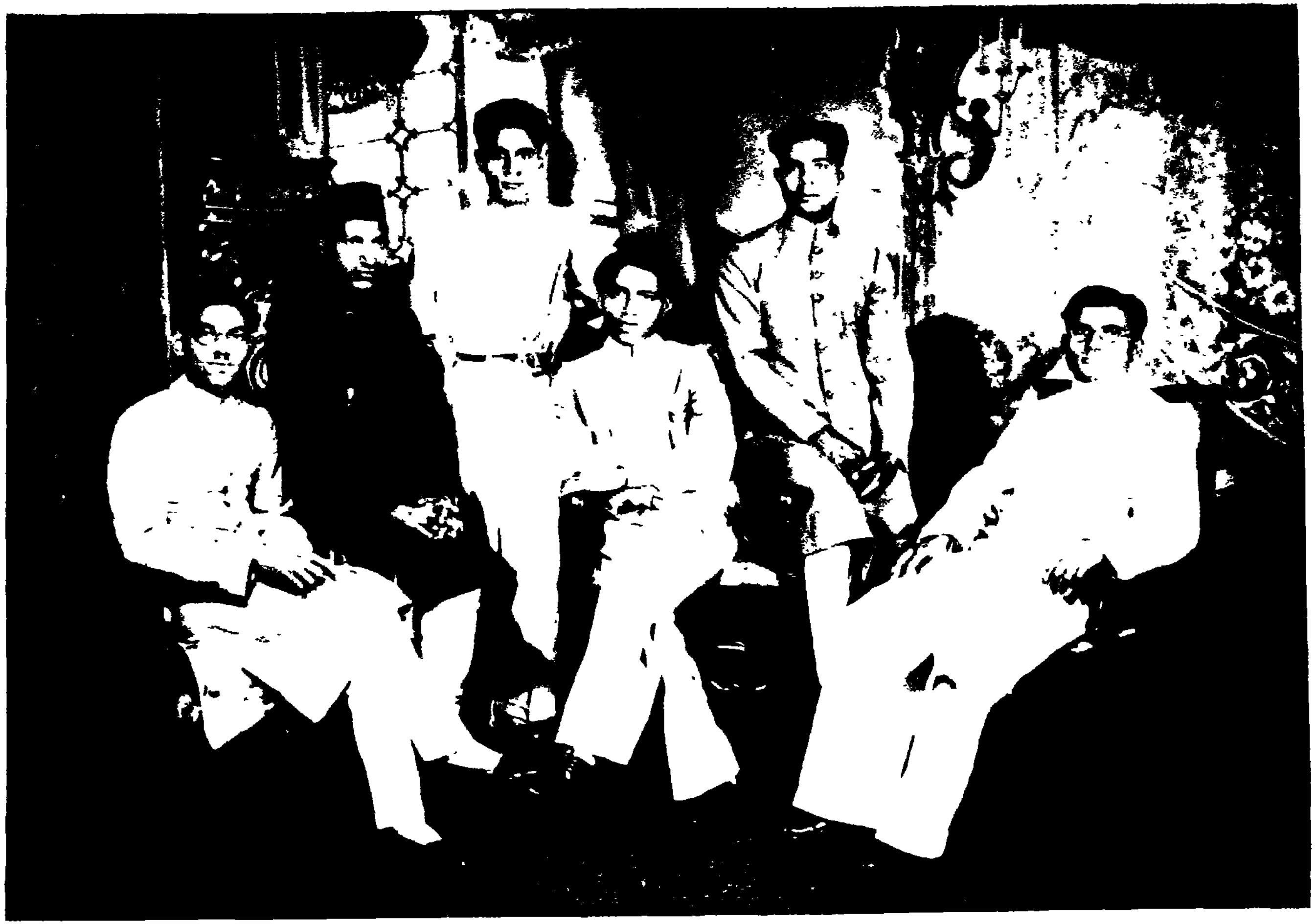
نگاہِ اوّلین

الحمد للہ کہ اس پرچے کے ساتھ ساقی کی بارھویں جلد کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس عرصے میں ہماری کوشش یہی رہی کہ ساقی میں بہتر سے بہتر مضامین شائع ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اپنے ارادوں میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ ساقی کے خاص نمبروں نے خاص اہمیت حاصل کر لی ہے اور شائقین ان کے لئے بے چینی سے منتظر رہتے ہیں۔ افسانہ نمبر اپنے نام کے اعتبار سے صحافتِ اردو میں کوئی نئی چیز نہیں ہے، مگر ساقی کا افسانہ نمبر اپنے مضامین کے لحاظ سے اردو پڑھنے والوں میں بہت مقبول ہے۔ ساقی کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اسے اردو کے بہترین اہلِ قلم کی اعانت حاصل ہے۔ فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ افسانہ نمبر میں کیسے کیسے لکھنے والوں کے مضامین شامل ہیں۔ افسانوں کے متعلق ہمارا کچھ کہنا بے سود ہے۔ اس کا فیصلہ آپ خود فرمائیں۔ بعض اچھے افسانے افسانہ نمبر میں شائع ہونے سے رہ گئے۔ کیونکہ ساقی کی ضخامت یوں بھی بڑھتے بڑھتے ۱۷۰ صفحے تک جا پہونچی۔ (یہ ضخامت صرف مضامین کی ہے۔ اشتہارات کے صفحے اس میں نہیں گنوائے گئے ورنہ ۲۲ صفحے اس میں اور جوڑ کر کہا جاتا کہ تقریباً ۲۰۰ صفحے کا خاص نمبر شائع ہوا ہے۔) باقی ماندہ منتخب افسانے آئندہ اشاعت میں پیش کئے جائیں گے۔

سنہ ۳۵ء اردو علم و ادب کیلئے بہت منحوس ثابت ہو رہا ہے۔ نصف سال ہی میں تین سرپرست اٹھ گئے۔ منشی نور الٰہی اور آغا حشر کے انتقال سے اردو ڈرامے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا۔ جون کے وسط میں شمس العلماء مولوی ممتاز علی صاحب کے سانحہ ارتحال کی خبر سُنی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم سرسید کے رفقا میں سے تھے اور اگلے لوگوں میں سے صرف آپ ہی رہ گئے تھے۔ اردو علم و ادب کے مربّی تھے۔ آپنے ساری عمر تعلیمی خدمات میں صرف کی اور طبقۂ نسواں پر آپ کے جو احسانات ہیں انہیں آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہیں کر سکتیں۔ "تہذیبِ نسواں" نے مسلمان عورتوں میں جو بیداری پیدا کی اُسے مدِ نظر رکھتے ہوئے "محسنِ نسواں" کا جسقدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ عورتوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ بچّوں کی ذہنی تربیت کا بھی مولوی صاحب کو بہت خیال تھا۔ چنانچہ "پھول" نے ہزاروں بچّوں کی تعلیم و تربیت میں حصہ لیا ہے اور آج وہی بچّے کامیاب زندگی گذار رہے ہیں۔ قوم کے اس محسنِ اعظم کے انتقال پر کس کا دل ہے جو آنسو بنکر آنکھ سے نہ بہہ جائے۔ اِسے ہماری بدنصیبی سمجھیئے کہ ایسی بابرکت ہستی ہم میں سے اُٹھ گئی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے۔

ساقی کا ایک نیا خاص نمبر — ہر سال اکتوبر میں ساقی کا "دلّی نمبر" شائع ہوا کرتا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ایک ہم کوئی اور خاص نمبر شائع کریں اور یہ خاص نمبر ایسا ہو کہ آج تک کسی اور پرچے نے شائع نہ کیا ہو۔ ہماری کوششیں عرصے سے جاری ہیں اور غالباً آئندہ پرچے میں اسکے متعلق مفصل اعلان شائع کر سکیں گے۔

شاہد



ممتاز حسین　　انصار ناصری　　اختر رائپوری　　محمود مورخ　　فضل حق قریشی　　شاہد

Calcutta Art Press Delhi

نجم السحر کا ایک باب

ربِّ عمون کا وعدہ

از جناب مولوی عنایت اللہ صاحب بی، اے

صبح کا وقت ہے آفتاب نے ابھی ابھی طلوع ہو کر طیبی کے شہر کو روشن کیا ہے۔ دریا پر ایک نہایت آراستہ کشتی میں شہزادہ ثوران زرق برق لباس پہنے بیٹھا ہے۔ قریب ہی اس کا سپہ سالار اطس اور شموان نجومی مع دو اور سرداروں کے حاضر ہیں۔ پیچھے ایک دوسری کشتی میں چند غلام لڑائی کے قیدیوں کو جن میں وحشی قوموں کے دو بڑے سردار اور انکی عورتیں شامل ہیں، حراست میں لئے ہیں۔ اسی کشتی میں ایکطرف کئی صندوقوں میں مقتول دشمنوں کے نمک پاشیدہ سر اور ہاتھ مقفل ہیں۔ شہزادہ انہیں اپنے ساتھ منوف سے لایا ہے تاکہ فرعون کے سامنے پیش کرے۔

شہزادے کی کشتی کے ملاح سپید وردیاں پہنے بڑی تیزی سے چپو چلا رہے ہیں۔ دائیں بائیں جنگی جہاز صف بستہ ہیں اور کشتی ان کے بیچ سے دریا کے چڑھاؤ پر بہت تیز جا رہی ہے۔ ثوران نے ان جنگی جہازوں کو جو فرعون کے حکم سے یہاں کھڑے کئے گئے تھے بہت حیرت سے دیکھا اور دل میں کہنے لگا کہ شموان نجومی سچ کہتا تھا کہ بے سوچے سمجھے کسی کام کو کر بیٹھنے میں کیا کیا قباحتیں ہیں۔ واقعی فرعون ہر اچانک حملے کا جواب دینے کو بالکل تیار ہے۔ یہی خیال ثوران کو اس وقت بھی آیا تھا جب کہ شروع میں کشتی سے اتر کر بندرگاہ کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا تھا اور دیکھا تھا کہ ہر طرف سواروں اور پیادوں کے دستے اور صدہا سپاہی فصیلوں کے اوپر بالکل ہوشیار اور مسلح کھڑے ہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ اتنے آدمیوں کی آہنی صفوں کو ایک قلیل جمعیت سے توڑنے کی کوشش میں اپنا کیا درجہ ہوتا

سیڑھیوں پر فرعون کے امرائے لشکر زرع بکتر سے آراستہ اور بت خانوں کے کاہن نیچے نیچے لباس پہنے استقبال کیلئے حاضر تھے ان سب کیساتھ ثوران بندرگاہ سے نکلکر اس عالیشان بت خانہ کے احاطہ میں داخل ہوا جسکی تعمیر طیبی کے تین بڑے خداؤں کے نام پر ہوئی تھی۔ اس بت خانہ کا نام "جنوب والا بیت العمون" تھا۔ یہاں پہنچکر اس عمارت کے عالیشان دروازوں کے نیچے سے گذرتا ہوا یہ جلوس اس سڑک پر آیا جس کے دونوں طرف باغوں میں امیروں کے مکانات تھے۔ جا بجا علم نصب تھے اور ان کے سروں پر رنگ برنگ کے پھریرے اڑ رہے تھے۔ اس رستہ سے گذر کر جلوس قصر فرعون کی دیوار کے قریب پہنچا۔ قصر کے اونچے اونچے برجی دروازے بند تھے۔ یہ اس قدر وزنی تھے کہ علاوہ ان سپاہیوں کے جو ساتھ تھے اور بہت سے سرہنگ مدد کیلئے بلائے گئے اور ان سب نے ملکر بڑی طاقت سے ان کو کھولا۔ واقعی حال تو یہ تھا مگر کل رات کو ثوران اس خیال میں تھا کہ ان دروازوں کو توڑ کر محل میں داخل ہونا کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔ قصر میں داخلہ کے بعد درختوں کی چھاؤں چھاؤں جن میں پھول کھل رہے تھے ثوران مجلس ہزار ستون یعنی فرعون کے ایوانِ عام میں آیا۔

چونکہ باہر روشنی تیز تھی اسلئے دربار کا یہ وسیع کمرہ تاریک معلوم ہوا، صرف چھت کے ایک روشندان سے شعاعِ آفتاب چھن کر جانب صدر اس طرح پڑ رہی تھی کہ فرعون اور اسکی ملکہ تختِ عاج و طلا کار پر بیٹھے اور سروں پر تاج رکھے بخوبی نظر آتے تھے۔ تخت کے ایکطرف امرا فوج اور مشیرانِ دولت مع بہت سے کاتبوں اور منشیوں کے مؤدب کھڑے تھے۔ دوسری طرف فرعون کی بیگمات اور حرم نشین کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ ہر ایک کی خدمت میں حسین حسین کنیزیں بناؤ سنگھار کئے حاضر تھیں۔ تخت کی پشت پر ستونوں کے بیچ میں نوبیہ کے دو سو مسلح جوان صف بستہ تھے۔ ان کا کام ہر وقت

فرعون کی جان کی حفاظت تھا اور محض وفاداری اور شجاعت کی بناء پر وہ اس خدمت کے لئے منتخب کئے گئے تھے۔

اس تمام تزک واحتشام کا مرکز فرعون تھا۔ آفتاب کی کرن معتدل روشنی میں اسکے چہرے پر پڑرہی تھی۔ سب کی نگاہیں اسکی طرف لگی تہیں۔ بادشاہ کی نظر جس طرف اٹھتی تھی، حاضرین گھٹنے زمین پر ٹکاکر سر جھکاتے تھے۔ یہ بادشاہ ایک نحیف وناتوان چالیس برس کا آدمی تھا۔ چہرے پر جھریاں، صورت فکرمند، رعایا پر لطف وکرم کے آثار ہر ادا سے ظاہر۔ وزنی تاج سے پیشانی بھنوؤں تک چھپی ہوئی حالانکہ تاج باریک کپڑے کا تھا اور سوائے کلغی میں سونیکے ایک خیالی سانپ کے کوئی بہاری چیز اسمیں نہ تھی۔ اس شکل ووضع میں بادشاہ مرصع جواہرات کا لباس پہنے اپنے تخت پر بیٹھا تہا۔ یہ وہ تاجدار تہا جسے لاکھوں بلکہ کروروں آدمی جنہوں نے کبھی اسکی صورت بھی نہ دیکھی تھی، خداماں کر اسکی پرستش کرتے تھے۔

توران ایک موٹا تازہ خنگا۔ گول گول دیدے۔ موٹے موٹے ہونٹ۔ اسی باپ کا بیٹا جسکا فرزند فرعون تھا حیرت سے بادشاہ کی صورت دیکھ رہا تہا۔ برسوں کے بعد آج ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت بھی اور بچپن میں بھی جب کہ ایک ہی محل میں دونوں پرورش پاتے تھے تو ایک حرم بچی میں جسکی ماں کو کسی ملکی مصلحت کی وجہ سے فرعون سابق نے اپنے محل میں ڈال لیا تہا اور ایک صحیح النسب ملکزادے میں بڑا فرق کیا جاتا تھا۔ لیکن اب توران نے اپنی مضبوط شخصیت اور طاقت کے بل پر کمزور وناتوان بادشاہ کو جو ایسے ماں اور باپ کا بیٹا اور ایسے دادا اور دادی کا پوتا تھا جس میں حقیقی بہائی اور بہن کا رشتہ تھا در پردہ حقارت کے ساتھ بہت غور سے دیکھنا شروع کیا۔ مگر باوجود اسکے فرعون کی شریف نگاہیں بتارہی تھیں کہ ان میں پشتہا پشت کی حکمرانی وجہانبانی کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں اور توران کی وحشی فطرت کو اسکے سامنے اپنا سر جھکا دینا لازمی ہے۔ جسم گو زار وحقیر تہا مگر اس میں ایک مغرور ومتکبر روح متمکن تھی اور یہ ایک ایسے تاجدار کا زیور تھی جسکی رگوں میں سو بادشاہوں کا خون حرکت کرتا ہو۔

توران نے قریب آکر تخت کو بوسہ دیا۔ کسی قدر توقف کے بعد فرعون نے اپنا عصائے شاہی اسکی طرف بڑہایا۔ توران نے اسے آنکھوں سے لگایا۔ فرعون نے نحیف مگر صاف آواز سے کہا۔

"شہزادے آؤ، تم تو ہمارے بھائی ہو۔ تمہارا آنا موجب مسرت ہی۔ آج برسوں کے بعد ملنا ہوا۔ عرصہ ہوا کہ ہم تم کسی بات پر لڑ لئے تھے۔ تم کو بھی یاد ہوگا۔ مگر زمانہ وہ چیز ہے کہ ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہی۔ اے ابن الاب تمہارا آنا بہت مبارک ہے۔" اتنا کہہ کر فرعون نے توران کے توانا وتندرست جثہ کو دیکھ کر کہا "یہ پوچھنا کہ تمہاری تندرستی کیسی ہی بیکار سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

توران نے بہاری آواز سے کہا۔

"مرحبا اے داور مصر، جسکے تاج میں عمون کا شہپر اور جس کے ہاتھ میں اوسیرس کا تازیانہ ہے۔ مرحبا۔ اے پیکر فانی جسکے سر پر رب رع نے اپنا نور لازوال برسا رکھا ہے۔ صحت بدنی اور طاقت جسمانی ہمیشہ نصیب رہے۔"

فرعون نے آہستہ آواز سے جواب دیا "شہزادے میں تمہارا ممنون ہوا۔ طاقت اور تندرستی کی بے شک مجھے ضرورت ہی۔ لیکن خوف ہی کہ یہ چیزیں شاید اُس وقت نصیب ہوں جب کہ اوسیرس کا تازیانہ ہاتھ سے رکھدینا پڑے۔ رہی یہ بات کہ تازیانہ کیوں میرے ہاتھ میں ہے تو اس کا حال خود اس سے پوچھو جس نے اُسے مستعار دے رکھا ہی۔ لیکن۔ بس۔ اپنا ذکر پھر کبھی تنہائی کی ملاقات میں ہوگا۔ اس وقت امور سلطنت پیش ہونے چاہئیں۔ یہ بتاؤ کہ منوف کی حکومت کو بحال خود چھوڑ کر تم بغیر اجازت اس تخت گاہ میں کیسے آئے؟"

توران نے نہایت ادب سے کہا "جہاں پناہ۔ ناراض نہ ہوں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ حضور کے حکم کے مطابق میں اُن وحشیوں پر جو صحرائی علاقوں سے آپکی حکومت اٹھانی چاہتے تھے حملہ آور ہوا اور خدائے جنگ منیقو کی طرح اُن کے سر پر پہنچا اور فوراً حملہ کر کے ہزاروں کو خاک وخون میں

لٹا دیا۔ اُن کے دو بادشاہوں کو معہ اُنکی عورتوں کے گرفتار کیا جو اس وقت باہر حاضر ہیں تاکہ حضور ان کو قتل کریں۔ ان وحشیوں کے سو سرداروں اور پانچسو سپاہیوں کے سر اور ہاتھ اُنکی لاشوں سے قلم کر کے اپنے ساتھ لایا ہوں تاکہ میرے بیان کی تصدیق ہو سکے۔ اب گذارش ہے کہ یہ کل متمرد و سرکش وحشی بالکل غارت کر دئے ہیں اور کم از کم ایک پشت تک سلطنت کے شمالی حصہ میں اُنکی انتہائی سرحد تک ہمیشہ امن و امان رہیگا۔ اجازت ہو تو دشمنوں کے بریدہ سر اور ہاتھ سامنے منگوا کر گنوائے جایئں تاکہ انکی بو عطر بن کر حضور کے مشام میں پہنچے "

فرعون۔ "کوئی اور انہیں گن لیگا۔ ہم ایسے کشت و خون کے علامات دیکھنے پسند نہیں کرتے۔ جو کچھ تم کہتے ہو وہی کافی ہے۔ اچھا اب اس کارگذاری کا کیا صلہ چاہتے ہو۔ میرے اور مصر کے فائدے کیلئے جو خدمتیں تم نے کی ہیں ان کا انعام تمکو بہت کچھ دیا جائیگا"

پیشتر اسکے کہ ثوران بادشاہ کے سوال کا جواب دے اُس نے ملکہ احورہ کی طرف دیکھا جو فرعون کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ پھر اور بیگمات کی طرف دیکھ کر بادشاہ سے عرض کیا۔

"شاہا۔ میں یہاں بہت سی بیگمات کو دیکھتا ہوں لیکن کسی کے ساتھ کوئی بچہ نظر نہیں آتا۔ غالبا وہ سب اپنے اپنے محلوں میں ہونگے۔ جہاں پناہ حکم دیں کہ وہ دربار میں لائے جایئں تاکہ ان کے حسن و جمال کو دیکھ کر میں بھی اپنی آنکھیں روشن کروں، اور جب یہاں سے جاؤں تو منوف میں اپنے بچوں سے یعنی ان کے بنی اعم سے ان کا ذکر کروں "

ان الفاظ کو سنتے ہی احورہ ملکہ مصر کا چہرہ سرخ ہو گیا اور جس قدر بیگمات دربار میں موجود تھیں اُنہوں نے ثوران کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اس سخت طعنہ پر غصہ کھا کر آپس میں چپکے چپکے باتیں کرنے لگیں۔ صرف فرعون کی صورت ایسی تھی جس پر کوئی اثر نہ تھا چنانچہ اس نے نہایت متانت سے کہا۔

"شہزادے ایسے لوگوں پر طعنہ زنی جن کو خداؤں نے کسی نعمت سے محروم کر رکھا ہو خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو یا کھیت کا غریب کسان ایسی بیجا حرکت ہے جسکو خدا کبھی معاف نہیں کرتے۔ تم کو خوب معلوم ہے کہ میرے کوئی لڑکا ہے نہ لڑکی، پھر تم کیوں سوال کرتے ہو کہ ان کو سامنے لایا جائے "تا" کہ تم ان کا حسن دیکھو"

ثوران نے عرض کیا: " اے خسرو دوراں میں نے اس قسم کی افواہ ضرور سنی تھی لیکن تقصیر معاف ہو مجھے اس کا یقین نہ آیا تھا۔ یہ وفادار کیونکر گمان کر سکتا تھا کہ قصر شاہی میں بیگمات کی اتنی کثرت پر بھی کوئی اُن میں صاحب اولاد نہ ہوگی۔ چونکہ فدوی کو اپنا ایک معروضہ پیش کرنا ہے اسلئے اس امر کو پہلے سے تحقیق کر لینا ضروری سمجھا۔ شاہا۔ میرا معروضہ اس قسم کا ہے جسے نہ صرف اپنی ذات کے لئے بلکہ حضور اور حضور کی سلطنت کے فوائد کے خیال سے بھی پیش کرنیکی ضرورت سمجھتا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو سر دربار اپنا مدعا عرض کروں "

فرعون نے سخت لہجہ سے کہا "کہو۔ کوئی بات جس میں مصر کا فائدہ ہو وہ ادر مصر اُسے سُنے گا"

ثوران نے سینہ پر ہاتھ رکھکر سر جھکایا اور کہا۔

"حضور نے ابھی ارشاد فرمایا تھا کہ یہ خداؤں کا عتاب ہے کہ جہاں پناہ اولاد سے محروم رہے یہانتک کہ ایک لڑکی بھی اُنہوں نے آپ کے ہاں پیدا نہ کی تاکہ نسل فرعون کی نشانی بن کر اس دن تخت مصر کو رونق بخشتی جسدن حضور اوسیرس کے اقلیم کو رحلت فرماتے۔ اگر ایک لڑکی بھی حضور کے خون کی یہاں موجود ہوتی تو پھر مجھے کچھ عرض کرنا نہ تھا میرے لبوں پر وہ سکوت ہوتا جو گورستان میں ایک قبر پر ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضور اولاد نہیں رکھتے۔ مجھے تسلیم ہے کہ بیگمات شاہی حسین و جمیل ہیں اور پھر وہ متعدد ہیں لیکن ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ حضور آئندہ بھی ہمیشہ

اسی حال میں رہیں گے۔ کیونکہ آج سے نہیں بلکہ برسوں سے خداؤں نے آپکی طرف سے اپنے کان بہرے کر رکھے ہیں۔ باوجودیکہ حضور نے بڑے بڑے عالیشان بت خانے ان کے نام پر بنوائے۔ بے حد مال و دولت انکی نیاز و نذر میں صرف کیا۔ پس جب اس داد و دہش پر بھی اتنے دن آپکی التجا اُنھوں نے نہ سنی تو اب کیا سنیں گے۔ رب عموں جس کے ہاتھ میں سب کی تقدیر ہے جو حضور کا باپ ہے اور جسکا نام حضور کے نام میں شامل ہوا ہے وہ بھی کوئی کرشمہ نہ دکھائیگا لیکن یہ سب حضور کی شان و عظمت کا باعث ہے۔ جو ایسی بالا اور رفیع ہے کہ کاتب تقدیر کا بھی کچھ زور نہ چلا اور یہی لکھنے بن پڑا کہ آسمان سلطنت پر ماہ شب چہاردہم کی طرح سوائے آپ کے کوئی دوسرا لمعہ فگن نہ ہوسکیگا حتےٰ کہ ایک ستارہ تک آپ کے نور سے بہرہ اندوز نہ ہونے پائیگا۔"

ملکہ احورہ نے جو اس تقریر کو بہت غور سے سن رہی تھی اب پہلی بار اپنی زبان کھولی اور بہت تیز و ترش ہو کر کہا۔

"منوتن کے عالم۔ تمہیں کیسے علم ہوا کہ ہم ہمیشہ اولاد سے محروم رہیں گے بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ آسمانوں کے خدا اپنے قول کو منسوخ کر دیتے ہیں اور جس نعمت سے اُنھوں نے کسی کو مدتوں محروم رکھا ہے ایک دن وہی نعمت اُسکو بخشدیتے ہیں۔ بہر شوہر زندہ ہے، میں زندہ ہوں، ممکن ہے کہ اب بھی ہمارے ہاں اولاد پیدا ہو اور وہ تخت مصر کی مالک بنے۔"

توران نے سر جھکا کر عرض کیا "اے بانوے شہریار ممکن ہے ایسا ہو اور میں اپنی ذات سے یہی دعا مانگتا ہوں کہ ایسا ہو کیونکہ میں کون ہوں جو ارباب فلک کی مصلحتوں میں دخل دوں۔ اگر فرعون کے صلب اور آپکے بطن سے ایک لڑکی بھی پیدا ہوگئی تو پھر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کا ایک ایک حرف واپس لے لونگا اور "اُم الملوک" کا جو خطاب اس وقت تک حضور کے تخت پر اور حضور کی یادگار عمارتوں پر بالکل غلط اور باطل طریقہ پر کندہ رہا ہے۔ اس خطاب سے آئندہ حضور کا نام اپنی زبان پر لاؤنگا۔"

ملکہ احورہ اس طنز آمیز و جگر خراش تقریر کو سن کر جواب دینے کو ہوئی لیکن بادشاہ نے اسکے گھٹنے پر ہاتھ رکھدیا اور توران سے کہا۔

"شہزادے تمکو جو کچھ کہنا ہے کہو۔ ہرگز نہیں۔ جو کچھ اس وقت تک تمہاری زبان سے سنا وہ ہم پہلے سے جانتے تھے یعنی یہ کہ ہم اولاد نہیں رکھتے۔ اب وہ بات کہو جو ہم نہیں جانتے یعنی اپنے دل کی اصلی خواہش بیان کرو۔ جو تمہارے الفاظ سے ابتک صاف صاف نہیں ظاہر ہوئی ہے۔"

توران۔ "شاہا میری اصلی خواہش یہ ہے اور اسے حضور سنیں۔ میں توران اس مبارک خون سے ہوں جس سے حضور ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی ربانی صفت باپ کے فرزند ہیں۔"

ملکہ احورہ بیچ میں بول اٹھی "مگر تمہاری ماں دیوتائی صفت نہ رکھتی تھی۔ وہ عورت ایسی قوم سے تھی جس نے اس ملک پر طرح طرح کے غضب نازل کرادئے۔ ثبوت درکار ہو تو آئینہ لے کر اپنی صورت دیکھ لو۔"

توران نے ملکہ کے بیچ میں بولنے کا کچھ خیال نہیں کیا اور اپنی تقریر اس طرح جاری رکھی:۔

"جہاں پناہ کمزور ہوتے جاتے ہیں آسمان حضور کا منتظر ہے۔ زمین حضور کے قدموں کے سامنے سے ہٹی جاتی ہے کہ اپنی آغوش میں حضور کو جگہ دے، ملک کے شمال اور جنوب میں ایسے آثار پیدا ہیں جن سے سلطنت کو خطرہ ہے۔ اس حالت میں اگر حضور کی آنکھیں بند ہوگئیں تو شمال اور جنوب سے وحشی قوموں کا ایک سیلاب ملک پر آجائیگا اور جو لوگ اس وقت صاحب قوت ہیں آپ کے تخت کے مدعی بنکر آپس میں کشت و خون شروع کر دینگے۔ شاہا میں مرد میدان ہوں، بیسیوں معرکے سر کرچکا ہوں۔ مضبوط اور طاقتور ہوں۔ میری اولاد بہت ہے اور میرے

خاندان کی بنیاد ریت پر نہیں بلکہ کوہِ راسخ پر رکھی گئی ہے۔ فوج کا ہر متنفس مجھ پر اعتماد رکھتا ہے۔ رعایا میں لاکھوں میرے جان نثار ہیں۔ پس شاہا منظور فرمایئے کہ میں آپ کے ساتھ حکومت کروں اور تمام ملک میں اعلان کر دیا جائے کہ آپکے بعد میرے لڑکے آپ کے جانشین ہوں تاکہ ہمارا دودمانِ شاہی پُشتہا پشت تک دائم و قائم رہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے حضور آرام اور اعلیٰ توقعات کیساتھ اپنی زندگی گذار سکتے ہیں۔ بس یہی میرا معروضہ تھا۔ جو کچھ عرض کرنا تھا عرض کر چکا۔"

ثوران کی یہ درخواست سن کر اور ایسی بے جا جسارت دیکھ کر حاضرینِ دربار حیرت زدہ ہو کر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ملکہ اخورہ کا غصّہ سے یہ حال ہوا کہ ہاتھ میں جو پھول لئے تھی اسکی پتیاں توڑ توڑ کر اور مَل مَل کر زمین پر پھینک دیں۔ صرف فرعون جس انداز سے بیٹھا تھا آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا، معلوم ہوتا تھا کہ دل ہی دل میں کوئی دعا پڑھ رہا ہے۔ ایک لمحے یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ تک یہی کیفیت رہی اُسکے بعد اُس نے اپنا پاکیزہ چہرہ مگر زرد رنگ جس پر ہلکا سا تبسّم تھا ثوران کی طرف پھیر کر نہایت شریفانہ انداز سے کہا۔

"برادرمن۔ تم تو کہہ چکے۔ اب جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ بھی سُنو۔ مجھ سے پہلے اس تخت پر بہت سے بادشاہ بیٹھے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی بادشاہ موقت ہوتا اور تمہاری یہ تقریر سنتا تو اس عصا سے تمہاری طرف اشارہ کرتا اور تمہاری یہ زبان ہمیشہ کو بند کر دیجاتی۔ موت کا ہاتھ تمہاری طرف بڑھتا اور وہ تمکو اور تمہارے نام کو اور تمہارے خاندان والوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا۔ لیکن تم میں ایک غیر معمولی بے باکی ہمیشہ سے دیکھی گئی ہے۔ چونکہ تم نے اپنے دل کی اصلی باتیں ہم پر ظاہر کر دی ہیں۔ اس لئے تمہیں معاف کیا جاتا ہے لیکن ثوران۔ باوجود اسکے تم نے اپنے دل کی سب باتیں نہیں کہیں مثلاً تم نے۔۔۔ (اس موقع پر دربار میں بالکل سناٹا ہو گیا اور ہر شخص منتظر ہو گیا کہ دیکھئے فرعون آگے کیا کہتا ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے اب ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر صاف صاف اس طرح کہا۔) مثلاً تم نے یہ نہیں بیان کیا کہ کل رات کو تم کس بات کا مشورہ کرتے تھے! اپنے صلاح کاروں سے کس کس طرح بار بار پوچھتے تھے: "بتاؤ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے پانچسو سپاہیوں کو لیکر فرعون کے محل میں داخل ہوں اور اُس کو قتل کر کے اس بنا پر کہ ہمارا اور اس کا خون ایک ہے اس سلطنت کے مالک بنجائیں۔ اور اسی خون کے رشتہ کی بنا پر ایک بھائی کا خون کر ڈالیں"

بادشاہ کے مُنہ سے یہ جملے نکلنے تھے کہ اہلِ دربار میں ایک شور برپا ہو گیا بیگمات اپنا سینہ کوٹنے لگیں۔ امرا شاہی اپنی کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے فوجی سرداروں نے نیام سے تلواریں کھینچکر علم کر لیں اور ایسے سنگین جُرم کا انتقام لینے کو آگے بڑھے۔ فرعون نے اپنا عصا اونچا کیا، سب دم بخود ہو گئے، صرف ثوران چیخ چیخ کر کہتا تھا۔

"وہ کون ہے جس نے حضور کے کان تک ایسی جھوٹی خبروں سے مجھ پر بُہتان بندی کی ہے۔" اتنا کہہ کر ثوران کبھی ثمون نجومی کی طرف اور کبھی اپنے نوجوان ارلاطس کی طرف دیکھتا تھا۔ اور اب غصّے یا خوف یا ان دونوں باتوں کی وجہ سے اسکی زبان بند ہو گئی۔

فرعون نے کہا "شہزادے تم اپنے ان خادموں کی طرف سے بدگمان نہ ہو۔ اور ہم جو کچھ کہیں اس کا یقین کرو، ان دونوں آدمیوں کا کچھ قصور نہیں ہے لیکن ثوران تم خود ہی غور کرو جب بادشاہوں کو قتل کرنے کیلئے کوئی مشورہ یا اہتمام کیا جاتا ہو تو ایسے کام کے لئے چاروں طرف سے کھلا ہوا ایک جہاز اور وہ بھی جہاز کے اوپر کا حصّہ مناسب مقام نہیں ہو سکتا، ہمارے جاسوس ہر طرف موجود ہیں۔ اور نہ صرف جاسوس بلکہ بعض خدا بھی جنکو تم ہمارا قرابت مند سمجھتے ہو فرعون کے کان تک خبریں پہنچا دیتے ہیں۔ ثوران اپنے ان خادموں اور سرداروں پر ہرگز شبہ نہ کرو۔ البتہ ہم اس نجومی کے جو تمہارے پیچھے کھڑا ہے ایک طرح پر شکرگذار ہیں۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو تم اپنے مجنونانہ قصد پر ضرور عمل کرنے اور پھر میں مجبور ہوتا کہ تمہاری جان اس طرح لوں جیسے کوئی بوریئے کے نیچے سانپ کا سر کچل دے۔ اچھا۔ نجومی۔ ہم تجھے انعام دینگے تو بڑا ہوشیار و ہوشمند ہے۔

لیکن ہمارا انعام قلمدانِ وزارت نہ ہوگا جس سے کل تو نے خود اپنے تئیں محروم کر لیا۔ کل شب کو اپنے آقا سے تو نے جو کچھ انعام پایا تھا شاید اس میں ایک لونڈی بھی تھی جو بے قصور مار کھانے کے بعد تجھے عنایت ہوئی تھی۔"

"توران۔ تم شہزادے ہو اور بھائی ہو۔ میں تمہیں ایک ایسی حرکت پر معاف کرتا ہوں جسکا تم نے قصد تو کیا لیکن اس پر عمل نہ کر سکے۔ اور صرف معاف ہی نہیں کرتا بلکہ میری دعا ہے کہ آسمانوں کے خدا اور ہمارے بزرگوں کی روحیں بھی تمہارا قصور معاف کریں۔ اب رہی تمہاری درخواست چونکہ سوائے تمہارے میرا کوئی بھائی نہیں ہے، اس لئے میں تمہاری درخواست پر غور کرونگا۔ ممکن ہے میرا فیصلہ یہ ہو کہ اگر میں لاولد مروں تو میرے بعد تمکو بادشاہ کر دیا جائے گو ظاہر ہے کہ تم نجیب الطرفین نہیں ہو، تمہارے خون میں ایک ایسی قوم کا خون شامل ہے جس سے مصر کو نفرتِ قلبی ہے اور تم آدمی بھی اسی قسم کے ہو جسے اپنے آقا اور بادشاہ کے قتل میں دریغ نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی ممکن ہے کہ میں تمکو اپنا جانشین مقرر کر جاؤں۔ کیونکہ تمہارے بہادر اور شجاع ہونے میں کسی کو کلام نہیں اور باپ کی طرف سے بہرکیف تم شاہی نسل سے ہو، گو ماں تمہاری ایک ذلیل قوم کی عورت تھی۔ لیکن ابھی میں مرا نہیں ہوں۔ اور ممکن ہے کہ آئندہ میرے ہاں اولاد پیدا ہو۔ پس توران۔ جب تک اوبیرس مجھکو آسمان پر طلب کرے کیا تم ہماری نظربندی میں رہنا اور ایک بات پر حلف لینا پسند کرتے ہو"

ذلت و ندامت سے اس وقت توران کی بُری کیفیت تھی اور جس خطرے میں اس وقت اسکی جان تھی اس کو وہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔ بہت کھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "جہاں پناہ میں حلف لینے کو تیار ہوں"

"اچھا تو تخت کے سامنے آؤ اور خدائے مہیب رب عمون کا نام لیکر قسم کھاؤ کہ اگر میرے ہاں اولاد پیدا ہوئی خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی ہر حال میں تم اسکو اپنا آقا اور بادشاہ سمجھکر دل سے اسکی اطاعت کروگے۔" اس دربار کے تمام حاضرین کے سامنے ان دونوں باتوں پر قسم کھاؤ اور جان لو کہ یہ قسم وہ ہوگی کہ اگر اس کو توڑا تو مصر کے تمام خدا تمہاری اس زندگی میں تم پر طرح طرح کے آفات ڈالیں گے اور مرنیکے بعد تم پر ایسا عذاب نازل ہوگا جو کبھی ختم نہ ہوگا۔"

توران کو اب چارہ ہی کیا تھا۔ فرعون کے کہنے کے مطابق قسم کھائی اور قسم کی تصدیق میں عصائے سلطنت کو بوسہ دیا۔

رات کا وقت ہے طیبی کا وہ بڑا بُت خانہ جسے "سمتِ شمال کا بیت العمون" کہتے تھے رات کے اندھیرے میں بھیانک معلوم ہو رہا ہے۔ اس کا بالکل اندرونی حصہ جو زیارت گاہ خاص ہے اور بھی ہیبت ناک نظر آتا ہے۔ اس بلند اور وسیع کمرے کے بیچ میں پتھر کا ایک بہت اونچا بت عمون رع کا جو تمام خداؤں کا باپ مانا جاتا تھا نصب ہے اور اس پر لپٹے ہوئے پروں کی شکل کا ایک اونچا تاج رکھا ہے۔ یہ وہ تاریک محفوظ و مقدس مقام ہے جہاں کاہنوں کے سب سے بڑے سردار اور خاندانِ شاہی کے لوگوں کے سوا کوئی قدم نہیں رکھ سکتا۔ اس ڈراؤنے وقت میں فرعون اور ملکہ احورہ معمولی لوگوں کی طرح چادریں اوڑھے بُت کے قدموں پر سر رکھے رو رو کر اولاد کیلئے دعا مانگ رہے ہیں۔

اس مقدس ایوان میں صرف ایک چراغ روشن ہے جو صدیوں سے ایک ہی طرح جلتا چلا آیا ہے اسکی دُھندلی اور ناکافی روشنی میں نیچے سنگین فرش پر بادشاہ اور اسکی ملکہ دونوں بُت کے قدموں پر پیشانیاں رکھے اپنے غم کی داستان سُناتے ہیں اور اوپر چھت سے ملا ہوا بُت کلبے حس و حرکت چہرہ گھُپ اندھیرے میں انکی طرف نگاہ جمائے ہے اور اس طرح دیکھ رہا ہے جس طرح ان سے پہلے اور لوگوں کی طرف شادی و غم کی حالت میں ہزارہا برس سے دیکھتا چلا آیا ہے۔ دونوں نے عرض کیا کہ توران نے ہمکو طعنے دے دے کر ذلیل کیا۔ ہم سے کہا کہ اپنی اولاد کی صورت دکھاؤ۔ درآنحالیکہ ہم اولاد نہ رکھتے تھے، اسکی باتوں سے ہمارا دل زخمی ہوگیا۔ رعایا کی طرف سے ہمکو الگ خوف رہتا ہے بس ہماری دلی تمنا ہے کہ اپنی زندگی میں

ہم کسی کو اپنا جانشین کر جائیں۔ اے رب عمون، اے عمون رع۔ ہم پر رحم کر، ہمارے قدیم شاہی گھرانے کو مٹنے نہ دے۔ یہ مصر کا وہ خاندان ہے جس کے تمام فراعنہ نے جن میں غیر کا خون کبھی آمیز نہیں ہوا نسلاً بعد نسل اسی جگہ تیری پرستش کی ہے۔ اے رب ہمکو اولاد دے۔ اسکے شکریہ میں ہم تیرے صنم خانے میں بڑی بڑی نذریں چڑھائیں گے۔ تیرے نام کے عظیم الشان بُت خانے اور ہیکل بنوا کر ان کے لئے بڑی بڑی جاگیریں وقف کریں گے۔ اے رب ہماری مراد پوری کر"

اسکے بعد ملکہ احورہ بُت کے قدموں پر بار بار اپنا ماتھا رگڑ کر کہتی تھی "اے عمون رع مجھکو دنیا میں انگشت نما نہ ہونے دے۔ ذلت و رسوائی سے مجھے بچالے۔ ایک بچہ میرے ہاں پیدا کر دے جو میرے شوہر کے بعد اُسکے تخت کا مالک بن سکے۔ اے رب مجھے ایک جان دے اور اسکے بدلے میں میری جان حاضر ہے"

لیکن بُت نے کچھ جواب نہ دیا آخر کار جب دعائیں مانگتے مانگتے دونوں تھک گئے تو اُٹھکر چلے۔ دروازے پر کاہنوں کا سردار ایک پیر سفید ریش انتظار میں کھڑا تھا۔

فرعون نے اسکو دیکھتے ہی غمگین آواز میں کہا "اے رب عمون کے کاہن اس در سے ہم ناکام چلے۔ ہمکو کچھ جواب نہ ملا۔ کوئی آواز ہم سے مخاطب نہ ہوئی"

ملکہ کی روتی ہوئی صورت دیکھ کر کاہن کا دل بھر آیا۔ اور وہ بولا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے میں برابر غیب کی آواز سنتا رہا ہوں لیکن جو کچھ اُس نے کہا اسکے ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ اب آپ دونوں محل کو تشریف لیجائیں اور ایک ہی خوابگاہ میں استراحت فرمائیں۔ اور اے ملکۂ عالم حالت خواب میں ایک نشانی آپ پر ظاہر ہوگی۔ عمون رع ایک رحمدل خدا ہے اور اسکی جو اولاد اس سے محبت رکھتی ہے اس سے وہ بھی محبت رکھتا ہے جب وہ نشانی آپ پر ظاہر ہو تو جو کچھ اُس سے آپ کو معلوم ہو اُسے بے خوف و خطر اور دل میں کسی طرح کا شک اور شبہ لائے بغیر شہزادہ تُوران پر فوراً ظاہر کر دیں۔ کیونکہ اس نشانی میں جو کچھ آپ کو بتایا جائے گا، اس کا پورا ہونا ہر حال میں ضروری اور لازمی ہوگا"

اتنا سُن کر بادشاہ اور اسکی ملکہ دونوں بت خانے کے کمروں اور بلند ستونوں میں سے پرچھائیوں کی طرح گذرتے ہوئے شہین دروازے کے قریب آئے۔ دروازہ فوراً کھول دیا گیا۔ باہر سواری تیار تھی۔ فوراً محملوں پر بیٹھ کر ایک راستہ سے جسکے دونوں طرف مینڈھوں کے سر والے اونچے اونچے بت کھڑے تھے بادشاہ اور ملکہ دونوں روانہ ہوئے اور ایک چور دروازے سے نکل کر اپنے محل میں پہنچ گئے۔

آدھی رات گذر چکی ہے۔ تمام شہر پر گہری تاریکی اور خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں کتے البتہ آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا اُٹھا کر بھونک رہے ہیں یا شہر پناہ سے پہرے والوں کی للکار کبھی کبھی سنائی دیتی ہے، فرعون اور ملکہ احورہ اپنے خوابگاہ میں زرنگار مسہریوں پر تھکے ہارے غافل سو رہے ہیں اتنے میں ملکہ کی آنکھ کھلی۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ اندھیرے میں چاروں طرف خوف زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ آخر کو ہاتھ بڑھا کر شوہر کا شانہ ہلایا، اور اسکے کان میں گھبرا کر کہا

"اُٹھو۔ اُٹھو۔ میں نے ایک بات دیکھی ہے جو تمہیں بتانے کی ہے"

بادشاہ بیدار ہوا ملکہ کی آواز میں کوئی بات ایسی تھی کہ آنکھوں سے نیند کی نقاب بالکل اُٹھ گئی۔

بادشاہ۔ "احورہ کیا ہے"

ملکہ بولی میں نے ابھی ایک خواب دیکھا ہے جسکو محض خواب کہنا مشکل ہے ایسا معلوم ہوا کہ میں بالکل اندھیرے میں کھڑی ہوں اور یہ اندھیرا ایک جگہ سے ہٹ گیا ہے اور وہاں ایک نور پیدا ہوا ہے جسکی کوئی شکل ہے نہ صورت۔ اب اس نور سے ایک بہت مہربان اور شیریں آواز یہ کہتی سُنائی دی۔

"ملکہ احورہ۔ میری بیٹی۔ میں عمون ہوں جسکے سامنے آج ہی رات کو تو نے اور تیرے شوہر نے میرے ہیکل میں ایک مُراد مانگی تھی تم دونوں اُسوقت یہ سمجھے کہ کسی نے تمہاری فریاد نہیں سُنی لیکن یہ بات نہ تھی۔ ہم نے سنا اور اپنے کاہن پر اپنا کل منشا ظاہر کر دیا۔ احورہ تو نے اور تیرے شوہر فرعون نے ہم پر برسوں سے ایمان رکھا ہے اور یہ بیکار نہیں جا سکتا ایک لڑکی تیرے بطن سے پیدا ہوگی اور اس میں جو روح ہوگی وہ خاص میری روح ہوگی۔ یہ لڑکی بڑی ہو کر ایسی حسین اور فرزانہ ہوگی کہ اسکی مثل نہ ابتک پیدا ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی پیدا ہو۔ میں اپنے ہاتھ سے تندرستی طاقت اور عقل اُسے بخشونگا۔ مصر کے شمالی اور جنوبی دونوں حصوں پر وہ حکومت کریگی اور اس دوگونہ حکومت کا تاج اُسکے سر پر سالہا سال تک رہیگا۔ مصر کا کوئی بادشاہ جو اس سے پہلے گذرا ہے یا آئندہ گذرنے والا ہے اسکے برابر نہ نکلے گا۔ مصائب اور خطرات اس کو پیش آئیں گے، لیکن ان سب میں وہ روح جو میں نے خاص اپنی روح سے اسکو دی ہے ہمیشہ اُسے محفوظ رکھے گی اور وہ اپنے دشمنوں کو ہمیشہ پامال کرے گی۔ شاہی خاندان سے اس کا ایک عاشق پیدا ہوگا۔ یہ بھی اس پر عاشق ہوگی اور دونوں اس عشق میں سرور رہیں گے، اور انکی نسل سے بہت سے بادشاہ اور بادشاہزادے پیدا ہونگے۔ اس لڑکی کا نام نیطرطیہ یعنی نجم احمر ہوگا اور علاوہ ملکہ ہونے کے وہ میرے ہیکل کی سب سے بڑی کاہنہ ہوگی۔ کیونکہ دراصل وہ میری مولود ہوگی جسے میں آسمان سے اُٹھا کر تم دونوں کے حوالے کر دونگا۔ مجھکو اس بچی سے عشق ہوگا اور میں نے ابھی سے آسمان کی تمام رباۃ کو حکم دیدیا ہے کہ دُنیا میں اسکی دوست رہیں اور اوسیرس سے بھی کہدیا ہے کہ جب زمین پر اس لڑکی کا وقت ختم ہو تو آسمان پر اُسکے استقبال کے لئے حاضر رہے۔"

"اور اے ملکہ دیکھ ان باتوں کی تصدیق میں میں اپنے ہاتھ سے ایک نشان تیرے سینہ پر بناتا ہوں اور یہی نشان اُس لڑکی کے سینہ پر بھی ہوگا جو تیرے بطن سے پیدا ہوگی جسوقت میں تیرے سینہ سے اپنا ہاتھ اُٹھا لونگا تو تو جاگ جائیگی۔ جاگتے ہی اپنے شوہر کو بیدار کرنا جو تیرے پہلو میں سوتا ہے اور جس قدر باتیں میں نے تجھ سے کہی ہیں وہ بہت جلد ایک کاغذ پر لکھ لی جائیں تاکہ اس کا کوئی لفظ فراموش نہ ہو سکے۔"

اتنا قصہ سُنا کر احورہ نے شوہر سے کہا "پھر اے بادشاہ اس نور سے ایک ہاتھ نکلا اور اس ہاتھ میں "نقش حیات" تھا جو شعلہ کی مثل چمکتا تھا اسی ہاتھ نے اس نقش کو میرے سینہ پر رکھا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے جلتا انگارا رکھدیا ہو۔ اس تکلیف میں میں جاگ اُٹھی اور دیکھا کہ چاروں طرف تاریکی ہے اور تم قریب سو رہے ہو۔"

فرعون نے جب یہ کُل حال سن لیا تو ملکہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اس واقعہ کو اچھا شگون سمجھ کر ملکہ کے حق میں دعا کی۔ دعا کے بعد تالی بجائی تاکہ شاہی خوابگاہ کے باہر جو خواصیں سو رہی تھیں اندر حاضر ہوں۔ دستک کے سنتے ہی خواصیں روشنیاں لئے خوابگاہ میں آئیں اور بادشاہ نے ایک خواص کے ہاتھ سے شمع لے کر ملکہ کے گلے کے نیچے سینہ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو "نقش حیات" بنا ہوا معلوم ہوا اور اس نشان کی شکل ایک حلقے کی سی تھی جس کے نیچے دو ترچھے خط تھے۔

اب فرعون نے حکم دیا کہ کاتب خاص مع کاغذ قلم دوات فوراً حاضر ہو اور بیت العمون کے بڑے کاہن کو بھی ابھی طلب کیا جائے۔ اس حکم کے جاری ہوتے ہی کاتب خاص بادشاہ کی خوابگاہ میں حاضر ہوا اور کاہن کی موجودگی میں جو کچھ ملکہ احورہ نے بیان کیا تھا اُس کا ایک ایک لفظ لکھ لیا گیا۔ بادشاہ اور ملکہ نے اس نوشتے پر اپنے اپنے دستخط کئے اور کاہن نے اس پر اپنی گواہی لکھی۔ پھر اس تحریر کی نقلیں فوراً تیار کرکے ہیکل

عموؔن کے پوشیدہ خزانے میں محفوظ کر دیگئیں۔ اور "نقشِ حیات" ملکہ حورہ کے سینہ پر موت کے دن تک بدستور قائم رہا۔

جب رات گذری تو صبح ہوتے ہی فرعوؔن نے اپنے تمام درباریوں کو طلب کیا۔ اور حکم دیا کہ شہزادہ ثوراؔن بھی دربار میں حاضر کیا جائے چنانچہ شہزادہ حاضر ہوا اور فرعون نے اس سے بہت نرمی سے کہا۔

"اے ابن الاب۔ میں نے تمہاری اس درخواست پر کہ تم تخت مصر پر میرے شریک ہوکر جلوس کرو اور اپنے بعد میں تمکو اور تمہارے لڑکوں کو اپنا جانشین مقرر کر جاؤں بہت غور کیا۔ اور اب میرا فیصلہ یہ ہے کہ میں تمہاری درخواست کو قطعی نامنظور کرتا ہوں۔ تمکو معلوم ہوجانا چاہیئے کہ خداؤں میں سب سے بڑے خدا یعنی رب عموؔن نے مجھ پر اور ملکۂ مصر پر یہ بات ظاہر کی ہے کہ ہمارے ہاں اپنے وقت پر ایک لڑکی پیدا ہوگی جسکا نام نیطرطیہ یعنی نجم السحر یا "عموں کا ستارہ" ہوگا اور میرے بعد یہ لڑکی اور اسکے بعد اسکی اولاد اس ملک میں بادشاہی کریگی۔ پس ہماری اس خوشی میں تم بھی دل سے شریک ہو اور اب اپنے شہر کو جس کے تم ہماری طرف سے حاکم ہو واپس جاؤ اور ہمارے لطف و کرم کے سایہ میں ان خوبیوں اور شجاعانہ اوصاف کے ساتھ جو خدا نے تمکو عطا کئے ہیں خوش اور آباد رہو۔"

ثوراؔن اتنا سنکر غصہ سے کانپنے لگا کیونکہ وہ سمجھا کہ یہ کل قصہ ایک جعل و فریب ہے لیکن یہ سوچکر کہ اسوقت فرعون کے قبضے میں ہوں اور ہر وقت جان کا خطرہ ہے جواب دیا "جہاں پناہ جسوقت عمون کا یہ ستارۂ سحر طلوع ہوگا تو میرا کوکب اقبال ضرور اسکی تعظیم و تکریم کریگا" یہ الفاظ منہ سے نکلے ہی تھے کہ فوراً اشموؔن نجومی کا یہ قول یاد آیا کہ جب عموؔن کا ستارہ مشرق سے طلوع ہوگا تو ثوراؔن کے ستارہ کو وہ محجوب کردیگا۔

فرعوؔن نے ثوراؔن کا یہ فقرہ سُن کر غصہ سے کہا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں غلط کہتا ہوں اور ایک کذب سے اپنی زبان کو ناپاک کرتا ہوں۔ خیر میں یہ قصور بھی تمہارا معاف کرتا ہوں۔ بس اب تم جاؤ۔ اور جو کچھ ہونے والا ہے اُسکے منتظر رہو۔ اور اس نشان کو دیکھتے جاؤ۔ یہ وہ نشان ہے جس سے تمکو ہمارے قول کی آئندہ تصدیق ہوگی جس وقت شہزادی نیطرطیہ یعنی نجم السحر پیدا ہوگی تو یہی نشان جو "نقشِ حیات" ہے اسکے سینہ پر موجود ہوگا۔ اچھا اب تم رخصت ہو تاکہ ہمارا مزاج زیادہ برہم نہ ہو۔ تمہاری خدمات کا جو صلہ میں نے تجویز کیا ہے وہ منوف پہونچنے پر تمکو ملجائیگا۔"

پس ثوراؔن طیبؔی سے رخصت ہوکر اپنے دار الحکومت کو واپس گیا اور وہاں پہنچکر مشہور کیا کہ فرعوؔن نے اسکو اپنے حق سے محروم کرنیکے لئے یہ قصہ گڑھا ہے کہ اسکے گھر میں لڑکی پیدا ہونے والی ہے مشہور کردیا ہے لیکن اشموؔن نجومی نے جب سُنا تو سر ہلا کر دل میں کہا "نہیں عمون رع کا ستارہ سحر ضرور طلوع ہوگا اور نیطرطیہ نجم السحر وارث تخت مصر ضرور پیدا ہوگی۔ کیونکہ عمون رع نے تقدیر میں پہلے ہی سے یہ لکھ رکھا ہے۔

واقعات جو افسانہ ہو گئے

غازی الدین حیدر بادشاہ

از جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

۲۳ رجب ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۴ء کو نواب غازی الدین حیدر بہادر نے تختِ وزارت پر جلوس فرمایا۔ پانچ سال وزارت کرنے کے بعد بایمائے ایسٹ انڈیا کمپنی نواب گورنر جنرل بہادر کے حکم سے حضور نے (جو ابتک نواب کے لقب سے مشہور تھے) لقب شاہی ابوالمظفر معزالدین شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ، قبول فرمایا۔ پہلے سرکار کمپنی کی طرف سے نواب گورنر جنرل بہادر بالقابہ کا ایک نشان جس میں دو شیر ہاتھوں میں جھنڈا لئے ہوئے تھے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور کہا گیا، اگر جہاں پناہ اس کو اپنے شاہی سکہ پر منقش فرمائیں تو بہت مناسب ہے، ہماری ولایت میں اس نشان کو [illegible] سلطنت کے لئے شگون نیک ہے۔ بادشاہ نے یہ ہدیہ بطیب خاطر منظور فرما کر مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور [illegible] ترمیم کی کہ اپنے خاندانی نواب صفدر جنگ بہادر مرحوم کے مروجہ نشان کو بھی جس میں مچھلی بنی تھی شامل کر لیا۔ مچھلی بیچ میں بنوائی گئی، مجوزہ نقشہ جمعیت رائے اور روشن لال کائستھ سکینہ منصرم ٹکسال کے پاس دار الضرب میں بھیجدیا گیا۔ ارکین سلطنت کے مشورہ سے اسباب جشن، تاج و تخت اور چتر کے لئے تین کرور کا صرف منظور کیا گیا۔ بادشاہ کی اس سیر چشمی نے رعایا کے دل میں جگہ کر لی جشن جلوس کے لئے مہتمم معتمد مقرر کئے گئے اور حکم ہوا کہ تمام شہر میں روز جشن سے سات دن تک جلسہ رقص و نشاط برپا رہے اور تمام رعایا شاہی مہمان بنے۔ دو کرور روپیہ خزانہ قدیم سے [illegible] شاہ گوبند لال پسر شاہ بہاری لال مہاجن کی تحویل میں دیا گیا کہ چتر شاہی مرصع و مکلل جواہر کار، شامیانہ کارچوبی جھالدار مروارید کی تیار ہو۔ ایک کرور روپیہ دعوتِ رعایا و مدارات سرکار کمپنی میں صرف کیا جائے، چھ مہینے پیشتر سے انتظام شروع ہوگیا۔ "مچھلی والی بارہ دری" میں اچھے اچھے کاریگر [illegible] زردوز بیش بہا تنخواہوں پر نوکر رکھے گئے۔ جشن کے مہمانوں کی راحت کے لئے "موتی محل" "بادشاہ منزل" اور عمارات "دلکشا" کی تیاری کی گئی۔ کوٹھی "فرح بخش" میں ایک نہر بنائی گئی، انجن کے ذریعے سے پانی نہر اور باغ میں پہنچایا گیا، عمارات فرح بخش کے لئے معماروں کو حکم ہوا [illegible]۔ دیواروں پر نقش و نگار بنے، چاروں طرف ہلکی ہلکی رنگین بیلیں، دروں پر مچھلیاں، باغ کو گلشنِ طلسمات بنا دیا، سرخ بانات سے تمام اشجار، شاخ یاقوت معلوم ہوتے تھے۔ صد برگ پر عقیق کا دھوکہ ہوتا تھا، گھاس میں کرن کی چمک دمک تھی، دیواروں پر مینا کا کام بنا ہوا، موتیا، موگرا، گل شبو مہک رہے تھے۔ نافرمان، گل چمپا، گل اورنگ، گل خیرو، گل فرنگ، سیوتی، کیتکی، گلاب، نسترن، بڑے بیل، نسرین، نرگس، گل داؤدی، اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے، ہر روش پر بادلہ بچھایا گیا، پھلوں پر تمامی کی تھیلیاں چڑھائی گئیں۔ انگور کے گچھے خوشۂ پروین ہو رہے تھے، خوبصورت نہریں، موتی سا پانی، نہر کے سامنے مکلف فرح بخش کوٹھی جس سے کاخ گردوں بھی شرماتا تھا، چاروں طرف بڑا چبوترہ، جسکے آگے زردوزی سائبان پڑا ہوا، تمام کوٹھی شیشہ آلات سے دلہن کی طرح آراستہ پیراستہ، قد آدم جلبی آئینے، جھاڑ سب ایک ڈال، دیوارگیریاں نفیس و نادر، دو شاخے کنول دست دعا کی طرح بلند، تصویریں پری چہرہ مرصع کار فریم، مرقع نادر کار، تمام سقف و دیوار منقش پر بہار گلکاری چاروں طرف فرشی جھاڑ، سبز سرخ فانوس، صدر میں مسند پر زر بچھائی گئی۔ اس کے علاوہ شہر میں جا بجا خیمے کھڑے کئے گئے، سواروں نے اپنی اپنی پالیں کھڑی کیں، حفاظت کے لئے چاروں طرف پلٹنوں نے پڑاؤ کیا، جا بجا چھولداریاں استادہ ہوئیں، قناتیں کھڑی کی گئیں، شہر کے اطراف میں ترپولئے کھڑے کئے گئے، ٹھاٹھ سنہ

ہوئی، توپ خانے نصب کئے گئے تمام متوسلان شاہی کو حسب مراتب جوڑے تقسیم ہوئے تلنگوں اور سواروں کو وردیاں ملیں، زمینداران مضافات نذریں دینے کو مع جلوس حاضر ہو کر مہمان شاہی ہوئے۔ تمام شہر آدمیوں سے کھچا کھچ بھر گیا، پرانی عمارتوں پر نئے کلس چڑھائے گئے، جو راجہ مہاراجہ خود نہ حاضر ہو سکے انکی طرف سے نائب نذر دینے حاضر ہوئے، تمام صوبہ اودہ کی طوائفوں نے اپنا خیمہ ڈیرہ لکھنؤ میں ڈالا، خاص بازار سے مینا بازار تک دکانیں سجائی گئیں۔ صاحبان انگریز بہادر کی دعوت کے لئے مسٹر ریکٹن صاحب رزیڈنٹ بہادر کو لاکھوں روپے دئے گئے، کوٹھی کے پاس ایک کمرے میں صاحب لوگوں کے لئے سامان عیش تیار تھا، انگریزی میز پر ایک سے ایک تحفہ، بادۂ ارغوانی کے کنٹر، گزک، نواکہ، ہر قسم کے کباب تشتریوں میں بادام، پستے بھنے ہوئے، طرح طرح کے پلاؤ، دو پیازے، متعدد پکوان موجود تھے۔ رات ختم ہوئی، اور اسی عیش و عشرت سے ختم ہوئی۔ دم سحر حضور بیدار ہوئے، شب کی پوشاک اتاری، لباس فاخرہ زیب جسم کیا، ہوادار پر سوار ہوئے، کوٹھی میں آمد آمد سواری کا غل ہوا۔ نواب معتمد الدولہ بہادر، اور مولوی محمد خلیل الدین، ظفر الدولہ کپتان فتح علی خانبہادر اپنے اپنے رتبے کے موافق مودب کھڑے ہو گئے، نواب روشن الدولہ نے مسودہ اعلان تخت نشینی صاحب رزیڈنٹ بہادر کو سنایا۔ مسٹر ریکٹن صاحب بہادر رزیڈنٹ نے تلوار کی داب کمر سے لگائی اور قرینے سے کھڑے ہو گئے۔ جب بادشاہ سلامت بوچے سے اترے، صاحب بہادر نے ادب سے ہاتھ ملایا، مزاج پرسی ہوئی، بادشاہ سلامت تخت رواں پر سوار ہو کر بارہ دری میں داخل ہوئے، پہلے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر تخت شاہی پر تشریف لائے، مجتہد العصر اور بڑے صاحب بہادر کھڑے تھے، صمصام الدولہ مرزا چھجو صاحب سونے کی کشتی میں تاج شاہی لائے، تاج کا ایک گوشہ صاحب رزیڈنٹ بہادر اور ایک گوشہ مجتہد العصر نے لیکر فرق مبارک پر بسم اللہ کہکر رکھا، خواصی نے چتر لگایا۔ شامیانہ مکلف کھنچا ہوا تھا، خواص مرچھل جھل رہے تھے، بادشاہ چاند النور رونق افروز تھے، سلامی کی توپیں سر ہوئیں، چاروں طرف مبارکباد کا غل ہوا، ناچ ہونے لگا۔ بینڈ باجہ بجایا گیا۔ کارچوبی چتر میں موتیوں کی جھالر، گنگا جمنی مور پنکھی، بڑے بڑے بوٹے بہار دکھا رہے تھے۔ بادشاہ کے گول چہرے، کتروان ڈاڑھی پر تاج بہت خوشنما معلوم ہوتا تھا، جوان قوی، قد مائل بہ درازی، رنگ کھلتا ہوا، جمیع امرائے عظام و اراکین ذوالاحتشام نے اشرفیاں نذر اقدس میں پیش کیں۔ نذر پر بادشاہ صرف ہاتھ رکھدیتے تھے تو وہ اشرفیاں تحویل میں جمع ہو جاتی تھیں۔ مجتہد نے تسبیح نذر کی، جملہ خورد و بزرگ جواہر و خلعت فاخرہ سے حسب ضابطہ علیٰ قدر مراتب سرفراز ہوئے، عہدۂ داخل نویسی مع خطاب راجگی کے دیا کرشن کو حاصل ہوا، مظفر علیخاں کو خلعت توپخانہ عنایت ہوا۔ اور اہتمام سواری کا سپرد ہوا۔ تین تین لاکھ روپے کے علاقے پر ایک ایک تحصیلدار مقرر ہوا، زر تحصیل سے دہیک کا مستحق ہوا، جملہ مصارف ملازمین و سہ بندی اس کے متعلق رہے، بیس لاکھ کے علاقے پر ایک ناظم مقرر ہوا، دو ہزار روپے مصارف ذات کے لئے مقرر ہوئے، شہزادہ مرزا نصیر الدین حیدر بہادر ولی عہد ہوئے۔ معتمد الدولہ وزیر اول، نواب روشن الدولہ ابن مسترت علیخاں وزیر دوم، علی محمد خاں نواب سالار جنگ کے پوتے وزیر سوم، میر نظیر علیخاں عہدۂ جرنیلی پر ممتاز ہوئے، حسام الدین فقیر محمد خاں جرنیل صاحب کے نائب مقرر ہوئے، کچہریوں کے نام جدید مقرر ہوئے۔ دار الانشا، دار الاجرہ، صدر الصدوری، سلطانی کچہری، دفتر نظامت دفتر جرنیلی، دفتر دیوان خانہ وغیرہ کی سندیں ملیں۔ زمینداران مضافات اودہ نے عرضداشتیں مبارکباد سلطنت کے نذروں کیساتھ ارسال خدمت عالی کیں، خطاب راؤ، راجہ اور خلعت گران بہا حاصل کئے۔ راجہ امرت لال کاستھ عرض بیگی مقرر ہوئے، شیخ ناسخ نے یہ تاریخ جلوس پیش کی۔

بحمد اللہ کہ با اقبال و دولت به تخت زر جلوس شاہ گردید

زمین و آسماں یک بزم عیش است زماہی خرمی تا ماہ گردید

مبارکباد اے آفاق عالم طلوع آفتاب جاہ گردید

ندا آمد بگوشم زود یارب　　که شاہ امروز شاہنشاہ گردید

پے سالِ ہمایونِ جلوسش

بگو تاریخ کہ ظل اللہ گردید

۱۲۳۵ھ

دوپہر کے بعد سے جلوس سواری کا بندوست ہونے لگا فوجوں نے پرا باندھا، سوار صف آرا ہوئے جلوخانے میں سامان جلوس جمع ہونے لگا، صاحب رزیڈنٹ بہادر بڑے جاہ و احتشام سے درباری پوشاک پہنے ہوئے، چوڑیدار پگڑی سر پر، مغرق جیغہ سرپیچ گوشوارے سے آراستہ پیراستہ ہو کر جہالر دار پالکی کی سواری میں تشریف لائے۔ تمام یوروپین، ہندوستانی، درباری لباس پہنے ہوئے شریک ہوئے، اسی طرح کوٹھی موتی محل، کوٹھی دلکشا کوٹھی خورشید منزل کے مہمان امراء و روساء بہ لباس فاخرہ سوار ہو کر مع جلوس آئے، اب جلوس نکلنا شروع ہوا پہلے سقے آبپاشی کرتے ہوئے آگے آگے جاتے تھے، بازار کے دونوں طرف کوٹھوں، کمروں اور دکانوں میں دو طرفہ عورت، مرد، بڈھے، بچے ٹھٹھ کے ٹھٹھ کھڑے تھے۔ چھڑکاؤ کے بعد ہاتھی ماہی مراتب کا نکلا، چاندی کی چوب میں سونے کی مچھلی گز بھر کی لمبی دانت نکالے مع نقش و نگار کے میناکار ایک آدمی لئے ہوئے ہاتھی پر بیٹھا تھا۔ مراتب تربوز کے برابر گول، بیضاوی سونے کا انڈا، چاندی کے طاس پوش نشان میں لگا ہوا سرخ وردی پہنے آدمی نشان لئے ہوئے ہاتھی پر بیٹھے تھے۔ اسکے بعد ہاتھی پر دو نقارے بجتے ہوئے جنکی آواز دور دور جاتی تھی۔ اس کے بعد شتران جنگی کئی ہزار سرخ بانات کی پوشش سے آراستہ شتر سوار جھنڈیاں لئے ہوئے، انکے بعد ناقہ سوار کار چوبی وردیاں پہنے ہوئے، پھر تخت ڈال پر توپ خانہ، روشن چوکی، نفیری والے، شہنانواز، ترک سوار نیزے ہاتھوں میں لئے ہوئے، زرہ پہنے ہوئے تلوار کمر سے لگائے، تزک و احتشام سے گھوڑے کداتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے رسالدار قندہاری عمدہ مشکی گھوڑے پر سوار، پیدل کی پلٹنیں، بندوق کاندھے پر رکھے۔ چلتے پہنے، ڈھال پشت سے لگائے، پھریرے نشان کھلے، سلامی کو تلے، قواعد کیساتھ مڑتے ہوئے بندوقوں پر ملکی سنگینیں چڑھی، سیاہ توسدان کمر سے لگائے، فوجی باجے بجاتے، خراماں خراماں جارہے تھے، ہر رنگ کے گھوڑے، عربی، ترکی، تازی کاٹھیاوار برق دم، جلو میں پیشقدمی کرتے ہوئے موجود، ہندوستانی باجے ڈھول تاشے، جھانجھ بجتے ہوئے، بعد اسکے ترم بجتا ہوا، محمل سواری پالکی نالکی، فینس، سکھپال، تخت رواں، تامجام طلائی نقرئی مخمل کاشانی زردوزی پردے، ہوادار طلائی، نقرئی، ہاتھی عماری دار ہودے طلائی و نقرئی کارچوبی جھولیں پڑی ہوئی مسندی رنگین، دانتوں میں طلائی میناکار چوڑی، فیلبان مغرق لباس پہنے ہوئے، بوڑے بردار، چترکٹے، سرخ بانات کی وردیاں ڈانٹے ہوئے، داہنے بائیں برچھے بردار، علم بردار، چوبدار، نقیب آواز لگاتے ہوئے "نگاہ روبرو سواری ہے بادشاہ جمجاہ کی اشیران بہادر بڑھے ہوئے" ہرکارے، ڈنکا سواری کا بجتا ہوا، مرصع داہنے بائیں اردگرد چند سوار نہایت ہوشیار، معزز، ممتاز، نامی گرامی، زرہ، خود، چار آئینہ، دستار سیف کمر سے لگائے، نیزے ہاتھ میں لئے ہوئے، تیغ قبود میں رکھے ہوئے، نہایت چست و چالاک بیچ میں بادشاہ خاص ہاتھی عماری دار پر جلوہ افروز، داہنے بائیں چنور بردار مورچھل کرتے ہوئے، پشت پر خواصی چتر لگائے ہوئے، اس کے بعد ہاتھیوں پر مرشدزادہ آفاق مرزا نصیر الدین حیدر بہادر، نواب محسن الدولہ نواب رکشن الدولہ، نواب معتمد الدولہ، نواب ظفر الدولہ کیورس صاحب، مسٹر جارج ویلی، ڈاکٹر اکینسن صاحب بہادر، مرزا حاجی، راجہ نول کرشن، راجہ بشن چند بڑے جاہ و جلال سے سوار تھے، نواب معتمد الدولہ اشرفیاں تصدق کی لٹا رہے تھے، شہدے غل مچا رہے تھے، خلق خدا دعا دے رہی تھی، آزاد فقیر آوازے پھینک رہے تھے "لال نہ ادھر بھی ایک اشرفی پھینک دے"۔ اس کے بعد اور فیل نشین، تعلقدار، زمیندار، ہالی موالی، ملازمین خدمتگار ساتھ تھے، اسی شان و شوکت سے سواری درگاہ حضرت عباس میں آئی، بادشاہ کیطرف سے سونے کا علم چڑھایا گیا، دو سو اشرفیاں نذر دی گئیں، بادشاہ نے نہایت ادب اور احترام سے ضریح پاک کو بوسہ دیا اور تاج اتار کر زیارت پڑھی۔ زیارت پڑھنے کے بعد دعا مانگی، پھر سوار ہو کر اسی تزک و احتشام

سے واپس ہوئے، کوٹھی فرح بخش میں جلوس فرمایا سلامی کی توپیں سر ہوئیں، شادیانے خوشی کے بجائے گئے، رجب علی فضل علی قوالوں نے مبارکباد گائی، سہرو بائی نے حافظ شیرازی کی یہ غزل ع! اے نسیم سحر آرام گہہ یار کجاست، گاکے لٹا لٹا دیا چونے والیوں نے مل کر گانا شروع کیا۔ لال پردے کے باہر جو مجرائی جمع تھے ان سب کو باری باری سے اجازت باریابی اور مجرے کی ملی، امردھے، چوبدار، نام مجرائی کا معہ ولدیت لیکر پکارتے تھے لالہ امرت لال عرض بیگی سرو قد جھکا کر کہتے تھے ملاحظہ ہو، بادشاہ کبھی حقے کی نہال اور کبھی ہاتھ سے سلام لیتے تھے اس عظیم الشان جلسے میں مہمانوں کی اس قدر کثرت تھی کہ روپے نقد اور اجناس و تحائف دئے گئے، سبحان علیخاں کمبوہ نے شاہی سکے کے واسطے شعر نظم کیا جو منظور اور مسکوک ہوا،

سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

سردی کا آغاز اور ذی الحجہ کا مہینہ ہے۔ سنہ ۱۲۳۵ھ ختم ہو رہا ہے، بادشاہ نے منجمین کو حکم دیا کہ تاریخ سعد جلسہ تخت نشینی ما بدولت تجویز کرو سب نے زائچہ کھینچکر عرض کیا خداوندا اس مہینے کی اٹھارویں تاریخ ہفتے کا روز سعد اکبر ہے۔ شہر میں تاریخ جلوس کی شہرت ہوئی، لوگ اپنے اپنے شغلے، ہٹکے کی تیاری کرنے لگے، شہر میں ڈھنڈورہ پیٹا گیا "خلق خدا ملک بادشاہ کا تاریخ جلوس ۱۸، ذی الحجہ مقرر ہوئی ہے" اس روز سواری بادشاہ کی نہایت تزک و احتشام سے نکلیگی اور ۱۷۔ کی شب کو کوٹھی فرح بخش میں آتشبازی چھوڑی جائیگی اور جلسہ ارباب نشاط ہوگا تاریخ مقررہ سے سات روز تک تمام رعایا شاہی مہمان رہیگی، خدا خدا کرکے ۱۸ تاریخ کی صبح ہوئی، مینا بازار سے خاص بازار تک اچھا خاصہ مجمع ہے، اہل شہر سفید پوش ادہر اُدہر ٹہل رہے ہیں۔ نامی طوائفیں بناؤ کرکے کوٹھی فرح بخش کے سامنے جابجا درختوں کے نیچے گھاس پر چاندنیاں بچھائے بیٹھی ہیں، دروازے کے سامنے دوطرفہ بازار لگا ہے، حلوائیوں کی دکانوں پہ تازہ تازہ پوریاں، گرم گرم جلیبیاں تھالوں میں رکھی ہوئی ہیں، مٹھائی کے خوانچے سجے ہیں نان بائی خمیری روٹیاں گرم گرم تنور سے نکال رہے ہیں، شیرمال، کلچے خستہ گرما گرم رکھے ہیں، تنبولنوں کی دکانوں پر شتاقوں کا مجمع ہے، خوانچے والے چاروں طرف آواز لگاتے پھرتے ہیں۔ چینی بازار سے چوک تک پالکیوں، فنٹسوں، بوچوں، ہوادا روں کا تانتا لگا ہوا ہے، کھیتوں میں کنارے کنارے بہلیاں، گاڑیاں، فنٹسنیں کھڑی ہیں۔ گاڑیوں میں عورتیں کھڑکیوں سے جھانک رہی ہیں۔ کوچ بکس پر مہریاں بیٹھی ہیں، یہاں بھی ہزاروں سودے والے جمع ہیں کوئی دکان ایسی نہیں ہے جو نہ ہو۔ جا بجا ہزاروں تنگیرے استادہ ہیں، نہایت سلیقے اور قرینے سے بازار کی بنا ڈالی گئی ہے، ایک طرف سواروں کے رسالے، پیدل کی پلٹنیں، اُن کے خیمے خرگاہ شہر کے باہر تھے، دور، دور تک ہزاروں ڈیرے ارباب نشاط کے پڑے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہزاروں چوبدار، یساول، مردہے، ہرکارے اِدہر اُدہر آنے جانے لگے، رونق، آبادی، چہل پہل نام خدا بڑہتی جاتی ہے، شام کے قریب آتشبازوں نے قلعے کھڑے کئے۔ پٹاخے، چرخیاں لگائیں، ہوائیاں، گولے، انار وغیرہ لیکر آئے۔ آٹھ بجے رات سے بارہ بجے تک آتشبازی چھوٹا کی، روشنی کی کثرت ہوئی، مہمانوں کا ہجوم ہوا، محل میں تیاریاں ہونے لگیں، بھاری بھاری جوڑے زیب بدن ہوئے، موتیوں کے زیور پہنے گئے، کوئی چوٹی گُندھواتی ہے، کوئی مِسّی ملتی ہے کوئی بناؤ سنگھار میں مصروف ہے اندر سے باہر تک نواب ناظر کا بندوبست ہے ڈیوڑہی پر دربانوں کا شور ہے، مہاتو کوا تر رہا ہے ہیں محلدار گھبرائی گھبرائی پھرتی ہے، اتنے میں بادشاہ سلامت محل سے تخت رواں پر سوار کوٹھی فرح بخش میں تشریف لائے، وزراء امراء نے ادب قاعدے سے سلام کیا، امردہے، چوبدار اپنے اپنے قرینے سے ہاتھ باندہ کر کھڑے ہو گئے، خود بدولت شہ نشین کے اندر مغرقی کرسی پر جلوہ افروز ہوئے۔ سامنے چلمنیں پڑ گئیں تمام دولت خواہان سلطنت اپنی اپنی جگہ پر فروکش ہوئے، ہرکاروں نے طوائفوں کو نام بنام پکارا، ارباب نشاط سب سازو سامان سے آراستہ ہوکر، پیشواز پہن کر ناز و انداز سے اکڑتی ہوئی آئیں اور مجرا کرکے رقص و سرود شروع کردیا، بادشاہ کچھ دیر کے بعد محل میں تشریف لے گئے، شہزادگان و امرائے عالیشان شریک جلسۂ رقص رہے۔ فرح بخش کی نہر کے دونوں طرف قصر فلک اور قصر

دو تکمیرے کھچوائے گئے، ان میں ارباب نشاط رقص کر رہے تھے اور خاص و عام لوگ شریک جلسہ تھے۔ ایک محفل "عیش باغ" سے "چار باغ" تک منعقد تھی جس کے مہتمم ارکان سلطنت تھے، اس میں راجہ مہاراجہ، زمیندار اور اطراف کے مہمان تھے۔ جا بجا آئینہ بندی تھی۔ دو سو طائفے شہر کے ناچ رہے تھے اور باہر کی چرنے والیاں، نٹنیاں، قوال، بین کار، باجے، سرود اپنا اپنا فن دکھا رہے تھے۔ کئی ہزار اہتمام کرنے والوں سے مہمانوں کو اور محلات معلی میں اور امرا کو کھانا وقت پر نہ پہنچ سکا۔ اس لئے فوراً نقد نوبہ بندی کی گئی، فی حصہ ایکسو پچاس روپیہ تقسیم ہوا، خدمت گاروں اور ادنیٰ ملازمین کو سات روپیہ فی حصہ تقسیم ہوا، کئی ہزار روپے کے مدار پیٹے خریدے گئے، محلات میں بھی اسی طرح جشن ہوا جس کے مہتمم نواب ناظر محمد آفرین علیخاں اور افتخار الدولہ مہاراجہ میوہ رام تھے۔ اسی فیاضی کی بدولت ساہ گوبند لال نے چوراسی کوٹھیاں اپنی مہاجنی قائم کرلیں۔ عمارتوں میں شیشہ آلات کی روشنی اسی دربار میں پہلے پہل کی گئی۔ جس کا نام شاہی حکم سے "حسن محفل" رکھا گیا، خیمہ رشک فلک بغیر طناب اور چوبوں کا اسی دربار کیلئے خاص بنوایا گیا جسے دیکھکر لوگ حیرت کرتے تھے۔ ہاتھی کے ہودے چوڑخے اسی جلوس کے لئے وضع کئے گئے۔ کھانے طرح طرح کے نان آفتاب، شب دیگ، اور مٹی شیرمال ایجاد کی گئی۔ لکھنؤ میں چھاپے خانے کی بنیاد اسی عہد میں قائم ہوئی۔ لغت کی کتاب "سفت قلزم" "ذ شرح منازل" "محامد حیدریہ" اسی بادشاہ کے حکم سے تصنیف ہوئیں اور نہایت خوشخط جلی قلم کی لکھائی اور اعلیٰ درجے کی چھپائی سے طبع ہوئیں، دریائی کشتیاں مچھلی، ہاتھی اور گھوڑے کی شکل کی نقشی بنوائیں۔ ابتدا میں بہت مستعدی سے حکومت کی، آدھی آدھی رات تک کچہری ہوتی تھی۔ جناب عالی نے دو مرتبہ روپیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو قرض دیا اُسکے معاوضے میں کمپنی نے اپنا مقبوضہ علاقہ کھیری گڈھ اور کچھ حصہ علاقہ نیپال کا ملک اودھ میں شامل کردیا، جناب عالی کے زمانے میں حافظ ابراہیم خوشنویس، مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف "فسانہ عجائب" شاعر، میاں دلگیر مرثیہ گو، شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش شاعر یادگار زمانہ گذرے ہیں۔ جناب عالی کا نام زمانہ ولی عہدی میں "بڑے مرزا" تھا اور اسی نام سے مشہور تھے تعمیر عمارات اور آراستگی کوٹھی سے خاص دلچسپی تھی، آپ کی پہلی شادی بادشاہ بیگم صاحبہ سے بنارس میں ہوئی تھی۔ نواب بادشاہ بیگم صاحبہ مشیر الدولہ نجم بادشاہ دہلی کی بیٹی تھیں انہیں کے بطن سے ایک صاحبزادی "پوتی بیگم" صاحبہ پیدا ہوئیں جو نواب مقرب الدولہ مہدی علیخاں کے فرزند نواب محمد علیخاں سے منسوب تھیں۔ جناب عالی کے عہد میں انتقال فرمایا "جہانگیر باغ" (لکھنؤ) میں دفن ہوئیں، اُن کے بیٹے نواب محسن الدولہ بہادر کی شادی نواب نصیر الدولہ بہادر کی دختر سے ہوئی۔ دو بیٹیاں پوتی بیگم صاحبہ کی اور تھیں ایک زہرہ بیگم، دوسری حاجی بیگم، زہرہ بیگم حشمت الدولہ مرزا ابو تراب خاں سے منسوب تھیں اور حاجی بیگم کی شادی معز الدولہ مرزا ابو القاسم خاں سے ہوئی تھی۔ بادشاہ کا دوسرا محل نواب ممتاز محل تھا جن کا مقبرہ جہانگیر باغ میں ہے ان کے فرزند مرزا نصیر الدین حیدر بہادر تھے، تیسرا محل نواب مبارک محل کرنل آنن کی بیٹی تھی۔ چوتھا محل نواب سلطان مریم بیگم ڈاکٹر شارٹ صاحب کی بیٹی تھیں۔ پانچواں محل نواب سرفراز محل تھیں۔ ان کے علاوہ متعدد محل تھے۔ بادشاہ کے بھائی نواب شمس الدولہ مرزا احمد علیخاں کی شادی حضرت بیگم سے ہوئی تھی۔ نواب حضرت بیگم صاحبہ شوکت الدولہ مرزا جمعہ کی بیٹی تھیں ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۶ء میں نواب بہو بیگم صاحبہ والدہ نواب آصف الدولہ بہادر نے فیض آباد میں انتقال فرمایا، ان کا بہت سا اسباب حریفوں نے مار لیا صرف ایک کروڑ روپیہ اور بیس صندوقچے جواہر بیش بہا کے مع موجودہ اسباب کے جناب عالی کے قبضہ میں آیا۔

۱۸۲۵ء میں بادشاہ نے ایک کروڑ روپیہ لطور قرض ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیا۔ منافعہ اسکا پانچ لاکھ روپیہ سالانہ مقرر ہوا یہ روپیہ ہمیشہ کے واسطے قرض دیا گیا۔ واپسی کا اختیار کسی وقت نہ ہوگا نفع اس کا نسلاً بعد نسل سکہ مروجہ کے موافق حسب ارشاد جناب عالی تقسیم ہوا کریگا، امامباڑہ شاہ نجف کے خادموں کی تنخواہ۔ ایک ہزار ایکسو سینتیس روپیہ دس آنے آٹھ پائی بذریعہ متولی ماہوار دیا جائیگی۔ نواب مبارک محل۔ نواب ممتاز محل

نواب سلطان مریم بیگم، نواب سرفراز محل، نواب معتمد الدولہ۔ نواب امین الدولہ کے وثیقے مقرر ہوئے۔ مالی، ملکی، اور شاہی اختیارات وزیر المالک معتمد الدولہ مختار الملک سید محمد خان بہادر ضیغم جنگ کے حوالے تھے، جو آغا میر کے نام سے مشہور تھے۔ بادشاہ نہایت عالی حوصلہ تھے۔ اسی سبب سے تمام متوسلین شاہی بھی سیر چشم تھے۔ مہاراجہ جھاؤلال جن کا پل اور ایک بازار مشہور ہے، غازی الدین حیدر بہادر کے عہد میں یہ ایک دیوان تھے۔ ان کے یہاں ایک بکری پلی تھی اُس کے یہاں بچہ ہوا، مہاراجہ نے اُسکی چھٹی کا جلسہ نہایت دھوم دھام سے کیا، لاکھ روپیہ خرچ ہوئے دیوان خانے کے داروغہ رائے امرت لال عرض بیگی نہایت نیک دل، قابل، مخیر، اور قوم پرور تھے۔ مرزا قتیل کے شاگرد تھے کالستھہ سکینہ تھے کہا کرتے تھے کہ کتھے کے درخت میں کالستھہ کے دو رکن ہیں اس وجہ سے مجکو اس پھل سے محبت ہے منشی الملوک راجہ رتن سنگھ ناظم نظامت بیسواڑہ بہت مخیر اور نیک مزاج تھے، بادشاہ کے عہد میں سات ہزار سوار اور اکتالیس پلٹنیں تلنگہ ونجیب علاوہ توپخانہ کے ملازم تھی۔ بادشاہ کی طرف سے ایک سفیر کلکتہ میں رہتا تھا جو مہمات ملکی کو الیسٹ انڈیا کمپنی سے طے کرتا تھا۔ دنیا ہمیشہ سے گذشتنی اور گذاشتنی ہے جو شخص پیدا ہوا ہے ایک روز ضرور ناپید ہوگا، غازی الدین حیدر بہادر ۲۳، رجب ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۴ء میں مسند نشین ہوئے، تخمیناً تیرہ سال آٹھ ماہ حکومت کرنیکے بعد ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء ۵۶ سال کی عمر میں لبعارضۂ اسہال انتقال فرمایا۔ شاہ نجف (لکھنو) میں مدفون ہوئے، خلد مکاں لقب ملا۔ یہ قطعہ تاریخ شاہ نجف میں آویزاں ہے:-

چوں رفت شہ دین ز دنیا　　ماتم دل خاص و عام بگرفت
از روئے بکا و آہ گفتم　　حیدر نجف مقام بگرفت

راج ہنس کا گیت

مجھے اندیشہ ہے کہ میرا وقت آگیا، تیز رو ہوا کا ہر جھونکا ایک اُداس ترانہ الاپتا ہے، ہر نو شگفتہ کلی میں میں موت کا پیغام پڑھتا ہوں —— اور ہر ستارے کا طلوع مجھے ایک غمناک سندیسہ پہونچاتا ہے۔

+

پھر بھی، میں گاتا رہونگا، اُس راج ہنس کی طرح جو مرتے مرتے بھی لوگوں کے کانوں میں اُمرت ٹپکاتا رہتا ہے۔
میری روح اُڑ جائیگی لیکن میرے گیت ابد الآباد تک گونجتے رہیں گے

+

بڑھو، بڑھو، میٹھے نزالو! کبھی یہ سینہ تمہارا مسکن تھا، یہاں تم نے گھر کر لیا تھا۔ جبکہ شہد کی مکھیاں گلاب کے کانوں میں گنگنایا کرتی تھیں۔ تم اس سینہ میں سرمدی خوابوں سے مدہوش ہو کر شانتی کے جھولے میں جھولا کرتے تھے۔

+

ٹھیرجا اے راگ کی دیوی — میری رانی — ذرا تو ٹھیر! تو کب آتی ہے — اپنے پرانے گھر — اس ویرانہ کو یوں نہ چھوڑ جا۔ میرا غمزدہ دل کبھی تجھے عزیز تھا۔

+

اس دنیا کو اپنے آخری اُداس گیت سے بھر دے۔ جیوں جیوں تو فنا کے قریب پہنچے، اپنی آواز میں زیادہ سے زیادہ درد پیدا کرے۔ میری زندگی کی طرح مضمحل نہ ہو، بلکہ صبح کے ٹمٹماتے چراغ کی طرح اور زیادہ چمک!

+

اب میرا کام ہو چکا — آ — میری دُلہن، موت۔ آ۔ نقاب اُٹھا دے۔ زلفیں بکھیرے۔ میرے پاس آ۔ تیرا چہرہ کتنا حسین ہے! آہ! مجھے اپنے گداز سینے سے پیوست کرے۔ یہاں تک کہ میں تیرے آغوش میں تحلیل ہو کر جذب ہو جاؤں۔

+

مجھے انسانی برادری سے محبت نہیں تھی اور نہ انسانوں کو مجھ سے۔ مجھے اس نمائشی دنیا کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی صرف تین چیزیں تھیں جنکی ......

افسانہ کی تنقید

از جناب سید وقار عظیم۔ ایم۔ اے

افسانہ اور اُس کا فن یا تو اُن لوگوں کے لئے دلچسپی کا سامان بہم پہونچا سکتا ہے جو ہر چیز کے متعلق کچھ نہ کچھ جاننا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ صرف علم کے شیدائی ہیں اور اس لئے جہاں علم اور واقفیت کی ذرہ برابر بھی جھلک ہوتی ہے وہ اُس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایسے لوگ کم ہیں۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو کسی علم یا فن کو صرف اس لئے سیکھتے ہیں کہ اُسکے اُصول پر عامل ہونے کے بعد کامیاب آرٹسٹ بن جائیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد کثرت سے ہوتی ہے اور افسانہ نگاری کی دُنیا میں تو ایسے لوگ حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ نقادوں کی ہر جگہ کمی ہے۔ ہماری زبان اور ادب کو ترقی کی شاہراہوں پر پہونچنے کے لئے بہترین نقادوں کی ضرورت ہے۔ ایسے رہبروں کا ہونا ضروری ہے جو اپنا یہ فرض سمجھیں کہ بھولے بھٹکوں کو راستہ بتائیں۔ بُرے راستے پر چلنے والوں کو سخت سے سخت ہدایتیں کریں کہ وہ اس راستے کو چھوڑ دیں لیکن ان سب باتوں کیلئے سب سے پہلے خود آنکھوں میں روشنی اور دل میں علم اور دیانتداری کی چمک ہونی ضروری ہے۔ خود اچھائی اور بُرائی کے جانچنے کیلئے کسی معیار کا ہونا بیحد ضروری ہے۔ اس لئے جہاں فن ہو، جہاں علم ہو اور جہاں لوگوں کو آرٹسٹ بننے کا جنون ہو وہاں تنقید کی شمع ہونی چاہیئے۔ نقادوں کی رہبری کا سہارا ملنا چاہیئے۔

افسانے کے فن کا تعلق جہاں ایک طرف اُس کی مجموعی حیثیت اور اثرات سے ہے وہاں افسانہ نگار کو دوسری طرف اس بات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اُسکے مختلف حصّے بھی فن کی بلندیوں سے خالی نہ ہوں۔ تنقید ان مختلف حصّوں پر الگ الگ نظر نہیں ڈالتی۔ وہ افسانہ نگار کو مجموعی حیثیت سے دیکھنے کے بعد افسانہ کو ایک آرٹ کے مکمل نمونے کی حیثیت سے دیکھتی ہے۔ اس لئے تنقید کے ہر پہلو کا تعلق یا تو افسانہ نگار کے طریقے، اُس کے مقصد، اُس کے رُجحان، اُس کے انداز بیان، طرز ادا اور پیش کرنے کے طریقے سے ہے اور یا افسانے کے مجموعی اثرات سے۔

اس لئے افسانہ کی تنقید کرتے وقت نقاد کو پہلی چیز یہ دیکھنی چاہیئے کہ افسانہ نگار نے اپنے افسانہ میں توجہ (Concentration) سے کام لیا ہے یا نہیں۔ افسانہ نگار کا پہلا فرض مواد کی فراہمی ہے اور اسکے لئے اُسے توجہ کی سب سے زیادہ مدد لینی پڑتی ہے۔ اُسے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ جس مواد کا انتخاب اُس نے کیا ہے اُس کا کوئی حصہ افسانے کے لئے فضول تو نہیں، اس میں کوئی ایسی تفصیل تو نہیں جو افسانوی مقصد کے لئے فضول ہو۔ اسلئے تنقید کرتے وقت ہمیں پہلے افسانے کے اسی پہلو پر نظر ڈالنی چاہیئے کہ اسمیں توجہ کو کہاں تک کام میں لایا گیا جو مواد افسانے کے لئے منتخب ہوا ہے اس میں ایسی تفصیلات تو نہیں ہیں جو بجائے اسکے کہ افسانے کو دلکش اور مقصد سے قریب بنائیں اُس میں عیب پیدا کر دیتی ہیں۔ اگر افسانہ میں یہ کمی نہیں تو فن کی ایک منزل پوری ہو گئی۔

دوسری چیز جو افسانے کی تنقید میں سب سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے وہ اتحاد ہے۔ افسانہ میں عمل، مقصد یا تحریک، زمان و مکان (Time & place) ہر چیز میں اتحاد کی ضرورت ہے لیکن تنقید کرتے وقت جس اتحاد پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ اتحادِ اثر (Unity of impression) ہے۔ افسانہ پڑھتے وقت ہماری توجہ شروع سے آخر تک ایک ہی بات پر رہے۔ ایک ہی بات برابر ہمارے دل، دماغ اور جذبات پر قبضہ کئے رہے۔ ذرا سی دیر کو بھی اس کا اثر ہمارے ذہن سے دُور نہ ہونے پائے۔ اس میں افسانہ نگار نے صرف ایک خاص بات کہی ہو

اور وہی خاص بات ہمارے ذہن و دماغ پر مسلط رہے۔ اُسکی ابتدا سے لیکر انتہا تک افسانہ نگار نے منطقی اور نفسیاتی پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے افسانے کو جس طرح شروع کیا تھا اُسی طرح ختم کیا ہو۔ اس ابتدائی یا تحریکی مقصد میں فرق نہ آیا ہو۔ اگر یہ سب چیزیں افسانے میں ایک جگہ موجود ہیں تو اُسے اچھا افسانہ کہا جاسکتا ہے اور باوجود دوسری دلچسپیوں کے اگر اس میں اتحادِ اثر کی کمی پیدا ہو گئی تو نقاد اسے فن کا بہت بڑا عیب سمجھے۔

افسانے کی بُنیاد کسی نہ کسی تحریکی جذبے پر ہوتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ افسانہ کسی نہ کسی مقصد پر مبنی ہوتا ہے۔ خواہ یہ جذبہ نفسیاتی ہو خواہ منطقی، خواہ اصلاحی۔ خواہ شاعرانہ۔ اس سے نقاد کو بحث نہیں اور نہ اس کا کام یہ ہے کہ وہ ان میں سے کسی کو اچھا سمجھے اور کسی کو بُرا۔ اُس کے نزدیک تحریکی جذبات کوئی چیز نہیں۔ بلکہ وہ صرف یہ دیکھتا ہے، اس تحریکی جذبے یا مقصد کو افسانہ نگار نے کس طرح پیش کیا ہے۔ اُس نے اس اثر کو پیش کرنے کیلئے واقعات کا جو ڈھانچہ تیار کیا ہے وہ اس مقصد کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتا ہے یا نہیں۔ اسکے ایک ایک لفظ سے، ابتدا سے لیکر انتہا تک ترتیب (setting) سے لیکر پلاٹ تک ہر چیز اس مقصد کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتی ہے یا نہیں۔ اگر ایسا ہے تو فن کے نزدیک یہ افسانہ مکمل ہے۔ اس چیز میں جتنی کمی ہوتی جائے گی نقاد کے نزدیک اس میں اُتنا ہی عیب بڑھتا جائے گا۔ ایسے موقعوں پر عموماً افسانہ نگار یہ چاہتے ہیں کہ انہیں کوئی بنا بنایا اُصول مل جائے جس پر عمل کرنے کے بعد وہ افسانے کو فنی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ مکمل بنا سکیں۔ اس لئے وہ عموماً تفصیلوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بجائے خود ایک فنی غلطی ہے۔ کوئی چیز فن کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ مکمل ہے یا نہیں! اسکے دیکھنے کے لئے ہمیں اصول کے علاوہ جس چیز سے بہت زیادہ کام لینا پڑتا ہے وہ خود ہمارا ذوق جمالیاتی (Aesthetic taste) ہے۔ کبھی کبھی موضوعہ اُصول کی کورانہ پابندی بھی بے حد مہلک ہوتی ہے اسلئے نقاد کو صرف یہی نہیں دیکھنا چاہیئے کہ افسانہ نگار نے اپنے مقصد کو نمایاں کرتے وقت اس فنی اُصول کی پابندی کی ہے یا نہیں۔ اُسے صرف اپنے ذوق کو کام میں لاکر صرف اس بات پر توجہ کرنی چاہیئے کہ افسانہ نگار اپنے مقصد یا تحریکی جذبے کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرسکا ہے یا نہیں۔ اس سے اُسے سروکار نہیں کہ اُس نے اس کامیابی کیلئے کون سے طریقے استعمال کئے۔ البتہ اگر افسانہ نگار کو اپنے مقصد کے پیش کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی ہے تو اُس کا یہ فرض ضرور ہے کہ دوسروں کی رہبری کے لئے یہ بتائے کہ اس ناکامی کی کیا وجہ ہے؟۔

اکثر ہوتا ہے کہ افسانے کے مختلف حصّے فن کی حیثیت سے مکمل ہوتے ہیں اور اُسکے بعد بھی نہ تو ان میں اتحادِ اثر ہوتا ہے اور نہ مقصد یا تحریک کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ مختلف حصّے موضوعہ مقصد یا مجموعی اثر کے تابع نہیں ہوتے۔ اس لئے نقاد کو اس بات پر زور دینا چاہیئے۔ اس چیز پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ مختلف حصّے اتحادِ اثر کے تابع ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو یہ فن کے نزدیک عیب ہے اور اس کمی کی وجہ سے افسانے میں اثر کا باقی رہنا ممکن نہیں۔

اس مقصد کے تحت میں اصلاح بھی آجاتی ہے۔ اصلاح کا کام ادب اور اسکی ہر صنف سے لیا جاتا ہے۔ اُسکے ہر شعبہ میں اصلاحی مقصد کا وجود اب ناگزیر سا ہوگیا ہے لیکن اس اصلاح کو، اصولِ فن اور اُصولِ حُسن کا تابع رہنا چاہیئے۔ ادبی شان میں کمی آنے کے بعد اصلاحی مقصد ادب میں ایک عیب بن جاتا ہے۔ اُس کا حُسن صرف یہ ہے کہ وہ پورے افسانے پر چھایا رہے۔ افسانے کے حُسن میں، اسکی فنی نزاکتوں میں، لطیف شاعرانہ اثرات میں فرق نہ آنے پائے۔

افسانے کے نقاد کو جس چیز پر برابر نظر رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ افسانہ نگار میں وفا شعاری موجود ہے کہ نہیں۔ وفا شعاری یا (fidelity) سے

افسانے میں یہ مراد ہے کہ افسانہ نگار جس موضوع یا جس کردار یا جس ماحول کی مصوری اپنے افسانے میں کر رہا ہے اُس سے وہ اچھی طرح واقف ہے یا نہیں۔ جو زندگی وہ افسانے میں پیش کرے اُسکے ایک ایک راز اور پہلو سے اُسے اچھی طرح واقف ہونا چاہیئے۔ ان چیزوں کی فطرت کو اپنی فطرت کا ایک جزو خاص بنائے بغیر اُنکے متعلق کچھ لکھنا افسانوی وفاشعاری (Fidelity to nature) کے منافی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ عیب نہیں کھلتا لیکن جب کھل جاتا ہے تو افسانے کی ساری دلچسپیاں اور لطافتیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ اس بات کا نقاد کو بیحد خیال رکھنا چاہیئے۔ افسانہ نگار نے کہیں اس حیثیت سے اپنی ذہنی ایمانداری کو مجروح تو نہیں کیا ہے۔

افسانہ نگار کی فطرت کا ایک بڑا عیب جو افسانے کے لطف، دلکشی اور حُسن کو پامال کر دیتا ہے عموماً اپنے موضوع سے علیحدگی یا (digression) ہے۔ digression سے افسانے میں بہت سے عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتحاد اثر، توجہ، فن، وفاشعاری اور اس قسم کی اور دوسری چیزیں جو افسانے کو ہر حیثیت سے بلند بناتی ہیں۔ کبھی کبھی محض اسی علیحدگی کی وجہ سے اس بُری طرح پامال ہوتی ہیں کہ اس کا اندازہ ہر شخص کو نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں اگر اس علیحدگی (digression) کو الگ کر کے افسانے کو پڑھا جائے تو آسانی سے اندازہ ہو جائے گا کہ ایک ہی افسانے میں صرف ایک بات کا شامل کر دینا اور دوسرے وقت میں اسے الگ کر دینا اسکے حُسن اور قیمت کا کس حد تک مدار ہے۔ نقادوں کو چاہیئے کہ اس چیز کو زیادہ سے زیادہ دبانے اور پامال کرنے کی کوشش کریں۔

افسانہ اور اُس کا فن ہم سے جو کچھ بھی کہے، ہمارے بلند مقاصد کو افسانے میں کتنی ہی اہمیت حاصل ہو، ہمیں اپنی تحریکات کو نمایاں کرنے کی کتنی ہی ضرورت محسوس ہو لیکن جس چیز کو افسانہ میں ہمیں کبھی نہیں چھوڑنا چاہیئے وہ قوانین حُسن (Laws of Beauty) ہیں۔ یہ قوانین کسی کے بنانے سے نہیں بنتے اور نہ ان کا کوئی بگاڑنے والا ہے۔ ان کی جگہ ہر دل میں ہے۔ کوئی اس سحر سے کم متاثر ہوا ہے کوئی زیادہ۔ کسی میں اس نغمہ کی ہزاروں دلکش تانیں لگانے کی صلاحیت ہے اور کوئی صرف ایک لے کا پابند ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر دل پر اسکا اثر ہے۔ اس لئے یہ بتانا یا یہ بتانے کی کوشش کرنا کہ حُسن کے قوانین کیا ہیں، فطرت کے راز کو مجروح کر دینا ہے۔ ہر وہ چیز جو ہم پر مسرت کا جذبہ طاری کر سکے قوانینِ حُسن کی تابع ہے۔ افسانے میں کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اس میں دلوں کو کسی نہ کسی طرح مسخر کرنے کا حُسن ضرور ہونا چاہیئے۔ اور اس کا اندازہ یا تو افسانہ نگار کر سکتا ہے اور یا پھر اُس کے بعد نقاد کا فرض ہے کہ افسانے کو ان قوانینِ حُسن کے معیار سے پرکھے۔

لیکن یہ کہنے کہ قوانینِ حُسن کا کوئی خاص معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مطلب نہیں کہ ہم کسی چیز میں حُسن پیدا کرنے کیلئے کسی اُصول کی پابندی نہیں کر سکتے۔ حُسن اور اُصول دونوں چیزیں فطرت سے بالکل قریب کی ہیں اور حُسن پیدا کرنے کے لئے عموماً کچھ نہ کچھ اُصول کا برتنا ضروری ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قوانینِ حُسن، انسان کے بنائے ہوئے اصُول کے تابع نہیں ہو سکتے، یہ اور بات ہے کہ مختلف حیثیتوں سے دونوں ایک ہی نتیجہ اور اثر پیدا کریں۔ اور اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے اصول قوانینِ حُسن کے منافی ہوں اور وہ حُسن اور اثر پیدا نہ کر سکیں لیکن اُن پر عمل کرنا بجائے خود ایک حُسن ہے۔ اور اس لئے افسانہ نگاری میں حُسن اور اثر پیدا کرنے کے لئے عموماً دو تین باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

ان میں سے پہلی چیز تصور آفرینی (Suggestiveness) ہے۔ اس چیز کے بغیر حُسن اور بلندی کا پیدا ہونا قریب قریب غیر ممکن ہے۔ افسانہ نگار کو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اُسے اثر اور حُسن پیدا کرنے کیلئے کن کن چیزوں کا انتخاب کرنا چاہیئے اور کن چیزوں کو قطعی نظر انداز

کر دینا ضروری ہے۔ جو چیزیں ظاہرا بہت اہم اور پُر تاثیر معلوم ہوتی ہیں وہ افسانے میں داخل ہو کر بے کیف اور بے مزہ ہو جاتی ہیں۔ جن چیزوں کو ہماری نظر محض سطحی اور معمولی سمجھکر چھوڑ دیتی ہے وہ افسانے میں شامل ہو کر اس میں حُسن اور لطافت کا سرمایہ بن جاتی ہیں۔ اس چیز کا اندازہ بے حد ضروری ہے اور یہی انتخاب اور اس کمی کو تصور کے ذریعے سے پورا کرنا قوانینِ حُسن کی پابندی کا دوسرا نام ہے۔

دوسری چیز جو افسانے میں ایک پُر کیف حُسن کا اضافہ کرتی ہے، وہ ادبی سادگی (Literary Simplicity) ہے۔ سادگی بجائے خود فطرت سے قریب کی چیز ہے۔ اس لئے قوانینِ فطرت اور قوانینِ حُسن کے نزدیک اس میں تصنع اور رنگینی کو شامل کرنا زیادہ تر عیب میں داخل ہے۔ ادب کے دوسرے شعبوں میں تصنع، رنگینی اور مبالغہ کو پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن افسانے میں اس تصنع، رنگینی اور مبالغہ کو سادگی کا تابع ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی رنگینیاں، تصنعات، شاعرانہ مبالغے افسانے میں بھی حُسن پیدا کر سکتے ہیں لیکن اس موقع پر بھی اُن میں جو چیز غالب رہتی ہے وہ شاعرانہ حقیقت (Poetic Truth) ہے۔ شاعرانہ حقیقت کبھی سادگی کے منافی نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ شاعری کی دُنیا کی سادگیاں بھی معمولی سادگی سے زیادہ رنگین، زیادہ پُر کیف اور زیادہ لطیف ہوتی ضروری ہیں۔ دونوں کا مقصد صرف قوانینِ حُسن کی پابندی ہے، اور اسی لئے افسانے میں سادگی اور کہیں کہیں شاعرانہ رنگینی کو حُسن پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

تیسری چیز جو افسانے کے علاوہ صرف شاعری کے لئے ایک حُسن خیال کی جا سکتی ہے وہ جذبات کی تیزی، بلندی یا گہرائی ہے۔ افسانہ نگار کی حدود بہت مختصر ہیں اور اُنہیں حدود میں رہ کر اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ ہر وہ اثر پڑھنے والے کے دل میں پیدا کر دے جو وہ چاہتا ہے۔ اس لئے اُسے ہمیشہ جذبات میں زیادہ سے زیادہ تیزی، بلندی اور گہرائی پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ ہر پڑھنے والے پر وہ تیر و نشتر کا اثر کریں۔ یہ اثر واقعی مطمحِ نظر کا پابند ہے تو افسانہ نگار داد کا مستحق ہے اور اگر اس کوشش میں اُسے ناکامی ہوئی تو یہ حُسن عیب بن جاتا ہے اور یہیں نقاد کا فرض شروع ہو جاتا ہے۔

اس لئے نقاد کو چاہیئے کہ افسانوں میں قوانینِ حُسن کی تلاش کرے۔ اگر وہ پہلی نظر میں اس پر اپنا اثر جما لیں تو افسانہ نگار کی تعریف کرنی چاہیئے۔ اور اگر وہ محسوس کرے کہ افسانہ نگار نے قوانینِ حُسن کو نظر انداز کیا ہے تو وہ اس کی وجہ بتائے تاکہ دوسرے اُسے اپنے لئے شمعِ ہدایت بنا سکیں۔

اندازِ بیان اور زبان کو بھی افسانے کے حُسن و قبح میں بہت بڑا دخل ہے۔ اپنے مقصد کو سادے، مختصر اور مؤثر الفاظ میں پیش کرنا افسانہ نگار کا پہلا فرض ہے! اور نقاد کو اندازِ بیان اور اُسکے اثر پر بھی کافی زور دینا چاہیئے۔

(۳)

تنقید کا مقصد چیزوں کے معیار کو بلند بنانا ہے۔ نقاد کسی اچھی چیز کی خوبیوں کو اس لئے زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتا ہے کہ لوگ اُسکی طرف متوجہ ہوں۔ اور اُسے ایک بلند نمونہ سمجھکر ویسی ہی دوسری چیز کی تخلیق کی کوشش کریں۔ کسی بُری چیز کے عیبوں کو اسلئے طشت از بام کیا جاتا ہے کہ لوگ اِن سے سبق لیں اور آئندہ اس بُرے نمونے کی تقلید نہ کریں۔ دونوں صورتوں میں مقصد وہی ایک ہے۔

تنقید کے متعلق دوسری ضروری چیز جو اُس سے زیادہ اہم ہے یہ ہے کہ تنقید اور اُسکے معیار کہیں سے بنے بنائے نہیں آتے۔ اُنہیں انسان بناتے ہیں اور بلند نمونوں کو دیکھکر بناتے ہیں۔ کسی فن کے سب سے بڑے ماہر کے بلند ترین نمونے اس فن کا بلند ترین معیار سمجھے جاتے ہیں، اور

نقاد ان نمونوں میں سے خاص خاص نکات نکال کر لوگوں کے سامنے اس جیسی دوسری چیزوں کے پرکھنے کا ایک آلہ یا کسوٹی پیش کر دیتا ہے اور یہی کسوٹی تنقید کے اصول ہیں۔ یہ تنقیدی اصول عموماً ایسے وقت بنائے جاتے ہیں جب فن اچھی طرح پھیل نہیں چکا ہوتا۔ بلکہ اُسے کچھ لوگوں نے اختیار کیا ہے اور دوسرے لوگ اسکی تقلید میں دوسری چیزیں لکھنے یا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب ہر ملک میں ایک ساتھ نہیں پیدا ہوتا مختلف ملکوں میں ایک ہی قسم کا ادب ایک ہی وقت میں مختلف دوروں سے گذرتا ہے۔ مثال کے لئے ہم مختصر افسانے کو لیں تو اس کا اندازہ زیادہ اچھی طرح ہو سکے گا مختصر افسانے اب سے کوئی ڈیڑھ صدی پہلے کی تخلیق ہیں۔ اسلئے جہاں یہ شروع میں پیدا ہوئے اور اسکے بعد ڈیڑھ سو برس تک ترقی کی وہاں ان کا معیار لازمی اس جگہ کے مقابلے میں بلند ہوگا جہاں اسکی پیدائش کو مشکل سے چالیس برس ہوئے۔

ہماری افسانہ نگاری دو مختلف حصّوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ اس کا ایک حصہ تو ایسا ہے جسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام ارتقائی منزلیں طے کر کے مغرب کا ہم پلہ ہو گیا ہے اور دوسرا حصہ ایسا ہے جسے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگاری اُردو میں ابھی بالکل پہلی منزل میں ہے۔ اسکی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مغرب نے ہم پر بہت تیزی سے اثر کیا اور جو لوگ اس سے زیادہ متاثر ہوئے اور جن میں افسانہ نگاری کی فطری صلاحیت تھی وہ بلند معیار تک پہونچ گئے۔ جو لوگ نہ تو افسانہ نگاری کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ انہیں مغرب کے بلند نمونوں سے سبق حاصل کرنے کی پروا ہے وہ بہت پیچھے رہ گئے۔

بہرحال مجموعی حیثیت سے ہماری افسانہ نگاری ایک ایسے دَور سے گذر رہی ہے جسے اُس کا تعمیری دور کہنا چاہیئے۔ ابھی ہمارے افسانہ نگاروں کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جو حقیقتاً یہ نہیں جانتا کہ افسانہ نگاری کیا ہے اور اسکے باوجود بھی افسانہ لکھنا اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتا ہے۔ ہماری زبان اور ادب کیلئے ضرورت ہے کہ وہ اگر مغرب کی ہم پلہ نہ بن سکے تو کم از کم اپنے ملک کی دوسری زبانوں سے پیچھے نہ رہے۔ بنگالی اور ہندی ہر چیز میں اُس سے بہت آگے بڑھ رہی ہیں اور اس لئے اُردو والوں کو اسکے لئے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں کہ وہ اُردو جسے وہ ملکی زبان کہتے ہیں اتنی ہی اہم ہو جتنا انہیں اسکا احساس ہے۔ اسکی ذمہ داری ہمارے نقادوں پر ہے۔ اور اگر وہ چاہیں تو اسے اُن بلند منزلوں تک پہونچا سکتے ہیں جہاں اس کا پہنچنا بیحد ضروری ہے۔

ہمیں اس جگہ تنقید کے اُن شعبوں سے مطلب نہیں جو شاعری، ناول، ڈرامہ، سیرت نگاری یا نثر کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق ہیں، ہم افسانہ نگاری کی موجودہ ضروریات کو دیکھکر صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ افسانہ نگاری اور اسکی تنقید کے جو اصول ہم نے ابتک بیان کئے ہیں وہ صرف اس منزل پر پہونچکر کام میں لائے جا سکتے ہیں، اس موقع پر مفید ثابت ہو سکتے ہیں جب ہماری افسانہ نگاری ایک خاص منزل پر پہونچ جائے۔ جہاں اسکے لئے یہ خطرہ نہ ہو کہ اُسے اس جگہ سے کوئی ہٹا سکتا ہے۔ ہماری افسانہ نگاری جس جگہ ہے اگر اسے اسی حالت پر چھوڑ دیا گیا تو تقلید کے دیوانے افسانہ نگاری کو بالکل آسان اور لچر سمجھنے والے، اسکی بلندیوں اور نزاکتوں سے بے بہرہ افسانہ نگار اُسے کسی ایسی جگہ لے جاکر ڈالدیں گے جہاں اس کا پتہ نشان تک باقی نہ رہیگا۔ اور جس چیز کے متعلق ہم یہ اُمید لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ آئندہ مغرب کے بلند معیار کے سامنے بھی پست نہیں بلکہ بلند ہی جائیگی اُس کا ماتم کرنا پڑیگا۔

اس لئے سب سے پہلے تو یہ ضرورت ہے کہ ہمارے رسالوں کے اڈیٹر ایسے افسانوں کی اشاعت اپنے لئے گناہ سمجھ لیں جن میں فن اور ادب کی بلندی کے علاوہ نقطۂ نظر کی گہرائی نہیں موجود ہے۔ سطحی نقطۂ نظر سے لکھے ہوئے افسانے ہمارے معیار کو پست بناتے ہیں اسلئے اُن کی تعداد اُردو میں جتنی کم ہوتی جائے اچھا ہے۔

لیکن رسالوں سے زیادہ جو لوگ ہمارے معیار کو پست اور بلند بنا سکتے ہیں وہ خود ہمارے نقاد ہیں۔ انہیں اردو افسانہ نگاری کی موجودہ ضرورتوں کے لحاظ سے نئے اصولِ تنقید پر عمل کرنا چاہیئے۔ خود ایسے اصول بنانے چاہئیں جن سے اچھے افسانہ نگاروں کو بڑھایا جائے اور جو لوگ بری مثالیں پیش کرتے ہیں انہیں دبانے کی کوشش کی جائے۔

اس لئے اردو کے موجودہ افسانوں پر تنقید کرتے وقت ہمیں اس اصول کی پابندی کرنی پڑے گی جو تنقید کے بلند معیار کے نزدیک کبھی پسندیدہ نہیں سمجھی گئی اور جسے ہم خود اردو افسانہ نگاری کے آئندہ دور میں مذموم سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔ ہمیں تنقید اور تخریب دونوں میں مبالغہ سے کام لینا پڑیگا۔

جو لوگ اچھے افسانے لکھتے ہیں اور جنہوں نے افسانہ نگاری کی دنیا میں اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی ہے ان کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ ضرورت ہے کہ ان کی برائیوں کو بھی نمایاں کر کے دکھائیں تاکہ نئے لوگ ان لوگوں کے نمونوں کی تقلید کرتے وقت ان عیوب کو بھی نہ اختیار کر لیں۔

دوسرے یہ کہ جو افسانہ نگار تقلید کے شوق میں افسانے لکھتے ہیں اور جن میں حقیقی طور پر افسانہ نگاری کی صلاحیت موجود نہیں ہے اور آئندہ چل کر بھی وہ کامیاب افسانہ نگار نہیں ہو سکتے، انہیں جس طریقے سے ممکن ہو افسانہ نگاری سے باز رکھا جائے۔ ان کے عیوب کو ایک بلند مقصد کے حاصل کرنے کے لئے زیادہ نمایاں کرنے میں بھی کوئی عیب نہیں ہے۔ تنقید کی ہمدردی ([illegible]) اور عیبوں کو حتی الامکان نظر انداز کرنے یا انہیں ہلکا کر کے دکھانے کی کوشش ایسے لوگوں کے ساتھ ہرگز نہیں ہونی چاہیئے جن کے متعلق یقین ہو کہ وہ آئندہ چل کر بھی کامیاب افسانہ نگار نہیں بن سکتے۔

برخلاف اس کے ان افسانہ نگاروں پر ہمدردانہ تنقیدیں ہونی چاہئیں جن کے ساتھ اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ جن کے متعلق ہم آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ آئندہ چل کر کامیاب افسانہ نگار ہونگے۔ ان میں افسانہ نگاری کی فطری صلاحیت موجود ہے اور فن کی پابندی اور مشق اسے اور جلا دے گی اور ان کے افسانے اردو میں قابل قدر اضافہ کریں گے۔ اور ہمدردی صرف انہیں لوگوں کے لئے ہے، اور ہونی چاہیئے۔ ان کے عیوب کو ظاہر کر دینا چاہیئے تاکہ وہ ان سے بچیں لیکن اس طرح کہ وہ اسے ایک ہمدردانہ نصیحت سمجھ کر ماننے پر بھی مجبور رہوں۔

ظاہراً تنقید کے یہ اصول بلند تنقیدی معیار کے منافی ہیں۔ تنقید ہر شخص کے لئے برابر ہونی چاہیئے۔ لیکن میرے پاس اس کا صرف یہی جواب ہے کہ ہم تنقید جیسی بلند چیز کو صرف ایک بلند مقصد کے لئے کام میں لا سکتے ہیں۔ اگر صحیح اصول تنقید سے ہماری زبان اور ادب کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے تو ہم مجبوراً ایسے اصول وضع کریں گے جن کی ہمیں اس وقت سخت ضرورت ہے اور اس دور کے نکل جانے کے بعد افسانہ نگاری کو اس کے یکساں معیار تک پہونچانے کے بعد ہم بھی اسی اصولِ تنقید کو برتیں گے جو ہر زمانے اور ہر وقت کے لئے یکساں ہے۔

سید وقار عظیم

تسلسل

از جناب عبدالحمید عدم

کبھی تھے اِس طرح شیر و شکر ہم آپس میں   ہم اُنکے بس میں تھے دوست وہ مرے بس میں
اُنہیں مجسمۂ صدق جانتا تھا میں   اور اُن کی بات کو الہام مانتا تھا میں
مری نگاہ کا معبد تھے بام و در اُن کے   علی الصباح میں جاتا تھا روز گھر اُن کے
وہ مجھکو دل سے، تہِ دل سے پیار کرتے تھے   بڑی لگن سے مرا انتظار کرتے تھے

پر اتفاق سے برہم وہ سب نظام ہوا   اُس ابتدائے محبت کا اختتام ہوا
دلوں میں میل سی کچھ رفتہ رفتہ آ ہی گئی   خلوص و صدق کو اک بدظنی سی کھا ہی گئی
کہاں وہ جوشِ محبت، کہاں وہ پیار ندیم   ہے اب یہ حال کہ ملنا تو درکنار ندیم
نہیں ہے ذکر بھی اک دوسرے کا ہمکو پسند

مَیں سوچتا ہوں، وہ پہلی محبتوں کا عروج   اور اُس کے بعد المناک نفرتوں کا عروج
تو دل کو چوٹ سی لگتی ہے، رنج ہوتا ہے   کہ جیسے روح میں نشتر کوئی چبھوتا ہے
وفورِ غم سے مری کچھ عجیب حالت ہے   کہ اُن سے اب مرے مجروح دل کو نفرت ہے
نہ کس لیے ہو، کہ فطرت کا یہ تقاضا ہے   پر اب بھی آ کے اگر کوئی یہ سُناتا ہے
علیل ہیں وہ، طبیعت ہے مضمحل اُن کی   تو بھول جاتا ہے سب بے وفائی دل اُن کی
مَیں سوچتا ہوں عیادت کے واسطے جاؤں   اک اجنبی کی طرح جا کے حال پوچھ آؤں
یہ سوچتے ہی مگر پھر خیال آتا ہے   (جو میرے عزم کو اک ٹھیس سی لگاتا ہے)
ہے دل اگرچہ سراپا اُداس، کیوں جاؤں
مَیں اُس عدوئے محبت کے پاس کیوں جاؤں

عدم

دکھیاری ماں

طلوع آفتاب کا وقت تھا کہ مارکس کو پھانسی دیدی گئی ایک روز پہلے صوبے کے حاکم، جونیس ویرس نے صبح سے شام تک اس کا مقدمہ سُنا تھا۔ ملزم کی جانب اس کا رویہ حسب معمول بہت منصفانہ تھا لیکن وہ کیا کرتا، اس کے خلاف نہایت واضح اور صریح شہادت گذری تھی۔ یہ الزام پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا تھا کہ اس نے لوگوں کو شاہنشاہی احکام کے خلاف ورزی پر آمادہ کیا تھا بلکہ خود مارکس نے اقبال جرم کرلیا تھا اور اپنی صفائی میں محض یہ بات پیش کی تھی کہ بحیثیت عوام کے لیڈر کے اس کا فرض تھا کہ ظلم اور بے انصافی کے مقابلے میں ان کی حمایت کرے، جوں جوں مقدمہ نے طول کھینچا گرمی بڑھتی گئی، اور آسمان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک بہت بڑا پیتل کا کاسہ ہے جسے کسی نے اُلٹ کر رکھدیا ہے گویا اس وقت حاکم عدالت کو بہت سے سیاسی اور انتظامی معاملات درپیش تھے جن کی وجہ سے اس کی طبیعت پریشان تھی، لیکن اس قیدی میں اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی تھی اس نے کئی بار تعجب کے ساتھ مارکس کی طرف دیکھا اور وہ حیران تھا کہ اس کی عدالت میں کیوں ایک ایسے غیر معمولی نوجوان پر مقدمہ چلایا جارہا ہے اس کی یہ حیرت بجا تھی۔ مارکس اپنے گاؤں کے اور لوگوں سے بہت مختلف تھا، وہ نو عمر تھا، بمشکل بیس برس کا ہوگا مگر اس نے کسی قدر تعلیم پائی تھی۔ اس کی تقریر میں ایک ایسی قدرتی فصاحت تھی جس پر روم کے پُرانے ممبران سینٹ بھی رشک کرسکتے تھے۔ اس میں وقار کی شان تھی۔ حاکم کی موجودگی میں اس کا رویہ خود اعتمادی اور تمکنت کا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں ادب اور تعظیم کی چاشنی بھی تھی جس کی وجہ سے ایک خاص دلاویزی اور امتیاز کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ جونیس ویرس کو یہ مقدمہ کرنا پسند نہ تھا، اس کی مدت ملازمت ختم ہونے والی تھی اور اس کو یہ بڑی فکر تھی کہ کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے جو اس کی طویل اور نیک نام خدمات کو بٹہ لگائے۔ اسے توقع تھی کہ بہت جلد وہ مستعفی ہوکر اپنے پسپائی والے مکان میں عافیت کے ساتھ زندگی بسر کرے گا اور آرٹسکن تاریخ کا جس سے اسے شغف تھا دل لگاکر مطالعہ کرسکیگا۔ اس کی عمر ابھی پچاس سال کی بھی نہ ہوئی تھی، لیکن روم کے بہت سے سرکاری عہدہ داروں کی طرح وہ وقت سے پہلے خستہ اور ضعیف ہوگیا تھا۔ اس نے بہت وفاداری کے ساتھ حکومت کی خدمت کی تھی اور اپنے فرائض کو اس قدر مستعدی اور جانفشانی سے ادا کیا تھا کہ زندگی بھر بہت ہی کم فرصت نصیب ہوئی تھی۔

اس نے دیکھا تھا کہ کس طرح رفتہ رفتہ مارکس نے عوام کے دلوں میں گھر کرلیا تھا اور اسے اس بات کی خاصی تشویش تھی کیونکہ پُرانے تجربہ کی بنا پر اسے اندازہ تھا کہ اس قسم کے مُصلح حکومت کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں اگر دیہوں کی ایک بستی کی بستی باغی ہوجائے تو اس سے بھی زیادہ خطرناک!

اور مارکس واقعاً خطرناک ثابت ہوا تھا۔ اس نے لوگوں میں تشویش پیدا کردی تھی اور انہوں نے بعض اصلاحوں کا مطالبہ کیا تھا اور خود قیصر کے لگائے ہوئے ایک محصول کے خلاف ایک چھوٹی سی بغاوت کرڈالی تھی۔ شروع شروع میں گ

اس نوجوان کی خودسری پر ششدر رہ گئے تھے اور اس کی امداد کرنے میں تامل کرتے تھے لیکن جس طرح کبھی کبھی ایک ذراسی چنگاری سے ایسا شعلہ بھڑک اُٹھتا ہے جو سارے جنگل کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے اسی طرح مارکس نے کاشتکاروں میں ایک آگ سی لگادی اور جس چیز کی شکل ابتدا میں ایک مقامی بےچینی کی تھی وہ بڑھ کر ایک خطرناک بغاوت کی شکل اختیار کر رہی تھی۔

حاکم صوبہ نے بہت قابل تعریف مستعدی دکھائی تھی اور فوراً احکام صادر کر دئے تھے کہ مارکس گرفتار کر لیا جائے لیکن حکومت نے اس کی حرکات کا تدارک کرنے میں جس قدر جلدی دکھائی تھی اس سے زیادہ سرعت کے ساتھ اس کی ہر دلعزیزی اس کے آڑے آئی۔ جس نے اس کو اس طرح اپنی حفاظت میں لے لیا جس طرح کوئی کسی بچے کو اپنے لبادہ میں ڈھانپ لے۔ چنانچہ کئی ہفتہ تک وہ گرفتار نہ ہوسکا جن گاؤں نے اسے سرکاری سپاہیوں سے بچا کر پناہ دی تھی ان پر بڑی سختیاں کی گئیں، لیکن اس کے ساتھیوں کے پائے ثبات اور پاسِ وفا کو لغزش نہ ہوئی۔ اور آخر میں وہ محض ایک اتفاق سے پکڑا گیا جو اس کے ساتھیوں کے لئے بہت بدشگون ثابت ہوا۔ جب اس کی گرفتاری اور مقدمہ کی خبر عام ہوئی تو گاؤں گاؤں لوگوں کی آہ وزاری کی صدائیں بلند ہوئیں کیونکہ انہیں مدت کے بعد مارکس میں ایک نڈر اور بہادر لیڈر ملا تھا۔ ان کو اس کی ذات کی بدولت اُمید کی ایک جھلک دکھائی دیتی تھی اور ان کی پست ہمتوں میں جان پڑنے لگی تھی۔ اس کی گرفتاری ان سب لوگوں کے لئے ایک شدید صدمہ تھی جو جانتے تھے کہ وہ عوام کی آزادی کا حامی اور ان کا دوست ہے۔

جونیئس ویرس نے اپنے منصب کی مصلحت اور شان کا لحاظ کرتے ہوئے یہ طے کیا تھا کہ مارکس پر اسی گاؤں میں مقدمہ چلایا جائے جہاں وہ گرفتار ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا فلاکت زدہ گاؤں تھا جس کے منتشر جھونپڑوں اور مکانوں میں بمشکل ایک سو مرد عورتیں بچے رہتے تھے قریب جوار کی زمین بہت بنجر اور ویران تھی اور سوائے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے جو گاؤں کے ایک سرے پر واقع تھی ساری زمین ریگستان کی طرح چٹیل اور بھیانک تھی۔ مقدمہ کے دوران میں صبح سے شام تک لوگ حاکم کے خیمے کو گھیرے کھڑے رہے ان کی حالت کو دیکھ کر اسے کچھ اندازہ ہوا کہ وہ کیسی غربت اور بےبسی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مارکس کی پُرجوش تقریروں نے دلوں میں ایک بہتر زمانے کی اُمید کو بیدار کر دیا تھا۔ جس وقت تیسرے پہر کی دھوپ رن کو جھلس رہی تھی مقدمہ ختم ہوگیا۔ گواہوں کی بھن بھن کرتی ہوئی آوازیں بند ہوگئیں اور حاکم عدالت قیصر روم کے نام پر فیصلہ سنانے کے لئے سنبھل بیٹھا۔ اسے پھر اس نوجوان قیدی کے انداز پر تعجب ہوا، لیکن اسے یہ خوشی تھی کہ وہ فوراً فیصلہ سنا کر سزائے موت کا حکم صادر کرسکیگا۔ اسے یہ خیال آیا کہ اگر اس شریف نوجوان کو روم بھیجنا پڑتا تو وہاں اس کو جنگلی جانوروں سے لڑایا جاتا یا ٹائیبر کے قید خانے میں شرمناک طریقہ پر موت کا سامنا کرنا پڑتا اور یہ بہت افسوسناک بات ہوتی۔ اس نوجوان میں آپالو کی سی خوبصورتی تھی پیٹرونیس ثالث تک اس کے رویّہ پر کوئی اعتراض نہ کرسکتا تھا۔

حاکم نے افسوس کے ساتھ ایک ٹھنڈا سانس بھرا وہ فطرتاً ایک رحمدل شخص تھا اور اسے اپنا یہ کام کسی طرح پسند نہ تھا لیکن اس نے ایک سلیس اور منصفانہ تقریر کی اور مختصر طور پر جملہ الزامات، شہادتوں اور قانونی سزا پر تبصرہ کیا اور یہ فیصلہ سنایا کہ مارکس کے جرم کی سزا پھانسی ہے۔ اس نے ایک سپاہی کو جو قریب کھڑا تھا یہ حکم دیا کہ کل طلوع آفتاب کے

بقت مجرم کو پھانسی دیدی جائے اور تمام دن اس کا جسم لوگوں کی عبرت اور تنبیہ کے لئے پھانسی پر لٹکا رہے اور مغرب کے قریب اس کے اعزہ کے سپرد کر دیا جائے۔

جس وقت حاکم کرسیٔ عدالت سے اُٹھا اور خود پوش سپاہیوں نے ہاتھ اُٹھا کر اسے سلامی دی تو ایک عورت کی آواز گریہ بلند ہوئی جو اپنے بیٹے کا ماتم کر رہی تھی۔ لیکن خود مارکس کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور اگلے روز وہ اسی اطمینان اور تبسم جرأت کے ساتھ موت سے ہم آغوش ہو گیا اُس وجہ سے اس کی جانب رومی سپاہیوں کے رویّہ میں بھی ایک حد تک مہربانی اور تعظیم کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ جب آفتاب افق مغرب کی طرف ڈھلنا شروع ہوا تو گاؤں والے ایک ایک کر کے اس پہاڑی سے واپس ہونے لگے۔ صبح سویرے سے ایک مجمع خاموشی کے ساتھ اس کا ماتم کرتا رہا تھا اور جوں جوں آفتاب بلند ہوتا گیا گرمی بڑھتی گئی۔ ایک سقہ لوگوں کو پانی بلا کر خوب پیسے وصول کرتا رہا۔ کبھی کبھی بعض عورتیں اپنی تھکی ہوئی آنکھیں سورج کی طرف اُٹھاتی تھیں کیونکہ مدتِ انتظار کاٹے نہ کٹتی تھی۔ چند بہت چھوٹے بچے جنہیں مائیں گھر نہیں چھوڑ سکتی تھیں بھوک اور تکان کی وجہ سے روتے تھے۔ اس عجیب وحشت ناک خاموشی میں صرف ایک یہی آواز مخل ہوتی تھی۔

جب دن ڈھلنے لگا تو بہت سے لوگ آہستہ آہستہ خاموشی کے ساتھ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ریت کے اوپر ان کے قدموں کی چاپ تک نہ سنائی دیتی تھی، لیکن ریت کا بادل کہر کی طرح فضا پر چھا گیا اور اس غبار میں وہ لوگ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے بھوت آہستہ آہستہ انسانوں کی نظروں سے غائب ہو رہے ہیں۔

لاش پھانسی پر بے بسی سے لٹکی ہوئی تھی اور صرف ایک رومی سپاہی اس کی محافظت کر رہا تھا اور وہ بھی اس بیکاری سے پریشان اور خستہ ہو کر جمائیں لے رہا تھا۔ وہ ایک جوان آدمی تھا جو چند ماہ بیشتر خاص روم میں تعینات رہا تھا اور وہاں عیش و آرام کے ساتھ کچھ عرصہ گذار چکا تھا۔ وہاں کی ہنگامہ خیز زندگی کے بعد جس میں شراب عورتوں اور کھیل تماشوں کی افراط تھی اسے دور از راہ صوبوں میں نوکری کرنے سے سخت کوفت معلوم ہوتی تھی۔ اس نے تمام صوبوں کے باشندوں پر تمام کی اُداسی اور افسردگی پر اور اس مجرم پر لعنت بھیجی جس کی وجہ سے اسے یہ ناگوار اور تھکانے والی بیگار اُٹھانی پڑی تھی اسے گاؤں کے شراب خانے کا خیال آیا اور اپنے ساتھیوں کو جو اس وقت آرام کر رہے ہوں گے اور مزے دار کھانوں پر جو پک رہے ہوں گے اور تلخ شراب کی طرح اس کے مزاج میں برہمی پیدا ہوئی۔ ایک بچہ محض اپنی فطری کرید کی وجہ سے ذرا آگے بڑھ گیا تھا اسے سپاہی نے اپنے برچھے کے دستے سے دھکا دیکر ریت پر گرا دیا اور جب وہ حیرانی اور تکلیف کی وجہ سے روتا ہوا اٹھا تو اسے ڈانٹ کر کہا "موری کے کیڑے! پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو" اس کی ماں اسے گود میں لینے کے لئے بڑھی تو اس نے بہت حقارت کے ساتھ زمین پر تھوک دیا۔

چند مرد اور عورتیں اب تک پھانسی کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے سپاہی کی طرف دیکھا لیکن ان کی نگاہوں میں نہ غصہ تھا نہ عداوت۔ سپاہی کو ان سے نفرت تھی لیکن انہیں سپاہی سے نفرت نہ تھی۔ شکست کی ذہنیت ان پر اس درجہ غالب تھی کہ رومیوں کی خودسری اور غرور کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

سپاہی نے بڑبڑاتے ہوئے برچھے کو اپنے کاندھے پر رکھا اور تکان کم کرنے کے لئے ڈھال کو بائیں بازو پر لے لیا۔
اس کا پیتل کا کلغی دار خود معمول سے دوگنا بھاری معلوم ہوتا تھا، اور اس کا سر گویا تنور میں پک رہا تھا۔ اس نے جھلا کر پھر ہزارویں مرتبہ سورج کی طرف دیکھا اور سورج دیوتا کے بے رحم شعلوں پر لعنت بھیجی، لیکن اس مرتبہ اسے معلوم ہوا کہ افق پر ہلکی ہلکی بادلوں کی لکیریں پیدا ہو چلی تھیں جیسے کسی حسین عورت کے چہرے پر خستگی کی وجہ سے خفیف شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ وہ اظہار اطمینان کے طور پر کھنکھارا۔ دن تقریباً تمام ہو گیا تھا۔ اب بہت جلد یہ کمبخت اپنا مردہ لے جائیں گے اور اسے فراغت حاصل ہو گی۔ اس نے اپنے کاندھوں کو سیدھا کیا اور پھانسی کے سامنے فوجی باقاعدگی کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ چھوٹا سا مجمع اس کی طرف ایسی ہی بے پرواہی سے دیکھ رہا تھا جس طرح بھیڑیں کسی غیر متعلق چیز کو دیکھتی ہیں، چونکہ انہیں سوائے اس نوجوان کے جس کی لاش پھانسی پر جھول رہی تھی اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ اس وجہ سے کسی نے اس عورت کو بھی نہ دیکھا جو شاہراہ کو چھوڑ کر پہاڑی کے لمبے اور دشوار راستہ پر پڑ لی تھی اور اسی طرف کو آ رہی تھی۔ کوئی پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ یہ اجنبی عورت پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئی، اور اس وقت تک وہاں صرف تین آدمی رہ گئے تھے، دو مرد اور ایک عورت جو رومی سپاہی کے ساتھ لاش کی نگرانی کر رہے تھے۔

یہ دونوں مرد ادھیڑ عمر کے کاشتکار تھے جن کی کمر کو محنت اور مزدوری نے جھکا دیا تھا اور جن کا بوسیدہ لباس ان کی غربت کا پتہ دیتا تھا۔ عورت کافی معمر معلوم ہوتی تھی، لیکن اس کو پیرانہ سالی سے زیادہ صدموں اور سختیوں نے ضعیف کر دیا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھی تھی، اور اپنی اوڑھنی کے کناروں میں سر چھپائے اپنے مردہ بیٹے پر چپکے چپکے رو رہی تھی۔
بہت خاموشی کے ساتھ بغیر کسی کے دیکھے، اجنبی عورت پہاڑی کی چوٹی پر سے ہو کر اس مصیبت زدہ ماں کے پاس آ بیٹھی۔ تھوڑی دیر تک دونوں عورتیں ایک دوسرے کو چپ چاپ دیکھتی رہیں۔ مگر بہت جلد ان میں مانوسیت پیدا ہو چلی اور انہیں ایک دوسرے کی موجودگی سے تسکین اور تقویت محسوس ہونے لگی۔ پھر دفعتہً مارکس کی ماں نے اجنبی عورت سے گفتگو شروع کر دی۔ یہ عورت اسی کی ہم عمر معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی بیتے ہوئے دکھ درد کی شکنیں پڑی ہوئی تھیں مگر اس کی آنکھوں میں رحم کی جھلک تھی اور ان سے وہ خاموش ہمدردی ٹپکتی تھی جو زخمی دلوں کے لئے مرہم کا کام کرتی ہے اس نے کہا "آج صبح سویرے میرے بیٹے کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور شام کے دھندلکے سے پہلے اس کی لاش نہیں ملے گی۔" اس نے پھر اپنا سر نیچے جھکا لیا، اور اس کی سیاہ اوڑھنی کے کناروں نے کوّے کے پروں کی طرح اس کے چہرے کو ڈھانک لیا۔ اس کے ایک بھائی نے مارکس کی لاش کی طرف نظر کر کے اجنبی عورت سے کہا:۔
"اس کا یہی ایک بیٹا تھا، بڑا اچھا لڑکا تھا، اسے ظلم اور بے انصافی سے نفرت تھی۔ جب اس نے لوگوں کو مصیبت میں گرفتار دیکھا تو اس کا دل بھر آیا اور اس نے قیصر کا مقابلہ کیا لیکن اس کے دل میں شر بالکل نہ تھا۔ البتہ ہمت اور حوصلہ بھرا ہوا تھا۔"

اجنبی عورت نے آہستہ سے کہا "مجھے سارا قصہ سناؤ۔" گو اس کی آواز بہت دھیمی تھی اور اس کے چوٹ کھائے ہوئے دل کی پردہ دری کرتی تھی، لیکن اس کے الفاظ بالکل صاف سنائی دیتے تھے جیسے کوئی شخص کسی گڈریئے کی گھنٹی پر چوٹ مار کر سڑک کو جگا۔

مارکس کی ماں نے اپنا سر اُٹھا کر کہا " اس کی عمر صرف بیس سال کی تھی' اور جیسا بھائی نے تم سے کہا وہ بہت نیک اور سعادتمند لڑکا تھا۔ اس میں شر کے لئے بالکل گنجائش نہ تھی کیونکہ وہ مصیبت زدوں کی محبت سے بھرا ہوا تھا"۔ اجنبی عورت نے آہستہ آہستہ اپنا سر ہلایا۔ ذرا سی دیر ٹھہر کر ماں نے پھر کہا۔

" گاؤں کے لوگ اسے چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ سپاہی بھی اسے پسند کرتے تھے کیونکہ وہ کھیلوں میں اور برچھا چلانے میں بڑا ہوشیار تھا۔ لیکن اسے ظلم کی برداشت نہ تھی اور اس نے گاؤں والوں کو قانون شکنی پر آمادہ کیا اس لئے حکومت نے اسے گرفتار کر کے موت کی سزا دیدی"۔ شدت غم سے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی اور جب اس نے دوبارہ رونا شروع کیا تو رومی سپاہی نے غصہ سے اسے گھورا لیکن وہ کچھ بولا نہیں کیونکہ اس نے دیکھا دور آسمان میں جس پر جلدی جلدی اندھیرا چھا رہا تھا' دو مکروہ شکلیں منڈلاتی ہوئی اس طرف آ رہی ہیں۔ وہ کچھ دیر تک ان کی طرف دلچسپی سے دیکھتا رہا اور یہ خیال کر کے مسکرایا کہ انہیں کس قدر مایوسی ہوگی جب یہ لوگ لاش کو پھانسی پر سے اُتار کر گاؤں میں لیجائیں گے۔

بھائی نے پھر بہن کو تسکین دینے کی خاطر کہا:۔

" بہن حوصلہ کرو۔ اس نے بہادری کے ساتھ جان دی۔ دیوتا یقیناً اس سے بہت خوش ہوں گے۔ تیز قدم ڈائنا اس کا استقبال اور اس کی قدر و منزلت کرے گی۔ کیونکہ وہ بہت اچھا شکاری تھا"۔

ماں نے اپنا سر انکار کے طریقہ پر ہلایا اور غصہ کے لہجے میں جواب دیا:۔

دیوتا بے رحم ہیں۔ کیا میں نے اس کی پیدائش کے روز ڈائنا کے نام پر قربانی نہیں کی تھی؟ کیا میں نے ہرکلیز کے نام پر چڑھاوا نہیں چڑھایا تھا کہ وہ اس کو قوت عطا کرے۔ کیا میں نے دیوتا آئی سس کے نام پر نذر نہیں مانی تھی۔ انہوں نے میری ذرّہ برابر پرواہ نہیں کی۔ وہ بے رحم اور بے پرواہ ہیں۔ میرا بیٹا بھلائی کرنا چاہتا تھا اور اس کے بدلے میں دیوتاؤں کے طفیل اسے یہ شرمناک موت نصیب ہوئی"۔

جب مارکس کی ماں خاموش ہو گئی! تو اجنبی عورت نے بہت نرمی اور آہستگی سے کہا " مبارک ہیں وہ جو نیکی کے لئے بھوکے پیاسے ہیں ان کی خواہش پوری کی جائے گی"۔ مارکس کی ماں نے سر اُٹھا کر اس کو حیرت سے دیکھا اور آہستہ سے جواب دیا:۔

" ممکن ہے ایسا ہو لیکن میرا بیٹا تو مر گیا اور میں تنہا اور بے آس ہوں"۔

" مبارک ہیں وہ جو غم کرتے ہیں' ان کو تسکین دی جائے گی"۔ اس نے پھر بہت ملائمت کے ساتھ کہا۔ مارکس کی ماں نے سر ہلا کر جواب دیا " ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن میرا بیٹا آج مر گیا ہے اور میں تنہا ہوں' وہ کسی کا بدخواہ نہ تھا۔ لیکن حکومت نے اس پر اور اس کی قوم پر زیادتیاں کیں اور چونکہ وہ انصاف کا دوست تھا اس لئے اُسے مار ڈالا"۔

اجنبی عورت نے پھر بہت آہستگی کے ساتھ جواب دیا:۔

" مبارک ہیں وہ جن پر نیکوکاری کے راستے میں ظلم کئے جائیں کیونکہ آسمانی حکومت انہیں کا حصہ ہے"

مارکس کی ماں نے ایک عجیب انداز سے جس میں تھوڑا سا خوف بھی پایا جاتا تھا اس کی طرف دیکھا اور کہا " یہ تو بیشے

دلکش الفاظ ہیں۔ میں نے پہلے کبھی انہیں نہیں سُنا، یہ کس کے الفاظ ہیں؟"

جواب ملا" اُس شخص کے الفاظ ہیں جس کو تمہارے بیٹے کی طرح نیکی سے محبت تھی۔"

" اور کیا وہ بھی اسی طرح مار ڈالا گیا جس طرح آج میرا بیٹا مرا ہے؟"

اجنبی نے سر جھکا کر جواب دیا:-

" ہاں وہ بھی جس کے یہ الفاظ ہیں تمہارے بیٹے کی طرح مارا گیا۔ راستی کی خاطر اور اس وجہ سے کہ وہ تمام انسانوں سے محبت کرتا تھا اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جائیگا لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کے اس طرح مارے جانے میں ان کی نجات کا راز پنہاں ہے اور اس کی موت اور اس کی مصیبت سے لوگوں میں اُمید اور ایمان اور ہمت پیدا ہوگی کہ وہ راست بازی کی زندگی بسر کریں۔"

دونوں بھائی اور مارکس کی ماں ہمہ تن گوش اس کی باتیں سُن رہے تھے اور تعجب کے ساتھ اس اجنبی کو تک رہے تھے جو اس مایوسی کے لمحے میں اُمید اور ایمان اور ہمت کا پیغام دے رہی تھی۔

ایک بھائی نے پوچھا" اس شخص کی موت کیسے واقع ہوئی جسے ہم سے اس قدر محبت تھی؟"

اجنبی عورت نے سارا قصّہ ان کو سُنایا۔

جب اس نے قصّہ ختم کیا تو شام کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ رومی سپاہی دفعتًہ ان کے سامنے آکھڑا ہوا اور اس نے درشتی کے ساتھ کہا" چلو اب اس لاش کو لے جاؤ اور جلدی کرو ورنہ گیدڑ کچھ بھی نہ چھوڑیں گے۔" یہ کہا اور قہقہہ مار کر برچھے کو کاندھے پر رکھا اور کھٹ پٹ کرتا پہاڑی سے چل دیا۔ دونوں بھائی فوراً کھڑے ہوگئے۔ ایک نے رسّی کاٹنے کے لئے پیٹی سے چھُرا نکالا اور دونوں چُپ چاپ پھانسی کی طرف چلے۔

مارکس کی ماں نے پوچھا اور اس کی آواز میں ایک نئی ملائمت تھی" اس شخص کا نام کیا تھا جس نے میرے بیٹے کی طرح جان دی؟" عورت نے جواب دیا" اس کا نام عیسیٰ تھا۔"

" تمہیں اس سے بہت محبّت ہے۔" جواب ملا" مجھے اس سے جیسی محبّت ہے وہ انسانوں کی فہم سے بالاتر ہے" پھر خاموشی چھا گئی۔ محض پھانسی کے تختوں کی چرچراہٹ سُنائی دیتی تھی کیونکہ دونوں بھائی مارکس کی لاش اس پر سے اُتار رہے تھے۔

ماں نے اُس سے دریافت کیا" کیا تم اسے اچھی طرح جانتی تھیں؟"

اجنبی عورت نے بہت آہستگی کے ساتھ جواب دیا، اتنا آہستہ کہ اس کے الفاظ بمشکل سُنائی دیتے تھے:-

" ہاں وہ میرا بیٹا تھا۔"

(ترجمہ از انگریزی)

خواجہ غلام السیدین۔

تم کہاں ہو

جھٹپٹے میں راگ ہے ندی کا کتنا دلنواز　　انتہائے نغمہ زارِ عشق ہے پست و فراز
بہہ رہی ہے مستیوں میں اپنی بل کھاتی ہوئی　　جا رہی ہے جنگلوں میں نغمے برساتی ہوئی
تم کہاں ہو آ بھی جاؤ بن کے اک تازہ بہار

صبح کی رنگینیوں میں غرق ہے صبحِ بہار　　گنگناتا جا رہا ہے کس مزے سے آبشار
کیفِ سرمستی سے جنگل کی فضا مدہوش ہے　　مخزنِ دُرہائے شبنم سبزے کا آغوش ہے
تم کہاں ہو آ بھی جاؤ بن کے اک روحِ نشاط

یہ طلوعِ صبح، یہ ہلکا ترنم، یہ بہار　　روحِ نغمہ بن گیا ہے اب سکوتِ کوہسار
ہلکی ہلکی روشنی میں راستوں کے پیچ و خم　　خواب ہائے عشق کی ہوں جیسے تعبیریں بہم
کاش لیتے اس سے آ کر تم محبت کا سبق

روحِ موسیقی ہے خوابیدہ سحر کی چھاؤں میں　　کروٹیں لیتا ہے سبزہ بھی نظر کی چھاؤں میں
ساری دُنیا بن گئی ہے اک مرقع نور کا　　ذرے ذرے میں نظر آتا ہے عالم طور کا
کاش تم بھی دیکھتے یہ منظرِ راحت فزا

یعقوب بٹالہ پوری

مستقبل بنا رہا ہوں

از جناب قیسی رامپوری

چٹاخ ــــ میں نے اس متبرک آبنوسی میز کا بوسہ لیا۔

"خوں خوں خوں، یہ شاید میز سے عید ملی جا رہی ہے" میری شانتا نے اپنی مترنم ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے شوخی سے دریافت کیا۔

بوسے کو میز سے اسی قدر بُعد ہے جسقدر حسن گریز پا کو آغوش کریہہ سے۔ لیکن یہ میز ایک معمولی چوبی میز نہیں تھی بلکہ دو خاندانوں کی زندہ روداد، تاریخ مستحکم! جسکے عرض و بسط میں، جسکے ایک ایک نقش میں اس گھرانے کے واقعات منجمد ہوئے تھے!!

میرے آبا و اجداد شروع سے صاحب سیف رہے ہیں۔ تلوار! اُف! اس فولاد کے دھار دار ٹکڑے نے دُنیا کی تواریخ میں کیا کیا انقلاب پیدا کئے ہیں۔ میرے بزرگوں نے بھی اسی سلیح خونریز کے ذریعے جسکی برش کا تمام دُنیا کو اعتراف ہے اقتدار حاصل کیا تھا اور اس اقتدار کی قیمت ہمارے قبیلے نے اپنے خونِ حیات سے ادا کی تھی۔ لیکن گردشِ دوراں زبردست قربانیوں اور رفیع الشان شجاعتوں سے مرعوب ہونے والی چیز ہے۔ امتدادِ زمانہ نے ہمارے اقتدار کو بھی اسی طرح مٹا ڈالا جس طرح وہ عظیم المرتبت ہستیوں کی سطوت فنا کرتا آیا ہے۔ اب جبکہ میرے والد کا سن اٹھارہ سال کا تھا انکے قبضہ میں نہ تو وہ جاہ و حشم تھا، نہ وہ ثروت و اقتدار۔ ہاں اگر کچھ پاس تھا تو عزتِ رفتہ کے آثار میں سے اُن کا اپنا کیریکٹر تھا یا تلوار۔ لیکن اب زمانہ برشِ شمشیر کو خاطر میں لانے والا نہ رہا تھا۔ نسلی خوبیاں، زعمِ شرافت اور تفاخرِ نجابت کے معنی اب محض "ڈینگ" کے رہ گئے تھے۔

والد سب کچھ کھو دینے کے بعد حشمِ گذشتہ کے بازحصول میں تنہا اپنا کیریکٹر لے کر نہیں نکلے تھے۔ اُنکے ہاتھ میں اب بھی تلوار تھی لیکن صرف نیام میں رکھنے کیلئے! ہر سپاہی منش انسان بلند کیریکٹر کا حامل ہوتا ہے۔ والد نے اپنے شجاعانہ اطوار، سپاہیانہ کردار اور جفاکشی سے ایک معزز ہندو گھرانے میں رسوخ حاصل کر لیا تھا اور وہیں انہوں نے اپنی شادی بھی۔ اس مبارک شادی کی پہلی اور آخری نشانی یہ خاکسار ہی ہے۔ میرے شفیق والد اس کے بعد رحلت فرما گئے اور میرے قبضے میں اُن کا تمام اندوختہ آگیا۔ کیونکہ والدہ کا انتقال اُن سے ایک ماہ پیشتر ہی ہو چکا تھا۔

میں بچہ تھا اور بے یار و مددگار۔ چچا نے میری پرورش کی ذمہ داری (بلکہ زحمت)، اپنے سرلی۔ علائق عملی یا جوشِ خون کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اس طمع کی خاطر کہ میرے پاس ترکہ تھا! اس زمانے میں کون بیغرضانہ کسی کے کام آتا ہے۔

باپ ایک سچا مسلمان اور ماں ایک نیک ہندو عورت تھی۔ میرے اندر بھی دونوں خصوصیات موجود تھیں۔ باپ کا فطری صفائے باطنی اور ماں کی جبلی نیکدلی۔ مجھے ایک عربی کے مدرسے میں ٹھونس دیا گیا۔ جہاں میں مدتوں تک الف دو زبر آن اور بے دو زبر بن پڑھتا رہا۔ آپ تعجب کرینگے کہ جب میری عمر پندرہ سال کی تھی تو میں عربی کی تقریباً انتہائی تعلیم ختم کر چکا تھا۔ لیکن اتنا نہ جانتا تھا کہ افریقہ کہاں ہے، آفتاب کیا بلا ہے، گاؤ زمین کی کیا حقیقت ہے، سیاست کس چڑیا کا نام ہے، گاندھی کیا بکتا ہے، محمد علی کیا کرتے کرتے مر گئے۔ حکومت کا اونٹ کس سمت جا رہا ہے۔ اور ناقہ ہند کا دودھ کون دوہے جا رہا ہے۔ یہ ہے عربیہ مدارس کی تعلیم کا عالم!! اس کے برعکس میرے ہم عمر وہ طلبا، جو سرکاری مدرسوں میں پڑھتے تھے، ادبیات، سیاسیات، جغرافیات، اقتصادیات، واہیات اور خرافات تک پر وہ مزے سے بحث کرتے تھے کہ میں سمجھنے لگا تھا کہ یا تو یہ سب دیوانے ہیں یا میں

مادرزاد پاگل ہوں لیکن ایک باب میں وہ اور میں برابر تھے۔ وہ بھی عملی زندگی میں عضو معطل کی حیثیت رکھتے تھے اور میں بھی۔ وہ سب کے سب نوکریوں پر ٹوٹے پڑتے تھے (جو اُن کے نصابِ تعلیم کا نتیجہ تھا) اور میں مسجدوں میں اذانیں دیتا پھر رہا تھا۔ شاید کہ میری خوش الحانی سے کہیں امامت مل جائے۔

چچا نے ہمیشہ میری تعلیم کی جانب سے بے پروائی برتی۔ میں نے جو کچھ حاصل کیا اپنے ذوق سے کیا۔ میں شروع سے ہی ذہین، فہیم وطباع تھا۔ میری طبیعت میں اُپج اور اختراع ابتدا ہی سے ودیعت تھے۔ عربی کے دورانِ تعلیم میں میں انگریزی سیکھنے سے بھی غافل نہ رہا۔ کچھ شُدبُد ضرور رکھتا تھا۔ ایک روز آخر میں نے ایک اسکول میں داخل ہونے کا تہیہ کر لیا اور بڑی مشکل سے پانچویں جماعت میں داخل ہو سکا۔ جب میں نویں جماعت میں آیا تو میری عمر سترہ سال کی ہو چکی تھی۔ میں دو ایک درمیانی سیڑھیوں کو پھلانگ گیا تھا۔

میرا ننھیال ہندو تھا۔ جب تک نانا نانی زندہ رہے کبھی کبھی اُن سے ملنے چلا جاتا تھا۔ اب وہاں کا باب میرے لئے تقریباً بند ہو چکا تھا۔ اس گھرانے میں اب در کوئی رہا بھی نہ تھا۔ صرف میرے ماموں کے ایک دور کے عزیز باقی تھے، مگر وہ رئیس اعظم تھے اور میں معمولی حیثیت کا انسان۔ کبھی پوچھتے بھی نہیں تھے۔ وہ تو میں ہی ڈھٹائی سے ہولی دیوالی پر انکے درشن کر آتا۔ ورنہ انہوں نے کبھی مجھے اپنے مکان پر مدعو کرنے کی ذلت گوارا نہیں کی۔ ہاں اُن کی بیوی میرے ساتھ مخلصانہ برتاؤ ضرور کیا کرتی تھیں۔ میں جاتا تو میرے لئے علیحدہ باسن میں پوری کچوری ساگ وغیرہ رکھدیتیں جس میں شانتا (اُن کی لڑکی) اپنی معصومانہ ہمدردیوں (ہمدردی منافقانہ بھی ہو سکتی ہے) کی بنا پر دہی، دودھ، مکھن کا اضافہ کر دیا کرتی تھی۔

بابو رام دیال کی کوٹھی بڑی شاندار تھی جسکو نہایت قیمتی فرنیچر سے مزین کیا گیا تھا۔ مجھے اُن کے تمام بیش قیمت سامان میں ایک میز خاص طور پر پسند تھی۔ یہ میز کیا تھی زمانۂ قدیم کی صناعی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ شانتا نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ بابو جی (اسکے والد) اسکی عمر ڈیڑھ سو برس کی بتاتے ہیں اور وہ پُشتہا پشت سے انکے خاندان میں منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ امتدادِ زمانہ نے اس آبنوسی صفت کے نمونے پر ذرا اثر نہیں کیا تھا۔ وہ اب بھی اسی قدر اپنی قدیم شان کے ساتھ تمام قیمتی اشیا میں بیش قیمت نظر آ رہی تھی۔ اُسکے کندہ نقوش، اُبھرے ہوئے بیل بوٹے۔ اس کا عریض وطویل چمکیلا سیاہ حجم طبیعت پر ایک خاص قسم کا دبدبہ پیدا کرتا تھا۔ میں جب کبھی اس شاندار کوٹھی میں جاتا تو اس نادر میز کو ضرور دیکھتا تھا۔ حسرت سے، نہ معلوم کس خیال سے۔ سنِ شعور تک پہونچتے پہونچتے میں اپنے خیالات کا راز سمجھنے لگا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ایسی میز میرے قبضے میں بھی ہو۔ نہیں میں بھی اسی طرح رئیس ابنِ رئیس بنوں۔ (جو اب ناممکن تھا) میں چاہتا تھا کہ میری اولاد بھی اسی طرح اشیا نادرہ کی قابض ہو۔ اسکے پاس بھی اپنے آبا و اجداد کی ثروت وامارت کے بقیۃ الآثار میں سے ایسی ہی بیش بہا چیزیں ہوں۔ میں بھی خوب دولت پیدا کروں۔ اور کوٹھی، جائداد، مال و زر کثیر تعداد میں اپنی اولاد کے لئے چھوڑوں، یہ ایک صغیر سن لڑکے کے خیالات سہی مگر ان میں ایک طفلانہ جوش تھا، ایک "بچکانہ" عزم تھا!

آپ میری اس روداد کو غور سے پڑھیے۔ میں اسکو قلمبند کر ہی محض اس لئے رہا ہوں کہ آپ کو بتاؤں کہ میری زندگی کے ہر دور پر کس طرح متاثر کن اشیا اپنا زبردست اثر ڈالتی رہیں اور میں کس طرح ان مستقبل ساز تاثرات کی مدد سے اپنا کیریکٹر بناتا رہا۔ میں شروع میں کیا تھا، کیا کردار رکھتا تھا، کس سے دوچار ہو کر میری حسیات پر کیا اثر پڑا۔ اور وہیں سے میرے کردار میں کیا تبدیلی یا اضافہ ہوا۔ یہ سب کچھ آپ کو میری اس سوانح میں نظر آئے گا۔ میں نے اپنا مستقبل آپ بنایا ہے۔ میں اس وقت جن بلند مدارج پر پہونچا ہوں اپنے کیریکٹر کی قوت سے پہونچا ہوں۔ مجھ پر تبدیلیوں نے کیا اثر ڈالا۔ میں نے واقعات کو کیسے زیر کیا۔ میں نے جادۂ حیات کو کس طرح ہموار کیا اور میں نے اپنی زندگی کی آخری مرتفع حد کس طرح حاصل کی۔ اسکے اظہار سے وہ لوگ بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں جو اپنے کو پامالِ حوادث وہلاکِ واقعات سمجھتے ہیں، بدنصیبیاں راہ میں

[redacted]

ملتی ہیں، سو ء اتفاقات میرا راستہ روکتے ہیں، نحس مواقع میرے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں، لیکن میں اپنے کیریکٹر کی قوت سے انکو کچلتا ہوا نکل جاتا ہوں۔ زندگی میں ہار اور جیت دونوں ہیں، بلکہ ہارنے کے مواقع زیادہ ہیں لیکن میں جب ہار جیتنے کے لئے۔ جب پچھڑ اُٹھ کھڑے ہونے کے لئے۔ ایک توانا جسم اور ایک فہیم دماغ تمہارے قبضے میں ہونا شرط ہے۔ دُنیا اور اسکی تمام سازگاریاں تمہارے ساتھ ہیں۔ ہر چیز میں صحت کا خیال رکھو، جسم میں، خوراک میں، لباس میں، کردار میں، اخلاق میں، معاملہ میں پھر دیکھو اس تسخیرِ صحت سے تم کیا بنجاتے ہو۔ جسمانی صحت ذہنی صحت پر منتج ہے! اور ذہنی جسمانی پر۔ تم کس کو آسانی سے اختیار کرسکتے ہو۔ تم جب صحیح طور پر سوچنے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ عدم صحت سے دوچار ہو سکو! ایک سمجھدار دماغ اس جانباز و قوی اسپِ تازی کی طرح ہے جو راکب کو دُشمنوں کے نرغے میں سے نکال کر تمام حوادث سے بچاتا ہوا منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا ہے۔ تم اگر تعقل و تفہیم کی صلاحیت رکھتے ہو تو عوائق دُنیوی و موانعات حیات کو زیر کرتے ہوئے زندگی کی بلند ترین منزل تک پہونچ سکتے ہو۔ کیسی بدنصیبی اور کہاں کی سیاہ بختی۔ جب انسان کسی کڑی کی تابِ مقاومت لانے کے قابل نہیں رہتا ہے، جب اس کے قوائے ذہنی جواب دے جاتے ہیں تو اُس وقت وہ اپنے کو بدنصیب سمجھنے لگتا ہے۔ یہ ایسی ہی بُزدلانہ اور کمزور کیفیت کا نام ہے ورنہ حقیقتاً بدنصیبی کوئی شے نہیں۔

خیر اب آپ بیتی سُنیئے۔ میں آپ کو علی الواقعہ بتاتا ہوں کہ مجھ پر مختلف واقعات کے ساتھ کیسا کیسا رنگ چڑھتا رہا اور اسکے بعد میرا کیریکٹر کس کس طرح سے ڈھلتا رہا۔ عربیہ مدرسہ کی تعلیم کے بعد میں ایک متعصب کٹر مسلمان تھا۔ میرے اندر رواداری اور وسیع الخیالی نام کو نہ تھی۔ ہاں تنگ نظری اور تاریک سینی کی فراوانی تھی۔ میں ہندو تو کیا مسلمانوں تک کے لئے اپنے تنگ قلب میں گنجائش نہیں پاتا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ اگر مسلمان ہوں تو بس میں ہوں۔ اور مسلمان کافر، مرتد، ملحد یا گمراہ ہیں۔ جنت کی ہوس میں میں نے ایسی ایسی "تکفیر بازی" کی، وہ وہ دلآزاری کی کہ میں اب اُسکے خیال سے کانپ جاتا ہوں۔ اسکول میں جب داخل ہوا تو وہاں کی فضا نے ذرا میری تنگ نظری کو کم کیا۔ اور میں ذرا وسیع القلب سا ہوگیا۔ میرے اندر رحم، حلیمی اور بندگانِ خدا کی ہمدردی کا خیال پیدا ہونا شروع ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سخت متعصب نہیں بلکہ شکارِ تعصب ہوگیا۔ ہسٹری میں وہی پڑھنا شروع کیا۔

اورنگ زیب ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا۔

اس سے خوش ہوتا تھا کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں پر خوب خوب ظلم کیا ہے (جو واقعہ کے خلاف ہے لیکن ہماری ہسٹری یہی بتاتی ہے) ہندو طلبا مسلمان حکمرانوں سے نفرت کرتے تھے اور اس کے ساتھ اُنکے ہم مذہب لوگوں سے بھی۔ میں انتقاماً اُن سے نفرت کرنے لگا اور جیسا تعصب وہ میرے ساتھ برتتے میں اس سے دوچند اُن کے ساتھ کرتا۔ گو میں طبعاً متعصب نہیں تھا لیکن اسکول کی فضا نے اور ہندو طلبا نے مجھے بنادیا۔ تعصب پیدا ہوتے ہی میری خوئے عدم رواداری اور ترقی کرگئی۔ لیکن ہندو طلبا تنگ نظری اور افلاسِ دماغی میں مجھ سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ ہمارے عربیہ مدرسے میں متعصبانہ تعلیم نہیں تھی لیکن گروکل کی تعلیم سراسر تعصب آفریں ہے!۔

چند سال پہلے میں دیکھتا تھا کہ میرے والد کے ہندو احباب و اعزا اُن سے نہایت محبت سے پیش آتے تھے، اُن میں اخلاص، ہمدردی اور محبت تھی۔ لیکن اس نئی پود میں ان تمام باتوں کا فقدان تھا۔ ہسٹری کے بے سر و پا واقعات، تاریک دل اخبارات کی تعصب کاری اور فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے لیڈروں کی تباہ کُن قیادت، یہ وہ سامان تھے کہ ہندوستان کی اِن دونوں بڑی قوموں کے درمیان خلیج اختلافات پیدا ہوتی چلی جا رہی تھی۔

شاننتا کے والد کی میز نے میرے اندر امیر کبیر بننے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا چنانچہ میں ہر شنیع و احسن طریقے سے دولتمند بنجانے کی ٹھاننے لگا تھا۔ پرواہ نہیں اس اکتساب زر کے سلسلہ میں کسی کے حقوق غصب ہوں، کسی کو نقصان پہونچے۔ میں تو روپیہ چاہتا تھا، فقط روپیہ، اس طرح میرے کیرکٹر میں خود غرضی کا ایک اور جدید اضافہ ہو گیا تھا۔ اگر میں واقعی، جیسا کہ میں نے پہلے سوچا تھا ناجائز ذرائع سے دولتمند ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو آج شاننتا کی اس متبرک میز کو اسقدر احترام سے نہ چومتا۔ اس میز کو دیکھکر مجھے دولت کمانے کی حرص تو ہو گئی تھی لیکن شکر ہے کہ میں دولت پیدا کرنیکے باب میں ناروا طریقے اختیار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اب میرے کیرکٹر کے تین جزو تھے۔ تنگ نظری (عربی مدرسے کی پیداوار)، تعصب (اسکول کی تعلیم کا بخشا ہوا) اور خود غرضی (خواہش اکتساب زر کی پیدا کردہ) اسکول کی تعلیم مجھے سہل انگار، کاہل اور پست بھی بنا سکتی تھی لیکن میں ان مہلک بیماریوں کا تریاق پیشتر سے اپنے خون میں تحلیل رکھتا تھا۔ میرے والد شجاع، باہمت، صاحب عزم و حوصلہ، مستقل مزاج اور راستباز انسان تھے۔ چنانچہ یہ خوبیاں میں نے بھی ورثہ میں پائی تھیں۔ پھر اسکول نامعقول کی فضا کا مجھ پر کیا اثر ہو سکتا تھا!

میں نے میٹرک پاس کر لیا اور بخیال بیکاری معاش فرسٹ ایر میں داخل ہو گیا۔ کالج کی زندگی ایک عجیب زندگی تھی۔ اس کالج میں مشترکہ تعلیم کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا چنانچہ رات دن دعوت نظر کے سامان پیش نظر رہتے تھے۔

میری عمر اس وقت ۱۹، ۲۰ کے درمیان تھی۔ عنفوان شباب تھا۔ مذاق لطیف کے باب میں ہمیشہ شرمیلا رہا ہوں۔ مجھے اکثر لڑکیاں بنایا کرتی تھیں اور میں اپنی بہتری ہمیشہ اس میں سمجھتا تھا کہ چپ چاپ بیٹھا ہوا بنتا رہوں یا اٹھکر بھاگ جاؤں۔ کم گو انسان تھا۔ باتیں بنانی مجھے آتی نہ تھیں۔ میں کالج کے تمام لڑکوں میں صرف محمود کو پسند کرتا تھا اور لڑکیوں میں شاننتا کو، یہ دونوں میری دلآزاری (میں تو اس مذاق کو جس میں خود نہ لطف لوں، دلآزاری ہی سمجھتا ہوں) سے علیحدہ رہتے تھے۔ شمیم ان تمام لڑکیوں میں تیز و طرار تھی۔ کالج کے لڑکے تو "بے اصولے" ہوتے ہی ہیں اب ان لڑکیوں کی "بے اصولی" "نیچر" کو کون بھگتے گا۔

میں دیکھتا تھا کہ ہندو لڑکیاں پھر کچھ مقصد حیات رکھتی تھیں۔ ان کا تعلیمی پروگرام پھر کسی اصول کے ماتحت تھا۔ اگرچہ انہوں نے بلند ڈگریاں حاصل کر کے معیشت میں مزید دشواریوں کا اضافہ کر دیا تھا۔ تاہم وہ حب وطن کو منتہائے زندگی سمجھتی تھیں۔ انکے اندر خانگی امور کی بیداری کے آثار پائے جاتے تھے۔ وہ قانون ازدواج، اصول کفایت شعاری اور بچوں کی دیکھ بھال اپنے فرائض میں سے سمجھنے لگی تھیں۔ انہوں نے اپنی سادہ اطواری سے ہندوستان کی غربت زدہ فضا میں ایک سہولت و سکون پیدا کر دیا تھا۔ وہ بیش قیمت لباس اور فیشن ایبل اشیاء کی اسقدر دلدادہ نہیں تھیں جسقدر ان کی مسلم بہنیں تھیں۔ مسلمان لڑکیاں ہند کے افلاس رسیدہ ماحول میں اپنی فضول خرچیوں اور بے نیل خراجات سے انتشار پیدا کر رہی تھیں۔ ان کو پرواہ نہیں تھی کہ وہ غریب ملک جس کے باشندوں کی یومیہ آمدنی مشکل سے چار پیسے کا اوسط رکھتی ہے انکی فیشن پرستی سے تباہ ہوا جا رہا ہے۔ ان کی وہ انمل بے جوڑ تہذیب، وہ افلاس کی نیند میں ریاست کے خواب، وہ بے اصولی زندگی اور وہ نمائش حسن کی خاطر اپنی روایات پاکدامنی سے انحراف، صریح طور پر ثابت کر رہے تھے کہ یہ وطن، خاندان اور ناموس کی باغی ہستیاں ملک و ملت کو قبل از وقت تباہ کر ڈالیں گی۔ مسلم نوجوان کا مقصد حیات کیا ہے؟ ایک آتشیں نوا شاعر بنجانا، وطن و محبت وطن کے نام سے شرمانا، عشق و عاشقی کے معاملات میں مجنوں و فرہاد کے استاد بنے رہنا۔ کسی ٹھوس کام یا ذمہ داری کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنا۔ اور انکی مسلم بہنیں زندگی کا صحیح نصب العین کیا سمجھتی ہیں؟ خانگی زندگی سے گھبرانا، اور کسی طرح اینگلو انڈین لڑکی سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جانے کی کوشش کرنا۔ الغرض۔ آنچہ ہمہ دارند تو تنہا داری!

[redacted]

شمیم بھی بے حد فیشن پرست لڑکی تھی۔ اُسکے والد ایک اوسط درجے کی حیثیت کے انسان تھے لیکن اُن کا روپیہ تعلیم سے زیادہ شمیم کی فیشن پر صرف ہوتا تھا۔ مخلوط تعلیم کے عطا کردہ جنسی ارتباط نے تعلیم کے حقیقی مقصد کو بہت بڑی حد تک فنا کر دیا تھا۔ کالج کی عشق خیز فضا نے وہ تمام ہوس کاریاں یہاں پیدا کر دیں تھیں جن کا عشقِ بے ہنگام کی قلمرو میں پایا جانا ضروری ہے۔ یہاں بیکار شعر و سخن کا خوب چرچا تھا۔ یہاں فہل آرٹ کا بڑا پرچار تھا۔ یہاں رقابتوں کی بڑی فراوانی تھی۔ یہاں ضبط تولید کے تجارب کئے جاتے تھے۔ قصہ مختصر یہاں سب کچھ تھا۔ ہاں عمل و کارکردگی جیسی حقیر چیز یہاں نہیں پائی جاتی تھی۔

شمیم کو مغالطہ ہوا کہ میں اسکو چاہنے لگونگا۔ چنانچہ اُس نے مجھے پھانسنا چاہا لیکن یہاں ان تلوں میں تیل ہی نہ تھا۔ اُدھر کملا کو بھی غلط فہمی ہوئی کہ میں اُس پر مرتا ہوں لگی خواہ مخواہ غمزے کرنے۔ دیوانی ہوئی ہے۔ میں نے دل میں کہا لیکن میں شمیم کو ستانا چاہتا تھا۔ خواہ مخواہ کملا کی طرف التفات کرنے لگا۔ الغرض میں نے شمیم اور کملا میں رقابت پیدا کر دی اور خود علیحدہ ہو گیا۔ ایسے واقعات وہاں رات دن پیدا ہوتے رہتے تھے۔

اکیس سال کی عمر میں میں نے انٹر کا امتحان پاس کر لیا۔ اب سوچا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ چچا کی رپورٹ تھی کہ والد مرحوم کا تمام اندوختہ میری تعلیم پر صرف ہو چکا ہے اور اب مجھے سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے کوئی ذریعۂ معاش اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ اُن کی بد دیانتی تھی اب بھی کم از کم دو ہزار روپیہ ترکہ کا انکے پاس تھا میں کیا کر سکتا تھا سر پیٹ کر رہ گیا۔

کالج کی زندگی کو خیرباد کہکر سوچا کہ نوکری کرو۔ چنانچہ لگے غلامی کیلئے حکام کے آستانوں پر ناصیہ فرسائی کرنے۔ سارے زمانے کی خاک چھانی۔ بہتیرے جتن کئے مگر نوکری دُنیا سے ایسی ناپید ہوئی گویا اسکو کبھی اسکی ماں نے جنا ہی نہ تھا۔ بات یہ تھی کہ یہ زمانہ تھا ہندو مُسلم مناقشات کا۔ ہر جگہ برادرانِ وطن کا عنصر غالب تھا جسکو ضد ہے کہ اُن کے ہوتے ہوئے کوئی مسلم بچہ نوکر نہ ہو سکے۔ ان لوگوں نے ہر ہر جگہ میری راہ میں سنگِ گراں رکھدئے۔ اکثر بار میری خارجی کوششوں سے ملازمت کی آس بندھ جاتی لیکن عین وقت پر مسلم آزار شیطنت سب کھیل بگاڑ دیتی۔

عجیب منحوس زمانہ ہے۔ چار ہندو بیٹھے ہونگے تو مسلمانوں کی تباہی کی تجاویز سوچ رہے ہونگے اور کہیں چند مسلمان جمع ہونگے تو وہ ہندوؤں پر تبرا بھیج رہے ہونگے ایک دوسرے سے بیزار۔ یہ دونوں قومیں تباہ کیوں نہیں ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان کو ایسی گندگی ذہنیت اور اسقدر متعصب قوموں کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر انہیں جانور آباد نہ ہوتے تو اس پر انسانوں کا قبضہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

جب میں نے دیکھا کہ نوکری نہیں ملتی ہے تو خلافِ قانون جماعتوں سے مل جانیکا خیال پیدا ہوا۔ آخر حکومت کیوں نہیں اس تعطل و بیکاری کا علاج کرتی ہے۔ کبتک کوئی بھوکا مرے۔ لیکن آجتک میرے معزز آباؤ اجداد نے کوئی مجرمانہ حرکت نہیں کی تھی۔ چنانچہ میں نے بھی اس خیال کو دل سے نکالدیا۔

آہ وہ بڑی آبنوسی میز! اکیس سال کی عمر ہو گئی مگر اسکو حاصل کرنے کا اب تک ایک بھی ذریعہ پیدا نہ ہو سکا۔ بلکہ اب وہ مجھ سے بہت دُور ہوئی جا رہی تھی۔ مگر میں ہر وقت اسکو اپنے تخیئل میں موجود پاتا تھا۔ بابو رام دیال چاہتے تو میرے لئے سب کچھ کر سکتے تھے۔ مگر یہ خیال کبھی اُنکے دماغ میں آیا بھی نہ ہوگا کہ میں مستحق ہمدردی تھا۔ ایکدفعہ شام کو میں اُن کی کوٹھی کی طرف جا نکلا۔ شانتا لباس تبدیل کئے کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھی مجھے دیکھتے ہی لپکی لیکن میں پہلے اسکی ماں سے ملا جو شانتا کے پاس ہی آ رہی تھیں۔

"تم تو بھیا آجکل ادھر آتے ہی نہیں"، شانتا کی ماں نے کہا۔ پھر بولیں: "کیوں کیا کہیں نوکری لگ گئی ہے؟"

"نہیں" میں نے مختصر جواب دیا۔

"ارے ابتک بیکار ہی ہو" شانتا نے اس بار پوچھا۔

"ہاں" میں بولا۔

"وہ...... ماجی بابو جی کے دفتر میں ایک جگہ خالی ہے نہ ــــــ"

"شکریہ شانتا" میں نے اسکی پیاری تجویز کو وہیں ختم کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں تم لوگوں سے کسی نوکری کے معاملہ میں سفارش لینے نہیں آیا ہوں۔ بلکہ صرف ملنے آیا ہوں بیں تم سے منت کہتا ہوں کہ تم بابو جی سے میری نوکری کے متعلق کوئی ذکر نہ کرنا"

"بھیا اس میں بگڑنے کی کونسی بات ہے" شانتا کی ماں نے کہا۔

"دیکھو تو سہی" شانتا نے میرے تیور پر حیران ہوکر کہا۔ میں چند منٹ یہاں بیٹھکر اور اس پُراسرار میز پر ایک حسرت کی نظر ڈال کر چلا آیا۔

سال بھر مجھے بیکاری میں گذر گیا۔ اس عرصے میں کبھی ڈان کک زوٹ بننے کی ٹھانتا اور کبھی رستم۔ دو شخص لڑتے تو خواہ مخواہ کمزور کی جانبداری کرکے قوی کو پیٹ دیتا۔ اکثر لوگ میری دلیری سے مرعوب تھے اور میرے قوی جسم سے ڈرتے تھے۔

جب ابنائے وطن کی چیرہ دستیاں مجھے کافی تباہ کر چکیں اور مجھے کہیں ملازمت ملنے کی توقع نہ رہی تو میں نے فوج میں بھرتی ہو جانے کی ٹھانی۔ نہ مجھے کوئی رونے والا تھا نہ میرا کہیں دل اٹکا ہوا تھا کہ کسی کا خیال میرا دامن تھامنے کی کوشش کرتا۔ فوراً افسرانِ فوج سے ملا اور چند روز بعد ہی اپنے قد و قامت و توانائی کی سفارش سے سپاہیوں میں داخل ہوگیا۔ چند ماہ قواعد وغیرہ سیکھنے میں گذارے۔ میری کارکردگی و جفاکشی سے افسر وغیرہ خوش تھے، چنانچہ سپاہی کے رینک سے نکال کر مجھے اسسٹنٹ کوارٹر ماسٹر کی جگہ دیدی گئی۔ ہر کام کو ہمیشہ فرض کی حیثیت سے انجام دینا میری فطرت میں داخل تھا۔ یہاں اس قدر تندھی سے کام کیا کہ ڈیڑھ سال کے عرصے میں کوارٹر ماسٹر بن گیا۔ ہاں اب وہ آبنوسی میز مجھ سے قریب ہوتی جا رہی ہے۔

میرے حسادکو اور بابو رام دیال جی کو جب اس میرے غیر متوقع عروج کی خبر ہوئی تو مجھے اپنا رشتہ دار سمجھنے میں ان کی ہچکچاہٹ ذرا کم ہوگئی اور میں چشم بدبیں میں کافی سے زیادہ محسوس ہوگیا۔ میں دراصل فطرتاً سپاہی طینت تھا یہ عہدہ میرے مذاق کے مطابق نہ نکلا۔ لیکن فوجی ڈسپلن سے مجبور تھا۔

جنگِ عظیم کا جہاں سوز زمانہ تھا۔ ہر سمت سے ملک و تاج پر فدا ہونے والے جانباز سپاہی اپنی ماؤں، بیویوں اور محبوبوں سے جدا ہو ہو کر میدانِ کارزار کی آتشبار وسعتوں میں جمع ہو چکے تھے۔ جنگ کا خون آشام دیو اپنی شقاوت و قسی القلبی کے ساتھ امن و امان کی سلطنتوں پر قابض ہو چکا تھا۔ اس حرص کے پتلے، آز کے مجسمہ (انسان) کی حریص و طامع طینت ملک گیری کی ہوس میں اسکو دنیا کا خون بہانے پر آمادہ کر چکی تھی۔ وہ تہذیب کی علمبردار قومیں جو جہاں رانی و جہانبانی میں اپنے کو خدا کا خلیفہ سمجھتی ہیں سو سو جتن سے ہزاروں مکاریوں سے بیشمار بیہودہ و لاتعداد بہیمانہ حرکات سے دنیا کے امن کا تختہ لوٹ دینے کا تہیہ کر چکی تھیں۔

ہماری رجمنٹ بھی میدانِ جنگ میں پہونچ گئی تھی۔ رات دن سینہ شگاف گولیوں کی بارش، کوہ شکن توپوں کے گولوں کی ہیبت آواز، فضائے آسمانی پر سے قہرِ خدا کی طرح نازل ہونے والے شیل کے گولوں کے جگر خراش دھماکے، اور تاحدِ نگاہ چشم کور دھوئیں کے متعفن بادل ہی بادل نظر آتے تھے۔ انسان کی قیمتی جان کی حقیقت یہاں ایک کرم حقیر کے برابر بھی نہ تھی۔ موت ہزاروں قسم کے مہیب روپ بھرے ہوئے انسانی

سروں پر منڈلاتی پھرتی تھی تشکیل ۔ قوی جانباز سپاہی اپنی تمام سپاہیانہ شجاعت و دلیرانہ عزائم سینے میں لئے ایک اچانک گولی سے سرد ہو کر راہیِ ملک عدم ہوئے جاتے تھے۔ عیش و آرام، راحت و آسائش ہم سے اسقدر دور تھی جس قدر امیدِ زیست و توقع بازدیدِ وطن!

میدانِ جنگ کی زندگی، وہاں کا ماحول اور وہاں کے خیالات کا اظہار قلم سے ناممکن ہے۔ دماغ پر ایک قوی جمود سا طاری رہتا تھا قوتِ خیال و سامعہ ہر جہت سے معطل ہو کر صرف اپنے افسر کی کمان سننے کے لئے وقف ہو چکی ہو۔ یہی کیفیت بینائی کی تھی۔ سپاہی ہر شے کی جانب سے اندھا ہوتا ہے۔ اگر دیکھ سکتا ہے تو دشمن کی نقل و حرکت یا اپنے کمانڈر کے اشارات۔ اسکی آنکھوں کے سامنے اسکے کسی پیارے دوست عزیز وغیرہ کے گولی لگتی ہے اور وہ چند منٹ خاک و خون میں لوٹتا ہوا سرد ہو جاتا ہے لیکن اسکو نظر نہیں آتا کہ کون مرا، کون زندہ باقی ہے! بس وہ ہوتا ہے اُسکی بندوق ہوتی ہے، اسکے کمانڈر کا حکم ہوتا ہے۔ باقی کالعدم!

ہماری رجمنٹ کے سوءِ اتفاق سے ذرائع رسد و خبر رسانی مسدود کر دئے گئے تھے۔ ہم اپنی دوسری فوجوں سے بالکل جدا کر دئے گئے تھے، ہماری جیبوں میں صرف اُس روز کے لئے چند آخری بسکٹ رہ گئے تھے۔ فوری ضرورت تھی کہ یا تو راستہ کھولا جائے یا ہم سپر انداز ہو جائیں، ہمارے جانباز لفٹیننٹ نے ایک کمیشن طلب کیا کہ کون بازکشائی راہ کے لئے اپنے کو پیش کرتا ہے۔ میں اب جمعدار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا سب سے پہلے میں نے اپنے آپکو پیش کیا۔ فوجی حکم تو خیر اور چیز ہے لیکن واقعہ یہ ہے اس موتِ صریح، اس مرگِ یقینی کے لئے کوئی شخص تیار نہ تھا۔ میرے ساتھ ایک دستہ کو جانے کا حکم ملا۔ میں یہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ موت سے کھیلنا میرا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ چنانچہ دلیرانہ روانہ ہو گیا۔

یہ رات سخت تاریک تھی اور پُر کُہر۔ ہم سے ایک میل کے فاصلے پر دشمن کی چوکی تھی اور اس سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر مخالفین کی زبردست لائن تھی۔ ہمارا نوجوان بہادر افسر نشۂ شجاعت میں یہاں آپھنسا تھا اور اب گھر کر رہ گیا تھا۔ پوری تفصیل میں بہت طوالت ہے۔ بس یہ خیال فرمائیے کہ ایک میل کی مسافت تین گھنٹے میں سینے کے بل رینگ رینگ کر طے کی اور وہ پہلا شخص میں تھا جس کی چھپی ہوئی سنگین مشین گن والے حریف کے جگر کے پار ہو گئی۔ دشمن ہماری بے بسی و اقلیت سے مطمئن ہو کر زیادہ خبردار و محتاط نہیں تھے۔ خوب دست بدست جنگ ہوئی۔ کبھی وہ غالب تھے کبھی ہم۔ مجھے جو ایک تدبیر سوجھی تو دشمن کی لوئیس گن چپکے سے اٹھا کر کسی طرح عقب میں جا پہونچا اور وہاں سے لگا گولیوں کی بارش کرنے۔ معلوم نہیں اس اندھی یورش میں میرے ہاتھ سے اپنی فوج کے کتنے سپاہی کام آئے لیکن آدھ گھنٹے میں یہاں ہمارا قبضہ تھا۔ اسکے بعد ہماری پوری رجمنٹ اُٹھ آئی اور دشمنوں کی گولیوں سے مرتے گرتے اپنی لائن سے آملی۔ یہ میری ترقی کا پہلا زینہ تھا۔

چند روز بعد مجھے لفٹیننٹ بنا دیا۔ اور اپنی کارکردگی و حوصلے سے بڑھتے ہوئے فرسٹ لفٹیننٹ ہو گیا۔ جس روز مجھے یہ ترقی ملی اُسی روز میرے شانے میں گولی لگی تھی۔ زخمی ہو جانے کے بعد مجھے شفاخانہ میں پہونچا دیا گیا۔ جہاں میں تین ماہ تک سخت کرب اور بے چینی کی حالت میں پڑا رہا۔

جسمانی کمزوری کی حالت میں اکثر بیمار کو مایوس کن اور بھیانک خیالات آ جایا کرتے ہیں۔ یا وہ اس فراموش کردہ شے کو پھر یاد کرنے لگتا ہے جو بحالتِ تندرستی کثرتِ مشاغل کے باعث اسکے دماغ سے محو ہو گئی ہو۔ مجھے بھی اس آہنوسی میز کے خیال نے پھر آ دبوچا۔۔۔ لیکن اسدفعہ ایک جدید خیال کے اضافہ کے ساتھ! میز اور۔۔۔ اسکے پاس شانتا کا مسکراتا ہوا چہرہ!

مجھ خانماں برباد کا دُنیا میں کون تھا جس کی غمگساری کی اس وقت میری ضعیف روح تمنا کرتی۔ کوئی نہ تھا۔ مگر نامعلوم کیوں شانتا کی اعجاز

آفریں مسکراہٹ اور اس کا وہ سچی ہمدردی کے جذبات سے مملو معصوم چہرہ میرے پیش نظر رہنے لگا۔ آہ اگر اسکو معلوم ہو جائے کہ میں شفاخانے میں زخمی پڑا ہوا ہوں تو فوراً وہ میری تیمارداری کے لئے آتشیں حدود کو عبور کر کے آجائے گی ۔۔۔ آجائیگی ضرور آجائے گی۔ اپنے مغرور باپ کی فرعونیت کو ٹھکرا کر، ماں کے خشمگیں تیور سے بے پرواہ ہوکر، مذہبی اختلاف کی ناقابلِ عبور خلیج کو عبور کر کے۔ خدا جانے یہ اعتقاد کی حد تک مضبوط آرزو کیوں میرے دل میں قائم ہو گئی تھی۔

تین ماہ تک جب میرا زخم نہیں بھرا اور اس میں پیپ پڑ گئی تو ہاتھ کاٹ ڈالا گیا۔ افسوس میرا داہنا ہاتھ ضائع ہو گیا اور اسکے ساتھ ہی اُس کی فولادی قوت سے حاصل کیا ہوا اعزاز و حشم بھی! میری فوجی زندگی کا نہایت افسوس کے ساتھ خاتمہ ہو گیا اور میں ایک مصنوعی ہاتھ لگائے اعزاز و شہرت اور دولت بھی لیکر ہندوستان آگیا۔

یہاں آتے ہی میں نے ملکی مصنوعات کا ایک کارخانہ قائم کیا جس میں بدنصیب ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوان مزدور کی حیثیت تک کے لئے کام کرنے پر آمادہ تھے۔ تعصب، تنگ نظری اور خود غرضی کے جذبات میدانِ جنگ کی غیور زندگی نے الحمدللہ مٹا ڈالے تھے، انکے بجائے میرے اندر اب ایثار، محبت، ہمدردی، غیرت اور مردانگی (جن کا میدان جنگ سے آئے ہوئے ہر شریف آدمی کے دل میں پیدا ہو جانا ضروری ہے) پیدا ہو گئی تھی۔ میں سرکشوں کی سرکوبی اور قابل امداد لوگوں کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھنے لگا تھا۔ تعصب و تنگ نظری کے متعفن اور گھناؤنے خیالات سے مجھے دلی نفرت ہو گئی تھی اور ان مکروہ جذبات کے انسان کو میں گردن زدنی سمجھنے لگا تھا چنانچہ میرا کارخانہ ہندو اور مسلمان بیکار جماعتوں کے لئے کھلا ہوا تھا۔ میرے پاس بیکار مسلمانوں کی کثیر تعداد اکثر شکایت کرتی کہ ان کو ان کے ہندو پروپرائٹر نے اپنے قابلِ لعنت تعصب کی بنا پر نکال دیا ہے، تو جذبہ غیرت وطنی سے میرا خون کھولنے لگتا۔ ہندو بیکاروں کو بہت کم یہ شکایت تھی کیونکہ اُن کے پہلے ہی بہت سے کارخانے قائم ہیں لیکن اسکے باوجود میرے پُر ایثار دل نے گوارا نہیں کیا کہ تنگ نظر برادرانِ وطن کی بیہودگی کا انتقام ان بیگناہوں سے لوں۔ چنانچہ میں نے ان لوگوں کو بھی ہر طرح کی مراعات بخشیں۔

افسوس متعصب جماعت اسکے باوجود بھی اپنی شیطنت سے باز نہ آئی، اُس نے ہر ممکن کوشش سے میرے کارخانے کو بٹھا دینا چاہا لیکن میرے تجربہ کار منیجر کی باریک بینی سے مجھے کوئی نقصان نہ پہونچ سکا۔

میں اب بھی امیر کبیر انسان نہ تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ پھر بھی ہزاروں سے اچھا تھا۔ سارے زمانے میں کار میں بیٹھکر چکر لگاتا لیکن بابو رام دیال جی کے ہاں ہمیشہ پیدل ہی جاتا۔ اب وہ مجھے اُٹھکر تعظیم دینے لگے۔ مجھے نہیں میری پوزیشن کو، میری دولت کو۔ انکی بیوی لیکن میرے ساتھ وہی اپنے بزرگانہ طریقے سے پیش آتی تھیں گویا مجھے کوئی دنیوی عروج حاصل نہیں ہوا تھا۔ ہاں شانتا مجھے اب نہ معلوم کیا سمجھنے لگی تھی۔ وہ میری فوجی عزت اور کارناموں سے مجھے مافوق الانسان تصور کرنے لگی تھی۔ آخر اُس نے ایک روز حیرت سے دریافت کیا ہی۔

"کیوں لفٹیننٹ صاحب آپکو اپنی جان کا تو وہاں ہر وقت ہی اندیشہ رہتا ہوگا؟"

"پہلے اس "لفٹیننٹ" اور "آپ" کو اسی بے تکلفانہ نام سے تبدیل کرو پھر تمہارے سوال کا جواب دونگا" میں نے اُسکے تکلف کو برطرف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نام؟ پہلے کس نام سے مخاطب کرتی تھی میں آپکو؟ مجھے یاد نہیں رہا" اس نے دریافت کیا۔

"افسوس شانتا تم میرا بچپن کا نام اسقدر جلد بھول گئیں۔ مجھے دیکھو کہ میدانِ جنگ میں بھی تمکو اور تمہارے نام کو نہیں بھولا" میرے ان الفاظ کی

کے حسین چہرے پر عرق ندامت آگیا میں نے اُسکی پریشانی مٹانے کی نیت سے پھر کہا: اچھا اب بتادوں تو پھر تو نہیں بھولوگی ؟ اس نے
ب سر ہلادیا کہ نہیں بھولے گی۔

"اچھا تو ایک شرط پر میں نے اسکی زمین پر جھکی ہوئی آنکھوں کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ دفعتاً شانتا کی ماں کی آواز کان میں آئی۔
نہیں بابوجی بلا رہے ہیں"

بابوجی میرا انتظار کر رہے تھے۔ بولے "آئیے آپکو وہ زمین دکھادوں جس کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا" میں ایک مختصر مگر نفیس کوٹھی
نے کی فکر میں تھا اور بابوجی کی معرفت بنوانا چاہتا تھا کیونکہ پی۔ ڈبلو۔ ڈی کا محکمہ ان سے متعلق ہونیکے باعث توقع تھی کہ کام سستا نکل جائیگا ہمنے
دیکھی بلکہ خریدلی اور تیسرے روز سے ہماری بلڈنگ بننی شروع ہوگئی۔

مجھے دنیا کی دولت حاصل تھی۔ میں بفضلہ تندرست تھا، صحیح الاعضا تھا، صحیح الدماغ تھا، صاحب حوصلہ تھا اور باصول انسان تھا لیکن
ت کے باب میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ زخمی ہوجانے کے بعد سے مگر شانتا کی دلربا صورت اکثر آنکھوں کے نیچے رہنے لگی اور میں بہت جلد محسوس
نے لگا۔ نہیں مجھ پر جلد اس امر کا انکشاف ہوگیا کہ یہ صورت تو ایک مدت سے میرے نفس تحت الشعور پر مرتسم ہے اور اکثر خواب میں یا بحالت تعطل میرے
منے آتی رہی ہے۔ بچپن سے میرے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنا۔ ہاں اس زمانے میں مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرنا جب میں نہایت پریشانیوں کے
ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اور میرا اس بڑے گھرانے کی صرف دو چیزوں میں بچپن سے دلچسپی لینا (میرے اور شانتا کے) کیا اس امر کی دلیل نہیں کہ ہماری
میں ازلی ایک دوسرے کی پرستار ہیں؟ کم از کم میری روح تو ابد سے اسکی پجاری تھی۔

شانتا کی جوان امنگوں ہی لیکن مجھے ابتک دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ میری حسرتوں کو سمجھتی ہے یا نہیں۔
میرا مکان چونکہ بابوجی کی معرفت بن رہا تھا چنانچہ مجھے اکثر ان کے پاس جانا پڑتا تھا جسکو میں پسند نہیں کرتا تھا۔ میرا دل اگرچہ ان کی طرف
سے صاف تھا لیکن ان کے دل میں اب بھی میل تھا۔ وہ مجھ سے ملتے تھے لیکن منافقانہ۔ میں جب کوٹھی میں پہونچا تو شانتا اور کملا بیڈمنٹن کھیل رہی
تھیں۔ کملا نے مجھے حسرت سے دیکھا اور میں نے اسکو نفرت سے۔ شانتا نے معصومانہ میری جانب نظر ڈالی اور میں نے اسکو پیار سے دیکھا۔ جب
لوگ کھیل سے فارغ ہوچکیں اور کملا رخصت ہوگئی تو میں نے نیٹ کھولا دونوں بلے اٹھائے اور سب چیزیں مناسب جگہ پر رکھکر جانے لگا۔ شانتا
نے آہستہ سے کہا: "مجھے آپ کا نام یاد آگیا لفٹیننٹ"۔

"پھر وہی "آپ" اور "لفٹیننٹ"" میں نے کہا۔

"تو پھر کیا کہوں" اُس نے پوچھا۔

"تم" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تمہارا نام قیصری ہے نا جسکو میں تمہیں چھیڑنے کیلئے اکثر کیسر کہدیا کرتی تھی"

"ہاں، اچھا یہ نام تمہیں پسند ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بیحد" اس نے آہستہ سے جوابدیا۔

"تم تو ہمکو بھول چکی تھیں نا۔ آخر یہ تم کو کیسے یاد آگیا؟" میں نے اسکی لجائی ہوئی حسین آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر پوچھا۔ اُس نے حیا سے منہ موڑلیا
اور نہایت آہستہ سے بولی "نام یاد نہیں رہا تھا لیکن تم ہمیشہ یاد رہتے تھے"

"شانتا میں بھی تمہاری مقدس عصمت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم بھی مجھے اکثر یاد آتی رہیں" میں نے کہا۔
"اکثر ؟" اس نے شرارتاً دریافت کیا۔
میں بوکھلا گیا۔ گھبرا کر بولا "نہیں بارہا"
"بارہا ؟" اس نے پھر اسی قدر شوخی سے پوچھا۔ میں پھر بگڑ گیا۔ لاحول ولا قوۃ کمبخت زبان بس میں نہیں رہی تھی۔ پھر بوکھلا کر بولا "نہیں روز روز، دن میں ہزار بار"
"خیر جھوٹ تو کھل چکا۔ بننے سے کوئی فائدہ نہیں" میری زبان سے واقعہ یہ ہے کہ پہلے سچ بات نکلی تھی۔ مجھے شانتا اکثر یاد آتی تھی تاکہ روزانہ۔ "شانتا آخر ان" یادآوریوں "کا انجام کیا ہوگا ؟" میں نے دریافت کیا۔ اس نے حسرت سے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی اور چپ ہو گئی۔ چند منٹ اور بیٹھ کر آخر میں چلا آیا۔

دوسرے روز میں نے ٹھان لی کہ میں اس کٹھن مسئلہ پر آج بابوجی سے براہ راست گفتگو کروں گا۔ کوٹھی پر پہونچا۔ وہ لائبریری میں مطالعہ میں مصروف تھے، مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور میرے چہرے پر وحشت سی دیکھ کر متعجبانہ بولے "کیوں خیریت ہے ؟"
"تشریف رکھئے مجھے آج آپ سے ایک بہت ضروری بات عرض کرنی ہے" یہ کہہ کر میں نے پستول نکالا اور انکے سامنے میز پر رکھ کر بولا "دیکھئے اگر میری زبان سے آپکی شان کے، آپکے خاندان کی عزت کے، آپ کے مذہب کے اور آپ کی عفیفہ صاحبزادی کیخلاف اگر کوئی لفظ نکلے تو آپکو میں یہ تحریری حق دیتا ہوں کہ آپ فوراً میرے گولی مار دیں"
"قیصر یہ تم کیا کہہ رہے ہو" انہوں نے وفور حیرت سے پوچھا اور لرزتے ہوئے ہاتھ سے پستول ایکطرف سرکا دیا۔
"میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ میں شانتا سے شادی کرنا چاہتا ہوں" میں نے جرات سے کہا۔
"شانتا سے ؟" انہوں نے غصہ سے پستول کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔
"جی شانتا سے" میں نے آگے سینہ بڑھا کر جواب دیا۔ بابوجی نے پستول پھر رکھدیا اور سخت لہجے میں بولے "یہ تمہیں کیونکر جرأت ہوئی"
"کیونکہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں" میں نے کہا۔
"تم جھوٹے ہو" بابوجی نے شعلہ فشاں آنکھوں سے مجھے دیکھکر کہا۔
"دیکھئے آپ شرافت کی حد سے متجاوز ہوئے جاتے ہیں" میں نے اپنی فوجی غیرت و نسلی حمیت سے مغلوب ہو کر کہا۔
"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں" بابوجی نے ملائم لہجے میں ندامت سے کہا "لیکن تم کو مجھ سے یہ سوال نہ کرنا چاہیئے تھا" وہ پھر بولے۔
"بابوجی معاف کیجئے گا آپ غلطی پر ہیں۔ آخر شانتا کے اور میرے اتصال میں کونسی چیز حائل ہے میں ہر طرح اسکی پاک ہستی کا اہل ہوں"

"مذہب۔ تمہارے اور ہمارے دھرم میں زمین و آسمان کا فرق ہے" وہ بولے۔
"افسوس میں ایک تعلیم یافتہ ہندو کی زبان سے ان الفاظ کا متوقع نہ تھا۔ بابوجی، مذہب کی کیا غایت ہے ذرا مجھے یہ تو سمجھائیے۔ دین و مذہب ہماری مشرقی، اخلاقی اور بعض لوگوں کے خیال کے مطابق روحانی، تعلیم کے لئے ہے خواہ وہ ہندو دھرم ہو خواہ اسلام۔ تعلیم سب اخلاق کی دیتے ہیں۔ بس اصول تعلیم مختلف ہیں۔ تو پھر محض اختلافی اصول کی بنا پر ایک مذہب کو اچھا کہنا اور دوسرے کو برا سمجھنا کہاں کی دانائی ہے۔ کیا آپ میرے سوال

کا جواب دے سکتے ہیں کہ کسی مذہب نے خدا کو چھوڑ کر شیطان کی پرستش کی تعلیم دی ہے؟ اگر تمام مذاہب کی غایت تزکیہ نفس، بلندی اخلاق، ایثار، محبت، ہمدردی اتحاد نوعی و رواداری ہے تو یہ تعصب، یہ افلاس دماغی، یہ تنگ ظرفی اور یہ کم دلی کس کے نتائج ہیں؟ کیا مذہب کے؟ نہیں اپنے خود کے خبث باطنی و تنگ نظری کے۔ اخلاقی مبلغ شوپنہار اسی حقیقت کو کس خوبی سے واضح کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ زید و بکر جو دو، اور دو کو جمع کرنے سے نتیجہ نکلتا ہے اس سے خوب واقف ہیں لیکن زید صرف اس وجہ سے اس صریح نتیجہ سے انحراف کرتا ہے کہ بکر بھی اس جمع سے وہی نتیجہ نکالتا ہے۔ انسان شر پسند، بہیمانہ طینت اور حسد آشنا فطرت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حقائق کے اعتراف سے بھی ہمیشہ روگش نظر آتا ہے۔ آپ ہی نہیں ہندو مہاسبھا اور تبلیغ والے بھی خوب سمجھتے ہیں کہ اسلام کوئی ہوا نہیں ہے اور ہندوازم کوئی بھوت نہیں ہے۔ لیکن وہ محض اپنی شر پسند فطرت کی بنا پر حقیقی غایت مذہبی کو پس پشت ڈال کر ان مسائل کو جو ارکان مذہب میں داخل تک نہیں ہیں مذہبی چیز کی شکل میں پیش کر کے اپنے تخریبی پروگرام پر عمل پیرا ہیں۔ یہ تو تل کی اوٹ پہاڑ ہے ذرا خود سوچیے مکتی ہو سکتی ہے کہیں دوسرے کا برا چاہنے سے؟ بہشت مل سکتی ہے کہیں کسی کا گلا کاٹنے سے؟ اور میں کہتا ہوں سن لیجیے۔ اگر واقعی مذہب نام ہے کسی ناقابل عمل تعلیم کا۔ کسی مہمل تلقین کا۔ اگر مذہب ان اصولوں کو کہتے ہیں جو صرف دھارمک پستکوں اور مقدس صحائف کے صفحات میں بند پڑے رہتے ہیں اور جن پر عمل پیرا ہونا بشر کے امکان میں نہیں۔ تو کھود پھینکیے ان تمام مذاہب کی جڑ جو عمل کے صرف اسقدر قابل ہیں کہ انسان آپس میں کتوں کی طرح لڑیں اور اپنی اخلاقی اصلاح نہ کر سکیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مذہب کس کو کہتے ہیں، خدا کیا ہے۔ دھرم کے کیا معنی ہیں۔ خدا کا کام آپ کی زندگی کی تعمیر ہے۔ اور محبت بھی ضمانت حیات کا جزو اعظم ہے۔ چنانچہ خدا محبت ہے اور محبت ہی خدا ہے۔ پھر تمام جزوی اصول اسی کے ضمن میں آ جاتے ہیں۔ شانتا کی اور میری زندگی کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ ہندو اور مسلمان کی جنگ آفرین و اختلاف آرا لعنت سے ہمارے سینے پاک ہونگے۔ ہمارا دین، ہمارا دھرم ہوگا پریم۔ ہمارا مذہب ہوگا محبت۔ اور جب محبت تمام کائنات پر چھا جاتی ہے تو وہ اپنے طور سوز نور سے تمام ذہنی پراگندیوں، تعصب کے مہلک جراثیم اور تکدرات روحانی کو خاکستر سیاہ کر دیتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ دل ہزاروں لاکھوں ہوتے ہیں۔ لیکن سب ایک ہی حرارت کے ماتحت ایک ہی دوران خون کے زور سے سینوں میں دھڑکنے لگتے ہیں۔ اگر آپ کو اعتراف نہیں ہے کہ اسلام وہی غایت رکھتا ہے جو اور مذاہب رکھتے ہیں تو یقیناً آپ اپنے مذہب کی حقانیت میں بھی متشکک ہوں گے۔ میں دنیا کے تمام مذاہب کی غایت کو سمجھتا ہوں چنانچہ ہندوازم کو بھی تنگ نظرانہ طور پر نظر انداز کرنے کا روادار نہیں۔ لائیے میں اسلام اور ہندو دھرم کے امتزاج سے ایک ایسا پاکیزہ جذبہ پیدا کرتا ہوں کہ اس پر تمام آئندہ نسلیں ناز کرتی رہیں گی۔ میں اپنی طرف سے اسلام پیش کرتا ہوں آپ اپنی جانب سے ہندوازم پیش کیجیے۔ مباحثتاً نہیں بلکہ الفت کے جامہ میں۔ اب ذرا دیکھیے تو اس مقدس اتصال سے کیا چیز صورت اختیار کر رہی ہے۔ اتحاد۔ وہ شے جس کو حاصل کرنے میں ہم ایک صدی پیچھے ڈال دیے گئے ہیں۔ میں اپنے اسلام کو برقرار رکھتے ہوئے ہندو دھرم کی اخلاقی و روحانی تعلیم اختیار کرتا ہوں۔ کیا یہ میرا اقدام مجھے شانتا سے نہیں ملا سکتا ہے؟"

"ضرور ملا سکتا ہے" متعصب بابو جی نے اپنے مطلب کی بات سنکر میری تمام بکواس کے جواب میں فرمایا۔

"شرم، پھر وہی تنگ نظری۔ پھر نہیں سمجھے آپ مذہب کو۔ اسلام کہتا ہے جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے۔ زنا، چوری، دل آزاری، غیبت و بہتان سے بچو۔ ہندو دھرم کہتا ہے۔ جھوٹ بولنا مہا پاپ ہے، استے چار سے اور جیو ہتیا سے بچو۔ اب بتائیے اگر میں بالکل ہم شکل اصولوں کو عربی زبان میں لیے ہوئے مسلمان ہوں اور آپ انکو ہندی یا سنسکرت میں اختیار کیے ہوئے ہندو ہیں تو کیا آپ اقلیدس کی رو سے مسلمان نہیں ہوئے اور کیا میں ہندو نہیں ہوں؟ پھر میرا ہندو دھرم اختیار کرنا اور شانتا کا اسلام لانا کیا معنی؟"

"لفٹیننٹ تم سے جیتنا مشکل ہے. لو یہ اپنا پستول سنبھالو" بابوجی نے پہلی بار ہنسکر کہا.

"مجھے شانتا کو سنبھالئے جو اس سے زیادہ میری جان اور زندگی کی حفاظت کرسکتی ہے" میں نے مسکرا کر کہا.

"قیصر تم نے میری آنکھیں کھولدیں. میں اندھا تھا. میں تم سے محض اس بنا پر تعصب کرتا تھا کہ تم مسلمان ہو. اور اب جبکہ تم میرے داماد بنجاؤگے تو کیا پھر بھی میں تمہارا برا چاہ سکونگا. ہرگز نہیں. تم تو میری اولاد کے مانند ہوگے. اس تعصب و اختلافات مذہبی کی خلیج کو پاٹنے کے لئے صرف بین الاقوامی شادی بیاہ ہی سودمند ہوسکتے ہیں. لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ مسلمان بھی اپنی لڑکی کسی ہندو کو دے سکیں گے؟"

"آپ نے پھر وہی ہندو اور مسلمان کا لفظ استعمال کرکے ترتیب خیال میں انتشار پیدا کردیا. مسلمانوں کو اپنی لڑکی دینے سے کیا انکار ہوسکتا ہے. شرط یہی ہے کہ مجھ جیسا داماد انکو بھی محبت کی باتوں سے جیتے. وہ بھی منافقانہ جذبات اور متعصبانہ ذہنیت نہ رکھتا ہو"

میرے کیریکٹر کی تبدیلیوں کا اجمالی خاکہ پھر ملاحظہ ہو. عربی مدرسے نے میرے اندر عدم رواداری و تنگ نظری پیدا کردی تھی. آبنوسی میز نے حسن و قبح کے سوال کو مٹا کر اکتساب زر کی ہوس پیدا کی جو خود غرضی تک منتج ہوگئی تھی. اسکول کی تعلیم نے تعصب کو تاہ بینی کا مادہ پیدا کردیا تھا. پھر تعطل و بیکاری نے نہایت فرقہ وارانہ ذہنیت میرے دماغ میں پیدا کردی. لیکن ان تمام عیوب کا ازالہ فوجی ملازمت نے کردیا. میدانِ جنگ کی آتشیں فضا نے ہر ایک عیب کو جلادیا. اسکے عوض دلیری، ایثار، محبت، انصاف اور راستبازی پیدا کردی لیکن اسکے ساتھ ہی چند خرابیاں بھی لگالایا تھا. اکڑ، فوجی پن، لامنطقیت. مگر سب سے آخر میں شانتا کی علوی محبت نے ہر ایک عیب کا ازالہ کرکے میرے خمیر میں محبت اور صرف محبت کو رہنے دیا. اور باقی ہر شے کا خاتمہ کرڈالا.

قیسی رامپوری

خطاب بہ محبوب

ایک روز اس وقت کہ نہایت ہی دلکش سماں تھا... میں نے اس حسینہ سے کہا.....

اے میرے محبوب تو ہی بتا کہ اپنی نظم میں میں تجھے کیا لکھوں؟؟

روم اور یونان کے کون سے شیریں نام سے میں تجھ کو یاد کروں؟

لالیج...... نیرا..... کلورس

سافو..... لسبیا..... ڈورس

ارتھوسا..... یا..... لگرسی

اے میرے محبوب! بتا... ان ناموں میں سے کون سا نام تیرے لئے پسند کروں... آخر تجھے کس چیز سے خطاب کروں!

حسینہ نے ایک آہ سرد کھینچکر میرے سوال کا جواب دیا...

اے میرے پیارے!..... نام دراصل کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے.....

اپنے مصرع کی موزونیت کے لئے مجھے کسی چیز سے خطاب کر،

مجھے سافو کہہ..... یا کلورس

لالیج..... کہہ... یا ڈورس

مگر میری ایک التجا قبول کر..... ایک تمنا..... کہ براہِ خدا

..... جب کبھی تو مجھے یاد کر، مجھے صرف اپنا ہی کہکر پکار.....

اے میرے پیارے!

(کالرج)

[illegible]

بگلا بھگت

از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی

ہرتی پور کے زمیندار لالہ ہزاری لال کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہو چکی تھی مگر وہ اپنے خیال میں خود کو نوجوان ہی سمجھتے تھے، بچپن پر ان پر سیتلا دیوی کی نظر لگ چکی تھی جس سے ان کا چہرہ کچھ خراب ہو گیا تھا۔ مذہبی کاموں میں وہ بہت حصہ لیتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن ستیہ نرائن کی کتھا بھی کرتے جس سے لوگ انہیں پارسا اور خدا پرست سمجھتے مگر حقیقت میں یہ سب ڈھونگ تھا، فریب تھا، ان کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور تھا۔ وہ انسان کے قالب میں شیطان تھے۔ بوالہوسی ان کا شعار، جھوٹ اور فریب ان کا مشغلہ تھا۔ چیچک سے چہرہ داغدار تھا پھر بھی ان کو اپنے خوشجمالی پر ناز تھا۔ بالوں میں خضاب اور آنکھوں میں سرمہ لگانا ان کا معمول تھا۔ [illegible] والی مثل ان پر صادق آتی تھی۔ وہ حسن کے رسیا تھے۔ باغِ حسن کی نہ جانے کتنی کلیاں شگفتہ ہونے سے پہلے ہی لالہ جی نے توڑ کر پھینک دی تھیں۔ بچے اپنا کھلونا توڑ کر کچھ دیر رنجیدہ رہتے ہیں لیکن لالہ جی کو کلیوں یا پھولوں کو مسلنے میں ایک خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔

گھر میں کوئی بڑا بوڑھا روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ دائم المریض بیوی اپنے میکے میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ گاؤں میں کسی کی مجال نہ تھی کہ لالہ جی کے خلاف کوئی اپنی زبان ہلائے۔ زمیندار کا حکم ہی بادشاہ کا قانون تھا۔ کچھ تو لالہ جی کی دولت اور کچھ اُن کی ظاہری خدا پرستی اُن کی بداعمالیوں کی پردہ دار ہوئی۔

شام کے وقت لالہ جی کے دروازے پر گاؤں کے چند بےفکرے جمع ہو جاتے جنہیں جھوٹ سچ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لالہ جی کی ہاں میں ہاں ملانا ہی اُن کے لئے معراجِ کمال تھا۔ لالہ جی "لال پری" کے بھی متوالے تھے۔ اس کے لئے انہیں کوئی خاص تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی تھی کیونکہ گھر ہی میں مہوہ کی شراب کھنچوائی جاتی تھی۔ پولیس کا کوئی خوف نہ تھا، حلقہ کے داروغہ جی کو لالہ جی نے ملا رکھا تھا۔ صرف داروغہ جی ہی کی نہیں بلکہ ادنےٰ کانسٹیبلوں کے بھی پیٹ پوجا کا سامان لالہ جی مہیا کرتے رہتے تھے۔ ایسی حالت میں لالہ جی کو کسی کا ڈر کیوں ہوتا۔

بھگنا پاسی اور جودھا اہیر لالہ جی کے منہ چڑھے ہمراز زیادہ تھے، انہیں کے ذریعے سے لالہ جی ایک طرف اپنی پارسائی، شرافت اور رہبانیت کا ڈھنڈھورا پٹواتے اور دوسری طرف نفس پرستی اور گناہ کی زندگی بسر کرتے تھے۔

دُنیا کا بھی عجب حال ہے۔ غریب معمولی غلطی پر بھی بدنام ہو جاتا ہے لیکن سرمایہ دار کا گناہ بھی ثواب سمجھا جاتا ہے۔ امیر اپنے گناہوں پر دولت کا پردہ ڈال کر پارسا بنا رہتا ہے مگر فاقہ کش مصیبت زدہ غریب کو یہ بات کہاں میسر۔

(۲)

ماگھ کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ "آئی بسنت ہوئیں متوالی" کی دھوم گاؤں میں مچی ہوئی تھی۔ شام ہونے والی تھی جنگلی ہنسوں کا جھنڈ اُس وقت آسمان کی دھندلی غروبِ آفتاب کی سُرخی مائل روشنی میں کسی ندی کے کنارے ریت کے ڈھیر پر ریت کاٹتے چلا جا رہا تھا۔ دن بھر کے تھکے بیل سر جھکائے چلے آتے تھے۔ پیڑوں کی پتیاں خاموش اور پھولوں کی زبانیں بند تھیں۔ چہچہاتی چڑیاں ایک ناقابلِ بیان شاعرانہ دلآویزی تھی جس کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے شاعر کا دل اور مصور کی نظر چاہیئے۔ لالہ جی ایسے وقت میں اپنے ہمرازوں کے ساتھ کسی شکار کی تلاش میں نکلے تھے، وہ سرسبز کھیتوں کو پامال کرتے چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ایک طرف چلے جا رہے تھے کہ سامنے سے گھاس کا گٹھا

لائے ایک جوان عورت گذری۔ لالہ جی اور ان کی ٹولی کو دیکھکر اس عورت نے گھونگھٹ کاڑھ لیا لیکن بوالہوس لالہ جی اس سے پہلے ہی صرف ایک نظر دیکھکر لٹو ہو چکے تھے، عورت جوانی کے عالم میں تھی اور بقول استاذی حضرت نوح ناروی "جوانی میں تو ہر صورت حسین معلوم ہوتی ہے" اس لحاظ سے وہ حسین بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس کا حسن پھٹے پرانے کپڑوں سے باہر نکلا پڑتا تھا۔ دیہات کی آب وہوا میں پلی ہوئی عورت کا جسم بہت سڈول تھا۔ ایسے ننگے پاؤں گرد آلود تھے۔ بھلا لالہ جی سا رسیا مرد ایسے موقع پر کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ انہوں نے فقرہ کسا "تم تو ایسے چھپے جاتے ہو جیسے شام سندر جیسے چاند چھپے اندر بدری" جودھا پہیر نے مالک کا ساتھ دیا "بھوجی ذرا سنبھل کر یہ غریب کی جورو کو "بھوجی" (بھاوج) بنانا بہت آسان ہے۔ بھگنا پاسی بولا "رام نے کبوتری ہے کبوتری" یہ سب کہتے ہی رہے اور وہ عورت جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی دور نکل گئی۔

لالہ جی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "ارے یار جنگل میں یہ گلاب کب کھلا میں نے تو آج سے پہلے کبھی اسکو گاؤں میں نہیں دیکھا معلوم ہوتا ہے ابھی آئی ہے"

جودھا "جی ہاں آپ کا منگرو اچمار ابھی دو چار روز ہوئے اپنا گون لایا ہے"

لالہ جی "اس چمار کو ایسا عمدہ مال کہاں سے مل گیا؟"

جودھا "یہاں سے پندرہ بیس کوس پہ ایک گاؤں "چمر پیروا" ہے۔ اس گاؤں کی یہ لڑکی ہے"

لالہ جی "مگر مزہ تو جب ہے کہ یہ مال یاروں کے ہاتھ لگے"

جودھا "مالک کی دیا چاہیئے یہ کون بڑی بات ہے"

بھگنا پاسی نے کہا "مگر یہ عورت بڑی چتر اور نیک ہے۔ قابو میں مشکل سے آئیگی"

لالہ جی نے ڈانٹ بتائی "بس تو اپنی قابلیت رہنے دے، تو ان باتوں کو کیا جانے؟ میں ایسی ایسی بہت سی چتر عورتوں کو بیوقوف بنا دیا ہے"

جودھا پہیر نے کہا "بیشک بیشک، جس پر سرکار کی نظر پڑ جائے وہ بھلا کہاں بچ سکتی ہے! بھگنا تو ہمیشہ کا ڈرپوک رہا ہے"

بھگنا نے تیوری چڑھا کر جواب دیا "میری تو جتنی بدھی ہے اتنی ہی ہوں گا۔ تو جودھا بنا ہے، وقت پڑنے پر دیکھ لینا اس پاسی کے سامنے تمہاری جودھائی دھری رہ جائی"

لالہ جی نے بات بڑھتی دیکھکر بیچ بچاؤ کر دیا اور کہا "یار۔ تم آپس ہی میں لڑ گئے تو کیسے کام چلے گا، میں تو اب اسی کو عقلمند اور بہادر سمجھوں گا جو اس مال پر میرا قبضہ دلائے گا"

گھر پہونچنے پر بھی لالہ جی بڑی رات تک اسی عورت کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

(۳)

دوسرے دن لالہ جی کے پیادے منگرو اچمار کو بلانے اسکے گھر پہونچے اس وقت منگرو نار پل پی رہا تھا اور اسکی عورت سُندریا اُپلے تھاپ رہی تھی یا اسی طرح زمین اسکے پیادوں کو اپنے گھر پر دیکھکر منگرو گھبرا گیا، ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ منگرو بیگار میں پکڑا جا چکا تھا۔ اس نے پیادوں کو نہایت ادب سے رام رام کہا اور ڈرتے ڈرتے پوچھا "سویرے سویرے درشن دئیے کیسے تکلیف کی"

جودھا نے کہا "ہاں سب خیریت ہے چلو تم کو لالہ جی بلاتے ہیں"

منگرو "کاہے بلاوت (بلاتے) ہیں"

چودھا۔ "یہ بات تم خود ڈیوڑھی پر چل کر پوچھ لینا۔"

اور کچھ پوچھنا بیکار تھا۔ منگرو۔ سر جھکائے ڈرتا ڈرتا لالہ جی کے پاس پہونچ گیا۔ لالہ جی نے بڑی محبت کے ساتھ کہا "کہو چودھری اچھے تو ہے"

گاؤں کا زمیندار ایک نیچ چمار کو "چودھری" کہے۔ منگروا کے سارے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جاہل گنوار شکریہ کے الفاظ ڈھونڈنے لگا، اُسکی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ ایک بڑے زمیندار کا شکریہ کس طرح سے ادا کرے اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بھگوان مالک کو بنائے رکھیں سب ہجور (حضور) کی کرپا ہے"

لالہ جی۔ "ہم کو ایک پیادے کی ضرورت ہے تو کام کریگا"

منگروا کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ اس نے کہا "پیادہ؟"

لالہ جی: "ہاں ہاں پیادہ، کیا تجھے یہ نوکری پسند ہے"

جودھا نے دیکھا کہ یہی کارگذاری دکھانے کا موقع ہے جھٹ سے بول اُٹھا "واہ بے منگروا تو بالکل گنوار ہی رہا مالک تجھ کو پیادہ بنا رہے ہیں اور تیری سمجھ میں نہیں آتا"

بھگنا پاسی کیلئے یہ شرم کی بات تھی کہ ایک پیادہ تو اپنی قابلیت کا اظہار کرے اور وہ خاموش رہے چنانچہ اس نے بھی وکالت کی "منگروا کا سوچت ہے جلدی سے ہاں کر دے"

منگروا خوشی کے مارے بول اُٹھا "تو میں سرکار کے حکم سے باہر تھوڑا ہوں"

لالہ جی: "ہاں میں نے تیری تعریف سُنی تھی کہ تو بڑا بہادر ہے"

بھگنا پاسی: "منگروا کشتی بڑی اچھی لڑت ہے"

جودھا کو بھگنا پاسی کی یہ سبقت ناگوار ہوئی اُس نے کہا "تو نے تو سُنا ہی ہوگا میں تو خود اپنی آنکھوں سے اسکو کئی دنگلوں میں دیکھ چکا ہوں، اُس نے کئی کشتیاں ماری ہیں"

منگروا چمار کو حیرت تھی کہ آج سے پہلے ان پیادوں نے اُسکی تعریف کیوں نہیں کی تھی، اس سے پہلے تو وہ سیدھے مُنہ بھی بات نہیں کرتے تھے، تھوڑی ہی دیر میں یہ کیسا انقلاب ہوگیا۔

لالہ جی نے کہا "اچھا منگروا اب جا کل سے تو کام کرنے آجانا چار روپے مہینہ تنخواہ ملے گی۔ اسکے علاوہ ہر فصل پر آسامیوں سے جانتا تو ہوگا کچھ بھینٹ بھی مل جایا کرے گی"

لالہ جی سے رخصت ہوکر منگروا جب اپنے گھر کی طرف چلا تو خوشی کے مارے زمین پر اُس کے پاؤں نہ پڑتے تھے اب وہ چھاتی پھلا کر چل رہا تھا۔ اب وہ زمیندار کا پیادہ تھا اُس وقت وہ عالم خیال میں اڑا چلا جا رہا تھا ــــ آج کا دن کیسا مبارک ہے، مُنہ اندھیرے اُس نے سُندریا ہی کو دیکھا تھا۔ اب وہ روزانہ صبح اُٹھکر سب سے پہلے سُندریا کا مُنہ دیکھا کرے گا۔ غریب سُندریا کے پاس کوئی اچھی دھوتی نہیں، وہ اب شہر سے ریشمی دھوتی لائے گا۔ زیور بھی تو نہیں ہے، خیر کوئی پرواہ نہیں پہلی تنخواہ ملتے ہی وہ اس کا بھی کچھ انتظام کرے گا۔ اب وہ اپنے دشمنوں سے ضرور بدلا لے گا۔ بدھو بھجنا بنئے نے اُسکو بہت دق کیا ہے اب وہ بنئے کے بھی مزاج درست کر دے گا۔ پیادے کے لئے ایک لوہ بندی لاٹھی کی بھی ضرورت ہے فی الحال تو وہ لالہ جی کے یہاں سے لے لیگا۔ اسی قسم کی باتیں منگروا اپنے دل سے کرتا جا رہا تھا وہ تصور کی نگاہ سے اپنا مستقبل

دیکھ رہا تھا جو نہایت شاندار تھا۔

(۴)

لالہ جی نے جس مطلب سے منگروا کو پیادہ بنایا تھا وہ پورا نہ ہوا کیونکہ جب منگروا سے کہا گیا کہ وہ رات کو ڈیوڑھی پر سویا کرے تو اُس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اپنی عورت کو گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ لالہ جی کا خیال تھا کہ جب گُڑ سے کام نکل سکتا ہے تو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ منگروا کے انکار سے اُنہیں صدمہ تو بہت ہوا لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہے۔ اب اُنہوں نے دوسری چال چلی، جب وہ سیر کو جاتے تو گھومتے پھرتے "چمروٹی" کی طرف بھی نکل جاتے، جن چماروں سے اُنہیں کبھی بہت نفرت تھی، جن اچھوتوں کے سائے سے وہ دُور بھاگتے تھے اب وہی اچھوت اُنکے دوست تھے، وہ چماروں کے گھر پر جاتے اور اُن سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے۔ زمانے کے ستائے ہوئے بدقسمت اچھوت، زمیندار کو اپنے حال پر مہربان پاکر بہت خوش ہوئے۔ لالہ جی نے اعلان کرا دیا کہ اب غریبوں سے بیگار نہ لی جائے گی۔ جو کام کرایا جائے گا اُسکی مزدوری بھی دی جائے گی۔ لالہ جی کی اس شرافت کی دُور دُور شہرت ہو گئی۔

ایک دن لالہ جی نے منگروا کو کسی کام سے ایک گاؤں پر بھیج دیا۔ خیال تھا کہ وہ آج واپس نہ ہوگا۔ شام کو سیر کرتے ہوئے وہ منگروا کے گھر پر جا پہونچے، جودھا اُن کی ہمراہی میں تھا۔ سندریا ایک طرف بیٹھی چاول بین رہی تھی۔ لالہ جی کو دیکھتے ہی اُس نے گھونگھٹ کر لیا اور کھڑی ہو گئی۔

جودھا نے کہا: "واہ بھوجی، بھلا مالک سے بھی کوئی پردہ کرتا ہے!"

سندریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کُریدنے لگی۔

تھوڑی دیر انتظار کر کے لالہ جی خود بولے "منگروا کیا ابھی واپس نہیں آیا؟"

سندریا اب بھی خاموش تھی۔ جودھا نے کہا "بھوجی، تم نے بھی شرم کی حد کر دی۔ مالک جو کچھ پوچھتے ہیں اس کا جواب کیوں نہیں دیتیں۔"

سندریا نے شرما کر جواب دیا "وہ ابھن (ابھی) نہیں آئے!"

لالہ جی سوچنے لگے واہ کتنی پیاری آواز ہے، اس آواز میں کتنی مٹھاس ہے۔ سندریا سے وہ کس قسم کی باتیں کریں یہ اُنکی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔

تھوڑی دیر سوچ کر اُنہوں نے پوچھا "تم کو منگروا کوئی تکلیف تو نہیں دیتا؟"

سندریا نے اپنے دل میں سوچا مالک کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اُس نے کہا "مو کا بہت آرام ہے!"

اتنے میں پڑوس کی دو ایک اور عورتیں آ گئیں۔ اب زیادہ دیر تک ٹھہرنا مناسب نہ سمجھکر لالہ جی اپنے گھر واپس ہوئے۔

لالہ جی کے خلاف توقع دن ڈوبتے ہی منگروا اپنے گھر واپس آ گیا۔ سندریا نے لالہ جی کا آنا اور اُن کی سب باتیں بتا کر منگروا سے کہا "مو کا (مجھکو) تو مالک کی نیت کھراب (خراب) علوم ہوت ہے!"

منگروا نے ہنسکر کہا "پگلی کہیں کی۔ مالک ایسا دیوتا سروپ زمیندار تو ڈھونڈے سے نہیں مل سکتا ہے۔ ایسے مہاتما کی نیت کھراب نہیں ہو سکت۔ اب کہے تو کہے مدا (مگر) اب ایسی بات کبھو نہ کہے، اچھا؟"

منگروا نے اپنا ناریل اُٹھایا، چلم پر تھوڑا سا تمباکو جمایا اور سندریا کی طرف بڑھا کر کہا "اے چلم پر تنی (ذرا) آگ رکھدے۔ جس ہنڈیا (پیالہ) میں کھائے وہ ماں (اس میں) چھید کوؤ نا ہی کرت۔ (کوئی نہیں کرتا)، میں تو سمجھت رہوں کہ تو بڑی بدھمان (عقلمند) ہے۔ مدا آج معلوم بھیا (ہوا)

کر سو رکھ (نادان) ہے۔

سندریا نے سوچا کہ اگر اس وقت وہ کچھ بولی تو بات بڑھ جائیگی۔ وہ چپ چاپ ہو گئی۔

(۵)

لالہ جی کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ انہوں نے ایک کٹنی کے ذریعے سے سندریا کو دولت کے جال میں پھنسانا چاہا مگر سندریا نے کٹنی کو نہایت حقارت سے دھتکار دیا۔ لالہ جی کو حیرت تھی کہ آخر سندریا کس دل و دماغ کی عورت ہے جو انکے قبضہ میں نہیں آتی۔ انکے خیال میں امیروں ہی کے گھروں میں شرافت اور عزت کا نشان مل سکتا ہے۔ یہ عورتیں تو عصمت کے زیور سے مرصع ہوتی ہیں۔ غریب اچھوتوں میں یہ جنس عنقا ہے چاندی کے چند ٹکڑوں کے عوض میں ایک چمارن کی عصمت خریدی جاسکتی ہے لیکن لالہ جی کو شاید پہلی بار اسکے خلاف تجربہ ہوا۔ شریف خاندان میں پرورش پاکر بھی لالہ جی نے شریف دل نہ پایا۔ ورنہ ان کا یہ تجربہ انکو راہ راست پر لے آتا اور وہ ہمیشہ کیلئے اپنی کمینی حرکتوں سے باز آجاتے مگر انکا دل سیاہ ہوچکا تھا۔

سندریا اب اپنے گھر سے کبھی تنہا باہر نہ جاتی تھی اس نے کئی مرتبہ اپنے شوہر پر لالہ جی کے متعلق اپنے شک کا اظہار کیا لیکن منگرو کو یقین نہ آیا۔ اس پہ "پیاوہ گری" کا جادو چل گیا تھا۔

جبتک سندریا گھر سے تنہا باہر نکلتی تھی اس وقت تک لالہ جی اسکی طرف سے مایوس نہ ہوئے تھے لیکن جب انکو پتہ چلا کہ اب سندریا اکیلی گھر سے باہر نہیں نکلتی تو وہ اپنا مطلب نکالنے کیلئے مذہب کی آڑ میں شکار کھیلنے کو تیار ہو گئے۔ اب انہوں نے دھرم کا سہارا لیا اسی کی مدد سے انکے مشکل کام بنجاتے تھے چنانچہ گاؤں میں منادی کرادی گئی کہ لالہ جی کے یہاں ست نرائن کی کتھا ہوگی سب گاؤں والے ایسے شبھ کام میں ضرور شریک ہوں۔ اس کیلئے شہر سے ایک جٹادھاری پنڈت بھی بلائے گئے۔ منادی ہونے کے چوتھے دن رات کے وقت ایک عالیشان شامیانے کے نیچے پھول اور پتوں سے مزین تخت پر پنڈت جی نے خوش الحانی کے ساتھ ست نرائن کی کتھا شروع کی۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے عورت مرد سب کتھا میں شریک تھے۔

عورتوں کے مجمع میں سندریا ایک طرف بیٹھی تھی کہ اس سے ایک بوڑھی عورت نے چپکے سے کہا "اری جلدی چل منگرو اکی نہ جانے کیسی خراب حالت ہوگئی ہے وہ ادھر دالان میں بیہوش پڑا ہے"۔ شوہر کی محبت میں سندریا اپنی ساری ہوشیاری بھول گئی۔ وہ عورتوں کے مجمع سے نکلی اور اسی عورت کے ساتھ چلدی۔ سندریا کو کیا معلوم تھا کہ اسکو تباہ کرنے کے لئے فریب کا جال پھیلایا گیا ہے۔ اس کے شوہر کو شام ہی سے اتنی بھنگ پلا دی گئی ہے کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ بوڑھی عورت کے ساتھ تھوڑی دور چلکر سندریا ٹھٹکی۔ اسکو کچھ شک گذرا۔ اس نے کچھ پوچھنا ہی چاہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آکر اس کا منہ بند کر دیا اور تاریکی میں ایک طرف اٹھالے گیا۔

اسکے ایک گھنٹہ کے بعد جب ست نرائن کی کتھا میں گاؤں والوں کو بڑا لطف آرہا تھا سندریا چیختی ہوئی آئی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چہرہ غصہ کے مارے تمتا رہا تھا۔ اس نے چلا کر کہا "پنڈت جی دہائی ہے گاؤں والوں دہائی ہے لالہ جی نے میری عزت لے لی"۔ لالہ جی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے انکی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ انہوں نے جوش کھا کر حکم دیا "اس بدمعاش عورت کو باہر نکالدو۔ ایک تو مجھ پر جھوٹا الزام لگاتا اور اس پر دھارمک کام میں کتھا کے وقت شور و غل مچانا چاہتی ہے"۔ سندریا کو دھکے مار کر نکالدیا گیا۔ جاتے وقت اس نے دانت پیس کر کہا "پاپی میرا انصاف پرماتما کے یہاں ہوگا"۔ اتنا کہکر سندریا تاریکی میں غائب ہوگئی۔ پھر اس کا کہیں پتہ ہی نہ چلا۔ دوسرے دن جب منگرو چمار سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے لالہ جی نے سندریا کی بدمعاشی اور اسکی فراری کا ذکر کیا تو منگرو نے کہا "مالک! بہت اچھا ہوا جو ایسی بدمعاش عورت سے چھٹکارا ملا۔ چمار نیوگی کی نہیں میں دوسری شادی کرلیتا ہوں"۔ ناکردہ گناہ بدنام ہوئی لیکن لالہ جی کے گناہ پر ایسا پردہ پڑا تھا کسی کو اصلیت کا پتہ ہی نہ چل سکا اور اگر کسی کو حقیقت معلوم

پوشیدہ

از افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش

ایک بیرزمین گیر اپنی ڈائری میں سے یہ چند اوراق پیش کرتا ہے۔ مدتِ مدید کا دکھڑا ہے۔ جوانی دیوانی کے مٹے مٹائے نقش ہیں جو اب بھی کبھی کبھی اُبھر آتے ہیں۔

میں عالمِ رنگ و بو کا سیار۔ مدت ہوئی ایک دفعہ پُرنیا (بنگال) کے ایک باغ میں اکیلا رہا کرتا تھا۔ اُن دنوں صرف ایک رفیق میرے ساتھ تھا۔ وہ بھی حُسنِ اتفاق سے بیمار ہو کر اپنے وطن چلا گیا۔ اب میں بالکل تنہا رہ گیا۔ طرح طرح کے آموں سے لدا ہوا ایک باغ۔ پھونس کا بنگلہ۔ ایک باورچی۔ دو چپڑاسی۔ ایک بندوق اور میں۔ ریاست کا منیجر ایک بیرسٹر تھا جو میری خفیہ نگارش کے خوف سے کبھی کبھی میرے دل بہلانے کو میرے پاس آتا رہتا تھا۔ بس اور کوئی نہ یار تھا نہ آشنا نہ ملاقاتی۔

میں اپنی اس ویرانہ تنہائی پر روتا رہتا تھا اور بار بار یہاں سے بھی رسیاں تڑا کر بھاگ جانے کی فکر میں تھا ——— میں بھولا! میں بھولا! ہاں میرا مونس میرا ہمدرد صرف ایک ناگیسر کا پُربہار درخت تھا جس کے نیچے بیٹھ کر میں اکثر اوقات تنہائی میں اپنی حالتِ زار پر آنسو بہایا کرتا تھا۔ یہ درخت جب پھولتا اُس وقت تو یہ دور تک اپنی خوشبو سے کھلے میدانوں کو معطر کرتا تھا۔ مگر سادے دنوں میں بھی اسکی گھنیری چھاؤں اور سرسبز پتے مجھے بہت ہی فرحت دیتے تھے۔

ایکدن شاموں شام تک اُسی ناگیسر کے درخت کے نیچے بہت ہی بیقرار ہو ہو کر روتا رہا اور آخر وہاں سے اسوقت آنسو پونچھکر اُٹھا جب ایک زبردست ہاتھ نے میرے شانے پر گر کر مجھے چونکا دیا۔

"ہیں! کیا تم رو رہے ہو؟ بھئی واہ۔ تم تو بڑے بزدل نکلے۔ ذرا سی تنہائی پر اتنا گھبراتے ہو؟ چلو میرے ساتھ تمہیں سیر کرا لاؤں۔" بیرسٹر صاحب نے مجھے اُٹھاتے ہوئے یہ الفاظ ادا کئے۔ کمرے میں جا کر میں نے کپڑے پہنے اور کر و فر تمام اُنہیں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھکر قصبے کی سیر کو چل نکلا ———

یہ قصبہ ایک کالا پانی تھا۔ نہ بلڈنگ نہ عمارت۔ نہ ہاٹ نہ بازار۔ بس ایک لمبا لہکارا بانسوں سے ڈھکا ہوا اُجاڑ بھیانک سا گاؤں جس میں کبھی کوئی دلچسپی کسی کو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

بیرسٹر: کیا ہے جی۔ اس طرح تو تم کسی دن روتے روتے اپنی جان ہی دیدوگے اور ہمیں خواہ مخواہ اسٹیٹ کو لکھنا پڑے گا کہ وہ شخص عالمِ تنہائی کی نظر ہو گیا ——— "

میں: بھئی پھر کیا کروں۔ کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا۔ ہمجنس کی آواز تک نہیں سُنائی دیتی۔ یہ باغ یہ نعمتیں۔ یہ پھول پھلواریاں اور چمن در چمن میری نظر میں سب خاک ہیں۔ جب اُن کا لطف اُٹھانے والا کوئی میرا ساتھی نہ ہو۔ آپ خیال تو کریں اسی تنہائی کی وجہ سے جناب آدمؑ باوجود اولوالعزم پیغمبر ہونیکے کسقدر گھبرا گئے تھے اور آخر انہیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی پڑی کہ بغیر ایک ہمجنس کے میں زندہ نہیں رہ سکتا۔"

بیرسٹر: خوب! تو اب آپکے لئے ریاست کو ایک ہمنشیں بھی مہیا کرنا چاہیئے۔ عقل کے ناخن لو بھائی۔"

میں: خیر بھئی جی ہے تو جہان ہے۔ اگر مجھے اسی طرح سُکھا سُکھا کر گھلا گھلا کر مار ڈالنا ہے تو یہ بات ہی دوسری ہے ورنہ بغیر دوسرا ہمدم کے اب

میں یہاں کھڑا پانی نہیں پی سکتا۔ ۔ ۔ "

بیرسٹر: "اچھا چلو ہم آپ کو اسی قصبے میں سے ایک دل خوش کن ندیم تلاش کر دیتے ہیں۔"

غرض ہم دونوں آپس میں یہ باتیں کرتے ہوئے گاڑی میں چلے ہی جا رہے تھے جو یکایک قصبے کا بازار تمام ہوگیا اور آخری حصہ میں ایک ٹین کی چھت کے نیچے ایک حیرت انگیز حسین صورت مجسم استادہ نظر آئی۔ منیجر نے معاً مجھے ٹہوکا دیا اور پیچھے مڑ کر اپنے تحصیلدار سے کہا: "دیکھو جی ان سے کہو آج آپ کی دعوت ہے، اور انہیں گاڑی میں بٹھا کر اوصاف باغ میں آٹھ بجتے بجتے پہنچا دو۔" تحصیلدار سیدھا گاڑی سے اتر گیا۔ اور ہم لوگ خوش خوش اس نعمت غیر مترقبہ کے تذکرے کرتے ہوئے پھر واپس اوصاف باغ آ گئے۔

بنگلے کے برآمدے میں آرام چوکیاں بچھ گئیں تھیں۔ میز پر بجلی کا لیمپ جل رہا تھا۔ تازہ تازہ آم اور اکل و شرب کا سامان مہیا تھا۔ پھولوں کے گلدستے سجے ہوئے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ادھر اُدھر کے ذکر اذکار ہوتے رہے۔ آج میرے باورچی نے ایک نئی قسم کی مچھلی کباب کی تھی۔ اسکی بھی ٹھنگیہ ساتھ کے ساتھ ہوتی جاتی تھی کہ یکایک اوصاف باغ کا پھاٹک کھلا اور ایک بند گاڑی جسے وہاں شمنی کہتے ہیں اور ہم منجھولی بیل گاڑی داخل ہوئی۔ وہی تحصیلدار آگے آگے اکڑا ہوا پڑا۔ اور گاڑی بنگلے کے سامنے آکر رکی۔ میں نے دوڑ کر ایک سرو نو خاستہ کو ہاتھ کا سہارا دے کر گاڑی سے اتار لیا۔

وہ بالکل رام قطعی بے تکلف غنچے کی طرح ہنستی مسکراتی شاداب گل کی طرح مہکتی چہکتی برآمدے میں چڑھ آئی اور جب میز کے سامنے ایک کرسی کھینچکر اسے بٹھایا تو بجلی کی روشنی میں وہ بلا مبالغہ ایک چینی کی مورت تھی یا سنگ مرمر کی ایک تصویر تھی جس کے اعضا کو نہایت چابکدست کاریگر نے بے مثل تراشا تھا۔

آنے والے نئے مہمان نے میز پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے جو کلمات مجھ سے کہے وہ غریب منیجر کے لئے قطعی دل شکن تھے یعنی بس اب انہیں کہئے کہ یہ اپنے گھر جائیں۔ منیجر نے مسکراتے ہوئے اسی وقت کرسی چھوڑ دی۔ گو سنکر مجھے اس قسم کی بے تکلفی سے کچھ جھینپنا بھی پڑا۔ مگر وہ خدا کے بندے فوراً اپنا بید اٹھا کر "اچھا صاحب اچھا" کہتے ہوئے چلے گئے۔

میں: "آپ تو بہت صاف اردو بولتی ہیں اور بہت ہی بیباک ہیں خیر سے۔"

مہمان: "کیا آپ سے بھی بڑھکر؟"

میں: "میں تو کیا۔ مگر آپ کو منیجر صاحب سے اتنی بے رخی نہیں کرنی چاہیئے تھی۔"

مہمان: "سبب؟ میں ان کا کوئی دیا کھاتی ہوں مطلب آپ سے ہے۔ اگر آپ نہیں چاہتے تو میں انہیں پھر بلا لوں۔"

میں: "(ڈر کر اپنی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے) "جی نہیں جی نہیں یہ میرا مقصد نہیں۔"

میں خود اپنی تقدیر پر اس قدر نازاں ہوں کہ ....

"ہو سکتا ہے۔" یہ کہتے ہی اس غیبی مخلوق نے بلا تکلف میز پر رکھے ہوئے گلاس کو خالی کیا اور رومال سے منہ پونچھکر دوسرا گلاس میری طرف تواضع کیا۔ میں نے شکریہ کیساتھ تعمیل کی۔ اب ہم گویا برسوں کے دوست تھے۔ آہ میں کہہ نہیں سکتا وہ رات کسقدر مختصر تھی۔ جب ہم لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو ۱۲ بج چکے تھے۔ میں انکا ہاتھ پکڑے ہوئے صحن چمن میں نکل آیا تھا۔

ماہ دو ہفتہ پورے شباب پر تھا۔ باغ کے پھول۔ سبزہ۔ بیلیں اور تمام باغ کا چپہ چپہ مجھے اتنا حسین معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پہلے

میں نے اُسے کبھی ایسا نہیں دیکھا تھا۔ ہم ایک ایک روش پر سو سو بار ٹہلتے رہے یہاں تک کہ شدہ شدہ میرا مہمان مجھے کھینچکر اُسی میرے پرانے رفیق ناگیسر کے درخت کے نیچے لے گیا۔

مہمان: "کیوں جناب، آپ یہاں بہت بیٹھا کرتے ہیں؟"

میں۔ (چونک کر) "ہاں اکثر"

مہمان: "مگر آپ اس قدر بیتاب ہو کر کیوں رویا کرتے ہیں؟" میرا اضطراب اور توہم بڑھنے کو تھا جو یہ فقرہ فوراً ہی شامل کیا گیا "نہیں نہیں آپکے آدمیوں نے مجھ سے کہا کہ آپ یہاں پر تنہائی سے بہت پریشان ہیں۔ اکثر روتے رہتے ہیں"

میں: "ہاں بیشک، آپنے درست فرمایا۔ میری ایسی ہی حالت تھی مگر اُس خدا کا شکر ہے کہ آج وہی کنج تنہائی ایک ایسی حورِ بہشتی کی تشریف آوری سے بہشتِ عنبر سرشت کا دھوکا دے رہا ہے۔ خدا آپ کا بھلا کرے"

مہمان: "خدا آپ کا بھی بھلا کرے جس نے اتنے دن یہاں رو رو کر رحمتِ الٰہی کو جوش زن کر دیا اور ہم کو آپ کی دلداری کرنی پڑی" قریب تھا جو اِس فقرے سے میں بھونچکا ہو جاؤں مگر فوراً ہی دوسرا فقرہ شامل کر دیا گیا ـــ "بات یہ ہے کہ آپ جیسے آدمیوں کی باتیں شہر میں جا بجا مشہور ہو جاتی ہیں۔ میں بھی یہاں تازہ وارد تھی اس لئے مجھے بھی معلوم ہو گیا"

آغا شاعر

عورت کی فریاد

(۱)

شیشم کے درخت چیخ رہے تھے۔
بادل، بکھری ہوئی فوج کی طرح ایک جگہ مجتمع ہونا چاہ رہے تھے،
سمندر کے ویران ساحل پر ایک عورت بیٹھی تھی،
پانی کی لہریں سنگین چٹانوں پر اپنا سر ٹپک رہی تھیں
رات کی محشر خیز تاریکی میں یہی پُر درد آواز سُنائی دے رہی تھی
صاف، فرشتہ موت کے خوفناک پیام کی طرح صاف،

(۲)

"میرے محبوب! دُنیا کتنی دلفگار ہے تیرے بغیر
اُمید ختم ہو جانے کے بعد مجھے وہ شے ہی کیا سکتی ہے؟
خُدا مجھے اپنے پاس بلالے میں اپنا فرض ادا کر چکی ہوں
انسان کا دُنیا میں اور کام ہی کیا ہے؟ "حیات" اور "محبت"!

(۳)

"میری بچی! تیرے آنسو بیکار ضائع ہو رہے ہیں،
موت کی ابدی نیند کے ماتے کو کوئی آواز جگا نہیں سکتی،
تجھے کون سی چیز تشفی دے سکتی ہے؟ مجھ سے کہہ
تیری آرزوئیں پوری کرونگا۔ تیرا آقا در مطلق"

(۴)

"میرے آنسوؤں کو بیکار ہی بہنے دے اے مالک!
گو میری فریاد مردہ کو جگا نہیں سکتی۔
لیکن محبت زدہ دل کی تشفی کے لئے دو ہی چیزیں ہیں
آنسو۔ اور گذشتہ محبت کی رُوح فرسا یاد"

شمسی سکروی

تفسیر حیات

از جناب ایم۔ اسلم

ہرمز ایک دیہاتی سکول میں مدرس تھا۔ کوئی چوبیس پچیس کے درمیان عمر تھی۔ بہت ہنسکھ اور شریف طبیعت آدمی تھا۔ ہرمز جی کی بیوی رتن ایک سروقد حسینہ تھی۔ ہلکی سانولی رنگت۔ بڑے دلکش خدوخال اور لیلائے شب کو شرما دینے والے سیاہ اور تار سنبل سے باریک بال تھے۔ اُمیں بیس کے قریب سن و سال تھا اور گود میں چار پانچ ماہ کا بچہ تھا جس کا نام سہراب تھا۔ دونوں میں بہت محبت تھی اور خوب مزے سے بسر ہو رہی تھی۔ شام کے وقت دونوں میاں بیوی کھیتوں کی طرف نکل جاتے اور مناظر قدرت سے لطف اندوز ہوتے۔ لیکن میاں بیوی کے یہ ڈھنگ ساس کو ایک آنکھ نہ بھاتے۔ ہرمز جی کی ماں ایک پرانے خیال کی بوڑھی عورت تھی۔ اس لئے ساس بہو میں اکثر بے لطفی سی رہتی۔ رتن بامذاق، شوخ اور چنچل۔ ساس غصیلی اور متلون مزاج۔ ہرمز خوش باش۔ تینوں اپنے اپنے اصول پر گامزن تھے۔ وقت کٹتا چلا جا رہا تھا۔

ایسٹر کے ایام میں محکمہ تعلیم کی سینما گاڑی اس قصبے میں آئی۔ جب تک گاڑی قصبے میں رہی ہرمز بیوی کو ہر روز لے جاتا۔ ایک روز بمبئی کی فلم دکھائی گئی۔ رتن نے اسی روز سے بمبئی دیکھنے کی رٹ لگا دی۔ جانے عورت کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ اگر اُسے کوئی چیز ایک بار پسند آ جائے تو جب تک وہ اُسے حاصل نہ کر لے اُسے قرار نہیں آتا۔ اس بمبئی دیکھنے کے شوق نے کچھ یہاں تک زور پکڑا کہ رتن شوہر سے بھی گاہے گاہے کشیدہ رہنے لگی۔ اور ساس سے بھی دن بھر میں دو ایک بار تو تو مَیں مَیں ہو جاتی۔ اور وہ جو ہر شام سیر کو جانے کا ایک قاعدہ باندھ رکھا تھا اب اس میں بھی ناغہ ہونے لگی ہاں! جب ننھے سہراب کے کھٹولے کے پاس دونوں بیٹھے تھے۔ ایک طرف رتن تھی ایک طرف ہرمز۔ بچہ کھٹولے میں پڑا کچھ اوں غاوں کر رہا تھا۔ رتن بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ ہرمز کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ کبھی بچے کی طرف دیکھکر مسکرا لیتے لگتا۔ دفعتاً رتن بہت سُریلی آواز میں ہوئے ہوئے گانے لگی ؎

خدا نے دلبند دیا ہے ہم کو ہماری آنکھوں کا ہے یہ تارا

ہرمز نے کتاب چھوڑ کر اور بیوی کی طرف دیکھکر کہا ؎

ہم اسکی خاطر سے جی رہے ہیں اسی کا ہم کو ہے اب سہارا

رتن نے مسکرا کر شوہر کی طرف دیکھا اور کہا ؎

ہے مرے دل کو سرور اس سے ہے مری آنکھوں کو نور اس سے
بلا ہے اسکی دور اس سے ہے جان و دل سے بھی یہ پیارا

ہرمز نے کھٹولے پر سے ہاتھ بڑھا کر بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور کہا ؎

میری اُمیدوں کی اس سے دنیا رہے گی آباد اب ہمیشہ
ہو فکر کیسی کہاں کا خدشہ جوان ہوگا مرا دل آرا

اور رتن نے سہراب کو جھولاتے کر کہا ؎

مرے چمن کو بہار اس سے ہے میرے دل کو قرار اس سے
ہے زندگی کا شرار اس سے یہ سروِ گلزار ہے ہمارا

پھر دونوں مل کر بولے ؎

خدا نے دلپسند دیا ہے ہم کو ہماری آنکھوں کا ہے یہ تارا

ساتھ ہی باہر سے آواز آئی: "ہرمز جی ہیں؟"

"کون ہے بھائی؟" ہرمز نے پوچھا۔

"خوب!" باہر والا بولا۔ "اب پہچانتے بھی نہیں!"

"اندر آ جاؤ نا!" ہرمز نے اندر سے ہی جواب دیا۔

ایک جوان آدمی انگریزی لباس پہنے چلمن اُٹھا کر اندر آیا۔ یہ ہرمز کا دوست بنی تھا۔ دونوں بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ملے۔ ہرمز نے رتن سے تعارف کرایا۔ بنی نے جھک کر سہراب کی پیشانی چوم لی اور پانچ رُپے کا نوٹ اسکے ننھے سے ہاتھ پر رکھدیا۔

"آج ہم کیسے یاد آ گئے" ہرمز نے ہنسکر پوچھا۔

"بمبئی!" بینی نے بھی ہنسکر کہا۔ "انسان جیتے جی مل ہی بیٹھتا ہے"

"کاروبار کا کیا حال ہے؟"

"گذر ہوئی چلی جاتی ہے"

رتن بولی "آپ بمبئی رہتے ہیں؟"

"جی ہاں"

"بمبئی تو بہت بڑا شہر ہوگا؟" رتن نے پوچھا۔

"کچھ پوچھئے نہیں" بینی نے کہا۔ پھر رتن کی طرف دیکھکر "تو کیا آپنے ابھی تک بمبئی کی سیر نہیں کی؟"

"بمبئی" ہرمز بولا "اب کے درگا پوجا کے دنوں میں چلنے کا ارادہ تو ہے"

دوسرے کمرے سے ہرمز کی ماں آ گئی۔ اور بینی کو دیکھکر بولی۔

"اچھے تو ہو۔ بہت دنوں بعد دیکھا تمہیں"

"آپ کی دعا ہے!" بینی بولا۔

"رتن!" ساس نے بہو کی طرف دیکھکر کہا "میں بازار جاتی ہوں تو ذرا باورچی خانے میں چل بیٹھ!"

"چلو آتی ہوں" رتن نے بے رخی سے جواب دیا۔

بڑھیا سہراب کے گدگدی کرنے لگی۔ پھر بولی "اٹھو نا پھر!"

"کہا جو آتی ہوں!" رتن بولی "باورچی خانہ کہیں بھاگا تھوڑا جاتا ہے"

"بھاگا تو نہیں جاتا" ساس نے جواب دیا "لیکن تجھے مردوں کی باتوں سے کیا سروکار؟" اتنا کہکر بڑھیا بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

بینی کو ہرمز کے ہاں مہمان ہوئے کئی روز ہو چکے تھے۔ شام ہوتے ہی تینوں گھر سے سیر کو نکل جاتے۔ جب سے بینی آیا تھا ساس اور بہو میں کچھ زیادہ چشمک ہونے لگی تھی۔ ہرمز تو سارا دن سکول رہتا اور رتن اپنے شوہر کے مہمان کی خاطر و مدارات میں لگی رہتی۔ ہرمز کی ماں کو رتن کا آٹھوں پہر بینی کے پاس بیٹھے رہنا ناگوار تو گذرتا لیکن اُس کی سُنتا ہی کون تھا۔

ایک روز بڑھیا کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ رتن اور بینی برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں بینی نے پوچھا "آپ اِس زندگی کو زیادہ پسند کرتی ہیں یا جو اس سے پہلے گذر چکی!"

"یہ تو محض واقعات پر منحصر ہے!" رتن مسکرا کر بولی "اگر کسی آسودہ گھرانے کی لڑکی کی سسرال غریب ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے کنوارپنے کی زندگی کو زیادہ پسند کرے گی اور جو کوئی غریب ماں باپ کی لڑکی کسی امیر گھرانے میں آ جائے تو یقیناً وہ ازدواجی زندگی کو زیادہ پسند کرے گی"

"معاف فرمایئے!" بینی بولا "میں دولت اور ثروت کے نقطۂ نظر سے نہیں پوچھتا"

"تو پھر یہ طبیعت پر منحصر ہے" رتن نے جواب دیا "کوئی آزاد رہنا زیادہ پسند کرتی ہے اور کوئی گھر کے جھمیلوں کو ہی زندگی سمجھتی ہے"

"ٹھیک ہے!" بینی نے مسکرا کر کہا "لیکن میں تو آپ کی بات پوچھ رہا ہوں"

"میں جس حال میں بھی ہوں خوش ہوں" رتن بولی "ہرمز جی کی تنخواہ گو کچھ زیادہ نہیں پھر بھی آرام سے گذر ہو رہی ہے"

"تو گویا!" بینی نے رتن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ قانع بھی ہیں اور خوش بھی"

"تو اور کیا!" رتن نے ہنسکر کہا۔

"معاف فرمایئے!" بینی بولا "لیکن کل تک تو آپ کا کچھ اور ہی خیال تھا"

"کیا؟" رتن نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"اپنے دل سے پوچھئے" بینی بولا "میں کیا عرض کروں"

"مجھے تو کچھ یاد نہیں پڑتا" رتن نے ایک اندازِ جانانہ سے سر کو جنبش دے کر کہا "شاید ہرمزجی کے خلاف کوئی کلمہ میرے منہ سے نکل گیا ہو تو کہہ نہیں سکتی۔"

"کوئی کلمہ؟" بینی بولا "یا شکووں کا دفتر اور شکایتوں کا طومار؟"

"ہرگز نہیں" رتن نے ذرا سنجیدگی سے جواب دیا "ممکن ہے آپ کو سمجھنے میں کچھ غلطی ہوئی ہو۔"

"جو کچھ آپ سمجھ لیں" بینی نے کہا "خیر!"

"نہیں" رتن بولی "آپ کچھ بتلائیں تو سہی کیا کہا تھا میں نے؟"

"صرف اتنا ہی" بینی نے رتن کے چہرے پر نظریں جما کر جواب دیا "کہ آپ کو گاؤں کی زندگی پسند نہیں۔"

رتن یہ سنکر ہنسنے لگی پھر بولی "سمجھ گئی! آپ مردوں کے یہاں سچی بات کو شکوہ اور شکایت قرار دیا جاتا ہے۔"

"جی ہاں!" بینی بولا "اور وہ ہرمز کی سردمہریوں کا شکوہ؟ اور بمبئی کی سیر اور ہرمزجی کی ٹال مٹول۔ اور پھر ساس سے روز روز کا جھگڑا؟"

رتن نے یہ سنکر سر جھکا لیا پھر کہنے لگی "گھروں میں اس قسم کی باتیں ہوا ہی کرتی ہیں۔"

"ہرمزجی آپ کو بمبئی کیوں دکھلا نہیں لاتے" بینی نے پوچھا۔

"روپیہ ہو تو جائیں بھی" رتن نے جواب دیا "گھر کا خرچ چل جانا ہی بڑی بات ہے۔"

"ٹھیک ہے" بینی بولا "مدرسی بھی کوئی ملازمت ہے۔ مدرس غریب تو کولہو کا بیل ہوتا ہے جنگی پیسو روٹی کھاؤ والی بات ہے۔ مدرس اچھا شوہر تو ہو سکتا ہے لیکن ہر عورت میں مدرس کی بیوی بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔"

"صلاحیت؟" رتن نے بینی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!" بینی نے ہاں کو ذرا لمبا کر کے کہا "بیشک صلاحیت لیکن میں اس کے ساتھ آپ کے ایثار کی داد دیتا ہوں کیونکہ قدرت کا یہ ہرگز منشا نہیں تھا کہ آپ جیسی عورت ایک مدرس کی رفیقِ حیات بنے۔ میرے خیال میں ہرمز ایک خوش قسمت آدمی ہے جسے آپ جیسی رفیقِ زندگی ملی۔"

رتن ہنسنے لگی پھر بولی "خیر آپ کا دوست خوش قسمت تو ہے لیکن میں؟"

"میں تو عرض کر چکا کہ آپ کا ایثار قابلِ داد ہے۔"

"ایثار کو رہنے دیجیے" رتن نے کہا "ایثار کی کون قدر کرتا ہے۔ آپ مجھے یہ بتلائیں کہ مجھ میں وہ کونسی بات ہے جو ایک مدرس کی بیوی میں نہیں ہونی چاہیے۔"

"کہہ دوں" بینی نے مسکراتے ہوئے کہا "سنیئے! شوخی، شرارت، زندہ دلی اور..... خیر یہ شکل و صورت....."

رتن ذرا جھینپ سی گئی پھر ہنسکر بولی "گویا مجھ میں اتنے عیوب ہیں۔"

"معاف فرمائیے!" بینی نے کہا "آپ جن چیزوں کو عیوب قرار دیتی ہیں حقیقت میں انہی چیزوں کا نام زندگی ہے۔ ہاں! یہ اور بات ہے کہ آپ کے یہ اوصاف پانی کی اس نازک لہر کی طرح ہیں جو سینۂ آب پر ابھرتی ہے۔ اور سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہے۔"

یہ سنکر رتن نے پھر ایک بار ایک ادائے جانانہ سے سر ہلایا اور کہا "لیکن کبھی کبھی یہی نازک لہریں طوفان بھی تو برپا کر دیتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے!" بینی بولا "لیکن نتیجہ؟"

"جو طوفان کا نتیجہ ہوا کرتا ہے" رتن نے کہا۔

"بالکل ٹھیک!" بینی نے جواب دیا "سنیئے! ایک شریف عورت کے جذبات کو جب ٹھیس لگتی ہے تو اس کے سینے کے اندر غم اور غصے سے ایک تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنی فطری کمزوری کے باعث وہ حسرت اور یاس کے گرداب میں پھنسکر کچھ اس طرح ڈوبتی ہے کہ پھر ابھرنا نصیب نہیں ہوتا! اور وہی طوفان خود اسکی بربادی کا سامان

بن جاتا ہے۔ آپ کی باتوں سے میں نے اتنا تو معلوم کر لیا ہے کہ ٹھیس تو آپ کے جذبات کو بھی لگ چکی ہے۔ لیکن ابھی کچھ بگڑا نہیں۔ آپ چاہیں تو تدارک بھی ہو سکتا ہے۔"

یہ سنکر رتن نے سر جھکا لیا۔ لیکن اچانک ایک قہقہہ لگا کر کہا "تو بقول آپ کے میری سرشت میں شوخی بھی ہے اور شرارت بھی۔ اور ایک مدرس کی بیوی میں یہ باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ اب فرمائیے کہ ایسی عورت کو کونسی راہ اختیار کرنی چاہیے؟"

"راہ؟" بینی نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا "وہ راہ جو ایک آزاد چڑیا اختیار کرتی ہے۔ جس شاخ پر جی چاہا جا بیٹھی۔ جو چمن پسند آیا وہیں نشیمن بنا لیا۔ جو پھول من کو بھایا وہی توڑ لیا۔ اپنی نیند سونا اپنی نیند اٹھنا۔"

"عورت کیلئے یہ سخت کٹھن ہے۔" رتن نے یہ الفاظ ایک لمبا سانس لیکر کہے۔

"سچ ہے!" بینی بولا "بیل کو جس راہ لگاؤ غریب لگ ہی جاتا ہے۔"

"لیکن ہرمز کو تو مجھ سے کچھ شکایت نہ ہوگی؟"

"ایک اجنبی میاں بیوی کے تعلقات کو کیا جانے" بینی کہنے لگا "نہ میں ہرمز کا رازدار اور نہ آپ کا مشیر لیکن میرا خیال ہے کہ ہرمز اپنی جلد بازی پر کچھ متاسف ضرور ہے۔"

"کیا مطلب؟" رتن نے اسکی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیسی جلد بازی؟"

"اس کا خیال ہے" بینی نے کچھ بے اعتنائی سے کہا "کہ اسے شادی سوچ سمجھ کر کرنی چاہیے تھی۔"

"ٹھیک ہے!" رتن نے ایک آہ بھر کر کہا "مجھے خود اسی قسم کا خیال ہو رہا ہے۔ کاش! سہراب پیدا نہ ہوا ہوتا۔"

"کیا مطلب؟" اب بینی نے رتن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سہراب نہ ہوتا" رتن بولی "تو ہرمز آزاد تھا۔"

بینی یہ سنکر مسکرایا اور سر ہلا کر کہنے لگا "دیکھا! یہی عورت کی فطرتی کمزوری ہے۔"

"کمزوری نہیں" رتن نے جواب دیا "بلکہ مجبوری کہیے۔ میرے پاؤں میں جو زنجیر پڑ چکی ہے اس کا کاٹنا میرے بس کی بات نہیں۔"

"محض عورت کا خیال ہے" بینی نے ہنسکر کہا۔ ع

جو ہو ذوقِ نظر پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں!

اتنے میں رتن کی ساس آ گئی اور وہ کام کاج میں مصروف ہو گئی۔

بینی کی باتوں نے رتن کے دل میں جذبات کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ ہرمز غریب کو تو شکایت ہو یا نہ ہو لیکن رتن کو اب قسمت سے ضرور شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ کیوں ایک مدرس کے پلے پڑی۔ اب گھر کے کام کاج میں اس کا مطلق دل نہ لگتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس گھر سے ہی اس کا دل اچاٹ ہو گیا ہے۔ بینی بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا جو بار بار اس قسم کی باتوں سے رتن کے کان بھرتا۔ وہ دیکھتا تھا کہ اسکی باتوں کا سم اس بھولی بھالی عورت کے رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے۔ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کا تیر کبھی خطا نہ ہو گا۔

ایک روز جو ہرمز مدرسے سے واپس آیا تو باتوں باتوں میں بینی کہنے لگا "لو بھئی! کل میں واپس جاؤنگا۔"

"اتنی بھی کیا جلدی ہے" ہرمز بولا "ابھی دس پانچ روز تو اور ٹھیرو۔"

"تمہاری طرح میری کوئی نوکری تو ہے نہیں" بینی نے مسکرا کر جواب دیا "جو ماہ بماہ لگی بندھی رقم مل جائے۔ مزدور ہاتھ پاؤں ہلائے تو کچھ ملتا ہے۔"

ہرمز دن بھر کے کام کاج سے تھکا ہوا تھا چارپائی پر لیٹ گیا۔ بینی بولا "آج سیر کرنے نہیں چلوگے؟"

"مجھے تو آج معاف ہی رکھو" ہرمز نے ایک جمائی لیکر کہا۔ "تم گھوم آؤ۔"

"اکیلے ہی؟" بینی بولا۔

"اکیلے کیوں؟" ہرمز نے کہا۔ "رتن بھی ساتھ جائیگی۔"

اتنے میں برابر والے کمرے سے رتن بھی آگئی اور شوہر کے پاس بیٹھکر بولی: "یہ میرا کیا ذکر ہو رہا تھا؟"

"میں کہہ رہا تھا کہ تم بینی کے ساتھ جاکر سیر کر آؤ" ہرمز نے جواب دیا۔

"اور تم نہیں چلوگے؟" رتن نے پوچھا۔

"میرے سر میں کچھ درد ہے" ہرمز بولا۔

کچھ دیر بعد رتن اور بینی دونوں سیر کو نکلے اور ٹہلتے ٹہلتے کھیتوں کے پاس جا پہونچے۔ لیکن رستہ بھر دونوں خاموش رہے۔ آخر بینی نے ہی اس مہر سکوت کو توڑا۔ "تو پھر درگا پوجا پر تو آپ ضرور بمبئی تشریف لائینگی نا؟"

"ہرمز جی کی مرضی پر ہے" رتن بولی۔

"وہ تو مجھ سے کئی بار کہہ چکا ہے" بینی نے کہا۔

"قسمت کی بات ہے" رتن بچے کا بب درست کرتے ہوئے بولی۔

"قسمت کیسے؟" بینی نے پوچھا۔

"تو اور کیا؟" رتن نے کہا۔

"ارادہ اور ہمت سے بھی سب کچھ ہو سکتا ہے" بینی بولا۔

"اس بچے کا خیال ہے" رتن نے ذرا افسردگی سے جواب دیا۔

"آپ اسے دودھ تو نہیں پلاتیں" بینی نے پوچھا۔

"گائے کا دودھ پلاتی ہوں" رتن بولی "میرے دودھ کہاں!"

"اور رہتا بھی تو زیادہ تر دادی ماں کے پاس ہی ہے" بینی نے کہا۔

"ہاں!" رتن بولی "وہی لئے لئے پھرتی ہیں"

"تو فکر کیسی؟" بینی بولا "ہاں اگر نسوانی کمزوری غالب آجائے تو اور بات ہے"

کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے دونوں واپس لوٹے لیکن دونوں خاموش تھے۔ جب گھر کے قریب پہونچے تو رتن نے پوچھا "آپ کس وقت جائیں گے؟"

"آٹھ بجے جو بس چلتی ہے اسی میں جانے کا ارادہ ہے" بینی نے جواب دیا۔

"لیکن ایک شام کے قریب بھی تو چلتی ہے" رتن بولی۔

"ہاں چلتی تو ہے" بینی نے فوراً کہا "آپ کے لئے یہی ٹھیک رہے گی۔ اسی میں سوار ہو کر آجائیے۔ میں اسٹیشن پر منتظر رہونگا"

* * *

رتن کو بینی کے ساتھ بمبئی آئے کئی روز ہو چکے تھے۔ گو بمبئی کی دلچسپیوں نے رتن کو مسحور کر رکھا تھا تاہم بچے کی یاد اسے بیقرار کر دیتی۔ لیکن بینی باتوں باتوں میں ایسے سبز باغ دکھلاتا کہ سب حزن و ملال دور ہو جاتا۔ ایک روز دونوں کہیں سے سیر کرکے آ رہے تھے۔ بازار میں ایک جگہ لکڑی کے تختے پر مختلف پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک سرکس کا اشتہار بھی تھا۔ دونوں کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ اچانک رتن کی نگاہ ایک پوسٹر پر پڑی، یہ کسی اخبار کا اشتہار تھا۔ ایک جگہ موٹے موٹے حروف میں "سکول ماسٹر نے خودکشی کرلی" لکھا تھا۔ رتن کے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ دونوں وہاں سے ہٹ کر ایک سٹال پر آئے اور وہی اخبار مول لیکر پڑھنے لگے۔

"سکول ماسٹر نے خودکشی کرلی" یہ عنوان تھا۔ اس کے نیچے یہ عبارت تھی:۔

"ایک دیہاتی سکول کے مدرس ہرمز جی نے زہر پی کر خودکشی کرلی۔ کہا جاتا ہے کہ اسکی بیوی چھ سات ماہ کا بچہ چھوڑ کر کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ مزید حالات معلوم نہیں ہوئے۔"

جب دونوں گھر پہونچے تو رتن دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی لیکن بینی ایک قہقہہ لگا کر بولا "یہ اچھی رہی۔ خوش ہونے کی بجائے

تم تو رونے لگیں۔"

"خوش؟"

"تو اور کیا؟" بینی نے کہا۔ "قدرت نے خود ہی راستہ صاف کر دیا ہے۔ اب کوئی چیز سدِ راہ نہیں ہو سکتی۔ خیر! مجھے کاروبار کے سلسلہ میں رنگون جانا ہے، تیار ہو جاؤ۔"

اب بینی اور رتن رنگون میں تھے لیکن مداراتوں کی بجائے اب گھونسوں اور لاتوں سے رتن کی تواضع ہونے لگی تھی۔ بینی پرلے درجہ کا بدمعاش اور سیاہ باطن آدمی تھا۔ اور انسان کے روپ میں شیطان تھا۔ قمار بازی اس کا پیشہ تھا۔ اکثر پولیس سے بچنے کے لئے ادھر اُدھر بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ اور غریب ہرمزجی کے پاس بھی پولیس سے خائف ہو کر گیا تھا لیکن جب مطلع صاف ہوا تو دوست کی بیوی کو بھی اڑا لے گیا۔ رنگون میں اس کا گھر قمار بازوں کا مشہور اڈا تھا۔ اور اس گھر میں رتن کی حیثیت ایک داشتہ سے زیادہ نہ تھی۔ اب وہ پریشان تھی لیکن "خود کردہ را علاجے نیست" والا معاملہ تھا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ بینی بیمار پڑ گیا۔ جب بیماری نے طول کھینچا تو اُسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ رتن اب اُسکی ہسپتال میں تیمارداری کرنے لگی لیکن قدرت نے بھی بینی کی بے اعتدالیوں کا اس سے خوفناک انتقام لیا۔ اور اس نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہسپتال ہی میں جان دی۔ اب رتن آزاد تھی لیکن سر چھپانے کا آسرا بھی نہ تھا۔

ایک مدت ہسپتال میں رہ کر وہ نرس کے کام سے بخوبی واقف ہو چکی تھی چنانچہ دو ایک نرسوں کی سفارش سے اُسے ہسپتال میں ہی جگہ مل گئی اور رہنے کو ایک کوارٹر بھی ملا۔ رتن، ہرمز اور بینی دونوں کو بھول چکی تھی لیکن ایک سہراب کی یاد تھی کہ جو اُسے اکثر مضطرب اور بے قرار رکھتی۔ وہ دل میں سوچا کرتی کہ اب اس کا نورِ نظر جوان ہو گیا ہو گا اور شاید اُس نے شادی بھی کر لی ہو۔ آخر مامتا کے جوش نے اُسے اپنے بچے کو پھر ایک بار دیکھنے پر مجبور کر ہی دیا۔ اور رتن نے ملازمت چھوڑ کر وطن کی راہ لی۔

گاؤں کا نقشہ بدل چکا تھا بیس پچیس سال کے عرصے میں یہ گاؤں ایک چھوٹا سا شہر بن گیا تھا۔ پہلے ریلوے اسٹیشن پندرہ سولہ کوس کے فاصلہ پر تھا اور اب شہر سے ملحق تھا۔ جہاں چوبیس گھنٹے میں دو گاڑیاں آتیں اور دو جاتیں۔ شہر میں بجلی کی روشنی تھی۔ اور غلے کی منڈی۔ رتن ایک معمولی سے ہوٹل میں آکر مقیم ہوئی۔ دن کے وقت تو باہر نہ نکلتی لیکن شام ہوتے ہی بیٹے کی جستجو میں بازاروں میں گھومنے لگتی۔ مگر نہ تو اُسے اپنے گھر کا ہی نشان ملا اور نہ سہراب ہی نظر آیا۔ اور نہ ہی اُسے کسی سے کچھ پوچھنے کی جرأت ہوئی لیکن قدرت کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو وہ اُسکے اسباب خود ہی مہیا کر دیتی ہے۔ ایک روز جو وہ ہوٹل سے نکلی تو دروازے پر ایک بوڑھا فقیر کھڑا تھا۔ بوڑھے نے جھک کر اُسے سلام کیا اور خیرات کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ رتن نے اسکے ہاتھ پر ایک پیسہ رکھ دیا ساتھ ہی خیال آیا کہ اس نے اس آدمی کو کبھی پہلے بھی دیکھا ہے۔

"تم بھیک کیوں مانگتے ہو" رتن نے پوچھا۔

بوڑھا بولا "پیٹ جو پالنا ٹھہرا!"

"کب سے گداگری کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے؟" رتن نے پھر پوچھا۔

"مدت گذر گئی!"

"یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"جی ہاں!"

"پہلے کیا کام کرتے تھے؟"

"اسکول میں پانی بھرتا تھا!"

اب رتن کو یاد آیا کہ یہ وہی شخص ہے جسے ہرمز نے مدرسے کے گھڑے بھرنے کے لئے مقرر کر رکھا تھا لیکن بوڑھے نے اُسے پہچانا نہیں۔

"تو نوکری کیوں چھوڑی؟" رتن بولی۔

"نوکر رکھنے والا جو نہ رہا" بوڑھا بولا "تو نوکری کس کی کرتا؟"

"کس نے نوکر رکھا تھا تمہیں؟" رتن نے پوچھا۔ "اب کہاں گیا وہ"

"مر گیا بیچارا!" بوڑھے نے جواب دیا "بڑا نیک آدمی تھا۔ سہراب جی کو کون نہیں جانتا؟"

آج ایک مدت کے بعد شوہر کا نام سُنکر رتن کے دل پر ایک چرکا سا لگا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

بوڑھا پھر بولا "کسی کٹنی سے شادی کر لی تھی۔ کمبخت مالک کے دوست سے یارانہ گانٹھ کر بھاگ گئی۔ چھ سات ماہ کے معصوم بچے پر بھی ترس نہ آیا۔ ماسٹر جی نے اسی غم میں زہر کھا لیا۔"

"کیا نام تھا بیٹے کا؟" رتن نے پوچھا "وہ بھی تو یہیں رہتا ہوگا؟" رتن کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"جی ہاں!" بوڑھا بولا "سہراب جی کو کون نہیں جانتا۔ ریل بازار کے عقب میں اُن کا مکان ہے۔ کاروبار کرتے ہیں۔ اچھی ساکھ ہے۔"

رتن نے ایک اکنی اور بوڑھے کو دی اور وہ سلام کر کے چلتا ہوا۔

اگلے روز رتن نے اسی بازار میں ایک مکان کرایہ پر لے کر "نرس" کا بورڈ دروازے پر لگا دیا۔ قسمت سے مکان بھی بیٹے کے مکان کے عین سامنے ملا۔ گو دن بھر تو وہ گھر درست کرنے میں لگی رہی لیکن پھر بھی دس پانچ منٹ بعد کھڑکی میں کھڑی ہو کر سامنے والے مکان کی طرف دیکھنے لگتی۔ دو ایک بار ایک نوجوان مکان میں داخل ہوا بھی لیکن چونکہ رتن کی طرف اسکی پشت تھی اس لئے وہ اس کا چہرہ دیکھ نہ سکی۔

شام ہو چکی تھی۔ اور رتن بیٹے کے دیکھنے کی آس لگائے کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی بازار کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اتنے میں ایک خوبصورت جوان عورت اُس کے پاس آئی اور آتے ہی پوچھا: "آپ ہی نرس ہیں؟"

"جی ہاں!" رتن نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے جواب دیا "تشریف رکھیے۔"

نو وارد کرسی پر بیٹھ گئی تو رتن نے بھی بیٹھتے ہوئے پوچھا: "ارشاد؟"

نوجوان عورت بولی "میرا بچہ بیمار ہے۔ سہراب جی ڈاکٹر کو لینے گئے ہیں۔ آپ بھی چل کر ذرا دیکھ لیں۔"

"سہراب کا بچہ؟" بیساختہ رتن کے مُنہ سے نکلا۔ نوجوان عورت نے تعجب سے اُسکی طرف دیکھا اور کہا "جی ہاں! میں سہراب کی بیوی ہوں۔"

"سہراب کی بیوی ۔۔۔۔ سہراب کا بچہ!!" یہ الفاظ رتن نے ہولے ہولے کہے۔ اور ایک لمبا سانس لیا۔ پھر خود بخود اس کا سر جھک گیا اور پیشانی پر عرقِ انفعال کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ سہراب کی بیوی نرس کی یہ حالت دیکھکر گھبرا سی گئی۔ اور کرسی سے اُٹھکر بولی "آپ کی طبیعت تو اچھی ہے؟"

رتن نے آہستہ آہستہ سر اُٹھایا اور مُسکرا کر کہا "معاف فرمائیے! مجھے چکر آ گیا تھا۔"

پھر اُس نے اُٹھکر اپنا بیگ اُٹھایا اور بولی "چلیے! میں حاضر ہوں۔"

سہراب ایک دو منزلہ مکان میں رہتا تھا۔ نیچے کی منزل میں دفتر تھا اور اوپر کی منزل میں رہائش۔ سہراب کی بیوی رتن کو ساتھ لئے سونے والے کمرے میں آئی جہاں چھوٹے سے پلنگ پر کوئی سال بھر کا بچہ لیٹا ہوا تھا اور ایک عورت پاس خاموش بیٹھی تھی۔ رتن نے بیگ ایک طرف رکھدیا اور جُھک کر بچے کو دیکھنے لگی۔

"کیا تکلیف ہے اسے؟" اس نے پوچھا۔

"بس روتا ہے اور مٹھیاں زور زور سے بند کر لیتا ہے!"

"کب سے یہ حالت ہے؟"

"چار پانچ روز سے۔"

اتنے میں سہراب ڈاکٹر کو لے کر آ گیا۔ رتن پلنگ سے ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی اور بیٹے کی طرف دیکھنے کی جُرأت نہ پڑتی۔ ڈاکٹر کچھ دیر بچے کو دیکھتا بھالتا رہا۔ پھر کہنے لگا "بچے کے معدے میں تشنج ہو جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ کوئی نرس بلا لی جائے۔" سہراب کی بیوی بولی "نرس تو یہ پاس ہی کھڑی ہے!"

ڈاکٹر اور سہراب دونوں نے اُسکی طرف دیکھا لیکن رتن اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ ڈاکٹر نے پوچھا "آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

"زنگون سے" رتن نے ہولے سے جواب دیا۔

"یہاں کیسے آنا ہوا؟"

"بس ایسے ہی آگئی" رتن نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سہراب اس وقت بچے پر جھکا ہوا تھا۔

"پریکٹس کرتے کتنا عرصہ ہوا؟"

"کوئی بیس سال"

"اوہو!" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "پھر تو ہم لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں تشریف لے آئیں"

یہ سنکر رتن بھی مسکرا دی۔ ڈاکٹر بولا "بچے کو دن میں چار بار سینج کرنا ہوگا۔ دوائیں لکھ دیتا ہوں"

ڈاکٹر نے نسخہ لکھا اور فیس لیکر چلتا ہوا۔ اب سہراب رتن کی طرف دیکھکر کہنے لگا "آپنے دیکھ لیا؟ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"فکر مت کیجئے" رتن بولی "دو چار روز میں بالکل اچھا ہو جائیگا"

"کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟"

"بالکل نہیں"

"تو آپ پھر یہیں تشریف رکھیئے" پھر وہ بیوی کی طرف دیکھکر کہنے لگا "نوشابہ! میرے خیال میں بہتر ہوگا کہ نرس رات کو بھی یہیں رہے"

"رات ہی کو تو زیادہ ضرورت ہے" نوشابہ نے جواب دیا۔

"رات کو یہاں رہنے میں آپ کو تو کچھ اعتراض نہیں؟" سہراب نے رتن کی طرف دیکھکر پوچھا۔

"ہرگز نہیں"

نوشابہ بولی "ہم امیر تو نہیں لیکن حق خدمت کی طرف سے آپ مطمئن رہیں"

رتن نیچی نظروں سے مسکرا دی۔

رتن کو بیٹے کے گھر آئے دو روز گذر چکے تھے۔ وہ دل میں خوش تھی کہ گو بیٹے کو تو نہیں لیکن بیٹے کے بیٹے کو گود میں لے کر کھلانے کا تو اسے موقع مل گیا ہے۔ ڈرائنگ روم میں آتشدان کے اوپر سہر مرزجی کی ایک تصویر آویزاں تھی۔ رتن کو جب موقع ملتا شوہر کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو جاتی اور اپنی خطاؤں کی معافی مانگتی۔ بچہ پہلے سے بہت اچھا تھا۔ اسی طرح دو روز اور گذر گئے۔ نہ رتن نے جانے کی اجازت مانگی نہ میاں بیوی نے اسے اس خدمت سے سبکدوش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سہراب دن میں دو ایک بار آتا۔ کھانا کھایا ذرا بچے کو گود میں لیا اور پھر کام کاج میں لگ گیا۔ ادھر نوشابہ تھی جسے گھر بیٹھنا قیامت معلوم ہوتا تھا خصوصیت سے شام کے وقت۔

رتن بچہ کو گود میں لئے کمرے میں ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ نوشابہ کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ سہراب آگیا۔ سہراب کو دیکھتے ہی رتن کی آنکھیں خود بخود جھک جاتیں۔

"کہاں جاؤگی؟" سہراب نے بیوی سے پوچھا۔

"کل نوروز ہے" نوشابہ بولی "بازار جاؤں گی دو ایک چیزیں خریدنی ہیں"

سہراب کچھ تھکا ماندہ تھا جھلا کر کہنے لگا "نوروز جائے بھاڑ میں۔ کبھی گھر بھی بیٹھا کرو"

"میں کسی کی قیدی تھوڑی ہوں" نوشابہ نے بھی چمک کر جواب دیا۔

رتن بچے کو لیکر دوسرے کمرے میں چلی گئی لیکن میاں بیوی کی تکرار کی آواز برابر آتی رہی۔

تہوار کی رات تھی لیکن بدقسمتی سے آج پھر بچے کی طبیعت کچھ خراب سی تھی۔ اور سہراب بہت فکرمند تھا۔ نوشابہ ایک بہت خوبصورت ساڑھی پہنے کلب جانے کے لئے بیتاب ہو رہی تھی۔ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ رتن بچے کے پاس سونے والے کمرے میں بیٹھی تھی کہ نوشابہ کی آواز آئی "اب چلوگے بھی یا نہیں؟"

"کہاں؟" سہراب کی آواز تھی۔

"کلب! اور کہاں؟" نوشابہ بولی۔

"اور بچہ؟" سہراب نے پوچھا۔

"نرس جو ہے؟" نوشابہ نے جواب دیا۔

"حیران ہوں" سہراب نے کہا "کہ بچہ تو بیمار ہے اور تمہیں کلب کی سوجھ رہی ہے۔"

"چلتے ہو یا نہیں؟"

"نہیں۔"

"تو میں جاؤں۔"

"میں کیا جانوں۔"

دروازے کا پردہ اٹھا اور نوشابہ بچے کے پلنگ کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

"کیا حال ہے بچے کا؟" نوشابہ نے پوچھا۔

"سو رہا ہے۔" رتن نے جواب دیا۔

نوشابہ نے ایک لمبا سانس لیا۔ رتن نے پوچھا "خیر تو ہے؟"

"ہاں خیر ہے۔" نوشابہ نے غم انگیز لہجے میں کہا۔

"کہیں جانا ہے آپ کو؟" رتن نے پوچھا۔

"کلب جانا تھا۔" نوشابہ بولی۔

"تو پھر جائیے۔" رتن نے کہا "فکر مت کیجئے۔ میں جو یہاں ہوں۔ آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔"

"سہراب ناراض ہوگا۔"

"وہ کیوں ناراض ہونے لگے۔" رتن نے کہا "آپ شوق سے جائیے۔"

نوشابہ نے احسانمندانہ نگاہوں سے رتن کی طرف دیکھا۔ پھر جھک کر بچے کو پیار کیا اور چلی گئی۔

کوئی دس بجے کے قریب بچے کو پھر تشنج کا دورہ پڑا۔ سہراب گھر میں موجود تھا۔ آج وہ نوشابہ سے بہت ناراض معلوم ہوتا تھا۔ رتن جب سے یہاں آئی تھی بلا ضرورت اس سے کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ لیکن وہ دل ہی دل میں کردگارِ عالم کی شکر گذار تھی کہ اسے اپنے بیٹے کے گھر میں رہنے کا اور اسکے بچے کو گود میں لیکر کھلانے کا موقع مل رہا ہے۔

سہراب دس پندرہ منٹ بعد آتا اور بچے کو دیکھ جاتا۔ گیارہ بجے کے قریب بچہ پھر سو گیا۔ اب جو سہراب اسے دیکھنے آیا تو رتن بولی "آپ آرام فرمائیں۔ فکر نہ کیجئے۔ بچوں کو ایسے دورے پڑا ہی کرتے ہیں۔ نوشابہ بھی ابھی آتی ہی ہوگی۔"

سہراب دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد گھڑی نے بارہ بجائے۔ پھر سہراب کے کمرے کی ایک کھڑکی کے کواڑ کھلنے کی آواز آئی "کمبخت ابھی تک نہیں آئی" سہراب اپنے آپ سے کہہ رہا تھا "تف ہے ایسی ماں پہ جسے بچے کی بھی پروا نہیں .... بہت سرکش ہو رہی ہے ...... خیر آجائے ذرا ......"

سہراب کے کمرے میں چلنے کی آواز آرہی تھی اور وہ ہولے ہولے کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ پھر آواز آئی "لو! ساڑھے بارہ بھی ہوگئے ..... ابھی تک نہیں آئی ...... اچھا ..... اچھا ..... بس آج رات وہ یہاں نہیں آسکتی۔ میں اسے اس گھر میں تو اب قدم بھی نہیں رکھنے دونگا۔"

رتن دروازے سے لگی بیٹھی کی باتیں سن رہی تھی۔ اور دل میں خوب سمجھتی تھی کہ اگر آج اس غلط فہمی کو دور نہ کیا گیا تو اسکے بیٹے کو بھی وہی روزِ بد دیکھنا پڑیگا جو اسکے باپ کی تباہی کا باعث ہوا۔ مامتا سب باتوں پر غالب آگئی۔ وہ پلنگ سے اٹھی اور سہراب کے کمرے کا دروازہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ سہراب کھڑکی سے لگا بازار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آہٹ پاکر اس نے پلٹ کر دیکھا اور رتن کو کھڑے دیکھ کر جلدی سے پوچھا "خیر تو ہے؟"

"خیر ہے۔" رتن نے ہولے سے کہا۔

سہراب غور سے اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر بولا "آپ خاموش کیوں ہیں ..... میرا بچہ ......"

"سو رہا ہے۔" رتن بات کاٹ کر بولی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر سہراب کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ سہراب کا دل دھڑکنے لگا۔ رتن دو ایک قدم آگے بڑھی اور "سہراب" کہتی ہوئی بیٹے کے پاؤں

پر گر کر رونے لگی۔

جانے اُسکے "سہراب" کہنے میں کیا تاثیر، کونسا جادو مضمر تھا، کیا جذبہ تھا کہ سہراب کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ وہ بُت کی طرح خاموش کھڑا سخت حیرت اور تعجب سے رتن کی طرف دیکھ رہا تھا اور رتن دیوانوں کی طرح اسکے پاؤں چوم رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"ماں" اچانک اُسکے منہ سے نکلا۔ اُس نے جھک کر اُسے زمین سے اُٹھایا اور اُس کے سینے پر سر رکھکر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"میرا بچہ! میرا سہراب!" ماں کی ماں کہتی جاتی تھی اور اسکی بلائیں لیتی جاتی تھی۔

دونوں رو رہے تھے۔ ماں کی زبان پر میرا لال میرا بچہ تھا اور بیٹے کی زبان پر صرف "ماں" تھا۔

"ہاں! ہاں!" رتن بولی "تمہاری مجرم! تمہاری گنہگار ماں!"

یہ کہکر وہ دو زانو بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی "سہراب! اپنی گنہگار ماں کا قصور معاف کردے۔ میرے لال! اپنے بچے کے صدقے میں اپنی بدنصیب ماں کو معاف کردے"

لیکن سہراب کی زبان پر صرف ایک لفظ تھا "ماں" جو گاہے گاہے اُسکے منہ سے نکلتا۔ پھر اُس نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر ایک بار اس سے چمٹ کر رونے لگا۔ رتن نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ جب اس طرح دونوں دل کی بھڑاس نکال چکے تو دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ آتشدان پر جو گھڑی رکھی تھی اُس نے ایک بجایا۔ سہراب گھڑی کی طرف دیکھکر بولا "ماں! دیکھا! نوشابہ ابھی تک نہیں آئی بس اب وہ اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ غضب خدا کا۔ ننھی سی جان پلنگ پر پڑی تڑپ رہی ہو اور اسے کھیل تماشے سوجھ رہے ہیں۔ ماں! اگر آب وہ آئے تو تم دروازہ نہ کھولنا۔ بس یہی اسکی سزا ہے"

رتن سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ سہراب اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولا "ماں! تم چپ کیوں ہو! بولتی کیوں نہیں!"

آخر رتن نے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا "سہراب! آج چوبیس سال ہوئے کہ میں بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہوکر تباہ ہوئی۔ افسوس! آج پھر ایک بار وہی نحوست میں اپنے بیٹے کے گھر پر منڈلاتی دیکھ رہی ہوں۔ بیٹا! نوشابہ کا اس میں کچھ قصور نہیں، کوئی خطا نہیں، اُسکی عمر کا یہی تقاضہ ہے۔ کوئی اُنیس بیس سال ہی عمر ہوتی ہے۔ نوشابہ ابھی بچی ہے..... سہراب! ایک اسی قسم کے شوق کے لئے میں نے تیرے نہایت شریف اور نیک باپ کا گھر تباہ کیا۔ اپنی عمر برباد کرڈالی اور ایک دُنیا کی رسوائی اور ذلت اُٹھائی۔ اگر مرد عورت کے جذبات کی اور عورت مرد کے جذبات کی قدر کرے تو گھر میں کبھی پھوٹ نہیں پڑسکتی۔ بیٹا! اپنی گنہگار ماں کی زندگی سے عبرت حاصل کر اور کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوکر اپنے گھر کی رونق اور اپنی زندگی برباد نہ کر"

اتنے میں نیچے سے دروازے کی کُنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

"نوشابہ ہوگی!" سہراب بولا۔

"جا بیٹا!" رتن نے بیٹے کا ہاتھ پکڑکر کہا "نوشابہ کو لے آ"

سہراب اُٹھکر نیچے گیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں اوپر آئے۔ دونوں مُسکرا رہے تھے۔ سہراب نے نوشابہ کو ماں کے قدموں پر جھکا دیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ایم۔ اسلم

کاغذ کی ناؤ

از جناب اختر حسین رائے پوری بی. اے

خواب سے زیادہ جمیل ــــــ موسیقی سے زیادہ لطیف ــــــ تبسم سے زیادہ حسین! سپنیرے کی گونگی بیٹی میں قدرت نے جنگلی پھولوں کی رعنائی کو یکجا کر دیا تھا۔

ایک روز حسب معمول جب وہ نہانے کے لئے گھاٹ پر گئی تو دیکھا کہ اسکی خاموش دنیا میں کسی نے ایک نیا نغمہ چھیڑ دیا ہے۔ پہاڑی ندی کے کنارے مچھلی پکڑنے کا جال لگا ہوا ہے اور اسکے تاروں کی پیہم جنبش بتلا رہی ہے کہ وہ خالی نہیں ہے۔ ندی کا تیز دھارا گنگناتا اور نشیب و فراز کو ہموار کرتا یوں بھاگ رہا ہے گویا زندگی موت کا تعاقب کر رہی ہے اور مچھلیاں کسی سحاب رنگیں میں لہروں پر ناچتی آتیں، جال میں پھنسکر مرغ بسمل کی طرح پھڑکتیں اور تھک کر اس گھاس کی سیج پر سو جاتیں جو شکاری نے انکے لئے بچھا رکھا تھا۔ سورج کی زریں شعاعوں میں مچھلیوں کی سفید جلدیں چمک رہی ہیں اور انکی حیران آنکھیں پوچھ رہی ہیں کہ کیا یہی وہ مکان ہے جسکی تلاش میں وہ لامکاں سے نکلی تھیں!

گونگی رادھا کو یہ محسوس ہوا کہ اسکی زندگی کے اندھے کنوئیں میں کسی نے پتھر پھینک کر لہروں کے حلقے پیدا کر دئے ہیں اور ایک بھٹکی ہوئی کرن اسکے اندر جھانک رہی ہے۔ ایک سنسان جنگل اور اس میں کبھی گھنٹوں چپ اور کبھی شب و روز آہ و فغاں کرنے والے دیودار اور پلاس کے درخت۔ انکی ٹہنیوں پر رادھا کی بے زبانی پر چشمک کرنے والے رنگ برنگ کے پرندے۔ روز کھلنے اور مرجھانے والے پھول۔ لیل و نہار کا دامن و گریباں جوڑنے والے چاند اور سورج۔ پُر اسرار سرگوشیاں کرنے والے آسمانی جگنو ــــــ اور ندی کے اس پار پہاڑیوں کا ایک سلسلہ جن کا سرتاج اپنی رانیوں کے کاندھوں پہ ہاتھ رکھکر یوں سربلند ہو گیا تھا گویا زمین نے فلک کی طرف ایک چھری تان دی ہو! پٹاروں میں بل کھاتے اور پھنکارتے ہوئے سانپ اور انہیں بین پر نچانے والا سپنیرا ــــــ ایک زمانے سے رادھا کی یہی دنیا تھی۔

سپنیرا! کون ہے یہ سپنیرا؟ سانپوں کا پٹارا سر پر رکھے، زہرمار بوٹیوں کی جھولی کاندھے پر لادے، بین بجاتا اور اپنی وحشیانہ زلفوں کو الجھوں سے چنبیل کی بالیوں کو الگ کرتا قوس قزح کے رنگ والے شلوکے کی نکر جھاڑتا ہوا یہ شخص اپنی جھونپڑی سے اکثر کئی کئی روز کے لئے غائب ہو جاتا اور رادھا روز شام کو لکڑیوں کا الاؤ سلگا کر اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ جب وہ لوٹتا تو اس کے پٹارے میں کوئی نیا سانپ ہوتا اور اسکی جھولی میں مونگے کے ہار یا شیشے کے جوشن و بوٹ پر جھلملاتے ہوئے ارنڈی کے دئے کی جوت میں جگمگا اٹھتے۔ گونگی خوشی کے مارے باؤلی ہو جاتی، اسے چھین کر اپنے گلے یا بازو میں ڈال لیتی اور اسی دم ایک کونڈے میں پانی بھر کر چراغ کی پھیکی روشنی میں طرح طرح سے اسکی خوشنمائی کا نظارہ کرتی۔ پہلے تو وہ فرط انبساط میں ایک جست لگا کر سپنیرے کی گود میں جا بیٹھتی اور دونوں ہاتھ اسکے چاروں طرف حمائل کر کے اپنی معصوم کا فراوانی کی داد طلب ہوتی، لیکن کچھ عرصہ سے اسکی امنگوں پر اوس سی پڑ گئی تھی۔ اب سپنیرے کے لاکھ پوچھنے پر بھی وہ گاؤں کے میلے یا بازار سے کچھ نہ منگواتی تھی۔ وہ کچھ لے بھی آتا تو یہ مسرت کے اظہار سے اجتناب کرتی۔ البتہ جب وہ نہ ہوتا تو گلٹ اور شیشے کے گہنوں کو چھپر سے نکال کر وہ صبح سویرے گھاٹ پر جاتی اور نہانے کے بعد انہیں پہن کر ندی کے صاف پانی میں ان کی چمک دیکھکر آپ ہی آپ خوش ہوا کرتی تھی۔ کبھی ریت سے انہیں اتنا ملتی کہ دھوپ میں وہ سانپ کے من کی طرح جھلک اٹھتے۔ اکثر وہ اس انتظار میں دیر تک بیٹھی رہتی کہ اس پار کوئی گڈریہ کسی بھٹکی ہوئی بکری کی تلاش میں آئے گا اور یہ اسے اپنی طرف منعطف

کرکے اپنے خوبصورت زیوروں سے اسے مرعوب کرے گی۔ ایک دو مرتبہ ایسا ہوا بھی لیکن جب کوئی بہیلیا یا گڈریہ دوسری طرف دیکھتا گذر جاتا اور یہ کسی طرح اپنی آواز اس کے کانوں تک نہ پہونچا سکتی تو اس کی بے اعتنائی سے اُسے بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ تب پرندوں کے گیت سُنکر اُسے اپنی خاموشی پر بڑا غصہ آتا اور کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ اس رگ کو کاٹ کر پھینک دے جس نے اسکی آواز پر پھندا ڈال رکھا ہے۔ اسکے سینے میں الفاظ کا ایک سرجوش دریا اُمنڈنے لگتا جس کے تلاطم کو اپنی رگوں کی تھرتھراہٹ میں وہ محسوس کرسکتی تھی۔

گرمیوں میں جب طوفان سمندر کے تہ خانوں میں جاکر سو رہتے تو ندی کا دھارا ساکن اور آہستہ خرام ہوجاتا تھا۔ ان دنوں کبھی کبھی دیہاتی براتیں بڑے بڑے ڈونگوں پر بیٹھ کر اُسکی جھونپڑی کے آگے سے گذر جاتیں اور انکے ڈھول مجیروں کی آواز سنتے ہی گونگی آٹے میں سَنے ہوئے ہاتھوں کو اپنی پھٹی ہوئی ساری سے پونچھتی اور چولھے کے دُھوئیں سے ستائی ہوئی آنکھوں کو کلائیوں سے ملتی ہوئی باہر نکل آتی تھی۔ ڈونگے پر بیٹھے ہوئے بچے اُسے منہ چڑاتے اور ملاح ہنستے ہوئے اُسے قریب آنے کا اشارہ کرتے تھے۔ گونگی ٹکٹکی باندھ کر ڈونگے کو دیکھتی رہتی تاآنکہ اسکے سفید مستول اُفق کے بادلوں کی سفیدی میں غائب ہوجاتے تھے۔ جب ڈونگا شمال کی طرف جاتا تو دفعتاً اُسے وہ گاؤں یاد آجاتا جو اسی سمت کہیں تھا اور جہاں اس نے اپنا بچپن گذارا تھا۔ پھر وہ ہزار درجہ آزردہ اور رنجور ہوکر جھونپڑی میں لوٹتی اور سنپیرے کے بہت دلاسہ دینے پر بھی وہ دیر تک روتی رہتی تھی۔ ہر آن، ہر لمحہ اُسے ایامِ طفلی یاد آتے اور اسکی خاموش نگاہیں تب تک شمال کی جانب تاکتی رہتی تھی جب تک سنپیرا اُنکے اشاروں کو سمجھ کر اسکے دونوں ہاتھ پٹارے کے اندر نہ ڈال دیتا تھا۔

کتنا دلفریب تھا وہ گاؤں! سرسبز و شاداب کھیتوں کی میڈھوں پر گل مہر کے درختوں کی قطار، جن کی سُرخ، سبز اور زرد پتیوں کو دیکھکر گمان ہوتا تھا کہ قوس قزح کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر اُن کی ڈالیوں میں اٹک گیا ہے۔ ڈبڈبائے ہوئے تالابوں میں، کنول کی بیلوں پر پن ڈبیوں کے جھنڈ اور کانچ کے گلاس میں بال کی طرح صاف پانی میں سیاہ مچھلیاں! چاندنی راتوں میں میدان میں گاؤں کے مرد کھیل کود کرتے اور کھیتوں میں عورتیں ملکر گایا کرتی تھیں۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ ان میں سے دو چار ڈھیٹ جب ناچتیں تو ننھی لڑکیاں پہرے پر معمور کردی جاتیں کہ کوئی مرد گذرے تو خبر کردیں۔ اور کس طرح ان میں سے کوئی شریر امرود یا پیسے کی لالچ میں چپکے سے اپنے بھائی کو یہ خبر کردیتی اور کچھ منچلے وہاں کے گونوں کی آڑ میں بیٹھکر ناچ دیکھتے تھے۔ اسکے خاتمہ پر وہ باہر نکل آتے اور ایک فرمائشی قہقہہ کے ساتھ رنگ میں بھنگ ڈالدیتے تھے۔ رقاصہ لاج کے مارے گھونگھٹ کاڑھ ہوئی جاتی تھی خصوصاً اُس وقت جب ان گستاخوں میں اس کا منگیتر بھی ہوتا تھا۔ گونگی ان واقعات کو یاد کرکے ہنس پڑتی تھی اور پھر سنپیرے کی متحیر نظروں کو دیکھکر سراسیمہ ہوجاتی تھی۔

گو یہ سچ ہے کہ گاؤں میں اُسکی زندگی کسی طرح قابلِ رشک نہ تھی۔ قدرت نے روزِ اوّل سے اُسے محرومِ نطق رکھا اور ابھی وہ تین سال کی ہی ہوئی تھی کہ اُس کا پورا کنبہ کسی بیماری میں ایک رات میں موت سے ہمکنار ہوگیا۔ گاؤں کا بوڑھا چوکیدار اُسے اُٹھالے گیا اور بڑے ناز و نعم سے اسکی پرورش کرتا رہا۔ چوکیدار کے تنہا غمگسار پہاڑی کتّے نے پہلے تو اس نوآبادی کے خلاف شدید احتجاج کیا لیکن رفتہ رفتہ وہ اپنی ننھی ملکہ سے مانوس ہوتا گیا حتیٰ کہ گاؤں کے بچے گونگی کو چھیڑتے ہوئے ڈرنے لگے۔ لیکن چوکیدار ذات کا چمار تھا اور اس کی گود میں پلی ہوئی گونگی کے لئے گاؤں کے ہر اونچے مکان کا دروازہ بند تھا۔ جب اسکی ہم جولیاں بے دھڑک مندر میں گھُس کر آرتی کا گھنٹہ بجاکر بھاگ آتیں اور پجاری بھنگ کے نشے میں مخمور آنکھوں کو کھولکر غضبناک تیوروں سے انہیں دیکھتا تو گونگی ڈر کے مارے سیڑھیوں پر ٹھٹک جاتی تھی۔ شام کو بھی وہ وہیں ان کا انتظار چوروں کی طرح کرتی اور جب وہ بڑی بوڑھیوں کی آنکھ بچاکر پرشاد کی مٹھائی اسے دیتیں تو یہ اُسے اپنے پلو میں باندھ کر مجرم کی طرح بھاگ آتی تھی۔ اور ساون میں پیپل پر جب

جھولا پڑتا تھا تو گونگی کو کون قریب آنے دیتا تھا۔ تاہم کوئی اس سے نفرت نہ کرتا تھا۔ بوڑھا زمیندار اکثر اسکے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنے حوالیوں سے کہا کرتا تھا کہ اس بدبخت کو کسی راجہ کے گھر پیدا ہونا چاہیے تھا۔ مودی اسے ہمیشہ مفت میں گڑ کا ایک ٹکڑا دے دیا کرتا تھا اور پجاری بھی نہانے جاتے ہوئے اسے گود میں اٹھا لیتا تھا۔ قدرت نے اس کے گھنگرالے بالوں، پریشان آنکھوں اور چنپئی رنگ میں ایک جہانِ نوا سنجی بنا دیا تھا جس کا ہر رنگ ستاروں کو درسِ گفتار دیتا تھا۔ غریب اور حقیر ہوتے ہوئے بھی گونگی سڑک پر پڑے ہوئے اس پھول کی طرح تھی جسے کوئی پیروں سے نہیں روندتا۔

ایک روز یہی سپیرا عجائبات کا پٹارا لئے ہوئے گاؤں میں نمودار ہوا۔ گونگی نے اس سے پہلے ایسا عجیب آدمی نہ دیکھا تھا۔ پر ہیبت سانپ اس کی شعبدہ طرازی پر سر دھننے لگتے تھے اور وہ ایک ڈور پر ناچ سکتا تھا۔ وہ بانس پر کھڑا ہو کر قلابازیاں کھا سکتا تھا۔ مداری کیا نہ کر سکتا تھا! گاؤں کے ننھے بچوں کیلئے اسکی شخصیت مندر کے دیوتا سے بھی زیادہ پُر وقار تھی اور بڑوں کی ڈانٹ کی پرواہ نہ کر کے علی الاعلان انہوں نے اپنے اس عقیدے کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ گونگی اس کے کرشموں سے اس قدر مسحور و مبہوت ہوئی کہ تماشہ ختم ہونے اور سب کے چلے جانے کے باوجود وہ پیکرِ تصویر بنی وہیں کھڑی رہی۔ اور سپیرا کتنا اچھا آدمی تھا! اسے اس نے چھوٹے موتیوں کی ایک زنجیر دے دی ۔۔۔۔ دکھلا کر واپس نہیں لی بلکہ ہمیشہ کے لئے دیدی! انواع و اقسام کی مٹھائیاں ۔۔۔۔ اتنی کہ کھانے کے بعد بھی بچ گئیں ۔۔۔۔ اور گونگی کو اس نے کیا کیا نہ دینے کا وعدہ کیا۔ اسکے گھر میں سونے روپے کی اینٹیں ہیں اور کپڑے ایسے ہیں کہ زمیندار کی بیٹی کے پاس بھی نہ ہونگے ۔۔۔۔ وہ سب ریشم کے ہیں اور ان کے کناروں پر جگنو اور بیر بہوٹیاں ٹکی ہوتی ہیں۔ کھلونے! اور کھلونوں کی نہ پوچھو۔ ایک اڑن کھٹولا ہے جس پر بیٹھ کر گونگی آسمان کی سیر کر سکے گی۔ یہ کہتے کہتے سپیرے نے پٹارا سر پر رکھا اور گونگی کے ہاتھ میں اپنی انگلی دیدی۔ اس کا گھر دور نہیں ہے۔ یہ سامنے جہاں سورج غروب ہوتا ہے اس کا محل ہے۔ سب چیزیں اڑن کھٹولے پر رکھ کر رات وہ ابھی واپس بھیج دیگا۔

اس دن کے بعد راتوں کو آج تک وہ گاؤں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ برسوں گاؤں گاؤں اور شہر شہر کی خاک چھنوا کر اس نے اس بیچاری کو اس ویرانے میں قید کر دیا۔ جہاں اس پر سانپوں کا پہرا پڑتا تھا۔

دھیرے دھیرے گونگی کو اپنی نئی زندگی سے لگاؤ سا ہو گیا۔ جھونپڑی کے پاس ٹیلے پر اس نے ایک دیوتا بٹھا دیا جس کی پوجا کے لئے وہ روز جنگل سے تلسی کے پتے اور کامنی کے پھول لایا کرتی تھی۔ سانپوں کو دودھ پلانے میں بھی اسے ایک مزا ملنے لگا اور سانپ اس سے اتنے ہل گئے کہ کبھی اسکے ارد گرد حالہ بنا کر اپنی سیاہ پوش زبان اسکے پھول سے گالوں پر رکھ دیتے۔ وہ اسکے ہاتھوں سے مکئی کے دانے چھین کر کھانے کے بعد وہیں دیوانہ وار اس طرح رقص کرنے لگتے کہ بادل وجد میں آ جاتے تھے۔ اور سپیرے کی مہر و محبت کی انتہا نہ تھی۔ گونگی کیلئے اس نے وہ سب کچھ فراہم کر دیا تھا جس سے وہ اس مختصر دنیا کی شہزادی ہو جائے۔ ہر شام کو وہ گونگی کو عجیب و غریب داستانیں سنایا کرتا تھا جب تک کہ نیند جادو کی چادر اسے نہ اڑھا دیتی تھی۔ وہ میلوں اور بازاروں سے اسکے لئے ایسی ایسی چیزیں لاتا تھا جنکے نام بھی اس نے کبھی نہ سنے تھے۔ گونگی کی ہر خواہش وہ پوری کر سکتا تھا ۔۔۔۔ ماسوائے ایک کے۔ وہ اسکی زبان نہ کھول سکتا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ یہ معجزہ اسکے امکان سے باہر ہے۔ جب وہ اشاروں میں اسے سمجھاتی کہ اس کے سینہ میں ایک سیلاب امنڈ رہا ہے اور وہ اتنی باتیں کہنا چاہتی ہے کہ ستارے سنتے سنتے سو جائیں اور لہریں گوش برآواز ہو جائیں۔ اور سپیرا مایوسی سے سر ہلا کر اسے گلے سے لپٹا لیتا ۔۔۔۔ گونگی دیر تک شور و غوغہ کرتی اور پھر اپنی اس بے بسی پر جھینپ کر چپ ہو جاتی تھی۔

کئی سال گذر گئے اور ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی برشگال کا موسم آیا ایک نئی شان کے ساتھ۔ گونگی نے جب دیکھا کہ ببول کا پیڑ لہلہا رہا ہے

اُسکے کانٹے بالوں کی طرح نرم ہوگئے ہیں اور پیلے پھول دن میں دکھلائی دینے والے ستاروں کی طرح خنداں و فرحاں ہیں، ندی نالے ہیجان و جاندار کو پیام شادی سُنا رہے ہیں اور ریت پر سوئے ہوئے گزرے ہوئے طوفان زدہ درخت کے آغوش سے کئی خوشنما پودے سر نکال کر فطرت کے ترنم پر عاشقانہ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ تو اُسے ایک عجیب کیفیت محسوس ہونے لگی۔ یہ معلوم ہونے لگا کہ خون میں ایک ہلکی سی گدگدی ہو رہی ہے اور ہوا جسم پر ایک غیر مرئی انگلی پھرا رہی ہے۔ خود بخود اس کا جی چاہنے لگا کہ کوئی اور وہاں آئے اور اُسکے ساتھ اِس فردوسِ نظر سے لطف اندوز ہو اور وہ اسکی باتوں کا جواب دے کر اپنی بے زبانی کا انتقام لے۔ وہ اس نئے دوست کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے، اور جب وہ اسکی شانِ استغنا سے تنگ آکر اُسکے شانوں کو زور سے جھٹکا دے تو یہ ایک مغرورانہ جنبشِ سر کے ساتھ اُسے چھوڑ کر تھوڑی دور چلی جائے اور ایک درخت کی ڈال تھام کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ نہ معلوم کیوں گونگی کے ذہن میں یہ تصور اپنا رنگین تانا بانا بننے لگا اور ــــ جب وہ گھر کی طرف لوٹی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ جوان ہی نہیں ہوگئی ہے بلکہ جوانی کا احساس سانپ کی طرح اُسکے دل میں رینگ رہا ہے۔

دھوپ میں اپنے گیلے بالوں کو سکھاتے ہوئے وہ اُس شخص کا انتظار دیر تک کرتی رہی جس نے یہ جال لگایا تھا۔ اگر دھوپ تیز ہوئی تو سب مچھلیاں مر جائیں گی، انہیں نکالنے کے لئے ماہی گیر اب آتا ہی ہوگا۔ سنیچر اکل ہی باہر گیا ہے۔ دو تین روز بعد وہ لوٹے گا۔ گھر میں اُسے کوئی کام نہیں ہے۔ دیر تک بیٹھکر وہ ان مچھلیوں کا تماشہ دیکھ سکتی ہے۔ کیوں نہ وہ ان بیگناہوں کو جال سے نکال کر پانی میں ڈالدے۔ اور اگر اسی اثنا میں وہ شخص آکر اُسے مارنے لگے؟ نہیں اُسے کیا پڑی ہے۔ وہ اس سے بگاڑ نہ کرے گی کیا عجب کہ اُسے ایک مچھلی ــــ جو اپنی دم پنکھے کی طرح ہلا رہی ہے ــــ بھی دیدے! ابھی گونگی یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ سامنے سے اُسے بانسری اور ساتھ ہی شانو پتوار کی تگ و دو کی آواز سُنائی دی! ور اُس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کشتی بادِ مخالف کا مقابلہ کرتی ہوئی اس طرف آرہی ہے۔

جب وہ قریب آگئی تو گونگی نے دیکھا کہ یہ ماہی گیر وہی شخص ہے جس کا انتظار گذشتہ برشگال میں وہ صبح و مسا کیا کرتی تھی۔ حالانکہ اُسے اُسنے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن یہ وہی تو ہے جو کسی عالمِ بعید سے اُسے آواز دیتا تھا، یہ وہی تو ہے جو خوابوں میں گونگی سے بلا تکلف باتیں کیا کرتا ہے۔ اس کا نیم برہنہ جسم سورج کی کرنوں میں جادوگر کی چھڑی کی طرح منور ہے اور اسکی بانسری کی لے گونگی کی رُوح میں گونج رہی ہے۔

گونگی سانس روک کر اُس وقت تک اس نوجوان ماہی گیر کو دیکھتی رہی جب تک وہ دوسری طرف متوجہ تھا لیکن جیسے ہی کشتی کنارے لگا کر وہ جال کی طرف بڑھا یہ آہوئے رمیدہ کی طرح اپنی جھونپڑی کی جانب بھاگ چلی۔ تیر کی طرح وہ بھاگتی گئی اور جب اپنی جھونپڑی کے اندر پہونچی تو اس کا دل زور زور سے صدا دے رہا تھا، طوفان کی آمد سے قبل ہوا جس طرح تیز و تند ہوجاتی ہے اسی طرح اُسکی سانس میں ہیجان آگیا تھا۔ پہلے تو اس نے اندر سے زنجیر چڑھالی اور دراز سے جھانکتی رہی کہ وہ آتا ہے یا نہیں اور پھر دروازہ کھولکر جھجکتے ہوئے باہر نکل آئی۔

ٹیلے کی آڑ سے چھپ کر اُس نے دیکھا کہ ماہی گیر نے جال سمیٹ کر کشتی میں رکھ لیا ہے۔ اب وہ چلا جائے گا اور ممکن ہے کہ پھر نہ آئے۔ کیوں نہ وہ وہیں کھڑی رہی۔ اور دیکھو، اپنی گگری بھی تو وہ وہیں چھوڑ آئی ہے۔ وہ اس طرح چمک رہی ہے گویا سورج کا ایک ذرہ بیہوش ہوکر ریت پر گر پڑا ہو۔ گونگی کو بلا وجہ اپنے پر غصہ آنے لگا۔ اور یہ ماہی گیر! کتنا مغرور اور بے نیاز ہے وہ! جب وہ بھاگ رہی تھی تو اُس نے کیوں نہ پکارا، کیوں نہ اسکے پیچھے دوڑا۔ آیا بڑا مچھلی پکڑنے والا! جال کا منہ کھول دیتی تو وہ کیا کر لیتا۔ ابھی وہ یوں پیچ و تاب کھا رہی تھی کہ بانسری کی دلکش تان لہروں پر رقص کرتی اور پہاڑوں پر سے گاتی ہوئی خون کی بوندوں میں سما گئی اور وہ کشتی اُمید موہوم کی طرح چشم زدن میں حدِ نظر سے دور ہوگئی۔

گونگی دیر تک یوں خاموش بیٹھی رہی گویا اسکی متاعِ زندگی کو کوئی رہزن آنکھوں دیکھتے چھین لے گیا ہو۔ اس کا جی چاہا کہ ریت کے اُس ٹکڑے کو اس طرح اٹھا لائے کہ ماہی گیر کا نقشِ قدم نہ مٹے اور اس پر روز پانی چھڑکے، یہاں تک کہ جہاں پیر کے نشان تھے وہاں گھاس اگ آئے۔

——لیکن اس کا خدشہ غلط تھا۔ ماہی گیر ایک نیا جال لگا گیا تھا، وہ شام کو نہیں تو صبح ضرور آئے گا۔ اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ ندی کی کل مچھلیاں اس سے التجا کریں کہ تو روز آ کر اپنا جال لگا اور ہمیں گرفتار کر! گونگی خوشی کے مارے رونے کیلئے بیتاب ہو گئی۔

دن بھر وہ اسی کے متعلق سوچتی رہی۔ نہ جانے کیوں آج کائنات کا ذرہ ذرہ زمزمہ ریز تھا۔ گونگی نے تہیہ کر لیا کہ کل وہ ہرگز وہاں سے نہ بھاگے گی۔ وہ اپنی گگری پر پھولوں کا ایک ایسا نظر فریب ہار لپیٹ کر لے جائے گی کہ ماہی گیر لاکھ منع کرنے پر بھی چھین لے اور جب یہ روٹھ جائے تو طرح طرح سے منائے، اپنی مچھلیاں دے دے۔ بانسری سنائے اور اسے کشتی پر بٹھا لے۔ یہ سوچتے سوچتے گونگی کی آنکھ لگ گئی اور اس نے خواب میں دیکھا کہ وہی ماہی گیر باہر کھڑا آواز دے رہا ہے اور جب یہ دروازہ کھول کر خاموش کھڑی ہو جاتی ہے اور اسکے سوالوں کا جواب اشاروں سے دینے لگتی ہے۔ تو وہ سراپا حیرت بنا اسکے قریب آتا ہے اور با انداز دگر اسے دیکھ کر الٹے پاؤں لوٹ جاتا ہے۔ گونگی چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اسے محسوس ہوا کہ خواب میں وہ رو رہی ہے اور اسکا دل دھڑک رہا ہے۔ نہیں ماہی گیر ایسا نہ ہوگا۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ یہ گونگی ہے تو وہ غم زدہ ہو کر اسے گلے سے لگا لیگا۔ اسکی خوش الحانی اسکی تو محرومی کی منت کش ہو جائے گی۔

جب بنتِ نوائے سوچ کو نیند سے جگایا تو گونگی نے جلدی جلدی اپنی کلسی سنبھالی۔ لیکن جب وہ گھاٹ کی طرف چلی تو یہ معلوم ہونے لگا کہ ہر برگ شجر اس پر ہنس رہا ہے۔ جنگلی گلاب کی پتیاں گویا طنز آمیز تبسم کے ساتھ اسے دیکھ رہی ہیں اور نیم کے جہاندیدہ درخت شباب کی کجروی پر بوڑھوں کی طرح گردن ہلاتے ہیں۔ چمپا شرارت سے یوں کھل کھلا رہا ہے گویا کوئی بچہ یہ کہہ کر بھاگ رہا ہو کہ مجھے سب معلوم ہے اور تیتری اپنے کل گچھوں کو یوں ہلا رہی ہے جیسے اسے کسی سے سخت شکایت ہے۔ گونگی کو آپ ہی آپ رونا آنے لگا اور اس کا جی چاہا کہ کلسی توڑ دے، اپنے گہنوں کو پھینک دے، پھولوں کے ہار کو مسل ڈالے اور روتے ہوئے ان سب حاسدوں سے کہے کہ لو اب تو تم خوش ہوئے!

ماہی گیر ابھی آیا نہ تھا۔ گونگی نہانے کے بعد گہنوں کو دھونے لگی۔ لیکن آج وہ کتنے برے معلوم ہو رہے تھے۔ کالے، چپٹے، بھدے! ماہی گیر انہیں دیکھ کر کتنا ہنسے گا! اور یہ ہار——

اپنے خیالات میں وہ اسقدر منہمک تھی کہ جب کشتی کنارے آلگی اور ماہی گیر اسے ایک ٹھونٹھ سے باندھنے لگا تو وہ یوں چونک پڑی گویا اسکی زندگی کے خوابیدہ ساحل پر ایک جہاز ٹکرایا اور کسی نے ساحل کو کھینچ کر اسکے دامن سے باندھ دیا۔

وہ بھاگنے کیلئے اٹھی مگر اسکے پیر بے قابو ہو گئے۔ کسی نامعلوم مصیبت کے خوف سے اس کا جسم لرزنے لگا اور اسے کسی نے وہیں پابجولاں کر دیا۔ ماہی گیر کی شریر مسکراہٹ اور معنی خیز نگاہوں کو دیکھ کر وہ گرفتار نظر پرندے کی طرح وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ایک زیر لب تبسم کے ساتھ آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور انگوٹھے سے ریت کو کریدتے ہوئے ساری کے سرے کو چبانے لگی۔

ماہی گیر نے جال کا منہ کھولتے ہوئے کہا۔ "کیوں جی، سچ بتاؤ تم نے اس میں سے کتنی مچھلیاں نکالی ہیں؟" جب دو تین مرتبہ اس نے یہی سوال دہرایا۔ تو گونگی نے سر کے اشارے سے انکار کیا۔ اور بارہا وہیں چھوڑ کر گگری لئے ہوئے لوٹنے لگی۔ لیکن ماہی گیر نے واقعتاً راستہ روک لیا۔ "کل نہیں تو آج نکال لو۔ تمہیں لینا ہی ہوگا۔ میں تمہیں یوں نہ جانے دونگا۔" گونگی اسکی چھیڑ سے تنگ آ گئی اور جب اسے یہ احساس ہوا کہ اسکے متواتر اصرار کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکی تو اسکی خاموشی کی وجہ ظاہر ہو جائے گی اور وہ چلا جائے گا—— تو وہ زار و قطار رونے لگی۔ گگری اسکے ہاتھوں سے

گرپڑی اور اس میں پوشیدہ وہ گہنے بھی ریت پر اُلٹ کر آنسوؤں کی طرح عقدہ کُشا ہو گئے۔ گونگی نے جلدی سے انہیں اپنی گود میں چھپالیا! اور شرما کر ہنستے ہوئے اپنی اشک فشاں آنکھیں اسکی طرف اُٹھائیں اور جھکالیں۔

ماہی گیر پہلے تو خوب ہنسا اور پھر یکایک خاموش ہو کر غور سے اُسکے چہرے کو دیکھا "کیا تم بول نہیں سکتیں؟" گونگی نے تمکنت سے سر ہلایا گویا اسے اپنی بے زبانی پر فخر ہے! اور گگری اٹھا کر پھر آگے بڑھی۔ لیکن یہ ایک لمحہ کتنا تشکیب طلب تھا کتنا صبر آزما! انسان کی گویائی اور قدرت کی خاموشی میں کشمکش ہوتی رہی ——— اور جب تک گونگی اپنے کو سنبھالے وہ ماہی گیر کے آغوش میں تھی اور اُس کی زندگی کا ہر تارِ نغمہ لخواں تھا۔

سنیہرے نے دیکھا کہ گونگی میں یکایک تغیر ہو گیا ہے۔ چلتے چلتے وہ آپ ہی آپ رُک جاتی، کچھ سوچتی اور ہنس کر پھر مصروف ہو جاتی تھی۔ جوٹھے کو پھونکتے پھونکتے وہ کچھ گنگنانے لگتی اور اُسے یاد نہ رہتا تھا کہ جھونپڑی دھوئیں سے بھر گئی ہے۔ شام کو جب پہاڑیاں ایک سرمئی لبادہ اوڑھ کر شب کی سیاہی میں یوں گھل مل جاتی ہیں گویا اب وہ زمین کی ہنگامہ پروری سے گھبرا کر آسمان کی مسند پر گل بوٹے بنانا چاہتی ہیں۔ اور ندی یوں سمٹ جاتی ہے گویا وہ زمین کی ہتھیلی پر بدنصیبی کی لکیر ہو۔ تو گونگی دیر تک جھونپڑی کے باہر بیٹھ کر خاک پر انگلی سے دائرے بنایا کرتی ہے۔ ایک دو بار یہ بھی ہوا کہ دور سے آتی ہوئی بانسری کی آواز نے آوارہ فرشتوں کے بازوؤں کے نغمے کی طرح فضا کو متلاطم کر دیا۔ اور گونگی بے جان مجسمے کی طرح خاموش بیٹھی رہی لیکن اس کا چہرہ فورِ شادمانی سے لالہ گوں ہو گیا۔ ندی جانے کا اہتمام وہ سویرے سے کرتی ہے۔ بڑی احتیاط سے پھولوں کا ہار بنا کر آم کے مور کا ایک گچھا اپنے جوڑے میں لٹکا لیتی ہے۔ بڑی تشویش کے بعد سنیہرے کو اس راز کا پتہ چل ہی گیا۔

ایک روز صبح کو اس گھاٹ کے قریب کچھ اجنبی کشتیوں سے لکڑی کے تختے اتار رہے تھے اور بیک وقت کئی جال چٹانوں کے آغوش میں لگے ہوئے تھے۔ ایک کم عمر لڑکا دونوں ہاتھوں میں پنی سے اپنے الٹرپن سے مچھلیوں کو دور بھگا رہا تھا۔ بگلے جوگیوں کی طرح ندی کی تہہ پر آنکھ گڑائے جال کی طرف انداز حریصانہ سے تاک لیتے تھے۔ کالے بادل سیاہ چادر کے ٹکڑوں کی طرح آسمان پر اُڑ رہے تھے اور پہاڑ کی بلندی پر ان کی پرواز یہ گمان ہوتا تھا کہ کسی بجھی ہوئی مشعل سے دھنواں نکل رہا ہے۔

ماہی گیروں کا چودھری اپنی جھونپڑی کیلئے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا۔ جال کے مڑے ہوئے تاروں کو کاٹتے ہوئے ایک حبشی نے اپنی چڑھی ہوئی آنکھیں گونگی کی طرف اٹھائیں اور جھوم جھوم کر ہولی کی گالیاں گانے لگا۔ وہ لڑکا جو اپنی مٹھی میں پھنسے ہوئے کیکڑے کو نکالنے کی ترکیب سوچ رہا تھا، دوڑا اور گونگی کے کملائے ہوئے چہرے کے آگے اُسے ہلانے لگا۔

ان میں اس کا ماہی گیر نہیں تھا۔ وہ اب تک کیوں نہیں آیا؟ یہ لوگ کون ہیں۔ لاکھ ضبط کرنے پر بھی وہ اپنے انتشار کو چھپا نہ سکی۔ اس کی اشک آلود آنکھوں نے دیکھا کہ ریت پر کسی پرندے کا سایہ ایک لمحہ کے لئے تھرتھرا کر غائب ہو گیا۔ اسی طرح اسکی زندگی کے پردے پر ایک رنگین سایہ دم بھر کے لئے اپنا عکس ڈال کر معدوم ہو رہا تھا۔ اسکے سینے میں جیسے کسی نے ایک سوراخ کر دیا جو اپنے دائرے کو وسیع کرتا گیا یہاں تک کہ اندر سرد ہوا کے سوا کچھ نہ رہا جس کی مسلسل ہچکیوں کی ایک لے تھی ——— کچھ نہیں ہے، کچھ نہیں ہے۔

گونگی دیر تک روتی رہی اور سب ماہی گیر اسکے ارد گرد جمع ہو گئے۔ چودھری نے بیل کی گردن گڑی زمین پر پھینک کر اسکے قریب آ بیٹھا۔ جال کی رسی بٹتے ہوئے اس نے سب کو پاس آ کر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اسکی داڑھی کے سفید بال تمباکو کے دھنوئیں سے زردی مائل ہو گئے تھے۔ اسکے

جسم سے مچھلی کی بو آنے لگی تھی۔ اور ٹوٹے ہوئے دانتوں میں سے الفاظ پھسلنے لگے تھے۔ اُس نے بڑی سنجیدگی سے ندی کی لہروں کو گنتے ہوئے کہنا شروع کیا: "سبھی مرد ماہی گیر ہیں اور عورتیں مچھلیاں جو محبت کے کانٹے کو نگلنے کی جستجو میں رہتی ہیں۔ مچھلی کا مصرف صرف یہ ہے کہ اسے جلد کھا لیا جائے اور اس طرح کھایا جائے کہ اسکے کانٹے گلے میں نہ اٹک جائیں لیکن بعض طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان مچھلیوں کو حوضوں میں زینت کیلئے رکھ چھوڑتی ہیں تاوقتیکہ وہ سڑ نہ جائیں۔ ہم جیسے لوگ ان کا روزگار کرتے ہیں عقلمند مرد تب تک عورت کو چارہ دیتا ہے جب تک وہ محبت کے جال میں نہ پھنسے پھر اس کا گوشت کھا کر ہڈیاں سماج کی گندی موریوں میں بہا دیتا ہے۔ انسانوں میں ایک ذات والدین کی بھی ہوتی ہے جن کا پیشہ دختر فروشی ہے۔ اور ایک قبیلہ خاوندوں کا ہے جو عورتوں کو خاندان کے حوض میں بند کر کے اپنی بدذوقی کا ثبوت دیتا ہے۔ بتلاؤ، ان تینوں میں خوش نصیب کون ہے؟ مچھلیاں بیچنے والا، انہیں حوض میں بند کرنے والا، اور یا انہیں آگ پر بھون کر کھا جانے والا۔!

یہ دیکھو، میں پیپل کے پتوں کی ایک ناؤ پانی میں چھوڑتا ہوں۔ وہ کتنا نادان ہے جو اس پر بیٹھ کر اس کنارے پہونچنے کی اُمید رکھتا ہے لیکن اس عورت نے یہی کیا۔ مرد کی محبت کاغذ کی ناؤ ہے۔ وفاشعاری کا بار اُسے غرقِ آب کر دیتا ہے۔ میرا بیٹا اپنی زندگی کی ناؤ کو کھیتے ہوئے اس طرف سے گذرا رہا تھا کہ یہاں جوانی کے بھنور میں پڑ کر ڈوبنے لگا۔ اس عورت نے اسکے بادبان کو الفت کی ٹہنیوں میں اٹکا ہی لیا تھا۔ کہ میں نے بروقت انہیں کاٹ پھینکا اور ناؤ کو آگے دھکیل دیا۔ اب وہ واپس نہ لوٹے گی کیونکہ مرد کی محبت پانی کی لہر ہے جو کبھی پیچھے پھر کر نہیں دیکھتی۔ نئے پھولوں کو پیار کرتی جاتی ہے، مرجھائی ہوئی پنکھڑیوں کو نہلا کر گرد راہ بنا دیتی ہے۔ وہ ایک بجلی ہے جو کبھی یہاں تڑپی کبھی وہاں تڑپی۔ عورت کے عشق کی طرح نہیں کہ جھونپڑی کے دئے کی طرح ایک جگہ، ایک انداز سے جھلملا کر بجھ جائے۔

تم نے وہ قصہ سنا ہوگا کہ زمانہ قدیم میں کس طرح ایک مچھلی منسی سے بچنے کے لئے تیتری بنکر ہوا میں اُڑ گئی تھی۔ اب یہ مچھلی جس کے حلق سے میں نے محبت کا کانٹا نکال دیا ہے۔ کیوں نہ تیتری بن جائے، کیوں نہ اسکی زندگی سراپا رنگ و بو بن جائے۔ اس دیوی کی طرح جو مندر میں بیٹھا نہیں بلکہ ہر پجاری کے دروازے پر دستک دیکر اپنا خراج وصول کرتی تھی یہ بھی اپنے شباب کی زنجیر کو کیوں نہ ہلائے، تاکہ ہر کڑی الگ الگ ہو جائے۔ اور ہم میں سے ہر ایک اُسے اٹھائے، دیکھے اور بیکار سمجھکر اسے پھینک دے۔!"

سرمرد اپنی خواہشات کو یہ پیرایۂ اظہار اختیار کرتے دیکھکر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ بوڑھے نے اپنی شریر آنکھوں سے سب کا جائزہ لیا اور پوپلے مُنہ سے کسی گیت کو چباتا ہوا بڑے انہماک سے گڑگڑی پینے لگا۔

گونگی حیرت کی گوش بنی تقریر سن رہی تھی۔ پہلے تو اُس کا جی چاہا کہ بوڑھے کا مُنہ جُھلس دے۔ اُسے درخت سے باندھ کر یوں اُلٹا لٹکا دے کہ اس کا سر پانی کے اندر ہو۔ تھوڑی دیر تک یہ معلوم ہوا کہ جنگل میں صرف وہ پھول کھلے رہ گئے ہیں جن کی پتیاں سیاہ تھیں اور وہ پودے باقی رہ گئے جو خاردار تھے ــــــــــــــ دیر کے بعد جب اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو سرمرد مجسم تمنا بنا ہوا تھا۔ دو ایک تتری اپنے رنگین پروں سے زرتار جھاڑ رہی تھی اور ایک بھونرا پھولوں کی محفل سے اکتا کر ایک برگ گیاہ پر منڈلا رہا تھا۔

گونگی کی آنکھیں اس مرد پر جمی کی جمی رہ گئیں جو سب سے شکیل تھا۔

اختر حسین رائے پوری

─── ❖❖❖❖❖ ───

"SAQI"



صالومي

(تصویر سے متعلق)

سالومی

از جناب فضل حق قریشی دہلوی

جوکنعان! پیارے جوکنعان! میں نے تجھ پر بڑا ظلم کیا۔ تیرا سر تن سے جدا کر دیا۔ میں نادم ہوں اپنے اس فعل پر۔ منفعل ہوں اپنے اس ارتکاب جرم سے۔ دیوتا معاف کر دیتے ہیں۔ خدا معاف کر دیتا ہے۔ تو بھی معاف کر دے۔ میرے قصور کو۔ میرے گناہ کو۔ میں اندھی تھی۔ پاگل تھی۔ کج فہم تھی۔ میری عقل گم ہو گئی تھی۔ میں سمجھ نہیں سکتی تھی۔ سوچ نہیں سکتی تھی۔ جوانی کا نشہ مجھ پر طاری تھا۔ بادۂ شباب سے مدہوش تھی۔ تجھے دیکھا۔ تیری مینا بدوش آنکھوں کو دیکھا۔ تیری پیشانی چمک رہی تھی۔ خوبصورت بال مہک رہے تھے۔ تو نوجوان تھا۔ میری طرح نوجوان۔

ایک ہی نظر میں تو نے میرا دل موہ لیا۔ میں تجھ پر فریفتہ ہو گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھی کہ تیری ذات ایک منزہ و پاک ہے۔ تیرا جسم الوہیت کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ تیری روح مقدس پھولوں میں بسائی گئی ہے۔ تو اس دنیا میں تھا۔ اور تیرے خیالات سماوی تھے۔ تو نوع انسان کو پیغام دینے آیا تھا۔ ایک پیغام ربانی۔ تیرا ہر لفظ الہام تھا۔ تیری زبان سے آسمانی باتیں ادا ہوتی تھیں۔ مگر ان کو کون سمجھتا۔ وہ عام لوگوں کی فہم سے بالا تھیں۔ لوگ تجھ سے ڈرتے تھے۔ تجھ سے خائف تھے۔ لیکن کیوں؟ — یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میری ماں کے شوہر پر بھی تیرا رعب طاری تھا۔ اس نے تجھے محبوس کر رکھا تھا۔ قید خانے میں۔ ایک قعر تاریک میں۔ تجھے تکلیف دینے کے لئے نہیں۔ تجھ سے محفوظ رہنے کے لئے۔ تیری پیش گوئیاں اسے لرزہ براندام کر دیتی تھیں۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ واقعی تو پیغمبر ہے۔ تو نائب خدا ہے۔ آسمان سے زمین پر اتارا گیا ہے۔ میں تیرے لبوں کو چوم چکی۔ اس لذت سے بہرہ یاب ہو گئی۔ جسے حاصل کرنے کے لئے میری روح بے چین تھی۔

میرے حال پر رحم کر جوکنعان! میں نے تیری خاطر سلطنت کو ٹھکرا دیا۔ تخت و تاج پر لات مار دی۔ میں شاہزادی تھی۔ ملکہ ہیرودیس کی بیٹی تھی۔ اس ملکہ کی جسے تو حرام کار اور زانیہ بتاتا تھا۔ جس کی ننگ و ناموس تیری باتوں سے برباد ہو چکی تھی۔ میں پرستیدۂ عالم تھی۔ خود میری ماں کا شوہر میرا پرستار تھا۔ لیکن میں نے اپنا دل تجھ پر نثار کر دیا۔ اپنے شباب کی سرمستیاں تیرے قدموں میں ڈال دیں۔ تو نے ان کو ٹھکرا دیا۔ میری طرف سے منہ موڑ لیا۔ میں دوشیزہ تھی۔ غیر ہاتھوں کے لمس سے بیگانہ تھی۔ مگر تو نے ایک ہی نظر میں میرے سینے کے اندر جوش پیدا کر دیا۔ میرے جذبات برانگیختہ ہو گئے۔ میں تجھ سے لذت التثام کی طالب تھی۔ تو نے منظور نہ کیا۔

میں تسلیم کرتی ہوں جوکنعان! تو پیغمبر تھا۔ مگر دوسروں کیلئے۔ تو برگزیدۂ ذوالجلال تھا۔ مگر میرے لئے نہیں۔ میری نگاہ میں تو محض ایک خوشرو جوان تھا۔ مردانہ حسن کی مکمل رعنائیاں تجھ میں پنہاں تھیں۔ تو اعجاز صنعت کا نادر ترین نمونہ تھا۔ تو آفریدۂ ارضی نہیں تھا۔ تیرے جمال کی تابشوں نے میری روح کو مشتعل کر دیا۔ میں نے تجھے حکم دیا — تجھے دھمکیاں دیں — تجھ سے کہا — التجا کی — منت سماجت کی: "اپنے لب مجھے پیش کر دے۔ میں انہیں چوم لوں۔ ان میں سے جوانی کا نشہ اور زندگی کی شراب چوس لوں"

تو نہ مانا۔ تیری بے رخی نے میرے سینے میں آتش انتقام بھڑکا دی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تجھے حاصل کرنے کا۔ تیرے لبوں کو چوسنے کا۔ زندگی میں نہ سہی ہلاک زیست کر کے۔

میں نے اپنے حسین جسم کی عریانیاں پیش کیں۔ اور ان تمام کیفیات رقصیہ سے جن کا مظاہرہ صرف پرشباب اعضا کے رنگین لوچ سے ممکن ہے میں نے اپنی ماں کے شوہر کو مسحور کر لیا۔ اپنے حسن کی ان کرشمہ سازیوں سے مجبور کر دیا حاکم یہودیہ کو۔ اس سے منہ مانگی مراد طلب کی۔ وہ

پہلے ہی قول ہار چکا تھا۔ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ میں جو کچھ مانگوں گی، وہ پیش کر دیگا۔

میں نے کہا جوکنعان کا سر چاہیئے۔

وہ نصف سلطنت دینے کے لئے تیار تھا۔ اُس نے خراج میں حاصل کئے ہوئے تاج میرے قدموں میں ڈالدئے۔ اُسکے پاس بیضۂ مرغ کے برابر نیلم تھے۔ یاقوت کے ڈھیر تھے۔ الماس سے خزانے معمور تھے۔ بیشمار گوہر نایاب تھے۔ سنگِ طلسمات تھے۔ یک صد نقرئی طاؤس تھے۔ خوشنما بے نظیر طاؤس۔ کہکشاں سے توڑے ہوئے تارے تھے۔ سمندروں سے نکالے ہوئے موتی۔ شیروں کے خون سے کشید کی ہوئی شراب تھی۔ عنبر و گلاب کے خمیر سے ڈھالے ہوئے جام تھے —— یہ سب کچھ اُس نے پیش کیا۔ انہیں میرے قدموں میں ڈالدیا۔ مگر آہ جوکنعان! جسم کو آسائش پہونچانے والی، حسنِ ظاہری کو دوبالا کرنے والی، جمالِ نسائیت میں مزید رعنائیاں پیدا کرنے والی ان تمام اشیاء کو ٹھکرا دیا۔ اسی طرح ٹھکرا دیا۔ جیسے میری محبت کو، میری آرزو کو، میری دلی تمنا کو تو نے ٹھکرا دیا تھا۔ ظالم تو نے۔ تجھے نہیں معلوم صنفِ نازک اپنی آرزوؤں کے پامال ہو جانے پر مالکِ ارض و سما سے زیادہ قہار ہو جاتی ہے۔

میں جسمانی تلذذ کی خواہاں نہیں تھی، میں نے جاہ و حشم سے منہ موڑ لیا۔ میری روح تشنہ تھی۔ اسکی تشنگی بجھ سکتی تھی۔ صرف تیرے لبوں کو چوم لینے سے۔ صرف ایک دفعہ چوم لینے سے۔ ان لبوں کو جن میں رقص کر رہی تھی شباب کی دیوی کی روح۔ بربطِ نفس کے سب سے بلند آہنگ نغمے کی خاطر میں نے تہیہ کر لیا۔ ان لبوں کو ضرور چوموں گی۔ اگر زندگی میں نہیں تو تیرے مرنے کے بعد تیرا سر قلم کرانے کے بعد۔ میری ماں کے شوہر نے، میرے سوتیلے باپ نے جب میری مُراد سُنی تو وہ کپکپا اٹھا۔ وہ سہم گیا مستقبل کی تاریکیوں سے آئندہ نازل ہونیوالے عذاب سے۔ اسے احساس تھا تیری بزرگی و برتری کا۔ وہ جانتا تھا۔ سمجھتا تھا تیری بلند شخصیت کو۔

اُس نے التجا کی کہ میں اپنا کمینہ خیال ترک کر دوں۔ خود اپنی آرزو کو پامال ہونے دوں۔ مگر میں مصر تھی۔ مجھے اپنے عہد کا پاس تھا۔ میں ضد پر قائم تھی۔ وہ اپنے قول پر پشیمان تھا۔ وہ مجبور ہو گیا۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ خاموشی اختیار کر لی۔ میری ماں خوش تھی کہ میں نے اچھی مراد مانگی ہے۔ وہ تیری زندگی سے بیزار تھی۔ تیرے پیمانۂ حیات کو چھلکا دینے کی آرزو مند تھی۔ تو اسکے عیوب کا پردہ فاش کرتا تھا۔ وہ تجھسے برہم تھی۔ اُس نے فوراً مجھے انگشتری دیدی۔ اپنے شوہر کی انگلی سے اتار کر۔ وہ انگشتری جسے لیکر قتل کا حکم دیا جاتا ہے۔

مگر جوکنعان تو فقیر ہوتے ہوئے بھی شاہنشاہِ عالم تھا۔ لوگ تیرے نام سے تھراتے تھے۔ تجھ سے بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ میں نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ جوکنعان کو قعرِ تاریک سے نکال لاؤ۔ وہ کپکپا اٹھے۔ تجھے ہاتھ لگانے کے خیال سے ڈرتے تھے۔ میں نے جلاد سے کہا۔ جوکنعان کا سر قلم کر دیا جائے۔ اُسکے ہاتھ لرز گئے۔ شمشیر چھوٹ کر گر پڑی۔ اس کا سر چکرا گیا۔ مگر میرا حکم تھا۔ انگشتری میرے پاس تھی۔ اُسے خود اپنی ہلاکت کا اندیشہ ہوا۔ تعمیلِ حکم کرنی ہی پڑی۔ تیرا سر میرے سامنے پیش ہوا۔ نقرئی قاب میں۔ جس طرح چاند ہالے میں ہوتا ہے۔

میں بیتاب ہو کر دوڑی۔ تیرے سر کو اٹھا لیا۔ اس سر کو جو پیغمبری کے خیالات سے لبریز تھا۔ تیری زلفوں کو پکڑ لیا۔ ان زلفوں کو جن کے دام میں حسن کی دیوی سے خراج لینے والی شاہزادی گرفتار ہو چکی تھی۔ میں نے چوم لیا۔ تیرے لبوں کو، تیرے رخسار کو، تیری پیشانی کو، شدید جذبۂ فشار کے ساتھ۔ انتہائی فشار کے ساتھ۔ میرے اندر جوش تھا۔ اور تیرے اندر سکونِ مطلق۔ میں نے تیرے سر کو چھوا۔ مگر اس میں جنبش نہ ہوئی۔ میں نے تیرے لب چومے اور تو نے منع نہ کیا۔ کیونکہ میں ذی حیات ہوں اور تو غیر ذی روح۔ تیری بے رخی ختم ہو چکی۔ اجتناب کی حدیں ٹوٹ گئیں۔ اب تو مزاحمت نہیں کر سکتا۔ اپنی برہمی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ فضا تیرے مترنم الفاظ سے محروم ہو گئی۔

وہ تیرے پیغامات کہاں گئے؟ تیرے الہامات کیا ہوئے؟ سنا دے کوئی سرمدی ترانہ۔ کوئی سماوی پیغام۔ ایک پیغام سروش ــــ تو خاموش ہے۔ بولتا کیوں نہیں؟ لبوں کو زحمتِ جنبش دے! اب کیوں نہیں پکارتا دخترِ بابل کو شیطان کی بیٹی کہہ کر؟ میں وہی ہوں نہ ایک حرامکار ماں کی نفس پرست لڑکی۔ دیکھیں تو نے میری نفس پرستیاں!۔

تو جواب نہیں دیتا۔ اچھا تو آنکھیں بھی بند کرلے اپنی سحر طراز آنکھوں کو۔ تو مجھے مت گھور۔ کیا دیکھ رہا ہے؟ کیا میرے سینے کے ابھار کو؟ میرے مینائے شباب کو؟ میرے عریاں جسم کی رعنائیوں کو؟ میرے نازک اعضا کے حسین لوچ کو؟ لے، جوکنعان میں خود دکھاتی ہوں۔ میرے سینے کی طرف دیکھ۔ ان دو آبگینوں میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ شباب کی ازلی سرمستیاں۔ جوانی کی ابدی مدہوشیاں۔ ان میں کیفیت سکر ہے۔ نشۂ شرابِ زیست ہے۔ لیکن تجھے کیا؟ تیرے لب خود بادۂ شباب سے لبریز تھے۔ میں انہیں چوم چکی۔ انہیں چوس چکی۔ ان کی خمار آگیں شیرینی کو لذتِ کام و دہن بنا چکی۔ اس لئے مت گھور۔ مجھے نہ دیکھ۔ کیا تو دیکھ رہا ہے۔ نہیں نہیں۔ یہ میری نظر کا فریب ہے۔ سمجھ کا قصور ہے۔ تو غیر ذی روح ہے۔ تیرے تاثرات، تیرے احساسات اور تیرے جذبات کی دنیا برباد ہوچکی ہے۔ تیری وہ دنیا میرے لئے بحرِ انفعال میں بدل چکی ہے۔ میں عرقِ ندامت میں ڈوب رہی ہوں۔ متاسف ہوں۔ میرے خیالات رکیک تھے۔ میرے جذبات ذلیل تھے۔ میرا ادعائے محبت بے بنیاد تھا۔ حقیقت نہیں تھی۔ صرف جوشِ شباب تھا۔ نفس کی خواہشات تھیں۔

تو مرچکا ہے۔ تیری زندگی ختم ہوچکی ہے۔ پھر بھی تیری شخصیت کا اثر باقی ہے۔ تیرا رعب مجھ پر طاری ہے۔ میں تجھے اب چھو بھی نہیں سکتی۔ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ میرے اعضا میں ارتعاش ہے۔ قلب میں اختلاج ہو رہا ہے۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ آخر یہ کیوں؟ میری روح مضمحل ہو رہی ہے۔ میری آنکھیں فریب دے رہی ہیں۔ تیرا قلم کیا ہوا سر میرے سامنے نقرئی قاب میں رکھا ہے۔ مگر شش جہت میں کائنات کے ہر ذرے میں تیری شبیہ نظر آرہی ہے۔ میں ہر طرف تجھ ہی کو دیکھ رہی ہوں۔ آہ! میں نہیں دیکھ سکتی اس روح فرسا منظر کو جو ماضی کی یاد تازہ کردے۔ میرے دلِ مضطر میں۔ میں آنکھیں بند کرلیتی ہوں۔ اپنی نظریں پھیر لیتی ہوں۔ مگر افسوس! میرے تخیلات کی نگری تیرے تصورات کے نقوش سے معمور ہے۔ تو میرے دل سے محو ہوجا۔ میرے لوحِ قلب سے دور ہوجا۔ مجھے فراموش کردے۔ مجھے معاف کردے۔ میں محسوس کر رہی ہوں۔ دنیا میں انقلاب آنے والا ہے۔ میری ہستی برباد ہوکر رہیگی۔ میرے سر پر موت کا فرشتہ تیری شکل میں منڈلا رہا ہے۔ تیری روح خون کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔ لے لے۔ میں نامرادِ زیست ہوں۔ زندہ رہنے کی تمنا باقی نہیں۔ لیکن پہلے معاف کردے۔ جوکنعان ــ پیارے جوکنعان!......

فضلِ حق قریشی دہلوی

"پیرو"

از جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)

ایک روز کا ذکر ہے (شاید ۲۲ء کا) شروع برسات کا موسم تھا خیال آیا کہ چلو شکار کو چلیں۔ بی۔ بی۔ سی۔ آئی۔ ریلوے کا آگرہ سے (چھوٹی لائن پر) تیسرا اسٹیشن بچپوری ہے۔ یہاں سے کوئی چار میل ایک گاؤں ہے۔ وہاں میرے ایک دوست رہتے تھے۔ ارادہ یہ ہوا کہ صبح تڑکے گاڑی سے چلے جائیں، دن بھر تیتر کا شکار رہے اور شام کی گاڑی سے چلے آئیں۔

مگر بد قسمتی تو دیکھئے گاؤں میں پہونچا تو دوست کو ملیریا بخار نے "گٹ پٹ" کر رکھا تھا۔ نتیجہ یہ کہ دن بھر اُن کی تیمارداری میں گذرا۔ شام کو اوّل وقت میں وہاں سے روانہ ہو گیا کہ گھومتا پھرتا گاڑی کے وقت اسٹیشن پہونچ جاؤں اور جو راستہ میں کوئی عقلمند تیتر میری بندوق کی نال میں گھسنے کی کوشش کرے تو اُسے بھی ساتھ لیلوں۔

شام کا پُر فضا وقت تھا اور دُور تک کھیت چلے گئے تھے جن میں فصلیں ابھی ہاتھ بھر ہی اونچی نہ ہوئی تھیں۔ سامنے مغرب کی طرف سورج جھکتا جا رہا تھا اور کھیتوں کے کنارہ جگہ بہ جگہ "فراش"[1] کے درختوں کا سلسلہ عجیب طرح سے کھیتوں میں سایہ ڈال رہا تھا۔ میں خاموش چلا جا رہا تھا کہ بڑے فاصلے پر کوئی میری پُشت کی طرف سے پکارتا معلوم ہوا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ چاروں طرف دیکھا۔ کوئی نہ تھا۔ میں آگے چلا کہ پھر آواز آئی۔ کوئی پکارتا تھا "پیرو"۔ میں نے مُڑ کر پھر دیکھا اور پھر مجھے کوئی نظر نہ پڑا۔ شبہ ہوا سامنے درختوں کی قطار کے اُس پار کوئی کسی کو پکارتا ہوگا۔ یہ سوچکر میں تیزی سے آگے بڑھا اور اپنی دھن میں پیچ و پیچ ہوا کھاتا جا رہا تھا کہ عجیب ہی معاملہ پیش آیا۔

(۱)

بجلی کی تیزی سے ایک درخت کی آڑ سے دو فوجی سپاہی اِس طرح تڑپ کر میرے قریب ہی داہنی طرف نکلے کہ گویا زمین سے پیدا ہو گئے ہیں۔ ایکدم سے چونک پڑا اور سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُن میں سے ایک کڑک کر اس زور سے بولا کہ میدان گونج گیا۔ ..."سَرنڈر...ام"[2] اور لفظ "ام" کے ساتھ ایک جھٹکے میں دونوں کی فوجی رائفلیں مجھے گولی مارنے کیلئے اُنکے کندھے پر پہونچیں۔ فوجی رائفل کی نال جس وقت سامنے آتی ہے تو دیوتا کوچ کر جاتے ہیں اور پھر میں تو اس ڈرامہ کے لئے تیار بھی نہ تھا۔ "ارے... رے رے!" کہتا ہوا گولی کو گویا ہاتھ سے روکتا ہوا ٹیڑھا ہو کر رہ گیا کہ چشمِ زدن میں ایک سپاہی نے بڑھکر میری شکاری بندوق کی نال پکڑ لی۔ میں نے چھوڑ دی۔ اور دونوں سپاہی مسکرانے لگے۔ بولے "جناب آپ گرفتار ہو گئے"۔

میں نے ان دونوں کو غور سے دیکھا۔ یہ سمجھا کہ شاید یہ لوگ فوج سے اپنے افسر کو قتل کر کے بھاگے ہیں اور اب لوٹ مار کر رہے ہیں۔ لہذا میں نے مشکوک نظروں سے اُنکو دیکھتے ہوئے اور ڈاکہ زنی کا خیال کرتے ہوئے اُن سے پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

[1] مور پنکھڑی۔ جسے دیہاتی اُس طرف فراس کہتے ہیں۔
[2] "سرنڈر آرم" یعنی ہتھیار ڈالدو۔ (Surrender arm)

"اڈوانس گارڈ دلّی فورس"[1] ایک صاحب بولے "نائک جمعدار لاکھن سنگھ.... سپاہی آدم خاں نمبر ۱ راجپوت رائفل"
اور یہ کہہ کر جمعدار لاکھن سنگھ نے جیب سے اپنی نوٹ بُک نکال کر پیش کی اور کہا "لکھ دیجئے کہ آپ آج اسوقت گرفتار ہو گئے"۔

اب میں نے اِن دونوں کو غور سے دیکھا - ہو نہ ہو - میں نے دل میں کہا یہ دونوں ضرور بالضرور آگرہ کے پاگل خانہ سے کسی طرح نکل بھاگے ہیں اور معلوم ہوتا ہو فوجی بارکوں سے وردی اور رفل چُرا کر اب یہ دھندہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے کہا "آپ صاحبوں کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے اور میں اس گرفتاری کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ ہیں کون۔ اور کیسی گرفتاری۔ مجھے جانے دیجئے میری گاڑی چھوٹ جائے گی"۔

اب حماقت تو دیکھئے کہ اسپر جمعدار لاکھن سنگھ نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "واقعی جیسا سُنا تھا آپکو ویسا ہی پایا۔ مگر اب بھلا ہم آپکو چھوڑیں گے۔ چلئے ہمارے ساتھ رُنکتا[2]۔ ہم نے رُنکتا فتح کر لیا"۔

اب آپ ہی بتایئے کہ اِن دونوں کی احمقانہ باتوں کو میں کیا خاک سمجھتا - اور انکی حماقت ملاحظہ ہو کہ میں زچ آکر جو معاملہ پوچھتا ہوں تو ہنستے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہا ہوں۔ اور کہتے ہیں کہ تمہاری چالاکیاں ہم خوب سمجھتے ہیں۔ بالاخر میں بگڑ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا "آپ آدمی ہیں کہ بنجشا تہ" اور پولیس میں رپورٹ کرونگی اور اُن کے کمانڈر کو شکایت کی اور فوجی محکمہ ہلا ڈالنے کی دہمکی دی۔ تب جاکر کہیں حقیقت معلوم ہوئی۔ معلوم ہوا کہ دہلی اور آگرہ کے فوجوں کے مابین "شیم فائٹ" یعنی مصنوعی جنگ ہو رہی ہے۔ دلّی کی فوجیں عالمِ بیخبری میں آگرہ پر حملہ کر رہی ہیں۔ اور اس ہوشیاری سے دلّی والے بڑھ رہے ہیں کہ آگرہ والے پڑے سوتے ہی ہیں مستقل فوجی مخبر اور جاسوس جو دستور العمل کے مطابق لگے ہی رہتے ہیں۔ کچھ پکڑے گئے اور کچھ بیخبر ہیں اور آگرہ والوں کا سب سے ہوشیار جاسوس "پیترو" میں خود ہوں جواب پکڑا گیا!

میں نے چیخ کر کہا "قبلہ میں قطعی پیترو ویترو نہیں ہوں۔ مجھے آپ کی فوجی حماقتوں سے بھلا کیا تعلق ہے مجھے چھوڑو"۔

مگر توبہ کیجئے۔ فوجی لوگوں کے دراصل دماغ بھی فوجی ہوتے ہیں۔ بھلا عقل کو کیا دخل! اب میں لاکھ ان فوجیوں کو سمجھاتا ہوں کہ بھیّا میں پیترو نہیں۔ چلکر گاؤں میں پوچھ لو۔ نہ مانو اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ لو وہ بھی مجھے جانتا ہے اور پھر بھی نہ مانو اسٹیشن کے پاس زراعت کا فارم سرکاری ہے اُس کے منیجر سے پوچھ لو اور تصدیق کر لو کہ میں کون ہوں۔ مگر وہ نہیں مانتے بلکہ عقلمندی ملاحظہ ہو۔ کہنے لگے کہ بچپوری اسٹیشن ماسٹر کو قتل کریں گے۔ چھوٹی لائن کی پٹری توڑ کر سلسلہ آمد و رفت منقطع کریں گے اور زراعت فارم کے سپرنٹنڈنٹ کو بھی قتل کر کے زراعت کے گھاس وغیرہ کے گودام پر قبضہ کریں گے۔ وجہ یہ کہ جی۔ آئی۔ پی۔ ریلوے کا اسٹیشن رُنکتا یہ احمق فرضی طور پر فتح کر کے لائن قبضہ میں کر کے اسکو مستقر بنا چکے تھے اور چھوٹی لائن پر آمد و رفت ان کو توڑنا تھی۔ میں نے قسمیں کھائیں۔ دہمکیاں دیں۔ گرفتار ہونے سے مُنکر ہوا۔ اُنکو شرم دلائی مگر چھوڑتے نہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر دشمن ملا اور وہ سپاہی ہے اور گرفتار ہوا تو اپنا نمبر بتا دے اور گرفتاری کے دستخط کر دے تو چھوڑ دیتے ہیں اور پھر وہ جنگ میں حصّہ نہیں لیتا۔ یا جسکو مصنوعی طور پر قتل کر دیتے ہیں تو اُس سے

[1] ایڈوانس گارڈ۔ وہ دستہ جو حملہ آور فوج کے آگے دیکھا بھالی کے لئے رہتا ہے۔

[2] یہ اسٹیشن جی۔ آئی۔ پی۔ ریلوے کا آگرہ سے شاید چوتھا یا تیسرا اسٹیشن ہے۔

لکھوا لیتے ہیں کہ میں سپاہی نمبر فلاں قتل ہوگیا اور پھر وہ حصّہ نہیں لے سکتا۔ اب میں نے ان بیہودوں سے کہا کہ خدا کے واسطے تم مجھے جھوٹ موٹ قتل کر دو مگر چھوڑ دو۔ معلوم ہوا یہ بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ میں جاسوس ہوں اور اقبال نہیں کرتا۔ اور اب انھوں نے ضد کی کہ میں اُنکے ساتھ رنگتا چلکر قید کے لُطف اُٹھاؤں۔ اور جب میں نے دیکھا کہ یہ دونوں واقعی سنجیدہ ہیں اور جو کہتے ہیں وہی کرنے والے ہیں تو جناب میں بھی اب بگھر گیا۔ بھلا سوچیئے تو کہ آٹھ دس میل چلکر میں ان مسخروں کے ساتھ رنگتا جاؤں۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں بگڑ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔ تمہارے فرشتے بھی مجھے رنگتا نہیں لیجا سکتے۔ کیسی قید اور کیسی حراست۔ جہنم میں گئی تمہاری فوج اور سب شیم فایٹ۔ تمہاری فوج کے کمانڈر اور لفٹنینٹ سب پر ملا کر دعوی کردونگا۔ بندوق نہیں دبنے میں تھانہ میں رپورٹ کر دونگا۔ اور تمہارے نام اور نمبر نوٹ کراکے نہ اُلٹا گرفتار کرایا ہو تو میرا ذمہ۔ شیم فایٹ ہوئی تو یہ کب کہدیا گیا کہ خواہ مخواہ بھلے مانسوں سے بھڑتے پھرو۔ یہ کون سا فوجی قاعدہ ہے۔ یہ کہہ کر جو میں چلا تو بیچ بیچ ان کھُریوں نے میرا ہاتھ پکڑا۔ کہ اتنے میں سامنے سے گرد اُٹھی۔ دس بارہ سوار تیزی سے آرہے تھے۔ میں بھی رُک گیا۔ "پھر حنٹ[1] ...... ٹم"۔ جمعدار اآکہن سنگھ نے کڑک کر کہا۔ کھٹ پٹ کے ساتھ رسالہ کے افسر کو دونوں نے سلامی دی۔ اور خوشخبری کہ "ہیرو گرفتار ہیں"۔ لاحول ولا قوۃ۔

صوبیدار سالمیا سنگھ ایک صوبیدارانہ شان سے گھوڑے سے اُترے۔ میں نے سخت برہم ہوکر کہا کہ ان دونوں سپاہیوں نے مجھے ناحق پکڑ رکھا ہے اور میں کیا جانوں کون ہیرو اور کیسا ہیرو! مجھے چھوڑ دیئے۔ میری گاڑی چھوٹی جاتی ہے۔ صوبیدار صاحب نے ایک عجیب و غریب انداز سے (غالبًا فوجی نقطہ نگاہ سے) مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔ اور بولے۔

"آپ ہیرو نہیں ہیں"! (یہ کہتے ہوئے اپنی جیب سے کچھ کاغذ نکالے)

میں نے کہا۔ "جناب میں کیا جانوں کون ہیرو۔ میں تو کالج میں پڑھتا ہوں۔ چھُٹیاں نئیں گھر پر ہوں۔ شکار کو آیا انہوں نے پکڑ لیا۔ چھوڑیئے مجھے......"

اب صوبیداری ملاحظہ ہو کہ جیب سے ہیرو کمبخت کا حُلیہ نکال کر ملاتے ہیں:۔

"رنگ گورا......"

میں بولا۔ "یہ دیکھیئے۔ میں گورا نہیں ہوں"

ایک سوار صاحب جو کہ لتار کو شرمادیں بولے۔ "واہ۔ اور گورا رنگ کیسا ہوتا ہے"

اب واقعہ یہ کہ نہ میں گورا نہ کالا۔ مگر بحث کے بعد فیصلہ میرے خلاف صادر ہوا کہ میں قطعی گورا ہوں۔ میں لڑتا رہ گیا۔

اب آگے چلیئے۔

"ناک تیکھی۔ آنکھیں گول بڑی اور تیز۔ چہرہ لانبا۔ بدن دُبلا۔ قد اوسط درمیانہ...... شکاری کے بھیس میں گھومتا پھرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ"

یہ تیکھی کیا بلا ہوتی ہے! واللہ اعلم۔ دُبلا میں ضرور ہوں۔ قد بھی درمیانہ۔ شکاری ہونے سے منکر کیسے ہوتا۔ بس اور کیا

[1] پریزنٹ آرمس۔ یعنی سلامی کیلئے اسلح پیش کرنا۔

چاہیئے۔ سوائے اِس کے کیا کہتا کہ میری آنکھیں تیز نہیں ہیں۔ کمزور ہیں۔ عینک لگاتا ہوں۔ اور ضرورتاً لگاتا ہوں۔ عینک اپنی آنکھ میں لگا کر دیکھ لو۔ ہرگز نہ لگیگی۔ مگر توبہ کیجئے۔ کون سُنتا ہے۔ صوبیدار صاحب بولے کہ آپ فوجی آدمی ہو کر اتنا بہانہ کرتے ہیں یہ تو خلاف قاعدہ بات ہے۔

آپکو رُنکتا جانا پڑے گا۔ ہم قطعی نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ قطعی ہیرو ہیں۔"

میں نے جلکر کہا "جناب ہیرو یا خیرو ہونگے آپ۔ میری توہین مت کیجئے۔ میں ہیرو اور اُسکے فعل پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

جمعدار لاکھن سنگھ نے کہا "اگر آپ ہیرو نہ ہوتے تو ہم نے جب ہیرو کہہ کر پکارا تو کیوں آپ چلتے چلتے رُکے اور مُڑکر دیکھا۔ آپکو چلنا ہوگا ہمارے ساتھ۔"

اب واقعہ یہ ہے کہ آواز سُنکر میں نے مُڑکر ضرور دیکھا تھا۔ مگر میرا عذر سماعت نہ ہوا اور مجھسے ذرا رعب کے ساتھ کہا گیا کہ رُنکتا چلو۔

میں نے دیکھا کہ اب گاڑی کا وقت قریب آگیا۔ قسمیں کھائیں۔ گواہ شاہد پھر بتائیے اور جب کسی طرح وہ نہ مانے تو میں بسیر کر بیٹھ گیا زمین پر اور کہدیا میں نے کہ آپ تو آپ اگر آپ کا پورا رسالہ آجاوے تو بندہ تو رُنکتا جانے کا نہیں۔ جی میں آئے مار ڈالو مگر میں نہ ہلونگا۔ خواہ کچھ ہو جاوے۔

اِن فوجیوں کو اب جو گاندھی جی والی ترکیب سے سابقہ پڑا تو پہلے تو مجھے سمجھایا مگر جب دیکھ لیا کہ میں واقعی قطعی ناسمجھ ہوں تو آپس میں کمیٹی کرکے بہت جلد طے کر لیا کہ اچھا بچپوری اسٹیشن چلو۔ میں نے دل میں یہ سوچا کہ لگا موقعہ تو بندوق چھوڑ چھاڑ اڑنچھو ہو جاؤں گا۔

معلوم ہوا کہ بیس میل کے محاذ پر یہی حماقتیں ہو رہی ہیں اور دہلی کا ایڈوانس گارڈ بڑھا ہوا ہے اور یہی ایک آدمی الیس رُنکتا بھیج دیا گیا اور جمعدار لاکھن سنگھ کی نام چار حراست میں رہا اور ہم سب بچپوری چلے۔ مگر قبل اسکے کہ ہم وہاں پہونچیں پہونچیں آگرہ جانیوالی گاڑی آکر چل بھی دی اور میں بیٹھا رہ گیا۔

(۲)

اب اسٹیشن پر پہونچ کر اور حماقتیں ہوئیں۔ دو سوار داہنے اور دو بائیں دُور تک دوڑ گئے اور خبر لائے کہ دشمن نہیں ہے ایک اسٹیشن ہو کر آیا کہ مطلع صاف ہے۔ اب ہم سب لوگ اسٹیشن پہونچے۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو بیچ بیچ جا کر گھیر لیا اور مطلع کئے گئے کہ آپ قتل ہو گئے اور پٹری اُوکھاڑ دی گئی اور آگرہ کی فوج کا کوئی مزاحم نہیں اس کی تصدیق کے دستخط کر دو۔ میں نے کہا "صوبیدار صاحب انکو قتل نہ کرو۔ للہ انہیں بھی گرفتار کرو" ایک سے دو تو ہوں۔ میں نے سوچا۔ فرضی طور پر تار گھر بھی توڑا گیا۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب ایک سمجھدار آدمی۔ کہنے لگے "صاحب یہ کیا فضول بات ہے۔ ہمارے محکمۂ ریلوے سے کوئی ایسا حکم نہیں آیا۔ اور رہ گیا تار گھر توڑنا اور پٹری اوکھیڑنا تو جناب آپکے کیا گورا فوج بھی اسے چھو نہیں سکتی۔ یہ تو میں مانتا ہوں کہ آپ توڑ سکتے ہیں مگر میں اس کی تصدیق کرکے کیوں چکر میں پھنسوں۔ رہ گیا مجھے قتل کرنا تو کتنی فضول بات ہے کہ میں لکھ دوں کہ مجھے قتل کر دیا یا اگر چاہتے تو قتل کر دیتے اور کوئی روکنے والا نہ تھا۔"

ایک قلی بات کاٹ کر بولا "صوبیدار صاحب۔ آپ خود فوجی آدمی ہو۔ انگریزی راج ہے۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔"

اسٹیشن ماسٹر صاحب ہاتھ ہلا کر بولے "معاف کیجئے جناب۔ کوئی کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ نہ آپ مجھے اور نہ میں آپکو۔"

صوبیدار صاحب بولے "فرضی طور پر میں کہہ رہا ہوں۔"

اسٹیشن ماسٹر صاحب بولے "نہ فرضی نہ ارضی۔ (ہاتھ ہلا کر) جھوٹی بات ہے۔"

قصہ مختصر اسٹیشن ماسٹر صاحب بمشکل اسپر راضی ہوئے کہ لکھدیں کہ صوبیدار صاحب معہ سپاہیوں کے آئے اور کوئی ان کے علاوہ فوجی سپاہی نہیں۔ بڑی مشکل سے اُنھوں نے اتنا لکھا۔ اب یہاں ذرا سمجھ کی باتیں ہوئیں۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب نے میری تصدیق کی کہ میں ان کو جانتا ہوں۔ یہ تو پڑھتے ہیں اور برابر یہاں آتے رہتے ہیں اور ہیرو بھی نہیں ہیں۔ قلیوں نے اور دو ایک آدمیوں نے میری گرفتاری پر اظہارِ تعجب کیا اور صوبیدار صاحب سے ایسی باتیں کیں کہ اُن کو یقین آچلا مگر مجھے چھوڑنے کے سوال پر وہ بدک گئے۔ محض اس وجہ سے کہ بالفرض اگر میں "ہیرو" نکلا تب کون ذمہ دار ہوگا۔

یہاں سے سامنے زراعت کا فارم تھا وہاں پہونچکر صوبیدار صاحب سپرنٹنڈنٹ سے ملے۔ اُنھوں نے بخوشی قتل ہونا وغیرہ سب منظور کر لیا اور دستخط بھی کر دئے اور مجھ سے پوچھا کہ "ہیں تم ان کے ساتھ کیسے؟" قصہ مختصر میں نے ایسی ناقابل تردید تصدیق اپنے ہیرو نہ ہونے کی بہم پہونچائی کہ صوبیدار صاحب سچ مچ قائل ہو گئے کہ میں ہیرو نہیں۔ لیکن چھوڑنے پر موذی پھر بھی رضامند نہ ہوا۔ جب سپرنٹنڈنٹ نے بہت کچھ اُسے یقین دلایا تو کہنے لگا کہ ہم کل چھوڑ دیں گے۔ اس سے پہلے نہیں چھوڑ سکتے اور میں نے دل میں سوچا کہ وقت نکل گیا ورنہ ان کے تو فرشتوں کو چھوڑنا پڑتا اور وہ بھی ابھی۔ مگر نہیں۔ صوبیدار تو اب خلق مجسم بن گیا۔ کہنے لگا کہ "کبھی یاد تو کرنا پھنسے تھے۔ اب تو ہمارے ساتھ آؤ۔ دیکھو تماشہ دکھائیں گے۔" کبھی نرمی سے کہتا کہ "ہم بھی نوکر ہیں اور وہ بھی فوجی، اپنی نوکری سے ڈرتے ہیں آپ کا نقصان ہی کیا ہے۔ کل تک ہمارے ساتھ رہیئے۔" پھر جب زراعت فارم سے باتیں کرتے آگرہ والی سڑک پر آئے تو ہنسکر کہتا ہے کہ "اچھا چلے جایئے۔"

۳

رات ہو چکی تھی اور ایک سوار آگرہ والی سڑک پر دور تک کئی میل جا کر لوٹ آیا۔ دو تین سوار ادھر اُدھر چکر لگا آئے۔ تب جا کر سڑک کنارہ ایک بڑے درخت کے نیچے پڑاؤ کی ٹھہری۔

صوبیدار بڑا باعزہ دار آدمی نکلا۔ جنگِ عظیم پر ہو آیا تھا۔ سپاہی تھا اور سپاہی سے بہادری کے صلہ میں صوبیداری ملی۔ میں نے وقت کو غنیمت جانا۔ پوچھا کہ صوبیدار صاحب بہادری آپنے وہاں کیا دکھائی۔ ہنسنے لگا اور بولا کہ بہادری ہم نے یہ دکھائی کہ اپنی فوج کے صاحب کو بچا لیا۔

سب کو بھوک لگ رہی تھی۔ درخت کے نیچے جگہ جگہ چارجامے بچھا دئے گئے۔ تین سوار مسلح تین طرف پہرے پر مقرر ہوئے۔ زراعت کے سپرنٹنڈنٹ کی معرفت ایک قریب کے گاؤں سے پوریوں اور مٹھائی کا انتظام صوبیدار نے کیا تھا۔ آدمی پوریاں لیکر آگیا اور لوگ اپنے اپنے سامنے پوریاں رکھکر کھانا شروع کیں اور غپیں شروع ہو گئیں۔ میرے ساتھی کھانے میں دو پٹھان اور بھی تھے۔ صوبیدار صاحب نے اپنی بہادری اور عراق کی لڑائی کا قصہ شروع کیا۔

کہنے لگے "کبھی ہم بصرہ لام پر ہو آئے مگر نہ ہمارے کوئی گولی تلوار لگی اور نہ ہم نے کسی کی آج تک جان لی اور الیشور کی کرپا سے سپاہی سے صوبیدار بھی ہو گئے اور بہادری کا تمغہ بھی مل گیا ......"

میں نے پوچھا کہ "بہادری کا تمغہ کیونکر ملا؟"

صوبیدار بولے "سنتے جاؤ۔ درجنوں مورچوں پر ہم لڑے سینکڑوں رائفل کے فیر کئے مگر پتہ نہیں ہماری گولی کسی کے لگی بھی۔ ہمیشہ دُور ہی سے لڑائی رہی کبھی ہاتھا پائی والی جنگ کا موقعہ نہ آیا تھا۔ کہ ہمارے رسالہ کو آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ پوری فوجی تیاری ہوئی۔ پلٹن پیچھے بڑھی اور ہم کوئی آٹھ دس ہزار سوار آگے بڑھے۔ توپ خانہ ہماری پُشت پر تھا۔ سامنے ہمارے ویران سا علاقہ تھا جو دریا سے فاصلے پر چلا گیا تھا۔ ہم سے آگے ہمارا ایڈوانس کالم تھا۔ کوئی صبح کے دس بجے ہوں گے کہ ایڈوانس کالم کے سوار بھاگتے ہوئے آئے اور یہ خبر لائے کہ عربوں کی ایک بڑی زبردست جمعیت اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار آتی ہے جس کے ایڈوانس گارڈ کے ستر سواروں سے اُن کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا کیا جائے۔ بہت جلد طے ہو گیا کہ ایڈوانس کالم بڑھ کر چاروں طرف دیکھے اور چار آدمی اپنے توپ خانہ اور پلٹن کو اطلاع کرنے دوڑ آئے اور ہم سب لوگ اپنی اپنی رکابوں پر کھڑے ہو کر چاروں طرف گردنیں اُٹھائے دیکھ رہے تھے کہ ایکدم سے گویا آگئی آندھی۔

افق پر گرد و غبار کا طوفان اوٹھا اور اسکو چیر کر ایک قطار سی تھی کہ متحرک اونٹوں اور گھوڑوں کی نظر پڑی۔ بجائے سیدھی ہماری طرف آنے کے ہماری پُشت کی طرف سرعت سے بڑھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ہمارا راستہ کاٹنا چاہتے ہیں۔ فوراً ہم نے خود حرکت کی اور تیزی سے واپس لوٹنا شروع کیا۔ مشکل سے میل بھر پر پہونچ پائے ہونگے کہ عربی رسالہ سے ہماری ٹکر ہو گئی، اور ہم اچھی طرح جنگ شروع بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ہماری پُشت کی طرف سے ہی ایک کثیر تعداد نے ہم پر حملہ کر دیا۔ اور دونوں طرف سے اسقدر زیادہ دشمن کا نرغہ ہوا کہ بجائے لڑنے کے ہمیں نرغہ سے نکلنے کی سوجھی ورنہ اندیشہ تھا کہ اگر گھر گئے تو خاتمہ ہے۔ بجائے حملہ کے لڑتے ہوئے نکل چلنے کا حکم دیا گیا اور اُس میں ہمارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ عربوں کی رسالہ کے دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے اور ہم گویا دو چکی کے پاٹوں کے بیچ میں سے نکل کر سر پر پیر رکھکر بھاگے۔ چشم زدن میں ہماری جنگی ترتیب درہم برہم ہو گئی اور بھاگنے کی سوجھی، عرب لوگ پیچھے سے ہمیں مار رہے تھے، ہمارے رسالہ کا وہ حصہ جو اُنکو روکتا وہ بھی پُشت دکھا چکا تھا اور ہمارے صاحب نے ہم سے کہا "مین بھاگو"۔

عربوں نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ کہ چُن چُن کر انگریزوں کو مارنا شروع کیا۔ انگریز تھے تھوڑے اور ایک ایک انگریز کے پیچھے پچاسوں عرب لگ گئے۔ وہ بھی ایسے کہ دائیں اور بائیں کی خبر نہیں اور انگریز کا پیچھا لئے ہیں۔ اس طرح چُن چُن کر انگریز مرتے دیکھکر ہمارے صاحب کے حواس جاتے رہے اور ادہر بیچ بیچ عربوں نے ہمیں دابا۔ وہ بھی ایسا کہ دو چار دفعہ ہم میں سے کوئی ہندوستانی زد پر ہے مگر عرب "صاحب" کی دُھن میں ہیں ہم پر وار نہیں کرتا بہت جلد ایک زبردست سیاہ گھوڑے پر سوار عرب معہ اپنے دو چار ساتھیوں کے صاحب کے اور میرے پیچھے ایسا لگا کہ معلوم ہوا کہ اب ہمارا خاتمہ ہے۔

صاحب کا گھوڑا بہت اچھا تھا لیکن عرب کا گھوڑا بھی بہت اچھا تھا۔ اُس کی تلوار ہاتھ میں تھی اور ادہر میرے ہاتھ میں بھی برہنہ تلوار تھی۔ جتنا صاحب زور مار کر بھاگتے اتنا ہی وہ بھی آتا اور چشم زدن میں وہ اپنے گھوڑے کو دبا کر بڑھا لایا

[redacted]

اور میرے بالکل ہی قریب پہونچا۔ میں صاحب کے برابر ہی تھا کہ ایکدم سے ہاتھ بھر عرب کا گھوڑا جیسے اُڑکر میرے برابر پہونچا۔ مگر بجائے میرے اوپر وار کرنے کے عرب نے گھوڑے سے گھوڑا ملا دیا اور اس زور سے تلوار کا وار صاحب کے سر پر کیا کہ اگر میں اُسکی تلوار اپنی تلوار پر نہ روکوں تو صاحب کا خاتمہ ہی تھا۔ وار کے ساتھ ہی اُس کا گھوڑا پیچھے رہ گیا اور ہم اور صاحب نکل آئے۔ بہت جلد عربوں نے ہمارا تعاقب چھوڑ دیا اور لوٹ گئے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے ہمارا توپ خانہ اور پلٹن قریب ہی ہے۔ یہ دوڑ کوئی دو میل کی ہوگی، صاحب کا چہرہ فق ہوگیا تھا اور کہنے لگے کہ سا ملیا سنگھ آج تم نے بڑا بہادری کیا اور ہماری جان بچالی۔ یہ تھی وہ بہادری جس کے صلہ میں بہادری اور پھر کم عمری ہی میں صوبیداری مل گئی"۔

(۴)

رات کو دیر تک ہم سب باتیں کرتے رہے۔ صوبیدار صاحب مجھ سے اب اسقدر راضی تھے کہ اُن کا ذہن اب دوسری طرف دوڑا۔ وہ میری فوجی ملازمت کے مسئلہ پر غور کر رہے تھے۔ میں نے کہا ضرور۔ میں ضرور آپکے محکمہ میں نوکری کرونگا۔ بخشے مجھے یہ طے ہو چکا تھا کہ میں پیت رو نہیں ہوں اور دراصل اب طرح طرح سے معذرت ہو رہی تھی۔ باتیں کچھ اس طرح کھل کر ہوئیں کہ سبکو یقین ہوگیا۔ کوئی گیارہ بجے ہم سب سو گئے۔ مگر تو یہ کیجئے آرام سے سونا ملجاتا تو بات ہی کیا رہتی۔

کوئی رات کے دو بجے ہونگے، چاند نکلا ہوا تھا۔ نیند انتہا سے زیادہ خوشگوار تھی کہ اور ہی معاملہ درپیش ہوا پہرے والے سوار نے آکر سب کو جگا دیا کہ آگرہ کا ایڈوانس گارڈ آرہا ہے۔ ہم سے تعداد بہت زیادہ ہے اور چھاپہ ہم پر ماریں گے ہیں جناب اس خبر کے سُنتے ہی سخت گھبرایا۔ یہ سوچکر کہ ان احمقوں کی دھینگا مُشتی میں کہیں میں نہ پس جاؤں۔ گھبراکر میں نے صوبیدار سے پوچھا کہ کیا لڑوگے۔ "ہاں"۔ اُس نے سر ہلا کر کہا۔

"ارے"! میں نے گھبراکر کہا۔ "کیا سچ مچ"۔ اب وہ بیہودہ بجائے اسکے کہ کہے جھوٹ موٹ کہتا ہے کہ "تم دیکھتے جاؤ........ دشمن زیادہ ہے"۔ دوسری طرف مُڑکر اُس نے دوسرے سوار سے کہا۔ اب میں پوچھتا ہوں تو جلدی اور گھبراہٹ میں جواب کون دے۔ اپنے اپنے گھوڑوں پر پہونچے اور میں ان سے فاصلہ پر۔ جب میری نہ سُنی تو میں نے غُل مچا دینے کی دھمکی دی۔ صوبیدار صاحب نے بگڑ کر مجھے اطمینان دلایا اور کہا۔ علیحدہ چُپکے بیٹھے رہو۔ اب سامنے دیکھتا ہوں تو آگرہ کے بیہودے بڑی تعداد میں چلے آرہے ہیں۔ دُور سے چاندنی رات میں ایک متحرک سیاہ دھبہ سا تھا جو بجائے سیدھ میں آنے کے درختوں کی آڑ پکڑکر سڑک کی طرف ہولیا۔ اب گویا درختوں کی آڑ میں ہوکر وہ سڑک پر سے گذرتا۔ کوئی سو آدمی ہونگے۔ مگر واہ رے ہمارے دہلوی صوبیدار۔ اُس نے سوچ لیا کہ میدان نہ چھوڑیں۔ چشم زدن میں اس تجربہ کار نے بتا دیا کہ شبخون مارنے وہ نہیں آرہے ہیں بلکہ اُن کو معلوم ہی نہیں کہ ہم لوگ یہاں ہیں اور کتنی تعداد میں۔ وہ لوگ سب پیدل تھے مگر اُن کے دو تین سوار بطور ایڈوانس گارڈ آگے تھے اور اب صوبیدار کی یہ تجویز ہوئی کہ اگر ان ایڈوانس گارڈ کے سپاہیوں کو ڈرالیا تو فتح ہے۔

صوبیدار نے ذرا ہٹ کر ایک درخت کے اندھیرے میں سڑک کے کنارہ اپنے آدمیوں کو کھڑا کیا اور تین آدمیوں کو پیچھے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر بگل دیکر کھڑا کیا۔ آگرہ والوں کے دو سوار آہستہ آہستہ سڑک پر آرہے تھے، جب وہ ذرا دور رہے تو صوبیدار نے اس زور سے کڑک کر نعرہ مارا کہ میدان ہل گیا۔ گھوڑا آگے بڑھا کہ...... "پریپرن مون.... ٹٹاک"[۵] آواز کے سُنتے

[۵] تیار ہو اور حملہ کرو۔ (Prepare mount & attack) کا مٹی خراب ہے۔

ہی درخت کے نیچے سے گھوڑے تڑپڑ کرکے پختہ سڑک پر آئے اور ساتھ ہی پیچھے والے تین آدمیوں نے حملہ کا بگل ایسے دیا جیسے سارا رسالہ ہی تو یہاں موجود ہے۔ یہ کرنا تھا کہ آگرہ کے سوار جو سر پر پیر رکھکر بھاگے ہیں تو گرد نہ ملی۔ انھوں نے جاکر آگرہ کی سپاہ سے کہا ہوگا کہ دشمن کافی قوت میں موجود ہے اور صوبیدار نے جو دوربین لگاکر دیکھا تو فاصلے پر دشمن کو بے ترتیبی سے بھاگتے پایا۔ بس نہ پوچھیئے صوبیدار صاحب کی خوشی کا حال۔ نتیجہ یہ کہ اب کوئی نہ سویا اور باتیں کرتے صبح کردی۔ اور مجھے بھی صبح کی گاڑی سے جانے دیا۔ میں ان مسخروں سے جان چھڑاکر جو بھاگا ہوں تو اسٹیشن آکر دم لیا اور صحیح سلامت گھر پہونچا۔ جب میں اس محکمہ پر براپولا حول بھیجتا ہوں اور ہر جمعدار اور صوبیدار کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا ہوں اور جب اس امر پر غور کرتا ہوں کہ ان لوگوں نے ایک مرتبہ یہ مذبوحی حرکت کی کہ مجھے "بیرو" سمجھا اور کسی طرح نہ مانے تو جی میں تو یہی آتا ہے کہ ان کا محکمہ ہی ایک سرے سے توڑکر سب کے سب یکقلم موقوف کردئے جائیں کہ جاؤ بچّا اپنے کھیت جوتو۔

عظیم بیگ چغتائی،

زبانِ محبّت

محبت کی زبان کیا ہے؟

سُرخی کی وہ لہر جو راز فاش کرنے والے اُداس رُخسار پر اچانک نمودار ہوتی ہے اور پھر دائمی زردی میں تحلیل ہوجاتی ہے۔ وہ ایک آنسو جو ترچھی نظروں کی گھنی پلکوں پر تھرتھراتا ہے۔ وہ ایک تبسّم جو فوراً آہ سرد میں تبدیل ہوجاتا ہے ۔۔۔۔ یہی ہے محبت کی زبان!

محبت کی زبان کیا ہے؟

دل کی بے ربط دھڑکن، سیماب دار نبضوں کا ایک عجیب احساس درد کیساتھ ٹھہرکر سست پڑجانا۔ پھر نئی نئی اُمنگوں کا سپیدہ سحری کی طرح خاموشی سے بڑھکر سارے جسم میں سنسنی پیدا کردینا ۔۔۔۔ یہی ہے محبت کی زبان!

محبت کی زبان کیا ہے؟

بلند ہمتوں کا ایکدم سے پست ہوجانا، من کی دنیا میں ایک غیر معلوم روشنی کے بس جلنے پر دل کا موم ہوجانا۔ دُنیا کی ہر حسین چیز میں متلاشی نظروں سے ایک ہی پیاری صورت کا ڈھونڈھنا۔ شرمیلے پن سے ہاتھوں کے چھُوجانے پر کانپ کانپ جانا۔ میٹھی نظروں اور مشتاق ہونٹوں کا ایک بار مِل کر کبھی جُدا نہ ہونا ۔۔۔۔ یہی ہے محبت کی زبان!

محبت کی زبان کیا ہے؟

بڑی سے بڑی تقریر کا اپنی کم مائیگی کے احساس سے سکوت میں تبدیل ہوجانا۔ میٹھی نظروں کے ملنے سے شعلۂ محبت کا اُس بجلی کی طرح چمک اُٹھنا جو طوفان کی آمد کا پتہ دیتی ہے۔ اور پھر طویل و خوش آیند خاموشی کا طاری ہوجانا۔ دھڑکتی ہوئی نبضوں میں دُکھ اور سُکھ کے ایک تند سیلاب کا برپا ہوجانا۔ ایک ایسے آغوش کی تمنّا۔ جہاں وارفتگی بے پایاں خوشی میں تحلیل ہوجاتی ہے۔ ایک پُر ارمان، جوشیلے بوسے پر مسرت کی تھرتھری! ۔۔۔۔ یہی ہے محبت کی زبان!

(ترجمہ) ا۔ ن۔ ص۔ ا۔ م

کاروبارِ نشاط

راستے میں اُس سمن پیکر کی نظروں کا سلام
چشمِ نکتہ فہم کو دیتا ہے مے کا ایک جام
اِک محبّت زادِ گُستاخیٔ عدم! اُنکے حضور
بخشتی ہے دل کو کیا وجد آفریں کیف و سرور
لڑکھڑا کر باغ میں گِرنا کسی محبوب پر
بھُولتے ہیں اتفاق ایسے حسیں، کب عُمر بھر
گرمیوں کی دوپہریں گاؤں کی پریوں کے راگ
بڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں جلتی ہوئی اُلفت کی آگ
بنسری کی آتشیں لَے، اور نگاہوں کی مٹھاس
جس سے بُجھتی بھی ہے اور بڑھتی بھی ہے شاعر کی پیاس
کتنے زرّیں عیش ہیں بکھرے ہوئے ہر گام پر
میں توجّہ کیا کروں، دُنیا! ترے آلام پر

عہد شکنی

از جناب دیوانہ بریلوی

"زندگی! نام ہے خودغرضی کا —— دُنیا میں جو زیادہ مطلب پرست ہو وہ ہی کامیاب تر ہی —— ایمانداری! تم بھی کیا باتیں کرتے ہو! —— مجھے تو اسکے نام پر ہنسی آتی ہے —— ہنسی۔"

نمبر ۱۰۲ نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں یہ الفاظ کچھ ایسی صفائی اور احتیاط سے کہے کہ پاس والے سُننا تو کجا، اس کے ہونٹوں کی جنبش بھی محسوس نہ کر سکے۔ دورانِ گفتگو اس کی سراسیمہ نظروں کو ہر امکانی احتیاط اور لبوں کی حرکت کو ہر ممکن پاس مدِنظر رہا۔ اس کے الفاظ فقط مخاطب ہی سُن سکا جو اس سے بالکل ملا ہوا کھڑا تھا۔ نمبر ۱۰۲ کو اس میں کمال حاصل تھا کہ ایسے موقعوں پر بات کرتے وقت اپنے چہرہ پر اطمینان اور نظروں میں غیر انتشاری حالت قائم رکھے۔ جو رفتہ رفتہ اس کی عادتِ ثانیہ بن گئی تھی۔

"تم کو ہنسی آتی ہے؟" نمبر ۸۹۷ نے اسی احتیاط اور آہستگی سے پوچھا —— مگر نہ اس صفائی اور بیساختہ پن سے "شکر ہے فضلو! مجھے ایسی شے کی تلاش تھی جو تم کو ہنسا سکے۔"

نمبر ۱۰۲ نے "ہُشش" کہہ کر مونچھ کا مٹھا سنبھالا اور موگری چلانے لگا۔

وجہ یہ تھی کہ غلام دستگیر خاں، جمعدار جیل ہاتھ میں ہنٹر لئے آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے ادھر آ نکلے تھے۔ اُن کے بھدے بیڈول سیاہ چہرے پر بھری ڈاڑھی کا چڑھاؤ اور گھنی مونچھوں کا تاؤ ہی کیا کم ہیبت ناک نظارہ تھا۔ مزید براں اس چکنی سیاہی پر اُن کی چمکتی ہوئی سفید آنکھیں، سُرخ لائٹ سے کسی طرح کم توت نہ رکھتی تھیں۔ برآمدے میں کچھ دیر کے لئے کھڑے ہو کر ان دونوں پر ایک غضب آلود نگاہ ڈالی —— مگر انکو مصروفِ کار پا کر جلد ہی اپنے قدم دوسری طرف بڑھا دیئے۔ سامنے کمرے میں چند قیدی فرش اور دیواروں کو دھو دھو کر صاف کر رہے تھے۔ غلام دستگیر خاں نے ان پر بھی ایک تحکمانہ نظر ڈالی۔ اور آگے بڑھ گئے۔

"کمبخت! حرامخور!" نمبر ۱۰۲ نے منہ ہی منہ میں کہا۔ بلکہ اور اسی طرح کی دس پانچ صلواتیں سُنا کر اپنا دل ٹھنڈا کرنے کے بعد بولا "جب دیکھو چھچھوندر کی طرح کونہ کونہ سونگھتا پھرتا ہے۔ آنکھیں بدنصیب کی سور کی طرح چہرہ میں دفن ہوتی جاتی ہیں۔"

نمبر ۸۹۷۔ "مجھے بھی اس کی صورت سے نفرت ہے...... مگر خیر تھوڑی دیر کے لئے تو فرصت ہوگئی۔ اب موذی ادھر جلد نہ آئیگا۔ —— بڑا سُست اور عہدی ہے۔"

قیدخانے کی بھدّی نیم آستین کرتی اور اُٹنگے جانگیئے کے باوجود نمبر ۸۹۷ کی رگوں میں ایک ایسی جھلک نمایاں تھی جس نے اُس کے مجسمہ میں اس حالت پر بھی ایک حُسن جاذبیت قائم رکھی تھی۔ روشن آنکھوں کی حیاداری۔ ہموار پیشانی کی صفائی۔ چہرے کا سڈول پن۔ اعضاء کا تناسب۔ لبوں پر شباب آفریں تبسم اور ماتھے کا شاندار اٹھان ایسے حقوق تھے جنکا جیل خانہ میں تقریباً چار سال کا طویل زمانہ گذارنے کے بعد ایک قیدی کیلئے برقرار رکھنا کسی طرح جائز اور روا نہ تھا۔ گو قید خانہ کی پُرازمصائب آلامِ زندگی نے اُس کے رخساروں کی رنگینیت کو مفقود کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی اس کی ہر حرکت میں ذوقِ سلیقگی۔ ایک کیفِ برد باری نمایاں رہتا۔

نمبر ۱۰۲ کی اور بات تھی۔ اُسکے چہرے کی تمام خصوصیات پھیکی بلکہ

[redacted]

معدوم ہوچکی تھیں۔ چندے سر کے پچھلے حصہ میں لمبے لمبے بے ترتیب بال کانوں کے گوشوں سے جھانک رہے تھے۔ کاغذی ہونٹوں پر استقلال نمایاں تھا۔ اس کی تیز اور نکیلی آنکھیں خونخوار شیر کی طرح ایک ساعت کیلئے ساکت نہ ہوتی تھیں۔ اس کی نظریں ہردم داہنے بائیں۔ اوپر نیچے ہر شئے پر خونخوارانہ پڑتیں اور ہٹ جاتیں۔ محنت اور مصیبت نے اس کے چہرہ میں کرختگی اور روزہاپن پیدا کر دیا تھا ـــــ اس چہرہ میں کبھی اگر حسین نہیں تو متین اور بھولا ہونیکا دعویدار ضرور رہا ہوگا۔ اس کے شانوں کا ڈھلاؤ۔ ہتیلیوں کے ڈھٹے اور چہرہ کی زردی قید خانہ کی قدیمی سرپرستی کے خود بخود شاہد تھے۔ صورت سے عمر پچاس سے کم کی نہ جچتی تھی۔ اس کے نام کی تختی پر لکھا تھا۔

نمبر ـــــ ۱۰۲۔

نام ـــــ فضل حسین عرف فضلو۔

عمر ـــــ ۴۱ سال۔

جرم ـــــ ڈکیتی۔

میعاد سزا ـــــ دس سال۔

فضلو نے بغیر ہاتھ روکے آہستہ سے کہا "تم بڑے خوش قسمت ہو ـــ اب ایک ہی مہینہ اور باقی ہے نا؟"

نوجوان نے ٹھنڈی سانس لیکر جواب دیا "ہاں انتیس دن اور ہیں ـــ ۶۹۶ گھنٹے ـــ ۴۱۷۰ منٹ!"

فضلو نے یہ حساب سنکر ایک گہری سانس لی اور دل ہی دل میں منٹ اور گھنٹے تو کجا اپنے متعلق مہینوں کا شمار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر خاموشی کے ساتھ مونجھ کٹتی رہی۔

فضلو نے ایک بار کنکھیوں سے دیکھ کر پوچھا "کہو صاحبزادے اب کیا ارادہ ہے؟"

نمبر ۷۸۹ "کیا بتاؤں ـــ نہ کوئی ارادہ ہے اور نہ کوئی سہارا ـــ بس اللہ مالک ہے۔"

فضلو "تو کیا توبہ کی ٹھہرائی ہے"

نمبر ۷۸۹ "ہاں ارادہ تو یہی ہے۔ آیندہ خدا کو اختیار ہے"

فضلو۔ (مسکراکر) "بیوقوف ہوئے ہو"

نمبر ۷۸۹ "کیا مطلب!"

فضلو "توبہ یا دعویٰ پارسائی صرف بیوقوفوں کا فعل ہے"

نمبر ۷۸۹۔ کیوں؟

فضلو۔ اس لئے کہ مجھ پر خود بیتی ہے۔ مجھے خود تجربہ ہے۔ ایک سزا یافتہ کو پارسا بننے کے لئے کافی موقعے ہاتھ آتے ہیں۔ مگر تم کو یہ نہیں معلوم کہ قید خانہ کچھ ایسے غیر فانی نقوش چہرے پر مرتسم کر دیتا ہے جو تاحیات ماند نہیں پڑتے۔ اور کمال یہ ہے کہ لوگوں کی نظریں ان کے امتیاز میں کبھی خطا ہی نہیں کرتیں۔ کسی دفتر۔ بنک یا عدالت میں جاکر دیکھ لیجئے۔ پہلی نظر میں انکا صاف جواب یہ ہوگا کہ بذات خود ہمکو تو اس میں کوئی اعتراض نہیں لیکن ہمارا عملہ سزا یافتہ لوگوں کے ساتھ کام کرنے پر سخت معترض ہوتا ہے۔

نمبر ۷۸۹ بغیر کوئی جواب دئے اپنا کام کرتا رہا۔ مگر اس کے ماتھے کی شکنیں اسکے غور و خوض کا پتہ دے رہی تھیں۔

فضلو نے پوچھا۔ تم پہلی مرتبہ آئے ہو نا۔؟

نمبر ۷۸۹۔ ہاں۔

فضلو۔ کس جرم میں۔؟

نمبر ۷۸۹۔ غبن کے سلسلہ میں۔

فضلو۔ غالبًا بے قصور!

نمبر ۷۸۹۔ سچ پوچھو تو روپیہ میں نے چرایا ضرور تھا۔

فضلو۔ (مسکراکر) اچھا اچھا مگر دیکھو ـــــ یاد رکھو کبھی کسی جرم کا اقبال نہیں کیا کرتے۔ ہم سب یہاں بے قصور ہی تو ہیں! اگر داروغہ جیل نے کہیں سن پایا کہ تم واقعی مجرم ہو تو خدا جانے کس مصیبت میں پھنس جاؤ ـــــ تم اپنے ساتھ

ہم بے گناہوں کو بھی لے ڈوبوگے۔!

نمبر ۸۹ ہنس دیا اور بولا۔ یہ تو واقعہ ہے کہ میرا کچھ قصور نہ تھا۔

فضلو۔ ہاں اب آئے راہ راست پر۔ کسی دوسرے نے تمہاری جیب میں نوٹ رکھدیئے ہونگے۔!

نمبر ۸۹۔ نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ میں نے جو کچھ کیا میرا حق تھا۔ میں جوان تھا۔ تنہا تھا۔ مجھے روپے کی ضرورت پیش آئی۔ ہر طرف مانگا جانچا۔ مگر جب کہیں نہ ملا تو مجبوراً میں نے بنک کے روپے سے اپنا کام نکال لیا۔ یقین مانناکہ میری نیت میں خامی کا شائبہ ہی نہ تھا مگر بنک والوں نے مجھے مجرم قرار دیدیا۔۔۔ میں سمجھتا ہوں فضلو تم بھی بالکل بے قصور تھے۔

فضلو۔ بالکل بے قصور ۔۔۔ قصوروار تو سوسائٹی ہے نہ کہ میں۔ سُنو، میں تم کو بتاتا ہوں کہ پہلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو تمہاری طرح نوجوان تھا، میں اپنے بڑے بھائی خلیل الرحمٰن کے ساتھ ایک بنک میں ملازم تھا۔ وہ انتہائی خلیق۔ نیک اور ایماندار تھے۔ ایک دن بنک کی ایکہزار کی تھیلی کسی نے اُڑادی۔ مجھے کامل یقین تھا کہ یہ حرکت کسی بڑے پیٹ والے کی تھی مگر کیا کرتا۔ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ واقعات کچھ ایسے پیش آئے کہ بالآخر میرے بھائی پر سارا الزام عائد ہوگیا۔ عدالت نے اُن کو سزا دیدی۔ وہ بیچارے ایسے شکنجے میں پھنس گئے کہ کسی طرح اپنی معصومیت ثابت نہ کرسکے۔ وکیل اور بیرسٹروں کے لئے روپے کی ضرورت تھی۔ میں نے اُن کا مقدمہ ہائیکورٹ تک لڑنیکے لئے بنک پر ہاتھ ماردیا۔ مگر قسمت کی خوبی میں بھی گرفتار ہوگیا۔ چنانچہ بھائی صاحب کو لمبی اور مجھے خفیف سزا دیکر دونوں کو مختلف قیدخانوں میں ڈالدیا ۔۔۔ میری بیوی اور ایک بچّی تھی۔ بیوی تو مرگئی اور شاید بعد کو بچّی بھی۔ ایک منٹ کیلئے فضلو خاموشی کے ساتھ مونچھ کو مٹتا رہا اور پھر بولا۔ جیل میں میری اِصلاح کی خاص کوششیں کی گئیں مگر اِصلاح وصلاح تو خاک نہ ہوئی بلکہ برخلاف اُسکے میں ایک ہوشیار اور شاطر چور بن گیا۔

مونچھ کا مٹھا بدلتے ہوئے نمبر ۸۹ نے پوچھا، تمہارا رحجان کبھی پارسائی یا راستبازی کی طرف بھی ہوا؟

فضلو۔ ہاں کچھ دنوں کے لئے ضرور ہوا۔ مگر مجھے اپنے بڑے بھائی کی دیانتداری اور نیکی کے نتائج ہمیشہ پیشِ نظر رہے۔ وہ فرشتہ خصلت ہستی باوجود اپنے زہد و تقویٰ کے قعرِ مذلت میں پڑکر اپنی زندگی کے دن بالآخر جیل کی محبوس کوٹھریوں میں گذار رہی تھی ۔۔۔ راستی موجب رضائے خداست، میں کہتا ہوں بالکل مہمل۔ غلط ۔۔۔ بیوقوفوں کی دو قسمیں ہیں ۔۔ ایک نیک اور خداپرست۔ دوسری بدمعاش اور دُنیاپرست۔ مگر نتیجہ دونوں کا جیل! اِس لئے میں نے فیصلہ کرلیا کہ.........

وہ دفعتہً خاموش ہوگیا اور اپنی موگری زیادہ مستعدی اور طاقت کے ساتھ چلانے لگا کیونکہ گرد اور بھوسہ کی ہلکی سی اوٹ میں سے غلام دستگیر خاں جمعدار کی خونخوار نظریں ان پر جمی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ نمبر ۱۰۲ و نمبر ۸۹، کو اپنے کارِ منصبی میں سرگرم پاکر جمعدار صاحب آگے بڑھ گئے۔

فضلو کے چہرے پر اظہارِ نفرت کی پیچ در پیچ شکنیں نمودار ہوگئیں، نمبر ۸۹، کی طرف مُنہ پھیر کر اُس نے پوچھا، کہو اس کی بابت کچھ اور سُننا چاہتے ہو،

نمبر ۸۹۔ ہاں۔ ہاں۔ کہے جاؤ۔ وقت گذر رہا ہے۔

فضلو۔ خیر میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ دُنیا خلاف ہوتی ہے تو ہو۔ ایمانداری کو بالائے طاق رکھکر میں نے بنک پر ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا۔ مگر اِس مرتبہ فرق اتنا تھا کہ میں نے ہتھوڑی

اور چھینی ہی استعمال کی۔ لیکن یہ پرانے قسم کے اوزار بنک کے مضبوط تالوں۔ کنڈیوں اور لوہے کی الماری پر بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ فی زمانہ چوری کے لئے بھی ہنر کی ضرورت ہے اور جدید آلات۔ ہتھیار اور اوزاروں کی۔ یہی وجہ تھی کہ میں بیٹھے بیٹھے جیل گرفتار ہو گیا اور اب یہاں خانماں برباد ہوں۔

"کیوں بے! لگالی ڈبکی۔ تم دونوں مردود نہ مانو گے؟" ایک کرخت اور بارعب آواز ان الفاظ سے سارے کمرے میں گونج گئی۔ نظر اُٹھی تو جمعدار کی شرر فشاں آنکھیں شعلۂ ملتہب کی طرح دمک رہی تھیں۔

دونوں نے اپنی موگری کی رفتار تیز کر دی۔

کچھ دیر گذری تو ایک گوشے سے ہنٹروں کی بوچھار اور مظلوم کی آہ و بکا سے ساری فضا متاثر ہوئی بلکہ ہر فرد اپنے کار منصبی کی انجام دہی میں زیادہ احتیاط۔ سرگرمی اور مستعدی کا اظہار کرنے لگا۔

ایک مردہ سی گھنٹی بجنے کی آواز پر تمام قیدی اپنا اپنا کام چھوڑ کر آگے پیچھے آہستہ آہستہ باورچی خانہ کی طرف جانے لگے جہاں دن بھر کی محنت شاقہ کے بعد ان کے پیٹ بھرنے کے لئے جو سامان تھا اس کی عفونت اور بھبکے کے باعث حیوان بھی اُس پر منہ ڈالنے سے گریز کرتے۔

دوسرے دن مونجھ کے ایک اچھے خاصے پہاڑ کے سامنے دونوں پھر ملے۔ فضلو نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ کہو اب بھی توبہ کا ارادہ ہے؟

نمبر ۵۸۹۔ ہاں۔ کم از کم رات بھر میں سوچتا تو یہی رہا۔

فضلو۔ صاحبزادے۔ کیوں پاگل ہوئے ہو ــــ دیکھو میرے بھائی کا کیا حشر ہوا ــــ انھوں نے ایمانداری کا کیا پھل پایا؟

نمبر ۵۸۹۔ تمہارے بھائی کا کیا حشر ہوا؟ ــــ تمہارا مطلب ہے کہ قید خانہ سے چھوٹنے کے بعد!"

فضلو۔ چھوٹنے کا حال تو مجھے معلوم نہیں۔ کیونکہ میں پھر کبھی اُن کو نہ دیکھ سکا۔ جب وہ رہا ہوئے تو میں دوبارہ قید خانہ میں تھا۔ اب خدا جانے اُن کو زمین کھا گئی یا آسمان ــــ غالباً انہوں نے اپنا نام تبدیل کر لیا اور کہیں چین یا جاپان روپوش ہو گئے۔

نمبر ۵۸۹۔ ایک بات پوچھتا ہوں سچ سچ بتا دینا۔

فضلو۔ ہاں پوچھو!

نمبر ۵۸۹۔ تمہارا اصلی نام فضلو ہی ہے؟

فضلو نے اس بے ساختہ سوال پر اُسکو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور بولا۔ بس اب زیادہ نہ بڑھو۔

نمبر ۵۸۹۔ (گھبرا کر) میرا مقصد کچھ اور نہ تھا۔

فضلو۔ تو کوئی ہرج نہیں ــ میرا نام دوسرا ضرور ہے اور بھلے آدمیوں کا سا بھی۔ مگر اس کے لینے کا نہ تو اب مجھے حق حاصل ہے اور نہ دل ہی چاہتا ہے۔ ہاں بہت ممکن ہے کہ میری بچی اگر زندہ ہو تو اُس کے نام کے ساتھ کبھی میرا نام بھی لے لیا جاتا ہو ــــ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے قصداً سلسلۂ گفتگو دوسری طرف منتقل کرتے ہوئے پوچھا، کیوں فہیم! اب تمہارے بس ۲۸ دن اور رہ گئے ہے؟

ہاں ۲۸ دن ــــ ۶۷۲ گھنٹے ــــ ۴۰۳۲۰ منٹ یا ۲۴۱۹۲۰۰ سیکنڈ، فہیم نے مسکرا کر حساب گنا دیا۔

فضلو۔ مگر میرے تو ابھی پورے آٹھ برس باقی ہیں۔

فہیم۔ تو فکر کی بات کیا ہے۔ تمہاری عمر ایسی بہت تو نہیں ــــ چھوٹتے وقت زیادہ سے زیادہ پچاس کے ہو گے۔

اتنی دیر تک دونوں سر جھکائے مستعدی سے کام کرتے رہے کہ جمعدار صاحب ٹہلتے ہوئے انکے سامنے سے گذر کر آگے بڑھ گئے۔ مطلع صاف پاکر فضلو نے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے پوچھا۔ کہو، کہیں کچھ روپیہ بھی رکھ آئے ہو؟

فہیم۔ (سر ہلاکر) ایک کوڑی نہیں۔

فضلو۔ افسوس! مگر تم پریشان نہ ہو — میں انشاءاللہ کچھ نہ کچھ بندوبست کر دونگا۔

کچھ دیر تک دونوں خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی موگریاں چلاتے رہے۔ جس کے بعد دفعتہً فضلو نے کہا۔ فہیم! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے!

فہیم۔ کہو۔

فضلو نے بقدر ہمت اُس کے کانوں کے قریب مُنھ لاکر کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تم یہاں سے دور کسی دوسرے ملک جاکر اپنی بقیہ زندگی سربفلک محلات میں گذارنا پسند کروگے۔ جہاں بجز عیش و راحت کے کوئی دوسرا کام ہی نہ ہوگا — کھانیکو نعمتیں، پینے کو اعلیٰ ترین شراب، دلچسپی کے لئے منتخب حسینوں کے پرے کے پرے، سواری کو گاڑی گھوڑے، خدمت کو نوکروں کی فوج، اور سب سے بڑھ کر، نے غم دزد نے غم کالا، کمبخت پولیس والوں کی زد سے محفوظ ۔"

فہیم۔ ماشاءاللہ تجویز تو امید افزا ہے — مگر فضلو! تم کیا خواب دیکھ رہے ہو؟

فضلو۔ خواب کیسا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں — تم ذرا ہمت کر جاؤ — سب کچھ ممکن ہے۔

فہیم۔ اچھا بتاؤ۔

فضلو۔ تو سُنو، تم کو تو یہ معلوم ہی ہو کہ فی زمانہ کوئی اپنے فن میں کتنا ہی ماہر اور شاطر کیوں نہ ہو مگر کامیاب موقعہ مشکل سے ہاتھ آتا ہو۔ چھوٹے سے چھوٹے بنک کا خزانہ بھی پولیس کی معقول تعداد کی زیر نگرانی رہتا ہو۔ اس کے علاوہ بجلی کے تار، گھنٹیاں وغیرہ ایسی نامناسب ایجادیں ہیں جن کی وجہ سے کہیں قدم رکھنا دشوار ہو گیا ہے۔ فی زمانہ بنک کی ایک اشرفی بیداغ اُڑاتا غالب کے جوئے شیر لانے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔ بنک میں اگر کوئی صورت کامیابی کی باقی ہے تو اتنی کہ کوئی اندرونی خفیہ سازش کی جائے۔ گو اس میں بھی صدہا رکاوٹیں اور مشکلات پیش نظر ہیں۔ اول تو بنک میں ملازمت ملنا ہی کارے دارد۔ اور اگر بفرض محال اس میں کامیابی ہو بھی گئی تو وہاں کی سخت نگرانی سے یہ ناممکن ہو جاتا ہو کہ عمر بھر میں بھولے سے کبھی ایکدن بھی بنک کا ایجنٹ اپنے نوجوان کلرک کے پاس جا بیٹھا ہو کا یکجا چھوڑ جائے۔

فضلو نے ایک بار فہیم کو کنکھیوں سے دیکھ لیا — وہ ہمہ تن گوش تھا۔

اب ذرا غور سے سُننا۔ فرض کرو کہ تم کسی معقول شہر میں جاؤ اور وہاں کے بڑے سے بڑے بنک میں ملازم ہو جاؤ۔ تمہارے لئے یہ کوئی دقت کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ تمہارا چہرہ ابھی تک قیدخانہ کے منحوس اثرات سے بے نیاز ہے اور ویسے بھی تم ماشاءاللہ ذہین اور تیز طبیعت ہو میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم پانچ چھ سال کے اندر ہی اندر خزانچی یا معین خزانچی کے ذمہ دار عہدہ پر یقیناً پہونچ جاؤگے اور اس طرح باسانی روپیہ اُڑا سکوگے — مگر یوں نہیں۔ تم کو اپنی سچائی اور دیانتداری کا سکہ ہر کس و ناکس کے دل پر ایسا جمانا پڑیگا کہ شک و شُبہ کی گنجائش باقی نہ رہے متواتر آٹھ سال تک تم، مولوی عبدالرحمٰن بنے رہوگے۔ شرعی پائجامہ نیچا کُرتہ۔ دوپلی ٹوپی۔ لمبی ڈاڑھی اور پھر نماز روزہ تو کبھی بھول کر قضا نہ ہونے پائیگا۔ مسجدوں میں بیٹھ کر وظائف اور عام وعظ و میلاد کے جلسوں میں شرکت تمہارا روزمرہ

[redacted]

ہوگا ــــــ مختصر یہ کہ تم ایک نوجوان مذہبی مُلّا کا سچّا نمونہ پیش کروگے۔ ...... سمجھے؟

فہیم نے سر ہلا دیا۔

ایکدن علی الصبح دفعتہً تم کو معلوم ہوگا کہ کسی بدمعاش نے بنک پر چھاپہ مار دیا اور سارا روپیہ اُڑا لے گیا ــــــ تم سمجھے ــــــ وہ کون ہوگا؟ ــــــ وہ ہونگا میں۔ آٹھویں سال جب میں یہاں سے رہائی پاؤنگا تو تمہاری مدد، ہدایت اور رہنمائی سے سارے صندوق اور تجوریاں خالی کر دینا کتنا آسان ہوگا۔ روپیہ لے کر میں سیدھا چین کی طرف روانہ ہوجاؤنگا ــــــ اور وہیں تمہارا انتظار کروں گا۔ تمہاری شہرت، نیکی اور دیانتداری کی وجہ سے تم پر کوئی شبہ بھی نہ کرے گا۔ سال چھ مہینے کے اندر تم بیمار پڑ جاؤگے اور اس بہانے رُخصت حاصل کرکے سیدھے چین کا ٹکٹ لوگے۔ میرا تمہارا آدھا ساجھا ہوگا اور پھر نوابوں راجاؤں کا سا عیش رہیگا ــــــ بولو کیا کہتے ہو؟"

فہیم نے کوئی جواب نہ دیا ــــــ اس کی آنکھیں دلی اضطراب اور کشمکش کی ترجمان تھیں۔

فضلو نے زور دیتے ہوئے پھر کہا۔ "بھئی سوچ لو ــــــ اور خوب اچھی طرح۔ گو اس میں تمہاری عمر کے پورے آٹھ سال خرچ ہوتے ہیں مگر نتیجہ دیکھ لو کہ ملتا بھی کیا کچھ ہے۔ بھلا ہمارے حصے میں پچاس پچاس ہزار سے کیا کم پڑیگا ــــــ آٹھ نو سال کی نمائشی راستبازی میں پچاس ہزار کی رقم کوئی مہنگا سودا تو نہیں ہے ــــــ فہیم۔"

فہیم نے مردہ آواز میں جوابدیا۔ ہاں بھئی ــــــ سودا بُرا تو نہیں،

دونوں پھر تھوڑی دیر تک مونجھ کوٹتے رہے۔ فہیم کی نظریں مونجھ اور موگری سے کہیں علیحدہ جمی ہوئی تھیں ــــــ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

فضلو۔ یہاں کی مصیبتوں کا کفارہ وہاں پہونچ کر محلات میں ملے گا۔

٭٭٭

آخر کار، رہائی کے دن نمبر ۸۹ داروغہ جیل کے روبرو پیش کیا گیا جو عموماً رہائی پانیوالے قیدیوں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرتا اور نیکی اور توبہ کی تلقین کیا کرتا تھا چنانچہ فہیم کو دیکھکر بھی حسب عادت اُس نے کہا، چار سال کے بعد تم کو اس عذاب سے چھٹکارا ملتا ہے۔ یہ تمہاری پہلی نالائقی تھی۔ مگر آیندہ کیلئے آنکھیں کھول لینا ــــــ خبردار جو میں نے پھر کبھی تم کو یہاں دیکھا۔

نمبر ۸۹ نے سر ہلا دیا۔ اس کے لئے یہ آخری رسومات بھی صبر آزما ثابت ہو رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح ہو وہ گھڑی جلد آجائے کہ اس پنجرے سے نکلکر باہر کی کھلی فضا میں اطمینان کا سانس لے سکے۔

داروغہ جیل نے اس کی رہائی کے متعلق اندراجات کی تکمیل کرتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔ دیکھو، تم ابھی نوجوان ہو تعلیمیافتہ ہو اور ماشاءاللہ ذہین بھی ــ گو تم نے غلط راستہ اختیار کر لیا تھا مگر زندگی کے میدان میں کامیابی حاصل کرنیکے لئے اب بھی بہت وقت باقی ہے جس کا سارا دارومدار تمہاری عقل اور ہمت پر ہے۔ بتاؤ میاں فہیم اب بھی تمہارا ارادہ توبہ کا ہے؟

نمبر ۸۹ اس سوال پر چونک پڑا۔ شرمندگی سے سر جُھکا کر اُس نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ انشاءاللہ ارادہ تو یہی ہے۔"

"شاباش! ــــــ اگر تم اپنی عقل و ہمت کا صحیح استعمال کروگے تو یقیناً خدا تمہاری مدد کریگا۔ اچھا جاؤ خدا حافظ........"

قیدخانہ کے آہنی پھاٹک کا قفل اور زنجیر کھلنے پر اُسکو وہ وقت یاد آگیا جبکہ آج سے چار سال قبل یہی پھاٹک اسی شور اور کرختگی سے بند ہوا تھا۔

پھاٹک سے نکل کر اُس نے پہلا قدم ڈالتے ہی ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ ننگے پاؤں جسقدر جلد ممکن ہوسکا وہ مُنہ اُٹھائے آگے چلا گیا۔

بمبئی کے پُر رونق بازار میں جس وقت وہ داخل ہوا شام ہو چکی تھی۔ وہ عجلت کے ساتھ مشرقی بازار کی طرف مُڑ گیا، اور میلی کچیلی غیر آباد گلی کے آخری مکان کے دروازہ پر چند نشانات دیکھ کر رُک گیا۔ جیب سے ایک پرچہ نکال کر کچھ دیکھا۔ پھر ایک اطمینان کی نظر ڈالکر دروازہ کھولا۔ اور ایک تاریک مگر کشادہ زینہ میں ٹٹولتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔ دوسری منزل پر پہنچکر اُس نے مخصوص وقفہ کے بعد متواتر تین دفعہ کُنڈی کھٹکھٹائی۔

اندر سے ایک کرخت، بھدّی آواز نے جوابدیا،

"کون ہے؟ —— چلے آؤ"

فہیم ایک میلے بے ترتیب سامان سے لبریز کمرے میں داخل ہوا۔ ایک موٹا بے ڈھنگا آدمی ٹوٹی سی میز کے سامنے بیٹھا ہوا تاش کے پتوں سے دل بہلا رہا تھا۔

"میں سیٹھ نہالچند کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں"

"فرمایئے"

"کیا جناب ہی کا اسم گرامی ہے"

"ہاں۔ ہے تو"

"مجھے فضلو نے بھیجا ہے"

سیٹھ جی نے اب نظر اُٹھا کر فہیم کی طرف غور سے دیکھا اور پوچھا "کیا چاہتے ہو"؟

"مدد۔ مجھے فضلو نے یقین دلایا تھا کہ آپ میری کچھ نہ کچھ مدد فرمائینگے"

سیٹھ جی بمشکل اپنا بوجھ سنبھالتے ہوئے کرسی سے اُٹھے۔ دوسرے کمرے سے ایک صندوقچہ اُٹھا کر لائے کھولا، کچھ نوٹ روپے گنے اور یہ کہتے ہوئے فہیم کے حوالے کئے۔

"لو۔ فی الحال یہی دے سکتا ہوں"

فہیم شکریہ کے لئے اپنی زبان کھولنا ہی چاہتا تھا کہ سیٹھ جی نے کہا "بائیں طرف ساتویں دوکان پر جاؤ۔ کہنا سیٹھ جی نے بھیجا ہے۔ وہاں تم کو حسب ضرورت سلے سلائے کپڑے مل جائیں گے"

دو چار اور معمولی ہدایات کے بعد سیٹھ جی کُرسی پر بیٹھ گئے۔ فہیم نے واپسی کے لئے پیٹھ پھیری ہی تھی کہ پھر آواز آئی "ہاں سُنو تو۔ (آہستہ لہجہ اختیار کر کے) اگر زیور کپڑے برتن وغیرہ کی قسم سے کوئی شے تمہارے ہاتھ لگے اور فروخت کرنا چاہو تو بے تکلف یہاں چلے آنا"

فہیم نے شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت چائے کی ایک دکان پر فہیم سنگِ مرمر کی شفاف میز کے سامنے بیٹھا اطمینان کے ساتھ چائے اور کیک اُڑا رہا تھا، ڈاڑھی کی صفائی۔ بالوں کی تراش اور آڑی مانگ نے اُس کا حلیہ بالکل تبدیل کر دیا تھا۔ مزید براں۔ گورے رنگ پر سیاہی مائل نیلا سوٹ بے طرح کھل رہا تھا۔ ترکی ٹوپی سامنے میز پر رکھی تھی اور قریب والی کرسی پر چمڑے کا چھوٹا سا سوٹ کیس۔ چائے پینے میں اُسکی نظر ریلوے ٹائم ٹیبل پر جمی ہوئی تھی جس کے ہر صفحہ پر شہروں اور بڑے بڑے اسٹیشنوں کے نام بغور دیکھ رہا تھا۔

"مدراس! —— یہ ٹھیک نہیں —— لاہور! یہاں بھی کام نہ چلے گا"

اُس نے بالآخر ٹائم ٹیبل بند کر دیا۔ پھر کچھ سوچ کے آنکھیں

بند کیں۔ دونوں ہاتھوں میں ٹائم ٹیبل اُٹھا کر ایک جگہ سے کھولا۔ اور اُسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے کلمہ کی انگلی ایک مقام پر رکھ کر آنکھیں کھولدیں ــــــ اُسکی انگلی مبئی کے نام پر تھی۔!

اس طرح بھی کسی فیصلہ پر نہ پہنچکر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ آگے بڑھکر ایک ٹائپ والے کی دُکان پر پہنچا۔ کچھ دیر کیلئے ایک مشین کرایہ پر لی۔ اپنے بکس سے دو فارم نکالے جن میں سے ایک تو شہر کی مشہور بنک کا تھا جس پر بنک کا نام مقام اور شاخوں وغیرہ کی طویل فہرست چھپی تھی۔ دوسرا مبئی کے ایک معروف سیٹھ کا تھا۔ جن کے نام کے علاوہ خطابوں کی بھرمار۔ گورنمنٹ اور پبلک خدمات کی شمار مسلسل کئی سطروں میں ختم ہوا تھا۔ پہلے فارم پر اُسنے بصد احتیاط ٹائپ کرنا شروع کیا۔

"تصدیق کی جاتی ہے کہ منشی ارشد حسین اس بنک میں کامل چار سال تک بطور معین محاسب خاص ملازم رہے۔ دوران ملازمت اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اُنھوں نے نہایت مستعدی۔ دیانتداری اور جفاکشی کا ثبوت دیا۔ بنک کیلئے افسوس کا مقام ہے کہ وہ محض اپنی کسی ذاتی مفاد کی غرض سے بنک سے تعلق قطع کر رہے ہیں"

فہیم اس پرشکوہ عبارت کو پڑھ کر ایک حد تک خوش ہوا اور خاص کر یہ دیکھ کر کہ اُس نے اپنا جدید نام کتنا بہتر تراشا ہے۔ مضمون کے آخر میں بنک کے ایجنٹ کے فرضی دستخط قلم برداشتہ کئے اور دوسرا فارم اُٹھا کر چھاپنا شروع کیا:-

"میں منشی ارشد حسین سے ذاتی طور پر عرصے واقف ہوں۔ مجھے اُن کے متعلق یہ تصدیق کرنے میں ذرا تامل نہیں کہ وہ ایک لائق سنجیدہ اور ذی فہم نوجوان ہیں۔ بمبئی کے شریف زادوں میں سے ہیں اور خاص کر دینی کاموں میں زیادہ حصہ لیتے ہیں"

اپنے متعلق ان عظیم الشان الفاظ کو پڑھتے ہوئے "نوزائیدہ" ارشد حسین نے جو کل تک میاں فہیم اور اس سے قبل قیدی نمبر ۹۸۳ ہی تھے۔ نہایت صفائی کے ساتھ سیٹھ جی کے دستخط بنائے۔ سنبھالکر دونوں کاغذوں کو تہ کیا جیب میں رکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

اب تک جو کچھ کیا وہ کسی خاص تجویز یا ارادے پر مبنی نہ تھا۔ شام کے قریب اپنا بکس ہاتھ میں لٹکائے ساحل سمندر پر ٹہل ٹہل کر گذارنے لگا۔

ہلال نامی جہاز مصر کیلئے تیار تھا۔ ایک عارضی کلرک کی ضرورت تھی۔ میاں ارشد حسین کو معلوم ہوا۔ فوراً نوکر ہوکر معہ اسباب مصر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اٹھارویں دن سکندریہ کے بازار میں چوراہے والے کانسٹبل سے پوچھ رہے تھے "کیوں جمعدار صاحب یہاں کوئی عمدہ سستی اور آرام دہ سرائے ہے۔ جہاں مجھے ٹھیرنے کے لئے جگہ مل جائے؟"

کانسٹبل نے اجنبی کو سر سے پیر تک دیکھا۔ غیر مانوس زبان کے سوال کو سمجھا۔ اور کچھ دیر کے غور و فکر کے بعد اشاروں میں جوابدیا "ہاں، آگے بائیں طرف "فاطمہ سرائے" ہے جہاں آپ کو حسبِ خواہش کمرہ مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ آپ مذہب کے پورے پابند ہوں"

"شکریہ! میں ایسی ہی جگہ چاہتا ہوں"

فاطمہ سرائے کوئی ایسی خوشنما سرائے نہ تھی۔ پرانی قسم کے سُرخ پتھر کی دو منزلہ عمارت جابجا سے شکستہ، بوسیدہ،

بہر حال ارشد حسین ناظم سرائے کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ جو تسبیح ہاتھ میں لئے، سر جھکائے، اللہ اللہ کرتا تھا۔ بڈھے ضعیف، لمبی سفید ڈاڑھی، متبرک صورت، ارشد پر پہلی ہی نظر میں رعب سا چھا گیا۔ منہ سے حرفِ مطلب نکالنے کی ہمت نہ پڑی۔ سامنے کھڑے ہو کر ایک بار آہستگی سے کھانس کر انکی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا چاہی۔

بڑے میاں نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔

ارشد۔ السلام علیکم!

بڑے میاں نے اشارے سے جواب دیکر پھر نظریں نیچی کرلیں۔

ارشد۔ مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

بڑے میاں۔ ہونہہ!

ارشد۔ مجھے ایک کمرے کی ضرورت ہے۔

بڑے میاں نے تسبیح کو بوسہ دے کر وظیفہ ختم کیا، اور بولے "حنفی؟"

ارشد۔ جی حضور۔

بڑے میاں۔ حقہ، سگریٹ۔

ارشد۔ عمر بھر ہاتھ سے نہیں چھوا۔

بڑے میاں۔ شراب؟

ارشد۔ حاشا وکلاّ!

بڑے میاں۔ جوا؟

ارشد۔ استغفراللہ!

بڑے میاں۔ قانوناً ان باتوں کی یہاں سخت ممانعت ہے۔ کمرہ تم کو عہ۲ فی ہفتہ کے حساب سے دیا جاسکتا ہے۔ تمہاری آمدنی کیا ہے؟

ارشد۔ ابھی تو حضور خاک نہیں، ملازمت کی تلاش میں ہوں۔

بڑے میاں۔ مگر کرایہ پیشگی ادا کرنا لازمی ہے۔

ارشد نے بڑھکر روپے حوالے کردئے۔

بڑے میاں۔ دیکھو، پھاٹک رات کو ساڑھے دس بجے بند ہوجاتا ہے اور روشنی ٹھیک گیارہ بجے۔

ارشد۔ بہت بہتر۔

ارشد نے چابی لی اور آگے بڑھ گیا۔ سرائے کے بیشتر کمرے آباد تھے۔ جن میں جوان، بوڑھے، تاجر پیشہ، ملازمت پیشہ ہر قسم کے لوگ رہتے تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچنے سے قبل وہ ہر طرف گھوم پھر کر عمارت کے مختلف حصص اور اُن کے رہنے والوں کا جائزہ لینے لگا۔

ایک طرف برآمدہ میں ایک نوجوان کرسی پر لیٹا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا اُس کے پاؤں ایک دوسرے پر لاپروائی سے دراز تھے۔ ارشد نے اُس کے قریب پہنچکر کہا۔ "السلام علیکم!"

نوجوان۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! (کرسی سے پاؤں ہٹا کر) آیئے۔ تشریف رکھئے۔

ارشد (بیٹھتے ہوئے) حاضر ہوں۔ آپ کا شہر تو نہایت دلچسپ اور بارونق ہے!

نوجوان۔ جی ہاں۔

ارشد۔ اور بڑا زرخیز بھی۔

نوجوان۔ جی ہاں۔

ارشد۔ مگر میرے خیال میں یہاں متمول لوگ زیادہ تعداد میں نہیں ہیں۔

نوجوان۔ کیوں؟

ارشد۔ میں نے سُنا ہے کہ یہ شہر بہت مفلس ہے۔

نوجوان کو یہ سُنکر حُب الوطنی کا ایک جوش آیا۔ اُس نے کرسی پر پہلو بدلکر کہا۔ آپ نے غالباً یہاں کے حاجی عبدالرؤف کا نام نامی نہیں سُنا۔

ارشد۔ ہاں میں نے اُن کا نام تو نہیں سُنا ہے۔

نوجوان۔ تعجب ہے۔ اس قرب جوار میں وہ سب سے بڑے رئیس مانے جاتے ہیں۔

ارشد۔ اچھا؟

نوجوان۔ جی ہاں رئیس کیا بلکہ اُن کو کروڑپتی کہنا چاہیئے۔

ارشد۔ (لاپروائی سے) یہ دولت اُنکے ہاتھ کہاں سے آئی؟

نوجوان۔ اسے صاحب یہ پوچھیئے کہ آئی کہاں سے نہیں۔ تقدیر کا ایسا دھنی کم دیکھنے میں آیا! لوہے کو ہاتھ لگا دے سونا ہو جائے! جس کام میں لگ جائے دم بھر میں سینکڑوں کے وارے نیارے کر دے!

کارخانوں کی انجمن کا صدر، کہیں کا ڈائرکٹر، کہیں کا کچھ، کہیں کا کچھ، اور سب سے بڑھ کر یہاں کے مشہور "انڈیا بنک" کا تنہا بلا شرکت غیرے مالک! مختصراً یہ ہیں حاجی عبدالرؤف صاحب!

ارشد۔ (متعجب صورت بناکر) اوہو! میں سمجھا کہ آپ حافظ عبدالرؤف صاحب کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ حاجی عبدالرؤف صاحب کی بابت تو میں بھی سُن چکا ہوں۔ موٹے موٹے سے سفید خشخشی ڈاڑھی ہے نا؟ (اُس کا قیافہ غلط ثابت ہوا)

نوجوان۔ جی نہیں وہ تو پتلے۔ دُبلے پستہ قد آدمی ہیں بھری ڈاڑھی اور سفید بال ہیں۔ مجھے بذات خود اُن سے گفتگو کا موقع مل چکا ہے۔ بڑے نیک۔ خدا پرست اور ہر دلعزیز ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں اگر وہ آج چاہیں تو سارا شہر خرید لیں۔

ارشد نے نوجوان کو دقعت کی نگاہوں سے اس لئے دیکھا کہ اسکو ایسے بڑے آدمی سے گفتگو کرنے کا فخر حاصل تھا۔ اُس نے سلسلۂ گفتگو کو قایم رکھنے کیلئے دریافت کیا۔ کیوں صاحب! اُنکو کہیں دیکھنے کا موقع مل سکتا ہے؟

نوجوان۔ جی ہاں۔ یہاں کی مسجد میں ہر جمعہ اور دوشنبہ کو وعظ ہوتا ہے، وہ بلاناغہ شرکت کرتے ہیں۔

ارشد۔ تب تو بڑا اچھا موقعہ ہے! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں ــــ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں اور ہوتی رہیں۔ نوجوان خاموش تھا۔ مگر ارشد آیندہ کے لئے تجاویز ذہن نشین کر رہا تھا۔ بالآخر اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا "اب اجازت چاہتا ہوں انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی"

ارشد نے اپنے مخصوص کمرے میں پہنچکر دیکھا کہ ایک طرف میز پر احتیاط سے قرآن شریف رکھا ہوا ہے۔ دوسری جانب دیوار پر مطبوعہ شرائط و ہدایات کا فارم آویزاں ہے۔ چھاریائی میز اور کرسی گرد آلود ہیں۔ اور کمرے کا فرش بھی ناہموار اور غلیظ۔ اس منظر سے ارشد کو کوئہ نفرت ہوئی۔ مگر طوعاً و کرہاً کپڑے اُتار کر لٹکا دیئے۔ دروازے میں چٹخنی لگائی۔ اور میز کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اپنے بکس سے بڑھیا وہسکی کی بوتل نکالی اور بہترین مصری سگریٹ کا کیس! اطمینان کے ساتھ شراب اُنڈیل کر پے درپے دو پیگ اُڑا گیا، سگریٹ سُلگایا اور دل بہلانے کے لئے تاش لے کر بیٹھ گیا۔ کھیلتے کھیلتے جب اُس کا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ کا بارہ تیرہ روپیہ کا مقروض ہو گیا۔ تو بالآخر اُس نے تاش پھینکدئے اور فضلو کو خط لکھنا شروع کیا:-

"مجی! ڈول تو ڈالدیا ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ دس سال تک میں صبر و استقلال کے ساتھ اُسکو نباہ بھی لیجاؤں۔ بہرحال شریف اور دیانتدار بننا عذاب کی زندگی ...."

گیارہ بجتے ہی روشنی گُل ہو گئی۔ ارشد مجبوراً پلنگ پر جالیٹا۔ گو دن بھر کی آوارہ گردی سے اُس کا جسم تھک کر چور چور ہو گیا تھا۔ مگر پھر بھی بڑی رات گئے تک اپنے متعلق

مخالف تجاویز سے دست و گریباں رہا۔ بالآخر نیند آئی۔ اُس نے عالمِ خواب میں دیکھا کہ —— چین کا ملک ہے اور مرصع طلائی محل، جہاں وہ شاہانہ خلعت میں ملبوس ایک مخملی ایرانی قالین پر بصد شان و شوکت گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھا ہے۔ زمردی پیچوان سامنے لگا ہے۔ اور پاس ہی —— فیروزی صراحی اور گلاس رکھا ہوا ہے۔ مصاحب، خدمتگار مودب بیٹھے ہیں۔ رقاصہ طلب کی گئی ہے اور اسی کا انتظار ہے ....

پاس والوں کی کھانس کھنکار اور جماہیوں کے پے در پے شور نے ارشد کو علی الصباح بیدار کر دیا۔ ناشتہ وغیرہ سے فراغت حاصل کرنیکے بعد پوچھتا پچھتا سیدھا انڈیا بنک پہنچ گیا۔

حاجی عبدالرؤف صاحب، دوسرے غیر معروف اور خودسر بنک کے منیجروں اور مالکوں کی طرح کسی پرائیویٹ سکریٹری یا معتمد خاص کی ضرورت کے پابند نہ تھے۔ چنانچہ یہ اطلاع کرانیکے بعد کہ اُسکو اشد ضروری کام ہے ارشد کو جلد باریابی کا موقع مل گیا۔

ارشد کی مضطرب نگاہوں نے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی دیکھا کہ حاجی صاحب پستہ قد، قبول صورت بزرگ ہیں۔ جن کے چہرے کی متانت اور سنجیدگی نے ارشد کو بلا مرعوب ہوئے دل کھول کر بات کرنیکی ہمت دلائی۔ اس نے بڑھ کر مودبانہ سلام کیا۔ اور ان الفاظ میں، جن کے حافظے کی مشق متواتر کئی گھنٹوں سے جاری تھی، بولا:-

"حضور والا، میں عرصہ سے بیکار ہوں، میری دلی خواہش ہے کہ مجھے آپ کے بنک میں کوئی جگہ مل جائے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایک ایماندار نوجوان کیلئے آپ کی خدمت سے زیادہ موزوں دوسرا کام نہ ہوگا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری استدعا قبول فرماکر مجھے خدمتگزاری کا موقعہ دیں گے۔"

حاجی جی۔ مگر تمہارا چہرہ اسقدر زرد کیوں ہے؟ کیا کچھ بیمار ہو۔

ارشد۔ جناب من، فاقہ کشی اور مصائب میں سب کا یہی حال ہو جاتا ہے۔

حاجی جی۔ اچھا تم نے کسی بنک میں کام کیا ہے؟

ارشد نے فوراً جیب سے خود ساختہ سرٹیفکیٹ نکال کر پیش کر دیا۔ حاجی جی نے عینک لگا کر غور سے پڑھا پھر ایک بار نظر اُٹھاکر کامل ایک منٹ تک اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتے رہے۔ ارشد کی نگاہیں نیچی ہوگئیں۔

حاجی جی نے پوچھا "تم کو نوکری کی ضرورت ہے؟"

ارشد نے فوراً ہی پُر التجا لہجہ میں کہا "جی ہاں۔ سخت اور اشد"

حاجی جی خاموش بیٹھے، ارشد کو پھر بغور دیکھتے رہے۔ کچھ دیر گذرنے کے بعد دفعتاً بولے "صاحبزادے ذرا کھڑے ہو کر اس کمرے میں دو چار مرتبہ ٹہلو تو!"

ارشد کے چہرے پر اس عجیب و غریب فرمائش سے ہوائیاں اُڑتی دیکھکر حاجی جی نے تسکین دہ اور ہمت افزا الفاظ میں کہا۔

"تم پریشان نہ ہو۔ اُمیدواروں کے جانچنے کے میرے چند غیر معمولی اُصول ہیں!"

ارشد کھڑا ہوا۔ اور وسیع کمرے میں آہستہ آہستہ کئی بار لوٹ پھر کر ٹہلنے لگا۔ اُس نے حتی الوسع اپنے جسم کو اس لئے استادہ رکھا تاکہ اُس کا مجسمہ شرافت، امارت اور مستقل مزاجی کا مظہر ہو!

حاجی جی۔ بس اسی قدر کافی ہے .... میں ابھی کوئی یقینی فیصلہ تو نہیں کر سکتا مگر بہت ممکن ہے کہ میں تم کو کوئی جگہ دے سکوں (کچھ سوچکر) اچھا کل صبح دس بجے پھر آنا۔

دوسرے دن بارہ بجے سے پہلے ہی میاں ارشد حسین

سکندریہ کے مشہور "بنک آف انڈیا" کے معین محاسب کا کام انجام دے رہے تھے۔

آٹھ سال گذر گئے۔ ارشد نے اِس درمیان میں اپنی جفاکشی دیانتداری اور مستعدی سے وہ اثر جمایا کہ حاجی جی نے رفتہ رفتہ بنک کا سارا کام اُس کے سپرد کردیا۔ گو وہ بنک کا فقط سکرٹری ہی مشہور تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُسکو بنک کے سارے معاملات میں سیاہ وسفید کا پورا اختیار حاصل تھا۔ اُس وقت اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھا ہوا صبح کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ ایک لفافہ چاک کیا تو شام کی دعوت کا رقعہ پایا۔ دوسرا دیکھا تو اس میں کلب کا بل تھا تیسرے میں لوکل ہسپتال کے لئے گرانبہا رقم کے عطیہ پر اظہارِ شکریہ تھا۔ اس کے بعد اس کے ہاتھ میں ایک میلا کچیلا شکن آلود لفافہ آیا جس پر نہایت بے ترتیبی اور بدخطی کے ساتھ پتہ لکھا تھا۔ اُسکو اُٹھاتے ہی اُسکی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اُس نے لفافہ ذرا جھٹکے سے چاک کیا، خط میں لکھا تھا۔

"دوست فہیم میں سکندریہ پہنچ گیا ہوں۔ کل شب کو دس بجے فاطمہ سرائے میں ملنا۔ جلیل الرحمٰن کو دریافت کرلینا —— تمہارا افضل"

ارشد حسین ٹھیک وقت پر فاطمہ سرائے پہنچ گیا۔ دفتر کے کلرک نے ارشد کو پہچان کر مودبانہ سلام کیا اور بولا "جی آپ نمبر ۵۴ میں تشریف لیجائیے۔ مولوی جلیل الرحمٰن صاحب آپکا انتظار کر رہے ہیں"

ارشد نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نمبر ۵۴ کا دروازہ کھولا۔ فضلو نے ہنستے ہوئے بڑھ کر مصافحہ کیا اور اپنے قدیم بے تکلف انداز میں پوچھا "کہو صاحبزادے! اچھے ہو؟"

ارشد نے فضلو کے چہرے میں مشکل سے کوئی فرق پایا۔ وہی قیدخانہ کی کرختگی۔ وہی روڑھاپن۔ ہاں اُس وقت جو رمق ملاحیت، متانت اور سنجیدگی کی نظر آتی تھی وہ کچھ تو حجام کچھ درزی اور کازمیٹک وغیرہ کی ممنونِ احسان تھی۔

بیٹھتے ہی فضلو نے پُراشتیاق لہجہ میں پوچھا، "کہو کب ارادہ ہے؟ یہاں سے جو پہلا جہاز شنگھائی کو جانیوالا ہے۔ میں نے اُس کا ٹکٹ خرید لیا ہے۔ واللہ چین میں ایک دفعہ تو لُطف ہی آجائے گا! مگر فہیم تمہاری حالت کیا ہے؟"

فضلو نے فہیم کے چہرے پر اضطراب اور انتشار کے مبین اثرات دیکھنے کے بعد گھبرا کر یہ سوال کیا تھا۔

ارشد نے ایک گہری سانس لیکر جواب دیا۔ "فضلو! بھئی مجھ سے تو اب ایسا نہ ہوگا"

فضلو۔ (متعجب ہوکر) کیا مطلب؟

فہیم۔ ہاں میں اب ایسا نہیں کرسکتا!

فضلو۔ (جھنجھلا کر) کیا تمہارا ارادہ عہد شکنی کا ہے؟

فہیم۔ (باطمینان) ہاں!

ارشد کے چہرے کا استقلال اور اثبات کا استحکام کچھ ایسا بین اور پُرزور تھا کہ فضلو کو اس کے یقین کے بعد فوراً ہی اپنا رویہ تبدیل کرنا پڑا۔ اُس نے ایک بار قہقہہ لگایا اور پھر تجاہل عارفانہ اختیار کرکے بولا "لو آؤ یار فہیم! بیوقوفی کی باتیں نہ کرو، بُزدلی چھوڑ دو۔ تم یہ نہیں دیکھتے کہ ساری آفتیں تو میں اپنے سر لینے کو تیار ہوں........ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر کون ایسا سبب ہے جو تم ہمت ہارتے ہو۔ بھلا یہ تو سوچو کہ تم نے اپنی عمر کے آٹھ عزیز سال محض اِس مقصد کیلئے قربان کئے ہیں"

فہیم (روکھے مُنہ سے) فضلو! میں جانتا ہوں کہ اسمیں تمہاری انتہائی دلشکنی ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنے

آٹھ سال اسی دن کی اُمید پر گن گن کر کاٹے ہونگے، مگر سُنو اور ذرا ٹھنڈے دل سے سُنو۔ تم کہتے ہو کہ میں نے اپنی عمر کے آٹھ سال محنت و مُشقت کے ساتھ محض اس ڈکیتی کی تیاری میں گذارے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ ہمارا تمہارا معاہدہ یہی تھا، مگر حاجی عبدالرؤف سے نیک آدمی کے یہاں مار آستین ہوکر رہنا مجھ سے کسی طرح ممکن نہ ہوسکا۔ فضلو! تم کو نہیں معلوم وہ نہایت نیک طینت۔ خدا پرست اور سچے مسلمان ہیں۔ ابھی پچھلے مہینہ کی بات ہے کہ اُنھوں نے ان الفاظ میں مجھ سے مخاطبت کی تھی۔ "ارشد! مجھے اب تم پر کامل بھروسہ ہے۔ میں تم کو آج سے بنک کا منیجر بنا کر سیاہ و سفید کا پورا اختیار دیتا ہوں"۔ فضلو! تم ہی انصاف سے کہو کہ یہی الفاظ اگر تمہارے متعلق کہے جاتے تو تمہارے دل میں اُن کی کیا وقعت ہوتی۔ چنانچہ میں نے اُسی وقت قطعاً فیصلہ کرلیا تھا۔ کہ میں اس ناپاک جرم کے ارتکاب سے اپنا دامنِ ناموس ہرگز سیاہ نہونے دونگا۔ میں نے اپنی صداقت قائم کرنے میں آٹھ سال صرف کئے ہیں اور میرا ارادہ ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ اُسکو تادمِ زیست اسی طرح برقرار رکھنے کی کوشش کرونگا۔ فضلو! سچ پوچھو، اب تو کوئی ایک لاکھ کیا بنک کا سارا روپیہ اُٹھا دے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ میرے پائے استقلال کو لغزش ہوجائے! میں بھی اپنی دُھن کا پکا ہوں۔

فضلو نے حقارت آمیز نظریں ڈال کر سخت لہجہ میں کہا۔ "صاحبزادے! ہوش کی دوا کرو۔ یہ اپنے ارادے اور استقلال بالائے طاق رکھو، اپنی عقل کے ناخن لو۔ میرے بھائی کا قصہ بھول گئے؟ اُنھوں نے ایمانداری، راستبازی برتی تو کیا پھل پایا! دیکھ لینا تمہارا بھی وہی حشر ہوگا۔ کوئی مبارک دن ایسا آئیگا کہ تمہارے بنک میں چوری ہوگی۔ تحقیقات میں پتہ چل جائیگا کہ تم پُرانے گنہگار ہو! میاں اسکو خوش نصیبی سمجھو کہ آج تک تمہارے متعلق کسی کو پتہ نہیں چلا۔ سمجھ لو۔ پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر ہوگا!"

ارشد۔ میں بہرحال اس منحوس دن تک تو انتظار کرونگا۔

فضلو۔ نہیں، تم ہرگز نہیں کرنے پاؤگے۔

ارشد۔ کیوں؟

فضلو۔ تم کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔

فضلو کی خونخوار نگاہیں ارشد کے زرد چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے غصّہ سے کہا۔ دیکھو، خیریت اسی میں ہے۔ کہ سیدھے سیدھے مجھے اس معاملہ میں مدد دو۔ ورنہ کل ہی حاجی عبدالرؤف صاحب کو معلوم ہوجائے گا کہ ان کے بنک کا لائق اور راستباز منیجر حقیقت میں ایک سزا یافتہ پکّا بدمعاش ہے۔

ارشد کُرسی کے تکیے سے لگ گیا۔ اپنی حالت کو سنبھالتے ہوئے اُس نے کُرسی کے دونوں بازوؤں کو مضبوط تھام لیا۔ اور خوشامدانہ لہجہ میں بولا "فضلو! خدا کیلئے ایسا نہ کرنا!"

فضلو نے اس کا جو کچھ جواب دیا وہ ایک فاتحانہ قہقہہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے پوچھا "ہنہہ! اچھا مجھے بنک کے کمروں وغیرہ کا کچھ حال تو بتاؤ!"

ارشد۔ فضلو، مجھے موقعہ دو۔ میں تم سے کہہ چکا کہ مجھ سے اب کچھ نہ ہوگا۔

اپنی کامیابی کا احساس کرتے ہوئے فضلو نے پھر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور بولا "نہیں ہوگا؟ آخر وجہ کیا ہے؟ ——— اِدھر دیکھو۔ کیا کوئی خاص سبب مانع ہے؟ کوئی خودغرضی یا کوئی عورت تو........"

ارشد کے چہرے پر "عورت" کے نام سے اس طرح ہوائیاں اُڑیں کہ فضلو کو اصلی سبب کے استفسار کی مزید خلش باقی نہیں رہی۔

ارشد- سچ پوچھتے ہو تو میں ایک دوشیزہ کا ممنونِ احسان ضرور ہوں۔

فضلو- تمہاری شادی ہو گئی؟

ارشد- نہیں۔

فضلو- منگنی؟

ارشد- نہیں۔

فضلو- پھر کیا واسطہ؟

ارشد- مگر مجھے اس سے محبت ہے- گو میری احتیاطوں نے آج تک کوئی حرفِ مطلب زبان پر لانے کی جرأت نہیں کی ہے اور نہ میں نے کبھی اپنے متعلق کچھ کہنا ہی مناسب سمجھا ہے۔

فضلو- مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ ہے کون؟

ارشد- حاجی صاحب کی بھتیجی عذرا۔

فضلو- اوہو! یہ کہیئے- اس تمام محسن کشی، عہد شکنی کا اصلی سبب کسی کافرہ کا حسن و جمال ہے! جب ہی تم اس بیدردی سے قدیمی تعلقات کو پسِ پشت ڈال رہے ہو! مگر بھئی! میں بھی مانتا ہوں سوجھی خوب ہے- حاجی کا سارا روپیہ یوں تو بڑی آسانی سے ہاتھ آجائیگا- بڑا نرم چارہ ڈھونڈ نکالا!

ارشد- بس فضلو بس- اس کے متعلق کچھ زیادہ زبان سے نہ نکالو- میں نے تم سے سچ کہا اور بالکل سچ، کہ میں محض ایمانداری کے خیال سے تائب ہوا ہوں- عذرا اور میرے درمیان اتنا ہی بُعد ہے جتنا زمین اور آسمان میں- اور پھر بھلا اپنی پچھلی سیاہ کاریوں کے باعث اُس کے سامنے شادی کیلئے منہ کھولنا! آہ، این خیال است و محال است و جنوں۔

فضلو- میرے خیال میں تو تمہاری قیدخانہ کی زندگی اس کے لئے ایک دلچسپ افسانہ ثابت ہوگی- کیوں؟

ارشد اس ضربِ شدید کی تاب نہ لا سکا- مجبوراً اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا-

فضلو- لو صاحبزادے! اب مان جاؤ زیادہ ضد نہ کرو- یہاں کی آٹھ سالہ محنت و مشقت، ایمانداری یا ریاکاری سال چھ مہینہ میں بھول جاؤ گے........ چین کی شاہانہ زندگی کا خیال کرو...... لو بتاؤ کب کی رہی-

ارشد- نہیں فضلو نہیں- خدا کیلئے ایک منٹ کو میری سُن لو- میں تمہاری مدد کرنے کو طیار رہوں-

فضلو- اب آئے راہِ راست پر!

ارشد- بنک کی بابت نہیں- بلکہ اس عرصہ میں میں نے جو کچھ روپیہ پیس انداز کیا ہے- میں وہ سب تمہاری نذر کرنیکو طیار ہوں- میں تم کو یہاں شہر میں کوئی اعلیٰ پیمانہ کی دُکان کھلوا دونگا- تم کو ہزار بارہ سو سالانہ کی گنجائش ہو جائیگی- بولو کیا کہتے ہو؟

فضلو- ہزار بارہ سو سالانہ! کیا رشوت دے کر کام نکالنے کا ارادہ ہے؟ مجھے ایمانداری کی تلقین کرتے ہو! ارشد! مذاق تو کرو نہیں-

ارشد- اچھا بس اب معاملہ طے ہے...... (اُٹھکر) خدا حافظ-

ارشد کو دروازہ کی طرف بڑھتے دیکھکر فضلو نے چلّا کر کہا "سُنو- اتنی جلدی نہ کرو- تم ہٹ دھرمی سے عہد شکنی پر آمادہ ہو جاؤ- مگر یاد رکھو میں اپنے الفاظ پر مستقل طور پر قائم رہونگا- کل صبح حاجی عبدالرؤف صاحب، اُن کی بھتیجی عذرا، بنک کے اور ملازم بلکہ سارا شہر تمہارے حالات سُنکر خوش ہوگا- بولو بولو! ہے اجازت؟"

ارشد نے ایک بار پیچھے مُڑ کر دیکھا اور ترشرو ہو کر جواب دیا-

"جاؤ۔ جو تمہارا جی چاہے کرنا!" اس نے جھٹکے سے دروازہ بند کیا اور چل دیا۔

ارشد اپنا بے چین دل روکے سنبھالے آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ کچھ دور چلکر وہ ایک گلی کے موڑ پر رُک گیا اور سوچنے لگا کہ ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔ چلوں چلکر فضلو کو راضی کر لوں۔ فضلو سچ کہتا ہے۔ میری زندگی کے راز ہائے سربستہ کوہ آتش فشاں کے مانند ہیں جو نہیں معلوم کب آگ اور دھوئیں کا طوفان بنکر اُبل پڑیں۔ آخر یوں کب تک گذریگی۔ کوئی دن ایسا ضرور آئے گا کہ میرے گذشتہ واقعات طشت از بام ہو جائینگے۔ اس عرصہ میں جو عزت آبرو حاصل کی ہے اُس کے زائل ہونیکے علاوہ اپنی اصلی حالت کے چُھپانے کے جرم میں کہیں دوبارہ جیل کی کوٹھڑی نصیب نہ ہو۔ اس غور و فکر اور غیر ارادی حالت میں اس کی نظروں کے سامنے قیدخانہ کی متعفن بارک اور غلام دستگیر کی شرر فشاں آنکھیں پھر گئیں!

اس کا زہد و تقویٰ، اس کا صبر و استقلال بھی یوں دفعتاً ٹھکرا دینے کے قابل نہ تھا۔ قیدخانہ سے اُسے نفرت ضرور تھی مگر وہاں ایک قسم کا سکون اور اطمینانی حالت تو نصیب تھی۔ برخلاف اس کے یہاں کی تشویشناک حالت، ہر دم پچھلے واقعات افشا ہونیکا اندیشہ، ایسی فضا تھی جس میں طوفانی بادل ہر دم برس پڑنے کو منڈلا رہے تھے۔ یہ تو ہو سکتا تھا کہ وہ چلتا بنے اور ان سب سے پیچھا چھڑائے۔!

اس کی زندگی کا یہ اہم ترین اور صبر آزما لمحہ بن گیا تھا۔ اس کے دماغ میں دُھندلی دُھندلی وہ خیالی تصویر اور مناظر گشت کر رہے تھے۔ جو جیل میں پہنچکر اُس کے پیش نظر ہوتے۔ ساتھ ہی اُس کی نظروں میں حاجی عبدالرؤف صاحب کا نورانی چہرہ پھر گیا۔ جنہوں نے اُس پر انتہائی اعتماد اور اعتبار کیا تھا۔ اُسکو وہ شباب آفریں، روح پرور نقشہ بھی دکھائی دیا جسکے لب جان بخش کی پُرکیف جُنبشوں نے آئندہ زندگی کیلئے ایک سہارا پیدا کر رکھا تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ ٹھنڈی سانس لی اور دبی زبان سے بولا "آہ! کل ان سب کو معلوم ہو جائیگا!"

کچھ دیر کے بعد وہ کسی مستقل ارادے پر پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ اور جلد جلد فاطمہ سرائے اور فضلو سے دُور ہوتا گیا حتیٰ کہ رات کی تاریکی نے اُس کو اپنی آغوش میں چُھپا لیا۔

حاجی عبدالرؤف صاحب ٹھیک نو بجے صبح بنک پہنچ جایا کرتے تھے۔ آج اُنہوں نے غیر معمولی طور پر مسٹر ارشد حسین کو اپنے کمرے میں بیٹھا منتظر پایا۔

حاجی صاحب۔ مسٹر ارشد! خیر تو ہے، آج خلافِ معمول آپ یہاں کیسے بیٹھے ہیں؟ آپ کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ شاید ایک ہفتہ بھر سے سوئے نہیں۔

ارشد۔ (گلوگیر آواز میں) مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔

حاجی صاحب۔ (مسکرا کر) مگر ایسی کون سی اہم اور ضروری بات ہے جس کے لئے تم اسقدر سراسیمہ اور پریشان نظر آتے ہو؟

ارشد۔ (بہزار کوشش) میں نے آپ کو فریب دیا ہے ...... آپ سے جھوٹ بولا ہے!

ارشد نے حاجی صاحب کے چہرے پر تجسس آمیز نگاہیں ڈالیں مگر اس اعلان کے بعد بھی اُن کے مستقل تبسم میں کوئی فرق نہ پایا۔

"آپ سمجھتے ہیں کہ میں راستباز، ایماندار ارشد ہوں...

…… جی نہیں! میں دراصل سزا یافتہ فہیم ہوں! بمبئی کی جیل میں پورے چار سال گذارنے کے بعد میں سیدھا آپکے پاس آیا تھا، میرا مقصد تھا کہ اپنی نمائشی راستبازی کا سکہ آپ کے دل پر جماکر آپ کے بنک پر ہاتھ صاف کردوں کل میرا دوسرا ساتھی جو ابھی قید خانہ سے چھوٹا ہے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے یہاں آیا ہے۔ مگر میں نے اُس سے کہدیا کہ اب میں اُس کا ساتھ نہیں دیسکتا۔ میں نے اُس پر ظاہر کردیا کہ اب راہِ راست پر پورے آٹھ سال گامزن ہونیکے بعد میں گمراہی اختیار کرنہیں سکتا۔ میرے اِنکار پر وہ اس درجہ برافروختہ ہے کہ مجھ سے ہر ممکن طریقہ پر انتقام لینے پر آمادہ ہے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں وہ یہاں آئیگا۔ محض اس لئے کہ آپکو میرے گذشتہ واقعات سے مطلع کردے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ قبل اسکے میں خود ہی اپنا سارا قصہ کیوں نہ کہدوں۔ بس مجھے اسی قدر عرض کرنا تھا۔ حاجی صاحب آپکی پرورش، سلوک اور بزرگانہ شفقت عمر بھر دل سے نہ بھولے گی۔ اجازت دیجئے میں اب رُخصت ہوتا ہوں!

ارشد نے حاجی صاحب کو پھر اُنھیں سراسیمہ نظروں سے دیکھا مگر اب بھی اُنکے چہرے پر نفرت یا انتشار کے اثرات نہ پاکر اُسکو سخت حیرت ہوئی۔ ان کے ہونٹوں پر حسب عادت تبسم کھیل رہا تھا بلکہ اُسوقت تو معمول سے کچھ اور زیادہ ہی!

حاجی صاحب۔ (باطمنان) بیٹھ جاؤ ارشد۔ میں تمہارے حالات سے اُسیدن باخبر ہوچکا تھا جبکہ تم میرے پاس ملازمت کی غرض سے آئے تھے۔ کیا تم یہ بھی خیال کرتے ہو کہ میں کسی ایسے شخص کا تقرر ایسی اہم جگہ کرسکتا تھا جس کے حالات کی میں نے حتی الوسع پوری تحقیق نہ کرلی ہو؟

آٹھ برس پیشتر جب تم پہلی مرتبہ میرے سامنے آئے تب مجھے معًا ظاہر ہوگیا تھا کہ تم سیدھے قید خانہ سے آرہے ہو۔ تمہارے چہرے پر قید خانہ کی زردی بیّن طور پر نمایاں تھی، تمہاری نظریں سراسیمہ، اور تمہاری گفتگو ڈری، سہمی ہوئی تھی! —— تم کو یاد ہے میں نے تم سے کمرہ میں ٹہلنے کے لئے کہا تھا۔ …… ارشد نے متحیر ہوکر اقرار کے لئے سر ہلادیا۔

…… تم کمرہ میں ٹھیک آٹھ فٹ اِدھر اور آٹھ فٹ اُدھر فاصلہ پر ٹہلے جو قید خانہ کی کوٹھری کی صحیح پیمائش ہے! تمہارے اسناد …… وہ بنک والا تو میرا ذاتی دوست ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تمہاری صورت تک سے آشنا نہیں! لیکن باوجود ان تمام باتوں کے میں نے فیصلہ کرلیا کہ تم کو راہِ راست پر آنے کے لئے موقعہ دیا جائے۔ مجھے تمہاری شرمیلی نگاہوں میں کچھ اُمید افزا آثار نظر آئے۔ میں اس وقت اقرار کررہا ہوں کہ شروع شروع تمہاری دیکھ بھال کیلئے مجھے غیر معمولی انتظامات کرنا پڑے تھے۔

حاجی جی نے محبّت آمیز جُنبش کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ ارشد کے کندھوں پر رکھدیئے۔

کیوں ارشد، سچ بتانا، مجھے تمہارے متعلق غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ …… اور ہاں اِن واقعات کو کم و بیش عذرا بھی جانتی ہے!

ارشد۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) افسوس!

حاجی جی۔ نہیں۔ میری طرح اُسکو بھی ہمیشہ یقین رہا کہ تم ثابت قدم رہے اور انشاء اللہ رہوگے۔

جوشِ مسرت میں ارشد کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اُس نے بڑھکر حاجی جی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں زور سے دبالیا۔ پھر یکبار اُنکے قدموں میں اپنا سر رکھکر بولا۔

"میں تاحیات آپ کا غلام ہو چکا۔ آپ نے خدا ترسی کی انتہا کردی۔ میرے اوراق زندگی پر سیہ کاریوں کی طویل فہرست کا مطالعہ کرنے کے باوجود آپ نے مجھ پر اعتبار کیا، مجھے موقع دیا، اور مجھے اس رتبہ پر پہنچا دیا! میں ہمیشہ اسی خیال سے پریشان رہا کرتا تھا کہ آخر مجھے کمرے میں ٹہلا کر دیکھنے میں کونسا راز مضمر تھا، اور مجھے اب بھی تعجب ہے کہ یہ حقیقت آپ نے پہچان کیسے لی؟"

حاجی جی کے چہرہ پر اب تبسم کے بجائے افسردگی اور متانت نمایاں تھی۔ ارشد کے سر کو بوسہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "میں تم کو ابھی بتاتا ہوں کہ کس طرح میں نے تم کو ایک نظر میں سراپا تصور کر لیا، اور میں یہ بھی بتاؤنگا کہ میرا دل تمہاری اعانت اور ہمدردی کے لئے کیوں بے چین ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد تم انشاءاللہ میرے دائرۂ خاندان میں شامل ہو جاؤ گے۔ اسلئے میں سمجھتا ہوں کہ اس راز کے معلوم ہونیکا تم کو گونہ حق حاصل ہو گیا۔ اس شہر میں سوائے عذرا کے اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو اس راز سے واقف ہو کیونکہ میں نے بھی اپنی زندگی کا معقول حصّہ قیدخانہ کی چاردیواری کے اندر کاٹا ہے!!!

قبل اس کے کہ متحیر و متوحش ارشد کچھ منہ سے کہہ سکے چپراسی اندر داخل ہوا اور حاجی جی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"حضور سے کوئی جلیل الرحمٰن صاحب ملنا چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ انہیں اشد ضروری کام ہے"

ارشد۔ یہی وہ شخص ہے۔ میری بابت کہنے آیا ہے۔

حاجی جی۔ ارشد تم یہیں ٹھیرو (چپراسی سے) جاؤ انکو بلا لاؤ۔

فضلو بھدے بے ترتیب قدم ڈالتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کی پہلی نظر ارشد پر پڑی اور جھجک کر بولا:۔

"مجھے آپ سے کوئی سروکار نہیں۔ میں حاجی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں"

ارشد۔ (حاجی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) حاجی صاحب یہ موجود ہیں۔

حاجی صاحب نے ایکبار پھر کر فضلو کو دیکھا اور گرتے پڑتے بے تحاشہ اس کی طرف بڑھے۔ فضلو کے ہاتھ سے چھڑی چھوٹ گئی۔

"جلیل!"

"بھائی خلیل!"

کمرے میں دونوں ناموں کی پکار بیساختہ اور بھرائی آوازوں میں گونج گئی........ حاجی جی اور فضلو ایک دوسرے کو بھینچ بھینچ کر سینے سے لگا رہے تھے!

حاجی جی۔ جلیل تم یہاں کہاں! میں تو سمجھتا تھا کہ خدانخواستہ تم........ (ان پر رقت طاری ہو گئی)

جلیل۔ کاش مجھے قبر کا پرسکون گوشہ نصیب ہو گیا ہوتا!

حاجی جی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کہاں تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے میری رہائی کی کوشش میں اپنی آزادی اور عزت کو قربان کر دیا تھا۔ (حاجی جی کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے اُن کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی)

دونو بھائی ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھے اسی طرح کھڑے رہے۔ فضلو کے چہرے سے قیدخانہ کی زردی اور کرختگی رفتہ رفتہ مفقود ہو رہی تھی۔

ارشد نے یہ منظر دیکھکر مناسب سمجھا کہ دونوں کو کچھ دیر کے لئے اس حال میں تنہائی کا موقعہ دے۔ چنانچہ سر جھکائے وہ دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ حاجی جی نے اسکو دیکھ لیا اور بولے:۔

"ارشد! میں جانتا ہوں —— تم اندر جا رہے ہو۔ عذرا سے کہہ! کہ میں اسکے باپ کو ہمراہ لاتا ہوں —— جاؤ —— تم ہی

سب سے پہلے اُسکو یہ خوشخبری سُناؤ کہ خدائے برتر نے ہماری دعا قبول فرمائی۔ ہماری تلاش کو کامیابی بخشی (رعبائی سے علیحدہ ہوکر) جلیل! میں نے عذرا کو بڑے ارمانوں سے پرورش کیا ہے۔ تمہاری نشانی سمجھ کر ہمیشہ اپنے پاس رکھا ہو۔ خُدا نے کیا اب وہ جوان ہے۔ مجھے تم اسی وقت اجازت دیدو کہ حسبِ دلخواہ میں جلد سے جلد اُس کی شادی کردوں"

"میری بچی ـــــ میری عذرا" جلیل کے مُنہ سے اور کچھ نہ نکلا۔ وہ بیقرار ہوکر رونے لگا۔ ارشد بھی صورت حال سے بہت متاثر تھا۔ اُس نے بڑھکر دروازہ کھُولا اور چاہتا تھا کہ باہر قدم رکھے مگر جلیل نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا "صاحبزادے ذرا ٹھیر جاؤ۔ تم ساتھ ہی عذرا سے یہ بھی کہدینا کہ تم دونوں کی شادی کے لئے خوشی سے اجازت دیتا ہوں! مجھے کیا خبر تھی کہ تمہاری

عہد شکنی

میں میری توبہ اور بخشش کا راز مضمر تھا"! جوشِ مسرت اور جوشِ گریہ کے پُرزور تصادم کا نتیجہ ارشد کی آنکھوں سے آنسو بنکر بہنے لگا۔ اس کا سراپا نیاز ہوکر ایک خوشگوار ادا کیساتھ خود بخود خم ہوگیا۔ اُسنے اپنے سینہ پر دونو ہاتھ اسلئے حمائل کر لئے کہ مبادا ارمان اور دلولوں کا محشر خیز سیلاب چھاتی پھاڑکر باہر نکل آئے!

دیوانہ بریلوی

مُغنّیہ سے

پھر سُنا ـــ پھر سُنا ـــ اے حسین مُغنّیہ۔ اپنا جادوانی نغمہ، پھر سُنا! اور مجھے اس آلام گاہ سے دُور، اُن پُرفضا وادیوں میں پہونچا دے۔ جہاں سکون کا دور دورہ ہے، جہاں حسین بادلوں سے صبح کا نورِ اوّلین چھن رہا ہے!

پھر سُنا ـــ پھر سُنا ـــ اے حسین مُغنّیہ۔ اپنا جادوانی نغمہ، پھر سُنا! تیری میٹھی زبان سے کیسے شیریں ترانے بلند ہوتے ہیں۔ میرے کان اور میری روح پر ان منتروں کا جادو چل گیا ـــ اور میری آنکھ سے دُکھ کے آنسو ٹپک پڑے۔

پھر سُنا ـــ پھر سُنا ـــ اے حسین مُغنّیہ۔ اپنا جادوانی نغمہ، پھر سُنا! میں خوب جانتا ہوں کہ ہمارا سنجوگ محال ہے۔ پھر بھی۔ تیری رس بھری آواز میری روح کے تاروں میں گونجتی رہے گی ـــ اور بہار کی حیات آفریں راتوں میں میرا تخیّل تیری ایک مورتی بنائیگا اور میں پھر تیرے گیت سُنونگا!!

(سورج کشن منشی۔) ا۔ ن۔ ص۔ ا۔ ما

سچّی کہانی

از پریم پجاری

تیرہ برس گذرے میں پنجاب کے ایک خالصہ ہائی اسکول میں پرشین ٹیچر تھا۔ بعض وجوہ سے میں اس مقام کا اصلی نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا جہاں یہ اسکول واقع تھا۔ آپ تھوڑی دیر کیلئے امرت پور فرض کر لیجئے۔ امرت پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی آبادی اُس وقت کل ۲۳۰۰ (دو ہزار تین سو) تھی اور باشندے زیادہ تر سکھ۔ انہیں کا یہ اسکول تھا۔ جس میں اردگرد کے دیہات سے لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایک بنگالی بابو مسٹر مکرجی تھے اور سیکنڈ ماسٹر ایک سکھ نوجوان سردار ہرنام سنگھ[1] بی۔ اے۔ میں اور مسٹر مکرجی ایک ہی مکان میں رہتے تھے اور آپس میں بہت ہی بے تکلف ہو گئے تھے۔ تین مہینے کے مختصر قیام میں سردار ہرنام سنگھ سے اتنے تعلقات بڑھے کہ ہم گہرے دوست ہو گئے، ہرنام سنگھ نے مجھ سے فارسی پڑھنی شروع کی۔ وہ فارسی میں ایم۔ اے کا امتحان دینا چاہتے تھے۔ انہیں اُمید تھی کہ اگر فارسی میں ایم۔ اے کر لیا تو خالصہ کالج امرت سر میں انہیں پروفیسری مل جائے گی۔

پہلے میرا خیال تھا کہ سکھ لوگ بڑے متعصب ہوتے ہیں اور خصوصاً مسلمانوں سے بہت نفرت کرتے ہیں، لیکن سردار ہرنام سنگھ سے ملاقات ہونے کے بعد مجھے اپنی رائے بدل دینی پڑی۔ سردار ہرنام سنگھ اگر سکھ تھے۔ اور یقیناً سکھ تھے۔ تو پھر سکھوں سے زیادہ بے تعصب قوم دنیا میں کوئی نہیں۔ وہ سراپا محبت تھے۔ سراپا اخلاص تھے۔ اس وقت اُن کا سن ۲۳ سال سے زیادہ نہ تھا۔ دراز قامت بلند بالا۔ گندمی رنگ، کتابی چہرہ، ستواں نقشہ۔ بلند پیشانی۔ دانت اُن کے ایسے آبدار اور خوبصورت تھے کہ جو دیکھتا رشک کرتا۔ چھوٹی سی سیاہ ڈاڑھی اُن کے بھولے چہرہ پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ مزاج میں سادگی کے ساتھ ساتھ نفاست پسندی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اُن کی شادی ہو چکی تھی۔ بیوی اُن کے ساتھ تھیں اور بہت جلد ایک بچّہ کی ماں بننے والی تھیں۔ ایران، عراق، عرب، مصر، یورپ کے اکثر ممالک اور ہندوستان میں کشمیر سے کولمبو تک اور کوئٹہ سے ڈھاکے تک میں نے اچھی طرح سیاحت کی ہے۔ مگر سچ کہتا ہوں کہ مسز ہرنام کی سی دلربا صورتیں میں نے دو چار سے زیادہ نہیں دیکھیں۔ وہ بنگالنوں کے سے ڈھیر کے ڈھیر لمبے لمبے کالے بال کمر سے نیچے تک لٹکتے ہوئے۔ وہ بڑی بڑی سیاہ موہنی آنکھیں جن پر شہزادیوں کو ناز ہے۔ لمبی لمبی گھنی پلکیں۔ بھنویں تھیں کہ کمانیں جیسے کسی چابکدست نقاش نے گہری سیاہ پنسل سے سفید کاغذ پر بنائی ہوں۔ ایرین ٹائپ کی بلند اور ستواں ناک۔ پتلے پتلے گلابی ہونٹ جن پر مسکراہٹ سے ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ کشمیرنوں کی سی گوری بھبوکا رنگت۔ رخساروں پر جوانی کے خون کی جھلک، جس سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید سُرخ پوڈر لگایا ہے۔ بیضوی چہرہ، چھوٹا سا دہانہ۔ خوبصورت بتیسی، جسم تھا کہ سانچہ میں ڈھلا ہوا سینہ کا اُبھار، کمر کی باریکی، اور اس کے بعد جسم کے نچلے حصّہ کا اُبھر کر ایک مخروطی شکل میں کم ہوتا چلا جانا اور ان سب حصّوں کا باہمی توازن و تناسب، فطرت کی نادرہ کاری کا ایک ایسا نمونہ تھا جو بار بار دیکھنے میں نہیں آتا۔ ایک ایک عضو اسقدر موزوں، اس قدر متناسب کہ دُور سے دیکھو تو شک ہو جائے کہ یہ انسان ہے یا کوئی یونانی مجسّمہ۔ چھوٹے چھوٹے

---

[1] بربنائے مصلحت مقامات اور اشخاص کے اصلی نام ظاہر نہیں کیے گئے۔

ہاتھ۔ چھوٹے چھوٹے پاؤں۔ چال میں ایک قدرتی متوالا پن۔ مزاج میں بے انتہا انکسار مگر چہرہ سے بلا کی تمکنت نمایاں، ناواقف دیکھے تو سمجھے کوئی رانی یا شاہزادی ہے۔ ہزار کے مجمع میں بٹھا دو تو الگ نظر آئے، جیسے ستاروں میں چاند۔ ماتھے پر سُرخ بندی ایک سرچشمہ تھی جس سے حسن اُبل رہا تھا۔ میں جب اُسے دیکھتا، ہرنام سنگھ کی قسمت پر رشک کرتا اور دل میں کہتا "کاش میں مصوّر ہوتا"۔ ہرنام سنگھ کو "پریا"[1] کے پردہ کا بہت خیال تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ حق پر تھے۔ ایک دفعہ نہیں میں نے بارہا دیکھا کہ جب کبھی پریا کے گھونگٹ کا پٹ اُلٹ گیا اور کسی کی نظر اُس پر پڑ گئی وہ ساری دُنیا کو بھول گیا اور جب تک دیکھ سکا پریا کے سوا اور کسی چیز کو نہ دیکھا۔

ہرنام سنگھ کو فارسی ادب سے ہی نہیں بلکہ ایران کی ہر چیز سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرے یہاں بیٹا ہوا تو اُس کا نام شہریار رکھونگا اور بیٹی ہوئی تو شہربانو۔ ایک مرتبہ میں نے کہا اگر تم نے ایسی حرکت کی تو سکھ لوگ تمہیں اپنی برادری سے نکال دیں گے، انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ کہ میں سچ مچ کا سکھ ہوں یعنی گرو نانک کا چیلا۔ وہ گرو نانک جس نے ذات پات کے بندھنوں کو توڑ کر چھوت چھات کو مٹایا۔ جس کے یہاں رام اور رحیم کے ایک ہی معنی ہیں جس کے یہاں صرف محبت و اخلاص معتبر ہے۔ الغرض جب ایک مہینہ بعد ان کے یہاں بیٹی ہوئی تو انھوں نے اُس کا نام شہربانو رکھا۔ امرت پور کے سکھوں اور ہندوؤں نے اُن کی اس "بدعت" کو بہت ناپسند کیا۔ ناراضی یہاں تک بڑھی کہ وہ انہیں اسکول سے علیحدہ کر دینے پر آمادہ ہوگئے۔ مگر کسی مناسب موقع کے منتظر تھے۔

دو مہینے اور گذر گئے، امرت پور میں سکھوں کا ایک بڑا بھاری جلسہ ہوا۔ مہمانوں کے لئے ہمارے اسکول کے میدان میں خیمے لگائے گئے اور وہیں "دربار" لگا۔ گرد و نواح کے ہزاروں سکھ جلسہ میں شریک ہوئے۔ باہر سے آنے والے نمائندوں میں ارجن گڑھ کی رہنے والی ایک نوجوان عورت بھی تھی جس کا نام روپ کور تھا۔ اُس نے اپنی زندگی مذہبی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ اب تک کنواری تھی اور آئندہ بھی شادی کا ارادہ نہ تھا۔ چھریرا بدن، متوسط قامت، سانولی رنگت، پتلا نقشہ، تیز آنکھیں۔ چہرے سے ذہانت کے ساتھ ساتھ تیز مزاجی کے بھی آثار نمایاں تھے۔ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس پہنے۔ کرپان لٹکائے۔ جس کا میان بھی سیاہ، حمائل بھی سیاہ، بڑی تمکنت سے اسٹیج پر آئی اور پنجابی زبان میں بھجن گایا۔ اُس کی آواز بہت پیاری تھی۔ کوئل کی طرح کوکتی تھی۔ الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آئے، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانوں کی راہ سے دل پر امرت کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ میں اور سردار ہرنام سنگھ اسٹیج کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ جیسے ہی روپ کور اسٹیج پر آئی، ہرنام سنگھ کچھ مضطرب سے ہوگئے۔ اور کسی کام کے بہانے سے اُٹھنے لگے۔ میں نے زبردستی بٹھا لیا۔ بیٹھنے کو تو وہ بیٹھ گئے۔ مگر بہت بے چین، چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ پوچھا خیر تو ہے، کہا کچھ نہیں طبیعت خود بخود بگڑ رہی ہے۔ روپ کور ایک محویت کے عالم میں بھجن گا رہی تھی۔ یکایک اُس کی نظر سردار ہرنام سنگھ پر پڑی، جیسے کوئی اچانک کالے ناگ کو اپنے قریب دیکھ کر جھجک جائے اور گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ ٹھیک یہی حالت اس کی ہوئی۔ اُسے ایک دھچکا سا لگا۔ اُس کی آواز میں ایک لرزش پیدا ہوئی، ایسی لرزش جو چھپ نہ سکتی تھی۔ وہ اب بھی گا رہی تھی مگر اُس کی

[1] ہرنام سنگھ اپنی بیوی کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ اصلی نام مجھے خود بھی معلوم نہیں۔

روح کہیں اور تھی۔ اُس کی نظر ہماری طرف جمی ہوئی تھی جس سے غم و غصہ اور نفرت و حقارت برس رہی تھی۔ جذبات کا ہیجان اُس کی آنکھوں اور چہرہ سے ایسا نمایاں تھا جیسے فانوس میں سے شمع یا شیشہ میں سے شراب۔ اس کے دل میں چوٹ لگی تھی۔ درد تھا۔ چسک تھی، کسک تھی۔ کوئی پُرانا زخم ہرا ہو گیا تھا۔ وہ ایک گھائل ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی، زیادہ دیر تک نہ گا سکی، اور جلد بھجن ختم کر کے بیٹھ گئی۔

جلسہ ختم ہونے میں ابھی دیر تھی۔ میں نے ہرنام سنگھ سے کہا چلو تمہیں گھر پہونچا دوں۔ انہوں نے کہا میں چلا جاؤں گا۔ میں نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ وہ چپ ہو رہے۔ ہم دونوں اُٹھے اور جلسے سے باہر آئے۔ میں نے کہا ایک منٹ ٹھیرو میں ابھی آیا۔ دفتر میں میری چھتری رکھی ہے وہ لے آؤں۔ میں چلا گیا۔ کوئی تین چار منٹ میں واپس آیا۔ ہرنام سنگھ جا چکے تھے۔ مجھے تعجب تھا۔ یہ عمل اُن کی عادت کے بالکل خلاف تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں اتنے میں مکرجی نظر پڑے اور ہم دونوں گھر چلے گئے۔ شام کو ہرنام سنگھ ملے تو میں نے پوچھا کہ آپ کہاں چلے گئے تھے۔ انہوں نے کہا کیا بتاؤں۔ جلسہ کے سکریٹری صاحب مجھے اپنے کیمپ میں کھینچ کر لے گئے۔ آپ کو مفت میں انتظار کی تکلیف اٹھانی پڑی۔ معاف کر دینا۔ میں نے کہا وہ بات ہی کیا ہے۔

اس واقعہ کے تیسرے دن سرِشام ہرنام سنگھ میرے یہاں آئے۔ میں اُس وقت تنہا تھا مکرجی باہر گئے ہوئے تھے۔ ہرنام سنگھ کو میں نے ایسی پریشان حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ منہ اُترا ہوا، آنکھوں میں سُرخی اور بھاری پن۔ ہونٹ خشک، آواز بھرائی ہوئی۔ ہاتھ ملایا تو معلوم ہوا بدن جل رہا ہے، خوب بخار چڑھا ہوا ہے۔ وہ میرے پاس پلنگ پر بیٹھ گئے۔ ابھی میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھے چمٹ کر ایک سہمے ہوئے بچّے کی طرح آہستہ آہستہ رونے لگے۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ کوئی خاص واقعہ رُونما ہوا ہے۔ میں نے پوچھا خدا کے لئے بتاؤ تو کیا ہوا۔ وہ کچھ نہ کہتے تھے۔ سسکیوں نے ہچکیوں کی صورت اختیار کی۔ آنکھیں گنگا جمنا بن گئیں۔ آخر میرے بار بار پوچھنے پر اُنھوں نے صرف اتنا کہا "پریم۔ میں تباہ ہو گیا۔ اب کوئی مجھے نہیں بچا سکتا۔"

مکرجی کے واپس آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس لئے میں نے کہا چلو دریا پر چلیں، وہاں بیٹھ کر باتیں کرینگے۔ ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ قصبہ سے پانچ چھ فرلانگ کے فاصلہ پر ایک ندّی بہتی تھی۔ جو برسات میں بڑھکر ایک خاصہ بڑا دریا اور گرمیوں میں سوکھ کر ایک پایاب تالاب بن جاتی۔ راستہ بھر ہم دونوں خاموش رہے۔ کوئی دس بارہ منٹ میں دریا پر پہونچ گئے۔ میں نے جوتا اُتار ڈالا اور پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ ہرنام سنگھ بھی بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

"اچھا اب بتاؤ۔ کیا حادثہ ہوا؟"

"کیا بتاؤں کیا حادثہ ہوا" انہوں نے ایک نہایت غمناک لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "آج تک تم مجھے ایک نیک، تہذیب یافتہ، شریف انسان سمجھتے تھے مگر آج سے ایک بدذات، کمینہ، بدمعاش، آوارہ اور خدا جانے کیا کیا سمجھو گے۔ خیر جو کچھ سمجھو، مگر میں واقعات کو تم سے چھپا نہیں سکتا۔ میں جیسا کچھ بھی سہی۔ آخر تم نے مجھے دوست بنایا ہے اور تمہاری محبت سے اُمید ہے کہ مصیبت میں ایک بدنصیب دوست کو تنہا نہ چھوڑو گے۔" میں نے کہا "ہرنام سنگھ اس تمہید کی ضرورت نہیں۔ تم مجھ سے اچھی طرح واقف ہو میں ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں، مگر کچھ معلوم تو ہو کہ ہوا کیا۔"

اُنہوں نے کہا "سمجھ میں نہیں آتا، کہاں سے شروع کروں۔"

"جہاں سے جی چاہے شروع کرو۔ کوئی عدالت کے سامنے تو بیان نہیں دے رہے ہو!"

"تو سنو۔ پریما میری بیاہتا بیوی نہیں۔ نہ وہ ہمارے خاندان کی لڑکی ہے۔ وہ ہمارے قصبہ کے ایک بڑے ساہوکار پنڈی داس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ یہ عورت جس نے آج صبح "دربار" میں بھجن گایا اُس کا نام روپ کور ہے۔ میرا ایک دوست ہے پریتم سنگھ۔ وہ ڈاکٹر ہے آج کل بغداد میں ملازم ہے۔ پریما، روپ کور، پریتم سنگھ اور میں، چاروں بچپن میں ایک ہی پاٹھ شالہ میں پڑھتے تھے اور ہم چاروں میں بڑا پیار تھا۔ پریتم سنگھ مجھ سے دو سال بڑا اور پریما کئی سال چھوٹی ہے، میں اور روپ کور ہم عمر ہیں۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو میں اور پریتم سنگھ پاٹھ شالہ چھوڑ کر ہائی اسکول میں آگئے اور پریما اور روپ کور دونوں لڑکیوں کے پرائمری اسکول میں داخل ہوگئیں۔ اب ہمارے اسکول علیحدہ علیحدہ تھے مگر محلہ ایک تھا اور ہمارے گھر بھی پاس پاس تھے۔ اس لئے ساتھ کے کھیل کود میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا۔ روپ کور مجھے بہت چاہتی تھی، مگر مجھے اُس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ پریتم سنگھ کا پریما کے بغیر کھیل میں جی نہ لگتا تھا، مگر پریما اس سے بیخبر تھی۔ وہ بڑی الہڑ تھی۔ میرا اور پریما کا بچپن ہی میں یہ حال تھا کہ گویا ہم ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ پاٹھ شالہ میں جب کبھی وہ پیسہ دو پیسہ کی مٹھائی یا اور کوئی چیز خریدتی یا گھر سے لاتی تو مجھے ضرور کھلاتی۔ میں نہ ملتا تو رکھ چھوڑتی۔ جب ملتا دیدیتی۔ یہ تھی ابتدا۔ سات برس گذر گئے۔ ہم سب جوان ہوگئے اور ہمارے ساتھ ہماری محبت بھی جوان ہوگئی۔ مجھے اٹھارواں سال تھا، پریما کو چودھواں۔ اسی سال میں نے انٹرنس پاس کیا۔ پریتم سنگھ دو برس سے میڈیکل کالج لاہور میں پڑھتا تھا۔ پریما اور روپ کور نے چھٹی کلاس پاس کرنے کے بعد ہی اسکول چھوڑ دیا تھا۔ ان سات برس کے واقعات کو کہاں تک سناؤنگا۔ مختصر یہ کہ ہر آنے والا دن ہمیں ایک دوسرے کے لئے محبوب تر بنا دیتا اور ہر گذرنے والی رات ہمیں قریب تر چھوڑ جاتی۔ پریتم سنگھ اب تک پریما کو چاہتا تھا مگر خاموش تھا۔ روپ کور کی محبت کو میری سرد مہری نے اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد میں خالصہ کالج امرتسر میں داخل ہوگیا۔

پریما جوان تھی، اس لئے بغیر کسی خاص ضرورت کے گھر سے نہیں نکل سکتی تھی اور ہماری ظاہری ملاقاتیں ڈھائی تین سال سے موقوف تھیں مگر ملے بغیر ہمیں چین کہاں۔ چھپ چوری ملتے تھے۔ وہ تقریباً ہر روز منہ اندھیرے پوجا کے بہانے مندر جاتی اور میں ٹہلنے کے حیلہ سے علی الصباح گھر سے نکل جاتا۔ جہاں موقعہ پاتے مل لیتے۔ خط و کتابت کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ گرمیوں کی چھٹی میں جب میں گھر آتا اُس وقت بھی یہی سلسلہ جاری رہتا۔ اس طرح دو برس گذر گئے اور میں ایف۔ اے کا امتحان دے کر امرتسر سے چلا آیا۔ پریتم سنگھ بھی اُسی زمانہ میں اپنی تعلیم ختم کرکے اور ڈاکٹر بن کر گھر آیا ہوا تھا۔ وہ میرا بہت عزیز دوست تھا۔ میں نے سال بھر کے پورے حالات اُسے سُنائے۔ وہ خاموشی کے ساتھ سُنتا رہا جب میں کہہ چکا تو وہ بولا "ہرنام میں بھی آج ایک بات تمہیں بتانے والا ہوں۔ مجھے بھی پریما سے ایسی ہی محبت ہے جیسی تمہیں اور آج سے نہیں بلکہ اُس وقت سے جب ہم یہ بھی نہ جانتے تھے کہ محبت کیا چیز ہے، لیکن رفتہ رفتہ مجھے یقین ہوگیا کہ پریما سے محبت کرنے کا حق صرف تمہیں حاصل ہے۔ اِس لئے کہ وہ خود تمہیں چاہتی ہے۔ کسی دوسرے کا اُس سے محبت کرنا ایسا ہی بے معنی ہے جیسے کسی خیالی مخلوق سے محبت کرنا۔ جس طرح میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا اُسی طرح آج سے

پریما کو بہن سمجھوں گا"

یہ تھا پرتھی سنگھ جس نے اپنی محبت کو ــــ اُس محبت کو جسے دس برس تک دل کے آغوش میں پرورش کیا اور سینہ میں چھپا چھپا کر رکھا ــــ دوستی اور شرافت پر قربان کر ڈالا۔ اور ایک روپ کور تھی جس نے شرافت اور انسانیت دونوں کو اپنی تمناؤں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اُس کی محبت نفرت میں تبدیل ہوگئی۔ وہ اُس بھوکی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی جس کے بچوں کو شکاری نے چھین لیا ہو۔ ہرچند پریما بالکل بے قصور تھی مگر روپ کور کے نزدیک وہ مجھ سے زیادہ عذاب کی سزاوار تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر پریما کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو میں اُس کی محبت کا جواب سرد مہری سے نہ دیتا۔ وہ ہمیشہ ہم دونوں کو تباہ کرنے کی تدابیر سوچتی رہتی تھی۔ اُس کی مخالفانہ کوششوں اور ہماری بے احتیاطیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے قصبہ میں ہماری خفیہ ملاقاتوں کا چرچا ہونے لگا۔ پریما کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جانے لگی۔ طرح طرح کی پابندیاں عائد کردی گئیں۔ اور اب بڑی دشواریوں سے ہفتہ عشرہ میں گھڑی دو گھڑی کے لئے ملنا نصیب ہوتا۔ اسی دوران میں ایف۔ اے کا نتیجہ نکل آیا۔ میں پاس ہوگیا۔ والدین نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ فوراً میری شادی کردی جائے۔ میں نے ہرچند شور مچایا۔ ہرچند مخالفت کی، مگر ایک پیش نہ گئی اور بزرگوں نے اپنی گھڑی بھر کی خیالی خوشی کی خاطر زندگی بھر کی حقیقی راحت و مسرت کو خاک میں ملا دیا۔ ان حالات میں مجھے بیوی سے کیا دلچسپی ہوتی۔ اب گھر مجھے کاٹے کھاتا تھا۔ اور میں جلد سے جلد کالج چلا جانا چاہتا تھا۔ لیکن والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں اپنی زمینداری کا کاروبار سنبھالوں۔ لکھنا پڑھنا موقوف۔ خدا کی قدرت۔ دو ہفتے کے اندر یکایک اُن کا انتقال ہوگیا۔ ہمارا خاندان بہت معزز اور پرانا ہے۔ سرکار کی خدمت کے صلے میں بزرگوں کو جاگیریں ملی تھیں جواب تک باقی ہیں۔ ہمارے چچا سردار ہرڈیو سنگھ پولیس انسپکٹر ہیں اس وجہ سے اور بھی سارا ارجن گڈھ ہمارا احترام کرتا ہے۔ چچا نے ہمیشہ مجھے بیٹے کی طرح سمجھا۔ بلکہ بیٹے سے زیادہ۔ والد کے انتقال کے بعد میری وحشت اور بھی بڑھ گئی۔ یہ حالت دیکھ کر چچا مجھے کالج بھیجنے پر رضامند ہوگئے۔ مگر بعض وجوہ سے میں نے دہلی کو امرتسر پر ترجیح دی اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخل کرا لیا۔

میری شادی کے بعد پریما بہت افسردہ رہنے لگی تھی۔ ملاقات ہوتی تو بہت کم بات کرتی، خاموش بیٹھی رہتی۔ میں اُسے تسلّی دیتا تو رونے لگتی اور رخصت ہوتے وقت کہتی "شاید یہ آخری ملاقات ہو۔ بھگوان جانے کیوں آپ ہی آپ میرا دل بیٹھا جاتا ہے!" پریما کے والدین خود اس فکر میں لگے ہوئے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس کی شادی کر کے ہمیشہ کے لئے اُن رُسوا کُن افواہوں کا سدّباب کردیا جائے جو اب روز بروز زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلتی جا رہی تھیں۔ دہلی جانے سے ایک روز پیشتر میں پریما سے ملا۔ اُس روز اُس کی حالت بہت تباہ تھی۔ اُس نے کہا کہ "ایک ضروری بات سُن لو۔ میں دو منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیر سکتی" اور قبل اس کے کہ میں کچھ پوچھوں اُس نے خود ہی کہنا شروع کیا۔ "دہلی کے کوئی سیٹھ ہیں کندن لال۔ اُن کے بیٹے سے میری شادی طے ہوگئی۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد یہ کام ہو جائے۔ پتا جی کی خود یہی مرضی ہے" مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے بہت بلندی سے مجھے فضا میں ڈھکیل دیا اور میں گرتا چلا جا رہا ہوں۔ میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ قریب ہی کسی کے پیروں کی چاپ سُنائی دی۔ پریما تیزی سے مُڑی اور میرے دیکھتے دیکھتے غائب ہوگئی۔ اب روپ کور میر

سامنے کھڑی تھی۔ اُس نے ایک فاتحانہ انداز میں کہا:۔

"کیوں بگڑے گئے آخر۔ مجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے ؟" شاید وہ میرے جواب کی منتظر تھی مگر میں کچھ کہے سُنے بغیر چپ چاپ وہاں سے چلا آیا اپنے پیچھے میں نے اُسے یہ کہتے ہوئے سُنا:۔ "دلّی جا کر سیٹھ کُندن لال کے بیٹے کو مار ڈالنا نہیں تو پریما ہاتھوں سے گئی۔" زندگی میں آج پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ پریما مجھ سے چھن جائے گی۔ کیا بتاؤں وہ رات کیسے کٹی۔ کٹی جیسے کٹی۔ صبح کو میں دہلی روانہ ہو گیا۔

تین ہفتے گذر گئے۔ پریما کی کوئی خیر خبر نہ ملی۔ نہ اُس کا خط آیا نہ میں بھیج سکا۔ مجھے اپنا نہیں پریما کی رسوائی کا خوف تھا۔ پرتھی سنگھ نوکری کی تلاش میں لاہور گیا ہوا تھا ورنہ اُس کے خط سے کچھ نہ کچھ اطلاع ضرور ملتی۔ ایک روز شام کو کھیل کے میدان میں میرے ایک دوست مہندر سنگھ نے ہندو کالج کے ایک طالب علم سے تعارف کرایا۔ اُس کا نام مدن لال تھا۔ مدن نے برسبیلِ تذکرہ میرا وطن پوچھا میں نے کہا۔ "ارجن گڑھ" مدن نے ذرا تعجب کے لہجہ میں کہا۔ "اچھا آپ ارجن گڑھ کے رہنے والے ہیں"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ کبھی ارجن گڑھ گئے ہیں ؟"

مدن ابھی کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ مہندر سنگھ نے کہا۔

"گئے تو نہیں مگر اب جایا کریں گے۔ وہاں کے سیٹھ پنڈی داس کی بیٹی سے اِن کی شادی ہونے والی ہے۔" پنڈی داس کا نام سنکر میں ایک سناٹے میں آگیا۔

"کہو کوئی چٹھی آئی ؟" مہندر نے مدن سے پوچھا۔

"ہاں کل خط آیا۔ ابھی تک وہی حالت ہے۔ بخار کسی وقت نہیں اُترتا۔" مدن نے جواب دیا۔ میں بڑی توجہ کے ساتھ اِن دونوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ کون بیمار ہے اور کس کا بخار نہیں اُترتا۔ مگر آپ ہی آپ میرا دل بیٹھا جاتا تھا۔ جب مدن چلا گیا تو میں نے مہندر سے پوچھا "تم کس کا ذکر کر رہے تھے۔ کون بیمار ہے" اُس نے کہا۔ "مدن کی منگیتر۔ پندرہ بیس دن سے اُس کی علالت کی خبریں آ رہی ہیں۔ یکایک اختلاجِ قلب کا عارضہ ہو گیا ہے۔ اب کوئی آٹھ دن سے بخار بھی ہے۔ اِسی مہینے میں مدن کی شادی ہونے والی تھی۔ مگر لڑکی کی بیماری کی وجہ سے ملتوی ہو گئی۔"

پریما کی بیماری نے بہت طول کھینچا۔ چھ مہینے گذر گئے۔ حالت سنبھلتی اور پھر بگڑ جاتی صحت کی اُمید بندھتی اور پھر ٹوٹ جاتی۔ یہ میں جانتا تھا کہ پریما مجھے بہت چاہتی ہے مگر ایسا بھی خیال نہ تھا کہ میرے بغیر اُس کی جان کے لالے پڑ جائینگے۔ میری زندگی خود اجیرن تھی مگر میں تنہائی میں بیٹھ کر رو لینے کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ مدن سیٹھ کُندن لال کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں کا بڑا لاڈلا۔ والدین کو اُس کی شادی کا بڑا ارمان تھا اور چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو بہو گھر میں آ جائے مگر پریما کی بیماری سے شادی میں تاخیر پہ تاخیر ہوتی چلی گئی۔ آخر وہ لوگ زیادہ دنوں تک صبر نہ کر سکے اور مدن کی منگنی پریما سے چھڑا کر مہینے بھر

کے اندر اندر کہیں اور اُس کی شادی کردی۔ اِدھر مدن کی شادی ہوئی اُدھر پریما کو صحت ہونی شروع ہوئی اور کوئی دو مہینے میں وہ خاصی تندرست ہوگئی۔ میرا بی۔ اے کا پہلا سال تمام ہوگیا اور میں پریما سے ملنے کی بڑی بڑی آرزوئیں دل میں لیکر گھر آیا۔ مگر پریما کے باپ نے بہت سی مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہوئے میرے ارجن گڈھ پہونچنے سے پہلے ہی پریما کو اُس کی ماں کے ہمراہ چُپ چُپاتے کسی پہاڑ پر بھیجدیا اور چھٹیوں کے ختم ہونے تک مجھے یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ مجھے جیسی کچھ مایوسی ہوئی ہوگی آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں۔ سال بھر تک ملاقات نہیں ہوئی۔ خط بھی اِس مدت میں زیادہ نہیں آئے مگر پریما کی محبت طوفان کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ ہم دونوں کی ایک ہی حالت تھی۔ مگر میں پھر آزاد تھا۔ پریما بالکل بے بس تھی۔ اب میرا بی۔ اے کا دوسرا سال تھا۔ امتحان میں تھوڑا ہی زمانہ باقی تھا۔ مجھے اپنی کامیابی کی ذرا بھی اُمید نہ تھی۔ ہر وقت کی کاہشوں نے مجھے کھا لیا تھا۔ میرا دماغ بالکل بیکار ہوگیا تھا۔ بہرحال امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ یکایک پریما کا خط آنا بند ہوگیا۔ دو مہینے گذر گئے۔ مطالعہ اب میرے لئے ناممکن تھا۔ ہر وقت پریما کا خیال دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ سوتے جاگتے اُس کی تصویر آنکھوں میں پھرتی۔ میں اسی اُدھیڑبن میں مبتلا تھا کہ کیا کروں کہ ایکدن لائبریری سے واپس آیا تو دیکھا کہ پریما کا خط میری میز پر رکھا ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے مگر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے خط کھولا لکھا تھا:۔

"پریتم جس گھڑی کا ڈر تھا آخر آگئی۔ آج بڑی مصیبت ہے، آج سے چھٹے دن یعنی منگل کے روز میری شادی ہوجائیگی۔ میں بے بس ہوں۔ تم مرد ہو۔ تم چاہو تو اب بھی سب کچھ ہوسکتا ہے۔ ورنہ ہم نے تو جو دل میں ٹھانی ہے وہ ٹھانی ہے۔ اس جنم میں تو ملنے کی اب آس نہیں۔ پھر کب ملیں گے۔ کہاں ملیں گے کسے خبر۔ بھگوان تمہیں جیتا رکھے خوش رکھے۔ مرتے دم تک تمہاری۔ پریما"

میرے لئے اس خط میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ پریما میری نہیں ہوسکتی۔ پھر بھی اس تحریر کو پڑھکر ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے بجلی کا تار چھولیا۔ دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ پریما نے لکھا تھا کہ تم چاہو تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ مگر میں پریما سے زیادہ بے بس تھا۔ کوئی خطرناک اقدام سوائے اس کے کہ ہم دونوں کی رسوائی اور تباہی کا باعث ہو اور کسی طرح سودمند نہ تھا۔ پریما نے دل میں کیا ٹھانی تھی اُس کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کے شوہر کو حجلۂ عروسی میں دُلہن کے بجائے ایک لاش ملے گی۔ اس تصور سے مجھے چکر سا آگیا اور اگر میں فوراً بیٹھ نہ جاتا تو لڑکھڑاکر گر پڑتا۔ میں کئی دن تک نہ کالج گیا نہ کہیں اور۔ راتدن اپنے کمرہ میں پڑا رہتا۔ اِس دوران میں ایک عجیب کیفیت مجھپر طاری رہی۔ نہ رنج کا احساس تھا نہ تکلیف کا۔ نہ اپنی خبر تھی نہ پریما کی۔ نہ کوئی ارادہ تھا نہ خیال۔ وقت گذر رہا تھا۔ کبھی کبھی رونے کو جی چاہتا مگر جب آنسو نہ نکلتے تو البتہ اذیت ہوتی۔ ہاں میں یہ کہنا بھول گیا کہ کئی مہینے سے پرتھی سنگھ ملازم ہوکر دہلی آگیا تھا۔ مگر کوئی ہفتہ بھر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پریما کا خط آئے آج پانچواں دن تھا۔ یعنی منگل۔ آج رات کو پریما کی شادی ہونے والی تھی۔ شام ہورہی تھی کہ پرتھی سنگھ آیا اُس نے کہا "ہرنام۔ یہاں اندھیرے میں پڑے کیا کررہے ہو۔ اور اتنے دنوں سے تم تھے کہاں"! مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یکایک سوتے سے آنکھ کھل گئی۔ حاسے بیدار ہوگئے۔ پریما۔ اس کا خط۔ اُس کی شادی۔ ایک آنِ واحد میں آنکھوں کے سامنے تھی۔ اب آنسو اُمنڈکر

آئے اور میں پرتھی سنگھ کو لپٹ کر رونے لگا۔ پریما کا خط دکھایا۔ پرتھی سنگھ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر دھیمی آواز سے بولا "ہرنام۔ افسوس تم نے بہت دیر کی۔ دو ڈھائی گھنٹے میں پریما کی شادی اور موت سب کچھ ہو چکیگا۔ مگر دیکھو اب ہمت سے کام لینے کا وقت ہے۔ تم اگر اپنی جان بھی دیدو تو اب کچھ حاصل نہیں" پرتھی سنگھ کہہ رہا تھا میں خاموش بیٹھا سُن رہا تھا۔ مگر آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے۔ کلیجہ کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے۔ اتنے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی۔ میں نے قمیص کے دامن سے اپنے آنسو پونچھے۔ آنے والا بورڈنگ ہاؤس کا چپراسی تھا۔ اُس نے کہا "سردار جی، ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں اور اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں بہت ضروری کام ہے" میں حیران تھا کہ یہ آنے والا کون ہے۔ کیا کام ہے اور تنہائی میں ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ پرتھی سنگھ نے مجھے اور میں نے پرتھی سنگھ کو دیکھا۔ پھر پرتھی سنگھ نے کہا "میں برآمدہ میں بیٹھا جاتا ہوں، تم انہیں کمرہ میں بلاکر مل لو" دو منٹ کے بعد ایک نوجوان جس کی پگڑی، کوٹ، قمیص، شلوار سب کپڑے سفید تھے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے آج سے پہلے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ دروازہ بند کرکے چٹخنی لگادی۔ میں حیران تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔ اجنبی میری طرف بڑھا اور قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ سے جنبش کروں۔ اس کی باہیں میری گردن میں اور اُس کا سر میرے سینہ پر تھا اُس نے آہستہ سے کہا "پریتم!" مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بجلی کی ایک لہر میرے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ پریما میرے آغوش میں سسکیاں لے رہی تھی۔

ہم تینوں نے وہ رات پرتھی سنگھ کے مکان پر گذاری۔ دوسرے دن پرتھی سنگھ نے پریما کو اپنی بہن بتا کر اندر پرست گرلس ہائی اسکول کے بورڈنگ میں داخل کرادیا اور مجھے سخت تاکید کردی کہ ہفتہ بھر تک کالج کے سوا بورڈنگ ہاؤس سے کہیں نہ جاؤں۔ دو دن کے بعد ارجن گڈھ کا تھانہ دار، اور دو سپاہی، دہلی پولیس کے ایک افسر کے ساتھ اچانک میرے کمرہ میں آ داخل ہوئے۔ ہمیں پہلے سے اُن کی آمد کا انتظار تھا۔ وہ پریما کی تلاش میں تھے اور مجھے اُس کے فرار کا ذمہ دار خیال کرتے تھے۔ باتیں تو بہت ہوئیں مگر نتیجہ معلوم۔ آخر ناکام واپس گئے۔ اس کے بعد کئی دن تک خفیہ طور پر میری نقل و حرکت کی نگرانی کرتے رہے۔ مگر بے سود۔ اُنیس دن کے بعد میں پرتھی سنگھ کے مکان پر پریما سے ملا۔ تنہائی تھی، آزادی تھی۔ اطمینان تھا۔ ہماری زندگی میں سچی خوشی کا یہ پہلا دن تھا۔ ایک دن اور ایک رات ہمیں باتیں کرتے ہی گذر گئے۔

بی۔ اے۔ کا نتیجہ نکل آیا۔ میں فیل ہوگیا۔ چچا کو میں نے لکھا کہ بیماری نے امسال کام کرنے کا موقع نہ دیا۔ اب گرمیوں کی چھٹیاں دہلی ہی میں گذاروں گا تاکہ اچھی طرح تیاری کرسکوں۔ چچا بیچارے راضی ہوگئے۔ چھٹیاں ختم ہوگئیں اور پریما پھر اپنے بورڈنگ ہاؤس میں چلی گئی۔ اس سال کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں نے پھر بی۔ اے کا امتحان دیا اور پاس ہوگیا۔ فوراً ہی یہاں اسکول میں نوکری مل گئی اور میں پریما کو لیکر یہاں آگیا۔ میں چاہتا تھا کہ وطن سے دور کسی گمنام جگہ میں رہوں۔ امرت پور سے دونوں مقصد پورے ہوگئے یہاں کے لوگوں کو ہمارے متعلق کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہوا۔ اور اگر

یہ نیک بخت روپ کور یہاں نہ آئی ہوتی تو آئندہ بھی کسی کو کانوں کان کچھ خبر نہ ہوتی۔ اُس روز آپ تو آفس سے چھتری لینے چلے گئے اور میں باہر کھڑا آپکا انتظار کرتا کہ یکایک کسی نے پیچھے سے نام لیکر مجھے پکارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، یہ روپ کور تھی۔ اُس نے کہا "ہری نام مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ ذرا میرے خیمہ میں چلو" میں انکار نہ کرسکا۔ خیمہ اکیلا تھا۔ ہم بیٹھ گئے۔ روپ کور کے چہرہ پر اس وقت غصہ کے بجائے مہربانی کے آثار تھے۔ اُس نے بڑی نرمی سے پوچھا۔ "ہری، تم یہاں کب آئے" میں نے کہا "تھوڑے ہی دن ہوئے"۔ کہا۔ "پریما اچھی ہے" اس کے مُنہ سے پریما کا نام سُنکر میرا خون خشک ہوگیا مگر میں نے خود کو سنبھالا اور فوراً جواب دیا۔

"خدا کرے اچھی ہو"

"اچھی ہو۔ خوب۔ گویا وہ تمہارے ساتھ نہیں"

"میرے ساتھ! میرے ساتھ کیسے"

"ہم نے تو یہی سُنا تھا"

"جانے دے رُوپو۔ اس طرح ستانے سے کیا فائدہ"

"اچھا تو پھر کہاں ہے"

"مجھے نہیں معلوم"

روپ کور یہ سُنکر خاموش ہوگئی اور کئی منٹ تک سوچتی رہی، پھر بولی:۔

"کیا تم یہاں اکیلے ہو؟"

"نہیں، بیوی بھی ساتھ ہے"

"آہا۔ بیوی سے اتنا پریم کب سے ہوگیا"

"پریم ہو یا نہ ہو، دُنیا داری کرنا ہی پڑتی ہے"

"کیا تم اب بھی مجھ سے خفا ہو"

"میں تو تم سے کبھی بھی خفا نہ تھا"

وہ پھر خاموش ہوگئی۔ ایک مبہم خوف لمحہ بہ لمحہ مجھ پر طاری ہوتا جارہا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ مجھے سخت اُلجھن ہورہی تھی۔ وہ یکایک کھڑی ہوگئی اور بولی۔ "اچھا ہری۔ فرصت ملے تو شام کو آنا۔ میں کل صبح چلی جاؤں گی" میں خدا کا شکر کرتا ہوا اُسکے خیمہ سے نکلا۔ آپ کو دیکھنے دفتر میں گیا۔ آپ جا چکے تھے۔ میں دفتر سے نکل رہا تھا کہ اس جلسہ کے سکریٹری صاحب آگئے اور وہ مجھے اپنے ہمراہ لے گئے۔ کوئی پندرہ منٹ وہاں ٹھیرنا پڑا۔ جس وقت گھر پہونچا تو مجھے دروازہ ہی سے کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز سُنائی دی۔ میں سہم گیا اور اندر پہونچکر جو منظر دیکھا اُس نے اور بھی میرے ہوش اُڑا دئے کیا دیکھتا ہوں کہ روپ کور ایک غضبناک شیرنی کی طرح گرج رہی ہے اور پریما ایک گنہگار کی طرح ہاتھ جوڑے اُس کے سامنے کھڑی آنسو بہارہی ہے۔ مجھے دیکھکر روپ کور اور بھی آپے سے باہر ہوگئی اور کڑک کر بولی:۔

"کیوں، یہی ہے تیری بیوی۔ پریما کہاں ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔ آدمی جھوٹ بولے تو اتنا تو بولے۔ شرم تو نہ آتی ہوگی۔

ایک شریف گھر کی بیٹی کو آوارہ کرنا۔ بدمعاشوں کی طرح بھگائے جانا اور پھر اُسے اپنی بیوی ظاہر کرکے معتبر بننا۔ آخر کمینہ پن کی کوئی انتہا بھی ہے۔ یہ ہیں اسکول کے سیکنڈ ماسٹر صاحب، لڑکوں کے اخلاق سدھارنے والے۔ جہاں کے اُستاد ایسے ہونگے وہاں کے شاگردوں کا کیا کہنا۔ کمیٹی والے بھی اندھے ہیں جو ایسے لفنگے بدمعاشوں کو ٹیچر بناتے ہیں۔ دیکھ ابھی تیری ساری قلعی کھولے دیتی ہوں۔ عورت کی محبت کو ٹھکرانا۔ بچّوں کا کھیل نہیں۔"

روپ کور غصّے کے مارے کانپ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ سیاہ ہوگیا تھا۔ پریا خوف کے مارے ایک سوکھی ہوئی پتّی کی طرح لرز رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ روپ کور پر میری منت وسماجت کا اُلٹا اثر ہوگا۔ پریا کی گریہ وزاری سے اُس کی آتشِ انتقام اور بھی بھڑک اُٹھی تھی۔ میں نے بھی ذرا بلند آواز سے درشت لہجہ میں کہنا شروع کیا:۔

"ضرور ضرور۔ دل میں کوئی حسرت نہ رہ جائے۔ ساری دُنیا کو دکھا دو کہ عورت کی محبت صرف اپنے نفس کی آگ بُجھانے کے لئے ہوتی ہے۔ یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ کیسی محبت، کس کا پریم۔ جس مرد نے عورت کی ہوس کو ٹھنڈا نہ کیا اُس نے اپنی قبر آپ کھود لی۔ رُوپو تو کیا جانے محبت کیا چیز ہے۔ محبت کو دشمنی سے کیا علاقہ۔ محبت قربانی کو کہتے ہیں مگر وہ صرف ایک مرد کرسکتا ہے۔ عورت نہیں۔ عورت کی محبت صرف تباہی لاسکتی ہے۔ عورت صرف انتقام لینا جانتی ہے۔ سچ ہے جس سے محبت ہو اُسے برباد نہ کیا تو کیا کیا۔"

تیر ٹھیک نشانہ پر لگا۔ رُوپو چوٹ کھا گئی۔ اُس کا غصّہ سرد پڑگیا۔ وہ خاموش ہوگئی۔ میں آگے بڑھا اور اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کاندھوں پر رکھ کر پھر کہنا شروع کیا:۔

رُوپو۔ آخر تو کیا چاہتی ہے۔ میری موت؟ مگر کیا تجھے یقین ہے کہ میری موت سے تجھے وہ خوشی نصیب ہو جائیگی جو تجھ سے چھن گئی ہے۔ نہیں رُوپو یہ تیری بھُول ہے۔ میری موت سے تُو خوش نہیں ہوسکتی۔ سوچ کے دیکھ۔ تھوڑی دیر کیلئے فرض کرلے کہ میری خون میں ڈوبی ہوئی لاش تیرے سامنے پڑی ہے۔ کیا اس تصوّر سے تجھے چین ملتا ہے۔ خوشی ہوتی ہے؟ یقیناً نہیں۔ میں تجھے تیرے ارادہ سے روکنا نہیں چاہتا مگر اتنا سمجھ لے کہ یہ بھید کھُل جانے کے بعد میرا ٹھکانا صرف موت کی گود ہے۔"

رُوپو کا سر جھُک گیا۔ وہ اپنے فعل پر نادم تھی۔ اُس نے پھر سر اُٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے کاندھوں سے جُدا کئے اور اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: "میری میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔" اتنا کہا اور خاموشی کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئی۔ میں اور پریا دونوں مبہوت کھڑے رہ گئے۔ اُس روز شام کو آپ کے یہاں آنے سے پہلے میں کیمپ گیا کہ دیکھوں روپ کور کس رنگ میں ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ دوپہر ہی کی گاڑی سے ارجن گڈھ چلی گئی۔ چچا آجکل چھٹی لے کر گھر آئے ہوئے ہیں۔ آج تیسرے پہر اُن کا خط ملا۔" یہ کہہ کر ہرنام سنگھ نے ایک لفافہ جیب سے نکالا لیکن اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس لئے خط پڑھا نہ جاسکا۔ انھوں نے اُسکا خلاصہ زبانی بیان کیا:۔

"روپ کور نے تمہارا سارا کچا چٹھا کھولدیا۔ ابھی پنڈی داس کو معلوم نہیں۔ معلوم ہو جائیگا۔ پولیس جلد تمہاری گرفتاری کیلئے امرت پور پہونچے گی۔ تم نے سارے خاندان کی ناک کاٹ دی۔ ہمیں سر اُٹھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ خیر جو کیا اچھا کیا۔ اب اس کا نتیجہ بھی دیکھ لوگے۔ خیریت اسی میں ہے کہ اُس عورت (پریا) کو فوراً وہاں سے نکالدو۔ ہمیں

اب خط نہ لکھنا۔ ہم نے سمجھ لیا کہ آج تم مر گئے ۔"

اس کے بعد ہرنام سنگھ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"میں یہ خط پریما کو دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اُس نے اصرار کیا میں نے دیدیا اُس نے پڑھا اور ہائے رام کہکر مجھے چمٹ گئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے بے حال ہو گئی۔ میں نے ہر چند اُسے تسلی دی مگر اُس کے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے۔ بچی کو اُٹھا لائی اور میری گود میں ڈال دیا اور پھر مجھے چمٹ گئی۔ اس وقت اُس کی عجیب حالت ہو۔ سودائیوں کی طرح کبھی اُٹھتی ہے کبھی بیٹھتی ہے۔ کبھی ٹہلنے لگتی ہے۔ چُپ ہو جاتی ہے۔ پھر رونے لگتی ہے۔ ابھی جب میں یہاں آنے لگا تو پھر میری آستین پکڑ کے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔ "مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ۔ مجھے اپنے ہاتھ سے مار ڈالو مگر اکیلا نہ چھوڑو۔ میرا دُنیا میں کوئی نہیں۔" بڑی مشکل سے یہ وعدہ کرکے آیا ہوں کہ گھنٹہ بھر میں واپس آجاؤنگا۔ کہئیے اب کیا کروں ۔"

میں نے کہا "میرے نزدیک تو سب سے محفوظ جگہ دہلی ہے۔ وہیں اندرپرست کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرادو۔ مگر فوراً چلا جانا چاہیئے۔" "مگر وہ لوگ شادی شدہ لڑکیوں کو نہیں لیتے۔ بالفرض لے بھی لیں تو بچی کا کیا بندوبست کیا جائے۔ بچہ کو بورڈنگ میں رکھنے کی تو ہرگز اجازت نہ ملے گی ۔"

"تو اس صورت میں بچہ کیلئے کسی قریب کے گاؤں میں دایہ کا انتظام کرنا پڑے گا۔"

"دایہ کا انتظام تو ہو سکتا ہے مگر ماں اس ننھی سی جان کو جُدا کرنا کیسے گوارا کریگی۔"

"میں خود یہی سوچ رہا ہوں۔ مگر اب اس کے سوا چارہ کیا ہے ۔"

سردار ہرنام سنگھ نے گھر جاکر پریما کو ہمارے مشورہ سے آگاہ کیا۔ وہ اپنی بچی کی جُدائی کے خیال سے تڑپ گئی۔ رات بھر آنکھوں سے آنسو نہ تھما۔ ہمارے اسکول کا ڈرائنگ ماسٹر تیجا سنگھ قریب ہی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اُسے کچھ دے دلاکر اس پر آمادہ کیا کہ بچی اُس کی بیوی کی حفاظت میں رہے اور یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو۔ امرت پور ریل کا اسٹیشن نہیں۔ گھڈا کرالا تک پیدل یا گھوڑے پر جانا پڑتا ہے۔ دوسرے دن رات کے تین بجے امرت پور سے روانگی قرار پائی تاکہ چُپ چُپاتے نکل جائیں۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں پچھلے پہر جب ہم لوگ سو کر اُٹھے تو چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ گھوڑے تیار تھے۔ تیجا سنگھ کی بیوی شہربانو کو لینے کے لئے رات ہی کو آگئی تھی۔ میں نے فراق کا ایسا دلدوز منظر اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ پریما اپنی بچی کو کلیجہ سے چمٹائے ہوئے تھی۔ دیوانہ وار بار بار اُس کا مُنہ چومتی تھی۔ بلند آواز سے رو بھی نہ سکتی تھی۔ گھُٹی گھُٹی آواز نکلتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس غم سے اُس کا دم نکل جائے گا۔ کبھی بچی سے خطاب کرکے کہتی "ننھی اب کب ملوگی میری جان۔ مجھے بھول نہ جانا بی بی۔ اِس جنم میں نہیں تو اگلے جنم میں ملیں گے۔ میں تو تجھے فوراً پہچان لونگی۔ یہ پیاری صورت کیا میں بھول سکتی ہوں۔ ننھی میرے پیچھے رونا نہیں۔ میں جلد آجاؤنگی۔" کبھی آسمان کی طرف مُنہ اُٹھاتی اور ایک دردبھری آواز سے کہتی "پرماتما پاپ تو میں نے کیا ہے۔ مگر اس ننھی سی معصوم جان کا کیا قصور ہے جو ماں کی گود اس سے چھن گئی۔" پریما اسی فریاد و زاری میں مصروف تھی کہ ہرنام سنگھ نے کہا۔ "اب وقت زیادہ نہیں۔ جلدی کرو۔" یہ کہا اور بچی کو پریما سے لیکر تیجا سنگھ کی بیوی کی گود میں دیدیا۔ پریما کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ ہرنام سنگھ نے سہارا دیکر اُسے سنبھالا اور گھوڑے پر سوار کیا۔ ہم دونوں بھی سوار ہو گئے۔ پریما نے

کہا۔"میری ننھّی کو اِدھر لاؤ۔ آخری پیار تو کرلوں۔ پھر بچّی کو سینہ سے لگایا۔ مُنہ چوما اور کہا "جاؤ بی بی پرماتما کو سونپا!"

آگے آگے میں اور پیچھے پیچھے پریما اور ہرنام سنگھ۔ اس طرح یہ تین سواروں کا قافلہ آخر شب کی خاموشی اور چاند کی زرد پھیکی روشنی میں امرت پور سے روانہ ہوگیا۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ ریتیلے میدانمیں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی سُنائی نہیں دیتی تھی۔ ابھی کوئی دو ڈھائی میل گئے تھے کہ مجھے اپنے پیچھے کسی چیز کے زور سے گرنے کی آواز سُنائی دی۔ ساتھ ہی ہرنام سنگھ نے گھبرا کر زور سے کہا۔"ارے!" میں نے پلٹ کر دیکھا پریما گھوڑے سے گر پڑی تھی۔ ہرنام سنگھ نے دوڑ کر اُٹھایا۔ وہ بیہوش تھی۔ میں نے کہا لٹا دو۔ ہرنام سنگھ نے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ قمیص کے بٹن کھولدئے میں دو قدم ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ پریما کئی منٹ بیہوش رہی۔ ہم دونوں سخت مضطرب تھے۔ یکایک پریما نے آنکھیں کھولیں اور نہایت کمزور آواز میں کہا۔"ننھّی۔ ہائے ننھّی!" ہرنام سنگھ نے پوچھا کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔ پریما نے جواب دیا مجھے کچھ خبر نہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد ہم پھر روانہ گئے۔ ہرنام سنگھ اور پریما دونوں ایک گھوڑے پر آگے آگے۔ اور میں دوسرے گھوڑے پر اُن کے پیچھے۔ تیسرے گھوڑے کی لگام بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ اس طرح ہم دن نکلنے سے پیشتر گھڈا کرالا پہونچگئے۔ میں ان لوگوں کو ریل میں بٹھا کر امرت پور واپس آگیا۔

پریما کو اندر پرست گرلس ہائی اسکول دہلی کے بورڈنگ میں داخل کرا کے ہرنام سنگھ چوتھے دن امرت پور لوٹ آئے۔ قصبہ میں ہر طرف اُن کے واقعات کا چرچا تھا۔ اسکول والوں نے اُنہیں نوٹس دیدیا۔ میں بھی اُن کی رفاقت میں ملازمت سے دستبردار ہوگیا۔ ہم دونوں کے چلے جانے کے بعد مگر جی بھی اسکول میں ٹھیرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے ہمارے ساتھ ہی اُنہوں نے بھی استعفاء دیدیا۔ انگریزی مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کی درمیانی رات میں پھر تین مسافر گھوڑوں پر سوار اس ریگستانی علاقہ میں جہاں حدّ نظر تک ریت کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا، خاموشی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ہرنام سنگھ کو میں اپنے ساتھ رام پور لے گیا۔ وہاں اُنھوں نے بڑی محنت سے ایم۔ اے کی تیاری شروع کردی مگر ان مسلسل پریشانیوں سے اُن کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ اُنہیں ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا۔ امتحان میں ابھی کئی مہینے باقی تھے۔ اُنہیں کرتار پور (ضلع فیروز پور) کے ایک مڈل سکول میں ہیڈ ماسٹری مل گئی اور وہ رام پور سے اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ پریما دہلی ہی میں تھی کیونکہ اُسے ساتھ رکھنا ہنوز خطرے سے خالی نہ تھا۔ کرتار پور گئے ابھی ایک ہی مہینہ گذرا تھا کہ ہرنام سنگھ یکایک زیادہ بیمار ہوگئے۔ مگر کچھ دنوں میں پھر طبیعت سنبھل گئی۔ اسی دوران میں وہ اپنی بچّی کو دیکھنے امرت پور گئے۔ وہاں سے واپس آکر مجھے لکھا کہ:۔

"بچّی بہت بیمار ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ جس وقت میں پہونچا تو میلے کچیلے گودڑ میں لپٹی ہوئی پڑی بلک بلک کر رو رہی تھی، کوئی اُس کے پاس نہ تھا۔ مُنہ پر مکھیوں کے چھتّے تھے۔ یہ حالت دیکھکر میرا دل پھٹنے لگا۔ میں نے اُسے اُٹھالیا، سینہ سے لگاکر پیار کیا۔ وہ فوراً چپ ہوگئی، مجھے غور سے دیکھنے لگی اور ایک خفیف سی مسکراہٹ اُس کے معصوم ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ گویا اُس نے مجھے پہچان لیا۔ پریم سے اس منظر کو دیکھ کر میرا کلیجہ مُنہ کو آگیا۔ بہت ضبط کیا مگر آنسو نہ رُک سکے۔ تیجا سنگھ کی بیوی کو میں کافی روپیہ ننھّی کی پرورش کے لئے دے

آیا تھا مگر معلوم ہوتا ہو کہ اُس بدبخت عورت نے ایک پیسہ بھی اُسپر صرف نہیں کیا۔ اب قریب کے ایک گاؤں میں ایک اور بیوہ عورت کے سپرد کر آیا ہوں۔ پریما کو میں نے یہی لکھدیا ہو کہ شہربانو بالکل اچھی ہو۔ وہ اپنی بچّی کے لئے بہت تڑپتی ہو کچھ بنائے نہیں بنتی"۔

ہرنام سنگھ کی علالت روز بروز بڑھتی گئی۔ وہ مہینے بھر کے بعد پھر اپنی بچّی کو دیکھنے گئے۔ جس وقت وہاں پہونچے اُس کے آدھے گھنٹے بعد بچّی نے دم توڑ دیا۔ اُن کے دل پر جو کچھ گذری ہوگی ایک صاحب اولاد ہی اُس کا احساس کرسکتا ہے۔ اُنہوں نے بچّی کی موت کو پریما سے پوشیدہ رکھا اور اُسے پھر یہی لکھدیا کہ "میں خود دیکھ آیا ہوں ننھی بالکل تندرست ہے"۔

اب میرا قیام بریلی میں تھا۔ ہرنام سنگھ بیماری کے باوجود ایم۔اے کا امتحان دینے لاہور گئے اور فارغ ہوکر جب کرتارپور واپس آئے تو مجھے خط لکھا کہ پرچے اچھے ہوگئے۔ اس کے بعد اُن کا کوئی خط نہیں آیا۔ دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے گذر گئے۔ اسی زمانہ میں میری والدہ کا انتقال ہوگیا۔ میں خود اپنی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ اس لئے بہت دنوں تک خط نہ لکھ سکا۔ پھر جب لکھا تو جواب نہ آیا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس طویل خاموشی کا باعث کیا ہو۔ کچھ دنوں بعد میں تعلیم کی غرض سے لاہور چلا گیا۔ تین مہینے یہاں بھی گذر گئے مگر ہرنام سنگھ کی کوئی خبر نہ ملی۔ ایک دن شام کے وقت لوہاری دروازے جاتے ہوئے نہر کے کنارے ایک اجنبی شخص نے مجھے سلام کیا اور ٹھہر گیا۔ میں نے اُسے بالکل نہیں پہچانا۔ پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ "میرا نام بشن سنگھ ہے، میں نے امرت پور کے اسکول میں آپ سے پڑھا ہو۔ اب انٹرنس پاس کرکے دیال سنگھ کالج میں آگیا ہوں"۔ میں نے امرت پور کے لوگوں خصوصاً اسکول کے سب ماسٹروں کا حال فرداً فرداً پوچھا اور وہ بتلاتا رہا۔ خدا جانے کیوں ہرنام سنگھ کا نام لیتے ہوئے ایک مبہم خوف میری زبان پکڑے لیتا تھا۔ آخر میں نے پوچھا:۔

"اور ہرنام سنگھ کہاں ہیں"؟

"ہرنام سنگھ! ہرنام سنگھ تو کئی مہینے ہوئے فوت ہوگئے۔ وہ بہت دنوں سے کرتارپور خالصہ اسکول کے ہیڈماسٹر تھے اُنہیں دق ہوگئی تھی اُسی میں انتقال ہوا۔ شاید آپ کو معلوم ہو اُنھوں نے ایم۔اے کا امتحان دیا تھا۔ نتیجہ اُن کے مرنے کے دو دن بعد آیا۔ وہ پاس ہوگئے تھے"۔

یہ سُننا تھا کہ میرا دل دھک سے ہوگیا۔ جو صدمہ مجھے اُس وقت ہوا اُس کا اظہار میرے بیان کی قدرت سے باہر ہے۔ میں نے ہرنام سنگھ کے چچا سردار ہردیو سنگھ کو تعزیت کا خط لکھا۔ اُنہوں نے فوراً جواب دیا۔ ہردیو سنگھ کا ایک جوان بیٹا ہے سُندر سنگھ۔ اُس نے مجھے علیحدہ خط لکھا اور اُن تعلقات کے باقی رکھنے کی خواہش کی جو میرے اور مرحوم ہرنام سنگھ کے درمیان تھے۔ ہماری مراسلت جاری ہوگئی۔ دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء میں کرسمس کی تعطیل میں مَیں نے سُندر سنگھ کو لاہور بلایا وہ آیا اور ہفتہ بھر میرا مہمان رہا۔ ایک دن میں نے اُس سے پوچھا کہ پریما کہاں ہے۔ اُس نے کہا کہ کچھ پتہ نہیں۔ بھیّا کے مرنے کے بعد بابا نے کہا کہ جو ہونا تھا ہوا اب وہ ہماری عزّت ہے۔ اُسے لے آؤ۔ میں دہلی گیا۔ بورڈنگ کی سپرنٹنڈنٹ نے بتایا کہ پریما تو پانچ چھ مہینے سے لاپتہ ہے۔ اُس کے پاس ایک خط کہیں سے آیا تھا۔ اُسے پڑھ کر دو دن رات برابر روتی رہی، کھانا پینا ترک کردیا تھا۔ ہرچند اُس سے پوچھا مگر اُس نے کچھ نہ بتایا۔ ہرنام سنگھ کو تار دیا گیا مگر وہاں سے کوئی

جواب نہ آیا۔ تیسرے دن صبح کو دیکھا تو پریما کا کمرہ خالی تھا۔ بہت تلاش کی، کچھ پتہ نہ چلا۔ پولیس میں اطلاع کی۔ کچھ نتیجہ نہ ہوا۔ اُس کی گمشدگی کا سبھی کو افسوس ہے۔ ایسی نیک بخت اور محنت کرنے والی لڑکی ایک بھی اسکول میں نہیں آئی۔ خیال یہ ہے کہ شاید اُس نے جمنا میں ڈوب کر یا اور کسی طرح خودکشی کر لی۔ یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"پریم چند بھاری"

حریمِ حُسن

حریمِ محبت میں ہر شے جواں ہے
شبابِ بہار آفریں حکمراں ہے

شہِ حسن ہی مسند آرائے تمکیں
"محبت" دو نازِ پر پاسباں ہے

جمالِ دل آرا کی ضو ریزیوں سے
یہ بزمِ طرب غیرتِ کہکشاں ہے

ہر اک سمت ہیں طلعتوں کی ضیائیں
ہر اک چیز پر حسن پرتو فشاں ہے

فضاؤں میں ہے اہتزازِ لطافت
ربابِ مسرت پہ نغمہ رواں ہے

ہے زہرہ و ناہید کا "رقصِ سیمیں"
بساطِ زمیں رشکِ آسماں ہے

رواں ہیں ترنم کی لہروں پہ بجرے
یہ وہ قلزمِ عشرتِ بیکراں ہے

ہے آنکھوں سے اک قلزمِ کیف جاری
نگاہوں سے تسنیم و کوثر رواں ہے

ہر اک مسکراہٹ سے کھلتی ہیں کلیاں
ہر اک خندۂ لغزشِ گلفشاں ہے

ہر اک خامشی میں ہو لرزاں ترنم
ہر اک گفتگو مست و بادہ چکاں ہے

یہ اقلیمِ مدہوشی و بیخودی ہے
یہاں عقل کی حکمرانی کہاں ہے؟

یہاں موت پیغمبرِ عیشِ رنگیں
یہاں زندگی راحتِ جاوداں ہے

حسیں غنچے سر بہ سجدہ ہیں ہر سو
جبیں خاک پر رکھے پیرِ مغاں ہے

ترانہ ہے الہام کا لب پہ جاری
زبانوں پہ تقدیس کی داستاں ہے

خطابت کی ہی سرد شعلہ نوائی
کہ آتش بیانی یہاں بے زباں ہے

نہیں فرق یاں بادشاہ و گدا میں
یہاں سب برابر ہیں، وہ آستاں ہے

شکست آشنا فرق، کجکلاہی
یہاں عشق نادار بھی کامراں ہے

شبستانِ حسن آفریں میں سنبھل کر
یہاں لغزشِ پا نیازی ازیاں ہے

نگہ روبرو کر! یہ وہ بارگہ ہے
جہاں کا ہر اک ذرہ یزداں نشاں ہے

بشیر نیازی

شکست سکوت

ایک عورت کی ڈائری کے چند ورق

روزنامچے بہت آدمی لکھا کرتے ہیں۔ کوئی کسی لئے لکھتا ہے اور کوئی کسی لئے۔ بعض اس لئے لکھتے ہیں کہ جہاں وہ اور کئی کام کرتے ہیں وہاں روزنامچے کو بھی ایک کام سمجھتے ہیں۔ بعض اس لئے کہ انہیں فرصت زیادہ ہوتی ہے اور کام کم۔ بعض اس لئے کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے اُسے لکھ لیں۔ بعض اس لئے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اُسے لکھ لیں۔ میں بھی روزنامچہ اسی لئے لکھتی ہوں کہ اپنے گذرے ہوئے واقعات اس میں درج کر لوں۔ میں نے نہ تو کچھ کیا ہے اور نہ کچھ دیکھا ہے۔ میں کیا تھی؟ یہی میری کُل تاریخ ہے۔ اور بھلا میں اسے لکھنے کیوں بیٹھی ہوں ۔۔۔ یا لکھنے کی کوشش کیوں کر رہی ہوں؟ ۔۔۔ اس لئے نہیں کہ میں بیکار ہوں بلکہ اسلئے کہ میں اکیلی ہوں، تنہا ہوں۔ اور مجھے کسی نہ کسی سے باتیں کرنی ہیں، بولنا ہے، کیونکہ مجھے اپنے وجود کو محسوس کرنا ہے۔ میرے لکھنے کا کچھ اسی سے ملتا جلتا سبب ہے جیسے کسی وجہ سے کوئی بچہ گانے لگے، یا کوئی عورت بعض اوقات رونے لگے جس طرح رونے سے دل کا بوجھ کچھ کم ہو جاتا ہے، اسی طرح اس روزنامچے کے لکھنے سے مجھ پر سے بوجھ کم ہو جائے گا۔ کس چیز کا؟ یہ میں نہیں جانتی۔

اس سے پیشتر کہ میں اپنا روزنامچہ لکھنا شروع کروں میں ایک بات کی طرف سے اپنا اطمینان کر لینا چاہتی ہوں ۔۔۔ کہ میں اُس بیوقوف جذباتی لڑکی کی طرح نہیں ہوں جو اپنے تخیل کی رنگین دُنیا بسا کر اس پر آہ و زاری کرتی ہے۔ میں ایسی لڑکیوں کو جانتی ہوں جو اپنے روزنامچے لکھا کرتی تھیں اور انہیں اس طرح استعمال کرتی تھیں جیسے کسی آئینہ کو اور اس میں اپنے چہرے دیکھ دیکھ کر طرح طرح کی بجسپ صورتیں بناتی تھیں۔ میں اُن جیسی نہیں ہوں۔ میں اپنے آپ کو ویسا ہی دیکھنا چاہتی ہوں جیسی کہ میں ہوں اور تھی۔ میں اسی کو قلمبند کرنا چاہتی ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ اس میں مجھے کامیابی ہوگی۔ میں نہیں جانتی کہ زندگی کیا ہے مگر مجھے کم از کم اتنا ضرور معلوم ہے کہ میری زندگی کیا ہے گو دیکھنے والوں کو میری زندگی واقعات سے یکسر خالی نظر آئے گی۔ اسکے کُل واقعات اندرونی ہیں جن کا مرکز دل ہے۔ میں جانتی ہوں کہ واقعہ اور خیال میں کیا فرق ہے لیکن میں نہیں جانتی کہ واقعہ اور تاثر میں کیا فرق ہے؟ بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کا شمار تاثرات میں نہیں ہو سکتا مگر سب تاثرات واقعات ہوتے ہیں۔ وہ کام ہی کیا ہوگا جس سے کسی کے تاثرات کو ٹھیس نہ لگے؟ یہ تو کوئی ایسی ہی سی بات ہوگی جیسے کسی دوسری دُنیا میں کچھ ہو رہا ہو۔ وہ خیال ہی کیا ہوگا جس کا ہم پر کوئی اثر نہ ہو؟ خیال اپنی معراج پر یا تو تاثر کی رہنمائی کرتا ہے یا اسکی بجائے کام کرتا ہے۔

ہاں مگر اس سب کچھ کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی ایک سوال باقی رہ جاتا ہے جس کا جواب اگر میں نے نہیں دے لیا تو بعد میں مجھے بہت پریشانی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ میری زندگی واقعات سے پُر ہو اگرچہ وہ صرف خیالات ہی سے مملو ہو۔ تسلیم ۔۔۔ مگر کیا یہ واقعات اِس لائق ہیں کہ اُن کی تاریخ لکھی جائے؟ کیا میرا احساسِ مضحک مجھے انہیں تسلیم کر لینے دیگا؟ ہاں۔ اور اس کا سبب یہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہر انسان تصویر کشی کے لئے اچھا نمونہ نہ بن سکے لیکن تشریحی اعتبار سے ہر انسانی جسم بہت اچھا نمونہ ثابت ہو سکتا ہے ۔۔۔ انسانی رُوح کا تو پھر پوچھنا ہی کیا۔ میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ مجھ میں جتنے امکانات ہیں یہ اُن میں سے ایک کی بھی مظہر نہیں ہوں۔ لیکن پھر بھی اگر انسانی زندگی کے کچھ معنی ہیں تو میری زندگی کے بھی کچھ

نہ کچھ معنی ضرور ہونگے۔

او ہو! میں کسقدر فلسفیانہ باتیں کرنے لگی۔ مگر اب فلسفیوں کی سی باتیں نہیں کروں گی۔ میں اب ایک بیوقوف عورت کی طرح اپنے خیالات ظاہر کروں گی۔

میں لیٹے روزنامچہ لکھتی ہوں لیکن یہ پہلے ایک یادداشت ہوگی کیونکہ میں نے آپ سے صرف اسی طرح بیان کر سکتی ہوں کہ اپنے بچپن سے اسکی ابتدا کروں۔ ایک خصوصیت جو میرے بچپن سے بھی متعلق ہے وہ یہ ہے کہ میں اسوقت بھی اکیلی تھی۔ میرا دل ہی میری حقیقی جولانگاہ تھا اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔ یا یہ کہ میں اپنے بھائی بہنوں سے خواہ مخواہ الگ رہتی تھی۔ اسکے برعکس میں انکے ساتھ ہر کھیل میں شریک ہوتی تھی۔ انکے ساتھ کھیتوں اور میدانوں میں دوڑتی پھرتی تھی اور درختوں پر چڑھتی تھی۔ جب میں ان کی شاخوں پر بیٹھ کر اپنے پاؤں ہلایا کرتی تھی ——— مجھے یہ اب بھی یاد ہے جیسے کل کی بات ہو ——— تو میرے دل میں پتوں کی سبز دنیا گھومنے لگتی تھی اور کچھ عجیب و غریب سبز روشنیوں سے میرے قلب کا گوشہ گوشہ منور ہو جاتا تھا اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روشنیاں ایک دوسری زندگی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ جب میں ہری ہری دوب پر لیٹ کر آسمان کی طرف دیکھتی تھی تو بادل مجھے جادو کے پہاڑ معلوم ہوتے تھے۔ تنکے دوروں میں تیرتی گویا بھٹکتی پھرتی تھی۔

میں نے اکثر لوگوں سے سنا ہے کہ اپنی ذات کا تجزیہ کرنا گویا بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو ایک روگ لگا لینا ہے لیکن یہ جو کچھ لکھ رہی ہوں وہ اپنا تجزیہ نہیں ہے۔ کاش میں اپنا تجزیہ کر سکتی۔ کاش میں اب بھی وہی ہو جاؤں جو پہلے تھی۔ آہ! اے ننھی لڑکی جو اب کھو گئی ہے، جو اب کبھی زندہ نہیں ہو سکتی، میں تیرے متعلق اس طرح سوچ سکتی ہوں اور تجھے اس طرح بیان کر سکتی ہوں گویا تو کوئی اور ہی تھی۔ میرے اور تیرے درمیان صرف یادداشت کا واحد رشتہ ہے۔ جو اکثر ٹوٹتا رہتا ہے ——— اور وہ ضمیر جو "میں" کہلاتی ہے۔

اور پھر کبھی شاید میں غلطی پر ہوں۔ جیسے جیسے میں لکھتی جاؤنگی اس پر غور کرتی جاؤنگی۔

میرے ماں باپ دونوں اچھے خاندان کے لوگ تھے مگر وہ اپنے عزیزوں سے الگ تھلگ رہتے تھے ان دونوں کی طبیعتوں میں ایک قسم کا پندار تھا جسکی وجہ سے وہ میل جول کو پسند نہیں کرتے تھے اور تنہائی کو ترجیح دیتے تھے۔ میرا سارا بچپن اپنے گھر کے محدود دنیا میں باغ میں گزرا۔ اور وہ بچپن کس قسم کا تھا! اوپر میں کچھ بتا چکی ہوں مگر سب کچھ میں نے نہیں بتایا تھا۔

مجھے ایک بات خوب یاد ہے اور اب بھی جب کبھی مجھے اس کا خیال آتا ہے تو بیساختہ ہنسی آ جاتی ہے میں اکثر یہ کرتی تھی ——— جس طرح اور بہت سی لڑکیاں کرتی ہیں ——— کہ آئینے کے سامنے کھڑی دیر تک اپنے آپ کو دیکھتی رہتی تھی۔ اور میرے عکس کی خوبصورتی، وہ جیسی کچھ بھی تھی، میرے دل میں ہلچل پیدا کر کے مجھے پریشان کر دیتی تھی۔ مجھے کبھی اس کا خیال ہی نہیں آیا ——— کبھی نہیں، جہاں تک مجھے یاد ہے ——— کہ "میں خوبصورت ہوں"۔ میں صرف یہ سمجھتی تھی کہ "یہ کوئی خوبصورت چیز ہے"۔ جب میں اپنے رخساروں کو دیکھتی تھی تو اپنے آپ کو یہ سمجھتی تھی کہ کوئی خوشنما پھول ہے جسکی حفاظت میرے ذمے ہے اور میں اس سوچ میں پڑ جاتی تھی کہ اس پھول کی خوش رنگ پنکھڑیوں کے معنی کیا ہیں اور ان کی نزاکت سے نیم خائف سی رہتی تھی۔

کس قدر بیوقوف ہوں میں کہ ایسی باتیں لکھنے بیٹھ گئی ہوں لیکن کیا میں واقعی بیوقوف ہوں؟ یہ تو واقعات ہیں ——— بالکل سچے اور سیدھے سادے واقعات اس زندگی کے جو بناوٹ یا ظاہرداری سے یکسر پاک تھی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی کے واقعات بالکل اسی طرح کیوں نہ پیش کئے جائیں جس طرح کہ اس پر بیتے؟

بہرحال ان میں سے کئی میں نے لکھ ڈالے ہیں۔ اب میں ذرا وسیع باتوں پر آتی ہوں۔ میرے یہ تمام خیالات و تاثرات جو آسمان، سمندر یا اپنے چہرے سے متعلق تھے یہ تو سب کے سب مظاہرے تھے ایک نامعلوم مسلسل خواہش کے جو مجھ میں جاری تھی اور جو اپنی تکمیل کے لئے بے چین تھی یہ نہ جانتے ہوئے کہ کس طرح۔

گو تکمیل کا طریقہ معلوم نہیں تھا لیکن اُسے معلوم کر لینے کی کوشش ہمیشہ جاری رہتی تھی۔ اور فی الحقیقت انہیں کوششوں سے میرے بچپن کی تاریخ عبارت ہے۔ بت تراشی، مصوری اور پھر علم ـــــ خشک علم ـــ میں نے ان سبھی کو تو اختیار کیا۔ یہاں میں اس کا ذکر نہیں کر رہی کہ میں نے اپنے اسکول میں کیا سیکھا۔ وہ تو نہیں کے برابر ہے۔ میں صرف اس کا تذکرہ کر رہی ہوں جو میں نے خود کیا۔ میرے دل کی تمام قوتوں نے مجھے اس پر ابھارا۔ میں نے جو کچھ بھی سیکھا، اسی طرح سیکھا بغیر کسی کی امداد یا رہنمائی کے۔ کسی وقت میں شاعری کی کتنی کتابیں مجھے حفظ تھیں! میں خود انہیں تلاش کرتی تھی اور اُن کا مطالعہ کرتی تھی صرف اس اُمید پر کہ ان میں اس سوال کا مجھے جواب مل جائے کہ "میں کس چیز کی آرزو مند ہوں؟" لیکن ان سے مجھے سکون حاصل نہیں ہوا بلکہ مجھے انہوں نے اور بے چین کر دیا۔ پھر میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ مجھے عملی طور پر کچھ کرنا چاہئے۔ میں نے تصویر کشی اور رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ اس میں چھ مہینے گذر گئے اور میں نے دیکھ لیا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں اور خلش ہے کہ بدستور جاری ہے۔ پھر موسیقی کی باری آئی۔ جتنا میرا حوصلہ اور ارادہ تھا اگر مجھے اس میں اتنی ہی کامیابی ہو جاتی تو ستیا رہن کی موسیقی بھی اُس کے آگے بے حقیقت پڑ جاتی۔ مگر میرے لئے تو ساز کے پردے قبروں کی ایک قطار بن گئے جن میں میری ساری کوششیں دفن ہو گئیں۔ اس کے بعد میں نے سائنس اور فلسفے کی کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ ان میں مشکل الفاظ کی بھرمار تھی جن کے معنی مجھے قیاس سے نکالنے پڑتے تھے اور مجھے ایک عرصے تک یہی معلوم ہوتا رہا کہ میں جس چیز کی آرزو کر رہی ہوں وہ صرف تسکینِ عقل ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس وقت کیسے کیسے خیالات میرے ذہن میں آتے تھے! میری عقل کے گویا پر لگ گئے تھے اور وہ ان خیالات کے ساتھ محو پرواز ہوتی تھی۔ ان خیالات کو میں قلمبند کرنے کی کوشش کرتی تھی اور اپنے مضمون کے بڑے بڑے الفاظ لکھ کر میں کس قدر خوش ہوتی تھی۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اور میں بڑھتی گئی تو مجھے معلوم ہونے لگا کہ یہ سب بڑی بڑی باتیں جن پر میں نے اتنی دماغ سوزی کی تھی بہت سیدھی سادی عام باتیں ہیں ورنہ قطعی مہمل اور لایعنی ہیں۔ مگر میں ناامید نہیں ہوئی ـــ کم از کم ایک طویل عرصے تک۔

میرے اس روزنامچے کو اگر میرے علاوہ کوئی اور پڑھے تو میں جانتی ہوں کہ وہ ایک بات تو ضرور ہی کہیگا، اور وہ یہ کہ "اس بیوقوف لڑکی کو جو اپنے جذبات کی تسکین کے لئے کسی چیز کی تلاش رہی ہے کیا یہ خیال کبھی آیا ہی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو کسی کی محبت میں گرفتار سمجھ لے؟ اس نے اپنی پریشانیوں کو اس طرح رفع کرنے کی کبھی کوشش کی ہی نہیں؟" اس کا جواب "ہاں" بھی ہے اور "نہیں" بھی۔ بلکہ "نہیں" زیادہ اور "ہاں" کم۔ میرے خیالات میں محبت کبھی داخل ہوئی تھی لیکن پہلے میں اسے بیان کر دوں کہ کس طرح۔ میں محبت کی صلاحیت اپنے میں محسوس ضرور کرتی تھی مگر کچھ اور ہی طریقے سے۔ کسی ایسے شخص سے اسے وابستہ کرنا جس سے میں کبھی ملی ہوں میرے نزدیک کفر سے کم نہ تھا۔ محبت کو میں اسقدر مقدس سمجھتی تھی اور میرا خیال تھا کہ اگر میں نے کبھی اسے محسوس کیا تو وہ اس درجہ شدید ہوگی کہ میں اُسکی تاب نہ لا سکونگی۔ چنانچہ اسکے خیال ہی سے میں ڈر جاتی تھی۔ میں خود اپنے آپ سے ڈرنے لگتی تھی۔ گویا مجھ میں کوئی خوفناک راز پوشیدہ ہے۔ ایک یا دو آدمی ـــ بلکہ ایک دو سے بھی زیادہ۔ جب میں چھوٹی ہی تھی ـــ میری محبت کا دم بھرنے لگے۔ بجائے اس کے کہ میں اس پر ناز کرتی یا اس سے خوش ہوتی میں نے ایسا محسوس کیا کہ انہوں نے کوئی بہت بڑی گستاخی کی ہے اور جب میں نے دیکھا کہ میں نے کسقدر آسانی سے ان کی محبت کو رد کر دیا تو مجھے بہت مسرت حاصل ہوئی۔ انہوں نے شاید مجھے سنگدل سمجھا مگر میں ایسی نہیں ہوں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں اپنے دل کو اسقدر معزز سمجھتی تھی؛ اور اس لئے جو نامعلوم چیز یا گوہر میں تھی اُسے اس قدر

مقدس سمجھتی تھی کہ ان کا ایسا خیال بھی اپنے دل میں لانا میرے غصے کا محرک ہوتا تھا۔ کیا میں صرف محبت کر سکوں گی ——— یہ تھا وہ خیال جو میرے سامنے آجاتا تھا ——— اس وقت احساس و تاثر کا کیا عالم ہوگا؟ میں تو اسکے غلبہ سے مر جاؤں گی۔ محبت مجھے کہاں لے جائیگی؟ یہ میں سوچتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔ میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ میں نے تو کسی ایک شخص کو بھی ایسا نہیں پایا، اور میں کسی ایسے شخص کے وجود کا خیال بھی نہیں کر سکتی تھی، جو اس جذبے کو موزونیت سے مجھ میں پیدا بھی کر دے اور پھر اس میں بدی کا شائبہ بھی نہ آنے دے۔ مجھے ابتک یاد ہے کہ میں اپنے آپ کسقدر ڈرنے لگی تھی یعنی ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ میں غزلیں پڑھنے کی بھی اپنے میں ہمت نہ دیکھتی تھی کہ خواہ مخواہ مجھ پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

صرف ایک جذبہ تھا، صرف ایک محبت جس سے میں ڈرتی نہیں تھی بلکہ روح میں تازگی سی پیدا ہو جاتی تھی، اور یہ تھی اپنے والدین سے محبت۔ وہ میری فطرت کو نہیں سمجھتے تھے ——— میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا لیکن مجھے اس کا احساس تھا کہ وہ میرے بہی خواہ ہیں۔ اور اگرچہ وہ میرے خیالات میں شریک نہیں ہو سکتے تھے تاہم مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انہیں پناہ ضرور دیتے تھے۔ آہ! ایک دن مجھے کسقدر صدمہ پہونچا ہے جب اتفاقاً میں نے ابا سے اماں کو یہ کہتے سنا کہ "عذرا اتنی حسین ہے کہ اسکی شادی کسی بہت اچھی جگہ ہونی چاہیئے۔" پیشتر اس سے کہ میں اتنی دور ہٹ جاؤں کہ ان کی باتیں نہ سن سکوں، میرے کان میں ایک مالدار پڑوسی کے نام کی بھنک پڑی۔ میں نے اس شخص کا نام پہلے بھی سنا تھا اور مجھے اس سے نفرت بھی نہیں تھی مگر جب اس طرح اس کا نام سنا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی چھری کا ذکر ہو رہا ہے جو میرے گلے پر پھیری جانے والی ہے۔ اسکے بعد تین ہفتے تک میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اماں اور ابا نہیں سمجھ سکے کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں حیدرآباد سے خالہ جان کا خط آگیا جس میں لکھا تھا کہ "میاں تنویر کا امتحان ختم ہو گیا ہے اور وہ دلی ٹھہرتے ہوئے آئیں گے۔ انہیں کے ساتھ پیاری عذرا کو بھی کچھ دنوں کے لئے یہاں بھیج دو۔" اماں ابا نے بھی یہ سمجھا کہ اچھا ہے اس طرح تبدیلی آب و ہوا بھی ہو جائے گی اور خالہ جان کا کہنا بھی پورا ہو جائے گا۔ دوسرے روز بھائی تنویر بھی آگئے اور میرا جانا طے ہو گیا۔ میں بھی کچھ خوش تھی مگر میرا ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جہاں میں گھنٹوں بیٹھتی تھی اور میری کتابوں کی الماری تھی جس میں میری محبوب کتابیں تھیں۔ ان کا چھوٹنا مجھے شاق گذر رہا تھا۔ بھائی تنویر بہت خوش مذاق آدمی تھے۔ ویسے بھی اچھے وجیہ آدمی تھے۔ سفر ان کی ہنسانے والی باتوں کی وجہ سے دلچسپی سے کٹا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے شادی کا اقرار کیسے کر لیا۔ میری خالہ میں اور میرے والدین میں رازدارانہ خط و کتابت ہوتی رہی۔ ایک دن خالہ جان نے مجھے بٹھا کر سمجھایا کہ "بیٹی تمہاری بات پکی ہو گئی ہے۔ تمہارے والدین بہت خوش ہیں کہ اتنا اچھا رشتہ مل گیا۔ محلے کے محلے ہی میں شادی ہو جائیگی..." خالہ جان خدا جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ میں تو کچھ ایسی کھوئی گئی کہ میں نے کچھ بھی نہیں سنا۔ ایک سبب میری آمادگی کا، ایک سبب میرے انکار نہ کرنے کا یہی تھا کہ اس شادی میں محبت کو دخل مطلق نہ تھا۔ شادی تو میرے لئے ایک ایسی چیز تھی جس کا تمامتر تعلق مجھ سے بیرونی تھا۔ میرے لئے تو یہ ایک ایسا غار تھا جس میں اماں نے اور سب نے مل کر مجھے دھکیل دیا۔ مجھے یہ کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں، یا میرے ساتھ کیا کیا جا رہا ہے؟ میں بالکل ناتجربہ کار تھی۔

مگر اب مجھے تجربہ ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی کسی کو اس کا یقین کیسے آسکتا ہے؟ خواہ کتنے ہی عرصے تک کسی نے غور سے میرا مطالعہ کیا ہو یا میرے ساتھ رہا ہو۔ میری شادی کے ابتدائی زمانے کی تاریخ کا قیاس کون کر سکتا ہے؟ میرے شوہر ہارون تو قطعی نہیں کر سکتے! اور اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ وہ نہ تو اسکی کوشش کرینگے اور نہ انہیں اسکی پروا ہے۔ میرے بھائی جب پردیس میں پڑھنے گئے تھے تو کہتے تھے کہ گھر کی ایک ایک چیز یاد

آتی تھی یہاں تک کہ فرش میں جو پیوند لگے ہوئے تھے وہ بھی یاد آتے تھے اور گھر کے آرام و سکون کو یاد کر کر کے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر رویا کرتے تھے۔ شادی کے تین سال بعد تک میری بھی یہی کیفیت رہی۔ میرے نوکر چاکر بے شمار تھے۔ اچھے سے اچھا کھانے کو اچھے سے اچھا پہننے کو موجود تھا۔ مگر جب کبھی کپڑے بدلے یا کھانا کھایا گھر کا لباس اور کھانا یاد آ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ سب کو چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاؤں اور پھر وہی کنوارپتے کی سی زندگی گذاروں۔ اگر میں گھر واپس جا کر اماں کی گود میں اسی طرح منہ چھپا لیتی جس طرح پہلے چھپا لیا کرتی تھی تو وہ کیا کہتیں؟

میں بھلا اُن سے کیا کہہ سکتی؟ اِس حرکت کا سبب میں اُنہیں کس طرح سمجھاتی؟ اُن سے تو میں اس طرح بیان ہی نہ کر سکتی کہ وہ میرا مطلب سمجھ لیتیں میں اپنے تجربات کو بہت کم الفاظ میں پیش کر دیتی۔ میں اُن سے کہہ دیتی کہ شادی نام ہے محبت کی خودکشی کا۔ لیکن میں ایسے واقعات پیش نہ کر سکتی جن سے اس درجہ غمناک نظریے کی تائید ہو جاتی۔ میں ان سے کہہ دیتی کہ ہارون خوش مزاج نہیں ہیں۔ اکثر بدمزاجی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُمورِ خانہ داری کی ذرا ذرا سی غلطی پر وہ غضبناک ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ تو انہوں نے، گو بعد میں وہ بہت نادم ہوئے، غصہ میں میری کلائی پر چھری کھینچ ماری جس کے زخم کو میں نے دس بارہ دن تک پٹی سے چھپایا۔ میں نے اس کا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔ جس بات کا خیال مجھے ہوا یہ نہیں تھا کہ ہارون کیسے ہیں بلکہ یہ تھا کہ ہارون کیا نہیں ہیں۔ وہ مجھے ایک طرح سے پسند کرتے تھے۔ ایک طریقے سے وہ میری بہت حفاظت کرتے تھے! اور وہ یہ تھا کہ مجھے ایک خوشنما نمائش کی چیز سمجھتے تھے۔ ان کی میز پر ایک حسین عورت کا بُت تھا۔ مجھ میں اور اِس بُت میں فرق صرف اسقدر تھا کہ وہ میز پر رکھا رہتا تھا اور میں میز کے قریب بیٹھی تھی۔ میں اس کتاب کی طرح تھی جس کی وقعت اُن کے دل میں محض اُسکی خوشنما جلد کی وجہ سے تھی مگر جسکو نہ تو وہ پڑھ سکتے تھے اور نہ پڑھنے کی پروا کرتے تھے۔ کتنے ہی عرصے تک تو میں خلافِ اُمید بھی آس لگائے رہی کہ وہ مجھکو سمجھنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوئے ہیں اور ہم ایک نہ ایک دن صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے شریکِ حیات بن جائیں گے۔ میں نے کوشش کی کہ اُن سے محبت کروں اور وہ مجھ سے محبت کرنے لگیں اور اگر میں اُن کی طرف سے ذرا بھی حوصلہ افزائی دیکھتی تو شاید مجھے اس میں کامیابی حاصل ہو جاتی۔ میں نے ہر ممکن طریقے کو آزمایا۔ جب وہ باہر سے آتے تھے تو میں دروازے میں کھڑی ان کا انتظار کرتی رہتی تھی اور اپنے آپ کو ہمیشہ ہنسمکھ اور خوش مزاج ظاہر کرتی تھی۔ اور اِس سب کا نتیجہ یہ تھا کہ مجھے اُن کے ساتھ کمرے میں آئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہ گذرتے ہونگے کہ وہ کمرے سے باہر نکل جاتے تھے۔ اگر میں اُن کے پیچھے پیچھے چلی جاتی تھی تو وہ پلٹ کر پوچھتے تھے کہ کیا چاہیئے! مجھے کیا چاہیئے؟ اب جو میں اُنکے اس سوال پر کبھی غور کرتی ہوں تو مجھے ہنسی آ جاتی ہے کہ کیسا مہمل سوال تھا۔ وہ ایک ایسی چیز تھی ہارون کہ اگر میں تمہیں بتا بھی دیتی تب بھی تم اُسے نہ سمجھ سکتے۔ مگر کھانے کے وقت ہارون تم مجھ سے اس طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے تھے اور کیا تمہیں اِس کا علم ہے کہ اس مختصر سے عرصے میں میں تمہاری رُوح میں کس طرح داخل ہو جانا چاہتی تھی؟ پہلے تو میں اُن چیزوں کا ذکر کرتی تھی جن میں میرا دل لگتا تھا یا جو مجھے متاثر کرتی تھیں ـــــ اُن چیزوں کا ذکر کرتی تھی جو مجھے حسین معلوم ہوتی تھیں یا مسرور یا مغموم یا پریشان کُن۔ میرے اللہ! یہ تو تمہارے لئے ایسی ہی تھیں جیسے میں تم سے سنسکرت بول رہی ہوں۔ میں اپنے خیالات کو تمہارے ہاتھوں میں ڈال دیتی تھی ـــــ وہ خیالات جنکی میں قدر و وقعت کرتی تھی، اور میں سمجھتی تھی کہ تم ان سے خوش ہوگے۔ مگر تم یہ کرتے تھے کہ اُن کی طرف بے معنی نظروں سے گھورتے تھے اور پھر انہیں پھینک دیتے تھے کہ وہ گر کر چورا چورا ہو جائیں۔ مگر میں اس پر بھی نا امید نہیں ہوئی۔ میں نے ایک اور طریقے سے تمہارا قُرب حاصل کرنا چاہا۔ تم چونکہ میری باتوں پر دھیان نہیں دیتے تھے اس لئے میں نے تمہاری باتوں کا تذکرہ کرنا شروع کیا۔ تمہیں یہ اور بھی زیادہ ناگوار گذریں۔ پہلے تو تم سرد مہری تھے، ان سے تم شقی القلب بھی ہو گئے۔ مگر اُن لوگوں کے ساتھ جنہیں تم اپنے ساتھ شریکِ طعام کرنے کی غرض سے گھر لاتے تھے تمہارا رویّہ کتنا اچھا تھا۔ وہ تمہاری اور تم اُن کی طبیعت کو خوب پہچانتے تھے۔ تم ان کی باتوں کا

جواب اس طرح دیتے تھے جیسے تم ایک ساز ہو اور انہوں نے تمہارے پردوں کو چھیڑ دیا ہو۔ میرے لئے تم سے بات کرنے کی کوشش ایسی ہی تھی جیسے کُہر میں کوئی بھٹکتا چلا جا رہا ہو۔

ان تین سال کے عرصے میں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں مر گئی تھی۔ اگر میرے دونوں بچوں کا واسطہ نہ ہوتا تو میں حقیقتاً مر گئی ہوتی۔ میں شروع ہی سے ان سے بہت محبت کرتی تھی، مگر بچے تو دوست نہیں ہوتے۔ گو وہ میرے دل کے قریب تھے لیکن وہ اسکی کسک کو محسوس نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے مجھے زندہ رکھا۔ انہوں نے میرے دل کو جامد ہو جانے سے باز رکھا۔ مگر جب بڑا بچہ مجھے پہچاننے لگا، وہ بولنے لگا اور کچھ کچھ سمجھنے لگا تو میں نے ایک نئی مسرت محسوس کی اور رفتہ رفتہ میری روح میں تازگی بڑھنے لگی۔ میں نے کم از کم یہ تو محسوس کیا کہ مجھ میں پہلی سی کچھ نہ کچھ بات پیدا ہو گئی ہے۔ اور ایک دن میں خوب لہک لہک کر گائی۔ گو یہ ہارون کو میرا گانا بہت ناگوار گذرا۔ انہوں نے مجھے برا بھلا کہا اور میں رو پڑی۔ خیر اسے تو جانے دو۔ میں جو کچھ کہنا چاہتی تھی یہ ہے کہ بچوں کی اس محبت کا مجھ پر بڑا عجیب اثر پڑا۔ مجھ میں میرا پندار پھر پیدا ہو گیا۔ میں چاہنے لگی کہ میرے کچھ ہم جلیس ہوں اور میری تفریح کا بھی کچھ سامان ہو۔ بعض اوقات میرے پہر کو جب میں اکیلی ہوتی تھی تو میں آئینے میں اپنا عکس دیکھا کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی اور بھی مجھے دیکھے۔ اگر کوئی عورت بھی ہوتی تو میں مطمئن ہو جاتی۔ میں زیادہ تر پسند بھی عورت ہی کو کرتی تھی، مگر جی چاہتا تھا کہ کبھی کبھی ایک آدھ مرد سے بھی واسطہ پڑے ــــ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ میں نے اس پر کیا اثر کیا۔ میری یہ آرزوئے ستائش معصومیت پر مبنی تھی۔ یہ خیال تو میرے نزدیک محال تھا کہ میں کوئی غلطی کروں یا غلطی کرنے کی آرزو کروں۔ خیر تو میں نے کچھ دوست پیدا کر لئے۔ ہارون کے دوستوں میں سے نہیں بلکہ چند اچھی عورتوں میں سے۔

زندگی میں اس سے زیادہ مختلف اور کیا چیز ہو سکتی ہے جتنی کہ کوئی آرزو تکمیل سے پہلے اور تکمیل کے بعد۔ میں نے شروع شروع میں ان عورتوں کو فرشتہ سمجھا اور آخیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ فرشتہ نہیں ہیں۔ وہ مجھ پر کس قدر مہربان تھیں اور ان کی باتیں کتنی بھلی لگتی تھیں مگر جب میں نے انہیں خوب سمجھ لیا تو مجھے کس قدر صعوبت برداشت کرنی پڑی! انہوں نے مجھے نہ تو مجبور کیا اور نہ اسکی ترغیب دلائی کہ میں بھی انہیں کی طرح ہو جاؤں لیکن انہوں نے مجھے اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا۔ ان میں سے ایک نے مجھے چند کتابیں دیں۔ یہ کتابیں مشہور مصنفین کی تھیں مگر اف! وہ کس قدر بیہودہ تھیں۔ ان میں جن عورتوں کا بیان تھا وہ کسقدر ذلیل اور پست تھیں۔ میں اسکو محسوس کر رہی تھی مگر پھر بھی ان کتابوں کو پڑھ رہی تھی۔ ایک ایک کر کے میں نے سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ لیکن پھر کچھ عرصے بعد مجھے یہ کتابیں ناقابل برداشت معلوم ہونے لگیں اور انہیں سے چند کو میں نے جلا دیا اور باقی خدا جانے کہاں گئیں۔

جو کچھ میں نے لکھا ہے اگر کوئی مرد یا عورت پڑھے تو خدا جانے میرے متعلق کیسی رائے قائم کرے۔ مگر میں نے جو کچھ بھی درج کیا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ ان عورتوں نے، ان کی ہم جلیسی اور خوشامد نے مجھ پر کوئی ناگوار اثر نہیں کیا۔ ان کے ساتھ میرا جو وقت گذرا وہ بھی میری زندگی کا کوئی نمایاں حصہ نہیں ہے۔ جس طرح اپنے بچوں کی محبت نے مجھ میں میرے پندار کو بیدار کر دیا تھا اسی طرح ان عورتوں کی چاپلوسی اور پستی نے میرے نسوانی غرور کو ابھارا۔ میں نے نہ صرف یہ بری کتابیں ہی نہیں پڑھیں بلکہ میں نے پھر سائنس اور فلسفہ کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اپنے وجود ہی ہستی کو سمجھنے کی آرزو پھر میرے دل میں پیدا ہو گئی۔ جھوٹی دوستی نے مجھ میں سچی دوستی کی آرزوؤں کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ یہ سچی دوستی آخر ہو گی کیا؟ یہ میں سمجھنے سے پہلے کی طرح اب بھی قاصر تھی۔ کیا یہ علم کی صورت میں ظاہر ہو گی یا حسن کی یا کسی انسانی پیکر کی صورت میں؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

اور اب میں کیا ہوں؟ میری تاریخ کس قدر بے ربط ہے! میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میری گذشتہ چار یا پانچ سال کی زندگی پر منطبق ہوتا ہے اور اس لمحہ بھی میری وہی کیفیت ہے۔ کیا میں کچھ اچھی ہوں؟ یا میں بہت بُری ہوں؟ مجھے معلوم ہے اس وقت بھی پانچ یا چھ مرد میرے عشق میں مبتلا ہیں اور مجھے اس پر کچھ ناز سا ہے گو مجھے اُن سے بالکل محبت نہیں بلکہ مجھے اُن کا خیال بھی نہیں آتا۔ کیا یہ بُری بات نہیں ہے؟ مگر جب میں اس پر غور کرتی ہوں تو میں یہ محسوس نہیں کرتی کہ میں کس قدر بُری ہوں بلکہ یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں کسقدر تنہا ہوں۔ میری ہستی کو کسی نے ابتک پوری طرح سمجھا ہی نہیں۔ میرے دل میں ہزاروں خیالات جمع رہتے ہیں اور مجھے پریشان کرتے رہتے ہیں مگر میں ان کا اظہار کسی سے نہیں کر سکتی۔ ان میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے کوئی ایسا شخص مل جاتا جو مجھے زندہ رہنے میں مدد دیتا تو خدا جانے میں کیا ہوتی۔ کوئی ایسا شخص جس کی آمدنی کے علاوہ اور باتوں میں بھی میں شریک ہو سکتی!

آہ! تم نے میرے ساتھ یہ کیا کیا؟ تم نے مجھے پسند کیا۔ تم نے مجھ سے شادی کی۔ تم نے ایک پوری زندگی لی اور اُسے قربان کر دیا تاکہ اپنی زندگی کے ایک گوشے کو اس سے سجالو۔ تمہاری غیر موجودگی میں میں تمہاری منتظر رہتی تھی۔ تمہاری راہ تکتی رہتی تھی۔ جب تم آتے تھے تو میں تم سے ملنے کے لئے دوڑ کر جاتی تھی۔ تمہارا دل میرے لئے بالکل اس صحرا کی طرح تھا جس میں پانی کی ایک بوند بھی نہ ہو۔ میرے خیالات اس میں نشو و نما کیسے پا سکتے تھے۔ میں نے جب یہ معلوم کر لیا تو چاہا کہ اس صحرا میں تمہارے ساتھ میں بھی شریک ہو جاؤں اور اس کا نخلستان بن جاؤں۔ اگر تم مزاحم نہ ہوتے تو مجھے اس میں کامیابی ہو جاتی۔ کسی نہ کسی طرح میں تم سے محبت کرنا سیکھ جاتی مگر تم نے مجھے دھتکار دیا۔ کیا تمہیں وہ رات یاد ہے جب تم نے میری کلائی پر چھری کھینچ کر ماری تھی اور میں نے تمہیں اسلئے پیار کیا تھا کہ تم اپنی حرکت پر نادم تھے؟ تم نادم تھے کہ تم نے مجھے مارا۔ تم نادم تھے کہ تم نے ایک عورت کو مارا۔ تم خود اپنے ہی وجود سے نادم تھے۔ مگر اس وقت بھی تمہارے دل میں میرے لئے ذرا سی بھی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ مجھے اس چوٹ کو یاد کر کے نہیں بلکہ اسکے بعد جو تمہارا طرزِ عمل تھا اسکے خیال سے تکلیف ہوتی ہے۔

اور اب میں کس سے بات کر سکتی ہوں؟ پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ کسی سے بھی نہیں۔ تم نے بہت تلخی سے مجھے عقل سکھائی ہے۔ تم نے میری ماں کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ میں اُن سے بھی پوری طرح دل کھول کر باتیں نہیں کر سکتی۔ تم نے میرے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ انہوں نے مجھے اندھے کنوئیں میں دھکا دیدیا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو ایک ایسی چیز سمجھا جس کا نہ تو دل ہے اور نہ روح۔ تم نے مجھے مجبور کیا کہ پانی، جنگلوں اور طلوع و غروب کو اپنا ہم جلیس بناؤں۔ قدرت میں کوئی ایسی نامعلوم چیز ضرور ہے جو میرے دل پر اثر کرتی ہے۔ لیکن جب کبھی میں کسی حسین چیز کو دیکھتی ہوں تو اس کے احساسِ حسن کے ساتھ ساتھ ایک اور احساس بھی ہوتا ہے —— اور وہ یہ کہ میرے ساتھ کوئی ایسا نہیں جس سے پلٹ کر کہہ سکوں کہ "کسقدر حسین ہے"۔

اماں تو شاید مجھ سے یہی کہدیں گی کہ جہاں تک ممکن ہو بہتر سے بہتر طریقے پر زندگی گذار دو۔ میں جانتی ہوں وہ یہ سمجھتی ہیں کہ میں مسرور اور کامیاب زندگی گذار سکتی ہوں۔ کیا یہ میرے لئے ممکن ہے؟ حالات و واقعات جیسے کچھ بھی ہیں ان کا انہوں نے غلط اندازہ لگایا ہے۔ وہ مجھے اس طرح دیکھتی ہیں جس طرح میں اپنے آپ کو آئینہ میں خود دیکھتی ہوں —— نک سے سُک تک بنی سنوری۔ سونے میں پیلی اور موتیوں میں سپید۔ مگر آہ! میں تنہا ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ اماں مجھے بدی کا مشورہ نہ دینگی۔ اور میں دُنیاداری نہیں برت سکتی۔ اونچے گھرانوں کی عورتوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ بُری عورتوں سے مجھے نفرت ہوتی ہے۔ کسی قدر سادہ زندگی مجھے مطمئن کر سکتی ہے اگر ایسی زندگی گذارنے کے مواقع نکل آئیں۔ کسی وقت میری زندگی بہت سادہ تھی۔ مگر اماں نے میری بہتری کے لئے وہ زندگی مجھ سے چھین لی۔ اور جہاں تک میری رُوح اور میرے خیالات کا تعلق ہے اب میری کوئی زندگی

سے ہی نہیں۔

میں بہت ناشکر گذار ہوں۔ ایک خزانہ تو میرے پاس ہے ــــ میرے بچے۔ وہ مجھے زندہ رکھتے ہیں۔ وہ میری روح کو مرجانے سے روکتے ہیں۔ اگر کشف کوئی چیز ہے تو میرے بچے خدا کو مجھ پر منکشف کرتے ہیں۔ میرے پیارے بچو! آؤ میں تمہارے دلوں میں اپنا دل ڈالدوں۔ آؤ میں اپنی جان تم پر سے صدقے واری کردوں۔ میرے بچو! اپنی ماں کے قصوروں کو معاف کردو کیونکہ بعض اوقات میں نے بہت خودغرضی برتی ہے، مثلاً میں نے آرزو کی ہے کہ تم بیمار پڑجاؤ تاکہ میں تمہاری خدمت کرتے کرتے مرجاؤں۔ مگر میرے بچو! تمہاری ماں کے دل میں ایسی تنہائیاں بھی ہیں جنکو تمہارا وجود دور نہیں کرسکتا۔ وہ ہر طرح تمہاری رفیق بن سکتی ہے مگر تم بعض لحاظ سے اُسکے رفیق نہیں بن سکتے۔

بیہ
شاہد

سرگوشیاں

کون، مجھے آہستہ آہستہ نجانے کیا کیا کہتا ہے!
یہ کس کی سرگوشیاں ہیں جو میں سنتا ہوں؟
ــــ اور سمجھ نہیں سکتا!
آہ یہ کس کے نامعلوم پیغام ہیں؟ ـ
جو میرے سکون میں ہلچل ڈالدیتے ہیں!
جو میرے سینے میں غیر واضح، مبہم خیالات کا طوفان
بپا کردیتے ہیں!
پھولوں کی خوشبو میں، ہوا کی سرسراہٹ میں!
خاموش تنہائی اور پرشور ہنگامہ میں!
دکھ کے آنسوؤں میں، مسرت کی مسکراہٹ میں!
غصّہ اور نفرت میں،
اور محبّت اور ہمدردی میں،
تمام میں وہی سرگوشیاں سنتا ہوں، دیکھتا ہوں،
محسوس کرتا ہوں! .....
آہ! یہ کون پُراسرار، دائمی روح ہے۔
جو اپنی وسیع لاانتہا آغوش میں،
مجھے لے لینا چاہتی ہے؟!۔

میں اپنے آنسو قہقہہ کے سیلاب میں غرق کرنا
چاہتا ہوں!
لوگ سمجھتے ہیں میں خوش ہوں!

٭ ٭ ٭ ٭

درخت یتیموں کے آنسو رو رہے ہیں!
ہوا سسکیاں لے رہی ہے۔
ننھی چڑیاں سورج کی تیز نگاہوں سے بھاگ کر
چھپ رہی ہیں!
دور ــــ کہیں دور ــــ فاختہ کوکو کررہی ہے!
خزاں آگئی!

٭ ٭ ٭ ٭

صبح کو پنکھڑیوں پر بلبل شبنم کے قطرے دیکھ کے حیران
ہوتی ہے۔
"میرے سوا اور کون دکھی ہے جو اتنے آنسو بہاتا ہے؟"

٭ ٭ ٭ ٭

زندگی کے چوراہے پر ہم ملے،
وہ مسافر ــــ اجنبی!۔

ہم نے ایک دوسرے سے راستہ پوچھا۔
اور چلے گئے! .....

٭ ٭ ٭ ٭

ننھی کلی مت ہنس!
آہ! مجھے دیکھ،
ایک قہقہہ کا خمیازہ کتنے آنسوؤں میں ادا کررہا ہوں!

٭ ٭ ٭ ٭

میں نے دل کے آبگینہ میں اپنی روح کی شراب
کھینچ کر رکھی ہے!
آہ! اور ایک ہی نگاہ سے اس جام کو خالی کردے! ....

٭ ٭ ٭ ٭

تو نے محبّت دی!
محبت نے غم دیا!
غم نے آنسو!
دیوی ــــ ان موتیوں کو کیا کروں؟۔

٭ ٭ ٭ ٭

مجھے اپنے حضور میں بلا کہ تیری چیز تیرے سپرد کردوں۔

تسنیم

بربطِ زہرہ

از جناب ظفر قریشی۔ بی۔ اے۔ دہلوی

"جس طرح لیناردو نے مونالزا کی تصویر کی نمائش سے اپنی محبوبہ کی توہین کی اسی طرح میرے تراشے ہوئے بت سے میری لوزینہ کی آبرو پر حرف آئیگا اس لئے میں اپنے بت کو توڑ دیتا ہوں۔ مجھے گمنامی اور ناداری کی زندگی بسر کرنی بہتر معلوم ہوتی ہے۔ میں اپنی لوزینہ کے بت کو دنیا کی نظروں سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہوں، میں نے اُسے توڑ دیا۔"

باب پہلا

سولہویں صدی کے اوائل میں فلارنس یورپ کی دلہن بنا ہوا تھا مصوری، نقاشی، رقص بت گری اور جملہ فنون لطیفہ فلارنس کے فرزندوں نے زندہ جاوید کر دئے تھے۔ آبادی خوش پوش خوش کلام خوش باش تھی۔ ہر شخص کو فنون لطیفہ سے دلچسپی لازمی تھی عشق اور محبت کی داستانیں عام تھیں۔ تصویروں اور بتوں کے بنانے والے جب تک انسانی پیکروں سے محبت نہ کریں حقیقت اور الوہیت کا رنگ مجازی نقوش میں نہیں آتا شہر کے باہر کوہستانی علاقہ دور تک چلا گیا ہے۔ پہاڑوں پر جا بجا عشرت گاہیں بنی ہوئی ہیں جہاں رقص و نغمہ کا شور و رفتار اہل دل کے لئے دعوت گوش و نظر دیتا ہے۔ نقاش کی مصوری، بت گر کی مجسمہ سازی، شاعر کی غزل، سب ان عشرت کدوں سے پیدا ہوتی تھیں۔ اطلی کی حسین ترین مخلوق، قدیم رومی مجسموں کی یاد تازہ کرنے والی زندہ ہستیاں ان عشرت کدوں میں جا بجا ملتی تھیں۔ سر شام قندیلیں روشن ہو جاتی تھیں اور دلنواز محبوب آنے شروع ہو جاتے تھے۔ امرا اور اہل فن بھی سردی لمحات گذارنے کے لئے ان کوہستانی تفریح گاہوں کا رخ کرتے تھے ——— غرض ہر طرف عشق اور فن کا چرچا تھا۔

——— ایک ایسی ہی شام کا ذکر ہے۔ جبکہ اطلی کا نیلگوں آسمان غروب ہونے والے آفتاب کی سنہری کرنوں کو اپنے سینے میں پیوست کر رہا تھا۔ دو پیکر ——— دو انسان، ایک مرد، ایک عورت اس کوہستانی علاقے میں دریائے ارونا کے نزدیک ٹہلتے ہوئے دیکھے گئے۔ آہستہ آہستہ تاریکی بڑھ رہی تھی اور یہ ترجمان عشق ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ بعض بعض عشرت گاہوں میں رنگین فانوس اور قندیلیں روشن بھی ہو گئی تھیں اور ان کا عکس دریا پر پڑ رہا تھا۔ نوجوان ایک اطالوی باشندہ تھا۔ لمبی ستواں ناک، کتابی چہرہ، مضبوط جسم، میانہ قد، رسیلی آنکھیں، باریک لب اور چہرے پر شباب و شعر کی وہ پر بہار مسرتیں جو صالح نوجوان کے لئے مخصوص ہیں، دکھائی دیتی تھیں ——— لڑکی پھول کی مانند تھی۔ حسن اور موزونیت کا یہ عالم تھا کہ شاید قدرت خود بھی اُسے بنا کر فخر کرتی ہوگی۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شباب و حسن اور آرائش و جمال کے جتنے نظری سامان دنیا میں دیکھے گئے ہیں وہ سب ختم ہو گئے تھے اس پیکر کمال پر۔ شاید قدرت نے اپنا سارا خزانۂ جمال اس پر نہایت فیاضی سے لُٹا دیا تھا ——— شباب کی مسرتوں اور رونق و انداز دلربائی کے باوجود جو اُن کے چہروں پر پائی جاتی تھیں ایک حجاب حزن اُن کے چہروں پر پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دونوں کی آنکھیں ملال اور غمگینی کا عکس دکھا رہی تھیں۔ بعض اوقات نوجوان اطالوی ایک سرد آہ بھی بھرتا تھا جس سے دلگیری و شدت افسردگی کا پتہ چلتا تھا ——— دونوں دریائے ارونا کے کنارے ٹہل رہے تھے اور اپنے عشق کی داستان پر مستقبل کی روشنی میں گفتگو کر رہے تھے ———!

"عمانویل ——— عزیز عمانویل"، لڑکی نے نوجوان کے شانے کی طرف جھکتے ہوئے کہا: "تم میرے باپ سے واقف ہو وہ کسقدر ضدی آدمی ہے۔ ایک دفعہ جو بات اُسکے مُنہ سے نکل جائے اُس پر عمل کر کے دکھاتا ہے۔ اُس کا یہ خیال ہے کہ اگر نواب آمینی سے میری شادی کر دی گئی تو ہمارے گھرانے کی کھوئی ہوئی دولت اور پرانی قسمت واپس آجائے گی۔ ہم پھر نوابی شان و شوکت کی زندگی بسر کرنے لگیں گے ——— مگر " یہ کہکر لڑکی سسکیاں لینے لگی۔

عمانویل نے اُسکو تسلی دیتے ہوئے کہا: "لوزینہ پیاری! اس قدر پریشان نہ ہو۔ ہماری محبتوں کو بار آور ہونا قسمت میں نہ لکھا تھا ——— تم مجھے بھول جاؤ۔ بیشک ایک غریب بُت ساز کا اور نواب زادے کا کیا مقابلہ۔ میرے پاس کیا رکھا ہے جو تمہارے گھرانے کی نذر کروں، مجھے تو صبح شام کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی ہے ——— ادھر نواب آمینی ہے جس کے پاس طاقت ہے، دولت ہے، حشمت ہے، اور عزت و شہرت ہے ——— مگر میرے پاس ایک حساس دل اور پرجوش محبت کے سوا تیرے لئے، سلے حسینۂ فلارنس، کچھ بھی نہیں ہے ———"

"مگر میں اس قیمت کو قبول کرتی ہوں۔ مجھے آمینی کے نواب کی ضرورت نہیں ہے۔ پیارے عمانیول تم غریب ہو لیکن میرے لئے تاج زریں اور بادشاہ سے بھی زیادہ ہو ——— مجھے عشق کی رعایت منظور ہے ——— مجھے اپنی غزلوں کا دیوان تمہارے نام پر معنون کرنا ہے ——— تو ——— مگر میرا باپ بڑا ظالم ہے۔ ہم فرار بھی نہیں ہو سکتے۔ کاش اسوقت تم مشہور اور دولتمند ہوتے!"

عمانیول نے لڑکی کا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا: "مگر لوزینہ میرے دماغ میں ایک تجویز آئی ہے۔ اگر نصیبے نے یاوری کی تو نہ صرف تم میری ہو جاؤ گی بلکہ دولت و عزت بھی ہمارے قدم چومیگی ——— مگر یہ ایک وہم سے زیادہ نہیں ہے ———"

"جلد کہو، پیارے عمانیول، آخر وہ کیا بات ہے ——— تم چُپ کیوں ہو گئے۔ ہمت کرو ——— کیا نمائش ———"

"ہاں، ہاں، پیاری لوزینہ، میں اس نمائش میں ضرور شریک ہونگا۔ ڈیوک فلارنس نے جو نمائش اطالوی مجسموں کی کی ہے میں بھی اُسمیں شریک ہونگا۔ اگر میرا مجسمہ بہترین تسلیم کر لیا گیا تو "تاج شاہی" جسکے جواہرات لاکھوں کی مالیت کے ہیں میرا ہے۔ میرا نام دُنیا میں چمک اُٹھے گا۔ اور ——— سب سے بڑھکر یہ بات ہے کہ میرا سب سے بڑا خزانہ، عزیز لوزینہ، تم میری ہو جاؤ گی۔"

"نمائش میں کتنے دن ہیں؟"

"نمائش میں تو اب صرف دس روز رہ گئے ہیں، مگر میرا بُت بالکل تیار ہے، صرف ایک بربط جو مجسمہ کے ہاتھ میں تھوڑا سا بنانا رہ گیا ہے اور وہ چند منٹ کی بات ہے۔ ہتھوڑی چھینی ہاتھ میں لینے کی دیر ہے، اُسے تو فوراً مکمل کر لیا جائے گا ——— مگر مجھے ایک خوف ہے ———"

"——— جلد کہو عمانیول کیا خوف ہے؟"

"مجھے ڈر ہے کہ میرا بُت نمائش میں بھیجنا بیکار ثابت نہ ہو، کیونکہ مجسموں کے مقابلے کا فیصلہ میکائیل انجیلو کرے گا۔ یہ تو تم جانتی ہو کہ میکائیل انجیلو کس غضب کا نقاد ہے۔ اس وقت فنِ بت سازی پر تمام اطلی درومامیں اس سے بڑھکر کوئی نقاد نہیں۔ وہ ایک صاحبِ ذوق و صاحبِ نظر نقاد ہے۔ اُسکے اشارے پر تمام اُمیدوں کا فیصلہ ہے۔ کاش وہ میرا مجسمہ پسند کر لے۔ مجھ سے بھی بڑے بڑے بُت سازوں نے اپنے بُت نمائش میں بھیجے ہونگے۔ شہر روما کے تمام بہترین بُت ساز اس مقابلے میں حصہ لے رہے ہیں۔ خود فلارنس کے بُت تراش کیا کم حیثیت کے ہیں۔ پھر میں ہوں کہ نہ میرا

نام مشہور ہے نہ میری کسی سے جان پہچان ہے۔ اور ادھر "میکائیل انجیلو" جیسا نقادِ فن، فخرِ وطن جج مقرر کیا گیا ہے۔ خدا ہی مدد کریگا تو کامیابی ہوگی ورنہ نہیں ــــــــ"

"مگر عمانیول عزیز! تم اس قدر مایوس کیوں ہو، میرا تو دل گواہی دے رہا ہے کہ تمہارا ہی مجسمہ میکائیل کو پسند آئے گا اور تم تاجِ زریں کے حقدار سمجھے جاؤ گے۔ عزیز عمانیول ــــــــ میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم نے بُت کا نام کیا رکھا ہے، اور یہ بُت کس چیز کا ہے؟"

"میرے بُت کا نام "بربطِ زہرہ" ہے ــــــــ اور اس میں دکھایا گیا ہے کہ عورت (زہرہ) مرد کو یعنی بربط کو ایک کھیل اور کھلونا سمجھتی ہے جب تک اسکی طبیعت چاہتی ہے بربط سے کھیلتی رہتی ہے۔ لطف لیتی رہتی ہے! اور جب جی چاہتا ہے اپنے بربط کو اٹھا کر رکھدیتی ہے۔ غصہ میں آکر بربط کے ایک ایک تار کو علیحدہ علیحدہ کر دیتی ہے!! کبھی اُسے عزت و محبت کے جذبے سے سینے سے لگا لیتی ہے کبھی نخوت و غصہ کے سبب پھینک دیتی ہے ــــــــ مگر اسے، بربطِ حیات کو، اپنے وجود سے علیحدہ نہیں کر سکتی۔ اگر بربط اس سے علیحدہ ہو جائے تو اسکے نغمے اس کی روح کو بے چین کرتے ہیں، خواہ بربط کو کسی جذبہ کے ماتحت اس نے علیحدہ کیا ہو زہرہ اپنا بربط دوبارہ اٹھانے اور اس سے لطف اندوز ہونے کیلئے مجبور ہوتی ہے، یا اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ بربط اسکی زندگی کا جُزو بن جاتا ہے ــــــــ تصور صرف یہ ہے کہ عورت مرد سے کھیلتی ہے، مرد اس کا کھلونا ہوتا ہے مگر اسے زہرہ کی زندگی میں، عورت کے وجودِ حقیقی میں، ایسا دخل اور گرفت حاصل ہو جاتی ہے کہ عورت اُسے علیحدہ نہیں کر سکتی ــــــــ آہ، عزیز تمہیں کیا بتاؤں میں نے اس مجسمے پر کتنی محنت کی ہے، دن رات اس پر جان کھپائی ہے۔ اب یہ مجسمہ "قبول حضرتِ سلطان" ہو یا نہ ہو مجھے اسکی پرواہ نہیں، مجھے مسرت ہے کہ میں نے اپنا پیغام مرمر میں منعکس کر دیا ہے، تم نے مجسمہ نہیں دیکھا ورنہ ضرور پہچان لیتیں کہ اس مرمریں بُت میں کس کا جلوہ جھلک رہا ہے۔ کس ستارے کی روشنی اس قندیلِ مرمریں میں جھلملا رہی ہے، کس جمال کا پرتو اس مجسمۂ حیات کے اعضا میں اپنی نمائش کر رہا ہے ــــــــ کیا تم نے سمجھا روزینہ میں نے کس کے تصور کو مرمر میں پوشیدہ کیا ہے ــــــــ؟"

عمانیول، بُت تراش روزینہ کا ہاتھ گرمجوشی سے دباتا ہے، تاریکی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی ہے۔

باب دوسرا

روزینہ نے دیکھا کہ قریب ہی سڑک پر ایک مجسمہ نصب ہے اور عمانیول اسکی طرف بڑھ رہا تھا۔ روزینہ نے پوچھا کدھر جا رہے ہو، کیا آج رقص میں نہیں چلو گے۔ عمانیول نے کچھ جواب نہیں دیا اور اس مجسمے کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ مجسمہ مریم کا ایک لاجواب بُت تھا۔ جو کسی امیر نے خرید کر راہ میں نصب کرا دیا تھا۔ یہ بھی عمانیول کا بنایا ہوا تھا، چنانچہ عمانیول اپنا لاجواب کمال روزینہ کو دکھانے کیلئے لے جا رہا تھا۔

"روزینہ، دیکھو یہ مجسمہ بھی میرا ہی بنایا ہوا ہے۔ یہ مریم کا بُت ہے اور ایک امیر نے کئی سال ہوئے خرید کر مجھے معاش سے بے فکر کر دیا تھا جن ہاتھوں نے یہ مجسمہ تراشا تھا وہی ہاتھ ایسے ایسے کمالات پیدا کرینگے کہ ایک دن اطلی اس پر فخر کریگا ــــ"

ابھی اس کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ تاریکی میں سے ایک سفید پوش میانہ قد انسان جو عمر میں ۵۰، ۵۵ سے کم نہ تھا اس مجسمہ کی طرف آتا دکھائی دیا۔ عمانیول خاموش ہو گیا۔ بوڑھا قریب آگیا اور اس نے پہلے تو مجسمہ کی طرف دیکھا اور پھر نوجوان اطالوی کی طرف دیکھا اور عمانیول کو مخاطب کر کے کہا "کیوں صاحبزادے کیا یہ مجسمہ تم نے تیار کیا تھا؟ تم ابھی کہہ رہے تھے کہ یہ مجسمہ تمہارا بنایا ہوا ہے، میں نے راہ چلتے ہوئے اس مجسمے کو دیکھا تھا اور دیکھنے کے بعد واپس جا رہا تھا کہ تمہاری یہ بات میرے کانوں میں پہونچی تو بیتاب ہو کر واپس آیا کہ دیکھوں وہ کونسے شریف ہاتھ ہیں جنہوں نے

آرٹ کا ایسا دلفریب تصور مرمر کی سخت زمین پر ذی حیات کر دیا ہو؟"

"اس کا مطلب یہ ہو کہ بڑے صاحب، آپ کو بھی آرٹ سے کچھ لگاؤ ہے اور ان معاملات پر رائی زنی کر سکتے ہیں" عمانیول نے بوڑھے کو مخاطب کر کے کہا اور لوزینہ کی طرف دیکھا۔

شریف صورت بزرگ نے عمانیول کو جواب دیا "ہاں، ایک زمانے میں مجھے بت سازی کے تصورات و کمالات کے سمجھنے کا شوق ہوا تھا اور بے پروائی سے اچھا خاصا مطالعہ اس باب میں کیا ہے، تھوڑا بہت ان معاملات کو سمجھ ہی لیتا ہوں"

"تو کیا آپ اس مجسمہ کو کسی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور پھر اس بات کو بھی سامنے رکھئے کہ صرف ایک ماہ کی مدت میں یہ مجسمہ ان غریب ہاتھوں نے تیار کر دیا تھا"

بوڑھے کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا "ہائیں، ایک مہینہ صرف تیس دن!! لڑکے، کمال کیا ہے، ایسا بے مثل ہاتھ اچھے اچھے باکمال آرٹسٹ کا بھی نہیں ہوتا اور تم تو غیر معروف ہو۔ مگر ایسا لاجواب نمونہ ہے، یہ فن بت سازی کا نگین دیکھکر حیران رہ گیا۔ اگر آرٹ کا کوئی نمونہ ابتدائی حالت میں بھی ہو تو جوہر اصلی چمک اٹھتا ہے اور دور بین نظریں تاڑ لیتی ہیں کہ ان ذروں میں آفتاب کمال پوشیدہ ہے ——— کیا تم نے اس نمائش کیلئے بھی کوئی بت تیار کیا ہے جو عنقریب ہونیوالی ہے اور جس میں ہمارے ملک کا ہر بت ساز حصہ لے رہا ہے"

عمانیول نے کہا "کونسا بت ساز ایسا ہے جس نے اس نمائش کے لئے کوئی شاہکار تیار نہ کیا ہو۔ میں نے بھی ایک مجسمہ تیار کیا ہے اور اسے مقابلے میں ضرور پیش کروں گا"

بڈھا یہ بات سنکر سڑک کی ڈھلان کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا اور پھر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ عمانیول نے لوزینہ کی کمر میں اپنا ہاتھ ڈالا اور الٹے سڑک کے پار لے گیا جہاں اس کے باپ کی محلسرا بنی ہوئی تھی اور جس کے ساتھ ہی اس نے رقص گاہ بھی بنوا رکھی تھی اور یہاں کی آمدنی پر اس کنبہ کی معاش کا دارومدار تھا۔

عمانیول اپنے خوابوں کی ملکہ، اپنے تصورات کی خالق، اپنے مجسموں کی زندگی اور جان خیال کو اس کے مکان تک پہونچانے کے بعد پھر شہر کی طرف لوٹا۔ رات کافی ہو چکی تھی اور وہ اپنے مکان کی طرف آ رہا تھا۔ اس کا مکان شہر فلارنس کی ایک تنگ تاریک گلی میں واقع تھا۔ دروازہ پر ایک سولہ سال کا خوش شکل لڑکا، جس کی آنکھوں سے مسرت و ذہانت ٹپک رہی تھی، ملا اس نے عمانیول کے گلے میں بانہیں ڈالدیں اور بولا:۔

"بھائی عمانیول میں تو تمہارا بہت دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ لو آج ہمارا نصیب جاگا، اتنی رقم ہاتھ آگئی ہے کہ کئی مہینے تک کام چلے گا۔ لو یہ بٹوہ جلدی لے لو"

یہ کہکر اس لڑکے نے ایک بٹوہ بجایا جس میں طلائی سکے کھنک رہے تھے۔ عمانیول نے لالچی عقاب کی طرح اس بٹوہ کو جھپٹا اور سکے گننے شروع کئے۔ جوں جوں رقم بڑھتی جاتی تھی اسکی آنکھوں کا نور اور چہرہ کی مسرت بار رونق بڑھ رہی تھی۔

"اخاہ! تیس ہیں! میرے عمانیول اس دفعہ تو کنجوس یہودی نے بڑا دل کیا کہ ایکدم تیس "ڈوکیٹ" دیئے!!"

"نہیں بھائی یہ یہودی نے نہیں دئے وہ کنجوس، اسرائیلی کتا، بھلا اتنی رقم کہاں دے سکتا ہے بمشکل سے پانچ چھ "ڈوکیٹ" دیتا۔ یہ تو ایک اور قدرداں نے دئے ہیں"

"جلد بتاؤ وہ کون تھا، ناموِیل" عمانیوِیل نے دروازہ بند کرکے اور سکوں کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے کہنے کے بموجب حضرت پطرس کا چھوٹا بت لیکر یہودی کٹے کی دوکان کی طرف جا رہا تھا کہ شاید وہ اُسے خرید کر اپنی دوکان میں رکھ لے۔ راستہ میں وہ ایوان آگیا جہاں دس دن بعد نمائش ہونے والی ہے اور جہاں بعض بت سازوں نے اپنے اپنے نمونے بھیج بھی دئے ہیں۔ ابھی وہاں مجسمے قرینے سے لگائے جا رہے ہیں۔ ایوان میں سفیدی ہو رہی ہے بعض بعض شوقین مجسموں کو دیکھنے کیلئے ویسے ہی اندر آجاتے ہیں ابھی کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ میں نے کہا لاؤ ذرا یہاں بھی جھانک لیں۔ دیکھوں میرے بھائی کے مقابلہ پر کن کن لوگوں نے کیسے کیسے کمالات کی نمائش کی ہے حضرت پطرس کا مجسمہ میرے ہاتھ میں تھا اور میں دیوار سے لگے ہوئے مجسموں کو دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو سفید عبا پہنے اور ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا لئے ہوئے کھڑا ایک مجسمہ پر غور کر رہا تھا۔ ویسے تو یہ گنوار معلوم ہوتا تھا ——"

"اُسکے سر پر سُرخ پروں کی ٹوپی تھی، ناموِیل"

"ہاں، ہاں! بالکل وہی، مگر آپ کو کیسے معلوم، کیا اس سے واقف ہیں"

"—— تو کیا اس نے پطرس کا بت خرید ا تھا؟" عمانیوِیل نے بہت بیتابی سے پوچھا۔

"ہاں اسی نے خریدا۔ کیا آپ اُسے جانتے ہیں؟"

"ہاں میری ابھی اس سے ملاقات ہوئی ہے، وہ مجھے شام کو مریم کے بت کے قریب ملا تھا۔ وہ آدمی شکل سے، باتوں سے، اور عمل سے بھی بہت نیک معلوم ہوتا ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فن کی قدردانی کرتا ہے اس کی نظر بھی "میکائیل انجیلو" سے کم نہیں معلوم ہوتی۔ مگر اس بوڑھے نے وہ مجسمہ تم سے کیونکر خریدا؟"

"میں یہ بت اپنی بغل میں لئے ہوئے کھڑا تھا اور ایک بت کو دیکھ رہا تھا کہ ایک بوڑھے کی نظر میرے بت کی طرف بڑھی اور اس نے بڑے غور سے دیکھا اور میرے قریب آکر اس نے پوچھا —— "صاحبزادے صاحب کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ بت کس کا ہے، اور کیا آپ کو بھی ان چیزوں کا شوق ہے؟" میں نے جواب دیا "یہ بت میرے بھائی کا بنایا ہوا ہے اور اسے بیچنے کے لئے ایک یہودی تاجر کے پاس لے جا رہا ہوں" یہ بات سُنکر بوڑھے نے وہ بت میرے ہاتھ سے لے لیا اور بہت غور سے دیکھتا رہا۔ اس طرح سر ہلایا گویا وہ اُسکی خوبیوں کو پرکھ رہا ہے اور جوہری کی قدردانی کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا "تمہارے بھائی کا نام کیا ہے؟" میں نے بلا تکلف نام بتایا کہ میرے بھائی کو "عمانیوِیل اصانیو" کہتے ہیں" یہ سُنکر اس نے اپنی جیب سے ایک بٹوہ نکالا اور اس کے پاس جو کچھ رقم تھی میرے حوالے کر دی۔ یہ رقم میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی فوراً اسے اپنے قبضہ میں کیا اور یہ مجسمہ اس کے حوالے کر دیا۔ وہ بوڑھا دولتمند ہونے کے علاوہ قدرداں بھی معلوم ہوتا ہے میں نے اُسے پتہ بتا دیا ہے شاید پھر کبھی ہمارے پاس آئے۔ بھائی جان اس وقت تک جو مجسمے نمائش گاہ میں لائے گئے ہیں ان میں تو ایک بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کے مجسمہ کے سامنے ٹھہر سکے۔ مجھے تو اب کامل یقین ہو گیا ہے، آپ کو ہی کامیابی ہوگی ——"

"اچھا، چلو ادھر جاؤ، کھانا کھا کر سو، زیادہ باتیں نہ بناؤ" عمانیوِیل نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا اور خود بھی کپڑے اُتار کر اوپر چلا گیا جہاں سونے کا کمرہ تھا۔

باب تیسرا

خواب میں عمانیوِیل بت ساز نے دیکھا کہ اس کی عزیز ترین مخلوق لوزینہ اسکی بیوی بن گئی ہے۔ اُسکی راہ میں جس قدر حائلات تھے دور ہو گئے۔

دنیا میں اس کا نام مشہور ہو چکا ہے اور وہ ایک امیر کبیر آدمی ہے۔ مگر صبح کو جب وہ بیدار ہوا تو رات کے خواب ہائے زریں وہم و تصور کی وسعت سے زیادہ معلوم نہ ہوئے کیونکہ اُسے یہ بات یاد نہ رہی کہ نواب آئینی اس کا ابھی تک رقیب ہے اور لوزینہ کا ہاتھ طلب کرتا ہے۔ ان خیالات نے عمانیویل کا دل توڑ دیا اور اس نے سوچا کہ ایوان میں جاکر اپنے رقیبوں کے کمالات بھی دیکھنے چاہئیں تاکہ اندازہ ہو کہ کس کس وزن کی چیز مقابلہ میں آچکی ہے، اور اسکے لیے کامیابی کے کچھ مواقع ہیں یا نہیں۔

عمانیویل کو ابھی گئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہی گذرا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ ناموئل استفہان دوڑا ہوا نیچے آیا اور دروازہ کھولا۔ وہی بوڑھا جس نے کل ایک بڑی رقم پر حضرت پطرس کا مجسمہ خریدا تھا دروازے پر موجود تھا۔ شاید وہ کوئی نئی خریداری کرنے آیا تھا۔ ناموئل نے اُسے بڑے تپاک سے اندر لیجا کر بٹھایا اور جسقدر خاطر مدارات اُسکے امکان میں تھی، کی۔

بوڑھے نے پوچھا: آپکے بھائی صاحب گھر میں ہیں؟"

"نہیں وہ ابھی ایوان نمائش میں گئے ہیں تاکہ وہاں آئے ہوئے بتوں کو دیکھکر یہ فیصلہ کریں کہ کس قسم کی چیزیں آچکی ہیں اور آیا ان کے لئے اپنا شاہکار نمائش میں بھیجنا ضروری ہوگا یا نہیں۔ ایسا نہ ہو جگ ہنسائی ہو"

"تو کیا آپکے بھائی نے کوئی بت تراشا ہے؟"

"جی ہاں۔ مگر آپ اُسے نمائش سے پہلے نہیں دیکھ سکتے۔"

"میاں لڑکے! کیا تم بھول گئے میں نے کل ایک چھوٹے سے مجسمہ کی کتنی بھاری رقم تم کو دیدی۔ اگر تم برا نہ مانو تو ایک ذرا کی ذرا مجھے اپنے بھائی کے بنائے ہوئے بت کو دکھا دو۔"

"ناممکن ہے! میرے بھائی کا سخت حکم ہے کہ اس نجی نگارخانے میں کسی کو آنے کی اجازت نہ ہو اور وہ کسی کو نہیں آنے دیتا۔"

"لیکن میں اس سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہوں ——— فرض کرو، مجسمہ نمائش میں منظور ہو جائے تو تمہارے بھائی کی ساری اُمیدیں خاک میں مل جائینگی۔ مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر خدا نہ کرے تمہارے بھائی کا مجسمہ نمائش میں مسترد ہو گیا تو میں اُسے خرید لونگا!!"

"آپ اسے خرید لیں گے!" ناموئل نے طنز یہ کہا۔

"ہاں، میں لے لونگا۔ اگرچہ میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی ہوں لیکن آرٹ سے مجھے عشق ہے اور اس کے لئے اپنی ساری زندگی اور سارا سرمایہ وقف کر رکھا ہے۔ تم نے میری فیاضی اور طبیعت کی وسعت کا کل اندازہ لگا لیا ہوگا۔ تم یقین کرو کہ اگر یہ مجسمہ فروخت نہ ہوا تو میں ایک ہزار ڈوکیٹ میں خرید لوں گا، خواہ وہ کیسا ہی خراب کیوں نہ ہو، مگر مجھے ایک نظر دکھا دو۔ فقط دکھانے میں تو شاید ہرج بھی نہ ہوگا"

ناموئل کے چہرے پر مایوسی اور ناکامی کے تصور کی ایک سیاہ جھلک دکھائی دی۔ اُس نے سوچا کہ اگر واقعی مجسمہ نامنظور ہو گیا تو پھر اُس کے فروخت کی اُمید نہیں اور یہ شخص ویسے بہت معقول اور قدر داں معلوم ہوتا ہے، کیا عجب ہے کہ مسترد ہو جانے کی حالت میں یہ بوڑھا اسے خرید لے اور ان کے دن پھر جائیں۔ یہ تمام تصورات ایک لمحہ کے لئے ناموئل استفہان کے ذہن میں آئے اور بادلِ ناخواستہ اُس نے فیصلہ کیا کہ نگارخانہ میں لیجاکر وہ نمائشی مجسمہ اس بوڑھے کو ضرور دکھا دیا جائے۔

باب چوتھا

"اچھا آپ میرے ساتھ آیئے" نامویل استفہان نے بوڑھے سے کہا اور اُسے اپنے بھائی کے پرائیویٹ کمرے میں لے گیا جو اس کا نگار خانہ تھا۔ جہانِ عمانویل کی اُمیدوں کا مرکز، اُسکے تصورات کی ایک چھوٹی سی دُنیا۔

اس کا نگار خانہ ——— ہاں ایک عجائب خانۂ دل تھا۔ ایک حساس دل کی نیرنگیوں اور قیامت ساماں جذبات کا مجموعہ۔ جہاں اُس نے رات دن اپنے خیال کو مرمریں منتقل کرنے میں گذارے تھے، جہاں اس کی تمناؤں اور تصوروں کی خالق لوزینہ کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ "بربطِ زہرہ" اس کا عنوان تھا۔ اصل میں وہ عمانویل کے تمام شباب کی ایک کہانی تھی جو مرمریں منتقل کر دی گئی تھی۔ وہ کہتا تھا "میں نے اس مجسمہ پر اپنا فن، اپنی زندگی، اپنی رُوح، غرض ہر چیز نثار کر دی ہے اور شاید آجتک کسی انسانی ہاتھ نے اس جفاکشی کے ساتھ کوئی نمونہ فن تیار نہ کیا ہوگا جیسا میں نے کیا ہے ———!" بیشک اس مرمریں مجسمہ میں عمانویل نے اپنی ساری رُوح جذب کر دی تھی۔ عشق و نیاز کی وہ تمام منزلیں جو ایک حساس بُت تراش طے کر سکتا تھا عمانویل نے پوری کر لی تھیں۔ اور اس کا مجسمہ "بربطِ زہرہ" عشق، نیاز، تصور، فن، حقیقت اور تمام اُن کیفیات کا جنہیں "راہ و رسم منزلہا" سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک دلنواز مجموعہ تھا۔

استفہان نے بوڑھے کو تپائی کے قریب لے جاکر کہا: "یہ ہے وہ مجسمہ جسے نمائش میں بھیجا جائیگا"

بوڑھا تھوڑی دیر تک اس بُت کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ یکایک اُس کے چہرے پر مسرت کی ایک چمک پیدا ہوئی اور وہ بولا "خدائے ناصری کی قسم! یہ تو شاہکار ہے!!"

استفہان کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اُسے مستقبل شاندار دکھائی دے رہا تھا۔

"کوئی تعجب نہیں کہ آپ کے بھائی نے اس لاجواب مجسمہ کو تمام نگاہوں سے چُھپا کر رکھا ہے، بیشک یہ ایسا پاکیزہ نمونہ ہے فنِ بت تراشی کا کہ سوائے معقول لوگوں کے کسی کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ اسکو دیکھکر انسان فردوس میں پہونچ جاتا ہے۔ اس کو تو چھونا بھی گناہ ہے۔ ایسی لطیف و پاکیزہ چیز صرف دُور سے دیکھنے کے لئے ہوتی ہے۔ بس ایسی چیزوں کا تصور دل میں کھٹک پیدا کرنے کیلئے ہے۔ آہ کیسا پیارا......!!"

یکایک بوڑھا کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی زہریلے جانور نے اُسے کاٹ کھایا ہے۔

"کیا ہوا آپ کو، کیا طبیعت ناساز ہو گئی؟" استفہان نے بوڑھے کے قریب جاکر اُسکے چہرے کی طرف جُھک کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں تو بالکل ٹھیک ہوں ——— مگر یہ دیکھکر کیسا صدمہ ہوا کہ ایسا نادر نمونہ فن بھی نقص سے خالی نہیں۔ اس مجسمہ کی جان وہ بربط ہے جو زہرہ کے ہاتھ میں دیا گیا ہے اور اس کو اس جگہ فن کار کی غلطی یا غفلت کا اندازہ ہو جاتا ہے ———"

استفہان نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر بوڑھے کے شانوں پر ہاتھ رکھکر جواب دیا "جناب یہ حصہ دانستہ طور پر نامکمل چھوڑ دیا گیا ہے جس دن یہ نمائش میں جائیگا میرا بھائی اوزار سنبھال کر چند منٹ میں اس کا بربط درست کر دیگا!"

جونہی استفہان کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے بوڑھا اوزاروں کے میز کی طرف بڑھا۔ ایک ہتوڑا اُٹھایا اور چھینی لیکر مجسمے کی طرف بڑھا۔ لڑکے نے جو یہ حرکت دیکھی تو اُس کے اوسان باختہ ہو گئے اور وہ جھپٹ کر آگے بڑھا۔ بوڑھے کا دامن پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ سے اوزار چھیننے لگا۔

"حضرت! یہ کیا حرکت ہے۔ کیا میں نے آپ کو پرائیویٹ نگار خانہ میں آنے کی اس لئے اجازت دی تھی کہ میرے بھائی کی محنتوں کو برباد

حرکت سے خراب کردیں۔ ایسا خیال بھی نہ کیجئے گا"

بوڑھے نے استفہان کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا "صاحبزادے! کیا میں نے تم سے کہا نہیں ہے کہ اگر مجسمہ مسترد ہوگیا تو میں اُسے ٹھیک کروں گا۔ اور اگر میں نے اسے خراب کر دیا تو ایک ہزار ڈوکیٹ تم کو دوں گا۔ بالکل بے فکر رہو میں اس کام کو جانتا ہوں"

"لیکن میرا بھائی ———!"

"نہیں، وہ خفا نہیں ہوگا۔ میں اس مجسمہ میں ایسا حُسن پیدا کر دونگا کہ وہ بھی دیکھکر تڑپ اُٹھیگا"

یہ کہکر وہ مجسمے کے قریب پہونچ گیا اور نامکمل حصے کو اوزاروں سے درست کرنے لگا۔ کچھ دیر یہ عمل کرتا رہا۔ خود ہی اُسے دور سے کھڑے ہوکر دیکھتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ استفہان کمرے کے وسط میں ہکا بکا کھڑا تھا اور خوفزدہ تھا کہ آخر انجام کیا ہوتا ہے۔ یکایک دروازے پر کسی کی دستک سُنائی دی۔ عمانیویل کی مخصوص نشانی تین دستکیں تھیں۔ جونہی عمانیویل نے سُنا وہ بوڑھے کو کمرے میں سے باہر نکال لایا اور باہر کی بیٹھک میں لاکر بٹھا دیا۔ پھر جاکر دروازہ کھولا۔ عمانیویل اندر داخل ہوا۔ اُسے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ وہی شخص جو دریائے ارونا کے قریب ملا تھا یہاں آیا ہوا ہے۔

استفہان نے رسمِ تعارف ادا کی: "یہی وہ صاحب ہیں جنہوں نے اپکا بنایا ہوا بت "پطرس بحالتِ دعا" کل مجھ سے خریدا تھا۔ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس ہونیوالی نمائش میں بھی آپ کوئی نمونہ بھیج رہے ہیں یا نہیں"

"ہرگز نہیں! پہلے تو میرا خیال تھا کہ کوئی چیز نمائش میں شامل کر دوں لیکن آج وہاں جاکر جو کمالاتِ ہنر دیکھے تو حیرت ہوگئی۔ بڑے بڑے نادر مجسمے اس نمائش میں آئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو جگ ہنسائی کا شکار بناؤں۔ میرے مجسمے میں کوئی خوبی نہیں ہے ——— نہیں میں شامل نہیں ہونگا" عمانیویل نے بوڑھے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"نوجوان! تم اس قدر مایوس و ملول کیوں ہوتے ہو۔ ہمت سے کام لو۔ میں نے تمہارے دو مجسمے دیکھے ہیں اُن ہی سے اندازہ ہوگیا کہ تم میں جوہرِ اصلی موجود ہے اور تمہارے ہنر میں وہ تمام خوبیاں اور رعنائیاں موجود ہیں جو کسی سخت سے سخت نقاد کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ بُت تراش اور مصور اور شاعر کو بہت قوی دل کا انسان ہونا چاہیے۔ مقابلہ و مسابقت کے خوف سے اپنے کمالِ ہنرمندی کو چھپانا گناہ ہے!"

بوڑھا یہ ہمت افزا الفاظ کہنے کے بعد کسی جواب کے سُننے کیلئے تیار نہ رہا۔ بلکہ دونوں بھائیوں کو رخصتی الفاظ کہکر فوراً مکان سے باہر چلا گیا۔ اُسکے جانے کے بعد ہی استفہان نے اپنے بھائی سے کہا: "پیارے بھائی! آپ ہمت نہ ہاریں، یہ شخص معقول خیال معلوم ہوتا ہے۔ اسکی رائے جب یہ ہے کہ آپ بہت اچھے ہنر کے مالک ہیں تو پھر کس وجہ سے مایوسی ہو رہی ہے"

"استفہان! تمہیں معلوم نہیں ہے کہ نمائش میں بڑے بڑے نادر نمونے آچکے ہیں۔ میرا مجسمہ تو اُن کے آگے ٹھہر بھی نہیں سکتا۔ لیکن میں اپنے مجسمے کو آج پھر دیکھوں گا اور نئی زندگی اپنے میں پیدا کروں گا۔ نیا خیال، نئی اُمنگ، نئی اُمیدیں اُسے دیکھکر میرے سینے میں پیدا ہونگی۔ اسکے بعد فیصلہ کرونگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے"

یہ کہکر استفہان کا ہاتھ پکڑ کر اُس نے نگار خانے کی طرف جانے کا ارادہ کیا کہ استفہان نے خوفزدہ ہوکر کہا "بھائی، ذرا ٹھہرنا، ابھی نہ جانا ———" وہ یہ کہتا ہی رہا اور عمانیویل جوش کے ساتھ اپنے بھائی کو کشاں کشاں نگار خانے کی طرف لے گیا۔ نگار خانے میں پہونچکر وہ

اپنے مجسمہ کے قریب جاکر کھڑا ہوا جونہی نامکمل بربطا ورزہرہ کے ہاتھ کی طرف اُس کی نگاہ گئی۔ اُس کے مُنہ سے ایک آواز نکلی جو حیرت اور مسرت کے جذبات سے پُر تھی۔

"استفہان" عمانویل نے تعجب سے کہا اور پھر آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر اُس نے مجسمہ کی طرف غور سے دیکھا۔ گویا اُسے اپنی آنکھوں کی بینائی پر شُبہ ہو رہا تھا۔

"استفہان! بت کو کس نے چھیڑا ہے!"

استفہان اپنے بھائی کے قدموں میں گر پڑا اور اُس نے کپکپاتے ہوئے تمام حال بلاکم وکاست بیان کر دیا۔ جسے سُنکر عمانویل کو پہلے غصہ آیا "میرے پاک مجسمہ کو کسی دوسرے انسان نے کیوں اپنے غلیظ ہاتھوں سے چھوا۔ میری جان سے زیادہ عزیز لوزینہ کو دوسرا خاکی ہاتھ مس کرے ــــــ! آہ! میں کیسا بدنصیب ہوں!!"

استفہان نے بسورتے ہوئے پوچھا "بھائی جان، کیا بُت خراب ہو گیا؟"

عمانویل بولا "نہیں بُت میں ایک عجیب حُسن پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اب مکمل شاہکار ہے کیونکہ اس پر ایک ایسے شخص کا لمسِ آخر کار فرما ہوا ہے کہ شاید کسی بُت تراش کو بھی نصیب نہ ہوا ہو گا!"

"یعنی؟" استفہان نے استفسار کیا۔

"ارے لڑکے!" عمانویل نے جوشِ مسرت سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا ــــــ "تجھے کیا معلوم ہے یہ کون شخص تھا! میکائیل انجیلو!!"

"میکائیل انجیلو! خود میکائیل ــــــ!"

"ہاں! ہاں! وہی۔ میں نے آج ہی تو پتہ چلایا ہے کہ یہ شخص میکائیل انجیلو ہے۔ جس کے چشم و ابرو کے اشارے پر تمام مسرتوں اور اُمیدوں کا انحصار ہے۔ آہ! میں کیسا خوش نصیب ہوں کہ فخرِ یورپ میرے غریب گھر میں آیا۔ اُس نے اپنے قدم سے میرا تاریک گھر روشن کر دیا۔ اوہو! اب دل خوشی سے لبریز ہے!! میں نہیں سمجھ سکتا کہ آئندہ دس روز کے اندر اندر میری زندگی میں کیا انقلاب رونما ہو جائیگا!"

عمانویل بہت دیر تک مسرت و اُمید کے الفاظ جوش کے ساتھ ادا کرتا رہا۔ استفہان بولا "بھائی اس نے یہ مجسمہ دیکھکر بہت اُمید افزا قیاسات کا اظہار کیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ تاجِ شاہی آپ کو ہی ملیگا! ہمارے دن اب پھرنے والے ہیں!"

باب پانچواں

دس روز اسی قسم کی باتوں میں گذر گئے اور نمائش کا دن آگیا۔ اس اثنا میں اُسے لوزینہ سے بھی ملنے کا موقع نہ مل سکا۔

لوزینہ کے باپ کو معلوم تھا کہ لوزینہ ایک مفلس و غیر معروف بت تراش سے محبت کرتی ہے اور شاید وہ نواب اپنی سے شادی کرنے سے انکار کر دے۔ اس لئے وہ اب بہت نگرانی کرتا تھا۔ بہت کم اُسے باہر نکلنے دیتا تھا۔ اور گذشتہ دس روز سے تو اُن کو چوری چھپے ملنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن ایک خفیہ خط کے ذریعہ عمانویل نے لوزینہ کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ مائیکل انجیلو کی آمد، اُس سے ملاقات کا ذکر اور اس کے مجسمہ کی بابت میکائیل کے ہمت افزا الفاظ اور آئندہ کی تمام اُمیدوں کا ذکر ایک خط کے ذریعے کر دیا تھا۔

گیارہواں دن نمائش کا تھا۔ رات کو بُت تراش شاید سوئے بھی نہ ہونگے، صبح کو اُٹھے تو اُنکے دل دھڑک رہے تھے، ماتھا گرم تھا اور اپنے

اپنے مستقبل کی جانب سے ہر ایک خائف تھا۔ صبح ہوئی تو فلارنس میں عجیب چہل پہل تھی۔ نو بجے نمائش شروع ہونے والی تھی۔ لوگ گھروں سے نکل پڑے تھے۔ جس ہال میں نمائش شروع ہونے والی تھی اس کے ارد گرد تمام بازاروں میں لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم ایوان میں جانے کیلئے مضطرب تھا۔ سب سے زیادہ لوگ اس ہستی کو دیکھنے کے لئے بیقرار تھے جسے روم سے اس نمائش کا فیصلہ کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ میکائیل انجیلو جو فن کا بہترین ماہر تسلیم کیا جاتا تھا اور جو یورپ کے نقادانِ فن میں اب بھی بہترین شارحِ فن اور بہترین نقاد سمجھا جاتا ہے۔ لوگ میکائیل انجیلو کی بھی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔

بذریعہ اعلانِ عام یہ خبر دی گئی کہ مقابلے میں آنے والے تمام مجسمے زیادہ سے زیادہ دوپہر تک ہال میں پہونچ جانے چاہئیں۔ نمائش کا فیصلہ آخر شام کو مین بجے سنا دیا جائیگا۔ میکائیل انجیلو منصف قرار دیا گیا تھا۔

عمانوئیل اور استفان بھی بستروں پر سے بے چین و بیقرار اٹھے۔ ایک ٹھیلے کا انتظار تھا جسے اس غرض سے کرایہ پر منگایا گیا تھا کہ اُن کے مکان سے ایوانِ نمائش تک بُت کو لے جائے۔ ابھی تک یہ ٹھیلا آیا نہیں تھا اور دونوں بھائی اس کا انتظار کر رہے تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی اور ایک لڑکا نواب ویوالڈی لوزینہ کے باپ کے ہاں سے وردی پہنے ہوئے اندر داخل ہوا۔ ایک خط جس پر عمانوئیل کا نام لکھا ہوا تھا دیا گیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

"عزیز عمانوئیل ——!

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ لوزینہ، میری لڑکی، اور تم آپس میں محبت کرتے ہو۔ اگر اس دنیا میں میں اور صرف میری لڑکی ہوتی تو تمہاری شادی میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ میرا ایک لڑکا بھی ہے۔ اور نواب آرمینی میری لڑکی کا ہاتھ اپنے نکاح میں طلب کرتا ہے۔ اگر میری لڑکی کی شادی اس سے ہو جائے تو میری گمشدہ دولت و حشمت واپس آ جائے گی۔ میرے گھرانے کا جو بُرا حال ہے وہ دولت و امارت، ناموری و سابق خوشحالی سے بدل جائیگا۔ خود میرا لڑکا کسی بڑے عہدے پر پہونچ جائیگا۔ اور اُسکی حالت بہتر ہو جائے گی جو اس کے اور اسکے شاندار خاندان کی پچھلی تاریخ کے شایانِ شان ہوگا۔ ایسی حالت میں لوزینہ کا کیا فرض ہے؟ کیا یہ نہیں کہ وہ اپنے باپ اور بھائی کیلئے اپنی محبت کی قربانی پیش کرے؟ اب تمہارا یہ فرض ہے کہ اپنی شائستگی کا ثبوت دو۔ تمہیں معلوم ہے کہ لینارڈو نے جب مونالیزا کی تصویر منظرِ عام پر بھیجدی تو مونالیزا کی کیسی رسوائی ہوئی۔ تشہیرِ عشق کیا مناسب ہے؟ خدا کیلئے میرے بڑھاپے پر نظر کرو، میرے سفید بالوں کا دھیان کرو میں تم سے ملتجی ہوں کہ اپنا بت نمائش کے لئے نہ بھیجو۔ ورنہ میرا خاندان اور میری لڑکی بدنام و رسوا ہوگی۔ میری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔ خدا کرے تم پر دنیا کی ساری مسرتیں اور خوشحالیاں نثار ہوں"

(کاؤنٹ) ویوالڈی ——"

باب چھٹا

خط عمانوئیل کے ہاتھ سے گر پڑا۔ مایوسی اور بے اطمینانی کے جذبات نے اُسے ایسا بے حس کر دیا گویا وہ برسوں کا بیمار ہے۔

اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے عمانوئیل بولا۔
"لینارڈو کی تصویر نے مونالزا کو رسوا کر دیا تھا میرا مجسمہ لوزینہ کی عفت کو رسوا کرے گا ——— ہرگز نہیں" ——— "اچھا" (اس نے ملازم کو مخاطب کر کے کہا) ——— "دیکھو! تم اپنے مالک سے جا کر کہدو کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ مجھے ہر طرح لوزینہ کی خوشی اور آرام اور عزت منظور ہے اگر آپ کا حکم ہو تو بت توڑ دیا جائے"
ملازم یہ پیغام سنکر جانے کے لئے تیار ہی ہوا تھا کہ اُسے عمانوئیل نے روک کر پوچھا:۔
"تمہیں اس خط کا حال معلوم ہے؟"
"جی ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ کیا بات لکھی گئی ہے"
"کیا بتا سکتے ہو کہ نواب ویوالڈی کو یہ کیونکر معلوم ہوا کہ میرے بت کی شکل لوزینہ سے ملتی ہے، یا میں نے لوزینہ کو مرمر میں تبدیل کیا ہے؟"
"رات کو میکائیل انجیلو، نواب فلارنس کے ہمراہ ہمارے مکان پر آئے تھے، وہاں سائرہ لوزینہ سے بھی میکائیل انجیلو کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے شباہت دیکھکر اس کا حال نواب ویوالڈی سے بیان کیا"
"اچھا! اب تم جا سکتے ہو" عمانوئیل نے پیغامی سے کہا۔ اُسکے جانے کے بعد عمانوئیل اپنے نگارخانہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ دروازے بند کر لئے۔ آستغفر ملول و دلگیر باہر کے کمرے میں آ کر سرنگوں بیٹھ گیا۔

باب ساتواں

تقریباً بجے دوپہر کو نواب آمپنی عمانوئیل کے گھر پر آیا۔ نواب آمپنی کو بالکل علم نہ تھا کہ عمانوئیل لوزینہ کی محبت کے معاملے میں اس کا رقیب ہے اور اس کا مجسمہ اس عورت کا مظہر ہے جس کا ہاتھ وہ طلب کرتا ہے۔ نواب آمپنی نائب تھا فلارنس کے حاکم کا اور جب سے فلارنس کے حاکم نے میکائیل انجیلو کی زبانی عمانوئیل نام ایک سنگتراش کے شاہکار کا حال سُنا تھا وہ اس بات کا متمنی تھا کہ کسی طرح وہ بت بھی فلارنس کی نمائش میں شامل ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ہنرمندی کا ایک کمال عام نظروں سے اوجھل رہ جائے اور دنیا کو اس کے کمالات کی جھلک بھی دیکھنی نصیب نہ ہو۔
"کیا آپ کا نام عمانوئیل ہے؟"
"حضور!" عمانوئیل نے نواب آمپنی کے سوال کا جواب سر خم کرتے ہوئے دیا۔
"نواب فلارنس نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ سے وہ بت طلب کروں جو آپ نے حال ہی میں بنایا ہے اور جس کی بابت میکائیل انجیلو نے ان سے کہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا بنایا ہوا بت نفیس ہنرمندی کا نمونہ ہے اور حاکم فلارنس اُسے نمائش میں دیکھنے کے لئے مُصر ہیں۔ آپ وہ بت ہمارے حوالے کر دیجئے"
"لیکن اب میں اُسے کسی انسانی آنکھ کو نہیں دکھا سکتا" عمانوئیل نے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر کہا۔
"——— مگر آپ کو دینا ہوگا۔ اگر رقم کا خیال ہے تو یہ لیجئے روپیہ حاضر ہے" یہ کہہ کر نواب آمپنی نے ایک کیسۂ زر میز پر پھینکدیا۔
"مگر میں کسی قیمت پر بھی اُسے نہیں دے سکتا۔ میں وعدہ کر چکا ہوں ——— اوہ! خدا" یہ کہکر عمانوئیل رونے لگا اور جانے لگا نواب آمپنی نے بڑھکر اُسے روک لیا۔

"لیکن میں حاکم فلارنس کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ اُنکے فرمان پر حرف بحرف عمل کرنا ہوگا"

"تو کیا آپ زبردستی لے جائیں گے، اس بُت کو اُٹھا کر" عمانوئیل نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"اگر آپنے برضا و خوشی وہ بُت ہمارے حوالے نہیں کیا تو لے جانا پڑیگا۔ کیونکہ حاکم فلارنس نے مجھے ایسا ہی حکم دیا ہے ———— تم کیوں ضد کرتے ہو۔ گھر میں رکھنے سے کیا حاصل ہے۔ اُمید ہے وہاں پہونچکر ایک بہت بڑا انعام حاصل کرے۔ خود میکائیل انجیلو جو تمام مقابلے میں انہوں کی چیزوں کا جج ہے، تمہارے بت کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا تم کیسے آدمی ہو جو اس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ بفرض محال اگر بُت مُسترد بھی ہو گیا تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اُسے خرید لونگا۔ ایک بھاری رقم پر۔ بہرحال تمہیں کوئی خدشہ نہیں"

"مگر میں وعدہ کر چکا ہوں کہ اپنی عزیزہ کی رُسوائی ————"

"کیا بہک رہے ہو تم!" نواب آپینی نے ترشرو ہو کر کہا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ وہ آگے بڑھکر مکان میں بُت تلاش کریں اور اُسے باہر لے جا کر اُس گاڑی میں رکھدیں جو اسی غرض سے نواب آپینی اپنے ہمراہ لایا تھا۔ عمانوئیل نے جب یہ حرکت دیکھی تو وہ شور مچانے لگا "یہ کیا ظلم ہے! آخر یہ کیا زبردستی ہے! غریب و بیکس کو کیوں ستاتے ہو!! ظالمو! تم میری ہستی کے پوشیدہ راز کو کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو۔ اُسکی رُسوائی سے میری رُسوائی ہے ———!"

استفہان نے بھائی کے سینے سے لپٹ کر کہا: "پیارے عمانوئیل کیوں نہیں دیدیتے اس بُت کو۔ کیا تعجب ہے کہ اسے انعام ملے اور ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے"

"تم نہیں جانتے، انجان لڑکے" عمانوئیل نے استفہان کو اپنے سینے سے الگ کرتے ہوئے کہا اور جب یہ دیکھا کہ نواب آپینی جبر کرنے کے لئے بالکل ہی آمادہ ہے تو اُس نے آگے بڑھکر کہا: "اچھا تم لوگ ابھی ٹھہرو۔ میں اپنے بُت کا آخری نظارہ کر لوں۔ اسکے بعد تم اسے اُٹھا کر لے جانا۔ میں اُسے ایک نظر دیکھکر ابھی آتا ہوں"

یہ کہکر عمانوئیل اپنے نگارخانہ میں داخل ہوا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ یہ لوگ باہر کھڑے رہے۔

کمرے میں سے ایک قہقہہ کی بلند آواز آئی۔ اسکے بعد غصے اور رنج کے ملے ہوئے جذبات سے لبریز ایک چیخ سُنائی دی اور ایک دھماکا ہوا جس سے تمام مکان لرز اُٹھا۔ یہ لوگ دوڑتے ہوئے آگے بڑھے، کمرے کا دروازہ توڑا گیا تو دیکھا کہ بُت پاش پاش ہو گیا ہے اور اُسکے ریزے فرش پر بکھرے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف ابتری کا سماں ہے اور عمانوئیل سر پکڑے ہوئے بیٹھا ہے۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" نواب آپینی نے خوف، تعجب اور رنج کے جذبات سے مملو لہجہ میں کہا: "میں اب حاکم فلارنس سے جا کر کیا کہونگا۔ وہ تو مجھ پر ناراض ہوگا کہ میری زبردستی کی وجہ سے ایسا نایاب نمونہ غارت ہو گیا!"

بہت دیر تک افسوس کرنے کے بعد اور عمانوئیل کے غصے اور ضد پر نفریں بھیجتے ہوئے نواب آپینی اور اُنکے ہمراہی مکان سے چلدئے۔ اُن کے جانے کے بعد استفہان بھائی کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہنے لگا۔

"دولت و شہرت ہمیشہ کے لئے ختم کر دی، بھائی"

"مگر اُسکی آبرو ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی پیارے استفہان" (کچھ سوچکر) ———"میں نے اسکی عزت و عفت کو بچا لیا۔ شہر میں نہ معلوم کیا کیا چرچا ہوتا۔ میں نے اپنے فن کی، اپنی محنت کی اور اپنے جذبِ صادق، اپنے عشقِ صالح کی قربانی دی ہے۔ خدا اسے قبول کریگا۔ بیشک میں گمنام

اور مفلوک الحال رہونگا لیکن میں رسوائیِ عشق پسند نہیں کر سکتا۔ میں لوزینہ جیسی عفیفہ کی پاکدامنی کو اپنے بت کی تشہیر سے داغدار نہیں بنا سکتا تھا۔ مجھے اپنے فعل پر آج ایسی مسرت و اطمینانِ نفس حاصل ہے گویا تاج شاہی اور لوزینہ دونوں کو حاصل کر لیا۔ استفہان تم نہیں سمجھ سکتے میرا دل کس درجے مسرور و مطمئن ہے اس خیال سے کہ میں نے اپنی لوزینہ کی عفت و نیکنامی کو شہر کی افواہوں اور بیرحمانہ نکتہ چینیوں سے بچالیا۔"

یہ گفتگو کرتے کرتے اُس پر پھر ایک جذبہ طاری ہوا اور وہ غصہ اور رنج کے جذبات سے مغلوب ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا ——— "استفہان! میں نے بڑی سخت غلطی کی جو ایسا ناپاک کام کیا۔ فن کے ایسے لاجواب نمونے کو توڑنا ایسا گناہ ہے جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ میں نادم ہوں اپنے جلدبازانہ فیصلہ پر۔ میں ملول ہوں اپنی تاریک زندگی اور نادار مستقبل کو دیکھکر۔ میں جتنا بھی روؤں پیٹوں بجا ہے۔ میں بڑا ہی کم نصیب ہوں مُردار ہوں ———"

عمانوئیل پر عجیب کیفیتیں طاری تھیں جب وہ لوزینہ کی محبت و عفت کا خیال کرتا تھا تو اپنا فعل ایک نیکی معلوم ہوتا تھا اور جب اپنی مفلسی اور فن کی تباہی کا تصور اسکے دل میں نشتر چبھوتا تھا تو وہ اپنی ضد، اپنے غصے اور بے تکے پن پر افسوس بھی کرتا تھا۔

یکایک دروازے پر لوگوں کے آنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، نواب آہینی اور اُس کے ہمراہی دروازے کو یونہی کھلا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

کمرے میں نواب ویوالڈی اور میکائیل انجیلو ایکدم آ گئے۔ میکائیل انجیلو نے عمانوئیل کی طرف دیکھکر کہا "ضدی لڑکے! تو نے یہ کیا حرکت کی، افسوس تیرے ہنر کا ایک لاجواب نمونہ جس کا تمام اٹلی کیا یورپ بھر میں جواب نہیں مل سکتا تھا، ضائع ہو گیا۔ جب میں نے نواب ویوالڈی کو اپنی لڑکی تیرے نکاح میں دینے پر راضی کر لیا تو یہ سنکر ہکا بکا رہ گیا کہ جس چیز کی خاطر تمام تگ و دو کی گئی وہ غارت ہو گئی۔"

"ناممکن ہے۔ میری لوزینہ نواب آہینی کی بیوی ہونیوالی ہے۔"

——— "نہیں، میں نے نواب ویوالڈی کو راضی کر لیا ہے، بیٹا! تیری قربانی قابل قدر ہے۔ تو نے اپنی محبوبہ کی آبرو کی حفاظت کیلئے جو شاندار ایثار کیا ہے وہ دُنیا میں بے مثال ہے۔ نواب ویوالڈی نے نواب آہینی کو صاف جواب دیدیا ہے اور جب حاکم فلارنس کو تیری قربانی کا علم ہوا تو اُس نے تاج شاہی دینے کا اعلان کر دیا۔ میں نے تیرے بُت کو نمائش کا بہترین بت تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ وہ نمائش میں نہیں لایا گیا مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہاں ایک نمونہ بھی ایسا نہیں آیا تھا کہ انعام کا مستحق قرار دیا جاتا۔ اس لئے میں نے سفارش کی کہ عمانوئیل بُت تراش کا بُت جسے میں بہترین نمونۂ ہنر سمجھتا ہوں اور جس کی قربانی دُنیائے عشق میں غیر فانی ہے۔ اس قابل ہے کہ تاج تجھے ہی دیا جائے۔"

——— عمانوئیل کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں! اور اُس نے اس بکس کو ہاتھ میں لیا جو نواب ویوالڈی نے اسکی طرف بڑھا دیا تھا۔ شاہی تاج ایک وزنی چیز تھی۔ عمانوئیل نے اُسے لیکر میز پر رکھدیا۔

——— "مگر نواب ویوالڈی کی دولت و حشمت کیونکر واپس آ سکتی ہے۔ میں کیونکر اس شرط کو پورا کردوں۔"

"تم اس کا کچھ فکر نہ کرو۔ حاکم فلارنس نے تمہاری داستانِ اُلفت سنکر نواب ویوالڈی کی املاک واگذار کرنے اور اُنکے لڑکے کو حاکم عدالتِ عالیہ بنانے کا حکم دیا ہے۔ اب نواب ویوالڈی کے دن پھر گئے ہیں۔"

نواب ویوالڈی نے اپنے بوڑھے سر کو ہلاتے ہوئے کہا "میرے پیارے عمانوئیل تم نے جسقدر بے لوثی کا اظہار کیا اور اپنے سچے عشق کی رعایت رکھی۔ جیسی پاک اور غیر فانی قربانی تم نے دُنیا کے سامنے پیش کی اُس نے میری ذہنیت میں یکسر انقلاب پیدا کر دیا۔ اگر میری املاک واگذار

نہ بھی ہوتی تو میں اس قربانی کو، پھر کبھی پیچھے نہ ہٹتا ——— اچھا اب چلو، تو زرینہ کو لے کے نکاح میں لانے کی تیاری کرو ہمارا ارادہ ہے کہ آج شام کو اپنی محلسرا کے چھوٹے گرجا میں تمہارا نکاح کر دیا جائے۔ ہمارے عزیز دوست میکائیل انجیلو خطبہ پڑھیں گے مگر ان کی ایک شرط ہے ———"

"وہ کیا؟ جلد کہیے" عاقولی نے گھبرا کر میکائیل کی طرف دیکھا جس کی نبض تیز چل رہی تھی۔

"میری شرط یہ ہے کہ آپ ایک اور مجسمہ ایسا ہی بنائیں جیسا یہ بنایا تھا خواہ اس میں آپ کو تمام عمر ہی کیوں نہ صرف کرنی پڑے مگر ایسا ہی ایک بت ضرور تراشیں"

"مگر میری بھی ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ اس بت میں ایک حصہ نامکمل چھوڑ دوں گا۔ اس پر آپ کا لمس آخری کام کرے گا جس طرح اس بت کے ساتھ ہوا۔ جب تک آپ کا مبارک ہاتھ نہ لگے گا نہ بت کی تکمیل ہوگی اور نہ ———"

——— "داستانِ الفت وایثار عشق کی کہانی مکمل ہوگی" ملکہ اصفہان نے قطع کلام کرتے اور مسرت سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا ———!

ظفر قریشی دہلوی

ایک آرزو

آہ! میں بے خود ہو جاتا ہوں،
تمہاری آنکھوں کی سحر انگیز رنگینی سے
بڑی بڑی آنکھیں دو جام ہیں
جن میں شراب چھلک رہی ہے!!
لیکن تمہاری نیم وا آنکھیں ———
غمگینی سے لبریز ہوتی ہیں،
آہ! اور یہ نگاہیں روح کی گہرائی تک اتر جاتی ہیں۔
آخر تم اتنی افسردہ کیوں ہو جاتی ہو؟
کیا عشاق کے درد کے احساس سے!
وہ جو خوش بخت ہیں مست صہبا ہیں
دنیا اور دنیا کے غموں کو فراموش کیے
بس اپنی عاشقی سے لطف اندوز!
ان کو اگر فرشتے
حلال کے نازک ساغر دیں

فردوس کی شراب بھی دیں
تو وہ اسے قبول نہ کریں
وہ تو مخمور ہیں،
تمہاری نیم باز آنکھوں کی بے پناہ دلکشی سے!!

* * *

کاش اس زندگی میں!
مستعار او فانی زندگی میں!
میں تمہارے درد کا علاج ہی پا جاؤں۔
اور میں اپنے درد کو اپنی زندگی سے خرید لوں!
اور پھر اتنی تمنا کہ
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
تمہارے در پر رکھ دوں
اور تب ہی بیدار ہوں
جب دنیا والے دنیا کو خیرباد کہہ چکے ہوں!!

نوجوان شامو کی داستانِ عشق

از جناب انصار ناصری۔ بی۔ اے دہلوی

"بعض لوگ پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ محبت کریں' بعض محبت حاصل کر لیتے ہیں اور بعض کے سروں پر محبت زبردستی منڈھدی جاتی ہے" آخر الذکر کی مثال ذیل کے قصے سے ذہن نشین ہو سکے گی۔ دیکھیے کہ ایک مسکین وہونہار نوجوان کی بظاہر خوشنما کھوپڑی پر کس طرح محبت کا بھاری بوجھ رکھدیا گیا۔

ذرا ٹھہرئیے۔ ابھی ہمارا ہیرو منظر پر نمودار نہیں ہوتا ——— پردہ اُٹھنے پر آپ کو دہلی کے ایک خاصے خوشحال گھر کا ایک کمرہ نظر آتا ہے۔ داہنی طرف آتشدان میں دھیمی دھیمی آگ روشن ہے۔ کارنس پر متعدد تصویروں کے درمیان شیڈ کا ایک برقی لیمپ نور افشاں ہے۔ قریب ہی سستے قسم کے انگریزی ناولوں کے ایک ڈھیر پر "جواز" ٹائم پیس رکھا ہے اور وہیں آئینہ، کنگھا، برش اور سینٹ کی خالی شیشیاں بھی پڑی ہیں۔ آتشدان کے اِدھر اُدھر دو میزیں ہیں جن پر خدا معلوم کیا کیا رکھا ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ چاء کے برتنوں سے لیکر "کوپرا" بوٹ پالش تک سب چیزیں آپ کو انہیں دونوں میزوں پر ملیں گی۔ فرش پر ایک بدرنگ دری بچھی ہوئی ہے۔ بیچ میں بغیر پوشش کی ایک میز ہے۔ جسکے چاروں طرف بہت سی کرسیاں پڑی ہیں۔ جن پر کچھ میلے کپڑے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک کرسی کے نیچے ایک ضعیف و نزار کالی بلی خدا معلوم کب سے پڑی سو رہی ہے۔ کمرے کی بائیں جانب دو دروازے ہیں اور داہنی جانب ایک جو اندر والے کمرے میں کھلتا ہے' اسی دروازے میں سے ایک زینہ اوپر کے کمروں کو جاتا ہے۔ سامنے کے رخ اسٹیج کے عقب میں ایک بڑی کھڑکی ہے جو ہمسایہ کے باغیچہ میں کھلتی ہے۔ اس کھڑکی میں ایک دراز قد، تندرست و توانا' گداز جسم والی ارمان بھرے سن و سال کی لڑکی۔ بھرپور جوانی کا نشہ بڑی بڑی آنکھوں کے گلابی ڈوروں میں چھپائے۔ سفید ساری میں لپٹی ہوئی اس طرح بیٹھی ہے کہ ایک پاؤں فرش پر ٹکا ہوا ہے اور دوسرا کھڑکی کے ایک پٹ پر رکھا ہے اور وہ خود اُمنگوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے بظاہر بے خبر کھڑکی کی سل پر گٹھری بنی بیٹھی ہے۔ گورے گورے چوڑیوں سے عاری ہاتھوں میں سفید سلائیاں تیزی سے حرکت کر رہی ہیں۔ نیلے رنگ کی اون کی گیند لڑھک کر فرش پر آ رہی ہے۔ بائیں ہاتھ کی ایک شمعی اُنگلی پر بہت سا اُون لپٹا ہوا ہے اور دوسری سلائی میں کچھ بنا ہوا حصہ لٹک رہا ہے ——— سلائیاں تیزی سے چل رہی ہیں اور اس کے ساتھ ہی میٹھے سُروں میں کُسم کماری کچھ گنگنا رہی ہے ——— ٹائم پیس کی مصروف و مسلسل ٹک ٹک، اُمراؤ دکالی بلی، کی منظم خرخر اور اس الھڑ کنواری کی بے ربط گنگناہٹ، ان تینوں کی ہم آہنگی نے کمرے کی فضا میں عجب جادو سا بھر رکھا ہے ......

دائیں طرف کا دروازہ آہستگی سے کھلتا ہے اور کرشن کماری، دُبلی پتلی لیکن تندرست و بشاش پچاس سالہ عورت جو ہر اعتبار سے ایک اچھی "ماں" معلوم ہوتی ہے۔ ایک ہاتھ میں فرائی پان اور دوسرے میں دودھ دان لئے تیزی سے داخل ہوتی ہے۔ کچھ دیر آتشدان والی دونوں میزوں پر الٹ پلٹ کرنے کے بعد، بیچ کی بغیر پوشش والی میز پر چاء کے برتن سلیقے سے رکھتی ہے۔ چاء دان میں کچھ چاء ڈال کر چلنا چاہتی ہے کہ گھڑی کی طرف دیکھکر چونک پڑتی ہے۔

"اوہو! سات بج گئے۔ شامو نہیں آیا' ابھی تک"

"اجی ابھی تو سویرا ہی ہے۔ ابھی سے وہ لاٹ صاحب کیوں آنے لگے ......" کسم کی سلائیاں ایکدم سے رک جاتی ہیں ......

"سر پر چڑھا رکھا ہے تم نے۔ رات کے بارہ بجے بھی آتا ہے تو تم اُسے کھانا دینے دوڑ پڑتی ہو۔ چھوکریوں کی طرح آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر دماغ ساتویں آسمان پر چڑھا دیا ہے۔ ہوں۔ میں تو کبھی تھوکوں بھی نہیں ......"

"آج تو تو نے بھی اُس کیلئے توس بنائے ہیں۔ کیوں کُسم؟" ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری خاطر سے" کُسم نے چمک کر کہا۔ "اس بندر کے لئے مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ چولھا پھونکوں ——— تم ہی کو مبارک رہے ایسی للو پتو۔ میں کیوں کروں، لاٹ صاحب ہیں کہیں کے کوئی نواب ہیں۔ کون ہے آخر ——— تم ہی اُس کا کام اس طرح دوڑ دوڑ کر کرتی ہو جیسے وہ جا ہے بچہ ہی تو ہیں ......" کُسم کی حسین آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "اسکے پھٹے ہوئے بدبودار موزے کون درجنوں کی تعداد میں دھو دھو کر سکھاتا ہے؟ اسکی پتلونوں میں کون پیوند لگا لگا کر اپنی آنکھیں دکھاتا ہے؟ اسکی معمولی سی گھڑیوں پر کون میری کریم کی شیشیاں کی شیشیاں تھوپ دیتا ہے؟ تم ——— اور کون! ایک اس کیلئے اور ایک ان ہنومان جی کیلئے تم اپنی جان ہلکان کرتی پھرتی ہو" کُسم نے چھت کی طرف اشارہ کر کے اپنی ناک ماتھے پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں جب اسکول سے آتی ہوں تو تم کبھی بھی اس طرح میری خاطر مدارات نہیں کرتیں ......"

ماں نے ایک تند قہقہے سے امراؤ (بلی) کو جگا دیا۔

"... شامو نے اپنے گندے جوتوں سے اور موٹر سائیکل کے گھناؤنے پرزوں سے ہمارے گھر کو لدر کر رکھا ہے۔ ہمارے گھر کو۔ اور تم کبھی بھی اُسے کچھ نہیں کہتیں اور اُلٹا مجھے ڈانٹ دیتی ہو۔ یہاں تک کہ اُس کی منحوس جرسیاں تک مجھے سینی پڑتی ہیں۔ تم کیوں اُسے منع نہیں کرتیں۔ کون ہے آخر وہ۔ ہمیں کیا دیدے گا ——— ہمارے گھر آیا ہی کیوں۔ کہیں اور نہیں مرسکتا تھا جا کر۔ ہمارے ہی گھر کو کوٹھی بنانا تھا ......" غصے کے مارے اس چنچل لڑکی کے آنسو نکل پڑے۔ ماں نے اس کے قریب پہونچ کر شفقت سے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا: "ایسا نہ کہہ کُسم ا ——— وہ بیچارا اور کہاں جا کر رہے آخر۔ دلی میں ہم ہی تو اُسکے رشتہ دار ہیں۔ اُسکی ماں نے اجمیر سے اُسے میرے پاس بھیجا ہے کہ جب تک وہ ایم۔ اے نہ پاس کرے اُسے اپنے ہی پاس رکھنا۔ کنبہ داری بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے آخر۔ قریب کا رشتہ نہ ہی پھر بھی اپنا ہے ——— اور اُسے دیکھ وہ تیرے ساتھ کیسی محبت سے پیش آتا ہے ......"

"جی! بڑی محبت سے پیش آتا ہے۔ سیدھے منہ بات تو کرنے کی توفیق نہیں محبت سے پیش آئیں گے بیچارے۔ ہوں۔ رات رات بھر بجلی جلائے بیٹھے پڑھتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ نہ ہو سکا کہ چلو بائسکوپ دکھا لائیں۔ بیسیوں جرسیاں سی ڈالیں پھوٹے منہ سے ایک لفظ شکریہ کا نہ نکلا ——— کالج کے اور لڑکے بھی تو ہیں من موہن کو دیکھو۔ ایک یہ ہیں۔ ——— شے ! ! بندر ......"

بائیں طرف کا دروازہ ایکدم سے کھلا اور ایک بلند قامت، قوی الجثہ، کسرتی بدن والا، مقبول صورت نوجوان خاموشی سے داخل ہوا۔ کمرے کی فضا میں فوراً نمایاں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ ہر چیز اسکے شاداب اور مسکراتے ہوئے چہرے کی طرح بشاش نظر آنے لگتی ہے۔ یہ کسرتی جسم والا، مسکین اور بھولا لڑکا فٹ بال کا بُری طرح شائق ہے چنانچہ آج بھی ایک زبردست میچ کھیل کر واپس آیا ہے۔

"ہلو! کُسم!!" شامو نے رسماً کہا اور کُسم اپنی تیوری پر کئی ہزار بل ڈالکر پھر کھڑکی میں ہو بیٹھی۔ اسکی سلائیاں زیادہ تیزی سے چلنے لگیں۔

"آؤ، شامو! آج تو بہت دیر لگا دی" کرشن کماری نے شفقت سے کہا جو اپنے اس دور پرے کے بھانجے سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنی کہ وہ اپنے بیٹے سے کرتی اگر کوئی ہوتا تو۔ کرشن کماری کا یہ عزیز بھانجہ اجمیر سے یہاں پڑھنے آیا ہوا تھا۔ اس کا پورا نام شیام سندر لال تھا جس کا بلا تکلف "شامو" بنجانا آپ خود سمجھ سکتے ہیں کسقدر ضروری تھا۔

"ہاں، مامی! آج ایک زبردست میچ تھا۔" شامو نے اپنی مخصوص نرم و باریک آواز میں کہا۔ اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ شامو کے احباب کیلئے شامو کی نرم و باریک آواز اور گڑ کی طرح میٹھا لب و لہجہ آج تک ایک "حل طلب لاینحل معمہ" ہے ــــ اور فی الحقیقت کون کہہ سکتا تھا کہ اس چھ فٹ دو انچ اور دو من دس سیر کے "معقول" حیوانِ ناطق میں سے ایسی آواز نکلے گی جو سرزمینِ اودھ کی "واللہ۔ ل۔ چناں۔ چنیں" والی مخلوق کو بھی مات کر دے۔

"چلو۔ جلدی سے چائے پیو۔ توس وس سب ٹھنڈے ہو گئے۔۔۔۔۔ ذرا بڑی بتی جلا دینا۔۔۔۔۔" اور شامو نے بغیر اپنی جگہ سے ہلے اپنا لمبا ہاتھ سوئچ بورڈ تک پہونچا دیا۔ کارنس والا لیمپ گل ہو گیا اور چھت والی بتی اپنے گلابی فانوس میں (جو مامی نے کسم کے ایک پرانے جمپر میں سے "تعمیر" کیا تھا) چمکنے لگی۔

"کون جیتا؟" مامی نے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

"ہم۔" شامو نے قدرے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ "اُن کے دو گول اور ہمارے پانچ۔ ہاف ٹائم تک بُری طرح لڑتے رہے۔ آخری دس منٹ پر ہم نے ایکدم تین گول کئے۔۔۔۔۔" غالباً یہ چیز دلچسپی سے سنی جائے گی کہ اب تک ہمارا فتحمند فٹ بالر پاؤ بھر دبیز توسوں کے علاوہ انڈا وغیرہ سب کچھ صاف کر چکا تھا اور اس گفتگو کے بعد تو وہ "ماحضر" میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ اتنی کہ اپنی نیک مامی کے سوالوں کے جواب میں وہ سوائے "ہاں" "نہیں" "ہوں" "جی" کہنے کے کسی مزید بیان کی گنجائش نہ نکال سکا ــــ یہ ضرور ہوا کہ شامو کے ہر اس قسم کے جواب پر کسم کی شوخ اور چنچل آنکھیں ماں کو یہ پیام پہونچا دیتیں کہ "دیکھی بات کرنے کی تمیز!" اور پیاری ماں ہر دفعہ مسکرا دیتی۔

"اور توس لو۔ شامو!"

"نہیں۔ بس میں کھا چکا۔"

"نہیں۔ بیٹا۔ یہ آخری توس تو ضرور کھاؤ۔ اس سے تمہیں ہزاروں روپے اور ایک خوبصورت بیوی ملے گی۔" شامو نے مسکراتے ہوئے آخری توس نوش جان کیا۔

"اور چائے؟"

"نہیں۔ میری تیسری پیالی ہے۔" شامو نے کسر نفسی سے کہا اور تیسرا لبریز قدح چڑھانے کے بعد چھت کی طرف نظر کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا حال ہے۔ آج تو سالگرہ ہے نا!"

"صبح سے کوئی اوپر نہیں گیا۔ ہم نے بھی اپنے تحفے بنواری کے ہاتھ بھیج دئے تھے۔ جب تک بلائیں نہیں کون جا سکتا ہے۔۔۔۔۔"

عین اسی وقت چھت پر تندی سے کھٹکھٹانے کی آواز آئی اور اسکے بعد لکڑی کے تختوں پر مین ایسی بلند بانگ چوٹیں پڑیں کہ گلابی فانوس والی بتی کانپ کانپ گئی۔ "کھٹ!۔ کھٹ!!۔ کھٹ!!!"

"لو، وہ پکار پڑی۔ مجھے بلایا ہے۔" کرشن کماری گھبرا کر دوڑی۔ فوراً ہی کمرہ دوسری مرتبہ اور گونجا "کھٹ!۔ کھٹ!!"

ہنستا ہوا شامو نے کھڑکی والی مہ جبیں کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بھی بلایا ہے، کسم!" اور کسم ننھے پھلاتی ہوئی تیزی سے زینہ کی طرف دوڑی۔ ایک اور "کھٹ!"

"ہا ــــ مجھے بھی!" اور انتہائی آہستگی سے شامو ایک قدم میں کسم سے آگے نکل گیا۔ اس دو من دس سیر کے زبردست انسان (جو اپنے

کالج کی ٹیم کا کیپٹن ہونے کے علاوہ اور بہت سے کھیلوں میں بھی مفید ثابت ہو چکا تھا۔) کے خرام ناز میں اتنی آواز بھی تو نہیں ہوئی جتنی کہ امراؤ (دلی) کے چپنے میں جو اس وقت چار کے خالی برتنوں کے درمیان اپنے مقدر کی آزمائش میں مصروف تھی۔

کمرے کے دروازے پر بنواری (ملازم) نے خندۂ دنداں نما سے استقبال کیا۔ اندر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سے ایک کپکپاتی ہوئی ڈانٹ بلند ہوئی —— "بہو؟"

"جی۔ بڑے دادا۔ آ گئی" کرشن کماری نے جواب دیا اور تینوں مسمی بلی بے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کی تاریکی اسقدر سرد تھی کہ خون جما جاتا تھا۔ مگر بڑے دادا بھلا دو آنے روز کی آگ کیسے جلا سکتے تھے۔ انکے مذہب میں پیسہ خرچ کرنا گویا خودکشی کر لینا تھا۔ یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ بڑے دادا (رائے صاحب لالہ کدار ناتھ، تحصیلدار (پنشنر) دراصل کُسم کے دادا کے بڑے بھائی تھے لیکن گھر بھر انکو بڑے دادا کہتا تھا۔ انکا شفیق و پُرخلوص ملازم بنواری بھی انہیں اسی نام سے مخاطب کرتا تھا۔ اور شاید امراؤ بھی۔ لیکن ہم نے کبھی سنا نہیں۔

خیر! تو یہ اسی جنونِ زرپرستی کا نتیجہ تھا کہ بڑے دادا کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ سامنے والے "گولڈ لک سینما" پر روشنی کا ایک بڑا سا نعل بنا ہوا تھا جو ہر دو سکنڈ منٹ پر کبھی سُرخ، کبھی نیلا، کبھی زرد اور کبھی سفید ہو جاتا تھا۔ بس اسی کی دمک پر بڑے دادا قانع تھے۔ بنواری کا بیان ہے کہ بہت سے موٹے موٹے ناول بڑے دادا نے اسی لال پیلی روشنی میں پڑھ ڈالے۔ شاید!!۔

بڑے دادا کا مقبرہ نما کمرہ ہر قسم کے کاٹھ کباڑ سے اٹا پڑا تھا۔ دنیا کی کونسی ایسی چیز تھی جو وہاں نہ ہوگی۔ اتنا سامان تھا کہ بیحد بے شمار، دو تین من تو صرف خاک ہی ہوگی۔ اور اسی قدر چمگادڑوں کا "عطیۂ تبریک" —— تینوں نو وارد بڑے دادا کی مسہری نما کرسی کی طرف بڑھے جو بے شمار کمبلوں، پرانے قالینوں اور بدبودار رضائیوں سے مرصع تھی۔ بڑے دادا اسی پر براجمان تھے۔ کس کی مجال ہے کہ ان کا حلیہ مبارک رقم کرے۔ صرف اتنا معلوم ہو جانا کافی ہے کہ روئے زمین پر صرف وہی ایک ایسے انسان تھے جو خفیف سی مرمت کے بعد ایک ضعیف کچھوے یا ایک مدقوق بندر میں باسانی منتقل ہو سکتے تھے۔ بس۔

"تم سب آ گئے۔ ہوں؟ ..... اتنی دیر کیوں لگی۔ ہائیں؟؟؟ بہو۔ تو نے ہماری آواز سنی تھی؟"

"جی بڑے دادا" بچوں کی طرح گڑگڑا کر بہو نے کہا۔

"تو نے۔ لڑکی؟"

"جی۔ بڑے دادا" کُسم کا جواب تیار تھا۔

"تو نے۔ لڑکے؟"

شامو کا خوبصورت دہانہ کھلا اور بند ہوا اور پھر کھلا "جی۔ بڑے دادا"

"پھر اتنی دیر کیوں لگی۔ لگی یا نہیں۔ ہوں؟"

خاموشی۔

"—— ہوں؟ خیر، تو، جانتے ہو کہ آج ہمارا جنم دن ہے۔ ہے کہ نہیں؟ ہوں؟؟ آج ہم پورے نوّے برس کے ہو گئے۔ کیوں؟ ——"

بڑے دادا کا پوپلا منہ مسکرا رہا تھا۔ اُف وہ بھیانک و دہشت خیز تبسم!! معلوم ہوتا تھا کہ خود عزرائیل صاحب یا کالی مائی مسکرا رہی ہو۔ "ہم چاہتے ہیں

کہ ہم تمہیں کچھ دکھائیں......"

"میں بتی جلا دوں جناب —" شامو بولے۔

"آپ کوئی ایسی حرکت نہ کر سکیں گے جناب —" بڑے دادا چڑ کر بولے۔ "بجلی ضائع کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ ہر چیز برباد کر ڈالتے ہو تم لوگ، نقصان کا خیال ہی نہیں ہے، فضول خرچی، ہر بات میں فضول خرچی ——— اور تم سے کچھ دور نہیں کہ تم نیچے کی بتی بھی جلتی چھوڑ آئے ہوگے (وہ دراصل چھوڑ آئے تھے) — بہو! پچھلے مہینے کا تیرا کیا بل تھا؟" توپ کے گولے کی طرح یہ سوال بہو کے دماغ پر پڑا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"میں ایک منٹ میں معلوم کر لیتی ہوں، بڑے دادا! میرے فائل میں سارے بل نتھی ہوئے ہوئے ہیں۔" بہو نے ہمت کر کے کہا۔

"فائل میں نتھی! کیا مطلب۔ ہائیں! تیرے دماغ میں کیوں نتھی نہیں ہیں ہائیں؟ تیرے بھیجے میں کیوں نہیں گھسے ہوئے۔ ہوں؟ تیری انگلیوں کے پوروں پر کیوں نہیں جڑے ہوئے — بول؟ یہ سب باتیں حفظ یاد ہونی چاہئیں۔ فائل میں نتھی! ہا۔ یو وہ!..." یہ بھی طے ہے کہ بڑے دادا جب ایکم تبہ گرجنا شروع کر دیتے ہیں تو ڈیڑھ گھنٹے تک گرجے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک سانس میں لاکھوں صلواتیں سنا ڈالیں۔

* * * * * * * * *

آج بڑے دادا کی سالگرہ تھی، ان تینوں عزیزوں نے انتہائی محبت سے بڑے دادا کی خدمت میں تحائف بھیجے تھے اور یہاں بڑے دادا تھے کہ بل کھا رہے تھے۔ خدا معلوم ان غریبوں پر کب کا بخار نکال رہے تھے۔ بارے اچھی طرح گرجنے کے بعد ذرا مزاج درست ہوا۔

"لڑکے۔ یہ پھول تو نے بھیجے تھے۔ کیوں؟"

"جی۔ بڑے دادا!" شامو نے جواب دیا۔

"ٹھیٹ جاڑوں میں گلاب کے پھول۔ بھلا کتنے کے آئے ہونگے۔ کیوں جی؟؟"

شامو صرف دانت نکوس سکا۔

"بولتا کیوں نہیں۔ آخر یہ فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے؟" بڑے دادا کی آواز تیز ہوتی گئی۔

"میرا خیال تھا کہ شاید۔ شاید آپ پسند کریں۔" شامو نے خدا معلوم کس طرح کہا۔

"آپ کا خیال تھا کہ میں آپ کی اس حماقت کو پسند کرونگا۔ ہوں! آپ کی اس خراجی کی قدر کروں گا۔ کیوں جی؟"

خاموشی

"— اور یہ اس لئے کہ تو نے مجھے یہ کہتے سنا ہے کہ میں حسن کا پجاری ہوں۔ مجھے تجھ جیسے مکروہ شکل کے انسانوں سے نفرت ہے۔ اسی لئے میں ہر وقت کرشن جی۔ کام دیو۔ رادھا اور وینس کے مجسموں میں گھرا رہتا ہوں —" اس مقام پر بڑے دادا نے اپنی سوکھی ہوئی انگلی سے سنگِ مرمر کے ان حسین بتوں کی طرف اشارہ کیا جو اس "خانقاہ" کے چاروں کونوں پر سلیقے سے رکھے ہوئے تھے — "اسی لئے نا۔ کیوں؟ لڑکے، تو نے اسی لئے پھول بھیجے تھے کہ میں ان کی خوبصورتی سے خوش ہوں۔ کیوں؟"

"جی ہاں۔ بڑے دادا!" شامو نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

بڑے دادا نے ایک مہیب قہقہہ لگایا۔ کمرہ اس کی دردناک چیخوں سے گونج گونج گیا۔ خدا ایسی بھیانک ہنسی کبھی نہ سنائے لیکن اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔

کرشن کماری، کُسم اور شامو کے خوفزدہ چہروں پر اطمینان کے آثار پیدا ہوئے۔ کم از کم جان بخشی کی آس تو بندھی۔

* * * * * * * *

بڑے دادا پھر چیخے "بہو! بتا سکتی ہو ہمارے پاس کتنا دھن ہے؟ بول!!"
بہو سوچ میں پڑ گئی۔
"لڑکی!؟"
"مجھے نہیں معلوم۔ بڑے دادا!" کُسم نے ایسے انداز میں کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ "مجھے کیا۔ ہو تو ہوا کرے۔"
"لڑکے!؟!"

شامو نے اپنے باریک رس بھرے ہونٹ کھولے، بند کئے۔ اور پھر کھولے "معلوم نہیں۔ بڑے دادا!"
"کسی کو نہیں معلوم۔ کیوں؟" سوکھے ہوئے سیاہ ہونٹوں پر پھر وہی دہلا دینے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی "کیوں؟"
"سنو!" بڑے دادا نے ڈانٹ کر کہا "میں اس وقت ایک لاکھ نقد اور دس ہزار سالانہ کی جائداد کا واحد مالک ہوں۔ سنا تم نے؟"
حیرت واستعجاب کی بجلی سی چمک گئی۔ یہ بڈھا کھوسٹ اتنا امیر ہے۔ یہ پرانا لنگور! سب کے دل میں بیک وقت یہی سوال پیدا ہوا۔ لیکن نہیں۔ شاید غریب بڑے دادا کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔ افسوس، بیچارہ قابل رحم ہے......
"ہوں! تم لوگوں کو یقین نہیں آتا۔ کیسے آئے۔ تم روپے کی قدر کیا جانو۔ بیوقوف گدھے۔ لڑکے! بنواری! بتی جلاؤ۔"
"بجلی! بڑے دادا!" بنواری نے پوچھا۔
"جی ہاں۔ بنواری لال جی۔ بجلی —— تو سمجھا تھا کہ میں پھلجھڑی جلانے کو کہتا ہوں۔ پاجی۔ شے....."
روشنی ہوتے ہی اس "خانقاہ" کی عریانی سب پر ظاہر ہو گئی مختصر الفاظ میں، یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایلورا یا اجنتا کے کسی غار میں بیشمار صندوقوں، الماریوں اور چینی کے ٹوٹے پھوٹے برتنوں کا ایک عجائب خانہ قائم ہے۔ جس کے مہتمم بڑے دادا ہیں جو اپنی جگہ خود ایک عجوبۂ روزگار چیز ہیں —— "کاغذوں والا بکس نکال بنواری!" بڑے دادا گرجے۔ متعدد چھوٹے بڑے صندوق کھلے تب جا کر کہیں کاغذوں والا بکس برآمد ہوا۔ بڑے دادا نے اپنے میلے کوٹ کے نہ معلوم کون سے گوشے سے کنجیوں کا دو سیر وزنی گچھا نکالا اور دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے وہ بکس کھولا جس میں سے کئی ہزار جھینگر ادھر ادھر پھدک نکلے۔

"یہ کاغذات۔ لڑکے!" بڑے دادا نے ایک پلندہ شامو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اگر تجھے پڑھنا آتا ہو تو پڑھیو۔ لیکن تو کیا جانے پڑھنا۔ چودہ! —— اور یہ دیکھ یہ امپیریل بنک کی کتاب۔ دیکھی تو نے۔ کتنے روپے۔ بول کتنے۔ بول۔ ساٹھ ہزار ہیں کہ نہیں؟ جانتا ہے ساٹھ ہزار کتنے ہوتے ہیں۔ اور سود۔ بتا سکتا ہے ۲½ فی صدی فی سال کے حساب سے پندرہ برس کا کتنا ہوا۔ بتا سکتا ہے۔ کیا خاک بتائے گا..... اور یہ دیکھ مکانوں کے قبالے۔ آٹھ کوٹھیاں اور چھ بڑے مکان...... ہاہاہاہا" بڑے دادا کی غضبناک ہنسی! الٰہی توبہ۔ شامو کا منہ تیزی سے کھلتا بند ہوتا رہا۔ کرشن اور کُسم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"...... تم سمجھتے تھے کہ ہم مفلس ہیں۔ کوڑی کوڑی کو محتاج ہیں۔ جبھی تو ہمیں پاجامے میں رکھ کر پہن لیا تھا —— پرواہ ہی نہیں تھی۔ اور لڑکی! دیکھ۔ یہ ہار اصلی نیلم اور یاقوت۔ جانتی ہے یاقوت کسے کہتے ہیں۔ اور دیکھ ہیرے کی یہ انگوٹھی۔ یہ سب تیرے لئے ہیں......"

"میرے لئے۔ بڑے دادا!" گُم نے خوشی کی ایک چیخ کے درمیان کہا۔
"ہاں تیرے لئے۔ لیکن میرے مرنے کے بعد۔ ابھی نہیں۔ اس لئے ابھی سے خوش ہونا بیکار ہے۔ سمجھی!" لیکن گُم بہرحال خوش تھی۔
"........ اور یہ ساری دولت۔ میری ساری جائداد، روپیہ پیسہ۔ تیرا ہے۔ لڑکے! سُنا تو نے؟ صرف تیرے لئے اُٹھا رکھا ہے۔ جانتا ہے۔؟؟"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

شامو کا خوبصورت دہانہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ حسین و منور آنکھیں بڑے دادا کے آئینے کی طرح شفاف اور گھسے ہوئے سر پر جم کر رہ گئیں۔ سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ زمین و آسمان چکر کھاتے معلوم ہوئے۔ تنفس کی رفتار دوچند ہو گئی۔ "یہ ساری دولت تیرے لئے ہے لڑکے!" بڑے دادا کے یہ الفاظ رعد و کڑک کی طرح اُس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ دولت کے انبار کے انبار۔ قارون کا خزانہ۔ ایک مستقل سلطنت (اُف شامو کے خدا!)
"میری ساری جمع پونجی، ساری جائداد، پیسہ پیسہ، سب تیرا ہے۔ اور ابھی! تجھے میرے مرنے کا بھی انتظار نہ کرنا پڑیگا۔ جب چاہے لے سکتا ہے۔ لیکن، ایک شرط کے ساتھ۔ جانتا ہے؟ ایک شرط پر۔ معلوم ہے شرط کیوں؟؟"
"کیا کہا نہیں؟ کیوں۔ کیا تو شرط کے معنی نہیں جانتا؟" بڑے دادا نے ڈانٹ بتائی۔
"لیکن، بڑے دادا۔ بڑے دادا۔ آپ کی شرط کیا ہے؟" شامو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"میری شرط۔ ہا۔ میری شرط" سوکھے ہوئے سیاہ ہونٹ بھیانک انداز میں پھیلے: "اچھا ہو! اور تو لڑکی!! تم لوگ جاسکتے ہو۔ تمہاری دلچسپی کی کوئی چیز نہیں ہے۔ سمجھیں؟؟" (بغیر جواب دئے یہ دونوں کی دونوں دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئیں۔ دلچسپی کی چیز کیسے نہیں تھی آخر۔ دُنیا کے سارے شریف انسانوں کو چھوڑ کر بڑے دادا دولت کے ڈھیر کے ڈھیر شامو کی طرف بڑھا رہے تھے صرف ایک شرط پر۔ وہ شرط کیا تھی معلوم تو ہو؟ اگر کوئی ضرورت سے زیادہ خطرناک چیز ہوگی تو بھاگ نکلیں گے۔ اس لئے دروازے کے قریب کھڑے رہنا قرینِ مصلحت تھا۔)
"...... ہاں تو۔ لڑکے! تیری کیا عمر ہوگی؟" بڑے دادا نے اپنی بے نور بٹن جیسی آنکھیں شامو کے متوحش چہرے پر گاڑ دیں۔
"بائیس" شامو نے اندازاً کہا۔
"بائیس برس۔ اوہ! ایشور۔ زندگی کا بہترین زمانہ ـــــ اچھا یہ بتا۔ کوئی لڑکی ہے؟ کیوں؟؟ کوئی سُندری؟؟" بڑے دادا نے رازدارانہ طور پر پوچھا۔
"کیا چیز جناب؟" شامو کا خوبصورت دہانہ کھلا اور بند ہوا۔
"چیز!! ہاہاہا۔ (بڑے دادا کی ہنسی خدا کبھی نہ سُنوائے) چیز!! ـــــ او گدھے! میں پوچھتا ہوں تجھے کسی لڑکی سے پریم ہے؟ کسی خوبصورت کنیا سے؟ کیوں؟؟" بڑے دادا غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔
شامو کا دہانہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"ـــــ کسی کالی کلوٹی سے۔ کسی چڑیل سے ـــ بولتا کیوں نہیں؟" بڑے دادا کی آواز تیز ہوتی گئی۔
شامو کا تن بدن کانپ رہا تھا: "نہیں۔ بڑے دادا!" اس نے قریب قریب روتے ہوئے کہا۔
"نہیں!! کیا مطلب؟ کیا تجھے آج تک کسی سے پریم نہیں ہوا! اس عمر میں بھی نہیں تو پھر کب؟ ـــ آیو ـــ کم نصیب!" بڑے دادا کو سچ مچ

غصہ آ رہا تھا۔ (کسم کی حسین آنکھیں خشم آلود تھیں اور شامو کی طرف اُس کا دل نفرت کی چنگاریاں پھینک رہا تھا۔)...... "کیوں نہیں کیا سبب ہے؟"

شامو نے اپنے دل کو قابو میں کرتے ہوئے کہا "معلوم نہیں بڑے دادا۔ مگر میں کسی لڑکی کو نہیں جانتا....!"

"ہا! افسوس۔ مگر مجھے پہلے ہی سے اس کا اندیشہ تھا۔ خیر ـــــ تو میری شرط سن! (شامو کے خدایا!!) میری شرط سن! تجھے بہت جلد ایک لڑکی حاصل کرنی پڑے گی۔ کہیں سے لا۔ کوئی ہو۔ کہیں کی ہو۔ کوئی قید نہیں۔ ہندو، سکھ، مسلمان، عیسائی، یہودی، انگریز، مصری، چینی، جاپانی۔ کوئی ہو۔ اسے لا۔ اور اُس سے شادی کر۔ سنا تو نے۔ لیکن کیسی لڑکی؟ کیسی لڑکی؟......"

خاموشی ـــــ بڑے دادا کا چمکدار سر تیزی سے ہل رہا تھا۔ اور آنکھیں بند تھیں۔ شامو کا منہ کھلا ہوا تھا۔ کسم بڑے دادا کی طرف اور کرشن شامو کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئی تھی۔۔

"کیسی لڑکی؟" بڑے دادا نے شامو کو ایک گہری نیند سے جگایا۔ "پرفکٹ! پرفکٹ!! جانتا ہے پرفکٹ کے معنی۔ مکمل!! ہر طرح سے مکمل! جوان۔ سچ سچ جوان! سُنا۔ پھٹ پڑنے والی جوانی میں دُھت ـــــ اور حسین۔ اُجلے رنگ کی شرط نہیں لیکن جسم تندرست اور اعضا قوی، گداز، سڈول اور کھچے ہوئے ہونے چاہئیں۔ مکمل صحت کے ساتھ نزاکت لازمی ہے۔ آنکھیں نرگسی کرگسی نہیں چاہئیں تیز، چمکدار اور روشن ہوں۔ بس۔ سمجھا۔ ـــ غرض ایک ایسی جوان کنواری تلاش کر جو بھرپور جوانی کے بوجھ سے دبی جا رہی ہو ـــــ جا۔ ڈھونڈھ۔ اُس کے آگے سجدہ کر۔ اُسکی پوجا کر۔ اور میرا سارا دھن تیرا ہے!!"

* * * * * * * *

تین منٹ تک بڑے دادا شامو کے متبسم و بشاش (لیکن فی الحال متوحش) چہرے کی طرف ٹکٹکی لگائے رہے اور پھر بغیر جواب طلب کئے اپنی چندی اور ماند آنکھوں میں بجلی کی سی چمک پیدا کر کے بولے: "حُسن کی پوجا کرنا میری زندگی کا محرک جذبہ ہے اور جو لوگ کسی محرک جذبہ کے مالک ہوتے ہیں وہ ضرور کامرانی حاصل کرتے ہیں.... تو کیا جانے ان باتوں کو.... یہ صرف اسی جذبہ کی بدولت ہے کہ آج میں ـــــ کیا ہوں۔ کیا ہوں؟ بولو؟"

"لکھ پتی! بڑے دادا!" شامت کی ماری کرشن کماری کے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔

"کیا بکا تو نے۔ ہوں؟ ہوں!۔ لکھ پتی! ہائیں؟! ـــــ بے تمیز۔ گدھی۔ کیا تو سمجھتی ہے کہ روپیہ میرا ایمان ہے۔ ہیں؟ کیا میں صرف روپے کی خاطر زندہ ہوں۔ بولتی کیوں نہیں؟ ـــــ کیا اس لئے زندہ ہوں کہ جوڑ جوڑ کر تمہارے لئے روپوں کی ایک کان بنا دوں اور پھر مر جاؤں؟ کیوں؟ ـــــ واہیات! شے...... دراصل میں حُسن کا پجاری ہوں، جانتی ہے! میں خوبصورتی کا عاشق ہوں۔ (کسم مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔) حُسن کی پوجا کرنا میری زندگی کا رولنگ پیشن ہے ـــــ آہ!" بڑے دادا نے کاغذوں والا بکس بند کیا اور پھر ایک نئے جوش کے ساتھ بولے...... "تم لوگوں نے دُنیا میں آخور کی بھیڑ رکھ رکھی ہے۔ افسوس! خوبصورتی، حُسن، سندرتا پہین کی اتنی کمی۔ اس دُنیا کو کیا ہو گیا ـــ ہا...... ہر طرف بدصورتی ہی بدصورتی نظر آتی ہے۔ کریہہ، گھناؤنی، بے ہنگم، منحوس شکلیں۔ شے شے! کتے کی سی تھوتھنیاں لٹکائے لوگ اس دُنیا کی شوبھا بڑھاتے پھرتے ہیں۔ اور خوش ہیں۔ چڑیل جیسی شکلوں پر پاؤڈر، پینٹ اور روج کی قلعی چڑھائی جاتی ہے۔ ہاہا ـــــ وہ نزاکتیں۔ وہ رنگ روغن۔ وہ زندگیاں۔ وہ چمک دمک، وہ تندرستیاں، وہ جوانیاں سب خواب ہو گئیں۔ آہ! سب خواب ہو گئیں۔ خواب۔ آہ!" جذبات کے غلبہ سے بڑے دادا کا نوے سالہ جسم لرز رہا تھا......"

خاموشی۔ دہشتناک خاموشی! بڑے دادا شامو کو گھور رہے تھے ـــــ خدایا! وہ نظریں!!۔

"لیکن ـــــ لیکن دُنیا کے پردے پر اب بھی کہیں نہ کہیں حُسن باقی ہے" بڑے دادا نے یقین کے لہجے میں کہا "کوئی نہ کوئی ایسی سُندری اب بھی زندہ ہے جو اِس دیوی کے سامنے!" بڑے دادا کی لرزتی ہوئی انگلی وینس کے مجسّمے کی طرف اُٹھی "جو اس مہا سُندری کے سامنے آتے ہوئے نہ شرمائے۔ اس مکروہ دُنیا میں آج بھی کہیں نہ کہیں کوئی ایسی سُندری ضرور ہوگی۔ جا۔ اور اُسے تلاش کر۔ اُس کے آگے گھٹنے ٹیک، سجدہ کر۔ اُس کی پرستش کر۔ ......"

شامو کا خوبصورت مُنہ کُھلا۔ باریک گلابی ہونٹوں کے درمیان سے ایک سرد آہ نکلی۔ الفاظ کی گنجائش ہی نہ تھی اور وینس جیسا دہانہ پھر بند ہوگیا۔

"سمجھ گیا یا نہیں۔ ہوں؟ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ تو ہزار بیوقوف اور گدھا سہی پھر بھی س گھر میں صرف تو ہی ایسا ہے جو میرے مزاج سے ذرا بہتر واقفیت رکھتا ہے..... جا اور پرفکٹ لڑکی کو یہاں لا۔ سمجھ گیا؟ تو پھر بولتا کیوں نہیں؟؟"

آہستہ آہستہ شامو کا مُنہ کُھلا ـــ "بڑے دادا جی۔ بڑے دادا ـــ لیکن میں۔ میں نہیں کر سکتا۔ مجھے نہیں معلوم۔ یہ مشکل ہے نہیں، مجھ سے نہیں ہوسکتا......"

"کیا؟؟؟" (بڑے دادا کی ڈانٹ پناہ بخدا!!) ـــ "کیا بکا۔ تجھ سے نہیں ہوسکتا۔ تو نہیں کرسکتا۔ اگر یہ نہیں کرسکتا تو دُنیا کا اور کونسا کام کرسکتا ہے ـــ ہا۔ مورکھ!! ایک خوبصورت لڑکی تلاش نہیں کرسکتا۔ اتنا مشکل ہے۔ کیوں۔ پاگل کہیں کا۔ شے...... لیکن تجھے کرنا پڑے گا۔ جا اور خوب سوچ۔ دولت کے بیشمار ڈھیر تیرے قدموں میں پڑے ہیں۔ جانتا ہے؟ انبار در انبار سونا تیرا منتظر ہے۔ ہوں!! کیوں نہیں ہوسکتا۔ کیا مشکل ہے۔ سوچ تو سہی۔ جا اور ایک ہفتہ کے اندر مجھے جواب دے۔ سُنا تو نے۔ جا۔ تم سب جاؤ۔ میرا دماغ خالی کردیا ـــ ارے بنواری!! آج وہ ملیگا یا نہیں۔ وہ، کیا نام کمبخت کا "کاؤلکس مالڈ ہورس" نہ جانے کیا"

بنواری نے ایک پیالی میں "ہورلکس مالٹڈ ملک" پیش کیا۔

.... تاریکی۔

اتوار کے دن غریب کرشن کماری کے گھر میں قیامت کا نقشہ ہوتا تھا۔ یہ اس لئے کہ اتوار کے اتوار شانتا اور چمپا (کرشن کماری کی نوجوان لیکن شادی شدہ بھتیجیاں) اپنے "سگار نوش" اور "ہارمونیم باز" شوہروں اور ہر جگہ پیشاب کردینے والے بچوں سمیت "بوا" کے ہاں مہمان رہتی تھیں۔ صبح سے شام تک یہ چاروں پانچوں (بجمعیت کسم کماری) وہ اودھم مچاتے تھے کہ دیواریں اور چھتیں کانپ کانپ جاتی تھیں۔ غریب شامو پر سب کی چھری تیز رہتی تھی۔ کمبخت کو ہزار طریق سے بنایا جاتا تھا ـــــــ ذرا نامناسب سا معلوم ہوتا ہے لیکن خیر، آیئے اس شیطانی لشکر سے آپ بھی مل لیجئے۔

"شانتا" نازک اندام۔ سانولی سلونی۔ حلیم الطبع۔ اپنے آپ کو ذرا لئے دئے رہتی ہے۔ ایک عدد بچے کی ماں۔ گرلز کالج میں انٹرمیڈیٹ تک پڑھی ہوئی۔ منجملہ دیگر مشاغل کے آپ مضمون نویسی فرماتی ہیں۔ اکثر مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی ایک مضمون "بوا" کے ہاں بیٹھکر مکمل کرنا ہے اور شام تک چاند میں بھیج دینا ہے۔

"مہندر کمار" شانتا کے "سگار نوش" خاوند۔ اتنے کاہل کہ ایک جگہ بیٹھکر پھر اُٹھنا اُنکے بس کا نہیں۔ فطرتاً خاموش اور سنجیدہ لیکن بوا کے ہاں آنے پر

ان سے زیادہ باتیں کرنے والا اور ان سے زیادہ بلند قہقہے لگانے والا ہندوستان بھر میں نہیں۔ اپنے لاڈلے سپوت "سرجو" پر ہزار جان سے عاشق ہیں۔ بطور دلچسپی کسی فرم کی ایجنسی لے رکھی ہے۔ کام وام خاک نہیں کرتے صرف اچھے اچھے سوٹ پہنتے ہیں۔ شانتا کیلئے انکی خدمات بحیثیت ایک محرر کے ہر وقت حاضر رہتی ہیں۔ لیکن جہاں کہیں کسی مضمون کے متعلق اپنی "ناچیز رائے" پیش کرتے ہیں فوراً اچھی مقدار میں ڈانٹ دئے جاتے ہیں۔ شامو کی طرفداری کرتے ہیں اور اکثر انکی سرپرستی فرماتے ہیں۔

"چمپا": شانتا کی چھوٹی بہن تیز، چنچل، چت چور سنگھار کی بری طرح دلدادہ معقول حد تک حسین بھی۔ کیک بنانے میں مشاق چنانچہ بوا کے ہاں آنے پر سب کے سب چمپا کا تیار کردہ کیک کھانا اپنا مذہبی فرض خیال کرتے ہیں۔ ہنسو سے چمپا اور نٹ کھٹ قسم کا گہرا "یارانہ" ہے۔ زیادہ تر یہ دونوں ساتھ رہتی ہیں۔ مہندر کمار کے سگار چرا کر پی جانا ان دونوں کی محبوب ترین شرارت رہ چکی ہے۔

"کشوری لعل": چمپا کے حسین اور "ہارمونیم باز" شوہر۔ پہلے کبھی سرکاری ملازم تھے آج کل کسی موٹر فرم میں اسسٹنٹ منیجر ہیں۔ عقل کے تیز۔ الائچیاں بہت کھاتے ہیں، چنانچہ اندر والی جیب الائچیوں سے پُر رہتی ہے۔ شامو کو بنانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ شانتا سے بھی اسکے مضامین کے سلسلہ پر بعض اوقات الجھ پڑتے ہیں۔ بنواری (بڈھے دادا کے شفیق ملازم) کی بھی انکے ہاتھوں بری گت بنتی رہتی ہے۔

* * * * * * * * *

"اتنے زور سے نہ بولو۔ خواہ مخواہ شور مچا رکھا ہے.....،" شانتا نے تمام حاضرین جلسہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا........ "چھٹا صفحہ کدھر گیا۔ ابھی تو یہاں رکھا تھا۔ توبہ۔ مجھے شام تک یہ کہانی مکمل کر کے چاند میں بھیجنی ہے اور یہ یہاں یہ حالت ہے۔ کدھر گیا وہ صفحہ؟ ہوں؟! تم بھی آنکھیں بند کئے بیٹھے رہتے ہو، بابو — ارے۔ یہ رہا۔ یہ رہا۔ ٹھیک ہے۔ سات آٹھ۔ نو۔ دسویں صفحہ پر نمبر نہیں ڈالا بابو تم نے۔ جلدی کرو۔ لو یہ رہا گیارھواں۔ ہم کہاں تک پہونچے تھے۔ ہاں۔ ذرا بولنا، کیا لکھا ہے....." کونے والی میز کے گرد شانتا اور اسکے مطیع "بابو" مہندر کمار بیٹھے تھے۔ شانتا بولتی جاتی تھی اور "بابو" لکھتے جاتے تھے۔ شانتا کے حکم کی تعمیل میں بابو نے آخری پیراگراف اٹک اٹک کر پڑھا۔

"...... پچھلے پہر کی نرمل چاندنی نے سارے سنسار کو نور کی اجلی، آبریشمی چادر اڑھا رکھی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ تھکی ہاری دنیا پڑی غفلت کی نیند سو رہی تھی۔ عین اسی سمے پریم کی شراب سے چھلکتے ہوئے، گنگا کی طرح پوتر، دو نیک اور معصوم دل چپ چاپ ایک دوسرے کی تیز دھڑکن سن رہے تھے۔ باغیچہ میں خنک ہوا چل رہی تھی۔ جیسے نشیلے اثر سے انسان وحیوان، چرند پرند، ہر ایک جاندار نیند کے آنند ساگر میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ چنبیلی کی کومل کلیاں ابھی کھلی تھیں۔ چہار طرف سے مست خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ ایک بنچ پر رام اور کملا چپ چاپ بیٹھے تھے۔ کچھ گھنٹوں کے بعد کملا اپنے بچپن کے ساتھی اور سچے پریمی رام سے ہمیشہ کیلئے چھوٹ جانے والی تھی......"

"...... ہاں، ٹھیک ہے!" شانتا نے فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر سوچنے لگی۔ بابو مہندر کمار نے دوسرا سگار سلگایا۔ یکایک کشوری لعل کے ایک پُرہنگام قہقہے نے در و دیوار ہلا دئے۔

"—— اور تم دیکھ لینا بڈھے دادا ضرور اسے کپڑوں کیلئے روپے دیں گے" کسم بولی۔

کشوری لعل نے قہقہے کے درمیان کہا "رہی اچھی! تو شامو بھیا راضی ہو ہی گئے۔ ہنومان جی کے دل کو آخر دن کے بانوں کیلئے تیار ہونا پڑا۔ خوب، خوب!! ہاہاہا!!!"

چمپا نے مٹک کر کہا: "جیمی! ہوں گھر آئی لکشمی کو کون لات مارتا ہے۔ لاکھوں روپے کا معاملہ ہے، کوئی مذاق ہے۔ لوگ تو پیسہ پیسہ پر خون کر ڈالتے ہیں اور پھر یہاں تو چپڑی اور دو دو ——— اچھا کسم! یہ تو بتا۔ کیا یہ سچی بات ہے کہ شامو نے بڑے دادا سے کپڑوں کیلئے کہا ہے؟"

"اسے سچ! اور کیا۔ اس سے زیادہ سچ اور کیا ہوگا۔ ماں سے پوچھ لو۔ تم ہی سوچو۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی سے پریم کرنے کیلئے کچھ کپڑے چاہئیں یا نہیں۔ یا فٹ بال کی پھٹی پرانی بدبودار جرسیوں سے عشق کیا جائے گا؟"

"دی پرفکٹ گرل۔ اوہ! مائی ڈیر یز۔" چمپا نے آہ سرد کے ساتھ کہا: "افسوس کہ میری شادی ہو چکی ہے ورنہ ———" اور کشوری لعل نے پھر ایک بے پناہ قہقہہ لگایا۔ اس مرتبہ جیندر کمار بھی اس قہقہے میں برابر سے زیادہ شریک تھے۔ (اور انکے قہقہے! ہے ہے۔ ایشور!)

شانتا کونے والی میز پر سے کڑک کر بولی: "یہ کیا ہو رہا ہے۔ گدھوں کی طرح ڈھینچوں ڈھینچوں کر رہے ہیں کسی طرح لکھنے نہیں دیتے۔ تم مت ہنسو جی بابو۔ کوئی بات بھی ہے۔ ہوں۔ چلو آگے لکھو ——— ٹھیرو، میں سوچ لوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہوا یہ کہ ———" کسم دلاویزی سے بولی: "کہ پرسوں ماں نے اُسے بہت سمجھایا یہی کہا کہ آخر کبھی نہ کبھی تو تو کسی سے شادی کرے ہی گا۔ اسلئے ایک خوبصورت لڑکی کیوں تلاش نہیں کر لیتا۔ آخر اس میں بات ہی کیا ہے۔ بڑے دادا بھی تو کہتے ہیں نا کہ کسی مہا سندری سے شادی کر۔ یہ تو نہیں کہتے کہ کسی کلمجڑی چڑیل کو اپنے پلّے باندھ ———"

کشوری بولے: "رہے گا یہ ڈرامہ دلچسپ۔ دیکھو کیا کیا مزے آتے ہیں۔ مگر بڑے دادا نے اپنے راجکمار کو کچھ تدبیریں بھی بتائیں؟ کچھ منتر وغیرہ؟"

"ہوں؟ نہیں۔ سب کچھ شامو کی مرضی پر منحصر ہے۔ جس طرح چاہے کرے۔" کسم طنز آمیز مسکراہٹ کیساتھ بولی۔

* * * * * * * *

"ہل ——— تو! شامو!" دروازہ کھلا اور حسین دہانے والا قد آور اور شہ زور شامو اوسان باختہ کمرے میں داخل ہوا۔ ایک پھٹا ہوا بنیان اور نیکر پہنے تھا۔ جو اسکی صبح کی دوڑ کی وردی تھی۔ اس شیطانی لشکر کو دیکھتے ہی شامو کا خوبصورت دہانہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"شامو گھبرا کیوں رہے ہو۔ خیر تو ہے۔ کیا ہمارا یہاں آنا پسند نہیں کرتے۔ کیوں؟" چمپا نے شوخ آنکھوں کو چمکاتے ہوئے کہا

شامو واقعی گھبرا رہا تھا۔ اور گھبرانے کی بات بھی تھی۔ کیا آپ نہ گھبرائیں گے جبکہ اچانک آپکو اس تلخ حقیقت کا پتہ چلے کہ جس بستر پر آپ ابھی بیٹھنے والے تھے اس پر ایک گھناؤنا بچہ پڑا سو رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس "معصوم" نے اپنی مسلسل ریزش سے سارے بستر کو اس حد تک "نوازا" ہے کہ کئی دن تک تر رہیگا ———!

"ہاں۔ شامو! میں نے سرجو کو تمہارے بستر پر لٹا دیا تھا۔" جیندر کمار نے میز پر سے اُٹھکر شامو کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"——— اور کہیں جگہ ہی نہیں تھی۔ چمپا اور کشوری نے بوا کا کمرہ گھیر رکھا تھا اور کسم نے اپنے پلنگ پر ساڑھیاں پھیلا رکھی تھیں۔ تم فکر نہ کرو۔ شامو! غسل خانہ میں جا کر کپڑے بدل لو۔ وہاں کوئی نہیں ہے سوائے تمراؤ کے۔ میں نے اُسے سرجو کا دودھ پی جانے پر یہ سزا دی ہے۔ صبح سے بند ہے۔ تم وہاں کپڑے بدل لو پھر یہاں آ بیٹھو۔ لیکن خاموش بیٹھنا۔ شانتا کام کر رہی ہے سمجھے!

* * * * * * * *

"شامو! میں وہ "ہو چلا" والی چیز نہیں سناؤ گے؟" شامو کی مہربان مامی کرشن کماری نے تیسرے پہر کی چاء کے بعد کہا۔

یہ معلوم ہو جانا چاہئیے کہ نوجوان شیام سندر لعل جو سرگم سے بھی واقف نہیں تھا غضب کی دل لبھانے والی آواز رکھتا تھا۔ اکثر شام کو میچ سے واپس آنے پر جب وہ اپنے حسین رس بھرے ہونٹوں سے بانسری جیسی نشیلی سیٹی بجایا کرتا تھا تو سارا گھر جادو کے ہنڈولے میں جھولتا معلوم ہوتا تھا۔ اس سے نفرت رکھنے والی مغرور اور الھڑ نسیم بھی اس باب میں اس کی قائل تھی۔

"اوہ ... اوہ ... ہاں بھی ضرور" نسیم تمیت صب نے چلا کر کہا۔

"آر رائیٹ! میں اپنی بینجو لے آؤں!" شامو نے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کہا ـــــ یہ بھی حیرت انگیز بات تھی کہ فطرتاً خاموش، شرمیلا اور کم سخن شامو "گا دینے" کو بالکل ہی تکلف چیز سمجھتا تھا۔ آخر اس میں شرم کو کیا دخل تھا۔ وہ ذرا سے اشارے پر ہر ایک کے لئے "گا دینے" پر فوراً آمادہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک منٹ بعد اپنی بینجو لئے ہوئے نمودار ہوا۔ بینجو کی "گردن" میں سرخ، نیلے اور زرد رنگ کے متعدد ربن لٹک رہے تھے۔ اتنی نفیس اور موٹی قسم کی چیز اس چھ فٹ دو انچ اور دو من دس سیر والے انسان کے ہاتھوں میں کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھی۔

کشوری نے باجہ سنبھالا اور شامو کی موٹی انگلیاں بینجو کے تاروں پر چلیں "ٹوائینگ۔ ٹوائینگ" کچھ دیر سُر ملانے کے بعد شامو نے آواز نکالی۔ آہ! وہ دلکش آواز! جو ہوا میں جادو کی لہریں پیدا کر دیتی تھی۔ جو سامعین پر خواب اور نشے کی سی کیفیت طاری کر دیتی تھی جس کے سحر آفریں پرد بم پر دل باہر کو آتا معلوم ہوتا تھا۔ در و دیوار، زمین و آسمان ہر چیز گم سُم ہو جاتی تھی۔ سوز و گداز سے لبریز، بلند اور نشیلی آواز نے حاضرین کے کانوں میں امرت ٹپکانا شروع کیا۔ یہ حضرت شامو جو عادتاً اس قدر "چپ" واقع ہوئے تھے، گاتے وقت اس حد تک چہکتے تھے کہ اپنے تن بدن کا ہوش کھو بیٹھتے تھے، اس قدر جھوم جھوم کر اور مست ہو ہو کر گاتے تھے کہ ہر سننے والا یہی خیال کرتا تھا کہ شامو کے دل میں ضرور عشق کا خار کھٹک رہا ہے!! بہرحال مامی کی فرمائش پر "ہو چلا" والی چیز شروع ہوئی جو شامو صاحب کا "شاہکار" تھی۔ گو یہ حضرت اردو سے ناآشنائے محض تھے لیکن اس غزل کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک اضافت کو ایسی صفائی اور سچائی سے ادا کر جاتے تھے گویا انہی کی غزل ہو۔

چہرہ مئے شباب سے گلنار ہو چلا فتنہ جو سو رہا تھا سو بیدار ہو چلا

پہلے ہی شعر پر سب کے سب دم بخود ہو گئے۔ سانس تک کی آواز نہ آتی تھی۔

دل آرزو کے نام سے بیزار ہو چلا۔

اُف! اتنے سے کے چڑھاؤ پر شامو کی آواز آسمان تک پہونچتی تھی! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دلوں میں کھب جانے والی آواز سننے والوں کو نیند میں بہنے والی موجوں کی طرح نہ معلوم کہاں بہائے لئے جا رہی ہو۔

دل آرزو کے نام سے بیزار ہو چلا دیوانہ اپنے کام میں ہوشیار ہو چلا
مدت کی مشق میں دلِ بیکس کا خونِ حق سب رفتہ رفتہ رنگِ رخِ یار ہو چلا
کچھ اس ادا سے عشق نے چھیڑا ربابِ غم جس نے سنا وہ غم کا طلبگار ہو چلا

سننے والوں میں سے سوائے شانتا کے کوئی بھی اتنا "ذوقِ سخن" نہ رکھتا تھا کہ ان اشعار کے معانی سمجھ سکتا۔ لیکن آواز کے جادو نے سب کو مبہوت و بیخود بنا رکھا تھا۔

اس عقلِ ہرزہ کار کو ٹھکرا کے آج میں پھر دامِ رنگ و بو میں گرفتار ہو چلا
اتنی اٹھائی ہیں غمِ حرماں کی لذتیں اب عرضِ مدعا بھی مجھے عار ......

مداخلت! زبردست مداخلت!! چھت پر زلزلہ سا آیا۔ بڑے دادا کسی کو بلا رہے تھے۔ لکڑی کے تختوں پر مسلسل کھٹکھٹاہٹ کے بعد ایک زبردست کھٹ!! (شامو کی طلبی کا اشارہ!)

خوبصورت پنچو اپنے رنگارنگ فیتوں سمیت امراؤ کے سر پہ گری اور شامو اپنی لمبی اور مضبوط ٹانگوں پر دوڑتا ہوا بڑے دادا کے زینے کی طرف لپکا۔

ساری دنیا کیلئے کمال حیرت کا مقام تھا کہ ایک ایک پیسے پر جان چھڑکنے والے بڑے دادا اپنے مزاج شناس "شامو کی پوشش کیلئے ایک بلینک" چیک لکھ دیں گے۔ یہی نہیں بلکہ مہندر کمار کو (جو ہمہ وقت جدید ترین فیشن کے چلتے پھرتے موڈل بنے رہتے تھے) اس نیک فرض پر مامور کریں گے کہ وہ شامو کیلئے بہترین قسم کے لباس فراہم کریں۔ حیرت سی حیرت تھی۔

* * * * * * * *

رینکن اور وائٹ اوے لیڈلا کے "خیاط خانے" شامو کی بارگاہ میں سر بسجود تھے۔ مشین، قینچیاں، سوئیاں، استریاں، اگر کسی کام میں مصروف تھیں تو شامو کے بھجن گا رہے تھے——— چابکدست ماسٹر ٹیلر نے شامو کے زبردست "ہرقلین" جسم کا ایک ایک حصہ اور سارے جوڑ توڑ ناپ ڈالے۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ اس "آپریشن" کے دوران میں شامو کا خوبصورت دہانہ ہزاروں مرتبہ بند ہو ہو کر کھلتا رہا۔

مہندر کمار کے لئے صرف "آرڈر" دینا ہی ایک مستقل عیش تھا۔ "گمن وِدھ دی ایوننگ۔ یس۔ سکس ڈنر جیکٹس اینڈ ٹیلز۔ تھری وائٹ ویسٹ کوٹ——— اینڈ ناؤ۔ یس۔ سکس لونج سوٹس۔ یس۔ ڈارک گرے فور دی مارننگ۔ اور بلیک۔ نو نو۔ ڈارک گرے۔ ول۔ سوفٹ کالرز فور دی لونج سوٹس۔ سے۔ اے ڈزن! یس۔ اینڈ ونگ کالرز فور دی ایوننگ——— آ۔ ناؤ۔ ون اور ٹو نیوی بلیوز——— اینڈ ون آف دس آلموسٹ المونیم۔ نو۔ نو۔ آئی ڈونٹ لائک ویٹ تھنڈر کلاؤڈ افیکٹ——— آہ یس۔ گڈ گریس!! تھری پیرز آف پمپس فور ز۔ ڈونٹ فرگٹ۔ فور پیرز آف گرے فلینلز اینڈ ہاف اے ڈزن آف وائٹ فلینلز۔ گاٹ اٹ؟ یس واٹ اباؤٹ ون آف یس۔ نو۔ نو۔ ول۔ شو می سم مور پیٹرنز.........."

(ہے بھگوان! شامو نے خیال کیا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ منوں اسباب میرے سر پر لاد دیں گے۔ ایشور مجھے بچا!) رنگ برنگ کے تھان گھسیٹے جا رہے تھے۔ کھولے جا رہے تھے۔ نچائے جا رہے تھے۔ گھورے جا رہے تھے۔ مسل مسل کر دیکھے جا رہے تھے اور پھر بحث۔ ردوکد۔ یہ نہیں وہ۔ وہ نہیں یہ——— (او۔ خدا!!)

"دی آل سلک انڈر ویرز۔ دی سلک پجامازود ھ پنک اینڈ گرین اسٹرائپس۔ دی سلک ساکس۔ دی ہیٹز۔ دی کیپس۔ دی بریسز۔ دی گلوز، دی ٹائیز۔ دی بٹنز——— (ہر دفعہ "دی" "دی"۔ گویا اس دنیا میں سوائے ان چیزوں کے اور کچھ تھا ہی نہیں——— دی بٹنز!!——— شامو کے نزدیک ایک بٹن صرف ایک بٹن ہی ہو سکتا تھا۔ کوئی گول سی چیز جسے ایک کاج میں اٹکا دیا جائے۔ لیکن ان لوگوں کیلئے "دی بٹنز" کا مسئلہ ایک مستقل آرٹ۔ ایک محتشم کلٹ اور ایک منظم قانون کی حیثیت رکھتا تھا!)

اور پھر——— "دی بوٹس اینڈ دی شوز!!۔

* * * * * * * *

اگلے اتوار کو شامو "دی آلموسٹ المونیم" والا سوٹ زیب تن کئے کھڑا نہیں تھا بلکہ نمائش کے لئے ایک پھرنے والی میز پر سرو قد

گھمایا جا رہا تھا۔

"بیوٹی فل — شاندار!!" حاضرینِ جلسہ نے یک زبان ہو کر کہا۔ یہاں "بیوٹی فل" سے مراد اُس کا حسین کسرتی جسم یا ونیس جیسا دہانہ نہیں بلکہ سرج کی ویسٹ کوٹ۔ خوبصورت ٹائی اور رومال۔ چمکدار جوتا اور دلکش فلیٹ کیپ!!۔

شامو کے پلنگ پر نیسٹ فیشنز کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ "دی ہیٹس اینڈ" "دی کیپس" کا پرا کا پرا وارڈروب کی چوٹی پر آویزاں تھا اور نچلے خانے میں "دی بوٹس اینڈ" "دی شوز" کی ایک چمکدار و رنگا رنگ فوج بیٹھی تھی۔

چمپا، شانتا، کسم، کرشن کماری اور بنواری دیدے پھاڑے گھور رہے تھے اور مہندر کمار ایک ایک چیز کی پوری تاریخ سُنا سُنا کر داد طلب کر رہے تھے —

"ٹھیرو شامو! دھکے نہ دو۔ ابھی ہم نے آدھی چیزیں بھی نہیں دیکھیں" چمپا نے "دی آل سلک پجامانز" و دھ پنک اینڈ گرین اسٹرائپس" کی موریوں کو جھنڈے کی طرح اُڑاتے ہوئے کہا — "یہ پجامے اپنے فینسی ڈریس میں پہنوں گی — کیوں شامو! دیدو گے نا؟"

لیکن شامو پر ایک نئی بپتا آپڑی — بڑے دادا نے سوائے فٹ بال کی جرسیوں اور کالج کے بلیزر کے شامو کے سارے پرانے کپڑے، دھوتیاں، اچکنیں، کوٹ، پیوند دار پتلونیں، غرض ہر وہ کپڑا جو شامو کو عزیز تھا بنواری کو "بخشش" کر دیا تھا۔ اور اب شامو کے لئے سوائے اسکے کوئی چارہ نہ تھا کہ انہیں "دی" کپڑوں کو پہنے۔ (ٹریجیڈی! شامو کا دل رو رہا تھا۔)

* * * * * * *

اُس رات شامو نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا — کیا دیکھتا ہے کہ جدید ملبوسات کی "دی" فوج نے چاروں طرف سے اُس پر دھاوا بول دیا۔ اور سب نے مل کر بیک وقت اُسے پہن ڈالا — دی آل سلک انڈرویر۔ دی آل سلک پجامانز — دی ہکس لونج سوٹس — دی ڈنر جیکٹس اینڈ دی ٹیلز۔ دی فلینلز۔ دی وائٹ فلینلز۔ دی آلموسٹ المونیم۔ سب کے سب اُس پر سوار ہو گئے۔ اور اُن سب کے اوپر دو عدد اوور کوٹ اور ان پر بیس سیر وزنی ڈریسنگ گون چڑھ گیا۔ سر پر دی ٹاپر۔ دی اوپرا۔ دی بولر۔ دی فلٹ کا ایک تعزیہ سا بنا معلوم ہوا۔ ہاتھوں پر ایک درجن کے قریب "دی" گلوز چڑھ گئے — اور ٹانگوں میں — آہ! ٹانگیں! جو اس وقت ہاتھی کا پاؤں معلوم ہو رہی تھیں — ان گنت پتلونیں — دی بگس — دی پجامانز — اور پچاسیوں جرابیں لپٹی ہوئی تھیں — شامو کا دم گھٹ رہا تھا۔ تن بدن کانپ رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ شامو نے چاہا کہ کسی کو آواز دے مگر گلے میں درجنوں کالروں اور ٹائیوں نے پھندا ڈال رکھا تھا — عین اُسی وقت بڑے دادا کی ڈانٹ سُنائی دی!۔

"مہا سُندری کو تلاش کر، اُس کے آگے جھک۔ گھٹنے ٹیک۔ سجدہ کر۔ اُسکی پوجا کر، ....!"

"جھکوں کیسے! بڑے دادا!" شامو نے چلا کر کہا۔ اور اُسکی آنکھ کھُل گئی!۔

(باقی باقی) ———— انصار ناصری۔ بی۔ اے دہلوی

شامو کی ایک فلم ایکٹریس سے ملاقات کا دلچسپ بیان اگلی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے۔

"ایڈیٹر"

" SAQI "



نواحہ سونیر

فسانۂ حیات

"لولہ مونیز"

ازجناب سیّد محمود مورخ بی۔ اے۔

عورت کی فطرت کا صحیح مطالعہ کرنا ایک حد تک غیر ممکن کام ہے۔ اس معمہ کو حل کرنے میں دُنیا کے نامور حکما، وفلاسفروں کو مُنہ کی کھانی پڑی ہے۔ خالقِ دوجہان نے عورت میں پردہ پوشی اور فریب کا وہ مادہ ودیعت کیا ہے کہ وہ اپنے راز کا اپنے ہر قت کے ساتھی اور دل وجان کے مالک کو بھی پتہ لگانے نہیں دیتی ہے۔ اُس کی ہر ادا اتراتی اور ہر فعل خاص موقعہ کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے ایک تبسم سے اپنے بدترین دشمن کو بھی اپنا غلام بے دام بنا سکتی ہے۔ اور عورت جس قدر زیادہ حسین ہوگی اُسی قدر زیادہ مغرور اور راز سربستہ ہوگی۔ حسین اور نیک سیرت عورتیں دُنیا میں شاذ ونادر ہی دیکھی جاتی ہیں۔ آئرلینڈ کی نامور حسینہ لولہ مونیز کی داستان حیات ان نظریات میں ایک زبردست دلیل ہے۔ اس نے مغربی ممالک کی تاریخ کی تشکیل میں نہایت اہم حصّہ لیا ہے۔ وہ ابتدا پیرس کی گلیوں اور کوچوں میں بھیک مانگتی ہوئی دیکھی گئی تھی۔ اور اُس وقت اُسکا ذریعہ معاش گانا بجانا تھا۔

وہ لنڈن سے نقل مکان کرکے پیرس گئی تھی۔ اُس کا شوہر ہندوستان کی فوج میں ایک معمولی افسر تھا۔ لولہ مونیز اسکے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اور کچھ عرصہ کے بعد اس سے نکاح کر لیا تھا لیکن جلد ہی اُس کے شوہر نے بذریعہ عدالت طلاق دیدی۔ شوہر کو کھو دینے کے بعد اُس نے لنڈن کے شاہی تھیٹر میں اسپینی ([illegible]) ناچ ناچا جس کی حاضرین نے بیحد تعریف کی۔ لیکن اسی وقت درجہ خاص کے ایک بکس میں سے جہاں لارڈ رینیلے بھی بیٹھا تھا لولہ کے خلاف آواز بلند ہوئی جس نے حاضرین کو متحیر کردیا۔ اور انھوں نے لارڈ رینیلے سے اس مظاہرہ کی وجہ دریافت کی۔ جواب میں لارڈ رینیلے نے کہا:-

"بیوقوفو!" لارڈ رینیلے نے باآوازِ بلند کہا۔ "وہ لولہ مونیز نہیں ہے بلکہ آئرلینڈ کی بیٹی جیمس نامی لڑکی ہے۔ میرے پیارے بھائیو ہمیں دھوکا دیا جارہا ہے"!

جیمس لولہ کے شوہر کا نام تھا۔ لیکن حاضرین کو یقین آگیا کہ انہیں واقعی دھوکا دیا جارہا ہے۔ اور اُنھوں نے اس قدر شور مچایا کہ لولہ غصّہ سے روتی ہوئی اسٹیج سے بھاگ کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ لارڈ رینیلے کے اس بزدلانہ حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ لولہ نے اُسے اپنا عاشق بنانے سے صاف انکار کردیا۔ اس نے اخبارات میں شائع کرایا کہ گو وہ لمرک کی فوجی بارکوں میں پیدا ہوئی تھی لیکن دراصل وہ سیوائل کی رہنے والی ہے۔ لارڈ رینیلے کے حملہ نے اس کی لنڈن کے اسٹیج پر مختصر زندگی کا خاتمہ کردیا۔ اور وہ وہاں سے برسلز چلی گئی۔ وہاں بھی اسے گوناگوں مصائب ومشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن وہ ان پر فتح حاصل کرنے میں بہت جلد کامیاب ہوگئی۔ لولہ کو دولتمند آدمیوں سے راہ ورسم پیدا کرنے کا سودا تھا۔ اور ایک ایسے ہی مالدار آدمی نے اُسے برلن پہنچا دیا۔ یہ سنہ ۱۸۴۳ء کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اس کا اخبارات میں چرچا ہونے لگا۔ اور مغربی دُنیا کا ہر اخبار اس کے متعلق ہر خبر کو آب وتاب سے شائع کرنے لگا۔

لولہ مونیز کو برلن میں رہتے کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ اُس کی قسمتِ خفتہ جاگ اُٹھی۔ اِنہی ایام میں جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ولیم چہارم نے اپنے داماد شاہ نکولس زار روس کے اعزاز میں جلسہ رقص وسرود منعقد کیا جس میں رقص کرنے کی

تولہ مونیبر کو دعوت دی گئی۔ تولہ نے فن رقص میں اپنے کمال کا اس عمدگی سے مظاہرہ کیا کہ زار بہت خوش ہوا۔ اُس سے تولہ کی شہرت کو پر لگ گئے اور اُس کی قسمت کا ستارہ اوج و ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا۔ اس کے چند روز بعد شاہ جرمنی اور زار روس کے اعزاز میں جو فوجی پریڈ ہوئی اُس میں تولہ عمدہ نسل کے گھوڑے پر سوار ہوکر شریک ہوئی۔ جلسے کے دوران میں گھوڑا اسے خاندان شاہی کے افراد کے قریب اُس وقت لے گیا جبکہ سلامی دی جا رہی تھی۔ پولیس والوں نے اس کی اس جرأت سے ناراض ہوکر اسے وہاں سے بھگا دینے کے لئے شور مچانا اور بے نقط سنانی شروع کر دیں اور ان میں سے ایک نے کود کر گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ یہ دیکھکر تولہ کو بھی غصہ آگیا اور اُس نے چابک سے اُس پولیس مین کو زخمی کر دیا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن صبح سویرے "باوردی پولیس مین" کی توہین کے جرم میں سمن کی تعمیل کرائی گئی۔ برلن کی فضا اس کے لئے بیحد گرم ہوگئی۔ اس لئے اسے مجبوراً اپنا سامان باندھ کر وہاں سے کوچ کرنا پڑا۔ راستے میں وہ چند روز کے لئے ڈریسڈن (Dresden) ٹھیر گئی۔ وہاں اس کی اُس زمانہ کے مشہور گویئے فرانز لیسنر سے ملاقات ہوئی۔ اور کچھ عرصہ تک یکجا رہنے کے سبب نسبت کی بنیاد پڑی اور وہ دونوں یک جان و دو قالب ہوگئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد موسم گرما میں یادگار بیتھوون (Beethoven) کی نقاب کشائی کے موقعہ پر فرانز کو بمقام بون جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس جلسہ میں ملکہ وکٹوریہ، شہزادہ البرٹ اور خاندان شاہی کے دیگر افراد بھی شامل ہوئے۔ حاضرین جلسہ نے بدنام تولہ کو پہچان لیا اور جب استقبالیہ کمیٹی کو اُس کی اس جگہ موجودگی کا علم ہوا تو وہ اس قدر ناراض ہوئی کہ انھوں نے حکم دیدیا کہ تولہ کو معزز مہمانوں میں ٹھہرنے نہ دیا جائے۔ لیکن تولہ ان حوصلہ شکن باتوں سے ذرا بھی نہ گھبرائی۔ اس نے بعد غور و فکر ان بندشوں پر فتح پانے کی ایک نہایت لاجواب تدبیر سوچی۔ ابھی تقریریں ہی ہو رہی تھیں کہ تولہ لوگوں کو دھکیلتی ہوئی کمرۂ رقص میں جا گھسی اور میز پر چڑھکر اس حسن و خوبی سے ناچی کہ اپنے بدترین مخالفین کو بھی خوش کرکے اپنا طرفدار بنالیا۔

تولہ اور فرانز ایک شہر سے دوسرے شہر مارے مارے پھرتے رہے لیکن مخالفین نے انہیں کہیں دم نہ لینے دیا۔ اسکے علاوہ تولہ نے فرانز کو اس قدر تنگ کیا کہ وہ اس سے عاجز آگیا۔ آخر اُس نے فرار ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک شہر میں جبکہ وہ ایک ہوٹل میں مقیم تھا فرانز کو موقعہ مل گیا۔ اُس نے ہوٹل کے قلی کے ساتھ سازش کرکے تولہ کو تو ایک کمرہ میں بند کر دیا۔ اور اپنا پتہ بتائے بغیر وہاں سے رفو چکر ہوگیا۔ جب تولہ کو اپنے عاشق کے فرار کا حال معلوم ہوا تو وہ بارہ گھنٹے اُدھم مچاتی رہی اور جو چیز اُس کے ہاتھ لگی توڑ پھوڑ ڈالی۔ فرانز کو اس کی اس روش کا حال معلوم تھا اس لئے اُس نے پہلے سے ہی ان کی قیمت ادا کر دی تھی۔

اس کے بعد تولہ ایک عرصہ تک خانما برباددں کی طرح شہروں کی خاک چھانتی اور مختلف طبیعتوں کے مردوں سے تعلقات پیدا کرکے منقطع کرتی رہی۔ آخر اُس نے کسی شہزادے کو پھانس لینے کا فیصلہ کیا اور اپنے اس ارادے سے فرانس کے زندہ جاوید ناولسٹ الگزنڈر ڈیوما کو مطلع کر دیا۔ جیسے کہ آجکل ہندوستان میں ریاستوں کے حکمرانوں، بے ملک نوابوں اور تعلقداروں کی افراط ہے بالکل اسی طرح اُس وقت جرمنی میں شہزادوں کی افراط تھی۔ وہ پیرس سے (جہاں اُس کا ایک پرستار ڈبول لڑتے ہوئے مارا گیا تھا) جرمنی گئی۔ ایک یا دو مرتبہ ناکام رہنے کے بعد (کیونکہ وہ بڑے موٹے شکار کی تلاش میں تھی) آخر تولہ

اپنے شہزادے کو پھانسنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ وہ بویریہ کا حکمران لڈوگ اوّل تھا۔ وہ علوم و فنون کا مربی و سرپرست اور خود شاعر تھا اور گو اُسے شاعری میں معمولی سا درجہ بھی حاصل نہ تھا۔ لیکن وہ حکمران تھا، وہ پہلی ہی ملاقات کے موقعہ پر لولہ کے دامِ زلف میں گرفتار ہو گیا۔

"معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے؟" لڈوگ نے کہا۔ "مجھ پر ضرور سحر کر دیا گیا ہے"۔

تعارف ہونے سے پانچ دن کے بعد لڈوگ نے بہ اعلان کر کے اپنے دربار کے ملازمین کو متحیر کر دیا کہ "حضرات میں آپ سے اپنی بہترین دوست کا تعارف کراتا ہوں۔ خیال رکھنا کہ اسکی ہر ممکن طریقہ سے عزت کی جائے"۔ اس وقت لولہ کی عمر ۲۷ سال تھی وہ حسین تھی، ایک ادیب کے بیان کے مطابق وہ مجسم ترغیب تھی اور دوسرے ادیب کے خیال میں وہ گستاخ اور بے حیا تھی۔ لڈوگ جو صنفِ نازک کے حُسن کا پرستار تھا اسیر لولہ کے حُسن کا جادو چل گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے لسے عشق کی گولیاں کھلا دی ہیں اور وہ اُس کی خاطر اپنی ہستی سے بے نیاز ہو گیا۔ دُنیا کو بھول گیا اور یہاں تک کہ اپنے شاہی وقار کو بھی فراموش کر بیٹھا، لولہ نہ صرف ایک حکمران کو اپنے دامِ زلف میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی بلکہ اُس نے ایک ساٹھ سالہ بُوڑھے کو سولہ برس کا نوجوان بنا دیا تھا۔

لڈوگ نے اظہارِ محبت کے لئے لولہ کے واسطے ایک نہایت عالیشان محل تعمیر کروایا۔ شاہ کی دولت اور لولہ کی نفاست پسندی کے سبب سے بہت ہی خوبصورت محل تعمیر ہوا جس کی غیر ملکی اخبار نویسوں نے بہت تعریف کی۔

"ملکہ کو بھی اس سے بہتر محل نہیں مل سکتا ہے"۔ لولہ نے انتہائی مسرت سے کہا۔

"تم میری ملکہ ہو"۔ تیرِ نظر کے گھائل لڈوگ نے جواب دیا۔

ان دونوں کے عشق کی داستان کا بہت جلد دور و نزدیک چرچا ہو گیا۔ لیکن مجلس وزراء کو یہ تعلقات پسند نہ تھے۔ اس لئے لولہ کی اعلانیہ توہین کی جاتی تھی۔ جب کبھی وہ کسی تھیٹر میں جاتی تو لوگ اُسکے قریب والی نشستوں کو خالی کر دیتے تھے۔ لوگوں نے اسے میونخ (München) سے چلے جانے پر مجبور کرنے کیلئے بہتیرے طریقے اختیار کئے۔ گمنام خطوط بھیجے۔ دھمکیاں دیں اور یہاں تک لکھ دیا کہ اسے لارڈ پامرسٹن (Lord Palmerston) نے انگلستان سے بویریا اسلئے بھیجا ہے کہ کیتھولک مذہب کو تباہ کر دے۔ آخر آرچ بشپ کو اس معاملہ میں دخل دینا پڑا۔ لیکن لڈوگ نے اُسے نہایت خشک جواب دیا کہ "تم اپنی مذہبی باتوں سے سروکار رکھو اور میں لولہ سے"۔

لولہ ایک مدت تک "بادشاہ بیگم" کا پارٹ بڑی کامیابی سے کھیلتی رہی۔ وہ کبھی کبھی اپنے دستخط کے ساتھ "بادشاہ کی مسٹرس" بھی لکھ دیتی تھی، لڈوگ کو یہ بات بُری معلوم ہوئی اور اُس نے لولہ کو اس حرکت سے باز رکھنے کی سعی کی۔ یہ بات لولہ نے مان لی۔ اور شاہ کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن اس کے عوض میں لڈوگ سے عجیب مطالبہ کیا۔ اُس نے کہا کہ:۔

"بادشاہ کی منظورِ نظر ہونے کے باعث میرا مرتبہ مجھے حق دیتا ہے کہ میں ایک پادری کی خدمات حاصل کروں جس کے سامنے میں اپنے گناہوں کا اقبال کروں اور اس غرض کیلئے ایک پرائیویٹ گرجا تعمیر کرایا جائے"۔

لڈوگ تو اس تجویز سے متفق ہو گیا لیکن کسی پادری نے مجوزہ خدمات منظور نہ کیں۔ کیونکہ اُن کو ڈر تھا کہ گناہ آلودہ کے

ساتھ رہکر ان کا دامن بھی داغدار ہو جائیگا۔ اس لئے وہ بہ قیام ہوش و حواس ایسی غلطی کس طرح کر سکتے تھے۔ پادری لوگ اس تجویز سے بیحد ناراض ہوئے۔ اُنکے طبقہ میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی اور اُنھوں نے اس مطالبہ کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک مقرّرہ دن مظاہرہ کیا۔ اسپر لڈوگ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ تحریری اعلان کیا کہ اُس نے توآ مونٹیز کی آخری خواہش یا مطالبہ کو کبھی دل سے منظور نہیں کیا تھا۔ اِس تحریر کے جواب میں ایک غیر جانبدار اور بے خوف مبصر نے طنزاً کہا کہ "یہی تو تمہاری بیوقوفی کی سب سے بڑی دلیل ہے"۔

گو توآ کی وجہ سے بادشاہ اور ریاست بوبیریا کی حکومت کے مابین جنگ جاری تھی لیکن دربار میں توآ کا اقتدار بڑھتا ہی گیا۔ مجلس وزرا نے اُسے اپنے ساتھ ملا لینے کی سعی کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ اس کے بعد اُنھوں نے اسے نقل وطن کر جانے کے لئے گرانبہا رشوتیں پیش کیں مگر لاحاصل۔ اس کا توآ نے یہ جواب دیا کہ "میں بوبیریا اس وقت چھوڑونگی جب ایسا کرنا مناسب و موزوں ہوگا۔ اور اس سے پیشتر ہرگز نہیں"۔

حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ لوگوں نے غصّہ اور جوش کی حالت میں سڑکوں پر مظاہرے کئے۔ بلوے کئے اور توآ کے محل کے باہر اُودھم مچایا۔ کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ لیکن اس دوران میں توآ نہایت اطمینان کے ساتھ محل کی چھت پر کھڑی شراب پیتی اور کھانڈ کے کھلونے مظاہرہ کرنے والے ہجوم پر پھینکتی رہی۔ ایک مرتبہ لڈوگ اپنے شاہی وقار اور غرور و تمکنت کو بالائے طاق رکھکر توآ کو بچانے کے لئے ہجوم میں جا گھسا۔ جہاں تک بادشاہ کا تعلق ہے توآ کا اثر اور اقتدار یہاں تک بڑھگیا کہ اُسے امرا کے طبقہ میں داخل کرلیا اور کاؤنٹس آف لینڈسفیلڈ کا خطاب عطا کیا۔ توآ نے بھی اُمرا کی طرح جلسے ہائے رقص و سرود بڑی کامیابی کے ساتھ منعقد کئے۔

لیکن آخر حالت اسقدر نازک ہوگئی کہ لڈوگ بھی اُسپر قابو نہ پاسکا۔ اور توآ کو نقل وطن کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لڈوگ کو مجبوراً ایک اعلان پر دستخط کرنے پڑے جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر توآ حدود بوبیریا میں پائی جائے تو فوراً گرفتار کرلی جائے۔ اسکے تھوڑے ہی دنوں بعد لڈوگ کو تخت شاہی سے محروم کردیا گیا۔

اب پھر توآ نے آوارہ گردی اختیار کی۔ وہ پیرس سے لنڈن۔ اور وہاں سے امریکہ اور آسٹریلیا کے اُن علاقوں میں گئی جہاں کان کنی کا کام ہوتا ہے۔ وہ ہر جگہ ایکٹنگ کرتی۔ لیکچر دیتی۔ ہنگامے برپا کرتی اور لرزہ خیز حالات پیدا کرتی رہی۔ اِسکے بعد وہ ناگہاں تارک الدُنیا ہوگئی اور آرائش و زیبائش اور فخر و غرور کو خیرآباد کہہ دیا۔ قلب کی تسکین کے لئے مذہب کی طرف رجوع کیا۔ اُسکے خیالات میں جو انقلاب رونما ہوا وہ حقیقی اور صادق تھا۔ اس نے گمراہ عورتوں کی مدد کرنے کی سعی کی۔ لیکن جن لوگوں نے اسکی فیاضی سے فائدہ اٹھایا اُنھوں نے اُسے اچھا نہ سمجھا۔ اُسکے دوستوں نے اُس سے تمام تعلقات منقطع کرلئے۔ اُس کے حسن کو زوال آگیا اور ۱۸۶۱ء میں وہ مہلک بیماری میں مبتلا ہوگئی۔ اُس نے بستر مرگ پر بیٹھے ہوئے دیوار کی طرف رُخ کرکے کہا۔ کہ "میں زندگی سے سیر ہوچکی ہوں"۔ اور اُسکے ساتھ ہی اُسکی روح قالب عنصری کو چھوڑ کر عالم جاودانی کو کوچ کرگئی۔

سیّد محمود مورخ۔ بی۔ اے

تجدید حیات

از جناب صادق الخیری صاحب بی۔ اے۔ بنوی

صبح ہو چکی تھی ـــــ

کسان، اپنے خیالات میں مگن، ہل چلا رہے تھے اور تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک دوشیزہ دوسری عورتوں کے ساتھ کھیتوں میں بیج ڈال رہی تھی۔

"کرسٹینا! او کرسٹینا! ارے کدھر چلی گئی؟ بوڑھی خادمہ نے ہانپتے ہوئے چیخ کر پکارا۔" "آئی ماں!" دوشیزہ نے دور ہی سے جواب دیا اور اس کے پاس آ گئی۔

"اری!" خادمہ نے ذرا غصہ سے اور محبت سے کہا "تو اپنا بچپن نہ چھوڑیگی؟ میں نے تجھ سے صبح ہی کہہ دیا تھا کہ کاؤنٹ انٹونیو اپنی خالہ سے ملنے آئے ہیں — بہت عرصہ کے بعد — اس لئے سب لوگ ان کا استقبال کریں گے اور ہر شخص کچھ نہ کچھ تحفے بھی پیش کریگا تو نے کیا تیاری کی؟"

"ماں! کرسٹینا نے بھول پن سے کہا" کاؤنٹ آج ہی آئیں گے؟"

"اور کیا! یہی تو کہہ رہی ہوں، بس اب آتے ہی ہوں گے، جلدی گھر چلی چل۔ ہاں! جب وہ گھر میں داخل ہوں تو ان کے پاس جا کر کہیو "آقا! میں آپ کے قربان!" پھر کوئی تحفہ ان کی نذر کر دیجیو۔ خبردار! کوئی طفلانہ حرکت سرزد نہ ہو۔"

"ماں! کاؤنٹ تو بہت بڑے ہوگئے ہوں گے" کرسٹینا نے بوڑھی خادمہ کی ہدایات سُنی ان سُنی کر کے کہا" وہ تو بڑے دنوں بعد آ رہے ہیں۔ جب ہم دونوں بچپن میں ساتھ کھیلتے تھے......"

"چپکی رہ!" خادمہ بولی"...... اپنی باتوں کو چھوڑ! بیٹی! کاؤنٹ بہت بڑے آدمی ہیں، بس اب چل"

(۲)

دونوں خالائیں اپنے بھانجے کاؤنٹ انٹونیو سے ملکر بہت خوش ہوئیں اور جاگیر کے تمام رہنے والوں نے اس کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا۔ بوڑھی خادمہ نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر کرسٹینا کہیں نہ تھی۔ ماں دل ہی دل میں بڑبڑانے لگی۔ کاؤنٹ اپنی خالاؤں کے ساتھ محل میں چلا گیا اور دفعتاً اس کی نگاہ ایک الھڑ دوشیزہ پر پڑی۔ وہ سفید اور سادے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اور اس کے سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے معصوم چہرے سے بھول پن برستا تھا اور وہ سادگی اور حُسن کی پوٹ معلوم ہوتی تھی۔ کاؤنٹ اُسے دیکھ کر فوراً بول اُٹھا "کرسٹینا! خالہ یہ تو اب بڑی ہوگئی!"

کرسٹینا اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اس نے نہ کوئی خاص تحفہ پیش کیا اور نہ اس کی آمد کی خوشی میں زبان سے کچھ کہا اتنی دیر میں خادمہ اندر آ گئی۔ کرسٹینا کو یوں دیکھ کر کان میں بولی "مؤدب ہو جا!"

کرسٹینا نے کاؤنٹ کے آگے احتراماً سر جھکا دیا۔

انٹونیو بچپن میں کرسٹینا کے ساتھ کھیلتا تھا۔ ہوش سنبھالنے پر اپنے آبائی پیشہ میں مہارت حاصل کرنے کے لئے فوج میں داخل ہونے چلا گیا اور اب عرصۂ دراز کے بعد یہاں آیا تھا۔ خالاؤں اور دوسرے لوگوں سے مل کر وہ محل کے باہر احاطہ میں چلا گیا۔

کرسٹینا دودھ دوہ رہی تھی۔

"کرسٹینا!" انٹونیو نے اُس کی طرف بڑھتے ہوئے آواز دی۔ "انٹونیو — میں کاؤنٹ انٹونیو!..... بھول گئی معاف کیجیے" کرسٹینا نے جرم کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ ہیں —" وہ اس کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا "انٹونیو ہی کہو۔ کیا میں اب بھی تمہیں یاد ہوں کرسٹینا!"

کرسٹینا نے انٹونیو کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آہستہ سے بولی "کیا میں تمہیں کبھی بھول سکتی ہوں..... میں یہ سمجھتی تھی کہ تم اب بڑے ہو کر — کاؤنٹ اور فوج کے اعلیٰ افسر ہو کر — مجھے اپنے ذہن سے بھی محو کر دو گے۔"

"ہرگز نہیں کرسٹینا —" انٹونیو نے کرسٹینا کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

انٹونیو وہاں چند روز رہا اس دوران میں بچپن کے وہ نقوش جو جوانی میں مدہم سے ہو گئے تھے از سرِ نو تازہ ہو گئے۔ رخصت ختم ہونے کی وجہ سے انٹونیو کو جلد واپس جانا تھا اس لئے اس نے ارادہ ظاہر کر دیا کہ وہ کل صبح کو روانہ ہو جائیگا۔

مملکتِ آسمانی پر ضو فشاں حکمراں جلوہ فگن تھا۔ چاندنی رات تھی اور پُر سکون خاموشی۔ ہر طرف حسین و جمیل گل بوٹے اپنی بہار دکھا رہے تھے اور کہیں دور بلبلِ رنگین نوا اپنی نغمہ سنجی میں مصروف تھا۔ ایک گوشۂ تنہائی میں انٹونیو اور کرسٹینا معصوم باتوں میں مصروف تھے اور جب دو قلب مائل بہ گفتگو ہوں تو ان کے الفاظ ہی کیا!

"میں صبح چلا جاؤں گا!" انٹونیو نے اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے ملتے ہوئے کہا۔ "پھر کب آؤ گے —؟" کرسٹینا اس کے سینہ پر سر رکھ کر بولی۔

"آنا تو میں بہت ہی عرصہ بعد مگر اب شاید جلدی ....." اس نے اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"جلدی کیوں؟" کرسٹینا ذرا شرارتاً بولی۔

"کیا تم اس قدر انجان ہو؟ نہیں تم جانتی ہو کرسٹینا!" انٹونیو نے پھولوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں جانتی ہوں انٹونیو! تم جلدی آنا..... میں تمہارا بے چینی سے انتظار کروں گی۔" وہ اس کی آنکھوں کو تکتے ہوئے بولی۔

کرسٹینا نے پاس سے نازک پنکھڑیوں کا ایک خوشنما پھول توڑا اور اُسے پیش کرتے ہوئے کہا "انٹونیو اس کا نام جانتے ہو؟"

"مجھے بھول نا نہیں" — یہ اس کا نام ہے۔" انٹونیو نے پھول لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں انٹونیو!..... اور اسی کو میرا پیغام سمجھو!" کہہ کر کرسٹینا نے دوسری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

(۳)

انٹونیو کی طویل جُدائی کے ساتھ ساتھ کرسٹینا کا انتظار روز بروز ترقی پذیر ہوتا گیا۔

ایک دن کرسٹینا نے اپنی ماں سے پوچھا "اماں! کاؤنٹ اب کب آئیں گے؟" بوڑھی خادمہ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں وہ جھلا کر بولی "مجھے کیا معلوم؟ آئیں بہت دنوں بعد۔ ہاں میں ایک بات بھول ہی گئی تھی، دیکھ کرسٹینا! تو کاؤنٹ سے زیادہ گھل مل کر باتیں نہ کیا کر، بچپن کا زمانہ اور ہوتا ہے اب تو بھی بڑی ہو گئی ہے اور بڑی خالہ اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتیں۔"

بات گئی گذری ہوئی مگر خالہ کی ٹیڑھی نظر کرسٹینا کے لیے پریشان کُن تھی۔

چند ماہ بعد خلافِ توقع انٹونیو خالہ سے ملنے پھر آیا۔ اس کا عہدہ بڑھا دیا گیا تھا اور اسی خوشی میں اس کو رخصت آسانی سے مل گئی۔ خوب خوشیاں منائی گئیں اور لوگوں نے کاؤنٹ کا بڑا شاندار استقبال کیا۔ انٹونیو کی نگاہیں بڑے تجسس کے بعد کرسٹینا کو پا سکیں۔ وہ اور بھی زیادہ حسین معلوم ہوتی تھی اور اس کی روزافزوں خوبصورتی نے کاؤنٹ کو اور بھی مسحور کر لیا تھا۔

دن بھر وہ دوسرے مشاغل میں مصروف رہا اور رات کو بمشکل تمام چھٹکارا پا کر وہ سونے کے کمرے میں جا سکا۔ وہاں وہ آرام کرنے کی غرض سے نہیں گیا تھا بلکہ اس لئے کہ قدرے سکون میسر آسکے اور گھر والے نیند میں مدہوش دنیا و مافیہا سے بے خبر سو جائیں۔

کرسٹینا اپنے بستر پر بیٹھی رہی۔ نیند جو اُسے لیٹ جانے پر مجبور کرتی، اُس سے کوسوں دور تھی۔ اندر سے تحکمانہ لہجے میں آواز آئی "کرسٹینا! روشنی گل کر دو!"

روشنی گل ہو گئی مگر وہ پھر بھی بیٹھی رہی اور اس کی نگاہیں کھڑکی میں سے بھیگے ہوئے درختوں کو دیکھنے لگیں۔

برسات کی رت تھی اور نیلے آسمان پر چاند ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی دھلا ہوا حسین مکھڑا۔ وہ چاند کو دیکھتی رہی اور اس کا دل خیالات میں اُلجھا رہا۔ کسی نے آہستے سے پکارا "کرسٹینا!" مگر وہ سُن نہ سکی۔ چند لمحات کے بعد اُس کی نظر کھڑکی پر واپس آئی تو اس نے انٹونیو کو سامنے کھڑے ہوئے دیکھا۔

وہ بیتاب ہو کر آگے بڑھی اور اس کے ہاتھ کو بوسوں سے بھگو دیا۔ "آؤ باہر آجاؤ — وہاں چلے چلیں، ممکن ہے یہاں کوئی جاگ اُٹھے" انٹونیو نے کرسٹینا کو باہر آنے میں مدد دیتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں محل سے نکل کر تھوڑے فاصلے پر چلے گئے اور وہاں باتیں کرتے رہے۔ یکایک چاند بدلی میں چھپ گیا اور اودی اودی گھٹائیں چاروں طرف سے اُٹھ اُٹھ کر سروں پر جھومنے لگیں۔ بجلیاں کوندنے لگیں اور بادل گرجنے لگے۔ لیلئ شب کا چہرہ خوفناک فضا سے تاریک ہو گیا۔ پُرسکون چاندنی رات خوفناک تاریکی میں بدل گئی۔ ایسی راتوں میں جبکہ شیطانی رغبتیں مائل بہ معصیت ہوں، فضائے بسیط اکثر لرز جاتی ہے اور انسانی سیاہ کاریوں کی ہیبتناک کارروائیاں تاریکی کے پردے میں جب معصومیت کا خون کرتی ہیں تو اُس وقت بادل بھی رونے لگتے ہیں۔ انٹونیو کے سر پر شیطانی بجلیاں کوند رہی تھیں اور حیوانی بدلیاں چھا رہی تھیں۔ ہیبتناک معصیت نے قرب جوار کی تاریک فضا کو سیاہ کاری میں ملفوف کر لیا تھا۔ وہ کرسٹینا کو آغوش میں لے لینے کے لئے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے آگے بڑھا۔

کرسٹینا بیچارگی سے بولی "نہیں — نہیں انٹونیو!"

"کیا تم بدل گئی ہو! — میں نہ کہتا تھا کہ تم مجھے بھول جاؤ گی، تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے" وہ والہانہ انداز میں کہنے لگا۔

"نہیں انٹونیو — میں بدلی نہیں، میں تمہیں چاہتی ہوں" کمزور عورت قوی مرد کے آگے بے بس ہو کر بولی۔

لیلئ شب ایسی ہی انسانی سیاہ کاریوں سے لرز اُٹھتی ہے۔ جب مجبور و معصوم عورت محبت کے دھوکے میں مرد کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دے۔

صبح ہوتے ہی انٹونیو کرسٹینا کے نام دس ہزار کا چیک دیکر چلا گیا۔ کرسٹینا کو کسی نے بیدار کیا، وہ نیند کی ماتی محبت کا خواب دیکھ رہی تھی۔ جھنجوڑنے سے وہ دفعتہً اُٹھ بیٹھی اور یہ سُن کر بڑی متعجب و مغموم ہوئی کہ انٹونیو جا چکا ہے۔ چیک دیکھ کر اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس نے غصے میں چیک کے پُرزے پُرزے کر دیئے اور غیظ و تحیّر سے مغلوب ہو کر کہنے لگی "انٹونیو! میں تمہاری محبت کی بھوکی ہوں، دولت کی نہیں!"

(۴)

وقت کے ساتھ ساتھ ماں بننے کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔ معصوم کرسٹینا خود اپنی حالت سے مجبور و متنفر تھی اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرح عورت اپنے گناہ نہیں چھپا سکتی۔ خالہ کی آتش غضب اور بھی بھڑک اُٹھی اور جوں جوں بچے کی پیدائش کا وقت قریب آتا گیا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی رہتی۔

ایک دن خالہ نے کرسٹینا کو تنہائی میں بُلایا اور دیر تک ڈانٹتی رہی لیکن کرسٹینا سوائے دم بخود ہو بیٹھے رہنے کے کیا کر سکتی تھی۔ خالہ غصّہ سے بے قابو ہو کر بولی "ہماری بدنامی ہو جائیگی۔ آج انٹونیو یہاں سے گذریگا، اگر اس کو علم ہو گیا تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ اس گناہ کے بار کو دوسروں کے سر کیوں تھوپتی ہو۔ تمہارے لئے وہ دس ہزار روپے کافی ہوں گے، تم آج ہی یہاں سے چلی جاؤ۔"

گھر سے نکلنے کا حکم کرسٹینا کے لئے پریشانی اور مصیبت میں ایک اور اضافہ تھا۔ اس نے اپنی ماں سے رو رو کر تمام حال کہہ دیا۔ دفعتہً اس کی پُرنم آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیوں؟" ضعیف ماں نے خون کے آنسو روتے ہوئے پوچھا۔ "ماں!" وہ بولی "میں اسٹیشن پر جا رہی ہوں انٹونیو کو لوٹا لونگی"۔

"کیا دیوانی ہو رہی ہو؟ تو بھول گئی وہ کاؤنٹ ہے اور تو خادمہ کی بیٹی!" اس نے اپنی بیچارگی اور بیکسی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

کرسٹینا بغیر کچھ سُنے اسٹیشن روانہ ہو گئی۔

دھواں دھار پانی پڑ رہا تھا۔ گاڑی آئی اور آہستہ آہستہ چلنے بھی لگی مگر کرسٹینا کی متجسس نگاہیں انٹونیو کو نہ پا سکیں۔ وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتی رہی، یکایک اس کی نگاہ انٹونیو پر پڑی جو اپنے دوستوں کے ہمراہ کھانے پینے اور قہقہوں میں مصروف تھا۔ کرسٹینا نے چیخ کر آواز دی مگر کھڑکی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ ساتھ ساتھ بھاگتی رہی مگر اس کی آوازیں فضا ہی میں منتشر ہوتی گئیں۔ گاڑی نکل گئی اور کرسٹینا ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ آسمان عورت کے حالِ زار پر لگاتار آنسو بہاتا رہا۔

بچہ پیدا ہوا اور مر گیا۔ خادمہ اور اس کی بیٹی بچّہ کو دفن کرنے قبرستان لے گئے۔ بچّہ کے تابوت کو زمین کی تاریک گہرائی میں اُتار دیا گیا، لیکن پیشتر اس سے کہ بوڑھی خادمہ اس پر مٹی ڈالنی شروع کرتی کرسٹینا — جو خود غرض مرد کی نفسانیت کو محبت سمجھ کر اس پر قربان ہوئی — والہانہ انداز میں بیتاب ہو کر تابوت سے لپٹ گئی "اے ماں!" وہ اپنے گناہوں پر آنسو بہاتی ہوئی بولی "— یہ معصوم بچہ . . . !"

اس عورت کے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں جو ایک ناجائز بچّہ کی ماں ہو۔ یہ نام نہاد سماج، فریب خوردہ عورت کے گناہ دھو دینے کی بجائے اُسے وہ دھتکار دیتی ہے۔ کرسٹینا کو بہر حال زندہ رہنا تھا اس لئے جب چاروں طرف سے اس

پھٹکار برسائی گئی، اس نے اس طرف رخ کیا جہاں انسانیت شرم کے مارے ملامت سے اپنا چہرہ چھپالیتی ہے ــ کرسٹنیا ایک حسن فروش بن گئی۔

اس واقعے کو کئی برس گذرے اور اس عرصے میں انٹونیو، جیوری کا رکن بنادیا گیا۔

عدالت میں قتل کا ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں دو ملزموں کے ساتھ ایک عورت بھی ماخوذ تھی۔ اس کے بھولے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیشتر رعنائی کھوچکی ہے۔ جرح اور اصرار پر اس نے کہا "میں اپنے آپ کو بے قصور سمجھتی ہوں۔ مجھے واقعات کا صحیح علم بالکل نہیں۔ مجھ سے ایک معمر عورت نے کہا تھا کہ مقتول کو یہ سفوف کھلادو جس سے وہ بے خبر ہوجائیگا اور اس طرح ہم حصولِ زر میں کامیاب ہوجائیں گے۔ مجھے بالکل خبر نہیں کہ وہ سفوف درحقیقت زہر تھا"

عدالت کے ایک اور سوال کے جواب میں اس نے رو کر کہا "ــ میرا پہلا نام کرسٹنیا تھا ــ"

جج نے حکم دیا کہ اراکین جیوری اپنے فیصلے سے مطلع کریں۔

انٹونیو نے جب کرسٹنیا کا نام سنا، وہ مختل الحواس ہوگیا۔ وہ اُسے بھول چکا تھا کیونکہ شاہی زندگی اور جج کی بیٹی سے معاشقہ نے اس کے لئے دُنیا ہی دوسری بنادی تھی مگر کرسٹنیا کے نام نے گذری ہوئی باتیں پھر یاد دلادیں۔ اس نے دوسرے اراکین کو اس کی بیگناہی پر ترغیب دینے کی انتہائی کوشش کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ وہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جرم اگرچہ عمداً نہیں کیا گیا مگر کرسٹنا سے سرزد ضرور ہوا ہے۔

عدالت نے فیصلہ دیا کہ کرسٹنیا کو پانچ سال کے لئے سائبیریا میں قید بامشقت کی سزا دی جائے۔

(۵)

انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی تقصیر کے لئے بے تحاشا آنسو بہانے لگتا ہے۔ دل کا خون آنسو بن کر پاپ کے پاپ دھونے کی کوشش کرتا ہے اور حیوانی رغبتیں مائل بہ عبودیت ہوتی ہیں۔ انٹونیو کے خیالات میں ہیجان برپا تھا اور اس کا ضمیر اس کے روئیں روئیں کو ملامت کی آگ میں جلا رہا تھا۔ گذری ہوئی باتیں اور مدھم پڑے ہوئے نقوش ذہن کی سطح پر اُبھر رہے تھے۔ کرسٹنیا کی معصوم صورت اس کے سامنے بار بار آرہی تھی اور وہ ایسا محسوس کررہا تھا گویا کرسٹنیا کی تباہ حالی کا وہی ذمہ دار ہے۔ برف سے ملفوف فضا، سائبیریا کی سردی جہاں سانس لینا بھی مشکل ہے وہاں عورت کے کمزور ہاتھ کیسے کام کریں گے؟ یہ خیالات نشتر بن کر اس کے دل کو چھلنی کررہے تھے۔ قیدی سائبیریا جانے والے تھے، رشتہ داروں کو ملنے کی اجازت دے دی گئی۔۔

ایک اژدھام تھا اور شور وغل کا طوفان کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مجرم اپنے بے شمار رشتہ داروں سے مل رہے تھے، ہر طرف آہ وبکا کا دور دورہ تھا۔ کہیں بیٹا جدا ہو رہا تھا اور کہیں شوہر، کہیں باپ تشدد برداشت کررہا تھا اور کہیں بھائی، کسی کی ماں بھڑک رہی تھی اور کسی کی بیٹی ــ غرض جدائی اور المناک فراق کا نظارہ تھا۔ انٹونیو بھی کرسٹنیا کو ہزاروں مجرموں میں تلاش کررہا تھا۔ بمشکل تمام اور اپنے رسوخ سے کام لیکر وہ کرسٹنیا کو ایک تنہا گوشہ میں بلوانے میں کامیاب ہوگیا۔

"تم مجھے جانتی ہو؟" کاؤنٹ انٹونیو رکن جیوری نے دریافت کیا۔ وہ پہلے سے بالکل بدل چکا تھا۔ اس کی ہیئت بھی کافی منقلب ہو چکی تھی۔

"ہیں! — تم کو مجھ سے کیا کام ہے؟" معصوم کرسٹینا نے لاپروائی سے کہا "کبھی انٹونیو کا نام سنا ہے؟" وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بولا۔

"انٹونیو! —" اس کے آنسو رواں ہو گئے — "تم؟ آہ! تم نے کیوں پچھلی باتیں یاد دلا دیں؟ تم یہاں سے چلے جاؤ — میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ میں نے تم کو بھلا دیا...... میں نے شراب شروع کر دی تھی کہ رنج و الم مجھ سے دور ہو جائیں... لیکن تم نے میرے زخم پھر ناخن سے چھیل دیئے...... تم چلے جاؤ۔" کرسٹینا بے اختیار وہاں سے نکل جانے کیلئے دروازہ کی طرف دوڑی۔

"ٹھہرو تو سہی ... " وہ اس کو روکتے ہوئے بولا ..... "میں تمہاری رہائی کی کوشش کرتا ہوں کرسٹینا! سمجھو تو سہی!"

"میں کیا سمجھوں؟ ... مجھے رہائی کی ضرورت نہیں ... تم خود غرض ہو! نفس کے بندے ہو! مجھے برباد تو کر دیا اب کیا چاہتے ہو؟" اس نے غصہ سے اور رنج میں کہا۔

"میں تمہیں یوں نہیں چھوڑ سکتا" انٹونیو متاثر ہو کر بولا۔

"نہیں — مجھے تمہاری ضرورت نہیں، خدارا مجھے جانے دو —" وہ وہاں سے نکل کر قیدیوں میں جا ملی۔

انٹونیو نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ تمام اراکین سلطنت سے ملتجی ہوا۔ یہاں تک کہ بادشاہ سے بھی ملا مگر کسی نے کرسٹینا کا جرم معاف نہیں کیا۔ قیدیوں کے روانہ ہونے میں صرف ایک رات رہ گئی تھی جب ہر طرف سے ناکامی کا یقین ہو گیا تو وہ شام کو پھر وہاں پہنچا اور کرسٹینا بہزار دقت علیحدہ کمرہ میں آئی۔

"کیوں آئے ہو —؟" کرسٹینا نے اس کی غمگین صورت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سنو! میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔" انٹونیو نے اس سے التجا کی۔

"شادی؟ آہ تم نے کہا؟ لیکن ...... اس بچے کا کیا ہو گا جو گاؤں کے نیچے زمین میں دفن ہے — جاؤ تم کسی امیر سے شادی کرو جو تمہارے برابر کی ہو، غریب عورت صرف اس لئے تھی کہ تمہاری خواہشات پر قربان ہو جاتی۔"

"بچہ کیسا؟" انٹونیو نے حیرت سے پوچھا۔

کرسٹینا نے تمام واقعات من و عن بیان کر دیئے۔ انٹونیو کے آنسو چہرہ پر بہہ رہے، ہو کر تڑپنے لگے۔

"مجھے معاف کر دو — کرسٹینا!" اس نے بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں معاف کر دوں! معافی تم اپنے نفس کی چاہتے ہو، میرے لئے نہیں، ضمیر تمہیں ملامت کر رہا ہے اس لئے تم اس کی تسکین چاہتے ہو اور بس!" کرسٹینا نے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے کہا۔

وہ پھر بولی "تم دولتمند ہو — اور جو تم نے کیا وہ دولت کا ادنیٰ کرشمہ ہے، تم اپنی دولت پر پھولتے ہو اور سمجھتے ہو کہ دولت سے عورت خریدی جا سکتی ہے۔ تم نے اپنی شکل دکھا کر میری زندگی کو جو پُرسکون ہو چلی تھی پھر تاراج کر دیا۔"

کرسٹینا چلی گئی — انٹونیو روتا رہا۔

"میں اپنے بچّہ کا قاتل ہوں اور کرسٹینا میری بھینٹ چڑھی۔ اے معبود! میرے گناہ کب دُھلیں گے؟" انٹونیو نے توبہ کرتے ہوئے کہا۔ سویا ہوا ضمیر جاگ اُٹھا تھا اور انسانیت، حیوانیت پر غالب آچکی تھی۔ انٹونیو کی آنکھیں کھُل گئیں، وہ آنسوؤں سے گناہ کی تاریک بدلی کو دھو تا رہا اور اس کا دل ناقابل معافی جرموں پر ماتم کرنے لگا۔

دوسرے روز قیدی سائبیریا روانہ کر دیئے گئے۔

(۶)

سائبیریا کی حدود میں داخل ہونے سے پیشتر، پہلی منزل پر سب کو قیام کرنا تھا اور ابھی قیدی میلوں کی تھکن دور کرنے کے لئے بیٹھے ہی تھے کہ ایک کوچ میں کاؤنٹ انٹونیو بھی وہاں پہنچ گیا۔ میر منزل سے انٹونیو کی گفتگو ہوتی رہی اور تھوڑی دیر بعد قیدیوں میں آگ لا ندی گئی کرسٹینا کون ہے؟

ایک تنہا کمرے میں کرسٹینا آہستہ آہستہ داخل ہوئی اور اس نے حیرت سے دیکھا کہ انٹونیو مغموم و خاموش کھڑا ہے۔ وہ دفعتہً بولی

"تم یہاں بھی آگئے ـــ کیوں؟"

"سُن تو لو ـــ" اس نے مرتعش آواز میں کہا "کرسٹینا! میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا ... مجھے تم سے محبت ہے۔"

کرسٹینا خاموش رہی۔

وہ کہنے لگا "... میں نے اپنی تمام جائداد اور جاگیر غریبوں کے لئے وقف کر دی اور اپنی تمام دولت کسانوں میں تقسیم کر دی ہے ـــ میں نے سب کو چھوڑ دیا ہے اب تو تم مجھے معاف کر دو ... میں صرف تمہیں چاہتا ہوں۔"

کرسٹینا نیچے سر کئے سب سُنتی رہی۔

وہ پھر بولا "میں نے انتہائی کوشش کی کہ تمہیں رہائی دلوا سکوں ـــ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تم جرم کی مرتکب نہیں ہوئیں مگر ناکامیابی ہوئی اس لئے میں نے سب کچھ چھوڑ دیا اور اب میرا ارادہ ہے کہ تمہارے ہی ساتھ سائبیریا میں رہوں ..."

"ہیں ... ہمیرے ساتھ سائبیریا میں ـــ؟ انٹونیو؟" وہ حیرت سے بولی۔ محبت اس پر غالب آرہی تھی۔

"ہاں کرسٹینا ـــ میرے گناہ بہت زیادہ ہیں اور ان کو صرف تم ہی دھو سکتی ہو ـــ تم مجھے معاف کر دو اور آج سے ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔" انٹونیو نے کرسٹینا کے قریب بڑھتے ہوئے کہا۔

اس دفعہ وہ پیچھے نہیں ہٹی۔ اس کے لبوں پر غمگین مسکراہٹ نمودار ہوگئی اور اس نے چپکے سے کہا "گذشتہ زندگی بھولکر؟"

"ہاں ـــ" انٹونیو ـــ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا "ـــ یہ ہماری زندگی کا نیا دور ہوگا۔ کیا مجھے معاف کرتی ہو ـــ؟"

"انٹونیو ـــ" کہکر وہ فرطِ مسرت و محبت میں اس سے لپٹ گئی "ہاں ... میں تمہیں معاف کرتی ہوں ـــ"

برف ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، سفید چوٹیاں ٹھنڈک سے تھرتھرا رہی تھیں اور ہر طرف سردی سانس کو بھی جما دیتی تھی۔ قیدی سردی کی شدت سے پریشان ہو رہے تھے مگر ان قیدیوں میں دو دل جوشِ محبت سے گرم تھے اور کرسٹینا اور انٹونیو مسکراتے ہوئے، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سائبیریا کی حدود میں داخل ہوگئے۔

(رُوسی) صادق الخیری

وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی؟

از جناب سید ممتاز حسین۔ بی۔ اے آنرز، بی۔ ٹی

شہباز نے لباس زیب تن کرکے اپنے بال سنوارے لباس خانہ میں لگے ہوئے قدِ آدم آئینہ میں ایک چبھتی ہوئی نظر ڈالی اور مسکرا دیا۔ جوانی کی آخری ساعتیں تھیں۔ شباب رخصت ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ ایک وجیہ آدمی تھا۔ دراز قد، چھریرا بدن، متناسب خدوخال، مقناطیسی کشش لئے ہوئے پُررعب آنکھیں۔ ہلکے رنگ کی بھوری مگر مختصر مونچھیں۔ المختصر وہ ایسی ناقابلِ بیان جاذبیتوں کا حامل تھا جو ضعیفی میں بھی انسان کو جوان بنائے رکھتی ہیں۔

وہ ایک احساسِ خود بینی کے ساتھ مسکرایا۔ اور زیرِ لب حفیظ کا یہ مصرع گنگنانے لگا:۔ ابھی تو میں بھی جوان ہوں۔

پھر وہ نشستگاہ میں چلا گیا۔ تاکہ صبح کی ڈاک دیکھ لے۔ کوئی تین چار اخبار بنے تھے اور کم وبیش ایک درجن خطوط۔ ہاتھ کی ایک جنبش سے اُسنے ان خطوط کو میز پر اس طرح پھیلا دیا جیسے کوئی قمار باز تاش کے پتوں کو انتخاب کیلئے پھیلا دیتا ہے۔ پھر اس نے ہر لفافے کی تحریر کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ اس کا معمول تھا کہ لفافہ کھولنے سے پہلے وہ خط کو پہچاننے کی کوشش کرتا تھا اُسکے لئے یہ لمحہ مسرت آمیز توقعات تجسس اور مبہم سی خلش کا ہوتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا "یہ سربمہر پراسرار خطوط میرے لئے کیا پیغام لائے ہیں؟ روحانی مسرت و شادمانی یا دلی۔ رنج و محن!" وہ انہیں ایک سرسری نظر سے دیکھ جاتا۔ اور تحریر سے اندازہ لگا کر جن خطوط سے اُسے جیسی توقع ہوتی اسی اعتبار سے انہیں ایک جگہ رکھتا جاتا۔

اس روز ایک خط نے غیر معمولی طور پر اُسکی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی ـــــ زنانہ طرزِ تحریر! ـــــ ہر وہ چیز اُسکے جذبات میں طوفان برپا کرتی تھی جس میں ذرا بھی نسائیت پائی جاتی ہو۔ اس نے غور سے خط کو دیکھنا شروع کیا۔ تحریر کچھ جانی پہچانی معلوم ہونے لگی۔ مگر صحیح طور پر یہ یقین نہ ہو سکا کہ وہ نقوش کس کی شوخیِ تحریر کا نتیجہ ہیں۔ اس کشمکش میں زیادہ دیر رہنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔ اسلئے لفافہ چاک کر ڈالا اور پڑھنا شروع کیا۔

"محبی! یقیناً تم مجھے بھول گئے ہوگے۔ یاد ہے تقریباً پچیس برس ہوئے جب ہمارے درمیان رشتۂ محبت قائم ہوا تھا۔ ہماری آرزو تھی کہ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ مگر زمانہ کی دست درازیوں نے ہمیں جدا کر دیا۔ تم سے رخصت ہو کر میں کلکتہ چلی گئی۔ جہاں میرے شوہر کا کاروبار تھا۔ اُس بوڑھے شوہر کا جسکے ساتھ میرے عاقبت نااندیش والدین نے محض دولت و ثروت کی طمع میں میرا پلّہ باندھ دیا تھا۔ بہت جلد اُسکی نفس پرستیوں نے مجھے تباہ کر دیا۔ میرے شباب کی جملہ رعنائیاں اُسکے ضعیف آغوش میں جذب ہو کر رہ گئیں۔ خیر اس افسانۂ فردا کو چھوڑو۔ اس خبیث کو انتقال کئے تقریباً ایک سال گذر چکا ہے۔ اور اب میں اپنی لڑکی کی شادی کرنے کے لئے ہوئے وطن آرہی ہوں۔ میری صرف ایک لڑکی ہے۔ خوبصورت اور نوجوان۔ تم اُسے دیکھکر بہت متعجب ہوگے کیونکہ وہ بالکل مجھ سے مشابہ ہے۔

میں نے سُنا ہے کہ شادی نہ کرنے کے باعث تم ابھی تک ویسے ہی وجیہ اور پُروقار نوجوان ہو جیسے آج سے پچیس سال پہلے تھے۔ اور میں تم سے بالکل متضاد۔ ایک کملائے ہوئے پھول کی مانند ہوں جو دوبارہ ترو تازہ ہو جانے کی امیدمیں ابھی تک ڈالی سے نہ گرا ہو۔ خیر اگر تم کو اپنی ننھی زاہدہ سے کچھ بھی محبت ہے تو پیر کی شام کو میرے ساتھ کھانا کھانا۔ میں اپنے موروثی مکان میں قیام کرونگی۔"

حرماں نصیب ـــــ زاہدہ

شہباز کا دل دھڑکنے لگا۔ خط ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شدید جذبات کا تلاطم اسقدر غالب تھا کہ اُسکی آنکھیں پُرنم ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس نے اپنی تمام عمر میں صرف ایک عورت سے محبت کی تھی۔ صرف زاہدہ سے ـــــ جسے وہ خاکسترِ گلاب کہا کرتا تھا۔ ماضی کی یاد اسکے دل میں تازہ ہوگئی۔ خوشگوار

شیریں مختصر لمحات۔ الم انگیز پرمحن طویل گھڑیاں۔ اُسے تمام باتیں رہ رہ کر یاد آنے لگیں۔ زاہدہ کس قدر شاعرانہ خیالات کی مالکہ تھی۔ وہ قدرت کی سچی پرستار تھی اور ہر اُس منظر سے متاثر ہوتی تھی جو ایک نقاش کیلئے سرمایۂ حیات ہوتا ہے۔ اُسے اپنی زندگی کی سچی کہانی ناول میں پڑھے ہوئے فرضی قصے کی طرح معلوم ہونے لگی۔ نظروں سے دُور ہو جانے کے بعد اس نے اپنے دل کے ہر ذرّے کو زاہدہ کی شمعِ محبت سے منور کر رکھا تھا۔

خط کو جیب میں رکھتے ہوئے وہ اُٹھا اور بلند آواز سے کہنے لگا "آج اتوار ہے۔ کل شام میں ضرور اُسکے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔ اپنی حسین زاہدہ کے ساتھ" اور اُس نے کسی دوسرے خط پر نظر نہیں ڈالی۔ کیونکہ اُس روز زاہدہ کا مکتوبِ محبت ہی اُسکے لئے کافی تھا۔

پیر کی شام کو اُس نے نہایت اہتمام سے غُسل کیا۔ اور ایک نسائی انداز میں تزئینِ جمال کی تمام باریکیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لباس پہنا۔ بال سنوارے۔ اور خوشبویات سے معطر ہو کر اپنا شوقِ ملاقات ظاہر کرنے کیلئے مقررہ وقت سے قبل ہی روانہ ہو گیا۔

زاہدہ کے مکان پر پہونچ کر نشستگاہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلی چیز جس پر اُسکی نظر پڑی خود اسکی تصویر تھی۔ پچیس سال قبل کی تصویر، جب اسکی حیاتِ تازہ ناشگفتہ غنچہ کی طرح بہار بر دوش تھی۔ وہ بیٹھ گیا۔ اور انتہائی بے چینی کے ساتھ میزبان کا انتظار کرنے لگا۔

چند منٹ کے بعد دروازہ کھُلنے کی آہٹ ہوئی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ دائیں جانب ریشمی پردے کو جُنبش ہوئی اور ایک ضعیف العمر عورت جس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے اپنے دونوں ہاتھ آگے کی طرف بڑھائے نمودار ہوئی۔ شہباز غرقِ تحیر ہو گیا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر دھوکا ہونے لگا۔ اُسے خیال ہوا کہ میں کسی دوسری جگہ آ گیا ہوں۔ آخر اُس نے اپنی قوتِ گویائی سے کام لیکر کہا "زاہدہ! کیا تم ہی زاہدہ ہو؟"

"ہاں! کیا تم کو یقین نہیں۔ بیشک میرا رنگ و روپ بگڑ گیا۔ میرے خدوخال کی موزونیت مفقود ہو گئی۔ لیکن کیا تمہاری محبت بھری نظریں میرے ظاہری جسم میں نفوذ کر کے میری رُوح کی گہرائیوں تک نہیں پہونچ سکتیں؟ تم مجھے پہچاننے سے قاصر ہو؟"

شہباز خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اُسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ زاہدہ ہو سکتی ہے۔ وہ حیران تھا کہ آخر کس موضوع پر گفتگو کرے۔ وہ پشیمان تھا کہ اسجگہ آتا ہی نہ تو اچھا ہوتا۔ اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ بغیر اجازت وہاں سے اُٹھکر چلا جائے۔ آخر بوڑھی زاہدہ نے کہا "تمہارا استعجاب صحیح ہے کیونکہ تم میرے مقابلے میں کم عمر معلوم ہوتے ہو۔ خیر میری لڑکی خالدہ ابھی یہاں آنے والی ہے۔ میں ارادتاً اُسکو اپنے ساتھ نہیں لائی تھی۔ تم اُسکو دیکھکر ایک دم چلا اُٹھو گے کہ زاہدہ یہ ہے۔ کیونکہ اس وقت وہ زندگی کے اُس عہد سے گذر رہی ہے جس عہد میں تم مجھ سے رخصت ہوئے تھے۔ میرا حُسن و جمال اور میرے خدوخال ورثہ میں اُسکو ملے ہیں۔ وہ بالکل مجھ سے مشابہ ہے"

پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ شہباز نے سوچا کہ اب میرے بولنے کی باری ہے۔ مگر وہ بول نہ سکا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ اس عمر رسیدہ بڑھیا کی موجودگی میں خوشگوار ماضی کی کوئی یاد تازہ نہیں ہو سکتی۔ مکتوب پڑھکر یکایک جو جذبات بھڑک اُٹھے تھے یکسر محو ہو گئے۔ اسکی جوانی کے محبوب کو جس کی محبت میں بھی وہ وارفتہ تھا کیا ہوا! اُس کے خوابوں میں بسنے والی نوجوان اور حسین لڑکی کو ——— کہاں ہیں وہ مخمور آنکھیں؟ کیا ہوا وہ شیریں تبسم؟

بہت دیر تک بے حس و حرکت، بے چین و مضطرب دونوں پریشان بیٹھے رہے۔ پھر رُک رُک کر اجنبیوں کی طرح نہایت دلچسپ موضوع پر بالکل بے ربط گفتگو ہوتی رہی۔ آخر دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ پھر لباس کی سرسراہٹ اور پھر نقرئی آواز میں کسی نے کہا "امی جان! میں آ جاؤں؟" تقویٰ شکن جلوؤں کے ساتھ ایک مجسمۂ حُسن و ناز اندر داخل ہوا اور شہباز پر بجلی گرا دی۔ اُسے محسوس ہوا کہ زاہدہ داخل ہوئی ہے۔ یہی وہ

خاتون تھی جس کے ساتھ پچیس سال قبل وہ زندگی کی دلفریب گھڑیاں بسر کرتا تھا جس سے اُسے محبت ہوئی تھی۔ اُسکے دل میں ایک والہانہ خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح اُسے اپنے دل میں بٹھا لے۔ کئی بار وہ اس نوجوان لڑکی کو غیرارادی طور پر زاہدہ کے نام سے مخاطب کرتے کرتے رہ گیا۔ وہ اس سوچ میں پڑ جاتا کہ آخر ان دونوں میں سے اصلی زاہدہ کون سی ہے؟ پھر اس نے کوشش کی کہ کسی طرح اس نوجوان زاہدہ اور پچیس سال پہلے کی زاہدہ میں کوئی ایسی چیز معلوم کرے جو دونوں کے درمیان مابہ الامتیاز ہو سکے حتیٰ کہ اُسے محسوس ہونے لگا کہ یہ آج کی دوشیزہ کل کی زاہدہ سے مشابہ نہیں ہے لیکن وہ شے پھر بھی معلوم نہ ہو سکی جس سے دونوں کا درمیانی فرق متعین کیا جا سکتا۔ وہ بہت دیر تک اس ذہنی الجھن میں پھنسا رہا کہ کسی طرح اس خاص چیز کو حاصل کرے۔ کاش! اُسے اس چیز کا علم ہو جائے جو اسکے محبوب کیلئے مخصوص تھی۔ اور جس سے یہ دوشیزہ محروم ہے۔

زاہدہ نے کہا۔ "شہباز! تم میں وہ پہلی سی زندہ دلی نہیں رہی"

اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "ہاں اور بہت سی باتیں ہیں جو مجھ میں نہیں رہیں"

اس کا دل کارگاہِ جذبات بنا ہوا تھا۔ اور پُرانی محبت میں انا عیات پید ہو رہے تھے بالکل ایک لپکتے شعلے کی طرح جو جسم اور روح کو یکساں طور پر خستہ کر دیتا ہے۔

نوجوان لڑکی اٹھلا اٹھلا کر گفتگو کر رہی تھی۔ اور کبھی کبھی شہباز کو اُسکے طرزِ گفتگو میں ایک شناسا اور مانوس لہجہ کا احساس ہو جاتا تھا۔ گاہے گاہے اُسکے لب و لہجہ میں اُسے اپنے محبوب کے اندازِ تکلم کا دھوکا ہوتا تھا۔ اور بعض اوقات نوجوان لڑکی کے خیالات اور اندازِ بیان اپنی ماں سے اسقدر مشابہ ہو جاتے کہ شہباز لرزہ براندام ہو جاتا۔ ان تمام نشتروں نے اُسکے دل کو گھائل کر کے رکھ دیا۔

شہباز بہت جلد وہاں سے رخصت ہو کر چلا آیا اور دیر تک باغ میں چکر لگاتا رہا۔ باوجود انتہائی کوشش کے اُسکے ذہن سے اس حسین دوشیزہ کا نقش مٹائے نہ مٹ سکا۔ پہلو میں دل کی حرکت تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ خون کی روانی میں سرعت پیدا ہو گئی تھی۔ بجائے دو عورتوں کے اب اسکی آنکھیں صرف ایک ہی کو دیکھ رہی تھیں ۔۔۔ اس حسین دوشیزہ کو ۔۔۔ اس محبوب دیرینہ کو جو امتدادِ زمانہ کے تباہ کن اثرات سے بچکر شباب کی رعنائیوں کے ساتھ اسکی خزاں رسیدہ زندگی کو ازسرِنو بہار کی تازگی بخشنے کیلئے دوبارہ دُنیا میں آگئی تھی۔ پچیس سال کی طویل مدت کے بعد اس کا سرد اور مایوس دل پہلے سے زیادہ گرمی اور فرحت محسوس کر رہا تھا لیکن عجیب خلش کیساتھ۔ آخر کار وہ اس عجیب اور خوفناک کیفیت پر سنجیدگی سے غور کرنیکے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تاکہ کوئی قطعی فیصلہ کر سکے کہ اب اُسے کیا راہِ عمل اختیار کرنی چاہیئے۔

لیکن جسوقت وہ شمعدان لئے آئینے کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ اس قدِ آدم آئینہ کے سامنے سے جس میں صبح کو روانہ ہونے سے قبل اُسنے ایک جذبۂ خود پسندی اور ایک احساسِ خود بینی سے اپنا عکس دیکھا تھا۔ وہاں اس آئینہ میں اب اُسے ایک عمر رسیدہ شخص کا چہرہ نظر آیا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ وہ پچیس سال پہلے زاہدہ کے عہدِ شباب میں کیا تھا۔ شمعدان کو قریب تر لا کر اپنے آپ کو زیادہ غور سے دیکھا۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی خوردبین سے جراثیم کو دیکھتا ہے۔ یکایک اُسے چہرے پر جھریاں نظر آئیں۔ امتدادِ زمانہ کی وہ خوفناک تباہ کاریاں جو ابتک اسکی آنکھوں سے پوشیدہ تھیں۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کا جسم لرز گیا۔ اپنی ہی صورت سے سہم کر۔ اور جب آئینے کے سامنے سے ہٹا تو اب وہ بجائے حفیظ کے غالب کا یہ مصرع گنگنا رہا تھا۔

وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

(ماخوذ از موپاساں)

ممتاز حسین بی۔ اے آنرز

شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم کی آخری تصنیف

اُمّہات الامّہ

سب سے حیرت انگیز اور عبرتناک واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کے چھپنے کے بعد ندوۃ العلما کا جو اجلاس دلی میں ہوا اس میں علمائے کرام تو موجود ہی تھے انہوں نے باہم مشورہ کر کے امہات الامہ کی تمام جلدیں جو ابتدائی طوفان کے بعد شہر کے بعض معززین نے مولانا کی منت سماجت کر کے ایک صاحب کے پاس رکھوا دی تھیں اور باہم بکری موقوف کرا دی تھی منگوا لیں اور اپنے سامنے ان کتابوں کا ڈھیر لگوایا۔ اور ان میں سے ایک مولوی نے زیادہ تر ثواب کمانے کیلئے آگے بڑھ کر مٹی کا تیل چھڑکا اور بسم اللہ کر کے آگ لگا دی۔ اس کے شعلوں کی روشنی مولویوں کے مقدس چہرہ پر پڑ رہی تھی۔ اور ان کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی بشاشت سے اس خوفناک دلی مسرت اور باطنی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا جو ایک خونخوار درندے یا ایک سنگدل انسان کی صورت سے انتقام لیتے وقت ظاہر ہوتا ہے۔ اگر حکومت کا ڈر نہ ہوتا تو مولانا نذیر احمد بھی اسی آگ میں جھونک دیے جاتے۔ یہ منظر قابل دید تھا مولویوں کا یہ طبقہ زمانہ وسطیٰ کے ان پادریوں کی یاد دلاتا تھا جنہوں نے کتابیں تو کتابیں ہزاروں بیگناہ زندہ دہکتی آگ میں جھونک دیئے کھولتے تیل کے کڑھاؤں میں ڈال دیئے، گھوڑوں کی ٹانگوں سے باندھ کر کھنچوا دیئے اور طرح طرح کے عذاب دیئے اور عجیب و غریب شکنجوں میں ان کے سر کا سر کچل ڈالے اور ان کے سامنے رکھ کر ڈھیر لگا دیئے تو وہ عبرت تھا جو بیسویں صدی عیسوی کے روشن زمانے کی ایک عجیب یادگار تھا۔ یہ اگر ممکن ہوتا تو ایک ایک بات جو کچھ بطور یادگار کے شیشوں میں بند کر کے رکھ دی جاتی تاکہ آئندہ نسلیں اسے سامنے رکھ کر ان علمائے کرام اور مصلحان ملک و ملت کی روح پاک پر فاتحہ پڑھا کریں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتیں۔ اس رات گویا مولویوں نے شب برات منائی اور اس آگ سے اپنے نفوس مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اعمالناموں میں ایک ایسی بڑی نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً ان کی نجات اخروی کا باعث ہو گی۔ یہ ان بزرگوں کا کام ہے جنہوں نے چشم بد دور مسلمانوں کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کا بیڑا اُٹھایا ہے۔"

(مولوی عبدالحق بی۔ اے۔ اورنگ آباد۔ دکن)

قیمت ۔ عہ

دیر نہ کیجیے جلدی کیجیے ممکن ہے پہلا انعام آپ کی قسمت میں لکھا ہو

معمہ

ایک ہزار روپیہ مفت حاصل کیجیے

پہلا انعام تین سو روپیہ۔ دوسرا انعام ایک سو پچاس روپیہ۔ تیسرا انعام۔ دو انعام (پچاس روپیہ) چوتھا انعام۔ دو انعام (پچیس روپیہ) پانچواں انعام۔ دس انعام (دس روپیہ) چھٹا انعام۔ ساٹھ انعام (پانچ روپیہ)

ذیل میں ہندوستان کے آٹھ مشہور شہروں کے نام ترتیب وار حروف دئے ہوئے ہیں۔ ایک ستارہ * کے نشان پر صرف ایک حرف لگانے سے شہر کا نام بن جاتا ہے۔ پہلے نمبر کا حل کراچی ہے۔ اسی طرح باقی کو حل کیجیے بہت آسان ہے۔

(۱) ک * * چ ی۔ (۲) ر * گ و ن۔ (۳) آ * * ہ۔ (۴) ک ل * ت ہ۔ (۵) * ن ک ل و ر۔ (۶) ب * ب ئ (۷) پ * ن ہ (۸) ل ک * ن ؤ۔

قواعد

(۱) داخلہ فیس ایک روپیہ بذریعہ منی آڈر بھیجنا ضروری ہے۔
(۲) حل منی آرڈر کوپن یا سادہ کاغذ پر مع نام و پتے کے صاف و خوشخط بھیجنا چاہیے۔
(۳) ایک شخص کئی حل بھیج سکتا ہے مگر ہر حل کے ہمراہ ایک روپیہ بھیجنا ضروری ہے۔
(۴) کئی حل کی داخلہ فیس ایک ہی منی آڈر سے بھیجنا چاہیے۔
(۵) حل دفتر میں مع داخلہ فیس کے ۱۵ اگست تک پہونچ جانا چاہیے۔
(۶) نتیجہ کے لئے ایک آنہ زیادہ بھیجنا چاہیے۔
(۷) نتیجہ ان صاحبان کے پاس جو ایک آنہ زیادہ بھیجیں گے ۱۵ اگست کے بعد روانہ کئے جائیں گے۔
(۸) کسی صاحب کو کسی قسم کی خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔
(۹) زیادہ صحیح حل آنے کی صورت میں انعام برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔
(۱۰) جوابات کے متعلق تمام تر فیصلہ کرنے کا حق صرف منیجر صاحب کو ہوگا۔
(۱۱) جو اصحاب ان قواعد کے خلاف عمل میں لائیں گے وہ مقابلے میں شریک نہیں کئے جائیں گے۔

نوٹ:۔ جو اصحاب چار حل خود بھیجیں یا اپنے دوستوں سے بھجوائیں ان کو پانچویں حل کی داخلہ فیس بالکل معاف ہے۔

پتہ:۔ منیجر۔ ایذی پزل کمپٹیشن۔ للت پور۔ (یو۔پی)

ہوتے تھے۔ ایک قرابت جس کا نام کاوک تھا اور چنگیز خاں کے مقابلہ میں لڑ چکا تھا چنگیز کے پاس آیا اور کہا کہ "میرے لئے یہ بات ناقابل برداشت ہوئی کہ میں اپنے آقا اور مالک کو گرفتار کرا کے اسکو قتل ہوتے دیکھتا تین دن تک میں اپنے اس آقا کیلئے لڑتا رہا تاکہ اسکو موقع دوں کہ وہ کہیں بھاگ کر چلا جائے۔ اب میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ اگر تم نے میرے قتل کا حکم دیا تو قتل ہو جاؤنگا۔ اور اگر تم نے میری جان سلامت رکھی تو نہایت تندہی سے میں تمہاری خدمت کرونگا۔" چنگیز خاں نے اسکی بات سنکر کہا کہ "ایسا شخص جس نے اپنے آقا کا برے وقت میں ساتھ نہ چھوڑا ہو اور اس غرض سے کہ آقا کو وقت اور جگہ اپنی جان بچانے کیلئے مل جائے تین دن تک برابر لڑتا رہا ہو ایسا آدمی فی الواقع جوانمرد ہے۔ تم آج سے میرے شریک ہو۔" غرض ہمیشہ اور ہر جگہ حتیٰ کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی چنگیز خاں نے حکومت شرفا کے اس قاعدے کی پابندی کی کہ فرمانروا کو اپنے توابع پر اور آقا کو اپنے غلاموں پر پورا اختیار ہوتا ہے۔ ہمیشہ اپنے ملازموں کی ہمت سے کہ وہ اسکے نیر طلب و نیک خواہ رہیں بڑھاتا رہا۔ اور ایسے آدمیوں کو قتل کر دیتا تھا جو اپنے آقا کو دھوکا دیں۔ چاہے یہ آقا چنگیز خاں کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ایک واقعہ تاتجوت کے سرداروں کے ساتھ پیش آیا۔ یہ سردار ترغاتائی کیرلتوک کے تابع تھے اور یہ واقعہ پایۂ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ ان سرداروں نے چاہا کہ ترغاتائی کو گرفتار کر کے چنگیز خاں کے حوالے کریں لیکن جب اس ارادے پر کاربند ہونیکو ہوئے تو دفعتاً خیال آیا کہ ایسی صورت میں چنگیز خاں انکے ساتھ کیا کریگا۔ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے ترغاتائی اپنے آقا کو رہا کر دیا۔ اور چنگیز خاں کے پاس جا کر یہ کل قصہ کہا۔ چنگیز نے کہا کہ اگر تم اسکو گرفتار کر کے میرے پاس لاتے تو میں یقیناً تم کو قتل کرا دیتا۔ اس بارے میں اور کئی مثالیں چنگیز خاں کی بیان کی جاتی ہیں۔ کاہستانوں کے گروہ شرفا کو اب اپنے خان چنگیز پر فخر و ناز تھا۔ چونکہ درحقیقت وہ خود جماعت شرفا سے تھا۔ اس لئے شرفا کی امیدوں اور خواہشوں کا پابند تھا۔

نائمان سے جنگ اور جاموقہ کی موت

چنگیز خاں جس زمانے میں ونگ خاں سے مصالحت رکھتا تھا اور اسی کی حفاظت میں رہتا تھا تو کئی بار وہ نائمان کے طاقتور قبیلے سے لڑ چکا تھا۔ نائمان کا وطن قرابت کے وطن سے مغرب میں تھا۔ قبائل نائمان تمام مغل قوموں میں سب سے زیادہ متمدن اور مہذب تھے۔ کیونکہ قوم ایغور[1] کی شائستگی اور تمدن سے وہ بہت متاثر ہو چکے تھے۔ غالباً نائمان پہلے لوگ تھے جنہوں نے ایغوری رسم خط کو اپنی ضروریات کی مناسبت سے ترمیم کر کے مغل زبان کی کتابت میں استعمال کیا تھا۔ علاوہ قوم ایغور کے نائمان کے تعلقات ترکستان اور ملک چینی سوزیمی یہ یحی (؟) کے باشندوں سے بھی تھے۔ نائمان کے ملک میں مسلمان تاجر آمد و رفت رکھتے تھے۔ اور نائمان کی جماعت اعلیٰ میں اسلامی تمدن و تہذیب کا اثر پہنچا ہوا تھا۔ اور اس اعلیٰ جماعت کے اثر سے عوام بھی اسلامی شائستگی اور تمدن سے متاثر تھے۔ بہت سے نائمان نسطوری عقائد کے عیسائی تھے۔

اب چنگیز خاں کے عروج نے نائمان کو بےچین کیا۔ خاصکر اس وقت جبکہ قرابت کو شکست دیکر چنگیز ایک زبردست فرمانروا ہو گیا۔ نائمان کا افسر اور حاکم اس وقت تایان خاں (تایانگ خاں) تھا۔ اس نے چنگیز خاں پر دو طرف سے حملہ کرنے کیلئے قوم اونگوت سے اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اونگوت دیوار چین کے قریب رہتے تھے۔ لیکن اونگوتیوں نے اس اتحاد سے محض انکار کی جگہ یہ کیا کہ تایان خاں کے ارادے سے چنگیز خاں کو مطلع کر دیا۔ چنگیز خاں اطلاع پاتے ہی لڑائی کا سامان کرنے لگا۔ اور لڑائی سے پہلے اپنی فوجوں کی تنظیم شروع کی۔ چنگیز خاں کے لشکر میں لڑنیوالوں کی تعداد بہت ہو گئی تھی۔ ایک بہت پرانے دستور کے مطابق اس نے اپنی سپاہ کو ہزار ہزار، سو سو اور دس دس کے دستوں میں تقسیم کیا۔ تجربہ کار

---

[1] ایغور ایک ترکی نسل کی قوم تھی جو چینی ترکستان کے شمالی مشرقی حصہ کے اضلاع ہامی اور دنبتی، طرفان اور کوچینگ میں آباد تھی۔

لوگوں کو جن سے خود واقفیت رکھتا تھا ہزارجات اور صدجات پر افسر مقرر کیا۔ ایک نیا عہدہ جربی کا قائم کیا جس کا کام رسد کا انتظام تھا! ایک دستہ فوجِ محافظ کا جسکو "کشیک" کہتے تھے قائم کیا۔ یہ فوج خان کی ذات کی حفاظت کیلئے تھی۔ علاوہ اس کے وہ تمام فوجوں میں بہترین سمجھی جاتی تھی۔ اس فوج کی تنظیم حکومت امرا کے اصول اور طرز پر ہوئی چست اور مستعد جوان اچھے حشے کے اور سب نویان اور افسران ہزارجات اور صدجات نیز ترکات (یعنی آزاد لوگوں) کے خاندان کے اس میں بھرتی کئے جاتے تھے۔

اس فوج کشیک کی تعداد ایک ہزار بگاتور (بہادروں) کی تھی لڑائی میں یہ فوج ہمیشہ آگے رہتی تھی۔ اور امن کے زمانے میں وہ خان کی حفاظت کرتی تھی۔ چنگیز خاں اس بات کو خوب جانتا تھا کہ کاہستانوں کے خانہ بدوش قبیلوں پر اچانک حملہ ہوجانا کیسی آسان اور معمولی بات تھی۔ اور یہ حملہ ایسا ہوتا تھا کہ آناً فاناً میں بڑے بڑے منصوبوں اور امیدوں کو خاک میں ملادیتا تھا۔ اس کا علم رکھنے کی وجہ سے اس نے خان کی ذات کی حفاظت کی طرف خاص طور سے توجہ کی۔ فوج کشیک کے قیام اور ہزارجات اور صدجات میں فوج کی تقسیم اور ان افسر مقرر کرنے سے کاہستانوں پر حکومت امرا کے فوجی انتظام کی بنیاد پڑگئی۔ اب قوم کے سردار ایک بے ترتیب فوج کے بے قاعدہ افسر نہ رہے۔ فوج کشیک اور ہزارجات کیلئے سخت قواعد جاری ہوئے! ور ان قواعد پر بڑی سختی اور پابندی سے خان کے اردر میں عمل ہوتا رہا۔

موسم بہار کے شروع ہوتے ہی چنگیز خاں نے قوم نائمان سے لڑائی شروع کردی۔ وقت کے لحاظ سے اتنا ضرور ہوا کہ جنگ کی ابتدا چنگیز خاں نے کی۔ موسم بہار کے شروع میں لڑائی کے چھڑ جانے سے بعض قباحتیں بھی پیدا ہوئی تھیں اور وہ یہ تھیں کہ گھوڑے جو سال بھر گھاس پر گذر کرتے تھے وہ بہار کے موسم میں لاغر ہوجاتے تھے۔ لڑائی پر جانے سے پہلے چنگیز خاں نے اپنے جھنڈے پر قربانی چڑھائی۔ منگلوں میں اعتقاد تھا کہ انکے علم میں سپاہ کی حفاظت کرنے والی قوت یا روح جسے وہ سلدی کہتے تھے رہتی تھی۔ نائمان کی فوجوں کی سپہ سالاری اس وقت خود تایان خاں اور اسکا فرزند کوچلوک کرتا تھا۔ یہ دونوں فوجوں کو بڑھا کر مقابلے پر لائے لیکن نائمان کو فاش شکست ہوئی۔ تایان خاں لڑائی میں مارا گیا اور اس کا فرزند کوچلوک جو بڑی ہمت اور ارادے کا آدمی تھا کوہستان التائی میں بھاگ کر چلا آیا۔

نائمان کے مقابلے میں چنگیزی لشکر کے بڑھنے کا حال "خفیہ تاریخ منگل" میں اس طرح بیان ہوا ہے "اس وقت جاموقہ بھی نائمان کیساتھ تھا۔ تایان خان رئیس نائمان نے اس سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں جو ہمارے آدمیوں کا تعاقب اس طرح کررہے ہیں جیسے بھیڑیے بھیڑوں کا پیچھا دوڑ کر ان کے گھر تک کرتے ہیں؟" جاموقہ نے جواب دیا "یہ تموجن کے چار کتے ہیں جو آدمی کے گوشت پر پلے ہیں۔ تموجن انکو لوہے کی زنجیروں میں باندھے رکھتا ہے۔ ان کتوں کی کھوپریاں پیتل کی ہیں۔ دانت انکے سنگ خارا سے تراشے گئے ہیں۔ زبانیں ان کی خنجر ہیں اور دل انکے لوہے کے ہیں۔ چابک کی جگہ ان کے ہاتھ میں خمدار تلواریں ہیں۔ شبنم پیتے ہیں اور ہوا پر سوار ہوتے ہیں۔ لڑائی میں وہ آدمیوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ اس وقت وہ زنجیروں سے نکال کر چھوڑے گئے ہیں۔ منہ سے ان کی رال بہہ رہی ہے اور وہ بہت خوش ہیں۔ ان چار کتوں کے نام جبی، کبلائی، جلمی، سوبدائی ہیں......"

تایان خاں نے جاموقہ سے پھر سوال کیا کہ "ان چاروں کے پیچھے وہ کون ہے جو بھوکے عقاب کی طرح شکار پر جھپٹنے کیلئے بے صبر ہے؟" جاموقہ نے جواب دیا "یہ میرا منہ بولا بھائی ہے۔ سر سے پاؤں تک فولاد وآہن میں چھپا ہوا ہے اور اب یہاں وہ ایک فاسقہ زدہ گدھ کی طرح اڑ کر آیا ہے۔ آپ اسے ذرا غور سے دیکھیں۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے کہ جس وقت یہ منگل خان یہاں آئیگا تو اس کا وہی درجہ ہوگا جو بھیڑ کے بچے کا ہوتا ہے۔ کھر اور کھال تک ہم باقی نہ چھوڑینگے"

نائمان کو شکست ہوئی اور کل قوم چنگیز خاں کے ہاتھ میں گرفتار ہوگئی۔ اب چنگیز خاں اپنے پرانے دشمنوں یعنی مرکیت سے لڑنے بڑھتا ہے مرکیت

ایک صحرا نشین قوم تھے اور توقتا اس کا سردار تھا۔ قوم مرکیت کو بھی چنگیز خاں نے شکست دی۔ سردار مرکیت توقتا مع اپنے بیٹوں اور چند ساتھیوں کے لڑائی سے بھاگا۔ یہی موقع تھا کہ چنگیز خاں نے قوم مرکیت کی ایک عورت سے جس کا نام کولون تھا شادی کی تھی۔ مغلوں کے شاعروں نے اپنے کلام میں اس عورت کا حسن و جمال بہت بیان کیا ہے۔

اسکے دوسرے سال چنگیز خاں کوہستان التائی سے اتر کر اس غرض سے آگے بڑھا کہ کوچلوک نائمان اور توقتا مرکیت کو جو زندہ بچ گئے ہیں غارت کرے۔ اب جو لڑائی کوچلوک اور توقتا سے ہوئی تو اس میں یہ دونوں شکست کھا گئے۔ توقتا مرکیت لڑائی میں مارا گیا اور کوچلوک نائمان بھاگ کر ختی سو (یعنی ریچی) کے ملک میں پہونچا اور وہ قراختائی کے پاس آیا جو اس ملک کے اس زمانے میں مالک تھے۔ اب چنگیز خاں نے اپنے بہترین سپہ سالار سوبدائی کو بھیجا کہ توقتا کے بیٹوں کو جو بقیۃ السف نائمان کے ساتھ فرار ہوئے ہیں گرفتار کرے۔

ان فتوحات نے چنگیز خاں کو تمام شمال منگولیا کا بھی مالک کر دیا۔ اور جسقدر مغل قومیں تھیں وہ سب اسکی رعایا ہو گئیں۔ صرف ایک جاموقہ سیچین اس سے آزاد رہا۔ مگر اب جاموقہ کے زندگی کے دن بھی پورے ہونیکو تھے۔ جاموقہ کے ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور یہ شخص جو جمہوریت کا شیدائی تھا اب رہزنوں کے ایک غول کی سرداری کرنے لگا۔ آخر کار اسی کے ساتھیوں نے ایک دن اسکو گرفتار کرکے چنگیز خاں کے حوالے کر دیا۔ اس موقع پر بھی چنگیز خاں نے حکومت امرا کے اصول کو جو اسکے ہمیشہ رہنما رہے تھے نہ چھوڑا۔ اور یہ کہکر کہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کو جنہوں نے اپنے آقا کو دغا دی ہو انکے قتل کا حکم نہ دیا جائے۔ چنانچہ یہ جو جاموقہ کو گرفتار کرکے لائے تھے سب قتل کر دیئے گئے۔ اور حکم ہوا کہ نہ صرف ان کو بلکہ انکے بیٹوں اور پوتوں کی بھی گردن اڑا دی جائے۔ اب اس بات کو یاد کرکے کہ چنگیز اور جاموقہ میں بھائی چارہ تھا اسلئے چنگیز خاں نے جاموقہ کو اس طرح مرجانے اجازت دی کہ اسکا خون نہ بہایا جائے۔ یہ بڑے رحم کا کام تھا جو چنگیز خاں نے کیا۔ کیونکہ شامانی مذہب میں اعتقاد یہ تھا کہ انسان کے خون میں اسکی روح ہوتی ہے۔

چنگیز خاں تمام اقوام مغل کا شہنشاہ ہو جاتا ہے

اس طرح تمام نسلیں جو نمدے کے خیموں میں رہتی تھیں متحد ہو کر ایک فرمانروا کے تابع ہو گئیں۔ سنہ ۱۲۰۶ء یعنی سال پلنگ میں یہ تمام قومیں دریائے اونان کے سرچشموں کے قریب جمع ہوئیں۔ اور سپید علم کو جو نو پایوں پر نصب ہوتا تھا بلند کرکے ان تمام قوموں نے چنگیز خاں کو خاقان کا خطاب دیا۔ اب چنگیز خاں نے قوم مغل کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور قوم سے کہا کہ "میں تمہارے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں اور میں ہزارجات کی سرداری ان کو دیتا ہوں جنہوں نے میرے ساتھ اس خانیت کے پیدا کرنے میں کام کیا ہے" اتنا کہکر اپنے ہزارجات پر نوئنان نامزد کئے۔ یہ واقعہ چنگیز خاں کی سوانح حیات میں بہت بڑا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اوپر کی عبارت ہم نے "خفیہ تاریخ مغل" سے نقل کی ہے۔

سنہ ۱۲۰۶ء میں چنگیز خاں کو خاقان (یعنی الوس مغل کے شہنشاہ ہونے) کا خطاب دینے کو جو قوریلتائی ہوئی اس میں چنگیز خاں کے عزیز و اقارب اسکے ساتھی نوئنان اور بہادر تمام شرفائے مغل حاضر تھے۔ یہ قوریلتائی دراصل ایک پہلی تحریک کی تائید میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ پہلی تحریک ایک مختصری جماعت امراء نے چنگیز خاں کو خان کا خطاب دینے کیلئے کی تھی۔ اب جو قوریلتائی ہوئی تو اس میں قوم کے تمام بڑے لوگ جمع ہوئے تھے۔ اور آج چنگیز خاں کے اس خیال نے جو تمام عمر دماغ میں سماتا رہا تھا عملی صورت پکڑی۔ غرض تموجن اب اپنے الوس کا رہبر اور پیشوا ہو گیا۔ اور جس الوس کا وہ رہبر و پیشوا ہوا وہ الوس ان تمام قوموں کا رہبر اور پیشوا ہوا جو نمدے کے خیموں میں رہتے تھے۔ اور ایماق بورجیجن نے ایک مرتبہ پھر ان قبائل کی شان و عظمت کو زندہ کر دیا جو نمدے کے نیچے زندگی بسر کرتے تھے۔ اور آئندہ یہ کل قومیں مغل کے نام سے

پکاری جائیں گی۔ تمام نوئنان، بہادر، بیگ اور تگین تمام شرفا اور الوسوں کے لوگ سب الوس مغل کے تابع فرمان ہو گئے۔ اور ان سب نے اپنے کو مغل کہنا پسند کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ تمام قوموں نے قوم واحد بنکر ایک ایسا نام اپنے لئے مقرر کیا جو سب پر یکساں حاوی ہوتا تھا۔ اور اس نام کو یہ عزت حاصل ہوئی کہ تمام اقوام خانہ بدوش نے اپنے کو مغل کہکر اس نام پر فخر کیا۔

چنگیز خاں جب خاقان ہو گیا تو اُس نے ایک واضح اور مستقل مذہبی خیال خود اپنے لئے اور اپنے الوس کیلئے اختیار کیا۔ اس مذہبی خیال کے اختیار کرنے میں کوکچو پسر منلیک نے بڑا حصہ لیا تھا۔ مغل اس شامان کی عزت بڑی وہم پرستی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ قوریلتائی کے موقع پر اس کوکچو نے اس کا اعلان کیا کہ "تنگری" (ازلی آسمان) نے چنگیز کو اپنا موردِ عنایات بنایا ہے۔ اور وہ تنگری کی طرف سے تنگری کا جاپاگتو (نائب) تمام روئے زمین اور اپنی قوم کیلئے مبعوث ہوا ہے۔ چنگیز خاں نے شامانِ کوکچو کی زبان سے اس حال کو سنتے ہی تسلیم کیا کہ "آسمان" نے مجھکو تمام دنیا کی قوموں پر حکومت کرنے کا اختیار عطا فرمایا ہے۔ اور آسمان کے ظل حمایت اور اسکی مدد سے میں نے قرابت کو شکست دے کر سب سے بڑا مرتبہ حاصل کیا ہے۔ سپید علم نہ پایہ میں اب لوس چنگیزی کی مدد کے لئے وہ قوت یا روح متمکن ہو گئی ہے جسکو سلدی کہتے تھے۔ اسی سلدی کی نسبت خیال ہوا کہ وہ چنگیز خاں کی فوجوں کو لڑائی میں فتحیاب کرے گی۔ کیونکہ تنگری یعنی آسمان کی یہی مرضی اور مشیت تھی۔ چنگیز خاں اس وقت آسمان کی منظوری (منگکی تنگری ان کوچون) اور حکم سے ہوا تھا۔ مغلوں نے ابتک اس علم کو اپنے پاس رکھا ہے۔ اور اُن کا اعتقاد ہے کہ اسی علم کی وجہ سے چنگیز خاں کو فتح پر فتح ہوتی رہی۔ آج کل کے مغل اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ چنگیز خاں کی روح اسی "علم سلدی" میں رہتی ہے اور یہ کہ چنگیز خاں ابتک اپنی باعظمت قوم کا محافظ اور نگہبان ہے اور وہ مغلوں[1] پر حکومت کرتا ہے۔

مذہب و معاشرت کے ان پہلوؤں پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چنگیز خاں اپنی سلطنت کا دستور العمل سوائے امرائی طرزِ حکومت کے دوسرا وضع نہ کرسکتا تھا۔ "امرائی حکومت" کا خیال وہی تھا جو کاہستان کے ایک امیر کو خاص اپنے ایماق اور الوس کیلئے ہوسکتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ چنگیز خاں کا یہ خیال ایک بڑے وسیع پیمانے پر تھا۔ جس طرح اُمرا کا ایک خاندان یا کوئی ایماق کسی الوس کا رئیس ہوتا تھا۔ اسی طرح چنگیز کے طرزِ حکومت میں التان اوروق (ایماق زرین) مع اُسکے تابعوں اور ہمراہیوں کے تمام الوسات اور تمام ایسے لوگوں کا حاکم اور رئیس ہوتا تھا۔ جو نمدے کے خیموں میں رہتے تھے۔ اس شاہی ایماق (ایماق زریں) کے سر پر شہنشاہ ہوتا تھا جو زیادہ تر اپنے ایماق یا اُن اُمرا کا رئیس ہوتا تھا جو اسکے ساتھ رہتے تھے۔ وہ عوام کا سردار رئیس اور حاکم نہ ہوتا تھا۔ چنگیز خاں نے اپنی نسبت کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ وہ عوام کی پیشوائی یا رہنمائی کیلئے پیدا ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک اُمرا کے ایماق کا پیشوا اور رہبر رہا۔ اور تمام رؤسائے مغل کو اُس نے متحد کرکے تن واحد کر دیا۔ چنگیز خاں کے احکام و قوانین کبھی عام رعایا کے نام جاری نہیں ہوئے۔ بلکہ وہ ہمیشہ شہزادوں یا نوئنان اور بہادروں کے نام جاری ہوئے۔

اس سال یعنی ۱۲۰۶ء میں چنگیز خاں نے اپنی فوج محافظ کی تنظیم کی اور یہ تنظیم بھی امرائی طرزِ حکومت کے اصول پر کی۔ اس میں چنگیز خاں کی غرض صرف یہ تھی کہ اپنے اردو کی حفاظت کیلئے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا تھا ایک قابل اعتبار فوج مرتب کرلے اور ایک ایسی جمعیت اپنے تابع فرمان کرے جس سے لائق اور معتبر سپہ سالار پیدا ہوتے رہیں۔ اس فوج کے ہر آدمی سے چنگیز خاں ذاتی واقفیت رکھتا تھا۔ اور ایسے کاموں پر جنہیں وہ انجام دینا چاہتا تھا پورے بھروسے کے ساتھ اُن کو متعین کرتا تھا۔

اس فوج کے ہر سپاہی کیلئے جسے کشکتن کہتے تھے، شریف خاندان سے ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ چنگیز کہا کرتا تھا چونکہ اب تنگری تعالیٰ کا

[1] یہ فقرہ ۱۹۲۴ء میں منگولیا میں جمہوری حکومت قائم ہونے سے پہلے لکھا تھا۔ اب وہ صرف ان مغلوں کی نسبت درست ہے جو وسط منگولیا اور چینی ترکستان میں رہتے ہیں۔

حکم ہے کہ میں تمام قوموں پر حکومت کروں۔ پس میں اب ہزارجات، صدجات و دہ جات سے ایک ہزار آدمی جن میں علاوہ تیر اندازوں کے اور جوانمرد بھی شامل ہوں جمع کرکے اپنی فوج کشیک میں شامل کرونگا۔ یہ لوگ میری ذات سے وابستہ ہونگے اور وہ سب ہمیشہ شریفوں یا ترکات (آزاد لوگوں) کی اولاد سے ہونے چاہئیں۔ چست و چالاک ہوں، جُثہ اچھا رکھتے ہوں اور محنت کش ہوں...... جو افسر ہزارجات یا صدجات یا دہ جات میں اس حکم کے خلاف چلیگا وہ مجرم اور قابل سزا سمجھا جائے گا۔ فوج کشیک کے جوانوں کو خاص خاص اعزاز و مراعات حاصل تھے چنگیز خاں کا حکم تھا کہ میری فوج محافظ (یعنی فوج کشیک) کا ہر جوان ہزارجات صدجات اور دہ جات کے افسروں سے رتبہ میں زیادہ ہوگا۔ اگر فوج ہزارجات کا کوئی افسر کسی کیشکتن سے اپنے کو درجے میں زیادہ سمجھ کر اس سے جھگڑا کرے گا یا لڑیگا تو وہ سزایاب ہوگا۔

فوج کشیک کے تمام سپاہی خصوصیت کے ساتھ خاقان کی حفاظت اور نگرانی کرتے تھے۔ صرف خاقان ہی انکے مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا۔ اس سپاہ کے جوانوں پر کسی دوسرے کو کچھ اختیار نہ تھا۔ ایک موقع پر چنگیز خاں نے کہا تھا کہ "میری فوج کشیک کا کوئی افسر اپنے کسی ماتحت کو بغیر میری اجازت کے خود سزا نہیں دے سکتا۔ اگر اس کو کوئی قصور ہوا ہو تو اسکی فوراً مجھے اطلاع دیجائے۔ پھر جو گردن زدنی ہوگا اسکی گردن ماردیجائیگی اور جو زدوکوب کے لائق ہوگا اسکو زدوکوب کیا جائیگا۔"

ایک مرتبہ اسی فوج محافظ کے لوگوں کو مخاطب کرکے کہا کہ "تم رات کے وقت میرے جسم اور میرے جان کی حفاظت کرتے ہو (کبتیوت)، تم میرے خیمے پر مینہ برستی اور برف گرتی راتوں میں اور ایسی راتوں میں جبکہ مطلع بالکل صاف ہوتا ہے پہرہ دیتے ہو اور میرے دشمنوں سے تم لڑتے ہو...... تمہاری بدولت میں آج اس اعلیٰ رتبہ پر ہوں...... پس میری اولاد میرے ان محافظوں کو خاص طور پر میری یادگار سمجھے گی۔" چنگیز خاں نے جن لوگوں کو اپنا معتمد سمجھا ان کو مختلف خدمتوں پر روانہ کیا اور انہوں نے اپنی خدمات کو بڑی خیر خوبی سے انجام دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خاں میں مردم شناسی کا مادہ کیسا غیر معمولی تھا۔ اور درحقیقت یہ بات ایسی تھی جس میں چنگیز خاں کی لیاقت سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی تھی۔ عام رعایا سے چنگیز خاں کے مطالبات زیادہ سخت ہوتے تھے۔ لیکن جن لوگوں کو ذاتی طور پر جانتا تھا ان کی ضروریات کو مہیا کرنے کا اسکو بیحد خیال رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر مہم میں خواہ وہ وطن سے کتنی ہی دور پیش آئے اس پر پورا اختیار او قابو خود اسکے ہاتھ میں آنا چاہیے۔ اسکی وہ کل کام اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ امرائی اختیارات کا نتیجہ چنگیز خاں کے خیال کے مطابق سوائے اس کے دوسرا نہ ہوسکتا تھا۔ مثلاً جس وقت سوبدائی بہادر کو توقتامرکیت کے تعاقب میں روانہ کیا تو ہدایت کی کہ "اگر کوئی آدمی تمہارا حکم نہ مانے اور میں اس آدمی سے ذاتی طور پر واقف ہوں تو تم اسکو میرے سامنے حاضر کرنا تاکہ میں خود اس کے مقدمے کا فیصلہ کروں اور اگر میں اس سے ذاتی واقفیت نہ رکھتا ہوں تو تم خود اسکو سزا دینا۔"

اب مغلوں کا لشکر بہت بڑا ہوگیا۔ اسکی تقسیم ہزارجات اور صدجات میں ہوئی۔ اور دو دو یا تین تین یا پانچ پانچ یا دس دس ہزار کے مجموعوں میں یکجا ہوکر ایک ایک فوج انسے بنی۔ دس ہزاری فوج کے افسر کو امیر تومان کہتے تھے۔ تمام ایماق اور الوس بھی اسی طرح یکجا ہوکر تقسیم ہوئے اور اسی شمار میں ان سے بھی فوجیں مرتب ہوئیں۔ غرض اس سے یہ تھی کہ وقت پر جلد سے جلد کافی تعداد میں فوج میسر ہوسکے۔ ہر فوج کا افسر اس شخص کو مقرر کیا جس سے چنگیز خاں ذاتی واقفیت رکھتا تھا۔ اور اسکو قابل اعتبار بھی جانتا تھا۔ یہ افسر ان لوگوں کے جن سے فوج مرتب ہوتی تھی عزیز بھی ہوتے تھے۔ اس تدبیر سے ایماقوں کی ترتیب کو مٹنے نہیں دیا اور ان کو ایک باقاعدہ فوجی تنظیم میں لے آیا۔ گو یہ فوجی تنظیم آج کل کے مقابلے میں بہت ہی ابتدائی شکل رکھتی ہے۔ جو لوگ محض اتفاق سے سرداری کے رتبے کو پہونچے تھے، جب وہ ہٹے تو ان کی جگہ ایسے آدمی مقرر کئے جو امرا کی جماعت سے تھے یا خان کی ملازمت میں رہے تھے اور ہمیشہ قواعد کی انہوں نے پابندی کی تھی۔ مغلوں میں ایک طریقے کے مطابق جو

ان میں قدیم زمانے سے چلا آتا تھا فوج کی تین حصوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ ایک حصے کو قول کہتے تھے یعنی مرکز یا قلب فوج اس نیایا کو افسر کیا۔ دوسرا حصہ جبر نغار تھا یعنی فوج کا بایاں بازو۔ اس کا افسر مقولی تھا تیسرا حصہ برنغار تھا یعنی فوج کا دایاں بازو۔ اسکو بغورچی بہادر کے تحت کیا جس وقت بغورچی کو برنغار کا افسر بنایا اس وقت چنگیز خاں نے اُس سے کہا "میں تم کو ۹ جرموں کی سزا سے مستثنیٰ کرتا ہوں۔ تم دہ ہزاری فوج کے افسر یعنی امیر تومان ہو جاؤ۔ اور مغرب کے ملکوں میں التائی کے پہاڑوں تک قوموں پر حکومت کرو" اسی وقت مقولی بہادر سے کہا تھا کہ تم میرے جبر نغار کے افسر ہو جاؤ اور مشرق کے ملک پر کراؤن کے پہاڑوں تک تمہارا فوجی علاقہ ہوگا۔ جو اعزاز تم کو بخشا جائے گا وہ تمہاری اولادوں میں بدستور قائم رہیگا"

چنگیز خاں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ اپنے سپہ سالاروں کو خود منتخب کر کے مقرر کرے اور ایسے لوگوں کو اس منصب پر مقرر کرے جن کے چال چلن، طور طریقوں سے خود واقفیت رکھتا ہو۔ ان سپہ سالاروں کو مقرر کر کے اُن کے کاموں پہ خود ہی نگرانی رکھتا تھا ایک موقع پر اس نے کہا کہ تومنان یعنی افسران دہ ہزاری فوج جو سال کے شروع اور اختتام پہ حاضر ہوکر خود ہماری زبان سے حکم سنکر اپنے اپنے موقع پر واپس جاتے ہیں وہی لوگ درحقیقت سرداری اور سپہ سالاری کے لائق ہیں لیکن جو سردار فوج اپنے خیموں میں بیٹھے رہتے ہیں اور ہماری ہدایتیں سننے بذاتِ خود حاضر نہیں ہوتے ان کا حال اس پتھر کا سا ہے جو گہرے پانی میں پھینک دیا گیا ہو۔ یا اُس تیر کا سا ہے جو نرسلوں کے بن میں چھوڑ گیا ہو........ ایسے آدمی سرداری کرنے کے قابل نہیں۔ ایک موقع پر چنگیز خاں جب سوبدائی بہادر کو ایک مہم پر روانہ کرنیلگا تو اس سے کہا کہ تم مجھ سے گو دور ہوگے لیکن یہ دوری نزدیکی کے برابر ہوگی۔ راہ میں تنگری (آسمان) تم کو سلامت رکھے گا اور تمہاری مدد کرے گا۔

خلاصہ یہ کہ لشکر پر افسری و سرداری شرفائے مغل کرتے تھے۔ یہی لوگ فوج محافظ کے اور یہی خاقان کے اُردو اور خیموں پر جو تعداد میں چنگیز خاں کی بڑی بیویوں کی تعداد کے مطابق چار تھے، مختلف خدمتوں پہ مامور و متعین رہتے تھے۔ ان خاندانی شریفوں کے ساتھ نویان اور نویان کے علاوہ ترکات (یعنی آزاد لوگ) تھے ان کے متعلق مختلف خدمتیں تھیں اور ان ہی خدمتوں کی وجہ سے وہ محصولوں سے مستثنیٰ تھے۔ اور ان کو اس بات کا حق دیا گیا کہ لڑائی میں جو مالِ غنیمت خود حاصل کریں یا شکار میں جو جانور خود شکار کریں وہ انہی کا حصہ سمجھا جائے۔ ترکات (آزاد لوگوں) میں سے بعض لوگ نویان کے مرتبے کو پہونچے۔ جن سرداروں کے پاس ہمراہی یا رعایا نہ تھی اگر انہوں نے عمدہ خدمات دکھائیں تو یہ دونوں چیزیں ان کو دی گئیں۔ جبی نویان اور سوبدائی بہادر سے چنگیز خاں نے کہا کہ جن لوگوں کو تم نے جمع کیا ہے ان پر افسر ہزارجات ہونے کی حیثیت سے حکومت کرو۔ بعض نسخوں میں ایسی بھی بیان ہوئی ہیں کہ چنگیز خاں نے ویگی کو جو بھیڑوں کا چرواہا تھا حکم دیا کہ وہ ایسے لوگوں کو جمع کرکے جن کے پاس رہنے کو گھر نہ ہوں ان پر ہزاری ہو جائے۔ انتظام کی غرض سے جب آدمیوں کی تقسیم ہوئی تو معلوم ہوا کہ گوبوگور بورچی کے پاس آدمیوں کی تعداد کم ہے چنگیز خاں نے اپنی تمام فوجوں کے سرداروں کو حکم دیا کہ ہر ہزارہ میں سے وہ چند آدمیوں کو علیحدہ کریں اور جو آدمی اس طرح علیحدہ ہوں ان پر گوبوگور اور قبیلہ جاجرات کے مل کلکو فہر ہزارہ مقرر کیا جائے۔

علاوہ اس فوجی اصلاح اور اُمراء کا ستان میں انتظام کے چنگیز خاں نے اپنے اُردو کی تنظیم۔ صید و شکار اور رسد رسانی کا پورا بندوبست کیا۔ اسکے ساتھ دیوانی کے نظم حکومت کو بھی قاعدے پر لانا چاہا لیکن۔ دیوانی کا انتظام بہ نسبت فوجی انتظام کے اسکے لیے مشکل تھا۔ کیونکہ وہ خود اور اسکے مغل تمدن کے ابتدائی مدارج میں تھے۔ خاقان کو نہ لکھنا پڑھنا آتا تھا اور نہ سوائے اپنی مادری مغل زبان کے کسی دوسری زبان کو سیکھنے کی کبھی کوشش کی تھی لیکن معمولی ذہانت اور دور اندیشی سے اس نے لکھنے پڑھنے کے پیشے کو ہمیشہ بڑا ممتاز اور خاصکر اس سلطنت کی ضرورتوں کیلیے

جسکو وہ قائم کرنا تھا اسکو نہایت ضروری سمجھتا۔ اس نے اس نے حکم دیا کہ اُسکے عزیزوں اور ساتھیوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا جائے۔ شیگی کوتاکو کو چنگیز نے بھائی بنایا تھا، اس نے پڑھنے لکھنے میں بڑی ترقی کی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ایغوری علم و فن سیکھنے میں کسی کی طبیعت کو اس سے زیادہ مناسبت نہ تھی۔ چنگیز خاں نے اُسکو اپنی سلطنت میں سب سے بڑا قاضی مقرر کیا اور یہ ہدایتیں اُسکو خاص طور پر کیں۔ اب چونکہ میرے اختیارات تمام قوموں پر قائم ہو چکے ہیں اس لئے تم اب میرے کان اور آنکھیں ہوں۔ خیال رکھو کہ کوئی تمہارے کہنے کے خلاف نہ چلے۔ میں تمہیں اختیار دیتا ہوں کہ سرقہ اور دغا کے مقدمات میں تم ہی فیصلے سنایا کرو۔ اور سزا دیا کرو...... تم ان مجرموں کو سزائے موت دوگے جو اس سزا کے لائق ثابت ہوں گے جب کوئی مقدمہ فیصل کرو تو اسکو ایک سیاہ تختی پر لکھ لینا تاکہ آئندہ تمہارے فیصلوں میں کسی طرح کا کوئی ردوبدل نہ کرسکے۔ سلطنت کا قاضی مقرر کرنے میں بھی چنگیز خاں نے مردم شناسی کا وہی ثبوت دیا جو فوج کے سپہ سالاروں کے مقرر کرنے میں دیا تھا۔ شیگی کوتاکو نے اپنے فرائض منصب کو بڑی دیانتداری سے انجام دیا۔ اور آئندہ جو لوگ قاضی ہوئے ان کے لئے وہ ایک مثال ہو گیا۔ بیان ہوا ہے کہ شیگی کوتاکو ایسی شہادت کو قابل تسلیم نہ سمجھتا تھا جو گواہ میں خوف پیدا کرکے حاصل کی گئی ہو۔

ہر کام کے عملی پہلو پر نظر رکھنے کیلئے چنگیز خاں نے ایغوری خط میں اپنے مقولات (بلیک) اور قوانین (یاسا یا یاساق) تحریر کرائے چنگیز خانی یاسا میں دراصل مغلوں کے قانون عامہ کی تدوین کی گئی تھی۔ مگر بلیک اور یاسا ایک ہی وقت میں مرتب نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ وہ بتدریج مرتب ہو کر چنگیز خاں کی پوری زندگی کا کام ثابت ہوئے۔ چنگیز خاں یاسا وضع کرنے کو نہایت ضروری سمجھتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ میرے بعد جو حکومت کرنے والے ہونگے اور جو اہل دربار بہادر اور نوئنان اُن کے گرد و پیش ہونگے اگر انہوں نے جملہ امور میں یاسا کی پابندی نہ کی تو انتظام سلطنت میں اُن کو بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی۔ اور انتظام جاری نہ رہ سکے گا۔ اس وقت وہ چنگیز خاں کو ڈھونڈیں گے مگر چنگیز اُن کو نہ ملیگا۔ ایک اور موقع پر اُس نے کہا "آج سے سو یا ہزار یا دس ہزار برس بعد جو اولاد میری جگہ بیٹھے گی اگر اس نے ان قوانین کو محفوظ رکھا اور یاسا کو نہ بدلا تو تنگری (آسمان) اُن کے اقبال میں بڑی ترقی دیگا"۔ غرض اس طریقے سے چنگیز خانی یاسا کی پابندی سب کے لئے لازمی ہو گی۔ حتی کہ سلطنت کا مالک و خاقان خود اس کا پابند رہا۔ چنگیز خاں اس خیال میں تھا کہ وہ ایک ایسا مجموعہ قوانین جاری کر جائے جو کبھی نہ بدلے اور اُسکی اولاد بھی اسکی اتنی ہی پابند رہے جیسے کہ اس کے زمانے میں سب کا عمل اُس پر تھا۔ یہ ناقابل تبدیل قانون نہ تو اُس نے کسی متمدن قوم سے حاصل کیا تھا کیونکہ متمدن قوموں کی قدر اُسکے دل میں کچھ نہ تھی۔ اور نہ کسی الہامی کتاب سے اُسکو نقل کیا تھا۔ (حالانکہ ایک قادر مطلق پر وہ ایمان رکھتا تھا۔) یہ قوانین چنگیز خاں نے زبانی روایتوں رسم و رواج اور اپنے ایماق اور الوس کے خیالات سے اخذ کئے تھے۔ چنگیز خاں کو یقین تھا کہ ان رسم و رواج اور دستور کو ترقی دے کر قانون کی شکل میں پیش کرنے سے اس نے ایسے قوانین وضع کر دئے ہیں جو ہمیشہ قائم اور جاری رہیں گے۔ اور ہر زمانے اور وقت میں وہ اُن کے لئے مفید ہونگے۔ کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات نہ آتی تھی کہ مغل کوئی دوسرا قانون سوائے اُسکے جو اُس نے اُن کے لئے وضع کیا ہے اور جسکے اس وقت وہ پابند ہیں، بنا سکیں گے۔ لیکن دنیا ایسی جگہ ہے جہاں سب چیزیں بدلتی اور گذرتی چلی جاتی ہیں۔ چنگیز خانی یاسا بھی قانون نہ رہا۔ اور آج کل کے مغلوں کو یاد بھی نہیں کہ وہ کیا تھا۔ یاسا کی کوئی دفعہ بھی ان کو یاد یا اُنکے پاس محفوظ نہیں۔ چنگیزی یاسا کا اس وقت جو کچھ باقی ہے وہ اُسکے چند اجزا ہیں جن سے مشکل سے پورے یاسا کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کیا تھا۔ باوجود اسکے سلطنت مغلیہ میں جس کا بانی چنگیز خاں ہوا مغلوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں یاسا نے بڑا اثر کیا تھا۔ بلکہ نہ صرف مغلوں پر بلکہ ان قوموں پر بھی جنکو مغلوں نے مغلوب کیا تھا اسنے اپنا معتد بہ اثر پہونچایا۔

یاسا کی پابندی بڑی سختی اور ظلم سے کی جاتی تھی۔ تھوڑی مدت گذرنے پر تمام قلمرو میں قتل و رہزنی، دروغگوئی اور زناکاری کے وقوعے شاذ و نادر پیش آنے لگے۔ یاسا نے امرائی طرز حکومت اور دستور کو اپنی منظوری دیکر قطعی رائج کر دیا۔ عام رعایا اور غلاموں کو جنکی تعداد فتوحات میں ترقی کی وجہ سے

روز بروز بڑھتی جاتی تھی) یہ قوانین نہایت ناگوار تھے یہ قوانین اُنکے حق میں ظلم و تعدی کا ایک آلہ بن گئے۔

بلیک یعنی ملفوظاتِ چنگیزی ایسے اقوال تھے جو مختلف اوقات میں چنگیز خاں کی زبان سے نکلے تھے اور اسکو رفتہ رفتہ جمع کر کے ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا۔ اور صرف ایسے مقولات ضبطِ تحریر میں آئے تھے جنکے محفوظ رکھنے کے لئے چنگیز خاں نے حکم دیا تھا۔ ان بلیکوں میں اس میں شبہ نہیں کہ بعض مقولے چنگیز خاں کے ساتھیوں اور دوستوں کو یاد رہ گئے ہوں۔ اور اسکو یاد رکھنا بھی اس وجہ سے آسان ہو گیا ہو کہ خود چنگیز خاں اور اسکے زمانے کے لائق اور قابل لوگ اپنے خیالات اکثر نظم میں ظاہر کرتے تھے۔ یہ طریقہ بہت پرانا تھا۔ اور اسی کے ذریعے ایک ناخواندہ قوم اپنے اسلاف کے مقولات یاد رکھا کرتی تھی۔ بعد کے زمانے میں بانئ سلطنتِ مغلیہ کے اقوال کی بڑی عظمت اور قدر ہونے لگی۔ اور چنگیز خانی بلیک ایک حاکم یا فرمانروا کی تعلیم کا لازمہ سمجھے جانے لگے۔ لیکن چنگیزی یاسا کی طرح بلیک بھی ہمارے زمانے تک محض اجزا کی صورت میں پہونچے بعض اقوال ابتک مغلوں میں محفوظ ہیں۔ اور بعض چینیوں اور مسلمانوں کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

فوج اور دیوانی کی تنظیم کے بعد چنگیز خاں نے ایک عہدہ بیکی کے نام سے قائم کیا۔ یہ شخص سلطنت میں سب سے بڑا مذہبی عہدہ دار ہوتا تھا۔ اُسکے اختیارات بہت تھے اور اُسکے اعلیٰ مرتبے کو باضابطہ طریقے پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ ناظرین کتاب کو یاد ہوگا کہ بیکی کا منصب بہت قدیم وقتوں سے چلا آتا تھا۔ اور اس زمانے میں بیکی کا لقب خاص طور پر صحرائی ایماقوں اور الوسوں کے سردار کیلئے مستعمل تھا۔ چنگیز خاں نے جو منصب بیکی کا قائم کیا اس میں ایک سردار کے دنیاوی اختیارات بھی اُن اختیارات پر اضافہ ہوئے جو مذہبی پیشواؤں یعنی شامان کو حاصل تھے۔ شامان کے اختیارات کا حصہ ان تعلقات پر تھا جو اُسکو ایماق کے مورث اعلیٰ یا اُس قوت سے ہوتے تھے جو اسکی نگہبان اور محافظ ہوتی تھی۔ چنگیز خاں نے اب ایک سرکاری شامان کا عہدہ بھی قائم کیا۔ پہلا بیکی جو مقرر ہوا اس کا نام بیسون تھا۔ یہ بڈھا آدمی تھا اور قبیلہ بارین سے تھا۔ چنگیز خاں نے بیسون سے کہا کہ تم بارین کی اولاد میں سب سے بڑے ہو۔ اسلئے تمکو بیکی ہونا چاہئیے اور بیکی کی حیثیت سے تمکو سفید گھوڑے پر بیٹھنا اور سفید ہی کپڑے پہنے ہونگے اور ہر صحبت اور جلسے میں تمہاری جگہ سب سے اعلیٰ اور ممتاز ہوگی اور تمہارا کام اس بات کا معلوم کرنا ہوگا کہ کون کون سا مہینہ سب میں مبارک اور سعد ہے۔

اس اثنا میں لڑائیوں کا وہ سلسلہ چھڑا جس میں چنگیز خاں بذاتِ خود بہت کم شریک ہوا۔ مگر ان لڑائیوں نے سلطنتِ مغلیہ کی حدود کو منگولیا کی حدود سے آگے بڑھا دیا۔ ۱۲۰۷ء میں جوجی چنگیز کا سب سے بڑا فرزند برنغار کی فوج کے ساتھ صحرائی قوموں کے مقابلے کیلئے روانہ کیا گیا۔ یہ صحرائی قومیں جنکے مقابلے کیلئے جوجی چلا اویرات اور قرغیز کی تھیں۔ قرغیز مغلوں کی نسل سے نہ تھے۔ دریائے ینیسی کی بالائی وادی میں وہ آباد تھے۔ ملک ان کا بہت شاداب تھا۔ اور اس زمانہ میں وہاں غلہ کی پیداوار بہت تھی جس کو مسلمان اور اور سوداگر بھر کرے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں ان صحرائی قوموں کے ملک میں ایسے جانور جنکے پوستین عمدہ ہوتے تھے بکثرت تھے۔ شکرے اور شنقار بھی اکثر اس ملک سے دور دور بکنے جاتے تھے۔ جوجی پسر چنگیز نے ان صحرائی قوموں سے لڑنے میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ اور اُس نے باپ کی سلطنت کو ان صحرائی قوموں کے اچانک حملوں سے محفوظ کر دیا۔ جن بڑی سڑکوں کے ذریعے تجارت ہوتی تھی اُن کو بھی جوجی نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ قوم الیغور نے خود ہی اطاعت قبول کی۔ اور الیغور کے حاکم نے جس کا لقب ایدیقوت تھا ایک سفارت مغلوں کے خاقان کے پاس بھیجی۔ اور پھر چنگیز خاں کے پاس خود اظہار اطاعت کیلئے حاضر ہوا۔ چنگیز خاں نے اپنی بیٹی الج التون کی اس سے شادی کر دی۔

۱۲۱۱ء میں جیبی مو (یعنی بیچی) کے شمالی حصے کو کیلانی نایان نے فتح کیا۔ اس طرح مغلوں کے خاقان کی سلطنت جو خانہ بدوشوں کی سلطنت تھی ایسی قوموں پر بھی ہو گئی جو پرانا تمدن رکھتی تھیں۔ اور جہاں رعایا کا ایک بڑا حصہ ایک ہی جگہ مستقل قیام رکھکر زندگی بسر کرتا تھا۔

اس زمانے میں چنگیز خاں نے خانہ بدوش سلطنت کا انتظام جب پورا کر لیا تو اُس نے قبائل اور ایماق کو اپنی ماں اور اپنے بھائیوں اور

ساقی ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں
شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ للعہ مع
محصولڈاک۔ششماہی عہ

جُرعات

ہر سال ساقی کے چار خاص نمبر شائع
ہوتے ہیں مستقل خریداروں سے
اُن کی قیمت الگ نہیں لی جاتی۔

جلد ۱۲ | ساقی دہلی۔ بابت ماہِ اگست ۱۹۳۵ء | نمبر ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

"افسانہ نمبر" اپنے بلند پایہ افسانوں کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ قدردانی شرط ہے۔ ہماری طرف سے اس سے بھی بہتر خاص نمبر شائع کرنے کا وعدہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اردو کے بہترین اہلِ قلم ساقی کی ترتیب میں حصہ لے رہے ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سال جناب عنایت اللہ بی۔ اے سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن کے نہایت پُرمغز تاریخی مقالات ساقی میں شائع ہوئے اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ چنگیز خاں کے سوانحیات کی ہر قسط کا بہت بے چینی سے انتظار کیا جاتا ہے۔ واقعات اس قدر دلچسپ پیرائے میں پیش کئے گئے ہیں کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی خشک تاریخ کا مطالعہ کیا جا رہا ہے بلکہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی دلکش ناول زیرِ مطالعہ ہے۔ یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس اشاعت میں تمدنِ عرب پر آپ کا مضمون بہت لائقِ قدر ہے۔ اگر اس قسم کے مضامین غیر زبانوں سے ترجمہ کئے جائیں تو ہماری زبان دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر سکتی ہے۔ اسد فعہ حضرت امین حزیں، حضرت جگر مرادآبادی اور علامہ کیفی چڑیا کوٹی بھی بزمِ ساقی میں شریک ہیں۔ اسے ساقی کی خوش قسمتی سمجھئے کہ اس پایہ کے شعراء کے کلام سے ساقی مزین ہوتا ہے۔ ساقی کی ہر دلعزیزی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ حضرت امین حزیں جنہوں نے ایک عرصے سے رسائل کو اپنا کلام بھیجنا بند کر دیا تھا بزمِ ساقی میں نہ صرف ابکے شریک ہو رہے ہیں بلکہ آپ نے آئندہ کیلئے بھی وعدہ فرمایا ہے کہ مستقل طور پر قلمی اعانت فرماتے رہیں گے۔ اس لطفِ خاص کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا۔

ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ ساقی کے تین نوجوان مضمون نگاروں نے اس سال بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ہم جناب صادق الخیری، جناب طاہر قریشی اور جناب میرزا ادیب کی خدمت میں اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

زیرِ نظر اشاعت میں دہلی کے مشہور آرٹسٹ مسٹر بھون ورما کی دو تصویریں شامل ہیں۔ مسٹر ورما اس نوعمری میں بھی موقلم پر پوری دسترس رکھتے ہیں اور آپ کی ہر تصویر شائقین کے لئے جنت نگاہ ثابت ہوتی ہے۔ ہماری فرمائش پر آپ نے آئندہ بھی اپنی تصویریں نذرِ ساقی کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

ساقی بک ڈپو کے اہتمام سے دو نئی کتابیں اس مہینے شائع ہوئی ہیں۔ ایک مولوی عنایت اللہ صاحب کی کتاب "نجم السحر" ہے اور دوسری کتاب محترمہ طاہرہ دیوی شیرازی کا مجموعۂ مضامین ہے جو "سحرِ بنگال" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ عنایت اللہ صاحب نے رائیڈر ہیگرڈ کی کتاب "دی مارننگ اسٹار" کا ترجمہ کیا ہے۔ اس سے پہلے آپ کے کئی ترجمے مشہور ہو چکے ہیں مثلاً زلفی اور تائیس۔ ہمیں امید ہے کہ "نجم السحر" ان سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل کرے گی کیونکہ اصل کتاب اپنی خوبیوں کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کر چکی ہے اور ترجمہ بھی ایسا فصیح و سلیس کیا گیا ہے کہ اصل اور ترجمہ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی کے اعتبار سے محترمہ طاہرہ دیوی شیرازی کے مضامین کی ہر طرف سے مانگ ہے۔ ہم مسرور ہیں کہ ان کے سب مضامین یکجا کر کے "سحرِ بنگال" کے نام سے شائع کر دیے گئے۔ اس طرح اردو افسانہ نگاری میں نئی طرز کے افسانوں کی ایک عمدہ کتاب کا اضافہ ہو گیا۔

شاہد

ہمچو نقشِ کفِ پا نام و نشانم باقیست

انگلستان کے مشہور عالم اور مصنف سیموئیل لینگ کی کتاب "ہیومن اوریجنز" کا موضوع یہ ہے کہ تاریخ قدیمہ اور علوم جدیدہ کو تحقیق کرکے وہ تمام شہادتیں پیش کی جائیں جن سے تخلیقِ عالم اور عمرانِ ارض کا حال معلوم ہو اور دریافت ہو کہ آفرینشِ کائنات میں ابتدائی انسان نے شروع کے مدارج حیاتِ حیوانی سے گذر کر عملِ ارتقا سے کہاں کہاں اور کس کس طرح اپنی موجودہ شکل جسمانی اور قوائے ذہنی کو حاصل کیا۔ یہ عجیب و غریب حالات اور تبدیلیاں مدت مدید اور زمانہ کثیر المقدار میں عمل پذیر ہوئیں۔ اس نہایت طول طویل زمانے کو مختلف عہدوں میں تقسیم اور قائم کرکے ماہرینِ فن نے اُن کی مدت کا تخمینہ کیا ہے۔ ایک عہد تو وہ بتایا ہے جب کہ یہ کرہ جس پر ہم آباد ہیں گنبدِ آفتاب سے مشتعل حالت میں جدا ہو کر فضا میں اپنے ہی زور پر گردش کرنے لگا۔ پھر اس پر ہواؤں اور زلزلوں نے اپنا عمل شروع کیا۔ حتیٰ کہ برق و بارانِ آتش اور برف کے اثرات اور حدت و برودت کے انقلابوں کے بعد طبقاتِ ارض نے اپنی اپنی شکل اختیار کی۔ اور سطح زمین اپنے حال پر آئی۔ پھر موسموں میں ایسا اعتدال پیدا ہوا کہ ابتدائی ذراتِ ذی حیات نے ظہور پکڑا۔ نباتات اور حیوانات کا دَور آیا۔ اُن کی شکلیں اور صورتیں جیسے کہ دیگر اشیائے کائنات کا حال ہے اُس قانون کے عمل سے جو خالقِ حقیقی نے اپنے نقشِ اوّل میں ہمیشہ سے مضمر رکھا ہے، تبدیل ہوتی رہیں۔ تاآنکہ حیوانِ انسانی یا انسانِ حیوانی نے انسان مکمل کی شکل مع قوائے ادراک نطق اور عقل کے اختیار کرکے اپنے ہاتھوں کا ہنر دکھلانا شروع کیا۔ جیسے نمونے زمین کے طبقوں اور پہاڑوں کی تہوں اور مدفنوں سے برآمد ہوئے اور شائقینِ فن اس قابل ہوئے کہ انسان کے حالاتِ ماضی کو کسی قدر دریافت کریں۔ یہ مختلف دَور کروروں لاکھوں اور ہزاروں برس کے سمجھے گئے ہیں۔ دورِ آخر جسکو "تاریخی عہد" کہتے ہیں جس کی قسمیں بھی متعدد ہیں کم سے کم آج سے آٹھ یا نو ہزار برس کا تصور کیا جاتا ہے۔ اس دورِ آخر کے حالات میں جہاں مصنفِ کتاب نے انسانی تمدن کی بحث میں جہاں اور ملکوں کے پرانے تمدنوں کا ذکر کیا ہے وہاں جزیرۃ العرب کے پرانے تمدن کا حال بھی تحریر کیا ہے۔ میں نے اسی حصے کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ مضمون حسبِ ذیل ہے:-

عرب قدیم کا تمدن بابل، اشور اور مصر کے تمدنوں سے قدامت میں کچھ کم نہیں ہے

اُنیسویں صدی عیسوی میں تاریخی معلومات کا ایسا سامان جو قدامت میں بابل و مصر کے تاریخی دفتروں کو بھی مات کرے۔ ملکِ عرب سے دستیاب ہوا ہے۔ اور اُمید کی جاتی ہے کہ اس ملک سے تاریخی معلومات کا اور سامان دستیاب ہوگا۔ عرب ایسا ملک ہے جس کا علم غیر ملک والوں کو ہمیشہ سے بہت کم رہا ہے جس تک غیروں کی رسائی شاذ و نادر ہی وقوع میں آئی۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ یورپ کے چند سیاح علمی تحقیقات کے شوق میں جانوں کو ہتیلی پر رکھکر اس ملک کے اندرونی حصوں میں پہونچے۔ اور پرانے ویران شہروں کے موقع دریافت کرکے اُن کی شکستہ عمارات پر جو کتبے (جنکو مورخینِ عرب نے مسند یا مسانید لکھا ہے) دیکھے اور اُن کے چربے لیکر اپنے اپنے وطن کو واپس آئے۔ یہاں ان کتبوں کو پڑھنے اور اُن کا مطلب سمجھنے میں بڑے بڑے ذہین دماغ مصروف ہوئے۔ ڈاکٹر گلیسر نے تین مرتبہ جنوبی عرب میں آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کی۔ اور ایک ہزار اکتیس (۱۰۳۱) کتبوں کے چربے اتار کر ولایت کو لائے۔ جب یہ کتبے بڑی محنت اور کوشش کے بعد پڑھے گئے تو معلوم ہوا کہ عرب قدیم کی تاریخ کے متعلق اُن سے بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہے۔

تمدنِ عرب کا اثر تاریخِ عالم پر

ڈاکٹر گلیسر نے ان کتبوں کے جو پڑھے اُن کی اور اُن کی مثل دوسرے کتبوں کی مدد سے اتنا ہوا کہ عرب قدیم کی قوموں اور ان قوموں کے اعلیٰ تمدن اور وسیع تجارت کی نسبت جو مشتبہ و موہوم روایات چلی آتی تھیں وہ صاف اور روشن صورت اختیار کر کے ایک خاص درجۂ یقین تک پہونچ گئیں۔ پروفیسر سائی جو آثار قدیمہ کے تاریخی حالات معلوم کرنے میں مشہور دقیقہ شناس مانا جاتا ہے ایک جگہ لکھتا ہے کہ "جزیرۃ العرب جس کے عہد ماضی پر ابتک تاریکی چھائی ہوئی تھی حال کی تحقیقات سے دفعتاً روشن ہو گیا ہے۔ اور اب صاف نظر آتا ہے کہ ہادیٔ عرب کے ظہور سے ہزارہا برس پہلے اس ملک میں بڑی بڑی سلطنتیں تھیں۔ علم و ہنر کا چرچا تھا۔ دولت اور تجارت بکثرت تھی۔ ایسی حالت میں ممکن نہیں کہ عہد سلف میں ملک عرب نے تاریخ عالم پر اپنا اثر نہ پہونچایا ہو۔

ملک سباء

ناظرین توراۃ کو اس قدیم تاریخ کی سب سے پہلی جھلک ملکۂ سبا اور حضرت سلیمانؑ کی ملاقات کے تذکرے میں نظر آئی۔ توراۃ مقدس میں "کتاب سلاطین" کے مؤلف نے اس ملک زادی کو ایک مشہور شایستہ و متمدن پُرہیبت سلطنت کی ملکہ لکھا ہے۔ گو یہ نہیں کہہ سکتے کہ مؤلف نے جس کی تالیف واقعات کے صدہا برس بعد لکھی گئی اس واقعہ کو درحقیقت صحیح سمجھکر اپنے یقین کے ساتھ لکھا تھا یا محض ایک مشہور روایت کے طور پر اُسکو نقل کر دیا تھا۔ مگر جن تحائف کا ذکر ہوا ہے کہ ملکۂ سباء نے حضرت سلیمانؑ کو پیش کئے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ جس ملک کی یہ ملکہ تھی وہ سوائے عرب کے اور عرب میں بھی سوائے یمن کے دوسرا ملک نہ تھا۔ اور یمن ہی کو قدیم زمانے میں سبا کہتے تھے۔ اور اِس ملک کی حکومت اور تجارتی تعلقات سمندر پار سامنے کے ساحل حبشہ اور ارض سومالی میں بھی بلکہ مشرقی ساحل افریقہ پر جنوب کی سمت میں دور تک چلے گئے تھے۔ نیز اشوری کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سبا آٹھویں صدی قبل مسیح میں ایک بڑی سلطنت تھی۔ اور یہ سلطنت اتنی وسیع تھی کہ شمال میں اُسکی سرحدیں سلطنت نینوا سے جبکہ تگلاتھ پھیسر اور شیروکن ثالث اُسکے فرمانبردار تھے جا ملی تھیں۔ ان سلاطین نینوا کے زمانے میں سبا کی سلطنت کوئی نئی ریاست نہ تھی بلکہ وہ ایک دیرینہ مملکت تسلیم کی جاتی تھی۔ نیز پرانے کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مملکت سبا بابل اور مصر کی سلطنتوں کی مثل چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں کے اجتماع سے جن کے حاکم سیاسی اور مذہبی دونوں قسم کے اختیارات رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایک بڑی جلیل القدر سلطنت ہو گئی۔ چونکہ شہری ریاستوں کے حاکم اُمور دینی و دنیاوی دونوں کے ہادی اور سردار ہوتے تھے اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ مملکت سبا کا ابتدائی طرز حکومت ایک مذہبی نظم سیاست کا سا تھا۔ اور جس طرح ارض اشور میں اشور کو رب اور معبود مانتے تھے اسی طرح سلطنت سبا میں سبا کو رب اور معبود مانا جاتا تھا۔

سلطنت معان

ملک عرب میں جو کتبے دستیاب ہوئے ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ گو سباء کی سلطنت بہت پرانی تھی لیکن یمن میں وہ سب سے پرانی سلطنت نہ تھی۔ اور اس سے بھی پرانی ایک سلطنت کے زوال پر اس میں حکومت آئی تھی۔ اس سب سے پرانی سلطنت اور قوم کا نام معان تھا۔ اس پرانی سلطنت اور قوم کو یونان کے مورخوں نے منی این لکھا ہے۔ اِس وقت تک عرب کے کتبوں میں ۳۲ سبائی یا معانی بادشاہوں کے نام پڑھے گئے ہیں۔ حالانکہ

یہ کتبے ابھی تک تعداد میں مصر اور بابل کے کتبوں سے کم ہیں۔ عرب کے بعض کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ معانی سلاطین کی حکومت جنوبی عرب ہی تک جہاں اُن کا پایۂ تخت تھا محدود نہ تھی۔ بلکہ تمام جزیرۃ العرب شام اور مصر کی سرحدوں تک پھیلی چلی گئی تھی۔ معانی سلاطین میں تین بادشاہوں کے نام ان کتبوں میں اَب تک پڑھے گئے ہیں۔ یہ کتبے مقام تیما میں ملے ہیں۔ اور یہ تیما عرب کا وہ مقام ہے جسکو توراۃ میں تیما یا تیمان لکھا گیا ہے اور یہ مقام اُس راستے پر واقع تھا جو عرب سے دمشق اور جزیرہ نمائے سینا کو جاتا تھا جنوبی عرب میں پتھر کی لوح دیکھی گئی ہے جو خدائے اشتر کی تعریف میں اس مضمون کی نصب کی گئی تھی کہ "ہم منت گذار ہیں معبود اشتر کے جس نے ہم کو اُس لڑائی سے نجات دی جو ندی اور مصر کے درمیان ہوئی تھی اور اُس لڑائی سے بھی نجات دی جو جنوب اور شمال کے بادشاہوں میں ہوئی تھی! اور ہم شکر گذار ہیں اس لئے کہ ان لڑائیوں سے فارغ ہو کر ہم سلامتی کے ساتھ اپنے شہر قرنا میں واپس آگئے"۔ جن لوگوں نے یہ کتبہ نصب کیا تھا وہ اپنی نسبت لکھتے ہیں کہ ہم معان کے بادشاہ "ابی یدع یسیع" کے متوسل تھے اور اسی کی طرف سے تسنتر اور اشور اور دریا پار کے حاکم تھے۔ مصر کی یادگاروں میں تسنتر اکثر اُس قلعے سے مراد لی گئی ہے جو مصر کی سرحد پر عرب کی زمین میں جہاں سے نہر سویس (سویز) شروع ہوتی ہے واقع تھی۔ عرب کے ایک کتبے میں مقام غیزہ کا ذکر آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معان کے بادشاہوں کی حکومت ارض ادوم میں بھی تھی۔ اور فلسطین اور قرب وجوار فلسطین کی قوموں سے بھی سلطنت معان کے مراسم تھے۔ ایسی وسیع سلطنت میں تجارتی راستوں کی حفاظت کے لئے قلعے اور جا بجا بڑے بڑے شہر جو تجارت کی وجہ سے متمول ہو جائیں قائم کرنے ضروری ہوئے ہونگے مدتہائے دراز سے مشرقی ملکوں کا مال مغربی ملکوں میں تجارت کی غرض سے آیا کرتا تھا۔ یہ مال کچھ خلیج فارس اور بحر قلزم کے راستے مغرب میں آتا تھا اور کچھ خلیج فارس یا بحر قلزم کے اختتام پر اتار لیا جاتا تھا اور کچھ دور خشکی طے کر کے بحر متوسط میں پہونچا دیا جاتا تھا۔ اسی طرح مال کی آمد و رفت ایشیا کی زمین پر کاروانی راستوں سے بھی ہوا کرتی تھی۔ انہی راستوں پر جب ایک راستے پر یہودہ کے بادشاہ حضرت سلیمان نے صور کے بادشاہ کی مدد سے قبضہ کر لیا تو کچھ زمانے کے لئے یہودہ کے بادشاہ حضرت سلیمان کی سلطنت کو بہت عروج ہو گیا۔ اہل مصر اور اہل اشور اور قوم حتی کے درمیان جس قدر لڑائیاں ہوئیں اُن میں اکثر کی وجہ یہی تجارت کے راستے تھے۔ جنکو ہر ایک اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا۔

عرب کی مخصوص اشیائے تجارت

اس بین الاقوامی تجارت کیلئے ملک عرب کا موقع اہل عرب کے حق میں نہایت مفید تھا کیونکہ جزیرۃ العرب مشرقی اور مغربی ملکوں کے مابین واقع تھا۔ بڑے بڑے نفود اور ریگزاروں کی وجہ سے جن سے قافلوں کا گذرنا مشکل تھا باہر کے دشمنوں سے اُسے حفاظت میسر تھی۔ اور جو سمندر اس سے ملحق تھے وہ بھی اس طرح واقع تھے کہ ساحل پر جو آبادیاں تھیں وہ اُنکے سامنے جو سمندر پڑتا تھا وہ سب دشمن کی زد سے بچے ہوئے تھے جنوبی اضلاع عرب کو یہ نفع حاصل تھا کہ انہیں ایسی چیزوں کی پیداوار بکثرت تھی جنکی اس زمانے میں بہت ضرورت تھی اور اسی ضرورت کی وجہ سے ان چیزوں کی قیمت بھی زیادہ تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ جنوبی عرب کے سوا یہ چیزیں کہیں اور میسر ہی نہ تھیں۔ یہ وہ نباتی یا جمادی اشیا تھیں جنکو جلا کر دھونی دینے سے یا جسکو پیس کر ملنے یا چھڑکنے سے خوشبو پیدا ہوتی تھی جس زمانے میں کہ ملکوں ملکوں عبادتخانوں میں قربانی اور بلیدان کیلئے جانوروں کو ذبح کرنا دین کے سب سے بڑے فرائض میں ہو تو اُس زمانے میں ایسی خوشبودار دھونیوں اور بخور کی کس قدر مانگ رہی ظاہر تھی۔ ایک آزاد فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان کا ہیکل جسکو غیضۃ البنان کہا جاتا تھا آب و ہوا کے لحاظ سے ایک عظیم الشان قصاب خانے سے کم نہ ہوگا اور اسکی ہوا انسان کیلئے ہر وقت موجب آزار رہتی ہوگی۔ ایسی حالت میں انہی خوشبوؤں اور دھونیوں کے سہارے زائرین و خدام دونوں ان عبادتخانوں میں انکی بدبو اور بساند برداشت کر سکتے ہونگے اور یہی حال ایشیا کے ہزارہا ہیکلوں اور عبادتخانوں کا ہوگا بادشاہوں کے محل اور امیروں کے دولتکدے ان آئے دن کی قربانیوں کی وجہ سے حفظان صحت کے اعتبار سے خطرناک رہتے ہونگے۔ اور خون کی بدبو کی وجہ سے ہر وقت دھونیاں اور بخور روشن رکھتے ہونگے۔ غرض انہی اسباب سے دنیائے قدیم میں خوشبودار اشیا کا صرف بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور سوائے عرب کے اور عرب میں سوائے یمن کے کسی

سلطنت معان کی قدامت

دوسرا دلچسپ نتیجہ جو حال کے عربی اکتشافات سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اُن سے قدیم زمانے کی ایک عربی متمدن اور صاحب تجارت سلطنت کا حال ہی نہیں کھلتا۔ بلکہ یہ بھی دریافت ہوتا ہے کہ جس عربی قوم کی یہ سلطنت تھی وہ ایک لکھی پڑھی قوم تھی۔ جسکے پاس اسکے خود ایجاد کردہ حروفِ ہجا بھی موجود تھے۔ اور جس کا طرزِ کتابت ایسا نہ تھا جو دوسروں سے اختیار کیا گیا ہو بلکہ اپنا خود تھا۔ اور یہ دونوں چیزیں یعنی حروف ہجا اور طرزِ کتابت مصر کے مصوری اور بابل کے پیکانی حروف اور طرزِ کتابت سے بھی زیادہ پُرانا تھا۔ عرب کے کتبے سب سے پہلے سٹ زن صاحب کو دریافت ہوئے اور انہوں نے ۱۸۱۰ء میں اُن کے چربے لئے۔ شروع میں ان کتبوں کی عبارتوں کو اُن کی زبان اور طرزِ کتابت کے اعتبار سے حمیری زبان اور کتابت کے زمرے میں شامل کیا گیا۔ یہ بات جلد معلوم ہوگئی کہ ان کتبوں کی زبان سامی ہے اور حروف حبشی یا عربی حروف سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اور فنیقی خط کی ایک تبدیل شدہ صورت معلوم ہوتے ہیں۔ سطور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی طرف نہیں بلکہ کھڑی یعنی اوپر سے نیچے کو چلتی ہیں۔ اسکے بعد ڈاکٹر گلیسر کی مزید تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہونچا گیا کہ عرب کے یہ کتبے دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم دوسری قسم سے زیادہ پُرانی ہے۔

زیادہ پُرانی قسم میں اصل سامی زبان کی صرفی خصوصیتیں اور لغوی ترکیبیں زیادہ پائی جاتی ہیں اور یہ کتبے معان کی زبان میں ہیں۔ دوسری قسم کے کتبے جو کم پُرانے ہیں سبا کی زبان میں ہیں۔ اِس سے ثابت ہوا کہ معان کی سلطنت اور اُسکی زبان سباء کی سلطنت اور زبان سے پہلے کی ہے۔ زمانے کے دور نے معان کی زبان میں بہت سی تبدیلیاں اُس کی صرف اور لغت میں کردیں۔ اور یہ تبدیلیاں کسی غیر زبان کے اثر سے نہیں بلکہ وہ ازخود ایک ہی ملک اور ایک ہی قوم میں پیدا ہوئیں۔ حتیٰ کہ معان کی تبدیل شدہ زبان سبا کی زبان کہلائی گئی۔ کسی زبان کی ایسی کایا پلٹ کے لئے کہ اُس کا نام اور حیثیت تک بدل جائے صدہا برس کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اِس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ معان کی سلطنت سباء کی سلطنت سے صدہا برس پہلے گذری تھی۔ سلطنت سباء کی نسبت یہ امر یقینی ہے کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں موجود تھی۔ حضرت سلیمانؑ حضرت عیسیٰؑ سے ایکہزار برس پہلے گذرے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں سلطنت سبا کوئی نئی سلطنت نہ تھی بلکہ اُنکے زمانے میں وہ ایک سن رسیدہ حکومت ہوچکی تھی۔ اور صدہا برس سے قائم چلی آتی تھی۔ اس وقت تک ۳۲ معانی بادشاہوں کے نام دریافت ہوئے ہیں۔ ممکن ہے مزید تحقیقات سے اور نام بھی دریافت ہوں۔ معانی کتبوں میں جو کتبے سب سے پُرانے ہیں۔ وہ مصر کے کتبوں کی طرح اپنے زمانے سے سابق کے زمانے کی تجارت اور تمدن کی خبر دیتے ہیں۔ پس اس سے لازم آیا کہ عرب کو بھی مصر اور بابل کے زمرے میں شامل کرکے اُسکو ایسا ملک سمجھنا چاہیے جو پُرانے سے پُرانے زمانے میں بھی بڑی بڑی متمدن قوموں کا گھر تھا۔ اور یہ امر خلافِ قیاس نہ ہوگا کہ جنوبی عرب کے کتبے آخر الامر انکشافِ حالات میں ہم کو اس عہدِ پیشیں تک پہونچا دیں جبکہ بابل میں شراکن اول (۲۰۰۰ ق م) اور مصر میں مینس حکومت کرتے تھے۔ یعنی عرب قدیم کے تمدن کی ابتدا گویا آج سے چار ہزار برس پیشتر ہوئی تھی

تین ہم عصر تمدن

عرب، بابل اور مصر کے تمدنوں کا ہمعصر ہونا ایسا خیال ہے جسکو تقریباً صحیح اور قابلِ یقین سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ بہت سی پُرانی روایات سے یہ بات پیدا ہے کہ جنوبی عرب اور اُسکے نزدیک شمال مشرقی ساحل افریقہ دُنیا میں ابتدائی تمدن کا سرچشمہ تھے۔ ایک معبود اوانیس کی نسبت بیان

ہوا ہے کہ وہ بحرِ فارس سے برآمد ہوا جس کا ایک ساحل عرب کا ملک ہے اور اس اوانیس نے اہلِ بابل کو تمدن کا سبق دیا۔ فنیقی اپنی اصل بحرین سے بتاتے ہیں جو عرب ہی کا ایک جزیرہ ہے۔ مصرِ قدیم کے لوگ ارضِ پنت کا نام بڑے ادب سے لیتے تھے۔ اور ارضِ پنت سے مراد جنوبی عرب اور اس کے سامنے سمندر پار ارضِ سومالی سے لی جاتی تھی۔ مصرِ قدیم کے باشندوں نے اپنے تمدن اور طرزِ کتابت کی اصل مصرِ شمالی یا مصرِ جنوبی سے نہیں بتائی بلکہ مصرِ وسطیٰ میں مقام عبدوس سے بتائی ہے۔ یہاں کسی زمانے میں توت اور اوسیرس حکومت کرتے تھے۔ یہ مقام وہ ہے جہاں دریائے نیل ساحل قلزم سے بہت ہی قریب آجاتا ہے اور اسی مقام سے وہ قریب کا راستہ نکلا ہے جس سے عرب اور مصر میں مدتہائے دراز تک تجارت وغیرہ کے تعلقات قائم ہوئے۔

مصر اور ارضِ پنت کے لوگوں میں جو تعلقات تھے وہ ان تعظیمی جملوں سے ظاہر ہوتے ہیں جو مصری کتبوں میں پنت کی نسبت پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ اہلِ مصر قریب کی غیر قوموں کی نسبت جن میں حتی۔ لیبیائی یا سوڈانی تھے سخت الفاظ مثلاً وحشی یا بدکار استعمال کرتے تھے۔ پنت کی تعظیم و تکریم کرنے کا ثبوت ان حالات سے بھی ملتا ہے جو مصر کے انیسویں شاہی خاندان کی ملکہ ہتاسر کے بحری سفر سے دریافت ہوتے ہیں۔ اس ملکہ نے تجارت کی غرض سے ایک بڑا بیڑا جہازوں کا تیار کرایا اور پنت کے ملک کو گئی اور وہاں سے بہت سا قیمتی مال لیکر وطن کو واپس آئی۔ پھر پنت کا بادشاہ اور اسکی ملکہ بھی تحائف لیکر فرعون (بادشاہِ مصر) اور اس کی ملکہ کی ملاقات کو آئے۔ ملکہ ہتاسر کے اس سفر کے حالات پڑھنے سے ملکہ سبا اور حضرت سلیمانؑ کی ملاقات کا واقعہ یاد آتا ہے۔ اس قصہ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مصر اور پنت کے ملکوں میں اتحاد بڑھا ہوا تھا۔ اور بحرِ قلزم میں عرب اور افریقہ کے درمیان جہاز رانی کا بازار خوب گرم تھا۔

سامی قوم

تمام شہادتیں اس نتیجے پر پہونچاتی ہیں کہ بنی سام کا وطن جنوب مغربی ایشیا میں غالباً عرب کا ملک تھا۔ ہر جگہ سامیوں کی یہی کیفیت دریافت ہوتی ہے کہ وہ ایک مہاجر اور فاتح قوم تھے اور جس ملک پر وہ چڑھکر گئے وہاں انہوں نے غیر قوموں کو پہلے سے آباد پایا۔ عرب کو چھوڑکر جو انکا وطن تھا۔ ہر جگہ ان کی شان فاتح و فوجکش کی رہی۔ بابل اور اشور میں سامیوں کا پہونچنا یعنی کسی گروہ کا جنوب کی طرف سے اور کسی کا بحرِ فارس کی راہ سے اور کسی کا عرب اور شام کے نفود اور ریگزاروں کو طے کر کے ارضِ دجلہ فرات میں داخل ہونا نہایت پرانی روایات سے ثابت ہے۔ اضلاعِ فرات میں پہونچکر یہ سامی قوم سومر میں (جو ایک تورانی قوم تھی) اور وہاں پہلے سے آباد تھی مل جل گئی۔ اور پھر بنی سام قوم سومر پر غالب آگئے۔ ملک مصر میں سامی عنصر بعد کو پہونچا۔ اور خیال یہ ہے کہ بنی سام کا کوئی دائمی اثر مصر پر نہ پہونچا۔ سام اور فلسطین میں فنیقی۔ کنعانی۔ عبرانی سب ایسے لوگ تھے جو نقلِ مکان کر کے ان ملکوں میں آئے تھے۔ اور یہ لوگ وہ تھے جو عرب سے خشکی کے راستوں بابل اور اشور میں ہوتے ہوئے شام اور فلسطین میں وارد ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے کہیں اپنے کو شام یا فلسطین کا باشندہ نہیں کہا ہے۔ بلکہ ہمیشہ یہی کہا کہ جب ہم ان ملکوں میں پہونچے تو ہم نے وہاں دوسری قوموں کو مثلاً قوم عموری اور حتی کو وہاں قابض پایا۔ عموری اور حتی کے حالات سے دریافت ہوتا ہے کہ وہ اپنے سابقین یعنی ان ملکوں کے اصلی باشندوں زموزمیم کا پتہ دیتے ہیں جنکی زبان عموری اور حتی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بنی سام نے جو رتبہ مسلمان ہوکر ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں حاصل کیا وہ ان کو ہادیِ عرب صلعم کی فتوحات اور تبلیغِ اسلام کے باعث حاصل ہوا۔ جب سے کہ حیاتِ انسانی کی سرگذشت میں تاریخی عہد شروع ہوتا ہے اسوقت سے بنی سام ملکِ عرب میں آباد ملتے ہیں۔ غالباً ان کی زبان اور عادات ایسے تمدن کے دور میں قائم ہوئے جو معان کے تمدن سے بھی پہلے کا تھا۔

اور یہ وقت وہ ہوگا جبکہ معان کی قوم "حجری عہد" نکل کر "معدنی عہد" میں پہونچی ہوگی۔ اور اُسکی معاشرت صیادی اور ماہی گیری کی ابتدائی حالت سے بدل کر اونچے درجوں یعنی کاشتکاری اور تجارت کے دور میں آگئی ہوگی۔

معان کی زبان اور کتابت

جن دوروں کا اوپر ذکر آیا اُنکے حالات کو چھوڑکر اب ہم معانی زبان اور طرز کتابت کا کچھ ذکر کرتے ہیں۔ معانی کتبوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حروف میں معانی زبان لکھی گئی ہے۔ وہ حروف قدیم سے قدیم فنیقی کتبوں کے حروف سے بھی پہلے کے ہیں۔ یونانی اور رومانی اور آج کل کی اکثر قوموں میں جو حروف مستعمل ہیں وہ فنیقی حروف ہجا سے نکلے ہیں۔ لیکن اس بات کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ معانی حروف پرانے سے پرانے فنیقی حروف سے بھی بیشتر کی ایک صورت دکھاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض علمار لسانیات نے یہ سوال پیدا کر رکھا ہے کہ کہیں فنیقی حروف کی اصل جنکی ساری دُنیا نے نقل اتاری ہے جزیرۃ العرب ہی سے تو نہیں ہے؟ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ معانی زبان اور معانی کتابت سامی زبانوں میں سے ایک پرانی زبان اور سامی طرز ہائے کتابت کی ایک شکل ہے۔ ایک قیاس یہ ہے کہ معانی حروف کی کچھ شکل بدلکر ان کو معان کی ہم نسل قوموں یعنی ان سامی قوموں نے اختیار کر لیا جو عرب سے ملے ہوئے ملکوں میں آباد تھیں۔ اور قافلوں کی آمد و رفت اور تجارت کی وجہ سے عرب سے انکے تعلقات ہمیشہ سے گہرے چلے آتے تھے۔ دوسرا قیاس یہ ہے کہ تمام سامی قومیں فن کتابت سے اُس وقت تک محروم رہیں جب تک کہ فنیقیہ والوں نے مصر کی کتابت اختیار کرکے دُنیا کو حروف ہجا نہ سکھائے۔ ہماری رائے میں قیاس اول بہ نسبت دوسرے قیاس کے زیادہ قرین صحت ہے۔ قیاس اول کو اگر صحیح مان لیا جائے۔ یعنی یہ کہ فنیقیہ والوں نے بجائے مصر کے معان کی کتابت کا فن اختیار کیا تو فنیقی حروف کی وجہ تسمیہ کہ کیوں الف کو الف اور بے کو بے کہتے ہیں بخوبی معلوم ہوجاتی ہے۔ فنیقی حرفوں کے نام اکثر ان اشیار کے ناموں کے مطابق نہیں ہیں جن اشیا کی صورت پر حرف کی شکل ابتدائی فن کتابت میں اکثر قائم کی گئی تھی۔ مثلاً معانی حرفوں میں پہلے حرف کی صورت بیل کے سر کی سی ہے۔ فنیقی حرفوں میں پہلے حرف کی شکل بیل کے سر کی سی نہیں ہے لیکن اس کا نام الف ہے جسکے معنی فنیقی زبان میں "بیل" کے ہیں۔ اس سے اتنا ضرور ظاہر ہوا کہ معان کے ایک حرف کی صورت دیکھکر جو بیل سے مشابہ تھی، فنیقیہ والوں نے اپنے پہلے حرف کا نام الف رکھا۔ گویا فنیقیہ والے جب اپنے حروف کے لئے نام وضع کرتے تھے تو معان میں حروف ایجاد ہوکر اُن سے کتابت جاری ہوچکی تھی۔

نتیجہ

ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ عرب کا قدیم تمدن مصر اور فنیقیہ اور بابل و آشور کے تمدن سے قدامت میں کم نہ تھا۔ عرب کے اس تمدن نے اپنی شان ملک عرب ہی کے حصوں میں نہیں دکھائی بلکہ عرب کی متوطن قوموں یعنی سامیوں نے جب دوسرے ملکوں میں نقل مکان کیا تو اپنی شائستگی اور تمدن کا اثر غیر قوموں پر ایسا ڈالا کہ ان ملکوں کی مجموعی تہذیب و تمدن سامی یا عربی تمدن کے نام سے تاریخ قدیمہ کے صفحوں پر درج کی گئی۔ اُمید ہے کہ آئندہ کسی مضمون میں ان واقعات اور نتائج کے بیان کرنے کی کوشش کرینگے جس سے قیاس ہو کہ سامی اور عربی دراصل ایک ہی بات ہے۔ اکثر عرب سامی ہیں اور اکثر سامی عرب ہیں اور دُنیا کے بہت کچھ آثار جو سامیوں سے منسوب کئے جاتے ہیں دراصل عربی اقوام کے کرشمے ہیں۔

عنایت اللہ دہلوی

نکات

جب تلک غم میں کامرانی ہے
کامرانی ہی زندگانی ہے
زندگی دل لگی نہیں ہے میاں
خدمت تری ہے جانفشانی ہے

یہ بجا ہے غم محبت شادمانی ہے
بن گئی عشق کی کہانی ہے
چشم تر سے یہ آنسو بہا آئی
ساون ہے برسات پانی ہے

دل کی موت اپنی ہی عمر فانی ہے
ماسوائے خدا سب کہانی ہے
جو کہ ہے بنائے وحشت ناک کو خاک
جلوہ روح جب اور وانی ہے

رنج و غم ہے شادمانی ہے
… پیشہ زندگانی ہے
… ہو گئیں
وہ … حسرت کی … پانی ہے

امین حزیں

اورنٹیل لائبریری ٹوکیو

ٹوکیو میں منجملہ دیگر لائبریریوں کے ایک لائبریری اس نام سے قائم ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مشرقی ممالک پر کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ یہ تمام کتب غیر زبانوں میں ہیں۔ محققین کے لئے یہ لائبریری بیش بہا ہے۔ معاملات چین پر تو دنیا میں اس سے بہتر کوئی لائبریری نہیں ہے۔ اسکی بنیاد ڈاکٹر ماریسن کی وہ کتب تھیں جو انہوں نے بیس سال کے قیام پیکن کے زمانے میں فراہم کی تھیں اور جو "ماریسن لائبریری" کے نام سے موسوم تھیں۔ ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر ماریسن نے چند وجوہ سے اپنی لائبریری "بیرن ہسایا اواساکی" کے ہاتھ فروخت کر دی۔ بیرن اواساکی نے ڈاکٹر ماریسن کی وصیت کے بموجب اس کا دائرہ وسیع کر کے موجودہ لائبریری قائم کی اور بعد ازاں خود اس میں بیشمار کتب ایشیائی ممالک پر خرید کر جمع کیں۔ اورنٹیل لائبریری کی اہمیت اور وسعت کو سمجھنے کے لئے ڈاکٹر کے سوانح حیات اور ماریسن لائبریری کا حال معلوم کرنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر جارج ارنسٹ ماریسن ۱۸۶۲ء میں وکٹوریا (آسٹریلیا) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کالج کے پرنسپل تھے اور انکے خاندان والوں کو ورزش کا شوق تھا۔ ماریسن بھی لڑکپن ہی سے کھیل کود میں ہوشیار تھے۔ مدرسہ چھوڑنے کے بعد ان کے شوق نے عملی صورت اختیار کی اور وہ بقول خود اٹھارہ برس کی عمر سے سیاح بن گئے۔ تعلیم یونیورسٹی کے زمانے میں انہوں نے جنوبی آسٹریلیا اور وکٹوریا کے جنوبی ساحل کا پیدل سفر کیا۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر انہوں نے جزائر بحرالکاہل کا عزم کیا۔ ان جزائر کے باشندے کوئینزلینڈ (آسٹریلیا) کے کھیتوں میں مزدوری کے لئے لائے جاتے تھے۔ اور ان پر بڑا ظلم کیا جاتا تھا۔ ماریسن نے تحقیقات کر کے اخبار ملبورن میں احتجاج کیا۔ ان کی تحریروں پر ان کی بہت لے دے ہوئی مگر گورنمنٹ نے شنوائی کی۔ ایک مرتبہ جزیرہ نیوگنی کے سفر میں وہ دیسیوں کی لڑائی میں سخت زخمی ہو گئے تھے۔ ایک ہمراہی پروفیسر نے ان کا علاج کیا اور انہی پروفیسر کی رہنمائی میں ماریسن نے ڈاکٹری سیکھی اور ۱۸۸۷ء میں ایم، ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ازاں بعد ڈاکٹر ماریسن نے ممالک متحدہ امریکہ سے اسپین، فرانس اور مراکو تک کی سیاحت کی۔ مراکو میں شریف کے درباری طبیب رہے اور پیرس میں دو برس تک ایک شفاخانے کے افسر رہے۔

۱۸۹۳ء میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر ماریسن مشرق بعید کی جانب روانہ ہوئے اور ۱۸۹۴ء میں شنگھائی سے رنگون تک بری سفر کیا۔ اس سفر کے اختتام پر وہ انگلستان واپس گئے اور وہاں لندن ٹائمز کی نامہ نگاری پر مامور ہوئے۔ آخر ۱۸۹۵ء میں سیام روانہ ہوئے اور یہاں بارہ مہینے مسلسل سیاحت میں گذارے۔ اس سفر کے جو حالات اخبار ٹائمز میں شائع ہوئے انہوں نے انگلستان اور خصوصاً فرانس میں کافی شہرت حاصل کی۔ اس سفر میں جب وہ ملک چین میں موجود تھے تو پلیگ کا سخت حملہ ہوا اتفاق سے بیماری کے قبل ان کے کیمپ میں ڈاکہ پڑ چکا تھا اور ان کی تمام ادویہ ڈاکو لے گئے تھے۔ آس پاس کہیں شفاخانہ نہیں تھا۔ نہ کہیں سے طبی امداد ملنے کی توقع تھی۔ ڈاکٹر ماریسن نے عجیب طریقے سے اپنے پلیگ کا علاج کیا۔ مکان کے چونے کے چکلے آتشدان میں جو ہر چینی کے گھر میں ہوتا ہے آگ روشن کرائی جب فرش خوب تپ گیا تو اس پر لیٹ گئے۔ تپتے ہوئے فرش سے تمام پسینہ جاتا رہا آپ بیٹھ گئے۔ مگر پلیگ کافور ہو گیا۔ بقول خود انہوں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ عجیب کوئی تجربہ نہیں کیا۔

اوائل ۱۸۹۷ء میں لندن ٹائمز کو چین کے دار السلطنت میں ایک مقیم نامہ نگار مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اس جگہ ڈاکٹر ماریسن کا تقرر کیا گیا۔ ان کو چین میں اپنے کام سے نہایت دلچسپی تھی مگر جب کبھی سیاسی امن ہوتا اور ان کو فرصت ملتی تو سیاحت کا دورہ اٹھتا تھا اور وہ اندرون ملک میں یا قرب وجوار کے ملکوں کا سفر کرتے تھے۔ جب جرمنی نے کیاؤچاؤ پر قبضہ کیا تو تفصیلی حالات اخبار میں شائع ہوتے تھے مگر ڈاکٹر

مارسین کے تاروں میں ایک مدبر کی سی پیش بینی اور مورخ کی سی صحت ہوتی تھی۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں شورش باکسر کے زمانے میں انہوں نے پیکن کی سفارتخانوں کی حفاظت میں عملی حصہ لیا۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں پورٹ آرتھر میں جاپانی افواج کے فاتحانہ داخلے کے وقت موجود تھے۔ اور صلح نامہ پورٹسمتھ میں بھی نامہ نگار ٹائمز کی حیثیت سے شریک تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے پیکن سے سرحدِ سیام تک اندرون ملک سفر کیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں پیکن سے روسی ترکستان تک تقریباً چار ہزار میل سفر گھوڑے پر کیا۔ انہوں نے سوائے تبت کے چین کے تمام صوبے دیکھے تھے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں جمہوریت چین کے اول پریسیڈنٹ نے ڈاکٹر مارسین کو اپنا پولیٹکل مشیر مقرر کیا۔ اور انہوں نے ٹائمز کی نامہ نگاری سے استعفیٰ دیدیا۔ جب جنگ عظیم ختم ہوئی تو وہ چین کے نمائندوں کیساتھ صلح کانفرنس میں شریک ہوئے۔

ڈاکٹر مارسین تمام دنیا میں "پیکن کے مارسین" کے نام سے مشہور تھے۔ وہ ہمیشہ دل سے کام کرتے تھے۔ جذبات کے غلام نہ تھے مگر بڑے حوصلہ مند تھے۔ واقعات کے متعلق انکی پیش بینی ضرب المثل ہوگئی تھی۔ پیکن میں انکے مکان کی خصوصیت لائبریری کی طویل عمارت تھی۔ جو چین کے بارے میں دنیا کی بہترین لائبریریوں میں شمار ہوتی تھی۔ اُن کا انتقال سنہ ۱۹۲۰ء میں ہوا۔

مارسین لائبریری ڈاکٹر مارسین کی بیس برس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اُس کی ابتداء ۱۸۹۷ء سے ہوئی جب وہ ٹائمز کے نامہ نگار کی حیثیت سے پیکن میں وارد ہوئے تھے۔ اس میں چین اور متصلہ ممالک کے حالات پر کتابیں ہیں جو اکثر یورپین زبانوں میں ہیں۔ اول اول ڈاکٹر مارسین یہ کتابیں پیکن کے بین الاقوامی محلے کے ایک مکان میں رکھتے تھے۔ بعد میں جب انہوں نے ذاتی مکان بنالیا تو اس میں منتقل کردیں۔ یہ لائبریری اس قدر مشہور ہوگئی کہ جس سڑک پر ان کا مکان تھا اُس کا نام مارسین اسٹریٹ پڑگیا۔ یہ لائبریری اُن کی ذاتی ملکیت تھی مگر حالات چین کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے والے اصحاب کو اس سے استفادے کی اجازت تھی۔ اسی وجہ سے مستشرقین میں بہت مشہور ہوگئی۔ اسکے متعلق مسٹر ڈیوڈ فریزر کا ایک مفصل مقالہ سنہ ۱۹۱۲ء میں اخبار "نارتھ چائنا ڈیلی نیوز" میں شائع ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں چین کے دیگر رسالوں میں بھی مقالے شائع ہوچکے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباسات مسٹر فریزر کے مقالے سے ماخوذ ہیں۔

ڈاکٹر مارسین نے مشرق بعید میں بیس سال کے مسلسل سفر اور مطالعے سے مشرق کی وسیع معلومات حاصل کرلی تھی۔ اپنی معلومات سے فائدہ اٹھاکر انہوں نے بڑی محنت سے کتابیں جمع کرنی شروع کیں۔ اور اب یہ لائبریری ایسی بلند پایہ ہے کہ ایشیا کی بابت ایسی مکمل لائبریری دنیا میں کہیں اور موجود نہیں ہے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں مرحوم مسٹر آرچیبالڈ لٹل نے مشرق بعید پر کتاب لکھتے وقت دیباچے میں ظاہر کیا تھا کہ میں نے ڈاکٹر مارسین کی لائبریری سے پیکن میں استفادہ کیا تھا۔ اور میں نے اُسے معاملات چین پر قابل قدر ذخیرہ پایا۔ اسکے بعد بھی انہوں نے بہت سی اہم کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔ کتب فروشوں میں وہ اس قدر مشہور ہوگئے تھے کہ جب کبھی انہیں معاملات مشرق پر نایاب کتاب دستیاب ہوتی تو پہلے ڈاکٹر مارسین کو اُس کی اطلاع دیتے تھے کہ آپ کو اس کتاب کی ضرورت تو نہیں ہے۔

ڈاکٹر مارسین نے اُس زمانے میں کتابیں خریدنی شروع کردی تھیں جب انہیں چین آنے کا خیال تک نہ تھا۔ سنہ ۱۸۹۷ء میں پیکن میں ٹائمز کی نامہ نگاری پر مامور ہونے کے بعد تو اُن کا یہ معمول ہوگیا کہ ملک چین کی بابت ہر کتاب ہر زبان میں خریدنے لگے اور اس مقصد کیلئے کتب فروشوں کی فہرستیں باقاعدہ مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس لائبریری میں چین، تبت، منگولیا، منچوریا، علاقہ کاشغر، سائبیریا، کوریا، فارموسا اور چین کے متصلہ ممالک پر کتابیں جمع ہیں۔ اس میں وسط ایشیا اور چین کی مغربی حدود پر روس و برطانیہ کی رقابت پر کتب کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔

اس لائبریری میں بیس زبانوں کی کتابیں فراہم کی گئی ہیں جن میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی، فلینڈی، ڈچ، ڈنمارکی، سویڈنی، ناروئیجی، اطالین، لیٹن، اسپینی، پرتگیزی، ترکی، عربی، فارسی اور عبرانی شامل ہیں۔ صرف لغات کی تعداد ۴۰۰ ہے جن میں اٹھارھویں اور سترھویں صدی کے نسخے بھی شامل ہیں جو اب نایاب ہیں۔ ان میں یورپین زبانوں میں منگولی، تبتی، منچو، بوریت اور ترکی کی لغات بھی موجود ہیں۔ ترکی زبان میں ملک چین کی بابت کتابوں کا ایک مکمل ذخیرہ ہے۔ ان میں سے اکثر مذہب اسلام کی بابت ہیں۔ یہ کتابیں کسی سفیر امریکہ متعینہ استانبول نے ڈاکٹر ماریسن کو پیش کی تھیں۔

اس لائبریری میں کثیر التعداد نسخے ایسے ہیں جن پر ان کے مصنفین یا مالکوں نے حاشیے چڑھائے تھے۔ ایسی کتابیں بھی بہت سی ہیں جو مشہور لائبریریوں سے آئی ہیں، مثلاً [illegible]، ڈیوک آف [illegible]، ڈیوک آف نارفاک، ڈیوک آف کیمبرج وغیرہ کی لائبریریوں سے۔ اس میں مارکوپولو کے اکتالیس نسخے موجود ہیں۔ ان میں ۱۴۹۶ء کا اطالوی زبان کا پہلا اور نہایت نایاب نسخہ شامل ہے۔ ایسا ہی نایاب نسخہ ۱۵۰۳ء کا اطالوی زبان کا ہے۔ بہت سے نسخے سترھویں صدی کے ہیں۔ انکے علاوہ پہلا انگریزی نسخہ، پہلا فرانسیسی نسخہ بھی موجود ہے۔ حال میں ڈاکٹر ماریسن نے اس کا پہلا نسخہ مطبوعہ ۱۴۸۵ء بزبان لیٹن حاصل کیا ہے۔ تمام لائبریری میں یہ سب سے پرانی مطبوعہ کتاب ہے۔

معلومات چین کی کتب فراہم کرنے میں ڈاکٹر ماریسن کے ذہن نے بڑی دور دور رسائی کی ہے۔ چنانچہ الیور گولڈ سمتھ کی کتاب "سٹیزن آف دی ورلڈ" کا نایاب پہلا نسخہ مطبوعہ ۱۷۶۲ء لائبریری میں موجود ہے۔ رابنسن کروسو اپنے دوسرے سفر میں چین پہونچا تھا اور صحرائے گوبی و سائبیریا کے راستے یورپ واپس گیا تھا۔ چنانچہ اس کتاب کا پہلا نایاب نسخہ مطبوعہ ۱۷۱۹ء بھی فراہم کیا ہے۔ چین کے متعلق تمام مضامین پر احاطہ کیا گیا ہے۔ مثلاً گولڈ کی کتاب "برڈز آف ایشیا" کی سات شاندار جلدیں موجود ہیں جس میں پرندوں کی دستی تصاویر ہیں اور جس کی طباعت میں ۱۸۵۰ء سے ۱۸۸۳ء تک ۳۳ برس لگے تھے۔ ڈونوان کی کتاب "انسکٹس آف چائنا" مطبوعہ ۱۷۹۸ء جس میں دستی تصاویر شامل ہیں۔ سر جوزف فیرر کی کتاب "تھینا توفیڈیا آف انڈیا" جس میں ہندوستان کے سانپوں کے علاوہ چین کے زہریلے سانپوں کا بھی [illegible]

اس احتیاط سے لائبریری کو مکمل کیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سالانہ اور ماہوار رسالوں کی پوری جلدیں موجود ہیں۔ مثلاً [illegible] کی تمام جلدیں ۱۸۰۸ء سے [illegible]، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا جرنل، جرنل ایشیاٹک، جرنل ہنکن اورینٹل سوسائٹی، چائنیز ریکارڈر، جاپان ریویو، ایشیاٹک سہ ماہی ریویو، وغیرہ۔

عیسائی مشنوں کے متعلق اس قدر کتابیں فراہم کی گئی ہیں کہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ چین کی بابت دنیا کی کوئی لائبریری اتنی مکمل نہیں ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے برطانیہ کی تمام بلیو بکس موجود ہیں جو بہت قابل قدر مجموعہ ہے۔ چین کی بابت برطانوی قونسل خانوں کی رپورٹیں تمام و کمال موجود ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ فارین ریلیشنز کا بھی تمام سٹ موجود ہے، جو اب دستیاب ہونا بہت مشکل ہے۔

لائبریری میں سینکڑوں نقشے بھی موجود ہیں جن میں سے سب سے پرانے ۱۵۵۰ء کے ہیں۔ بہت سے پرانے نقشوں میں کوریا کو جزیرہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کو دریائے یالو اور تومین براعظم سے جدا کرتے ہیں اور یہ دونوں دریا آپس میں مل جاتے ہیں جس سے ایک قسم کی آبنائے بن جاتی ہے۔ یہ نقشے بہت سی زبانوں میں ہیں اور بعض میں ہاتھ سے بڑے خوبصورت رنگ بھرے ہیں۔

شاید لائبریری کا سب سے قابل قدر پہلو یہ ہے کہ مشرق بعید پر جو پمفلٹ مختلف ممالک میں شائع ہوتے رہے ہیں، ان کا مجموعہ فراہم کیا گیا ہے۔ ان میں مشرق بعید اور مشرق وسطےٰ کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے اور ان سے سینکڑوں الماریاں بھری پڑی ہیں۔ ایک الماری میں جنگ روس و جاپان کی کتابیں ہیں۔ عہدناموں پر جتنی کتابیں پبلک کے لئے شائع ہو چکی ہیں سب موجود ہیں اور ان میں روسی، جاپانی، برطانوی، اور

امریکہ کی گورنمنٹوں کی مطبوعات شامل ہیں۔

شورشِ باکسر (سنہ ۱۹۰۰ء) پر مکمل مواد موجود ہے، اس میں سو سے زیادہ کتابیں محاصرۂ پیکن پر ہیں۔ اس شورش میں لائبریری پر بڑا سخت حادثہ پیش آیا تھا۔ یہ لائبریری اُس وقت بھی مشرق بعید میں سب سے بڑی تھی اور بربادی سے بال بال بچ گئی۔ اُس وقت یہ لائبریری ایک ایسے مکان میں تھی جو بین الاقوامی محلّے کے وسط میں واقع تھا اور جہاں اب اطالوی سفارتخانہ موجود ہے۔ ۲۴ جون کی صبح کو کرنل ششیبا نے ڈاکٹر مارلیسن سے کہا کہ یہ مکان جاپانی افواج کے حلقے میں ہے مگر فی الوقت جاپانی افواج کو پیچھے ہٹانے کی ضرورت ہے اور جب فوج ہٹ جائے گی تو یہ مکان حملے کی زد میں آجائے گا۔ ڈاکٹر مارلیسن نے شہزادہ سُو سے لائبریری کو پناہ دینے کی درخواست کی۔ ان کا محل قریب ہی تھا اور اس میں چینی عیسائی پناہ گزیں تھے۔ سینکڑوں عیسائی جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے محل سے مکان تک قطار باندھ کر کھڑے ہوگئے اور دم کے دم میں تمام لائبریری محل میں محفوظ جگہ منتقل ہوگئی۔ مکان خالی کرنے پر جاپانی محافظ سپاہ ہٹ گئی اور چند گھنٹے کے اندر اندر وہ مکان تباہ ہوگیا۔ پیکن کی دوسری لائبریریاں ایسی خوش قسمت نہ تھیں۔ تمام پادریوں کی لائبریریاں اور دیگر اشخاص کی لائبریریاں بھی برباد ہوگئیں۔ ان لائبریریوں کی تباہی کے بعد ڈاکٹر مارلیسن کی لائبریری کی وقعت اور بھی بڑھ گئی۔

اس لائبریری میں چینی زبان کی ایک بھی کتاب نہیں ہے۔ تمام کتابیں غیر زبانوں میں ہیں۔ تمام کتابوں کو بڑی باقاعدگی سے تقسیم و ترتیب دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے ڈاکٹر مارلیسن برسوں سے ایک ماہر سکرٹری رکھتے ہیں۔ اس وقت لائبریری ایک آتش پروف مکان میں قائم ہے جو حال میں اس کے لئے بنایا گیا ہے۔ ایک وسیع ہال کے چاروں طرف بیشمار الماریاں قرینے سے لگی ہوئی ہیں۔ دن کے وقت اوپر سے روشنی آتی ہے اور رات کو بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ ہزاروں قیمتی کتابیں ایسی ہیں جن پر زرِ کثیر صرف کر کے ڈاکٹر مارلیسن نے بڑی خوبصورت جلدیں بنوائی ہیں اور یہ مشرقی شان کا ایک نمونہ پیش کرتی ہیں۔

بعض وجوہ کی بنا پر ڈاکٹر مارلیسن نے اپنی لائبریری سنہ ۱۹۱۷ء میں فروخت کرنی چاہی اور اعلان کیا کہ ۱۷ء کے آخر تک فروخت کر دی جائے گی۔ اسے خریدنے کی بیسیوں فرمائشیں وصول ہوگئیں جن میں سے چار قابل ذکر ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی، ییل یونیورسٹی، کلیفورنیا یونیورسٹی اور ڈاکٹر پال رنش سفیر امریکہ متعینہ پیکن۔ مگر قیمت کسی سے طے نہ پائی۔ ۱۷ء کے موسم بہار میں مسٹر الونے گورنر یوکوہامہ اسپیشی بنک اور مسٹر اوداگیری مینیجنگ ڈائرکٹر بنک مذکور نے اس لائبریری کو جاپان کے لئے خریدنے کی ضرورت محسوس کی اور انہوں نے ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کو مقرر کیا کہ کتابوں کی قیمت کا اندازہ کریں۔ ان دونوں صاحبان نے بیرن ایواساکی کو ترغیب دی کہ لائبریری نایاب ہے خرید لیجئے۔ چنانچہ انہوں نے ۳۵ ہزار پونڈ میں خریدنی منظور کی۔ سودا طے ہوگیا اور ڈاکٹر مارلیسن نے چند شرائط پر بتاریخ ۲۹ اگست ۱۷ء کو تمام کتب لائبریری مسٹر اوداگیری کے حوالے کر دیں۔ مسٹر اشیدا موجودہ لائبریرین کو پیکن روانہ کیا گیا کہ وہ ٹوکیو میں لائبریری منتقل کرنے کا انتظام کریں۔ سفیر جاپان متعینہ پیکن کی درخواست پر چینی پولیس نے پیکن سے ٹینٹسن بندرگاہ تک حفاظت سے کتابیں پہونچانے کیلئے گارڈ متعین کر دیا اور ۲۷ ستمبر کو ساٹھ بڑے بڑے صندوق ٹوکیو کے اسٹیشن پر پہونچ گئے۔

بیرن ایواساکی نے ان بکسوں کو اپنے ایک مکان واقعہ فکاگاوا کے گودام میں عارضی طور سے رکھوا دیا۔ یہاں ایک نئی مصیبت نازل ہوئی۔ دو تین روز ہی گذرے تھے کہ ٹوکیو میں شدید طوفان آیا اور سمندر میں سخت تلاطم برپا ہوا۔ اس تلاطم سے سمندر زمین پر چڑھ آیا اور ایک لہر دور

تک فکاگاوا کے علاقے میں پھیل گئی۔ تمام بکس پانی کی زد میں آگئے اور کتابوں میں پانی سرایت کر گیا۔ فوراً بند کے بند بکس بیرن اوآساکی کے دفتر واقعہ مارونوچی میں منتقل کئے گئے اور کتابوں کی درستی کا کام شروع کر دیا گیا۔ ماہرین کے مشورے سے کتابوں کے سکھانے اور صاف کرنیکا کام کیا گیا۔ پھر انکی جلد بندی کرائی گئی۔ اس عمل سے تقریباً تمام کتابیں درست ہوگئیں مگر پھر بھی تھوڑی سی کتابیں ناکارہ ہوگئیں اور انہیں خارج کر دیا گیا۔ صفائی کے بعد ایک پختہ عمارت میں کتابیں منتقل کی گئیں اور وہیں انکی ترتیب کا انتظام شروع کیا گیا۔

لائبریری فروخت کرتے وقت ڈاکٹر مارلیسن نے تین شرطیں کی تھیں۔ اوّل یہ کہ تمام کتابیں ایک ہی مکان میں "ڈاکٹر جی، ای، مارلیسن لائبریری" کے نام سے رکھی جائیں گی۔ دویم یہ کہ اگر اسی مقصد کو مدنظر رکھکر کوئی بڑی لائبریری قائم کی جائے تو اس میں مارلیسن لائبریری ایک جزو کی حیثیت سے شریک کیجا سکتی ہے۔ سویم یہ کہ سنجیدہ شائقین کو لائبریری میں کتابیں پڑھنے کی اجازت دیجائے۔

اس وصیت کو مدنظر رکھکر بیرن اوآساکی نے بہت سی ایسی کتابیں خریدیں جو ڈاکٹر مارلیسن نے جمع نہیں کی تھیں اور مارلیسن لائبریری کو ایک اہم جزو قرار دے کر اس کا دائرہ وسیع کیا۔ ایک ایشیائی لائبریری قائم کرنے کے ارادے سے بیرن اوآساکی نے اس کا نام "تویوبنکو" یعنی اورنٹیل لائبریری رکھا۔ اس لائبریری کیلئے ایک علیحدہ عمارت بنانی تجویز ہوئی اور نومبر ۱۹۲۲ء میں تعمیری کام شروع کر دیا گیا۔ دوسرے سال یعنی یکم ستمبر ۲۳ء کو توکیو اور یوکوہامہ میں بڑا خوفناک زلزلہ آیا اور توکیو کا بڑا حصہ اور پورا یوکوہامہ آگ سے جل کر تباہ ہوگیا۔ اس حادثے سے بہت سی لائبریریاں زلزلے کے صدمے یا آگ سے برباد ہوگئیں مگر یہ لائبریری بچی رہی۔ اسی سال ماہ نومبر میں لائبریری کی عمارت مکمل ہوگئی اور اس میں کتابیں منتقل کر دی گئیں۔ اسکے بعد ایک سال تک کتابوں کی تقسیم و ترتیب کا کام ہوتا رہا۔ آخر کار ۲۹ نومبر ۲۴ء کو اورنٹیل لائبریری کا افتتاح ہوا۔ اس واقعہ کے دس روز قبل بیرن موصوف نے تمام املاک پبلک کے نام پر وقف کرا دی۔ اس میں کتب لائبریری، عمارت لائبریری، قطعہ زمین لائبریری، فرنیچر اور لائبریری کے مصارف کیلئے زرنقد شامل ہے۔ صرف کی جملہ میزان تین لاکھ پونڈ ہوتی ہے۔

مارلیسن لائبریری میں پچیس ہزار کتابیں شامل ہیں۔ اس میزان میں ہر کتاب کو ایک جلد شمار کیا گیا ہے خواہ اس کی کتنی ہی جلدیں ہوں۔ مثلاً اینوئل رجسٹر کی جلدیں ۱۷۵۸ء سے اب تک کی موجود ہیں اور یہ تمام جلدیں ایک کتاب مانی جاتی ہیں۔ بیرن موصوف نے اس میں غیر زبانوں کی پچیس ہزار کتابیں اضافہ کی ہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر جاپان کی بابت ہیں مگر ان میں منچوریا، منگولیا، وسط ایشیا، ایران، مغربی ایشیا، ایران، وسط ایشیا، ہندوستان اور بحرالکاہل جنوبی پر بھی کتابیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ تیئیس ہزار کتابیں چینی زبان کی حاصل کی گئی ہیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جو قدیم کتابیں اور کاغذات ہاتھ نہ لگ سکے ان کے فوٹو حاصل کر کے لائبریری میں شامل کر دئے گئے ہیں۔

لائبریری کی نگرانی دس متولیوں کے بورڈ کے سپرد ہے۔ عملی انتظام پانچ ڈائرکٹر کرتے ہیں۔ ان کے ذمے نگرانی کے علاوہ پانچ فرائض ہیں۔

(۱) کتابوں کی خرید جو لائبریری کا اہم ترین فرض ہے۔ ان کی قیمت اس روپے کے سود سے ادا کی جاتی ہے جو بیرن اوآساکی نے وقف کیا ہے۔ خریدنے کی منظوری ڈائرکٹر دیتے ہیں۔

(۲) جو شائقین کسی خاص فن کا مطالعہ کرنا چاہیں یا کوئی تحقیقات کرنی چاہیں ان کو عہدہ داران لائبریری اپنا اطمینان کر کے لائبریری کے

[redacted]

ریڈنگ روم میں کتابیں پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ریڈنگ روم صبح نو بجے سے سہ پہر کے چار بجے تک کھلا رہتا ہے۔ اتوار اور قومی تعطیل کے روز بند ہوتا ہے۔ یہاں ہمیشہ جاپانی، چینی، کوریوی اور یورپین محققین مطالعے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ریڈنگ روم میں قلم استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، پنسل سے اپنی کاپیوں میں نوٹ کر سکتے ہیں۔ لائبریری کی کتابیں گھر لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔

(۳) جاپانی اور یورپین زبانوں میں پمفلٹوں کی اشاعت۔ اس کیلئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے، وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔

(۴) لائبریری کے ہال میں تقاریر کے جلسوں کا انتظام۔ یہ جلسے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ قلت گنجائش کی وجہ سے عام پبلک کو ان جلسوں میں شرکت کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ تحقیقات کے شائقین کیلئے مخصوص ہوتے ہیں۔ مقرر عموماً یونیورسٹیوں کے پروفیسر ہوتے ہیں۔

(۵) وقتاً فوقتاً لائبریری کی مقبوضہ نایاب کتابوں، نقشوں، تصاویر وغیرہ کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔

اورنٹیل لائبریری کی عمارت شاندار ہے۔ اسکے چاروں طرف باغ لگا ہوا ہے۔ سامنے کا حصہ سہ منزلہ ہے۔ اسکے ایک پہلو میں ریڈنگ روم ہے جس میں محققین بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں تقریباً تیس نشستوں کا انتظام ہے۔ ہر ایک کیلئے علیحدہ میز کرسی ہے۔ اسی کمرے میں فہرست کتب ہے جو کارڈ سسٹم پر مرتب ہے۔ دوسرے پہلو میں آڈیٹوریم ہے جہاں تقاریر ہوتی ہیں۔ اس میں تقریباً سو نشستوں کا انتظام ہے۔ بیچ کے حصے میں دفتر کے کمرے ہیں۔ یہیں چند کمرے ایسے بھی ہیں جن میں محققین آرام سے بیٹھ کر سگریٹ پی سکتے ہیں اور دماغ کو آرام دے سکتے ہیں۔ ملازمین کے رہنے کے کمرے بھی اسی حصے میں ہیں۔

پوری عمارت انگریزی حرف "یو" کی شکل کی ہے۔ "یو" کی ایک ٹانگ سامنے کا حصہ ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا۔ دوسری ٹانگ اور پیٹ دونو کتابوں کے ذخیرے کا کام دیتے ہیں۔ ذخیرے کا حصہ پانچ منزلہ ہے۔ اس میں لفٹ کے ذریعے سے اترتے چڑھتے ہیں۔ ہر منزل میں دو طرفہ کتابوں کی الماریاں اس طرح چنی ہوئی ہیں کہ چھوٹے چھوٹے کمرے معلوم ہوتے ہیں۔ ہر کمرہ ایشیا کے کسی خاص خطے کے لئے مخصوص ہے۔ مجھے ترکی زبان کی کتابیں دیکھنے کا شوق تھا۔ مگر مجھے یہ حصہ دیکھکر بڑی مایوسی ہوئی۔ یہاں بہت کم کتابیں نظر آئیں۔ شاید ان میں سے اکثر سیلاب کی نذر ہو گئیں۔

عربی فارسی کی بہت سی پرانی کتابیں یورپ کی مطبوعہ موجود ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر جرمنی محققین کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ عربی میں تاریخ طبری (۱۵ جلد) معجم البلدان (۱۲ جلد) جغرافیہ یاقوت ابن عبداللہ حموی (۱۵ جلد) بڑی ضخیم کتابیں ہیں۔ انکے علاوہ نوبۃ الدہر فی عجائب البر والبحر مصنفہ ابوطالب دمشقی، سفرنامہ ابن جبیر، جغرافیہ محمد ابن موسیٰ خوارزمی، جغرافیہ ابوالفدا، تاریخ ابن خلدون، تاریخ مسعودی، آثار الباقیہ مصنفہ البیرونی، کتاب الانساب مصنفہ عبدالکریم سامانی، تاریخ خوارزم مصنفہ محمد النساوی، فتوح البلدان مصنفہ احمد ابن یحییٰ بلاذری، معرفت الادیب مصنفہ یاقوت الحموی، تاریخ ابن خلکان، کتاب محمد الشہرستانی، الروضۃ الطبیہ مصنفہ عبیداللہ بن جبرائیل بختیشوع، بھی موجود ہیں۔ یہ کتابیں اصل تصانیف کے دیباچے ہیں یا اجزا ہیں کیونکہ صرف ایک ایک جلد موجود ہے۔

فارسی میں تاریخ مستوفی قزوینی، طبقات ناصری، تاریخ برخواند۔ نزہت القلوب، تاریخ وصاف۔ کشف المحجوب، شاہنامہ فردوسی، چہار مقالہ نظامی عروضی، عمر خیام۔ فریدالدین عطار۔ گلستاں بوستاں موجود ہیں۔

افسوس ہے کہ عربی فارسی میں ابھی جاپانی محقق پیدا نہیں ہوئے۔ ان زبانوں کی کتابیں ڈاکٹر مارتین کی جمع کردہ ہیں۔ اب ان میں اضافے کی امید نہیں۔ بہرحال محققین کے لئے اس لائبریری میں بہت مواد موجود ہے۔

شعیب حسن برلاس (جاپان)

خونِ جگر

عشق نے توڑی سر پہ قیامت۔ زورِ قیامت کیا کہیئے
سُننے والا۔ کوئی نہیں رُودادِ محبّت کیا کہیئے

دل ہے کسی کا رازِ حقیقت۔ رازِ حقیقت کیا کہیئے
حیرتِ جلوہ مُہر بہ لب ہے، جلوۂ حیرت کیا کہیئے

ایک تجلّی۔ ایک تبسّم۔ ایک نگاہِ بندہ نواز
اس سے زیادہ۔ اے غمِ جاناں دل کی قیمت کیا کہیئے

شیشۂ دل۔ وہ ہستیِ نازک ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا
اُس پہ کسی کے تیرِ ستم کی مشقِ سیاست کیا کہیئے

جب سے اُس نے پھیر لیں نظریں رنگِ تباہی آہ نہ پوچھ
سینہ خالی، آنکھیں ویراں۔ دل کی حالت کیا کہیئے

مقدس معصیت

اُسے کسقدر فخر تھا اپنے زہد و اتقا پر۔ کتنا ناز کرتا تھا اپنی تقدیس و طہارت پر۔ سمجھتا تھا کہ دنیا سے منہ موڑ کر جنگل میں آ جانے سے اس نے نفس پر فتح حاصل کر لی ہے۔ وہ خوش تھا کہ دنیا کی معصیت سے بچ نکلا ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے سرابِ زندگی کو بے نقاب کر کے ان حقیقتوں کو معلوم کر لیا ہے جو خوب و زشت میں امتیاز پیدا کرتی ہیں۔ اسے یقین تھا کہ اب میں نسوانی فطرت کی سحر کاریوں، حسن و جمال کی فتنہ سامانیوں، عشق و محبت کی [illegible] کی دسترس سے کوسوں دور ایک ایسی معصوم فضا میں پہونچ گیا ہوں جہاں صرف الوہیت رقص کرتی ہے تقدس کی نے پر۔ جہاں مخلوقِ سماوی کے نغمے بیدار ہوتے ہیں تاروں کی جھلملاتی آغوش میں۔

وہ راہب تھا، ایک تارک الدنیا راہب۔

نمودِ سحر سے وہ چڑیوں کے دلفریب چہچہوں، آبِ رواں کی رقیق رنگینیوں اور بادِ صبا کے نرم جھونکوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اس برگزیدہ ہستی کی حمد و ثنا میں محو ہو جاتا جس نے ــــ خود اُسکے اعتقاد کے مطابق ــــ اسے صرف اسی مقصد کے لئے تخلیق کیا تھا۔ وہ گھنٹوں سجدہ سہو میں پڑا رہتا۔ حالانکہ چلتے چلتے دھوپ ڈھل جاتی اور رات کی تاریکیاں حسبِ معمول کائنات کے ذروں پر پھیل جاتیں۔ خود رو درختوں کے پھل اور بہتے ہوئے دریا کا شفاف پانی ہی اُسکے کام و دہن کی لذت کیلئے کافی تھا۔

ایک روز حسبِ معمول وہ ساحل کے قریب بیٹھا عبادت میں مشغول تھا کہ لہروں کے شگافوں میں ایک زرنگار سفینہ نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف [illegible] اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس کی نظریں جم گئیں۔ اور جم کر اس مرکز پر قائم ہو گئیں جو نسوانی رعنائیوں کا حامل تھا۔ دریا کی ہر موج کے ساتھ سفینہ قریب آتا گیا یہانتک کہ ساحل کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔

اس کے اعضا پر لباس یا تو تھا ہی نہیں، اور اگر تھا تو محض برائے نام۔ اس قدر باریک اور ایسے رنگ کا جو اعضا کی لحمیت سے وصل ہو کر جلد میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اور اسی کا ایک جزو معلوم ہونے لگتا ہے۔

سفینہ کے ٹھہر جانے پر اس نے ایک رباب اٹھا لیا۔ نازک انگلیوں میں جنبش ہوئی۔ اور فضا میں تاروں کی جھنکار سے ایک مترنم تموج کا تلاطم برپا ہونے لگا۔ پھر لبوں کی شگفتگی نے ان نغموں کو سنا دیا جو اس وقت تک رباب کے تاروں سے بھی بیدار نہ ہو سکے تھے۔ راگ کے زیر و بم کے ساتھ شباب و رعنائی کے حامل سینہ عریاں میں بھی ایسا نشیب و فراز پیدا ہوتا۔ گویا وہ خود ایک زندہ ساز ہے۔ جو آرزومند ہے صرف ایک مضراب کا۔ گاتے گاتے خود ہی پر ایک محویت طاری ہونے لگی۔ اور در حقیقت اس وقت موسیقی کا یہی اعجاز ہونا چاہیئے تھا کہ خود مغنیہ وجد میں آ جاتی۔

راہب نے سب کچھ سنا اور سنتے سنتے اُسے اپنے جسم میں وہ تھرتھری محسوس ہونے لگی جو خون میں سرعتِ رفتار پیدا ہو جانے کے بعد نمایاں ہوتی ہے۔

اُسے یقین ہو چلا کہ اگر ماحول بدستور رہا تو آج عمر دراز کا تمام زہد و اتقا اس حسینہ کے قدموں میں ڈالدینا پڑے گا۔ اسلئے پوری احتیاط کے ساتھ وہ اس طرح پنبہ بگوش ہو گیا کہ بیرونی صدا تو در کنار اس کے قلب کی دھڑکن بھی اس کی سماعت پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ لیکن اُس کی آنکھیں ــــ غیر ارادی طور پر وہ اسی مرکز پر جمی رہیں۔

نغموں کو دوبارہ آسودۂ خواب کر کے وہ ساحل پر اس طرح اتر آئی گویا برق کی ایک لہر ہے جس کا اضطراب متشکل ہو گیا ہے۔ وہ رقص کے انداز میں کمر کے

اندر بل ڈال کر اس طرح کھڑی ہو گئی گویا کالی ناگنوں کو لہرانے کی تعلیم دے رہی ہے۔ پھر ہاتھوں کو شانوں کے متوازی کر کے ساعدِ سیمیں میں خفیف حرکت شروع کر دی اور اسکے ساتھ ہی بائیں ٹانگ میں تھوڑا سا خم ڈالکر پاؤں کی انگلیوں سے کسی ناشنیدہ نغمے کے سروں پر تال دینے لگی۔ اس طرح کہ کائنات کے ذرّوں سے ہم آہنگ ہو کر بدن کا ہر رونگٹا گنگنانے لگا۔ بکھرے ہوئے بال اور منتشر ہو گئے۔ ابھرے ہوئے مینائے شباب کو کچھ اور سرفرازی نصیب ہوئی۔ آنکھیں تھرکنے لگیں، بھویں مٹکنے لگیں اور بحیثیت مجموعی اسکے تمام جسم پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو طوفانی سمندر میں موجوں کے ہچکولوں پہ ڈگمگاتی ہوئی کشتی پر ہوتی ہے۔ پھر وہ رقصِ طاؤس کے انداز میں پشت کی جانب جھکی اور اتنی جھکی کہ سر زمین سے آلگا۔

اس وقت اس کے جسم کا وہ مخصوص حصہ مکمل عریانی کے عالم میں راہب کی آنکھوں کے سامنے تھا جس کے معکوس ساغروں میں خون بھی شراب معلوم ہونے لگتا ہے۔

راہب کو اندیشہ ہوا کہ مبادا تابِ ضبط نہ رہے۔ اس لئے اس نے منہ موڑ کر آنکھیں بھی بند کر لیں لیکن دل و دماغ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کیونکہ پیشانی پر پڑنے والے بلوں اور اندازِ نشست سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ منتظر ہے یہ معلوم کرنے کیلئے کہ اب عورت کے پاس وہ کونسا حربہ باقی ہے جسکے ذریعے اسکی اہرمنی قوتیں بروئے کار آسکتی ہیں۔

کچھ دیر سکوت طاری رہا۔

حسینہ کشتی کے قریب جاکر کھڑی ہو گئی۔ راہب نے ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ آنکھیں اس طرح کھولنی شروع کیں۔ گویا نسیمِ صبح کے لطیف جھونکوں اور قطرہ ہائے شبنم کی مساعدت سے دو غنچے بتدریج شگفتہ ہو رہے ہیں۔

یہ دیکھکر کہ وہ کشتی میں بیٹھکر چلے جانے کا ارادہ کر رہی ہے۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ شیطانی وسوسوں سے نجات مل گئی لیکن عین اسوقت جبکہ وہ سکّان کو پکڑ کر اندر بیٹھ جانے کی آمادگی ظاہر کر رہی تھی۔ اس نے ارادتاً اپنا توازن بگاڑ دیا۔ اور پانی میں جا پڑی۔ اپنے ہاتھوں کی بے قاعدہ جنبشوں اور ہراسناک ہلکی چیخ سے اس نے راہب کو محسوس کرا دیا کہ وہ تیرنا نہیں جانتی۔

راہب نے کچھ دیر اسے بغور دیکھا۔ لیکن پھر یقین ہو گیا کہ ایک انسانی ہستی خطرے میں ہے۔ اس لئے فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور بے تحاشہ دریا میں کود پڑا۔ چند لمحے بعد حسینہ بیہوشی کے عالم میں اس کی آغوش میں تھی۔ اور وہ اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا یہ دیکھکر کہ اُسکے آنسو بھی بہہ رہے ہیں اس کا دل ہل گیا۔

اُف ! یہ حسین آنکھیں ! اور اشک آلود ـــــ

جوشِ ہمدردی میں اُس نے حسینہ کو اپنے سینے سے لپٹا لیا اور خاکستری لبوں سے اسکے پپوٹوں پر گرم بوسے ثبت کر کے آنسوؤں کو خشک کر دینا چاہا۔ اُس نے آنکھیں کھولدیں اور اپنی اس کامیابی پر مسکرانے لگی۔

اپنی جان کو مصیبت میں پھنسا کر اور اشکوں کے تقاطر سے فریب دے کر دوسروں کی ہمدردی حاصل کر لینا صنفِ نازک کا وہ آخری اور کامیاب حربہ ہے جسکے مقابلے میں تیر و تفنگ کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔

نمودِ سحر سے قبل اس خواب بیداری کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ مناظرِ قدرت کی کیفیات بدستور تھیں۔ لیکن خلافِ معمول دیکھا گیا کہ راہب جنگل کے گوشۂ تنہائی کو چھوڑ کر شہر کے ہنگاموں کی طرف قدم بڑھا رہا ہے کیونکہ یہ حقیقت اس پر روشن ہو چکی تھی کہ صنفِ نازک سے منہ موڑ کر تارک الدنیا ہو جانا ایک ایسا تقدس ہے جو اپنی عمومیت کے لحاظ سے ایک زبردست معصیت ہے۔

طاہرہ دیوی شیرازی

مُغنّی

بپا کر کے نوائے مست کا طوفاں وہاں لے چل
بہا کر راگ کا اک سیلِ بے پایاں وہاں لے چل

بجز موسیقیوں کے کچھ نہیں جس شہرِ نغمہ میں
ہے آباد اک سرودِ دلنشیں جس شہرِ نغمہ میں

درخشاں غیر فانی روح پرور راگ بہتے ہیں
جہاں گیتوں کے دھارے پر فقط نغمے ہی بہتے ہیں

نواؤں کے اشارے پر نوائیں رقص کرتی ہیں
صدائیں ڈوبتی ہیں اور صدائیں ہی ابھرتی ہیں

جہاں گیتوں کا دن چڑھتا ہے گیتوں کے سویرے میں
جہاں گیتوں کی رات آتی ہے گیتوں کے اندھیرے میں

ازل سے جس جگہ موسیقیوں کا نور رخشاں ہے
وہ ارضِ صوت ہر ذرہ جہاں کا بربطستاں ہے

جہاں وقت اک مسلسل راگ کی جھنکار ہے خود بھی
ہمیشہ بجنے والے ساز کا اک تار ہے خود بھی

اُٹھا بربط کو اے نباضِ بربط، وجد میں آکر
شبِ ماہتاب ہے، گیتوں کی پریوں کو جگا، گا کر

فضاؤں میں بہا دے چشمۂ افسونِ موسیقی
رگِ لمحات میں ہو محوِ گردش خونِ موسیقی

سماعت تیری تانوں سے لپٹ کر مست ہو جائے
مری ہستی ترے کیف آفریں نغموں میں کھو جائے

ساحر

مہاراجہ چندولال کے دربار میں شمالی ہند کے شعرا

مہاراجہ چندولال (سنہ ۱۱۸۹ھ تا سنہ ۱۲۶۱ھ) سلطنت آصفیہ کے مشہور دیوان تھے۔ ان کو شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ نہ صرف سخن فہم اور سخن سنج تھے بلکہ خود بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ شاداں آپ کا تخلص تھا۔ آپ کے فارسی اور اردو دیوان شائع ہوچکے ہیں جن سے آپ کے نادر الکلامی کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔ آپ کا کلام نہایت سنجیدہ، شگفتہ اور پسندیدہ مضامین کا ذخیرہ ہے۔ کلام کی رنگینی، انداز بیان کی جدت اور تخیل کی بلندی آپ کے اعلیٰ شاعری کے شاہد ہیں۔ آپ کے کلام کا بڑا حصہ معرفت اور تصوف سے بھرا ہوا ہے۔ بعض شعر ملاحظہ ہوں:۔

لو تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا ❊ کچھ تو لے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

ہمیں کیا کام ہو دونوں جہاں کا ❊ ترا ملنا ہمارا مدعا ہے

تو ہی غفار ہے مجرم ہوں تیرا ❊ خطا کیوں کر نہ ہو آخر بشر ہوں

کہتا ہے کوئی کیا تو ایمان کے باعث ❊ ایمان ملا اسکو یہ قرآن کے باعث

پردہ چشم اٹھا دیدۂ تحقیق سے دیکھ ❊ جب یگانہ وہ ہو کوئی نہیں بیگانہ

باغباں خود لٹا رہا ہے دیکھ ❊ بھرلے جھولی کو تو ثمر سے آج

جامہ یار کو کیا جامۂ گل سمجھا ہے ❊ خار کی طرح سے دامن دلدار نہ کھینچ

مہاراجہ کے دربار میں ہر وقت شعرا کا جمگھٹا رہا کرتا۔ ان کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر تھیں۔ مہاراجہ کے یہ درباری شعرا صرف دکن کے باشندے تھے بلکہ شمالی ہند کے شعرا کا بھی ایک بڑا حصہ مہاراجہ کے دامن دولت سے وابستہ تھا جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

حفیظ۔ مشتاق۔ نصیر۔ صفا۔ شہید۔ وغیرہم۔ ان حضرات کا مختصر تعارف یہاں مقصود ہے۔

حفیظ شیخ حفیظ نام اور حفیظ تخلص تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ آپ کے بزرگ سپاہ پیشہ تھے۔ حفیظ نے اسکو ترک کر کے طالب علمی شروع کی فن شاعری میں مہارت پیدا کی اور اپنی خداداد طبیعت کی جولانی اور فکر رسا کے باعث بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔ دہلی سے اورنگ آباد آئے اور راجہ مہیت رام کی خدمت میں باریاب رہے۔ راجہ صاحب جب صوبہ داری سے معزول ہو گئے تو حفیظ حیدرآباد آئے اور مہاراجہ چندولال کے دربار میں رسائی پیدا کی اور اپنی جادو بیانی سے مہاراجہ کو مسخر کرلیا۔ ایک ہزار روپیہ ماہوار مقرر ہوئی اور ملک الشعرا کے درجے پر فائض ہوئے۔

اس زمانے میں اردو شاعری کے تین بڑے استاد تصور کئے جاتے تھے۔ شیخ ذوق دہلی میں۔ ناسخ لکھنؤ میں اور حفیظ دکن میں۔

حفیظ فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے اور آپ کا کلام اپنی سنجیدگی اور صفائی کے لحاظ سے قابل تعریف ہوتا تھا۔ سنہ ۱۲۴۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا اور حیدرآباد میں دفن ہوئے۔

آپ کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

لب جاناں کو جی اداس آیا ❊ ہم کو آب بقا نہ راس آیا

ہم اُسے بادۂ گلرنگ پلا دیتے ہیں ❊ خانہ باغ آئینۂ رُخ کو بنا دیتے ہیں

خیال کاکلِ مشکیں پہ مجکو دوش رہا ✽ کہ مثلِ کعبہ مرا دل سیاہ پوش رہا
چاک سینہ ہوگیا دل سے صدا آنے لگی ✽ کھلتے ہی اُس در کے جنت کی ہوا آنے لگی
محبت آہ کیا کیا رنگ عاشق کو دکھاتی ہے ✽ اگر یکدم ہنساتی ہے تو پھر پہروں رلاتی ہے
تسمہ تشہیر کیا قاتل بیچارے کو ✽ آپ فرمائیے قبلہ اسے کیا کہتے ہیں
میں وہ شمع مزارِ بیکس ہوں ✽ کہ پتنگا نہ جس کے پاس آیا

مشتاق حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ بعض کے خیال میں آپ کو ناسخ سے تلمذ حاصل تھا۔ حیدرآباد آکر ماہ لقابائی چندا کے یہاں قیام کیا۔ مہاراجہ چندولال کو آپ کی خبر ہوئی دربار میں طلب فرمایا اور دوسو روپے تنخواہ ماہوار مقرر کردی۔ بیان کیا جاتا ہے آپ کو ایک آنکھ سے بالکل نظر نہ آتا تھا۔ حیدرآباد کے مشہور شاعر جنہوں نے زمانہ مابعد میں اپنی شاعری کی دکن میں دھوم مچادی یعنی شمس الدین فیض اُن کو آپ ہی سے تلمذ حاصل تھا۔ ایک سو برس کے سن میں آپ کا انتقال ہوا۔ حیدرآباد میں دفن ہوئے۔ سنہ وفات نامعلوم ہے۔ اُنکے بعض شعر حسب ذیل ہیں۔

جسکو چتوں تیری تیکی نظر آئی ہوگی ✽ بے اجل اس نے کئی ہیرے کی کھائی ہوگی
کوہکن و پرویز کو قصہ اپنا سنانے دو ✽ ہے یہ وہی افسانہ شیریں ایک پری دیوانے دو

نصیر شاہ نصیر الدین نصیر بوجہ سیاہ رنگی میاں کلو بھی کہلاتے تھے۔ اصلی وطن دہلی تھا۔ مہاراجہ چندولال نے حیدرآباد طلب فرمایا اور پانچ روپے یومیہ مقرر کردیا۔ چند روز قیام کے بعد پھر آپ دہلی چلے گئے۔ مگر اپنی زندگی میں دو تین مرتبہ حیدرآباد آئے اور آخری مرتبہ جو حیدرآباد آئے تو پھر دہلی جانا نصیب نہ ہوا۔ یہاں ہی انتقال کیا اور موسیٰ قادری کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ نصیر ذوق کے اُستاد تھے نصیر کا مفصل حال آبحیات۔ گل رعنا۔ شعر الہند وغیرہ کتابوں میں مذکور ہے۔ اس لئے مزید وضاحت کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ البتہ ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ ایک رات مہاراجہ چندولال کے یہاں مشاعرہ تھا۔ تمام دکن اور ایران کے شعرا جمع تھے۔ سبنے اپنے اپنے طبیعتوں کے جوہر دکھائے علی الخصوص ایرانیوں نے خوب قصائد سنائے ہر طرف سے واہ واہ ہوئی۔ جب شاہ نصیر کی نوبت آئی تو ایک چوبدار نے آہستہ سے کان میں کہا آپ غزل نہ پڑھیں تو مناسب ہوگا۔ آپ وہیں بگڑے اور فرمایا کیوں؟۔ اُس نے کہا ہوا تیز ہے لطف نہیں ہوگا۔ آپنے خفگی سے منہ پر ہاتھ پھیر کر فرمایا ایسا تو میں خوبصورت بھی نہیں کہ کوئی صورت دیکھنے کو نوکر رکھے گا۔ تو پھر میں کس مرض کی دوا ہوں۔ اسی گفتگو میں شمع آگئی اور آپ نے غزل سنائی تو سب کو لُٹا دیا۔

نصیر کے بعض شعر حسب ذیل ہیں۔

نصیر اُس شہ خوباں سے مانگ مت بوسہ ✽ کہ تو فقیر ہے صورت تری سوال کی ہے
دم لے لے کوہکن اب تیشہ زنی خوب نہیں ✽ جان شیریں نہ کھو کوہکنی خوب نہیں
میں بھی ہوں جادہ پیمائے جنوں اے مجنوں ✽ اس قدر لاف زنی آگے مرے خوب نہیں
شیشہ بادہ گلرنگ پٹک دے ساقی ✽ جامہ سبز میں دیکھے جو تن سُرخ ترا
ہر دم نصیر ہے تو اُمیدوار رحمت ✽ تیری زباں پہ کس دن لاتقنطو نہ آیا

صفا میرذوالفقار علی خاں نام اور صفا تخلص. لکھنؤ کے شریف زادے اور مشاہیر سے تعلق رکھتے تھے. میر تقی میر سے تلمذ حاصل کیا تھا. لکھنؤ سے بنگال گئے اور پھر مدراس پہونچے. مدراس سے حیدرآباد کی راہ لی. یہاں چندروز کے بعد آپ کی شہرت ہوئی اور مہاراجہ چندولال کے دربار میں رسائی ہوئی. پانچ سو روپے ماہوار مقرر ہوگئی اور مصاحبوں میں داخل ہوگئے اور اپنے انتقال تک مہاراجہ کے ساتھ رہے. بڑے خوش مزاج اور ظریف تھے. فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے. مؤلف گلزار آصفیہ نے آپ کی قابلیت کی بڑی تعریف کی ہے. سنہ ۱۲۶۱ء میں آپ کا انتقال ہوا. کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

میں جاکے کیا کروں گا زار دل نہیں لگتا　　بغیر تیرے کہیں یار دل نہیں لگتا
خدا کے واسطے منہ بند رکھیو اے ہمدم　٭　ہمارا ذکر کچھ اس کے حضور مت کیجو
سنبھل کے ٹانکیو ٹک زخم دل کو او جراح　　یہ حکم ہے کہ رفو دور دور مت کیجو
صفا جو چاہو کیجو معاف ہے لیکن　　گلہ کسی کا کسی کے حضور مت کیجو
رتبہ فکر تو اب عقل سے گذرا ہے صفا　٭　ایک زنجیر کا باقی ہے کھٹکا ہونا
حسن گفتار سے طوطی کو قفس میں ڈالا　٭　بھاڑ میں ڈالئے کیا ایسی زباں دانی کو
غنچہ و گل سے غرض کیا مرغ حسرت زاد کو　٭　آنکھ جو کھولی تو دیکھا صورت صیاد کو
ایک نالہ کر دکھاؤں چرخ کج بنیاد کو　　کیا کروں یاری نہیں دیتا گلہ فریاد کو
خال سیاہ نہیں ہے اس ابرو کے خم تلے　٭　سیدے ہلال تھے ہمیں طاق حرم تلے

شہید امیر احمد علی خاں شہید دہلوی. آصف جاہ ثالث کے زمانے میں حیدرآباد آئے. مہاراجہ چندولال کے دربار میں باریاب تھے. آصف جاہ رابع نے آپ کو امیرالشعرا کے خطاب سے مخاطب کیا. سنہ ۱۲۹۲ء میں آپ کا انتقال ہوا. فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں آپ طبع آزمائی کرتے تھے. شاہ نصیر سے آپ کو تلمذ حاصل تھا. آپ کا کلام اپنی برجستگی اور لطافت اور نازک خیالی سے مملو ہوتا تھا.

کیا کمال انساں میں تھا عشق کی تاثیر سے　　سجدہ گاہ عرشیاں مٹی کا پتلا ہوگیا
مریض عشق کو دارالشفا سے کیا مطلب　٭　ہمارے درد کو عیسیٰ دوا سے کیا مطلب
وصل ہے زلف و رخ یار میں اب　٭　ربط ہے کافر و دیندار میں اب
جو دیر لگتی ہے صاحب تمہارے آنے میں　٭　تو باقی کچھ نہیں رہتا ہے جان جانے میں
پان کھاکر ہونٹ دکھلانے لگے　٭　میں شہید اور رنگ تم لانے لگے
نہ فکر زر کی نہ پروائے مال و جاہ رہی　٭　فقط نظارۂ یوسف لقا کی چاہ رہی
سیاہ بختی مجنوں خوش آئی لیلیٰ کو　　بنا کے آپ بھی اک خیمۂ سیاہ رہی
شہید فکر کرو ورنہ آگے مشکل ہے　　جو ایسا عشق رہا اور ایسی چاہ رہی

نصیرالدین ہاشمی

کیفیات

وہ جس انداز میں ہونگے رہیں گے دل نشیں ہوکر
کبھی برقِ تبسّم اور کبھی چینِ جبیں ہوکر

خدنگِ ناز بنکر مرگِ عاشق آنے والی ہے
فلک کھِنچنے لگا ہے کوئے جاناں کی زمیں ہوکر

نہ گُل میں رنگ ہے اُن کا نہ غنچے میں نزاکت ہے
خُدا ہی جانتا ہے کیا ہوئے ہیں وہ حسیں ہوکر

مرادستِ طلب ہے حُسن و کرم کی شان بنجائے
ترا دامن جو ہاتھ آجائے میری آستیں ہوکر

کوئی باقی نہیں تیرے سوائے نازِ یکتائی!
ملا یہ تجھ کو ہستی میں جمالِ آتشیں ہوکر

یہی کیا کم ہے جانبازی کی قیمت غم کی دُنیا میں
مرا دم آگیا ہونٹوں پہ میرے آفریں ہوکر

تصدق حُسن جلوہ کا دکھادے میری آنکھوں کو
کہ آتا ہے تجھے کس طرح رہنا دل نشیں ہوکر

کمالِ شوقِ سجدہ کی یہ صورت آفرینی ہے
اُبھر آیا ہے ان کا نقشِ پا میری جبیں ہوکر

تسلّی دینے دل کو وہ دو عالم لے کے آئے ہیں
ملا جاتا ہے اے کیفی ہمیں سب کچھ حزیں ہوکر

سید محمد کیفی سروی

جامِ صہبائی

وہ کیفِ شراب اب کہاں سے لاؤں
وہ لطفِ رباب اب کہاں سے لاؤں
آتی ہے بہار لے کے مینا و رباب
وہ رنگِ شباب اب کہاں سے لاؤں

ہے حسن و جمال کی کہانی مجھ سے
مستی ہے مئے عشق کی زبانی مجھ سے
مینا نے اڑا لئے ہیں ترانوں کا سرور
اور دیکھو یہ جام لے گیا لن ترانی مجھ سے

یہ موت و حیات کیا ہے معلوم نہیں
سچ یہ ہے کہ ذات کیا ہے معلوم نہیں
کیا قبلِ حیات تھا خدا ہی جانے
اور بعدِ ممات کیا ہے معلوم نہیں

کیا کوئی کسی سے کہے کہ وہ کہاں رہتا ہے
بے نام و نشاں وہ لامکاں رہتا ہے
کیا میں ہی نہاں ہوں اس کی ہستی میں آہ
یا میرے ہی دل میں وہ نہاں رہتا ہے

اثر صہبائی

افسانہ نویسی

افسانہ، قصہ، کہانی، داستان، قریب قریب ہم معنی الفاظ ہیں۔ اسلوب بیان اور طرزِ نگارش کا اختلاف اگرچہ ان میں باہمی امتیاز پیدا کر دیتا ہے، لیکن اس امتیاز کے پردے کو الٹ کر دیکھا جائے تو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط، مشترک اور متحد المرکز نظر آئے گا۔ انگوری شراب کو مختلف رنگ کے پیالوں میں بھر دیجئے، نگاہ کو ہر پیالے میں جدا اور نئی قسم کی شراب محسوس ہوگی۔ لیکن ظروف کے اختلاف سے مظروف کی نوعیت تو نہیں بدل گئی۔ دنیا کو ہمیشہ سے قصہ، کہانی سے رغبت رہی ہے، استعجاب انگیز واقعات اور اعجوبہ زا حادثات کو ہر زمانے میں دلچسپی کیساتھ سنا گیا ہے۔ فطرتِ انسانی کا یہی ذوق قصہ اور افسانہ کا خلاق ہے۔

انسان فطرتاً ہنگامہ پسند اور تنوع پرست واقع ہوا ہے۔ اسکو ہنگاموں اور انقلابوں میں بڑا لطف محسوس ہوتا ہے، اُسکے کان ہر وقت کسی غیر معمولی حادثے کے سننے کے منتظر رہتے ہیں، وہ اخبار میں پڑھتا ہے کہ "جاپان میں زلزلہ آیا اور ہزاروں جانیں ہلاک ہو گئیں۔" اس خونیں حادثے کو پڑھکر اس کا دل دکھتا ہے لیکن قلب کی اس بے چینی اور ضمیر کے تاسف میں وہ بڑی دلچسپی محسوس کرتا ہے، ان ہی واقعات و حادثات کو جب کوئی تمام جزئیات کے ساتھ ذرا پُر لطف اور رنگین پیرائے میں بیان کرتا ہے اسے تو "قصہ اور کہانی" کہتے ہیں، اور اسکی ترقی یافتہ (short story) شکل کا نام افسانہ ہے۔

دنیا کو ہمیشہ قصہ، کہانی سے دلچسپی رہی ہے۔ اُس وقت جبکہ انسانی آبادی پر تمدن کی ایک کرن بھی جلوہ گستر نہ ہوئی تھی، انسان نیم شعوری حالت میں زندگی بسر کرتا تھا، تہذیب کے پھولوں سے اسکی انجمن یکسر خالی تھی، وہ قصے کہانی کہتا سنتا اور اُن سے لطف لیتا تھا۔ اُسکی صورت یہ ہوتی تھی کہ کسی غیر معمولی واقعہ کو کوئی چرب زبان، نمک مرچ لگا کر بیان کرتا تھا، اور لوگوں میں یہ کہانی پھیل جاتی تھی۔ آئندہ نسلیں حسب ذوق اس پر اور اضافے کر دیتی تھیں، اور اس طرح یہ واقعہ ایک مکمل کہانی اور دلچسپ قصہ کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ گرمی محفل کیلئے بھی فرضی قصے گھڑے جاتے تھے، اور جو قصہ جسقدر زیادہ دلچسپ اور رنگین ہوتا تھا، اسی قدر لوگ اسکو دلچسپی کے ساتھ سنتے تھے، اس طرح پر حقیقی واقعات اور ظہور میں آئے ہوئے حادثات کے علاوہ محض تخئیل کے زور پر فرضی قصص و حکایات کی بنیاد پڑ گئی، اور اسی بنیاد پر آج "افسانہ" کی پُر شوکت عمارت کھڑی کی جا رہی ہے۔

عہدِ قدیم کے متعلق جو کچھ تاریخی مواد ملتا ہے وہ سب ان ہی قصص و حکایات سے ماخوذ ہے، اگر قصے، کہانیاں وجود میں نہ آتیں تو عہدِ قدیم کے متعلق ہم کچھ نہ جانتے، اور ہماری تاریخ نامکمل رہ جاتی۔ مہاراجہ رام چندر اور راون کی آویزش، جو ہندوستان کی تاریخ کا اہم باب ہے، صرف پرانے افسانوں اور قدیم کہانیوں سے عبارت ہے۔ اگر یہ افسانے سینوں میں محفوظ نہ ہوتے تو والمیک جی کبھی رامائن نہیں لکھ سکتے تھے۔ رستم و سہراب کی جنگ کی داستان کے نقوش اگر ایران کے صفحۂ تاریخ پر نہ پائے جاتے تو فردوسی شاہنامہ جیسی عظیم المرتبت اور فقید المثال نظم نہیں کہہ سکتا تھا، مطلب عرض کرنے کا یہ ہے کہ ان کہانیوں اور قصوں سے دنیا کو یہ فائدہ پہونچا کہ قدیم تاریخ کے متعلق کسی نہ کسی حد تک معلومات حاصل ہو گئیں۔ یونان اگرچہ فلسفہ کا شیدائی تھا لیکن اُس کے یہاں بھی اچنبھے میں ڈالنے والے قصوں کی بہتات پائی جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ان قصوں کو "اساطیر" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اساطیر یونانی زبان کا لفظ ہے، جو "اسطورہ" "نسطورہ" یا "استور" کی جمع ہے۔ یہی "اسطور" انگریزی میں پہونچکر

(-story) بن گیا۔

یہ افسانے۔ قصے، حکایات، کہانیاں محض خونیں واقعات اور غیر معمولی حادثات سے ہی عبارت نہ تھیں، بلکہ ان میں محبت کی چاشنی کا بھی بڑا عنصر ہوتا تھا۔ قیس، لیلیٰ، سلمیٰ، عنترہ، شیریں، فرہاد، سسّی، دمینتی، شکنتلا، پدمنی، قلوبطرا کے رنگین قصوں میں محبت ہی کا عنصر کارفرما ہے۔ زمانہ بہت کچھ ترقی کر گیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ محبت کے قدیم افسانوں میں آج بھی غیر معمولی دلچسپی لی جاتی ہے، اور اُن کو جھٹلاتے ہوئے دل بڑا دُکھ محسوس کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک انسانی فطرت کا تعلق ہے متمدن اور غیر متمدن انسان میں کوئی فرق نہیں ہے، آج سے ایک لاکھ سال قبل جس نوعیت کے ساتھ جذباتِ محبت پیدا ہوتے تھے، اسی طرح آج بھی پیدا ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے میں جس طرح ترچھی نگاہ کے تیر دل کو برماتے تھے، آج بھی دل کو مجروح کرتے ہیں۔ پس متمدن زمانے نے غیر متمدن زمانے کے محبت آمیز افسانوں اور حکایات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان میں ضرور اختلاف ہے۔ لیکن تخلیقِ جذبات اور شغف وانہماک کی حد تک ایک دوسرے میں بڑی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے۔

قدیم قصص وحکایات زیادہ تر تین مدات پر مشتمل ہیں۔ (۱) غیر معمولی واقعات جو خونیں حادثات، اور جنگ کی تفصیلات سے عبارت ہیں۔ (۲) دیو، پری، بھوت پریت کے قصے۔ (۳) حکایاتِ عشق ومحبت ——— پرانے لوگوں کو دیو، پری، بھوت، پریت کے قصوں میں بڑا لطف آتا تھا۔ کسی دیو نے پہاڑ کا پہاڑ انگلی پر اُٹھا لیا، کوئی پری پورے بالغ کو اُٹھا کرلے گئی، کسی بھوت نے ہزاروں انسانوں کو خاک وخون میں تڑپا دیا۔ کسی خبیث رُوح نے آبادی کی آبادی کو بیہوش بنا دیا۔ ان مافوق العادت واقعات میں عہدِ قدیم کے انسان بڑی دلچسپی لیتے تھے، اور اس عہد کے اکثر قصے ان واقعات سے لبریز ہیں۔ اُردو کے قصوں میں "فسانۂ عجائب" کو بلاغت وندرت کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف نے بڑی محنت اور کاوش سے قصہ مرتب کیا ہے۔ الفاظ کا شکوہ، جملوں کی ترکیب، اشعار کا برمحل استعمال اپنی جگہ پر بہر حیثیت سے مستحقِ قدر وتوصیف ہیں لیکن دیو، پری اور بھوت کے ایسے عجیب وغریب ٹکڑے آگئے ہیں کہ سارا افسانہ اَنمل بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ میں صاحبِ فسانۂ عجائب کی تنقیص نہیں کر رہا، اُس زمانے کے لوگوں کا مذاق اسکو گوارا کر سکتا تھا، لیکن آج یہ باتیں وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتیں۔ اسی طرح اُردو کی بہترین مثنوی "گلزارِ نسیم" بھی اس نوع کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اس دَور کے افسانوں، قصوں اور حکایات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جب مصنفین معشوق اور عاشق کا ملاپ کراتے ہیں تو اقتران ووصل کی تمام جزئیات کو ظاہر کر کے چھوڑتے ہیں، بوسہ اور چھیڑ چھاڑ سے لیکر جانبین کی بدمست سانسوں تک کی تفصیل پیش کرتے ہیں، اور اس ڈرامہ کا اختتام اس ہیجان انگیز سین پر ہوتا ہے کہ مسہری پر چوڑیاں ٹوٹی پڑی ہیں، پھولوں کے گجرے بے ترتیبی کے ساتھ بکھرے ہوئے ہیں۔ اور نازک کلائیوں اور شہابی رُخساروں پر نہ معلوم کتنے نیل پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کیفیات جسقدر زیادہ دلچسپ ہیں اسی قدر تباہ ناک اور قابلِ افسوس۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقتران ووصل کا مجازی تصور بڑا لطف انگیز ہے۔ لیکن؛ وہ باتیں جو عامۃ الورود ہیں، اُنکے ظاہر کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ ان پر پردہ پڑا رہنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اس قسم کی بیحجابیاں اور واقعہ نگاریاں پڑھنے والے کو بعض وقت غیر معمولی طور پر متاثر کرتی ہیں، اور اس سے بد سے بدتر نتائج پیدا ہونے کا امکان قوی ہے۔

دورِ حاضر کی افسانہ نویسی

اردو کی موجودہ افسانہ نویسی بڑی حد تک مغربی افسانوں کی تقلید کی رہینِ منت ہے۔ المیہ اور طربیہ افسانوں میں جو کیفیات ہمارے

افسانہ نگار پیش کرتے ہیں، اُن سے اُردو کے قدیم قصے اور کہانیاں خالی ہیں۔ لیکن اس تقلید کے باوجود بعض افسانہ نویس مشرق کی ثقافت (کلچر) کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور یہی وہ افسانے ہیں جن کو صحیح معنوں میں اُردو کے افسانے کہہ سکتے ہیں۔ ابھی اُردو کی افسانہ نگاری عالمِ طفولیت میں ہے اور شدید ضرورت ہے کہ اس ہونہار بچے کی توجہ کے ساتھ غور و پرداخت کی جائے، تاکہ یہ بے راہ رو نہ ہو جائے۔

افسانے کی کامیابی کا راز پلاٹ کی نُدرت میں مضمر ہے۔ پلاٹ ایسا دلچسپ و رفطرت کے موافق ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والا پورے افسانہ کو پڑھکر دم لے، وہ لوگ جو دوسروں کے پلاٹ میں کاٹ چھانٹ کر افسانہ لکھ مارتے ہیں کبھی کامیاب افسانہ نگار نہیں بن سکتے، افسانے کا ہر ٹکڑا ندرت اور تنوع چاہتا ہے، پیش پا افتادہ مضامین اور منظر عام پر آئے ہوئے مناظر کو اپنے الفاظ میں ذرا رد و بدل کے پیش کر دینا "چوری" نہیں تو کم از کم ایک "خوفناک نقالی" ضرور ہے۔ پلاٹ کے لئے افسانہ نگار کو بہت زیادہ سوچنا چاہیئے، اور پلاٹ کا خاکہ مرتب کئے بغیر افسانہ کبھی شروع نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد "الفاظ" اور "عبارت" کا درجہ ہے، کہ اس رُوح کے بغیر پلاٹ کا خوبصورت جسم حرکت نہیں کر سکتا۔ افسانہ نویس اگر شاعر نہ ہو تو کم از کم اُسکی طبیعت میں شعریت کا عنصر بدرجہ غایت ممزوج ہونا چاہیئے۔ افسانہ درحقیقت نثر کی شاعری ہے۔ اور وہ شخص جس میں شعریت نہیں پائی جاتی، اچھا افسانہ کبھی نہیں لکھ سکتا۔ افسانہ نگار کے وجدان کی اُنگلیاں الفاظ کی نبض پر ہونی چاہئیں۔ جُملوں کی ترکیب، الفاظ کی نشست، محاورات کے استعمال پر اگر اُسکو پورا قابو نہیں ہے تو وہ ایک کامیاب افسانہ ہرگز نہیں لکھ سکتا۔

ہم اکثر افسانوں میں دیکھتے ہیں کہ محبت کا انجام شادی ہوتا ہے! اور ہمارے افسانہ نگار دوست کسی نہ کسی عُنوان سے ہیرو اور ہیروئن کا نکاح پڑھوا کر چھوڑتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ "محبت" افسانہ کا لطیف ترین عُنوان ہے اور مناکحت بھی اس کوشش کا انجام ہو سکتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر محبت کا انجام "شادی" ہو۔ اور اسکے بغیر افسانہ مکمل ہی نہ ہو سکے۔ اس طرح تو ہم افسانے کو محدود کر دینا چاہتے ہیں۔ اور "محبت" میں سوائے "ازدواج و مناکحت" کے دوسرا مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہے۔ حالانکہ "محبت" کے بہت سے پہلو ہیں، اور اس کا لطیف ترین پہلو "مناکحت و ازدواج" سے بہت بلند ہے۔

ہمارے افسانہ نگاروں کو زیادہ تر اصلاحی افسانوں پر توجہ کرنی چاہیئے۔ تاکہ ملک کے نوجوانوں میں خدمتِ ملک و قوم کی صحیح اسپرٹ پیدا ہو سکے۔ روس کے انقلاب میں افسانوں کا بہت کچھ ہاتھ ہے۔ آج ہندوستان ذلت و نکبت کی پریشان کُن منزل سے گذر رہا ہے۔ ایسی حالت میں ہر محبِ وطن ادیب و شاعر کا فرض ہے کہ وہ ماحول کے بدلنے کے لئے اسباب مہیا کرے، کیونکہ ادیب و شاعر ہی ملک و قوم کی ذہنیت بدلتے ہیں۔ ہندوستان میں افسانے بہت زیادہ دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں، کاش ہمارے افسانہ نویس کرمفرما حبِ وطن اور آزادی کی شراب سے ملک کے نوجوانوں کی تواضع کر سکیں۔

ماہر القادری

خونی تھوک

گاڑی آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔

مسافروں کے گروہ کے گروہ پلیٹ فارم کے سنگین سینے کو روندتے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے، پھل بیچنے والی گاڑیاں بڑھا مُر پہیوں پر خاموشی سے تیر رہی تھیں، بجلی کے سینکڑوں قمقمے اپنی نہ جھپکنے والی آنکھوں سے ایک دوسرے کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ برقی پنکھے سرد آہوں کی صورت میں اپنی ہوا پلیٹ فارم کی گدلی فضا میں بکھیر رہے تھے، دور ریل کی پٹڑی کے پہلو میں ایک لیمپ اپنی سُرخ نگاہوں سے مسافروں کی آمد و رفت کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا——پلیٹ فارم کی فضا سگرٹ کے تند دھوئیں اور مسافروں کے شور میں لپٹی ہوئی تھی۔

پلیٹ فارم پر ہر ایک شخص اپنی اپنی دُھن میں مست تھا۔ تین چار بنچ پر بیٹھے اپنی ہونے والی سیر کا تذکرہ کر رہے تھے، ایک گھڑی کے نیچے خدا معلوم کن خیالات میں غرق زیرِ لب گنگنا رہا تھا، دُور کونے میں نیا بیاہا ہوا جوڑا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ خاوند اپنی بیوی کو کچھ کھانے کیلئے کہہ رہا تھا اور وہ شرما کر مُسکرا دیتی تھی، پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر ایک نوجوان قلیوں کے ساتھ ساتھ لڑکھڑا کر چل رہا تھا جو اُسکی بہن کا تابوت اٹھائے ہوئے تھے، پانچ چھ فوجی سپاہی ہاتھ میں چھڑیاں لئے اور سیٹی بجاتے ہوئے ریفرشمنٹ روم سے شراب پی کر نکل رہے تھے، بُک سٹال پر چند مُسافر اپنا وقت ٹالنے کی خاطر یونہی کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے میں مشغول تھے، بہت سے قلی سُرخ وردیاں پہنے گاڑی کی روشنی کا اُمید بھری نگاہوں سے انتظار کر رہے تھے——ریفرشمنٹ روم کے اندر ایک صاحب انگریزی لباس زیبِ تن کئے سگار کا دھواں اُڑا کر وقت کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"قلیوں کی زندگی بھی گدھوں سے بدتر ہے!"

"مگر میاں کیا کریں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں"

"ایک قلی دن بھر میں کتنا کما لیتا ہوگا؟"

"یہی آٹھ، دس آنے!——"

"یعنی صرف جینے کا سہارا——اور اگر بال بچے ہوں تو اپنا پیٹ کاٹ کر اُن کا منہ بھریں۔ خالد! خدا کی قسم جب ان لوگوں کی تاریک زندگی کا خیال ایک دفعہ بھی میرے دماغ میں آجائے تو پہروں یہی سوچتا رہتا ہوں کہ آیا اُن کی مُصیبت ہماری نام نہاد تہذیب پر بدنما داغ نہیں ہے؟"

دو دوست پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

خالد اپنے دوست کی گفتگو سُنکر قدرے متعجب ہوا اور مُسکرا کر کہنے لگا۔

"کیوں میاں یہ تلقین کب سے بنے ہو تم؟——تہذیب کس بلا کا نام ہے——انسانیت کے سرد لوہے پر جما ہوا زنگ!——جانے دو ایسی باتوں کو، جانتے ہو میں پہلے ہی سے اپنے حواس کھوئے بیٹھا ہوں"

"خالد، سچ کہتے ہو۔ یہ باتیں واقعی دماغ کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ دو روز ہوئے اخبار میں ایک خبر پڑھی کہ پندرہ مزدور کارخانے میں آگ لگ جانے سے جلے ہوئے کاغذ کی مانند راکھ ہوگئے۔ کارخانہ بیمہ شُدہ تھا۔ مالک کو روپیہ مل گیا مگر پندرہ عورتیں بیوہ بن گئیں اور خدا معلوم کتنے بچے یتیم ہوگئے۔ کل تین نمبر پلیٹ فارم پر ایک خاکروب کام کرتے کرتے گاڑی تلے آکر مر گیا۔ کسی نے آنسو تک نہ بہایا——جب سے یہ واقعہ دیکھا ہے طبیعت سخت مغموم ہے۔ یقین جانو حلق سے روٹی کا ٹکڑا نیچے نہیں اترتا۔ جب دیکھو اُس خاکروب کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش آنکھیں نکالے میری طرف گھور رہی ہے——مجھے اُسکے گھر ضرور جانا چاہئے، شاید میں اُسکے بچوں کی کچھ مدد کر سکوں"

خالد مُسکرایا اور اپنے دوست کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا "جاؤ——پندرہ مزدوروں کی بیکس بیویوں کی مدد بھی کرو، یہ ایک نیک اور مُبارک

جذبہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی شہر سے کچھ فاصلے پر چند ایسے لوگ بھی آباد ہیں، جنکے پاس ایک وقت کے لئے سوکھی روٹی کا نصف ٹکڑہ بھی میسّر نہیں ــــ گلیوں میں ایسے بچے بھی ہیں جن کے سروں پر کوئی دستِ شفقت رکھنے والا نہیں، ایسی سینکڑوں عورتیں موجود ہیں جن کا حُسن غربت کی کیچڑ میں گل سڑ رہا ہے ــــ بتاؤ تم کس کس کی مدد کروگے؟ ان پھیلے ہوئے ہاتھوں میں سے کس کی مٹھی بھروگے؟ ــــ ہزاروں ننگے جسموں میں سے کتنوں کی ستر پوشی کروگے؟"

"آہ! درست کہتے ہو خالد!" ــــ دوست کہتے ہو، مگر بتاؤ اس تاریکی ندی کو کس طرح روکا جاسکتا ہے؟ ــــ اپنے ہم جنس افراد کو ذلت کی زندگی بسر کرتے دیکھنا، ننگے سینوں پر چمکتے ہوئے بوٹوں کی ٹھوکریں لگتے دیکھنا ــــ سخت بھیانک خواب ہے!"

"واقعات کی رفتار کا نتیجہ دیکھنے کا انتظار کرو۔ یہ لوگ اپنی طاقت کے باوجود اس طوفان کو نہیں روکتے۔ خود اعتمادی نے انہیں برداشت کرنا سکھا دیا ہے ــــ چنگاری کو شعلوں میں تبدیل کر دینا آسان ہے مگر چنگاری کا پیدا کرنا بہت مشکل ہے ــــ بہرحال تمہیں امید رکھنی چاہیئے، شاید تمہاری زندگی میں ہی مصائب کے یہ بادل دُور ہوجائیں۔"

"میں یہ سہانا وقت دیکھنے کے لئے اپنی زندگی کے بقایا سال نذر کرنے کو تیار ہوں۔"

"کاش یہی خیال باقی لوگوں کے دل میں بھی موجود ہوتا! ــــ مگر یار گاڑی آج کچھ دیر سے آتی معلوم ہوتی ہے، دیکھو نا پٹڑی پر روشنی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا!"

خالد کا دوست کسی گہری فکر میں غوطہ زن تھا اس لئے اس نے اپنے دوست کے آخری الفاظ بالکل نہ سُنے اور اگر سُنے تو کچھ خیال کر کے کہنے لگا: "واقعی یہ خیال پیدا کرنا چاہیئے اور اگر ــ"

"چھوڑو میاں اب اس فلسفے کو ــــ کچھ پتہ بھی ہے گاڑی کب آنیوالی ہے؟" خالد نے اپنے دوست کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"گاڑی؟" اور پھر سامنے والی گھڑی کی طرف نگاہ اُٹھا کر نو بجکر پچیس منٹ، بس دس منٹ تک آجائے گی ــــ یعنی دس منٹ کے بعد ہمارا دوست ہمارے پاس ہوگا۔ ذرا خیال تو کرو، میں وحید کی آمد اس دردناک گفتگو کی وجہ سے بالکل بھول چکا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے خالد کے دوست نے جیب سے سگرٹ نکالکر سُلگانا شروع کر دیا۔

پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم تیزی سے بڑھ رہا تھا مُسافر بڑی سرعت سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، قلی اسباب کے ڈھیر کے پاس خاموش کھڑے گاڑی کے منتظر تھے کہ جلد اپنے کام سے فارغ ہو کر ایک آنہ حاصل کر سکیں۔ خوانچے والے دوسرے پلیٹ فارموں سے جمع ہو کر اپنی مخصوص صدا بلند کر رہے تھے ــــ فضا گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ مختلف انجنوں کی بھپ بھپ، خوانچہ والوں کی صداؤں مُسافروں کی باہم گفتگو کے شور اور قلیوں کی بھدّی آوازوں سے معمور تھی ــــ برقی پنکھے بدستور آہیں بھر رہے تھے۔

ریفرشمنٹ روم کے اندر بیٹھے ہوئے مُسافر نے جو ابھی سگار کو دانتوں میں دبائے کش لے رہا تھا اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف بڑی بے پروائی کے انداز میں دیکھا اور بازو کو جھٹکا دیکر مرمریں میز پر سہارا دیتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ "بوائے!"

تھوڑی دیر خادم کا انتظار کرنے کے بعد وہ پھر چیخا۔ "بوائے، بوائے!" اور پھر آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے "نکما ہے"۔

"جی آیا حضور" دوسرے کمرے میں سے کسی کی آواز آئی۔

ساتھ ہی سپید لباس پہنے ایک خادم بھاگ کر اُس مُسافر کے قریب مؤدب کھڑا ہوگیا۔

"حضور!"

"ہم نے تمہیں دو دفعہ آواز دی ــ سوئے رہتے ہو تم لوگ شاید!"

"حضور میں نے سُنا نہیں ورنہ کیا مجال ہے کہ غلام حاضر نہ ہوتا!"

غلام کا لفظ سُنکر مُسافر کا غصہ فرو ہوگیا۔

"دیکھو، درجہ اول کے مسافروں سے یہ بے رخی اچھی نہیں، ہم تمہارے بڑے صاحب کے بھی کان کھینچ سکتا ہے۔ سمجھے؟"

"جی ہاں!"

"ایجنٹ کے! ــــ وہ ہمارا دوست ہے ــــ خیر! دیکھو تم ویٹنگ روم میں جاؤ اور ہمارے قلی سے کہو کہ وہ صاحب کا تمام اسباب پلیٹ فارم پر لے جائے، گاڑی آنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔"

"بہت اچھا حضور!"

"اور ہاں ہمارا بل دوسرے آدمی کے ہاتھ بھجوا دو۔"

"دیکھو! ــــ بل میں پانچ سو پچپن نمبر سگرٹ کے ایک ڈبے کے دام بھی شامل کر لینا ــــ پانچ سو پچپن نمبر کا ڈبہ، خیال رہے۔"

"بل اور ڈبہ گاڑی میں لے کر حاضر ہو جاؤں گا، وقت تھوڑا ہے۔"

"جو مرضی میں آئے کرنا، مگر اب تم جاؤ۔ اور جلد ہمارے قلی کو اسباب نکالنے کیلئے کہہ دو۔"

مسافر نے یہ کہکر ایک انگڑائی لی اور میز پر پڑے ہوئے شراب کے گلاس میں سے آخری گھونٹ ایک ہی جرعے میں ختم کر دئے۔ گیلے ہونٹ ایک بے داغ ریشمی رومال سے صاف کرنے کے بعد وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔

صاحب کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھکر ایک خادم نے جلدی سے دروازہ کھولدیا۔ مسافر بڑی رعونت سے ٹہلتا ٹہلتا پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔

دور ریل کی آہنی پٹڑیوں کے درمیان خیرہ کن روشنی کا ایک دھبہ نظر آرہا تھا جو آہستہ آہستہ اس پاس کی تاریکی کو چیرتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ دھبہ روشنی کی ایک لمبی دھاری میں تبدیل ہوگیا۔ اور دفعتاً انجن کی چوندھیا دینے والی روشنی ایک لمحے کے لئے پلیٹ فارم کے قمقموں کو اندھا بناتے ہوئے گل ہوگئی۔ ساتھ ہی کچھ عرصے کے لئے انجن کے آہنی پہیوں کی بھاری گڑگڑاہٹ تلے پلیٹ فارم کا شور دب کر رہ گیا ــــ ایک چیخ کے ساتھ گاڑی اسٹیشن کے سنگین چبوترے کے پہلو میں کھڑی ہوگئی۔

پلیٹ فارم کا دبا ہوا شور انجن کی گڑگڑاہٹ سے آزاد ہوکر ایک نئی تازگی سے بلند ہوا۔ مسافروں کی دوڑ دھوپ، بچوں کے رونے کی آواز، قلیوں کی بھاگ دوڑ، اسباب نکالنے کا شور، ٹھیلوں کی کھڑکھڑاہٹ، خوانچہ والوں کی بلند صدائیں، شنٹ کرتے ہوئے انجنوں کی دلخراش چیخیں اور بھاپ نکلنے کی شاں شاں پلیٹ فارم کی آہنی چھت تلے فضا میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے تیر رہی تھیں۔

"خالد۔ وحید کو دیکھا تم نے کسی ڈبے میں؟"

"نہیں تو!"

"خدا جانے اس گاڑی سے آیا بھی ہے یا نہیں!"

"تار میں تو اسی گاڑی کا ذکر تھا ــــ ارے وہ ڈبے میں کون ہے؟ ــــ وحید!"

"ہاں، ہاں وحید۔"

دونوں دوست بھاگتے ہوئے اس ڈبے کی طرف بڑھے جس میں سے وحید اپنا اسباب اتروا رہا تھا۔

ریفرشمنٹ روم والا مسافر تیزی سے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا۔ باہر دروازے کے برابر لگے ہوئے کاغذ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا اور پیتل کی ایک سلاخ پکڑ کر قلی اور اپنے اسباب کا انتظار کرنے لگا۔

قلی اسباب سے لدا ہوا، گاڑی کے ڈبوں کی طرف دیکھ دیکھکر دوڑا چلا آرہا تھا۔ مسافر نے اسے دیکھا اور جھلا کر بلند آواز میں کہا۔

"ابے اندھے ادھر آ!"

قلی نے مسافر کی آواز پہچان کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، مگر بھیڑ میں خود مسافر کو نہ دیکھ سکا۔ وہ ابھی اسی پریشانی میں تھا کہ ایک اور آواز آئی "کیوں نظر نہیں آرہا کیا؟ ــــ ادھر ادھر ــــ ناک کی سیدھ!"

قلی نے مسافر کو دیکھ لیا اور اسباب لیکر اس کے ڈبے کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔

"صاحب، ایک طرف ہٹ جایئے، میں اسباب اندر رکھدوں۔"

"ہاں رکھو" مسافر دروازے کے قریب ایک گدّے دار نشست پر بیٹھ گیا۔ "مگر اتنا عرصہ سوتے رہے تھے کیا؟ خانسامہ نے تمہیں یہ نہیں کہا تھا کہ صاحب کا سامان اُٹھا کر گاڑی آتے ہی فوراً ڈبے میں رکھ دینا۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کس ڈبے میں سوار ہونگے۔" قلی نے ایک بھاری ٹرنک اُٹھا کر بالائی نشست پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ڈبہ ہمارا ریزرو ہے۔ باہر چِٹ پر نام بھی لکھا ہوا ہے۔"

"آپ نے پہلے ہی یہ کہا ہوتا تو ہرگز دیر نہ ہوتی ۔۔۔ ایک، دو، تین ۔۔۔ آٹھ ۔۔۔ اور یہ دس۔" قلی نے اسباب کی مختلف اشیا گننا شروع کر دی۔

سامان قرینے سے رکھنے کے بعد قلی نے اپنے اطمینان کے لئے ایک بار پھر رکھی ہوئی چیزوں پر نگاہ ڈالی اور ڈبے سے نیچے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔

"صاحب اپنا سامان پورا کر لیجئے۔"

مسافر نے بڑی بے پروائی سے اپنی جیب سے ایک نفیس بٹوہ نکالا اور ابھی کھول کر مزدوری ادا کرنے والا ہی تھا کہ اُسے کچھ یاد آیا۔

"ہماری چھڑی کہاں ہے؟"

"چھڑی ۔۔ چھڑی تو آپ ہی کے پاس تھی۔"

"میرے پاس، بکتا کیا ہے ۔ وہیں چھوڑ آیا ہوگا تو۔"

"چھڑی آپکے پاس تھی ۔۔۔ مگر صاحب اِس سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں، جب میں نے کوئی خطا نہیں کی ۔۔"

قلی کی زبان سے اس قسم کے الفاظ سنکر مسافر آگ بگولا ہو گیا اور اپنی جگہ سے اُٹھکر دروازے کے پاس کھڑا ہو کر چلانے لگا۔

"سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں ۔۔۔ کسی نواب کا بچہ ہے! ۔۔۔ جتنے کی چھڑی ہے اُتنی تو تیری مزدوری بھی نہیں۔ چھڑی لیکر آتا ہے یا نہیں؟ ۔ چور کہیں کا!"

چور کے لفظ نے قلی کے دل میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ اُسکے جی میں آئی کہ اس مسافر کی ٹانگ پکڑ کر نیچے کھینچ لے اور اُسے اس اکڑفوں کا مزا چکھائے مگر طبیعت پر قابو پا کر خاموش ہو گیا اور نرمی سے کہنے لگا۔

"آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے ۔۔ چھڑی آپنے کہیں رکھدی ہوگی، مجھے بتایئے میں وہاں سے لے آؤں۔"

"گویا میں بیوقوف ہوں ۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں چھڑی لے کر آ، ورنہ ساری شیخی کرکری کر دونگا۔"

قلی ابھی کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ اُسے چند قدم کے فاصلے پر خانساماں نظر آیا جو ہاتھ میں سگریٹ کا ڈبہ اور چھڑی لئے چلا آ رہا تھا۔

"چھڑی خانساماں لیکر آ رہا ہے اور آپ خواہ مخواہ مجھ پر برس رہے ہیں۔"

"بکو مت ۔ کتے کی طرح چلاتے جا رہا ہے۔"

یہ سُنکر قلی غصے سے بھرا ہوا مسافر کی طرف بڑھا۔ مسافر نے پورے زور سے اس کے بڑھے ہوئے سینے میں اپنے نوکیلے بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر کھاتے ہی قلی چکراتا ہوا سنگین فرش پر گر کر بیہوش ہو گیا۔

قلی کو گرتے دیکھ کر بہت سے لوگ اُسکے اِردگرد جمع ہو گئے۔

"بیچارے کو بہت سخت چوٹ آئی ہے۔"

"یہ لوگ بہانہ بھی کرتے ہیں۔"

"منہ میں سے شاید خون بھی نکل رہا ہے۔"

"معاملہ کیا ہے؟"

"اُس آدمی نے اِسے بوٹ سے ٹھوکر ماری ہے!"

"کہیں مر نہ جائے بیچارہ"

"کوئی دوڑ کر پانی کا ایک گلاس تو لائے۔"

"بھئی ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو، ہوا تو آنے دو۔"

قلی کے گرد جمع ہوتے ہوئے لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد خالد اور اُس کا دوست بھیڑ چیر کر گرے ہوئے مزدور کے قریب پہونچے۔ خالد نے اُسکے سر کو اپنے گھٹنوں پر اٹھا لیا اور

[redacted]

اخبار سے ہوا دینا شروع کر دی۔ پھر اپنے دوست سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مسعود، وحید سے کہدو کہ ہم اب اس سے گھر پر مل سکیں گے۔ اور ہاں اُس ظالم کو تو دیکھنا کہاں ہے۔ گاڑی چلنے والی ہے کہیں چلا نہ جائے۔"

یہ سنتے ہی لوگ اُس مسافر کے ڈبے کے پاس جمع ہو گئے جو کھڑکی کے پاس بیٹھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اخبار پکڑے پڑھنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔

مسعود اپنے دوست وحید سے رخصت ہو کر اُس مسافر کی طرف بڑھا اور کھڑکی کے قریب جا کر نہایت شائستگی سے کہا۔ "آپ یہاں اخبار بینی میں مصروف ہیں اور وہ بیچارہ بیہوش پڑا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"چلئے اور کم از کم اُسکی حالت تو ملاحظہ کیجئے۔"

"کمبخت نے میرے سفر کا تمام لطف بدمزہ کر دیا۔" اور پھر دروازے سے باہر نکلتے ہوئے: "چلئے صاحب — یہ مصیبت بھی دیکھنا تھی۔"

خالد بیہوش قلی کا سر تھامے اُسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگ جھکے ہوئے خالد اور قلی کے چہروں کی طرف بغور دیکھ رہے تھے۔

"خالد، آپ تشریف لے آئے ہیں۔" مسعود نے مسافر کو آگے بڑھنے کے لئے کہا۔

"ہاں، جناب — یہ ہے آپکے ظلم کا شکار — کسی ڈاکٹر کو ہی بلوا لیا ہوتا آپ نے۔" مسعود نے مسافر سے کہا۔

مسافر قلی کے زرد چہرے اور لوگوں کا گروہ دیکھکر بہت خوفزدہ ہوا اور گھبراتے ہوئے جیب سے اپنا بٹوہ نکالا۔

مسافر ابھی بٹوہ ہی نکال رہا تھا کہ قلی کا جسم متحرک ہوا اور اُسنے اپنی آنکھیں کھولکر ہجوم کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

"یہ نوٹ آپ اسے میری طرف سے دے دیجئے گا، میں جا رہا ہوں، گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔" مسافر نے مسعود کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے انگریزی زبان میں کہا اور پھر قلی کو ہوش میں آتا دیکھکر اُس سے مخاطب ہوا۔ "ہم نے اس غلطی کی قیمت ادا کر دی ہے۔"

قلی یہ سنکر تڑپا، مُنہ سے خون کی ایک دھار بہہ نکلی۔ بڑی کوشش کے بعد اُس نے یہ چند الفاظ اپنی زخمی چھاتی پہ زور دیکر ادا کئے۔

"میں بھی انگریزی زبان جانتا ہوں ... دس روپے ... ایک انسان کی جان کی قیمت ... میرے پاس بھی کچھ ہے ... جو ..."

باقی الفاظ اُسکے خون بھرے مُنہ میں بلبلے بنکر رہ گئے۔ مسافر قلی کی یہ حالت دیکھکر اُسکے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اُس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا۔ "میں زیادہ بھی دے سکتا ہوں۔"

قلی نے بڑی تکلیف سے مسافر کی طرف رُخ پھیرا اور مُنہ سے خون کے بلبلے نکالتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس ... بھی ... کچھ ہے ... یہ لو ..."

یہ کہتے ہوئے اُس نے مسافر کے مُنہ پر تھوک دیا۔ تڑپا اور پلیٹ فارم کی آہنی چھت کی طرف مظلوم نگاہوں سے دیکھتا ہوا خالد کی گود میں سرد ہو گیا۔

مسافر کا مُنہ خونی تھوک سے رنگا ہوا تھا۔

خالد اور مسعود نے لاش دوسرے آدمیوں کے حوالے کر کے مسافر کو پکڑ کر پولیس کے سپرد کر دیا۔

* * * * * * * * * * * * * * *

* * * * * * * * * * * * * * *

مسافر کا مقدمہ دو مہینے تک متواتر عدالت میں چلتا رہا۔

آخر فیصلہ سُنا دیا گیا۔ فاضل جج نے ملزم کو تھوڑا سا جرمانہ کرنیکے بعد بری کر دیا۔ فیصلہ میں یہ لکھا تھا کہ قُلی کی موت اچانک تلی پھٹ جانے سے واقع ہوئی ہے۔

فیصلہ سُناتے وقت خالد اور مسعود بھی موجود تھے۔ ملزم اُنکی طرف دیکھکر مُسکرایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

"قانون کا قفل طلائی چابی سے کُھل سکتا ہے۔"

"مگر ایسی چابی ٹوٹ بھی جایا کرتی ہے۔"

خالد اور اُس کا دوست باہر برآمدے میں گفتگو کر رہے تھے۔

سعادت حسن منٹو

عشق

عشق و محبت کے بارے میں یہ طے شدہ امر ہے کہ جائز عشق و محبت سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ مرض کی صورت میں لا علاج بھی ہے ہمیں فلسفہ سے مطلب نہیں معاشرتِ موجودہ میں عشق بیچارے کا درجہ دیکھنا ہے۔ ذرا غور فرمائیں۔ اگر کسی غیور نوجوان کو معلوم ہو جائے کہ اسکی بہن فلاں شخص پر عاشق ہو گئی تو عجب نہیں وہ ان عاشقِ زار کی ہڈی پسلی توڑ دے اور بہن کا گلا گھونٹ دے لیکن وہی نوجوان جب یہ سنتا ہے کہ اس کی بہن اپنے شوہر پر جان دیتی ہے اور اسکی خدمت و محبت میں فنا ہوئی جاتی ہے تو اس کا دل خوش ہوتا ہے۔ گویا ہماری معاشرت اس عشق کو جائز سمجھتی ہے جسے انگریزی میں "میرڈ لو" (محبت از ازدواج) کہتے ہیں۔ وہ عشق و محبت جو میاں بیوی کو شادی ہونے کے بعد ایک دوسرے سے ہو جاتا ہے، اس محبت کو سب ہندوستانی جائز سمجھتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں۔ یہی عشق عین شرافت ہے، اس عشق کی سب کی طرف سے اجازت ہے اور ہمارے ہندوستان جنت نشان کی قدیم معاشرت اسی عشق و محبت کے سلسلہ میں لاکھوں نوجوان بیواؤں کو زندہ جلوا چکی ہے۔ اس عشق و محبت کی شروعات شادی کے بعد ہوتی ہے۔ جب ایسی صورت ہے تو سوال یہ ہے کہ ہم اس قسم کے عشق پر ناول کیسے لکھیں۔ اگر اسکے خلاف جاتے ہیں تو معاشرت کی تصویر غلط ہوئی جاتی ہے۔ اگر شریف زادیوں کے بارے میں آپ کو ناول لکھنا ہے اور عشقیہ ناول لکھنا ہے تو مستثنیات اور بدچلن عورتوں کو چھوڑ کر آپ کو چاہیئے کہ اسی قسم کا عشق لیجئے۔ معاشرتی افسانوں میں چند مخصوص قسم کی لڑکیوں کو اور انکے واقعات کو لینا زیادتی ہے۔ اب دوسرے قسم کا عشق لیجئے۔

ہماری معاشرت میں اجازت نہیں کہ لڑکی کسی نوجوان پر عاشق ہو۔ اور اس کا بھانڈا پھوٹے۔ سخت معیوب ہے۔ ایسی لڑکی ننگِ خاندان ہے۔ اگر لڑکی نے ایسا کیا تو وہ بری ہے۔ اس قسم کا ناجائز عشق وہ خفیہ طور پر ہی کر سکتی ہے۔ لڑکی خود بھی اپنے کو اس قسم کے عشق سے بچاتی ہے۔ خود اپنے منظورِ نظر عاشق کے گھر جا کر بھی اس کی کوئی عزت نہیں رہتی اور مفرورہ کا لقب باقی ہے۔ اسکے اس فعلِ قبیح کا اثر تین پشت تک نہیں جاتا۔ اب یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ معاشرت کی یہ سختیاں صحیح ہیں یا غلط ہیں، مگر حقیقت ضرور ہیں۔ افسانہ نگار کو حقیقت سے بحث ہے۔ عشق ناجائز کرنے والی حرافہ اور بدمعاش ہے۔ شریفوں میں ایسی نہیں ہوتیں۔

اب ان دونوں قسم کے جائز و ناجائز عشق پر غور کیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ اب تک ہمارے ناول نویس اور افسانہ نویس کدھر جا رہے تھے۔ انکے ناولوں اور افسانوں کی ہیروئن ہمیشہ بگڑی ہوئی شریف زادیاں تھیں۔ انکے عشق ناجائز کے حالات پیش کرنا افسانہ نویس کا کام تھا۔ اسی لئے لفظ ناول گندہ ہو کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ ناول پڑھنے والی لڑکیاں بری سمجھی جانے لگیں۔ ایک سرے سے عشقیہ ناول ہی گندے اور مخربِ اخلاق سمجھے جانے لگے۔ اگر یہ عشق ہماری معاشرت میں جائز ہوتا تو بھی ناول بہترین مانے جاتے۔ ناول نویس بیچارے کی جان عجیب مصیبت میں۔ اگر عشقیہ ناول لکھتا ہے تو مجبوراً اسے بگڑی شریف زادیوں ہی کے حالات بنے ہیں، مجبور و ناچار ہو کر ان بدچلن، آوارہ خیال عورتوں کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ اچھا کہتا ہے۔ انکے اس عشق کو عین شرافت کہتا ہے۔ تعریف کرتا ہے۔ گویا جس لڑکی اور اسکے فعل کو شرافت ذلیل سمجھتی ہے اسے وہ اچھا کہتا ہے۔ وہ چیز پیش کرتا ہے جو معاشرت میں موجود نہیں۔ واقعات اگر ایسے ہیں تو وہ پسندیدہ نہیں سمجھے جاتے۔ اسے اگر اس قسم کے افسانے لکھنا تھے تو لکھتا اور ضرور لکھتا مگر ساتھ ہی برے کو برا سمجھتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ واقعہ تو یہ تھا اور ہے کہ شریف زادیاں عموماً ایسی نہیں ہوا کرتیں اور اس طرح عشق کسی شریف کے گھرانے میں نہیں ہوتا ہے اور جو ایسا کرے تو وہ کمین اور بدمعاش ہے لیکن وہ اپنے ناول میں برخلاف دکھاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس قسم کے ناول نہ تو آرٹ پیش کر سکے اور نہ اردو کی کوئی خدمت کر سکے نہ اپنی معاشرت

کی صحیح تصویر پیش کر سکے، اپنی کہانی کے عنصر کی وجہ سے البتہ کامیاب ہوئے کیونکہ ہر کہانی از خود دلچسپ ہے۔ اس قسم کے عشقیہ ناولوں کی ابتدا ممنوعہ عشق سے ہوتی تھی اور ناول ہیرو اور ہیروئن کی شادی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ مقام اسے ختم ہونے کا ہے جہاں سے دراصل ہماری معاشرت کے عشق کی ابتدا ہوتی ہے۔ میری عرض یہ ہے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ اب تک صرف ان لڑکیوں کے اکا دکا واقعات عشق پر ناول لکھے جاتے رہے جنکو معاشرت بدمعاش کہتی ہے۔ آخر اس عشق کو اپنے عشقیہ افسانوں کے لئے کیوں پسند کیا جو ممنوع اور ناجائز ہے اور جس کا وجود خود آپ ہی کے گھر میں نہیں۔ یہ عشق اور یہ واقعات ہماری معاشرت میں نہ کبھی پہلے تھے اور نہ اب ہیں۔ اگر شریف زادیوں میں سے کوئی لڑکی ایسی نکل گئی تو اسکی داستان معاشقہ کسی طرح بھی سوسائٹی کی صحیح تصویر نہیں پیش کر سکتی۔ اس قسم کے معاشقہ کے دل خوش کن نتائج جو ناول نویسوں نے اپنے افسانوں میں دکھائے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔

پرانی قسم کے ناول عشق کے وجوہات پر بھی ہماری معاشرت سے باہر ہے۔ عشق پیدا ہونے کے بہت وجوہات ہیں۔ ان میں سے صرف چند ہی ہماری معاشرت میں ممکن ہیں۔ پردے کی سختی کی وجہ نے ناول نویسوں کو مجبور کر دیا کہ عشق کو بیک نظر پیدا کریں۔ پرانے قصوں میں تو کسی حسین دوشیزہ کی جھلک ہی دیکھکر اس پر عاشق ہو جانا ممکن تھا۔ ایک مشہور افسانہ نگار نے انہی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک صاحب کو کسی لڑکی کے وزٹنگ کارڈ کو دیکھکر عاشق کر دیا تھا۔

اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو پردے کی سختی اور معاشرت قدیمہ کو دیکھتے ہوئے ہماری معاشرت میں شادی سے پہلے عشق ہی ناممکن تھا اور جو کچھ بھی اس سلسلہ میں لکھا گیا اس میں معاشرت کی سچی تصویر نہیں تھی مگر وہی معصوم لڑکیاں جب شوہر سے ملتی تھیں تو اس کے عشق میں فنا ہو کر رہجاتی تھیں۔ ان کا عشق بعد شادی کے پیدا ہوتا تھا۔ اُن کا آپس کا برتاؤ عاشق و معشوق سے کم نہ تھا۔ کم و بیش ہماری سوسائٹی کی مجموعی طور پر حالت اب بھی یہی ہے۔ موجودہ دور کی تعلیمی فضا نے ان خیالات میں بہت کچھ ترقی کی ہے مگر باوجود اس ترقی کے معاشرت کی رفتار بدستور وہی ہے۔ لڑکیاں باپ اور بھائی کے علم میں کھلم کھلا عاشق نہیں ہو سکتیں۔ موجودہ دور کی لڑکیوں نے اپنے حقوق کا صحیح طور پر اندازہ کر لیا ہے اور اپنی شادی اپنی مرضی کے موافق اور پسند کے موافق ہونے کی امیدوار ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی نوجوان اُنکی شوہریت کے لئے پسند کیا جائے تو اُن کی رائے شامل ہو۔ ایسی صورت میں زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتی ہے کہ ناپسند کر دے مگر کسی پر عاشق ہونے اور خود نام تجویز کر دینے کے واقعات ایک سرے سے ہماری معاشرت میں مفقود ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لڑکی یہ کر سکتی ہے کہ کئی امیدواروں میں سے کسی کو دل میں منتخب کر لے اور پوشیدہ طور پر اپنی سہیلیوں یا ہمجولیوں کی مدد سے یہ کوشش کرے کہ اس کی شادی فلاں امیدوار سے ہو جائے۔ کم سے کم جس معاشرت کی فضا میں ہم سانس لیتے ہیں اور جس معاشرت کی ہم تصویر کھینچنا چاہتے ہیں اس میں "عشق قبل از نکاح" اگر ہے تو بس اتنا ہی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کو عشق کہاں تک کہہ سکتے ہیں۔

ایک لڑکی اگر اپنی آئندہ زندگی سدھارنے اور سنوارنے کی نیت سے اگر یہ تمنا کرے کہ اُسکی شادی بجائے زید کے عمر سے ہو جائے تو اُسکو عشق ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ لیکن نہیں۔ اسکے برخلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسی سلسلہ میں اگر لڑکی کی لڑکے سے اتفاقیہ ملاقات ہو جائے، ایک دوسرے کے دلی خیالات کا پتہ چل جائے۔ دونوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ ایک دوسرے سے شادی چاہتے ہیں۔ خط و کتابت ہو جائے۔ تب لازمی وہ عشق رونما ہوگا جس کو "عشق قبل از نکاح" کہہ سکتے ہیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ خود اپنی بہن، اپنے دوست احباب کی بہنوں و بیٹیوں کی سرشت و خصائل کا اگر آپ کو صحیح اندازہ ہے تو آپ کو قائل ہونا پڑے گا کہ ہماری معاشرت کا رنگ ڈھنگ کچھ ایسا ہے کہ اگر یہ واقعات بھی ہو جائیں تب بھی لڑکی آپے سے باہر نہیں ہوگی ہمیشہ جائز حدود میں رہیگی اور اُس کے عشق کی انتہا یہی ہوگی کہ کسی طرح حسب منشا اگر اُس کی شادی ہو سکتی تو بہتر تھا۔ اس کے خلاف

جو واقعات لیں گے وہ بڑی آسانی سے مُستثنیات کے تحت میں آسکتے ہیں اور مُستثنیات میں نہ تو اپنی معاشرت کی سچی جھلک ملے گی اور نہ اپنی معاشرت کی لڑکی نظر آئے گی۔

مندرجہ بالا خیالات صحیح ہوں یا غلط کم ازکم میری تو یہی رائے ہے کہ جہانتک میں نے اپنی معاشرت کا مطالعہ کیا ہے ہمارے یہاں "عشق قبل از نکاح" ناپید ہے۔ اور میرا مشورہ ہے کہ مبتدی اس قسم کے عشق کو اپنے افسانوں میں نہ دکھائے۔ اور اگر دکھائے تو اُس عشق کی حدود مقرر کر دے، وہ یہ کہ لڑکی کی دلی خواہش کہ کسی طرح میرے والدین میری شادی فلاں شخص سے کریں تو بہتر ہے۔ اگر اسکو عشق کہہ ہی سکتے ہیں تو اُسکے وجوہات بھی قابلِ توجہ ہیں۔ لڑکے کا بہ نسبت دوسرے لڑکوں کے قابل ہونا۔ نیک ہونا۔ کماؤ۔ اچھے خاندان کا ہونا۔ خوش مزاج ہونا۔ خوشحال ہونا۔ اور بدرجہ آخری خوشرو ہونا۔ یہ ہیں وہ وجوہات جنکی بنا پر ہماری معاشرت کی لڑکیاں کسی نوجوان کو پسند کرتی ہیں۔ اور اس بات کی کوشش کرتی ہیں کہ اُنکے والدین اس شخص کو پسند کرلیں۔ اسکو جی چاہے عشق کہہ لیجئے اور جی چاہے کچھ اور کہہ لیجئے۔ رہ گئیں یہ باتیں کہ خفیہ طور سے عاشقِ زار سے مُلاقاتیں کرنا۔ بےمحابہ عریاں گفتگو کرنا۔ انتہا سے زیادہ عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی خط و کتابت کرنا۔ خود دیوانہ ہو کر عاشق کو بھی دیوانہ کر دینا۔ آنکھ میچ کر محض صورت شکل دیکھکر لٹو ہو جانا یا اسی قسم کی حرکتیں کرنا جو عموماً افسانوں میں دکھائی جاتی ہیں تو یہ باتیں ہماری معاشرت میں تو لڑکیوں میں عام طور پر نظر نہیں آتیں۔ اگر ہم اس پلاٹ پر افسانہ لکھیں گے بھی تو اس طرح کبھی نہ لکھیں گے کہ لوگ سمجھیں کہ ہماری معاشرت میں یہ واقعات اور ایسی باتیں عام ہیں۔ غیر معمولی واقعات کے افسانے پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن میری دانست میں غیر معمولی کیریکٹر کی لڑکیاں اپنے افسانوں میں مت پیش کیجئے۔ وہ جو عام لڑکیوں سے بالکل جدا ہوں اُن کو مت پیش کیجئے۔ اُس حُسن و عشق کی داستان کو پیش کیجئے جس کی اہل خود آپ کی اور میری بہن ہو سکتی ہے اور کبھی اس امر کو مت نظر انداز کیجئے کہ آپ کو اپنے افسانہ کی ہیروئن کو عام لڑکیوں سے اعلیٰ یا ادنیٰ کیریکٹر نہیں دینا ہے۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر میرے تمام افسانوں میں "عشق قبل از نکاح" مفقود ہے اور اگر ہے تو وہی جسکی تفصیل میں نے اوپر بیان کر دی۔ کم ازکم میں نے تو آج کل کی شریف زادیوں میں اس سے زیادہ عشق تو دیکھا نہیں۔ اور جو میں دیکھتا ہوں وہ لکھتا ہوں۔ جتنا اور جیسا دیکھتا ہوں ویسا ہی لکھتا ہوں اور اسی کا مشورہ دیتا ہوں۔

میرے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر ہماری معاشرت کی لڑکی رموزِ عشق سے بعد شادی ہی آشنا ہوتی ہے۔ اُسکے عشق کی گرمی اور محبت کے جذبات بعد شادی ہی رونما ہوتے ہیں اور میری دانست میں اگر عشقیہ ناول لکھنا ہیں تو اپنی معاشرت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حُسن و عشق کی داستانوں کیلئے میاں اور بیوی کو لینا چاہیئے۔ بجائے اسکے کہ ایک عشقیہ ناول ہیرو اور ہیروئن کی شادی پر ختم ہو جائے میری دانست میں اسکو شادی ہی کے بعد شروع ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اسی کو مدِ نظر رکھکر ا۔ دو میں شاید پہلی دفعہ میں نے اس قسم کے افسانے لکھے۔ وہ کامیاب ہیں یا ناکام اس کا فیصلہ ناظرین کے ہاتھ میں ہے۔ شادی سے پہلے مجھے کہیں دوسری جگہ عشق کی گرمی نظر نہیں آتی۔ کم ازکم ہماری موجودہ معاشرت کا حال تو یہی ہے۔

اُمورِ مندرجہ بالا پیشِ نظر رکھتے ہوئے امکان کا سوال آتا ہے۔ یہ کوئی منطر یا کلیہ نہیں ہے۔ نہ اس سے یہ مطلب ہے کہ اس کے برخلاف واقعات ہماری معاشرت میں ناپید ہیں۔ نہ اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ آپ مستثنیات پر افسانے نہ لکھیں۔ نہیں۔ ضرور لکھئے۔ مگر خدارا جھوٹ نہ لکھئے نہیں نہ بانکئے فرضی قصوں کو چھوڑئیے۔ امکانات کو جوڑئیے میں ڈالئے حقیقت اور واقعہ کو لیکر آئیے پھر کامیابی آپکی ہے۔

[illegible]

محبت کی پری

... شمیم! کھڑکی کے شیشے پر بارش کے قطروں کے گرنے کی آواز سن رہی ہو؟ ... اور ہوا کی کراہ؟ ... کتنی مہیب رات ہے! ایسی رات جب بیچارے غریب امیروں کے دروازے پر سردی سے کانپتے ہیں۔ اور دولتمند اپنے بند کمروں میں انگیٹھیوں کے پاس بیٹھے پشمینہ اور بانات میں لپٹے خوش گپیاں کرتے ہیں! ..... آؤ، سلیپر اتار کر میری گود میں آتشدان کے نزدیک بیٹھ جاؤ۔ اپنے ریشمی شاندار کپڑوں کو اتار کر رکھدو۔ میں ایک اچھا سا "پری کا قصہ" کہونگا۔

بہت دن ہوئے، شمیم! کسی پہاڑ پر ایک قلعہ تھا۔ اسکے اونچے اونچے دروازے مضبوط لوہے کے تھے جس میں موٹی موٹی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ یہ قلعہ دیکھنے ہی میں بہت ڈراؤنا معلوم ہوتا تھا! لانبے لانبے سپاہی سر سے پیر تک لوہے کا لباس پہنے دن رات اسکی حفاظت کیا کرتے۔ اور قلعہ کے مالک "نواب فیروز بخت" تک فوجی ہی آدمی کی رسائی ہوتی! .....

اگر تم اس کے جھریدار سخت چہرے کو اور اسکی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھوں کو دیکھتیں اور اسکی کرخت آواز سنتیں تو تم بھی اسکی ننھی خوبصورت بھتیجی صوفیہ کی طرح ڈر کے مارے کانپ جاتیں! ... شمیم! تم نے کبھی کسی صبح کو سورج کی کرنوں کے پہلے ہی بوسے سے کسی جنگلی گلاب کی کلی کو پھول ہوجاتے دیکھا ہے؟ ... صوفیہ بالکل ایسی ہی تھی! ... کسی جنگلی گلاب کی طرح! ... اکھڑ سپاہیوں کے درمیان! ! ... وہ خوبصورت تھی۔ اس کا قد لانبا تھا! ... اکثر اسکی طبیعت گھبراتی تھی ... اور وہ ٹھنڈی سانسیں لیا کرتی ... لیکن اسے خود خبر نہ تھی کہ کیوں؟ ... اس کا کمرہ ایک اونچے منارے پر تھا اور وہ اپنا سارا وقت رومال پر پھول بنانے میں گذارتی ... جب طبیعت زیادہ گھبراتی تو وہ عبادت کرنے لگتی۔ یا کھڑکی سے باہر کے خوشنما مناظر اور آسمان پر ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی کو دیکھنے لگتی ... اور اس میں اسے کچھ سکون ملتا! ... اکثر رات کو وہ دریچے سے چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھتی! کتنی مرتبہ اس سولہ سالہ لڑکی نے ان چمکتی ہوئی دنیاؤں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور حیرت کی کہ وہاں کتنا سکون ہوگا! ... ایکدم اطمینان !! ... جبکہ وہ اس قدر پریشان ہے! جبکہ اسکے ننھے سے سینے میں ایک طوفان بپا ہے! ... اور ان بے خواب راتوں کے بعد، اسکی خوابیدہ محبت کی پہلی بیداریوں کی تمنا کے بعد وہ بے اختیار رو پڑتی! ... وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسکو پیار کرتا ... اسکے بوڑھے، سخت ہاتھوں والے سپاہی ہی! ... لیکن اسکے چچا کی ایک غصہ بھری نگاہ اسکی آرزوؤں کا خون کردیتی ... اور وہ چپ چاپ اپنے رومال پر پھول کاڑھنے اور سلائی میں مشغول ہوجاتی! ... شمیم! تمہیں بیچاری صوفیہ پر افسوس آرہا ہے۔ ہاں، وہ غریب ایک خوشبودار پھول کی طرح تھی جسے ڈبہ میں بند کر دیا گیا ہو! ...

ایک روز صوفیہ دریچے میں بیٹھی فاختہ کے ایک جوڑے کو دیکھ رہی تھی جو ہوا میں ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا! ... یکایک نیچے سے ایک نہایت سُریلی آواز آئی۔ اس نے جھک کے دیکھا۔ ایک حسین نوجوان بڑی پُر موسیقی آواز میں دربان سے قلعہ کے اندر جانے کی اجازت مانگ رہا ہے۔ اسکی آواز نے، میٹھی سُریلی آواز نے اسکے دل پر عجیب طرح کا اثر کیا اور بے اختیار اسکی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے آنسو نکل کر اسکے سُرخ گالوں پر بہتے ہوئے اس پھول کے گچھے پر گرے جو اسکے ہاتھ میں تھا۔ سب پھول اسکے آنسوؤں سے تر ہوگئے!

قلعہ کا دروازہ نہیں کھلا۔ مسلح دربان نے چیخکر کہا "ہٹ جاؤ۔ یہاں صرف فوجی آسکتے ہیں!"

صوفیہ دیکھتی رہی۔ آنسوؤں سے بھیگا ہوا پھول کا گچھا اسکے ہاتھ سے نیچے نوجوان کے پاؤں پر گر پڑا۔ نوجوان نے سر اٹھایا اور کھوئے حسین بالوں والی صوفیہ کو دیکھا ... پھول کے گچھے کو اٹھاکر چوما اور چلدیا۔ اسکے نظر سے غائب ہوجانیکے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی اور خدا کا شکر ادا کیا: ...

خود نہیں معلوم کہ کیوں؟ وہ عجیب طرح کی خوشی محسوس کر رہی تھی گرچہ اُسے خود خبر نہ تھی کہ اسکی خوشی کی وجہ کیا تھی؟ ... اور اُس رات کو اُس نے بڑا دلچسپ خواب دیکھا۔ اُس نے اُسی پھول کے گچھے کو دیکھا جو اُس نے حسین نوجوان کو دیدیا تھا۔ اُسکی کانپتی ہوئی پتیوں میں سے آہستہ آہستہ ایک چھوٹی سی پری نکلی۔ اُس کے پَر انگارے جیسے سُرخ تھے! سر پر سُنہرا تاج تھا اور بدن پر لانبا، سبز ریشمی لبادہ! ... اور اُس نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔

"صوفیہ، میں محبت کی پری ہوں۔ صبح میں ہی نے نوجوان کو تمہارے پاس بھیجا تھا میں ہی نے تمہارے آنسوؤں کو خشک کرنا چاہا۔ اور پھولوں میں جذب کر لیا۔ میں تمام، ادھر اُدھر گھومتی رہتی ہوں اور اکیلے دلوں کو ملاتی ہوں۔ میرا گذر کسان کی جھونپڑی میں ہے اور بادشاہ کے محل میں بھی! اور بعض وقت میں محل کا جھونپڑی سے رشتہ جوڑتی ہوں! میں دو دلوں کو ایسے رشتہ ایک کرتی ہوں کہ وہ خوشی کے مارے دھڑکتے ہیں! .. میرا قیام پھولوں کی پنکھڑیوں میں ہے! ... جنگل کے راستوں میں! ... اور جاڑے میں محبت کرنے والوں کے کمرے میں جلتی ہوئی انگیٹھی میں بیٹھی رہتی ہوں! جہاں میں جاتی ہوں وہاں صرف محبت ہی ہوتی ہے! ... تو تم بھی نہ رو صوفیہ! میں "محبت کی اچھی پری" ہوں! ... تمہارے آنسو خشک کرنے آئی ہوں! ......"

... اور پھر وہ پھول میں چھپ گئی ... اور اسکی پنکھڑیاں آہستہ سے بند ہو گئیں! ــــــــ

تم جانتی ہو شمیم! کہ محبت کی پری! سچ مچ ہے! ... دیکھو اس وقت بھی وہ کیسی خوش خوش ہمارے کمرے میں اُڑتی پھر رہی ہے! ... اور افسوس کہ وہ اُن بیچاروں پر جو اس کا یقین نہیں رکھتے! .....

ہاں تو دوسرے روز صبح کو جب صوفیہ نیند سے جاگی تو اسکے کمرے میں آفتاب کی سہانی سہانی کرنیں ناچ رہی تھیں! کھڑکی پر ایک ننھی چڑیا گا رہی تھی! اور ہوا عجیب عجیب طرح کی خوشبوئیں لئے آ رہی تھی! ... وہ خوش تھی اور دن بھر گاتی رہی! ... مُسکراتی ہوئی۔ وہ کھلی فضا میں چڑیوں کو کھیل کرتے دیکھتی اور ان کا گانا سنتی ... اور کبھی کبھی خوشی میں زور سے ہنسکر تالی بجانے لگتی۔ اس کا دل ہلکا معلوم ہو رہا تھا ... اور اسکے دماغ میں پری کی پیشینگوئی تھی! ...

شام کو وہ بڑے کمرے میں گئی۔ نواب کے پاس ایک نوجوان فوجی سوار بیٹھا مودبانہ اُسکی باتوں کو سُن رہا تھا۔ صوفیہ انگیٹھی کے پاس بیٹھ گئی۔ اور کتاب دیکھنے لگی۔ کئی مرتبہ نیچی نگاہوں سے اُس نے نوجوان سوار کو دیکھا .. اور ایک مرتبہ اُسکی نظر پھول کے گچھے پر پڑ گئی جو اُس کے کوٹ میں لگا ہوا تھا! ... اس نشانی سے، اسکی سُریلی آواز سے صوفیہ نے لولو کو پہچان لیا! ... خوشی سے بے اختیار چیخ اُس کے مُنہ سے نکلنا چاہتی تھی! ... اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور خوشی کو چھپانے کے لئے وہ لوہے کی سلاخ سے انگیٹھی کی طرف جھک کر آگ اکسانے لگی! شعلے زور سے اوپر کی طرف اُٹھنے لگے اور انگاروں میں سے "محبت کی پری" مُسکراتی ہوئی نکل آئی۔ اپنے سبز لبادہ پر سے آگ کے ٹکڑوں کو جو سونے کے ذروں کی طرح چمک رہے تھے، جھاڑتی ہوئی وہ کمرے کے بیچ میں آ گئی ــــــ اور ہاں شمیم بوڑھے نواب فیروز بخت جیسے بوڑھے، جن کے دل عمر کے ساتھ سخت ہو جاتے ہیں، اس پری کو نہیں دیکھ سکتے! ــــ اور دونوں نوجوان ہستیوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی ... اور جبکہ نواب اپنے جوانی کے کارنامے بڑے فخریہ لہجے سے اپنے نئے مہمان کو سُنا رہا تھا، وہ اپنی دھیمی میٹھی آواز میں، ایسی آواز میں جیسے دُور کوئی آبشار کا نغمہ، کہنے لگی۔

"میرے بچو! محبت کرو! ... گذشتہ کارناموں اور جوانی کی یاد بوڑھوں کے لئے چھوڑ دو! ... ابھی تم اپنے معصوم دلوں کو ایک دوسرے کی محبت میں دھڑکنے دو! ... بعد میں ضعیفی کے غموں کو ماضی کے شیریں لمحات کی یاد سے دُور کرنیکا

بہت موقع ملے گا!... اس وقت، شباب میں، الفاظ بیکار ہیں۔ ایک نگاہ بڑی بڑی تقریروں سے بہت کچھ زیادہ کہدیتی ہے!

محبت کرو، میرے بچو، محبت کرو........"

...اور تب اُس نے دونوں کو اپنے پروں سے ایسا چھپا لیا کہ نواب اُنہیں اس وقت نہ دیکھ سکا۔ جب لولو نے کانپتی ہوئی صوفیہ کی پیشانی کو، اُسکی بڑی بڑی آنکھوں کو اپنے گرم مشتاق ہونٹوں سے پہلی بار چھوا ــــــ آہ، شمیم! گھبراؤ نہیں، میں تو تمہیں بتانے ہی والا ہوں۔ ہاں، ہاں، پری کے پروں ہی کے متعلق! سنو، محبت کی پری کے خوشنما پر تو شیشے کی طرح شفاف اور تتلی کے پروں کی طرح نازک!... لیکن جب دو محبت کرنیوالوں کو ڈر ہوتا ہے کہ کہیں کوئی اُنہیں دیکھ نہ لے تو وہ اس قدر بڑھ جاتے ہیں اور اتنے غیر شفاف ہو جاتے ہیں کہ تیز نگاہیں اُن سے نہیں گذر سکتیں!ــــ تو اس لئے صوفیہ اور لولو بھی اُنہیں پروں میں چھپے ہوئے ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے... اور سخت دل نواب کو خبر تک نہ ہوئی!....

کیسے عجیب پر! سُنا ہے کہ لڑکیاں اکثر اُنہیں اپنے لئے ڈھونڈھ نکالتی ہیں! ہے نا شمیم؟... آخر کار نواب کی داستان ختم ہوئی۔ پری انگیٹھی میں غائب ہو گئی۔ لولو محبت بھری نظروں سے صوفیہ کو دیکھکر رخصت ہوا۔

صوفیہ اتنی خوش تھی کہ اُس نے عجیب و غریب خواب دیکھے۔ اُس نے دیکھا کہ ایک پہاڑ پر صرف پھول ہی پھول ہیں!... اور ہر پھول آفتاب سے بھی زیادہ چمکیلا!.....

صبح کو صوفیہ باغ میں گئی اور پھولوں کے تختے میں گھوم رہی تھی کہ گلاب کے تختہ کے پاس اُس نے لولو کو دیکھا۔ دونوں آبشار کے کنارے بیٹھ گئے۔ اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا!.....

میں تمہیں یہ نہیں بتاؤں گا کہ اس روز تمام دن بلوط کے پرانے درختوں نے کیا کیا سُنا!... ہاں اتنا بتا دونگا کہ دونوں بولتے رہے.... متواتر، مسلسل، وہ دونوں، محبت کرنیوالے!... یکایک اُنہوں نے نواب کے بھاری قدموں کی آواز سُنی اور ڈر کے مارے کانپ گئے... لیکن اُسی وقت آبشار کے سفید پانی سے محبت کی پری مُسکراتی باہر آئی اور اُن کو اپنے پروں میں چُھپا لیا۔ اور شمیم، خیال کرو کہ نواب کتنا متعجب ہوا ہوگا جب اُس نے آوازیں سُنی ہونگی اور بولنے والوں کا کہیں پتہ نہ پایا ہوگا!.....

محبت کی پری نے دونوں کو اپنے پروں سے چُھپائے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔

"میں محبت کی حفاظت کرنے والی ہوں!... جو محبت نہیں کرتے اُن کی آنکھوں اور دلوں پر پردہ ڈالدیتی ہوں! پیارے بچو، محبت کرو! اس چشمے کے کنارے! اس خوبصورت باغ میں! پھولوں کے اس کنج میں! میں تمہارے ساتھ ہوں! تمہاری محافظ!... خدا نے مجھے انسانوں میں بھیجا ہے... اور وہ جو پاک چیزوں کی تحقیر کرتے ہیں تمہارا کچھ نہیں کر سکتے! خدا نے مجھے یہ طلسمی پر دئے اور کہا "جا! نوجوان دلوں کی مددگار ہو"... ہاں تو محبت کرو....."

...اور پھر وہ ناچتی ہوئی پھولوں میں سے شبنم کے قطرے جمع کرنے لگی... (کیونکہ یہی اُسکی غذا ہے!)

اب تم پوچھوگی کہ صوفیہ اور لولو کا آخر کیا حشر ہوا!... میری شمیم! مجھے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی! کیونکہ تم یقین نہ کروگی اور اگر یقین کروگی تو اُن کی خوش قسمتی پر رشک کرنے لگوگی اور پھر مجھے ڈر ہے کہ مجھے اپنا پیارا مُنہ چومنے نہ دوگی!... لیکن کچھ ہو مجھے تمہاری خواہش پوری کرنی ہوگی!..... تو سُنو!۔

رات تک پری اِدھر اُدھر اُڑتی رہی اور جب رات ہوئی تو اُس نے دیکھا کہ وہ بالکل جُدا ہونا ہی نہیں چاہتے! یہ دیکھکر اُس نے اُن سے

آہستہ آہستہ کچھ باتیں کہیں اور یقیناً وہ بڑی اچھی باتیں ہونگی کیونکہ اُنکے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے!... اور جب وہ پری کے مشورے پر رضامند ہو گئے تو اُس نے اُنکی پیشانیوں کو اپنی "جادو کی چھڑی" سے چھوا... اور یکایک ——

اوہ! شمیم... تمہارا دل کتنے زور سے دھڑکنے لگا ہے!... تمہاری آنکھیں کتنی تعجب سے پھیل گئی ہیں!... اور اگر اب میں قصہ کا نتیجہ تمہیں سُنانے سے انکار کر دوں تو تم غصہ میں اپنے ننھے پیروں کو زمین پر کتنے زور سے پٹکنے لگو گی!

—— ہاں تو چھڑی سے چھوتے ہی یکایک "لولو" اور "صوفیہ" "دل آرام" ( ) کے دو حسین پھول بن گئے!

... ایسے حسین کہ صرف پری ہی ویسا بنا سکتی ہے!... اُن کی پنکھڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں! عجیب وغریب پھول! کبھی نہ مرجھانے والے! ہمیشہ ساتھ رہنے والے!......

اور اب شمیم! جب کبھی ہم پہاڑی پر جائیں گے ہم اُن "حسین پھولوں" کو تلاش کریں گے... اور لوگوں سے دریافت کریں گے کہ "محبت کی پری" کن پھولوں میں رہتی ہے!...

پیاری شمیم! شاید اِس قصہ میں کوئی نصیحت بھی ہے۔ کچھ بھی ہو۔ میں نے انگیٹھی کے پاس بیٹھے ہوئے تمہیں یہ کہانی سُنائی کہ دسمبر کی اِس سرد رات میں کھڑکی کے شیشے پر گرتے ہوئے بارش کے قطروں کو تم بھول جاؤ۔ اور اِس اُمید میں کہ شاید تم اس قصے کو سُنکر اپنے "بھائی جان" سے کچھ اور محبت کرنے لگو!.....

(ردولی) —— تمنائی

تجلّیات

حیاتِ جاوداں جب دے چکا ذوقِ فنا اپنا
پھر اسکے بعد قاتل دے تو کیا دے خوں بہا اپنا

معاذاللہ فریبِ جادۂ منزل معاذاللہ
کہ ہر نقشِ قدم کو ہم نے سمجھا نقشِ پا اپنا

کریں اب کیا رہا ہو کر کہ ہم نے موسمِ گل میں
قفس کے پاس دیکھا آشیاں جلتا ہوا اپنا

ہر اک داغِ تمنا آفتابِ صبحِ محشر ہے
دلیلِ صدقِ قیامت ہے دلِ درد آشنا اپنا

مری بیتابیاں خود مانعِ اظہار ہوتی ہیں
کہ سمجھایا نہیں جاتا اب اسکو مدعا اپنا

گریباں کو گریباں ہی سمجھتے ہیں خبر کیا تھی
کہ دورِ آگہی دے گا جنونِ فتنہ زا اپنا

کریں احباب سے کیا شکوۂ جورِ فلک تابش
نہ کوئی غمگسار اپنا نہ کوئی ہمنوا اپنا

تابش دہلوی

دُو دوست

پیرس کا محاصرہ ہو چکا تھا۔ لوگ بھوکوں مر رہے تھے۔ صورت حالات حد کو پہنچ چکی تھی۔ چھتوں پر چڑیاں کم دکھائی دیتی تھیں۔ نالیاں چوہوں سے خالی ہو چکی تھیں۔ لوگوں کو جو ملتا تھا غنیمت سمجھ کر کھا لیتے تھے۔

جنوری کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ موسیو مارسیو گھڑی ساز، خالی پیٹ، فوجی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، ایک شجر دار فراخ سڑک پر مغموم پھر رہا تھا، کہ یکایک اس کا ایک دوست اس سے بغلگیر ہوا۔ وہ ٹھہر گیا۔ یہ موسیو ساویج تھا، اس کا پرانا دوست جسے پہلے پہل اسے دریا پر ملا تھا۔

جنگ سے پہلے مارسیو ہر اتوار کی صبح کو، طلوع آفتاب کے وقت، مچھلی پکڑنے کی چھڑی ہاتھ میں لے، اور ٹین کا صندوق پیٹھ پر دھرے گھر سے نکلا کرتا تھا۔ وہ ارجنٹول کی طرف جانے والی گاڑی پر بیٹھ کر کولمبیز پہنچ جاتا، اور وہاں سے مارنتے کے جزیرے تک پیدل چلا جاتا۔ اس جگہ جو اس کے خوابوں کی بستی تھی، پہنچتے ہی وہ مچھلی پکڑنے میں مشغول ہو جاتا۔ ہر اتوار کو ایک پست قد، خوش طبع آدمی، موسیو ساویج سے، جو لارٹ ڈی میں بزازی کا کام کرتا تھا، اور مچھلی کے شکار کا بے حد مشتاق تھا اس کی ملاقات ہوتی۔ وہ اکثر ہاتھ میں شکار کی چھڑی تھامے، ندی میں پاؤں لٹکائے، پاس پاس بیٹھے، آدھا آدھا دن گذار دیتے۔ اس طرح دونوں میں گہرا رابطہ پیدا ہو چکا تھا۔ کسی دن وہ بات تک نہ کرتے، اور کبھی باتیں کرتے، مگر باتوں ہی پر کیا منحصر ہے وہ ایک دوسرے کو یوں بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان کا مذاق اور احساس یکساں تھا۔

بہار کی ایک صبح کو، دس بجے کے قریب، جب نوزائیدہ سورج خاموشی سے بہتے ہوئے دریا پر ہلکی سی دھند پیدا کر رہا اور ان دونوں مشتاق شکاریوں کی پیٹھوں پر نئے موسم کی کیف آور دھوپ پڑتی تو مارسیو اپنے ساتھی سے کہتا "کہو کیا یہ موسم خوشگوار نہیں؟" اور موسیو ساویج جواب دیتا "بڑا فرحت افزا ہے۔" یہ تھی وہ بات جس سے وہ ایک دوسرے کے مذاق کو سمجھ چکے تھے اور ایک دوسرے سے محبت کیا کرتے تھے۔

موسم خزاں میں، دن ڈھل جانے کے بعد، جب آسمان کا رنگ شفق سے سرخ ہو جاتا اور قرمزی بادلوں کا عکس پانی پر پڑ کر تمام دریا رنگین ہو جاتا۔ اس ارغوانی فضا میں دونوں دوست آگ کی طرح سرخ دکھائی دیتے، اور درخت، جو موسم سرما کی آمد سے کانپتے تھے، لالہ گوں معلوم ہوتے تھے۔ موسیو ساویج، مارسیو کی طرف متبسم ہو کر دیکھتا اور کہتا "کتنا خوش آیند منظر ہے۔" اور مارسیو اپنی آنکھیں اٹھائے بغیر مسرت آمیز لہجے میں جواب دیتا "قطعی!"

ہاں تو جب وہ ایک دوسرے کو پہچان چکے، انہوں نے نہایت گرمجوشی سے ہاتھ ملائے، اور مختلف حالات میں رہنے کے باوجود ملاقات سے ان کے دل بھر آئے۔ موسیو ساویج نے آہ کھینچ کر دبی آواز میں کہا "کیا انقلاب ہوا!" مارسیو غمگین لہجے میں بولا۔ "اور موسم بھی کتنا خوش ہے۔ آج اس سال کا نوروز ہے۔" اس وقت آسمان واقعی شفاف اور خوش آیند دکھائی دیتا تھا۔

وہ مغموم و محزون، ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ مارسیو بولا۔ "اور مچھلی کا شکار! آہ وہ زمانہ کتنا پرلطف تھا۔" موسیو ساویج نے پوچھا "کاش ہم پھر اسی طرح شکار کو جائیں!"

وہ قہوہ خانے میں داخل ہوئے۔ دونوں نے اکھٹے شراب پی اور دوبارہ ٹہلنے لگے یکایک مارسیو رُک گیا اور کہنے لگا "ایک جام اور!" ساوِیج نے جواب دیا "میں بھی ساتھ ہوں" وہ ایک دوسری دوکان میں داخل ہوگئے اور بے فکر ہوکر باہر نکلے، جس طرح لوگ خالی پیٹ شراب پی کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتے ہیں۔ دن خوشگوار تھا اور نرم ہوا اُن کے چہروں سے اٹھکیلیاں کررہی تھی

موسیو ساویج جس کی بیفکری تازہ ہوا نے حد تک پہنچادی تھی، ٹھہر کر کہنے لگا "میں کہتا ہوں اگر ہم جائیں......!"

"اس سے تمہارا مطلب؟"

"مچھلی کے شکار کو"

"کہاں"

"اپنے جزیرے کی طرف، فرانسیسی چوکیاں کولمبیر کے پاس ہی ہیں۔ میں کرنیل ڈومولین کو جانتا ہوں وہ یقیناً ہمیں گزرنے کی اجازت دیدیگا۔"

مارسیو نے بیقراری سے کانپتے ہوئے جواب دیا "اچھا تو میں تیار ہوں" اور وہ شکار کا سامان لینے چلے گئے۔

ایک گھنٹہ کے بعد وہ شاہراہ پر چل رہے تھے۔ وہ کرنیل کے بنگلے پر آئے اور اجازت لے لی اور پھر چل پڑے

وہ جلد ہی چوکیوں سے گذر کر اور کولمبیر کے ممنوع گاؤں کو چھوڑتے ہوئے، انگور کے چھوٹے سے باغ کے کنارے پر پہنچے جو دریائے سین کے پاس واقع تھا گیارہ بج چکے تھے۔

ارجنٹول کا گاؤں بالکل ویران ہوچکا تھا۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سے نینٹری تک پھیلے ہوئے میدان میں بیری کے درختوں اور بادامی زمین کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ بالکل غیر آباد دکھائی دے رہا تھا۔

موسیو ساویج نے چوٹیوں کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دبی آواز میں کہا "جرمن وہاں پر ہیں!" اس ویران جگہ کو دیکھتے ہوئے دونوں دوستوں کے دلوں پر بےچینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جرمن —! انہوں نے کبھی کوئی جرمن نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ وہ کئی مہینوں سے پیرس کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ اور تمام فرانس میں بڑی شدت سے لوٹ مار، قتل، غارتگری، لوٹ مار برپا کررہے ہیں۔ ان کا دل اس عجیب و غریب فاتح قوم کی نفرت سے بھر گیا تھا۔

مارسیو نے کانپتے ہوئے کہا "میں کہتا ہوں اگر ہمیں چند جرمنوں سے دوچار ہونا پڑے تو"...... موسیو ساویج نے اہل پیرس کی طرح حوصلے کو برقرار رکھتے ہوئے کہا "تو ہم انہیں چند بھُنی ہوئی مچھلیوں سے مطمئن کردیں گے۔" وہ پہاڑوں کی خاموش فضا سے خوفزدہ ہو کر آگے جانے سے ہچکچاتے تھے۔ بالآخر موسیو ساویج نے دلیری سے کام لیکر کہا "چلئے آؤ مگر ذرا احتیاط سے۔"

وہ انگور کے باغ میں بیٹھ گئے۔ اور ہر جھاڑی کے پیچھے سہارا لیتے جھکتے ہوئے، سراپا احتیاط، آگے بڑھتے گئے۔ ان کے آگے کھلی زمین تھی جس پر سے گذر کر ان کو دریا پر پہنچنا تھا۔ اُنہوں نے دوڑتے ہوئے اس میدان کو طے کیا اور جونہی وہ کنارے پر پہنچے، وہ سوکھی جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئے۔

مارسیو نے خفیف سے خفیف آہٹ سننے کیلئے اپنے کان زمین سے لگا دیئے، وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ بالکل تنہا تھے۔

انہوں نے حوصلہ سے کام لیا اور شکار میں مصروف ہوگئے۔

ان کے سامنے ایک غیر آباد جزیرہ مارنٹی تھا، جس کی اوٹ میں.... دریا کے اُس پار نظر نہیں آسکتے تھے۔ جزیرہ کا چھوٹا سا ریسٹوران

بند تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کئی سال سے بند چلا آرہا ہے۔

موسیو سائیج نے پہلی مچھلی پکڑی، مارسیو نے دوسری۔ ہر منٹ کے بعد انہیں تازہ گوشت کا ٹکڑا کانٹے کے سرے پر لگانا پڑتا۔ اس دن انہوں نے بہت شکار کیا۔ وہ مچھلیوں کو نہایت احتیاط سے اپنے قریب پانی میں لٹکی ہوئی نفیس جالی میں رکھتے گئے۔ ان کے دل اس وقت اس شخص کی طرح مسرت سے بھر گئے، جو مسرت سے بہت عرصہ تک محروم رہ چکنے کے بعد دوبارہ اس سے لطف اندوز ہو۔

سورج کی کیف آور کرنیں ان کے کاندھوں کو گرما رہی تھیں۔ نہ ان کے کان کچھ سنتے تھے، نہ ان کے دل میں کوئی اور خیال آتا تھا۔

الغرض وہ اپنی دنیا میں بالکل محو تھے، یکایک ایک دل ہلا دینے والی آواز سے، جو زمین کے اندر سے پیدا ہوتی معلوم ہو رہی تھی، ساری زمین دہل گئی..... بمباری دوبارہ شروع ہو چکی تھی!

مارسیو نے اپنا سر پھیرا، اس نے کنارے سے بہت اونچے مونٹ ویلیریاں کی چوٹی پر دھوئیں کا مرغولہ، جو ابھی ابھی پیدا ہوا تھا، دیکھا۔ پھر قلعہ کی چوٹی پر سے دھوئیں کا ایک سیاہ بادل اٹھا، اور کچھ لمحوں کے بعد بندوقوں کی دہشتناک آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آوازیں بڑھتی گئیں۔ ہر منٹ سفید دھوئیں کے بادل جو آہستہ آہستہ آسمان کی طرف اڑتے جا رہے تھے، اور وہاں پہنچ کر ایک خوفناک بادل کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ پہاڑی میں سے موت کی صورت میں بلند ہو رہے تھے۔

موسیو سائیج نے اپنے کاندھے سکیڑ کر کہا "اس طرف دیکھو۔"

مارسیو، جو اپنے کانٹے کے بلبلوں پر نظر جمائے ہوئے تھا، بمباری کی دہشتناک آوازیں سن کر ایک امن پسند آدمی کی طرح بول اٹھا "یہ بالکل پاگل ہیں۔ دیکھو ایک دوسرے کو کس طرح مار رہے ہیں؟"

سائیج نے جواب دیا "بلکہ وحشی جانوروں سے بھی بدتر!"

مارسیو نے، جو مچھلی پکڑنے میں محو تھا، کہا "جب تک ہمارے سر پر ملوکیت رہیگی یونہی ہوتا رہیگا۔"

سائیج نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "جمہوریت کبھی جنگ کا اعلان نہیں کرتی۔"

مارسیو نے بات کاٹ کر کہا "مطلق العنان حکومت میں تم اپنے ہمسایوں سے جنگ کرتے رہتے ہو۔ اور جمہوری حکومت میں تم آپس میں لڑتے رہتے ہو۔" اور وہ سادہ لوح امن پسندوں کی طرح سیاسی عقدوں پر عجیب و غریب طریقوں سے روشنی ڈالنے لگے۔

مونٹ ویلیریاں مسلسل گونج رہی تھی۔ گولوں سے فرانس کی عمارتیں ریزہ ریزہ ہو رہی تھیں۔ آدمی اور ہر ذی روح چیز پس پس کر بے نشان ہو رہی تھی۔ بہت سے خواب — آئندہ کی خوشی اور مسرت کے خواب — خاک میں مل رہے تھے اور عورتوں، لڑکیوں اور ماؤں کے دلوں میں ناقابل اندمال زخم پیدا کر رہے تھے۔

موسیو سائیج نے کہا "کیا زندگی یہی ہے؟"

مارسیو نے جواب دیا "تمہارا مطلب، کیا موت یہی ہے" سے ہے۔ اور وہ ہنس پڑا۔ ان دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔ یقیناً کوئی ان کے پیچھے آرہا تھا۔ آنکھیں پھیر کر جو انہوں نے دیکھا تو ان کو بالکل قریب ہی چار آدمی بڑی بڑی ڈاڑھیوں والے نوکروں کے لباس میں، سر پر کشادہ ٹوپیاں اوڑھے نظر آئے۔ وہ ان کی طرف رائفلیں سیدھی کئے ہوئے تھے۔

کانٹے ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور ندی کی تہ میں جا پہنچے۔

چند ہی لمحوں میں وہ پکڑ لئے گئے۔ اور باندھ کر کشتی میں رکھ لئے گئے۔ اور جرمن جزیرے میں پہنچا دیئے گئے۔ جن مکانوں کو انہوں نے بالکل ویران سمجھ رکھا تھا۔ ان کی پشت میں اب ان کو بیس جرمن سپاہی نظر آئے۔

ایک گھنے بالوں والا، دیو پیکر انسان، جو کرسی پر پاؤں لٹکائے چینی کے پائپ سے تمباکو پی رہا تھا، فصیح فرانسیسی میں کہنے لگا "اچھا بھلے مانسو، مچھلی کے شکار نے تمہیں اس نوبت تک پہنچا دیا" اسی وقت ایک سپاہی نے اپنے افسر کے پاؤں میں مچھلیوں سے بھرا ہوا جال، جو وہ احتیاط سے لایا تھا، رکھ دیا۔ جرمن مسکرا کر بولا "خوب...... شکار تو اچھا خاصا کیا ہے۔ مگر ہمارے پاس بھوننے کے لئے اور بہت سی مچھلیاں موجود ہیں۔ اب سنو" اور ٹھنڈے دل سے، "میں تم کو دو جاسوس سمجھتا ہوں، جو ہمارا راز معلوم کرنے کے لئے بھیجے گئے ہوں۔ مجھے اس پر یقین ہے اور میں تمہیں گولی کا نشانہ بنا دوں گا۔ تم مچھلی کے شکار کے بہانے اپنی سازشوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اب تم میرے ہاتھوں میں ہو۔ اور اپنے کئے کی سزا بھگتو گے۔ یہ جنگ ہے جنگ ہے جنگ کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ تم اپنی چوکیوں سے دور نکل آئے ہو، مجھے یقین ہے کہ تمہیں لفظ راہداری (Pass-word) معلوم ہوگا۔ تاکہ تم اس کے ذریعے واپس مقام تک پہنچ سکو۔ وہ لفظ مجھے بتا دو، اور میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

دونوں دوست خوفزدہ ہو کر ساتھ ساتھ بت بنے کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھ کمزوری سے کانپ رہے تھے۔

افسر نے کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "کسی کو بھی تمہارے واپس چلے جانے کی خبر تک نہ ہوگی۔ اور یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ اگر تمہارا دل مانتا ہے تو تم آسانی سے اپنے گھروں کو واپس جا سکتے ہو۔ اگر تم انکار کروگے تو موت یقینی ہے۔ بے توقف موت ––– کہو۔"

وہ ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر کھڑے رہے۔

جرمن نے حیرت زدہ ہو کر اپنے ہاتھ پانی کی طرف بڑھائے اور کہا "سوچ لو۔ پانچ منٹ میں تم اس دریا کی تہ میں ہوگے ––– صرف پانچ منٹ میں ––– میرا خیال ہے کہ تمہارے بیوی بچے ہوں گے۔"

مونٹ ویلیریاں میں بدستور گرج پیدا ہو رہی تھی۔ دونوں ماہی گیر ساکت کھڑے تھے۔ جرمن نے اپنی زبان میں کوئی حکم دیا۔ پھر اس نے قیدیوں سے ذرا پرے ہو جانے کے لئے اپنی کرسی پیچھے کر لی۔ بیس آدمی آگے بڑھے اور بیس قدم کے فاصلہ پر کھڑے ہو گئے۔ اور اپنے ہتھیار درست کرنے لگے۔

افسر نے کہا "میں تم کو سوچنے کے لئے ایک منٹ اور دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک سیکنڈ تک نہ دوں گا۔" وہ بے طرح اٹھ کر دونوں فرانسیسیوں کے پاس پہنچا۔ مارسیو کو اس نے بازو سے پکڑا اور اپنے نزدیک لا کر اس کے کان میں کہنے لگا "جلدی کرو۔ لفظ راہداری بتلا دو۔ تمہارا دوست تک سننے نہ پائے۔"

مارسیو نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس کے بعد جرمن نے موسیو ساویج کو علیحدہ لے جا کر اس سے وہی سوال پوچھا۔ مگر اس نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔

پھر دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ہو گئے۔ افسر نے حکم دیا اور سپاہیوں نے رائفلیں سیدھی کریں۔

اس وقت مارسیو کی نگاہ مچھلیوں سے بھرے ہوئے جال پر جا پڑی جو اس سے تھوڑے فاصلہ پر گھاس کے اوپر پڑا تھا۔ دھوپ چمکدار مچھلیوں کے ڈھیر پر، جو ابھی تک زندہ تھیں، پڑ رہی تھی۔ اس کا حوصلہ جاتا رہا اور ہزار کوشش کے بغیر بھی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے

اس نے پست آواز میں کہا "خدا حافظ، موسیو ساویج، خدا حافظ!"

موسیو ساویج نے جواب دیا "خدا حافظ، موسیو ریسو!"

انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے - وہ بے قابو ہو کر سر سے پاؤں تک تھرتھرا رہے تھے -

افسر نے چلا کر کہا "فائر"

بارہ فائر بیک وقت سر ہوئے -

موسیو ساویج گٹھے کی طرح آگے کو گر پڑا - مارسیو جو بڑا تھا ڈگمگاتے ہوئے اپنے ساتھی پر جا پڑا - اس کا منھ آسمان کی طرف مڑ چکا تھا - چھاتی پر سے اس کی قمیص چھلنی ہو چکا تھا اور اس میں سے خون بہ نکلا تھا -

جرمن نے ایک اور حکم دیا - سپاہی منتشر ہو گئے - اور رسیاں اور پتھر لے کر واپس آئے - جو انہوں نے دونوں مردہ دوستوں کے پاؤں میں باندھ دیئے - اور ان کو دریا کے کنارے پر لے گئے - مونٹ ویلیرین میں سے بدستور گڑگڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی - اور دھوئیں کے مرغولے بادل بن بن کر اس پر جمع ہو رہے تھے -

دو سپاہیوں نے مارسیو کا سر اور پاؤں پکڑ لیا اور دوسرے دو نے موسیو ساویج کو اسی طرح تھام لیا - دونوں لاشیں بڑی تیزی سے آگے پیچھے کو جھلائی گئیں - اور پھر آگے کو عین دریا کے وسط میں پھینک دی گئیں - پتھر انہیں کھینچ کر پانی کے اندر لے گئے -

پانی کی سطح بلند ہوئی، جھاگ پیدا ہوا، لہریں نمودار ہوئیں، اور پانی پھر ساکن ہو گیا - چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھیں اور تیرتی ہوئی کنارے تک پہنچ گئیں -

خون کے چند قطرے پانی میں غائب ہو گئے -

افسر حیرانی سے کمزور آواز میں بولا "اب مچھلیوں کی باری ہے!" وہ اپنے بنگلے میں چلا گیا - مگر جونہی اس کی نظر مچھلیوں والے جال پر پڑی، جو گھاس پہ پڑا تھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے جال کو اٹھا لیا -

ایک سپاہی سفید جھنڈا پہنے دوڑتا ہوا آیا - جرمن افسر نے مرے ہوئے ماہی گیروں کی کمائی اس کی طرف پھینک دی، اور کہا :-

"ان ننھی ننھی تازہ مچھلیوں کو بھون لو - دیکھنا، بڑی لذیذ ہوں گی" اور وہ پائپ پینے میں مشغول ہو گیا -

طاہر قریشی

شفتالو کے پھول

ایک بڑے تالاب کے کنارے شاہی محل واقع تھا۔ کھنڈر اب تک گذشتہ عروج کا افسانہ سُنا رہے تھے۔ یہ محل کسی زمانہ میں چینی بادشاہوں کی عیش گاہ تھا لیکن پایہ تخت سے فاصلہ اور ملک کی تباہ حالت نے اسے شاہی خاندان سے تقریباً نا آشنا کر دیا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ پایہ تخت کی ذمہ داریوں سے شہنشاہ یونسونگ لطف کے چند دن گزارنے کے لئے یہاں آگیا تھا۔ اپنے یار غار تاتاری شہزادے سنریما سے الگ رہ کر بھی اس کی فلسفیانہ طبیعت تالاب کی ہموار سطح اور جنگل کی خاموشی میں دن گزار کر لطف حاصل کر رہی تھی۔ چھوٹی سی کشتی میں اپنا محبوب بھالا لیکر وہ تالاب کے گرد چکر لگاتا رہتا۔ وہاں کون جانتا تھا کہ یہ سادا انسان چین کا شہنشاہ یونسونگ اعظم ہے؟

ایک دن صبح کے وقت حسب معمول وہ اپنی کشتی میں بیٹھ کر خلد ساوی کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ درختوں کے سائے پانی میں تیر رہے تھے۔ یکایک اس نے دیکھا کہ کشتی شفتالو کے پھولوں میں سے ہو کر گذر رہی ہے۔ سامنے کے جنگل اس پھول سے خالی تھے۔ آخر یہ آئے کہاں سے؟ وہ اسی فکر میں تھا کہ اس نے یہ محسوس کیا کہ کشتی کسی ہلکے دھارے کی مدد سے آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ ایک دو گھنٹہ کی جد وجہد کے بعد اسے ایک چھوٹی سی درختوں سے ڈھکی ہوئی نہر ملی جو اسی تالاب سے نکلتی تھی۔ گھنے درختوں سے جان توڑ کشمکش کے بعد اس نے اس پوشیدہ نہر میں اپنی کشتی ڈال دی۔ نہر کشادہ ہوتی گئی تھی اور دھارا نہایت ہی ہلکا تھا۔ بغیر چپو کی مدد کے کشتی دھارے پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سلطنت کے جھگڑوں سے دور وہ ایک آزاد کسان کی طرح اس سے حظ اُٹھا رہا تھا۔

تھوڑی دور چل کر نہر داہنی جانب مڑ گئی۔ کشتی کنارے سے ٹکرا کر خود ہی ٹھہر گئی۔ گھنے جنگل کے درمیان انسانی ہاتھ نے ایک راستہ بنا رکھا تھا۔ گھنی گھنی سبز گھانس، پھول کی خوشبو، مگس کا نہ ختم ہونیوالا نغمہ ——— اسے یہ منظر دیکھ کر وجد آرہا تھا۔ جنگل شفتالو کے پھولوں سے پٹے پڑے تھے۔ کشتی میں بیٹھا ہوا شہنشاہ اس سے بھی بے خبر تھا کہ وہ کتنی غیر محفوظ جگہ آگیا ہے۔ اس نے یہ آزادی بہت عرصہ کے بعد حاصل کی تھی اس لئے وہ لطف اُٹھانا چاہ رہا تھا۔

راستہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا ایک اونچے ٹیلے پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ انسانی آبادی سے اتنی دور کون رہتا ہے؟ ——— اس کا دل یہ جاننے کے لئے بیچین ہو رہا تھا۔

ایسی سُنسان جگہ میں آبادی کے نشانات دلچسپی اور خطرے سے خالی نہ تھے۔ اس نے کشتی موڑ لی۔ ہلکے دھارے کے خلاف کشتی لے جانے میں اسے دقت نہیں ہو رہی تھی، اس کی نگاہیں کسی نئی چیز پر پڑنے کے لئے بیتاب تھیں۔ کنارے سے تھوڑی دور اسے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ جھنڈ کے درمیان چھوٹا سا خوبصورت خیمہ نصب تھا۔ پائے کسی قیمتی دھات کے بنے ہوئے تھے۔ سہ پہر کا آفتاب اس پر اپنی شعاعوں سے خیرہ کن چمک پیدا کر رہا تھا۔

اس نے کشتی باندھ دی۔ اپنا محبوب بھالا ہاتھ میں گھماتا اس دلچسپ جگہ کی سمت بڑھا۔ اس کی نظریں ہر چیز پر دریافت طلب انداز سے پڑ رہی تھیں۔ چاروں کنارے پھولوں کے گملوں سے سجے تھے۔ چڑیوں کے پنجرے، خیمہ کا فرنیچر ذوقِ سلیم کی شہادت دے رہا تھا۔ خیمہ کے دروازہ پر پہنچکر وہ ٹھہر گیا۔ غیر مکان میں بغیر اجازت داخل ہوتے ہوئے اسے جھجک سی معلوم ہو رہی تھی۔ یکایک دروازہ کا

پردہ ہٹا اور ایک عورت ظاہر ہوئی۔ اجنبی کی صورت دیکھ کر وہ کچھ دیر تک ساکت رہی چہرے سے گھبراہٹ کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

رُعبِ حُسن، سفر کی تعجب انگیز دلچسپیاں، ان سبھوں نے ملکر اسے مسحور کر دیا تھا۔ دل کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان معذور تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ اکثر رُعب، قوت و اقتدار سے بے نیاز بھی ہوتا ہے۔ زبان کُھلنے سے پہلے پردہ گر چکا تھا۔ وہ نظروں سے پنہاں ہو چکی تھی۔

اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہ کسی عورت کی موجودگی میں ایک غیر جگہ داخل ہو۔ وہ اُلٹے پاؤں لوٹا۔ گردن جُھکائے بھالا بغل میں دبائے چند ساعت قبل گذرے ہوئے واقعات پر غور کرتا جا رہا تھا — وہ کون تھی؟ خیمہ کا دروازہ پھر کُھلا۔ اب کے وہ نہیں بلکہ ایک سن رسیدہ شخص باہر آیا۔ لمبے لمبے سفید بال کاندھوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ شان رفتار گذشتہ جسمانی عروج کا پتہ دے رہی تھی۔ شہنشاہ پریشان خیالات کو جمع کر کے اپنی گمشدہ متانت سے اسے سلام کیا۔ بوڑھے کی آنکھیں اس پُر وقار انداز کو دیکھ کر چمک رہی تھیں وہ نہایت ہی اخلاق سے آگے بڑھا اور پوچھا۔

"تم شریف معلوم ہوتے ہو۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم کون ہو؟

"میں چینی سلطنت کا شاہزادہ یونسلین ہوں" شہنشاہ نے دروغ مصلحت آمیز کو راہ دیتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں کس لئے آئے ہو؟" بوڑھے کی آواز اپنی گذشتہ عظمت و بزرگی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

یونسولنگ نے سارا قصہ کہہ سنایا لیکن شہنشاہ کی جگہ اس نے خود کو ایک جلا وطن شہزادہ پیش کرنا مناسب سمجھا جو اُس ویران محل میں کچھ عرصہ کے لئے مقیّد کر دیا گیا تھا۔

"میری ایک لڑکی ہے" بوڑھے نے اس قصہ سے دلچسپی نہ لیتے ہوئے صاف صاف کہا "جس نے سوائے میرے آج تک کسی مرد کی صورت نہیں دیکھی ہے"

"معاف فرمایئے" شہزادہ نے جہاں بازانہ انداز سے جواب دیا "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں کبھی اس کے سامنے آنے کی جرأت نہ کرتا گو ایسا خوبصورت چہرہ . . ." الفاظ آہستہ آہستہ گُم ہو رہے تھے۔ بوڑھے کی ہمت افزا نگاہیں اس پر پڑ رہی تھیں۔

وقت آ گیا ہے کہ میں اس کے لئے کوئی مناسب آدمی تلاش کروں۔ خدا نے تمہیں اپنی مہربانی سے اس طرف بھیجا ہے چونکہ تم جانتے ہو یہ کوئی عام گزرگاہ نہیں ہے تم نے اپنا نام اور رتبہ خندہ پیشانی سے بتا دیا ہے۔ اس لئے مجھے بھی اس میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ میں چوستین ہوں مشہور باغی جنرل۔ تم شاید اس نام سے واقف ہو گے" وہ حقیقت کہہ رہا تھا شہنشاہ پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اس وقت سب سے بڑے دشمن کے سامنے کھڑا تھا اور اس وقت کوئی تیسری طاقت اس کی مدد کے لئے موجود نہ تھی۔ بوڑھے نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اب تم میری حالت سے واقف ہو گئے ہو گے شکست کے بعد میں نے اس ویران محل کو چھوڑ دیا اور اپنی بیوی اور بچّی کے ساتھ اس آخری جائے پناہ میں آ گیا ہوں۔ یہ لڑکی جو تم نے دیکھی ہے میری بچّی تخلین ہے۔ اب تمہیں اختیار ہے کہ ٹھہرو یا جس راستہ سے یہاں تک آئے ہو اسی راستہ سے واپس چلے جاؤ۔ لیکن میرے خیمہ میں تم اسی شرط پر داخل ہو سکتے ہو کہ آئندہ تمہیں اس بچّی کا سرپرست بننا پڑیگا"

شہنشاہ کا خاموش داخلہ بوڑھے کے سوال کا خود جواب بہم پہنچا چکا تھا۔ بوڑھا سردار شہنشاہ کو چھوڑ کر خیمہ کے اندرونی حصہ میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ حسین تحلین کو ساتھ لیکر شہنشاہ کے سامنے حاضر ہوا گھبراہٹ کی وجہ سے اس کی خوبصورت پیشانی پر پسینہ کے قطرے جمع ہو رہے تھے۔ اپنے ہونے والے سرپرست کو وہ وحشت و استعجاب کی نظروں سے گھور رہی تھی۔ وہ غیر معمولی طور پر حسین تھی جنگل کی پاک ہوا نے اسے آزاد ہرنی کی طرح تندرست بنا رکھا تھا۔ شہنشاہ کی نگاہیں اسے کوئی سماوی ہستی سمجھ رہی تھیں۔

عرصہ گذر گیا۔ شاہی محل میں شہنشاہ، سنریما اور تحلین، بھائی بہن کی طرح زندگی گذار رہے تھے۔ سنریما ایک جوان دل کا مالک تھا۔ شہنشاہ کا خلوص اور اس کی پاک دوستی اسے تحلین سے بے تکلف کر چکی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ "میں صرف تحلین کے لئے جی رہا ہوں"۔ وہ اکثر کہا کرتا۔ اس کے سارے کارناموں کے لئے تحلین کا ایک ہلکا سا تبسم گرانمایہ صلہ تھا۔ سنریما ایک حسین جوان تھا شاید شہنشاہ سے بھی زیادہ۔ وہ زندگی کے ان زینوں سے گذر رہا تھا جب انسان کے لئے صرف محبت ہی ایک شغل ہوتا ہے۔ وہ ایک مشہور دلیر تھا لیکن تحلین کی محبت نے اسے شاعر اور مغنی بھی بنا دیا تھا۔ وہ عورت کے دل کو مسحور کرنے چلا تھا لیکن اکثر لوگوں کی طرح خود بھی اس دام میں گرفتار ہو چکا تھا۔ بت گری ترقی کرکے بت پرستی بن چکی تھی۔

شہنشاہ کا تخیل اس سے بلند تر تھا۔ اس کے دل میں تین خانے تھے۔ محبت، دوستی اور شہرت۔ تحلین اس کی ہستی کا ایک تہائی جز تھی۔ لیکن وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ جسمانی حیثیت سے وہ خوبصورت سے زیادہ وجیہہ تھا۔ اونچی پیشانی بڑی بڑی آنکھیں رعب برقرار رکھنے میں ہمیشہ کامیاب رہتیں۔ وہ بہت کم مسکراتا لیکن تبسم اس کے رُخ پر اس طرح نمودار ہوتا جس طرح شبِ تار کے بعد آفتاب کا ہنستا ہوا چہرہ۔ رعایا کے دل میں شہنشاہ کے لئے عزت اور محبت تھی اور سنریما کے لئے صرف نفرت باقی رہی تھی۔ عورتیں انسانی دائرہ سے باہر نہیں ہوتیں۔ ان کے دلوں میں اوّل کے لئے عزت و ستائش ہوتی ہے اور دوسرے کے لئے صرف ان کی "کمزوریاں" وقف ہوتی ہیں۔

سلطنت کے کاموں کی مشغولیت، دوست اور بیوی کی محبت اسے یہ جاننے سے مانع ہو رہی تھی کہ سنریا ملک بھر میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی عزیز بیوی ذلت کی نگاہ سے۔

شہنشاہ اکثر اکیلا گھوڑے پر سیر کے لئے نکل جاتا۔ سنریما کو محل کے اندر آنے کی اجازت تھی۔ ایک دن محل کے نزدیک ہی میدان میں شہنشاہ کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ اسے بُرا شگون سمجھ کر شہنشاہ نے واپس ہی لوٹ جانا مناسب سمجھا۔ چند گھنٹوں کے بعد وہ چور دروازہ سے اپنے محل کے پائین باغ میں داخل ہوا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ موسم معتدل تھا۔ ایک جھرنے کے پاس بیٹھ کر وہ اس کی رفتار سے لطف اٹھا رہا تھا۔ پانی اس کے پاؤں چوم رہا تھا۔ ٹھنڈا پانی اس کے خیالات کو یکسو کر رہا تھا۔ کسی خیال کے ماتحت وہ ملکہ کی مخصوص خوابگاہ کی سمت چلا۔ خوابگاہ کا پردہ اٹھا کر وہ داخل ہونا چاہ رہا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں — تحلین اس کے عزیز دوست کے سینہ پر سر رکھے محو خواب تھی۔

غم تلوار کی ضرب کی طرح اس کے دل کے ٹکڑے کر رہا تھا۔ اس کے اختیار میں تھا کہ زبان کی ہلکی سی جنبش سے اپنی عزت کے ڈاکو کا خاتمہ کر دیتا، لیکن دل میں انتقام کی جگہ غم کی آگ بھڑک رہی تھی۔

شہنشاہ اس دن خلاف معمول کافی رات تک شکار میں مصروف رہا۔ وہ کئی دن پایہ تخت سے باہر رہا۔ اس کی غیر معمولی

غیر حاضری نے سارے شہر میں سنسنی پھیلا رکھی تھی - اس خبر نے سارے شہر میں استعجاب کی لہر دوڑا دی کہ قیدی شہزادہ سنر یا کو شہنشاہ نے شمالی علاقہ کا حاکم بنانے کا حکم صادر کیا ہے - بادشاہ کی اس فیاضی نے اس کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے لیکن عوام سنر یا سے دن بدن متنفر ہوتے جا رہے تھے - امراء میں اک گونہ خوشی کی لہر دوڑ گئی - انہیں سنر یا کی قربت کبھی بھی پسند نہ تھی - سنر یا اپنے علاقہ پر روانہ ہو چکا تھا کہ شہنشاہ نے پایہ تخت میں قدم رکھا - اتنی تھوڑی مدت کے بعد ہی شہنشاہ میں نمایاں تبدیلیاں ہو چکی تھیں - اس کے سر کے بال سفید ہونے لگے تھے - چہرے کی سرخی اب زردی سے بدل گئی تھی - لیکن اس کی خوش طبعی بڑھ گئی تھی اور وہ تحلین سے زیادہ تپاک اور گرمجوشی سے ملتا تھا -

---

اس واقعہ کے چھ مہینے کے بعد پایہ تخت میں اس خبر سے سنسنی پھیلی ہوئی تھی کہ شمالی علاقے نے شہنشاہ کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور باغی، شہزادہ سنر یا کی سرکردگی میں چینی تخت الٹنے کی فکر کر رہے ہیں - رحمدل شہنشاہ اس مار آستین سے تنگ آ گیا تھا - اس طرف سے بھی مقابلہ کی تیاریاں شروع ہوئیں - شاہی فوج اور باغیوں کا کیوبانگ میں سامنا ہوا - یونسو لگ نے تحلین کو پایہ تخت میں چھوڑنا مناسب نہ سمجھا تھا - ملکہ بھی فوج کے ساتھ آئی تھی - شاہی علم کے عقب میں اس کی سواری رکھی جاتی - لڑائی شروع ہونے سے ایک دن قبل شہنشاہ اس کے خیمہ میں داخل ہوا - آج وہ ضرورت سے زیادہ خلیق معلوم ہو رہا تھا لیکن معمول سے قبل ہی رخصت ہو گیا - ملکہ پر بھی آج ایک نئی کیفیت طاری تھی - اس کا اخلاق اسے اپنے فعل پر نادم کر رہا تھا - رخصت ہوتے وقت وہ اس کے پیروں پر گر کر خوب روئی - شہنشاہ اس کی اس کیفیت کو دل کی بےچینی سے منسوب کر رہا تھا - اسے نہایت محبت سے صوفہ پر بٹھایا - جنگلی نہر کے پاس کی پہلی ملاقات اس کی آنکھوں میں گھومنے لگی - وہ اسے گذشتہ ناموں سے یاد کر رہا تھا - محبت بھرے ناموں سے وہ چاہ رہا تھا کہ اس بدگمانی کے باوجود بھی محبت کی تجدید کرے -

رات آدھی گذر چکی تھی - چاند اپنا نصف سفر ختم کر چکا تھا - سوائے سنتریوں کی پکار کے فوج پر کامل خوشی طاری تھی - سپاہی آنیوالی موت کا خاموشی انتظار کر رہے تھے - وہ ملکہ کے خیمہ کی طرف چلا - چاند کی میٹھی روشنی چہرہ پر غم کے آثار ظاہر کر رہی تھی - دروازہ پر کھڑے ہو کر اس نے مقدس چاند پر نظر ڈالی - پردہ ہٹایا اور خیمہ کے اندر داخل ہو گیا - چاندنی حسین تحلین کے چہرے پر پڑ رہی تھی - آنسو کے قطرے ابھی تک اس کے رخساروں پر موجود تھے شاید وہ خواب میں بھی رو رہی تھی - وہ مسہری پر جھک گیا - اپنی نظریں اس کے حسین چہرے پر گاڑ دیں - ماضی، تاریک ماضی کے واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے آنے لگے لیکن وہ اسے معاف کر چکا تھا - دل کی روشن خلیج بدگمانیوں سے خالی ہو چکی تھی، وہ اس کی لغزشوں سے درگزر کر چکا تھا - جوانی کے دنوں کی ٹیس دل میں پھر محسوس ہو رہی تھی - اس نے اس کے نازک لبوں پر محبت کی ایک خاموش مہر ثبت کر دی -

صبح سے قبل ساری فوج میں ہلچل مچی ہوئی تھی - باغی شہزادہ شاہی خیمہ کے پاس بھیس بدلے ہوئے پکڑا گیا - فوج میں جوش پھیل گیا لوگ طوفان کی طرح ملکہ تحلین کے خیمہ کی طرف بڑھ رہے تھے - قیدی شہزادہ کی جان سخت خطرہ میں تھی - سپاہی اس کی بوٹیاں نوچنے کو تیار نظر آ رہے تھے - شہنشاہ اپنے خیمہ سے باہر نکلا - اس کا چاندی کا سفید بھالا حالت غیظ میں سینہ زمین کو چاک کرنے کے لئے بیتاب نظر آ رہا تھا - محافظوں نے تاتاری شہزادہ کو شہنشاہ کے سامنے پیش کیا - رسیاں اس کے جسم پر پیوست ہوتی جا رہی تھیں -

(بقیہ بر صفحہ)

بُزدلی اور اُسکی خصوصیات

جاپان کے مشہور فلسفی "یوری توموتاشی" کے نظریہ نے نفسیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کرکے فلسفہ کا ایک علیحدہ اسکول قائم کیا ہے۔ ایشیا اور یورپ کے بعض مفکرین کے مقابلے میں اس مشرقی فلسفی کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ محض عیوب و نقائص کے اظہار پر بس نہیں کرتا۔ بلکہ اُن کے اسباب و علل کا تجزیہ کرکے دفعیہ کی مختلف صورتیں بھی پیش کرتا ہے۔ بزدلی اور اُسکی خصوصیات کے متعلق اس مشرقی مفکر نے ایسا دلچسپ نظریہ قائم کیا ہے جو انسان کے روزمرہ کے معاملات و تجربات پر منطبق ہو جاتا ہے۔

یوری توموتاشی کہتا ہے کہ "اخلاق و آداب کے اکثر معلمین شرم و حیا کی تعریف میں بزدلی کی مذموم صفت کے تخیل کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں گویا یہ بھی انسان کی صفات حسنہ کا ایک جزو ہے جسے سوسائٹی بہ طیبِ خاطر گوارا کر سکتی ہے۔ لیکن یہ ایسا خطرناک مغالطہ ہے جو انسان کے گوناگوں اوصاف و کمالات کے باوجود حصول مقاصد کی راہ میں حائل ہو کر اسکی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیتا ہے"۔

تاشی کے خیال کے مطابق بزدلی کے سینکڑوں اسباب ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قوتِ ارادی کا اضمحلال یا فقدان بزدلی کا سب سے بڑا سبب ہے۔

(۲) خودداری و خود پسندی کا جذبہ جب حد اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے تو بزدلی پیدا ہوتی ہے۔

(۳) قوت متخیلہ کا اضمحلال جسکے سبب سے انسان عندالضرورت اپنے خیالات پریشان کو ایک نقطہ پر مجتمع نہیں کر سکتا۔ بزدلی کا تیسرا سبب ہے۔

(۴) تخلیق و تشکیل تخیلات کی مشق نہ ہونے سے انسان اپنے خیالات کا تجزیہ بھی نہیں کر سکتا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود ہی اپنے ارادے اور مقصد کو نہیں سمجھ سکتا۔

بعض اصحاب کی خود پسندی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی وقار اور اہمیت کو حد اعتدال سے متجاوز کر دیتے اور سمجھتے ہیں کہ دنیا کے اسٹیج پر ہر شخص کی نگاہیں انہیں پر جمی رہتی ہیں۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی ان کے حرکات و سکنات میں ایک قسم کا تصنع، بے ڈھنگا پن اور ناموزونیت پیدا ہو جاتی ہے جو مضحک شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ایک قسم کی بزدلی ہے۔ بزدل بغایت ذکی الحس بھی ہوتا ہے۔ اس کا دل و دماغ ان معمولی باتوں سے بھی بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے جسکی دوسرے اشخاص مطلق پرواہ نہیں کرتے وہ تو اپنی شخصیت کو ہر فرد بشر کی نظر کا مرجع تصور کرتا ہے اس لئے کسی شخص کی معمولی بے رخی پر بھی اسکے جذبات خودداری کو ٹھیس لگتی ہے۔ وہ اپنے احباب سے بہت جلد بدگمان ہو جاتا اور بیٹھے بٹھائے بہت سی مصیبتیں اپنے سر مول لے لیتا ہے۔ وہ اپنی تضحیک و تذلیل کے بے بنیاد اندیشے میں ہر وقت گرفتار رہتا ہے۔ یہ اندیشہ اُسکے چال ڈھال اور رفتار و گفتار میں تصنع پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہی تصنع اُسکے حق میں باعثِ تضحیک ثابت ہوتا ہے۔ اسکے جذبات خودداری و احساس کمتری میں سخت تصادم پیدا ہوتا ہے جسکے باعث سوسائٹی میں اسکا ہر فعل مضحک بنکر رہ جاتا ہے۔

تاشی کا قول ہے کہ بزدلی ایک آلہ خوردبین ہے جو ایک ذرا سے مقدار کی جسامت کو کئی سو گنا بڑھا کر ہماری نظروں کے سامنے پیش کرتا ہے لیکن خوردبین کے شیشہ کا دائرہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ ہم بیک وقت اس شے کے تھوڑے ہی حصے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح بزدل شخص معمولی باتوں

کو ضرورت سے زیادہ اہم اور وقیع تو بنا دیتا ہے لیکن اس کا زاویۂ نگاہ اس قدر محدود ہوتا ہے کہ اس شے کی حقیقت اور اصلی تصویر اس کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے۔

تاہم ایک واقعہ بیان کرتا ہے جس سے ناظرین کو حقائق مندرجہ بالا کی روشنی میں بزدلی کے ایک مریض کی صحیح حالت کا اندازہ ہوگا۔

میرے پڑوس میں ایک نوجوان تھا جو اپنے والد کے ذاتی اثر و اقتدار کے سبب سے اس علاقہ کے مہذب و تعلیم یافتہ اشخاص سے اچھی طرح شناسائی رکھتا تھا۔ وہاں کی شائستہ اور مہذب مجلسوں میں اس کی رسائی تھی۔ ان مجلسوں میں یہ نوجوان اپنی بے سلیقگی اور حماقتوں کے سبب سے بہت مشہور اور زندہ دلوں کی دلبستگی کا باعث تھا۔ شرفاء اور امراء کی مجلسوں میں جب اس کے سامنے چائے پیش کی جاتی تو وہ پیالی کو گھبراہٹ میں کچھ اس طرح پکڑتا کہ چائے اکثر اس کے کپڑوں پر گر جاتی۔ اس سے اس کی سراسیمگی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس وارفتگی میں وہ اور بھی حماقت آمیز حرکتوں کا مرتکب ہوتا۔ کھانے کے وقت اپنی تیلیوں کو ایسے بے قرینہ طور پر استعمال کرتا کہ ان میں بیک وقت چاولوں کی بہت قلیل مقدار آتی تھی۔ دوسرے اشخاص اپنا کھانا ختم کر لیتے اس وقت بھی نوجوان کے پیالے کا نہائی حصہ چاولوں سے پر رہتا۔

بسا اوقات یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ اسے بغرض استقبال یا کسی شخص کو معلوم کرنے کی غرض سے چار و ناچار اٹھنا پڑا۔ وہ کچھ عجب مخمصہ کی حالت میں لیس و پیش کرتا ہوا اٹھتا اور شرمیلے انداز سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش کی اشیاء سے بالکل بے خبر۔ ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا اور آس پاس کی چیزوں سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھتا تھا۔

نوجوان کے والد کو جب میرے متعلق یہ اطلاع ملی کہ میں ان دنوں دماغی امراض کا بہ نظر غائر تجربہ کر رہا ہوں تو وہ لڑکے کو میرے پاس لائے اور علاج کی درخواست کی۔ ہم دونوں کا خانہ باغ بالکل متصل تھا۔ میں اس نوجوان کو باغ میں بہت اطمینان و آزادی کے ساتھ تنہا سیر کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ ان دو متضاد حالتوں کا موازنہ کر کے مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ مغرور نوجوان بھی ان مریضوں میں سے ہے جن کی خود بینی حد اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہے اور جن کی حماقتوں کا اظہار منظر عام اور مجلسوں میں ہی ہوا کرتا ہے۔ مجھے اپنی صحت رائے اور تشخیص کا یقین تھا اس لئے میں نے اسی وقت مریض کا علاج بھی شروع کر دیا۔

"کیا یہ آپ کا لڑکا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ تو اس لڑکے کو جانتے ہیں" نوجوان کے والد نے کہا۔

"ہاں، دیکھا ہوگا، لیکن اس سے پہلے میں نے کبھی اس کا خیال نہیں کیا"

"کیا خوب! کل مسٹر سیمور لانگ ہرسٹ کے دولتکدے پر آپ بھی تو مدعو تھے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بھری محفل میں اس لڑکے سے کیسی حماقت آمیز حرکتیں سرزد ہوئیں"

"یعنی؟"

"کیا آپ کو یاد نہیں کہ جب اس لڑکے کا مہمانوں سے تعارف کرایا جا رہا تھا۔ اس وقت اس کی زبان میں لکنت تھی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا اور سراسیمہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ گھبراہٹ میں اس کا پاؤں قالین کی ایک تہ سے الجھ گیا اور وہ گرنے لگا۔ اس نے سنبھلنے کے لئے ایک میز کا سہارا لیا جس پر چینی ظروف آراستہ تھے۔ دفعتاً میز کے الٹنے سے تمام ظروف زمین پر گر کر ٹوٹ گئے۔ میرا بد قسمت بچہ اور بھی سراسیمہ و ہراساں ہو کر وہاں سے بھاگ نکلا"

[redacted]

"ہاں! یہ تو معمولی واقعہ تھا" میں نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔ "مجھے اب یاد آیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس واقعہ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ کیونکہ میں اُس وقت سیمورے لانگ ہو کے ساتھ ایک دلچسپ گفتگو میں اس درجہ منہمک تھا کہ ہم دونوں نے اس واقعہ کی طرف مطلق توجہ نہ کی اور نہ اس شخص کا خیال کیا جس کے سبب سے یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا۔"

میری گفتگو سے نوجوان کے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کا چہرہ دفورِ مسرت سے چمکنے لگا۔ اب مجھے اپنی صحت رائے کا اور بھی یقین ہوگیا۔ وہ لڑکا میرے پاس رہنے لگا۔ دوسرے دن میں نے اپنے چند فلسفی احباب کی مجلس میں اس کا تعارف اپنے ایک معمولی محرر اور گمنام شاگرد کی حیثیت سے کرایا۔ اور لڑکے کو پہلے ہی تاکید کردی تھی کہ کسی کے سامنے اپنے والد کی شخصیت و تمول اور خاندانی شرافت و عظمت کا اظہار نہ کرے۔ چونکہ میرا اور ان فلسفیوں کا چولی دامن کا ساتھ تھا اس لئے وہ نوجوان بھی گویا ہر وقت انہیں لوگوں کی صحبت میں رہنے لگا۔

نوجوان نے دیکھا کہ اُسکی شخصیت سے سوسائٹی کا ہر فرد ناواقف ہے تو اُسکے جذبات خود بینی و خود نمائی رفتہ رفتہ زائل ہونے لگے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایک فلسفی کے گمنام شاگرد اور معمولی محرر کی شخصیت اصحاب علم و فضل کے لئے ہرگز قابل توجہ اور جاذب نظر نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کے آتے ہی تصنع اور خود نمائی کے مذموم جذبات اُس کے دل و دماغ سے یکقلم محو ہوگئے۔ اور چند ہی ماہ کے بعد اُس کے عادات و اطوار حرکات و سکنات اور رفتار و گفتار میں شائستگی پائی جانے لگی۔ اب اُسے اطمینان قلب حاصل ہوا۔ اور وہ معمولی متانت و سنجیدگی اور خندہ پیشانی سے ہر مجلس میں شریک ہونے لگا۔

بزدلی کا ایک اور سبب اپنی ذات سے بے اعتمادی ہے۔ یوں تو ہوتا یہ ہے کہ اس جماعت میں وہی لوگ شامل ہیں جن کے دل و دماغ پر احساس کمتری ——————— کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے احساس کی یوں تو متعدد وجہیں ہو سکتی ہیں لیکن بالعموم احساس کمتری کے شکار وہی اشخاص ہوتے ہیں جو اسرار خودی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اپنی قابلیت و صلاحیت کی قدر نہیں کرتے اور اپنے جوہر ذاتی کو غیر وقیع تصور کرتے ہیں۔ یا وہ لوگ جنہیں اپنی کمزوریوں کا احساس تو بدرجہ اتم ہوتا ہے لیکن ان میں اتنی قوت ارادی نہیں ہوتی کہ وہ ان نقائص کے ازالہ و تلافی کی کوشش کریں کریہہ منظر اور نحیف الجثہ ہونے کا احساس بھی کبھی کبھی بعض اشخاص کے احساس کمتری کا باعث ہوتا ہے۔

غرض ایسے لوگ دوستوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بالوجہ یا بلاوجہ کمتر تصور کرتے ہیں۔ اور یہی بزدلی کا ایک بڑا سبب ہے۔ بلاشبہ اس قسم کی بزدلی بھی ایک خطرناک مرض ہے کیونکہ اس سے انسان کی قوت عمل ضائع ہو جاتی ہے تاہم سوسائٹی کے لئے ایک حد تک یہ قابل برداشت ہے۔

بزدل شخص ہرگز اس بات کو گوارا نہ کریگا کہ کوئی شخص اسکے کردار یا معاملات میں دلچسپی لے۔ اگر تم کسی معمولی بات میں بھی اسکی ناراضگی طبع کا باعث ہوئے تو اسکی بزدلی تمہاری طرف سے اسکے دل میں صد درجہ نفرت پیدا کردے گی۔

بعض بزدل ایسے بھی ہیں جو خواہ مخواہ اپنے آپ کو دوسروں کی ہمدردی سے محروم تصور کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے طرز عمل میں وہ اسدرجہ احتیاط برتنا شروع کرتے ہیں کہ ہر مجلس میں وہ اجنبی سی معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت جلد گوشۂ تنہائی اختیار کر لیتے اور دل ہی دل میں اپنے آپکو دوسروں سے اچھا سمجھنے لگتے ہیں۔ "انکے خیال باطل میں اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسرے لوگوں نے (خلاف حقیقت) ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔"

اسکا نتیجہ بہترین ثبوت یہ ہے کہ ایسے بزدل شخص کا سابقہ جب ان لوگوں سے پڑتا ہے جو اُسکے مقابل یا ہم رتبہ نہیں ہیں تو اس کا خوف وہراس قطعی طور پر زائل ہو جاتا ہے اور وہ اپنے سے کم رتبہ لوگوں کے ساتھ بلا تصنع ملتا جلتا بلکہ مخلصانہ سلوک کرتا ہے لیکن جب وہ اپنے سے فائق و برتر ہستیوں سے ملتا ہے تو اسکا خوف وہراس اُسے نہایت سنجیدہ و متین بننے پر مجبور کرتا ہے۔

عوام کی رائے زنی اور نکتہ چینیوں کا خوف جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے تو اس سے بھی بزدلی پیدا ہوتی ہے۔ جاپانی فلسفی اس نظریہ کی تصدیق مندرجہ ذیل واقعہ سے کرتا ہے۔

کسی سیاسی مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے لئے ملک کے مدبرین و ماہرین سیاست کا جلسہ منعقد ہوا۔ یہ مسئلہ بہت متنازع فیہ تھا۔ حاضرینِ مجلس میں لانگ شو نامی ایک شخص تھا جو اپنے تدبر اور فضل و کمال کے باوجود اسی قسم کے مرض (بزدلی) میں مبتلا تھا۔ اسکے تبحر علمی اور شعلہ بیانیوں کے سبب سے شرکائے جلسہ اپنے حریفوں میں سب سے زیادہ اسی شخص سے خائف تھے۔ مخالف جماعت کا ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ لانگ شو تقریر کے لئے نہ کھڑا ہو۔ مخالفین کی دھواں دھار تقریریں ہوچکیں اور سب اپنے اپنے دلائل و براہین پیش کر چکے تو لانگ شو کی باری آئی۔ حاضرین جلسہ چونک پڑے اور ہمہ تن گوش ہوگئے۔ سامعین میں ایک شخص جو لانگ شو کی دکھتی ہوئی رگ کو پہچانتا تھا، اٹھا اور چپکے سے اسکے کان میں کہدیا کہ آپ نے شاید کپڑے عجلت میں پہن لئے ہیں۔ لباس کا ایک حصہ بالکل بے ترتیب و غیر موزوں معلوم ہو رہا ہے۔ چند اصحاب اسے دیکھکر زیر لب مسکرا رہے ہیں۔ یہ جملہ لانگ شو کیلئے گویا شکست کا تازیانہ تھا۔ اسکے ہوش و حواس جاتے رہے۔ مذمت و تضحیک کے خیال نے جو بزدلوں میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اسکے جسم میں رعشہ اور زبان میں لکنت پیدا کر دی۔ واہمہ کی خلاقی دیکھئے کہ اب وہ ہر شخص کے لب پر تمسخر آمیز تبسم بھی محسوس کرنے لگا۔ آخر کار تضحیک کے بے بنیاد خیال سے مرعوب ہوکر گھبراہٹ میں بمشکل چند جملے ختم کئے اور مجلس سے چلا گیا۔ حاضرین کو یقین واثق تھا کہ لانگ شو اپنے تبحر علمی اور زور بیانیوں سے ان کے دل و دماغ کو مسحور و مسخر کر کے اپنی تجویز کو کثرت آرا سے منظور کرالے گا۔ لیکن رائے عامہ کے بے بنیاد خوف و ہراس نے آلۂ خوردبین کی طرح ایک معمولی سی بات کو جو شاید کسی کے لئے جاذبِ توجہ نہ ہوتی اس درجہ بڑھا چڑھا کر اسکی نظروں کے سامنے پیش کیا کہ وہ اس مصنوعی شکل اور فرضی عیب کے مقابلے میں اصلی حقیقت کا ادراک نہ کرسکا۔

سطور بالا میں کہیں بیان کیا گیا ہے کہ خیالات کا انتشار بھی ہمیشہ بزدلی کا باعث ہوتا ہے۔ اس قسم کے دماغی انتشار کے شکار اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ہمیشہ دوسروں کی ہمدردی کے متمنی رہتے ہیں لیکن اس ہمدردی کے متعلق خود انہیں کے دل میں شک و شبہ بھی پیدا ہوتا رہتا ہے۔ طرفہ تماشہ یہ کہ بیچارہ اظہار ہمدردی کرنے والوں اور سوسائٹی میں ملنے والوں سے بھی ڈرتا ہے۔ اس اجتناب و گریز کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ بزدلی کے جذبے کو مغلوب کرسکتا ہے اور نہ اسکے تعارف کا حلقہ ہی وسیع ہوتا ہے۔

بزدل کی بعض عجیب و غریب خصوصیتیں یہ بھی ہیں کہ وہ اسباب رنج و غم کو جو محض اسکے واہمہ کی خلاقی ہوتی ہے، ضرورت سے زیادہ اہم بنا دیتا ہے۔ اسے ایک ہلکے سے تبسم میں تمسخر اور ایک بے ضرر دل لگی میں توہین نظر آتی ہے۔ دوسروں کے ہر اشارہ و کنایہ میں جس کا تعلق اس کی ذات سے ہوتا ہے، وہ ایک ناگوار تنقید یا نکتہ چینی محسوس کرتا ہے۔ وہ تحسین و ستائش سے اتنا ہی ڈرتا ہے جتنا مذمت و نکتہ چینی سے۔ اعتراضات اور نکتہ چینیوں کے خوف کا غلبہ اسے اسقدر ذکی الحس بنا دیتا ہے کہ وہ اپنے متعلق تحسین و تعریف کے کلمات سننے سے بھی ہراساں ہوتا ہے چونکہ تنقید اس پر جوابدہی کی ذمہ داری عاید کرتی ہے اسلئے اس غریب کی حالت قابل رحم بلکہ ناگفتہ بہ ہوجاتی ہے۔

تاشی کہتا ہے کہ ڈرپوک کی ایک خصوصیت تنہائی پسندی بھی ہے جو خوفِ ہلاک کی طرح اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ایک معمولی بات کا تذکرہ بھی جو اس کی ذات سے متعلق ہو اس کے چہرے کے رنگ کو متغیر کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دوسروں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا اور چونکہ بزدلی انسان کو دوسروں کی رائے اور مشورے کا تابع بنا دیتی ہے اس لئے جب اس کے روبرو کسی موضوع پر گفتگو شروع ہوتی ہے تو وہ ڈرتا ہے کہ کہیں سلسلۂ بحث اسکے عیوب کی طرف کوئی ناگوار اشارہ نہ [illegible] ... موضوع کوئی شخص ہو تو بھی بزدل کے خوف و ہراس [illegible]

انتہا نہیں رہتی۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس شخص کا نام نہ لیا جائے۔

ڈرپوک آدمی تنہائی اور دماغی سکون کی حالت میں اپنے اقوال و افعال اور عادات و خصائل کا تجزیہ کرتا رہتا ہے جسکے سبب سے اُس کے جذبات اور بھی نازک و حساس ہو جاتے ہیں۔ غور و فکر کی عادت اور خیالات کی یکسوئی بلاشبہ دوسروں کے حق میں مُفید ثابت ہوتی ہے لیکن بزدل کے لئے سم قاتل کا اثر رکھتی ہے کیونکہ اس حالت میں وہ خود ساختہ خیالی تصویروں کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگتا ہے۔ اس طرح اسکی دماغی تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ ایک صحیح الدماغ اور وسیع النظر شخص کے مقابلے میں دوسروں کی مخالفت و عدم التفات کا احساس بزدل کو زیادہ اور بہت جلد ہوتا ہے اس لئے خیالات کی یکسوئی اُسکے دماغی توازن کو اور زیادہ درہم برہم کر دیتی ہے۔ وہ بہت جلد معمولی بے التفاتی کو مخالفت اور مخالفت کو عناد و بدسلوکی تصور کرنے لگتا ہے۔

حقائق مندرجہ بالا کی روشنی میں "یوری تو موتا شی" کے اس نظریے کی لفظ بہ لفظ تائید ہوتی ہے کہ:۔

"شرم و حیا کا انتہائی جذبہ دراصل ایک مُہلک بیماری ہے جس کا سرچشمہ نمائش بیجا، خود پسندی اور قوت عمل کا فقدان ہے لیکن ہم غلطی سے اس عیب کو ہنر سمجھتے اور اُسے صفات حسنہ کا ایک جزو تصور کرتے ہیں"

مترجمہ رضیہ سلطانہ

کیفِ غم

غربت کا ذکر کیا؟ میں بیگانہ ہوں وطن میں
دیوانہ وار تنہا بیٹھا ہوں انجمن میں

ہمرنگِ شمعِ دل اب لَو دے رہی ہے رگ رگ
تابانیِ دروں سے ہے تار پیرہن میں

ہر حرفِ شوق نکلا بنکر دُھواں لبوں سے
ہو سوز لیکن اے دل اتنا نہ ہو سخن میں

میرے سکوت میں ہے وہ شورشِ تکلّم
گویا زبان ہوں میں تصویر کے دہن میں

پھر پہلو ہی میں ہونے لگی خلش سی
تصویرِ دل جو دیکھی آئینۂ چمن میں

فرسودہ ہو چکے ہیں اگلے رسوم کوکبؔ
ذکرِ وفا و اُلفت اس عہدِ ماومن میں

کوکب شاہجہانپوری

خمستان

اثر صہبائی کا مجموعۂ کلام

موجودہ دور کی بہت سی ادبی بدعتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جہاں کوئی ادیب یا شاعر ادب سے روشناس ہوا اور فوراً ہی وہ چند خیالات یا افکار جمع کر کے صاحبِ تصنیف یا صاحبِ دیوان بن بیٹھا۔ بہت کم مثالیں ایسی ہیں جن کو اس نظریہ سے مستثنےٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی "فوری" ادبی خدمتیں تعمیری نہیں تخریبی ثابت ہوتی ہیں۔ یوں ہونے کو تو بازار میں بہت سی ایسی کتابیں ملیں گی جو جذبات کو برانگیختہ کرنے کی وجہ سے مقبول بھی ہیں مگر انکی ادبی قیمت کیا ہے؟ یہ صرف ادب کی کسوٹی پر ہی پرکھا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا نظر سے اگر دیکھا جائے تو خواجہ عبد السمیع اثر صہبائی کا زیرِ بحث مجموعہ کلام جو "خمستان" کے نام سے شائع ہوا ہے تعمیری کہا جائیگا۔ اس مجموعے میں غزلیں نظمیں، قطعات، رباعیات اور متفرق اشعار ہیں۔ ہر وہ شخص جو بلند پایہ رسائل میں عمدہ کلام پڑھنے کا شائق ہوتا ہے اثر صہبائی کے نام سے ضرور واقف ہوگا۔

اثر فطری شاعر ہیں اور بچپن سے شعر کہتے ہیں۔ ان کے اشعار میں روانی ہے تسلسل ہے اور جذبات کی ترجمانی ہے۔ وہ صرف غزل کے تنگ دائرے ہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ شاعری کی مختلف اصناف پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار زندگی، موت، محبت، حسن، قدرت، غرض زندگی کے ہر شعبے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے قطعات اور رباعیات ان کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان کے کلام کی خصوصیات بلندیٔ تخیل، بیان کی برجستگی اور جذبات کی ترجمانی ہے۔ جہاں تک ہم اندازہ کر سکے، اثر زندگی کے خوش کن حالات بہت کم مطالعہ کرتے ہیں، ان کے اشعار حزن و ملال حسرت و یاس اور رنج و الم کے اظہار میں بے مثل ہیں۔ اسکے علاوہ انکی شاعری پر خیامؔ و حافظؔ، اقبالؔ و غالبؔ، میرؔ و حسرتؔ کا رنگ اکثر مقامات پر نمایاں ہے۔

خمستان پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ تخلیات کے نام سے موسوم ہے اس میں غزلیات ہیں جو بحیثیتِ مجموعی خاصی ہیں۔ ان میں چند بہت اچھی ہیں مثلاً صفحہ ۵۶ پر ایک غزل ہے اسکے چند اشعار یہ ہیں۔

ہے نہ آغاز سفر کی اور نہ منزل کی خبر   کیا معمّا ہے الٰہی! کاروانِ زندگی

او غافل کیش! تو نے بھی کبھی سوچا کہ کیوں   ہو گیا آخر اثرؔ بھی نوحہ خوانِ زندگی

صفحہ ۸۲ پر ایک دوسری غزل جگرؔ کے رنگ میں ہے اور خوب ہے بعض اشعار یاد کر لینے کو دل چاہتا ہے۔

اب خواب ہے آہ دورِ جوانی   شامِ طرب کی رنگین کہانی

وہ حسن اور عشق کی داستانیں   کچھ گل فشانی، کچھ خونفشانی

پُر کیف رنگیں تھی بزمِ ہستی   تھا رشکِ فردوس عہدِ جوانی

دوسرے حصہ کا نام سمن زار رکھا ہے اسمیں مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں، اور بحیثیت مجموعی اچھی ہیں، مناظرِ قدرت اور ان کے تاثرات سے جو

جو جذبات پیدا ہوتے ہیں انکی عکاسی بعض نظموں میں خوب کی ہی صفحہ ۱۱۰ پر چھوٹی بحر میں "چاند اور سمندر" اور صفحہ ۱۲۶ پر "پھول اور ستارہ" دو نظمیں بہت عمدہ ہیں۔ نظم "کسی کے خیال میں" بہت ہی اچھی ہے، کیا خوب کہا ہے :-

آہ وہ میری محبت اور وہ تیری سادگی　　عشق اپنے حسن اپنے حال میں مستانہ تھا
عشق نوکِ خار بیتابی سے نہانا آشنا　　حسن بے پروا بھی مشقِ ناز سے بیگانہ تھا

"کائنات اور انسان کے" زیرِ عنوان نظم کافی عمیق مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ صفحہ ۱۴۰ پر "محبت اور موت" شاید اس حصے کی بہترین چیز ہے۔ چند اشعار یہ ہیں :-

محبت کے سحر سے محفلِ دل جگمگاتی ہے　　اجل کی شام میں لیکن سکوں کی نیند آتی ہے
محبت ایک ہنگامہ ہے جوشِ زندگانی کا　　اجل پیغام ہے لیکن سکونِ جاودانی کا
اسیرانِ محبت کو بھی دن کیسے گذرتے ہیں　　قیامت کی کشاکش ہے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

تیسرے حصہ کا نام جام صہبائی ہے اور اس میں رباعیات ہیں۔ باقی حصص میں عبدالسمیع پال اثر سمجھئے اور اس میں صہبائی خیام کا تتبع کرنے والا حضرتِ ریاض مرحوم کے بعد صہبائی ہی کو زیادہ کامیاب کہا جائیگا۔ صہبائی میخانے میں مے کا متوالا معلوم ہوتا ہے اور پروازِ تخیل سے ایسی دنیا بناتا ہے جہاں دوسرے شعرا مشکل سے پہنچتے ہیں۔ رباعیات و قطعات میں صہبائی کو قابلِ رشک ملکہ حاصل ہے، اسی حصے میں بعض ایسی بھی رباعیات و قطعات شامل ہیں جو فطرتِ انسانی، حیاتِ انسانی اور فلسفہ انسانی پر کافی روشنی ڈالتی ہیں، ان میں سے چند لاجواب ہیں۔

شیرازۂ ہستی کو بکھرنا ہوگا　　ظاہر ہے کہ ایک روز مرنا ہوگا
لیکن یہ سوال ہے ابھی لاینحل　　کیا ڈوب کے مجھکو پھر ابھرنا ہوگا

سب سے پہلے یہی اک کام کیا کرتے ہیں　　صبح اٹھتے ہی ترا نام لیا کرتے ہیں
یاد تو نے بھی کبھی ہمکو کیا ہے پیارے؟　　نام لے لے کے ترا ہم تو جیا کرتے ہیں

تھی کیف و سرور زندگانی میری　　فانی تھی مگر وہ شادمانی میری
اندوہِ حیات سے پریشاں ہوں　　بھولا ہوا خواب ہے جوانی میری

مدت ہوئی زخم دل پہ کھاتے کھاتے　　اے کاش! وہ پوچھ لیتے آتے جاتے
جب غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے اثر　　آتا ہے قرار دل کو آتے آتے

چوتھے حصہ کا نام شاعر نے "راحت کدہ" تجویز کیا ہے، اس حصے کے اکثر اشعار پڑھنے والے کو متاثر کر دیتے ہیں۔ ان اشعار میں شاعر اپنی پوری شانِ "اثریت" سے جلوہ نما ہے۔ اثر اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد ہی حقیقت میں اثر بنے اور بقول ان کے یہ اشعار راحت مرحومہ کی یاد میں "داغہائے فرقت کے چند پھول، اشکہائے محبت کے چند موتی اور سازہائے غم کے چند نغمے ہیں" جو بربطِ قلب کے حرمان نصیب تاروں کو مضراب فرقت سے چھیڑنے میں اس طرح بلند ہوئے کہ آس پاس کی فضا مرتعش ہو گئی۔ خمستان کو اثر نے اپنی محبوب دلہن کے نام معنون کیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ تمام کتاب کی قیمت بس "راحت کدہ" ہے، اس حصے کو اثر کی شاعری کا عروج اور منتہا سمجھنا چاہیئے۔ چند دردانگیز اشعار یہ ہیں۔

میری بہار لٹ گئی، مجھ سے وہ آہ چھٹ گئی　　"راحت" بنج، جس سے تھی میری بہارِ زندگی

سب کی سب باتیں سنیں منہ سے نہ کچھ بولا مگر — دیر تک احباب صہبائی کو سمجھاتے رہے

اے مری تسکیں، مری راحت مری آرام جاں — تیرے ماتم میں مری آنکھیں ہوئی ہیں خونفشاں

اشک گلگوں ہے مرا عنوانِ رودادِ حیات — اور رودادِ حیات، آلام و غم کی داستاں

کیوں اپنے پرستار سے منہ موڑ گئی ہو — میرے دلِ پُر شوق کو کیوں توڑ گئی ہو

بیٹھا ہوں تری یاد میں افسردہ و تنہا — اے راحتِ جاں! مجھکو کہاں چھوڑ گئی ہو

تیری تربت پہ رو رہا ہوں میں — بیج اُلفت کے بو رہا ہوں میں

تیرے دم سے تھا شعلہ زارِ حیات — بُجھ کے اب راکھ ہو رہا ہوں میں

عمر بھر گردو غبارِ رنج و غم دھویا کئے — اشک باری میں متاعِ زندگی کھویا کئے

تیرے جلووں سے رہی محروم چشمِ سوگوار — آہ! تیرے ہجر میں جب تک جئے رویا کئے

پانچواں حصہ "ستارے" کے نام سے موسوم ہے اور اس میں مختلف اشعار ہیں جو اپنی جگہ پر خاصے ہیں۔

اصول تبصرہ اور فن تنقید کے منافی ہوگا اگر اس مضمون کو یکطرفہ چھوڑ دیا جائے۔ خمستان میں چند نقائص بھی ہیں جن کو اگر دوسرے ایڈیشن میں دور کر دیا گیا تو یہ مجموعہ کلام بہتر صورت میں ہو جائیگا۔

کلام کی ابتدا میں شاعر نے عرض کا عنوان "ہا و ہو" رکھا ہے جسکا مطلب عام فہم نہیں۔ دوسرے نقائص عام طور پر وہ غلطیاں ہیں جو شاعر سے ترکیب الفاظ یا فن معانی و بیان کے بارے میں سرزد ہوئی ہیں، مثلاً صفحہ ۹۳ کا ایک شعر ہے:۔

چاندکی چاندنی رسیلی ہے — بھینی بھینی ہے پیاری پیاری ہے

ہمیں چاندنی کے رسیلی اور بھینی ہونے میں اختلاف ہے۔ رسیلی وہ چیز ہوتی ہے جسے رس سے تعلق ہو اور بھینی وہ جسمیں خوشبو کا عنصر پایا جائے۔ چاندنی ان دونوں چیزوں سے مبرا ہے اور شاید "شعریت" بھی اسکی اجازت نہ دے۔ ایک اور شعر صفحہ ۱۳۶ پر ہے:۔

پھر دل دیوانہ خود وحشت ہی وحشت ہوگیا — پھر حسیں ہونے لگے جلوہ فشاں ہونے لگے

اس میں مصرعہ اولی کا مصرع ثانی سے کوئی بین تعلق نظر نہیں آتا اور اگر ہو بھی تو شاعر اپنے مفہوم کو ادا نہیں کر سکا یعنی کون حسین اور کیا جلوہ فشاں ہونے لگے؟ اسکی وجہ شاید جذبات کی فراوانی ہے جسمیں شاعر اکثر ربطِ بیان کو ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے اور مطلب الفاظ سے آزاد ہو کر اسکے ذہن ہی میں رہجاتا ہے اسی طرح صفحہ ۲۵۷ پر مقطع ہے:۔ مگر آتش ہے خموش و حیراں، حواس گم، چاک چاک داماں + لبوں پہ آہیں نظر پریشاں ہے، رخ پہ آنسو ڈھلک رہے ہیں

اصولاً لفظ "ہے" کو حذف کر دینا چاہیئے تھا جیسے "لبوں پہ آہیں" کے ساتھ "ہیں" محذوف ہے لیکن ایسا کرنے سے شعر تقطیع سے گر جاتا ہے اور رکھنے سے رعایتاً "ہے" کو "رخ" کے ساتھ ملا کر پڑھنا پڑیگا ورنہ علیحدہ کر کے "پریشاں" کیساتھ پڑھنے سے "شعر" معلوم نہیں ہوتا۔ اگر یہ مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا۔

لبوں پہ آہیں، نظر پریشاں اور رخ پہ آنسو ڈھلک رہے ہیں! "ہے" کو "اور" میں تبدیل کر دینے سے نہ صرف ترکیب الفاظ بہتر ہو جاتی ہے، بلکہ معانی میں زیادہ عمدگی اور مطلب میں زیادہ وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

خمستان بحیثیت مجموعی بہت اچھا کلام ہے مگر کتابت اور طباعت بہت عمدہ ہیں۔ اثر کی تصویر، سید سلیمان ندوی اور کیفی صاحبان کے مقدمات بھی شامل ہیں خمستان کی قیمت دو روپے آٹھ آنہ ہے + ملنے کا پتہ:۔ **منیجر آزاد بکڈپو، شہر سیالکوٹ**

صادق الخیری دہلوی

نوجوان شامو کی داستانِ عشق

(گذشتہ سے پیوستہ)

اتفاق کہیئے یا چاہے جو کچھ۔ شامو صاحب جو نئے نئے سوٹ پہنے ہر لحظہ "مہا سُندری" کی تلاش میں خاک بسر پھرتے رہتے تھے اچانک ہندوستان کی خوبصورت ترین دوشیزہ سے "ٹکرا" جاتے ہیں۔ کس طرح؟ یہ بھی لطف سے خالی نہیں۔

ہوا یہ کہ ایک خوشگوار صبح کو نوجوان شامو اور اُن کے شیطان سے زیادہ مکّار دوست "نجم" قدسیہ پارک میں گھاس پر لیٹے امتحان کی تیاری میں مصروف تھے کہ انہیں مس کامنا سنکلیر (ہندوستان کی خوبصورت ترین دوشیزہ) سے مُلاقات کی عزت حاصل ہوئی ـــــ اگر آپ اُسے فی الواقع "ملاقات" کہہ سکیں کہ اچانک ایک شعلہ جوالہ جو ایک صبا رفتار گھوڑے کی گردن میں لٹکی، فضا میں تیرتی بَل کھاتی، بھیانک چیخیں مارتی اُڑی چلی جارہی ہو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آپ کے کُھلے ہوئے بازوؤں میں آگرے اور آپ کے چہرے کو عنبری بالوں کے ریشمی لچھوں سے ڈھک دے اس طرح کہ پہلے بیس سکنڈ تک آپ یہ نہ معلوم کرسکیں کہ ہوا کیا؟

جی ہاں! ایک حادثہ۔ زبردست قسم کا ایکسی ڈنٹ۔ یہ مسماۃ جو گھوڑے کی سواری سے اتنی ہی واقف تھیں جتنا کہ میں اور آپ (بعد معافی!) اپنی شامت اور شامو کی خوش نصیبی سے ایک دن ایک نالائق قسم کے مُنہ زور گھوڑے پر چڑھ بیٹھیں نتیجہ ظاہر ہے یہی ہوا کہ گھوڑا اُن کو لیکر ایسا اُڑا کہ اُن کے پیچھے بھاگنے والے سائیس صاحبان، پولس سارجنٹ اور دو عدد عاشقانِ صادق کو ہزاروں میل پیچھے چھوڑ کر ہوا سے باتیں کرنیلگا ـــــ گھوڑے کے سموں کی تیز کھٹاہٹ اور "سوارہ" کی بے ہنگم چیخوں نے ان دونوں محنتی طالب علموں کو فلسفیانہ اُلجھنوں سے چونکا دیا۔

"بھاگ۔ شامو!!" نجم چلایا۔

لیکن بہادر شامو موقع کی نزاکت کو سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ گھوڑا سر پر آپہونچا۔ دوسرے لمحے شامو کا زبردست ہاتھ گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے تھا اور ایک لرزہ براندام قتالہ اُسکے گلے میں لپٹی ہوئی تھی ـــــ حسینہ کے زرد تھرتھراتے لبوں نے شامو کے "عارضِ گلگوں" پر ایک عدد بوسہ اظہارِ تشکّر کے طور پر ثبت کیا! (شامو کے خدایا!!)

* * * * * * *

"اوہ!" حواس بجا ہونے پر حسینہ نے بسورتے ہوئے کہا "تم نے میری جان بچالی! ـــــ"

"یقیناً" شامو نے کہا۔

"تھینکیو، میں تمہاری احسانمند ہوں، مسٹر۔ تم مجھ سے ملنے آنا کبھی، کسی دن، کیوں؟"

شامو کا خوبصورت دہانہ کُھلا "آخر کیا فرض ہے؟ جان بچانے کے صلہ میں یہ سزا کیوں تجویز کی جارہی ہے؟" شامو نے دل میں سوچا اور اُسکا ونیس جیسا دہانہ خود بخود بند ہوگیا۔

"کل ریہرسل کے بعد تیسرے پہر کو" حسینہ نے اپنی جادو بھری آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے کہا "تم میرا نام تو جانتے ہوگے؟"

"نہیں" شامو نے سادگی سے کہا۔

"ارے نہیں!! نہیں جانتے!!! تعجب ہے۔ میرا نام نہیں جانتے؟! وری اسٹرینج! لیکن میں اس لباس میں تو واقعی عجیب معلوم ہوتی ہونگی" اُس نے اپنے لیٹسٹ راؤنڈ نگ کٹ" پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "شاید کوئی کارڈ نکل آئے" کہتے ہوئے اپنی پتلی اور نازک کمر کو دو ایک قیامت خیز بل دئے اور چُست کوٹ کی اندر کی جیب سے ایک کارڈ نکالا۔

"تم نے یہ نام کہیں سُنا تو ضرور ہوگا؟"

"مس کامنا سنکلیر!" شامو نے پڑھا۔ اُس نے یہ نام کہاں سُنا تھا؟ کہاں دیکھا تھا؟ ہاں کل ہی ایک بڑے سے پوسٹر پر اُس نے یہ نام دیکھا تھا اور ایک عالیشان تصویر بھی۔ ٹریمے کار پر، بجلی کے کھمبوں پر، لاریوں پر، ٹھیلوں پر، ہر طرف اور ہر جگہ اسی نام کے پوسٹر چسپاں تھے! اور ساتھ ہی جلی حروف میں یہ الفاظ بھی تھے "ہندوستان کی خوبصورت ترین دوشیزہ"

ٹھیک ہے۔ ہو نہ ہو کوئی ایکٹریس ہو۔

"تو کیا آپ فلمز میں کام کرتی ہیں؟" شامو نے پوچھ ہی ڈالا۔

ذرا شامو صاحب کے اس سوال پر غور کیجئے۔ مس کامنا سنکلیر سے یہ پوچھنا کہ کیا وہ فلمز میں کام کرتی ہے! جس زمانے کا یہ ذکر ہے اُس وقت کسی میگزین، کسی رسالے، اور کسی اخبار کو اُٹھا کر دیکھئے۔ ہر ایک کے اوّلین صفحے پر آپ کو اسی "مہاسندری" کی تصویر نظر آئے گی۔ درحقیقت میں کامنا کی تصویر چھاپ دینے کے معنی یہ ہوتے تھے کہ تعداد اشاعت یقینی طور پر کئی ہزار بڑھ گئی۔ یہی نہیں بلکہ ہر ایک کریم، سنو، سینٹ، پاوڈر، صابن اور دیگر اشیاء کا اشتہار بھی اس طرح دیا جاتا تھا کہ فلاں فلاں فیس کریم کو ہندوستان کی مہاسندری مس کامنا سنکلیر نے پسند کیا اور بہت تعریف کی ــــ اور یہاں ہمارا نوجوان شامو اس شہرت کی دیوی سے یہ پوچھتا ہے کہ کیا وہ فلمز میں کام کرتی ہو۔

کامنا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اُسکے ساتھ تم بھی۔ کئی سیکنڈ تک وہ اس عجیب الخلقت نوجوان کو گھورتی رہی۔ پھر اپنے اسٹوڈیو کا پتہ بتا کر خراماں خراماں مٹکتی ہوئی ایک طرف کو چلتی ہوئی۔ شامو کچھ حیرت اور کچھ خوف سے اُسی طرف برابر دیکھتا رہا۔

شامو ہرگز جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن "مہاسندری" کی تلاش کے اٹل حکم نے اُسے وہاں دھکیل ہی دیا۔ ہیند رکمار نے کہا کہ کہیں نہ کہیں سے تو یہ تلاش شروع کی جائیگی۔ اس لئے ابتدائے عشق کیلئے یہ بہترین موقع ہے۔ اور پھر ہندوستان کی خوبصورت ترین دوشیزہ! ضرور جانا چاہئے" چنانچہ ایک زبردست فٹ بال میچ کو اس منحوس تلاش پر قربان کر کے شامو بادلِ ناخواستہ روانہ ہوا۔

* * * * * * * *

رام نام لے کر وہ ایک وسیع ہال میں داخل ہوا۔ جا بجا "سائلنس" "خاموش!" "نو سموکنگ" "سگرٹ پینے کی ممانعت ہے" کے نوٹس لگے ہوئے تھے۔ شامو حیران و پریشان کھڑا تھا کہ ایک وجیہ جنٹلمین تیز قدموں سے اُسکے قریب آیا۔

"کیا آپ ہی مس کامنا سنکلیر کے دوست ہیں؟"

"ہاں!" شامو کے پاس صرف یہی جواب تھا۔

"مسٹر شیام سندرلال! جنہوں نے بڑی بہادری سے مس کامنا کو بچایا تھا؟ اوہ! گڈ!! آپ سے ملکر بڑی خوشی ہوئی ــــ واٹ لے پٹی! اس وقت کوئی بھی آدمی شوٹ کرنے کے لئے نہیں تھا ــ"

"شوٹ کرنے کے لئے!" شامونے خوفزدہ ہوکر کہا۔ ظاہر ہے کہ وہ اِس اصطلاح کے معنی نہیں جانتا تھا۔

"آئیے۔ تشریف لائیے۔ میں مس کامنا سے آپ کو ابھی ملاتا ہوں۔ عجیب و غریب لڑکی ہے۔ اتنی سی عمر میں لاجواب کام کرتی ہے ——— کم رائٹ اِن!"

شامو انگشت بدنداں، پھٹی ہوئی آنکھوں سے اِس جادو کے شہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ فرش پر متعدد اونچے نیچے چوبی چبوترے بچھے ہوئے تھے۔ ایک چبوترے پر مصنوعی گھاس اور پودے اُگے ہوئے تھے۔ ایک پر کرسیوں میزوں کا ایک ڈھیر تھا۔ ایک جگہ شیشیوں کی مدد سے مصنوعی تالاب بنا رکھا تھا جس میں ایک بوند پانی نہ تھا لیکن قریب پہنچنے پر بھی پانی سے بھرا نظر آتا تھا۔ ایک کونے میں بغیر پہیوں کی ایک موٹر کھڑی تھی۔ اُس کے قریب ہی ریل کا ایک پورا ڈبہ کھڑا تھا۔ سامنے موٹے موٹے رسوں کا ایک پہاڑ سا بنا ہوا تھا۔ دوسری طرف بجلی گھر تھا۔ جہاں سے تاروں کا جال سارے اسٹوڈیو میں پھیلا ہوا تھا۔ آدھی آدھی آستینوں کی قمیصیں اور میلے میلے نیکر پہنے بیسیوں آدمی ادھر سے اُدھر کچھ سٹر پٹر کرتے پھر رہے تھے ——— زور سے ایک بگل بجا۔ شامو چونک پڑا۔ "چلیے ریہرسل شروع ہونے والی ہے ——— "

وجیہ جنٹلمین نے کہا ——— "دیکھیے۔ یہ سٹ "پریم کی آگ" میں جو مالی کی جھونپڑی تھی اُس کا ایک ٹیرپرہے۔ آپ نے "پریم کی آگ" دیکھا تھا؟ نہیں! اوہ! واٹ اے پٹی۔ کامنا نے لاجواب کام کیا تھا۔ اِس سین میں دیکھیے وہ۔ وہ ہے جھونپڑی۔ یہ کاغذ کی بنی ہوئی ہے۔ اسکے آگے ہمیں کامنا کو بارش میں بھیگتے ہوئے دکھانا تھا۔ بارش کا افکٹ ہم نے اعلیٰ درجے کا پیدا کر لیا تھا۔ دیکھیے۔ وہ اوپر۔ یہ ہمارا شاور ہے۔ موسلا دھار بارش معلوم ہوتی ہے لیکن صرف دس مربع گز میں برستی ہے۔ اور آندھی کیلئے وہ دیکھیے سامنے۔ دائیں بائیں چار چار بڑے پنکھے ہیں۔ ۔ ۔ ہم وولٹ کے۔ نہایت عمدہ افکٹ پیدا ہو گیا تھا! اور پھر کامنا کا کام۔ ہندوستان بھر میں صرف وہی ایسی ایکٹریس ہے جو ہر جذبے کو کامیابی کے ساتھ رجسٹر کر سکتی ہے ——— (رجسٹر کیا بلا ہوتی ہے۔ شامو نے سوچا) ——— آئیے۔ ادھر دیکھیے یقین جانیے۔ یہاں کل تک کسی چیز کا نام و نشان بھی نہیں تھا اور اب دیکھیے کتنا عالی شان ڈرائنگ روم ہے ——— آئیے، اس طرف آئیے ریہرسل شروع ہو گئی ہو گی ——— "

* * * * * * *

شامو نے دیکھا۔ کیا دیکھا؟ یہی سمجھا کہ سچ مچ کی شادی ہو رہی ہے۔ ہال مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا ہے۔ پہلو کے دروازے پر میزبان صاحب ——— ایک موٹی سی توند پر چھوٹی سی دھوتی باندھنے والے بڑے پیمانے کے سیٹھ صاحب ——— مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں۔ لوگ۔ عورتیں اور مرد ——— زرق برق لباس پہنے ہنستے کھلکھلاتے چلے آ رہے ہیں۔ سامنے کے رُخ تین چار کیمرہ مین مصروفِ کار ہیں۔ اِدھر اُدھر آٹھ دس مائکروفون گلدستوں میں چھپے رکھے ہیں۔ دُور شیشے کے ایک پنجرے میں بند ریکارڈسٹ صاحب بیٹھے ہیں ——— ایکدم سے ایک سیٹی بجی۔

ہاف ٹائم! شامو نے خیال کیا اور اُسے نارنگیاں یاد آئیں۔ فٹ بال میچ کا سارا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ تماشائیوں کا ایک غول اُس کی پیٹھ ٹھونک رہا ہے ——— لیکن یہاں معاملہ ہی دگرگوں تھا ——— شامو نے دیکھا کہ ایک خوبصورت، چست و چالاک جوان پلیس فورز پہنے کیمرا مین کے پیچھے کھڑا ایڑا سا بارن مُنہ سے لگائے چلا رہا ہے۔

"مسٹر نوروزجی۔ ہمارا بہترین ڈائرکٹر۔ ہالی وُڈ میں دس برس سیکھ کر آیا ہے!" شامو کے گائڈ نے چپکے سے شامو کے کان میں کہا۔

"ناؤ پیپل ———!" نوروزجی نے چلا کر کہا۔ "کامنا کے آتے ہی سب لوگ کامنا کی طرف دیکھیں۔ سب کی نظریں اُسکے چہرے پر گڑ جائیں۔ ایک عاشق کی نظروں کی طرح۔ سمجھے! مسٹر گوپال، کیمرہ نمبر تین پر کلوز اَپ میں عینک صاف کریں۔ سمجھ گئے۔ مس موتی اور مس شکنتلا خاموشی سے اشارے کریں۔ ناؤ۔ ریڈی، ریڈی۔ مسٹر بشمبر! ہیٹ اتارو ——— ریڈی۔ ایکشن!!"

مہمانوں کی آمد جاری رہی۔ پھر شروع ہو گئی۔ مقررہ اشارہ پر کامنا شاندار ریشم کی ساری میں لپٹی، مسکراتی، لچکتی، لجاتی دروازے پر نمودار ہوئی۔ موٹی توند والے سیٹھ جی ریشہ خطمی ہو گئے۔ سب کی نظریں اس پر جم گئیں۔ کامنا نے اشتیاق سے چاروں طرف نظر کی۔ پھر ایک طرف گھور کر دیکھنے لگی ——— نوروزجی کی آواز پھر گونجی ——— "کیمرہ، سیکنڈ، کلوز اپ آن دی ہیروئن۔ گاٹ اٹ؟ کامنا آہستہ چلو، بھاگو نہیں، اور آہستہ، ٹھیک ہے ——— ایکشن۔"

کامنا مور کی طرح ناچتی ہوئی، ادھر ادھر کے سلاموں کا جواب برق پاش مسکراہٹ سے دیتی، ہیرو کی طرف بڑھی جو اپنے یاروں کے ساتھ گپ بازی میں منہمک ہے۔ چپکے چپکے جا کر اس کی آنکھیں بند کر لیں ——— کٹ۔ کٹ۔ کٹ!" نوروزجی چلایا۔ "ہیرو کو چونک پڑنا چاہیئے۔ یہ کیا۔ اور کامنا اس معمولی سمائل (تبسم) سے کام نہیں چلے گا۔ زور کا قہقہہ چاہیئے۔ گاٹ اٹ؟ یس۔ ایک سپیشن فرم دی ویلین۔ جنٹل مین نمبر ——— گوپال! یو، ای ڈیٹ، واٹ آر یو لکنگ ایٹ۔ آئیز آن دی ہیروئن۔ ڈیم اٹ!! ——— یس۔ ایکشن!!! ——— "

"ابھی تھوڑی دیر میں یہ سین ختم ہو جائے گا۔ اور پھر ہم چائے پئیں گے۔" شامو کے کان نے کہا۔ "چلئے تب تک میں آپ کو اسٹوڈیو کی اور عجیب چیزیں دکھاؤں ——— "

* * * * * * * *

"ہلو مسٹر شام! تھینکیو سو مچ فور یور کمنگ راؤنڈ ہیر ——— " کامنا نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے شامو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

"او۔ کے!" شامو نے مسکرانے کی کوشش کی۔

شامو کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مس کامنا منگلیکر، ہندوستان کی خوبصورت ترین دوشیزہ اس وقت چڑیل سے زیادہ مہیب اور گھناؤنی نظر آ رہی تھی۔ اس کا پھول سا چہرہ ۶ء، ۲ء اور ۳ء کی امتلا انگیز رنگ آمیزی سے مسخ ہو رہا تھا اور چہرہ کی اس سرخی مائل زرد زمین پر سیاہی سے کیوپڈ کی کمان نما دہانہ پینٹ کیا گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد نیلگوں حلقے بنائے گئے تھے۔ بھرے بھرے سیمیں بازووں پر شامو نے اندازہ لگایا کہ راکھ ملدی گئی ہے ——— بعد میں معلوم ہوا کہ یہی چیزیں تو اس کی لاثانی خوبصورتی کا راز ہیں۔ بہرحال! شامو کو اس سے کیا واسطہ!

"ماں، یہی ہیں مسٹر شام سندر لال جنہوں نے مجھے بچایا تھا ——— مائی مدر!" کامنا نے ایک بھدی سی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ شامو نے ادب سے سر جھکا دیا۔ ماں نے شامو کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

"یہاں آؤ مسٹر شام۔ میرے پاس بیٹھو۔ میں تو تم سے ملنا چاہتی تھی۔ تم نے بڑا کمال کیا۔ ڈونٹ نو، ہاؤ ٹو تھینکیو ——— چار ہو گے! ——— اس کھیل کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟"

"فائن" شامو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا تھا

"مجھے بڑا لطف آتا ہے اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر۔ تم نے "مالن" دیکھا تھا؟"

"نہیں" شامو نے سچ سچ کہدیا۔

"ارے نہیں!" کی آگ "بھی نہیں! تعجب ہے۔"

فخریہ انداز میں کامنا کی ماں نے یکے بعد دیگرے کامنا کے لاتعداد فلموں کا ذکر مع مبالغہ کرنا شروع کیا۔ بڑھیا نے غضب کی قوت بیانیہ پائی تھی شامو سوائے "ہاں۔ ہوں" کے اور کر ہی کیا سکتا تھا۔

"ڈو یو ڈینس؟" کامنا نے شامو کی عزت بڑھانے کے خیال سے پوچھا۔

"نو"

"وری اسٹرینج، لیکن تمہیں سیکھنا پڑے گا مسٹر شام! یہ تو بڑی ضروری چیز ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ آج کی رات" ہنگ مین" گذاری جائے۔"

شامو نے اپنا منہ کھولا ــــــ اپنے کالج کے ساتھیوں کی تصویریں اُس کی نگاہوں کے سامنے پھر گئیں۔ کامنا کے ساتھ ڈانس کرنے کی لائق حسد دعوت پاکر اُن کی کیا حالت ہو جاتی۔ خوشی کے مارے دیوانے ہو جاتے۔ خیال تو کیجئے۔ دُنیا بھر کی محبوبہ ــــ کروروں جوانوں کے خیالوں میں رہنے بسنے والی طلسمات کی شہزادی۔ ارمانوں کی دیوی۔ ہندوستان کی خوبصورت ترین دوشیزہ۔ مس کامنا سنکلیر آپ کو ڈانس کی دعوت دے!! نگم تو اکڑ کر تختہ بن جاتا۔ رابرٹ زمین پر قدم رکھنا بھی اپنی توہین سمجھنے لگتا۔ اور تھیرا تو شاید ہوا میں اُڑتا پھرتا ــــــ یہ کیا حماقت ہے۔ شامو نے خیال کیا۔ ہمت کرنی چاہیئے۔ آخر اس چھوکری پر رُعب گانٹھنا کونسی بڑی بات ہے۔ اور پھر بغیر اسکے کام کیسے چلے گا۔ اگر یہی حالت رہی تو بڑے بڑے اداکی دولت ہاتھ آچکی! شامو نے دل ہی دل میں کمر ہمت کسی اور اپنا دہانہ مضبوطی سے بند کیا۔

* * * * * * * *

معصومیت اور خوش دلی کی دیوی مسز سنکلیر (کامنا کی ماں) نے بالآخر یہ طے کر ہی لیا کہ اگر مسٹر شام کنٹری لائف کو پسند کرتے ہیں تو انہیں ہفتے کیلئے "شالامار ولا" آنا پڑیگا اور انکے ساتھ ٹھہرنا پڑیگا۔

"انکے ساتھ ٹھہرنا!" شامو کے تن بدن میں دوبارہ ایک سرد سنسنی سی دوڑ گئی۔ "کیا آپ لوگ وہیں رہتے ہیں؟"

"نہیں تو مسٹر شام۔ ہم نے کمپنی سے آگے ایک چھوٹا سا بنگلہ دریا کے کنارے لے لیا ہے۔ بڑی عمدہ جگہ ہے ــــ اکثر ویک اینڈ کے لئے ہم لوگ وہیں چلے جاتے ہیں۔ اب تو لائٹ بھی لگ گئی ہے۔ خاص الطف رہتا ہے ــــ ضرور آنا مسٹر شام انہیں بہت خوشی ہوگی۔ آج کل کا موسم بھی عجیب نہیں ہو سکتا۔ کامنا کے اور چند دوست بھی آتے ہیں۔ آہ گئے؟ تو پھر نکسٹ سنڈے طے پایا ــــ تھینکیو......!"

ــــــــــــــــــــــــــــ

دو عدد عمدہ قسم کے سوٹ کیس فراہم کئے گئے اور نند رکھا رنے بنواری کی معیت میں شامو کے چند بہترین "ڈی" سوٹ اور "ٹوائلٹ" (سنگھار) کا ضروری و نفیس سامان ان میں بھر دیا۔ شامو کے انکار اور ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی ــــ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ملکۂ حسن کے مہمان بنکر جا رہے ہیں اور مُصر ہیں کہ میں تو اپنا وہی ٹوٹا ہوا کنگھا لے جاؤنگا۔ غور کیجئے حماقت ہے یا نہیں!

اور جو کچھ ہوا سو ہوا۔ شامو اس چیز کو کبھی گوارا نہ کر سکتا تھا کہ "ینگ مین" سے میچ کھیلے بغیر چلا جائے۔ پچھلے سال ہی "ینگ مین" نے اس کی ٹیم کو نصف درجن گول "عطا" کئے تھے۔ اُن کا بدلہ اتارنا شامو پر فرض تھا۔ اور فی الحقیقت وہ سارے سال اسی غرض سے اپنی ٹیم کو جان توڑ "پریکٹس" کروا تا رہا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ان کا "چیلنج" آئے اور وہ محض اس وجہ سے نہ کھیلے کہ اسے ایک نک چڑھی مسماۃ سے ملنے جانا ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ چیز شامو کے مذہب کیخلاف تھی۔ اس جیسی ہزار مہاسہ ریاں ایک طرف اور "ینگ مین" سے میچ ایک طرف! چنانچہ میچ ہوا اور خونریز قسم کا ہوا۔ شامو کے بائیں بیک کی ایک آنکھ نیلی ہوگئی۔ رائٹ آوٹ کی پنڈلیاں چورا چورا ہوگئیں۔ لفٹ ان کے پاؤں میں خطرناک موچ آئی اور گول کیپر صاحب کا ایک دانت شہید ہو گیا ــــــ جی ہاں! پھر بھی شامو کی ٹیم جیت کر رہی! کھیل بھی وہ لاجواب کھیلے ہیں کہ بایدوشاید۔ ایک جوش تھا۔ ایک آگ تھی۔ ایک سیلاب تھا کہ بڑھائے لئے جا رہا تھا۔ مر رہے تھے۔ کٹ رہے تھے لیکن پوری طاقت سے گھسے جا رہے تھے۔ پلے پڑ رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نہ دو اکٹھے سات گول ــــ "ہپ۔ ہپ۔ ہرّا!!!" سارا شہر چلا رہا تھا ــــ تمغے، رومال اور نہ معلوم کیا کیا شامو کی ٹیم پر ہر چہار طرف سے برس پڑے۔ زمین سے آسمان تک اگر کوئی آواز سنائی دے سکتی تھی

تو یہی کہ ـــــ ہپ۔ ہپ۔ ہرّا !!!!"

* * * * * * * *

ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ کمبخت رابرٹ (شامو کی ٹیم کا ہاف بیک) اپنی نیلی آنکھ سمیت اسی ٹرین سے اپنی خالہ کے گھر (متھرا) جارہا تھا۔ شامو کو اسی کے ساتھ بیٹھنا پڑا ـــــ اس موقع پر میں اپنے معزز قاری کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ صرف نوجوان لڑکیوں ہی کی فطرت نہیں بلکہ نوجوان لڑکے بھی اپنے ساتھیوں کی ذرا ذرا سی بات کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ لباس میں کیوں ایک دم سے تغیر پیدا ہوگیا ـــــ بناؤ سنگھار ضرورت سے زیادہ کیوں کیا جارہا ہے۔ فلاں جگہ کیوں گئے۔ فلاں وقت کہاں تھے وغیرہ۔ لہٰذا رابرٹ کی مندرجہ ذیل تفتیش بے محل نہیں کہلائی جاسکتی:۔

"شامو، دوست! سچ سچ بتاؤ، آخر بھید کیا ہے؟"

"بھید!!" شامو نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ آخر یہ عمدہ عمدہ سوٹ خواہ مخواہ تو نہیں پہنے جارہے۔" رابرٹ نے شامو کے نیوی بلو بلیزر اور وائٹ فلینلز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سوٹ۔ کیوں کیا بات ہے؟ ہیں!" شامو نے ٹالنا چاہا۔

"اب تم بنو تو نہیں۔ یہ بتاؤ کہ وہ غریب کھیاری کونسی ہے جس پر تم جان چھڑکنے لگے۔" رابرٹ نے فی الواقع طنز سے کہا۔

"میں کیا جانوں!" شامو کو شرمانا پڑا۔

"جانتو اسی کے پاس رہتے ہونا؟ کیوں؟؟" رابرٹ نے چالاکی سے کام لیا۔

شامو مسکرا دیا۔

"جبھی ـــــ ہوں!!" رابرٹ جل مرا۔ "ہے کون؟ یہ تو بتاؤ ـــ کیوں؟ نہ بتاؤ گے؟"

"ہندوستان کی خوبصورت ترین دوشیزہ" شامو نے ذرا اکڑ کر کہا۔

"جی۔ ضرور ہوگی! ـــــ کیوں نہ ہو، آپ کی محبوبہ جو ٹھہری۔ خیر، یہ تو بتاؤ، کیا اسٹیشن پر آئے گی؟"

"شاید" شامو نے کہا۔

"دیکھا جائیگا!" رابرٹ نے اپنی نیلی آنکھ کو سینکتے ہوئے کہا۔

اب اسے شامو کی خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی کہ مس کامنا سنکلیر خود بدولت مع اپنی چند حسین وجمیل سہیلیوں کے اسٹیشن پر تشریف لے آئیں۔ ـــــ شام کی اداس روشنی میں کامنا گہرے نیلے رنگ کی ساری باندھے حور شمائل سہیلیوں کے جھرمٹ میں الگ پہچانی جاتی تھی۔ بلند وبالا، تیز طرار، سیاہ ریشمی بالوں کے جھالے شانوں پر لٹکائے بڑے ٹھسک کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔ جادو بھری نشیلی آنکھیں چلتی ہوئی ریل کے ایک ایک ڈبے میں متجسسانہ پڑ رہی تھیں۔

"آئی سی۔ شامو! لک اپ! ـــ مائی گاڈ، اے بیوٹی انڈیڈ!" رابرٹ نے تڑپ کر کہا۔

شامو اطمینان سے اپنا سفری بیگ بند کرتا رہا۔

"دیکھ تو، شامو! اس نیلم پری کو تو دیکھ! کیا قیامت ہے، اُف! ہائے ......" رابرٹ مچل گیا۔

شامو مسکرایا۔ گاڑی ٹھیر گئی اور مس کامنا نے شامو کو دور سے دیکھ کر اپنا نازک ہاتھ ہلایا۔ شامو نے مسکراتے ہوئے اپنی ہیٹ ہلائی ـــ
"گریٹ کنگ!! کیا تو انہیں کے پاس جا رہا ہو ـــ کیا یہی ہے تیری ......" رابرٹ کا دم نکل گیا۔
"جی ہاں ـــ!" شامو نے کہا: "سو لونگ!!"
شامو ان رنگ برنگ کی پریوں کے جھرمٹ میں غائب ہوگیا۔ رابرٹ کو تارے نظر آنے لگے۔ "ول، آئی ایم ڈیشڈ!!" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اور ٹرین اُسے "خالہ کے گھر" کی طرف لے دوڑی۔

شالامار ہولا شامو کے اندازے سے زیادہ رفیع الشان نکلا۔ چاروں طرف رنگا رنگ کے پھولوں سے مہکتا ہوا باغیچہ۔ درمیان میں بڑا سا بنگلہ۔ عقب میں پُرسکون دریا چپ چاپ بہہ رہا تھا جس میں کامنا کا ایک مختصر سا اسٹیمر پڑا تھا ـــ اعلیٰ قسم کے فرنیچر اور بیش بہا ساز و سامان سے آراستہ بے شمار کمرے تھے۔ لیکن ایک چیز جو شامو کے لئے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوئی یہ تھی کہ ہر کمرے میں "ہندوستان کی خوبصورت ترین دوشیزہ" کے طرح طرح کے فوٹو گرافس کی بھرمار تھی۔ ہال میں، ڈرائنگ روم میں، لونج روم میں، ڈائننگ روم میں، بیڈ روم میں، ہر جگہ اور ہر طرف ہندوستان کی حیاسُندری اپنی جادو بھری آنکھوں، صراحی دار گردن اور کیوپڈ کی کمان نما ہونٹوں سمیت موجود تھی۔ شامو گھبرا گیا۔ جہاں جاتا بڑی بڑی غلافی آنکھیں بدمستی سے اُسے گھورتیں۔ کوئی کونا ایسا نہ تھا جہاں وہ اس حیاسندری کی مقناطیسی کشش سے وہ محفوظ رہ سکتا ـــ کہیں ہنستی ہوئی۔ کہیں روتی ہوئی۔ کہیں غصہ میں۔ کہیں خوفزدہ۔ کہیں ناچ رہی ہیں۔ کہیں اپنے کتے سے کھیل رہی ہیں۔ کہیں پھول بیچ رہی ہیں۔ کہیں ایک طوائف کے بھیس میں جلوہ گر ہیں۔ کہیں ایک وفاشعار بیوی کی حیثیت سے اور کسی میں صرف ایک ناز آفریں محبوبہ۔ کہیں زرق برق پوشاک میں ملبوس ہیں اور کسی میں نیم عریاں ـــ ان تصویروں کو تو خیر کسی نہ کسی طرح برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن اُن تصاویر کو کیا کیجئے گا جن میں ہندوستان کی حیاسُندری کے ساتھ سینکڑوں آدمی ـــ (ایک وقت میں ایک ہی۔ یاد رہے۔) ـــ عشق کرتے نظر آتے ہیں۔ شامو کا خون کھولنے لگا۔ تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ بیحیائی کی بھی حد ہوتی ہے آخر۔ یہ کیا۔ توبہ! (پرکھو!! دیا کر۔ شامو کا دل چلایا۔) کسی تصویر میں کوئی عاشق صادق صاحب صراحی دار گردن میں باہیں ڈالے، کیوپڈ کی کمان نما لبوں پر پورے جوش کے ساتھ مُہر ثبت کر رہے ہیں۔ کسی میں کوئی صاحب سربسجود تھے۔ کسی میں سچ مچ بغلگیر ہو رہے تھے ـــ "توبہ!" شامو نے ڈرز جیکلس اینڈ "دی شیلز" پہننے کے بعد "دی" بڈ مائیز سے لڑتے ہوئے کہا۔

* * * * * * *

شامو کو اس پرستان میں آئے تین دن ہو چکے تھے۔ سب کو اس کی اصلی فطرت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ بعض منچلے تو اس غریب کو ضرورت سے زیادہ بناؤ ڈالتے تھے۔ فی الواقع شامو کی قسم کا آدمی کسی سوسائٹی میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ چُپ چاپ، بھیڑ کے بچے کی طرح شرمیلا۔ نہ کسی سے بات نہ چیت۔ نہ کھیل نہ تماشہ۔ نہ گانا نہ بجانا۔ نہ شعبدہ بازی نہ چالاکی۔ نہ لطیفے نہ چٹکلے ـــ پھر بتایئے گذر ہو تو کیسے ہو۔ "سوشل سرکس" کیلئے غالب والے "ذوق فضول" اور "جرأت رندانہ" لازمی ٹھیرے اور یہاں ان کا نام و نشان بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شامو اوروں کیلئے اور اور لوگ شامو کے لئے ایک مستقل جنجال ثابت ہونے لگے ـــ حالانکہ خود مس کامنا (ہندوستان کی خوبصورت ترین دوشیزہ) اس کا ہاتھ پکڑے چاندنی راتوں میں دیر تک دریا کے کنارے ٹہلتی رہی۔ اس کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتی رہی۔ بدمستی سے اُسے گدگداتی رہی۔ اگر کوئی اور ہوتا تو اب تک "عشق و ہوس" کی تمام منازل بیسیوں مرتبہ طے ہو چکی ہوتیں لیکن شامو صاحب کو احساس بھی نہیں ہوا۔ اُن کی حالت تو یہ تھی کہ کبھی اتفاقاً اُن کا نیم شحیم ہاتھ مس صاحبہ کے گداز جسم سے مس ہو جاتا تھا تو وہ گھبرا کر معافی مانگ

پرتُل جاتے تھے ——— واقعہ یہ تھا کہ دراصل مس کامنا سنکلیہ خود ہی شامو پر بُری طرح لٹو ہو رہی تھیں۔ کچھ تو اس گھوڑے والے حادثہ کے سلسلے میں کچھ شامو کی زبردست اور عجیب و غریب شخصیت سے مرعوب ہو کر اور کچھ شامو کی نشیلی، رو بھری آواز سے متاثر ہو کر (واضح رہے کہ شامو صاحب سے ان کی بے منظر ملاقات ہو چکا تھا "وائی چنیز" یہاں تک متعدد بار سنی گئی) بہر حال حالات اس درجہ متجاوز ہوئے کہ غریب شامو کا وہیں جیسا دیوانہ اور عمدہ کپڑوں میں ملبوس پیوند شدہ داغ والا قدس کامنا سنکلیہ تیر جیسی اور تند خو عورت کے ارمانوں کا مرکز بن گیا ——— ایک رات ہندوستانی "مہا سُندری" بہ نفس نفیس شامو کو اس کے بیڈ روم تک گدگدانے کھینچ آئی۔ شامو ٹھیک یہ کہنا چاہتا تھا کہ ——— کیوپڈ کی کمان نما گرم و تر ہونٹ اسکے تھرتھراتے ہوئے خشک لبوں پر اپنے جوش کے ساتھ چسپاں ہو گئے گداز صندلی بانہیں پھانسی کے پھندے کی طرح اسکے گردن میں جکڑی گئیں۔ گدرایا ہوا سینہ اسکے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ وصلی کی طرح پیوست ہو گیا اور ——— لائٹ گل ہو گئی!!!

* * * * * * *

شامو کو مس کامنا سنکلیہ سے پہلے ہی سے نفرت سی تھی۔ اب تو یہ نفرت مکمل حقارت میں بدل گئی ——— بڑے دادا ساری دنیا کی دولت بخشدیں مگر وہ اس آبرو باختہ ایکٹریس سے کبھی بھی شادی نہ کریگا۔ چاہے وہ ہندوستان کی ہی نہیں ساری دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہو۔ اور پھر ایسی حسینہ جسکی خوبصورتی کا راز ... ... لپ اسٹک اور روج میں مضمر ہو۔ نہیں! کبھی نہیں!!

مس کامنا سر پٹختی رہ گئی لیکن شامو دس بجے کی گاڑی سے روانہ ہو کر رہا ——— پریوں اور حوروں کا ایک جھرمٹ کا جھرمٹ اُسے اسٹیشن پر چھوڑنے آیا۔ ان میں سے وہ ایک کو وہ واقعی پسند کرتا تھا۔ اور جن کے متعلق اس کا خیال تھا کہ شاید بڑے دادا کے "امتحان" میں پوری اتریں۔ مس مادھوری کامنا کی ایک عزیزہ جو کسی کالج میں پڑھتی تھی اُسے خصوصیت کے ساتھ پسند تھی۔ وہ اسی سے "کچھ" باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں نہیں۔ مس کامنا کے "شالامار دلا" میں کبھی نہیں۔

نرم و گرم، نازک لچکدار ہاتھ ہلے اور شامو مس مادھوری سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے بڑے دادا کی خدمت میں اپنی فتوحات کا اظہار پیش کرنے روانہ ہوا۔ نوجوان شامو نے بالآخر "مہا سندری" کو ڈھونڈھ ہی نکالا کس طرح؟ اگلی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے۔

انصار ناصری۔ بی۔ اے

ایک طائرِ خاموش پر چند آنسو

دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است — زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

کیا یہ حقیقت ہے کہ تم ہمیشہ کے لئے اس سرائے فانی سے رخصت ہو چکی ہو؟ میں کس طرح مان لوں کہ تمہاری زیست کا رشتہ کل شام کو ٹوٹ گیا؟ تسلیم نہ کرنے والی باتوں کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ جو حادثات وہم و گمان میں بھی نہ آتے ہوں۔ انہیں امرِ واقعی سمجھ لینا دشوار ہے۔

جب مجھ سے کہا گیا کہ بھیانک موت کے ظالم فرشتے نے اپنے بے رحم ہاتھوں سے تھپک کر تم کو ابدی نیند سلا دیا ہے۔ تو تمام دنیا میری نگاہوں میں تاریک ہو کر رہ گئی۔ تمہارا عالیشان قصرِ حیات منہدم ہو کر ایک ایسی برباد شدہ عمارت کی شکل میں نظر آنے لگا جسے اچانک شدید زلزلے نے مسمار کر دیا ہو۔ اس ایوانِ تصور پر لگے ہوئے کتبے پر "کل من علیہا فان" کے نقوش ابھرنے لگے۔ کائنات کے ہر ذرے سے ویرانی ہی ویرانی ٹپکنے لگی۔

اگر تم اس سے ناراض ہو کر تم نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا ہے تو ان کے لئے مجھے بتاؤ کہ تمہیں ایک بار پھر منا لینے کے لئے کس طرح تمہاری بزہمیِ مزاج کو دور کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر ارادتاً تم نے اس کو خیرباد کہا ہے تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کس چمن کی بہارِ دلفزا ہے جس کو اس جہاں کی رعنائیوں پر تم نے ترجیح دی ہے؟ ذرا سوچو تو کہ جب تمہاری عارضی جدائی ہی ناپسند ہو تو دائمی مفارقت کیونکر برداشت کی جا سکتی ہے؟ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اب مجھ سے کبھی نہیں مل سکتیں۔ کیونکہ ایسی فضا یں جہاں شہد و موسیقی کے سوا کچھ نہ ہو ایک بار پہونچ جانے کے بعد کوئی واپس آنا گوارا نہیں کر سکتا۔ خیر! جہاں رہو خوش رہو۔ خدا کا فضل و کرم تمہارے ساتھ ہو۔

تم مر گئیں۔ اور مجھے مبتلائے رنج و محن کر کے ایک طرف آنسوؤں کا دریا بہانے کے لئے اور دوسری طرف یہ سوچنے کے لئے تنہا چھوڑ گئیں کہ آخر اس زندگی کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ عقل حیران ہے۔ اگر عرصۂ حیات عبارت ہے ان قلیل لمحات سے جو انسان اس دنیا میں محض اس لئے بسر کرتا ہے کہ دل میں آرزوؤں کی نشو و نما ہو لیکن تکمیلِ تمنا سے قبل خود اسکی ہستی فنا ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایسے پیدا ہونے سے ناپید رہنا ہی بہتر ہے۔ تخلیق کی ساعتیں ہی نہ گذریں تو زیادہ مناسب ہے۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی اگر قابلِ تعزیر نہیں تو لائقِ تحسین بھی نہیں ہے کہ وہ ان ہستیوں تک کو موت کے آغوش میں سلانے سے نہیں چوکتی جن کا ابھی عہدِ شباب ہوتا ہے۔ قضا و قدر کی ظالم دیوی اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ غنچے شگفتہ ہو کر پھول بننے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ کھلتے ہی مرجھانے کے لئے نہیں۔ ممکن ہے حیاتِ اجتماعی کا نظام قائم رکھنے کے لئے موت اشد ضروری ہو لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ثمرِ زیست کو نورس ہونے سے قبل ہی ڈال سے جدا کر دیا جائے۔ کوئی بیوقوف بت تراش بھی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ اس کے تراشے ہوئے مجسمے تکمیلِ نقش سے قبل ہی شکستہ کر دئے جائیں ——— تم ایک ناشگفتہ غنچے کے مانند تھیں۔ ابھی تم کو پھول بننا تھا کہ کملا کر فنا ہو گئیں۔

تمہارے تقدیس شکن حسن کی کرشمہ سازیوں نے اور تمہاری ہوشربا اداؤں کی ملائک فریبیوں نے میرے جذبۂ عشق کی ازلی سرمستیوں سے شبابِ زندگی کا سب سے پہلا خراج کہاں اور کب حاصل کیا؟ ——— یہ ایک سوال ہے جس کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ مجھے منظور نہیں اور نہ مسلکِ عشق میں جائز ہو سکتا ہے کہ خلوتِ معصوم کے رازہائے سربستہ کی تشہیر کروں۔ اور وہ بھی ایسے لوگوں کے سامنے جنکی دریدہ دہنی عفت مآب مریم کی زندگی کو بھی معصیت سے ملوث کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

لیکن نہ بھولنے والے واقعات یاد آئے بغیر نہیں رہ سکتے میں ان کو فراموش کر ہی نہیں سکتا۔ تمہاری حیاتِ فانی کے ان مختصر لمحات کو جن کی تا ثرو

ضیا میں تم نے میرے تخیلات کی شبستانِ آرزو کو سینکڑوں حسین خواب دکھائے اور پھر بیدار کر دیا۔ اس طرح کہ وہ دلفریب نقوش ہمیشہ کے لئے میرے قلبِ مضطر پر مرتسم ہو کر رہ گئے۔

"کاشمیرا" نامی فلم کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ نہایت خراب اور ناقابلِ دید ہے۔ وہ کہا کریں۔ مجھے اُن کی رائے سے کیا واسطہ۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ صنعتِ فلم سازی کی دُنیا میں اس سے بہتر فلم آج تک تیار نہیں ہوا۔ اس لئے نہیں کہ ڈرامہ کا پلاٹ مؤثر اور اُس کا اسلوبِ بیان دلپذیر تھا، اس لئے نہیں کہ عکاسی کے لحاظ سے وہ فن کا بہترین نمونہ تھا۔ اس لئے نہیں کہ ترنم و موسیقی کی اس میں فراوانی تھی اور اس لئے نہیں کہ اسکے اداکار شہرۂ آفاق تھے۔ بلکہ محض اس لئے کہ میں نے اُسکو تمہاری معیت میں دیکھا تھا۔ اور وہ بھی پہلو بہ پہلو، اس طرح کہ تمہاری نگاہیں بے حجابانہ طور پر پردۂ سیمیں کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ اور میں بیباکی کے ساتھ تمہارے رُخِ انور سے لذتِ دید حاصل کر رہا تھا۔ میں نے نہ ان متحرک تصاویر پر نظر ڈالی۔ نہ مکالمے کے کسی لفظ کو سُنا۔ پھر بھی میں اس سے بخوبی محظوظ ہوا۔ اس لئے کہ تم اس سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ میں تمہارے ان تاثراتِ قلبی کا بنظرِ عمیق مطالعہ کر رہا تھا جو فلم کی لطافتوں سے تمہارے دل کی اس دھک دھک کو سُن رہا تھا جو جوشِ مسرت کی فراوانی سے پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے وہ تماشہ دیکھا تمہاری نگاہوں سے اور کانوں کو سُنا تمہارے کانوں سے۔ اور وہ محویت اس قدر مدہوش کن تھی کہ جی چاہتا تھا کہ اسی حالت میں بیٹھا رہوں۔ خواہ اس دوران میں قیامت ہی شروع ہو کر ختم ہو جائے۔ صرف یہی وہ سرمایۂ نشاط تھا جس کی بناء پر میں کہتا ہوں کہ صنعتِ فلم سازی کی دُنیا میں "کاشمیرا" بہترین نمونۂ فن ہے۔

خدا شاہد ہے کہ تمہارا اولین مکتوبِ محبت میری رُوح کی حسرت نصیب خلوتوں میں حرزِ جاں بنا ہوا محفوظ ہے۔ اور اکثر راتوں کے اس خاموش سناٹے میں جو ایک پرسکوت پیغام ہوتا ہے اس امر کا کہ کائنات کا ہر ذرّہ آسودۂ خواب ہو چکا ہے۔ میں اپنی بیداریوں کے چند مضطرب لمحات اُس کے مطالعے میں صرف کر دیتا ہوں۔ اس سنسان عالم میں جب کہ انسان خود اپنے دل کی دھڑکن بھی نہیں سُن سکتا۔ تمہارے رنگین و معطر خط کے وہ دلپذیر نقوش جن کی قسمت میں بظاہر نطق سے محرومی لکھی ہے ایک کلمِ بلیغ بن جاتے ہیں۔ اور میں محسوس کرتا ہوں گویا تم میرے قریب ہی ہو۔ اور ہمارے پُر شباب لب تبادلۂ صہبا میں مصروف ہیں۔

کون کہتا ہے کہ تم مر چکی ہو! ——— تم زندہ ہو۔ کم از کم میرے لئے ضرور زندہ ہو۔ میرے کانوں میں تمہاری آواز گونج رہی ہے۔ کائنات کے ہر ذرّے میں تمہارا متبسم چہرہ جھلک رہا ہے۔ تمہارے سانس کا لمس میں اپنے جسم پر محسوس کر رہا ہوں، اگر یہ سراب بھی ہے تو خدا کرے ہمیشہ قائم رہے۔ میں اس سنہرے گرداب سے نکلنے کی بجائے اس میں غرق ہو جانا چاہتا ہوں کیونکہ زندگی کی معراج یہی ہے کہ وہ فنا ہو جائے۔

اگر تمہارے جسم کے عناصر کی ترکیب عارضی طور پر منتشر ہو گئی ہے، تو ہو جایا کرے۔ اس سے "تم" تو نہیں مر سکتیں۔ تم قائم بالذات ہو۔

یہ ہیں وہ دلخراش نقوش جنکو تمہاری یاد میں خون کے آنسوؤں سے قلمبند کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ان کو بطور ہدیہ نہیں بلکہ بطور خراج تمہاری معصوم روح کے قدموں میں ڈال دوں۔ تمہارے پیارے نام سے معنون کر دوں۔

کیا تم اِس انتساب کو قبول کر لوگی؟

فضلِ حق قریشی دہلوی

خمستان

شاعر

شاعر تو کیا گائیگا کیا سُنائیگا؟

دُنیا میں جب سب لوگ برسرِ کار تھے، اکیلا تو آوارہ لڑکوں کی طرح بھاگ کر میدان میں آیا اور بھری دوپہر میں غم دیدہ درختوں کے سائے میں بیٹھکر دن بھر بانسری بجاتا رہا۔ لعنت، اب تو ٹھہر جا۔

آگ کہاں لگی ہے؟ دنیا کو بیدار کرنے کے لئے کون صور پھونک رہا ہے؟ کس کی فریاد سے فضا گونج رہی ہے؟ کس قید خانے میں پابہ زنجیر دُکھیاری مدد کی طلبگار ہے؟

لاتعداد بےبسوں کے سینوں کا خون توہینِ انسانی کو غسل دے رہا ہے۔ خودغرضی درندگیِ انسانی پر ہنس رہی ہے۔ وہ بے زبان جو سرنگوں کھڑا ہے جس کے اُترے ہوئے چہرے پہ صدیوں کے مظالم کی داستان کندہ ہے، جو چپ چاپ ہر قسم کے بار کو اٹھائے چلا جا رہا ہے اور پشت در پشت اس بارِ مصیبت کو ورثہ میں چھوڑ جاتا ہے ــــ وہ قسمت کا گلہ گزار نہیں ہے۔ نہ دیوتاؤں کو کوستا ہے اور نہ انسان کی شکایت کرتا ہے۔ جو کام کرنے کیلئے زندہ رہتا ہے اور زندہ رہنے کیلئے دو مٹھی اناج کے سوا کچھ نہیں چاہتا اور جب اس مایۂ حیات کو بھی کوئی چھین لیتا ہے، جب کوئی فرعون اُسکے اس اثاثہ پر بھی دست درازی کرتا ہے تو وہ بدبخت غریبوں کے خدا کو پکار کر جان دے دیتا ہے۔

اِسی حسرت نصیب کو قوتِ گویائی بخشتا ہے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دل میں اُمید کا دیا جلاتا ہے۔ اُسے پکار کر کہتا ہے کہ چشم زدن کے لئے سربلند ہو جا اور پھر دیکھ کہ جس ظالم کے خوف سے تو لرزہ براندام ہے وہ تجھ سے کہیں زیادہ بُزدل ہے۔ جیسے ہی تو جاگے گا وہ راہِ فرار اختیار کرے گا۔ تیرے سامنے آتے ہی وہ راستے کے کتے کی طرح دُم ہلانے لگیگا۔ خدا اس کا دشمن ہے۔ وہ بے یار و مددگار ہے، اسکی چرب زبانی پر نہ جا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی ذات پر نادم ہے۔

اے شاعر، اگر تیرے دل میں ذرا بھی احساس ہے تو اسے اپنا تمنا بنا اور اپنی زندگی اس پر قربان کر۔ غم و اندوہ کی انتہا نہیں اور اس سیاہ خانے کی تاریکی اور بدنصیبی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ روٹی، زندگی اور روشنی کی ضرورت ہے۔ صحت، علم اور آزادی سے دُنیا کو مالامال کرتا ہے۔ اے شاعر، افلاس کی ظلمت میں ایک بار جنت کے ہوشربا نظاروں کے دروازے کھول دے۔

(ٹیگور)

اختر رائے پوری

عورت کی قسمت

ہر ہستی کی قسمت میں یہی لکھا ہے ـــ ہر عورت کیلئے مقسوم ہو چکا ہے ــــ

کہ کسی پر اپنی روح کے خزانے فدا کر دے اُس شخص پر جو اُس کی ساری دولت لے لیتا ہے

لیکن، اسکا عشق نہ ہی واپس نہیں دیتا، کل دولت کا تو ذکر ہی کیا۔

جب میں تمہاری آنکھوں پر اپنی نظریں جما دیتی ہوں اور منتظر رہتی ہوں ــــ

اپنی محبت بھری نظروں اور پُرمحبت لمس کے جواب کی تو میں محسوس کرتی ہوں کہ اس سے زیادہ بدنصیبی اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ کسی سے شدید ترین محبت کی جائے۔

کیا تم رحمدل نہیں ہو؟ ہاں تم بہت مہربان ہو۔ تمہیں میرے آرام کا
اس قدر خیال رہتا ہے اور تم اس قدر سچے ہو۔
ہاں ہاں میرے محبوب مگر میں دیکھتی ہوں اور ڈرتی ہوں کہ
تم مجھ سے اتنی قدر محبت نہیں کرتے جس قدر کہ میں تم سے کرتی ہوں۔

محبت کا ایک لفظ اور ایک طویل بوسہ،
میری زندگی کو موسیقی سے اور گیتوں سے بھر دے گا۔
اور اگر تم ذرا بھی بے توجہ ہوئے جو یا میں تمہارے نغمۂ دل کو نہیں
سن سکی تو
میری کائنات درہم برہم ہو جاتی ہے۔

اکثر اوقات تم مجھے بچہ سمجھنے لگتے ہو — کمزور۔
مثلاً جب کسی معمولی سے لفظ پر میری آنکھوں سے آنسو جاری
ہو جاتے ہیں۔

تم نہیں سمجھ سکتے کہ تم جو کچھ کہتے ہو اس میں میرے غریب دل کی
گہرائیوں تک کو ہلا دینے کی کسقدر ضرورت ہوتی ہے۔

میں اس پر مجبور ہوں میرے پیارے۔ کاش مجھے اس پر قابو ہوتا۔
یا بجائے پرستش کرنے کے میں بے توجہی کا اظہار کر سکتی۔
کیونکہ اگر تمہیں یہ معلوم ہونے لگے کہ میں تم سے کم محبت کرتی ہوں
مردوں کی طرح،
(مجھے اس بات میں شبہ نہیں ہے) تم مجھ سے زیادہ محبت کرنے
لگو گے۔

محبت سے کبھی رو گرداں نہ ہونے والا دل۔ ایک خطرناک تحفہ
ہے۔ جیسے بہت راگ گائے جا چکے ہیں — کیونکہ وہ ان کے واقعات
ثابت کرتے ہیں کہ بات سے نہ کہہ سکے۔ لے لو تمام غم کے ڈنک چبھتے
رہتے ہیں اور جن کی محبت استوار نہیں ہوتی ان سے زیادہ خوش قسمت کی
بیاتی ہے۔

(ای۔ ڈبلیو۔ ولکاکس)

شاہد

سرگوشیاں

بجلی بے چاپ ہے۔
لیکن جب وہ ہرے بھرے درخت پر گرتی ہے تو اسے ٹھنڈ بنا جاتی ہے!
محبت میرے دل میں بجلی کی طرح آئی،
اور امید و دل آویز حوصلوں کی سرسبز ٹہنیوں کو جھلسا گئی۔
اور اب میرا دل بے برگ، خشک، جھلسا ہوا دل،
خوشیوں کی پُر سرور بارش سے،
غموں کے رنجدہ گرم جھونکوں سے،
متاثر ہوئے بغیر،
چپ چاپ کھڑا ہے!

تنہائی میں — میرے خیالات،
عجیب پُراسرار خیالات،
مجھے بے حد خوفزدہ کر دیتے ہیں!
میں ہنگامے میں، ہجوم میں،
بھاگ جاتا ہوں — ان سے بچنے کے لئے!

جبتک روشنی پاس ہوتی ہے ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا!
لیکن جب وہ ہٹ جاتی ہے اور تاریکی ہمیں گھیر لیتی ہے،
تو ہم اس کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں ... ...
ہم یکجا تھے — میں تمہارے ساتھ کھیلتا رہا، ہنستا رہا!

اب کہ تم چلی گئیں — تنہائی مجھے ستا رہی ہے،
میں تمہارے لئے رو رہا ہوں!

معصومیت کے دُھندلکے میں — میں نے ایک خواب دیکھا،
درخشاں کارناموں سے بھرے ہوئے شباب کا،
پُرسکون، مطمئن پیری کا! ——
آہ! لیکن اس وقت اس زریں خواب کی بربادی پر آنسو بہا رہا ہوں!

نفس کی ایک پھونک نے،
محبت کی جھلملاتی شمع کو ٹھنڈا کر دیا!
میں گناہ کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہوں،
دیوی! — اپنے [illegible] معصوم کی سوال کرتا ہوں —

میرا چراغ پھر روشن کر دے!

گناہ کی سیاہ بدلیوں میں سے،
نیکی اور معصومیت کی کرنیں،
کبھی کبھی میری تاریک دنیا پر بھی چمک جاتی ہیں!

گھاس کی پتیوں پر گرتے ہوئے اوس کے ننھے قطرے،
سورج کی روشنی میں جواہرات کے ٹکڑوں کی طرح جگمگاتے ہیں!
ایک بیچاری کمزور چھوٹی روح بھی،
کسی ارفع و بلند ہستی کے پر تو سے،
چمک سکتی ہے!

تمنائی

محافظ غصہ میں تھپیڑوں اور گھونسوں سے اس کی تواضع کر رہے تھے ۔

"رسیاں کھول دو" شہنشاہ نے حکم دیا ۔

شہزادہ آزاد کر دیا گیا ۔ اس نے لوگوں پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالی تکلیف سے اس کا حسین چہرہ کمہلا سا گیا تھا ۔ تماشہ بین اس کی بوٹیاں نوچنے پر کمربستہ نظر آ رہے تھے کشمکش بڑھتی جا رہی تھی شہنشاہ کچھ حکم دینے کے لئے مڑا ۔ سنزیا نے اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر نزدیک کے ایک فرد کی ننگی تلوار چھین لی ۔ چشم زدن میں ملکہ کے خیمہ میں غائب ہو گیا ۔

ایک ہلکی سی چیخ سنی گئی ۔ تاتاری شہزادہ سنزیا فوراً مسکراتا ہوا خیمہ سے باہر آمد ہوا ۔ خون کے قطرے اس کی تلوار سے ٹپک رہے تھے ۔ لیکن غصہ سے بھرے ہوئے سپاہی اور امراء کی ذرا سی جنبش سے بھی قبل شہنشاہ کی خون آشام تلوار سنزیا کے جسم کو کئی حصوں میں تقسیم کر چکی تھی ۔ آفتاب اپنی پہلی کرن سے ان گنہگاروں پر نفرت کی بارش کر رہا تھا ۔

شہنشاہ اس روز دن بھر خیمہ سے باہر نہ نکلا ۔

تاریخ کہتی ہے کہ چین کے شہنشاہ یونسونگ اعظم نے اس واقعہ کے بعد کبھی تلوار نہیں چھوئی ۔

ریار کر دلیں

شمسی کاکوی

خمکدہ

ترے جو حسن سے بانکل نقاب اٹھا ۔۔۔ سکون قلب کو برباد کر حجاب اٹھا

[illegible] اٹھا ۔۔۔ یہ کس کے حسن دل افروز کا نقاب اٹھا

[illegible] خانماں خراب اٹھا ۔۔۔ لب نقاب کو جنبش ہوئی نقاب اٹھا

نیاز [illegible] وہ ہونٹ کو تعال ۔۔۔ حیات و موت کا جھگڑا مٹا حجاب اٹھا

یہ کس حسین نے انگڑائی لی سوئے مشرق ۔۔۔ یہ کس کے دیکھنے کو فرق آفتاب اٹھا

تمام اہل وفا ہو نہ جائیں خاکستر ۔۔۔ خدا کے واسطے رخ سے نہ اب نقاب اٹھا

پھنسا ہوا دیکھاں ابن وآں کے جھگڑوں میں ۔۔۔ حجاب جزو کل اے بندۂ حجاب اٹھا

وہ چشم مست اٹھی انجمن میں میری طرف ۔۔۔ کہ آج پردۂ تجلی سے ماہتاب اٹھا

کسی کو تاب نظر تھی نہ دین و دل کی خبر ۔۔۔ فضائے دہر میں جب حسن کا نقاب اٹھا

نہ آپ نے کبھی اہل نظر کا حال سنا ۔۔۔ نہ درمیاں سے کبھی پردۂ حجاب اٹھا

تڑپ گئے پھر کبھی موسیٰ نفس کی حسرت پر ۔۔۔ الٰہی خیر یہ کیوں بے سبب نقاب اٹھا

یہ ذرے ذرے کی بیتابیاں معاذ اللہ ۔۔۔ کہ آج حشر کی صورت وہ مست خواب اٹھا

بہت خمار کو امید دید میں رکھا

ترے نثار مری جان اب نقاب اٹھا

خمار دہلوی

نقد و تبصرہ

مُنتخب افسانے:- جناب عبدالرزاق (جو ادبی دنیا میں ملیح آبادی کے نام سے مشہور ہیں) نے مشرق و مغرب کے بہترین مختصر افسانوں کے تراجم کا مجموعہ اس نام سے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں (۴۸) افسانے ہیں اور سب اس لائق ہیں کہ غور سے پڑھے جائیں جناب ملیح آبادی اس کتاب کے دیباچے میں فرماتے ہیں:۔

"ہمارا موجودہ علمی ادبی دور، ترجمہ کا ہے نہ کہ تصنیف کا.......اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی ذہنی خدمت یہ ہے کہ آزاد قوموں کا بہترین لٹریچر ملکی زبان میں منتقل کر دیا جائے"

اس رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ غیر ملکی زبانوں میں اتنا عمدہ لٹریچر موجود ہے کہ اگر اُسے اُردو میں منتقل کر دیا جائے تو ہماری زبان مالا مال ہو جائے۔ ہمیں اس وقت تراجم کی ضرورت زیادہ ہے اور تصانیف کی کم۔ نئے نئے خیالات اور نئے نئے اسالیب بیان اردو میں اسی طرح رائج کئے جا سکتے ہیں کہ غیر زبانوں سے تراجم کئے جائیں اور اُن کی تمام خوبیاں اپنی زبان میں جذب کر لی جائیں۔ ملیح آبادی صاحب نے اس مجموعہ میں جرمنی، فرانس، روس، سوئڈن، اٹلی، مصر، ترکی، یوگوسلاویہ، پولینڈ، ناروے، انگلینڈ اور امریکہ کے منتخب فسانوں کے سلیس و فصیح تراجم پیش کئے ہیں۔ ان میں سے اکثر جرائد و رسائل میں شائع ہو کر قبولیت خاص و عام حاصل کر چکے ہیں۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ضخامت ۵۱۲ صفحات۔ سائز ساقی کا نصف۔ قیمت ایک روپیہ بہت کم ہے۔ منیجر ہند بک ایجنسی۔ ۲۰۱ لے چیتر نجن ایوینو۔ کلکتہ سے طلب کیجئے۔

ادبی دُنیا کا ڈرامہ نمبر لاہور کے مشہور رسالہ "ادبی دُنیا" کا ڈرامہ نمبر جون کے آخری ہفتے میں شائع ہوا ہے۔ منصور احمد صاحب کی ادارت میں ادبی دنیا نے لائق رشک ترقی کی ہے اور اس پرچے پر صحافتِ اُردو ناز کر سکتی ہے۔ سالنامے کی کامیاب اشاعت کے بعد "ڈرامہ نمبر" ادبی دُنیا کا دوسرا شاندار کارنامہ ہے۔ سرورق سہ رنگا اور نہایت دلکش۔ مضامین کے اعتبار سے اس سے بہتر خاص نمبر شائع کرنا مشکل ہے۔ ڈرامہ اور اُس کے متعلقات پر جو علمی و تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں اس لائق ہیں کہ ان کا مطالعہ بار بار کیا جائے۔ جناب عطاء اللہ کلیم۔ ایم۔ اے کا بسیط مضمون "ڈراما کے ڈھائی ہزار سال" بہت کاوش و تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اور ڈراما نمبر میں اگر صرف یہی ایک مضمون شائع ہوتا تب بھی یہ خاص نمبر کامیاب کہلانے کا مستحق ہو جاتا۔ علامہ کیفی دہلوی کا مضمون بھی قابل قدر ہے مگر پنڈت جی جیسے محقق سے ہم اس سے بھی زیادہ کے متوقع تھے۔ بعض اصطلاحات کے تراجم بھی مناسب نہیں معلوم ہوتے مثلاً اسٹیج کو تختہ اور اسکرین کو چادر کہنا طبیعت کو ناگوار گذرتا ہے۔ تختہ اور چادر دونوں چیزیں اصطلاحاً مفرد دل سے متعلق ہو چکی ہیں۔ اگر اُردو میں بھی اسٹیج اور اسکرین ہی مستعمل ہوں تو کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ اسی طرح کا ترجمہ "نشستانہ" سے بہتر "لیس منظر" موجود ہے۔ علامہ موصوف نے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ لائق غور و عمل ہیں۔ تراجم میں جرمنی، انگریزی، سینی، جاپانی، روسی، فرانسیسی اور امریکن زبانوں کے بہترین ڈراموں کے شستہ و رفتہ تراجم شامل ہیں۔ پانچ طبعزاد ڈرامے بھی شائع کئے گئے ہیں جن میں آغا حشر مرحوم کے ایک ڈرامے کا ایک سین بے مثل ہے۔ چند نظمیں، رباعیات و قطعات بھی شریک اشاعت ہیں جن میں علامہ اقبال، حفیظ جالندھری اور آغا حشر مرحوم کا کلام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ڈرامہ نمبر کی ضخامت (۱۳۰) صفحات ہے۔ بیس رنگین اور سادہ تصاویر بھی اس میں شامل ہیں۔ قیمت صرف ۱۲ر تجویز کی گئی ہے جو بہت کم ہے۔ منصور احمد صاحب کی سعی و کاوش مشکور ہے کہ اتنا اچھا خاص نمبر اتنے سستے داموں شائقین کو دیا جا رہا ہے۔

الاطفال رسالہ ہمدرد صحت دہلی دو سال سے جاری ہے اور اپنے بلند پایہ اور مفید طبی مضامین کی وجہ سے اردو پڑھنے والوں میں بہت مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ حکیم عبدالحمید صاحب کی نگرانی میں اس پرچے نے اپنی ارتقائی منازل نہایت سُرعت سے طے کی ہیں اور طبی پرچوں میں اگر اسے سب سے عمدہ اور سستا رسالہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ہمدرد صحت کا اعادۂ شباب نمبر شائع ہوا تھا اور ملک نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جولائی میں اس کا ایک اور خاص نمبر "الاطفال" کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں بچوں کی نفسیات، بچوں کے امراض اور اُنکے علاج، بچوں کی جسمانی و دماغی تربیت، بچوں کا رکھ رکھاؤ اور اُن کی دیکھ بھال کے متعلق مشہور ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں کے مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ یہ مضامین سلیس اور عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں۔ چند افسانے اور نظمیں بھی شامل ہیں مگر ان میں بھی بچوں کے کسی اصلاحی پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ صوری لحاظ سے بھی یہ خاص نمبر بہت خوب ہے۔ کل تصاویر کی تعداد (۳۲) ہے جن میں بلاک اور لیتھو دونوں قسم کی تصاویر شامل ہیں۔ افادی حیثیت سے "الاطفال" اس لائق ہے کہ ہر گھرانے میں اس کی ایک کاپی رکھی جائے۔ "الاطفال" کی قیمت بھی کم تجویز کی گئی ہے۔ قسم اعلیٰ کی قیمت ۱۲ر اور معمولی ایڈیشن کی ۸ر۔ ضخامت (۲۰۸) صفحے۔ چندہ سالانہ عہ۔ دفتر ہمدرد صحت دہلی سے طلب کیجئے۔

عزیز کالج میگزین — یہ کالج کا ایک رسالہ شائع ہوتا ہے۔ عزیز کالج میگزین کئی چند سال سے شائع ہو رہا ہے۔ گذشتہ ایک سال میں اس کے کئی بہت اچھے اچھے پرچے شائع ہوئے [illegible] ۳۹ء کا پرچہ ہے جو ساقی کے مشہور افسانہ نگار جناب صادق الخیری [illegible] کے لحاظ سے اس کا معیار بلند ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لائق مدیر نے اس پرچے کو [illegible] مضامین حاصل کر کے اس پرچے کو چار چاند لگا دئیے ہیں۔ [illegible] ان کا خاص [illegible] پرچے کی ضخامت (۱۴۸) صفحے ہے۔

[illegible]

مکتوبات نیاز — مجموعہ ہے جناب نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار کے [illegible] جو وقتاً فوقتاً انھوں نے اپنے احباب کو لکھے۔ نیاز صاحب مشہور انشا پرداز ہیں [illegible] نگار کے مالک [illegible] ادبی رسالوں [illegible] لٹریچر کو ایک نئے مذاق سے آشنا کیا ہے ہیں اور آپ کی تحریریں [illegible] پڑھنے والے کے دل میں گھر کر لیتی ہیں۔ مکتوبات نیاز میں آپ کی بے تکلف بے ساختہ قلم دیکھنے کی [illegible] اس کتاب کے مطالعہ سے وہ کیف حاصل ہوتا ہے [illegible] ایک نیازی [illegible] خطوں میں بیان ہوتی ہے کہیں نصیحت ہے کہیں تضحیک کہیں سنجیدگی ہے کہیں شوخی [illegible] کہیں شدت غم کہیں [illegible] غالب [illegible] شراب ناب سے [illegible] رنگ کی اپنے پیالے ہیں۔

غالب کے خطوط کے بعد نیاز کے خطوط ہی ہیں وہ پہلے خطوط ہیں جو [illegible] نیاز صاحب کے ناقد معتقدات سے ہمیں اتفاق نہیں اور اس کتاب میں [illegible] کچھ اختلاف ہیں [illegible] شوخی بھی [illegible] لیکن نہ اس قدر ہے مگر ان کی تعداد اس قدر کم [illegible] صفحات [illegible] نیاز صاحب کی [illegible] تصویر ہے [illegible] کا عکس [illegible] کتاب مجلد ہے۔ قیمت [illegible] نگار بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب کی جا سکتی ہے۔

سلسبیل — جناب آل احمد صدیقی [illegible] کلام اس نام سے شائع ہوا ہے۔ ابتدا میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے [illegible] لکھا ہے۔ اس [illegible] چیدہ چیدہ اشعار چن لیے گئے ہیں لہٰذا پڑھتے وقت [illegible] آتی ہے اور عبرت بھی حاصل ہوتی ہے [illegible] مناظر فطرت سے [illegible] بیشتر نظمیں کہی ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے ان کے اشعار میں اثر ہے۔ اس مختصر سے مجموعے میں [illegible] غزلیں بھی [illegible] جیسے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہے خود محسوس کر کے کہا ہے۔ خیالات میں بلندی، جذبات میں روانی [illegible] کے ولدادہ ہیں (جیسا کہ ہر نوجوان کو ہونا چاہیے) مگر ان کے کلام میں وہ بے راہ روی اور خود سری نہیں ہے جو کہ آج کل کی جدید شاعری کی ہے مگر [illegible] اوزان و تقطیع کے تجربوں اور قیود سے [illegible] سرور صاحب نے تین سال کے مختصر عرصے میں جو کچھ کہا ہے اسے سلسبیل کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ ضخامت ۱۱۱ صفحات۔ قیمت ۱۲ [illegible]

ملنے کا پتہ: مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڑھ۔

"شاہد"

پانچ سو روپیہ ماہوار

اگر کمانا چاہو تو ہم سے صابون بنانا سیکھو۔ فیس [illegible] روپیہ کے بجائے پندرہ روپئے ہیں [illegible] صابون کی ٹکیہ بنانے کی [illegible] مشین [illegible] ہمراہ مفت مگر نام چھپی ہوئی [illegible] روپیہ علیحدہ ہوگی۔ صابون کی ترکیب اور مشین کے ہمراہ ہم اقرار نامہ بھی روانہ کرینگے جس پر لکھا ہوگا اگر ہم بذریعہ تحریر یہ ثابت کر دیں کہ [illegible] طریقوں سے بغیر چربی ۴ قسم کا صابون مثل ولایتی کے سوڈا کاسٹک، سوڈا کرسٹل اور ڈی [illegible] کے مانند کوٹے کھدر کو سفید کرنے کا مصالحہ بنانا نہ سکھا سکے یا اس میں دوگنا منافع نہ ہوا یا [illegible] برس کا لڑکا پانچسو روپے کا مال تیار نہ کر سکے یا مشین میں ایک دن میں [illegible] تک [illegible] کی ٹکیہ نہ بن سکے تو صاحب پانچسو روپے جرمانہ بذریعہ عدالت ہم سے وصول کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ پانچ روپیہ پیشگی وصول ہوئے بغیر تعمیل نہ ہوگی۔ المشتہر — ڈاکٹر شفیع احمد، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ایڈیٹر رسالہ دستکاری دہلی

بیٹوں میں تقسیم کیا۔ (زمین یا ملک کی تقسیم ممکن نہ تھی کیونکہ رعایا خانہ بدوش تھی۔ پس بجائے زمین اور ملک کے رعایا تقسیم کی گئی۔) اس موقع پر اور ایسے ہی اور موقعوں پر چنگیز خاں نے اس رسم و رواج کی پابندی کی جو خانہ بدوشوں میں قدیم زمانے سے چلے آتے تھے۔ یہ وہ جانتا تھا کہ سلطنت کے حصے کرکے ان حصوں کو اپنے عزیزوں میں بانٹ دینے سے سلطنت کے واحد اور سالم رہنے میں کوئی فرق نہ آئیگا کیونکہ کل سلطنت خاقان کے آہنی پنجے میں تھی۔ اور یاساق جاری تھا۔ جس میں کسی قسم کی بدنیتی ممکن نہ تھی۔ سلطنت کے اجزا اپنے عزیزوں کے ساتھ مخصوص کرنے میں چنگیز خاں نے کاہستانوں کی امرائی طرز حکومت کی پابندی کی۔ اور اس بات پر زور دیا کہ اسکی سلطنت بالخصوص اس ایماق کے لئے ہے جس کا وہ خود ایک رکن ہو۔ جب جوجی لڑائی سے واپس ہوا تو چنگیز نے اس سے کہا کہ میری اولاد میں تم سب سے بڑے ہو اور میرے فرزندوں میں تم ہی سب سے پہلے لڑائی پر گئے تھے۔ اور بغیر لشکر کو خستہ کئے تم نے تمام صحرائی قوموں کو مغلوب و محکوم کیا۔ پس میں انہی قوموں پر تمکو مسلط کرتا ہوں۔

چنگیز خاں کی عمر اس وقت ۵۰ برس سے کچھ زائد تھی۔ نہایت توانا تندرست تھا اور اپنے مستقبل پر بڑی امید اور اطمینان سے نظر ڈالتا تھا اور اس بات کا یقین دل میں تھا کہ تنگری قوت اسکی مدد پر ہے اور اس کی مرضی یہی ہے کہ چنگیز خاں اور اسکی قوم کو تمام دنیا پر قبضہ دے۔

کوکچو شاماں سے نزاع

چنگیز خاں مذہبی طبیعت بھی رکھتا تھا بلکہ وہم پرست بھی تھا۔ مغلوں کا ابتدائی مذہب بھی ایسا تھا جس میں وہم پرستی کو بڑا دخل تھا۔ یہ خواہش بلکہ اس بات کی ضرورت کہ تنگری (آسمان) کی مشیت یا ان ارواح کی مرضی اور منشا دریافت ہوجائے جو مغلوں کی نگہبان تھیں اس امر کی ترغیب دیتی تھی کہ شامانوں، ساحروں اور فالگیروں سے آئندہ کے حالات دریافت ہوتے رہیں لیکن ان باتوں میں بھی جیسا کہ اور باتوں میں حال تھا چنگیز خاں ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھا۔ اور اس نے اپنی طبیعت کی آزادی کو برقرار رکھا۔ یہ کام اسکے لیے آسان نہ تھا۔ کیونکہ اس میں اس وہم پرستی سے اسکو کشمکش کرنی پڑتی تھی جو بچپن سے اس کے دل میں بیٹھی تھی۔ یہاں ہم جس واقعہ کا ذکر کریں گے اسکو اسی وہم پرستی کے خوف سے تعلق ہے۔ اس واقعہ کے گذر جانے کے بعد بھی چنگیز خاں شاماموں اور ساحروں سے اکثر آئندہ کے حالات دریافت کرتا رہا مگر ایک خاص حد سے زیادہ اپنی طبیعت کو ان چیزوں سے متاثر نہ ہونے دیا۔ اگر دیکھا کہ کسی ساحر یا شامان کا کہنا یا خود اپنا وہم عقل کے خلاف ہے یا دیکھا کہ جو منصوبے اس نے سوچے ہیں اور جو اسکو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں وہ تلف ہوتے ہیں تو پھر وہ کسی کا کہنا یا اپنا وہم ہرگز نہ مانتا تھا۔ اور وہ کبھی کسی ایک خیال کا پابند ہوکر رہنا نہ جانتا تھا۔ مقصد اور ارادے میں یہ مغل فولاد سے زیادہ سخت تھا اور وہم پرستی جس میں وہ اپنی قوم کے ساتھ شریک تھا اسکو باطل کر دینا بھی اسے خوب آتا تھا۔

منلیک جسے یسوکائی بہادر نے مرتے وقت اپنے خاندان کی نگہداشت سپرد کی تھی سات جوان بیٹوں کا باپ تھا۔ ان بیٹوں میں سے ایک جس کا نام کوکچو تھا مشہور و معروف شامان ہوا۔ کوکچو کے علاوہ اسکو تب تنگری بھی کہتے تھے۔ تب تنگری کے معنی آسمان یا عرش کے ہیں۔ کوکچو کسی سے کم رہنا نہ چاہتا تھا چونکہ اس خاندان کو چنگیز خاں سے قریب کا تعلق تھا اس لئے کوکچو کو طبقۂ امرا میں شامل کئے جانے کا ایک طرح پر حق حاصل تھا۔

کوکچو کی بڑی خواہش یہ تھی کہ جس قدر اختیارات ایک شامان کو حاصل ہوسکتے ہیں وہ سب اسکو حاصل رہیں۔ اور روحوں سے بات کرنیکی قوت بھی قائم رہے۔ اور معاملات سیاست میں بھی چنگیز خاں پر اپنا اثر پہنچانے کا شوق جاری رہے۔ ممکن ہے کہ اس سے بھی بڑھکر کوئی بات اسنے سوچ رکھی ہو۔ کیونکہ امرا میں اس کا رسوخ زیادہ ہو چلا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ چنگیز خان کے بھائی قستار سے جو بڑا پہلوان تھا تب تنگری

دوڑکر چنگیز خاں کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "روح نے تب تنگری کا ایک حکم ظاہر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے تموچن سب قوموں پر حکومت کریگا اور اُس کے بعد اُس کا بھائی قسار حکومت کریگا۔ اگر تم نے قسار کا کام تمام نہ کیا تو پھر تمہاری حکومت کو خطرہ ہے۔" تب تنگری کی یہ چال چل گئی۔ اور اسکے الفاظ نے چنگیز پر وہی اثر پیدا کیا جو اثر وہ پیدا کرنا چاہتا تھا کیونکہ چنگیز اپنی حکومت میں کسی قسم کی کمی گوارا نہ کرسکتا تھا چنانچہ اسی شب کو چنگیز خاں قسار کے پاس آیا اور اسکی مشکیں کس کر اسکی ٹوپی اور پیٹی اتار لی۔ ٹوپی اور پیٹی کے اتار لینے کے معنی یہ ہوتے کہ اب وہ آزاد آدمی نہ رہا۔ بلکہ قیدی ہوگیا۔ اب چنگیز نے قسار سے جرح شروع کی مگر اتنے میں ان دونوں کی بڑھیا ماں اولون یکایک آن موجود ہوئی۔ اُسکے نوکروں نے اِس ماجرے کی اطلاع اُسکو کر دی تھی۔ اولون نے آتے ہی قسار کی مشکیں کھولیں اور اسکو اسکی ٹوپی اور پیٹی اٹھا کر دی۔ اور زمین پر بیٹھکر اپنی دونوں چھاتیاں کھولیں اور نہایت غیظ وغضب میں کہا: "دیکھو انہیں چھاتیوں سے تم دونوں نے دودھ پیا ہے۔ قسار سے ایسا کیا گناہ سرزد ہوا ہے کہ تموچن تو اپنے ہی خون و پوست کی جان لینے کو تیار ہوگیا جب تو بچہ تھا تو تو نے صرف ایک چھاتی سے دودھ کھینچ لیا تھا۔ دوسری چھاتی کا دودھ کاچیون اور اتچیکن نہ کھینچ سکے لیکن قسار نے دونوں چھاتیوں سے دودھ کھینچکر دودھ کی زیادتی سے مجھے نجات دی۔ تموچن کو خدا نے کمال بخشا ہے لیکن قسار میں طاقت جسمانی اور تیراندازی کا ملکہ موجود ہے۔ تموچن ہمیشہ جب کبھی تیرے خلاف تیرے دشمن اٹھے تو اسی قسار نے تیر وکمان سے اُن کو مغلوب کیا۔ جب سب تیرے دشمن مر گئے تو اب قسار کی ضرورت تجھے نہ رہی۔" چنگیز خاں ماں کی اِس تقریر کو سنکر بہت شرمندہ ہوا۔ پھر بھی قسار کے ملازموں میں اس نے تخفیف کر دی۔

غرض اس طرح اولون کے بیچ میں پڑ جانے سے کوکچو کو بھائیوں کے فساد ڈلوانے میں کامیابی نہ ہوئی۔ اگر وہ کامیاب ہوجاتا تو چنگیز خاں بہت ہی الجھنوں میں پڑ جاتا۔ اور اسکو ذلت بھی اٹھانی پڑتی۔ باوجود اس ناکامی کے کوکچو چنگیز خاں کے پاس روزانہ آکر ملکی معاملات میں طرح طرح کے مشورے اسکو دیا کرتا۔ غرض اس شامان کا اثر اور اقتدار روز بروز بڑھتا گیا۔ اُمرا میں اس کے ارادتمند بہت پیدا ہو گئے اور یہ لوگ کوکچو کو وہم اور خوف کے ساتھ دیکھتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ رعایا بجائے اپنے آقاؤں کی اطاعت کرنے کے کوکچو کی زیادہ مطیع اور تابعدار معلوم ہونے لگی۔ اب کوکچو نے اپنے بھائیوں کی پشت گری سے چنگیز خاں کے عزیزوں سے اور بھی گستاخانہ انداز اختیار کیا۔ حتیٰ کہ چنگیز خاں کے چھوٹے بھائی اتچیکن کو اُسکے منہ پر ہتک آمیز الفاظ کہے۔ اب لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ چنگیز خاں کی بیوی بورتہ نے ایک دن شوہر سے کہا کہ: "اگر یہ لوگ اس کوشش میں ہیں کہ تمہارے سرو قد بھائیوں کو ہلاک کر دیں تو پھر تمہارے جینے سے کیا حاصل۔ دُنیا کے لوگوں کا حال تو اُڑتی چڑیوں کا سا ہے کہ جدھر کی ہوا ہوئی اُدھر ہی پرواز کرنے لگیں۔ وہ تو جنگل کی اونچی گھاس کی طرح ہیں کہ جدھر کو ہوا کا جھونکا آیا اُدھر ہی جھک گئی۔ جب تم نہ ہوگے تو تمہاری اولاد کو یہ لوگ کیا مانیں گے۔"

اب چنگیز خاں کو خیال ہوا کہ کوکچو کی ان باتوں کو برداشت کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اُسکے شامان ہونے کا خوف دل سے دور ہوا اور اپنے چھوٹے بھائی اتچیکن سے جسکی توہین کوکچو نے کی تھی کہا کہ آج جسوقت تب تنگری یہاں آئے تو تم جو کچھ تمہارے جی میں آئے اُسکے ساتھ کرنا۔

تھوڑی دیر میں جب تب تنگری مع اپنے باپ اور بھائیوں کے چنگیز خاں کے سامنے آیا تو اتچیکن نے دوڑ کر تب تنگری کی گردن پکڑ لی چنگیز خاں نے اتنا دیکھتے ہی کہا کہ اگر کشتی لڑنی ہے تو باہر جا کر لڑو۔ اِس پر دونوں گتھے ہوئے خیمے کے دروازے سے باہر آئے۔ یہاں تین بڑے طاقتور آدمی پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے تب تنگری کو پکڑکر زمین پر ایسا پٹکا کہ اسکی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ (اور وہ ختم ہوگیا) اب اتچیکن یہ کہتا ہوا چنگیز خاں کے خیمے میں آیا کہ تب تنگری مجھ سے کشتی لڑنی نہیں چاہتا کشتی لڑنے کی جگہ وہ زمین پر لیٹ گیا ہے اور اٹھتا نہیں منلیک تب تنگری کا باپ اتنا سنتے ہی اصل معاملے کو سمجھ گیا۔ اور اُسنے رو کر چنگیز خاں سے کہا کہ خاقان میں اِسوقت سے آپ کا تابعدار چلا آتا ہوں جبکہ

آپ کو عروج ہونا بھی شروع نہیں ہوا تھا بس آج کے دن سے میری تابعداری ختم ہوئی۔

اس مشہورِ خلائق شامان کے مرنے سے لوگوں میں بڑا تہلکہ ہوا۔ اس تہلکہ کو رفع کرنے کیلئے چنگیز خاں نے یہ تقریر کی: تب تنگری میرے بھائیوں کو برا کہتا تھا اور بڑی بے انصافی سے ان کی نسبت توہین کے جملے زبان سے نکالتا تھا یہی وجہ ہوئی کہ تنگری نے اپنی نظرِ مہر اس پر سے اٹھالی اور اسکی جان اور جسم دونوں سے وہ بے پرواہ ہوگیا۔"

چنگیز خاں نے شامان کے جسم کا جو ذکر کیا اسکی وجہ یہ تھی کہ وہم پرست مغلوں میں یہ افواہ اڑ چکی تھی کہ تب تنگری کی لاش پر ایک خیمہ نصب کر دیا گیا تھا اور اس خیمے کے روزن سے جہاں سے دھواں نکلتا ہے لاش نکل کر غائب ہوگئی ہے۔ اس تقریر سے چنگیز خاں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ آسمان کی نظرِ لطف و کرم اس پر اور اسکی قوم پر بدستور جاری ہے۔ اور جو شخص مغلوں کے خاقان یا اس کے عزیزوں کے خلاف کھڑا ہوگا اسکو سزا دی جائے گی۔ علاوہ اسکے اس تقریر میں یہ بھی ظاہر کیا کہ ایک شخص شامان ہو کر بھی بے انصافی سے دوسرے شخص کی ہتک اور توہین کر سکتا ہے۔ چنگیز خاں کی یہ تقریر خواہ اسکی طبیعت کی کیسی ہی مقتضی ہو لیکن درحقیقت عوام الناس میں ان لوگوں کے سنانے کیلئے کی تھی جو اس شامان کے بڑے معتقد ہو چلے تھے۔ منلیک سے جو کچھ چنگیز خاں سے کہا اس کا رنگ دوسرا تھا۔ منلیک سے چنگیز خاں نے کہا کہ تم نے اپنے بیٹوں کو کچھ نہ سکھایا۔ تمہارا بیٹا میری برابری کرنی چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اگر مجھکو تمہارا اور تمہاری طبیعت کا یہ حال پہلے سے معلوم ہوتا تو تم سب کا خاتمہ کر کے آج مجھکو مدت گذری ہوتی لیکن اس موقع پر اپنی طبیعت پر ضبط کر کے ظلم و زیادتی سے پرہیز کیا۔ اور منلیک سے کہا اگر کوئی آدمی صبح کچھ کہے اور شام تک اپنی زبان بدل دے یا جو کچھ شام کو کہا ہو صبح ہوتے اس سے پھر جائے تو دنیا کے سامنے اسکو شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں تمہاری موت کا باعث کبھی نہیں ہونا چاہتا۔ بس جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ اس معاملے کو اب ختم ہوا سمجھو۔

تنگوت اور چین سے لڑائیاں

منگولیا کی تسخیر اور ان تمام قوموں اور نسلوں کو جو صحرا کے خیموں میں رہتی تھیں بخوبی تنبیہ کر کے اب چنگیز خاں ان بڑی متمدن سلطنتوں کی طرف جو منگولیا کی بلند زمین سے جنوب میں واقع تھیں متوجہ ہو کر ان کے مقابل آیا۔ یا یہ کہیے کہ چین اور تنگوت (سی ہیا) کی سلطنتوں کے مقابلے پر آمادہ ہوا۔ چین کی دولت جو اسکی شاداب زمینوں اور اعلیٰ تمدن کا نتیجہ تھی ہمیشہ سے شمال کی خانہ بدوش قوموں کی نظر میں ایسی چیز تھی جسکے حاصل کرنے کی ان کو ہمیشہ آرزو رہتی تھی اور اس دولت کو لوٹنے کیلئے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اگر لوٹنے پر بس نہ چلتا تھا تو چین سے تجارت کرتے تھے۔ شمال کی یہ خانہ بدوش قومیں اکثر چین پر ٹوٹ پڑتی تھیں۔ کبھی اسکے شہروں پر قبضہ کیا اور کبھی اسکے بڑے بڑے علاقوں میں آباد ہو گئے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ کوئی صحرائی خاندان جس کی اصل کسی خانہ بدوش قوم سے تھی وہاں بادشاہی کرنے لگا۔ پھر جس طرح وہ سلطنت کا مالک ہوا تھا اسی طرح سلطنت سے محروم نظر آنے لگا۔ یا چین کی تہذیب اختیار کر کے وہاں کی کثیر آبادی میں دریا میں قطرہ کی طرح شامل ہو کر فنا ہو گیا۔ یہی حال چین کی تاریخ میں بار بار پیش آیا تھا۔ اور اب تک پیش آتا ہے۔ صرف واقعات کی تفصیل میں فرق ہوتا ہے۔

چین ان خانہ بدوش قوموں کو جن کے پاس کچھ نہ تھا مقناطیس کی طرح انکو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ ان قوموں کو لوٹ کا شوق دامنگیر تھا۔ شمالی کوہستانوں کی خانہ بدوش قومیں جہاں کسی قدر صاحبِ قوت ہو گئیں پھر وہ چین میں داخل ہو کر تر ک و تاز قتل و غارت کا بازار گرم

کردی تھیں۔ اب چونکہ چنگیز خاں خانہ بدوشوں کا سردار اور خاقان ہو گیا اس لئے اس نے بھی وہی کیا جو اس کے سابقین نے کیا چنانچہ اسکو بھی جنوب کی طرف لوٹنے اور اپنی شان بڑھانے کیلئے جانا پڑا۔

اُس زمانے میں جس سرزمین سے معمولی طور پر چین مُراد لی جاتی تھی وہ تین سلطنتوں میں منقسم تھی۔ یہ تینوں سلطنتیں وسعت میں تقریباً برابر تھیں۔ یہ سلطنتیں حسب ذیل تھیں:۔

(۱) شمال مغرب کا ملک جس میں دشت گوبی کے کچھ حصے جو متصل تھے، شامل تھے، تنگوت کے قبضے میں تھے۔ تنگوت[1] کی سلطنت کا نام ہسی ہیا یا قاشین تھا۔

(۲) جس ملک کو آج کل منچوریا کہتے ہیں اس میں چین خاص کے شمال مشرقی صوبجات کو شامل کرکے جو ملک بنتا ہے اس پر جرچین حکومت کرتے تھے۔ جرچین، منچو تنگیز نسل کے لوگ تھے۔ اور اُن کی سلطنت کا نام فرمانروا خاندان کے نام پر قن (زرین) تھا۔

(۳) چین کا جنوبی حصہ بجائے خود ایک سلطنت تھا۔ یہاں چین کا قومی خاندان سنگ حکومت کرتا تھا۔

چنگیز خاں نے معمولی دور اندیشی سے چین کی لڑائیوں کا سلسلہ پہلے تنگوت پر لشکر کشی سے شروع کیا۔ چونکہ قرابیت، و نائمان اور دوسری منگل قومیں تنگوت سے قریب کا تعلق رکھتی تھیں۔ اس وجہ سے تنگوت کے ملک اور اسکے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ چنگیز خاں نے ان ایغوروں سے بھی اپنے بہت سے کام نکالے نائمان کو فتح کرنے پر چنگیز خاں کی سرحد تنگوت سے آملی تھی۔

سنہ ۱۲۰۵ء میں چنگیز خاں تنگوت کے ملک میں داخل ہوا تنگوت کے لشکر کو شکست دیکر حن سین (لیگ چاؤ) کے شہر تک پہونچا۔ یہاں تنگوت کا بادشاہ رہا کرتا تھا۔ یہاں چنگیز خاں نے اس شرط پر صلح کی کہ تنگوت اسکو سالانہ خراج دیا ہوگا۔ اس صلح کے بعد چنگیز خاں بہت سا مال غنیمت لے کر اپنے چراگاہوں کو واپس آیا۔

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ نائمان پر فتح پانے سے قبل چنگیز خاں کی طرف سے تنگت پر فوج کشی ہوئی تھی۔ اور دوسری لشکر کشی ۱۲۰۷ء میں بیان ہوئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان معرکوں میں چنگیز خاں نے بذات خود کچھ حصہ نہیں لیا تھا اور نہ اُن میں کچھ دلچسپی ظاہر کی تھی۔ بہرکیف ۱۲۰۹ء کی جنگ میں چنگیز خاں کو مال غنیمت بکثرت ملا اور ہسیا کی سلطنت کو اس نے اتنا کمزور کر دیا کہ اب اسکی طرف سے چنگیز کو کسی طرح کا اندیشہ نہ رہا۔ علاوہ اس کے اس لشکر کشی میں چنگیز نے اپنے لشکر کو آزما لیا کہ وہ ایسے دشمن کے مقابلے میں ٹھیر سکتا ہے جس کے پاس قلعے اور فصیلدار شہر ہوں۔

دوسرا بڑا کام جسے چنگیز خاں انجام دینا چاہتا تھا وہ قن کے مقابلہ میں معرکہ آرائی تھی چنانچہ اب اس طرف چنگیز خاں حسب عادت بڑی سرگرمی سے متوجہ ہوا۔ علاوہ ان اغراض کے جن کے لئے شمال کی خانہ بدوش قومیں چین پر یورشیں کیا کرتی تھیں۔ چنگیز خاں کو خاندان قن سے ذاتی طور پر بھی کچھ شکایتیں چلی آتی تھیں۔ قن اپنی سلطنت کی شمالی سرحدوں کو محفوظ رکھنے میں ہمیشہ کوشاں رہے تھے۔ اور انہوں نے کوشش کی تھی کہ اُن کی سلطنت کی شمالی سرحدیں کس طرح محفوظ رہیں۔ اور کوہستانوں کی آزاد قوموں کو چین پر یورشیں کرنے سے روکا جائے۔ خاندان قن کے بادشاہوں کی یہ حکمت عملی ہمیشہ سے چلی آتی تھیں کہ خانہ بدوش قوموں میں ہمیشہ نفاق رکھا جائے۔ اور ان میں ایک قوم دوسری قوم سے ہمیشہ دست و گریباں رہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں کچھ تو ان قوموں میں فساد ڈلوا کر اور کچھ تاتاریوں کی مدد سے قن نے الوس مغل کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اور مغلوں کے دو نامی سرداروں کو اپنے دار الحکومت میں بڑی اذیت دیکر ہلاک کیا تھا۔

---

[1] تنگوت کو تبتیوں سے قریب کا تعلق تھا [2] صوبہ کانسوں میں دریائے ہوانگ ہو پر آباد ہے۔

اب چونکہ چنگیز خاں نے الوس مغل کو پہلے سے بھی زیادہ صاحب قوت اور اقتدار کر دیا تھا اور اسکو ایک بڑی خانہ بدوش سلطنت کا مالک بنا دیا تھا اس لئے ضروری ہوا کہ اپنے بزرگوں پر جو ظلم ہوئے تھے ان کا انتقام لے۔ قن چنگیز خاں کے بدترین دشمن تھے۔ اسکی قوم کے برباد و غارت کرنے والوں میں ان کا شمار تھا۔ پس چنگیز خاں نے چاہا کہ بڑی سختی کے ساتھ ان دشمنوں سے بدلا لے۔ قومی عصبیت اور اپنی قوم کے لئے اپنے فرض منصب کو ادا کرنے کے خیال نے اس سختی پر اور بھی مجبور کیا۔ قن کی سلطنت کو ختم کرنے میں مغلوں کے شرفا اور چنگیز خاں کے عزیزوں کو اپنے نفع کا خیال بھی تھا۔ انہوں نے یہ سوچا تھا کہ چین پر کامیاب ہو جانے کے بعد یورشیں کرنے کی بجائے اب جو فوج کشی وہ کریں گے وہ ایک ملکی خیال کو پیش نظر رکھکر عمل میں آئیگی۔ اس خیال نے چنگیز خاں کی سپاہ پر اچھا اثر کیا ہوگا۔ کیونکہ لشکر کے لوگ اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ اس وقت وہ صرف لوٹ مار کیلئے کسی مہم پر نہیں جاتے ہیں۔ بلکہ اپنے خاقان بدترین دشمنوں اور اپنے الوس کے بڑے بدخواہوں کو سزا دینے اٹھتے ہیں۔ اور یہ خاقان وہ ہے جس نے تمام منتشر گروہوں کو جو سمندروں کے خیموں میں رہتے تھے انکو متفق و متحد کر دیا ہے۔

لیکن صرف یہی خیال چنگیز خاں کو مطمئن نہ کر سکا۔ اس نے ایک مذہبی رنگ بھی اس میں پیدا کیا۔ اس نے سوچا کہ ازلی آسمان (تنگری) اسکی مدد کریگا۔ کیونکہ الوس مغل پر تنگری خاص طور پر مہربان ہے۔ اور خود اسی نے چنگیز خاں کو اس الوس پر سردار مقرر کیا ہے۔ پس آسمان اسکے لشکر کی رہبری اس غرض سے کریگا کہ دشمنوں نے جو جو بدسلوکیاں اسکے ساتھ کی ہیں ان کا انتقام لے کیونکہ جو اس کا دشمن تھا وہ آسمان کا بھی دشمن تھا۔ غرض قن سے لڑائی پر جانے سے پہلے چنگیز خاں نے اپنے خیمے کا دروازہ بند کیا اور اس میں اکیلا ہو بیٹھا۔ اور تین دن تک اسی حال میں رہا۔ خیمے کے گرد سپاہ اور مخلوق کھڑی چیختی تھی تنگری تنگری (آسمان آسمان)۔ چوتھے دن چنگیز خیمے سے باہر نکلا اور لوگوں سے کہا کہ تنگری نے فتح کا وعدہ کیا ہے۔ پس اب چلنا چاہیئے تاکہ قن کو سزا دیں۔

ایک بیان یہ بھی ہے کہ چنگیز خاں ایک پہاڑی پر چڑھا۔ اور وہاں سر سے ٹوپی اتاری۔ اور کمر سے پیٹی کھولکر گردن میں ڈالی اور تنگری سے دعا کی کہ وہ ان بدسلوکیوں کا بدلہ لینے میں اسکی مدد کرے جو قن نے اسکے بزرگوں اور قوم والوں کے ساتھ کی تھیں۔ اور خاصکر امباغائی خاں کو جس اذیت کے ساتھ شہنشاہ قن نے جان سے مارا تھا اسکے انتقام میں مدد دے۔

لڑائی کی تیاری کے زمانے میں چنگیز کو موقع ملا کہ قن کی سلطنت کے حالات صحیح صحیح دریافت کرے۔ اور معلوم کرے کہ قن کی فوجیں کہاں کہاں ہیں۔ قلعے کس کس موقع پر ہیں اور سامان جنگ انکے پاس کسقدر ہے۔ یہ اطلاعیں اسکو ان لوگوں سے ملیں جو قن کی سلطنت سے سخت عداوت رکھتے تھے۔ یا ان کے ملک سے بھاگ آئے تھے۔ اونگوت مغل جو دیوار چین کے قریب گویا چین کی دہلیز پر رہتے تھے۔ وہ بھی جاسوسی میں بڑے بکار آمد ثابت ہوئے۔ لیکن ان سے بھی زیادہ تر حالات مسلمان تاجروں سے دریافت ہوئے۔ مسلمان تہذیب و تمدن میں اونچی سطح پر تھے۔ اور طرح طرح کا تجربہ ان کو حاصل تھا اور بالخصوص یہ کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہونچنے کے راستے وہ خوب جانتے تھے اسی سبب بڑھے تھے۔ اور جس جس علاقے یا ضلع میں وہ تجارت کرتے تھے وہاں کے حال سے خوب واقف تھے۔ انکے ملنے والے ہر جگہ موجود تھے۔ اور مختلف مقامات میں لوگوں سے ان کے تعلقات بڑھے ہوئے تھے۔ منگولیا اور چین میں صرف یہی مسلمان تاجر ایسے لوگ تھے جنکو صرف ایک ہی ملک کا حال معلوم نہ تھا بلکہ ایران سے چین تک جسقدر ملک و دیار تھے سب کے حال سے وہ آگاہ تھے۔ اس قسم کے مسلمانوں سے چنگیز خاں بہت ملتا رہتا تھا۔ اور اپنے مطلب کے لئے انکی بہت قدر کرتا تھا۔ جو ہدایات چنگیز خاں نے اپنی قوم کو دیں ان میں تاجروں کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے جو اپنے کار منصب میں خوب مشاق اور مستعد ہیں۔ ایک موقع پر چنگیز خاں نے ہدایت کی کہ جس طرح تاجر زریں پارچے اور اچھی اچھی چیزیں نفع کی امید میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں اور اس طرح مال کی تجارت کرتے کرتے بڑا تجربہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہماری فوج کے افسروں اور سرداروں کو چاہیئے کہ اپنے لڑکوں کو تیراندازی اور شہسواری کی

مشق کرائیں اور ان کو فنِ سپہ گری میں ایسا جوانمرد اور آزمودہ کار بنا دیں جیسے کہ تاجر اپنے فن میں ہوشیار اور تجربہ کار ہوتے ہیں"۔ یہ خیال تو چنگیز خاں کا تاجروں کی نسبت تھا۔ اور تاجر چنگیز خاں کو منصف اور فیاض ہی خیال نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کا خیال تھا کہ جس چیز میں چنگیز کا فائدہ ہو اسی میں ہمارا فائدہ بھی ہے۔

تاجروں نے دیکھا کہ جس قدر چنگیز خاں کی سلطنت کو استحکام ہوتا جاتا ہے اسی قدر دُور دُور کے ملکوں میں تجارت کے تعلقات اور معاملات میں آسانی اور اس پیشے میں فائدہ بڑھتا جاتا ہے۔ چنگیز خاں تاجروں کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہی لوگ وہ ہیں جو متمدن ملکوں کے ایسے مصنوعات ہمارے ملک میں لاتے ہیں جن کی ضرورت سب کو خاص کر خانہ بدوش کے امرا و شرفا کو ہوتی ہے اور یہی شرفا و امرا در حقیقت سلطنت میں حکمران تھے۔ غرض اس آپس کی واقفیت نے چنگیز خاں اور مغلوں کے امرا کو گو انکا مذہب شامانی تھا مسلمان تاجروں سے تعلقات رکھنے میں مستحکم کر دیا۔ اور دولتمند مسلمان تاجر مغلوں کے حق میں انکے فرمانبردار دوست ہو گئے۔

گو تیرھویں صدی عیسوی کے شروع میں قِن کی سلطنت زوال پر آنی شروع ہو گئی تھی لیکن پھر بھی اُن کی سلطنت کا قصر ایسا نہ تھا جسکی بنیاد ریت پر رکھی گئی ہو۔ حال میں اس نے اپنی سخت جانی کا ثبوت دشمن کے حملوں کا جواب کر کے دیا تھا۔ چنگیز خاں خوب سمجھتا تھا کہ اب وہ ایک نہایت سخت دشمن کے مقابلے میں جانا چاہتا ہے۔ جیسے قِن جینے ہیں ویسے مستحکم قلعے اور متحصن شہر ہیں اور یہ قلعے اور شہر بہت بڑے ہیں اور خورد و نوش کے سامان سے بخوبی مہیا ہیں اور انکی دیواریں بلند اور دیواروں کے آثار بڑے ہیں۔

۱۲۱۱ء کے موسمِ بہار میں لڑنے کی غرض سے چنگیز خاں دریائے کلوران کے کنارے چل پڑا۔ چار فرزند یعنی جوچی، چغتائی، اوکتائی اور تولی مع تین سپہ سالاروں کے ہمراہ تھے۔ وطن کی یورتوں کو محفوظ رکھنے کے خیال سے تھوڑی سی فوج منگولیا میں چھوڑی۔ قِن کو مغلوں کی اس فوج کشی کے ارادے کا حال کھل گیا۔ انہوں نے بھی دشمن کو دفع کرنے کا بندوبست کیا۔ بلکہ انہوں نے اپنی طرف سے دشت گوبی کے اس حصہ پر جس کا تعلق منگولیا سے تھا حملہ کرنے کا قصد کیا لیکن جو واقعات پیش آئے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حملے کے لئے جو کچھ تیاری انہوں نے کی تھی وہ کافی نہ تھی۔ تعداد کے اعتبار سے قِن کا لشکر زیادہ تھا۔ مگر چنگیز خاں کی جوڑ کا نہ تھا۔ سب میں بڑا نقص اُس میں یہ تھا کہ اہلِ لشکر میں باہم اتفاق نہ تھا۔ قِن کے لشکر میں تین نسلوں کے آدمی بھرتی تھے یعنی چینی۔ جرجان اور کیتان (یا خیتان) خیتان اُس خانہ بدوش قوم کی اولاد تھے جنکے قبضے میں قِن سے پیشتر چین کا شمالی حصہ تھا۔

سرحد سے گذر کر چنگیز خاں نے قِن کے لشکر کو جو تاشی کی سرکردگی میں تھا شکست دی۔ اس فتح سے چنگیز خاں کا قبضہ اُن زمینوں پر ہو گیا جو دیوارِ چین کے اندر کے رُخ واقع تھیں۔ ان زمینوں کے مالک ابتک قِن رہے تھے۔

چنگیزی سپہ سالار جیبی نویان نے جو اپنے لشکر کے ساتھ پہلے روانہ کر دیا گیا تھا اُن قلعوں کو فتح کر لیا جو قِن کے مغربی دارالسلطنت تائی تنگ کی حفاظت کرتے تھے۔ تائی تنگ کو کچھ عرصے کے بعد چنگیز خاں نے خود فتح کر لیا۔ اور اسکے ساتھ سوان تی فو اور فوچو کے شہروں پر بھی قبضہ کیا۔ اس زمانہ میں چنگیز خاں متفرق فوجیں اپنے تین بڑے بیٹوں کی سرکردگی میں صوبہ شانسی کے شمالی حصے میں جو شہر تھے اُن کو فتح کرنے روانہ کر چکا تھا۔ ان نوجوان شہزادوں نے بڑی کامیابی اور سرخروئی حاصل کی اور مرتبہ پھر چنگیز خاں نے خود سالارِ فوج بنکر قِن کو شکستیں دیں۔ جیبی نویان

۱؎ نسل خیتان کے حکمران خاندان لیاؤ نے ۹۱۶ء سے ۱۱۲۵ء تک چین میں حکومت کی تھی۔ خیتان کو جسکی ترکی شکل ختائی ہوئی کیتھے کا نام ملا۔ اور ابتک روسی چین کو کتائی کہتے ہیں۔ ۲؎ شمال شانسی میں ہے۔ ۳؎ صوبہ چیلی کے شمالی حصہ کا ایک شہر ہے۔

نے اُس قلعہ پر قبضہ کیا جو تی یوان کوان کے درے کی حفاظت کرتا تھا۔ اسی درے سے ایک سڑک منگولیا سے پی کنگ کے میدان میں آتی تھی۔ قن کے درمیانی دارالسلطنت میں جسے آج کل پائی پنگ (پی کنگ) کہتے ہیں مغل گھس آئے۔ بڑے لشکر سے چند فوجیں بھیجکر مغلوں نے بہت سے شہر پی کنگ کے شمال میں سمندر کے کنارے تک فتح کرلئے۔ اور جب جاڑا آیا تو چنگیز نے شاہانِ قن کے گھوڑوں کے گلے پکڑ لئے۔

سنہ ۱۲۱۲ء میں جنوبی منچوریا کے خیتان نے قن سے بغاوت کی اور خیتان کے سرداروں نے چنگیز خاں کی اطاعت قبول کرکے قن سے بغاوت کرنے میں مدد پائی۔ اب مغلوں کی بڑی فوجوں نے صوبہ چہلی میں فتوحات شروع کیں۔ اور قن کی بہت سی فوجوں کو شکست دی۔ چنگیز خاں نے اپنی فوجوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ان میں سے ایک حصہ کو جو توچی، چغتائی اور اوکتائی کی سرکردگی میں شانسی بھیجا۔ دوسرا حصہ فوج کا اُس مُلک کی طرف روانہ ہوا جو دریائے ہوانگ ہو (دریائے زرد) سے ملحق تھا تیسرے حصہ پر چنگیز خاں خود سالار بنکر شان تنگ گیا۔

ان تینوں لشکروں کو لڑائیوں میں فتح ہوئی اور چند ماہ کے اندر قن کی تمام زمینوں کو جو دریائے ہوانگ ہو کے شمال میں تھیں فتح کرلیا۔ اب صرف چھ یا سات ایسے شہر جنکے گرد فصیلیں تھیں اور درمیانی دارالسلطنت جسے پی کنگ کہتے تھے فتح ہونے سے رہ گئے۔ مغلوں کے نام اور اقبال کو اب ایسی شہرت ہوئی کہ صرف خیتان بلکہ جرچین کے سردار بھی چنگیز خاں کے پاس آکر اُسکے شریک بننے لگے۔ اُن کو معلوم ہوگیا کہ مغلوں کی یہ فوج کشی وحشی خانہ بدوشوں کی لوٹ مار کے دھاوے نہیں ہیں اور نہ چنگیز کا لشکر کاہستانوں کے سواروں کا کوئی بے قاعدہ گروہ ہے۔ اب وہ سمجھے کہ چنگیز خاں دراصل چین کا آئندہ مستقل بادشاہ ہونے والا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قسمت میں قن کو تخت سے معزول کرکے اپنے خاندان میں بادشاہی کی بنیاد ڈالنی لکھی ہے۔ عام لوگوں کے اس خیال سے چنگیز خاں کو فائدہ پہونچا۔ اور اُس نے چینیوں کو اپنی فوجوں میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ ایسی فوجیں جن میں چینی بھرتی کئے گئے مغلوں کے اختیار میں رکھی گئیں لیکن ان پر افسر جسقدر مقرر ہوئے وہ چینی تھے۔

سنہ ۱۲۱۴ء میں مغلوں کی فوجیں شہر پی کنگ کے شمال میں جمع ہوئیں۔ انکے ساتھ بہت سا مالِ غنیمت تھا۔ لیکن قن کے اس درمیانی دارالسلطنت یعنی پی کنگ پر حملہ کرنے کی ابھی تک کوشش نہیں کی گئی۔ چنگیز خاں اس بات سے واقف تھا کہ جن شہروں کے گرد فصیلیں ہیں ان میں ہر طرح کا سامان رسد اور بہترین فوجیں موجود ہیں۔ اور اُن کو فتح کرنا آسان بات نہیں ہے۔ اب چنگیز خاں کو یہ طمع دامنگیر ہوئی کہ قن کے دولتمند دارالحکومت کو فتح کرکے بہت سی دولت حاصل کرے۔ مگر وہ تمام خطروں سے واقف تھا۔ اس لئے مناسب سمجھا کہ اس وقت تک جو مالِ غنیمت ملا ہے اُسکو کسی طرح منگولیا پہونچادے۔ پس چنگیز خاں نے قن سے اس شرط پر صلح چاہی کہ قن کا شہنشاہ اپنی بیٹی کی شادی بہت سا قیمتی جہیز دیکر چنگیز خاں سے کردے۔ شہنشاہِ قن نے یہ درخواست منظور کرلی۔ اور اپنی ایک نئے بالک بیٹی کو جو شہنشاہ سابق کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی بڑا جہیز دیکر چنگیز خاں کو بیاہ دی۔ جہیز میں سونے چاندی کے علاوہ پانچ سو لڑکے اور اتنی ہی لڑکیاں اور ایک ہزار گھوڑے دئے۔ اسکے بعد چنگیز خاں چین سے ہٹ آیا۔

لیکن اسکی تھوڑی مدت بعد پھر لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ غالباً ان لڑائیوں کا سلسلہ صلح کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے ہی چھڑ گیا۔ قن نے سوچا تھا کہ مغلوں نے جن قلعوں کو لڑائی کے زمانے میں مسمار کردیا ہے اس وقفے میں ان کی مرمت کردی جائیگی اور چند نئے قلعے بھی تعمیر ہوجائیں گے۔ دوبارہ جنگ چھڑ جانے کا باعث یہ ہوا کہ چنگیز خاں نے ایک سفارت جنوبی چین کے فرمانروا خاندان سنگ کے پاس اس غرض سے بھیجی کہ اُس میں اور سنگ میں اتحاد ہوجائے۔ قن نے اسکی مخالفت کی۔ اسی زمانے میں خبر ملی کہ شہنشاہ قن پیکنگ سے چلا گیا ہے اور اپنے ولی عہد کو وہاں چھوڑ گیا ہے۔ شہنشاہِ قن نے اُس وقت شہر پی ان میں سکونت اختیار کی تھی۔ (پی ان کا نام آج کل کائی فنگ ہے۔ اور یہ صوبہ ہونان کا صدر مقام ہے۔) پی ان شمالی سرحد سے زیادہ دور نہ تھا۔ شاہی دربار کے اس نقل مکان کے زمانے میں جو فوجیں ساتھ گئی تھیں ان میں ختائیوں نے بغاوت کردی۔ اور چنگیز خاں

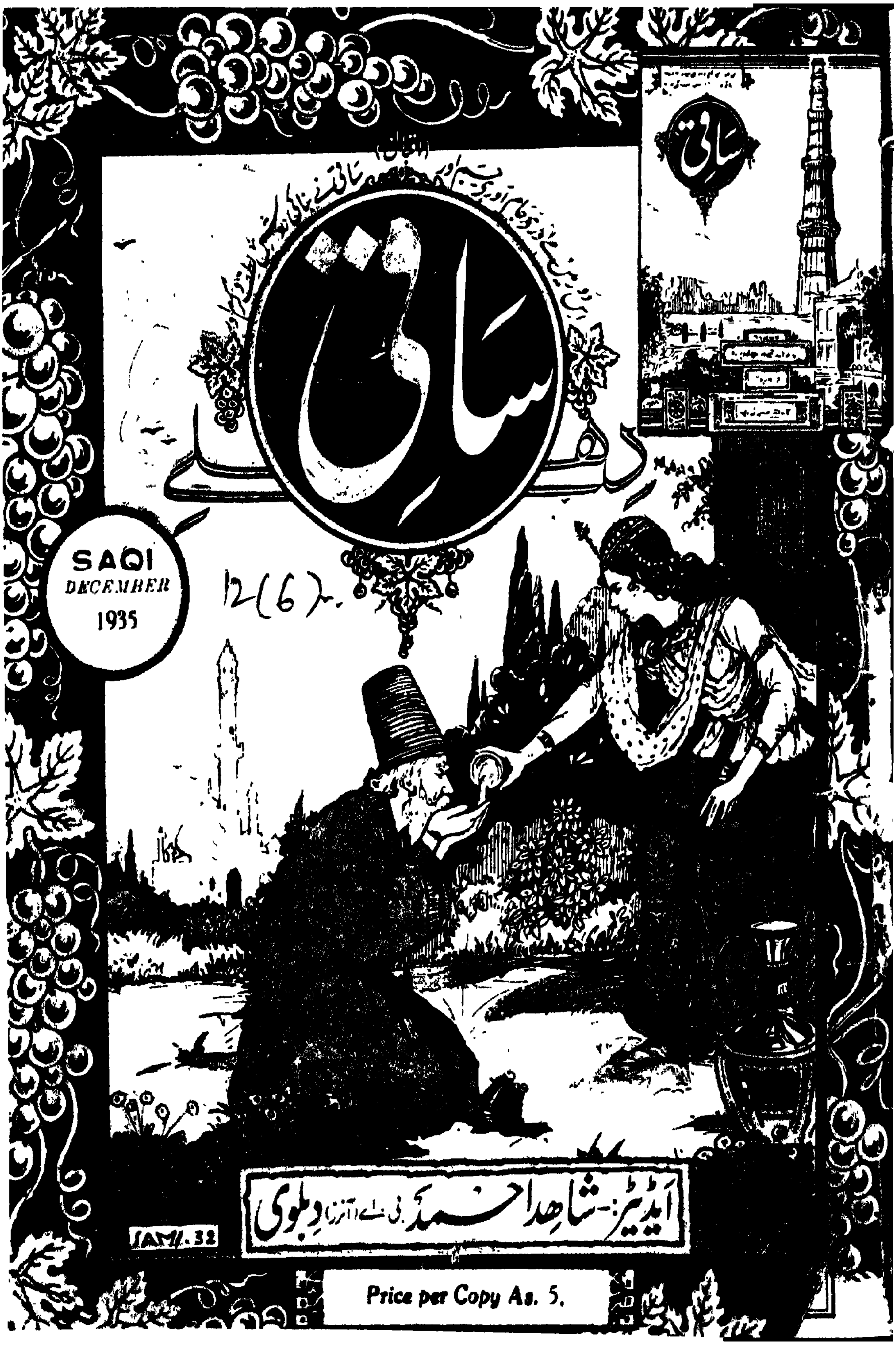
کو کہلا بھیجا کہ ہم آپ کے ہوا خواہ ہیں ہماری مدد کیجئے۔ چنگیز خاں نے فوراً اپنا لشکر قن سے مقابلہ کرنے بھیجا۔ یا اب جی تویان چنگیزی سالار نے پھر ایک مرتبہ لی یو آن کو آن کے دے پر قبضہ کیا۔ مقولی بہادر نے جنوبی شیخو یا پر لشکر کشی کی اور بعض چنگیزی سپہ سالار چین اور ختانوں کیساتھ جو مغلوں سے مل گئے تھے پیکنگ پر چڑھ آئے اور شہر کا انہوں نے محاصرہ کر لیا۔ شہنشاہ قن نے شہر کے بچانے کو جو فوجیں بھیجی تھیں انکو مغلوں نے شکست دیدی۔ آخر کار ۱۲۱۵ء کے موسم گرما میں پیکنگ مغلوں کے ہاتھ فتح ہو گیا۔

اس زمانے میں چنگیز خاں دیوار چین سے شمال کی طرف تھا۔ وہ اپنا لشکر یہاں اس غرض سے لایا تھا کہ گرم موسم سے بچائے۔ یہاں سے وہ قن کے خلاف لڑائیوں کا اہتمام بھی کر سکتا تھا۔ جس وقت پی کنگ کے فتح ہونے کی خبر پہونچی تو اس نے شیگی کتاکو کو مع دو درباریوں کو اس غرض سے بھیجا کہ وہ مال غنیمت کا اندازہ کریں کہ وہ کس قدر ہے اور قن کے شاہی خزانے پر اپنا قبضہ کریں۔ قن کے عہدہ داروں نے جو خزانے کی حفاظت پر تھے چنگیز خاں کے بھیجے ہوئے آدمیوں کو بھاری رشوت دینی چاہی۔ لیکن شیگی کتاکو نے یہ کہکر رشوت یا تحائف لینے سے انکار کیا کہ اب تک درمیانی دارالسلطنت پیکنگ کا خزانہ شہنشاہ قن کا تھا لیکن اب وہ چنگیز خاں کا مال ہے۔ اس خزانہ کو بغیر چنگیز خاں کی اجازت کے کوئی چھو نہیں سکتا۔ لیکن شیگی کتاکو کے دو ساتھیوں نے جو ساتھ آئے تھے چند تحائف قبول کر لئے۔ جب چنگیز خاں کو اسکی خبر ہوئی تو اس نے ان دونوں آدمیوں کو بلا کر نہایت سخت و سست کہا اور شیگی کتاکو کو انعام دیا اور اسے یہ کہا کہ تم بے کون چشم ہو۔ چنگیز خاں ایسے مال کی جو اسکا ہو اپنے کو تقدا سمجھتا ہو نہایت سخت تھا۔ اور ایسے دیانتدار فرمانبردار آدمیوں کو جیسے

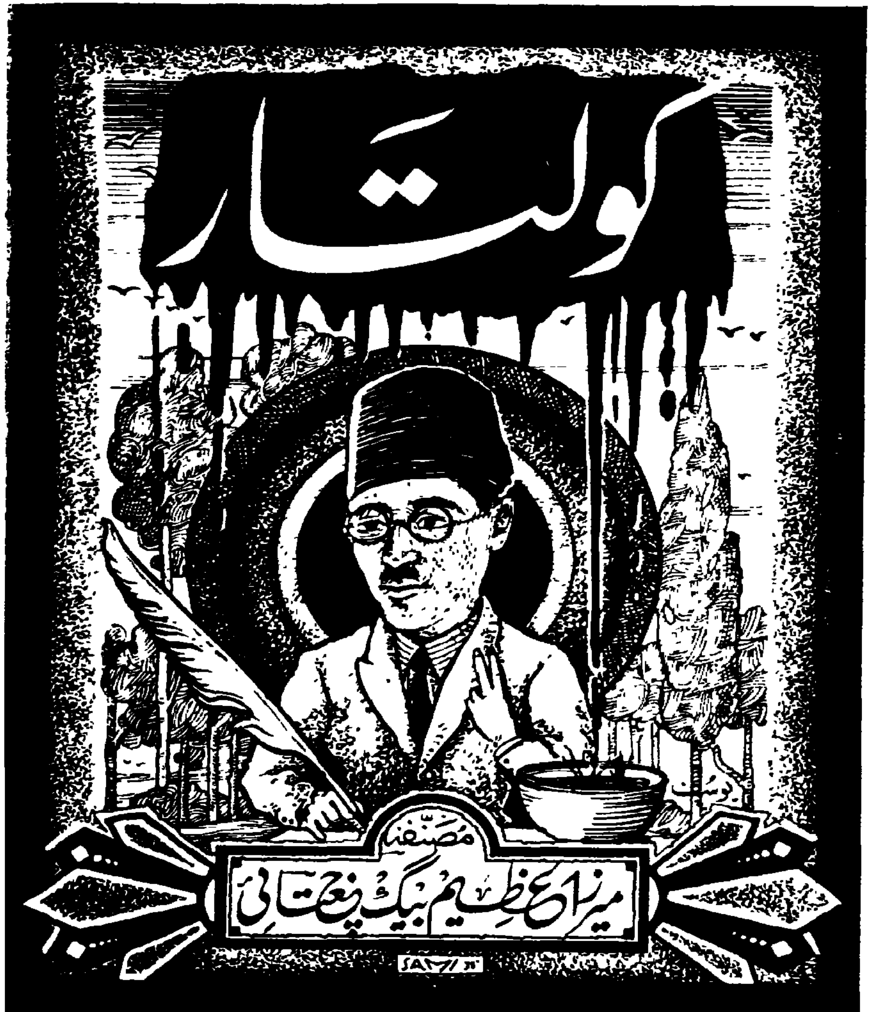
پیکنگ پر قبضہ کرنے کے بعد چنگیز خاں نے کچھ فوج پی ان پر حملہ کرنے روانہ کی۔ پی ان شاہان قن کا جنوبی دارالسلطنت تھا۔ اور آج کل شہنشاہ قن وہاں مقیم بھی تھا۔ چنگیز خاں کا یہ مطلب نہ تھا کہ شہر پی ان پر قبضہ کر کے شہنشاہ قن کا خاتمہ ہی کر دے۔ کیونکہ وہ اس شہنشاہ کے خاتمہ کو سمجھتا تھا کہ وہ ایسی چیز نہیں ہے جو اس وقت پیش آئے بلکہ آئندہ کسی وقت میں پیش آنے والی ہے۔ اور اس میں کئی سال کا عرصہ لگے گا۔ چنگیز خاں کی بھیجی ہوئی فوج صوبہ ہونان میں داخل ہوئی۔ اور وہ جنوبی دارالسلطنت پی ان پر آئی۔ وہاں سے تنگ کوان کے قلعہ پر قبضہ کیا۔ یہ قلعہ بہت بڑا تھا۔ قن کے شہنشاہ نے پہلے ہی ہمت ہار دی تھی۔ اب اس نے صلح چاہی۔ اس صلح کے پیغام کا جواب چنگیز خاں نے جو کچھ دیا وہ یہ تھا کہ اب ہمکو مال غنیمت درکار نہیں ہے۔ ہم اب ملک میں جیسے کہ تم نے کبھی اسکو فتح کیا تھا اس کو فتح کرکے اس پر مستقل قبضہ و قیام چاہتے ہیں۔ پس قن کو چاہیئے کہ دریائے ہوانگ ہو کے شمال میں جس قدر ملک ہے اس سے دستبردار ہو۔ شہنشاہ کا لقب ترک کرے اور اپنے وہ صرف شاہ ہونان کہلائے جانے پر قناعت کرے۔ قن نے ان شرائط کو منظور کرنا غیر ممکن تصور کر کے پھر لڑائی جاری کی۔ اب چنگیزی سپہ سالاروں کے تحت ملک میں مختلف مقامات پر لڑائیاں ہونے لگیں۔ یہ لڑائیاں خاص کر مقولی بہادر نے لڑیں۔ اور اسکو چنگیز خاں نے جدید مفتوحہ علاقوں کا نائب سلطنت مقرر کر دیا۔ اس مشہور عہدے کے ساتھ وہ جنرل افسری کے سپہ سالاری پر بھی بدستور قائم رہا۔ ۱۲۱۶ء میں چنگیز خاں اپنے خیمہ گاہ دریائے اونان کے کنارے واپس آیا۔

چین میں چنگیز خاں کا وارد ہونا اور یی لیو چناؤ سے ملاقات

قن کی قلمرو میں جس وسیع پیمانے پر لڑائیاں شروع کیں ان سے چنگیز خاں کے حربی کمالات سب پر روشن ہو گئے۔ لڑائی میں فراست و کیادت اور تجربے کے جوہر ہی نہیں دکھائے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ میدان جنگ میں لشکر کی رہبری کے وقت جو اوصاف ایک سالار فوج سے ظاہر ہونے لازمی ہوتے ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ بلکہ فوجوں کو نقل و حرکت میں لانے کے فن میں جبکہ ایک ہی وقت میں دور دراز ملکوں میں معرکہ آرائیاں ہوتی ہوں چنگیز خاں نے اپنے تئیں بڑا صاحب کمال ثابت کیا۔ دشمن کے فوجی افسر جو اپنی فوجوں سے علیحدہ ہو کر چنگیز خاں سے


ساقی
دہلی
SAQI
DECEMBER
1935
12(6)
ایڈیٹر:- شاہد احمد بی اے (آنرز) دہلوی
IAM/.32
Price per Copy As. 5.

جدید اڈیشن


کولتار
مصنفہ
میرزا عظیم بیگ چغتائی


روح ظرافت
میرزا عظیم بیگ چغتائی

ساقی ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ للعہ ششماہی ۱۲/ مع محصول ڈاک

جرعات

ہر سال ساقی کے چار خاص نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل خریداروں سے انکی قیمت الگ نہیں لی جاتی

جلد ۱۲ — ساقی دھلی۔ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۵ء — نمبر ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلین

خدا کا شکر ہے کہ اس پرچے کے ساتھ ساقی اپنی زندگی کے چھ سال پورے کر رہا ہے۔ اس مختصر سی زندگی میں جیسی کچھ بھی خدمت ہو سکی ساقی نے کی اور مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ملک میں اور ملک سے باہر بھی ساقی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی چیز اس کی بقائے حیات کی ضامن ہے ورنہ "زردادن و دردسر خریدن" کی مثال ساقی سے بہتر کم ملے گی۔ مجھے یہاں اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں کہ ساقی مالی مشکلات سے اب تک چھٹکارا کیوں نہ پا سکا۔ اردو لٹریچر کی قدردانی معلوم۔ ساقی بک ڈپو کا سارا منافع ساقی پر صرف کر دینے کے باوجود کم و بیش سو روپے ماہوار کا نقصان اب بھی برداشت کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ گھر یا دکان کا کرایہ ایک پیسہ نہیں دینا پڑتا۔ اور ایڈیٹر تو گویا بیکاری میں پیدا کیا ہے۔ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں ذاتی ذوق و شوق سے ہو رہا ہے۔ جس کا صلہ جرمانے کی صورت میں ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مل جاتا ہے ؎

ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

جنوری میں یہ کچھ رسم سی ہو گئی ہے کہ ہر پرچہ اپنا سالنامہ یا خاص نمبر شائع کرے۔ چنانچہ ساقی بھی اپنی سالگرہ کے موقع پر "جاپان نمبر" پیش کرے گا۔ یہ خاص نمبر پروفیسر برلاس کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے جنہوں نے جاپان کے مختلف پہلوؤں سے متعلق خود مضمون لکھے اور اپنے جاپانی احباب سے لکھوائے ہیں۔ ہندوستان کے چند مشاہیر نے بھی جاپان نمبر کے لئے نہایت پاکیزہ مضامین لکھے ہیں۔ اس طرح جاپان اور ہندوستان کے ادیبوں کی متفقہ کوشش سے "جاپان نمبر" مرتب ہوا ہے۔

مضامین اور تصاویر کا مفصل اعلان اسی پرچے میں کہیں درج کیا جا رہا ہے۔ اس پر صرف ایک نظر ڈال کر خود فیصلہ کر لیجئے کہ "جاپان نمبر" کیسا ہو گا۔ ضخامت کے متعلق ابھی کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ "جاپان نمبر" کے وزن کے متعلق بھی میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ "افسوس" اس لئے کہ اب عمدگی کا معیار "وزن" رہ گیا ہے۔ "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا اب زمانہ کہاں۔

مولوی عنایت اللہ صاحب کا ترجمہ "چنگیز خاں کے سوانح حیات" اس اشاعت کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ آج کل آپ فرانسیسی انشا پرداز فلابیر کا شاہکار "سلامبو" اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس کا ایک باب ساقی کی گزشتہ اشاعت میں شائع کیا گیا تھا اور ایک باب اس پرچے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ان ابواب سے اندازہ کیا جائے گا کہ مولوی صاحب موصوف نے مشکل عبارت کو کس عمدگی اور سلاست سے اردو میں پیش کر دیتے ہیں۔ آئندہ بھی اس کتاب کے چیدہ چیدہ باب ساقی میں شائع کئے جائیں گے۔

مجھے اپنے دوست مسٹر فضل حق قریشی کی طرف سے یہ اعلان کرنا ہے کہ کامران کا اجرا ابھی ان کی ادارت میں نہیں ہو رہا۔ اس کے اڈیٹر سید ولایت حسین صاحب اور نبی احمد صاحب ہونگے اور اس کی پالیسی کے ذمہ دار بھی یہی حضرات ہونگے۔

یہ پرچہ عجیب و غریب مقاصد لیکر نکلنے والا ہے اس لئے یہ اعلان کر دینا ضروری ہوا۔ ترسیل مضامین و خط و کتابت وغیرہ سب ایڈیٹر کامران کے نام ہونی چاہئے۔ فضل حق صاحب اس سے بالکل غیر متعلق ہیں۔

"شاہد"

سلامبو

طلوع ہوتے چاند کی شعاعیں موجوں سے ہم سطح تھیں، سارا شہر اندھیرے کے کالے کمبل میں لپٹا پڑا تھا۔ کسی کسی آنگن میں رتھ کے چوب کا پیتل یا کہیں کوئی سپید کپڑا لٹکا ہوا یا کسی دیوار کا پہلو یا کسی بت کے گلے کا سنہری طوق سپیدی کی ایک تحریر یا روشنی کا نقطہ معلوم ہوتا ہے۔ معبدوں اور بت خانوں کی چھتوں پر شیشے کے گولے بڑے بڑے ہیروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی پرانی عمارتوں کے کھنڈر یا باغات یا کالی مٹی کے ڈھیر سیاہی میں اور سیاہی پیدا کرتے ہیں۔ قلعہ کے نیچے ماہی گیروں کے جال ایک گھر سے دوسرے گھر تک اس طرح پھیلے ہیں، جیسے کوئی زبردست بڑا مکڑا اپنے پر تانے ہو۔ رہٹ جس سے قصر کی اونچی سے اونچی منزل پر پانی پہنچایا جاتا ہے، اس وقت اس کی آواز بند ہے۔ سائبانوں میں اونٹ شتر مرغ کی طرح بیٹھ کے بل بیٹھے آرام میں ہیں۔ حمال گلیوں میں گھروں کی دہلیز پر سر رکھے بے خبر سوتے ہیں۔ شہر کے چوک جن میں اس وقت سناٹا ہے وہاں بڑے بڑے بتوں نے اپنی پرچھائیاں دور تک پھیلا رکھی ہیں۔ بت خانوں کی چھتوں سے جو بہت اونچی کھیروں کی میں کہیں کہیں کسی جنتی قربانی کا دھواں نکلتا نظر آتا ہے۔ اس دھوئیں میں عود و عنبر کی خوشبو ہے۔ سمندر کے نمکین پانی کی مہک دن بھر کی تپتی دیواروں کا بھبکا گرم ہوائیں ملا جلا محسوس ہوتا ہے۔ شہر کے گرد پانی کی بے حس و حرکت سطح حلقہ باندھے چمک رہی ہے۔ پہاڑوں سے گھری خلیج اور تونس کی جھیل پر چاندنی کھلی ہے۔ ریت کے ٹیلوں پر گلابی پر والے ہنس اور لق لق پرے جمائے بیٹھے ہیں۔ افق کے کنارے آسمان کا نیلا گنبد ایک طرف زمین کی خاک اور گرد میں اور دوسری طرف سمندر کے غبار اور کہر میں چھپا ہے۔ قلعہ کی چوٹی پر ہیکل عشمون کے اونچے اونچے سرو و شمشاد جھوم جھوم کر اس طرح سائیں سائیں کرتے ہیں جیسے شہر پناہ کے نیچے سمندر کی موجیں کنارے سے ٹکرا ٹکرا کر ہلکی ہلکی آواز پیدا کرتی ہیں۔

سلامبو اپنی دایہ تنعاخ کا سہارا لئے سیڑھیاں چڑھ کر محل کے بالاخانے پر آئی۔ یہ دایہ گھر کی باندی ہے۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک لمپ تھا جس میں کوئلے سلگ رہے تھے۔ بالاخانے کے صحن کے وسط میں ہاتھی دانت کی ایک چھوٹی سی کوچ پڑی تھی۔ اس پر خناق کا ایک پوستین پڑا تھا۔ اور بہت سے تکیے رکھے تھے جن میں طوطوں کے پر بھرے تھے۔ یہ پرندے خداؤں کے دربار کا پیشین گو ہونے کی وجہ سے متبرک سمجھا لیا جاتا تھا۔ صحن کے چاروں گوشوں پر خوبصورت وضع کے چار ظروف رکھے تھے ان میں خوشبو کی چیزیں مثلاً بالچھڑ، دارچینی، اور مرنجھرا تھا۔ دایہ نے جلتے کوئلوں پر یہ چیزیں چھڑک دیں، فوراً خوشبو کا دھواں اٹھنے لگا۔ سلامبو نے قطب تارے کی طرف نگاہ جمائی اور آسمان کے چاروں گوشوں کی طرف منہ کر کے باری باری تعظیماً جھکی۔ پھر زمین پر گھٹنے ٹیکے جس پر لاجوردی ریت بچھا تھا اور اس پر آسمان کی طرح ستارے و سیارے بنائے تھے۔ سلامبو نے اب اپنے دونوں بازو پہلوؤں سے ملا کر کہنیاں سیدھی کیں اور دونوں ہاتھ پھیلا کے سر نیچے کو ڈالا چہرے پر چاندنی پڑ رہی تھی۔ عبادت میں یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے۔

"او ربتنا...... بعلت...... تانیت...... ربۃ کہ یہ نام اس نے پیسے لمبے اور دردناک لہجے میں لئے جیسے کوئی تکلیف میں کسی کو پکارتا ہو...... اناتیس، استارتی، دریکتو، استوریت، ملیتہ، اثارہ، ایلیتہ، تراتہ، سوگند ہے تجھ کو مرتز بافتن اور حلحبد کی صداؤں کی اور سوگند ہے زمین پر حل کے خطوط و نقوش کی میری قربانیوں او رقسم ہے تم کو سکوت ازلی اور دائمی ثمر بخشی کی لے جو ترن اور اس کے بے نیاز کنارے کی رانی اور اے جملہ اشیائے رطیب کی ملکہ تجھ پر سلام ہو"

اس دُعا میں اس نے دو تین مرتبہ کھڑے کھڑے جھونکے سے کھائے اور پھر دفعتاً زمین پر اس طرح گری کہ پیشانی خاک پر تھی اور دونوں ہاتھ پھیلے تھے۔

دایہ تنعاخ نے فوراً سلامبو کو زمین سے اُٹھایا۔ کیونکہ یہ ایک مذہبی رسم تھی کہ جب کوئی عبادت میں اس طرح گرے تو اُسکو فوراً اُٹھایا جائے۔ اور اس طرح گرنا اس بات کی علامت تھی کہ جو دُعا مانگی تھی وہ قبول ہوئی۔ جب کبھی پہلے سلامبو عبادت کرتے کرتے اس طرح گری تھی تو دایہ تنعاخ اپنا مذہبی فرض سمجھکر اسکو زمین سے اُٹھایا تھا۔

دایہ تنعاخ کا قصہ یہ ہے کہ "ورتیبان گیتولیا" سے چند بردہ فروش قرطاجنہ میں لائے تھے۔ اُس وقت تنعاخ بچہ تھی۔ انہی بردہ فروشوں سے وہ خرید لی گئی۔ حالتِ غلامی میں سلامبو کو اُس نے دودھ پلایا۔ آزاد کی گئی مگر اس پر بھی آقا کا گھر نہ چھوڑا۔ اس وقت وہ زرد رنگ کا سایہ جو کولوں پر بہت چُست تھا پہنے تھی۔ سایہ کی گوٹ میں بہت سے شیشے کے چھلّے لگے تھے جو چلنے میں آواز دیتے تھے۔ چہرے کا نقشہ کسی قدر چپٹا تھا۔ اور اس کا رنگ زرد کرتے کے رنگ میں ملتا ہوا تھا۔ سر کے جوڑے میں پیچھے کے رُخ چاندی کی کیلیں بالوں میں اس طرح لگی تھیں جیسے کسی روشن چیز سے کرنیں نکلی ہوں۔ ناک میں کیل کی جگہ ایک سُرخ مونگا تھا۔ کوچ کے قریب منتظر نیچے کئے سرو قد کھڑی تھی۔

سلامبو اب بالاخانے کے بالکل کنارے آئی۔ نگاہ اُٹھا کر چاروں طرف آسمان کو دیکھا۔ پھر نظر نیچی کر کے شہر پر جمائی۔ شہر پڑا سو رہا تھا۔ مُنہ سے آہ نکلنے میں سینہ اونچا ہوا۔ اور ردا جو اس پر بغیر کسی تکمے یا بند کے پڑی تھی وہ اِس سرے سے اُس سرے تک ہوا میں لہرانے لگی۔ پاپوش جس کی نوکیں اوپر کو اُٹھی تھیں فیروزوں کے گچھوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ بن گندھے بالوں کا ڈھیر سُرخ ڈوروں کی جالی میں پڑا تھا۔ ربۃ قمر کے دیدار کے لئے سر اونچا کیا۔ اور ایک دُعا کے اجزا میں اپنے الفاظ شامل کر کے اس طرح کہے:۔

"ربۃ تیری گردش کیسی سبک ہے۔ اثیر کا جو ہر لطیف تجھے فضا میں سنبھالے ہے۔ اور تیرے گرد وہ نورانی ہے۔ ربۃ تو اپنے قلب کی کسی اندرونی تحریک سے دُنیا میں ہوائیں چلاتی اور شبنم گراتی ہے جس سے زمین ثمر خیز ہوتی ہے۔ تیرے بڑھنے گھٹنے میں بلی کی آنکھیں اور چیتے کے گُل بڑھتے گھٹتے ہیں۔ عورتیں ہر دردِ زہ میں تیرا ہی نام زور زور سے لیتی ہیں۔ تو ہی صدف میں موتی ڈالتی ہے۔ تیری ہی وجہ سے شراب میں جھاگ اُٹھتے اور مردے لڑتے ہیں۔ تو ہی سمندر کی تہ میں دُرِ شاہوار پیدا کرتی ہے۔ اے ربۃ تیری ہی وجہ سے تاریک اور گہرے مقامات میں ہر قسم کے جراثیم نمو پاتے ہیں۔

جب تو آسمان پر ظاہر ہوتی ہے تو زمین پر سکون اور اطمینان رہنے لگتا ہے۔ پھول اپنے ورق بند کر لیتے ہیں۔ اور سمندر میں موجیں تہ میں بیٹھکر استراحت کرتی ہیں۔ تھکی ہاری مخلوق اپنے سینے تیرے سامنے کھول دیتی ہے۔ اور یہ سارا جہاں مع اپنے سمندروں اور پہاڑوں کے تیرے چہرے میں آئینہ کی طرح اپنی شکل دیکھتا ہے۔ تو اُجلی اور پاک ہے۔ نجیب اور روشن ہے۔ دوسروں کی تو دستگیری کرتی ہے۔ اُن کو پاک و طاہر بناتی ہے۔"

گرم چشمے والی پہاڑیوں کے اوپر خلیج کی دوسری جانب دو پہاڑیوں کے جوف میں ماہِ نو ہلال کی شکل میں نظر آرہا تھا۔ اُسکے نیچے ایک چھوٹا سا ستارہ تھا اور گرد روشنی کا ہالہ۔

سلامبو نے ربۃ قمر سے مخاطب ہو کر کہا۔ لیکن اے ماتا۔ آقا اور مالک ہونے کی حیثیت سے تو بڑی قہرناک ہے۔ بہوت پریت عجیب الخلقت جانور سب تیرے خلق کئے ہوئے ہیں۔ قہر و غضب کے خیال پیدا کرتی اور جھوٹے خواب دکھاتی ہے۔ تیری نگاہیں عمارتوں کے پتھروں کو فنا کر دیتی ہیں اور بلے

رتہ جب تو گھٹنے لگتی ہے تو بندر درختوں کی شاخوں میں بیمار پڑ جاتے ہیں۔

اے رتہ بتا تو کہاں جاتی ہے۔ کیوں اس طرح اپنی صورت بدلتی رہتی ہے۔ کبھی تو ایک نازک کمان کی طرح فضا میں اس طرح حرکت کرتی ہے جیسے سمندر پر کوئی کشتی بغیر مستول و بادبان کے جاتی ہو۔ کبھی تو ستاروں کی پاسبانی اس طرح کرتی ہے جیسے کوئی چرواہا اپنے گلوں کی رکھوالی کرے۔ تو گول ہے اور درخشاں ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر اس طرح چلتی ہے جیسے کوئی نور کا پہیا چلے۔

اے معبودہ، اے ماں! کیا تجھکو مجھ سے عشق و الفت نہیں ہے۔ میں نے مدتوں تیری طرف آنکھیں لگائے رکھی ہیں۔ لیکن نہیں تو اس زمردی فضا میں بادبان لگائے اڑتی پھرتی ہے اور میں اس بے حس و حرکت زمین پر ہوں۔"

سلامبو کہتی ہے۔" دایہ ذرا اپنا عود اٹھالا۔ اور چاندی کا تار ہلکے ہلکے بجا۔ کیونکہ میرا دل اداس ہے۔"

تنعاخ جلدی سے آبنوس کا بنا ہوا عود اٹھا لائی جو قد میں اس سے اونچا تھا۔ اور مثلث کی شکل رکھتا تھا۔ تنعاخ نے اسکو دونوں ہاتھوں سے بجانا شروع کیا۔

باجے کی صدائیں ایک کے بعد ایک جلد جلد پیدا ہوئیں مگر وہ ایسی ہلکی تھیں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنائیں۔ رفتہ رفتہ آواز میں گونج پیدا ہوئی۔ اور یہ آواز جو انسان کی آہوں سے زیادہ مشابہ تھی۔ اندھیری رات میں فرار ہو کر قلعہ کی بلندیوں پر سے گذرتی ظلمت میں غائب ہو گئی۔

سلامبو نے یکلخت کہا۔" بس خاموش!"

دایہ بولی۔" بی بی آج کل تو ذرا ذرا سی بات آپ کو پریشان اور آپکے خیالات میں مخل ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ نسیم کا ہلکا سا جھونکا یا آسمان پر بادل کا گذرنا تک آپ کو چونکا دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بی بی آپ عبادت اتنی کرتی ہیں کہ تھک کر چور ہو جاتی ہیں۔"

سلامبو نے کہا۔" دایہ، جی تو یہ چاہتا ہے کہ اپنی روح کو تحلیل کر کے عبادت میں اس طرح جذب کر دوں جیسے شراب پھول کو جذب کر لیتی ہے۔"

"تنعاخ، تو کیا عود و عنبر کے بخور نے اپنی تیز خوشبوؤں سے تم کو پریشان کیا ہے؟"

سلامبو نے جواب دیا۔" نسیم شیریں تو وہ چیز ہے جس میں خداؤں کی روح آسودہ رہتی ہے۔"

اب دایہ نے سلامبو کے ایک ہلکارہ کا ذکر کیا۔ اسکی نسبت خیال کیا جاتا تھا کہ وہ عنبر والے ملک میں جو ملک قرۃ کے پہاڑوں سے بھی آگے ہے گیا ہوا ہے۔ دایہ نے کہا کہ" اگر ہلکارہ نہ بھی آئے تو بھی تمہیں چاہیئے، جیسے کہ اُن کی خواہش تھی کہ ارکان ریاست میں سے کسی بزرگ کے بیٹے سے عقد کر لو۔ جب تم ایک مرد کے پہلو میں ہوگی تو یہ تنگ مزاجی اور طبیعت کی افسردگی دور ہو جائیگی۔"

سلامبو نے پوچھا۔" یہ کیسے۔ میں نے تو جتنے مرد اب تک دیکھے، یہی دیکھا کہ بد تمیز بنگ جانوروں کی طرح ہنستے اور خوش رہتے ہیں اور ہاتھ پاؤں انکے کرخت اور سخت ہوتے ہیں۔"

تنعاخ، میرا حال تو یہ ہے کہ بعض وقت کلیجے میں گرم دھواں سا اٹھتا ہے۔ اور وہ ایسا گرم اور تکلیف دہ ہوتا ہے جیسے آتش فشاں پہاڑ سے بخارات اٹھتے ہوں اور اُن سے دم گھٹنے لگے۔ میرے کانوں میں آوازیں آتی ہیں جیسے کوئی مجھے پکارتا ہے۔ سینے میں ایک آگ کا گولا سا اٹھتا ہے جس سے دم بند ہو جاتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اب مرتی ہوں۔ اس کے بعد کوئی نرم اور لطیف چیز میرے تمام جسم میں سرایت کرتی ہے اور وہ پیشانی سے لیکر قدموں تک سارے میں دورہ کرتی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس میں ایک لذتِ ملاطفت ایسی ہوتی ہے کہ وہ تمام جسم پر محسوس ہوتی ہے

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خدا سر سے پاؤں تک مجھ پر چھایا ہے۔ ہائے کاش یہ رات کا اندھیرا مجھکو نگل جاتا۔ یا کوئی دریا مجھکو اپنی تہ میں بٹھا دیتا یا میں درختوں میں ان کی شاخوں کا رس بن جاتی۔ یا اس قالب خاکی کو خالی کر کے میں نسیم کا ایک جھونکا ہو جاتی یا روشنی کی شعاع بنکر فضا میں تیرتی اور اڑتی پھرتی۔ اور اسی طرح اڑتی ہوئی اپنی معبودہ قمر سے جا ملتی۔ ان میں سے کوئی بات بھی ہوتی تو میرے لئے وہ کیسی موجب مسرت ہوتی۔"

سلامبو کمان کی شکل پیچھے کو مڑی اور اپنے دونوں ہاتھ جہاں تک ممکن تھا اونچے کئے۔ سیاہ لباس میں اس کا چہرہ چاند کی مثل زرد اور چاند ہی کی مثل اس مادّی عالم کی چیز نہ معلوم ہوتا تھا۔ اسی حال میں وہ ہاتھی دانت کی کوچ پہ گر پڑی۔ تنعاخ نے فوراً ایک تعویذ جس میں عنبر کے ٹکڑے اور دولفن کے دانت پروئے تھے اس کے گلے میں ڈال دیا تاکہ جو خوف سلامبو پہ طاری تھا وہ دُور ہو جائے۔ سلامبو نے دایہ سے آہستہ سے کہا کہ "شہابیم کو جلد بلا لاؤ"

سلامبو کے باپ نے اسکو کاہنات سے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی اور نہ اس بات کی اجازت دی تھی کہ ربۃ تانیت کے متعلق بیٹی کو وہ علم ہو جو عوام الناس کو تھا۔ ہملکار کا قصد تھا کہ بیٹی کا عقد ارکان سلطنت میں کسی بڑے آدمی کے فرزند سے کر دے تاکہ اسکے ملکی منصوبوں میں اس تعلق سے مدد مل سکے۔ سلامبو باپ کے محل میں تنہا رہتی تھی۔ ماں کو مرے ہوئے برسوں گذرے تھے۔

اس کی تمام زندگی زہد و پرہیزگاری، روزوں اور عبادت الٰہی اور تزکیہ نفس میں گذری تھی۔ اسکے گرد و پیش ہمیشہ ایسی چیزیں رہتی تھیں جن سے تہذیب اخلاق ہو اور جو عظمت اور وقار کی پیدا کرنے والی ہوں جسم اس کا منظر رہتا تھا اور قالب خاکی باتوں سے معمور تھا۔ شراب یا گوشت اس نے کبھی نہ کھایا تھا کسی ناپاک جانور کو چھوا تک نہ تھا۔ اور نہ ایسے مکان میں قدم رکھا تھا جہاں کوئی مُردہ ہو۔

خداؤں کی ایسی مورتیں جن سے رفث و فحش پیدا ہو ان کا اسے علم نہ تھا چونکہ ہر خدا اپنے کو مختلف صورتوں اور شکلوں میں ظاہر کرتا تھا اسلئے جو مذہبی رسوم اس سے وابستہ تھے ان میں اس درجہ اختلاف ہوتا کہ تناقص پیدا ہو جاتا۔ بہرکیف وہ ایک ہی اصل کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ سلامبو ربۃ قمر کی پرستش محض اس کے جرم فلکی ہونے کی وجہ سے کرتی تھی۔ مگر اس جوان لڑکی پر ماہ کا اثر ہو گیا تھا اور جب چاند پورا ہو کر گھٹنا شروع ہوتا تو سلامبو کمزوری محسوس کرتی دن بھر طبیعت سست رہتی۔ شام ہوتے کسی قدر جان آجاتی۔ جب چاند کو گرہن لگتا تو نوبت مرنے تک پہونچتی۔ ربۃ تانیت نے اس جلن میں کہ اب باکرہ لڑکیاں اس پر قربانی چڑھانی بند ہو گئی تھیں اس دوشیزہ سلامبو کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اس کی طبیعت پر ہر وقت ایک بوجھ سا رہنے لگا۔ اور ایک ہی صورت ہر وقت سامنے بیٹھی نظر آتی۔ ان باتوں کی تکلیف اس وجہ اور بڑھی کہ وہ سمجھ سے باہر تھیں۔ علاوہ اسکے خود سلامبو کی خوش اعتقادی اور ایمان بھی اس میں شامل ہو کر اس تکلیف کو ترقی دیتا تھا۔

ہملکار کی بیٹی کو یہ تمنا رہتی تھی کہ ربۃ تانیت کے باطن و ظاہر جملہ حالات سے واقفیت پیدا کرے۔ چنانچہ اس دیوی کے جس قدر حالات تھے، اس کے اسفار اور جتنے مختلف ناموں سے وہ پکاری جاتی تھی، دریافت کر لئے اور تانیت کے مختلف اسمار بغیر ان کے معنی تحقیق کئے وہ جپا کرتی۔ اس خیال سے کہ تانیت کے مذہب کی اصل و حقیقت معلوم ہو جائے، سلامبو نے چاہا کہ ربۃ کے حرم کے سب سے اندرونی حصے میں جا کر اسکے پرانے بت اور بیش قیمت پیرہن کو دیکھے جس پہ قرطاجنہ کی قسمت کا دار و مدار تھا۔ کیونکہ اس وقت تک سلامبو کے دماغ میں خدا کے خیال میں اور اسکے مادی مظہر یعنی بت کے خیال میں کوئی تمیز قائم نہیں ہوئی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ بت کو چھونے یا اسکی صورت دیکھنے سے خدا کی قوت کا ایک جزو اس میں آ جائیگا اور نہ صرف یہ بلکہ اس خدا کی قوت پر کسی قدر قابو بھی حاصل ہو جائیگا۔

سلامبو نے مڑ کر دیکھا۔ شہابریم کی گھنٹیوں کی آواز جو اس کے لباس کے دامن میں آویزاں تھیں سُنیں۔ شہابریم سیڑھیاں چڑھ کر بالاخانے کی دہلیز پر رُکا۔ دونوں ہاتھ سینے پر رکھے تھا آنکھیں حلقوں میں بیٹھی تھیں اور اس طرح چمکتی تھیں جیسے قبر کے اندر دو چراغ جلتے ہوں۔ کتان کا لباس پہنے تھا۔ لباس کے دامن جن میں گھنٹیاں ٹکی تھیں بوجھ سے خوب نیچے جھکے تھے۔ ہر گھنٹی کے بعد دامن پر ایک گول دانہ فیروزے کا تھا۔ اس کی بانہیں دُبلی اور کمزور تھیں۔ ماتھا ایسے کہ جٹا اور ٹھوڑی باہر کو نکلی تھی۔ زرد چہرے پر کثرت سے جھرّیاں تھیں۔ چہرے سے نفس کشی کی علامتیں اور زہد کا اثر ظاہر ہوتا تھا۔ شہابریم ہیکلِ تانیت کا سردار کاہن تھا اور وہی سلامبو کا اُستاد بھی تھا۔

شہابریم نے سلامبو سے پوچھا "کس کام کو تم نے بلایا ہے؟"

سلامبو بولی "مجھے ارمان تھا..... آپ نے مجھ سے تقریباً وعدہ کیا تھا....." یہ فقرے سلامبو نے ہکلا ہکلا کر کہے۔ اس کے بعد اس کی تقریر بے ربط ہو گئی۔ پھر کچھ دیر چُپ رہ کر بلجلت کہنے لگی "شہابریم۔ تم مجھ سے بیزار کیوں ہو گئے ہو۔ مذہبی رسوم میں کوئی بات اب تک مجھ سے فروگذاشت نہیں ہوئی۔ تم میرے اُستاد ہو اور خود کہہ چکے ہو کہ میری مثل کوئی دوسرا ربۃ تانیت کی پرستش کا واقف کار نہیں لیکن ابھی کوئی بات ایسی ضرور ہے جو تم مجھکو بتانی یا سکھانی نہیں چاہتے۔ کیوں حضرت کیا یہ بات درست نہیں ہے؟"

شہابریم کو ہملکار کی ہدایتیں یاد تھیں اُس نے سلامبو کو جواب دیا "نہیں اب تجھے کچھ اور سکھانا باقی نہیں"

سلامبو کہنے لگی "کوئی رُوح ہے جس نے میرے دل میں یہ ارمان اور شوق پیدا کیا ہے۔ میں ہیکلِ عشمون میں جو آسمان کے سیاروں اور انسان کے عقل و ادراک کا دیوتا ہے سیڑھیاں چڑھ کر گئی۔ ملک قرۃ کے شجرِ زیتون کی چھاؤں میں جس میں سونے کے پھل لگے ہیں سوئی۔ اور میں کہتی ہوں وہ ہے جو صور کی کل نوآبادیوں کا محافظ اور نگہبان ہے۔ لعل خامول جو سرچشمۂ اثمار اور نباتات کی ہے اور جو پہاڑوں اور جنگلوں کا پاسبان ہے اس کے ہیکل میں بند ہوئی۔ معبودانِ کابیری جو تحتِ زمین رہتے ہیں ان پر قربانی چڑھائی۔ یہ خدا وہ ہیں جو ہواؤں، جنگلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے نگہبان ہیں لیکن مجھ سے اوپر اور بہت دُور ہیں۔ وہ مری رُوح میں موجود ہیں۔ اور وہ مرے جسم میں عجیب عجیب لرزشیں خوشی اور مسرت کی پیدا کرتے ہیں۔ میں ان کی آوازیں سنتی ہوں اُنکے چہروں کی جھلک دیکھتی ہوں اور روشنی سے میری آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے بعد پھر میں ظلمت و تاریکی میں آجاتی ہوں۔"

شہابریم خاموش رہا۔ سلامبو کی آنکھوں میں عجز و انکسار بھرا تھا۔ اور اسی حال میں وہ شہابریم سے فریاد کرتی رہی۔ آخر کار شہابریم نے اشارے سے کہا کہ یہ دایہ جو غیر قوم کنعان سے نہیں ہے بہتر ہے کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔ دایہ فوراً چلی گئی۔ اور شہابریم نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"معبودوں سے پیشتر اس عالم میں صرف تاریکی تھی۔ البتہ ایک غیر واضح اور جامد الحرکت نفسِ حیات پرواز میں تھا۔ جب وہ سخت اور منقبض ہوا تو خواہش اور ہوا و ہوس اس سے پیدا ہوئے۔ پھر اس خواہش اور ہوا و ہوس نے ابتدائی مادہ پیدا کیا جو کیچڑ کی طرح رقیق گہرا و سیاہ تھا اور برف کی مثل سرد تھا۔ اس مادے کی حالتِ جمود میں بھوت پریت اور عجیب الخلقت حیوانات رہتے تھے جن کی تصویریں تم نے اکثر حرم کی دیواروں پر دیکھی ہونگی۔ یہ اُن حیوانات کے غیر مربوط عناصر و اجزا تھے جو دنیا میں آئندہ پیدا ہونے والے تھے۔

جب یہ رقیق مادہ خشک ہو کر سکڑا تو وہ ایک بیضہ بن گیا۔ بیضہ ٹوٹا۔ نصف زمین ہو گیا اور نصف آسمان بنا۔ پھر چاند سورج ہوائیں اور بادل نمودار ہوئے۔ اور بجلی کے کڑکے پر حیوانات جو صاحبِ ادراک تھے جاگ اُٹھے۔ اس کے گنبدِ کواکب میں عشمون ظاہر ہوا اور خامون سورج بن کر چمکا۔ ملک قرۃ نے مسلح ہو کر اسکو قادس سے دوسری طرف ہانک دیا۔ کابیری نے جوالا مکھی پہاڑوں کے نیچے اپنے کو دفن کیا۔

اور رتبنامہ بان ماں کی طرح دنیا پر جھکی اور اس نے دنیا پر نور کی مثل اپنا دودھ چھڑکا۔ اور اپنی تاریکی چادر کی طرح دنیا کو اسنے اڑھادی۔

سلامبو نے پوچھا کہ "یہ کیا ہوا؟"

شہابریم نے کہا کہ میں نے اس عالم کی ابتدا کا راز تم پر ظاہر کیا تاکہ بلند تریں دیوتاؤں کی طرف تمہارا دھیان بٹ جائے" لیکن اس آخری جملے پر سلامبو کا شوق اور بڑھا اور شہابریم نے سلامبو کی تسکین کے لئے کہنا شروع کیا۔

"وہ مردوں کے عشق پر قابو رکھتی ہے"

سلامبو نے فکرمند ہو کر کہا "مردوں کے عشق پر"

شہابریم بولا کہ "وہ قرطاجنہ کی روح ہے، گو وہ سب میں ساری ہے مگر اس کی سکونت کی کوئی جگہ نہیں۔ وہ ایک نقاب کے پردے میں ہے"

سلامبو نے بڑی عاجزی سے پوچھا "کیا میں اس کو دیکھ سکتی ہوں جہاں وہ ہو مجھے وہاں لے چلو۔ میں مدت سے اسی پس و پیش میں تھی کہ تم سے یہ بات کہوں یا نہ کہوں۔ خیر اسکے دیکھنے میں مضمحل ہوئی جاتی ہوں اور اس حال پر ختم ہو جاؤں گی۔ مجھ پر رحم کرو اور میری مدد کرو۔ بس ہم دونوں ساتھ چلیں"

شہابریم نے غصہ میں حکیمانہ طریقے پر چلنے سے انکار کیا۔ اور کہا کہ "تمہیں نہیں معلوم اور نہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کو دیکھنا اور مرنا ایک بات ہے۔ ہمارے سوائے جو عقل میں مرد اور کمزوری میں عورت ہیں۔ یوں تمام مرد و عورت کی مشترکہ شکل میں کسی پر ظاہر نہیں ہوتے۔ تیرا شوق کہ تو تانیت کو دیکھے مذہب کے خلاف ہے۔ جسقدر علم تجھے حاصل ہے اسی پر قناعت کر"

سلامبو اتنا سنکر شہابریم کے قدموں پر گر پڑی اور کانوں میں انگلیاں دیں جو توبہ اور پشیمانی کی علامت تھی۔ شہابریم کی گفتگو سے اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ شہابریم جو اس قصر کے پتھروں سے بھی زیادہ بے حس تھا سلامبو کو اپنے قدموں میں گرا دیکھتا تھا اور اس کے کانپنے کو محسوس کرتا تھا۔ اسکو اس وقت اپنے علم لاہوت پر ناز اور خوشی تھی کہ سلامبو اسکی وجہ سے اسوقت تکلیف میں ہے۔ حالانکہ یہ علم وہ تھا جو خود اسکو پورا حاصل نہ ہوا تھا۔

شاخوں میں پرندوں نے بولنا شروع کیا۔ ہوا سرد چلنے لگی۔ آسمان پر زردی بڑھی اور چھوٹے چھوٹے بادل اڑتے نظر آئے۔ دفعتاً شہابریم نے شہر تونس کی پشت پر ایک غبار سا آسمان پر دیکھا۔ پھر دیکھا کہ گرد کی ایک موج سی زمین پر لوٹتی چلی آتی ہے۔ پھر گرد و غبار کی یہ موج پردے کی طرح اوپر کو اٹھی۔ اور دیکھا کہ آدمیوں کا ایک جم غفیر سانڈنیوں پر سوار نیزے اور ڈھالیں لگائے چلا آتا ہے۔ یہ سپاہ متاجرہ کا لشکر تھا جو قرطاجنہ پر حملہ کرنے آرہا تھا۔

عنایت اللہ۔ بی۔ اے دہلوی

شعور و وجداں

چشمِ ظاہر بیں تو کہتی ہے کوئی ساقی نہیں
اور ان مٹی کے مٹکوں میں مئے باقی نہیں

یہ مہ و خورشید و انجم کیا ہیں ہ گردش زادہ ہیں
واہمہ بکتا ہے جامِ نور ہیں پُر بادہ ہیں

اتفاقی ہے یہ ساری کائناتِ میکدہ
اور طلسماتِ منظم ممکناتِ میکدہ

ہے عمل دُنیا میں اک قانون عالمگیر کا
جو محرک ہی یہاں تخریب کا تعمیر کا"

میرے وجداں کا مگر پیغام ہی کچھ اور ہی
چشمِ باطن کی نظر کا نام ہی کچھ اور ہی

گر پسِ پردہ کوئی معشوقِ بے ہمتا نہیں
روح کیوں بیچین ہی ہ کیوں قلب بے سودا نہیں

یہ ضیا باری نہیں ہی گر جبینِ یار کی
دلکو کیوں بیتاب رکھتی ہی خلش دیدار کی

اِس مُنظم میکدہ کا اے امیں ساقی بھی ہی
اور اسکی چشمِ میگوں میں مئے باقی بھی ہی

امینِ حزیں

میری بادشاہت کا زمانہ

یادش بخیر جبکہ میں اور میرا دل یا وہ چیز جسے میں کہا جاتا ہے۔ اس دکھوں بھری دنیا فانی۔ فریب۔ جلم جلی۔ دنیا کی کشمکش سے بالکل بے خبر ایک نئی نئی جگہ آکر رہے تھے۔ آہ! میں سمجھتا ہوں گو یا اُس وقت میں بہت اچھا تھا اور وہ شاید میرے پنگورے میں انگوٹھے چوسنے کا زمانہ تھا۔ مجھے یوں ہی سا دھیان ہے۔ گو یا اُس وقت میں ایک گل گوتھنا سا بچہ یا گوشت کا لوتھڑا تھا جو اپنے آپ ہل سکتا نہ چل سکتا تھا۔ اپنی خواہش کو نہ اپنی زبان سے کہہ سکتا تھا نہ دوسرے کی سن سکتا تھا۔ گرم و سرد۔ خشک و تر۔ میٹھا۔ کڑوا۔ کسیلا۔ سفید و سیاہ۔ اندھیرا۔ اجالا مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ مگر ہاں اس محتاجی پر بھی میں گوشت کا ننھا سا لوتھڑا اس وقت سب کا حاکم تھا۔ اور سب کام میری مرضی کے موافق میرے کسی مقررہ اشارے پر آنًا فانًا ہوتے چلے جاتے تھے۔ آہ! میں سمجھتا ہوں میں اُس وقت بہت اچھا تھا۔ کیونکہ میں معصوم تھا۔ بالکل بے گناہ تھا اور وہ میری معصومیت ہی اُس وقت میری بادشاہت تھی۔

ذرا ذرا سی آہٹ پر میں چونک پڑتا تھا۔ لرز جاتا تھا۔ کچھ انجان پتلیاں۔ بالکل ناواقف مورتیں۔ جان نہ پہچان ہستیاں اُس وقت خود بخود مجھ پر ہاتھوں چھاؤں کرتی تھیں اور میں فوراً چھاتی سے لگا لیا جاتا تھا۔ آہ! یادش بخیر۔ یہ چھاتی سے لگانے والی مورت جو مجھے اُن سب میں سب سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی تھی۔ سب سے زیادہ پیاری لگتی تھی۔ آہ! وہ ہی مجسم نیکی ہمہ تن محبت اس وقت میرا بہشت تھا بہشت۔ یا یوں سمجھوں کہ میری ننھی سی جان کیلئے گوشت پوست کا ایک محفوظ قلعہ تھا قلعہ۔ جس کی چھاتی سے لگ کر مجھے پھر کسی چیز کی پرواہ نہیں رہتی تھی۔ وہی حد درجے کی مہربان ہستی میری ہر وقت کی نگراں جو آپ گیلے میں سوتی اور مجھے سوکھے میں سُلاتی تھی۔ مجھے سب سے پیاری تھی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو میں کبھی نہ ہوتا۔ اُس کے احسانات کسی طرح بھی میری گردن سے نہیں اُتر سکتے۔ وہ ہی محبت کی دیوی۔ پہلا پریم آتما میری بہشت نصیب ماں تھی ماں، جس سے زیادہ شفیق میں نے اس سنسار میں کسی کو آج تک نہیں پایا۔ آہ! میں بات بات میں بگڑتا تھا۔ روٹھتا تھا۔ ضد میں کرتا تھا اور وہ مقدس ساری ساری رات مجھے بہلاتی۔ مجھے پھُسلاتی۔ اور اگر ذرا بھی میرا جی بدمزہ ہوتا تو وہ میری دوا دارو میں لگی رہتی اور کبھی بھول کر بھی ایک لفظ شکایت کا زبان پر نہ لاتی۔ افسوس اس احسان کا بدلہ مجھ کافر نعمت کی طرف سے کچھ بھی ادا نہ ہوا۔ اور وہ نعمت مجھ سے اُس وقت چھین لی گئی جبکہ میں اس سے زیادہ سمجھنے کا احساس ہی نہ رکھتا تھا۔

ہاں مجھے خواب کی طرح سے یہ خیال بھی آتا ہے کہ اس وقت میرا گرد و پیش مجھے بہت ہی پیارا معلوم ہوتا تھا۔ ہر مورت جس کے پاس میں ہمک کر جاتا مجھے دل کی طرح چھاتی سے لپٹاتی اور چاروں طرف سے پیار ہی پیار برستا دکھائی دیتا۔ بلکہ میرے ذرا سے بے چین ہونے پر گھر کا گھر پریشان ہو جاتا۔ اُس وقت میری محسنہ۔ میری انتہائی شفیق کا تو عجیب حال ہوتا تھا۔ وہ تو گویا میری دموں دیوانی تھی۔ وہ تڑپ تڑپ کر بھینچ بھینچ کر مجھے گلے سے لگاتی۔ اپنی صورت میری صورت پر رکھتی۔ اور جب

تک مجھے قرار نہ آتا اُسے بھی چین لینا گناہ تھا۔ وہ بار بار کی بے قراری میرا رونا دھونا تھا۔ اور وہ دلاسا دینے والی اکیلی شفیق میری انتہائی تسکین۔

اسی عالم میں تھوڑی دیر بعد اچانک کسی اندرونی خواہش کے میری آنکھ پٹ سے کھل جاتی تھی۔ میں اپنی کمزور آواز میں کچھ کہتا تھا جسے وہی میری قدرتی پرستار فوراً سمجھ لیتی تھی۔ ایک نمکین سیال گرم سی چیز میرے منہ سے لگادی جاتی تھی اور میں مگن ہوکر پھر چُسر چُسر کرنے لگتا تھا۔ وہ بے چینی شاید میری بھوک تھی اور وہ بے منتِ رزق شیرِ مادر۔ میرا بچھونا میری آرام کی جگہ ہر وقت ایک دوسرے جسم سے گرم رہتی تھی۔ اس پر بھی میں حربے ضربے چونک پڑتا تھا اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اُس مہربان جسم کو ٹٹول لیتا تھا جس کا کوئی نہ کوئی حصہ میرے اوپر چھایا رہتا تھا۔ اور یہ دیکھکر میں پھر اپنے آپ کو حفاظت میں سمجھکر آرام کی نیند میں محو ہو جاتا تھا۔ میرا وہ بار بار چونکنا اس دُکھوں بھری جان کا خوف تھا اور وہ نرم سپر۔ میری محسنہ مادر گرامی کا ہاتھ تھا جو ہمیشہ میرے آڑے آتا تھا۔

ہر روشن اندھیرے میں مجھے گھر کی انگنائی میں لٹایا جاتا تھا۔ ایک نرم نرم سی چیز سنو سنو دفعہ مجھے چھیڑتی تھی۔ میرے جھنڈولے بال اُس سے اُڑنے لگتے تھے۔ میرے ننھے کُرتے کا دامن اُس سے کئی کئی بل کھاجاتا اور میں خوش ہو ہوکر آپ ہی آپ مسکرا دیتا۔

آخاہ! اب میں سمجھا۔ وہ روشن اندھیرا۔ وہ چمکیلی تاریکی ضرور گرمی کی چاندنی راتیں ہونگی اور وہ نرم سی بے چین چیز ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی سرسراہٹ جس سے مردہ دل بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔

اُس سے تھوڑی ہی دیر بعد عین میرے سر پر اونچی۔ بہت اونچی ایک چوڑی چکلی نیلی چادر بھی تانی جاتی تھی جس میں آپ ہی آپ میرے مُٹر مُٹر تکتے تکتے موتیوں کا بھرا پُرا کھیت بھی اُگنے لگتا۔ یا بہت سے ننھے روشن ہو جاتے۔ آپ ہی آپ روشنی ہو جاتی۔ ہاں ہاں بلکہ اُسی موتیوں کے کھیت میں ایک اور گول سی سُنہری ٹکیا بھی چمکتی نظر آتی تھی جو میرے ننھے سے دلکو بہت ہی بُھاتی۔ اس کے دیکھنے سے مجھے آنکھوں سُکھ کلیجے ٹھنڈک پہنچتی بلکہ جب میں اُس پر ٹکٹکی ہی باندھ دیتا تو اُس میں سے سینکڑوں سونے کے تار نکل نکل کر میری گود میں آجاتے۔ جنہیں میں ہُمک ہُمک کر۔ مسکرا مسکرا پکڑنا چاہتا تھا مگر افسوس وہ چیز سوائے میرے خوش کرنے کے کبھی میرے ہاتھ نہ آتی اور میں بے فائدہ کوشش کرکے ہر بار مایوس ہوکر رہ جاتا۔

اللہ اللہ اب میں سمجھا۔ وہ نیلی چادر رات کا دامن ہوگا جو ہر شام کو آسمان پر کھینچ جاتا ہے۔ وہ موتیوں کا کھیت یا چمکتے قمقمے درخشاں ستارے اور وہ گول سی ٹکیا۔ خدائی چراغ یا پیارا پیارا چاند تھا چاند!

آغا شاعر قزلباش

چاندنی رات اور آبشار

رُباعیات

(۱)

نکھری ہوئی چاندنی فضا نورانی
ہر شے پہ پھرا ہوا سُنہرا پانی
جنگل کے درختوں کی وہ گہری سبزی
اب بارشِ نور سے ہے دُھلکر دھانی

(۲)

چھائی ہوئی ہے فضا میں خاموشی سی
پھیلی ہوئی ہے ہوا میں بیہوشی سی
فطرت کی رُوح عالمِ وجد میں ہے
طاری ہے ایک خود فراموشی سی

(۳)

شبنم کی شراب سے ہوا ہے سرشار
صدقے ہوتے ہیں ہوش ایسی رفتار
جب پاؤں صبا کے لڑکھڑا جاتے ہیں
ہنستے ہیں تالیاں بجا کر اشجار

(۴)

جنگل کے نوا فروش خاموش ہوئے
دوشیزۂ خواب سے ہم آغوش ہوئے
کرتے تھے ہمیں جو زمزموں سے بیہوش
فطرت کے زمزموں سے بیہوش ہوئے

(۵)

جنگل کے سُکوت کو گھٹا دیتی ہے
فطرت کے سُرور کو بڑھا دیتی ہے
گرتے ہوئے جھرنوں کی مُسلسل آواز
اس عالمِ ہُو میں کیا مزا دیتی ہے

(۶)

بہتے ہیں آبشار ہو کر بیتاب ⁂ یا دامنِ کوہ میں رواں ہے سیماب
آئینہ سیال ہے یا آبِ رواں ⁂ ہر موج لئے ہے ایک لرزاں مہتاب

(۷)

چوٹی سے پہاڑ کی اُترتے آئے ⁂ ہموار زمین پر بکھرتے آئے
شبنم آلود چاند کی کرنوں سے ⁂ ہو کر سرشار رقص کرتے آئے

(۸)

پیہم یہ صدا جو آبشاروں کی ہے ⁂ یہ جُنبشِ نبضِ مرغزاروں کی ہے
فطرت کی نفیرِ خواب کہیئے اس کو ⁂ یا حرکتِ قلب کوہساروں کی ہے

(۹)

بکھرے وہ آبدار موتی بکھرے ⁂ بکھرے وہ زرنگار موتی بکھرے
ٹکرائیں وہ پتھروں سے موجیں ٹکرائیں ⁂ بکھرے وہ بے شمار موتی بکھرے

(۱۰)

یہ چادرِ آب جو چلی آتی ہے ⁂ گرنے میں کچھ اسطرح سے بل کھاتی ہے
جیسے اک ماہ وش کی زریں ساری ⁂ جھونکے کھا کر ہوا کے لہراتی ہے

(۱۱)

عشاق کے داغ تیرتے جاتے ہیں ⁂ سونے کے ایاغ تیرتے جاتے ہیں
موجوں میں نہیں ہے عکس سیاروں کا ⁂ پانی پہ چراغ تیرتے جاتے ہیں

(۱۲)

ایامِ شباب کی کہانی تم ہو ⁂ روتا ہوں جسے وہ زندگانی تم ہو
اے دامنِ کوہ کے غزلخواں جھرنو ⁂ میری گذری ہوئی جوانی تم ہو

مرزا عباس بیگ محشر

دوشیزۂ سلوم

پنگھٹ پر بھیڑ لگی ہوئی تھی اور گاؤں کی عورتیں پانی بھرتے ہوئے ایک سرگرم افواہ کے متعلق گفتگو کرنے لگی تھیں۔
ایک عورت نے مٹکا کنوئیں کی پتھریلی مُنڈیر پر رکھتے ہوئے کہا "کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص ایک کسان کی لڑکی کیلئے دو سَو پونڈ پیش کرے؟"

"ہاں ہاں۔ لطیفہ کی پھوپی اُمّ احمد نے خود مجھ سے کہا تھا کہ شیخ حسین کے لڑکے ابراہیم نے شادی کے عوض دو سَو پونڈ پیش کئے ہیں" ——— دوسری عورت نے جواب دیا۔

عائشہ اُمّ حمید ہاتھ جھٹک کر بولی "نہیں بی۔ اس میں شک نہیں کہ لطیفہ خوبصورت ہے لیکن اتنے روپے میں تو شہر کی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی ہوسکتی ہے۔ پھر وہ اس قدر دولت ایک دہقانی لڑکی کے لئے کیوں ضائع کر رہا ہے۔ ایسی لڑکیاں تو چالیس سے کم ہی میں مل جاتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن یہ بھی تو سبکو معلوم ہے کہ تمام فلسطین میں اس سے زیادہ خوبصورت لڑکی کوئی نہیں" پہلی عورت نے جواب دیا۔ "سرزمین سلوم میں کسی لڑکی کے بال بھی اُس جیسے نہیں۔ اور نہ کسی کی آنکھیں اُسکی جیسی گہری اور سیاہ ہیں۔ اور نہ کوئی اُس کی ملائم جلد کا مقابلہ کرسکتا ہے ——— لو وہ آہی رہی ہے۔"

بل کھاتے ہوئے راستے پر سیاہ مٹکا لئے ایک پندرہ سالہ حسینہ گاؤں سے آرہی تھی۔ اسکا قد عربی دوشیزہ کی طرح لانبا تھا۔ اور چہرے سے جولانی ظاہر ہورہی تھی۔ اسکی دراز بھوری زلفیں اوڑھنی سے ڈھکی ہوئی تھیں اور اُس کے خوبصورت مکھڑے پر شگفتگی و تازگی کے آثار نمایاں تھے۔ جب وہ کنوئیں کے قریب آئی تو کم عمر لڑکیوں نے اس پر طنزیہ فقرے کسنے شروع کر دیئے۔ "دو سَو انگریزی سکّے!" ایک نے سر مٹکاتے ہوئے کہا۔ "اس کی ٹانگیں سونے کی ہونگی یا کمر ہیرے کی! جب ہی تو ایک شخص اتنی بڑی رقم اس کے لئے پیش کر رہا ہے۔"

"واہ!" دوسری ناک چڑھا کر بولی۔ "کیا تم نے نہیں سُنا کہ مرد دیوانے ہوتے ہیں اور یہ شیخ کا لڑکا ان سب سے بھی بڑھا ہوا ہوگا۔"

"مگر اسکو اس سے فائدہ ہی کیا پہنچے گا؟" ایک عورت نے تضحیک کرتے ہوئے کہا۔ "اُسے صابن کا زبردست خرچ برداشت کرنا پڑیگا۔ یہ تو دن میں تین مرتبہ منہ دھوتی ہے!" وہ سب عورتوں کی طرف دیکھ کر بولی "سُنا؟ تین مرتبہ!"

"کیوں اس کے سر ہورہی ہو؟" اُمّ رشید نے چیخ کر کہا۔ "اس بیچاری کا کیا قصور ہے، اس کا باپ جو چاہے وصول کرے۔ بہر حال وہ دبی دبائی لڑکی ہے۔ تمہاری طرح حاسد نہیں۔ آؤ لطیفہ! میں تمہارا مٹکا بھر دوں، تم ان بھونڈی لڑکیوں کا کچھ خیال نہ کرنا۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ گاؤں چلتی ہوں۔"

اُسی شام کو جبکہ لطیفہ اپنے باپ کی بکریوں کو چرا کر غار کیطرف واپس آرہی تھی اُس کا نوجوان چچا زاد بھائی تھوڑے فاصلے پر نمودار

ہوا، اور جب وہ اندر چلی گئی تو اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں اُسے پکارا۔

کوئی جواب نہ ملنے پر اُس نے دوبارہ آواز دی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم اندر ہو لطیفہ! کیونکہ میں عصر کی نماز کے بعد سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور میں نے تمہیں خود اندر جاتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔"

یہ دیکھ کر کہ وہ نہیں ٹلے گا، لطیفہ نے جواب دیا۔ "کیا ہے موسیٰ؟"

"چند لمحات کے لئے بات کرنا چاہتا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ غار میں داخل ہو گیا۔

"لطیفہ! کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری شادی مشرقی جبردان کے شیخ کے لڑکے سے قرار پا گئی ہے؟"

"یہ تم میرے والد سے دریافت کرو۔" اُس نے جواب دیا۔

"پننے سے کیا فائدہ؟" موسیٰ نے خفگی آمیز لہجہ میں کہا۔ "تم جانتی ہو۔ میں جانتا ہوں اور تمام گاؤں واقف ہو کہ شادی کے عوض دو سَو پونڈ دیئے جائیں گے۔ لطیفہ! میں بچپن سے تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہیں وہ وقت یاد ہے جب ہم گاؤں سے باہر اکٹھے کھیلتے تھے۔ لطیفہ! چلو ہم شمالی سائبریا بھاگ چلیں جہاں تمہارے خاندان والے ہمکو کبھی نہ پا سکیں گے..... اور وہیں ہم شادی بھی کر لیں گے۔"

"ہُش، شیطان!" لطیفہ پلٹ کر بولی۔ "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ خبر ہے ہم نے اگر ایسی بے وقوفی کی تو نہ صرف میرا باپ اور بھائی ہمارا پیچھا کر کے مار ڈالیں گے بلکہ میرا ہونیوالا شوہر اپنے قبیلے والوں کو لے کر ہمارے خون سے اپنے انتقام کی پیاس بجھائے بغیر نہ رہے گا کیونکہ میرا فرار اُس کی انتہائی توہین ہو گی۔"

"کچھ پروا نہیں لطیفہ!" موسیٰ نے کہا۔ "ہم اسے بھی برداشت کر لیں گے۔"

"اگر مجھے تم سے محبت ہوتی تو میں ایسا بھی کر لیتی۔" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔ "لیکن میں تم کو بالکل نہیں جانتی۔ میں تم سے کیوں شادی کروں اور کیوں ایک معمولی کسان کی بیوی بن کر اپنی زندگی خطرے میں ڈالوں جبکہ ابراہیم ابن شیخ حسین سے شادی کر کے میں چین سے زندگی گذار سکتی ہوں۔"

وہ کہتے کہتے دفعتاً رُک گئی کیونکہ موسیٰ اپنی کمر سے خنجر آبدار کھول رہا تھا جو گڈریے عام طور پر اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ "اپنا خنجر چھپا لو موسیٰ!" وہ چیخی۔ "ورنہ میں مدد کے لئے پکاروں گی۔ میرا باپ اور بھائی قریب ہی کام کر رہے ہیں اور بیشتر اس سے کہ تم مجھ پر حملہ کرو وہ اپنی کلہاڑیوں سے تمہارا دم نکال دیں گے۔"

چار و ناچار موسیٰ کو خونخوار خنجر نیام میں رکھنا پڑا لیکن اپنا دایاں ہاتھ اُٹھا کر اُس نے قسم کھائی اور کہا۔ "اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو بدوی شیخ سے بھی تمہاری شادی نہ ہو گی۔"

اُس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی اور وہ غار سے باہر نکل گیا۔

(۲)

کئی دن گذرنے کے بعد جب ابراہیم نے شادی کا انتظام کر لیا تو اُس کے باپ نے اطلاع دی کہ دولھا اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جمعہ کے روز پہنچے گا۔

لطیفہ نے یہی بہتر سمجھا کہ موسیٰ کی ناخوشگوار ملاقات کو بھول جائے اور اُسکی دھمکیوں کا کسی سے ذکر نہ کرے جمعرات کے دن

اُس کی ماں اور خالائیں اُسے یروشلم کے باب الثبات پر لے گئیں جہاں اُسے شادی کے لئے غسل دیا گیا اور جسم کو خوشبوؤں سے معطر کیا گیا۔ اس کے ہاتھوں میں حنا رچائی گئی اور خوشنما بال عروسی طریقے پر آراستہ کئے گئے۔ رات گئے جب وہ اپنے باپ سے باتیں کر رہی تھی موسیٰ کے باپ نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھا "موسیٰ کا صبح سے پتہ نہیں، کیا آپ نے اُسے دیکھا ہے؟"

اُن کے انکار کرنے پر وہ نوجوانوں کے اطوار پر بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اُس وقت موسیٰ اپنے علاقہ سے دُور پہاڑیوں پر جا رہا تھا۔ رات کا کچھ حصہ اُس نے ایک غار میں چھُپ کر گذارا کیونکہ فلسطینی سپاہیوں کا ایک گروہ رہزنوں کی تلاش کر رہا تھا۔ اگر اُنھوں نے اس کی رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی دیکھ لی ہوتی تو یقیناً وہ اُسے گرفتار کر لیتے یا گولی سے مار دیتے۔

علی الصباح وہ نکل کھڑا ہوا اور تھوڑی دیر بعد خان الاحمر کے پُرانے اور بوسیدہ قلعہ پر پہنچ گیا جس سے تھوڑے ہی فاصلے پر اُس کے گاؤں جانیکا راستہ تھا۔

قلعہ کی فصیل پر اُس نے اپنے آپکو اس طرح چھُپا لیا کہ ایک موکھے میں سے وہ ہر اُس چیز کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا جو شاہراہ پر سے گذرے۔ دس بجے کے قریب اُس نے دیکھا کہ چند بدوی سوار عرب کے عروسی گیت گاتے ہوئے جا رہے ہیں۔ آنکھوں میں نفرت اور دل میں غصے سے وہ اُنکو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ اُس کے بالکل قریب آگئے۔ اُس نے اپنی رائفل سنبھالی۔

دولھا کے سر پر ریشم کی خوبصورت ٹوپی تھی اور اونٹ کی اون سے بنی ہوئی احمریں و سنہری عبا اُس کی پشت پر سے نیچے لٹک رہی تھی جس سے اُس کی توقیر و عظمت ظاہر ہوتی تھی۔ قانون کے مطابق جبردان کی سرحد پر اُنھوں نے اپنی بندوقیں امانت رکھوا دی تھیں اور اب ان لوگوں کے پاس کوئی نشانہ لگانیوالا ہتھیار نہ تھا۔ البتہ ابراہیم کی کمر میں ایک تلوار لٹکی ہوئی تھی۔

چاروں طرف ایک نگاہ ڈال کر کہ کوئی فلسطینی سپاہی اُسکو نہیں دیکھ رہا وہ رائفل تان کر سامنے آگیا۔ بدوی سوار حیرت زدہ ہو گئے۔ لیکن پیشتر اس سے کہ وہ کچھ کر سکتے موسیٰ نے خوفناک آواز میں کہا "اجنبی کتّے! تو دوشیزۂ سلوم سے کبھی شادی نہ کر سکیگا!" یہ کہہ کر اُس نے دولھا پر رائفل چلائی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا زین سے نیچے گر کر مر گیا۔ موسیٰ نے اُس کے ساتھیوں کو بھی اپنی رائفل سے ڈرایا اور قلعہ کے پیچھے وادیٔ کیل کی جانب روانہ ہو گیا۔

انتقام اور رنج کی بلند آہوں کے ساتھ چار ساتھی لاش کو خان الاحمر کی طرف لے گئے اور دو آدمی سلوم کی طرف روانہ ہوئے تاکہ اس المناک واقعہ کی خبر کریں۔

کوہِ زیتون سے اُتر کر اُنھوں نے دیکھا کہ رسل العمود کے میدان میں سلوم کی تمام آبادی دولھا کا انتظار کر رہی ہے۔ بدوی لوگوں کو دیکھ کر اُنھوں نے مسرت کے نعرے لگائے لیکن دردانگیز خبر سُنکر یکبارگی ان پر افسردگی چھا گئی۔

خوفزدہ مجمع قاتل کی تفتیش کے متعلق گفتگو کرتا ہوا منتشر ہو گیا اور مختار (گاؤں کا چودھری) نے دونوں بدوی سواروں کو اپنا مہمان بنا کر ایک قاصد بارکوں کی طرف بھیج دیا۔

چاروں طرف غائب شدہ موسیٰ کی تلاش کی گئی مگر کہیں کوئی سراغ نہیں ملا ——— اور ملتا بھی کیسے؟ وہ اس دُنیا ہی میں نہیں تھا۔ اُس نے ایک یونانی ماہی گیر کی کشتی میں سوار ہو کر بھاگ جانے کی کوشش کی مگر ہوا اُس کے خلاف ہو گیا اور اُسکی کشتی منجدھار میں پھنس گئی ——— گویا قدرت نے شیخ کے خون کا بدلا لے لیا۔

مہینوں گذر گئے اور لوگ اس واقعہ کو بھولنے لگے۔ لطیفہ روز بروز حسین ہو رہی تھی اس لئے اُس کے باپ نے اس سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اعلان کر دیا کہ صرف وہی شخص لطیفہ سے شادی کرنیکی خواہش کرسکتا ہے جو دو سَو پونڈ معاوضہ دے سکے۔ گاؤں کے دہقان سے لیکر شہر کے آفندی تک اپنے دل مسوس کر رہ گئے کیونکہ وہ اتنی بڑی رقم ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ بُرا ہوا۔ گاؤں میں ابتری پھیل گئی۔ سازشیں، لڑائیاں، یہاں تک کہ ماربیٹ کا بھی دور دورہ ہو گیا لیکن لطیفہ کے حُسن میں پھر بھی لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا گیا جس سے اُسکی ہم عمر لڑکیاں اس سے حسد کرنے لگیں۔ گاؤں والوں اور انگریزی پولیس افسر کے لئے وہ مستقل طور پر تکلیف دہ تھی اور جب اس کی وجہ سے کافی بدعنوانی پھیل گئی تو پولیس افسر نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں گاؤں کے بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے اور لطیفہ کے باپ کو شریک ہونے کا بُلاوا بھیجا۔

مختار، گاؤں کا مُکھیا ہونیکی حیثیت سے سب لوگوں کے بیچ میں بیٹھا ہی تھا کہ لطیفہ کا باپ آگیا اور سبکو سلام کرکے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھیں پولیس افسر کے خوفناک چہرے پر لگ گئیں جو قالین پر ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔

"اے ابو عفیف!" مختار نے کہنا شروع کیا "خدا نکرے ہم تمہارے اندرونی معاملات میں دخل دیں لیکن تمہاری لڑکی تمام گاؤں اور یروشلم کے تمام شہر کے واسطے بدامنی کا سبب بن رہی ہے اس لئے ہم سب اور جناب مدیر (پولیس افسر) چاہتے ہیں کہ تم جلد از جلد اس طرف توجہ کرو۔"

ابو عفیف نے جواب دیا "اللہ تم سب کا بھلا کرے مگر میری لڑکی تو اس مصیبت کا سبب نہیں ہے بلکہ اس کی تمام ذمہ داریاں یہاں کے نوجوانوں پر ہیں جن میں سے بعض یہاں بیٹھے ہوئے حضرات کے صاحبزادے ہیں۔ وہ شادی کی تمنا کرتے ہیں لیکن شرط پوری نہیں کر سکتے۔ میں خود پریشان ہوں کیونکہ مجھے اپنی لڑکی کی اُن نوجوانوں سے حفاظت کرنی پڑتی ہے جو اُسے بھگا لیجانیکا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر نوجوانوں کو قبضے میں کر لیا جائے تو مصیبت کا چند خاتمہ ہو جائیگا۔"

"بڑے گستاخ ہو!" مختار نے چیخ کر کہا۔ "جناب مدیر کی موجودگی اور میرے سامنے اس قسم کی گفتگو کرتے شرم نہیں آتی۔ تم اپنی حرص کی وجہ سے اپنی بیٹی کو رکھنا چاہتے ہو اور اس طرح گاؤں میں فساد پھیلا کر تم ہمیں گورنمنٹ کی نگاہ میں ذلیل بناتے ہو۔ اگر تم لطیفہ کے لئے مناسب معاوضہ کی خواہش کرو۔ اور اسقدر زبردست رقم مانگو جو ایک شہزادی کے لئے طلب کیجاتی ہے، تو معاملہ فوراً طے ہو جائے۔"

"جو اللہ کی مرضی!" ابو عفیف نے پارسائی سے کہا "ایسی ہی بات ہے تو آپ میں سے کوئی صاحب اتنی رقم مجھے دیں جتنی شیخ کا لڑکا دے رہا تھا اور میں آج ہی نہایت خوشی سے اپنی بیٹی کو بیاہ دونگا۔"

دھمکیاں اور خوشامدیں بھی ابو عفیف کا لالچ کم نہ کر سکیں۔ آخر کار بُرا بھلا کہہ کر اُسے جلسے سے رُخصت کر دیا گیا اور بعد میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ تنگ آکر برہم افسر بولا "کچھ نہ کچھ فوراً کرنا چاہیئے ورنہ ہم تمہارے گاؤں کو ضبط کر لیں گے اور امن قائم کرنے کے لئے سب پر جُرمانے کرنے پڑینگے۔" اس دھمکی کے بعد وہ سُبک رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔

پولیس افسر کی دھمکیوں سے سب دم بخود رہ گئے اور جرمانوں کے خیال سے سب کی روح فنا ہو گئی کیونکہ کسی کسان کی جیب پر نگاہ ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر انتہائی ظلم توڑا گیا ہے۔ بہت دیر تک گفت و شنید ہوتی رہی اور بالآخر ایک تجویز سوچی گئی اور وہ یہ کہ گاؤں کے بڑے بڑے آدمی اپنے رشتہ داروں کو ــــــ جو اتنی بڑی رقم پیش کر سکیں ــــــ دور دراز سے بُلائیں تاکہ اُن

میں سے کوئی "دوشیزۂ سلوم" کو پسند کر کے ابوعفیف کی شرط پوری کر دے۔

دوسرے روز فنار بارکوں میں جا کر مدیر سے ملا کہ گاؤں والوں کو "دوشیزۂ سلوم" کا معاملہ طے کرنے کے لئے ایک ماہ کی مہلت دی جائے۔

(۳)

تین ہفتے گذرنے کے بعد بڑی مشکل سے بات قرار پائی۔ گاؤں میں پھر ہنگامہ برپا ہو گیا کیونکہ گاؤں کے نوجوان نہیں چاہتے تھے کہ حسین لطیفہ اُن کی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو۔

شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں اور کچھ روز بعد لطیفہ کو پھر غُسلِ عروسی دیا گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں مہندی رچائی گئی۔ اور بالوں کو خوشبودار تیل سے آراستہ کیا گیا۔ ابوعفیف نے بھی اس دفعہ فیاضی دکھائی اور شادی کے موقع پر ایک عالیشان دعوت کا انتظام کیا۔ ایک گائے اور چھ بھیڑیں ذبح کی گئیں۔ چاول، انڈے، آلو، مُرغیاں اور مٹھائی تیار کرائی گئی۔ اور عمدہ قسم کے شربت منگائے گئے۔

لطیفہ کو مایوں بٹھا دیا گیا۔ اس لئے اُسے صرف گاؤں اور شور وغُل سے معلوم ہو سکا کہ اُس کا دولھا کوئی بیس ساتھیوں کے ساتھ آ گیا ہے۔ دو روز تک سلوم میں گانا بجانا ہوتا رہا اور تیسری رات کو ——— جب دُلہن وداع ہونے کو تھی ——— ایسا معلوم ہوا کہ تمام دشمنیاں اور حسد آج جواب تک فساد پھیلاتے رہے، بھُولے جا چکے ہیں اور سب لوگ شادی سے مسرور ہیں۔

راس العمود کے نزدیک آگ روشن تھی اور بوڑھے اور جوان ایک گھیرے میں شادی کے قدیم رواج کے مطابق ناچ اور گا رہے تھے۔ پولیس افسر اور چند سپاہی بھی اس جشن میں شریک ہو کر رونق بڑھا رہے تھے۔

کوہِ زیتون کی بلند چوٹی پر قمرِ چہاردہم جلوہ فگن تھا اور ناچ گانا جاری تھا کہ ایک معمر راوی (پیشہ ور داستان گو) نے عہدِ رفتہ کا ایک طویل قصّہ چھیڑ دیا۔ سب لوگ اس کے اِردگرد جمع ہو گئے اور بُوڑھے آدمی کی داستان غور سے سُننے لگے۔ دفعتاً کرب کی ایک جگر خراش چیخ سُنائی دی اور لوگوں نے شعلوں کی مرتعش روشنی میں دیکھا کہ احمد ابن موسیٰ ابوالاعجاز جو لطیفہ کے پرستاروں میں تھا، فرش پر تڑپتے ہوئے دولھا کے سینے میں سے ایک چوڑا خنجر نکال رہا ہے۔ "تو اس سے شادی کرے گا! اجنبی کتّے!" وہ وحشیانہ انداز میں چیخا اور خنجر دوبارہ اُس کے سینے میں بھونک دیا۔

پیشتر اس سے کہ خوفزدہ لوگ سمجھ سکتے کہ اُن کی آنکھوں نے کیا دیکھا، احمد نے ایک چھلانگ ماری اور درختوں کے سایوں میں غائب ہو جاتا اگر نوشہ کا ایک ساتھی اسکو اپنے مضبوط ہاتھوں میں نہ پکڑ لیتا۔ اُس نے پوری طاقت سے اپنی کلہاڑی اُس کے سر پر ماری جس کی ضرب سے ابوالاعجاز چکرا کر گرا اور گرتے ہی مر گیا۔

احمد کا قاتل یہ دیکھ کر کہ مدیر نے پستول نکال لیا ہے اور سلوم کے تمام لوگ اپنے ہم وطن کا بدلا لینے کے لئے اُس کی طرف لپک رہے ہیں، وہ سٹ پٹا گیا اور پریشانی کے عالم میں گھنے درختوں کے تاریک سایوں کی طرف بھاگا۔ گرد و نواح سے انجان اور موت کے ڈر سے خائف اُس نے دس قدم ہی لئے ہونگے کہ وہ پہاڑ کی چوٹی سے پھسلا اور پتھروں سے ٹکراتا ہوا کُردان کی وادی میں لاش بن کر گر گیا۔

دولہا والے اور اہلِ سلوم کلہاڑیاں اور خنجر لئے ایک دوسرے پر حملہ کرنا چاہتے تھے کہ مدیر اپنے ہمراہیوں کو لیکر بیچ میں آگیا۔ دولہا والے گرفتار کر لئے گئے اور اہل سلوم کو فوراً گھروں میں چلے جانے کا حکم دیدیا گیا۔

ان درد انگیز اور المناک واقعات کو گیارہ سال گذر گئے لیکن لطیفہ اب بھی کنواری ہے۔ کوئی شخص، جسے اُن لوگوں کا حال معلوم ہے جنہیں اُس کی وجہ سے اپنی جانیں دینی پڑیں، اُس سے شادی کرنیکی جرات نہیں کرتا۔ ستائیس۲۷ سال کی عمر میں وہ ایک بوڑھی کنواری ہے اور کوئی نوجوان اُسے اب "دوشیزۂ سلوم" کے نام سے نہیں پکارتا۔ اُس کے مہلک حسن کے زائل ہوتے ہی اُس کے بے شمار پرستاروں کی آتشِ پرستش بھی سرد ہوگئی ہے اور اُس کا باپ ابو عفیف اس صدمے سے جانبر نہ ہوسکا جو اُسے دو ننھو پونڈ دوبارہ نہ ملنے سے پہنچا۔

لطیفہ دُنیا میں یکہ و تنہا رہ گئی تاکہ نوجوان نسلوں کے لئے کنویں سے پانی بھر کر اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائے۔ روایت کے مطابق "دوشیزۂ سلوم" جیسی حسین عورت ایک صدی میں ایک دفعہ پیدا ہوتی ہے اور مدیر گذشتہ تکالیف اور مصیبتوں کو یاد کر کے تمنّا کرتا ہے کہ کاش یہ روایت صحیح ہو۔

(مترجمہ) صادق الخیری بی۔ اے

لمعات

میں دل کو چیر کے رکھدوں یہ ایک صورت ہے
بیاں تو ہو نہیں سکتی جو دل کی حالت ہے

تجھے بھی علم ہے اے دل کی حسرتِ تعمیر
مری تمام خرابی تری بدولت ہے

مری زباں تو نہ اُٹھے گی وقت پرا اے دل
میں کسطرح یہ کہوں گا مجھے محبت ہے

کسی فریب میں پھر مبتلا ہوا ہوں میں
کسی سے آج مرے دلکو پھر شکایت ہے

مرے سفینے کو دھارے پہ ڈالدے کوئی
میں ڈوب جاؤں کہ ترجاؤں میری قسمت ہے

رگوں میں دوڑتی ہیں بجلیاں لہو کے عوض
شباب کہتے ہیں جس چیز کو قیامت ہے

لطافتیں سمٹ آتی ہیں خلد کی دل میں
تصوّرات میں اللہ! کتنی لذّت ہے

بجھا سکو گے تم اختر نہ آنسوؤں سے اسے
یہ کوئی آگ نہیں جذبۂ محبت ہے!

اختر انصاری دہلوی

ثمراتِ تخیّل

عہدِ حاضر میں یہ کیسی تیرے پیمانے میں ہے
کشمکش کا دورِ بے ہنگام خُم خانے میں ہے

سرگذشتِ دل ہوا اپنے قصۂ غم میں شریک
اک فسانہ اور بھی شامل اس افسانے میں ہے

آفتابِ روئے ساقی کے ہیں جلوے اسقدر
شام ہمرنگِ فروغِ صبح مے خانے میں ہے

ساقیٔ دوراں سے شکوۂ بیش و کم کا ہے فضول
ظرف جتنا اُس نے دیکھا اُتنی پیمانے میں ہے

تیری آمد کا سُنے پیغام کیا اے روزِ حشر
محو یہ بزمِ جہاں اپنے ہی افسانے میں ہے

آج میں آمادۂ دریا کشی ہوں مُغبچو
پوچھ لو ساقی سے کتنی اور مے خانے میں ہے

پھر ترے رنگین جلووں سے ہی پُر بزمِ خیال
پھر بہارِ خُلد مہماں اپنے کاشانے میں ہے

نوحہ خواں ہیں عظمتِ ماضی پہ ذرّے خاک کے
اک جہانِ بیکسی آباد ویرانے میں ہے

خاک پر گرتے کبھی دیکھی نہیں پیمانہ خاں
کیا سلیقہ تیرے میخوار دنیں میخانے میں ہے

کیا الم انگیز ہے انساں کی رودادِ حیات
حرف حرف اک دفترِ عبرت اس افسانے میں ہے

انجمن میں پارساؤں کی تھا یہ ذکرِ نہالؔ
اُس شرابی کی لحد سُنتے ہیں میخانے میں ہے

نہالؔ سیوہاروی

تخلیق کردار

سب سے پیشتر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ تخلیق کردار سے مطلب کیا ہے کسی شخص کا ایسا کیریکٹر دکھانا کہ اُس میں کوئی کمزوری ہی نہ ہو یہ از خود افسانہ نویس کی کمزوری ہے بعض اس عجیب و غریب غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اُن کے کیریکٹروں کو خوبی کا مجموعہ ہونا لازمی ہے صاحب افسانہ میں کوئی بُرائی اگر ہو تو نا سمجھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا کیریکٹر مُصنّف نے قابل تعریف نہیں دکھایا۔ گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ کبھی بدمعاش اور لُچّے کا ایک سرے سے قصہ ہی نہ لکھا جائے۔ بعض کے نزدیک اگر ہیرو کمزور طبیعت اور بے اصول انسان کو قصہ کا ہیرو بنایا تو گویا مصنّف ناکام رہا۔ تخلیق کردار کے مفہوم کو سمجھنے میں دراصل عوام بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اور بہت سے نومشق افسانہ نویس بھی اسی وہم میں گرفتار نظر آتے ہیں اور پھر مبتدی جو افسانہ نویس بننا چاہتے ہیں وہ تو ایک سرے سے اس کے قائل ہیں کہ صاحبِ افسانہ تمام خوبیوں کا مجموعہ ہونا چاہیئے۔ اُس سے کوئی قابلِ نفرت فعل سرزد ہی نہ ہونا چاہیئے۔ دنیا کی تمام خوبیاں صرف اُسی میں جمع کر دینا چاہئیں۔

تخلیق کردار کا دراصل یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ایک ایسا انسان پیش کیجیے جو فرشتوں کے کان کاٹے۔ ہرگز نہیں۔ تخلیق کردار کا اصل مطلب میری دانست میں یہ ہے کہ جس کریکٹر کو آپ پیش کریں وہ اتنا جیتا جاگتا اور ہم انسانوں سے ایسا ملتا جلتا ہو کہ اُس کے وجود میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہ جائے۔ اگر اُس کا کوئی فعل بھی قصہ کے واقعات کو مدِنظر رکھتے ہوئے غلط ثابت ہو گیا تو وہی کمزوری ہے۔ جو کیریکٹر آپ نے تخلیق کیا ہے اُس میں لازمی نہیں کہ خوبیاں ہی خوبیاں ہوں۔ انسانی کمزوریاں بھی اُس میں ہونا چاہئیں۔ اگر آپ نے قصہ میں شروع سے آخیر تک مجموعی طور پر کوئی لغزش نہیں کی اور اپنے کیریکٹر کو انسانیت کے دائرے سے نکالکر فرشتوں یا شیطانوں کے زمرہ میں شامل نہ کر دیا تو آپ کامیاب ہیں۔ آپ کے قصّوں کے "صاحب افسانہ" اچھے بھی ہونگے اور بُرے بھی۔ عقلمند بھی ہونگے اور بیوقوف بھی۔ رحمدل بھی ہونگے اور بیرحم بھی۔ وہ کیسے ہی ہوں۔ آپ کا فرض یہ ہے کہ اُن میں جان ڈالدیجیے اور بس۔ ان کے افعال اگر واقعات سے منطبق ہیں اگر گردوپیش کے واقعات سے ان کے جذبات صحیح اور قدرتی طور پر متاثر ہوتے ہیں اور جس فضا میں آپ انکو پرورش کرتے ہیں اُن سے وہ قدرتی طور پر متاثر ہوتے ہیں اور وہ قوانین قدرت کے تابع ہیں تو آپ کامیاب ہیں۔ اور یہی تخلیق کردار ہے۔ کسی افسانوی شخصیت کو پیش کرنا۔ مختلف افعال اُس سے سرزد ہونا۔ بولنا چالنا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے واقعات مرتب ہونا اور اُن واقعات کا ملکر افسانہ کا مُرتب ہونا۔ یہ تمام مراحل ہیں جو آپ کا تخلیق کردہ کردار طے کرتا ہے اور ان تمام مراحل کو اس طرح طے کرانا کہ کہیں قصہ اکھڑ نہ جائے۔ کہیں آپ کا کیریکٹر انسانیت سے خارج نہ ہو جائے۔ کہیں آپ کا تخلیق کردہ کیریکٹر فرشتہ نہ ہونے پائے۔ انسانیت سے خارج ہونے پائے نہ تو گونگا ہو جائے اور نہ بہرا ہو جائے۔ نہ اندھا ہونے پائے اور نہ دن کو تارے دیکھنے پائے۔

غرض یہ تمام ذمہ داریاں آپ پر ہیں اور جس افسانہ نویس نے ان مراحل کو خوبی کے ساتھ طے کرالیا وہ کامیاب ہے۔

طریقہ

یہ سوال بہت دشوار ہے کہ وہ کیا طریقے ہیں جنکو اختیار کرنا چاہیئے تاکہ تخلیق کردار کرنا آجائے۔ میری دانست میں غالباً کوئی بھی عملی طریقہ نہیں بتایا جا سکتا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ صحیح طریقے کیا ہیں لیکن غلط سلط اور برے افسانوں کو پڑھکر میں نے چند نتائج اخذ کئے ہیں جن کا ذکر لازمی ہے۔

میری دانست میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ افسانہ نویس خود کو نہ بھول لے۔ ہر شخص اپنے بارہ میں جانتا ہے کہ میں کیسا ہوں۔ برا یا اچھا۔ اپنی برائیاں اور اپنی خوبیاں پیش نظر رہنا چاہئیں۔ افراد افسانہ کو اپنا ہی سا انسان سمجھنا چاہیئے۔ ہرگز اسکو وہ خوبی مت دیا کرو جسکو تم خیال کرتے ہو کہ خود تم میں نہیں ہے اور نہ آسکتی ہے اور ہرگز کسی کو وہ برائی مت دیدو جو تم میں نہ ہو یا آنہ سکتی ہو۔ آپ کہیں گے کہ افسانوں میں اچھائیاں اور برائیاں ایسی دکھائی جاتی ہیں جو ہم میں نہ تو موجود ہیں اور نہ آسکتی ہیں۔ یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔ میں اسکو اس طرح حل کرتا ہوں کہ اگر خدا کے فضل و کرم سے آپ اتنے بڑے نہیں ہیں تو شکر ہے لیکن افسانہ کے لئے تھوڑی دیر کو آپ امکان کے مسئلہ پر غور کر لیجئے اور پھر جس طرح بھی ممکن ہو افسانہ پورا کیجئے۔

سطحی نظر سے ردی اور غلط افسانوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ افسانہ نویس کی اپنی ذات افسانہ سے معدوم ہے۔ افسانہ نویس کو چاہیئے کہ ہر کیریکٹر میں خود موجود ہو تاکہ کم از کم اس بات کا اندیشہ تو جاتا رہے کہ کوئی کیریکٹر لوٹ پوٹ کر فرشتہ نہ ہو جائے۔ کسی کیریکٹر کی جگہ بھی اگر افسانہ نویس کو رکھ دیا جاتا تو خود افسانہ نویس بھی ہرگز وہ باتیں نہ کرتا جو وہ کیریکٹر کرتا دکھایا گیا ہے۔ دراصل افسانہ نویس کیریکٹر کو وہ کرتے دھرتے دکھاتے ہیں جو خود انکو پسند ہے اور اُن کی دانست میں کرنا چاہیئے۔ گو وہ خود ہوتے تو انکا دل جانتا ہے کہ ہرگز نہ کرتے یا نہ کر سکتے۔ گویا جو بات ہوتی اسکو تو وہ چھوڑ دیتے ہیں اور جو بات اُن کی دانست میں ہونا چاہیئے تھی اُسے وہ افسانہ میں پیش کرتے ہیں۔ افسانہ کو نذر جذبات و نذر نظریات کر دیتے ہیں۔

دوسرا طریقہ تخلیق کردار میں کامیابی حاصل کرنے کا یہ ہے کہ کسی کیریکٹر کو نیکی یا بدی کی عام سطح سے بلند نہ کرو۔ نہایت ہی سختی سے افسانہ پر نظر رکھو کہ تمہارا ہیرو کہیں بھی عام انسانوں سے خصوصیت حاصل نہ کرنے پائے۔ تمہارا ہیرو کسی جگہ بھی اگر کسی لحاظ سے بھی بہترین یا بدترین ہو گیا تو اندیشہ ہے کہ تم نہ ہو نہ کہا جاؤ گے۔ ایک نہایت ہی معمولی صفت کے انسان سے زیادہ اسکو کبھی درجہ مت دو۔ مثال کے لئے میں ایک افسانہ کا پلاٹ پیش کرتا ہوں جو کل ہی مجھے ایک صاحب نے بغرض اصلاح دکھایا ہے۔

افسانہ یہ ہے کہ ایک صاحب دفتر سے تشریف لاتے ہیں تو پڑوس کا ایک لڑکا اپنی ماں کا پیغام لاتا ہے کہ آپکو بلایا ہے۔ یہ جاتے ہیں تو معلوم کرتے ہیں کہ بیوہ کا جوان لڑکا جو واحد ذریعہ آمدنی تھا پاگل ہو گیا اور اب دو چھوٹے بچوں اور خود ماں اور پاگل کا کوئی کفیل نہیں رہ گیا۔ وہ مستدعا کرتی ہے اور یہ قبول کر لیتے ہیں کہ آج سے سب گھر کے کفیل ہو گئے۔ اس بیوہ کے شوہر کے بھائی کو جو بہت متمول ہے یہ بار بار لکھتے ہیں مگر وہ نہیں سنتا۔ حتیٰ کہ نوبت یہ آتی ہے کہ پاگل لڑکا مر جاتا ہے۔ اور بچے بھی مر کھپ جاتے ہیں اور بیوہ بھی صدموں سے ختم ہو جاتی ہے۔ تار جاتا ہے تو بیوہ کے شوہر کا بھائی جواب بھی نہیں دیتا۔

اب اس پلاٹ کو دیکھئے۔ دفتر میں کام کرنے والے صاحب ایک پورے گھر کا بار اپنے سر لیتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ یہ

ناممکن ہے بلکہ غرض یہ کرنا ہے کہ لکھپتی ہی ایسا نہیں کرتا اور جو اس حیثیت کا آدمی کرتا ہے وہ عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند ہے۔ بیوہ کے شوہر کے بھائی کے سے سینکڑوں شقی القلب ہونا ممکن ہیں اور ہوتے ہیں مگر اس قصہ میں اُس کا کیریکٹر بدترین ہے جیسا لاکھ میں نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہر معاملہ میں اس طرح کی انتہا پسندی ہے کہ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر کیریکٹر اس افسانہ کا صرف اسی افسانہ کے لئے تخلیق کیا گیا تھا۔ تمام کیریکٹر انسانیت سے خارج ہیں۔ یا فرشتے اور یا شیطان۔ نتیجہ یہ کہ قصہ ایک نہایت بھدّی گھڑنت ہو کر رہ جاتا ہے۔ قصہ کا جو کچھ بھی پلاٹ ہے اُس کے کیریکٹر اگر انسانی ہوتے تو ہرگز خرابی نہ پیدا ہوتی۔ وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نویس نے افسانہ لکھتے وقت خود اپنی ہستی کو بھلا دیا۔ نہ تو وہ خود انصاف سے اگر دیکھیں تو اتنے اچھے ہو سکتے تھے کہ بڑھیا دسن کو عمر بھر کھلانے کا ٹھیکہ لیلیں اور نہ بیوہ کے شوہر کے بھائی اگر وہ خود ہوتے تو بھتیجوں اور بھائی کی بیوہ کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتے تھے۔

جہاں تک ممکن ہو اپنے کیریکٹروں کی ذہنیت ہمیشہ معمولی رکھو۔ کوئی قوت انکو ایسی مت عطا کرو جو غیر معمولی ہو افسانہ کے ہر قدم پر یہی خیال رکھو کہ اگر تم خود ہوتے تو اُس جگہ کیا کرتے۔ یہ ہرگز مت سوچو کہ کیا کرنا مقتضائے شرافت تھا یا کیا کرنا قابل تعریف ہوتا بلکہ یہ سوچو کہ ایک معمولی انسان اگر ایسے موقعہ پر ہوتا تو وہ کیا کرتا۔

اِس بات کا خیال رکھو کہ بُرے سے بُرے آدمی میں بھی کچھ اچھائیاں ہوتی ہیں اور اچھے سے اچھے آدمی میں کچھ نہ کچھ بُرائیاں ممکن ہیں۔

انسانی فطرت کا صحیح طور پر مطالعہ کر کے لکھو۔ آج کل مبتدی افسانہ نویس جو ٹھوکر کھاتے ہیں وہ محض اسوجہ سے کہ انسانی فطرت کا مطالعہ نہیں کرتے۔

اِس بات کا پختہ ارادہ کر لو کہ جو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے وہ لکھیں گے اور جو دیکھو وہ لکھو۔ جو خود تجربہ میں آیا ہو وہ لکھو۔ اور جو نہ تو تمہارے خود کے تجربہ میں آیا ہے اور نہ تم نے خود دیکھا ہے اور محض سُنا ہی سُنا ہے وہ ہرگز مت لکھو جب تک تم اپنی آنکھ سے خود نہ دیکھ لو کہ اس گوشت و پوست کی دُنیا میں ایک ایسا آدمی موجود ہے اُس وقت تک تم ہرگز ہرگز اپنے کیریکٹروں میں ویسا آدمی نہ پیش کرو۔ کیا کبھی تم نے غور کیا ہے کہ سچ سچ تم نے ویسے خصائل کا آدمی خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے جیسا تم اپنے افسانہ میں دکھا رہے ہو؟ کیا تم نے کبھی اس امر پر غور کیا ہے کہ تم نے آج تک کوئی ایسا اچھا آدمی نہیں دیکھا جیسا تمہارا ”صاحب افسانہ“ ہے؟ کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ تمہارے ایک افسانہ کے ”صاحب افسانہ“ کے افعال ایسے ہیں کہ کم از کم تم نے کبھی ایسا شخص نہیں دیکھا جس نے ایسے اچھے یا بُرے کام کئے ہوں؟ اگر غور کیا ہے تو تمہارے کیریکٹر افسانہ نویسی کے اصول پہ پورے اُتریں گے اور اگر تم نے ان امور کی طرف سے خالی الذہن ہو کر افسانہ لکھا ہے تو تم ناکام ہو گے۔

اِس بات کا خاص خیال رکھو کہ تمہارے افرادِ افسانہ کے افعال و اقوال سے تمہارا افسانہ مرتب ہو گا اور اُن کے افعال و اقوال ایسے ہونا چاہئیں کہ جیسے عام آدمیوں کے ہوتے ہیں۔ اُن میں ذرہ بھر خصوصیت نہ رکھو۔ اگر مجبوراً کہیں ایسا کرنیکی ضرورت ہو تو افسانہ میں پہلے اسباب پیدا کر لو۔ مثال کے طور پر ایک کنواری شرمیلی قدرتاً ہوتی ہے۔ اگر تم اس کلیہ کے خلاف کوئی بات کرو تو پہلے اُس کے اسباب مہیا کر لو۔ افسانہ میں اسباب ایسے پیدا کر کے دکھا دو کہ لڑکی شرم توڑنے پر مجبور ہو جائے۔

اگر تم نے ایسے اسباب مہیا نہیں کئے اور کنواری سے کوئی ایسا فعل سرزد کرا دیا جو اس کلیہ کے خلاف ہو تو یہ غلطی ہے۔ یہ مانا کہ ایسی کنواریاں بھی ہوتی ہیں جو شرم نہیں کرتیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیوں آپ کا تخلیق کردہ کیریکٹر خاص الخاص قسم کا ہو۔

کیریکٹروں کی تخلیق میں ناکامی کا ایک اور بھی عام سبب ہے۔ وہ یہ کہ اکثر افسانہ نویس واقعات سے منکر ہو کر تخیلات میں جاتے ہیں۔ افسانہ نویس کو ہر دم یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ خواہ اچھا ہو یا برا جو کچھ بھی روزانہ ہوا کرتا ہے وہی اپنے افسانوں میں دکھائے۔ مطلب میرا یہ ہے کہ ایک تو ہماری موجودہ معاشرت ہے۔ جو اپنی خوبیوں اور برائیوں کے ساتھ ایک ٹھوس حقیقت کی طرح موجود ہے۔ اب اس معاشرت میں سے برائیاں نکال ڈالی جاویں تو وہ خیالی معاشرت رہ جاتی ہے جو نصب العین ہے اور جس کا وجود محض خیالی ہے۔ افسانہ نویس یہ کرتے ہیں کہ اس خیالی معاشرت کو پیش نظر رکھ کر افسانہ لکھتے ہیں نتیجہ یہ کہ انکے کردار مردہ ہو جاتے ہیں۔ گویا اگر آپ بجائے حقیقت کے تخیل یعنی آئیڈیل پیش کیجئے گا وہیں آپکے کرداروں میں کمزوری آجائیگی۔ وہ بات دکھایئے جو ہے۔ اور اسے دکھانے کی مت کوشش کیجئے کہ جو ہونا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے آپ کے کرداروں میں جان پڑ جائے گی۔

ایک غلطی یہ بھی ہوتی ہے کہ بسا اوقات کرداروں کو کہانی کا ماتحت بنا دیا جاتا ہے۔ قصہ کا پلاٹ ہی مجبور کرتا ہو کہ افسانہ کا کوئی خاص فرد کسی خاص فعل کو کرے اور اگر ایسا نہ ہو تو سب قصہ ہی بگڑ جاتا ہو۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ایسے افراد بے جان ہونگے۔

بعض افسانہ نویس قصہ کو کسی خاص نتیجہ پر پہونچانے کی خاطر اپنے تخلیق کردہ کردار کو خواہ مخواہ پھانسی دیدیتے ہیں۔ قصہ کو دیکھتے ہوئے اسکا نتیجہ نکلنا چاہیئے کچھ۔ اور نکالتے ہیں نتیجہ بالکل ہی مختلف۔ اور یہ ممکن جب ہی ہوتا ہے کہ کسی فرد افسانہ سے ایسی بات سرزد کرادی جائے جو بے محل اور بے تکی ہو۔ ایسا زیادہ تر وہ لوگ کرتے ہیں جو اصولاً اپنے افسانے کسی خاص مقصد کیلئے لکھتے ہیں۔

زیادہ تر افسانہ نویس تخلیق کردار میں ناکام ان افسانوں میں نظر آئیں گے۔ جو کسی اصلاح کی نیت سے لکھے گئے ہیں۔ پردہ کی حمایت میں مغربی تعلیم کی خلافت میں۔ مذہبی تعلیم کی حمایت میں۔ عورتوں میں فیشن کی وبا روکنے کے لئے۔ لڑکیوں کو انگریزی تعلیم سے باز رکھنے کے لئے اور اسی قسم کے مقاصد حاصل کرنیکے لئے جو افسانے لکھے گئے ہیں انکو غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس دور کے افسانوں میں وہ بدترین افسانے ہیں۔ افسانہ نویسی کیلئے وہ افسانے باعث ذلت و خواری ہیں۔ تخلیق کردار کا جہاں تک تعلق ہے ان افسانوں کو اس سے بے نیاز پایئے گا۔ اس قسم کے افسانے محض ایک خاص اور محدود اور مذہبی طبقہ کا دل بہلانے کے علاوہ اور کسی کام کے نہیں ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی

خود دریابی

خود ہی مے ہوں خود ہی خُم ہوں خود ہی خُمخانہ ہوں میں
بے نیازِ ساقی و مینا و پیمانہ ہوں میں

مظہرِ نورِ حقیقت ہے مری دیوانگی
عقلِ کُل ہی جسکے قرباں ہو وہ دیوانہ ہوں میں

بے نیازِ شمعِ محفل ہے مرا سوز و گداز
خود ہی شمعِ حسن ہوں اور خود ہی پروانہ ہوں میں

جلوہ گاہِ نورِ حق ہوں اور خود آگاہ ہوں
جلوہ ہائے محفلِ ہستی سے بیگانہ ہوں میں

خاک ہوں لیکن نہاں ہیں مجھ میں انوارِ ازل
جس میں پوشیدہ ہیں گنجینے وہ ویرانہ ہوں میں

سجدہ گاہِ دو جہاں ہے آستانِ دل مرا
بے نیازِ کعبہ و دیر و صنم خانہ ہوں میں

آ مرے سینہ میں ہو گرمِ تماشا اے کلیم!
جلوہ ہائے دو جہاں کا آئینہ خانہ ہوں میں

کیفِ صہبائے محبت کو نہیں بیمِ خمار!
جاوداں ہیں مستیاں جسکی وہ مستانہ ہوں میں

بادۂ حق و صداقت سے اثرؔ سرشار ہوں
خوابگاہِ دہر میں غوغائے مستانہ ہوں میں

اثرؔ صہبائی

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد اور ناول نویسی

مبصرین علم وادب کا قول ہے کہ تاریخ وافسانہ اپنے مقاصد اور دلچسپی کے اعتبار سے ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اگر دونوں معلم الاخلاق بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو دونوں کے ذریعے حضرت انسان کی طرز معاشرت اور تہذیب وتمدن اور عادات واطوار کی صحیح تصویر پیش کی جاسکتی ہے۔ ان دونوں کے وجود میں آنے کا سب سے اہم سبب بس یہی ہے کہ موجودہ نسل انسانی کو نہایت دلچسپ طریقہ اور اقل ترین دماغی کاوش سے اپنے اسلاف اور اپنے ہم جنس بھائیوں کے کارناموں اور انکی خصوصیات سے کماحقہ واقفیت ہوجائے۔ ہر زمانہ کے ادب لطیف کا غائر مطالعہ کرنے سے اس زمانہ کی معاشرتی تواریخ اور رسم ورواج کی کیفیت بآسانی لکھی جاسکتی ہے۔ اور اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو یہی کہ تواریخ "واقعات" کا تذکرہ ہے اور افسانہ حقیقی تواریخ کا مرقع۔ افسانہ جذبات اور احساسات انسان کی تواریخ ہے۔ انسان کے کسی شعبہ زندگی کے صحیح نفسیاتی خاکہ کو افسانہ کہا جاتا ہے۔ اسی لئے تو اسے حقیقت سے اسیقدر قرب ہوتا ہے جتنا کہ تواریخ کو عدم حقیقت سے۔ دُنیا کی موجودہ تواریخی کتب کا مطالعہ کرنیکے بعد ہر ہوشمند اور حقیقت بین نگاہ بآسانی تاڑ سکتی ہے کہ ان کے لکھے جانے کا مقصد حقیقت کی پردہ پوشی ہے۔ مورخین نے جن انسانوں کو پیش کیا ہے وہ انسانیت سے تہی دست اور مورخ کی ذاتی غرض کا شکار ہیں۔ وہ انسان تو بیشک ہیں صرف خشک اور کرخت ہڈیوں کے ڈھانچے۔ نہ انکی فطرت کا پتہ چلتا ہے اور نہ انکی خصوصیات کا بیکن برخلاف اسکے حضرت انسان کی جو دلکش تصویر افسانہ نویسوں نے پیش کی ہے وہ مجاز افسانہ کو حقیقت تواریخ کا حریف ہی نہیں بلکہ عواطف وامیال انسانی کا ایک رنگین مرقع بھی بنادیتی ہے

اس رزمگاہِ حیات میں انسان ہر وقت فکر کسب معاش میں پریشان رہتا ہے۔ تمام دن اور رات کے بھی ایک بیشتر حصہ تک جسمانی اور دماغی محنت کرنیکے بعد فلسفہ سائنس یا سیاسیات کا مطالعہ کرنا ایک محنت شاقہ جسے برداشت کرنا امر محال ہے جن خوش قسمتوں کو دن بھر کوئی کام نہیں اور جو ہوادار کمروں اندآرام کرسیوں پر لیٹے یا سیر وسیاحت میں وقت عزیز گذار سکتے ہیں۔ ان کے لئے ایسے اہم مضامین کا مطالعہ نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہے۔ لیکن ایسے خوش قسمت بہت ہی کم ہیں۔ آبادی کا ایک کثیر حصہ ہر وقت فکر معاش میں کھویا رہتا ہے۔ یہ لوگ یا تو افسانوں اور ناولوں سے دلچسپی اور تفریح حاصل کرسکتے ہیں یا کچھ نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے یوروپین مصنفین تاریخ وفلسفہ سیاسیات وسائنس وغیرہ دقیق موضوع پر ناول پیش کررہے ہیں، تاکہ اس دلچسپ وسیلہ سے ہی ان مصروف ہستیوں کو دنیاوی ترقیوں اور انکشافات سے باخبر رکھا جائے اور ان علوم کے خشک اصول اقل ترین دماغی کاوش سے ذہن نشین ہوجائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ نے افسانوں اور ناولوں کو ادب کا سب سے اہم اور نہایت ضروری جزو تسلیم کرکے ناول نویسی کو ایک فن کا رتبہ دیدیا ہے۔

تاریخ عالم پر ناقدانہ نگاہ ڈالئے، معلوم ہوگا کہ افسانہ گوئی ہی دُنیا کا قدیم ترین فن ہے۔ ہنگامہ پسندی اور تنوع پرستی حضرت انسان کی فطرت کا خاصہ ہے۔ اسلئے بُت تراشی، مصوری اور دیگر فنون لطیفہ کی پیدائش سے بھی بہت پیشتر افسانہ اسکی دلچسپی کا باعث بن چکا

تھا بقول حکمائے یونان قصہ گوئی، شاعری اور موسیقی کی دیویوں سے بھی قدیم تھے۔ کیونکہ جسوقت اُنھوں نے جنم لیا یہ موجود تھا۔ یہ ہمیشہ ان کا مونس رہا اور اپنی دلفریبیوں سے ان کے کانوں کو لذت اندوز کرتا رہا ہے، اسکی جہانگیری اسی بات سے ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم یا کوئی انسان ایسا نہیں جس کے کان اس سے ناآشنا ہوں محققین علم و ادب کو اس بات پر اتفاق ہے کہ ابھی دُنیا کی کسی زبان کے ابتدائی قواعد بھی مدون نہ ہوئے تھے۔ مگر قصے اور کہانیاں بوڑھوں کے نوکِ زبان اور بچوں کے صفحۂ دل پر منقوش تھیں، مقدس ہستیوں کے حالات اور بہادروں کے کارنامے سینہ بہ سینہ چلے آتے تھے۔ عہد قدیم کے متعلق جو کچھ تواریخی مواد دستیاب ہوا ہے وہ سب قصہ کہانیوں سے ماخوذ ہے، اس میں شک نہیں کہ ان قصوں میں جانوروں اور بیجان چیزوں سے انسانوں کا کام لیا گیا ہے۔ مافوق الفطرت واقعات انکی رُوح رواں ہیں۔ اور جہاں کہیں حضرت انسان کے کارنامے بیان کئے ہیں تو انکی ہیرو یا تو فرشتہ خصلت یا دیو یا شیطان سیرت ہیں۔ اسی طرح ہیروئن یا تو اندر کے اکھاڑے کی پریاں ہیں یا چڑیلیں۔ گو اس قبیل کے قصوں اور کہانیوں سے واقعات مصدقہ کی بجائے مصنفین کے تخیل اور ذہنیت کا پتہ چلتا ہے لیکن بایں ہمہ انھوں نے تاریخ عالم کی تدوین میں جو نمایاں حصہ لیا ہے اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ قصوں اور کہانیوں کی مقبولیت اور دلنوازی کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دُنیا کے تمام مذاہب کی مقدس اور الہامی کتابوں مثلاً انجیل، توریت، وید اور قرآن پاک میں انھیں ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔ الغرض دُنیا کو ابتدائے آفرنیش سے ہی قصوں اور کہانیوں سے دلچسپی رہی ہے اور جب تک دنیا قائم ہے اسکی دلنوازی اور دلفریبی کا اثر قائم رہیگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مذاق اور ذہنیتوں کے انقلاب کے ساتھ ساتھ قصے اور کہانیاں بھی نئے نئے لباس میں جلوہ گر ہوتی رہیں گی۔

یہ بتانا بہت ہی مشکل ہے کہ قصوں اور کہانیوں کو باضابطہ بیان کرنے یا قلمبند کرنیکا کام سب سے پہلے کس ملک اور کس قوم نے کیا لیکن مبصرین کو اس بات پر اتفاق ہے کہ تقدم بلحاظ زمانہ مشرقی قصوں اور کہانیوں کو ہی حاصل ہے اور افسانہ کی وہ صنف جسے ناول کہا جاتا ہے اور جو فی زمانہ یورپین ادب کا جزو لاینفک بن گئی ہے۔ سب سے پہلے مشرق میں نمودار ہوئی۔ جاپانی ادب میں نثریہ افسانوں کی ابتدا دسویں صدی مسیحی کے آغاز میں ہی ہو چکی تھی۔ سراساکی نوشکلین نامی ایک خاتون نے سب سے پہلا جاپانی ناول "گنگی مانوگاتری" ۱۰۰۴ء میں تصنیف کیا تھا، یہ ناول جاپان کے ادب عالیہ میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح چین میں بھی سولہویں صدی مسیحی سے قبل ہی بلند پایہ ناول تصنیف ہو چکے تھے، ہندوستان میں بھی افسانہ نویسی کا وجود ابتدائے تواریخ سے ہی پایا جاتا ہے۔ ادبِ سنسکرت کا انمول خزانہ منظوم قصوں اور نثریہ افسانوں پر ہی مشتمل ہے "رامائن" اور "مہابھارت" کے نیم تواریخی افسانے "ہتواپدیش" اور "شکنتلا" کے علمی اور اخلاقی قصے اپنی بلند پروازی تخیل اور بندش کی رنگارنگی کے لحاظ سے بے مثل مانے گئے ہیں۔ ہندوستان کی دیگر قدیم و جدید زبانوں میں بھی ایک سے ایک بلند پایہ افسانے موجود ہیں۔

اُردو افسانے ادبِ لطیف اور افسانوں کی پیدائش کیطرف اسی وقت توجہ دیجاتی ہے جب ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ یا اُسوقت جب کوئی قوم فنون جنگ سے نفرت کرنے لگے اور عیاشی اور بے فکری میں مبتلا ہو جائے۔ اب ان دونوں نظریوں کی روشنی میں ادبِ اُردو پر نگاہ ڈالئے۔ معلوم ہوگا کہ اُردو اس وقت پیدا ہوئی جب کہ ہندوستان میں سلطنت اسلامی کا ستارہ اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکا تھا مسلمان نہ صرف خوشحال تھے بلکہ دولت سے کھیلا کرتے تھے۔ چنانچہ دورِ ابتدائی میں سوائے منظوم قصے کہانیوں کے اور کیا رکھا ہے۔ اسکے بعد جب زبان نے نشو و نما پا کر بچپن میں قدم رکھا تو محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ تھا، ہر طرف عیش و نشاط کی مجلسیں گرم تھیں۔ گو

اسی زمانہ میں نادر شاہ ایسے سفاک حکمران نے ملک پر حملہ کرکے شہروں کو تاخت و تاراج کیا پشتوں کی جمع کی ہوئی دولت لوٹ لی۔ لیکن وہ ایک بادل تھا کہ گرجا برسا اور دیکھتے دیکھتے کھل گیا۔ اس حملہ کا ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر اول تو کوئی خاص اثر پڑا ہی نہیں۔ اور اگر پڑا بھی تو بالکل معمولی، نادر شاہ کے ہندوستان سے جاتے ہی پھر عیش و نشاط کی مجلسیں گرم ہوگئیں۔ کہ گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

مورخین نے اُردو کے افسانوی ادب کو چھ حسبِ ذیل دوروں پر منقسم کیا ہے :۔

(۱) ۱۰۸۳ھ ہجری سے ۱۲۰۰ھ ہجری تک، اس دور کا سب سے اہم کارنامہ "طوطی نامہ" ہے جو ابن نشاطی نے ۱۰۸۳ھ ہجری کے قریب لکھا تھا۔ سودا نے بھی اسی دور میں میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کو نثر کا جامہ پہنایا۔

(۲) ۱۸۰۰ء–۱۸۳۶ء، اس دور میں جس قدر بھی افسانے تصنیف یا تالیف ہوئے وہ سب فورٹ ولیم کالج کے علم دوست انگریزوں اور خاص کر جان گلکرائسٹ کی کوششوں کے مرہون منت تھے۔ ان میں زیادہ تر فارسی اور سنسکرت افسانوں کے تراجم ہیں۔ جن میں میر امن دہلوی کی "باغ و بہار"۔ حیدر بخش حیدری کی "آرائشِ محفل" اور نہال چند لاہوری کی "گل بکاولی" زیادہ مشہور ہیں۔ اس دور کا امتیاز خصوصی زبان کی سادگی و سلاست ہے۔

(۳) ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء تک اس دور میں افسانے بہت کم لکھے گئے اور جو لکھے بھی گئے وہ اپنے اسلوب بیان کے تکلفات کی وجہ سے بہت کم مقبول ہوئے۔

(۴) ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک۔ اس زمانہ میں انگریزی ادب کا اثر ادب اُردو پر بھی پڑنے لگتا ہے۔ اور کوشش کیجاتی ہے کہ اردو افسانوں کو بھی انگریزی افسانوں کی وضع پر ڈھالا جائے۔ اس دور کی سب سے اہم پیداوار مولانا نذیر احمد کے اخلاقی ناول اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کا "فسانہ آزاد" ہیں۔

(۵) ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۶ء تک اس دور میں جس قدر بھی افسانے اور ناول تصنیف و تالیف کیے گئے ان میں سے زیادہ تر انگریزی افسانوں اور ناولوں کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ مولانا عبدالحلیم شرر، منشی سجاد حسین، مولوی بشیر الدین احمد، اور مولانا راشد الخیری وغیرہ کے تاریخی۔ ظریفانہ اور اخلاقی ناول اسی زمانہ میں تصنیف ہوکر مقبول ہوئے۔

(۶) یہ دور ۱۹۱۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اسکی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اردو افسانوں اور ناولوں پر انگریزی ادب کے علاوہ روسی اور فرانسیسی ادبیات کا بھی نمایاں اثر پڑنے لگا ہے۔ اس دور میں مختصر افسانے زیادہ اور قابل قدر اور مقبول عام ناول بہت ہی کم لکھے گئے ہیں جسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ رسالوں اور اخبارات کی افراط کے سبب سے مختصر افسانوں کی مانگ زیادہ ہے۔ اور طویل افسانے یا ناول کساد بازاری اور بد ذوقی کی وجہ سے بہت ہی کم لکھے جاتے ہیں۔ ۱۹۲۲ء کے قریب پنجاب اور یوپی کے بعض شہروں میں بیشمار ناول شائع ہوئے۔ لیکن وہ اپنی افسانویت اور زبان کے لحاظ سے بہت ہی پست اور واہیات ہیں۔ اس دور میں صرف مرزا محمد ہادی رسوا۔ حکیم محمد علیخاں۔ منشی پریم چند۔ سدرشن۔ نیاز فتحپوری۔ مسٹر سجاد حیدر۔ اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے ناول و افسانے قبول عام کا تمغہ حاصل کرسکے ہیں۔

ناول اور قصے کی امتیازی خصوصیات

اس میں شک نہیں کہ ناول کو قصوں اور کہانیوں کی ارتقائی صورت کہنا زیادہ مناسب ہے لیکن اگر آپ نے "باغ و بہار" "آرائشِ محفل" "گل بکاولی" وغیرہ قصوں اور مولانا نذیر احمد، مولانا عبدالحلیم شرر، منشی پریم چند اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے ناولوں اور افسانوں کا بغور مطالعہ کیا ہے تو آپ کو

معلوم ہوگا کہ دونوں طرز کے افسانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان دونوں طرزوں کی نہایت اہم اور بین امتیازی خصوصیت بس یہی ہے کہ ناولوں میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں وہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اور اسکے برخلاف طرز قدیم کے قصوں کو حقیقت سے بہت کم تعلق ہے۔ ان میں نہ صرف مافوق الفطرت عنصر موجود ہوتا ہے۔ بلکہ انہیں ان کے مصنفین کے تخیل کی بلند پروازی۔ وسعتِ خیال اور بندش کی رنگارنگی کے شاہکار کہنا زیادہ مناسب ہے۔ قدیم قصے زیادہ تر فارسی قصوں کے تراجم یا انہی کی تقلید میں لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے ان میں ہیرو اور ہیروئن بھی عربی و ایرانی نژاد ہیں۔ اور ان کے پلاٹ کا بھی ایران اور عرب کی سرزمین سے تعلق ہے مصنفین نے اپنے توسنِ طبع کی جولانیاں دکھانے کیلئے ایک ایسے میدان کا انتخاب کیا ہے جسکی ہر شے ایک طلسم نظر آتی ہے۔ پریاں۔ جن۔ دیو۔ اور عجیب الخلقت ہستیاں اشخاص قصہ کا کام دیتی ہیں۔ ان قصوں کو شروع سے آخر تک پڑھیئے، صداقت حیات کے قیود کا پتہ تک نہیں ملیگا۔ اور نہ ان کا اسلوب بیان جذبات و احساسات انسانی کو متاثر کرسکتا ہے۔ ان کا اہم عنصر عشق ہے جو قصے کی دلچسپی کی جان ہے۔ بعض مصنفین نے تو قصہ کو اس بیہودگی سے بیان کیا ہے کہ اخلاق کی مروجہ بندشوں کو پارہ پارہ کرکے رکھدیا ہے۔

۱۸۵۷ء کا غدر فرو ہونے کے بعد جب اسلامی سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل ہوگیا اور تمام ملک پر انگریزوں نے تسلط کرلیا۔ انگریزی زبان اور مغربی علوم کی ترویج کیلئے کلکتہ اور بمبئی کی یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں تو پبلک کی ذہنیت اور مذاق میں بھی ایک انقلاب رونما ہوا۔ ”بوستانِ خیال“۔ اور ”طلسم ہوشربا“ کی پُر لطف اور رنگین داستانیں بے مزہ معلوم ہونے لگیں۔ مولانا نذیر احمد کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اُنہوں نے سب سے پہلے اس انقلاب کو محسوس کیا اور ارادہ کیا کہ ان تعلیم یافتہ لوگوں کیلئے جو قصہ خوانی کو محبوب مشغلہ جانتے ہیں انگریزی مطبخ سے ایسی غذا لائیں جو ناگوار نہ گذرے۔ چنانچہ اُنہوں نے اُردو میں ناول نویسی کی بنا رکھنے کی طرف توجہ کی اور ”مراۃ العروس“۔ ”بنات النعش“۔ ”توبۃ النصوح“ وغیرہ ناول لکھکر عملاً ثابت کردیا کہ ہندوستانی زندگی اور معاشرت کو بھی ناول کے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ مولانا نذیر احمد نے یہ بخوبی سمجھ لیا تھا کہ تعلیم یافتہ لوگوں سے اس بات کی توقع رکھنا کہ محض تخیل کے کرشموں میں دلچسپی لیں اُمیدِ موہوم ہے۔ انکی نظروں میں صرف وہی عمارت جچ سکتی ہے جسے معمارِ تخیل واقعات کی بنا پر کھڑا کرے۔ داستان ایسی بیان کی جائے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہوں۔ طلسماتی اور مافوق الفطرت افسانوں سے صرف وہی لوگ لطف اُٹھاسکتے ہیں جو حیات انسانی کو ایک جائے امتحان نہیں بلکہ بازیچۂ اطفال تصور کرتے ہیں۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ انسان کیلئے بہترین مضمونِ مطالعہ خود انسان ہے۔ مولانا نذیر احمد نے اس قول کی پیروی کرتے ہوئے اپنے ناولوں میں انسان۔ اور انسانی تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت کا ذکر کیا ہے۔ اُنہوں نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے جو فطرتِ انسانی کی ضد ہو۔ بلکہ اُنہوں نے فطرت انسانی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اور وہی واقعات قلمبند کئے ہیں جو انسانی خواص اور خصائل کے مطالعہ و مشاہدہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے آج نصف صدی گذر جانیکے بعد بھی ان کی دلچسپی برابر قائم ہے۔

مولانا نذیر احمد کے ناولوں کے عناصر

آیئے اب ہم مولانا نذیر احمد کے ناولوں پر ایک مبصرانہ نگاہ بھی ڈال لیں۔ ان کا ہر ناول چھ عناصر سے مرکب ہے یعنی (۱) تمہید (۲) اشخاص قصہ (۳) پلاٹ (۴) مکالمہ (۵) مقصد ناول یا فلسفۂ حیات۔ اور (۶) زمان و مکان۔ اب ہم ان کو فرداً فرداً تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

تمہید:۔ مولانا نذیر احمد کا قاعدہ تھا کہ اپنے ہر ناول کی ابتدا میں دیباچہ یا تمہید ضرور لکھتے تھے جس میں ناول کا مقصد بیان

کر دیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی اشخاص قصہ کو بھی مختصر الفاظ میں قارئین سے روشناس کرا دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے ناول (جیسا کہ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا) لڑکیوں کو اخلاقی تعلیم دینے کیلئے سینڈ فورڈ کے ناولوں کی تقلید میں لکھے تھے۔ اور انکے ذریعہ سے لڑکیوں کو پابندیٔ مذہب۔ فرمانبرداریٔ والدین۔ دوسروں سے نیک سلوک کرنے۔ پڑوسیوں سے اخلاق کے ساتھ پیش آنے بھائیوں اور اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور امور خانہ داری کا درس دیا ہے۔ اسکے علاوہ انہوں نے بعض ناول مثلاً "توبۃ النصوح" "ابن الوقت" اور "محصنات" لڑکوں کیلئے لکھے تھے جن میں انہوں نے لڑکوں کو مذہبی اعتقادات کی طرف رجوع کرنے کی تعلیم دی ہے۔ عشق بازاری کی خرابیاں بیان کی ہیں۔ دو شادیاں کرنے سے جن مصائب تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے ان کا ہو بہو نقشہ "فسانۂ مبتلا" میں کھینچا ہے۔ "ابن الوقت" میں بتلایا ہے کہ جو لوگ اپنے ملک کی تمام خوبیوں سے منحرف ہو کر غیر ممالک کے لوگوں کے اطوار اور ڈھنگ پر فریفتہ ہو جاتے ہیں تو ان پر وہی مثال صادق آتی ہے کہ "کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا"۔ "توبۃ النصوح" میں بیان کیا ہے کہ والدین کا فرض صرف اسی قدر نہیں ہے کہ بچوں کو پال پوس کر بڑا کر دیں بلکہ ان کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ انکی تربیت اس طرح کریں کہ آئندہ زندگی بجائے ایک جنجال کے ایک نعمت معلوم ہو۔ اور اُسکے ساتھ ہی یہ بھی دکھایا ہے کہ جو خرابیاں بچپن سے دامنگیر ہو جاتی ہیں۔ انکی اصلاح مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتی ہے کلیم کا کردار اسکی ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ مولانا نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے دیباچوں میں وہ ضروری اور کام کی باتیں بیان کی ہیں جن کو ہم اپنی روزانہ زندگی میں نظرانداز کر جاتے ہیں۔ پہلے وہ ہمیں ہمارے حالات بتاتے ہیں۔ پھر ہمارے فرائض یاد دلاتے ہیں۔ اسکے بعد دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور اسی پر قصہ کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ مولانا نے بعض ایسے واقعات بیان کئے ہیں جو بذات خود تو کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں لیکن دیگر واقعات کے ساتھ ملکر زندگی کی کامیابی یا ناکامی اور چال چلن پر عمدہ اور دیرپا اثر ڈالتے ہیں۔ "مراۃ العروس" کی تحریر کا بغور مطالعہ کیجئے معلوم ہوگا کہ مولانا نے اطاعت والدین۔ ملنساری۔ راست بازی کا بہترین اخلاقی درس دیا ہے۔ بدزبانی۔ بداخلاقی۔ بےحیائی اور بدچلنی کی مذمت کی ہے۔

اشخاصِ قصہ:۔ مولانا نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں جو اشخاص قصہ پیش کئے ہیں وہ تمام کے تمام مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ان کے ناولوں میں ایک بین عیب یہ ہے کہ ان کے اشخاص قصہ زیادہ تر آپس میں ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی حرکات و سکنات اور اعتقادات وغیرہ کے لحاظ سے ایک دوسرے کا چربہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہی عیب مولانا عبدالحلیم شرر کے ناولوں میں بھی نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اور ناول نویسوں میں صرف حکیم محمد علی خاں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے ہر ناول میں ایک نیا شخص پیش کیا ہے جسکی وضع قطع اور چال ڈھال دوسروں سے قطعاً مختلف ہے۔ اسی عیب کی وجہ سے مولانا نذیر احمد کے پیش کردہ اشخاص قصہ قاری کے ذہن پر دیرپا اثر ڈالنے میں ناکام رہتے ہیں۔ مولانا نے عام طور پر ہر ناول میں دو متضاد چال چلن اور اعتقادات کے اشخاص پیش کئے ہیں۔ مثلاً "مراۃ العروس" میں **اکبری** کو پھوہڑ۔ بدسلیقہ۔ بدتمیز اور بنا بنایا گھر بگاڑنے والی لڑکی دکھایا ہے اور اسکے خلاف "اصغری" کو ایک پاکباز، باتمیز، باسلیقہ اور سعادتمند لڑکی کے لباس میں پیش کیا ہے۔ مولانا عبدالقادر سروری کا خیال ہے کہ "مولانا نذیر احمد نے کردار نگاری میں بعض جگہ اس قدر نفسیاتی طریقہ سے کام لیا ہے کہ انگریزی ناول نگار جارج ایلیٹ George Elliot کے ناول یاد آجاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جارج ایلیٹ کی طرح انکی بڑی عمر نے ان کو مختلف سوسائٹیوں کے مطالعہ کا نہایت عمدہ موقع دیا تھا۔ دونوں اپنے افسانوں میں ایک خاص مذہبی اعتقاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔" (دنیائے افسانہ صفحہ ۱۶۵) مولانا نذیر احمد نے اپنے اشخاص قصہ کے کردار میں جو استقلال دکھایا ہے

اس پایہ تک شرر اور سرشار بھی نہیں پہنچ سکے ہیں۔ "توبۃ النصوح" میں نصوح کے کردار اور مستقل مزاجی پر غور کیجئے جب وہ اپنے گھر کی اصلاح کرنیکا فیصلہ کرلیتا ہے۔ بیوی۔ بچوں۔ اور اپنے بڑے بیٹے کلیم الغرض سب کی مخالفت استقلال اور ہمت سے برداشت کرتا ہے۔ اور کوئی مشکل بھی اُسے اُسکے عزم راسخ سے منحرف نہیں کرسکی ہے۔ وہ کلیم کا آخری دم تک پیچھا کرتا ہے۔ اور صبر کیساتھ یقین کرتا ہے کہ ایک نہ ایک دن اُسکی یہ اُمید بھی ضرور بر آئیگی۔ "اکبری" کے کردار پر نظر ڈالیئے اور دیکھیئے کہ وہ کس قدر استقلال کیساتھ روزانہ نہوت ہوں کرتی ماما کو بدنام کرتی ہے۔ اسکے خلاف شرر نے جو اشخاص قصہ پیش کئے ہیں وہ معمولی سی تکلیف سے ہی افسردہ ہوکر جان دینے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

پلاٹ:۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا نذیر احمد کے بعض ناولوں کے پلاٹ میں کوئی خاص نوعیت وحدت نہیں ہے لیکن اُنہوں نے جیساکہ رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" میں لکھا ہے "معمولی واقعات زندگی کو منتشر پلاٹ کی صورت میں پیش کرکے بیان کیا ہے" اردو ناول نویسوں میں مولانا نذیر احمد کو ہی یہ فخر حاصل ہے کہ باوجود موجد ہونے کے انہوں نے پلاٹ کی ترتیب اور اس میں واقعات کا لگاؤ اور اشخاص قصہ کے تعلق کے راز کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ اُنہوں نے پلاٹ بنانیکا یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ پہلے اشخاص قصہ کا انتخاب کرلیا ان کی حرکات وسکنات سے جو واقعات پیدا ہوئے ان کو یکجا کرکے پلاٹ تیار کرلیا۔ "مراۃ العروس" اسکی ایک عمدہ مثال ہے۔ انہوں نے واقعات بیان کرنے میں یہ خوبی دکھائی ہے کہ کردار کا ارتقا اور اشخاص قصہ کے افعال وحرکات بالکل مطابق فطرت معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مولانا نذیر احمد کے ناولوں کے پلاٹوں کو بالکل سادہ پلاٹ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اُنہوں نے سرشار کی طرح رطب ویابس بھی نہیں ٹھونسا ہے۔

مکالمہ:۔ مبصرین ومورخین ادب اردو کا بہ اتفاق رائے یہ قول ہے کہ اردو ناول نویسوں میں مولانا نذیر احمد ہی وہ پہلے ناول نویس ہیں جنہوں نے ناول میں مکالمہ استعمال کیا لیکن اس ضمن میں ان پر یہ اعتراض بالکل صحیح کیا گیا ہے کہ انہوں نے بعض جگہ مکالمے کو بے ضرورت طول دیدیا ہے اور کہیں کہیں مثلاً "توبۃ النصوح" میں اپنے اشخاص قصہ سے ایسی باتیں کرائی ہیں جو نہ انکی عمر اور کردار کے زیبا تھیں اور نہ فطری معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے مکالموں سے اشخاص قصہ کے کردار اور انکی خصوصیتوں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اور انکی گفتگو سے ان کی قومیت اور علمی استعداد کا بآسانی پتہ چل جاتا ہے۔

فلسفۂ حیات:۔ فلسفۂ حیات جسے تنقید حیات بھی کہہ سکتے ہیں وہ نقطہ نظر ہے جس سے مصنف حیات انسانی کا مطالعہ کرتا ہے۔ چونکہ ناول کا تعلق براہ راست حیات انسانی سے ہے۔ اس لئے اسے "تنقید حیات" کہنا زیادہ مناسب ہے۔ جو ناول نویس اپنے کرداروں کی حرکات وسکنات، احساسات وجذبات اور انکی کش مکش۔ کامیابیوں اور ناکامیوں کی تصویر صفحۂ قرطاس پر اتارتا ہے وہ انکی زندگی سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ مولانا نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں مسلمان گھرانوں کی رسومات اور طرز معاشرت کی زندہ تصویریں پیش کی ہیں۔ اور گو اُنہوں نے خواتین کی حمایت میں قلم اُٹھایا تھا لیکن اپنے ہونہار مقلد مولانا راشد الخیری کی طرح مردوں کو جور وستم کا بانی نہیں بتایا ہے اور نہ ہی انہیں سرشار کی طرح ہر جگہ آزاد ہی آزاد نظر آتے ہیں۔ مولانا نذیر احمد نے حیات انسانی کے متعلق جو خیال پیش کیا ہے اُس کا لب لباب یہ ہے کہ دُنیا فانی ہے اس میں اس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ آپس میں کسی طرح کی رنجش نہ ہونے پائے۔ دوسروں کی تکالیف کو محسوس کرنا۔ ہمدردی۔ وفاداری اور نیک سلوک کے ساتھ پیش آنا جوہر حیات انسانی ہے۔ دُنیاوی الجھنوں میں پھنسکر خالق کون ومکان کو فراموش کردینا غلطی ہے۔ والدین شوہر استاد خسر وغیرہ کی عزت کرنا مصیبت زدوں کے کام آنا جھگڑے فساد سے بچتے رہنا زندگی کو کامیاب بنانے کیلئے ضروری ہے۔

زمان ومکان:۔ طرز قدیم کے قصوں میں جس دنیا کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہندوستانی نہیں ہے۔ ان کے ہیرو بھی ہندوستانی

نہیں بلکہ عربی اور ایرانی النسل ہیں۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ نے بھی عربی اور ایرانی النسل ہیرو ہی پیش کئے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی شررؔ پر یہ اعتراض بھی کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے خلاف واقعہ امور کو تاریخی واقعہ کا جامہ پہنا کر عوام کو گمراہ کرنے کی سعی کی ہے اور ان کے ناولوں نے عوام میں بالکل غلط خیالات رائج کردئے ہیں۔ یہ ایک نہایت زبردست اور ناقابل تردید الزام ہے۔ لیکن اسکے خلاف جو اشخاص قصہ مولانا نذیر احمد نے پیش کئے ہیں وہ ٹھیٹ ہندوستانی ہیں۔ اور جو واقعات قلمبند کئے ہیں وہ مشاہدہ اور تجربہ کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں خاصکر دہلی کی معاشرت، مسلمانوں کی زبوں حالی، اچھی اور بُری رسموں، اور عادات و اطوار کی ایک چابکدست مصور کی طرح کم سے کم الفاظ میں تصویریں کھینچی ہیں۔ اور اس رنگ میں اگر وہ سرشار سے بڑھے ہوئے نہیں ہیں تو ان سے کسی طرح پیچھے بھی نہیں ہیں۔

مولانا نذیر احمد کے ناولوں کی خصوصیات

اگر ہم مولانا نذیر احمد کے ناولوں پر مبصرانہ نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ ان میں علاوہ دیگر فنی خوبیوں کے حسب ذیل چار خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

(۱) مولانا نذیر احمد کے تمام ناول حد درجہ دلچسپ ہیں۔ وہ قاری کی توجہ کو جذب کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ انکی دلچسپی کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ روزِ اشاعت سے اب تک متعدد بار چھپ کر ہاتھوں ہاتھ لے جا چکے ہیں۔ اور اپنے مصنف کو مالا مال کردیا۔ نہ صرف حکومت وقت نے نقد انعام دیکر قدر کی بلکہ قوم نے بھی خرید کر اپنی پسندیدگی کا عملی ثبوت دیا۔ گو یہ ناول مستورات اور خاصکر مسلمان خواتین کے مطالعہ کیلئے تصنیف کئے گئے مگر ان میں دلچسپی اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ غیر مسلم مردوں اور عورتوں نے بھی ان کے مطالعہ سے استفادہ کیا۔ جو لوگ اُردو نہ پڑھ سکتے تھے ان کے لئے مولانا کی اجازت اور بغیر اجازت بھی کئی ناولوں کا انگریزی اور ہندوستان کی بعض دیگر زبانوں میں ترجمے کئے گئے۔ مولانا کے ناولوں کے دلچسپ ہونے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ان کے اشخاص قصہ اسی عملی دُنیا اور پھر دہلی کی ہی سوسائٹی کے افراد ہیں۔ اندر کے اکھاڑے کی پریوں، جن، دیو، بھوت اور چڑیل قسم کی کسی مخلوق کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اور اپنے قلم کو حضرت انسان کے افعال و احساسات کی ترجمانی کے لئے مخصوص کردیا تھا۔ مولانا کے ناولوں کے مطالعہ سے جذبات اور احساساتِ انسانی جوش میں آجاتے ہیں۔ اور اشخاصِ قصہ سے خودبخود ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) جن احباب نے "مراۃ العروس" "توبۃ النصوح" وغیرہ ناولوں کا بغور مطالعہ کیا ہے ان کو معلوم ہوگا کہ ان میں صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے "صداقت" سے یہ مطلب نہیں کہ کسی واقعہ کو من و عن بیان کردیا جائے۔ بلکہ جو واقعات بیان کئے جائیں ان کو پڑھتے وقت قاری کو یہ یقین آجائے کہ اسیطرح ہوا ہوگا۔ نہ کوئی واقعہ اصولِ فطرت کے منافی ہو۔ اور نہ دیو، جن، یا پریوں جیسی عجیب و غریب ہستیوں کو انسانی اسٹیج پر پارٹ کرنے کیلئے بلایا جائے۔ مولانا نذیر احمد نے جو کچھ لکھا ہے وہ مشاہدہ اور تجربہ کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔

(۳) مولانا نذیر احمد کے ناول شاعری، مصوری اور موسیقی کی طرح نہ صرف ان کے اپنے بلکہ قاری کے خیالات کے بھی حامل ہیں۔ مولانا نے سادہ واقعات کو اس حُسن و خوبی سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کا خیال ان کے اعلیٰ و ارفع مفہوم تک بہ آسانی پہنچ جاتا ہے۔ مولانا عبدالقادر سروری نے "دُنیائے افسانہ" میں لکھا ہے کہ "مراۃ العروس صرف لڑکیوں کی خاطر لکھی گئی تھی۔ لیکن آج ہم اسکو افسانوی ادب کا بہترین سرمایہ تصور کرتے ہیں۔"

(۴) زبان کے اعتبار سے بھی مولانا نذیر احمد کے ناول اس قدر بلند واقع ہوئے ہیں کہ اگر ان کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو زبان کے رازوں اور نزاکتوں سے کماحقہٗ واقفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ الفاظ اور محاورات کا برمحل استعمال اور بہترین جملے مولانا کے اسلوب بیان

کی خوبیاں ہیں۔ اسی لئے مؤلف "دنیائے افسانہ" نے لکھا ہے کہ "حافظ نذیر احمد کے اکثر ناول دہلی کے محاورات اور روزمرہ کے انمول خزانے ہیں۔ ان کا مطالعہ ہمکو دہلی کے شریف گھرانوں کی زبان سے روشناس کرادیتا ہے۔"

مولانا نذیر احمد اور ان کے معاصر

ہمیں اعتراف ہے کہ کسی ایک طبعزاد لکھنے والے کا کسی دوسرے مصنف سے موازنہ کرنا فنی اور اصولی غلطی ہے۔ کیونکہ جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں بھی ایک جیسی نہیں ہوتی ہیں اسی طرح ہر مصنف کا رنگ اور اسلوب بیان اسکے اپنے لئے ہی مخصوص ہوتا ہے۔ آزاد کی رنگین بیانی کو حالی۔ شبلی یا نذیر احمد کی تحریروں میں ڈھونڈنا بالکل جہالت ہے۔ خیالات کا توارد ممکن ہے مگر اسلوب بیان کا توارد ہرگز نہیں ہوسکتا ہے۔ اور پھر جب کہ دو مصنفوں نے علیحدہ علیحدہ موضوع پر طبع آزمائی کی ہو۔ اسی لئے مولانا نذیر احمد کے ناولوں کا شرر اور سرشار کے ناولوں سے موازنہ کرنا مبصرین کی حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ کیونکہ مولانا نذیر احمد مقصدی اور معاشرتی ناول لکھنے میں کمال رکھتے تھے۔ اور برخلاف اسکے شرر اور سرشار اس میدان میں بری طرح ناکام رہے۔ سرشار کو تو ناول نویسوں کی صف میں ہی جگہ دینا غلطی ہے۔ اور شرر کو جو شہرت حاصل ہے وہ صرف تاریخی ناول لکھنے والے کی حیثیت سے ہے۔ اسکے علاوہ مولانا نذیر احمد کے ناول خالص مشرقی ہیں۔ اور انہوں نے اسکو عروج کمال پر پہنچا دیا ہے اور مولانا شرر کے ناول مشرقی ناول نہیں۔ بلکہ یوروپین ناولوں کی بھونڈی تقلید ہیں۔ سرشار نے مغربی ناول نویسی کی پیروی کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔

ہم اس بے سود بحث میں اپنا اور آپکا وقت ہرگز ضائع نہ کرتے مگر مولانا نذیر احمد کے سوانح نگار کی حیثیت سے اردو کے ممتاز مبصرین ڈاکٹر سید عبداللطیف اور مولانا عبدالقادر سروری کو انکی اصولی غلطی سے آگاہ کردینا ہمارا فرض ہے۔ تاکہ عوام کے گمراہ ہونیکا سدباب ہوسکے۔ اسکے علاوہ اگر ہم تھوڑی دیر کیلئے یہ بھی مان لیں کہ ایک مصنف کی دماغی پیداوار کا دوسرے مصنف کی دماغی پیداوار سے موازنہ ہوسکتا ہے تو بھی ہمکو یہ کہنا پڑیگا کہ مولانا نذیر احمد کو اپنے معاصرین پر ہر طرح فضیلت حاصل ہے۔ مولانا کے ناولوں کی خصوصیات کا ہم سطور بالا میں مفصل ذکر کرچکے ہیں۔ اور سرشار کے متعلق مبصرین کا یہ اتفاقی طور پر خیال ہے کہ "فسانۂ آزاد" کے علاوہ انکے تمام دیگر ناول نہ صرف ناکام رہے بلکہ سرشار کی شہرت اور نیکنامی پر بدنما داغ ہیں۔ "فسانۂ آزاد" کو بھی کسیطرح اور کسی حالت میں ناول نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں ناول نویسی کے فنی اصولوں کی پیروی کی گئی ہے۔ نہ اسکا پلاٹ منظم ہے اور نہ ہی کرداری ارتقا ہے۔ ایک صاحب نے رسالۂ مخزن (۱۹۰۶ء) میں شرر اور سرشار کا موازنہ کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا تھا کہ "اگر فسانۂ آزاد جیسی معجون مرکب کا ہی نام افسانہ یا ناول ہے تو شاید دنیا میں سرشار سے پہلے ان الفاظ کا مفہوم کسی بشر کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔"

شرر کے ناولوں کے متعلق ایک بے لاگ اور غیر جانبدار مبصر کی رائے ہے کہ "شرر کے سب قابل قدر ناول بلا استثنا تاریخی افسانے ہیں۔ تاریخی افسانوں کے علاوہ جو ناول انکے قلم سے نکلے ہیں۔ وہ کسی طرح انکی شہرت میں اضافہ نہیں کرتے۔ "دلچسپ" تو خیر غنیمت ہے لیکن "دلکش" میں سوا اسکے کوئی خصوصیت نہیں کہ شاید کسی اصل واقعہ کی بنا پر لکھا گیا ہو .... "بدرالنسا کی مصیبت" اور "میوۂ تلخ" بدقسمتی سے شرر کی تصنیف ہیں اور شاید جس قدر نقصان انکو ان دو قصوں کی تصنیف سے پہنچا ہے۔ اسکی تلافی انکا مقبول سے مقبول ناول بھی نہیں کرسکتا ہے۔" (رسالۂ مخزن" [illegible] ۱۹۰۶ء)

مذکورۂ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ مبصر کی نظروں میں "فسانۂ آزاد" ناول ہی نہیں ہے۔ اور سرشار کے دیگر قصے انکو بدنام کرنیکا باعث ہوئے ہیں۔ اسی لئے سرشار کو ناول نویسوں کی صف میں جگہ دینا مبصرین کی زبردستی ہے۔ شرر کے متعلق مبصر کی بے لاگ رائے یہ ہے کہ انکے تاریخی ناول تو واقعی قابل قدر ہیں لیکن معاشرتی یا مقصدی ناول لکھنے میں بری طرح ناکام رہے۔ اس لئے ان کا اس

تونس کے ناولوں کے موجد مولانا نذیر احمد سے موازنہ کرنا جہالت ہے۔

معترضین کے فضول اعتراض

اردو کے بعض نامور مبصرین مثلاً سر عبدالقادر (مؤلف New School of Urdu Literature)، ڈاکٹر سید عبداللطیف (مؤلف Influence of English Lit: on Urdu Lit:) اور مولانا عبدالقادر سروری (مؤلف "دنیائے افسانہ") نے مولانا نذیر احمد کے ناولوں کو بار بار "ناول" تسلیم کرنے اور انکی خوبیاں دکھانے کے بعد ہی ناول کے نام سے موسوم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ تو وہی بات کہ فرانس کے مایۂ ناز ناول نویس موپاسان کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض مبصرین نے انکو ناول تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب اس کا جواب بھی موپاسان کے ہی الفاظ میں دیا جا سکتا ہے کہ "میں اپنے محترم مبصرین کو بہتر ماننے کیلئے ہی تیار نہیں ہوں۔" ان گمراہ مبصرین نے لکھا ہے کہ مولانا نذیر احمد کے ناولوں میں نہ تو ڈرامائی عنصر ہے۔ اور نہ پلاٹ میں پیچیدگیاں ہیں۔ اب آپ غور کریں یہ کس قدر لچر، لایعنی اور فضول اعتراض ہے۔ کیونکہ اگر ہم اس اعتراض کو صحیح مان لیں تو پھر ہمیں کہنا پڑیگا کہ جو افسانہ جاسوسی یا عشقیہ نہ ہو وہ ناول نہیں کہلا سکتا۔ مگر مبصرین نے تسلیم کیا ہے کہ ناول معاشرتی اور مقصدی بھی ہو سکتا ہے۔ اور معاشرتی ناولوں میں پلاٹ کی پیچیدگیوں اور سنسنی خیز یا حیرت انگیز واقعات کی توقع رکھنا بالکل جہالت ہے۔ اور جہاں تک ڈرامائی عنصر کا تعلق ہے۔ ہم ان محترم معترضین سے استدعا کرینگے کہ خالی الذہن ہو کر مولانا کے ناولوں کا از سر نو مطالعہ کریں۔ ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد جگہ ڈرامائی اور سنسنی خیز واقعات مل جائیں گے۔ مولانا کے ناولوں میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جنکو مبصرین نے کامیاب ناول کیلئے ضروری سمجھا ہے۔ "محصنات" کا مطالعہ کیجئے۔ مبتلا نے ایک بازاری عورت ہریالی سے نکاح کرنیکے بعد اس راز کو چھپانے کی از حد کوشش کی لیکن جس طرح ناگہاں اور بالکل غیر متوقع طور پر اس راز کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ اور اس وقت جو تماشہ مبتلا کی پہلی بیوی غیرت بیگم کرتی ہے اس سے زیادہ اور کیا حیرت انگیز بات ہو سکتی ہے؟ نصوح جب ہیضہ میں مبتلا ہوتا ہے اور اس پر موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ خواب دیکھکر اپنے گناہوں سے تائب ہوتا ہے اور ساتھ ہی اپنے گھر کی اصلاح کرنیکا عزم راسخ کر لیتا ہے تو اسکا اسکے خاندان اور خاصکر کلیم پر جس قدر حیرت انگیز اثر ہوا ہوگا اسکا اندازہ لگانا آسان ہے۔ جب ابن الوقت کو ناگہاں احساس ہوتا ہے کہ باوجود وفاداری اور اطاعت کے انگریزی سوسائٹی میں اسے کوئی وقعت حاصل نہیں ہے اور اس نے اپنی بیہودہ حرکتوں سے اپنے ہموطنوں کی ہمدردی بھی کھو دی ہے تو یہ احساس یاس انگیز ہونیکے ساتھ ہی یقیناً حیرت انگیز بھی ہوگا۔ انسانی زندگی ڈرامائی نہیں بلکہ سیدھی سادی ہے لیکن بایں ہمہ مولانا کے ناولوں میں ڈرامائی عنصر کا فقدان نہیں ہے۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ خالی الذہن ہو کر ان کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے۔ اس وقت مبصرین کو اپنے اعتراضات کی لغویت کا علم ہوگا۔

مذکورہ بالا اعتراضات کے علاوہ مبصرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا نذیر احمد نے حسن و عشق کے جلوے نہیں دکھائے ہیں۔ اسکے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاید مبصرین نے مولانا کے ناولوں کا بغور مطالعہ ہی نہیں کیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ایکدفعہ نہیں بلکہ متعدد بار حسن و عشق کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انہوں نے اس بازاری اور اخلاق سوز عشق کے ذکر سے عمداً پہلو تہی کی ہے جس نے قدیم افسانوں کی قدر کو کھو دیا۔ اگر معترضین صرف بازاری عشق کے ہی جلوے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا اس فرض کو انجام دینے کی بجائے ناول نویسی سے ہی توبہ کر لیتے۔ انہوں نے "فسانۂ مبتلا"، "رویائے صادقہ" اور "الحقوق والفرائض" میں حسن کے متعلق اپنی رائے لکھدی ہے اور "امہات الامۃ" میں حسن اور مفہوم حسن کو اس طرح بیان کیا ہے:-

"فی اکثر الاحوال بکثیر از دلرج کی اصل محرک حسن پرستی ہوتی ہے اور حسن کا حال یہ ہے کہ ایک ملک کے لوگ اعضائے خاص کی شکل صورت اور رنگ اور وضع کی نسبت ایک قرارداد کر لیتے ہیں کہ اس طرح کے اعضاء کو حسین سمجھیں گے۔ اول تو مذاقِ حسن سب جگہ یکساں نہیں۔ انگریز کرنجی آنکھوں اور بھورے بالوں کے شیدا ہیں۔ ہم موتی چور آنکھوں اور کالے بالوں کے۔ چینیوں نے ناک کو چہرے کی ہمواری میں خلل انداز سمجھ کر بچوں کی ناک پر کمانیاں چڑھا چڑھا آخر ناک کو مٹا چھوڑا۔ حبش میں کوئی ہمارے ملک کا گیہواں رنگ آدمی جا نکلے تو اسکو مبروص سمجھ کر اسکی چھاؤں سے دور بھاگیں۔ حبشیوں کے ہونٹوں کو ترسنا ہوگا۔" لب زیر نیش تا پرّہ بینی رسیدہ ولب زیرینش تا زنخدان فروہشتہ"۔ اختلاف مذاق پر طرّہ یہ کہ ہر شخص کو اپنے مذاق کے مطابق حسن سے یکساں طور پر ہیجان ہوتا ہے۔ حالانکہ اعضائے خارجی کے حسن کو کیسا بھی ہو نفس خواہش میں کچھ بھی دخل نہیں۔ مثلاً ہمارے شاعر ناک کی شان میں کہتے ہیں۔ ع

آتشِ حسن سے ایک شعلۂ سرکش بینی۔

"...... ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آدمی کی فطرت میں جہاں اور باتیں ہیں ایک بات یہ بھی ہے کہ اوائل عمر میں اسکی طبیعت جو رنگ پکڑ لیتی ہے وہ تازیست زائل نہیں ہوتا یعنی ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق حسن صورت کی طرف فطرتاً مائل ہوگا۔ اور اس میلان میں اسپر کچھ الزام نہیں۔ غایتہ مافی الباب یہ میلان نتیجہ ہے اصل قوت کا۔ پس میلان کا برا بھلا ہونا موقوف ہے اصل قوت کے حسن یا قبیح ہونے پر اور اصل قوت خداداد یعنی فطرتی قوت ہے کہ عمر کی ایک حدِ خاص کو پہنچکر خود بخود ظہور کرتی ہے اور تمام خداداد اور فطرتی قوتیں حسن ہیں اسی واسطے کہ کسی مصلحت سے خدا نے دی ہیں۔"

مذکورہ بالا سطور کے مطالعہ سے مولانا نذیر احمد کا معیارِ حسن صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ اندریں حالات ان پر یہ اعتراض کرنا کہ وہ "حسن مثالی" قائم نہیں رکھتے بالکل لغو اور مہمل ہے۔ ہاں یہ بات بھی درست ہے کہ انہوں نے بازاری اور عریاں حسن کی تصویریں پیش نہیں کی ہیں کیونکہ وہ معلم اخلاق تھے۔ نہ کہ پبلک کو گمراہ کرنے والے۔ انہوں نے یہ ناول اپنی بیٹی اور خواتین مشرق کے مطالعہ کیلئے لکھے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ہر اس بات کو جو کسی صورت سے بھی قابل گرفت اور اخلاق سوز قرار دیجا سکے قلم زد کر دیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے یہ ناول طمع زر سے نہیں لکھے تھے۔ قادر مطلق نے انہیں فکر معاش کی طرف سے فارغ البال کر دیا تھا۔ اسی لئے وہ ناولوں کی فروخت کی آمدنی سے بے نیاز تھے۔ اور اسی سبب سے وہ عوام کے بیہودہ اور مہمل مذاق کی پیروی کرنے سے بچے رہے۔

معترضین کا یہ کہنا کہ مولانا نذیر احمد کے ناولوں میں عنصر عشق کا فقدان ہے بالکل غلط ہے۔ لفظ "عشق" کئی معنوں میں مستعمل ہے۔ انتہائی محبت کو عشق کہا جاتا ہے۔ والدین کی اپنی اولاد سے محبت۔ بھائی کی بھائی سے محبت۔ انسان کو انسان سے محبت۔ انسان کو اپنے خالق سے محبت، میاں بیوی کی باہمی محبت وغیرہ۔ ان سب قسموں کی محبت کی متعدد مثالیں مولانا کے ناولوں میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اگر لفظ "عشق" سے معترضین کی مراد اس انسانی جذبہ سے ہے جو خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کیلئے پیدا ہو جاتا ہے اور حصول مدعا کے بعد غائب ہو جاتا ہے۔ ایسے "عشق" کو دنیا کے چند مصلحین نے معیوب اور بداخلاق قرار دیا ہے۔ ایسے اخلاق سوز عشق کے جلوے دیکھنے کی توقع مولانا کے ناولوں میں رکھنا مولانا کے ساتھ زیادتی ہی نہیں بلکہ ظلم ہے۔ انہوں نے "فسانۂ مبتلا" میں ایسے ہی بازاری عشق کی خرابیاں دکھائی ہیں۔ "مبتلا" ہر جائی کے عشق میں پھنسکر جانوروں کی موت مرتا ہے۔ دراصل مولانا نذیر احمد نے یہ ناول صرف اسی وجہ سے لکھے تھے کہ اس وقت جو کتابیں دستیاب ہوتی تھیں ان میں بازاری اور حیا سوز عشق کے جلوے دکھائے گئے تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی بہو بیٹیوں کے ہاتھوں میں ایسی واہیات کتابیں دیں۔ وہ تو اس معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ قدیم طرز کے افسانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے وہ شیخ سعدی کی "گلستاں" کی بعض حکایتوں کا مطالعہ بھی

مقصد خیال کرتے تھے۔ اندریں حالات وہ اپنے ناولوں کو ان گندگیوں سے ہرگز آلودہ نہ کرسکتے تھے۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے اشخاص قصہ کو اُن بکس کے بے نازک طبع اور دل پھینک حضرات کے لباس میں پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی انہوں نے وقتی و غیر متین محبت کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے جہاں بھی محبت کی کہانی چھیڑی ہے تو وہ محبت جنون نہیں ہے اور آخری وقت تک غالب رہتی ہے۔ نہ کبھی گھٹتی ہے اور نہ بڑھتی ہے۔ انہوں نے ایسے عاشق مزاج لوگ پیش نہیں کئے ہیں جو وقت پڑنے پر عشق کی برائیاں کرنے پر اتریں۔ اور دنیا چھوڑ کر جنگل میں ڈیرا جمائیں۔

اسلوب بیان

مولانا نذیر احمد کے اسلوب بیان پر ایک طائرانہ نظر ہم اس سے قبل بھی ڈال چکے ہیں۔ انکی تحریر فصیح ہونے کے علاوہ بعض جگہ اس قدر موثر ہے کہ قاری کو ان کے جذبات اور احساسات پر مجبوراً ایمان لانا پڑتا ہے۔ مولانا غلام محی الدین کی رائے ہے کہ "مولانا نذیر احمد" قصہ بیان کرتے کرتے کسی معاملہ میں ضمناً انسان اور فطرت کے متعلق اس جوش اور ادبیت کے ساتھ خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کے جملے تیر کی طرح دل میں اترنے لگتے ہیں۔ اور جی چاہتا ہے کہ انہیں زبانی یاد کر لیا جائے" ("اردو کے اسالیب بیان") مولانا عبد القادر سروری نے لکھا ہے کہ "ناول میں خود مصنف کو نہیں بلکہ واقعات کو گویا ہونا چاہیئے۔ یہ کام حافظ نذیر احمد نے جس حسن و خوبی سے انجام دیا ہے۔ اسکی مثالیں اردو افسانہ نگاری میں بہت کم ملتی ہیں۔ مثلاً "توبۃ النصوح" کو دیکھئے کلیم جب دولت آباد جاتا ہے تو مولویوں کے ساتھ اسکی گفتگو۔ مولویوں کی تمثیلی گفتگو کا نمونہ ہے۔ موٹے موٹے عربی لغات۔ ہر حرف کو مخرج کے ساتھ ادا کرنا۔ مذاق کے قصے غرض تمام چیزیں ایسے بے تکلفانہ انداز میں نکل پڑی ہیں کہ بالکل فطری معلوم ہوتی ہیں۔ درحالیکہ مصنف نے ایک لفظ بھی انکی گفتگو یا ملاقات کی توضیح کے متعلق نہیں کہا ہے" ("دنیائے افسانہ" صفحہ ۸۱) مولانا کی تحریر اور اسلوب بیان میں ظرافت کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ جسکے متعلق رام بابو سکسینہ کہتے ہیں کہ "خاص چیز جو انکی (مولانا نذیر احمد کی) نثر کا جوہر اعلیٰ ہے وہ انکا ظریفانہ رنگ ہے۔ جو ان کے ناولوں تقریروں اور مضامین سب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ انکی ظرافت بہت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے اور اس میں پھکڑپن مطلق نہیں ہوتا" ("تاریخ ادب اردو") مولانا نذیر احمد نے اس قدر ظریفانہ طبیعت پائی تھی کہ اگر وہ کوئی سنجیدہ بات بھی کہنا چاہتے تھے تو بمشکل سنجیدگی اختیار کرتے تھے۔ انکے شاگرد رشید مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب کی کوئی بات ایسی نہ تھی جس میں خوش مذاقی کا پہلو نہ ہو۔ کوئی فقرہ نہ تھا جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہو۔ کوئی طرز بیان نہ تھا جو ہنسانے ہنسانے نہ لٹا دے۔ وہ دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے اپنی باتوں سے انکو ہنسائیں ("مضامین فرحت" حصہ اول صفحہ ۱۱) اسی لئے ظریفانہ رنگ اُن کے اسلوب بیان میں بخوبی نمایاں ہے۔ یہانتک کہ قرآن پاک کے ترجمہ میں بھی بعض بعض جگہ ظریفانہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ مولانا نذیر احمد کے اسلوب بیان کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ کی بے لاگ رائے یہ ہے:۔

"محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا۔ تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاوروں کی ٹھسم ٹھاس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے۔ اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے۔ خدا معلوم انہوں نے محاوروں کا کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا کہ ایسے ایسے محاورے انکی زبان قلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے۔ انکی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔ مگر چلتے چلتے راستے میں عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے۔ پہاڑ کھڑے کر دیتے تھے .... بہرحال انکی تحریر کا ایک خاص رنگ ہے۔ اور اسکی نقل اتارنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔ ترجمہ کا انہیں خاص ملکہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے۔ اگر ایک زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوا تو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھ دیا .... ان کے ترجمہ میں خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے تھے لیکن وہ لفظ ایسا ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔ تعزیرات ہند کا ترجمہ اٹھا کر دیکھو وہی لفظ پر لفظ معنے بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ہل

بھی نہیں سکتا ..." (مضامین فرحت حصہ اول صفحات ۴۱-۴۰-۳۹)

اب ہم انکی تحریروں سے چند اقتباس پیش کرتے ہیں۔ اس مضمون میں طول وطویل عبارت نقل کرنیکا نہ موقع ہے اور نہ جگہ۔ اسی لئے چند سطور پر اکتفا کرتے ہیں یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ہم نے صرف سادہ اور آسان عبارتیں نقل کی ہیں۔

"مبتلا کے باپ کی تو پہلے ہی سے یہ رائے تھی کہ اسکو شروع ہی سے مدرسہ میں بٹھا یا جائے مگر عورتوں کو مبتلا کی اتنی مفارقت بھی گوارا نہ ہوئی۔ ناچار پورے چھٹے برس میاں جی کو نوکر رکھکر اسکو گھر پر ہی تعلیم کرایا۔ اب میاں جی کا بھی سرمایۂ معلومات ہو چکنے پر آیا اور فارسی کی درسی متداول کتابیں سب مبتلا کی نظر سے نکل گئیں اور بات صاف تو یہ ہے کہ مبتلا کے سر میں اب اور ہوا بھری ہوئی تھی۔ اسکی آنکھیں ڈھونڈتی تھیں یاروں کے جلسے، دوستوں کی صحبتیں اور وہ گھر پر میسر نہ تھیں۔ باپ نے کچھ اور سوچا۔ مبتلا نے کچھ اور، غرض سب کی صلاح سے مبتلا مدرسے میں داخل ہوا۔ گو مبتلا نے مدرسے میں چھ برس تعلیم پائی۔ مگر مکتب کیا تھا برائے نام اسکا جی بہلنے کیلئے چار پانچ ریزگی لڑکے اور بٹھلائے گئے تھے، یعنی بھلا بے چودہ برس کی عمر تک مبتلا بھونرے میں پلا، اور دنیا کی کسی قسم کی ہوا اسکو نہ لگنے پائی۔ اب جو مدرسے کی عربی جماعت میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا لڑکوں کا جنگل کہ سات سات اور آٹھ آٹھ برس کی عمر سے لیکر بیس بیس پچیس پچیس برس تک کے اچھے خاصے جوان ہر ذات کے ہر پیشے کے چار ساڑھے چار سو لڑکے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں (" محصنات "یا فسانۂ مبتلا")

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ کیا دھوکا ہوا ہے۔ ہم مدت سے اسی خیال میں رہے کہ صادقہ اور یوسفی دو سگی بہنیں تھیں۔ اب تحقیق ہوا کہ ایک عورت کے دو نام ہیں۔ اور اصلی ایک بھی نہیں۔ اسکے میکے ہی میں لوگ صادقہ کہنے لگے تھے۔ اسی واسطے اس نے ساری عمر نہ کبھی جھوٹا خواب دیکھا۔ اور نہ اپنے سے بنا کر کوئی خواب بیان کیا۔ بیاہی گئی تو سسرال کی طرف سے یوسفی بیگم کا خطاب ملا۔ اسلئے کہ کثرت سے خواب دیکھتے دیکھتے اسکی تعبیر میں ایسا ملکہ ہو گیا تھا کہ اسکی رائے تیر بہدف ہوتی تھی" ("رویائے صادقہ" پہلی فصل صفحہ ۲)

مولانا نذیر احمد کے اسلوب بیان کی مولوی بشیر الدین احمد اور مولانا راشد الخیری کی تحریروں میں بھی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں صاحب کمال انھی کے باغ علم کے خوشہ چین اور اسی اسکول کے پیرو ہیں۔ لیکن مولانا راشد الخیری کی تحریر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غم اور اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اسی لئے تو انہیں مصور غم کہا گیا ہے۔

غرض مولانا نذیر احمد موجد ہونے کے باوجود بہت بلند پایہ اور کامیاب ناول نویس تھے۔ ان کے ناولوں میں وہ تمام خوبیاں جو اعلےٰ ناولوں میں ہونی ضروری ہیں۔ بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ انکی مقبولیت، شہرت اور اثر کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سر سید مرحوم نے روزمرہ اور سیدھی سادی زبان میں سنجیدہ تحریریں لکھنے کی ابتدا کی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مغربی ادب کی تقلید میں سیرت نگاری اور تنقید لکھنے کا راستہ تیار کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی رنگین بیانی کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ مولانا شبلی نے تواریخ جیسے خشک مضمون پر کتابیں لکھیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی وہ شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل نہیں ہوئی جو مولانا نذیر احمد کے حصے میں آئی۔ تعزیرات ہند اور دیگر سرکاری کتابوں کا ترجمہ کرنے کے سبب سے پبلک ان کے نام سے واقف ہوئی۔ قرآن پاک کا ترجمہ کرنیکے بعد ان کا نام ہر مسلمان کی زبان سے سنا جانے لگا۔ اور دلچسپ اور مفید ناول لکھکر انہوں نے ہندو اور مسلمان لڑکیوں، لڑکوں، اور انکی ماؤں میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ آخر تعزیتوں کے ذریعے انہوں نے شہرت دوام حاصل کی اور مقلدین کا ایک گروہ تیار کر لیا۔ مادر گیتی نے ایسے صاحب کمال بہت کم پیدا کئے ہیں۔ جب تک اردو زبان زندہ ہے ان کے احسانات سے ہرگز سبکدوش نہ ہوسکیگی ✦

سید محمود مورخ، بی، اے

ضرباتِ قلب

امکانِ ناممکنات

اُس وقت مجھے تمہاری آرزو تھی جس طرح اب تمہیں میری تمنا ہے لیکن دریا کا پانی آخری پل کے نیچے سے بھی گذر چکا ہے۔ اور جو پانی ایک بار پل کے نیچے سے گذر جاتا ہے۔ وہ سمندر کی جانب اپنا راستہ بنائے بغیر رہ نہیں سکتا۔

اُس وقت مجھے تم سے محبت تھی جس طرح اب تمہیں مجھ سے الفت ہے لیکن نسیمِ صبح کا تیز جھونکا غنچۂ گل کو گدگدا کر آگے بڑھ گیا۔ اور نسیمِ صبح کا جو جھونکا غنچۂ گل کو گدگدا کر آگے جاتا ہے۔ وہ اس سے دوبارہ اٹھکھیلیاں کرنے کیلئے واپس نہیں آتا۔

اُس وقت میں تمہاری پجارن تھی جس طرح اب تم میرے پرستار ہو۔ لیکن تمہاری سرد مہریوں سے من کے مندر کے پٹ بند ہو گئے۔ اور جب من کے مندر کے پٹ کسی کی سرد مہریوں سے بند ہو جاتے ہیں۔ تو آہوں کی گرمی یا آنسوؤں کی تپش انہیں دوبارہ کھول نہیں سکتی۔

اُس وقت مجھے تمہاری کج ادائی کا گلہ تھا جس طرح اب تمہیں میری بے رخی کی شکایت ہے لیکن عاشق کی تلون مزاجی محبوب کے دل کو گھائل کر دیتی ہے اور جب کسی کا لبریز محبت دل ایک بار گھائل ہو جاتا ہے تو مخلوق سماوی کی مسیحائی بھی اس کا اندمال نہیں کر سکتی ——— آہ! ———

اب بتاؤ یہ میرا اپنا قصور ہے یا خود تمہاری شومیٔ قسمت کہ ہماری زندگی ایک دوسرے سے جدا بسر ہو رہی ہے۔ تم محبت کے اہل نہیں۔ مجھے تم سے محبت ہو نہیں سکتی۔

ماضی کے فنا شدہ واقعات میں تجدیدِ حیات غیر ممکن ہے۔
لیکن اگر محبت سچی ہے تو غیر ممکن ممکن بن سکتا ہے۔

جاؤ! دریا کی سطح میں نشیب کو فراز سے بدل کر پانی کی روانی کو پلٹ دو ——— نظامِ قدرت میں دخل اندازی کر کے نسیمِ صبح کے جھونکوں کا رُخ تبدیل کر دو عشق کے دیوتا کو رام کر کے من کے مندر کے پٹ کھلوا دو اور پھر ان سب سے زیادہ یہ کہ خود میرے دل کو موہ لو۔ کسی طرح مجھے اپنا بنا لو۔

ورنہ میرے در سے تمہیں محبت کی بھیک نہیں مل سکتی۔
میں تمہیں دے سکتی ہوں ایک دردِ محرومی۔ ایک احساسِ ناکامی اور بس۔

میری دوشیزگی

میری سہیلیاں آئیں اور مجھ سے کہنے لگیں "اٹھو سکھی! تہوار کا دن ہے آج۔ عمدہ لباس پہنو۔ سنگھار کرو اور اپنے دل کو مسرت سے معمور کر لو"
ہائے میں کیونکر ان سے کہوں کہ عورت کا حقیقی سنگھار صرف شوہر کے لئے ہو سکتا ہے۔ اس کی تمام زینتیں مخصوص ہونی چاہئیں صرف اُس ہستی کیلئے جس کی وہ شریکِ حیات ہے۔ خدا جانے کیوں وہ اصرار کرتی ہیں۔ حالانکہ جانتی ہیں۔ کہ میں ان کی طرح نہیں ہوں۔ میں تو ابھی دوشیزہ ہوں۔

موسم بہار آیا اور کج فہم کوئل آم کی ڈالیوں پر کوکنے لگی۔ گویا اُس نے مجھے بھی دعوتِ موسیقی دی۔ میرے دل میں درد پیدا ہو گیا۔ ایک ہوک سی جگر میں اُٹھنے لگی۔ لیکن میرے تمام تاثرات جو نوحۂ غم بن چکے تھے۔ نوکِ زبان تک نغزین کر آئے اور رُک گئے۔ میں نے اپنے لبوں کو جنبش نہ دی۔ ہائے کمبخت کوئل سے کون کہے کہ عورت کی ترنم ریزیاں صرف شوہر کی سامعہ نوازی کے لئے ہوتی ہیں۔ وہ اپنے نغموں سے صرف اس ہستی پر کیفیت سُکر طاری کرے۔ جس کی وہ شریکِ حیات ہو۔ مگر خُدا جانے وہ کوکنے سے کیوں باز نہیں آتی۔ حالانکہ وہ جانتی ہے کہ میں اپنی سہیلیوں کی طرح نہیں ہوں۔ میں تو ابھی دوشیزہ ہوں۔

میں نے پہاڑ کے دامن میں ایک کنجِ عزلت دیکھا۔ اور میں وہیں بیٹھ گئی ـــــ اپنا غم غلط کرنے۔ تنہائی میں آنسو بہانے ـــــ میں خوش تھی۔ وہاں جنگلی گلاب کا ایک پودا تھا۔ اس میں ایک کلی تھی ـــــ ایک دوشیزہ کلی ـــــ جس کے لبوں پر رات میں پڑی ہوئی شبنم کی چند دوشیزہ بوندیں موجود تھیں ـــــ حوادثِ روزگار کی دستبرد سے بظاہر محفوظ ـــــ مگر دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی شعاعیں آئیں۔ اور ان دوشیزہ بوندوں کو اپنے آغوش میں جذب کر کے لے گئیں۔ نسیمِ صبح کا جھونکا چلا ـــــ اٹکھیلیاں کرتا ہوا ـــــ اور اس دوشیزہ کلی کے لبوں کو چوم کر اُسے شباب کی سرمستیوں میں چُور کر دیا۔ آہ! قدرت نے ان کو دوشیزگی کے بار سے سُبکدوش کر دیا۔ نہ جانے خُدا کو کیا منظور ہے ـــــ اس میں کیا مصلحت ہے کہ میں ابھی تک دوشیزہ ہوں۔

تہدیہ

میرے محبوب! مجھے یاد ہے۔ جب تم نے میرے محبت بھرے دل کو ٹھکرایا تھا ـــــ حد درجہ بے رُخی اور نفرت، حقارت کے ساتھ ـــــ تو آسمان پر چمکنے والے ستاروں کے قہقہے سے تمام فضا گونج اُٹھی تھی۔ اور دریاؤں کا چلتا ہوا پانی بھی مجھے چھیڑنے کی نیت سے کچھ دیر رُک گیا تھا ـــــ مگر تمہیں اُنکے تمسخر ہائے بیجا سے کیا غرض؟!

ستارے متعجب تھے کہ کُرۂ ارض پر رہنے والی مخلوق اتنی بے رحم ہے اور دریا کا پانی مُتحیّر تھا کہ اس کے ساحلوں پر بسنے والے لوگ بھی ستم گار ہیں۔ ستاروں کی دیوی نے حکم نافذ کیا کہ آئندہ اِس مخلوقِ ارضی پر نور وضیا کی بارش نہ ہو۔ اور دریا کی جل پریوں نے باہمی فیصلہ کیا کہ پانی کا کوئی قطرہ آئندہ جنسِ قوی کے حلق کو تر نہ کرے۔

لیکن میرے محبوب! یہ ستارے ـــــ سورج دیوتا سے روشنی کی بھیک مانگ کر چمکنے والے ستارے ـــــ کج فہم ہیں۔ اور وہ دریا بھی جو شہر کی غلیظ نالیوں کے اشتراک سے ترتیب پاتے ہیں قوتِ ادراک سے محروم ہیں۔ ستارے روزانہ دیکھتے ہیں اور نہیں سمجھتے۔ کہ چاند ہزار بار چھپے مگر پھر بساطِ فلک پر اُسے جلوہ گر ہونا ہی پڑتا ہے۔ دریا محسوس کرتے ہیں مگر اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ پانی کا ایک قطرہ بھاپ بن کر سمندر سے کتنی ہی مدت جُدا رہے انجامِ کار سطحِ زمین پر برس کر اُسے سمندر میں مل جانا ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح میرے محبوب! تم میرے دل کو کتنا ہی ٹھکراؤ۔ پامال کرو۔ کبھی نہ کبھی اسے اپنے سینے سے لگانے کے لئے مجبور ہو ہی جاؤ گے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ اور اس کا مجھے احساس ہے۔ میرے قلب کی دھڑکن تمہاری رُوح کا ایک جُزو ضرور بنجائیگی۔

یہ مغرور ستارے اگر اپنا نور نہ دیں تو نہ سہی۔ اور تنگ ظرف دریا اپنے دو چلو پانی پر گھمنڈ کرتا ہے تو کرنے دو۔ نہ میرے شعلۂ قلب کی چمک مدھم پڑی ہے۔ اور نہ میری آنکھوں میں آنسو خشک ہوئے ہیں۔ میں اُن کا نعم البدل پیش کر دونگی۔

میری ہستی تمہارے ہی لئے ہے۔ میرے محبوب!.

تمنائے دید

چاند بزم انجم میں بساطِ فلک پر، میں تنہا دریا کے کنارے سطحِ زمین پر، اور میرے خیالات فضائے بسیط میں سرگرداں و پریشان۔ اس وقت تم مجھے یاد آرہے تھے میرے پریمی۔

مانا کہ ہم دونوں کے درمیان سینکڑوں میل کا فاصلہ ہے، لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ یہ تخیل عرش ہم دونوں پر ایک ہی وقت میں ضوفشاں نہ ہو ــ اور ہاں میں نے آرزو کی۔ کاش! اس سمے تمہاری نگاہیں بھی اسی منبع نور و ضیا پہ مرکوز ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ہماری شومیٔ قسمت۔ لیکن ہماری نظروں کا اتصال تو ایک ہی جگہ ممکن ہو جائے۔

میں خوش تھی اور محسوس کر رہی تھی کہ اس نورانی فضا کی تمام نعمتیں صرف میرے اور تمہارے لئے ہیں۔ کہ ایک ستارے نے آسمان سے ٹوٹ کر مجھے چونکا دیا۔ فرشتے میری حماقت پر ہنس رہے تھے ـــــ اور ہاں میں نے آرزو کی۔ کاش! اس سمے تمہاری نگاہیں اس منبع نور و ضیا پہ مرکوز نہ ہوں۔

مجھے احساس ہوا کہ ابھی دنیا میں بیداری کا بازار گرم ہے۔ رات زیادہ نہیں آئی تھی۔ اور یہ یقینی امر تھا کہ اس وقت میری طرح دوسری ہزاروں عورتیں بھی چاند پر نظریں جمائے بیٹھی ہونگی۔

بھلا میں کس طرح گوارا کر لیتی میرے پریمی! کہ ان کی نظروں کا اتصال تمہاری نگاہوں کے ساتھ ہو ــ ایک ہی مرکز پر، ایک ہی وقت میں ــ اور میں آتشِ رشک سے جل نہ اٹھوں۔ میں تو تمہاری نگاہوں کو صرف اپنے ہی لئے مخصوص کر لینا چاہتی ہوں۔

بتاؤ پریمی! تم مجھے دیکھنے کب آؤ گے؟۔

فضل حق قریشی دہلوی

تجلّیات

عہدِ فروغِ گُل میں کوئی خزاں رسیدہ ــ داغوں کو جانتا ہے گلہائے نو دمیدہ
جوشِ جنوں ہے گویا دیوانگی کا حاصل ــ ہے پنجۂ جنوں میں اک دامنِ دریدہ
افسردہ ہیں گُلِ تر، ویران ہیں نشیمن ــ ہے بادِ خزاں سے رنگِ چمن پریدہ
گلشن میں آج میرا باقی نہیں نشاں تک ــ تھا جس پہ کل نشیمن وہ شاخ ہے بُریدہ
پیشِ نظر ہے اب تک منظر بہارِ گُل کا ــ سمجھے خزاں، خزاں کو کیونکر بہار دیدہ
جوشِ جنوں ہے کون اب کرتا ہے دستگیری ــ ہر ایک خار سے ہوں میں آستیں کشیدہ

عیشِ جہاں کو تابشؔ کیونکر قبول کر لوں
ہوں روزِ اولیں سے تلخیٔ غم چشیدہ

نزہت دہلوی

جامِ صہبائی

"صہبائی کی فطری شاعری کی اصل جلوہ گاہ اُن کی رُباعیات ہیں"

رُباعی کب پیدا ہوئی اور کہاں ؟ یہ ایک طولانی بحث ہے۔ بہرکیف یہ امر مسلمہ ہے کہ رُباعی اہلِ عجم کی ایجاد ہے۔ اس کی شانِ نزول کیا ہے ؟ اس سے بہت سی کہانیاں منسوب کی جاتی ہیں جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ وجہ تسمیہ کے متعلق صرف اسی قدر کہدینا کافی ہوگا چونکہ رُباعی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور مجموعہ میں دو بیت ہوتے ہیں اس لئے اہلِ عجم اسے رُباعی یا دوبیتی کہتے ہیں۔ بعض علماء صرف اسی وجہ تسمیہ کو ناکافی سمجھتے ہیں اور اس کے اوزان کا مربع الاجزا ہونا بھی ایک وجہ بیان کرتے ہیں۔ لیکن وہ اوّل الذکر توجیہ کی صحت سے منکر بھی نہیں۔ فارسی کی ابتدائی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ رُباعی اوّل اوّل کُلیتہً معدوم تھی۔ وہاں شاعری کی ابتداء قصیدہ سے ہوئی اور قصیدہ ہی کی ایک شاخ سے غزل کی طرح اندازی ہوئی۔ اور غزل کو جو ترقی ایران میں حاصل ہوئی تاریخِ ادبیاتِ عالم اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دیگر اصنافِ سخن بھی معرضِ وجود میں آتی رہیں لیکن رُباعی کا کہیں نام بھی نہ تھا۔ بالآخر یہ بھی ظہور پذیر ہوئی۔ یہ ایک ایسا خوش آیند نغمہ تھا اور اسے وہ قبولیت عامہ حاصل ہوئی کہ ہر شاعر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن وقت نے یہ ثابت کردیا کہ رُباعی فی الواقع آخر میں ہی ہونی چاہیئے تھی۔ کیونکہ عام شعراء حقیقی معنوں میں رباعی گو نہیں ہوسکے۔ گو ہر ایک کچھ نہ کچھ ضرور کہہ گیا ہے۔

رُباعی کے چند اہم ترین خواص یہ ہیں۔ کہ اس میں ایک مہتم بالشان مسئلہ پر روشنی ڈالی جائے۔ کسی لطیف نکتہ کی تشریح اور توضیح پیش کی جائے۔ ایک پاکیزہ سوال کا جواب سپردِ قلم کیا جائے۔ یا کسی ٹھوس اور نہایت وسیع مضمون کو اس خوبی سے ادا کیا جائے کہ اُس کے ہر جزو پر روشنی پڑے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ ہر مصرعہ قلزم درآغوش ہو۔ ہر مصرعہ میں ایک راز کا انکشاف ہو۔ اور مصرعے بتدریج ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچیں کہ مصرعہ چہارم میں پورا زور نمایاں ہوجائے اور یہ مصرعہ باقی مصرعوں پر حاوی نظر آئے۔ یہ تو تھیں معنوی خوبیاں اب لفظی محاسن بھی دیکھئے۔ زبان شستہ۔ عام فہم اور مضمون کے مطابق ہو۔ الفاظ برجستہ اور مناسب مواقع پر رکھے گئے ہوں۔ تراکیب دلاویز ہوں وغیرہ۔ السنہ شرقیہ کی شاعری میں یہ ایک مشکل ترین اور احسن ترین صنفِ سُخن ہے۔ اور حقائق ماوراء مافوق کے زیرِ نظر یہ ضروری ہے کہ رُباعی گو زبان پر ملکۂ تامہ رکھتا ہو۔ علوم و فنونِ متداولہ پر اُسے عبور کامل حاصل ہو۔ صحیح الفکر ہو۔ فنِ عروض میں بھی دستگاہ رکھتا ہو۔ پختہ خیال ہو۔ دیگر اصنافِ سُخن پر بھی قادر ہو۔ ایران میں رباعی سے پیشتر ہر شاعر اپنے لئے ایک جُداگانہ شاہراہ منتخب کرچکا تھا۔ اس لئے عام شعراء رُباعی میں کامیاب ہوسکے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اچھے رُباعی کہنے والے شعراء کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اور ہم خیام۔ ابوسعید ابوالخیر۔ بابا افضل کو ہی۔ سحابی اور جامی کے اسمائے گرامی ہی پیش کرسکتے ہیں۔

خیام رُباعی کے بادشاہ ہیں اور ابوسعید اُن کے ہم پایہ کہے جاسکتے ہیں۔ دیگر شعراء کو ایک ہی صف میں جگہ دیجاسکتی ہے۔ خیام ایک متبحر عالم تھے۔ مذہبیات میں کامل دستگاہ تھی۔ زمانے کے سرد و گرم سے واقف تھے۔ دل درد سے معمور تھا۔ اس لئے جو کچھ نکلتا تھا شعلہ درآغوش ہی ہوتا تھا۔ اُن کا رنگِ خصوصی وہی ہے جس کی وجہ سے کوتاہ اندیش اُنہیں متہم کرتے ہیں۔ یعنی ساغر و مینا اور ساقی۔ یہ خیام کے ہیرو ہیں، اسی طرح جیسے فردوسی کا ہیرو رستم ہے مگر حقیقت میں دیکھتے ہیں اور جانتے بھی ہیں کہ خیام کے خمکدہ اور نگارستان

کی کیفیات کون سے رازہائے درون پردہ کی آئینہ دار ہیں۔ اس کو چھوڑ یئے۔ انسانی عظمت۔ حقائق و معارف، زندگی۔ مسائل تقدیر۔ رموز و اشارات تصوف۔ مذہبیات کے نکتہ ہائے لطیف کچھ اس خوش اسلوبی سے بیان کرگئے ہیں کہ آج تک اُن کا جواب نہیں ہو سکا۔ عشق و محبت۔ بے ثباتی عالم۔ بیکار پیہم کے مضامین کی بھی فراوانی ہے۔ شیخ و زاہد سے بھی چھیڑ چھاڑ جاری ہے۔ اُن کی زبان میں ایک خاص رنگینی ہے جو بالکل ممتاز معلوم ہوتی ہے۔ سوائے سلطان ابوسعید ابوالخیر کے کوئی اُنکی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا۔ ابوسعید ابوالخیر عالم تھے۔ صوفی تھے۔ آپ کے متعلق بیان کیا جاتا ہی کہ چودہ سال تک مجذوب رہے۔ پھر سلوک میں آگئے۔ لیکن رنگِ جذب پھر بھی باقی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی رُباعیات میں عشقِ الٰہی کا رنگ غالب ہے۔ آپ جو کچھ فرماتے ہیں اُسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ خاتم الاولیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور آئمہ کرام سے اُنہیں خاص عقیدت ہی جس کا اظہار گاہ بگاہ کیا گیا ہے۔ بابا افضل کو ہی کے ہاں۔ انسانی عظمت۔ ذوقِ عمل۔ گفتار و کردار کے مضامین کثرت سے ہیں۔ لیکن یہ سب متاخرین کی شاعری کے جزو اعظم تصوف و فلسفہ سے منحرف ہیں، سحابی صوفی ہیں اُن کی رُباعیات میں بھی رنگ تصوف جھلکتا ہے۔ لیکن بعض مقامات پر۔ ساغر و مینا اور ساقی کے مضامین میں رنگِ مجاز اس قدر نمایاں ہے کہ اُن کے تصوف میں اشتباہ کا امکان پیدا ہو جاتا ہی۔ لیکن یہ ماحول کے تاثرات ہیں۔ اُردو شاعری میں بھی رُباعی کی حالت عجیب رہی ہے۔ متقدمین سے متاخرین تک چلے آیئے۔ تو انیس و دبیر کے سوا رُباعی کسی شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ ایک ضخیم دیوان کے آخر میں چند رباعیات نظر آجاتی ہیں۔ وہ بھی کہیں کہیں۔ پھیکی اور بدمزہ سی۔ اُردو کے مشہور شعرا۔ ولی۔ میر۔ غالب۔ ذوق۔ مومن۔ داغ۔ امیر۔ وغیرہ کا میدان غزل و تغزل رہا ہے۔ ویسے بھی ہندوستان میں ایران کی طرح قصیدہ و غزل پیش پیش رہے ہیں۔ دبیر۔ انیس کے ہاں جو رُباعیاں نظر آتی ہیں۔ وہ بھی "سلام" اور آئمہ کرام کی مدح و توصیف تک محدود ہیں۔ زبان اُن کی اپنی ہے لیکن رُباعی کے معنوی خواص کی کمی ہے۔ اب ہماری نظر بہ آسمانِ اُردو کے درخشندہ ستارے اور ادب اُردو کے بزرگترین محسن مولانا حالی مغفور پر پڑتی ہیں۔ آپ نے کافی رُباعیات کہی ہیں اور رُباعی کا حق بوجہ احسن ادا کیا ہے۔ قومی درد آپکے رگ و ریشہ میں سرایت کرچکا تھا۔ اخلاقیات سے انہیں ایک خاص ذوق تھا۔ قدرتاً اس کا رنگ اُنکی شاعری میں نمایاں ہونا ناگزیر تھا۔ اس لئے اُن کے ہاں۔ اخلاقیات۔ قوم پرستی۔ پند و موعظت کثرت سے ہے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم مولانا ممدوح کے قریبی ہمعصر کہے جاسکتے تھے۔ انھوں نے بھی کافی رُباعیات کہی ہیں۔ آپ کے ہاں تخیلات کا تنوع قابلِ ستائش ہے۔ قوم پرستی۔ اخلاقیات عرصہ حیات کی تنگ و دو۔ انسانی عظمت۔ عصرِ حاضر کی مخرب اخلاق فضا۔ جہد البقاء کے متعلق نہایت پاکیزہ خیالات قلمبند فرماتے ہیں۔ آپ کی طبیعت پر ظرافت کا رنگ غالب ہے۔ سنجیدگی میں بھی اس کی چاشنی نظر آتی ہے۔ ایشیا کے قابلِ تقلید شاعر اور ہندوستان کی مایۂ ناز شخصیت حضرت لسان العصر علامہ سر محمد اقبال نے بھی رُباعیاں کہی ہیں۔ لیکن بہت کم۔ آپنے قطعات ضرور لکھے ہیں۔ لیکن قلزمِ شعریت سے چند قطروں کا وجود ادب اُردو کی شادابی کے لئے کم ہے۔ اُن کے ہاں۔ خود دریابی۔ بیکار پیہم اور ذوقِ عمل کثرت سے ہی۔ حضرت امجد حیدر آبادی نے کثرت سے رُباعیات لکھی ہیں۔ جو بلندیٔ تخیل۔ پاکیزگیٔ اخلاق اور مضمون آفرینی کے اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ مسٹر جگت موہن صاحب رواں کی رُباعیات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب موصوف نے رُباعی کے جملہ لوازمات کو برقرار رکھنے کی کوشش فرمائی ہے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جو تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا گہوارہ رہا ہو شاعری کی اس حسن ترین اور اہم ترین صنفِ سخن کی یہ حالت مایوس کن نظر

آتی ہے۔ شعرائے کرام کا عام رُجحان غزل کی طرف ہے۔ نظم کی طرف توجہ ہو رہی ہے۔ رُباعی بھی اب ایک آدھ ضرور نظر آرہی ہے۔ "ورِ دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی" کے مصداق مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ عین اس عالم بیم و رجا میں ہماری نظر ہندوستان کے مایۂ ناز نوجوان فلسفی شاعر حضرت اثر صہبائی پر پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے آپ نے "مردے از غیب برون آید و کارے بکند" کی تصدیق کی ہے۔ آپکی رُباعیات جن میں کچھ قطعات بھی شامل ہیں "جامِ صہبائی" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ اور بہت سی غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ جو ہمایوں۔ ادبی دُنیا۔ اور ساقی وغیرہ رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ صہبائی نے جس رُباعی کی طرح اندازی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شعر و شاعری کی ابتدا ایامِ تعلیم سے شروع ہوتی ہے۔ اور جوں جوں علمی ترقی ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے معیارِ شعر بھی بلند ہوتا جاتا ہے۔ غزل۔ نظم۔ مثنوی وغیرہ سب کچھ کہا اور اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوا لیا۔ لیکن اوروں کی طرح وہ اپنی بلند طبیعت کو اسی چار دیواری میں محبوس نہ کر سکے۔ اور دُوررس نگاہ رباعی جیسی اہم ترین صنفِ سخن پر پڑی۔ آپکے دیگر کلام میں۔ غالب۔ اقبال۔ خواجہ حافظ شیرازی۔ مولانا حسرت موہانی کا رنگ غالب ہے۔ رُباعی میں حکیم خیام کا رنگ نمایاں ہے۔ کہنے میں مختصر یہ ہے کہ دارفتہ طبیعت اس حلقے سے گھبرا کر نکلی۔ پختہ کار پہلے ہی سے ہو چکے تھے۔ عروض میں بھی دستگاہ تھی۔ علمی سرمایہ بھی فراواں تھا۔ زبان پر قدرت تھی۔ دینیات کے شعبہ پر بھی حاوی تھے۔ اِن خصوصیات نے جمع ہو کر رُباعیات کہلوائیں اور "جامِ صہبائی" شاہد ہے کہ عہدِ خیامی کی تجدید کردی اور اگر وہ جامِ صہبائی کی بجائے "مرقع خیامیات" نام رکھتے تو موزوں تر ہوتا۔ کیونکہ یہ خیامیت اس حد تک اثر انداز ہے کہ زبان کا ہی فرق حائل ہوتا ہے ورنہ تمیز کرنا مشکل ہے۔ ایک ہی مضمون کو سو سو بار کہتے ہیں لیکن ہر رنگ میں نیا انداز ہوتا ہے۔ ہر بار نئی ہی کسوت میں جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ ایک ایک رُباعی بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت اُکتاتی نہیں۔ رہا تنوعِ مضامین، اُس کی شہادت آیندہ سطور دینگی۔ "جامِ صہبائی" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عصرِ حاضر کے رُباعی گو شعرا میں انہیں اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہے۔ اور خیامیت کا تاثر اسباب کا مقتضی ہے۔ کہ اگر خیام پیغمبرِ رباعی ہیں تو صہبائی مجدد رُباعی کہے جائیں۔ جامِ صہبائی یا صہبائی کے جام میں کیا ہے؟ دو آتشہ سہ آتشہ نیم تُند۔ دہ سالہ۔ ہزار سالہ۔ کیف و مستی۔ سرور و شادمانی۔ حقائق و معارف عرفانِ حقیقت۔ فلسفہ و حکمت۔ شاعر کسے کہتے ہیں؟ فطرت کے پیغام رساں کو! مشاعرہ میں مترنم آواز سے چند اُلٹے سیدھے جملے پڑھکر شہرت حاصل کرنے والا شاعر نہیں کہلا سکتا۔ حقیقی شاعر ان باتوں سے بلند و بالا ہوا کرتا ہے۔ شاعر کا فرض تکمیلِ فن ہے جسے اظہارِ حقیقت سے موسوم کیا جا سکتا ہے اور یہی اظہارِ حقیقت فطرت کا پیغام ہوا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اُس کا فرضِ اوّلیں فطرت کی پیغام رسانی ہے خواہ وہ نظم کا جامہ پہنکر آئے۔ خواہ مثنوی کی قبا در بر کرکے جلوہ افروز ہو۔ اور خواہ رباعی کے خلعت میں آراستہ ہو کر ضیا پاش ہو۔ صہبائی نے یہ راز ابتدا ہی سے پالیا اور اُن کی شاعری ابتدا سے انتہا تک اس امر کی شاہد ہے۔ علامہ اقبال کے مخصوص مضامین "خودداری"۔ "بلندی عزائم" اور "درسِ عمل" صہبائی کی رباعی میں کثرت سے ہیں۔ چنانچہ آپکی خیامیت اور اقبالیت کہانتک کامیاب ہے۔ اِس کا جواب آیندہ سطور دینگی۔ جامِ صہبائی کا جرعہ اوّلیں ہی ملاحظہ ہو کن کیفیات کا حامل ہے۔

وجودِ مطلق

"وجودِ مطلق" یا "ہستی خدا" ایک ازلی اور ابدی مسئلہ ہے اور صوفیانہ شاعری میں یہ مسئلہ روحِ شاعری رہا ہے۔ اسلامی فلسفہ نے

اس موضوع پر طول وطویل مباحثات قلمبند کئے ہیں۔ مولانا رومؔ۔ امام غزالیؔ۔ شیخ محی الدین اکبر وغیرہ نے اس مسئلہ پر ہر طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ مسئلہ ہی کچھ ایسا پیچیدہ سا ہے کہ عقل اس کا حل نکالنے میں ناکام رہی ہے۔ اہل اسلام کا ایمان ہے کہ خدا ہے اور یہ دُنیا اُسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ لیکن جب پوچھا جائے کہ کیا ہے اور کہاں ہے؟ تو جواب گھبرائی ہوئی نظروں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ بعض کوتاہ فہم تو خدا کو ایک وجود خیال کئے بیٹھے ہیں۔ لیکن مخالفین اعتراض کرتے ہیں کہ جب وجود ہے تو وجود کا پیدا کُنندہ کوئی ضرور پیدا ہونا چاہیئے۔ اور جب خدا کو بھی کسی نے وجود دیا تو خدا کہاں رہا۔ حضرات صوفیا کا قول ہے اور قریبًا قریبًا تمام اہل فلسفہ کا بھی کہ خدا ازلی و ابدی ہے۔ ہر وجود اُس معبودِ مطلق کی شانِ کبریائی کا ظہور ہے۔ پھول میں بُو اسکی ہے۔ کواکب کی بینایانہ جلوہ پاشیوں میں اُنہیں وہی نظر آتا ہے۔ دریا کی روانی میں وہ اُسی ذات کو متموّج دیکھتے ہیں اور یہاں فرق یہ ہے کہ صوفی دیدۂ دل سے دیکھتا ہے اور اُسے ہر جگہ عیاں پاتا ہے اور دلیل یہ دیتا ہے کہ جس نے عقل کو پیدا کیا اُسے عقل کے ذریعہ ہی تلاش کرنا صحیح نہیں کیونکہ ہر حالت میں موجد۔ ایجاد سے افضل ہے۔ اس لئے موجد کو تلاش کرنیکے لئے موجد کے برابر کی ہی کوئی چیز ہونی چاہیئے۔ عقل صرف موجودات ہی کا تجسّس کر سکتی ہے اور موجود کے لئے ضروری ہے کہ اس کا وجود ہو۔ لیکن خدا وجود سے منزا ہے۔ اور جس کا وجود معلوم نہیں اُسے عقل سے ڈھونڈھ نکالنے کا دعویٰ کرنا ایک سعی لا طائل۔ ہے۔ اہل تفلسف ہر بات کو عقل و استدلال سے معلوم کرنے کے مُدعی ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر اُلجھ جاتے ہیں اور اس معاملہ میں تو وہ خود ایسے اُلجھتے ہیں کہ کسی کے لئے بھی کوئی تسکین آمیز جواب پیدا نہیں کر سکے۔ اس کے علاوہ ایک اور فرقہ ہے جو مادہ پرست (Materialist) کہلاتا ہے۔ یہ فرقہ سرے سے ہی مُنکر ہے اُن کا خیال ہے کہ تکوین عالم کسی علیحدہ ہستی کا کام نہیں دُنیا میں چند ایسے اجزا موجود تھے جن کا امتزاج تکوین عالم کا سبب ہوا اور یہی وہ اجزائے مادہ ہیں جو ہر چیز میں نظر آتے ہیں اور انہیں صوفیا مظہر حق سمجھتے ہیں۔ بعض حکمائے حاضرہ کا بھی خیال ہے کہ کوئی ما فوق الفطرت (super-natural) طاقت موجود ہے جو نظامِ عالم کی ذمہ دار ہے۔ شاعر کی دُنیا نرالی ہے۔ وہ ہر بات کو اپنے ہی زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے اوروں کی کہی ہوئی باتوں میں اُسے فرسودگی نظر آتی ہے اور پھر وہ شاعر ہی کیا جو جدّت پسند نہ ہو۔ صہبائیؔ فطری شاعر ہیں اُن کی طبع وقاد فلسفہ کی وساطت سے تلاش میں نکلتی ہے لیکن پھنس جاتے ہیں اور عالمِ تذبذب میں پکار اُٹھتے ہیں ؎

تیری ہستی کا کچھ یقیں بھی نہیں ۔۔۔ میرے لب پر مگر "نہیں" بھی نہیں
دیکھتا ہوں تو ہر جگہ موجود ۔۔۔ سوچتا ہوں تو پھر کہیں بھی نہیں

مصرع ثانی میں "نہیں" کی تکرار بہت خوب ہے۔ اور اس تذبذب آمیز اقرار کو لطیف تر بنا دیتی ہے۔ عقل و نظر کا موازنہ بھی خوب ہوا ہے۔ اب پھر کوشش کرتے ہیں، لیکن انہیں یہ ایک راز معلوم ہوتا ہے اور وہی تذبذب طاری رہتا ہے ؎

رازِ عدم و وجود پایا نہ گیا ۔۔۔ یہ پردۂ مرگ و زیست اُٹھایا نہ گیا
انکار بھی ہو سکا نہ تجھ سے ہمدم ۔۔۔ ایمان بھی مگر خدا پر لایا نہ گیا

صوفیانہ نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں مگر فلسفہ پھر آڑے آجاتا ہے۔ اب اِن دونوں گروہوں سے الگ ہو جاتے ہیں اور مادہ پرستی نمایاں ہو جاتی ہے ؎

پھولوں میں کبھی اُسے عیاں پاتا ہوں ۔۔۔ دل میں بھی کبھی کبھی نہاں پاتا ہوں
سب عقل و نگاہ کے ہیں دھوکے ورنہ ۔۔۔ کب دیکھتا ہوں اُسے کہاں پاتا ہوں

"کبھی کبھی" کی بھی خوب کہی۔ مصرع چہارم میں "کب اور کہاں" کی کرامت دیکھئے۔ انکار میں کس قدر تقویت پیدا کر دی۔ اب اِن دونوں گروہوں کو چھوڑ چھاڑ صوفی بنجاتے ہیں۔ جذبۂ شعر پہلے سے موجود ہے۔ اب عقل اُنہیں ایک پردہ نظر آتی ہے۔ یہ بالکل ایک صوفیانہ خیال ہے کہ عقل میں حجاب ہے عقل چھوڑ دیوانہ بنجایئے وہی نظر آئیگا۔ وہی محسوس ہو گا ؎

هر چند نہیں ہے جلوہ پیدا تیرا ڈھانپا ہوا عقل نے ہے چہرہ تیرا
محسوس یہ ہو رہا ہے لیکن یارب دُنیا تیری ہے میں بھی تیرا تیرا

اب ذرا سابقہ تخیل سے موازنہ کیجئے۔ وہاں تو بالکل مُنکر ہو گئے کیونکہ کچھ نظر نہیں آیا اور کہیں نظر نہیں آیا۔ یہاں جن چیزوں سے پہلے بندشس کرتے ہیں اُنہی کو حجاب سمجھتے ہیں۔ اور احساسات کی دُنیا میں آجاتے ہیں اور ایک والہانہ انداز سے اقرار ہو جاتا ہے۔ ارباب فن جانتے ہیں کہ "تیرا تیرا" اقرار الوہیت کو کس حد تک نمایاں کر جاتا ہے۔ اب اقرار تو ہو جاتا ہے۔ لیکن گذشتہ خیال ذہن میں عود کر آتا ہے۔ اور اس فکر میں پڑ جاتے ہیں کہ ایسا کیوں تھا۔ پہلے کیوں نظر نہیں آیا۔ تو معلوم کیا ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ظاہر کی نظر نے تجھے پنہاں پایا باطن کی نظر نے تجھے عریاں پایا
تھی عقل بھی جویا ترے جلوے کی مگر کم بخت کو سرگشتہ و حیراں پایا

معلوم ہوتا ہے صہبائی قوافی کی تلاش میں کچھ کاوش سے کام لیتے ہیں۔ "پنہاں اور عُریاں" دونوں اسقدر خوب واقع ہوئے ہیں کہ ظاہر اور باطن کے موازنہ کے لئے اِن سے بہتر شاید ہی کوئی لفظ آسکتا۔ چشم ظاہر کے لئے پوشیدگی میں قطعیت اور باطن کے لئے عریانی نہایت ہی خوب اور موثر ہے۔ اب یہاں سے آگے بڑھتے ہیں حاسۂ باطنی موجود ہے اور اب خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟

جب آئینہ دل کا روبرو ہوتا ہے جلوہ تیرا ہی ہو بہو ہوتا ہے
یوں غرقِ مئے جمال ہو جاتا ہوں میں ہوتا ہوں کہاں تو ہی تو ہوتا ہے

اللہ اللہ رفعت تخیل "تو ہی تو ہوتا ہے"۔ "تو" کی تکرار سے اپنے آپکو مٹا دیا قابل صد ستائش ہے "اور میں ہوتا ہوں کہاں" سونے پر سہاگہ ہے۔ حضرات صوفیہ دل کو آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ صوفیانہ خیال ظاہر کرتے ہوئے ضروری ہے کہ تشبیہات بھی صوفیانہ ہوں۔ صہبائی نے یہ شرط کہانتک پوری کی۔ خود قارئین فیصلہ کریں۔ میں نے اس موضوع پر صہبائی کی کچھ رُباعیاں پیش کی ہیں۔ جن سے یہ واضح ہو جائیگا کہ صہبائی نے اس اہم مسئلہ کے رموز و نکات پر اپنی قوت تخلیق کے ذریعہ کس خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے اور اسپر مستزاد یہ ہے کہ اس خشک مضمون پر اپنی رفعت تخیل۔ الفاظ کی برجستگی۔ اُن کے مضمون کے ساتھ مطابقت سے رنگ شعریت چڑھا دیا ہے۔ اب جب اللہ سبحانہٗ کے عدم وجود پر بحث کر چکے تو طائر خیال پرواز کرتا ہوا پھر فلسفہ اور حکمت پر ہی اُترتا ہے۔ اور "بعد از معاد" کے جھنجھٹ میں آجاتے ہیں۔ رُباعی کے لوازم کا تقاضہ ہے کہ اس قسم کے اہم مسائل پر یہ روشنی ڈالی جائے۔ غزل۔ نظم یا مثنوی میں مضامین زیب نہیں دیتے۔ صہبائی نے اس مسئلہ پر کیا کچھ کہا اور وہ کس نتیجہ پر پہنچے؟ اسکا جواب آگے دیا جائیگا۔ اِس سے پہلے ضروری ہے کہ اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

حیات بعد الموت یا مسئلہ معاد

یہ بھی ایک قدیم ترین مسئلہ ہے۔ ظہورِ اسلام سے پیشتر جاہلیت عرب میں جب وہاں بُت پرستی زوروں پر تھی۔ یہ خیال پردۂ عدم میں تھا۔

اسلام کی ضیا پاشیاں شروع ہوئیں تو یہ مسئلہ بھی ایک اہمیت حاصل کرنے لگا۔ شعرائے عرب جو اُس وقت تک بُت پرست تھے اس خیال کا مضحکہ اُڑایا کرتے تھے اور اس موضوع پر لمبے لمبے قصاید لکھا کرتے۔ وہ اکثر کہتے کہ "اے ابراہیم کی اولاد کیا تم یقین کرتے ہو کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو جنہیں قبر کے کیڑے ریزہ ریزہ کردینگے پھر زندگی حاصل ہوگی"۔ پیروان دین متین کا یہ اعتقاد کامل تھا اور ہے کہ تمام دُنیا ایک دن فنا ہوجائیگی اور پھر بروزِ محشر بحکم رب قدیر زندہ ہوگی اور وہاں اعمال کا حساب ہوگا۔ موجوداتِ عالم پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ ہر موجود کے لئے ایک محدود وقت مقرر ہے۔ ہر موجود ذی روح یا غیر ذی روح اپنی مدت پوری کرتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ کیا وہ پھر اپنی حالت پر عود کر آئیگا؟ باغ میں درخت ہی کو لیجئے۔ بیج ڈالدیا جاتا ہے۔ پودا نکلتا ہے۔ جسے قدرت سیراب کرتی ہے۔ یہی پودا بڑھتے بڑھتے ایک تن آور درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ شاخیں پیدا ہوتی ہیں۔ غنچے پھوٹتے ہیں، پھول کھلتے ہیں صحن چمن معطر ہوجاتا ہے۔ پھل کی باری آتی ہے، درخت جُھک جاتا ہے۔ اثمار کی بہار ختم ہوتی ہے، پتے گر پڑتے ہیں اور یہ درخت ایک تن بے جان بالکل عریاں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن کیا یہ سلسلہ یہیں ختم ہوجاتا ہے؟ نہیں۔ آندھی آتی ہے اور اسے بیخ و بن سے اکھیڑ ڈالتی ہے۔ کیا یہ درخت پھر وہی صورت اختیار کر سکیگا؟ یہ ایک لاینحل سا سوال ہے۔ یہی کیفیت انسانی زندگی کی ہے۔ پیدائش شیرخوارگی۔ طفولیت۔ شباب۔ بڑھاپا۔ اور آخر میں موت کی آندھی۔ انسان اشرف المخلوقات ہے، عالم اکبر ہے۔ اس کے لئے کوئی اور وجہ امتیاز ہونی چاہیئے۔ درخت اگر گرے نہیں۔ اُس کی اصل یعنی جڑ قائم رہے تو آمد بہار پر پھر وہی نظارہ ہے۔ وہی کیفیت ہے۔ وہی رنگینی ہے۔ انسان کی اصل روح ہے۔ اگر وہ باقی رہے تو توقع کی جاسکتی ہے کہ اسے بھی حیاتِ ثانیہ مل جائے۔ اور اس پر بھی بہار کی کیفیت اثر انداز ہو، مگر روح کا عدم و وجود ایک متنازع مسئلہ ہے کہ آیا انسان کے ساتھ یہ بھی مرجاتی ہے یا زندہ رہتی ہے۔ حضرات صوفیہ اور بہت حد تک اسلامی فلسفہ کے مطابق روح موت کی قید سے آزاد ہے۔ یہ ماضی میں تھی۔ حال میں موجود ہے اور مستقبل میں رہے گی۔ مادہ پرست فلسفی کہتے ہیں۔ روح چیز ہی کوئی نہیں یہ سب مادہ ہے جو مُرتحل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے نازک مسئلہ کا ہاتھ میں لے لینا اور پھر ایک شاعر کا ایک غیر معمولی بات ہے۔ صہبائی یہ جسارت کرتے ہیں اور نہایت آزادی سے اس پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ طبیعت میں فلسفہ کا ذوق اور جذبۂ شعر انہیں لکیر پیٹنے سے باز رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شیرازۂ ہستی کو بکھرنا ہوگا ظاہر ہے کہ اکروز مرنا ہوگا
لیکن یہ سوال ہے ابھی لاینحل کیا ڈوب کے تجھکو پھر اُبھرنا ہوگا؟

آپ اُبھاؤ میں آگئے اور نکلنے کی راہیں مسدود پاتے ہیں۔ سطور مافوق میں ذکر کیا گیا ہے کہ جاہلیت میں یہ خیال زوروں پر تھا۔ آج چودہ سو برس کے بعد وہی خیال صہبائی پیش کرتے ہیں تو اسے کس چیز سے تعبیر کیا جائے۔ کوئی مُلّا اُٹھیں گے تو فتوی الحاد پیش کرینگے۔ لیکن میں کہونگا کہ کشش بنہاں یہ جذبۂ شعر ہے جسنے یہ بات کہلوائی اور اس کے ساتھ فلسفہ کی چاشنی ہے، یہی مضمون پھر ادا کیا جاتا ہے لیکن لفظی ہیر پھیر میں ایک اور حُسن پیدا ہوجاتا ہے ؎

مرنا تو میں جانتا ہوں ہوگا ہوگا مرجانے پہ پوچھتا ہوں میں کیا ہوگا
آکر تو مجھے یہاں سے جانا ہے ضرور جاکر بھی وہاں سے کیا پھر آنا ہوگا

مصرع اوّلے میں اقرار مرگ کا بھی عجیب انداز ہے اور "ہوگا ہوگا" کی کرامت ہے۔ "پوچھتا ہوں میں" بھی خوب ہے۔ ابھی ان پیدھنوں

سے جان نہیں چھٹتی کہ ایک اور گورکھ دھندا لے بیٹھتے ہیں اور متجسس طبیعت مبدا کی طرف عود کر آتی ہے۔ اور ان ہر دو مسائل کو جو مجموعی حیثیت سے ایک ہی ہیں کیسے بیان کیا جاتا ہے ؎

یہ موت و حیات کیا ہے؟ معلوم نہیں — یہ صبح یہ رات کیا ہے؟ معلوم نہیں
کیا قبل حیات تھا خدا ہی جانے! — اور بعدِ ممات کیا ہے معلوم نہیں!!

"خدا ہی جانے" کس قدر سادہ الفاظ ہیں۔ نفی نام کو نہیں لیکن انسانی بیچارگی اور عدم واقفیت جیسے ان سے نمایاں ہو جاتی ہے وہ حرف نفی شاید ہی کرتا۔ اور معلوم نہیں جن سوالوں کا جواب ہے اُن کے جواب میں زیادہ سادہ اور جامع الفاظ اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہیں۔ اب اِسے چھوڑ دیجئے۔ صہبائی کو نہ معلوم اِس فلسفہ اور تصوف سے کیوں اتنا لگاؤ ہے کہ جس طرف نگاہ اُٹھتی ہے یہی کچھ نظر آتا ہے۔ یہ بحث ختم نہ ہونے پائی تھی کہ "جبر و قدر" آ دھمکے اب یہ بھی سنیئے۔

جبر و قدر

یہ مسئلہ بھی ازلی و ابدی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا انسان اپنے افعال و اعمال کے لحاظ سے مجبور ہے یا مختار۔ بالفاظ دیگر اور واضح طور پر بیان کیا جائے تو یوں ہوگا کہ آیا انسانی فعل و عمل خود اسی کی طاقت سے وقوع پذیر ہوتا ہے یا اس میں خدا کا ہاتھ بھی ہوتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی پیچیدہ اور اہم ترین مسئلہ ہے۔ ہر قوم کے مفکر نے اس پر اپنے اپنے خیال کے مطابق بحث کی ہے۔ علمائے اسلام اس کے متعلق مختلف خیال ہیں۔ امام حسن علیہ السلام جبر و قدر کے بین بین بتاتے ہیں۔ ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات انسان ارادہ کرتا ہے اور یہ ارادہ عملی صورت اختیار کرتا ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُسے استصواب کی ضرورت نہیں پڑی۔ اور نہ ہی اُسے کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے فعل کی محرک کوئی اور ہستی ہے جسے عرف عام میں خدا کہا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات انسان اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہو کر ارادہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور وہ ارادہ فعل کی صورت اختیار کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ماحول کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ کیا خود انسان ہی ہے؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ اور اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ انسان ارادہ کرنے میں مجبور بھی ہے اور مختار بھی۔ بعض حالتوں میں دیکھا گیا ہے کہ انسان ارادہ کرتا ہے، اُسے عملی جامہ پہناتا ہے۔ اُسے اس کا اجر ملتا ہے۔ اور اُس وقت انسان کے دل میں کبھی ہی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قسّامِ ازل کا عطیہ ہے۔ ورنہ تمام حالتوں میں وہ اس فعل اور اُس کے نتیجہ کو اپنی ہی قوت و طاقت کا مظہر خیال کرتا ہے لیکن اگر ناکامی ہو تو قسمت کا رونا رویا جاتا ہے۔ اب یہاں کیا کہا جائے۔ صوفی شعرا نے اِسے راز سمجھا اور اس راز کو طشت از بام کرنا قرینِ مصلحت نہ سمجھا۔ چنانچہ خواجہ حافظ فرماتے ہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز — ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

لیکن مشکل تو یہ ہے کہ صوفیہ میں بھی اختلاف ہے۔ علامہ محمود شبستری نے میر حسینی ہروی کے سترہ سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اپنی مشہور عالم مثنوی "گلشن راز" میں اس مسئلہ کا تذکرہ کیا ہے اور وہ نہایت شد و مد سے انسان کو مجبور محض قرار دیتے ہیں اور لگاتے طنزیہ رنگ میں کہتے ہیں ؎

ندارد اختیار و گشتہ مامور — زہے انساں کہ شد مختار و مجبور

صہبائی نے بھی اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور پُرلطف بات یہ ہے کہ ہر رباعی میں یہ خیال مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ اور ترقی کرتے کرتے ارتقاء کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ انسانی نشو و نما پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بچپن معصومیت و شرارت کا زمانہ ہے۔ یہاں اعلیٰ تخیلات کی دُنیا معدوم ہوتی ہے۔ شباب دیوانگی کا زمانہ ہے۔ اس وقت انسان جذبات سے معمور ہوتا ہے جن میں کچھ چلبلاپن ہوتا ہے۔ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن دماغ "کیوں" اور "کیسے" کی دُنیا میں آنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ کوافر زمانہ کے ساتھ ذہنی ارتقاء کا وقت آ پہنچتا ہے اور یہاں سے پختگی کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ انسان ہر بات کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ہر رنگ میں اُسے الہام نظر آتا ہے اور یہ منزل وہاں جا کر ختم ہوتی ہے جب انسان حسبِ مقدور کسی حقیقت کی انتہا معلوم کر لیتا ہے۔ صہبائی نے جس طریق پر اس مسئلہ کو واضح کیا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں شبابی رنگ عدم امتیاز ہے۔" چون و چند پر غور نہیں کیا۔ اس کے بعد ارتقائی دور شروع ہوتا ہے اور اس کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے بامِ ثریا پر جلوہ گر نظر آتے ہیں ابتداء میں کیا خیال تھا ملاحظہ ہو ؎

بیگانۂ ہوش ہوں کہ ہوشیار ہوں میں   ہوں عالمِ خواب میں کہ بیدار ہوں میں!
فطرت کی ستم ظریفیاں تو دیکھو   "مجبور" کو وہم ہے کہ "مختار" ہوں میں!!

"فطرت کی ستم ظریفیاں" نہایت ہی موزوں استعمال ہوا ہے۔ اربابِ فن جانتے ہیں کہ "وہم" کے استعمال نے قطعیت پیدا کرنے میں کیا کام کیا۔ پھر وہی مضمون ہے لیکن شان بالکل جُدا ہے۔ انسان کام کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ نتیجہ اُس کی خواہش کے مطابق ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ ویسے ہی ہو۔ اس لئے یہاں انسان کو مجبور قرار دیتے ہیں ؎

کیا رنگِ بہار تیری تدبیر سے ہے؟   کیا بادِ سموم تیری تقصیر سے ہے؟
اندیشۂ انجام میں کیوں گھُلتا ہے   تقدیر سے ہے تمام تقدیر سے ہے

شاعر بعض اوقات کسی مضمون کو بیان کرتے وقت مضمون کا کچھ حصّہ غیر مذکور رہنے دیتا ہے لیکن اندازِ بیان اسی قسم کا ہوتا ہے کہ شعر پڑھتے ہوئے غیر مذکور افراد خود بخود ذہن میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہاں بیتِ اوّل میں کچھ حصّہ چھوڑ دیا گیا اور بعد میں خود ہی وہ حصّہ ایک جامع صورت میں پیش کر دیا گیا ہے اور یہ صرف رنگِ استفہام کی خوبی ہے۔ مصرعہ چہارم اتنا ہی پُر روز ہے جتنا اساتذہ نے ہوتا بیان کیا ہے۔ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں تو تذبذب کی حالت طاری ہو جاتی ہے ؎

ساغرِ مئے عیش سے کبھی بھرتا ہوں   انجامِ بہار سے کبھی ڈرتا ہوں
تقدیر ہی یوں تو کارفرما ہے اثرؔ   محسوس یہ ہوتا ہے کہ میں کرتا ہوں

اب ارادہ کی باری آتی ہے تو بالکل ایک صحیح تصویر پیش کر جاتے ہیں۔ مگر پختگی شروع نہیں ہوئی ؎

غرقابِ سکوت ہوں کہ تقریر کروں   ممکن نہیں سرتابیٔ تقدیر کروں
تدبیر بھی کرنے پہ ہوں مجبور اثرؔ   تقدیر میں لکھا ہے کہ تدبیر کروں

حقائق افروزی کی جو مثال مصرع چہارم میں ملتی ہے کم دیکھنے میں آتی ہے۔ یہاں سے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں تو پورا مسئلہ ذہن میں آ جاتا ہے۔ اور ادا کیسے ہوتا ہے وہ بھی سُنیئے ؎

ہر چند سلاسل "مکافات" بھی ہیں — کچھ وجہ شکست و فتح "حالات" بھی ہیں
تدبیر مرد بھی عزم ہمت بھی درست — دنیا میں مگر کچھ "اتفاقات" بھی ہیں

اس تمام مسئلہ کی روح "مکافات" "حالات" اور "اتفاقات" میں ڈالدی گئی ہے۔ اور اگر کوئی چاہے تو اس پر ایک مستقل مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ لیکن یہاں تک پہنچنے سے بھی سیر نہیں ہوئے اور اب ایک ایسی جگہ پر پہنچے ہیں۔ جو حقیقت کی انتہا کہی جاسکتی ہے۔ اور جس سے کوئی ذی فہم انکار نہیں کرسکتا۔ اور پرلطف بات یہ ہے کہ یہ رباعی باقی کی رباعیات سے بہتر کہی گئی ہے اور صہبائی جس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ وہ ہے بھی یہی ؎

جب ہمت اہل دل سنبھل جاتی ہے — تقدیر سے تدبیر کی چل جاتی ہے
جب صدق طلب ہو اور شمشیر عمل — تقدیر بھی لے دوست بدل جاتی ہے

ارباب فن جانتے ہیں کہ "سنبھل جانا" اور "چل جانا" کیسے معنی خیز واقع ہوئے ہیں اور اس رباعی میں جو جادو طرازی ان سے ہوئی وہ بھی مخفی نہیں۔ لیکن شرط بھی کڑی رکھی ہے۔ صہبائی نے اس اہم اور نازک ترین مسئلہ کی توضیح پیش کی ہے اور اس طرح کہ حقیقت کے قریب تر اور پھر شعریت میں ڈبو کر۔ کیا یہ تمام حقائق صہبائی کی قوت تخیل، علمی قابلیت اور جذبہ شعری کی روشن دلیل نہیں؟ صوفیا نے اسے راز کی حیثیت دی اور مُہر بلب رہنا قرین مصلحت خیال کیا۔ علما نے جو کہا صوفیا اُسے عدم خبری پر محمول کرگئے اور کہدیا کہ ان رازہائے سربستہ کا انکشاف علم وعقل کا کام نہیں۔ لیکن صہبائی کی طبع نقاد اس سے مطمئن نہ ہوسکی اور انھوں نے علم وعقل کے ذریعہ سے اس کا حل پیش کرنے کی کوشش فرمائی۔ یہ سعی کہانتک مشکور ہوئی؟ یہ خود قارئین فیصلہ کریں۔ موصوف نے "جبر وقدر" پر غور وفکر کرتے ہوئے جو نتیجہ اخذ کیا وہ موخر الذکر رباعی میں مذکور ہے۔ اور یہاں سے دنیائے عمل کی سرحد شروع ہوجاتی ہے۔ اسی لئے اس سلسلہ کی کڑیوں کو ملانے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر انھوں نے جو کچھ کہا اُس کا تذکرہ کیا جائے اور یہاں سے اُن کی اقبالیت کی جلوہ پیرائی شروع ہوتی ہے۔

درسِ عمل

دنیا وعقبیٰ کی ترقی وبہتری کا راز کس چیز میں مضمر ہے۔ مفکرین و مدبرین عالم متفق الآرا ہیں کہ یہ عمل میں مستور ہے۔ سطحی طور پر دیکھنے سے بھی یہی نظر آتا ہے کہ بے عمل انسان دنیا میں ناکام رہا ہے۔ تاریخ پر ایک طائرانہ نظر بتاسکتی ہے کہ صرف وہی اور وہی ملک قوم یا فرد افق ترقی پر تاباں و درخشاں نظر آئے جنھوں نے اپنا مسلک حیات عمل بنائے رکھا۔ رسالتمآب سے جب یہ سوال کیا گیا کہ کون سا علم بہتر ہے تو آپ نے تین دفعہ فرمایا کہ "عمل"۔ فارسی شاعری جو چنگیز خانی حملہ کے بعد ظہور پذیر ہوئی اسکی روح بھی یہی درس عمل تھا۔ کسی فارسی اُستاد کا قول ہے۔ ؎

نابردہ رنج گنج میسر نمیشود — مزداں گرفت اے جان برادر کہ کار کرد

مفکرین عالم نے وقت کو انتہائی اہمیت دی ہے اور اسے دنیا کا سب سے قیمتی جواہر پارہ تسلیم کیا ہے۔ مذہبی مجلسی سیاسی پیشوا وقت کی قدر کرو کی تلقین کرتے رہے ہیں اور کررہے ہیں "کار امروز بفردا مگذار" بھی اسی عمل کے زیر نظر کہا گیا ہے۔ لیکن کیوں؟ سہل کوش اور

تن آسان طبقہ کے نزدیک اسے کوئی اہمیت نہیں۔ وہ اسے بیکار اور مہمل چیز خیال کرتا ہے۔ بلکہ بعض اسے وہم تصور کئے بیٹھے ہیں۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ نہ جانتے ہوئے بھی اُن سے نیک و بد عمل ضرور ہوتا ہے۔ وقت کی قیمت کسی صاحب عمل ہی کو معلوم ہوسکتی ہے۔ باتونی انسان اس کی قدر و قیمت پہچاننے سے معذور ہے۔ کیونکہ وقت محض عمل کے لئے ہے۔ ورنہ اسکا مصرف ہی کچھ نہیں۔ آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ مولانا روم اور حضرت اقبال نے عمل کو جوہر حیات اور روح کائنات قرار دیا ہے۔ اور یہ اُن کا خاص مضمون ہے۔ ہمارے صہبائی بھی اس رنگ میں اُنکے قدم بقدم دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ اور یہاں سے وہ سرحد شروع ہوتی ہے جسے میں "اقبالیت" سے منسوب کرچکا ہوں۔ صہبائی بالکل اُسی رنگ میں جلوہ پیرا ہوتے ہیں ؎

مسجد میں رہیں سبحہ خوانی کب تک　　اندیشۂ رزم زندگانی کب تک
زندہ ہے تو کارزار ہستی میں نکل　　یہ فکر شکست و کامرانی کب تک

تن آسان ہستیوں کے لئے ایک سبق ہے۔ "کارزار ہستی" بھی خوب ہے۔ "کب تک" کا استعمال حساس طبیعت کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ شکست و فتح سے بے نیازی کی تلقین خوب تر ہے۔ تقدیر کے رازہائے سربستہ سے کوئی واقف نہیں ہوا۔ اپنے افعال کا نتیجہ کوئی از خود نہیں دیکھ سکا جب تک کہ فی الواقع سامنے نہ آجائے۔ صہبائی کہتے ہیں چھوڑیئے اس جھنجھٹ کو اور آیئے دنیائے عمل میں کیونکہ عمل بجائے خود فتح ہے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

ہے ذوق ستیز کامرانی ہے یہی　　سرمایۂ لطف و شادمانی ہے یہی
تقدیر کا لکھا اُلٹنا معلوم　　ہو گرم عمل کہ زندگانی ہے یہی

"معلوم" نہایت موزوں واقع ہوا ہے۔ تمام رُباعی میں خبر یا عدم خبر کہیں نام کو نہیں لیکن "یہ معلوم" کی کرامت ہے کہ دونوں حالتوں کی ایک غیر مُنتسم تصویر ذہن میں کھنچ جاتی ہے۔

"عمل" کو ایک تصویر خیال کیجئے۔ اس کے دو رُخ ہونگے۔ ایک وہ جو بالکل صاف اور نمایاں ہوگا دوسرا دھندلا اور تاریک۔ یہ ہے حسن و قبح عمل۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ عمل ہی تو کرنا ہے۔ نیک ہو یا بد۔ اور میرے خیال میں ایسے شخص کو "گناہ اُس وقت تک دلچسپ ہے۔ جب تک نہیں ہوتا" کہہ دینا چاہیئے۔ اور حسن عمل کی کیا کیفیت ہوتی ہے ؎

عشرت باقی نہ بزم عشرت باقی　　باقی ہے گناہ کی ندامت باقی
کیا روح فروز ہے مئے حسن عمل　　تلخی فانی ہے اور لذّت باقی

عیش پسند طبقہ شراب و شباب و مطرب ہی کو زینت حیات خیال کرتا ہے لیکن صہبائی کی زینت حیات کیا ہے۔ وہ بھی ملاحظہ ہو ؎

بیتاب ہوں جام ارغوانی کے لئے　　مرتا ہوں شراب شادمانی کے لئے
کوئی نہیں گلگونہ بجز حُسن عمل　　تنزئین نگار زندگانی کے لئے

"گلگونہ" بقول علامہ شبلی خود ایک شعر ہے۔ اور "نگار زندگانی" کیا ہے یہ فیصلہ میں آپ پہ چھوڑتا ہوں۔ علم و عمل دو توام چیزیں ہیں صوفیا کا قول ہے کہ عمل بغیر علم کے گمراہی ہے اور علم بغیر عمل کے جہالت ہے۔ علمی انسان کسی کام کو ہاتھ میں لینے سے پیشتر اُسکے مختلف پہلوؤں پر غور کریگا۔ پھر کسی نتیجہ پر پہنچیگا۔ اس کے بعد اس کام کو عملی صورت دینے کی تجویز کریگا۔ پھر اس تجویز پر تنقیدی نظر ڈالی جائیگی۔ کسی سے مشورہ بھی شاید کیا ہی جائے۔ اور ماحصل یہ ہے کہ اکثر حالتوں میں تجاویز تجاویز ہی رہتی ہیں۔ عملی صورت اختیار نہیں کرسکتیں۔ عملی انسان ارادہ کرتا ہے

اُسے قوت سے فعل میں لاتا ہے یہ ضرور ہے کہ علم کے بغیر اُسے تکلیف اُٹھانی پڑے۔ غلط راستے پر پڑ جائے۔ جس کا لازمی نتیجہ پریشانی ہے لیکن یہ ممکن ہو کہ عامل غلطی سے صحت کی طرف آجائے لیکن بے عمل انسان کے لئے تو کوئی بھی ذریعۂ نجات نہیں۔ صہبائی نے علم و عمل کا موازنہ کیا ہے اور اُن کا کیا خیال ہے ذیل کی رُباعی سے پتہ چلیگا ؎

لاریب ہی ایک چراغ یہ علم و شعور　　ہے دستِ عمل میں رشکِ صد شعلۂ طور
محرومِ عمل کا علم و دانش لیکن　　گویا سرِ گور ہے اِک مشعلِ نور

یہاں سے عمل کی شاخیں نکلتی ہیں جس کی ایک شاخ "بلندیٔ عزائم" بھی ہے۔ اور یہ عمل کا بہترین و بلند ترین درجہ ہے۔ صہبائی نے اس سلسلہ کی روانی کے لئے اس موضوع پر بہت سی رُباعیاں کہی ہیں۔ جن میں سے چند پیش کی جائیں گی لیکن اس سے پیشتر کچھ "بلندیٔ عزائم" کے متعلق ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بلندیٔ عزائم

انسانی زندگی کی اگر کوئی قیمت ہے تو اُس کا ذریعہ محض عمل ہی ہے۔ لیکن یہ دُنیائے عمل مصائب و آلام سے پُر ہے۔ شکست اِسکی تمہید ہے مشکلات کا وہ حشر بدامن سمندر متلاطم ہے جسے عبور کرنا اہلِ ہمت ہی کا کام ہے۔ یہاں آبلہ پائی اولیں منزل ہے۔ پاؤں میں لغزش ہوتی ہے۔ بدن لرزتا ہے۔ روح کانپ اُٹھتی ہے اور انسان بیم و رجا میں اس بُری طرح پھنس جاتا ہے کہ چھٹکارا دشوار ہے۔ انسان فطرتاً آرام و سکون کا متلاشی ہے۔ اسے ذرا سی تکلیف بھی ناقابلِ برداشت نظر آتی ہے اور جب مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو وہ ہچکچاتا ہے کام سے دستکش ہو جانا چاہتا ہے۔ لیکن اِس کا علاج کیا ہے؟ بس یہی مستقل مزاجی۔ بلند ہمتی۔ سر پر تلوار ہے تو اُف نہ نکلے لیکن یہ صورت مشکل ہے بلکہ آجکل تو یہ کسی حد تک ناممکن صورت اختیار کر رہی ہے۔ ہندوستان کا طالبعلم ناکام رہنے پر اپنے آپکو گولی کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتا۔ اکھاڑی تلے سر کٹوا دیتا ہے۔ لیکن یہ بزدلی ہے۔ زندگی کا راز یہی ہے کہ انسان مستقل مزاج ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ ارادہ ہوتا ہے۔ عملی صورت میں آتا ہے۔ لیکن ناکامی ہوتی ہے۔ انسان کی کمرِ ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ ذرا استقلال سے کام لیتا ہے اور پھر ایک پُر زور کوشش کی جاتی ہے اور اب "دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا"! پر کمند ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ چوٹیں آتی ہیں۔ خون بہتا ہے۔ درد کی ٹیسیں اُٹھتی ہیں لیکن حصولِ مقصد کیلئے پھر ایک فیصلہ کُن انداز میں اور پوری قوت سے حملہ ہوتا ہے اور...... فتح کی دیوی قدم چوم لیتی ہے۔ اس وقت اِس انسان کے دل کی کیا کیفیت ہوگی یہ اُسی کو معلوم ہے جسے ذاتی تجربہ ہو قیاسات اس کی صحیح تصویر پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن یہاں سے ایک اور دور شروع ہوتا ہے۔ وہی "فتح" انسان کو ایک معمولی تحصیل نظر آتی ہے۔ کیوں؟ اُسے حاصل ہو گئی ہے۔ اور استدلال یہ ہوتا ہے کہ جو چیز حاصل ہو سکتی ہے وہ آسان ہے اور مشکل ہی وہ ہے جو ناممکن الحصول ہو اور پھر وہ اپنے خیال کے مطابق کسی مشکل تر چیز کی تلاش میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کولمبس برسوں کی محنت شاقہ کے بعد ساحلِ امریکہ پر لنگر انداز ہوتا ہے تو وہ بارگاہ ایزدی میں سربسجود نظر آتا ہے۔ لیکن ایک لمحہ کے بعد اُس کی تمام مسرت کافور ہو جاتی ہے۔ لیکن کیوں؟ تحصیل کے بعد وہی مُہم اُسے آسان نظر آتی ہے اور وہ اُسے نامکمل خیال کرتا ہے اور یہ "اور بھی ہو بالا دست" کا سلسلہ ایک غیر متناہی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اسے کہتے ہیں اصطلاح تفلسف میں "بلندیٔ عزائم"۔ بعض انسان ارادہ کرتے ہیں اُسے عملی جامہ پہنانے کی زحمت بھی گوارا کرتے ہیں اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں فتح یا

شکست۔ فتح ہو تو عام حالتوں میں یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ نہیں جانتے کہ دنیا میں مدارج ترقی کا شمار نہیں ہو سکا۔ ہر مقام سے کوئی نہ کوئی ارفع مقام ضرور ہے۔ لیکن اُس کا ذہن اس طرف متوجہ ہونے کی زحمت گوارا کرتا۔ اگر شکست ہو تو بسورتی صورت بنا گوشہ گیر ہو جاتے ہیں، یہ ہے کم ہمتی کی دلیل۔ ایسے آدمی سے صہبائی کیونکر مخاطب ہوتے ہیں۔ واہ۔ واہ ؎

ناکامیٔ زندگی سے ڈرنا کیسا　　ہنگامِ شکست آہ بھرنا کیسا
زندہ ہے اگر تو ننگِ ہستی کیوں ہے　　یہ موت سے پیشتر ہی مرنا کیسا!!

کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔ فی الحقیقت خوفِ شکست موت کے مرادف ہے "پیش از مرگ واویلا" بھی خوب کہا ہے۔ اور ایسے شخص کو ننگِ ہستی کہنا ہی زیبا ہے صہبائی اِن ناکامیوں کو کامرانیوں میں کیسے تبدیل کرتے ہیں اور اُس میں رنگِ درس کیسے جھلکتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

صحرا و چمن سے میں گزرتا ہی گیا　　طے جادۂ زندگی کو کرتا ہی گیا
مٹتا رہا نقشِ آرزو بن بن کر　　مٹ مٹ کے پر اور بھی اُبھرتا ہی گیا

"نقشِ آرزو" نہایت خوب ہے اور اُس کا "مٹ مٹ کے اُبھرنا" خوب تر ہے۔ اہلِ فن سمجھتے ہیں کہ اُبھرنا میں ازدیاد کی کشش کس قدر ہے۔ انسان کو دیکھتے ہیں کہ حصولِ علویت میں سرگرم کار ہے۔ لیکن ذرا سی تکلیف سے تلملا اُٹھتا ہے۔ فلک کی کجروی کی شکایت کرتا ہے۔ تقدیر کو کوستا ہے۔ یہ بات اہلِ دل کے لئے ذہنی اذیت کا موجب ہوا کرتی ہے۔ صہبائی جوش میں آکر پکار اُٹھتے ہیں ؎

یا سوئے فلک جرأتِ پرواز نہ کر!　　یا شکوۂ جورِ چرخِ کجباز نہ کر!
یا دعویٔ عاشقی کو باطل ٹھیرا!　　یا بارشِ سنگ پر بھی آواز نہ کر!!

دونوں صورتیں پیش کر دی ہیں۔ "عاشقی" اور "بارشِ سنگ" لازم ملزوم ہیں۔ کوئی سی پسند کرے یہی موضوع ہے۔ مگر جدت پسندی دم نہیں لینے دیتی! انسانی عظمت و وقار کا محافظ کون ہے اور انسان کا مسلکِ حیات کیا ہونا چاہیئے ملاحظہ ہو ؎

رو رو کے عبث شکوۂ بیداد نہ کر　　اے ننگِ جہاں روح کو برباد نہ کر
ہمت سے ہے رزمگاہِ ہستی میں وقار　　کھا زخم پہ زخم اور فریاد نہ کر

"رزمگاہِ ہستی" ایک مکمل شعر ہے۔ یہاں تمغہ دلانے والا ہتھیار "کھا زخم پہ زخم اور فریاد نہ کر" ہے۔ تن آسان اور سہل کوش کو دیکھتے ہیں کہ چلائے جاتا ہے معمولی سی رُکاوٹ اُسے بیچین کر دیتی ہے تو مجسّم ناصح بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ (یاد رہے "ناصح" سے مُراد وہ ناصح نہیں جو شعرا کی مشقِ ستم بنے ہوئے ہیں) ؎

غافل اسے رسوا سرِ بازار نہ کر　　دوشیزۂ روح کو گنہگار نہ کر
مقصود ہے امتحانِ ہمت تیرا　　بے یاری و بیکسی کا اظہار نہ کر

"دوشیزۂ روح" ایک اچھوتی ترکیب ہے۔ "دوشیزہ" کا لفظ ہی بجائے خود ایک شعر بلکہ محرکِ شعر ہے۔ شاعر تو رہے بجائے خود۔ یہ لفظ ہر نوجوان۔ بوڑھے ادھیڑ عمر کے لئے سامع نواز ہے۔ کسی دوشیزہ کی سرِ بازار رسوائی بلا لحاظِ مذہب و ملت غیرت سوز واقع ہوئی ہے۔ یہ تو عام دوشیزہ کی حالت ہے اور پھر دوشیزۂ روح کی آلودگی تو خود خدا کی آلودگی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ کس قدر موثر ہے۔ ہنگامِ مصائب فی الواقع امتحان کا وقت ہے جو پورا اُترا بازی لے گیا۔ اگر ناکام رہا تو قعرِ مذلت میں جا پڑا۔ سب ہی کچھ بیان کیا ہے لیکن

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ سوچ میں پڑ گئے ہیں کہ شاید عوام نہ سمجھ سکتے ہوں۔ اِس لئے ایک نمونہ پیش کرنے کی سعی فرماتے ہیں اور قرعۂ انتخاب اپنے آپ پر پڑتا ہے۔ کیونکہ ذاتی مثال اکثر زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ کس قدر خوب ہے ؎

دشوار ترین ہے سب سے مشکل میری مشکل سے مُراد ہوگی حاصل میری
دشواریٔ راہ بقدر ہمت ہے اثر خوش ہوں کہ بہت کٹھن ہے منزل میری

غالب مرحوم تو یہ کہہ کر کہ "مرد بکعبه اگر راه ایمنی دارد" عوام کو منع کر گئے۔ اور علامہ اقبال "بعزم کعبہ نہ رفتم کہ راہ بے خطراست" کا بہانہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نہیں گئے۔ لیکن صہبائی ایک پُر از مصائب راستہ تلاش کر لیتے ہیں تو شادیانے بجاتے ہیں۔

ایذا کشی اور جستجوئے پیہم ہی وہ طریق ہے جو انسان کو زندگی کے اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچا سکتا ہے اور اس میں وہ لطف حاصل ہوتا ہے جو تحصیل میں نہیں۔ صہبائی اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

جو لطف ہے جستجو میں حاصل میں نہیں لذت جو تگ و دو میں ہے منزل میں نہیں
وہ منظرِ زندگی جو امواج میں ہے کشتی میں نہیں سکوتِ ساحل میں نہیں

"منظرِ زندگی" خوب ہے اور "وہ" اِشارہ بعید نے جو کرامت یہاں دکھائی وہ بھی پوشیدہ نہیں۔ دُور کی چیز اچھی ہو یا بُری۔ اچھی ہی معلوم ہوتی ہے۔ اِنسان کی فطری خواہش ہے کہ وہ ہر اچھی چیز حاصل کرے۔ خواہ راستے کانٹوں سے بھرے پڑے ہوں۔ آبلہ پائی کیوں نہ ہو۔ اور حساس طبیعت کو گدگدانے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ دُنیا مشکلات سے پُر ہے۔ لیکن کم حوصلہ لوگ ذراسی تکلیف سے گھبرا اُٹھتے ہیں۔ اور اگر کوئی استقلال سے کام بھی لیتا ہے تو ایک سخت تر ضرب اُسے بھی توڑ دیتی ہے۔ اور اِنسان کشمکش ہونا ہی اچھا سمجھتا ہے۔ لیکن جو اسے سمجھتے ہیں وہ کبھی فریاد ہی نہیں کرتے۔ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اُنہیں غم محسوس ہی نہیں ہوتا ؎

صہبائے نشاطِ روح معدوم نہیں آگاہ حیات ہیں جو مغموم نہیں
انجام کی فکر کیوں ہے ناداں تجھکو معلوم نہیں کسی کو معلوم نہیں

"معلوم نہیں" کی تکرار رُباعی میں ایک برق پیدا کر گئی ہے جو دُنیائے "چہ ندوچوں" کو جلائے ڈالتی ہے۔ اور اِنسان سعیٔ پیہم میں مصروف ہو جانے کی خواہش محسوس کرتا ہے۔ نہ معلوم صہبائی کا مشکل پسند ذوق کیا ہے جو طبیعت ان حقائق آفرینیوں سے اُکتاتی نہیں۔ وہ نہایت بلند آہنگی سے اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرتے ہیں ؎

ہنگامۂ رزم زندگانی ہے مجھے پیکارِ حیات شادمانی ہے مجھے
وہ ذوق سپر ہے کہ ہر ایک شکست دیباچۂ فتح و کامرانی ہے مجھے

حیاتِ اِنسانی فی الحقیقت ایک "ہنگامۂ رزم" ہے اور اسے وجۂ شادمانی سمجھنا اہلِ ہمت ہی کا کام ہے "دیباچہ" بھی خوب ہے۔ موضوع زیرِ بحث کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیائے عمل مصائب و آلام سے پُر ہے۔ لیکن صرف بلندیٔ عزائم ہی ایک جوہر ہے جو حیاتِ اِنسانی کے لئے باعثِ زینت ہو سکتا ہے۔ لیکن نتیجے سے کوئی بھی واقف نہیں۔ گاہے مخالف گاہے موافق۔ کم ہمت دل چھوڑ بیٹھتا ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ صہبائی نے یہ بھی تجویز کر دیا۔

تسلیم و رضا

مقاماتِ تصوف میں "تسلیم و رضا" بلند ترین مقام ہے۔ کیونکہ تسلیم و رضا کے ساتھ ہی "فنا" کی حد شروع ہو جاتی ہے بلکہ یوں کہئے کہ "فنا" "تسلیم و رضا" ہی کا دوسرا نام ہے۔ صوفی پر جب یہ حالت طاری ہو جاتی ہے۔ تو اُسے دوست و دشمن کی تمیز نہیں رہتی۔ شادی و غم مساوی نظر آتے ہیں۔ حیات و ممات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ حوادث کی آندھیاں چلیں۔ مصائب کے بادل برسیں۔ تکالیف کی بجلیاں گریں اُسے پرواہ نہیں۔ اُس کے لب کبھی فریاد آشنا نہیں ہوتے۔ وہ اس میں ایک لطف محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ سمجھتا ہے کہ یہ شاہدِ حقیقی کی ادائیں ہیں۔ ع "ہرچہ از دوست مے رسد نیکوست"۔ اسے کیا غرض کہ اِن لطف اندوزیوں سے اپنے آپکو محروم کر دے اور اگر کبھی کسی "فریاد نا تکلم" کا اظہار نہ ہوا بھی تو اس لئے نہیں کہ تکلیف سے نجات حاصل ہو۔ بلکہ ؎

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغِ اسیر　　خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

تاریخی واقعہ ہے کہ چنگیز خانی غارتگری کیوقت مرد و زن۔ پیر و جواں۔ خاص و عام موت کے گھاٹ اُتارے جا رہے تھے۔ خواجہ فریدالدین عطار نیشاپور میں مقیم تھے۔ آپ ایک سپاہی کے ہاتھ پڑ گئے۔ وہ آپکو پکڑ کر مقتل میں لے آیا اور پاؤں کے بل بٹھا دیا۔ خواجہ ممدوح پر اُس وقت جذبہ توحید مستولی تھا۔ اُس سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ "بایں کہ کلاہ نمدی بر سر نہی و تیغ ہندی بہ کمر بندی واز ترکستان بہ ایران آمدی۔ دانی کہ ترا نمی شناسم"۔ مقتل ہو۔ تلوار سر پر چمک رہی ہو۔ جان کے لالے پڑے ہوں اور قاتل میں شاہدِ حقیقی نظر آئے۔ اگر یہ واقعہ تاریخی نہ ہوتا تو عوام اِسے تسلیم کرنے میں ہچکچاتے لیکن اب اِس سے کوئی اِنکار کی جسارت نہیں کر سکتا۔ اِسے کہتے ہیں "فنا" جو تسلیم و رضا کا دوسرا نام ہے۔ طبّی طور پر اہلِ عالم مختلف الامزجہ ہیں۔ ضروری ہے کہ احساس میں اختلاف ہو۔ قوتِ برداشت بھی متفاوت ہو۔ فلسفی اور صوفی اِس مسئلہ پر متفق نظر آتے ہیں۔ صہبائیؔ فلسفی ہیں بلکہ فلسفہ سے اُنہیں عشق ہے۔ اِس مسئلہ کی ایک مکمل تصویر جو صہبائیؔ کی ذیل کی رباعی میں ہمیں ملتی ہے اُردو رباعی میں شاید ہی ملے۔ کس شاعرانہ شان اِستغنا سے فرماتے ہیں ؎

ہر ایک بقدرِ ظرف مینوش ہوا　　بہکا کوئی تو کوئی مدہوش ہوا
کم ظرف ہی وقفِ شکوہ ہائے بیجا　　اور دُردکشِ ازل ہی خاموش ہوا

"دُردکشِ ازل" ترکیب نہایت خوب ہے۔ باوجودیکہ ایک پامال ترکیب ہے لیکن حسبِ موقع استعمال نے ایک حُسن پیدا کر دیا ہے۔ اسی عالمِ رنگ و بو میں ہر متنفس کی تگ و دو محض تحصیلِ مسرت تک محدود ہے لیکن رنج و تکلیف کا ایک ثانیہ بھی اسے حشر بداماں دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت کیا محسوس ہوتا ہے ؎

صہبائے نشاط کا بھی پینا ہوگا　　زہرِ غمِ زندگی بھی پینا ہوگا
غم سے بھی نشاطِ روح حاصل ہو جسے　　جینا تو اُسی کا جینا ہوگا

بیت اوّل حیاتِ انسانی کی ایک غیر مبتسم تصویر پیش کر رہا ہے۔ "جینا" کی سادگی اور تکرار نہایت موزوں اور پُرزور ہے۔ صہبائیؔ کا منتہائے مقصود کیا ہے۔ آپ پرستش کس کی کرتے ہیں۔ حسد سے تنفّر اور حصولِ غنائم سے بے نیازی کی کیفیت ملاحظہ ہو ؎

سرشارِ طرب نہیں ہے مسعود میرا تختِ جم دکے نہیں ہے مقصود میرا
وہ دل کہ گذار دے خوشی سے غم کو معبود میرا وہی ہے معبود میرا

رضا بہ قضا کی انتہا ملاحظہ ہو۔ کیا خوب کہا ہے ؎

گو بحرِ حوادث کا تلاطم نہ گیا بر ربط سے میرے لطفِ ترنم نہ گیا
وہ زندہ دل دہر ہوں اے صہبائی مر کر بھی میرے لب سے تبسم نہ گیا

مصرع چہارم میں رضا کی جو مثال پیش کی گئی ہے۔ اس سے بہتر شاید ہی ہو سکے۔ صوفی جب اس مقام پر پہنچتا ہے اُسے ہر کانٹے سے پھول کی خوشبو حاصل ہوتی ہے۔ زہر میں تریاق ملا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ وہ زہر کو زہر ہی نہیں سمجھتا بلکہ یہ اس کے لئے بمنزلۂ آبِ حیوان" ہے۔ صہبائی اس عالم میں کیا محسوس کرتے ہیں۔ وہ بھی سُنیئے ؎

ہر رنج میں ہے خوشی کا ساماں پنہاں ہر درد میں ہے درد کا درماں پنہاں
سہتے ہیں رنج و غم بظاہر لیکن ملتی رہی ہمکو دادِ پنہاں پنہاں

لفظِ "پنہاں پنہاں" میں جو کشش ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یہ تو تھا تسلیم و رضا۔ یہ حاصل کیسے ہو۔ کیا ہر شخص ایسی استعداد رکھتا ہے۔ اس زنجیر کی کڑیاں ملانے کے لئے ایک اور مضمون ہے جو پیشِ نظر ہے۔

خود دریابی

علامہ سر اقبال سے صہبائی کو جو ایک اور وجہِ مماثلت حاصل ہے اور جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں وہ یہی ندریس "خود دریابی" ہے۔ اس سے مُراد یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت سے آگاہ ہو۔ علامہ موصوف کا یہ خاص مضمون ہے "پیامِ مشرق" کا ایک شعر ہے ؎

تو قدرِ خویش ندانی بہاز تو گیرد وگرنہ لعلِ درخشندہ پارہ سنگ است

صوفیا کا خیال ہے کہ انسان کچھ نہیں۔ بلکہ عالم کائنات ہی کچھ نہیں جو کچھ بھی ہے وہ خدا ہی ہے اور یہ اُنکے تاثراتِ قلبی کی کیفیات ہیں لیکن یہ تاثرات کہاں سے پیدا ہوئے خود دریابی ہی سے۔ انا الحق کہلوانے کی ذمہ دار بھی یہی خود دریابی ہے انسان ذرا غور سے دیکھے تو معلوم ہو جائیگا کہ وہ صانعِ حقیقی کی غیر متناہی صنعت کاریوں کا مجموعہ ہے۔ اشرف المخلوقات ہونے کا لقب اسے حاصل ہے۔ قدرتِ عالیہ کے انوار و تجلیات کی جلوہ گاہ یہی ہے تخلیقِ آدم کے وقت فرشتوں کا حکمِ ربانی سے اسی مُشتِ خاک کے سامنے سربسجود ہونا بھی اِسبات پر دال ہے کہ اِسے اُن نوری ہستیوں پر بھی فوقیت ہے جنہیں ہر وقت بارگاہ ایزدی کا قرب حاصل ہے۔ حضرت علی رضؓ کا قول ہے کہ انسان عجیب معجونِ مرکب ہے جو اگر ایک طرف مائل ہو تو فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے اور اگر دوسری طرف مائل ہو تو حیوانوں سے بھی گر جاتا ہے۔ یہ قول اس واقعیت پر دال ہے کہ ہر انسان میں فطری طور پر ہر قسم کی قابلیتیں اور طاقتیں ودیعت کی جا چکی ہیں اور یہ اگر اُنہیں بروئے کار لائے تو دینی یا دنیوی کسی گتھی کا سُلجھانا زیادہ مشکل نہیں۔ کسی مشکل کا حل اس کی ادنیٰ کرشمہ سازی ہے۔ دُنیا میں اگر کسی چیز کی کوئی قدر و قیمت ہے تو صرف انسان کی وجہ سے ہی ہر موجود کا

قیام صرف اسی کے وجود سے ہے۔ تخلیق عالم کا سبب یہی ہوا تھا۔ خلیفۃ اللہ کا درجہ حاصل ہے۔ پھر جو وجود ان کیفیات کا حامل ہو وہ اگر ریا کاری کے جذبہ کے تحت کسی اور کے در پر جبہ فرسائی میں مشغول نظر آئے۔ یا حصولِ مقصد کیلئے دوسرے کی امداد کا طالب ہو۔ اپنی حقیقت سے دُور جا پڑے۔ تو صاحبِ دل کے جذبات مجروح ہو جاتے ہیں۔ صہبائی بھی اسی عالم میں آ گئے اور حقیقت آشنا دل میں ایک اضطراب پیدا ہوا۔ دل سے ایک درد آمیز نغمہ نکلتا ہے جس کی ابتدا یہ ہے ؎

تو اپنے ہی جوہر سے شناسا نہ ہوا ہر گام پہ منت کش بیگانہ ہوا
پوشیدہ ہیں تجھ میں بھی ہزاروں جلوے افسوس کہ تو گرم تماشا نہ ہوا

اغیار کی منت کشی میں ضروری ہے کہ تذلیل ہو، تحقیر ہو، ناکامی بھی ہو۔ اس صورت میں انسان کے دل میں شکایات پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ دوست و دشمن کی تمیز میں غلطاں و پیچاں ہونے لگتا ہے۔ صہبائی اس مقام پر اُسے کیا خطاب کرتے ہیں اور "خود دریابی" کی تلقین کیسے کیجاتی ہے ؎

آزادِ طلسم رنگ و بو ہی نہ ہوا نیرنگِ جہاں کا راز جو ہی نہ ہوا
دُنیا سے عبث رہی شکایت تجھکو افسوس کہ اپنا دوست تو ہی نہ ہوا

"عبث" نے جو قطعیت کا اثر پیدا کیا اس کا تقاضہ یہ ہے کہ "اپنا دوست تو ہی نہ ہوا" کی بابت دیگر کا راستہ لیا جائے۔ پھر یہی مضمون ہے لیکن ذرا سا تغیر ہے اور توضیح کی گئی ہے ؎

گل تیرا نہ باغباں نہ گلشن تیرا تیرا ہی دل زار ہے دامن تیرا
اغیار سے کیوں ہے تجھکو امید دہرس تیرا کوئی دوست ہے نہ دشمن تیرا

انسان خود غرض ہے۔ بارگاہِ حقیقی میں سجدہ ریزی بھی ریا کارانہ طریق پر ہوتی ہے۔ صہبائی اس عالم میں اُسے خوابِ غفلت سے کیونکر بیدار کرتے ہیں اور کیا نکتہ بتاتے ہیں۔ نہایت خوب ہے ؎

اے بیخبر خودی ہے کیوں سر بسجود تیرے ہی خیالات ہیں تیرے معبود
تیری ہی تگ و دو سے ہے ہنگامۂ دہر ہے تو ہی حقیقت اور تو ہی مقصود

حقیقتاً انسان ہو تو دُنیا کچھ نہیں "ہے تو ہی حقیقت اور تو ہی مقصود" میرے خیال میں یہ ایک طویل بحث ہے جس پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے تو ہی کی تکرار نہایت اچھی ہے۔ کارزارِ حیات تکالیف و مصائب سے پُر ہے، انسان ان سے بچاؤ کی خاطر اغیار سے مدد کا طلبگار رہتا ہے لیکن "یہ منت کش بیگانگاں" یا یوں کہیئے کہ "حقیقت نا آشنا" کا حشر کیا ہوتا ہے ؎

یہ جادۂ زندگی ہے پُر پیچ و دراز جسمیں ہیں ہزار ہا نشیب اور فراز
بے دم ہے رہی جسکو تلاشِ ہمدم منزل پہ ہے تھا جو آپ اپنا دمساز

مصرع چہارم ایک بہترین حقیقت ہے۔ انسان خود ایک رمزِ فطرت ہے، یہ کیوں عالمِ اسباب کی تحقیق کرتا پھرے۔ کیوں نہ اپنے آپ کو ہی پہچانے جبکہ ان تمام موجودات کی وجہ وجود یہی ہوا تھا اور ہے ؎

جویائے امور رمزِ فطرت تو ہے آگاہ حقیقت ہو حقیقت تو ہے

اسبابِ و علل میں کیوں ہو غلطاں پیچاں
اِس عالمِ اسباب کی غایت تُو ہے

"حقیقت" کی تکرار نہایت خوب اور معنی خیز ہے۔ "غایت" بھی نہایت موزوں اور پُرمعنی واقع ہوا ہے۔ انسان مکمل ہے اُسے کسی چیز کی ضرورت نہیں جو شاہراہ ترقی پر قدم زن ہونے کے وقت اس کی ممد ثابت ہو۔ اس لئے انسان کو ہر وقت اپنی حقیقت ہی کا مُتلاشی رہنا چاہیئے۔ کس خوبی سے یہ مضمون ادا ہوا ہے

اے حاملِ دہر تجھکو حاصل کی تلاش !
اے بر لبِ ساحل تجھے ساحل کی تلاش !!
تو خضر بھی منزل بھی۔ رہِ منزل بھی
رہبر کی تلاش کر نہ منزل کی تلاش !!

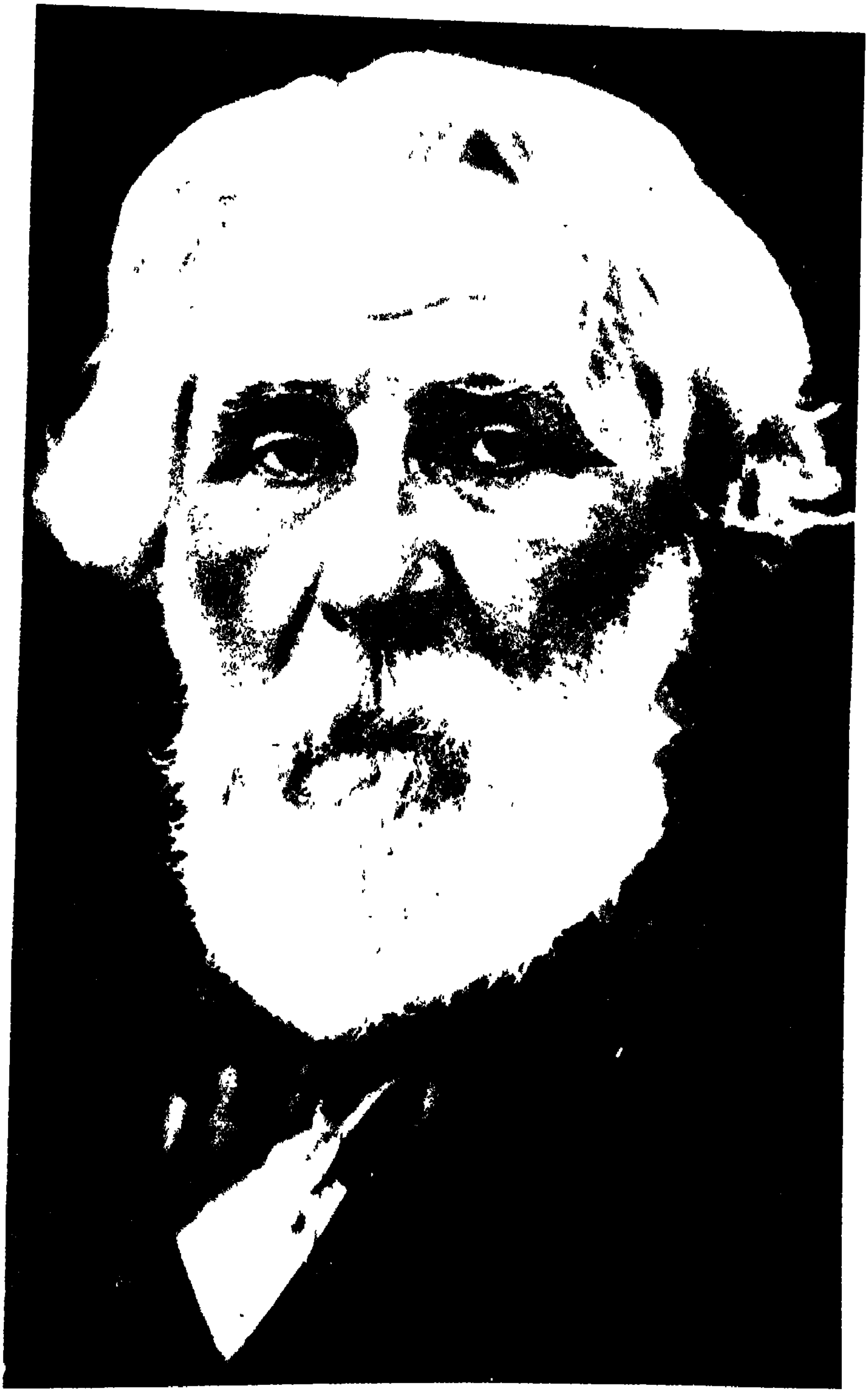
سطورِ بالا میں ہم نے صہبائی کے چند اہم مضامین پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ہر چند یہ مضمون ابھی تشنۂ تکمیل ہے اور جامِ صہبائی کی کئی دیگر ممتاز خصوصیات پر ہم قلم نہیں اٹھا سکے۔ تاہم یہ اُمید ہے کہ قارئین کرام اِن سطور سے ہی حضرت صہبائی کی رُباعی گوئی کا کسی حد تک اندازہ لگا سکیں گے۔ موصوف نے ہر مسئلہ کی توضیح و تشریح پیش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور مختلف نظریوں کے تحت ہر حقیقت کی پردہ کُشائی کی ہے۔ آپ کی رُباعیات میں تنوعِ مضامین کی کثرت ہے۔ فلسفہ و تصوف۔ مناظرِ فطرت۔ شراب ساقی وغیرہ سبھی کچھ ہے۔ مزید یہ ہے کہ فلسفہ اور تصوف جیسے خشک مضامین شعریت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب فلسفہ کی طرف آتے ہیں تو مثالیہ انداز سے بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور خود مجسم نمونہ بن کر سامنے آجاتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ کسی پیچیدہ چیز کو عام فہم بنانے کے لئے مثالیہ انداز نہایت کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ ہر مسئلہ پر متعدد رُباعیاں کہی ہیں۔ اور ہر رُباعی ایک علیحدہ خصوصیت کی حامل ہے۔ مجھے یہاں اعتراف کرنا پڑیگا کہ میں نے اکثر مضامین ترک کر دئے ہیں اور جو بیان ہوئے ہیں اُن میں بھی اختصار مدِ نظر رہا ہے۔ اور یہ فی الحقیقت زبردستی ہو مگر طوالت کا خوف بھی دامنگیر رہا ہے۔ ہاں تو صہبائی کے مختلف مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ خیال ابتدا میں کچھ ہوتا ہے۔ پھر تنقید و تبصرہ کی باری آتی ہے۔ یہاں سے ترقی کا زینہ شروع ہوتا ہے اور اس طرح ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے بلند و بالا سے بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ ایک ہی مضمون بار بار کہتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے اُکتاتے نہیں۔ نئی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اور اِس کے باوجود زورِ طبیعت کم نہیں ہوتا بلکہ پختگی آتی جاتی ہے۔ تصوف کو چھیڑتے ہیں تو بالکل صوفی معلوم ہوتے ہیں کہیں کہیں فلسفہ کا رنگ بھی جھلکتا نظر آتا ہے لیکن پایان کار منزل تصوف پر ہی ختم ہوتی ہے۔ عقل و عشق کے موضوع پر بہت سی رُباعیات ہیں اور مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ صہبائی کے اِس معرکۃ الارا موضوع کو شامل مضمون نہیں کر سکا۔ مختصر یہ ہے کہ وہاں بھی قنوطیت ہی جلوہ پیرا ہے۔ شعر کی تعریف ہر شخص نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے لیکن جامع و مانع کوئی بھی نہیں کر سکا۔ شعر کی ایک اہم صفت یہ ہے کہ وہ شاعر کے جذبات کا ترجمان ہو۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ کہنے والا اپنی ذہنی ایمانداری کو مجروح نہیں کر رہا۔ اگر شعر میں یہ خصوصیت نہیں تو میرا خیال ہے کہ وہ شعر نہیں۔ علامہ شبلی نعمانی شعر العجم میں شعر پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "ہر وہ چیز جو دل پر ایک تعجب انگیز کیفیت پیدا کرے وہ شعر ہے۔ خواہ وہ ایک لفظ ہو یا ترکیب۔ مصرع ہو یا ایک مکمل نظم۔ کائنات کا ایک ذرہ ہو یا اِس عالمِ رنگ و بو کا ایک غیر معمولی واقعہ اور یہ تعجب انگیزی تبھی پیدا ہوتی ہے جب لطیف احساسات کو ایک ٹھیس پہنچے اور عمیق قلب کے تاثرات دماغ میں جمع ہو کر۔ الفاظ و تراکیب کی بندشوں۔ طرزِ ادا کی جدتوں۔ تشبیہ و استعارہ کی رنگینیوں بحور و اوزان کی قیود کی خلعت زیب کر کے ظاہر ہوں اور سامع کو تھوڑی دیر کیلئے خود فراموشی کی حالت تک پہنچا دیں۔" صہبائی کے ہاں یہ چیز بدرجۂ اتم پائی

جائیگی۔ ایک اور بات یہ ہے کہ زبان مضمون کے مطابق ہو۔ یہ نہ ہو کہ موضوع تو محاسن نگاری ہو اور اصطلاحات فلسفیانہ استعمال ہوئی ہوں۔ صہبائی کی رُباعیات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اُسی موضوع کے عین مطابق۔ الفاظ و تراکیب۔ تشبیہات و اصطلاحات استعمال کی ہیں اور معنوی محاسن جسے عرف اشاعرہ میں تخیل کہا جاتا ہے اس کے تو دریا بہائے گئے ہیں۔ اغلاق سے انہیں نفرت ہے اور سادگی کی یہ حد ہے کہ ہر رُباعی فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ عوام اُسے سطحی نظر سے دیکھتے ہیں اور خواص اس کی تہ تک پہنچتے ہیں۔ اور بقول علامہ شبلی یہ بھی شعر کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ زبان نہایت شستہ اور سادہ استعمال کرتے ہیں۔ مشکل الفاظ اور غیر مانوس تراکیب سے پرہیز کرتے ہیں۔ تصوّف و فلسفہ کی بعض اصطلاحیں نہایت پُرپیچ واقع ہوئی ہیں۔ اور ان کے سمجھنے کے لئے کچھ غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن یہ صہبائی کے اندر بیان کی خوبی ہے کہ وہ ان کو بھی عام فہم بنا گئے۔ شعر کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے۔ کہ الفاظ و تراکیب کی بندش کے وقت اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ الفاظ قواعد زبان کے لحاظ سے اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پائیں اور اگر ہٹیں بھی تو بہت دُور نہ جا پڑیں یعنی جسطرح نثر میں فاعل۔ مفعول اور فعل کے تقدّم۔ توسّط اور تاخر کا لحاظ رکھا جاتا ہے اسی طرح نظم میں بھی رکھا جاتا ہے۔ یہ کوئی قید نہیں یا اصول نہیں۔ البتہ اگر ایسی چیز پیدا ہو جائے یا کی جائے تو ایک اور حُسن پیدا کر دیتی ہے۔ صہبائی کے ہاں اکثر رباعیات ایسی ملیں گی جن کی اگر نثر بنانا مقصود ہو تو بالکل وہی مصرع نثر کی حالت میں آجاتا ہے اور کوئی لفظ ادھر ادھر کرنا نہیں پڑتا اور اگر کرنا پڑے بھی تو زیادہ دُور نہیں جانا پڑتا۔ شعر کی اہم ترین خوبی یہ ہے کہ وہ تصنع و آورد سے مُنزّا و مبّرا ہو۔ صہبائی کی تمامتر شاعری اس قبح سے اسی قدر پاک صاف ہے جیسے پھول تعفّن سے۔ اور رُباعی جو ان کی شاعری کی روح رواں ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ طبیعت پر زور دیکر نہیں کہی گئی بلکہ اُسی طرح جیسے دریا کی روانی سے ہلکا سا ترنّم اُٹھتا سُنائی دیتا ہے جو بعد میں نزدیک و دُور کی فضا کو مُترنّم بنا دیتا ہے۔ یہ حالت اُسی وقت ہوتی ہے جب دماغ کسی خارجی واقعہ یا موجود سے متاثر ہو اور تخیّلات کی رَو کا طوفان اُمنڈ آئے۔ صہبائی کے خاص مضامین۔ سعیٔ پیہم۔ خودداری۔ عشق و عقل ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جنہیں میں اقبالیت سے منسوب کر چکا ہوں۔ اسرارِ کائنات۔ اور وہ خود معترف ہیں کہ وہ اس رنگ میں علامہ اقبال سے بہت حد تک متاثر ہیں۔ حضرت خیّام کے رنگ میں فلسفۂ مسترت۔ مناظرِ فطرت۔ ساقی و مینا کے مضامین اس انداز سے پیش کئے ہیں کہ خیّام کی روح شاعری کو اُردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ لیکن بخوف طوالت ہم یہ مضامین کسی آئندہ فرصت پر اُٹھا رکھتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ بقول علامہ کیفی دہلوی "جامِ صہبائی حقیقت میں مناظرِ فطرت کی زرنگاریوں حُسن و عشق کی نغمہ سرائیوں۔ بادۂ عرفان کی سرمستیوں اور فلسفہ و حکمت کی حقائق آرائیوں کا روح افروز مجموعہ ہے"

ایم عبدالرشید منشی فاضل

خانم:- مصورِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی کا شہ پارہ جسکا کئی سال سے انتظار تھا چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں بیس نہایت عمدہ مضمون ہیں۔ جن میں جٹھانی دیورانی اور سادہ لوح شوہر اور اسکی تنک مزاج بیوی کے عجیب عجیب ہنسانیوالے واقعات درج ہیں۔ چند باب مُلک کے مقتدر رسائل میں شائع ہو کر مشہور ہو چکے ہیں۔ کتابت وطباعت نہایت اعلیٰ درجہ کی۔ کاغذ عُمدہ چکنا۔ بانگِ درا سائز کے چار سو صفحات نہایت مضبوط اور قیمتی جلد۔ قیمت چار روپے۔ علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:- ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔



تورگەنف

تورگنیف کی موت

اگر ۱۸۱۸ء کے ہندسوں کو اُلٹ پلٹ کیا جائے تو روسی رومان نویس اور مفکر تورگنیف کا سنِ پیدائش (۱۸۸۱ء) نکل آتا ہے۔ اس چیز میں شگون دیکھتے ہوئے تورگنیف کو یقین تھا کہ اُس کی موت یکم اکتوبر ۱۸۸۱ء کو وقوع پذیر ہوگی۔ مگر اُس کا یہ خیال صحیح نہ نکلا۔ وہ ۱۸۸۳ء میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔

مارچ ۱۸۸۲ء میں تورگنیف ایک مہلک مرض میں گرفتار ہوا۔ مشہور ڈاکٹر شارکوٹ کی تشخیص کے مطابق یہ حلق کی سوزش تھی۔ چنانچہ وہ ایک طویل عرصے تک بستر کے ساتھ جکڑا رہا۔ مہینوں گذر گئے مگر جیسا کہ تورگنیف خود کہتا ہے، وہ "کوئی غیر متحرک سی چیز" بنا لیٹا رہا۔

دودھ کی غذا اُسے مفید ثابت ہوئی، چنانچہ ستمبر کے آغاز تک اُس میں اتنی طاقت عود کر آئی کہ اُس نے Beyond the Death کو مکمل کر دیا۔ یہ افسانہ بعد ازاں (Clara Militch) کے عنوان سے شائع ہوا۔

ایک سال اسی طرح گذر گیا۔ جنوری ۱۸۸۳ء میں اس پر عملِ جراحی کیا گیا۔ جب آپریشن کے کچھ روز بعد وادو[۱] اُس سے ملنے کے لئے آیا تو روسی انشا پرداز نے اُسے بتایا کہ وہ آپریشن کے دوران میں میز پر لیٹا اپنے درد کا تجزیہ کر رہا تھا اور ایسے لفظ سوچ رہا تھا کہ جس سے اُس وقت کے احساسات بیان ہو سکیں جب اُسکے جسم میں نشتر داخل ہوا تھا۔ چنانچہ اُس نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"ایسا معلوم ہوا کہ گویا تو کیلے کو کاٹ رہا ہے"۔

آپریشن کے دو ہفتے بعد تورگنیف کی طبیعت قدرے بحال ہوگئی۔ یہ اس وقتی صحت کو محسوس کرتے ہوئے اُس نے کہا "میں یقین کیجئے کہ اس قدر تندرست محسوس کر رہا ہوں کہ میرا ناچنے کو جی چاہتا ہے" — مگر اچانک مرض خطرناک صورت اختیار کر گیا اور ایک معمّہ سا بن کر رہ گیا۔ دراصل اسکی ریڑھ میں ورم ہو گیا تھا۔

درد کو کم کرنے کے لئے اُسے افیون کا جوہر دیا جاتا تھا۔ اس نشہ آور دوا کے کثرتِ استعمال نے اُس کے دماغی اعصاب پر بہت اثر کیا۔ چنانچہ وہ اس قدر زور سے چیختا رہتا کہ اُسکی چیخیں بازار میں بخوبی سنائی دیتی تھیں۔ وہ مرنے کی خواہش کرتا تھا۔ اس غرض کے لئے اُس نے کئی مرتبہ زہر طلب کیا۔ اُسکے دماغی اضطراب اور خلل کو وہ طول طویل اور غیر مربوط تار ظاہر کرتے ہیں جو اُس نے اپنے مختلف دوستوں کو بھیجنے کی خاطر لکھوائے۔

ایک مرتبہ اس نے روسی سفیر سے جو اُس کے بستر کے پاس کھڑا تھا جھنجھلا کر کہا "تم مجھے بیڑیاں کیوں پہنا رہے ہو؟" اسی طرح اُس نے ایک رات گھنٹی کی زنجیر کھینچ کر گھر بھر کو جگا دیا اور جب مادام وائرو[۲] اُسکے پاس آئی تو تورگنیف نے رسّی سے بندھی ہوئی پیتل کی گیند اسکی طرف پھینک کر چلاتے ہوئے کہا "آہ! یہ ہے لیڈی میکبتھ!"

جب یہ طوفان کچھ کم ہوا تو ایفان تورگنیف نے اپنے دوست ایمن کوف سے کہا "میں سمندر کی تہہ میں غوطہ زن تھا۔ وہاں میں نے بہت بھیانک اور خوفناک مخلوق دیکھی ہے۔ یہ منظر آج تک کسی انسانی قلم نے بیان نہیں کیا ہے!"

۱؎ فرانس کے مشہور انشا پرداز۔ یہ تورگنیف کا دوست تھا۔ ۲؎ مشہور فرانسیسی مُغنّیہ۔ اس سے تورگنیف کو بہت محبت تھی۔

اُس کا خیال تھا کہ وہ صحت ہونے پر وہ تمام کیفیات صفحۂ قرطاس پر منتقل کریگا۔

چند ماہ تک تورگنیف کی طبیعت خوش رہی۔ اس دوران میں ایک روز اُس نے مادام وائردو کو اپنے پاس بلاکر نمناک آنکھوں سے کہا۔

"میں ایک افسانہ لکھنا چاہتا ہوں جو میرے دماغ میں محفوظ ہے، لیکن یہ مجھ سے خود نہ لکھا جائیگا"

مادام وائردو نے اُس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا: "تو آپ بولتے جایئے، میں لکھتی جاؤں گی۔ گو میں روسی زبان تیزی سے نہیں لکھ سکتی لیکن اگر آپ نے ذرا تحمل سے کام لیا تو آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا"

"نہیں، نہیں، اگر میں روسی زبان میں لکھواؤں گا تو مجھے ہر جملے اور ہر لفظ پر غور کرنے کے لئے ٹھہرنا پڑیگا! اور میں یہ چاہتا نہیں۔ میں یہ افسانہ اُن مختلف زبانوں میں بولتا جاؤنگا جو تجھے اور تمہیں آتی ہیں۔ اس طرح مجھے اپنے اظہار میں دقت محسوس نہ ہوگی!"

چنانچہ یہ افسانہ جو بعد میں [illegible] کے عنوان سے شائع ہوا لکھا گیا۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تورگنیف کی فن کاری ایک امرے پر گھوم کر پھر اپنے اصل مقام پر آگئی ہے۔

افسانہ لکھانے کے چند ماہ بعد اُس کی طبیعت یکایک پھر خراب ہوئی، وہ پھر سنبھلنے نہ پائی۔ مرض کی تکلیف سے تنگ آکر اُس نے کئی مرتبہ خودکشی کا ارادہ کیا۔ ماپساں اُس کی موت کے پانچ روز پیشتر اس سے ملاقات کرنے کے لئے آیا۔ تورگنیف نے اُس سے التجا کی کہ وہ دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے اُسے پستول لادے۔

اب جسمانی لحاظ سے تورگنیف کا مضبوط اور توانا جسم ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، اور بانہیں چھڑیوں کی طرح پتلی ہو گئی تھیں۔ اپنی یہ حالت دیکھ کر ایک روز اُس نے یہ کہا "ٹڈے ایسی ٹانگوں کے ساتھ انسان کیونکر زندہ رہ سکتا ہے؟"

اگست کے آخری دن، یعنی جمعہ کے روز لوٹی مریض کے کمرے میں آئی۔ تورگنیف نے اُسے پہچان لیا مگر باایں ہمہ اس کا دماغ دھند میں ملفوف تھا۔

"دیکھو لوٹی" تورگنیف نے اُس سے کہا: "دیکھو، کس قدر تعجب کی بات ہے کہ میری ٹانگ اس کونے میں معلق ہے! کمرہ تابوتوں سے بھرا ہے۔ لیکن اُنہوں نے مجھے تین دن اور جینے کی مہلت دیدی ہے"

اتفاق سے اُس کا کہنا درست نکلا۔

اتوار کے روز وہ بولنے لگا، مگر جس زبان میں وہ بولتا تھا وہ فرانسیسی تھی اور نہ روسی بلکہ روسی کسانوں کی خام زبان تھی جسے کوئی سمجھ نہ سکتا تھا۔ وہ میریانی[1] اور مادام شیموریت[2] سے مخاطب ہو کر کچھ کہتا تھا مگر وہ سمجھ نہ سکتی تھیں۔ مرنے سے کچھ عرصہ پہلے بغلگیر ہونے کے لئے اُس نے اُن کی طرف ہاتھ پھیلائے اور پریشان آنکھوں سے دیکھتے ہوئے یہ کہا۔

"آؤ، میرے نزدیک آجاؤ۔ مجھے محسوس کرنے دو کہ تم میرے نزدیک ہو۔ روسی زاروں کی طرح اب رخصت لینے کا وقت آگیا ہے!"

ایک لمحہ کے لئے ایسا معلوم ہوا کہ اُس نے مادام وائردو کو پہچان لیا ہے۔ چنانچہ فوراً اُس سے مخاطب ہوا "یہ ہے سب سے بڑی ملکہ، یہ کسقدر مہربان ہے!"

اب اُس کے لبوں پر دہقانوں کی سیدھی سادی گفتگو تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو قریب المرگ دہقان تصور کر رہا ہے۔ آہستہ

---

[1] مادام وائردو کی بڑی لڑکی۔ [2] مادام وائردو کی دوسری لڑکی۔ [3] کہا جاتا ہے کہ یہ تورگنیف کی اپنی لڑکی تھی۔

ہستہ آہستہ الفاظ بکھرتے گئے اور اُس کی گفتگو غیر مربوط ہو گئی۔

پیر کے روز سہ پہر کے وقت اُس کی سانس اُکھڑ گئی۔ وہ خاموش لیٹا ہوا تھا۔ دو بجے کا وقت تھا کہ وہ اپنے بازو آخری مرتبہ پھیلا کر سرد ہو گیا۔ اُردو افقِ ادب کا درخشندہ ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

سعادت حسن منٹو

سرگوشیاں

ماہ کشیاں، پھول، تتلیاں، جگنو، ستارے، اوس!
دنیا میں ان کے سوا اور بھی چیزیں ہیں؟

*

[illegible] سے بگڑتے ہیں
[illegible]
[illegible] اور [illegible]
طوفان اور جھکڑ بھی!
لیکن ایک چھوٹی سی بات ان بڑی چیزوں کو گھبراتی
ہے!
[illegible] سکون ملتا ہو!
تتلیاں، مکھیاں، پھول، خوشبوئیں، اوس،
[illegible]

***

لوگ پوچھتے ہیں: "کیوں؟ اداس رہتے ہو؟"
نہیں کیا بتاؤں کہ میرا سکھ چین کس نے چھین
لیا!
لوگ میری وحشت اور تنہا پسندی کے بارے میں
استفسار کرتے ہیں
انہیں کیا بتاؤں کہ سنہرے کھیتوں، میدانوں اور پہاڑوں
میں اُن کے ساتھ کھیلتا ہوں؟
اپنی اداسی، حیرانی، وحشت، دیوانگی کا کیا سبب بتاؤں؟
جب [illegible]

***

[illegible] کرتا ہوں
وہ [illegible] کہتا ہے "کائنات بڑی نابالغ ہے"
[illegible] حیران ہے کہ وہ کیا ہے!

***

میں [illegible]!
[illegible]!
[illegible]

*

[illegible] مجھے لوٹ لیا
گرم جلتی سلاخ میرے سینے میں اتار دی گئی،
میرے جسم میں چھید کیے گئے،
اور اب میں بانسری ہوں!!

***

[illegible] میری تباہی پر فریاد کرتی ہے!
یہاں سوکھی زرد پتیاں سسک رہی ہیں؟
بلبلے ٹوٹ رہے ہیں،
پنکھڑیاں بکھر رہی ہیں،
تو نے یہ کیوں کیا، میرے مالک!؟

***

[illegible] بانسری [illegible]
[illegible]!
[illegible] آہستہ آہستہ سسک رہی تھی،
[illegible]

***

[illegible]
[illegible]
[illegible] گہری [illegible]
[illegible]
کتنا چین [illegible] ہے
میرے تمنا [illegible] ......

"تمنائی"

ستارے کی سرگذشت

روزانہ شام کو فرشتے ستاروں کو آسمان پر لٹکا دیتے، اور صبح اتار لیتے۔ یہ چراغاں روزانہ کیا جاتا۔ تمام ستارے اپنی حالت پر خوش اور قانع تھے۔ مگر ایک، وہ اس زندگی سے تنگ آچکا تھا۔ گرد و پیش کا ماحول اُسے کاٹنے دوڑتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی نئے ماحول میں چلا جائے۔ مگر وہ مجبور تھا۔

۱

نیا سال شروع ہونے والا تھا۔ یہ سال کی آخری رات تھی۔ فرشتے دوڑ دوڑ کر جگہ سجا رہے تھے۔ فرش بچھا رہے تھے۔ کیونکہ جبرائیل سب فرشتوں کو نئے سال کے متعلق احکام سُنانے آنے والا تھا۔ شام سے کچھ پہلے جبرائیل آگیا۔ اور فرشتے ہمیشہ سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ کاموں میں مشغول ہوگئے۔ ایکدم ایک فرشتہ چیخا۔ "ارے بھئی آج ستارے نہ لٹکاؤ گے!" دوسرا بولا "لاحول۔ لاقوۃ ہم تو یہ بالکل بھول ہی گئے تھے۔ چلو جلدی چلو" چند فرشتے ستارے لٹکانے لگے۔ ایک فرشتہ بے صبر ستارے کو باندھ رہا تھا کہ پیچھے سے ایک آواز آئی۔ "طیمائیل ذرا جلدی یہاں آنا۔ ایک ضروری کام ہے" طیمائیل نے جلدی جلدی ستارے کو لٹکایا اور چلا گیا۔ جب رات ہوگئی تو سب فرشتے جبرائیل کے پاس احکامات سننے چلے گئے۔

۲

بے صبر ستارے نے جب دیکھا کہ بہ نسبت روز کے آج گرفت مضبوط نہیں ہے۔ تو آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد وہ آزاد تھا۔ مگر نہایت تیزی سے نیچے گر رہا تھا۔ کئی گھنٹے گذر گئے۔ مگر فضائے بسیط کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ بے صبر ستارہ خوفزدہ ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ میں جہنم میں گر رہا ہوں۔ مگر تھوڑی دیر بعد اُسے زمین نظر آئی۔ جیسے جیسے وہ نیچے گرتا، ویسے ویسے زمین اُسے بڑی دکھائی دینے لگی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ زمین کے نزدیک آگیا۔ کہ اُسے ایک پرندہ نظر آیا۔ اس نے چاہا کہ میں بھی پرندہ بن جاؤں۔ مگر کس طرح۔ یک بیک اُسے خیال آیا کہ ایک فرشتے نے جو جہنم سے آیا تھا۔ ایک لفظ کہا تھا کہ اس سے شکل تبدیل ہوسکتی تھی۔ وہ لفظ اُس نے کہا اور وہ پرندہ بن گیا وہ زمین پر پہونچ گیا۔ مگر وہ بہت متعجب تھا کہ لحظہ بہ لحظہ روشنی بھی زیادہ ہو رہی تھی۔ اور نئی چیزیں نظر آتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اُسے ایک آدمی نظر آیا۔ وہ لکڑیوں کا پشتارہ کمر پر اٹھائے ہوا تھا۔ آدمی کو دیکھتے ہی اُسے ہزاروں برس پیشتر کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ جب کہ اس نے اسی طرح کا ایک آدمی دیکھا تھا۔ فرشتے اُسے آدم کہتے تھے۔ اور فرشتوں نے اُسے سجدہ بھی کیا تھا۔ ہو نہ ہو یہ انسان ہے۔ کیوں نہ میں بھی انسان بن جاؤں۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے وہی لفظ کہا۔ جس نے اُسے پرندہ بنایا تھا۔ کہتے ہی وہ انسان بن گیا۔ انسان تو نہیں البتہ انسان کی سی صورت اس کی ہوگئی۔ وہ اسی آدمی کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ چلتے چلتے آخر کار وہ ایسی جگہ پہونچ گیا۔ جہاں سینکڑوں آدمی پھر رہے تھے۔ مکانات بنے ہوئے تھے۔ دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ ہر ایک چیز کو دیکھ کر متعجب ہو رہا تھا۔

۳

صبح جب آسمان پر سے ستارے اتارے جا رہے تھے۔ ایک ستارہ کم تھا۔ تمام فرشتے حیرت میں تھے۔ بالآخر معلوم ہوا کہ اس ستارے کو طیمائیل لٹکا رہا تھا۔ اور جب وہ اُسے باندھ رہا تھا اُسے کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ اور وہ گھبراہٹ میں ستارے کو جلدی جلدی باندھ کر چلا گیا۔ آخر کار جب ثابت ہوگیا کہ طیمائیل ہی کی غلطی سے ستارا گم ہوگیا تو طیمائیل کو حکم دے دیا گیا کہ جاؤ ستارے کو تلاش کر کے لاؤ۔ جب تک تم ستارے کو تلاش کر کے

نہ لاؤ گے آسمان پر نہیں آسکتے۔ بے چارہ طیمائیل آزردہ و غمگین ستارے کو تلاش کرنے زمین پر آگیا۔ کیونکہ اس کو یقین تھا کہ ستارہ کھل کر زمین پر ہی گرا ہوگا۔

(۴)

رفتہ رفتہ ستارہ انسان کی عادتوں سے واقف ہوتا گیا۔ مگر خود اُس میں ایک عادت بھی انسانوں کی سی نہ تھی۔ سوائے شکل و صورت کے وہ ستارہ ہی تھا۔ مگر صورت شکل میں انسان۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ انسان میں نیکیاں کم اور بُرائیاں زیادہ ہیں۔ تو وہ بہت متحیر ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان فرشتوں سے بدرجہا بہتر ہوگا۔ کیونکہ فرشتوں نے اُسے سجدہ کیا تھا۔ مگر انسان تو فرشتوں سے بدتر نکلا۔ اُس نے دیکھا کہ چند پیسوں کی خاطر ایک انسان دوسرے کو قتل کر دیتا ہے۔ رات کی تاریکی میں ہزاروں ایسے گناہ کرتا ہے کہ جس کے محض تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بعض انسان ایسے تھے جو بظاہر پارسا تھے۔ مگر بباطن نہایت بدطینت۔ بعض قوم کے بہی خواہ بنکر اُسے تباہی کے غار میں دھکیل رہے تھے۔ غرض انسان کی بُرائیاں دیکھ دیکھ کر وہ انسانوں سے بے حد متنفر ہو گیا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ پھر آسمان پر چلا جائے۔ مگر یہ ناممکن تھا۔ وہ کسی طرح آسمان پر نہ جا سکتا تھا۔ وہ بیحد متاسف تھا کہ کیوں وہ زمین پر آیا۔

(۵)

جب ستارہ انسانوں سے متنفر ہو گیا تھا وہ آبادی سے باہر رہا کرتا تھا۔ تاکہ اُسے انسان دکھائی نہ دیں۔ ایکدن جب وہ ایک ندی کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ طیمائیل آزردہ و غمگین چلا جا رہا ہے۔ ستارہ فرشتے کو دیکھکر بہت خوش ہوا۔ وہ دل میں کہنے لگا "شاید یہ میری تلاش میں یہاں آیا ہے کیوں نہیں ستارہ بن جاؤں۔ اگر مجھے لینے آیا ہوگا تو فوراً مجھے ساتھ لے جائیگا" یہ سوچتے ہی اُس نے وہ لفظ کہا جس سے کہ وہ انسان و پرندہ بنا تھا۔ کہتے ہی وہ ستارا بن گیا۔ جوں ہی کہ طیمائیل کی نظر اس پر پڑی وہ مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ دوڑ کر ستارے کو اُٹھا لیا۔ اور آسمان کی جانب اُڑ گیا۔

محمد ایوب

غزل

برہم کُن دل یوں کبھی برہم نہ ہوا تھا ⁝ حیرت اثر ایسا مرا عالم نہ ہوا تھا
ان شوخ نگاہوں نے تڑپا اور بڑھا دی ⁝ اللہ ابھی درد جگر کم نہ ہوا تھا
اب بھی مجھے خودداری جاناں میں نہیں شک ⁝ پہلے بھی مرا دل متوہم نہ ہوا تھا
اے پیر مغاں! اسکی بقا میں مجھے شک ہے ⁝ واقف اثر جام سے کیا جم نہ ہوا تھا
وہ شوخ مجھے دیکھکے یوں شرم سے جھک جائے ⁝ جس کا سر مغرور کبھی خم نہ ہوا تھا
اس کم نگہی نے تو مجھے مار ہی ڈالا ⁝ ایسا اثر پرسش پیہم نہ ہوا تھا

مشہور وہ منظور ہے جس کیلئے کل تک
سرمایۂ شہرت ہی فراہم نہ ہوا تھا

علی منظور حیدرآبادی

ہیر کا پیغام رانجھے کے نام

وارث شاہ پنجابی زبان میں اپنے طرز کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اور ہیر وارث شاہ اس کا شاہکار ہے۔
وارث شاہ شیخو پورہ کے قریب کے ایک قصبہ جنڈیالہ شیرخاں ضلع گوجرانوالہ (پنجاب) کا رہنے والا تھا۔
وارث شاہ نے علوم ظاہری قصور میں مولانا غلام محی الدین صاحب قصوری نقشبندی سے اور باطنی حضرت عنایت اللہ صاحب قادری لدورسے سیکھے۔ جو حضرت خواجہ فرید الدین شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان میں سے ہیں۔
وارث شاہ نے لکھا ہے۔ کہ ہیر اور رانجھا کو ایک دوسرے سے عشق تھا۔ مگر ہیر کے والدنے ہیر کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کردیا۔ نکاح کے بعد ہیر کو جبراً سسرال بھیج دیا گیا۔
اب ایک سال گذر گیا ہے۔ کوئی عورت ہیر کے والدین کے شہر جارہی ہے اور ہیر رانجھے کو پیغام بھیجتی ہے۔ اس واقعہ کو وارث شاہ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ادا کیا ہے۔

وجودی

ایک عورت ہیر کے پاس آتی ہے اور پیار اور محبت سے اُسکے حالات دریافت کرتی ہے

(۱)
ایک سال گذر گیا۔
ایک عورت۔
جھنگ سیال کی طرف
جانے کے لئے۔
تیار ہوتی ہے۔
وہ ہیر کے پاس
جاکر
بیٹھ جاتی ہے۔
اور کہتی ہے۔
میں تم پر۔
قربان۔

(۲)
تم
کوئی پیغام۔
اپنے والدین کے نام۔
دو۔
تم۔
اس قدر۔
جان سے بیزار۔
کیوں ہوگئی ہو۔؟
جو کچھ۔
تم کہنا چاہتی ہو۔
وہ ہی۔
مجھ سے کہہ دو۔
میں بھی۔
تمہارے غم میں۔
شریک ہوتی ہوں۔

(۳)
اے ہیر!
میں تو۔
سسرال جارہی ہوں۔
تم سے۔
یہ ہی دریافت کرنے۔
کے لئے۔
چلی آئی۔
اے وارث شاہ!
ہیر نے۔
رونا شروع کیا۔
اور کہا۔
میں تو۔
رانجھے کے بغیر
برباد ہوگئی ہوں۔

* * * * * * * * *

یہ ہی چیز دوسرے رنگ میں

(۱)
ایک اور دلہن
اپنے سسرال۔۔
جھنگ سیال کو۔
چلی۔

اور
ہیر کے پاس۔
پیغام لینے آئی۔
اور کہا۔
میں تمہارے۔
والدین کے شہر۔
جارہی ہوں۔

تم۔
اپنے سب حالات
مجھ سے بیان کرو

——(۲)——

تمہاری ۔
تمہارے شوہر سے۔
کیسی محبت ہے ؟

بیوریاں۔
ہم کو۔
سب کچھ بتادیتی ہیں۔
تمہارے ساس سسرے
تم سے۔
کیسا برتاؤ کرتے ہیں؟
یہ سب کچھ۔

تم اپنے والدین کو۔
کہلا بھیجو۔

——(۳)——

ہیر کہتی ہے۔
یوں معلوم ہوتا ہے۔
جسطرح جلا ہی کو۔
ریشم کے ساتھ۔

دشمنی ہو۔
اے وارث!
میں کیوں نہ۔
اپنی قسمت پر۔
شاکر رہوں اور۔
کیوں ہر ایک سے۔
اپنا دردِ دل بیان کروں؟

ہیر ایک سہیلی کو پیغام دیتی ہے

——(۱)——

تم۔
میری طرف سے۔
ہاتھ جوڑ کر
گلے میں
کپڑا ڈال کر۔
میرے ہم وطنوں کو۔
میری دعا دینا۔
اور سلام کہنا۔
اور یہ بھی۔

میرا پیغام پہنچا دینا۔
کہ۔
تم نے۔
مجھے دشمنوں کے۔
سپرد کردیا۔
اور سہیلیوں نے۔
میرا نام تک۔
بھلا دیا۔

——(۲)——

ہم
گہرے پانی ہیں
والدین کو ڈبو دیں۔
اُن سے۔
بھلا میرا تعلق ہی کیا؟
ہاں۔
تم ہاتھ جوڑ کر۔
رانجھے کے۔
پاؤں پکڑ لینا۔
اور۔
اُس کو

میرا۔
صرف اتنا پیغام۔
پہنچا دینا۔

——(۳)——

مہربانی کرو۔
اور۔
خود آؤ۔
ورنہ۔
میرا خاتمہ سمجھو۔
اے وارث!

جن کا۔
کوئی وارث نہ ہو۔
اُن پر۔
رحم کرنا چاہیے۔
خدا کرے۔
مجھ پر۔
مہمان ہوکر۔
میرا شام
آجائے۔

——٭——

سہیلی سے ہیر اپنی آرزو بیان کرتی ہے

——(۱)——

ہیر کے سر پر۔
انتہائی غضب کی۔
بجلی گری۔
میں تو۔
تیری۔

محبت اور فراق کی۔
ذبح کی ہوئی ہوں۔
میرے جگر میں۔
درد اٹھتا ہے۔
میں جینا نہیں چاہتی۔
میں نے تو۔

مرنے پر۔
کمر باندھی ہے۔

——(۲)——

ہیر نے
درد اور فراق سے۔
کہا۔

میں۔
اپنا حال بیان کرتی کرتی۔
تنگ آگئی ہوں۔
نہ مجھے
دن کو قرار ہے
نہ رات کو آرام

اس کے
عشق کی آگ نے۔
مجھے کہیں کا نہ رکھا۔

——(۳)——

عوام کو۔
سوتے ہوئے۔

رات کے وقت۔
چور پڑتے ہیں۔
ذرا غور کرنا۔
میں
دن کے وقت۔
سر بازار۔

لٹ گئی ہوں۔
تم۔
جوگی بن کر ہی۔
اس شہر میں۔
آجاؤ۔
آہ

میری قسمت۔
وہ مجھ سے۔
کس قدر خفا ہوگیا۔
——(۴)——
تیرے بغیر۔
مجھے گھر بار۔

اُجاڑ معلوم ہوتا ہے۔
کھیڑے۔
مجھے ہر روز مناتے ہیں۔
اور میں۔
روٹھی ہوئی ہوں۔
اے وارث!

وہ کس قدر۔
خوش قسمت ہیں؟
جن کو۔
کوئی بلا بھیجے۔
میں تو۔
قسمت کی ماری ہوئی ہوں۔

پیغام۔ دوسری دفعہ

——(۱)——
اری بہن۔
تم رانجھے کو۔
میرے وطن بھیجنا۔
کہنا۔
بچاری ہیر۔
موت کے قریب ہے۔
یا تو۔
آکر
اُس سے مل جاؤ۔
ورنہ۔
وہ تمہاری امانت۔
اب
اپنے پاس نہیں رکھ سکتی۔
——(۲)——

وہ۔
ان ہی۔
چند دنوں میں۔
آجائے۔
ورنہ۔
وہ۔
زیادہ انتظار۔
برداشت نہ کرسکے گی۔
وہ بیچاری۔
تیرے درد فراق میں۔
اُس جنیر کی طرح۔
نابود ہونے کو ہے۔
جس کو۔
دیمک کھا گئی ہو۔
——(۳)——

اے پیارے!
بغیر کسی جھجک۔
اور۔
ملاح کے۔
یہ گہرا دریا۔
تیرنے کے لئے۔
تیار ہے۔
وہ صرف
زبان سے۔
کہنا ہی نہیں جانتی۔
وہ راستے ہی میں
تھک کر۔
ہار جانے کو ہے۔
——(۴)——
سسرال نے۔

مجھے بہت ہی
دکھ دیا ہے۔
میں بھی اپنے ساتھ
کھیڑوں کا سکھ ہی!
لئے جارہی ہوں۔
اے ماں۔
میری ساس۔
مجھے۔
بہت ہی تکلیف
دیتی ہے۔
اور ہر روز۔
مجھ سے لڑتی ہے۔
——(۵)——
تم
خدا کے لئے۔

خدا کو پوجنے والا۔
جوگی بن کر ہی۔
آجاؤ۔
بھیس بدلے بغیر
بات بنتی۔
نظر نہیں آتی۔
اے وارث!
پردیس میں۔
کبھی نہ کبھی۔
طاقت کے بغیر
ایک رات بھی۔
بسر کرنا۔
مشکل ہے۔
(وارث شاہ)

احمد وجودی؛

خمستان

فرض

اگر تمہیں اپنے دل و دماغ میں جوانی کی اُمنگوں کا احساس ہوتا ہے، اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو، اگر تم پاک و صاف، مکمل اور ارتقا پرور زندگی سے سرفراز ہونا چاہتے ہو۔ یعنی اگر تم ان حقیقی مسرتوں سے محظوظ ہونا چاہتے ہو جن کی تمنا ہر ذی حیات کرتا ہے۔ تو مضبوط ہو، عظمت و وقار کے زینوں پر چڑھو اور ہر کام مستقل مزاجی سے انجام دو۔

اپنے چاروں طرف زندگی کی تخم ریزی کرو۔ خبردار! اگر تم دھوکا دو گے، جھوٹ بولو گے، اور سازش کرو گے تو آپ اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاؤ گے۔ قعرِ پستی میں جا گرو گے اور تمہاری حالت اس غلام کی سی ہو جائے گی جو اپنے آقا کو اپنا خدا ماننے لگتا ہے! اگر تمہارا رجحانِ طبع اسی طرف ہو تو یہی کرو لیکن اس حالت میں لوگ تمہیں کمزور، حقیر اور قابلِ نفرت سمجھنے لگیں گے اور تم سے ایسا ہی برتاؤ کریں گے۔

تمہاری طاقت کا کوئی ثبوت نہ پا کر عوام تمہیں قابلِ رحم سمجھیں گے۔ سوچو، رحم و کرم کے قابل ہو جانا انتہائی ذلت ہے۔ اگر خود اپنی صلاحیت کے بال و پر نوچتے ہو تو دنیا کو دشنام نہ دو۔ اس کے خلاف خود کو کمربستہ کرو اور اگر کہیں تمہیں کوئی بے انصافی نظر آتی ہو خواہ اس کی نوعیت کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو۔ تو تم اس جبر و ظلم اور ناحق کے خلاف بغاوت کر دو۔ جہاد کرو تاکہ ساری دُنیا اطمینان کی زندگی بسر کر سکے، یقین جانو کہ اس لڑائی میں تمہیں جو روحانی مسرت حاصل ہوگی وہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔

(کروپاٹکن)

اختر حسین رائے پوری، بی اے

* * * * * *

مُطالعۂ کائنات

ایشیائی مٹی کی گرم اور سُنسان رات تھی۔

خشخاش کے پودے رات کی سیاہی میں غائب ہو گئے تھے۔

دُور ـــــ ناریل کے سیاہ جھنڈ پر صرف ایک بڑا سا ستارہ جگمگا رہا تھا۔

آسمان پر چاند تھا ـــ نہ زمین پر کسی قسم کی روشنی!

ایسے وقت میں شاعر ایک ندی کے قریب ترشے ہوئی چٹان پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اور مطالعۂ کائنات میں غرق تھا۔

قریب ہی کبھی کبھی صحرائی اُلّو اپنی دل ریش آواز دفعتاً بلند کرتا تھا جو تاریکیوں کو چیرتی ہوئی جنگل کے باہر نکل جاتی تھی۔

یا کبھی پہاڑی چھپکلی کی باریک غمناک چیخ سُنائی دیتی تھی۔

اس کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔

ایسے وقت میں شاعر چُپ چاپ ایک ندی کے قریب ترشی ہوئی چٹان پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اور مطالعۂ کائنات میں غرق تھا۔

گیہوں کے کھیتوں میں کسان تاروں بھری فضا کے نیچے بےحس و حرکت ہو گئے تھے۔

کائنات لاش کی طرح خاموش تھی۔

شہر پر نیند کا جادو چل گیا تھا۔

اور جنگل کے درخت طلسمی دیوؤں کی طرح چُپ چاپ کھڑے تھے۔

مگر میری آنکھوں میں نیند نہ تھی!۔

ایسے وقت میں شاعر، چپ چاپ ایک ندی کے کنارے ترشی ہوئی چٹان پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا اور مطالعہ کائنات میں غرق تھا۔

حجاب امتیاز علی

میرا گیت

میرا یہ گیت اپنی موسیقی سے محبت کے پُر اشتیاق آغوش کی طرح تمہارے گرد لپٹ جائے گا۔ میرا یہ گیت دُعا اور آشیرباد کے بوسے کی طرح تمہاری پیشانی کو مس کرے گا۔ جب تم اکیلے ہو گے تو یہ گیت تمہارے پاس بیٹھا ہوا تمہارے کانوں میں سرگوشیاں کریگا۔

جب تم لوگوں کے ہجوم میں ہو گے تو یہ تمہارے گرد خلوت کا پردہ حائل رکھے گا۔ میرا گیت تمہارے خوابوں کے لئے پروں کا ایک جوڑا بن جائے گا۔ اور تمہارے دل کو اڑا کر لامکاں کے کنارے پر پہونچا دیگا۔

جب تمہاری راہ پر اندھیری رات چھا جائے گی تو یہ گیت وفادار ستارے کی طرح تمہاری رہنمائی کرے گا۔

میرا یہ گیت تمہاری آنکھوں کی پتلیوں میں جا بیٹھے گا۔ اور تمہاری نظر کو اشیاء کے باطن تک پہونچا دیگا۔ اور جب میری آواز موت کی خاموشی میں ڈوب جائے گی میرا گیت تمہارے زندہ دل میں نغمہ ریز ہو گا۔

(ٹیگور)

ہمشیرہ شرف حسین لکھنوی

ٹیگور کے تین جام

(۱)

رات اندھیری ہے اور میرے وجود کی خاموشی میں۔

تمہاری نیند گہری!

✤ ✤ ✤

اے دردِ عشق! تو بیدار ہو جا—

میں باہر کھڑا ہوں اور یہ نہیں جانتا

کہ دروازے کو کس طرح وا کروں!

✤ ✤ ✤

ساعتیں منتظر ہیں—

تارے نگہبانی کر رہے ہیں۔

ہوا ساکت ہے—

خاموشی میرے دل میں بار معلوم ہوتا ہے!

✤ ✤ ✤

اُٹھ! اے عشق! تو بیدار ہو جا—

میرا جام خالی پڑا ہے— تو اسے پُر کر دے۔

اور اپنے نغمے کی ایک لے سے، شب کو متزلزل کر دے!

(۲)

جب تم نے میرے دل کو،

پھٹے پرانے پیوند آلود کپڑے پہنا کر،

بھیک مانگنے کیلئے سڑک پر باہر نکال دیا—

تو اسوقت، انبساط و شادمانی کی ایک ہلکی سی لہر—

آسمان پر دوڑ گئی۔

✤ ✤ ✤

وہ در بدر ماری پھری—

لیکن ہر مرتبہ جب اُس کا پیالا پُر ہو جاتا۔

تو رہزن اُسے لوٹ لیتے!

✤ ✤ ✤

دن کے ختم پر جب وہ اپنے المناک آبگینہ کو لئے ہوئے

تمہارے محل کے دروازے پر پہونچی،

تو تم اُس جگہ آئے، اور ہاتھ پکڑ کر،

خود اپنے ساتھ تخت پر بٹھا دیا!

(۳)

میں نے اپنے مٹی کے چراغ کو

گھر سے باہر نکال کر کہا۔

"بچو! آؤ میں تمہاری راہ میں روشنی کرونگا"

✤ ✤ ✤

لیکن رات اُسوقت بھی تیرہ و تاریک تھی،

جب میں سُنسان سڑک کو چھوڑ کر،

گھر واپس آیا— اور بلند آواز میں بولا—

"اے آگ! اب تو مجھ کو ہی روشن کر دے

کہ میری مٹی کی شمع سڑک پر چکنا چور پڑی ہے"

جمیل احمد کندھاپوری

چڑیا!

میں شکار سے واپس آرہا تھا — ایک باغ کے احاطے سے گذر رہا تھا — میرا کتا آگے آگے دوڑ رہا تھا۔

دفعتاً وہ رک گیا — اس کی تیزی سکتہ میں تبدیل ہوگئی — وہ ایک طرف غور سے دیکھ رہا تھا جیسے شکار ہو۔

میں نے احاطے کی طرف دیکھا اور میری نظر ایک چڑیا کے بچے پر پڑی جس کی چونچ نارنجی اور سر خاکی تھا — وہ گھونسلے سے گر پڑا تھا۔ تیز ہوا درختوں کی شاخوں کو جھونکے سے ہلا رہی تھی — اور وہ بیٹھا تھا حرکت کرنے سے مجبور — یاس کے عالم میں اپنے آدھے پروں کو کھولے ہوئے!

کتا اس کی طرف آہستہ آہستہ احتیاط سے بڑھ رہا تھا۔ — دفعتاً نزدیک کے درخت سے ایک بڑی چڑیا شور کرتی ہوئی پھینکے ہوئے پتھر کی طرح اس کی ناک پر گری — سب کانپ اٹھے — ڈر گئے — کانپتی اور چیختی اس نے دوبارہ اپنے کو کھلے اور چمکتے ہوئے جبڑوں کے سامنے کر دیا۔

وہ مدد کو کودی — گھونسلے کے سامنے اپنے کو موت کے منہ میں ڈال دیا — لیکن اس کا جسم خوف سے لرزاں تھا — آواز سخت اور عجیب تھی — خوف سے کانپتے ہوئے اس نے اپنے کو موت کے سامنے ڈال دیا!

کتا اسے کیسا ہیبتناک نظر آیا ہوگا! لیکن اس نے شاخ کے اوپر محفوظ رہنا پسند نہ کیا — تحفظ نفس سے بلند تر ایک طاقت اس پر غالب آئی اور اسے نیچے ڈال دیا۔

میرا حیرت زدہ کتا پیچھے ہٹا — بیشک اس نے بھی اس طاقت کو محسوس کیا!

میں نے اپنے گھبرائے ہوئے کتے کو بلا لیا اور چلا گیا — بڑے احترام سے — ہاں آپ ہنسیں نہیں! میں نے اس چھوٹی بہادر چڑیا کیلئے — اسکے محبت کے ہیجان کیلئے — ایک احترام محسوس کیا۔

محبت — میں نے خیال کیا — موت یا موت کے خوف سے زیادہ طاقتور ہے۔ اسی سے زندگیاں بنتی اور نشو و نما پاتی ہیں!

(روسی) — انعام الحق شیدائی

ایک مثالی مسکن

دیکھنا! یہاں کسی ہاتھوں نے کام نہیں کیا۔ کسی نے نہیں بلکہ روح نے اوائل جوانی سے سال بسال اس کی تعمیر کی۔ یہ ایک ایسا ایوان ہے جہاں روح سیر کر سکتی ہے۔ یہ مسرت کا معبد ہے۔ یہ ایک مثالی مسکن ہے جس کی بنیاد صداقت پر رکھی گئی ہے۔

ذرا اس مکان کی ساخت دیکھنا! یہ حسین تخیلات، خوش آیند خیالات اور پاکیزہ ترین امیدوں سے بنا ہوا ہے۔ یہاں حافظہ کی مشعل روشن ہے جو بالاخانے پر سے شب کی تیرگی میں ضوفشاں ہے یہاں رنگین خوابوں سے بنے ہوئے پردے آب و تاب آویزاں ہیں۔ اسکا وسیع ایوان ہمت کی گونج سے بھرا ہوا ہے نعمتوں کی یادگار روحوں کا اس مقام پر نزول ہے۔

یہ مکان نہایت مستحکم ہے خواہ طوفان کیوں نہ آئے، افکار اور بلائیں خواہ کیسی ہی بھیانک کیوں نہ ہوں اسکو متزلزل نہیں کر سکتیں۔

اس مکان کی ساخت میں کسی انسانی ہاتھ کو دخل نہیں۔ یہ ایک مسکن ہے جہاں سکون اور مسرت ابدی حاصل ہے جہاں امن میزبان اور مسرت مہمان ہے اور محبت کی پاک آگ روشن ہے۔

(ترجمہ) — مظہر علی

معروضہ

مارا ہوا فراقِ محبت کا اک مریض
کرنے لگا یہ عرض بہ عشقِ وفا ادا

(۱)

اے جذبۂ تمام دلی، سربسر وفا — اے مدعائے حُسنِ جہاں، مرکزِ جفا
اے صاحبِ خیال تصور کے بادشاہ — اے اشک ریز گردشِ قسمت کی انتہا
اے مستقل خزانِ گلستانِ زندگی — عنوانِ صد فسانہ و دیباچۂ فنا
اے شورشِ دوام، تماشائے کُل جہاں — اے کشتۂ خیال حقیقت کی ابتدا
اے دل فروش، صاحبِ ارمان و آرزو — اے میرے کاروانِ رہِ خاص مُدعا
اے منظرِ خلق و مصیبت نوازِ دہر — اے اے غریقِ کشتیِ طوفان آشنا

اے صاحبِ مجاز و حقیقت جفا پسند
مجھ بدنصیبِ دہر کو اتنا ہی دے بتا

(۲)

کچھ یاد ہیں تجھے بھی وہ اگلی نوازشیں — جب میرا قلبِ صاف نہ تھا درد آشنا
ناواقفِ نگاہ حسیں تھا میں دہر میں — میری نگاہ میں نہ کبھی تھی کوئی ادا
اک کیفِ مستقل میں گذرتے تھے رات دن — رہتا مری زباں پہ تھا ہر وقت قہقہا
ہر بات میں اُمنگ تھی، دل مست مست تھا — میں ہو چکا تھا اصل مسرت سے آشنا
میری نظر میں حُسن کی وقعت نہ تھی کوئی — مجھ پر فریبِ حُسن ذرا بھی نہ چل سکا
تھے دُور میری فہم سے معنیِ حُسن و عشق — تھا اک سکوں کا دَور زمانہ تھا ہمنوا
القصہ ایک رنگ تھا بے سوز و اضطراب — تھا اور جز وہ تھا مری دُنیا سے ماسوا

پر آہ پُرسکون یہ گھڑیاں بدل گئیں
اے عشق تیرا وار مرے دل پہ چل گیا

(۳)

ہونے لگا مجھے بھی اک احساسِ زندگی — ہر ذرہ اب نگہ میں مری رشکِ طُور تھا
میں چاندنی میں اُٹھ کے ٹہلتا تھا رات کو — میں خود ہی پوچھتا تھا کہ یہ مجھ کو کیا ہوا
شب کی لطافتوں پہ تڑپتے تھے دل جگر — نغموں کے سوز و ساز سے ہوتا تھا در دسا
میری نگاہِ شوق مچلتی تھی دید کو — کس کی؟ یہ خود خیال مجھے بارہا ہوا
خالی سا پا رہا تھا میں اپنی ہی زیست کو — میری سمجھ سے دُور تھا خود اپنا مدعا
مَیں کھو یا جا رہا تھا کسی کی تلاش میں — اک دَرد دل میں ہونے لگا تھا ذرا ذرا
خالی تھے کیف سے مرے ایامِ زندگی — دل چاہتا تھا کہ نہیں سکتا تھا خود ہی کیا

اک روز آگیا مجھے ایک مہ لقا نظر
جس سے کہ رازِ زیست کا سب مجھ پہ کھل گیا

(۴)

اس کی نگاہِ ناز نے کی تیر افگنی — میرے دلِ حزیں کا ذرا حوصلہ بڑھا
گرتی تھیں پے بہ پے مری ہستی پہ بجلیاں — میں رو کے رہا تھا تبسم پہ اکتفا
اک محشرِ خیال میں دونوں کے قلب تھے — آنکھیں لڑی ہوئی تھیں محبت کا جوش تھا
اسدرجہ کھو گیا تھا میں دُنیائے حُسن میں — نقشِ سجود میں بھی تھا اندازِ نقشِ پا
اس کی نگاہ دیتی تھی پیغامِ عاشقی — میری نگاہ کہتی تھی ہاں اور مرحبا
وہ حشر کر رہا تھا رفتارِ نازنیں — اور میں ہوا ہی جاتا تھا پامالِ ہر ادا
اس کی نگاہ پوچھتی تھی میرے دل کا حال — میری نگاہ کہتی تھی ہر دل کا مدعا

پلٹی ہوائے دہر، مری زندگی میں آہ
تاریکیاں بڑھیں بڑا اندھیر ہو گیا

(۵)

اُس کی نگاہِ ناز پھری اور بلا سبب — میں اپنے دل کو تھام کے گھبرا یا رو پڑا
اب میری زندگی ہمہ تن سوز و ساز ہے — اب چاندنی میں کچھ نہ راتوں میں کیف تھا

تنہا ہوں میں لگنے لگا ہے دل حزیں ٭ مجنوں کی دلکشی سے ہی مجھ کو لطف رہا
باقی رہی چمن میں نہ وہ دلکشی نہ رنگ ٭ تجھ کو ہر ایک پھول ہے گویا ستم نما
اس بیوفا کی یاد ہی سینے میں موجزن ٭ میں ہوں غریق کشتی طوفان آشنا
مجھ کو تمام دہر سے نفرت سی ہوگئی ٭ اب موت مانگتا ہوں میں کہہ کہہ کے یا خدا

سمجھے اسے جہان نہ سمجھے اسے جہاں
جو زندگی کا راز میں باتوں میں کہہ گیا

(۶)

اے عشق تجھ پہ رحمتیں اللہ پاک کی ٭ لیکن خدا کے واسطے اتنا مجھے بتا
تھا ایک میں ہی دہر میں کیا بدنصیب دہر ٭ آخر بتا کہ تو نے مجھے کیوں مٹا دیا

آئی ندا یہ عشق کی خاموش اے مریض ٭ کیوں دے رہا ہے تو مجھے الزام ناروا
احسان لاکھ لاکھ مرے مان خوش نصیب ٭ مری نگاہ کیف کا سایہ جو پڑ گیا
تنہا تو ہی نہیں مرے ہاتھوں کے دردمند ٭ فرہاد قیس و وامق و فرہاد سے نوا
ان سب کی عزتیں بڑھیں میرے ہی فیض سے ٭ ورنہ انہیں جہاں میں کیوں کوئی پوچھتا
میری نگاہ فیض سے لاکھوں ولی ہوئے ٭ میں ہی ہوں اصل راہ حقیقی کا راستا
میرے یہاں مجاز بھی ہے اور حق بھی ہے ٭ جس کی جسے طلب تھی وہ اس نے لے لیا
تیری دراصل مجھ سے شکایت فضول ہے ٭ میں نے تو اصل میں ترا رتبہ بڑھا دیا

کیا خوب سچ کہا ہے کسی نے جہان میں
الفت ہی ابتدا ہے اور الفت ہی انتہا

—— حاجی نبی احمد بریلوی

ہوشیار!

مجھے معلوم ہے کہ وہ دوشیزہ دیکھنے میں نہایت پاکیزہ ہے۔
لیکن خبردار!
وہ باوفا بھی ہوسکتی ہے اور دغاباز بھی۔۔ خبردار!
اس کا اعتبار ہرگز نہ کرنا۔۔ وہ تمہیں بیوقوف بنا رہی ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کی آنکھیں نہایت چمکدار، رسیلی اور سیاہ ہیں۔
خیال رکھنا!
وہ ایک نگاہ غلط انداز ڈالتی ہے
غافل مت ہونا،
اس کا اعتبار ہرگز نہ کرنا،
وہ تمہیں الو بنا رہی ہے۔

٭ ٭ ٭

اُس کے گیسو سنہری اور صندلیں ہیں۔
ان پر نہ مرمٹنا۔

جو کچھ وہ کہہ رہی ہے سچ نہیں،
ہاں ۔۔ اس کا یقین ہرگز نہ کرنا۔
وہ تمہیں دھوکا دے رہی ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کا سینہ بلور کی مانند سفید ہے۔
ہوشیار رہنا!
اسے معلوم ہے کہ اظہار الفت کہاں تک کرنا چاہیئے۔
اس کے دام میں نہ آنا ۔۔ اس پر اعتماد نہ کرنا
وہ تمہیں فریب دے رہی ہے۔

٭ ٭ ٭

وہ تمہیں ایک حسین ہار دے گی اپنے ہاتھوں سے گوندھا ہوا،
ہوشیار رہنا!
وہ تمہیں بیوقوف بنا رہی ہوگی۔ خبردار!
فریب نہ کھانا۔ دھوکے میں نہ آنا۔

(ترجمہ از المانوی)

—— نذیر احمد خاں مرغوب ایم۔ اے

■

چنگیز خاں کی بڑی بیویاں بورتے۔ کولان۔ یسوئی۔ یسوجن یہ سب چار تھیں۔ اس وجہ سے اُن کے چار اردو علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان بیویوں کے علاوہ چند بیویاں کم درجے کی بھی تھیں۔ (جن میں ایک شہنشاہِ قن کی بیٹی تھی۔) اور متعدد حرمیں اور خادمائیں تھیں۔ جس زمانے میں چنگیز خاں اپنے اردو میں ہوتا تھا تو حسین عورتوں کو اپنے گرد و پیش رکھتا تھا۔ لڑائی پر جب جاتا تھا تو علاوہ ایک یا دو بیویوں کے ایک طائفہ (ایامہ) خوش گلو اور موسیقی میں مشاق عورتوں کا بھی ساتھ ہوتا تھا۔ یہ بیان ایک چینی سپہ سالار کا ہے۔ اور اسی نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "جب ہمارا سفیر خاقان کے سامنے پیش ہوا تو آداب و مراسم کے ادا ہونے کے بعد وہ خان کی بیوی لائی مان کے پاس مے نوشی کے لئے بٹھا دیا گیا۔ اس ملکہ کے پاس اس وقت آٹھ حرمیں تھیں جن کو خواتین کہتے تھے۔ یہ عورتیں ہمیشہ اس وقت جبکہ خاصہ کھایا جاتا تھا حاضر رہتی تھیں۔ یہ عورتیں سب گورے رنگ کی تھیں۔ اور وہ حسین تھیں۔ ان میں چار قن کی شہزادیاں اور باقی چار کبھی پہلے کے تاتاریوں کی بیویاں تھیں۔ یہ عورتیں سب بڑی خوبصورت ہیں اور چنگیز خاں کو ان سے بے حد الفت ہے۔"

گو لکھنے والے نے ایسا ہی لکھا ہے لیکن یہ قیاس کم ہو سکتا ہے کہ چنگیز خاں کو اپنی کسی حرم یا کسی عورت سے کبھی محبت و عشق یا بیجا الفت ہوئی ہو۔ جب تک وہ زندہ رہا اور عمر بھی بڑی پائی اُس وقت تک بدنی تازگی و توانائی کو برقرار رکھا۔ موت سے چند روز پہلے تک برابر صید و شکار میں مصروف رہا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہوائے نفسانی کی طرف کبھی اس کو زیادہ رغبت نہیں ہوئی۔ گو یہ کہنا مشکل ہے مگر اس کا کافی ثبوت کہ چنگیز خاں کو کبھی کسی سے عشق ہوا ہو ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ مغلوں کی روایتوں میں اکثر آیا ہے کہ حسین ملکہ کولان سے جو قوم رکیت سے تھی چنگیز خاں کو غایت درجہ عشق تھا۔ اسی روایت میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ چنگیز خاں نے اپنے ملازم نایا کو حکم دیا کہ جس طرح بن پڑے کولان کو میرے پاس لا۔ نایا گیا اور کولان کو اپنے ساتھ لئے آرہا تھا کہ راستے میں دشمنوں کا خوف ہوا اور اُس نے کولان کو تین دن تک اپنے خیمے میں ٹھیرائے رکھا۔ اس تین دن کے بعد نایا کولان کو چنگیز خاں کے پاس لے گیا۔ جب چنگیز خاں کو معلوم ہوا کہ کولان نایا کے خیمے میں تین دن تک رہی ہے تو وہ غضبناک ہوا اور حکم دیا کہ اس معاملے کی تحقیقات کی جائے۔ اور تحقیقات کے بعد نایا قتل کر دیا جائے۔ جس وقت نایا کو اذیتیں پہونچنے لگے تو کولان نے عرض کیا کہ "نایا نے ہم سے کہا تھا کہ وہ خان کا درباری ہے! اور وہ اور عورتوں کے ساتھ مجھے یہاں لا رہا تھا۔ کہ راستے میں کچھ باغی سپاہی ملے۔ اُنکے خوف سے نایا نے مجھے اور ان عورتوں کو جو میرے ساتھ تھیں اپنے خیمے میں ٹھیرا دیا۔ اگر نایا ساتھ نہ ہوتا یا اگر وہ اپنے خیمے میں مجھکو جگہ نہ دیتا تو معلوم نہیں ہمارا کیا درجہ ہوتا۔ نایا کو جسمانی اذیت نہ پہونچائی جائے۔ مجھ پر رحم فرمایا جائے۔ اگر یہی مرضی ہے تو میرے کنوارپنے کا امتحان کر لیا جائے۔" نایا نے چنگیز خاں سے کہا "میں نے آقا کی خدمت ہمیشہ سچی وفاداری سے کی ہے۔ اور ہمیشہ اپنا فرض منصب سمجھا کہ خوبصورت عورتیں اور اچھی نسل کے گھوڑے باہر کے ملکوں سے جسقدر ملیں آقا کی خدمت میں پیش کروں۔ اگر اسکے سوا کوئی بات میرے دل میں آئی ہو تو مجھے قتل کر دیا جائے۔" چنگیز خاں نے کہا "کولان نے ٹھیک بات کہی ہے" غرض اُسی دن کولان کا امتحان کیا گیا اور وہ باکرہ ثابت ہوئی۔ اس واقعہ سے چنگیز کو کولان سے اور بھی محبت ہو گئی۔ نایا کو رہا کیا گیا اور چنگیز خاں نے کہا کہ "اس آدمی میں مکر و فریب نہیں ہے۔ بڑے کاموں میں اُس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔"

چنگیز خاں کو جس طرح اپنے مال کا خیال رہتا تھا کہ اُس پر کوئی بری نیت نہ رکھے اُسی طرح بیویوں کے بارے میں بھی اسکو ان کی حفاظت کا خیال تھا اور ذرا سی بات میں بدگمان ہو جاتا تھا۔ ایک دن اپنی دو بیویوں یسوئی اور یسوجن کے ساتھ بیٹھا شراب پی رہا تھا (یہ دونوں بیویاں تاتاری تھیں۔) کہ دفعتاً یسوئی کے منہ سے ایک آہ نکلی۔ اس آہ کے سنتے ہی چنگیز خاں کو شبہ گذرا۔ اور واقعہ بھی یہ تھا کہ جس خیمے میں بیٹھا تھا اُس سے کچھ زیادہ دور نہیں ایک جوان آدمی ایسا دریافت ہوا جو اُن قبائل سے نہ تھا جنکو چنگیز خاں نے مطیع کیا تھا۔ یہ جوان گرفتار ہو کر خاقان کے سامنے جب لایا گیا تو خاقان نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟۔ تو اُس نے جواب دیا کہ یسوئی سے میری منگنی ہوئی تھی جس وقت گرفتار ہوئی تو میں

بھاگ گیا۔ اب چونکہ یسوتی کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تو جہاں یہ چھپا تھا وہاں سے نکلا اور سمجھا تھا کہ بھیڑ بھاڑ میں مجھے کوئی پہچانے گا نہیں اور میں چپ چاپ نکل جاؤں گا۔ چنگیز خاں سمجھ گیا کہ وہ تاتاری ہے۔ فوراً اسکے قتل کا حکم دیا۔ اور کہا کہ تو میرے دشمنوں کی اولاد ہے اور یہاں تو جاسوس بنکر آیا ہے۔ میں نے تیرے تمام عزیزوں کو قتل کیا ہے اور تیرے قتل کا حکم دینے میں بھی مجھے تامل نہیں۔"

باوجود اس سختی کے جہاں ضرورت ہوتی تھی وہاں اپنی طبیعت کی اس بدگمانی اور رشک پر غالب بھی آجاتا تھا۔ جس وقت اسکی بیوی بورتہ کو مرکیت پکڑ کر لے گئے تو انہوں نے اپنی ہی قوم کے ایک آدمی کو جس کا نام چلگر تھا بورتہ کو دیدیا۔ کہ اس کو بطور بیوی کے رکھے لیکن جب بورتہ پھر چنگیز خاں کو ملی تو اسکے ساتھ ویسی ہی محبت اور الفت کا سلوک رکھا جو پہلے تھا۔ اور اپنی بیویوں میں ہمیشہ اس کو سب سے ممتاز سمجھا۔ اور جو لڑکے اسکے بطن سے ہوئے انہی کو شہزادوں کے حقوق اور اعزاز عطا کئے گئے۔

جس وقت اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ عورتیں اپنے لئے اور اپنے ہواخواہوں کے لئے دستیاب ہوتی رہیں گی تو کبھی کبھی اپنی بیویوں اور حرموں میں سے کسی کسی کو اپنے کسی لائق اور قابل انعام سپہ سالار کو بخش بھی دیتا تھا۔ چنانچہ اپنی ایک بیوی ایاگو کو جو جاگنبو کی بیٹی تھی اور ونگ خان کی بھانجی ہوتی تھی اپنے سپہ سالار جرجودائی کو دیدیا۔ وجہ اسکی یہ ہوئی تھی کہ چنگیز خاں نے ایک بڑا وحشتناک خواب اس حالت میں دیکھا تھا جبکہ وہ اس بیوی کے ساتھ سو رہا تھا۔ جرجودائی اس وقت خوابگاہ پر پہرا دے رہا تھا۔ چنگیز خاں نے اس بیوی ایاگو سے کہا "تم یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تمہارے چال چلن میں کوئی فرق دیکھکر یا تم کو کم حسین سمجھکر تمہاری چاہت چھوڑ دی نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں تمہیں جرجودائی کو اس وجہ سے دیتا ہوں کہ اسکی خدمات قابل قدر ہیں۔ اس نے لڑائی میں اپنی جان کو خطروں میں ڈالا تھا اور ان قبیلوں کو جو مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے انکو میرے پاس واپس لاکر سلطنت کا ان کو مطیع بنایا۔ تمہارے باپ جاگنبو نے تمہارے جہیز میں ایک باورچی اتسک تیمور نامی اور دو سو آدمی دیئے تھے۔ اور جبکہ میں تمہیں دوسرے کو دیتا ہوں تو ان دو سو آدمیوں میں سے سو آدمی اور اتسک تیمور باورچی میرے پاس تمہاری نشانی رہیں گے۔"

چنگیز خاں کے لئے سب سے بڑے شوق کی چیز شکار تھا۔ اچھے گھوڑوں اور عمدہ شراب کا بھی شوقین تھا۔ شراب خواری میں اپنی قوم کی عادتوں اور مذاق کا پابند تھا لیکن ان میں بھی ضبط اور قاعدے سے حسب عادت کام لیتا تھا۔ فوج میں گو شراب خواری کو بڑھنے نہیں دیا۔ لیکن تیز شرابوں کی قطعاً ممانعت بھی نہ کر سکا۔ ایک مرتبہ حکم دیا کہ "اگر کسی آدمی کو شراب سے روکنے کا کوئی طریقہ ممکن نہیں ہے تو پھر ایسے شخص کو مہینے میں صرف تین مرتبہ شراب پینے کی اجازت ہے۔ اگر تین مرتبہ سے زیادہ شراب پیئے گا تو یہ حکم کے خلاف ہوگا۔ مہینے میں صرف دو مرتبہ شراب پینا اور بھی بہتر ہوگا۔ اور صرف ایک بار پینا اس سے بھی بہتر ہوگا۔ اور سب سے افضل یہ ہوگا کہ مطلق نہ پیئے۔ لیکن کہاں ایسا آدمی مل سکتا ہے جو بالکل ہی نہ پیئے۔۔۔؟"

ایک موقع پر چنگیز نے اپنے پرانے رفیق اور ہمراہی بغورچی سے پوچھا کہ "انسان اپنی سب سے بڑی خوشی اور مسرت کس بات میں سمجھتا ہے؟" بغورچی نے کہا کہ "سب سے بڑی خوشی اور مسرت انسان کے لئے اس میں ہے کہ بہار کا موسم ہو۔ عمدہ گھوڑے پر انسان سوار ہو۔ شکرہ ہاتھ پر ہو اور اس سے شکار مارتا ہو۔" یہی سوال اس نے بورد گولا اور دوسرے فوجی سرداروں سے کیا۔ اس کا جواب بھی کم و بیش وہی تھا جو بغورچی نے دیا تھا۔ اب چنگیز خاں نے اپنے سوال کا جواب خود یہ دیا کہ "نہیں انسان کی سب سے بڑی مسرت اس میں ہے کہ اپنے دشمنوں کو شکست دے۔ اپنے سامنے انہیں بھاگتا ہوا دیکھے۔ جو کچھ انکے پاس ہو وہ سب اپنے قبضے میں لائے اور جن لوگوں سے اپنے دشمنوں کو محبت و تعلق ہو ان کو آنسوؤں سے روتا دیکھے انکے گھوڑوں پر سوار اور ان کی بیویوں اور بیٹیوں سے ہم کنار ہو۔"

یہ الفاظ چنگیز خاں کی طبیعت کو بخوبی ظاہر کرتے تھے۔ اسکو شوکت یا قوت حاصل کرنے یا جوہر شجاعت دکھانے کا اتنا شوق نہ تھا

جیت، تاکہ فتح سے جو پھل ملتے ہیں اُن کے چکھنے اور دشمن سے بدلہ نکالنے کے بعد جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں اُن سے حظ اُٹھانے کا شوق تھا۔ کاہستانوں میں جتنے جنگجو تھے اُن میں لوٹنے والوں کا بہترین نمونہ چنگیز خاں تھا۔ دوسروں کا مال حاصل کرنے کا شوق اور دوسروں کی چیزوں کو اپنے قبضے میں لانے کا لگاؤ طبیعت میں بے حد تھا۔

لیکن ارادے کی قوت اس میں ایسی زبردست تھی کہ اس قسم کی خواہشوں کو قابو میں رکھتا تھا اور ان سے زیادہ سے زیادہ نفع اور نتیجہ بھی پیدا کر لیتا تھا۔ ارادے کی قوت، طبیعت پر قابو اور ضبط، ادھوری تحویلوں سے پرہیز یہ سب باتیں جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں اس کی طبیعت اور مزاج کا بڑا خاصہ تھیں۔ ہر چال کے ادا کرنے کے لئے مناسب وقت اور محل جانتا تھا۔ اور اپنے ماتحتوں سے بھی اس بات کا متوقع رہتا تھا مغلوں نے اپنی روایتوں میں چنگیز خاں کا ایک قول نقل کیا ہے، وہ قول فضول نہ تھا چنگیز خاں کے الفاظ یہ تھے: "روزمرہ کی زندگی میں ایسے رہو جیسے دو برس کا گائے کا بچہ ہوتا ہے۔ لیکن لڑائیوں میں شکرہ بن جاؤ۔ ضیافتوں اور جلسوں میں اس طرح کھاؤ جیسے بچھیرے کھاتے ہیں۔ لیکن لڑائی میں عقاب بنکر شکار پر جھپٹو۔ دن کی روشنی میں بڈھے بھیڑیے کی طرح چوکنے اور رات کے اندھیرے میں کالے کوّے کی طرح ہوشیار رہو۔" چنگیز خاں خود انتظار کرنا اور انتظار میں صبر کے ساتھ بیٹھا رہنا خوب جانتا تھا۔

اپنے منشاء اور مرضی پر سب کو ڈھال لینا اور قہر و غضب کو روک کر عقل کا پابند ہو جانا اُسے خوب آتا تھا۔ ایک موقع پر ارادہ کیا کہ اپنے چچا داریتائی کو قتل کر دے کیونکہ اُس نے اپنے سگے بھتیجے کا کچھ خیال نہ کیا اور اُسکے دشمن ونگ خاں سے وہ جا ملا۔ بغورچی کو جب چنگیز خاں کا قصد معلوم ہوا تو اُس نے چنگیز خاں سے کہا کہ "کسی عزیز کو جان سے مارنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے گھر کے الاؤ کی آگ کو اپنے ہاتھ سے بجھانا۔ تمہارے پاس سوائے اِس چچا کی صورت کے اور کوئی صورت باپ کی صورت یاد دلانے کو نہیں ہے۔ کیا ایسا دل رکھتے ہو کہ اس صورت کو مٹا دو؟" چنگیز خاں پر اس گفتگو کا اثر ہوا۔ اسکی رائے سے اتفاق کیا اور اپنے چچا کا قصور معاف کر دیا۔

اسی طرح مسلمانوں کے قاضی وحید الدین بوشنجی کے ساتھ چنگیز خاں کے تعلقات اُسکی طبیعت کا حال سُناتے ہیں۔ چنگیز خاں اس قاضی سے اکثر اسلام کی باتیں پوچھا کرتا تھا۔ ایک دن چنگیز خاں نے وحید الدین بوشنجی سے کہا کہ "سلطان محمد خوارزم شاہ سے جو انتقام میں نے لیا ہے اس سے میرا نام تمام دُنیا میں بڑی شان سے مشہور ہوگا۔ چونکہ سلطان محمد خوارزم شاہ بادشاہ نہ تھا بلکہ رہزن تھا۔ اُس نے میرے ایلچیوں کو قتل کیا۔ یہ کام ایسا تھا کہ کوئی بادشاہ ہو کر نہ کر سکتا تھا۔" اس کے بعد قاضی سے چنگیز نے پوچھا "بتاؤ میرا نام دُنیا کی آنے والی نسلوں میں بڑی عظمت سے مشہور ہوگا یا نہیں؟" وحید الدین بوشنجی نے سر نیچا کر لیا۔ اور کہا کہ "اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔" چنگیز خاں نے قاضی کی جان سلامت رکھنے کا وعدہ کیا۔ قاضی نے کہا کہ "حضور کے نام کو شہرت ہوگی تو وہ کس میں ہوگی۔ حضور کے مُلازم کسی کو زندہ تو چھوڑتے ہی نہیں۔" جب قاضی یہ جملے کہہ چکا تو چنگیز خاں نے تیر و کمان ہاتھ سے زمین پر پھینک دیا۔ اور قاضی کے سامنے غصہ کی حالت میں ہٹ گیا۔ چنگیز خاں کو غیظ و غضب میں دیکھکر قاضی سمجھا کہ اب اپنا کام تمام ہوا، اور اب کوئی دم میں دنیا سے رُخصت ہونا پڑیگا۔ مگر ایک لمحے کے بعد چنگیز نے قاضی کی طرف دیکھکر کہا کہ "اب تک تو میں اِس شخص کو عاقل و زیرک سمجھتا تھا لیکن اس وقت جو کچھ اس کی زبان سے نکلا اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو سب باتوں کا علم نہیں ہے۔ روئے زمین پر بہت سے بادشاہ اور سلطنتیں ہیں جو شخص اِس سلطان محمد کو پناہ دے گا وہ اپنے مُلک کو غارت کرے گا۔ لیکن اجنبی قومیں اور غیر ملکوں کے بادشاہ چنگیز خاں کا نام ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

بہت سے عجیب واقعات ایسے موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ چنگیز خاں میں اپنے غصے کو روکنے کی کس درجہ قابلیت موجود تھی۔ قواعد اور قوانین کی پابندی میں مبالغہ کے ساتھ سختی کرتا تھا لیکن بعض وقت مصلحت سمجھکر ایسے شخص کو بھی سزا دینے سے پرہیز کرتا تھا جس نے اُسکے

احکام کے خلاف عمل کیا ہو۔ مثلاً بلادِ مغرب کے زمانۂ قیام میں جبی نویان، سوبدائی بہادر اور توغاچار کی سرکردگی میں کی تومان فوج سلطان محمد خوارزمشاہ کی تلاش میں روانہ کی تو ہدایت کر دی کہ حاکم ہراۃ امیر الملک کے مقبوضات کو کسی طرح کا نقصان نہ پہونچا نا۔ جبی نویان اور سوبدائی بہادر نے اس ہدایت کا بہت خیال رکھا۔ لیکن تغاچار نے حاکم ہراۃ کے مقبوضات کو سخت نقصان پہونچایا۔ جب چنگیز خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو پہلے تغاچار کو قتل کر دینے کا ارادہ ہوا۔ لیکن جب زیادہ غور کیا تو بجائے سزائے قتل کے اس کو محض تنبیہ کا ایک خط لکھا اور سپہ سالاری سے اُسے معطل کر دیا۔

لشکر میں قواعد اور سلطنت میں احکام کی پابندی میں بہت سخت تھا لیکن اسکے ساتھ ہمیشہ بلند حوصلگی فیاضی اور تواضع بھی ایسی ہی کرتا تھا جو کاہستانوں کے اُمرا اور رؤسا کی شان تھی چین کے مشہور درویش چنگ چون یا سنگ کے ایلچی یا مسلمانوں یا الغوریوں سے ملاقات میں وہ غیر ملک والوں سے ملنے میں خاصکر جب اپنی کوئی غرض اٹکی ہو تو خاطر تواضع سے کام لیتا تھا۔

چنگیز خان کو ظالم و سفاک، خونریز اور دغا باز مطلق العنان سمجھنا ہماری عادت سی ہوگئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ چنگیز خاں جدھر سے نکلا اُسکے گذرنے کا نشان ایک خون سے رنگا ہوا راستہ ہوتا تھا اور یہ راستہ لاکھوں بے گناہوں کی لاشوں اور جلے ہوئے شہروں اور قصبوں کے ویرانوں سے گذرتا نظر آتا تھا اور ان بے گناہوں کا قاتل اور شہروں اور قریوں کا ویران کرنے والا بھی یہی ظالم و سفاک چنگیز خاں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ چنگیز خاں کے جس قدر حالات ضبطِ تحریر میں آئے ہیں وہ اکثر ان ہی خونی کاموں کی سرگزشت ہیں۔ اور اپنے سوتیلے بھائی بکتر کے قتل سے لیکر آخری لڑائیوں میں قتل عام کی داستان ہیں۔

ان ظلموں کو پڑھ کر اور اس کی طبیعت کے دوسرے پہلو کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ وہ عجیب متضاد اوصاف کا آدمی تھا۔ مثلاً وہ ایسا جو انسان کے خون کا ہمیشہ پیاسا معلوم ہو کبھی ایک داستان کا ہیرو کبھی ایک وحشی غارتگر اور کبھی ایک سلطنت کا بانی بلا جلا نظر آتا تھا۔ لیکن کیا یہ خیال اصلیت سے مطابق ہوتا ہے؟۔

لیکن اگر ہم اُن ماخذوں کو جن سے چنگیز خاں کے حالات بالعموم لکھے جاتے ہیں احتیاط اور تعمق کی نظر سے پڑھیں تو آج کل کے طالب علم کو معلوم ہو جائے گا کہ چنگیز خاں کا نہ تو اُس وقت جبکہ وہ تموچین تھا اور نہ اس زمانے میں جبکہ وہ مغلوں کا خان ہوا کبھی ظلم بیجا اور خونِ ناحق یا غارتگری کی طرف میلانِ خاطر نہ تھا۔ مگر یہ کہنا ضروری ہے کہ خواہ وہ کیسا ہی ذہین اور صاحبِ کمال ہو مگر بہرکیف وہ اپنے زمانے اور اپنی قوم کا ایک فرد تھا اس لئے اسکی نسبت رائے قائم کرنے میں اس کی تصویر کو اُسی زمانے اور وقت کے پردے پر لا کر دیکھنا چاہیئے جس میں وہ پیدا ہوا تھا اور پروان چڑھا تھا۔ دوسرے ملک اور زمانے میں اُس کو منتقل کر کے دیکھنا درست نہیں۔ اگر ہم اس طرح چنگیز خاں کے حالات پر نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ سخت سے سخت لڑائیوں میں بھی خونریزی اور خون آشامی کے لحاظ سے وہ دوسروں سے بڑھا ہوا نہ تھا۔ دُنیا کے اور فاتحوں کے مثل جو مختلف وقتوں اور مختلف قوموں میں گذرے وہ بھی اپنی فوجوں اور دشمن کی فوجوں کو بیدردی سے میدانِ جنگ میں کٹوا دینے میں تامل نہ کرتا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اپنی اغراض کے لئے اگر مفید سمجھتا تو کسی شہر کی تمام مخلوق کو ہلاک کر دینے میں دریغ نہ کرتا۔ لیکن اُس نے کبھی بلا وجہ ظلم اور سفاکی کو جائز نہ رکھا۔ اور نہ کبھی اسیرانِ جنگ کو محض انتقام کی غرض سے وحشیانہ ظلم سے مارا۔ اسکے بعض ہمعصر بادشاہوں نے جو بہ نسبت اُسکے زیادہ شائستہ قوم کے لوگ تھے انہوں نے اپنے سامنے [illegible] کے قیدیوں کو سخت عذاب دیکر جان سے مارا تھا۔ (جیسے کہ جلال الدین نے جنگ پروان کے بعد مغلوں کو اذیت دیکر قتل کیا تھا اور اس قتل پر اپنی [illegible] بھی سنی تھی۔) چنگیز خاں کے دل میں یہ خیال تک نہ گذر سکتا تھا کہ وہ دو ہزار آدمیوں کو اوپر تلے رکھوا کر اُن پر مٹی اور چونا تھوپے اور اس طرح ایک مینار تیار کرائے۔ جیسا کہ امیر تیمور گورگان نے کیا جو ایشیا کا دوسرا بڑا فاتح ہوا ہے۔ اور جس کا مطمح نظر چنگیز خاں سے بھی وسیع تر تھا۔

چنگیز خاں مرتے دم تک طبیعت پر قابو رکھنے والا قواعد و قوانین کا پابند ایک چست و چاق خانہ بدوش انسان رہا۔ اور یہی چیزیں وہ تھیں جنہوں نے اُسکو بلاوجہ قاتلِ انسان نہ بننے دیا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا کہ متمدن اور شائستہ قوموں سے اُسکے خانہ بدوش آقاؤں کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اُس نے آنکھیں بند کر کے شہروں اور قصبات کو غارت کیا۔ البتہ کبھی کبھی اگر اپنا کوئی مقصد نکلتا ہو یا لڑائی کی ضروریات نے مجبور کیا ہو تو وہ پورے شہر کو غارت کرنے سے رُکا نہیں۔

چنگیز خاں کی نجی زندگی میں بھی کوئی بات ایسی دریافت نہیں ہوئی جس سے ظاہر ہو کہ جور و عقوبت کی طرف اُس کی طبیعت خاص طور پر مائل تھی۔ بلکہ اس کے برعکس بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں جو اُس کی فراخ دلی اور ضبطِ طبیعت کا ثبوت دیتی ہیں۔ جس کی طرف ہم پہلے بھی توجہ دلا چکے ہیں۔ اگر اُس زمانے کے طور طریقے پر نظر رکھی جائے تو اپنے بھائی بکتر کے قتل سے لیکر اُن صورتوں تک جو اُسکے حکم سے ہوئیں کہہ سکتے ہیں کہ چنگیز خاں فطرتاً ظالم اور انسان کے خون کا پیاسا نہ تھا۔ چنگیز خان کے جُرم اور گناہ جس کا وہ مرتکب ہوا یا جس کے ارتکاب کا اس نے قصد کیا بہت کچھ ہلکے ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم اُس ماحول کے اخلاقی معیاروں اور مذہبی خیالات پر جو اُس کے دل و دماغ میں سمائے ہوئے تھے غور کریں۔ مذہب میں وہ پُرانے شامانی عقائد کا قائل تھا۔ اور ازلی آسمان (تنگری) اور نگہبان روحوں کے سامنے اپنے کردار کا اپنے کو ذمہ دار اور جوابدہ سمجھتا تھا۔

لڑائی میں حیلوں اور فریبوں سے بھی کام لیتا تھا۔ مگر اپنی نجی زندگی میں وہ ان عیوب سے پاک تھا۔ صفائی اور سچائی کو بہت پسند کرتا تھا لیکن حریص اور طامع ضرور تھا۔ جو چیز اُسکی ہو اور اُس پر کوئی بُری نیت رکھے تو بہت جلد اس سے بدگمان ہو جاتا تھا۔

چنگیز خاں کے زبردست فاتح ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ بہت سی لڑائیاں لڑیں، بہت سے معرکوں میں خود بھی فوج کے ساتھ رہا لیکن ذاتی شجاعت میں وہ کچھ بڑھا ہوا نہ تھا۔ سرداری اور کارفرمائی میں جو درجہ اُسے حاصل تھا وہ سپہ گری اور شجاعت میں نہ تھا۔ اور اس قسم کی بہادری اور شجاعت جو افسانوں میں بیان ہوتی ہے اُس میں نہ تھی۔ لیکن جس دن سے خان ہوا ہمیشہ ایسے حالات میں رہا کہ ذاتی شجاعت دکھانی بے موقع ہوتی۔ دُور بیٹھا لشکروں کو لڑاتا تھا۔ اور لڑائی کے میدان میں فوجیں اُسکے حکم کے مطابق کام کرتی تھیں۔ لیکن خود سواروں کے گھمسان میں موجود نہ ہوتا تھا۔ وہ اسباب کو سمجھتا تھا کہ ایک سالارِ فوج کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ دست بدست لڑائی میں خود جا دھمکے۔

ایک مرتبہ چنگیز خاں کے سپہ سالار بلا نویان نے اس سے پوچھا کہ "آپ کو قوت و سطوت کا خدا سمجھا جاتا ہے آخر آپکے ہاتھ پر کوئی علامت اس قوت و سطوت کی ہے بھی یا نہیں؟"

چنگیز خاں نے جواب دیا کہ "مسند خانی پر بیٹھنے سے پہلے میں ایک دفعہ گھوڑے پر سوار راستے میں جا رہا تھا کہ ایک پل سے گذرنے لگا تو دیکھا کہ وہاں چھ آدمی میری تاک میں بیٹھے ہیں۔ جب میں اُنکے قریب پہونچا تو میں تلوار سونت کر اُن کی طرف بڑھا۔ اُنہوں نے دُور ہی سے مجھ پر تیر برسانے شروع کئے۔ لیکن جتنے تیر اُنہوں نے لگائے وہ سب خطا گئے ایک بھی میرے نہ لگا۔ اور میں نے بڑھ کر ان چھوں دُشمنوں کو قتل کر دیا۔ اور خود صحیح سلامت اس خطرے سے نکل آیا۔ واپسی میں پھر اُس جگہ سے جہاں میں نے ان چھ دشمنوں کو قتل کیا تھا گذر ہوا۔ وہاں دیکھا کہ اُن کے گھوڑے خالی پیٹھ پھر رہے ہیں۔ میں نے اُن گھوڑوں کو پکڑا اور اُنکو ہانکتا ہوا اپنے گھر لے آیا۔"

چنگیز خاں کے نزدیک یہی علامت قوت و سطوت فتح و ظفر کی اُسکے پاس تھی۔ ازلی آسمان نے اس کی تقدیر میں اُتارا تھا کہ اتفاقی موت اسکی نہ ہوگی۔ اُس نے اپنے دشمنوں کو قتل کیا اور اُنکے گھوڑوں پر اپنا قبضہ کیا۔ یہی خیال اُس کے دل میں ہمیشہ رہا کہ ازلی آسمان نے اُس کو اور اُس کے التان اوروق (سنہری قوم) کو اُن تمام نسلوں پر حاکم کیا ہے جو نمدے کے خیموں میں بستی ہیں۔ ان نسلوں کی اور اُن کے پڑوسیوں کی حتیٰ کہ تمام

عالم کی حکومت ازلی آسمان (تنگری) نے اسکو بخشی ہے۔ اس لئے اس کا فرض ہے کہ اپنے ساتھیوں کی رہنمائی اس طرح کرے کہ اُن کا فتحیاب ہونا یقینی ہوجائے اور فاتحوں کی طرح وہ تمام نعمتوں سے متمتع ہو۔ اس کا فوجی انتظام اور اُس کا یاسا دونوں چیزیں ایسی تھیں کہ وہ اپنی مختصر قوم پر قابو یافتہ اور تمام دُنیا پر حکومت کرتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جو لوگ آئندہ زمانے میں اُسکے یاسا پر اپنا عمل رکھیں گے وہ اپنی نسبت بھی وہی بات کہہ سکینگے جو چنگیز خاں اپنی نسبت کہا کرتا تھا کہ ازلی آسمان نے تمام قوموں پر حکومت کرنے کا مجھے حکم دیا ہے۔ غرض کہ چنگیز خاں جس کو وحشی اور صاحب کمال کہا جاتا ہے اُس کی لائف صرف یہی تھی جو اوپر بیان ہوئی۔ بیان ہوا ہے کہ چنگیز خاں دراز قامت اور ہڈی کا مضبوط تھا۔ گربہ چشم تھا۔ یعنی آنکھوں کی پتلیاں نیلی تھیں۔

"جاپان نمبر" کے چند مضامین

"جاپان نمبر" کی چند تصاویر

(ہر مطلوبہ کتب کا محصولڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

موجِ تبسم

شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ
قیمت دو روپے ؏

ومپائر

ایک شریف خاتون کی آبروریزی کا دردناک واقعہ اور ایک عجیب اتفاق سے اس کا دلچسپ انجام قیمت صرف دو روپے ؏

روحِ ظرافت

"انگوٹھی کی مصیبت" اور دیگر مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ہر افسانہ ظرافت کی سوغ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت ؏

مرزا جھنگی

لکھنؤ کے بانکے مرزا جھنگی اور ان کے احباب کا ایک نہایت دلکش ڈرامہ واجد علی شاہ کے زمانہ کے لکھنؤ کی ایک جھلک قیمت آٹھ آنہ

گناہ کی راتیں

سات عورتوں نے اپنے گوہر عصمت کو کس طرح کھویا؟ وہ کیوں اس پر مجبور ہوگئیں۔ عورت کی بے بسی دیکھئے۔ قیمت ؏

نغمۂ نوری

ماں کی ممتا سے متعلق ایک دلدوز حقیقی نغمہ کی ہولناک سرگزشت اس کی زندگی کی آخری ... گناہ کی زرخیز تصویر قیمت ۱۲ر

اخوان الشیاطین

سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ آج تک اس قسم کے حیرت خیز افسانے اردو میں شائع نہیں ہوئے پہلا افسانہ بہت مشہور ہے قیمت ؏

قُل بُوٹ

حسن و عشق کی عجیب و غریب داستان پلاٹ کے اعتبار سے مصنف کا بہترین ناول ہے۔ ایک بوڑھے کو ... کیا ہوا قیمت ؏

شریر بیوی

ایک خاتون کی معصوم شرارتیں اس قدر دلچسپ ہیں کہ کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تصویریں اور رنگین سرورق قیمت ؏

کمزوری

عورت کی کمزور فطرت کس طرح مرد کے ہتھکنڈے میں آجاتی ہے۔ ابتدائی حصہ ہنسانے والا اور آخری حصہ رلانے والا ہے۔ قیمت ؏

نرگس

ایک طوائف نے عشق و محبت کی خاطر اپنی جان پر بنالی اور ایسا ایثار سے کام لیا کہ اپنی جان آپ گنوادی۔ قیمت دو روپے ؏

بحرِ تبسم

شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت دو روپے ؏

طوفانِ تبسم

شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا تیسرا مجموعہ
قیمت دو روپے ؏

سرگزشتِ عروس

ناراضامندی کی شادی اور انمل بے جوڑ رشتوں کی وجہ سے کس قدر ناگوار صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں نہایت دلچسپ عبرت انگیز آپ بیتی قیمت ؏

روحِ لطافت

مہارانی کا خواب و دیگر افسانے جن کو پڑھ کر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے۔ پہلا افسانہ لاجواب قرار دیا گیا ہے۔ قیمت ؏

سیلابِ تبسم

شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا چوتھا مجموعہ
قیمت دو روپے ؏

چندرا موہنی

حسن و عشق کی داستان خونچکاں محبت کا سبق ہمیں سکھاتا ہے۔ سچے عشق کی المناک کہانی مؤثر اور مفید۔ قیمت دو روپے ؏

نرگسِ جمال

بلجیم کے مشہور تمثیل نگار "موریس میٹرلنک" کے ڈرامے جانزل کا شستہ و رفتہ ترجمہ جس میں خیالات و جذبات کی تصویر۔ قیمت ؏

پروین و ثریا

موریس میٹرلنک کی تمثیل "ایگلے وین ایلنڈ سیلیسے" کا پاکیزہ ترجمہ حسن و عشق کا ایک جدید نظریہ بہت عمدہ کتاب ہے قیمت

خطوط کی ستم ظریفی

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے یہ بہترین افسانہ اپنے مخصوص رنگ میں لکھا ہے۔ پلاٹ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے اور ساتھ ہی حیرت و استعجاب کی لہریں دماغ میں دوڑ جائیں گی۔ یہ صرف کتاب نہیں ہنسنے ہنسانے کا مستقل ذریعہ ہے۔ بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ خوبصورت ترین سائز پر شائع کی گئی ہے۔ قیمت صرف بارہ آنہ ۱۲ر

ملنے کا پتہ: کتبخانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی

نغمۂ نوری

تعلیم زدہ بیوی

ایک جدید فیشن کی ہندوستانی عورت غلط راستہ پر پڑ جانے کی وجہ سے کس قدر مصیبت میں مبتلا ہوتی ہے اور اس کا دلچسپ انجام ؏

شہاب کی سرگزشت

نیاز فتحپوری کا پہلا ناول جو اس قدر مشہور ہوچکا کہ اس کے مزید تعارف کی ضرورت نہیں انشاء نگاری کی خاص چیز۔ قیمت ؏

سلمیٰ

آسکر وائلڈ کی مشہور سلومی کا ترجمہ سلمیٰ حسین خون آشام کی ہوسناکی اور محبت کی کشمکش اور طرز بیان خاص چیز ہے
قیمت آٹھ آنہ ۸ر

دلی کا آخری دیدار

۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے دلی کی سوسائٹی کیا تھی لال قلعہ آباد تھا اور ہندوستان میں کیسی بہار تھی سو سال سے پہلے کی ایک جھلک دیکھئے قیمت ؏

لال قلعہ کی ایک جھلک

لال قلعہ کے عجیب و غریب واقعات جن کو پڑھ کر آپ مسرور بھی ہوں گے اور حیرت زدہ بھی قیمت ایک روپیہ ؏

یدِ قدرت

ظالم اپنے کیفر کردار کو کس طرح پہنچا۔ حق کی فتح اور باطل کی شکست خدا کا ہاتھ مرحوم کی طرف سے کس طرح انتقام لیتا ہے۔ قیمت ۵ر

تفویض

ایک گریجویٹ کی شادی ایک مسجد کے مُلّا سے ہوجاتی ہے۔ اس کے عجیب و غریب نتائج قیمت پانچ آنہ ۵ر

چار چاند

دلی کی ٹکسالی اور ستھری ستھری زبان کا لطف اگر آپ اٹھانا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو طلب کیجئے جو حضرت فراق مرحوم کی تصنیف ہے۔ قیمت ۸ر

نگارستان

نیاز فتحپوری کے مضامین کا پہلا مجموعہ جس کے قلم کا پورا اندازہ آپ کو ہوگا عہد شباب کے لکھے ہوئے مضامین ادب لطیف کا خزانہ قیمت ؏

(نہر مطلوبہ کتب خصوصاً ان ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

جوانی اور شادی کی مسرتیں حاصل کرنی ہوں تو

مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیئے۔ ان کتابوں میں جوانی اور شادی کی مسرتیں بھی ہیں عورتوں کے دلوں کو مسخر کرنیکی تدابیر بھی ہیں اور اس کے علاوہ صحت اور تندرستی کے قیام کے اصول بھی ہیں جس کے پاس یہ کتابیں ہونگی وہ بڑھاپے میں بھی جوانی کا کیف حاصل کریگا۔

شب عروسی

پڑھ لینے کے بعد عروسی کی سب باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ شادی کے وقت عموماً دوستوں کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیا جاتا ہے اگر آپ اپنے دوستوں کو ایسے موقعہ میں کوئی بہترین تحفہ دینا چاہتے ہیں تو صرف یہ کتاب دیجیے۔ شب عروسی اصلی کتاب زندگی کا پہلا ورق ہے یا تکمیل نسانیت کے بام کی پہلی سیڑھی ہے اگر اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس زینہ پر قدم رکھا جائیگا تو وہ ایسا کامیاب قدم ہوگا کہ انسان کی یہ فطری مسرت ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہیگی۔ قیمت عہ ہے جو اس کے منافعہ پر سو مرتبہ صدقہ ہے۔ محصول ۵ ر

شاہی کوک شاستر

جو بادشاہوں کے لئے تھا وہ اب عام ہوا اس کتاب میں رجوع اشیخ نے لذت شباب کے سرچشمہ عورت کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ لذتیں جو ایک جوان آدمی کے ذہن میں عورتوں میں ہوتی ہیں شاید وہ اس کے پاسنگ بھی نہ ہوں۔ ارباب منقش نے عورتوں کے رس رنگ میں سے لذت ہی لذت ثابت کی ہے اور اسی طرح مرد کی قوت نہانی کو مزید طاقتور کرنے کیلئے نسخے ٹھکانے اور ہزار ہا گر بتلائے ہیں اس علاج کے سلسلہ میں حکایات وصل بیان کی ہیں وہ صدہا مجربوں کو لاکھوں مقویات مدبر ٹکسیا گر ماہ مقوی ہیں قیمت عہ

برتھ کنٹرول

عورت کی شباب آفرین لذت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ تم اس کے حسن جمال کے خزانہ کو محفوظ رکھنے کا راز سمجھ لو اولاد کی کثرت سے نہ صرف ملکہ حسن کے باغ جمال پر خزاں چھا جاتی ہے بلکہ غریب والدین کیلئے انکی پرورش وبال جان بن جاتی ہے بلا لحاظ نقصان ازدواجی ذوق ولذت سے محروم ہو جاتا ہے۔ برتھ کنٹرول ایک حیرت انگیز طلسمی کتاب ہے جس کو پڑھنے کے بعد تمہارے سامنے زندگی کی ایک بڑی حقیقت بے نقاب ہو جائیگی اور یقین کے ساتھ اولاد کی پیدائش تمہارے قبضۂ اختیار میں ہو جائیگی قیمت عہ

عورت بالتصویر

پھولوں کی سیج پر حسن کی رعنائیاں دیکھنے سے پہلے مجسمہ ناز کے تمام پوشیدہ رازوں سے واقف ہو جائیے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب آپ کتاب پڑھیں۔ اس کتاب میں یورپ امریکہ کی بہترین صنفی کتابوں کا عطر کھینچا گیا ہے عورت میں نسوانی زندگی کا مکمل فوٹو ہے۔ عورت کے پوشیدہ اعضائے جسم عورت کی فطرت عورت کی زینت عورت کے باغ حسن کی خوشہ چینی غرضیکہ عورت کی زندگی کے متعلق کوئی بھی پوشیدہ بات ایسی نہیں جو اس کتاب میں نہ ہو وہ سو کے قریب عکسی و قلمی تصویریں ہیں قیمت ۲ محصول ۶ ر

افشائے راز نہاں

اُردو زبان میں سب سے پہلی کتاب دلچسپ اور عجیب کہ آپ نے اس دلچسپ مضمون پر شاید کوئی کتاب نہ سنی ہوگی۔ اس میں دو ہزار دو سو کنواری اور بیاہی عورتوں کی نفسانی خواہشات کے حالات خود ان کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں امریکہ کی ایک من چلی عورت نے یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کئے تو امریکہ میں ایک ہلچل مچا دی۔ اب اس کا ترجمہ بھی ہو گیا ہے خدا جانے کب تک یہ لوگوں کے مطالعہ میں رہ سکے ہر وقت اس کے بند ہونیکا خطرہ ہے اس لئے جلد منگا لیجے قیمت عہ محصول ۶ ر

لذت شباب

شباب جاوداں کی جستجو ہے تو لذت شباب یعنی ایرانی کوک شاستر کا مطالعہ کیجیے جس سے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ شباب کو عرصۂ دراز تک کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں عورت کے اسرار کیا ہیں حسن کی مہک سے کیونکر لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے گلزار شباب کس عمر و وقت خزاں ہوتا ہے شباب کی دہکتی ہوئی دیوی کس طرح منتظر ہے عورت اگر عورت ہے اور مرد اگر مرد ہے اپنی خواہش پوری کرے تو کیسے خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں لذت شباب کو حیات تازہ بخشنے کیلئے صدہا مجرب نسخے مقوی درج ہیں قیمت عہ

شب عروسی کے افسانے

وہ لذیذ کتاب ہے جو شب عروسی کے تمام لذائذ کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوئی کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ کتاب کیسی دلآویز ہوگی در واقعہ یہ ہے کہ عروس نو ہی کی طرح یہ کتاب حسین پر لذت اور جذبات کی آئینہ دار ہے شب عروسی کے متعدد افسانے ہیں اتنے ہی طریق پر اس زندگی کی سب سے بہتر راتیں کے مزے لوٹے گئے ہیں فقط باتیں یا حکایتیں ہی نہیں بلکہ ہر حکایت ایک نتیجہ خیز قصہ ہے جو بہت سے آئندہ کے خطرات سے محفوظ رکھتا ہے قیمت عہ محصول ۵ ر

لطف شباب

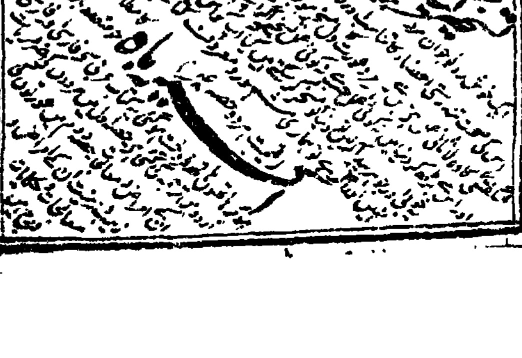
جو عربی زبان میں سلطان سلیم خان ترکی کیلئے لکھی گئی تھی۔ صدیوں سے نایاب تھی۔ امراء رؤساء اس کے دکھانے میں بخل کرتے تھے اور چونکہ عربی میں تھی اس لئے خاص ذی علم اور صاحب ثروت و فضلا اطبا ہی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس کا مطالعہ کمزوروں کے لئے اکسیر اور بے اولادوں کے لئے مژدۂ اولاد ہے اور مقوی باہ مجرب نسخوں اور طلسموں کا نادر و نایاب مجموعہ ہے نسخے نہایت آسان ہیں کو آپ آزمائیں گے تعریف پائیں گے قیمت عہ

شباب کی آٹھ بہاریں

شباب کی راتیں جن کیفیتوں اور ولولہ انگیزیوں کو اپنے اندر رکھتی ہیں ان پر مسرت ساعتوں میں جو جذبات جوش کرتے ہیں بدقسمتی سے ان کی عکاسی اس کتاب میں بہترین کی گئی ہے کتاب پڑھنے کے بعد تمام نقشہ آپ کی نگاہوں کے سامنے پھر جائیگا قیمت عہ علاوہ محصول

دلہنوں کی کانفرنس

سات دلہنوں کی شب ہائے خلوت کی دلچسپ داستان سات دلہنیں ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اپنے واقعات شب عروسی کے صحیح صحیح لیکن شرمیلے الفاظ میں سناتی ہیں اصلاح رسوم کا بہترین مشاہدہ ہیں اور تعلیم حقوق نسواں پر ہر لڑکی دلچسپی سے پڑھیگی اس کی ادبی سرگزشت ہے قیمت عہ



آپکی دعا کیوں قبول نہیں ہوتی

اس لئے کہ آپ دعا مانگنے کے طریقوں سے اور آداب سے ناواقف ہیں اگر آپ دعا مانگنے کے طریقوں سے واقف ہوجائیں تو آپ کی دعا قبول ہوگی اور ضرور ہوگی۔ اس کے لئے کہ قرآنی دعائیں پڑھئے اس کتاب کے پڑھنے اور عمل کرنے کے بعد بے اولاد صاحب اولاد بن جاتے ہیں۔ غریبوں کو افلاس سے نجات مل جاتی ہے۔ مقروض قرضہ سے سبکدوش ہوجاتے ہیں اور پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں ہدیہ آٹھ آنہ ۸؍

آپ سے کون خفا ہے؟

کون منانے سے نہیں منتا؟ آپ کسے اپنا مطیع اپنا فریفتہ اپنا دیوانہ بنانا چاہتے ہیں وہ کوئی عورت ہو یا مرد ہو کوئی بوڑھا ہو کوئی آقا ہو، کوئی حاکم ہو آپ کا مطیع و مسخر ہوسکتا ہے۔ اگر آپ اس عجیب و غریب طلسمی کتاب عمل تسخیر کو ملاحظہ کریں اور اس کی ہدایتوں پر عمل فرمائیں، ہر عمل کی ترکیب نہایت آسان ہے۔ قیمت آٹھ آنہ ۸؍

پندرہ منٹ میں شعر کہنا سیکھئے

اس کتاب میں یہ کمال ہے کہ کیسا ہی معمولی سمجھ اور معمولی لیاقت کا آدمی ہو لیکن پندرہ منٹ میں شاعر بن سکتا ہے اسمیں صرف میں چھوٹے چھوٹے لفظ تجویز کردیئے ہیں ان سے جس بحر کی چاہو تقطیع کرلو بس اگر آپ شاعر بننا چاہیں تو فن شاعری منگائیے۔ قیمت ۸؍

جادو بیانی

موجودہ زمانہ میں انسان کی ترقی کے لئے جن اور چیزوں کی ضرورت ہے وہاں گفتگو میں شائستگی اور تقاریر میں روانی بھی ہونی چاہیئے۔ یہ کتاب آپکو فی الحقیقت ایسا جادو بیان مقرر بنادیگی کہ سامعین آپ کی ہمنوائی کا دم بھرنے لگیں گے اس کے مطالعہ کے بعد آپ بہترین مقرر بن سکتے ہیں۔ قیمت ۶؍

تصویر خیال

عدم سے ہستی کی طرف سفر، زندگی کی کشمکش، دنیا کی نظر فریب دلچسپیاں، موت کے بعد کی کیفیت، دوزخ، اعراف اور جنت موجودہ فلسفہ کے مطابق اگر آپ دیکھنے ہوں تو تصویر خیال ملاحظہ فرمائیے قیمت صرف آٹھ آنہ ۸؍

عملیات

اس وقت تک عملیات کو غیر مستند کتابوں نے بدنام کر رکھا تھا اس کتاب میں پانچسو سے زیادہ ایسے مستند اعمال، اشغال و عملیات ہیں جو اولیاء اللہ اور بزرگان دین کے زیر عمل رہے ہیں اسمیں فن کی حیثیت سے عمل پڑھنا نقش لکھنا وغیرہ درج ہیں ۱۲؍

آپ کے فائدے کی بات

مختلف مقامات سے مختلف کتابیں طلب کرنے سے (خواہ آپ تاجر ہی کیوں نہ ہوں) آپ کو زائد محصول ڈاک ریل کا متحمل ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے آپ تمام کتابیں ہم سے طلب فرمایا کیجئے۔ تاکہ محصول ڈاک ریل میں کفایت ہو۔ دس روپے سے زائد یکمشت کتابیں طلب فرمانے پر ایک آنہ فی روپیہ کمیشن دیا جائیگا بشرطیکہ آپ مبلغ دو روپے پیشگی ارسال فرمائیں اس کی فیس منی آرڈر کتب خانہ کے ذمہ ہوگی۔ جو وی پی کے ساتھ مجرا کردی جائے گی۔

اگر آپ

کوئی کتاب طبع کرانا چاہتے ہوں تو ہم سے معاملہ کریں۔ ہمارے ہاں ہر قسم کی طباعت اور کتابت کا معقول انتظام ہے تمام معاملات خط وکتابت سے طے کرسکتے ہیں۔

مہتمم کتب خانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی

تذکرۃ الاولیائے ہند اردو

کفرستان ہند میں سات سو اولیائے ہند تو ایسے ہیں جن کا حال اس کتاب میں ہے۔ جس میں حالات و کرامات کے ساتھ اقوال الاولیاء کا وہ خزانہ بھی شامل ہے جو شاید کہیں اور نہ ملے۔ یہ کتاب اپنی جگہ خود صاحب تصرف ہے کیونکہ ایک ہندو رئیس نے اس کو پہلے پہل چھاپا اور اس کتاب کے ذریعہ مالا مال ہوگیا۔ یہ کتاب مسلمانوں کے مطالعہ سے گذرے گی تو اُن کے دل و دماغ معرفت الٰہی سے منور ہوں گے۔ قیمت چار روپے للعہ؍

بیویاں اور رانیاں

مسلمان شاہان ہند کی وہ نامور خواتین جن کا اعزاز اب تک تاریخ ہند میں ثبت ہے اس کتاب میں ۳۴۔ اُن شاہی بیگمات اور رانیوں کے حالات ہیں جو اپنی اپنی جگہ مخصوص شہرت کی مالک تھیں۔ ان میں حسین ترین بھی ہیں اور شاعرہ ادیبہ بھی جری اور صف شکن بھی ہیں اور عصمت و عفت کی پیکر بھی اور وہ ماہ پارے بھی ہیں جن کی چاند سی صورتوں پر سلطنتیں اور راجدھانیاں بھی قربان ہوگئیں بڑی دلچسپ اور سرشار کتاب ہے اور مولانا شریف احمد صاحب کی بیش بہا تالیف ہے۔ قیمت ۱۰؍ محصول ۶؍

آسان مضمون نویسی

مدارس کے اساتذہ اور طلبا کے لئے اور اُن لوگوں کے لئے جو اپنی تحریر میں زور پیدا کرنا چاہتے ہیں بہترین کتاب ہے اور اس قدر جلد مقبول ہوگئی کتاب اس کے کامیاب ہونیکا شبہ نہیں رہا اس میں تحریر کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کرکے مشاہیر اور اہل قلم کی تحریروں سے مطابق کیا ہے اور ابتدائی باتوں سے آخر تک تمام ضروری ہدایتوں کو قلمبند کیا ہے اور یقین ہے کہ اس کتاب کو ذہن نشین کرنے کے بعد آپ کی تحریر میں وہ سب خوبیاں پیدا ہوجائیں گی جو مشاہیر انشا پردازوں میں ہیں قیمت ۱۲؍

چار انقلابی

دور حاضرہ کا دلچسپ ترین جاسوسی ناول جس میں غیر معمولی دل و دماغ والا انسان ڈاکٹر نیلم الیسا کی چار زبردست طاقتوں سے ٹکر لیتا ہے۔ مقابلہ کی دلچسپ روداد سے جو پلاٹ بنا ہے بس وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے زبان نہایت سادہ اور چلتی ہوئی ٹکسالی۔ قیمت صرف ایک روپیہ عہ علاوہ محصولڈاک۔

(ہر مطلوبہ کتب کا محصولڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

کتب خانہ علم و ادب کی مقبول عام کتابیں

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی

- خانم
- کمزوری
- کولتار
- ویمپائر
- شریر بیوی
- روح ظرافت
- فل بوٹ
- روح لطافت
- قرآن اور پردہ
- حدیث اور پردہ
- گھریا بہادر
- دیکھا جائیگا
- خطوط کی ستم ظریفی ۱۲ر
- ملفوظات حامی ۱۲ر
- جنت کا بھوت ۱۲ر
- چینی کی انگوٹھی ۸ر
- شہزوری
- مرزا جنگی ۶ر
- تفویض ۵ر
- مقراض محبت ۵ر
- فرزند سرحد ۵ر
- قدر دان ۵ر

ملا رموزی

- شادی
- صبح لطافت
- لاٹھی اور بھینس
- شفا خانہ
- دیوان ملا رموزی

شوکت تھانوی

- موج تبسم
- سیلاب تبسم
- طوفان تبسم

سحر تبسم

- گہرستان

نیاز فتحپوری

- نگارستان
- گہوارۂ تمدن
- شہاب کی سرگذشت
- قرار، نگاہ حسن

شاہد احمد بی، اے

- سرگذشت عروس
- پردین و ثریا
- نرگس جمال

قاضی عبد الغفار

- لیلےٰ کے خطوط

متفرق کتابیں

- شیطان کا چرخہ ۴ر
- چور اور گرگٹ ۳ر
- سحر بنگال
- ید قدرت ۵ر
- چار چاند ۸ر
- مرجبین اندرا ۴ر

[illegible]

مرزا عظیم بیگ چغتائی کا وہ مشہور ترین شاہکار جس کے لئے ایک دنیا بیقرار تھی چھپ کر تیار ہوگیا ہے یہ وہ کتاب ہے جس نے اردو مزاح نگاری میں ایک نیا باب کھول دیا ہے اگر آپ اردو کا معیاری لٹریچر اپنی لائبریری میں جمع کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل رہے گی شروع میں محترمہ حجاب امتیاز علی کا دیباچہ شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کولتار سائز کے چارسو صفحات پر مشتمل ہے نہایت عمدہ کپڑے کی جلد اور اسپر سنہری ٹھپہ سونے پر سہاگہ ہے لکھائی چھپائی بہترین اور کاغذ چکنا ہے۔ ایک جلد ضرور خریدیئے

قیمت چار روپے محصولڈاک ۱۱ر کل

ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی

- جذبات بھاشا ۱۲ر
- ترغیبات جنسی

موسیٰ عنایت اللہ بی، اے

- نجم السحر
- چنگیز خاں کی سوانح ۱۲ر

انصار ناصری

- سلمیٰ ۸ر
- نجمہ نوری ۱۲ر
- چنار موہنی
- تعلیم زدہ بیوی ۸ر

- مجنوں کی ڈائری
- عجیب
- سیب کا درخت ۱۲

ایم اسلم

- مہدی
- ناظمہ کی آپ بیتی
- نرگس
- نغمۂ حیات
- طلسم سامری
- گناہ کی راتیں

- دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ ۴ر
- خواب پریشاں ۴ر
- عشق کی گرہیاں ۴ر
- مغلوں کی آخری شمع
- دلی کی آخری بہار
- دلی کا آخری دیدار ۱۲ر
- تماشا تماشا ۴ر
- سات طلا قنز کی کہانیاں
- بیگموں کی چھیڑ چھاڑ ۴ر
- گمنام عورت کا خط ۴ر
- سوز جگر

- اردو میں ڈرامہ نگاری
- حسرت کے سو شعر ۴ر
- جگر کے سو شعر ۴ر
- جوش کے سو شعر ۴ر
- غالب کے سو شعر ۴ر
- میر کے سو شعر ۴ر
- یادو بیر
- کلید موثر
- موازنۂ انیس و دبیر
- اصغر کے سو شعر ۴ر
- خمخانہ جاوید سوم
- البیان
- مرقع رسول ۶ر
- عقائد الاسلام
- اسلامی میاں بیوی ۱۲ر
- پیام خیام
- اجتماع ضدین ۶ر
- اختر النسار ۴ر
- گلبدن بیگم ۸ر
- حیات سعدی
- دیوان غالب
- تفسیر حقانی کامل
- انکشاف حقیقت ۴ر
- انتخاب کلام برقی
- مقدمہ شعر و شاعری
- عالم خیال
- چار انقلابی
- گفتار تجود
- فن تقریر ۸ر
- فن تحریر ۸ر
- اولاد کی تربیت
- بیوی کے فرائض ۸ر
- فیضان قدسی ۸ر
- آمنہ کا لال
- سیدہ کا لال
- صالحات





Pr ted at the Id isui mataba Delhi, and published by
Shahid Ahmad B.A. (*Hons.*) from the office of the "SAQI" De...